ایڈیٹر:۔۔۔ ماہر القادری

ماہِ اپریل سنہ ۶۲ء

ترتیب

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

چندہ سالانہ سات روپے

مقام اشاعت:۔ دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نقشِ اوّل

ایک شخص چاہے وہ سرکاری ملازم ہو یا پرائیویٹ، اس قسم کی غلطیوں، کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا مرتکب ہوتا ہے کہ اُسے ڈانٹنے ڈپٹنے کی، زجر و توبیخ کی اور بعض اوقات جرمانہ کی نوبت آجاتی ہے، انتباہ (Warning) اور سزا کے یہ تمام مرحلے اُس کی غفلت کوتاہی اور جرم کی نوعیت پر منحصر ہیں، پھر اُس سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جاتا ہے کہ اس کی پاداش میں اُس ملازم کی نوکری سے برطرفی عمل میں آجاتی ہے اور اس کی کوئی معذرت نہیں سُنی جاتی! یہی حال دُنیا کے دوسرے اداروں کا ہے، چاہے وہ کوئی کلب گھر ہو، فری میسن لاج ہو، اسکول اور کالج ہو، ادبی انجمن، سوشل سوسائٹی یا تجارتی ادارہ ہو، ان تمام انجمنوں، سوسائٹیوں اور اداروں کے ارکان اُن کی بعض شدید اور ناقابلِ درگزر غلطیوں پر ان اداروں سے خارج کئے جاتے ہیں، اور اُن کی رُکنیت ختم کر دی جاتی ہے۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ بعض غلطیاں اور جرائم اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ایک فرد کو ملازمت سے یا کسی ادارے کی رکنیت سے خارج کیا جا سکتا ہے، اور ایسا کرنا نہ ظلم ہے، نہ عصبیت اور تنگ نظری ہے! رواداری اور وسعتِ قلب و نظر کے نام پر ایسے غلط کاروں اور مجرموں کو کسی ادارے یا انجمن میں شامل و برقرار رکھنا، دراصل اُس انجمن اور ادارے کے ساتھ بہت بڑی دُشمنی ہے!

معاشرے میں بھی یہی ہوتا ہے کہ بعض غلط کاروں پر حُقّہ پانی بند کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات ذات باہر اور برادری سے خارج کر دیئے جاتے ہیں، تو "اخراج" (Excommunication) نہ کوئی عجیب بات ہے، نہ عقل و دانش کے اعتبار سے اس میں کوئی خامی اور نقص پایا جاتا ہے!

دین و مذہب میں کچھ غلطیاں تو ایسی ہوتی ہیں جن پر فسق و فجور یا گمراہی کی تعریف صادق آتی ہے اور بعض گمراہیاں اتنی شدید نوعیت کی ہوتی ہیں کہ اُن سے صرفِ نظر اور درگزر ممکن نہیں ہوتی، یہ "انکار" "کفر" اور "ارتداد" کی حد تک پہونچ جاتی ہیں، جھوٹی رواداری کے نام پر اس "کفر" کو وہی لوگ برداشت اور گوارا کر سکتے ہیں جن کے اندر دین کے احترام کا جذبہ ہی سرے سے باقی نہ رہا ہو اور جو ایمان و کفر کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں!

تو

کسی شخص کو اُس کے صریح کفریہ اقوال کے سبب خارج از ملّت اور کافر ٹھیرا دینا، درایت و روایت اور عقل و نقل کے اعتبار سے کوئی اچنبے کی بات نہیں ہے، یہ کیسے ممکن ہو کہ ایک شخص کفر بھی بکتا ہے، اور اس "کفر" کے ساتھ وہ ملّتِ اسلامیہ کا ایک فرد اور رکن کی حیثیت سے ملّت میں بھی شامل ہے، دنیا کی کسی منطق اور فلسفہ کی رُو سے ایسے شخص کو جس کی گمراہی صریح کُفر کی حد تک پہونچ چکی ہو، اسلام کا ایک فرد نہیں سمجھا جا سکتا، اُس کے "کفر" نے اسلامی رشتہ کو کاٹ دیا، اور یہ رشتہ اُس وقت تک نہیں جُڑ سکتا، جب تک وہ شخص کفریات سے توبہ کر کے نئے سرے سے ایمان نہ لے آئے۔

انکار، ارتداد، جحود اور کفر و شرک کی اصطلاحیں مُلّاؤں یا مولویوں کی گھڑی ہوئی نہیں ہیں، یہ تمام اصطلاحیں قرآن کریم

واضح طور پر ملتی ہیں۔ جو کوئی یہ سمجھتا ہو کہ جس کسی نے ایک بار اسلام قبول کر لیا اب وہ چاہے "کفر" ہی کا مرتکب کیوں نہ ہوا سے
لام اور ملت سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا، تو ایسا شخص اسلام اور ایمان کا صحیح علم نہیں رکھتا، اور شیطان نے اُس کے کان
جھوٹی رواداری اور مصنوعی دینی اخوت کا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے۔

بعض حقیقتیں بے شک بڑی تلخ، ناگوار اور تکلیف دہ ہوتی ہیں، مگر زندگی میں جب اُن سے سابقہ پڑ جاتا ہے اور اُن سے
رف نظر کرنا ممکن نہیں رہتا، تو انہیں قبول کرنا پڑتا ہے، مثلاً اولاد کے عاق کرنے کا مسئلہ ہے، ایک باپ کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ
اس اقدام پر آمادہ ہوتا ہے، اسی طرح کسی مسلمان کو کافر ٹھیرانا اور خارج از ملت قرار دینا، بڑی تکلیف دہ بات ہے مگر
ب اُس بدبخت سے صریحی طور پر "کفر" کا ارتکاب ہو جائے، تو پھر جس طرح سڑے ہوئے عضو کو جسم سے کاٹ دیا جاتا ہے، اسی طرح
ن مرتکب کفر مسلمان کو بھی کافر اور خارج از ملت قرار دینا پڑتا ہے۔

تاریخ و سیر کی مستند روایتیں بتاتی ہیں کہ عہد رسالت اور خلافت صدیقی میں "دعوئ نبوت" کو کفر و ارتداد سمجھا گیا
ضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مدعیان نبوت کا پوری قوت اور شدت کے ساتھ قلع قمع کیا، یہاں تک کہ مسیلمہ کذاب اور
سود عنسی مدعیان نبوت کو مسلمانوں کی تلواروں نے واصل جہنم کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبائل عرب کے بعض شیوخ مرتد ہو گئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
نے غیر معمولی عزیمت کے ساتھ فتنہ ارتداد کی سرکوبی کی یہاں تک کہ کندہ، بحرین اور عمان کے علاقے مرتدین سے پاک کر دیے
گئے۔ اس کے بعد انکارِ زکوٰۃ کا فتنہ رونما ہوا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے توحید و رسالت کے اقرار کے باوجود منکرین
زکوٰۃ کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ فرما دیا:-

"خدا کی قسم اگر ایک بکری کا بچہ بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا جاتا تھا، کوئی
<u>دینے سے انکار کرے گا</u>، تو میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔"

اسلام کے کسی ایک رکن اور فریضے کے ادا کرنے سے انکار کا فتنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عزیمت، استقلال غیرت اور
دینی تشدد کے سبب بہت جلد فرو ہو گیا، اور منکرین زکوٰۃ ندامت کے ساتھ بارگاہِ خلافت میں زکوٰۃ لے کر حاضر ہو گئے، اس واقعے
سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ توحید و رسالت کے اقرار کے باوجود اگر کوئی "مسلمان" نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ جیسے فرائض اور ارکان
اسلام سے انکار کر بیٹھے تو اُس کا یہ انکار اُس گمراہی کے مترادف ہے جسے دین میں "کفر"... کہا جاتا ہے۔

ایک ہوتی ہے غفلت، ذہول، بھول چوک، کوتاہی، فرو گذاشت یہاں تک کہ مسلسل فسق و فجور کے بعد بھی ایمان اگرچہ
ضعیف ہو جاتا ہے، مگر زائل نہیں ہوتا، وہ فساق و فجار جو گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں، اپنی شامت اعمال کے باوجود اگرچہ
برے مسلمان ہیں مگر ملتِ اسلامیہ میں شامل ہیں، عمل کی خرابی اور کاہلی مستحق احتساب ہے مگر وہ "کفر" نہیں ہے لیکن کسی
بدنصیب مسلمان کو شراب نوشی، قمار بازی اور زناکاری میں کوئی دینی قباحت محسوس نہ ہو اور وہ ان گناہوں کو جائز سمجھنے لگے یا
یہ شخص خدانخواستہ نماز روزے اور دوسرے ارکان و فرائض کا منکر ہو جائے تو توحید و رسالت کا اقرار اُسے "کافر" ہونے
سے نہیں بچا سکتا، سامنے کی بات یہ ہے کہ غفلت اور کوتاہی نفس کے سبب کسی قانون، حکم اور فریضہ کو نہ بجا لانا، انکار و کفر نہیں ہے
[illegible] اُس قانون اور حکم و فریضہ کا انکار "کفر" ہے!

اس حقیقت کو بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اعمال کی نیکی عقیدہ کی خرابی کا بدل نہیں ہو سکتی، ایک شخص بڑا ہی راست باز اور نیک

ہے گناہ کی باتوں سے وہ عام طور پر مجتنب اور نفور رہا ہے، اور توحید و رسالت اور آخرت پر بھی ایمان رکھتا ہو مگر وہ ذیل کی کسی ایک بات کا بھی قائل ہے :-

- ـــــــ حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد "نیا نبی" آسکتا ہے -
- ـــــــ قرآنِ کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے -
- ـــــــ شراب (خمر) گرم ملکوں کے لئے حرام ہے، مگر سرد ملکوں میں اُس کا پینا جائز ہے -
- ـــــــ وفات پالینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اُمت پر فرض نہیں رہی

تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہو۔

اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ "کفر" کوئی "عنقا صفت" چیز نہیں ہے جس کا غیر مسلموں کے سوا اور کہیں وجود ہی نہ پایا جائے، اور کوئی مسلمان کیسے ہی "کفریہ عقیدہ و عمل" میں مبتلا کیوں نہ ہوجائے، اُس کی تکفیر ہی نہیں کی جاسکتی! دین کے معاملہ میں یہ رواداری، فراخ دلی (؟) اور وسعتِ نظر (؟) دین اور عقل کے اعتبار سے بداہتہً غیر معقول ہے! دین کے بنیادی ارکان و عقائد سے انحراف و انکار کے بعد کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اسلام کی بنیاد ڈھانے والوں کو جو کوئی اسلام کے دائرے میں شامل اور باقی رکھنے پر اصرار کرتا ہو، وہ ضلالت آمیز وہم میں مبتلا ہو!

فلاں عقائد "کفریہ عقائد" ہیں؟ ان اقوال کی بنا پر فلاں مسلمان دین سے خارج اور کافر قرار پاتا ہے؟ اس کے فیصلہ کرنے کا حق کسے حاصل ہے؟ ظاہر ہے کہ اس حق کے حامل اور اس منصب کے مجاز وہی لوگ ہیں جو دین میں عالمانہ بصیرت رکھتے ہیں، اور قرآن کی اصطلاح میں جن کو "راسخون فی العلم" کہا گیا ہو!

اس نوبت پر یہ اعتراض وارد کیا جاسکتا ہو کہ علماء دین میں بڑے بڑے اختلافات رہے ہیں، چھوٹے چھوٹے مسائل پر قلمی جنگ اور فتوے بازی، کے باقاعدہ محاذ قائم ہوئے ہیں ـــــــ یہ واقعات اپنی جگہ غلط نہیں ہیں! لیکن عرض یہ ہے کہ تاریخ فلسفہ، سائنس، شعر و ادب ان میں کونسا فن ایسا ہے، جس کے عالموں کے درمیان ہر موضوع پر کامل اتفاق اور سو فیصدی ہم خیالی، موافقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ان کے یہاں "کفر و ارتداد" کی اصطلاحیں نہیں ہیں مگر ان فنون کے علماء نے ایک دوسرے کو غلط اندیش قرار دیا ہے، لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ان مسائل میں یہی علماء سند مانے جاتے ہیں! جب دنیا کے تمام علوم و فنون کے جاننے والوں کے درمیان اختلافی مسائل میں نزاع و جدال رہا ہے، تو علماء دین و شریعت کے درمیان اختلاف و نزاع کا پایا جانا، کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے! اور "اختلاف" کے سبب اُن کو بے اعتبار نہیں ٹھیرایا جاسکتا دنیا کا کوئی مکتبۂ فکر بھی اپنے اصول و نظریات کی تفصیل میں اختلافات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

قانون و عدالت کی دنیا میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہو کہ عدالت ماتحت سے کسی ایک ملزم کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے مگر ہائی کورٹ سے اُسی ملزم کو بری کر دیا جاتا ہے ـــــــ ایک ہی مقدمہ میں دو متضاد فیصلے!! مگر قانون، عدالت اور ملک کے مجسٹریٹوں اور ججوں کا اعتبار، اعتماد اور اُن کی ساکھ اس تضاد و اختلاف کے باوجود باقی ..... رہتی ہے اور رہنی چاہیے! اور وہ اس لئے کہ جہاں تک اصل قانون کا تعلق ہو، اُس پر ایمان لانے میں سب متفق ہیں، واقعات شہادت کے جانچنے اور قانون کی توضیح و تشریح میں، اختلافات واقع ہوجاتے ہیں۔

علماء دین کے اختلافات اور جدال و نزاع کی بنیاد پر جو لوگ علم شریعت کا استہزا کرتے ہیں، وہ کم نظر اور حقیقت ناشناس ہیں۔

پھر دُنیا کے ہر ادارے اور انسٹی ٹیوشن میں سب لوگ ایک ہی جیسے نہیں ہوتے، علمارِ دین میں بھی ہر کردار، ذہنیت اور فراست و استعداد کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں جہاں "دین فروش" پائے جاتے ہیں، وہاں "حاملانِ دین" بھی ملتے ہیں، جنھوں نے دین کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا ہے اور پھانسی کے تختہ پر بھی حق کا اعلان کیا ہے، اسلامی تاریخ کا کوئی دور بھی علمارِ حق سے خالی نہیں رہا۔ امام مالک امام احمد بن حنبل اور مجدد الف ثانی (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے حق گو علمار ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں

ہم ان واقعات کی پردہ پوشی نہیں کرتے بلکہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ علمار کے درمیان "تکفیر و تفسیق" کے معرکے گرم ہوئے ہیں اور ان معرکوں میں بڑی گھٹیا باتیں ظہور میں آئی ہیں، اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے غالب اور اقبال کو بعض شاعروں اور نادانوں نے "شاعر" ہی نہیں مانا، اور ان کا طرح طرح سے مذاق اڑایا ہے، تو بعض علمار شعر و ادب کی اس افسوسناک بلکہ نفرت انگیز معرکہ آرائی کے باوجود تمام شعرار اور ناقدین تو بے اعتبار نہیں ٹھیرائے جاسکتے، اور شعر و ادب کے ناقدین اس کا حق اور منصب رکھتے ہیں کہ کسی نظم، غزل یا نثر پارے پر غلط اور صحیح ہونے کا فتویٰ لگادیں۔

"تکفیر" کی ایک صورت یہ بھی رہی ہے کہ "توہینِ رسول" تو مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نزدیک "کفر" ہے، لیکن اس میں اختلاف ہو کہ فلاں بات "توہینِ رسول" ہے یا نہیں! چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات سے "علمِ غیب" کی نفی اور حضورؐ کی روح سے استمداد و استغاثہ کا انکار، ان مسائل میں "تکفیر" کی یہی نوعیت رہی ہے، جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے!

جس طرح شعر و ادب کی دنیا میں بعض غلط اندیشوں اور کور ذوقوں نے غالب اور اقبال کو شاعر نہیں مانا، یہی نوعیت بعض اہلِ حق علمار کی تکفیر میں پیش آئی ہے، مثلاً بعض "غیر محتاط الفاظ" کی بنا پر اہلِ بدعت نے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تکفیر کی ہے، لیکن اس "تکفیر" کو جمہورِ اُمت نے رد کردیا ہے ـــــــ تو "تکفیر" کے وہ واقعات جن کا تعلق علمار کی محدود تعداد یا ایک خاص گروہ سے ہے، پیش آتے رہے ہیں!

جو لوگ دین کے بارے میں ناپختہ علم اور ادھوری معلومات رکھتے ہیں، وہ ان واقعات سے جنہیں اُوپر بیان کیا گیا ہے، خلجان میں مبتلا ہوسکتے ہیں، اُن کا خلجان دُور کرنے کے لئے ہمیں قدرے تفصیل سے کام لینا پڑے گا ـــــــ سُنیئے:-

جس طرح دوسرے علوم و فنون کے علمار اس عالمِ آب و گل میں رہتے ہیں، اسی طرح علمارِ دین بھی اسی دنیا میں پیدا ہوئے ہیں اور پلے بڑھے ہیں، وہ کسی دوسری دُنیا کی مخلوق نہیں ہیں! دوسرے علوم و فنون میں یہ حادثات پیش آئے ہیں کہ چند ثقہ علمار کو بعض علمار نے بے اعتماد و غلط اندیش ٹھیرایا ہے مگر ان علمار کی اکثریت نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ چند یا متعدد افسوسناک اور غلط قسم کی مثالیں اس کے لئے بنیاد نہیں بن سکتیں کہ کسی علم و فن میں کوئی شخص چاہے کیسی ہی غلط اور گمراہ کن بات کیوں نہ کہہ دے، اُسے غلط کار اور گمراہ قرار نہیں دیا جاسکتا!

ایک واضح مثال: ـــــــ محمد تغلق کے بارے میں مورخین کے درمیان بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں، بعض مورخین نے اُسے دانش و فہیم اور سیاست داں بتایا ہے، اور بعض نے اس کو "مجموعہ اضداد" بلکہ "احمق اور نیم پاگل" قرار دیا ہے، محمد تغلق کے حکم سے دلی سے دیوگری کو دار الخلافہ کی منتقلی، بعض مورخین کے نزدیک کھلی ہوئی حماقت ہے، اور بعض کی نگاہ میں بڑی دور اندیشی کی بات ہے! ان اختلافات کے ہوتے ہوئے، تاریخ کے بعض ایسے حقائق ہیں جن میں تمام مورخین متفق ہیں ـــــــ مثلاً حجاج اور نیرو کے ظالم ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

علمارِ دین و شریعت کے درمیان بھی "تکفیر و تفسیق" کے اختلافات ملتے ہیں لیکن کتنے واقعات ایسے بھی ہیں، جن میں اُن کے

میان کوئی اختلاف نہیں ہے، مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی کی "تکفیر" تمام علماء نے کی ہے، اور علماءِ کرام کے اس "اتفاق" کو جو کوئی اُن اختلافات کی مثالوں سے مجروح کرنے کی کوشش کرتا ہو، وہ خود گمراہی میں مبتلا ہو۔

بعض صوفیاء اور حکماء (فلسفیوں) کے اقوال پر بھی احتساب کی یہ نوعیت رہی ہے کہ بعض علماء نے ان کے کسی قول کو تو کفر کہا ہو، مگر کہنے والے کو "کافر" نہیں کہا اور بعض نے اُسی قول کی بنا پر کہنے والے کی تکفیر کی ہے! اسی طرح سے بعض گمراہ فرقوں کے کفریہ عقائد ہیں، جن پر احتساب کیا گیا ہو!

مگر

مرزا غلام احمد کے بعد اس ساٹھ (٦٠) سال کی مدت میں دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، سُنی اور شیعہ علماء کے اتفاق کی یہ دوسری مثال سامنے آئی ہے کہ ساڑھے پانسو (٥٥٠) علماء نے غلام احمد پرویز کو کافر ٹھہرایا اور خارج از ملت قرار دیا ہے! مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علماءِ کرام کا یہ اتفاق بڑا ہی مبارک اتفاق ہے، اُن کی یہ دینی بصیرت ہر اعتبار سے تبریک و تحسین کی مستحق ہو!

علماءِ اُمت کے اس متفقہ فتویٰ میں پرویز کی تحریروں کے اصل اقتباسات دیئے گئے ہیں، جن کی بنا پر اُس کی تکفیر کی گئی ہے "کفریات" کی "تنقیح" کے بعض اجزاء حسبِ ذیل ہیں:۔

١:۔ قرآنِ کریم میں جہاں بھی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا ذکر آیا ہے، اُس سے مراد نظامِ حکومت کی اطاعت ہے۔

٢:۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے بلکہ وہ عبارت ہے ان صفاتِ عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے۔

٣:۔ رسول کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی اطاعت کرائے۔

٤:۔ ارکانِ دین ـــ نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقہ، خیرات وغیرہ عبادات اللہ تعالیٰ کے حضور خوشامدانہ مسلک کے مظاہر ہیں۔

٥:۔ "مرکزِ ملت" کو پرویز اختیار دیتا ہو کہ وہ عبادات مثلاً نماز میں ترمیم کرلے۔

٦:۔ ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہو کہ انسانی معاشرے کی باگ ڈور اشخاص کے بجائے حکومت کے ہاتھ میں ہوگی ـــ (وغیرہ)

فتویٰ میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بہ نظرِ احتیاط جو یہ چند جملے لکھ دیئے تھے کہ:۔

"۔۔۔ہم سے کسی اقتباس کے اخذ کرنے میں کوئی فروگذاشت ہوئی ہو یا پرویز صاحب کا مفہوم ہم نے کسی جگہ غلط سمجھا ہو، تو ہمیں مطلع فرمایا جائے، ہم شکریہ کے ساتھ اس پر غور کریں گے"

ان جملوں کی آڑ لے کر مسٹر پرویز نے مفتی صاحب موصوف کو ایک خط لکھا ہے، جو "طلوعِ اسلام" میں شائع ہوا ہے اور پمفلٹ کے طور پر بھی چھپوا کر تقسیم کیا گیا ہے ـــ اصل خط حسبِ ذیل ہو:۔

٢٥۔ بی گلبرگ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

٢٠؍ فروری سنہ ١٩٦٢ء

محترم مفتی محمد شفیع صاحب! السلام علیکم

مجھے ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا عنوان ہو۔

عُلمائے اُمّت کا متفقہ فتویٰ

پرویز کافر ہے!

اس فتویٰ کے تمہیدی بیان کے متعلق پمفلٹ میں لکھا ہے کہ وہ آپ کا تحریر فرمودہ ہے۔ اس تمہیدی بیان کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ:-

"علماء کو کوئی خوشی نہیں کہ کسی مدعیٔ اسلام کے بارے میں اس کے خلاف کوئی رائے رکھیں۔ بلکہ فقہاء کی اس معاملے میں انتہائی احتیاط ہر قدم پر ان کے سامنے ہے۔ مگر مجبور ہو کر یہ قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ اور پھر بھی ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سے کسی اقتباس کے اخذ کرنے میں کوئی فروگزاشت ہوئی یا پرویز صاحب کا مفہوم ہم نے کسی بھی جگہ غلط سمجھا ہو تو ہمیں مطلع فرمایا جائے ہم شکریہ کے ساتھ اس پر غور کریں گے۔"

میں یہ عریضہ آپکے بیان کے اسی آخری حصے کے سلسلے میں ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

۲۔ میں سب سے پہلے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ جب یہ اقتباسات اخذ کئے گئے تھے۔ اور ان سے کچھ مفہوم مستنبط کیا گیا تھا تو قبل اس کے کہ ان پر فتویٰ لیا جاتا اور اس فتویٰ کی اس طرح عام اشاعت کی جاتی مجھ سے دریافت کیا جاتا کہ کیا یہ اقتباسات صحیح طور پر اخذ کئے گئے ہیں اور جو مفہوم تمہاری طرف منسوب کیا گیا ہے وہ صحیح ہے؟ کیا یہ عجیب انداز نہیں کہ پہلے فتویٰ صادر کر دیا جائے اور اس کے بعد پوچھا جائے کہ کیا ہم نے صحیح بنیادوں پر فتویٰ صادر کیا ہے؟

۳:۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میری تحریروں سے ایک ایک آدھ آدھ فقرہ ادھر اُدھر سے اخذ کر لیا گیا ہے اور انہیں "مکمل اقتباسات" کہہ کر پیش کر دیا گیا ہے پھر ان منتشر ٹکڑوں سے جو مفہوم مرتب کیا گیا ہے وہ بے حد غلط اور گمراہ کن ہے۔

اب جب کہ آپ فتویٰ صادر فرما چکے ہیں اور اس کی اس طرح سے عام اشاعت بھی کر چکے ہیں تو اس کے بعد میری طرف کے کوئی وضاحت کیا مفید نتیجہ پیدا کر سکتی ہے؟ ہاں اگر آپ اس کا ذمہ لیں کہ جن مقامات پر یہ فتویٰ بھیجا گیا ہے وہاں میرا بیان بھی بھجوا دیا جائے گا تو میں ان تمام شقوں کے متعلق جن پر یہ فتویٰ شائع کیا گیا ہے اپنی تحریروں کے مکمل اقتباسات اور ان کا صحیح مفہوم ارسال خدمت کر دوں گا۔

۵:۔ سرِدست میں اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم نے اُس شخص کو مومن کہا ہے:۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲/۱۷۷)

میں اُن تمام امور پر اُن تصریحات کے مطابق جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ ایمان رکھتا ہوں۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری نبی اور رسول اور قرآن کریم کو تمام نوعِ انسان کے لئے آخری ضابطۂ حیات مانتا ہوں۔ ارکانِ اسلام (نماز۔ روزہ۔ وغیرہ) کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ امت کے مختلف فرقے انہیں جس جس طریق سے ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریق وضع کرے۔

(ب) اطاعتِ خدا اور رسولِ خدا کے متعلق میں جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صورت یہ نہیں تھی کہ ہر شخص اپنے اپنے مفہوم کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر لیتا تھا۔ صحیح شکل یہ تھی کہ حضورؐ کے بعد جو خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہوئی تھی اس سے پوچھا جاتا تھا کہ فلاں معاملہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے گی۔ جو فیصلہ وہاں سے ملتا اُسے خدا اور رسولؐ کی اطاعت سمجھا جاتا۔ اس سے وحدتِ اُمت قائم تھی۔ جب خلافت باقی نہ رہی تو خدا اور رسولؐ کی اطاعت انفرادی طور پر ہونے لگی۔ اس سے اُمت میں افتراق پیدا ہوا۔ اُمت میں دوبارہ وحدت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائے اور اُس کے فیصلوں کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی جائے۔ اس خلافت کو بغرضِ اختصار "مرکزِ ملت" یا اسلامی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور میں اس کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں۔ میں نہ ہر نظامِ حکومت کو اسلامی نظام کہتا ہوں اور نہ اس کے فیصلوں کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت۔ میرے نزدیک خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کے علاوہ کوئی نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اُسے "مرکزِ ملت" کہا جا سکتا ہے۔

(ج) میں ہر اُس حدیث کو صحیح مانتا ہوں جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔ یا جس میں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی شان میں کوئی طعن نہ پایا جاتا ہو۔ میں صرف اُن وضعی روایات کو "عجمی سازش" سے تعبیر کرتا ہوں جن میں غیر اسلامی معتقدات اور رسومات کو اسلام کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔

۶:۔ جس لٹریچر کی بنا پر مجھے کافر قرار دیا جا رہا ہے میں اُس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس ملک میں ہزار دن تعلیم یافتہ ایسے ہیں جو اس لٹریچر کی بدولت اسلام کے گرویدہ ہیں اور اگر یہ لٹریچر ان تک نہ پہنچتا تو وہ کبھی کے مغربی مادیت یا روس کے کمیونزم کی آغوش میں جا چکے ہوتے۔ میں اس لئے بارگاہِ کرم کے لئے بارگاہ ربّ العزت قدم قدم پر سجدہ ریز ہوں کہ اُس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی۔

۷۔ چوں کہ یہ عریضہ آپ کے اس بیان کے ضمن میں ارسال کر رہا ہوں جو آپ نے پمفلٹ میں شائع کر دیا ہے اس لئے اپنے اس عریضہ کو بھی بغرضِ اشاعت پریس میں بھیج رہا ہوں۔ والسلام۔

خیر طلب ——— پرویز

جناب مفتی محمد شفیع صاحب (متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ) نے مسٹر پرویز (علیہ ما علیہ) کے اس خط کا حسب ذیل جواب دیا ہے

جناب پرویز صاحب! السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عرض یہ ہے کہ آپ کا مکتوب مورخہ ۲۰ر فروری سنہ ۶۳ء مجھے ۲۴ر فروری کو مل گیا، مگر کاموں کا ہجوم ایسا ہے کہ مجھے جواب طلب مراسلات میں بلحاظ ضرورت و اہمیت کوئی ترتیب قائم کرنا پڑتی ہے۔ اور پھر اسی ترتیب سے جواب لکھتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔

جس وقت یہ فتویٰ میرے پاس توثیقی دستخط کے لئے آیا تھا اس وقت بھی اس امر کی اہمیت پوری پوری طرح ملحوظ تھی، احساس کا اطمینان کرنا ضروری تھا کہ جن اقتباسات پر فتویٰ لیا جا رہا ہے وہ واقعی آپ ہی کی تحریروں کے اقتباسات ہوں، نیز یہ کہ ان عبارتوں کو سیاق و سباق سے اس طرح منقطع کر کے نہ پیش کیا گیا ہو کہ اصل مفہوم سے مختلف کوئی مفہوم بن جاتا ہو، یا ایسی کوئی شاذ عبارت نہ ہو جو آپ کی کثیر التعداد تصانیف

اور مقالات میں پیش کردہ مسلک سے بالکل میل نہ کھاتی ہو، اور ایسی صورت میں تعبیر کی کوتاہی یا دقتِ سہو کا احتمال ہونے کے باعث وضاحتِ مراد کا موقعہ دیا جاتا ہے۔
متعلقہ عبارتوں میں کوئی ابہام و اغلاق بھی نہ تھا۔ ان کا مفہوم پورا واضح تھا۔ اور وہی مفہوم پیش نظر رکھا گیا ہے جو کسی اردو جاننے والے کے نزدیک اس کا ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے یا کسی مرحلہ پر آپ سے مراجعت کا کوئی سوال نہ تھا۔
ان صریح اور واضح عبارتوں میں ناقابل تاویل انداز کا کفر و الحاد دیکھ کر دیانۃً اس کی گنجائش نہ تھی کہ فتویٰ کی توثیق نہ کی جاتی ——— کسی ایک فرد کا ملتِ اسلامیہ سے کٹنا کوئی معمولی سانحہ نہیں ہوتا ——— بادل ناخواستہ اس تلخ فریضہ کو انجام دینے کے ساتھ تقاضائے احتیاط مزید یہ اہتمام بھی کیا کہ اگر بفرضِ محال کوئی عبارت آپ کی طرف غلط منسوب ہو گئی ہو، یا اقتباس ایسا ناقص اور ادھورا ہو کہ اپنے سیاق و سباق میں اس کا کچھ مفہوم بنتا ہو، اور جس طرح پیش کیا گیا ہے اس سے کچھ اور مفہوم بنجاتا ہو تو اس پر غور کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔

آپ نے اس خط کے جواب میں اسی بات کا اعادہ کرنے کے علاوہ کیا کر سکتا ہوں کہ اگر آپ کسی ایسے اقتباس کی نشاندہی کریں جو آپ کی جانب غلط منسوب کیا گیا ہے، یا اقتباس ایسا ناقص اور ادھورا ہے کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر کوئی بالکل مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے تو اس پر یقیناً غور کیا جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اگر نفس فتویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اس امر کی اشاعت بھی ضرور کی جائے گی۔ نفس فتویٰ اور اس کی ذمہ داری سے متعلق تو اتنی ہی بات تھی۔

باقی مسائل جو آپ نے اس مکتوب میں چھیڑے ہیں وہ منجملہ انہیں مسائل کے ہیں جو امت کے مسلمہ عقائد سے آپ کا انحراف اور آپ کے معتقدات کا اختلاف واضح کرتے ہیں۔ ایمان۔ اطاعتِ خدا و رسول! حدیثِ رسول کے متعلق تمام امت کے معتقدات اور نصوص قرآن و سنت کے خلاف تحریف و تلبیس کا مظاہرہ اس میں بھی ہے!
جہاں تک آپ کے موقف و مسلک کے خلاف دلائل و براہین کا تعلق ہے۔ متعدد اہل علم عرصہ دراز سے وقتاً فوقتاً شرح و بسط کے ساتھ اور مختلف عنوانات سے انہیں پیش کر کے آپ کو متوجہ کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس موضوع پر معتدبہ لٹریچر جمع ہو گیا ہے جس سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ میری جانب سے ان مسائل پر بحث و مباحثہ اور رد و قدح کا ایک نیا سلسلہ نہ کچھ نتیجہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ نہ میری توتی اور مشاغل اس کی چنداں اجازت دیتے ہیں۔ اگر ان مسائل پر ہر اعتبار سے ایسے موثر اور مدلل انداز میں جو طالبِ حق کے لئے کافی ہونا چاہیے۔ جن کی وضاحت نہ ہو چکی ہوتی تو شاید میں اپنی تمام معذوریوں کے باوجود اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی بصیرت و بضاعت کی حد تک ان مسائل پر جو آپ نے اس مکتوب میں چھیڑے ہیں، ضرور کچھ لکھتا لیکن نہ اس کی افادیت نظر آتی ہے نہ ضرورت۔ اس لئے یہ خط اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر حق واضح فرما دیں اور اسے قبول کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائیں اور تمام مسلمانوں کو شرورِ نفس سے مامون اور حق پر قائم رکھیں — واللہ الموفق والمعین

مغالطے اور فریب

مسٹر پرویز نے اپنے مکتوب میں مظلوم بن کر مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے کہ اُن کی تحریر کے کچھ ادھ کٹے فقرے اور نامکمل جملے ادھر اُدھر سے لے کر جوڑ دیے گئے ہیں، اور اُن کا جو مفہوم مرتب کیا گیا ہے، وہ غلط اور گمراہ کن ہے۔

اول تو یہ بات ہی سراسر تہمت ہے، افترا ہے اور ساتھ ہی مغالطہ آمیز ہے کہ پرویز صاحب کی تحریروں میں اس قسم کی کاٹ چھانٹ کی گئی ہے، جن کے سبب اُن کا مفہوم وہ نہیں رہا جو اُن عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے، یا اُن ادھوری عبارتوں سے علماء نے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ پرویز صاحب کے مفہوم اور عقائد سے مختلف ہے —— اگر بہ فرضِ محال ایسا کیا گیا تھا تو پرویز صاحب کو اپنے مکتوب میں ایک دو عبارتوں کے نمونے تو ضرور لکھ دینے چاہیے تھے، مگر وہ اس مبینہ "تحریف اور کاٹ چھانٹ" کا ایک نمونہ بھی اپنے مکتوب میں پیش نہ کر سکے، اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے علمائے کرام پر اپنی تحریروں کی تحریف، قطع و برید اور غلط مفہوم اخذ کرنے کا جو الزام لگایا ہے، وہ سراسر بے بنیاد ہے! وہ جو فارسی کی مشہور ضرب المثل ہے —— دروغ گویم بروئے تو ... دزدے کہ بکف چراغ دارد —— تو مسٹر پرویز کا ایسا ہی معاملہ ہے! ہم نے بعض کافروں کو بھی معاملات میں راست باز پایا ہے، مگر پرویز صاحب کی "کفریات" کی غرض و غایت اپنے نام سے ایک جدید فرقہ کی تشکیل دینِ اسلام کی قدروں کی تخریب اور اسلام کا حلیہ بگاڑنا ہے، اس لئے وہ "کفر" کے ساتھ ساتھ راست بازی اور سچائی کے اُس انسانی اور فطری احساس و استعداد سے بھی محروم ہو گئے ہیں جو خاندانی کافروں تک میں پائے جاتے ہیں۔

پرویز صاحب کی تحریروں میں "انا الحق" —— "سبحانی ما اعظم شانی" —— اور "وحدت الوجود" کے رموز و غموض بھی نہیں پائے جاتے کہ اُن کی مختلف تاویلیں کی جا سکتی ہیں، اُن کے عقائد و نظریات کا معاملہ ابن سینا، فارابی اور ابن رشد کے فلسفہ اور علم کلام جیسا بھی نہیں ہے کہ اُن کی نازک اور باریک توجیہات ممکن ہیں! پھر یہ بھی نہیں ہے کہ پرویز صاحب کے لٹریچر سے چند اقتباسات لے کر اور انہیں بے خبر رکھ کر یہ فتویٰ اچانک صادر کر دیا گیا ہے! تقریباً دس سال سے علمائے ارباب فکر اور اہلِ قلم پرویز صاحب کو اُن کی گمراہیوں پر مطلع کرتے رہے ہیں، تنہا رسالہ "فاران" میں پرویز صاحب کے گمراہ کن معتقدات و نظریات اور کافرانہ رجحانات پر متعدد طویل مقالے لکھے گئے ہیں اور ایک مضمون کتابی شکل میں شائع کر کے ہزاروں کی تعداد میں پھیلائے گئے ہیں اور پرویز صاحب کی خدمت میں بھی نہیں بھیجا گیا ہے — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے "منصب رسالت نمبر" شائع فرما کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا ہے۔

یہ واقعہ ہے اور اس کے ثبوت میں رسالہ "طلوعِ اسلام" کے فائل پیش کئے جا سکتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح غلام احمد پرویز بٹالوی کی گمراہی بھی تدریجی طور پر "کفر" تک پہونچی ہے! جہاں تک قرآنِ کریم کی معنوی تحریف کا تعلق ہے، پرویز نے باطنی ملاحدہ کو منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے، قرآنِ کریم کے خلاف، اسلام کے خلاف اور رسالت کے خلاف منظم طور پر اتنی خوفناک سازش کا تاریخ میں شاید ہی وجود مل سکے۔

اپنے مکتوب میں قرآنِ کریم کی جو آیت مسٹر پرویز نے درج کی ہے، وہ منافقانہ چال ہے:— یہ شخص اُس اللہ کو مانتا ہے —— جو ان صفاتِ عالیہ سے عبارت ہے، جنہیں انسان اپنے اندر منعکس دیکھنا چاہتا ہے"۔ (معارف صفحہ ۴۳۰) "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" کی تفسیر کرتے ہوئے پرویز صاحب نے "اللہ" سے "معاشی زندگی" کا قانون مراد لیا ہے (نظام ربوبیت ص۱۱) "الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" کی تفسیر ان لفظوں میں کی ہے:—

"جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہی معاشرہ مستحق تعریف و ستائش ہوگا جو ربّ العالمین"

(تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا۔ (سلیم کے نام بارھواں خط ص۱۹۲)

معاشرہ بقول پرویز "حمد" کا مستحق ہے تو کیا وہ "مالک یوم الدین" بھی ہے؟ اور "ایاک نعبد وایاک نستعین" بھی کیا اُسی کی صفت ہے!
کیا اُسے "مستعان" اور "معبود" بھی ہونا چاہیئے اور سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے نہیں تو کیا معاشرے سے ہدایت (اہدنا الصراط
المستقیم) کی دُعا مانگی جاتی ہے —— قرآنِ کریم کے ساتھ اس قدر ظالمانہ مذاق —— توبہ! ایک مجوسی بھی قرآن کریم کی تحریف
ایسی جرأت شاید نہ کر سکے! استغفر اللہ!

"ملائکہ کے بارے میں اس شخص کا یہ عقیدہ ہے:۔

"---- ملائکہ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انھوں نے آدم کو سجدہ کیا یعنی وہ آدم کے سامنے
جھک گئے، آدم سے مُراد آدمی یا نوعِ انسانی ہے، لہٰذا ملائکہ کے آدم کے سامنے جھکنے سے یہ
مُراد ہے کہ یہ (ملائکہ) وہ قوتیں ہیں جنہیں انسان مسخر کر سکتا ہے۔ (لُغات القرآن ص۲۲۴)

رہی "نبوت و رسالت" تو پرویز کا مشن ہی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو دین میں ناقابلِ حجت اور بے راہ
ٹھیرا کر اطاعتِ رسول ؐ سے مسلمانوں کو منحرف کر دیا جائے!

اللہ اور رسول ؐ کے بارے میں پرویز صاحب کیا تصور اور عقیدہ رکھتے ہیں؟ یہ انہی کی زبان سے سُنیئے:۔

"یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ نظامِ حکومت ہے (معارف جلد۴ ص۶۲۴)

اور

"---- اس لئے قرآنِ کریم میں مرکزِ ملت کو اللہ اور رسول ؐ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اللہ اور
رسول یعنی مرکزِ ملت کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے (معارف جلد۴ ص۶۳۴)

اس شخص نے اللہ، رسول، ملائکہ، آخرت، صلوٰۃ (نماز)، حق، باطل، فضل، طیبات، اعمالِ صالحہ، تقویٰ ---- ان سب کلمہ
مُثلہ (Mutilitation) کر کے رکھ دیا ہے۔

قرآنِ کریم کے ساتھ اس "نظامِ قرآنی کے داعی (؟)" کا یہ سلوک ہے۔

"اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو قرآن میں وراثت وغیرہ کے احکام کس
لئے دیئے گئے ہیں، تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرے کو اپنے متعین کردہ پروگرام
کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہونچاتا ہے، اس لئے جہاں وہ اس پروگرام کی
آخری منزل کے متعلق اصول و احکام متعین کرتا ہے، عبوری دور کے لئے بھی ساتھ ساتھ
راہنمائی دیتا چلا جاتا ہے، وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ، خیرات وغیرہ کے احکام
اسی عبوری دور سے متعلق ہیں جن سے معاشرہ گزر کر انتہائی منزل تک پہونچتا ہے۔
(نظامِ ربوبیت ص۲۵ —— تعارف کتاب)

جو شخص کارل مارکس کے معاشی نظریات کی تائید اور ذاتی ملکیت کی نفی کے لئے قرآنِ کریم کے ابدی احکام کو "عبوری دور" سے متعلق
ہو، وہ قرآنِ کریم سے مجوسیوں کی طرح دشمنی رکھتا ہے۔ (تشابہت قلوبھم!)

مُنافقین کی طرح پرویز بھی مسلمانوں میں شامل رہ کر اسلام کی جڑیں کاٹنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور مسلمانوں کی سو

اٹھانے کے لئے اللہ، ملائکہ، کتب اور نبیوں پر ایمان لانے کا زبانی اقرار کرتا ہے مگر ایسے منافقین کے بارے میں قرآن کریم
فیصلہ ہے:-

میں مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ	بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر
نَ ۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ	ایمان لائے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں، وہ اللہ اور
ھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۔ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ	ایمان والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں مگر دراصل وہ خود اپنے
ھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا کَانُوْا	آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے ان کے
نَ ۔ (البقرہ ۔ دوسرا رکوع)	دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا اور جو

جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے!

پھر پرویز صاحب نے اطاعتِ رسول اور خلافتِ علیٰ منہاج النبوت کا جو ذکر کیا ہے تو وہ ایک طرف تو فریب ہے
ری طرف خلافتِ راشدہ پر تہمت ہے۔ خلافتِ راشدہ میں خلفائے راشدین نے اور تمام صحابہ کرام اور تابعین
پوری امت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو دین میں حجت اور منصوص سمجھا ہے۔ بیعت خلافت کے دوسرے
مسجد نبوی کے منبر پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو خطبہ دیا تھا، اس کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

اطیعونی ما اطعت اللّٰہ ورسولہ فاذا عصیت	میں اللہ اور رسول کی اطاعت کروں، تو میری اطاعت کرو
اللّٰہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم قوموا	لیکن جب اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت
الی صلاتکم یرحمکم اللّٰہ (طبقات ابن سعد)	نہیں! اچھا! اب نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ، اللہ تم پر رحم کرے

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ اور رسول سے مراد میری ذات ہے کہ میں مسلمانوں کا امام ہوں اور نہ
یہ مرکز ملت ہوں جسے قرآن کریم میں اللہ اور رسول کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جس طرح قرآن کریم کے دوسرے منصوص احکام، الفاظ اور اصطلاحوں کو پرویز صاحب کی شرح و تفسیر نے "طلسم ہوشربا"
ہے کوئی احساسِ ذمہ داری نہیں، نہ خدا کا خوف، نہ بندوں کی شرم! اسی طرح "خلافت علیٰ منہاج النبوت" کی جو تعریف
نے بیان کی ہے، وہ ان کے اس ذہن کی تراشی ہوئی ہے جس نے اس بات کا بیڑا اٹھا لیا ہے کہ اسلام کی کسی "قدر"
، ۷۸) کو اس کی اصل حالت پر نہیں رہنے دو نگا۔

خلفائے راشدین کی زندگیاں، ان کے فیصلے، ان کے اقوال اور ان کا طرزِ حکومت چڑھتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہیں
! یہ نفوس قدسیہ سنتِ رسول اللہ کو دین میں حجت اور حرفِ آخر سمجھتے تھے! سنتِ نبوی کے بارے میں ان کا مسلک
وہی تھا، جو ہر دور میں جمہورِ امت کا عقیدہ رہا ہے، پرویز صاحب خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوتے اور قرآن
ں بے دردی کے ساتھ معنوی تحریف کرتے، اور سنتِ رسول کو بے اعتبار ٹھیراتے تو اسلامی حکومت کے احتساب
سکتے۔

پردہ خوانی سابق گورنر جنرل غلام محمد کی زندگی اور ان کے کرتوت ہم سب کے سامنے ہیں۔ پاکستان میں جتنا بھی بگاڑ
پیدا ہوا ہے، اس کا بہت کچھ ذمہ دار یہی شخص ہے، لیکن پرویز نے اس بدنام شخصیت کی جس جس عنوان سے
قصیدہ خوانی کی ہے، اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:-

"گورنر جنرل نے ۲۴ راکتوبر ۱۹۵۴ء کو غیر معمولی جرأت و تدبیر سے مجلس دستور ساز
کو توڑا، تو اُس پر ملک کے گوشہ گوشہ سے "احسنت و مرحبا" کا غلغلہ بلند ہوا اور
دیکھا جائے تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا کیوں کہ قوم مکمل تباہی کے غار تک پہنچ
چکی تھی ----

اپریل ۵۳ء میں گورنر جنرل نے اس قسم کی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے
ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کیا تھا، جو پیر تسمہ پا کی طرح ملت کے رگ گلو کے
لئے نشتر بن رہی تھی، یہ برطرفی ملک و ملت پر احسان تھا۔

(طلوع اسلام ہفتہ وار ۹ راپریل ۵۵ء)

اگست کو جب کہ ستمبر کا طلوعِ اسلام حوالہ ڈاک کیا جا رہا تھا، محترم غلام محمد صاحب (سابق گورنر جنرل) کی
ت کی اندوہناک خبر ملی، ان کی صحت عرصہ سے خراب چلی آ رہی تھی لیکن نہ ایسی کہ وہ ان کی موت کو قریب لے آتی
لئے یہ حادثۂ المیہ غیر متوقع سا تھا، اُنہیں جب سپردِ خاک کیا جا رہا تھا، تو ہمیں یہ خیال آ رہا تھا کہ ایسا ہی تھی
ن کی قوتِ بازو نے ابھی کل پوری کی پوری مملکت پاکستان کو موت کے منہ سے نکالا تھا، آج خود موت کے
ش میں چلا گیا، کیسی خوش آئند ہے وہ موت، جو ایک قوم کو سامانِ عطا کرنے کے بعد آئے

؎ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ے اس قحط الرجال میں مرحوم کی ہستی مغتنمات میں تھی، وہ اس انداز کے انسانوں کی آخری یادگار میں سے تھی
ے متعلق اقبال نے کہا ہے ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ اُو دلِ دردآشنائے
چو جوئے در کنارے کوہسارے

(طلوع اسلام)

نے ملک کو تباہی سے بچایا تھا ـــــ ملت پر احسان کیا تھا ـــــ مملکتِ پاکستان کو موت کے منہ سے نکالا تھا ـــــ
ے طینت تھا ـــــ اور جوئبار کی طرح اپنے اندر دلِ دردآشنا رکھتا تھا ـــ اس سے "طلوعِ اسلام" کی تحریک اور پرویز
نکا، فکر و نظر کا اور انسان شناسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے! ملک و ملت کو تباہ کرنے والے، جس کے نزدیک قوم کے
دہندہ اور مسیحا نفس ہوں، اُس کے دماغ کی کجی، فکر کی لپستی اور نگاہ کی غلط بینی کی بھلا کوئی انتہا ہے! ہائے اعلامسر
روں کا اس قدر غلط استعمال! فریاد!! کیا اس ذہنیت اور مزاج کے "مرغانِ باد نما" کی خیر خواہی اور قصیدہ خوانی پر
سکتا ہے! ؎

یہ تو وہ لوگ ہیں اپنوں کے نہ بیگانوں کے

. تکہ خواص و عوام سب کو اس بات کی حیرت تھی کہ انجکشنوں کے ذریعہ یہ لاش اب تک حرکت میں رہا!

(م۔ق)

ت رسولؐ سے دشمنی

اپنے خط میں مسٹر پرویز نے جو یہ لکھا ہے کہ :-

"میں ہر اُس حدیث کو صحیح مانتا ہوں جو قرآن کے خلاف نہ ہو"

— تو —

دھوکے کی بات ہے ! یہ بات تو ہندو، پارسی، عیسائی، یہودی اور سکھ بھی کہہ سکتا ہے کہ فلاں "حدیث" صحیح ہے، یعنی وہ سند
یت اور درایت کے اعتبار سے قولِ رسول ہی ہے، وضعی اور جعلی نہیں ہے ——— اصل مسئلہ یہ ہے کہ جس قولِ رسولؐ
ویز صاحب صحیح سمجھتے ہیں، اُس کا دین میں کیا درجہ ہے ؟ اگر اُن کے نزدیک "حدیث صحیح" دین میں حجت ہے، تو پھر ساری
ع ہی ختم ہو جاتی ہے ۔

مگر

وہ لفظی ہیر پھیر سے اپنے چند نادان ہوا خواہوں کو دھوکا دے سکتے ہیں، لیکن ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک
ا بیس سال سے وہ مسلسل "احادیث نبوی" اور "سنّتِ رسولؐ" کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں، اُن کی زندگی
ن ہی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث .... اور حضورؐ کی سنّت بے وزن اور ساقط الاعتبار ثابت ہو جائیں
لمانوں کا اُن پر اعتماد باقی نہ رہے ! احادیثِ رسولؐ کو انھوں نے ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار "عجمی سازش" سے تعبیر کیا ہے
نامہ "طلوعِ اسلام" کے اوراق اس کے گواہ ہیں کہ جب کبھی پاکستان میں "دستور سازی" کا موقعہ آیا ہے، پرویز صاحب نے
ن چوٹی کا زور لگا دیا ہے کہ "سنّتِ رسولؐ" کا لفظ دستور میں باقی نہ رہے، اور "سنّتِ رسولؐ" دستور اور قانون کی اساس و
نہ بننے پائے ! جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے، حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ سے اور طریقہ و سنّت سے اس قدر
ی اور بغض و عداوت ہو، اُس کی ایمان سوز ضلالت میں جو کوئی شک کرتا ہے اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔

انسانوں کے ساتھ ہمدردی بڑی اچھی چیز ہے۔ مگر ایک سفاک ڈاکو، جس نے لوگوں کا مال لوٹا
ہو اور دسیوں قتل کئے ہوں، اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں دیکھ کر اگر کسی
رس آتا ہے، تو یہ ہمدردی اپنی جگہ خود سفاکی ہے ! کسی مسلمان کی "تکفیر" یقیناً افسوسناک سانحہ ہے، اس سانحہ سے اللہ تعالیٰ
صاحبِ ایمان کو محفوظ رکھے، مگر کسی بدبخت اور برخود غلط کے یہاں موجباتِ کفر کی کثرت اور تکرار پائی جائے اور اُس کی گمراہیا
بھی کفر کی حد تک پہونچ جائیں، تو علماء دین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کریں اس وقت ایک حق
مند کو ہمدردی اسلام کے ساتھ ہونی چاہیے، نہ کہ اُس فرد کے ساتھ جس نے اسلام کے مقابلہ میں "کفر" کا ارتکاب کیا ہو۔

اس فتوے میں علماء کرام نے مسٹر پرویز کے صرف چند "موجباتِ کفر" کا ذکر کیا ہے، جن میں "ایصالِ ثواب" کا انکا
ی چیز بھی ضمناً آگئی ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص کی تحریریں، ضلالت و فساد اور موجباتِ کفر سے بھری پڑی ہیں !
سلوبِ نگارش اور افکار و خیالات میں پرویز صاحب نے نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" کا اثر قبول کیا ہے، مگر شاگرد نے
پنے معنوی اُستاد کو ضلالت و گمراہی میں منزلوں پیچھے چھوڑ دیا۔

جو نادان اور کم سمجھ علماء کرام کے اس فتوے پر مسٹر پرویز سے ہمدردی رکھتے ہیں، اور اس شخص کو مظلوم سمجھتے ہیں، وہ یہ بھی تو
یکھیں کہ خود یہ "مظلوم" کس ظلم و سفاکی کا ارتکاب کر چکا ہے ——— پرویز صاحب لکھتے ہیں :-

"..... لیکن تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا سارا زور اسی میں صرف ہوتا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح

اسلام کو قرآن سے پہلے زمانے کے "مذہب" میں تبدیل کر دیا جائے، چنانچہ وہ اس کوشش میں
کامیاب ہو گئے اور آج جو اسلام دنیا میں مروج ہے، وہ زمانہ قبل قرآن کا مذہب ہو تو ہو
قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

لرام کے فتویٰ کا تعلق پرویز نام کے ایک شخص کی ذات سے ہے' اور پرویز صاحب نے کروڑوں مسلمانوں پر جن میں بڑے شما
اور اتقیا بھی شامل ہیں' اُس مذہب کے پیرو ہونے کا فتویٰ لگا دیا، جس کا قرآنی دین سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"
"زمانہ قبل قرآن کا مذہب" یا تو نصرانیت ہوگا، یا یہودیت' یا کواکب پرستی اور بُت پرستی، یعنی کفر و شرک! تو پرویز
ب کے قول کے مطابق جمہور اُمت یا تو نصرانی ہے' یا یہودی ہے یا کافر و مشرک! ؎
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی!

ہم اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر آخرت کی جواب دہی کی ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ علماء
اپنے مسٹر پرویز کے جن کفریہ معتقدات و خیالات کی بنا پر ان صاحب کی تکفیر کی ہے' اس میں علماء کی طرف سے اس شخص پر نہ تو
تم کی زیادتی ہوئی ہے اور نہ اُس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہے' جو خلافِ واقعہ ہو! ایسا معاملہ بھی نہیں ہے کہ پرویز صاحب
م سے چند جملے کسی ذہول و غفلت کے سبب اتفاقیہ طور پر نکل گئے ہیں! اس شخص کا لکھا ہوا ہزاروں صفحات کا لٹریچر موجود ہے
ں کے گمراہ کن اور کفریہ عقائد کی تشریحات سے لبریز ہے!
زیادتی اور ظلم کا ارتکاب تو پرویز صاحب نے کیا ہے کہ پوری اُمت کے "مذہب" کو قرآنی دین کے دائرہ سے خارج
دیا ہے!

علماء کرام "تجدد پرستوں" اور "مغرب زدوں" کے استہزاء کے خوف سے اگر خاموش رہتے' تو اللہ تعالیٰ کے یہاں جوابدہ
تے، مگر انھوں نے اپنے فرض کو پہچانا، اور اعلانِ حق کا فرض ادا کر دیا۔

—— (فجزاھم اللہ خیر الجزاء فی الدارین) ——

—✕—

احمد القادری
۲۵ مارچ ۶۲ء

مسٹر پرویز کی گمراہی کی بنیاد یہی ہے کہ جمہور اُمت کے دین کو وہ قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس ضلالت میں مبتلا ہیں کہ اصل دین
مطابقِ قرآن ہے' وہ اُن کے اور صرف اُن کے پاس ہے! اس لئے اس شخص نے اُمت کے بنیادی عقائد کے مقابلہ میں اپنے ذہن سے بہت
خرافات" گڑھی ہیں' یہاں تک کہ لفظ "اللہ" اور "ربُّ العٰلمین" تک کی تحریف کر ڈالی ہے (نعوذ باللہ)

ملک غلام علی

فقہی مسائل میں رواداری اور توسّع!

کتاب "فقہ السنہ" پر "فاران" میں تازہ بحث مطالعہ میں آئی۔ اس سلسلے کی سابق بحثیں بھی نگاہ سے گزرتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں ایک مسئلہ ایسا چھیڑا گیا ہے جس کی اہمیت کے پیش نظر مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ مختلف المسلک اصحاب کا نماز میں ایک دوسرے کی اقتدا کا مسئلہ ہے۔ دوران بحث فقہائے حنفیہ کا یہ مسلک بیان کیا گیا ہے کہ اگر غیر حنفی امام سے کسی ایسے فعل یا ترک فعل کا صدور ہو، جو امام کے نزدیک مفسد صلوٰۃ نہ ہو، لیکن حنفی مقتدی کے نزدیک اس سے نماز کا فساد یا ابطلان لازم آتا ہو تو ایسے امام کے پیچھے اس مقتدی کی نماز فاسد اور قابل اعادہ ہے بلکہ مدیر "شہاب" نے دیگر ائمہ (مثلاً امام احمد اور امام شافعیؒ) کے قول و فعل کی توجیہہ بھی ایسے انداز میں کرنے کی سعی کی ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ بھی اس معاملے میں حنفیہ سے متفق ہیں اور اس مسئلے میں گویا کہ ائمہ مجتہدین کے مابین کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔

لیکن میری ناقص معلومات کی حد تک یہ صورت مسئلہ نہ صرف دیگر فقہاء کے یہاں غیر مسلّم ہے بلکہ خود فقہائے حنفیہ کے یہاں بھی اسے اجماعی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ تو میں مانتا ہوں کہ متاخرین حنفیہ نے بالعموم اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ اگر امام کسی شرط یا رکن کو ترک کر دے یا اس سے کسی ایسے فعل کا صدور ہو جو مقتدی کے نزدیک مُبطل صلوٰۃ ہو تو مقتدی کی نماز باطل ہو جائے گی، بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ اگر غیر حنفی امام حنفی مقتدی کے مسلک کے مطابق نماز کے جملہ سنن و مستحبات کی رعایت ملحوظ نہ رکھے تو اس کے پیچھے حنفی کی نماز مکروہ ہو گی لیکن متقدمین احناف کے ہاں اتنا تشدد مفقود تھا۔ نہ صرف امام شافعی بلکہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا ائمہ مالکیہ کے پیچھے نماز پڑھنا موثق ذرائع سے منقول ہے۔ شاہ ولی اللہ کے علاوہ امام ابن تیمیہ کے فتاویٰ (جلد دوم صفحہ ۳۸۰ مسئلہ فی صلوٰۃ اہل المذاہب الاربعۃ بعضہم خلف بعض) میں بھی یہ بات صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ ایک طرف امام مالکؒ کا مسلک دیکھئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ فرض میں تسمیہ کے قائل نہ تھے بلکہ صحیح تر الفاظ میں وہ عدم تسمیہ کو مسنون اور قراءت تسمیہ کو غیر مسنون (یعنی مکروہ) سمجھتے تھے (کیونکہ المدونہ میں ان کے اپنے الفاظ یوں مروی ہیں: - لا یقراء فی الصلوٰۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فی المکتوبہ - لا سراً فی نفسہ ولا جہراً وھی السنۃ - آگے ان کا مزید قول ہے کہ مکتوبات میں بسم اللہ نہ امام پڑھے، نہ غیر امام البتہ نوافل میں چاہے پڑھے، چاہے نہ پڑھے) دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تسمیہ مسنون ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک سورہ فاتحہ کا جزو لاینفک ہونے کی حیثیت سے تسمیہ فرض ہے لیکن یہ دونوں امام مالکیہ کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ اب اگرچہ بعد کے بعض احناف کے قول کے مطابق امام ابوحنیفہ کی یہ نماز مکروہ قرار پاتی ہے۔ (کیوں کہ امام ماموم کے سنن کا مراعی نہ تھا) لیکن میں بحیثیت ایک حنفی کے یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ اس نماز میں کوئی کراہت محسوس کرتے ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہی مسلک امام ابویوسفؒ کا تھا۔ جس کنوئیں سے مردہ چوہا برآمد ہوا تھا۔ اس سے غسل کر کے نماز جمعہ ادا کرنے کا واقعہ خود کتب حنفیہ (مثلاً ردالمختار جلد اول صفحہ ک) میں مذکور ہے۔ وہاں علامہ شامی نے اسے پیش ہی اس قاعدے کی مثال بنا کر کیا ہے کہ ایک عمل کو اگر اپنے مسلک کے مطابق درست خیال کر کے انجام دیا جائے اور بعد میں یہ واضح ہو کہ اپنے مذہب میں تو وہ باطل ہے

مگر کسی دوسرے مسلک کے مطابق وہ صحیح ہے تو اس عمل کے اختتام کے بعد بھی اس معاملے میں دوسرے مذہب کی تقلید جائز ہوگی (گویا عمل کر چکنے کے بعد بھی یہ سمجھا جائے گا اس کی بجا آوری اپنے مذہب کے مطابق نہیں بلکہ دوسرے مذہب کے مطابق ہوئی. میرا خیال ہے کہ صاحب رد المحتار کی اس توجیہ کے بعد نزاع محض لفظی حد تک رہ جاتی ہے اور امام ابو یوسف کے عمل کی ان عجیب غریب تاویلات کی حاجت باقی نہیں رہتی جو مدیر مشہاب نے تحریر فرمائی ہیں اور جن کے بارے میں انھوں نے راقم سے زبانی بیان کیا ہے کہ بعض احناف نے انہیں تعلیقاً فرمایا ہے۔ اگرچہ خود امام ابن عابدین شامی کا فتویٰ یہی ہے کہ امام کسی شرط یا رکن کو ترک کر دے یا کسی امر مفسد کا ارتکاب کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہوگی، تاہم خود انھوں نے رد المحتار جلد اول، باب الوتر میں اقتداء بالشافعی کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے جو کچھ درج فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ائمہ احناف اس بات کے قائل ہیں کہ اصل اعتبار امام کے مسلک کا ہے اور اگر امام کی نماز اپنے اعتقاد کے بموجب درست ہو تو مقتدی کے مسلک کے لحاظ سے خواہ اس نے ترک فرض ہی کیوں نہ کیا ہو۔ اس کے پیچھے نماز صحیح ہے۔

دیگر ائمہ و محدثین کا مسلک بھی یہی ہے کہ اگر امام کی نماز اپنے مسلک کے مطابق صحیح ہو تو خواہ مقتدی کے مسلک میں امام کی نماز غیر صحیح ہو اس کی اقتدا میں نماز جائز ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہ کے مذکورہ بالا مقام پر یہ بحث تفصیلاً مذکور ہے۔ اسی جلد کے دوسرے مقام[1] پر بھی یہ مسئلہ بالاختصار مذکور ہے جس کا ضروری حصہ میں یہاں نقل کئے دیتا ہوں:—

اذا ترك الامام ما يعتقد المأموم وجوبه مثل ان يترك قراءة البسملة سراً او جهراً والمأموم يعتقد وجوبها او مثل ان يترك الوضوء من مس الذكر او لمس النساء او المأموم يرى الوضوء من ذلك فهذا فيه قولان اصحهما صحة صلاة المأموم مذهب مالك واصرح الروايتين عن احمد في مثل هذه المسائل وهو احد الوجهين في مذهب الشافعي بل هو منصوص عنه فانه كان يصلي خلف المالكية الذين لا يقرؤن البسملة ومذهبه وجوب قراءتها۔ والدليل على ذالك ما رواه البخاري وغيره عن النبي صلى الله عليه وسلم قال:۔ ائمتكم يصلون لكم فان اصابوا فلكم ولهم وان اخطؤا فلكم وعليهم۔ فجعل خطأ الامام عليه دون المأموم وهذه المسائل ان كان مذهب الامام فيها هو الصواب فلا نزاع وان كان مخطئاً فخطؤه مختص به۔ والمنازع يقول المأموم يعتقد بطلان صلاة امامه وليس كذالك۔ بل يعتقد ان الامام يصلي باجتهاد او تقليد ان اصاب فله اجران وان اخطأ فله اجر۔

ترجمہ:۔ جب امام کسی ایسے امر کو ترک کر دے جو مقتدی کے نزدیک واجب ہو، مثلاً امام بسم اللہ آہستہ یا زور سے نہ پڑھے اور مقتدی ایسا کرنے کو واجب سمجھتا ہو، یا مثلاً امام عورت کو مس کرنے کے بعد وضو نہ کرے اور مقتدی کے نزدیک وضو ضروری ہو تو اس معاملے میں دو قول ہیں، جن میں سے صحیح تر یہ ہے کہ مقتدی کی نماز ایسی حالت میں درست ہوگی۔ امام مالکؒ کا مذہب یہی ہے اور امام احمد سے بھی اس طرح کے مسائل میں ظاہر اور واضح تر روایت اسی کے حق میں ہے۔ ایک جہت سے مذہب شافعی بھی اس کی تائید میں ہے بلکہ خود امام شافعی کا عمل صریح طور پر اسی کے مطابق ہے، کیونکہ وہ مالکیہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے جو (فاتحہ میں) بسم اللہ نہیں پڑھتے حالانکہ امام شافعیؒ ایسا کرنا واجب قرار دیتے ہیں۔ (ایسی تمام صورتوں میں مقتدی کی نماز کے صحیح ہونے کی) دلیل اس حدیث میں موجود ہے جیسے امام بخاری اور دیگر محدثین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اس میں آنحضورؐ نے فرمایا۔

"امام تمہیں نماز پڑھاتے ہیں۔ پس اگر وہ ٹھیک ٹھیک پڑھیں تو تمہارے لئے اور ان کے لئے اجر ہے اور اگر وہ غلطی کر جائیں تو تمہارے لئے اجر ہے اور بار خطا ان پر ہے"۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی کا بوجھ مقتدی کے بجائے امام پر ڈالا ہے۔ اس طرح کے مسائل میں اگر امام کا مسلک (عند اللہ) صواب ہے تو پھر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں اور اگر وہ غلطی کرتا ہے تو اس کی خطا اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے جواب میں معترض یہ کہتا ہے کہ مقتدی کے نزدیک، تو امام کی نماز باطل ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ مقتدی کے نزدیک

بھی امام جس طریق پر نماز پڑھتا ہے وہ یا تو اجتہاد پر مبنی ہے یا تقلید پر۔ پس اگر اس نے ٹھیک پڑھی تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور غلطی کی تو ایک اجر سے محرومی کے باوجود) ایک اجر تو ہے۔

امام ابن تیمیہ کی اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اور امام مالکؒ اس اصول کے قائل ہیں کہ امام کی نماز اگر اپنے مسلک کے مطابق صحیح ہو تو خواہ مقتدی کے مسلک کے مطابق وہ غیر صحیح ہو، مقتدی اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ان ائمہ کا استدلال صحیح حدیث سے ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ کم از کم ان ائمہ ثلاثہ کے قول و فعل کی ان دلچسپ توجیہات کی ضرورت ہی کیا ہے جو تنہا کے تبصرے میں پیش کی گئی ہیں۔ میں یہاں ایک مستند عالم دین جناب مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کی کتاب "علم الفقہ" (جلد دوم ص۱۱) کا ایک اقتباس بھی یہاں نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مولانا ممدوح فرماتے ہیں:-

"اگر امام اور مقتدی کا مذہب ایک نہ ہو، مثلاً امام شافعی یا مالکی مذہب ہو اور مقتدی حنفی تو اس صورت میں امام کی نماز کا صرف امام کے مذہب کے موافق صحیح ہو جانا کافی ہے، خواہ مقتدی کے مذہب کے موافق بھی صحیح ہو یا نہ ہو۔ ہر حال میں بلا کراہت اقتدا درست ہے۔

اس کے بعد مولانا عبدالشکور صاحب مزید بحث کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنے کی وہی مثالیں نقل فرماتے ہیں جو تحفۃ السنہ میں درج ہیں، پھر فرماتے ہیں:-

"ایقاظ النیام میں اس مسئلے کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اسی قول کو مختار و محقق لکھا ہے اور اسی کے موافق محققین مذاہب اربعہ سے تصریحات نقل کی ہیں۔ بعض علماء نے مثل صاحب بحرالرائق و درمختار و ردالمختار و ملا علی قاری وغیرہم کے اور اسی طرح بعض علمائے شافعیہ نے قول جواز کو اختیار کیا ہے بشرطیکہ امام مقتدی کے مذہب کی رعایت کرے مگر وہ صحیح نہیں گویا ان لوگوں کے نزدیک حق کا انحصار ایک ہی مذہب میں ہو گیا ہے۔ درحقیقت یہ قول بالکل بے دلیل اور نہایت نفرت کی نظر سے دیکھنے کے قابل ہے اور اگر اس قول پر عمل کیا جائے تو آپس میں افتراق پڑ جائے گا اور بڑی مشکل پیش آئے گی۔"

مولانا عبدالشکور صاحب کا ارشاد بالکل بجا ہے۔ یہ مسئلہ محض علمی اور نظریاتی (ACADEMIC) نوعیت کا نہیں بلکہ اس کے عملی نتائج نہایت دور رس ہیں۔ یہ تاریخی حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ دورِ تقلید سے قبل صحابہ و تابعین سارے فقہی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ نماز ہی وہ شے ہے جو امتِ مسلمہ کے اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی کر کے انہیں ایک ہی صف میں بنیان مرصوص بنا کر کھڑا کر سکتی ہے۔ تقلید کی افادیت سے مطلقاً انکار اور اس کی ضرورت سے استغنا ممکن نہیں۔ لیکن یہ کتنے بڑے تاسف و حرمان کی بات ہوگی کہ غیر منصوص قواعد و جزئیات ہمیں ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے روک دیں یا کم از کم اس میں تردد یا کراہت پیدا کر دیں۔ اگر نماز ہی میں ہم ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہو سکے تو پھر وہ کونسا ایسا مسالہ ہے جو ہمیں باہمد گر پیوست کر سکے گا؟ یہ محض وہمی اور فرضی خطرات نہیں ہیں جن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس طرح کے فروعی اختلافات نے ہماری نمازوں اور مسجدوں کو عملاً الگ الگ کر دیا ہے؟ ابھی پچھلے دنوں لاہور کے دو معاصر جرائد میں یہ بحث گرم رہی ہے کہ مقلد اور غیر مقلد کی نماز ایک دوسرے کے پیچھے جائز ہے یا نہیں، حالانکہ فریقین ہی میں سے ایک اہل حدیث کا ترجمان ہے اور دوسرا دیوبندی مکتب فکر سے متعلق ہے اور عام طور پر یا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں گروہ قریب المسلک ہیں!

یہ بات بھی کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے ملک میں شافعی، حنبلی، مالکی تو پائے ہی نہیں جاتے، اس لئے ان سے ہمارے اختلافات کا کوئی عملی اثر یہاں مترتب نہیں ہوتا۔ پہلی گزارش تو یہ ہے کہ اگر ان مسلکوں کے پیرو ہمارے ہاں ہیں ہی نہیں تو پھر ہم حنفیوں کو ایسا اعلان کرنے کی حاجت ہی کیا ہے کہ فلاں فلاں صورتوں میں ہماری نماز ان کے پیچھے نہیں ہوگی۔ دوسرے میں عرض کروں گا کہ ہمارے

ں اہل حدیث حضرات موجود ہیں جن کا عمل بہت سے جزئیات میں سے کسی نہ کسی مذہب فقہی کے مطابق ہوتا ہے' اس لئے مسلک اہل حدیث ی آپ سے آپ ان بحثوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ وضاحت مدعا کے لئے میں ایک مثال دیتا ہوں حنفیہ کے نزدیک جو جراب دبیز او رٹر پروف نہ ہو اس پر مسح جائز نہیں لیکن بعض دیگر فقہاء کے نزدیک جائز ہے بعض اہل حدیث حضرات کا عمل بھی اسی پر ہے ر وہ سردیوں میں ہر قسم کی جراب پر مسح کرکے نماز پڑھ پڑھا لیتے ہیں۔ حالانکہ حنفیہ کے نزدیک ایسا مسح ترک فرض کے مترادف ہے ب ایسی حالت میں ایک اہل حدیث امام کے پیچھے ایک حنفی مقتدی نماز پڑھے یا نہ پڑھے؟ میرا ناقص خیال یہ ہے کہ پڑھ لے۔ انشاءاللہ وہ فریضۂ صلوٰۃ سے سبکدوش ہوجائے گا، نہ وہ جرم تلفیق کا مرتکب ہوگا اور نہ دائرۂ حنفیت سے خارج ہوگا۔

یہاں تلفیق کا ذکر آگیا تو اس کے متعلق بھی چند باتیں عرض کئے دیتا ہوں۔ مدیر "شہاب" کا ارشاد یہ ہے کہ فقہاء نے بہرحال ملب مختلف مذاہب کے جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور اسی کا نام "تلفیق" رکھا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ تلفیق فقط دنیا طلبی اور نفس پرستی کی خاطر منع ہے یا امور دینیہ میں تخفیف وتیسیر کے پیش نظر بھی یہ فعل ممنوع یا مکروہ ہے، میری گزارش یہ ہے کہ تلفیق کی یہ تعریف غیر صائب ہے اور اس بارے میں اجماع کا دعویٰ بھی صحیح نہیں۔ تلفیق کی اصطلاح بالعموم حنفیہ کے یہاں یا پھر شافعیہ کے ہاں مروج ہے لیکن اس کی حرمت یا بطلان کے بارے میں دعوائے اجماع کا حال خود حنفیہ کے ہاں یہ ہے کہ در مختار کے متن "الحکم الملفق باطل بالاجماع" کی تشریح میں رد المحتار میں یہ عبارت موجود ہے: "فی دعوی الاتفاق نظر فقد حکی الخلاف فیجوز اتباع القائل بالجواز" (یعنی حکم ملفق کے باطل ہونے پر اجماع و اتفاق کا دعویٰ محل نظر ہے۔ اس معاملے میں اختلاف منقول ہے۔ اس لئے جواز تلفیق کے قائل کی پیروی جائز ہے) اب جہاں تک عمل تلفیق کی تعریف کا تعلق ہے' یہ ایک فنی اور ٹیکنیکل بحث ہے۔ میری معلومات کی حد تک مجرد ایک سے زائد مذاہب کے مختلف جزئیات کو جمع کرنا تلفیق کے تحت نہیں آتا، بلکہ تلفیق سے مراد ایسا عمل یا حکم ہے کہ جس میں دو جزئیے ایسے پائے جائیں جن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو جس کی صحت پر دو خاص مذاہب فقہیہ متفق نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی مسلسل عمل میں اگر دو اجزاء ایسے ہوں کہ جن میں سے کوئی ایک بھی دو مذاہب معینہ کے نزدیک صحیح نہ ہو تو وہ عمل ملفق کے حکم میں آکر باطل قرار پائے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے بقدر چہار انگشت سر کا مسح کیا، پھر گیلا ہاتھ کتے کو لگا بیٹھا تو اب اس کے عمل میں دو اجزاء ایسے جمع ہوگئے جن میں سے ہر ایک جزء ایسا ہے کہ اس پر جن پر دو مذاہب کا اتفاق ہے، دوسرے جزء پر ان دو کا اتفاق نہیں۔ مثلاً سر کا مسح امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے تو امام مالک کے نزدیک صحیح نہیں، کیونکہ امام مالک پورے سر کے مسح کو فرض قرار دیتے ہیں اور گیلا ہاتھ کتے کو لگ جانے کی صورت میں امام مالک کے نزدیک تو ہاتھ نجس نہ ہوگا مگر امام شافعی کے نزدیک نجس ہوجائیگا اب ایک ہی وضو میں ایسے دو عمل جمع کرنا تلفیق کہلائے گا اور جو فقہاء تلفیق کے جواز کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک یہ وضو باطل ہوگا

اس بحث سے یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ اگر ایک عمل کے فقط ایک جزء میں دوسرے کسی مسلک پر عمل کرلیا جائے تو یہ تلفیق نہیں ہے مثال کے طور پر اگر کوئی حنفی مسح علی الجوربین یا مفقود الخبر زوج کے تفریق نکاح کے معاملے میں کسی دوسرے مسلک پر عمل کرلے تو اس پر تلفیق کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ ان میں ایک سے زائد ایسے اجزاء کے جمع کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا جنکی صحت دو مذاہب کے مابین مختلف فیہ ہو فقہاء نے ایسے عمل سے مطلقاً نہیں روکا ہے بلکہ اس امر کی اجازت دی ہے کہ بعض خاص حالات میں دوسرے مسلک کے جزئیے کو اس کے پورے شرائط وقیود کے ساتھ اختیار کرلیا جائے۔

محمد ہاشم اسمٰعیل (بمبئی)

ایک روپے کی کہانی اُسکی اپنی زبانی

میری عمر دس سال کی ہے۔ میں نے کلکتہ میں حکومتِ ہند کی ٹکسال میں جنم لیا۔ میرے پتا جی کا نام حکومتِ ہند ہے۔ میرا کوئی دھرم نہیں، میرا کوئی نام نہیں۔ میں اپنا ملک چھوڑ کر باہر نہیں جاتا۔ اپنے ملک میں رہ کر ہر ایک کی سیوا کرتا ہوں۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، یہودی ہو یا عیسائی، میں جس کی جیب میں رہوں وہی میرا مالک ہے، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میرا کوئی مالک نہیں ہے۔ مجھ میں وہ طاقت ہے کہ خوب صورت سے خوب صورت اور مغرور سے مغرور عورت کو اپنی باندی بنالوں۔ بڑے بڑے مہاشے پنڈت کٹڑ سے کٹڑ مولوی اور پرہیزگار سے پرہیزگار پادری صاحب کو اپنا غلام بنالوں۔ مجھے پاتے ہی نرم سے نرم دل آدمی کا دل پتھر بن جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی نیت میں فرق آجاتا ہے۔ میری دُھن میں پجاری مندر کے دیوتا کو چھوڑ دیتا ہے اور مولوی مسجد سے مُنہ پھیر لیتا ہے۔ پولیٹیکل لیڈر قوم کی سیوا کرنے کے تمام وعدے بھُول جاتے ہیں۔ راجا اور پرجا کے درمیان کھینچا تانی شروع ہوجاتی ہے۔ میں جس کو چاہوں اپنا غلام بنالوں۔ میں جو چاہوں کروں۔ پرماتما کے بعد میرا ہی درجہ ہے۔ میں روز نیا گھر بساتا ہوں میں ہرگز وفادار نہیں۔ میں ایک کا ہو کے نہیں رہتا۔ میں ہرجائی ہوں۔ میری آنکھیں ہر روز ایسے واقعات دیکھتی ہیں کہ اگر انہیں بیان کرنے پر آؤں تو ایک حیرت بھری کہانی بن جائے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک سیٹھ جی کی جیب میں پڑا ہوا تھا۔ اور بھی کئی روپے میرے ساتھ تھے۔ کچھ نوٹ بھی تھے۔ مگر ہم روپے، نوٹوں کو حقارت کی نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں اُن کی کوئی عزت نہیں۔ اور کیوں عزت ہو؟ ہم میں آخر کچھ تو چاندی ہے۔ وہ تو صرف کاغذ کے ٹکڑے ہیں۔ ہم کو دھو لیجئے۔ ہم پھر چمکنے لگیں گے۔ اُن پر داغ دھبہ لگ جائے تو پھر گڑ دگڑ رنہ ہوگا۔ خیر ہُوا یہ کہ شام کو سیٹھ جی بن ٹھن کر موٹر میں سوار ہوئے اور اپنے کلب گئے۔ کلب کے دروازے پر چند دوست احباب نظر آئے۔ جن میں ایک شریمتی جی بھی تھیں۔ سیٹھ جی بہت دنوں سے اُن شریمتی جی پر ریجھے ہوئے تھے۔ اب اُن کو دیکھتے ہی پھر دل گدگدایا۔ اتفاق سے کلب کے دروازے پر ایک غریب بڑھیا بھکارن بھی کھڑی بھیک مانگ رہی تھی۔ ہاتھ پھیلائے ہوئے ایک ایک پیسے کے لئے دُعائیں دے رہی تھی۔ "کچھ راہِ خدا دے جا تیرا بھلا ہوگا" سیٹھ جی کو شریمتی پر رُعب جمانا تھا۔ جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھ کو نکال بھکارن کو دے دیا۔ یہ دکھاوے کی خیرات تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ خیرات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ دکھاوے کی خیرات، بے پرواہی کی خیرات، بیزاری کی خیرات، مروت کی خیرات، فرض ادا کرنے والی خیرات، ثواب یا نیکی کمانے والی خیرات، انکم ٹیکس سے بچنے کی خیرات، پولس کورٹ میں مجسٹریٹ کے حکم سے دی ہوئی خیرات۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہے یہ سب مکاری کی خیرات۔ ایسی خیرات کرنے والا انسانیت کو ذلیل کرتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ خیرات کی بجائے "امداد" کا لفظ استعمال کرنا چاہئیے۔ کسی بے کس ولاچار کی مدد تو دل کی تڑپ سے کی جاتی ہے۔ وہ دینا ہی کیا ہے جس میں دل کی تڑپ نہ ہو۔ دینے والا تو کسی کی تکلیف دیکھنا برداشت نہیں کرسکتا اور یہ سمجھ کر دیتا ہے کہ شاید اس کے دینے سے دوسرے کی تکلیف میں کچھ کمی ہوجائے۔ دینا تو وہ دینا ہے کہ دینے والے کو کم دینے پر شرم سے پسینہ آجائے اور اسی شرم کے احساس میں روح کی بلندی ہے۔ ہاں تو ہم کدھر سے کدھر جا پہنچے۔ بڑھیا بھکارن ایک دم سے مجھے پا کر مارے خوشی کے دعائیں دینا بھی بھُول گئی

اور گھبراہٹ میں مجھے اپنے میلے کچیلے چیتھڑے میں لپیٹ کر ہاتھ میں دبالیا اور چلی گھر کو۔ گھر کیا تھا، ایک گھنے پیڑ کے نیچے ٹوٹی پھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جس کے ایک کونے میں دو بیمار لڑکیاں پڑی سسک رہی تھیں ان غریبوں کی رات نے سویرے کا منہ نہیں دیکھا۔ ان کی زندگی کے اندھیرے میں خوشی کی جھلک ہی نہیں۔ یہ پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں اور جب تک زمین میں دفن نہ کئے جائیں یا چتا میں نہ جلائے جائیں یہ زندہ مُردہ بنے رہیں۔

خیر صاحب! بڑھیا مجھ کو لے کر دواخانے پہنچی اور بیمار لڑکیوں کے لئے دوا مانگی۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ لال رنگ اور کچھ پانی ملا ایک بوتل میں بھر کر بڑھیا کے حوالے کیا۔ بڑھیا دوا سے بھری ہوئی بوتل اور اُمید سے بھرا دل لے کر جھونپڑی کی طرف چلی۔ اگر بیمار لڑکیوں کو فائدہ ہو جائے تو اُن کی خوش قسمتی اور اگر مرجائیں تو بھگوان کی اِچھا۔ اب ہم ڈاکٹر صاحب کی جیب میں آ گئے۔ کھانا کھا کر ڈاکٹر صاحب کو رُوحانی عیاشی کی سُوجھی۔ بیوی سے کہا کہ دیکھو جی! نہ دن کو چین ہے نہ رات کو۔ اب پھر ایک بیمار کو دیکھنے جانا ہے۔ یہ سب محنت تمہارے اور بچّوں ہی کے لئے تو کر رہا ہوں۔ یہ فرما کر ڈاکٹر صاحب ایک جگہ گانا سننے کو چلے۔ کچھ دیر بائی جی کے یہاں طبلے پر تھاپ پڑتی رہی اور ہم بائی جی کی سُریلی آواز سنتے رہے۔ بائی جی نے خوب دیدے مٹکا مٹکا کر گانا سُنایا۔ مگر ہم دیکھتے رہے کہ بی صاحبہ کے ہونٹوں پر تو مُسکراہٹ ہے مگر دل میں تمام دنیا کے مردوں کی طرف سے نفرت بھری ہوئی ہے۔ لیکن کرے تو کیا کرے؟ بغیر مکر و فریب دُنیا میں کام نہیں چلتا۔ اب ہم بائی جی کے ہاتھ لگے۔ صبح ہوئی تو بائی جی نے ہم کو مُنّا لال بنیے کے ہاتھ دال اور آٹے کے لئے بیچ ڈالا۔ اب دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں مُنّا لال بنیا ہم کو تھیلی میں ڈال کر بنک کی طرف لے چلا۔ بنک تین میل کے فاصلے پر تھا۔ مگر اُس خدا کے بندے مُنّا لال نے ہم کو نہ بھُنانا تھا نہ بھُنایا۔ نہ بس میں بیٹھا نہ ٹرام کی طرف نظر کی۔ نامُراد پسینے میں شرابور چلتا ہی رہا۔ آخر کو ہم بنک پہنچے اور وہاں کے خزانچی مسٹر جمشید جی پیستن جی ورکنگ باکس والا نے ہم کو ٹھونک بجا کر آزمایا اور خزانے میں داخل کر لیا۔ یہ ہے ہمارے چوبیس گھنٹوں کی اَمر کہانی۔

سُنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

—x—

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی

اقبال اور صوفیائے کبار

اقبال کے کلام کا سرسری مطالعہ بھی یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ جس والہانہ انداز سے وہ صوفیہ مثلاً حضرت علی ہجویری، حضرت معین الدین اجمیری، مجدد الف ثانی سرہندی وغیرہم کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں وہ ہمیں تاریخ عام کے شہنشاہوں کے ساتھ نہیں ملتی۔ گویا اقبال کے نزدیک اسلامی اقدار کا احیا یا خود اسلام کی تبلیغ کا سہرا صوفیہ کے سر ہے نہ کہ شہنشاہوں کے سر! اور اگر کسی شہنشاہ کو خراج عقیدت پیش بھی کیا ہے تو صرف اس کو جس میں شانِ فقر بھی موجود تھی۔

اقبال نے اسلام کی نشر و اشاعت میں صوفیہ کی خدمت کو جس طرح سراہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال صوفیہ کی خدمات کے معترف تھے اور اس اعتراف کا یہ نتیجہ ہے کہ اقبال نے اسرار خودی سے لے کر ارمغان حجاز تک صوفیہ کے ذکر خیر سے اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔ اقبال نے صوفیہ کی زندگی کے جس پہلو کو اپنے یہاں پیش کیا ہے اگر اس کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اقبال کی مراد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ صوفیہ میں اتباع رسول ؐ کے رجحان کو پسند کرتے تھے۔

اس مقالے میں جن صوفیہ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کچھ تو وہ ہیں جنھوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز ہندوستان کو بنایا ہے مثلاً بو علی شاہ قلندر، محبوب الٰہی وغیرہم اور بعض ایسے ہیں جو بیرون ہند رشد و ہدایت میں مشغول و مصروف رہے جیسے بایزید بسطامی، جنید بغدادی ..... یہ حقیقت ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں صوفیائے کرام نے اسلام کی تبلیغ کا گرانقدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

کاملِ بسطام در تقلید فرد اجتناب از خوردن خربوزہ کرد (اسرار خودی)

* بسطام سے مراد خواجہ بایزید بسطامی ہیں۔ حضرت بایزید بسطام کے مشہور ترین صوفی تھے۔ ان کا اصلی نام طیفور تھا۔ اسی وجہ سے بعض ان کو بایزید طیفوری البسطامی بھی کہتے ہیں۔ ان کے دادا گبر تھے بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ بایزید اپنے زمانے کے ممتاز ترین صوفیہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی عبادت، زہد و تقویٰ اور فنا فی الرسول ایسی چیزیں تھیں جو آنے والے صوفیہ اور اولیا کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ بایزید کو رسول کریم ؐ کی ذات گرامی سے جو والہانہ عشق تھا اس کا کچھ اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے تمام عمر اس خیال سے خربوزہ نہیں کھایا کہ معلوم نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اس کو تراش کر کھایا ہے۔ آپ چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی ترک نہیں کرتے تھے۔ ۲۶۱ھ یا ۸۷۵ء میں انتقال کیا۔ ابن خلکان کے نزدیک بایزید کا سال وفات ۸۷۷-۸۷۸ھ ہے۔

باقومی گویم حدیث بو علی در سواد ہند نام او جلی (اسرار خودی)

نام شیخ شرف الدین اور لقب بو علی قلندر تھا۔ امام اعظم ابو حنیفہ کی اولاد سے تھے۔ ان کے والد ۶۰۰ھ (۱۲۰۳ء) میں عراق سے ہندوستان آئے وہ جید عالم تھے۔ شیخ بو علی قلندر ۶۰۵ھ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ کمسنی میں تمام علوم ظاہری حاصل کئے اور بیس برس تک دہلی میں قطب مینار کے پاس ان کا درس جاری رہا لیکن جب تصوف کی طرف مائل ہوئے اور عبادت و ریاضت کی تو جذب و سکر کی حالت میں علوم و فنون کی تمام کتابیں دریا میں ڈال کر جنگل کی راہ لی اور پانی پت کے مضافات اور کرنال کے

اح میں آخر وقت تک مقیم رہے لیکن اس جذب و سکر کی حالت میں بھی آپ تبلیغ و اشاعت اسلام میں مصروف رہے چنانچہ ڈاکٹر
رنلڈ نے اپنی زندہ جاوید تصنیف "پریچنگ آف اسلام" میں لکھا ہے کہ بہت سے راجپوت خاندان آپ ہی کی وجہ سے اسلام لائے
حضرت بوعلی قلندر کے ہم عصر سلاطین کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ان سلاطین میں جلال الدین خلجی اور علاؤالدین خلجی کے نام قابل
ذکر ہیں۔ ان کا انتقال ۷۲۴ھ (۱۳۲۳ء) میں ہوا اور کرنال میں مدفون ہوئے لیکن ان کے بعض اعزہ نے پوشیدہ طور پر نعش کو پانی
پت میں لے جاکر دفن کر دیا۔ قلندر پانی پتی صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ ان کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں۔ (۱) مکتوبات
بنام اختیار الدین (۲) قلم نامۂ شرف الدین (۳) مثنوی کنز الاسرار اور (۴) رسالۂ عشقیہ۔ حضرت بوعلی قلندر ہندوستان کے
ممتاز صوفیہ میں سے ہیں۔ رسالۂ عشقیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

مرحبا اے بلبل باغ کہن　　از گل رعنا بگو با ما سخن

سید ہجویر مخدوم امم　　مرقد او پیر سنجر را حرم　　(اسرار خودی)

"سید ہجویری ابوالحسن کنیت اور علی نام تھا۔ ہجویر اور جلاب غزنین کے دو گاؤں ہیں۔ شروع میں ان کا قیام یہیں رہا۔ اس
لئے ہجویری اور جلابی کہلائے۔ آخر زندگی میں لاہور آگئے اس لئے لاہوری بھی مشہور ہوئے۔ ولادت ۴۰۰ھ (۱۰۰۹ء) میں
ہوئی اور وفات ۴۶۵ھ (۱۰۷۲ء) میں۔ لاہور میں بھاٹی دروازے کے قریب آپ کا مزار ہے۔ آپ نے روحانی کسب کمال
کے لئے تمام اسلامی ممالک۔ شام، عراق، بغداد، پارس، قہستان، آذربائیجان، طبرستان، خوزستان، کرمان، خراسان،
ماوراء النہر اور ترکستان کا سفر کیا اور وہاں کے اولیا اور صوفیہ سے مستفیض ہوئے۔ باطنی اور روحانی تعلیم ابوالفضل محمد بن
الحسن ختلی سے پائی جو جنیدیہ سلسلے میں منسلک تھے۔

علی ہجویری صاحب تصنیف بزرگ تھے آپ کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔ (۱) منہاج العابدین (۲) کتاب الفنا والبقا
(۳) اسرار الخرق والمؤنات (۴) کتاب البیان لاہل العیان (۵) بحر القلوب (۶) الرعایۃ الحقوق اللہ اور (۷) کشف المحجوب
ان میں صرف کشف المحجوب ہی ملتی ہے۔ باقی کتابیں مفقود ہیں۔ کشف المحجوب ہی میں آپ کے ایک دیوان کا بھی ذکر ملتا ہے۔
کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے یہ کتاب ہر زمانے میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثل سمجھی گئی ہے۔

"پیر سنجر" اشارہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی طرف ہے

ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی خواجہ معین الملت والدین حسن چشتی سنجری سجستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد
سید غیاث الدین حسن سنجری ایک نہایت صاحب جاہ و ثروت بزرگ تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا
ترکے میں ایک باغ ملا اس کی نگہبانی کرتے تھے۔ ایک روز ابراہیم قلندر نامی ایک مجذوب باغ میں آئے۔ ان بزرگ کی
صحبت سے خواجہ معین الدین علائق دنیا کو چھوڑ کر خدا کی طلب میں مشغول ہو گئے اور سمرقند پہنچے۔ یہاں قرآن حفظ کیا اور
علوم ظاہری کی تعلیم میں منہمک رہے۔ سمرقند سے نکل کر عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ قصبۂ ہارون میں شیخ عثمان ہارونی کی
خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے شرف بیعت حاصل کیا۔ آپ کا شمار ہندوستان کے مشہور ترین صوفیہ میں ہے۔ آپ کے
کمالات ظاہری و باطنی اظہر من الشمس ہیں۔ آپ ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ء) میں اجمیر میں وارد ہوئے۔ آپ کا سال وفات ۶ رجب
۶۳۳ھ (۱۲۳۵ء) ہے اور آپ اجمیر میں مدفون ہیں۔ خواجہ معین الدین کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ مگر ان کے نام سے
کئی تصانیف منسوب ہیں مثلاً رسالہ در کسب نفس، رسالہ وجودیہ، حدیث المعارف، گنج الاسرار، دیوان معین،

انیس الارواح اور دلیل العارفین ۔

حضرت شیخ میاں میر ولی　　ہر خفی از نور جان او جلی　　(اسرار خودی)

میاں میر شیخ میاں میر قادری سلسلے کے بہت مشہور بزرگ ہوئے ہیں ۔ آپ کا اصلی نام میر محمد تھا اور لقب میاں میر ۔ آپ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے تھے ۔ شیخ میاں میر ٹھٹہ کے قریب ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) میں پیدا ہوئے ۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ سیستان میں پیدا ہوئے اور شیخ سیستان ہی کے خلیفہ تھے ۔ نہایت درجے کے عابد و زاہد تھے ۔ سیستان چھوڑ کر لاہور تشریف لائے اور یہیں ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں انتقال کیا ۔ آپ کا مزار لاہور ہی میں ہے ۔ شہنشاہ جہانگیر کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ شاہ جہاں بھی دو مرتبہ آپ سے ملنے آیا ۔ داراشکوہ جس کو آپ سے دلی ارادت تھی کئی مرتبہ حاضر خدمت ہوا ۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جو معقولات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے کئی مرتبہ شیخ میاں میر کے پاس آئے اور روحانی فیض حاصل کیا ۔ شہزادہ داراشکوہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور فارسی میں ایک کتاب شیخ میاں میر کی کرامات اور حالات زندگی سے متعلق قلمبند کی ۔ اخلاق کی مشہور کتاب ضیاء العیون حضرت میاں میر ہی کی تصنیف ہے ۔

پیر تبریزی ز ارشاد کمال　　جست راہ مکتب ملا جلال　　(اسرار خودی)

" پیر تبریزی " سے مراد شمس الدین محمد تبریزی ہیں ۔ شبلی نے ان کا نام علاء الدین لکھا ہے اور جامی نے نفحات الانس میں علی بن ملک داؤد تبریزی بتایا ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ شیخ رکن الدین سنجاسی کے مرید تھے ۔ آپ کو شیخ ابوبکر زنبیل باف تبریزی کا بھی مرید کہا گیا ہے اور بابا کمال الدین جنیدی کا بھی ۔ ممکن ہے آپ سب کی خدمت میں پہنچے ہوں اور سب سے فیض حاصل کیا ہو ۔ شبلی کے بیان کے مطابق ان کے والد کیا بزرگ کے خاندان سے تھے جو فرقۂ اسمٰعیلیہ کا امام تھا لیکن انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا ۔ شمس تبریز نے علوم ظاہری کی تحصیل کی ۔ بعد ازاں بابا کمال الدین جندی کے مرید ہو گئے لیکن عام صوفیوں کی طرح پیری مریدی اور بیعت و ارادت کا طریقہ اختیار نہیں کیا ۔ ایک دفعہ مناجات کے وقت دعا مانگی کہ الٰہی کوئی ایسا بندۂ خاص ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہو سکتا چنانچہ یہ دعا مقبول ہوئی اور شمس تبریزی روم کو روانہ ہوئے اور قونیہ پہنچ کر مولانا روم سے ملے ۔ بعض وجوہ سے مولانا روم اور شمس تبریز کی ملاقات کا یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا ۔ مولانا نے صرف دو سال ان کی صحبت سے فیض اٹھایا ۔ شمس تبریز کو مولانا کے بعض مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل کر دیا ۔ نفحات الانس میں ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) شمس کی شہادت کا سال درج ہے ۔ مولانا روم شمس تبریز کے فیض یافتہ تھے ۔

" کمال " سے مراد بابا کمال الدین جندی ہیں ۔ بابا کمال شمس تبریزی کے پیر ہیں ۔ آپ نے شیخ نجم الدین کی صحبت میں رہ کر علوم ظاہری و باطنی میں درجۂ کمال پیدا کیا ۔ شیخ نجم الدین ہی کے ارشاد کے جواب میں انھوں نے مولانا شمس الدین مفتی کے صاحبزادے احمد مولانا سے بھی تربیت حاصل کی ۔ بابا کمال کے حکم کے مطابق شمس تبریز مولانا روم سے جا کر ملے ۔ وہ اپنے عہد کے مشہور صوفیوں میں سے تھے ۔

شیخ احمد سید گردوں جناب　　کاسب نور از ضمیرش آفتاب　　(رموز بیخودی)

" شیخ احمد " اشارہ شیخ احمد رفاعی کی طرف ہے

شیخ احمد رفاعی طریقہ رفاعیہ کے بانی تھے ۔ یہ ۵۱۲ھ (۱۱۱۸ء) میں بصرہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ ۵۴۳ھ (۱۱۴۸ء) میں مسند ارشاد پر بیٹھے اور ۵۷۸ھ (۱۱۸۲ء) میں انتقال فرمایا ۔ شیخ احمد رفاعی عراق کے بڑے مقبول مرشد تھے اور

قاطع القلوب کے لقب سے مشہور ہوئے۔

شیخ احمد رفاعی کی مدح میں ایک قصیدہ سید محمد البالہدی نے عربی میں لکھا تھا۔ اس کی شرح سید محمود شہاب الدین الآلوسی نے ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں الاسرار الالٰہیہ کے نام سے لکھی جو اسی سال مصر میں چھپ کر شائع ہوئی۔

شیخ احمد رفاعی صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد چار ہے۔ ان میں حکم (الرفاعی) تصوف میں اور حقائق و شرح ملفوظات کے بارے میں زیادہ مشہور ہیں۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا   بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا   (بانگ درا)

اس شعر میں حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نام محمد، القاب محبوب الٰہی، سلطان المشائخ، سلطان الاولیا، سلطان السلاطین اور نظام الدین اولیا تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیا کا خاندان بخارا سے ہجرت کرکے لاہور آیا پھر وہاں سے بدایوں میں سکونت پذیر ہوا اور اسی شہر میں حضرت نظام الدین ماہ صفر ۶۳۴ھ (۱۲۳۶ء) میں پیدا ہوئے۔ سن تمیز کو پہنچ کر علوم شرعیہ میں کمال اور تبحر پیدا کیا یہاں تک کہ ہر مباحثے میں آپ ہی کامیاب رہتے۔ بیس برس کی عمر میں دنیوی معاملات سے دست کش ہو کر حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں پہنچے اور مرید ہوئے۔ ایک عرصے تک پیر کی خدمت میں رہے اور فیض اٹھایا۔ آپ کا انتقال ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں ہوا۔ مزار دہلی میں ہے۔ محبوب الٰہی کے ملفوظات جن کی حیثیت گویا ان کی تصانیف کی ہے یہ ہیں۔ (۱) فوائد الفواد (۲) فضل الفواد (۳) راحت المحبین اور (۴) سیر الاولیا۔

پاک مردان چون فضیل و بوسعید   عارفان مثل جنید و بایزید   (جاوید نامہ)

حضرت فضیل بن عیاض صوفیہ کے طبقہ اول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا شمار مشائخ کبار میں ہے۔ آپ کے ہم عصر آپ کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ آپ کی ریاضت اور زہد و تقویٰ بہت بلند و ارفع تھا۔ وطن آپ کا کوفہ تھا۔ بعض نے آپ کو خراسانی اور کچھ راویوں نے بخاری الاصل بتایا ہے۔ ابتدا میں یہ نہ صرف ایک ڈاکو تھے بلکہ ڈاکوؤں کے سردار بھی تھے۔ دفعتاً زندگی میں ایک انقلاب ہوا اور رہزنی ترک کرکے زہد و تقویٰ کی راہ اختیار کی۔ آپ نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے اکتساب فیض کیا۔ انتقال ۱۸۷ھ (۸۰۳ء) میں ہوا۔

ابوسعید۔ حضرت ابوسعید فضل اللہ بن ابی الخیر اپنے زمانے کے علوم و فنون میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ زہد و تقویٰ میں بڑے راسخ تھے۔ آپ کے والد امرائے محمود غزنوی سے اکثر مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ اسی عہد میں یکم محرم ۳۵۷ھ (۷ دسمبر ۹۶۷ء) کو ابوسعید پیدا ہوئے۔ ابوسعید نے مرو میں عبداللہ حصیری کی خدمت میں پانچ سال گزارے اور وہیں سے علوم ظاہری و باطنی میں کمال پیدا کیا۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ صحرا نوردی میں بسر کیا۔ اس کے بعد طریق ارشاد میں مشغول ہوئے۔ آپ کی فارسی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔ سال وفات ۴۴۰ھ (۱۰۴۹ء) ہے۔

جنید۔ حضرت جنید بغدادی صوفیہ کے طبقہ دوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی کنیت ابوالقاسم ہے اور لقب قواریری اور زجاج خزاز ہے۔ زجاج اس لئے کہتے ہیں کہ آپ کے والد شیشہ فروخت کیا کرتے تھے اور خزاز اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ ریشم کا کام کرتے تھے۔ آپ دراصل نہاوند کے رہنے والے تھے لیکن پیدا بغداد میں ہوئے۔ ابوثور کا مذہب رکھتے تھے جو امام شافعی کے بڑے شاگردوں میں ہیں اور بعض کے نزدیک آپ سفیان ثوری کا مذہب رکھتے تھے۔ حضرت سری سقطی اور حارث محاسبی وغیرہ کی صحبت سے فیض پایا۔ ان کے

نوردوں میں ہیں۔ آپ صوفیوں کے امام و سردار ہیں۔ آپ سید الطائفہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ کتاب الطبقات اور رسالہ قشیریہ میں آپ کا سال وفات ۲۹۷ھ (۹۰۹ء) درج ہے اور تاریخ یافعی میں ہے کہ ۲۹۸ھ (۹۱۰ء) میں انتقال فرمایا اور بعض کے نزدیک ۲۹۹ھ (۹۱۱ء) میں وفات پائی۔

کاش بودے در زمان احمدے　　تا رسیدے بر سرور سرمدے　　(جاوید نامہ)

احمد: اشارہ ہے شیخ احمد سرہندی کی طرف۔

شیخ احمد نام لقب مجدد الف ثانی تھا۔ زہد و علم میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ شیخ عبد الاحد فاروقی کے فرزند تھے۔ سرہند میں ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۰۳۴ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار سرہند ہی میں ہے۔ آپ اپنے کمالات علمی و روحانی اور جہاد و لسانی کے سبب بزرگان اسلام میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔

شیخ احمد سرہندی نے اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کا سد باب کیا۔ اکبر کے بعد جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے اس فتنے کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملت اسلامیہ کا وجود خطرہ میں پڑ گیا۔ ان حالات کو دیکھ کر شیخ احمد نے اس فتنے کو ختم کرنے کا تہیہ کیا۔ گو آپ کے مخالفوں نے آپ کی اس کوشش کو جہانگیر کے سامنے ایک بغاوت کے رنگ میں پیش کیا لیکن آپ نے جہانگیر کے ذریعہ پروانہ کی اور اس فتنے کا پورے طور پر استیصال کر دیا۔ آپ کے مکتوبات بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اتباع سنت اور عزیمت کا مجسم تھی۔

سید السادات، سالار عجم　　دست او معمار تقدیر امم!　　(جاوید نامہ)

سید السادات: اشارہ سید علی ہمدانی کی طرف ہے۔

سید علی ہمدانی ہمدان کے رہنے والے سادات خاندان میں سے تھے۔ امیر تیمور کی ناراضگی کی وجہ سے ترک وطن کر کے سلطان قطب الدین کے زمانے میں کشمیر آئے۔ سات سو مریدوں کی جماعت آپ کے ہمراہ تھی۔ یہ ۱۳۸۰ء کا زمانہ تھا۔ چھ برس تک کشمیر میں رہے۔ کشمیر کو یہ باغ سلیمان کہتے تھے۔ جب ایران واپس جا رہے تھے تو راستے میں انتقال کیا۔ ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی بھی ان کے بعد تین سو سیدوں کے ساتھ کشمیر آ کر آباد ہوئے اور بارہ برس تک وہاں رہے۔ انہوں نے جا بجا کشمیر میں حجرے بنوا دیئے تھے جو اشاعت اسلام کا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تبلیغ سے ہزارہا افراد مسلمان ہو گئے۔ کشمیری سادات اب تک وہاں موجود ہیں۔

بایزید و شبلی و بو ذر از وست　　امتاں را طغرل و سنجر از وست　　(جاوید نامہ)

حضرت ابوبکر شبلی بمقام بغداد ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار صرف اپنے زمانے کے صوفیہ ہی میں نہ تھا بلکہ محدثین کے گروہ میں بھی شامل تھے۔ فقہ مالکی کے مقلد تھے اور جنید بغدادی کے خلیفہ و مرید۔ آپ کا اصلی وطن خراسان تھا۔ بغداد میں جمعہ کے دن ۳۳۴ھ (۹۴۶ء) میں انتقال کیا۔ حد درجے زاہد و مرتاض تھے۔

سید معین الحق
لیکچرار شعبۂ تاریخ، اُردو کالج کراچی

خلافتِ بنو اُمیّہ

مقدمہ

خلافت ایک مذہبی ادارہ ہے جس کی بنیادیں چند احادیث نبویؐ پر قائم ہیں۔ نیز کلامِ الٰہی کی چند آیتیں نصب خلافت پر دلالت کرتی ہیں اور اُس کے قیام کا وجوب ثابت کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے خود دینِ اسلام ایک ایسے ادارے کے انعقاد کا متقاضی ہے جو اُس کے مطالبات کو پورا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد تدفین سے پہلے ہی صحابۂ کرامؓ نصب خلافت کی طرف متوجہ ہوئے اور سب سے پہلے اسی مرحلہ کو طے کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں :-

"اگر نصب خلافت شرعاً واجب و لازم نہ ہوتا تو قبل از دفن ہرگز اصحاب رسولؐ اُس طرف متوجہ نہ ہوتے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے ایک حدیث جو واضح طور پر اس کے انعقاد کا حکم دیتی ہے یہ ہے :-

"من مات ولیس فی عُنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ۔" (جو شخص مر جائے اور اُس کی گردن میں کسی کی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا) اس حدیث کے علاوہ متعدد احادیث ایسی ہیں جو قریش اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت و امامت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً :-

"الائمۃ قریش" (امام قریش میں سے ہونگے) لایزال ھذا الامر فی قریش مابقی منھم اثنان (جب تک قریش میں سے دو شخص بھی باقی ہیں خلافت اُنہیں میں رہے گی) ان ھذا الامر فی قریش لایعادیھم احدٌ الا اکبہ اللہ علی وجھہ ما اقاموا الدین۔ (خلافت قریش میں رہے گی جب تک وہ دین کو قائم رکھیں۔ اُن سے دشمنی نہیں کرے گا مگر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اوندھے منہ ڈالے گا) مزید وہ حدیث جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے اپنے مرض الموت میں مجھ سے ارشاد فرمایا

"اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکرؓ کے لئے دستاویز لکھ دوں ایسا نہ ہو کہ میری موت کے بعد لوگوں میں اُس سے متعلق (خلافت) اختلاف پڑ جائے۔" پھر خود ہی فرمایا :- "خیر چھوڑ دو۔ خدا نہ کرے کہ مسلمانوں میں ابوبکرؓ پر اختلاف ہو۔"

آیاتِ ربانی میں سے جو نصب خلافت پر دلالت کرتی ہیں یہ ہیں :-

"وَعَدَ اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰتِ لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلکم ولیمکننّ لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم۔" (تم میں سے جو لوگ ایمان لاتے اور نیک کام کئے اُنہیں اللہ وعدہ دیتا ہے کہ وہ اُن کو زمین کا خلیفہ بنائے گا جس طرح اُس نے اگلے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور اُن کے دین کو وسیع کرے گا جسے اُس نے اُن کے لئے پسند کیا ہے) اسی طرح :-

"الذین ان مکّنّاھم فی الارض اقاموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔" (یہ وہ لوگ ہیں کہ

له فاضل مضمون نگار کی غیر مطبوعہ کتاب "خلافت بنو اُمیّہ" کا ایک . . . ۱

کہ ہم ان کو زمین کا حاکم بنائیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے)

اب اگر خود مذہب کے مقتضیات و مطالبات پر روشنی ڈالی جائے تو اُن سے بھی نصب خلافت کے وجوب کا صاف پتہ چلتا ہے۔ ایمانیات کے بعد مذہب کا پہلا مطالبہ اقامت دین ہے یعنی اُن احکام کا اجراء اور نفاذ ہے جو آنحضرت ؐ کی وساطت سے مسلمانوں کو عطا ہوتے ہیں۔ مزید اُس دین کی توسیع اور تحفظ میں لقاء سے جنگ کرنا ہے جسے جہاد کہتے ہیں اور جسے مذہب نے فرض قرار دیا ہے۔ یہ تمام امور بغیر کسی ایسے ادارے کے انجام نہیں پا سکتے جس کے پاس سیاسی طاقت نہ ہو۔ اس طرح خود ارکان اسلام، احکام حدود شرعیہ، فرضیت جہاد اور علوم دینیہ ایک مرکزی ادارہ کے متقاضی ہیں جو اُن کے اجراء و اقامت کا انتظام کر سکے۔ ایسے اہل ادارہ کو "ادارۂ خلافت" کہتے ہیں اور اُس کے سربراہ کو خلیفہ کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔

نصب خلافت کے وجوب پر مسلمانوں کا اجماع رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین سے پہلے ہی جیسا کہ بیان ہوا مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس ادارہ کی بنیاد رکھ دی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے کبھی اپنی جماعت کو اس ادارہ سے خالی نہ رکھا۔ ہمیشہ اُن کی مذہبی و سیاسی تنظیم کا محور یہی ادارہ رہا یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء میں جدید ترکی کے بانی کمال اتاترک نے اسے ختم کر دیا اور وحدت ملی کے اس عظیم نشان کو مٹا دیا۔ ایک ہی اصول پر تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال تک کروڑوں مسلمانوں پر مشتمل، ملت اسلامیہ کا یہ اجماع عمل خود وجوب خلافت پر کھلی دلیل ہے۔

معتزلہ و خوارج دو فرقے بہرحال ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس کے وجوب سے انکار کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ صرف احکام شریعت کا اجراء واجب ہے، جب احکام جاری ہو گئے اور اُمت حدود اللہ پر کاربند ہو گئی تو پھر اُسے کسی امام یا خلیفہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن ان لوگوں کا یہ مسلک بالاجماع مردود ہے اور عقلاً بھی ... ناقابل قبول ہے۔ اُن کے انکار کی وجہ جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے:-

"یہ تھی کہ جب انھوں نے دیکھا کہ مذہب دنیا کی بے ثباتی کا اعلان کرتا ہے۔ اُس سے بیزاری کا سبق دیتا ہے اور زہد و عبادت کی طرف راغب کرتا ہے تو دوسرے الفاظ میں گویا وہ دنیوی الجھنوں اور مشغولیتوں سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ چونکہ خلافت کا ادارہ سیاسی مطالبات اور حاکمانہ لوازمات سے عبارت ہے، تغلب و تسلط چاہتا ہے اور دنیوی مشغولیتوں کی طرف دعوت دیتا ہے اس لئے اس کا قیام واجب ہونے کے بجائے مذہب کے منافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی یہ دلیل نہ عقلاً صحیح ہے اور نہ مذہب اسلام کی روح کے مطابق ہے۔ جو مذہب خود غلبہ چاہتا ہو اُس کے متعلق ہرگز یہ رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ وہ سیاسی تنظیم ہی کا مخالف ہے۔ قرآن مجید کی آیت " لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" خود اس رائے کو واضح طور پر غلط ثابت کر رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام نے نہ بذاتہٖ ملک و سلطنت کو برا کہا ہے اور نہ دُنیوی مشغولیتوں سے روکا ہے، اُس نے قہر و ظلم، جارحیت و عدوان کی مذمت کی ہے جو ناخدا ترس حکومتوں کا شیوہ رہا ہے۔ ساتھ ہی اُس نے قیام عدل، خدمت خلق اور نیکی کے اجراء کو بہت ہی مستحسن بتایا ہے اور اُن پر بڑے بڑے اُخروی صلہ اور اجر کا وعدہ کیا ہے۔ البتہ اُس نے اخروی زندگی اور اُس کے اجر کی اہمیت بتا کر دُنیوی نعمتوں اور اُس کی مشغولیتوں کو اُس کے تابع کر دیا ہے۔ یہی وہ عظیم فرق ہے جو عام حکومتوں اور خلافت کے درمیان پایا جاتا ہے۔

تمدنی زندگی کے لئے سیاسی ادارہ کا قیام تو بہرحال ضروری ہے۔ مگر اُس ادارہ کی لازمی صفات کیا ہونی چاہئیں۔ اس مسئلہ میں بہرحال اختلاف کی گنجائش ہے۔ عام حکومتوں کے نزدیک "قوت و استیلا" ہے۔ فرانسیسی سیاسی مفکر روسو کے نزدیک یہ ارادہ

مقدمہ حصہ دوم صفحہ ۲۵

قوت ہے۔ مگر اسلام کے نزدیک "قوت و امانت" ہے، دونوں کا فرق صاف ظاہر ہے، امام ابن تیمیہؒ نے حکومتی نقطۂ نظر سے امانت کی تین صفات بیان کی ہیں :—

(۱) خدا کا خوف (۲) مخلوق سے بے خوفی (۳) خدا کے احکام پر حب مال وجاہ کو ترجیح دینا۔ یہی احساس امانت تھا کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے انتخاب خلافت کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا۔

"صدق امانت ہے اور کذب خیانت ہے۔ تم میں سے ضعیف لوگ میرے نزدیک اس وقت تک قوی ہیں جب تک میں اُن کا حق نہ دلوا دوں اور تمہارے قوی لوگ ضعیف ہیں جب تک دوسروں کا حق اُن سے نہ دلوا دوں ۔۔۔۔"

اس خطبہ میں جہاں آپ نے اپنی حیثیت اور حکمت عملی کی وضاحت کی ہے وہاں حکومت اسلامیہ کی ان دو لاینفک صفات "قوت و امانت" کا ذکر بھی فرما دیا ہے گویا طاقت و امانت حکومت کے لازمی مظاہر ہیں۔

اس طرح اگر ریاست کے عناصر ترکیبی کا خلافت کے عناصر ترکیبی سے موازنہ کیا جائے تو دونوں کے درمیان نمایاں فرق نظر آئے گا۔ ریاست کے عناصر ترکیبی چار قرار دیئے جاتے ہیں، ملک، آبادی، تنظیم اور حاکمیت۔ حاکمیت سے یہاں مراد ایسی آزاد طاقت ہے جو قانون سازی میں کسی کے تابع نہ ہو۔ وہ طاقت ایک فرد میں بھی مرتکز ہو سکتی ہے اور چند افراد یا پوری قوم میں بھی اسی لحاظ سے اس کو مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں مثلاً شخصی، اُمرائی اور جمہوری وغیرہ۔ خلافت کے دو عناصر ترکیبی تو وہی ہیں جو عام ریاستوں کے ہوا کرتے ہیں یعنی ملک و آبادی، اور ان میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔ بقیہ دو تنظیم و حاکمیت کے تصور کے لحاظ سے یہ اُن سے جدا ہو جاتی ہے۔ عام حکومتوں کی تنظیم بلا تخصیص یا بالتخصیص مذہب، ملک کی پوری باشعور آبادی یا ملک کے کسی خاص طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے مگر خلافت کے اندر یہ تنظیم عقائد و مذہب کے اتحاد پر مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دے کر صرف انہیں کو شامل و محیط ہے۔ واضح الفاظ میں حکومت کو وجود میں لانے والی، چلانے والی اور قائم رکھنے والی تنظیم کے اندر غیر مسلم نہ فیصلہ کن رائے دے سکتے ہیں اور نہ فیصلہ کن حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کو چلانے کا کام صرف مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے کلام ربانی کی یہ آیت وَلَن یجعل اللّٰہُ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً۔ (کافروں کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر حکم کرنے کا کوئی حق نہیں دیا) اس سیاسی و حکومتی تنظیم کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کی مزید وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس تحریری دستور سے ہو جاتی ہے جو آپ نے ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں (مہاجرین والانصار) کو عطا فرمائے۔ اُس دستور کی پہلی دو[۱] دفعات ہیں

(ا) یہ حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمدؐ کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور اُن لوگوں کے مابین جو اُن کے تابع ہوں اور اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں اور اُن کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

(۲) تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل اُن کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت ہوگی۔"

یہ دفعات اسلامی ریاست کے اندر اُس تنظیم کی نوعیت کو واضح کر دیتی ہیں، جو حکومت کے لئے ایک عنصر ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی اصول کے تحت آپ نے اُن تمام افراد کو منظم کیا جو دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔

حاکمیت کے تصور کے لحاظ سے تو خلافت بالکلیہ عام حکومتوں سے جدا ہو جاتی ہے۔ عام ریاستوں کے اندر حاکمیت کسی ایک فرد (راجہ)، افراد یا پوری قوم کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس خلافت کا ادارہ اسی اس عقیدہ پر قائم ہے کہ حاکمیت صرف خداوند

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص۱۶۰ تا ص۱۶۹۔

الیٰ کو حاصل ہے ۔ یعنی تکوینی و تشریعی دونوں لحاظ سے وہی اور صرف وہی حاکم و مالک ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اُسی کے قوانین
رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مسلمانوں کو عطا ہوئے ہیں، نافذ و جاری ہونگے اور صرف وہی قوانین قابل اطاعت
وں گے ۔ وہ قوانین قرآن مجید اور احادیث نبوی کی شکل میں موجود ہیں ۔ اگر کسی مسئلہ کے بارے میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی
اموش ہوں تو پھر خدا ترس مجتہد مسلمانوں کی عام رائے جسے اجماع کہتے ہیں، قانون کی شکل اختیار کرے گی ۔

خلافت کے لغوی معنی جانشینی کے ہیں ۔ یہ جانشینی دو قسم کی ہے ۔ ایک وہ ہے جسے نیابت الٰہی کہتے ہیں ۔ یہ خلافت براہ راست
ن لوگوں کو عطا ہوتی ہے جن کو انبیاء کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے اور جنہیں احکام خداوندی براہ راست وحی کے ذریعے ملا کرتے تھے ۔
لام ربانی میں اس بلا واسطہ خلافت کا تذکرہ بھی آیا ہے ۔ مثلاً :-

" واذ قال ربک للملٰئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ " (اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں
یک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں) یہاں خلیفہ سے مراد حضرت آدمؑ ہیں ۔ اس طرح :-

" یا داؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض " (اے داؤد ہم نے تجھ کو زمین پر خلیفہ بنایا) یہ خلافت بلا واسطہ نیابت الٰہی
ہے اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو خلیفۃ اللہ کہتے ہیں ۔ یہ خلافت ختم رسالت کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ پر ختم ہوگئی اور آپ
کے بعد جن لوگوں نے اس سیاسی و مذہبی تنظیم کی سربراہی کی اُنہیں خلیفۃ الرسول سمجھا گیا ۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت صدیقؓ کو جب
لیفۃ اللہ کے لقب سے مخاطب کیا گیا تو آپ نے منع کیا اور فرمایا :-

" میں خلیفۃ اللہ نہیں ۔ خلیفۃ الرسولؐ ہوں "[1] چونکہ اس بلا واسطہ خلافت کا دوسرا نام نبوت و رسالت[2] ہے اور اسی نام
سے اُسے شہرت حاصل ہے، مزید اس کا سلسلہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے اس لئے اب خلافت سے مراد حضور صلعم
کی جانشینی ہے یا " نیابت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم " ہے اور یہی وہ دوسری قسم کی جانشینی ہے جس سے ہمیں یہاں بحث کرنی ہے ۔
یہ جانشینی ایک بالواسطہ خلافت ہے یا علامہ ابن خلدون کی تعریف کے مطابق " صاحب الشریعت کی نیابت ہے "[3] یہ خود
وحی کی حامل نہیں بلکہ صاحب وحی کے دین کا تحفظ اور اس کی تبلیغ اس کے لائے ہوئے احکام کا نفاذ و اجراء اقامت جہاد و احیاء علوم
دینیہ اُس کا مقصد و مدعا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں حراست دین و سیاست دنیوی دونوں کے مجموعہ کا نام خلافت ہے ۔ اسی
کا دوسرا نام " امامت " ہے ۔ جس طرح نماز میں امام کا اتباع ضروری ہے اسی طرح خلیفہ کا اتباع واجب ہے، بلکہ یہ " امامت کبریٰ " ہے کیوں
کہ جمیع احکام میں امت کو اس کا اتباع کرنا پڑتا ہے ۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ ایک دینی منصب ہے، جو مذہبی امور اور دنیوی معاملات
دونوں کو کفیل ہے ۔ خلیفہ کو جس طرح تشریعی اختیارات حاصل ہیں اسی طرح قضا و تنفیذ، سیاست ملکی امور دنیوی سے متعلق سارا انتظام بھی
اُسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ تاریخ اسلام میں اس خلافت کی ابتدا حضرت ابوبکرؓ سے ہوتی ہے اسی وجہ سے آپ کو خلیفہ اول کہتے ہیں اور حضرت
عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین کو بالترتیب حضورؐ کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے جانشین کے لقب سے یاد کرتے
ہیں ۔ اس خلافت کے اختتام پر ایک دوسرے طرز کی حکومت قائم ہوتی ہے جو خلافت بنو امیہ کہلاتی ہے ۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ
نیابت دو طرح کی ہو سکتی ہے ۔ ایک نیابت تو یہ ہے کہ جسکی نیابت کی جارہی ہے اُس کی کامل پیروی کی جائے ۔ ہر قدم پر اس کے منشا
و مدعا کو ملحوظ رکھا جائے ۔ اُس کے احکام و ہدایات کے صرف الفاظ ہی پر نہیں بلکہ اس کی روح پر بھی نگاہ رکھی جائے اور اُن کو اس طرح
نافذ و جاری کیا جائے، برتا جائے اُن پر عمل کیا جائے اور دوسروں کو اُن کی طرف دعوت دی جائے کہ مقتدی کا مقصد صحیح معنی میں

[1] طبقات ابن سعد ص۱۳۱　[2] ازالۃ الخفا ص۱　[3] مقدمہ ابن خلدون ص۱۳۴

حاصل ہو سکے۔ یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ نیابت کرنے والے کے دل میں اپنے مقتدیٰ کے لئے بے پناہ محبت ہو۔ اُس کی محبت مال و دولت، اہل و عیال غرض ہر ایک کی محبت پر غالب ہو، اُس کی توقیر و احترام کو وہ اپنا فرض اولین سمجھتا ہو، اُس کی ایک خواہش پر دنیا اور کائنات کی ہر چیز ٹھکرا دینے کے لئے تیار ہو۔ اُس کی تعلیمات کی روح سے اُس کے شعور نے ہم آہنگی پیدا کر لی ہو اور صرف اُسی کی اتباع کو وہ فلاح دارین کا ذریعہ سمجھتا ہو۔ ایسے ہی شخص سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نیابت کا حق ادا کرے گا۔

دوسری نیابت یہ ہے کہ مقتدیٰ کی پیروی تو کی جائے مگر ہر قدم اور ہر کام پر اُس کے منشاء و مُدعا کو ملحوظ نہ رکھا جائے یا ملحوظ رکھا بھی جائے پھر بھی اصل رُوح کی کمی کی وجہ سے وہ نتیجہ برآمد نہ ہو جو اُس نیابت کا تقاضا ہے۔ اسی پیروی کے لحاظ سے جانشینی کے مدارج متعین کئے جا سکتے ہیں اور اسی نقطۂ نگاہ سے خلافت سابقہ اور خلافت بنو امیہ کے درمیان فرق قائم کیا جاتا ہے عام مسلمانوں کا ہمیشہ اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ اوائل کے چار خلفاء حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، و علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کی اور قولاً عملاً و فعلاً ہر لحاظ سے آپ کے نقش قدم پر چلے ہی وجہ سے اُن کی جانشینی یعنی خلافت کو "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" یا "خلافتِ راشدہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

*

خلافتِ راشدہ یوں تو ایک سیاسی و تنظیمی ادارہ ہونے کی وجہ سے ایک حکومت ہی تھی مگر اپنی طرز کی وہ واحد اور مثالی حکومت تھی۔ چونکہ وہ "نیابت عن النبیؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عبارت تھی اس لئے ساخت، کردار اور مقاصد ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی وہ دوسری تمام حکومتوں سے ممیز و ممتاز تھی۔ وہ دنیا کی پہلی دستوری حکومت تھی جس کے بنیادی اصول اغراض و مقاصد دائرہ کار، حدود واضح اور مکتوب تھے۔ جو احکام الٰہی و ارشادات نبویؐ کے تحت منظم و اقامت پذیر ہوئی تھی اور وہیں سے فیضان حاصل کرتی تھی۔ جس کے آئین و ضوابط قرآن مجید و احادیث رسولؐ کی شکل میں مرقوم بھی تھے اور لوگوں کو ازبر یاد بھی تھے اس طرح اُس کا آئینی و دستوری قیام ہی تمام غیر آئینی اور مطلق العنان حکومتوں کے لئے ایک چیلنج تھا۔ ساتھ ہی سیاسی و قانونی زندگی کے انتہائی ارتقاء کا ایک نشان بھی تھا۔

اُس کی دوسری خصوصیت اُس کی مذہبیت تھی۔ یعنی یہ کہ وہ ایک دینی حکومت تھی جو دین اسلام کی آفاقیت و ہمہ گیری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ اُس کے صرف سیاسی اُصول ہی نہیں بلکہ دیوانی و تقریری، معاشی و عدالتی یہاں تک کہ جنگی و بین الاقوامی قوانین بھی منزل من اللہ تھے اور جو خالق کائنات کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وساطت سے دنیا کو عطا ہوئے تھے۔ اس طرح اس خلافت کو دین و دنیا کی تفریق مٹانے، مذہب و سیاست کو یکجا کرنے اور تمام اعمال کو ایک مرکز کے گرد گردش دینے کا فخر بھی حاصل تھا۔ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتی تھی کہ انسانی حیات کا کوئی شعبہ یا کوئی گوشہ بھی الٰہی ہدایات کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ اس طرح ابتداء ہی میں اُس نے قیصریت کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کسی بشر کو بھی قانون سازی کا حق دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کا بنیادی اصول تھا "الحکم للہ" یعنی حکم صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس پر وہ سختی کے ساتھ ایمان رکھتی تھی۔ ساتھ ہی وہ تھیا کریسی —— (THEOCRACY) بھی نہ تھی جو احکام خداوندی کی تشریح اور تفہیم کے لئے کسی مخصوص مذہبی طبقہ کی پابند ہو۔ مسلمان کے درمیان نہ تو پادریوں، موبدوں، ربیوں، پروہتوں یا برہمنوں جیسا کوئی طبقہ موجود تھا اور نہ خلافت نے اپنی تنظیم کے اندر اس کی کوئی گنجائش رکھی تھی۔ احکام الٰہی و ہدایات نبوی براہ راست تمام مسلمانوں کو مخاطب کرتے تھے اس لئے وہ اس کا اہل ہر اس مسلمان کو سمجھتی تھی جس نے پورے خلوص و خدا ترسی کے ساتھ قرآن مجید و احادیث نبویؐ پر عبور حاصل

کرلیا ہو۔

ان دو خصوصیات کے ساتھ وہ ایک نظریاتی اور تصوری حکومت تھی۔ وہ اس نظریہ کی علمبردار تھی کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے حاصل ہے۔ یعنی جس طرح یہ ساری کائنات اور جو کچھ اس میں ہے اسی کی بنائی ہوئی اور اسی کی ملک ہے اسی طرح وہ ان کا حاکم و فرماں روا بھی ہے۔ اس دنیا کے اندر اس نے اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو افضل بنایا ہے اور اس نظام شمسی کو اس کے لئے مسخر کر دیا اور اُسے طبیعی نظام کے ناقابل تبدیل و ناقابل شکست قوانین کے تابع کرکے ایک مخصوص دائرہ کے اندر آزادی عطا کر دی ہے جس کی بدولت اُسے دوسری مخلوقات پر فضیلت حاصل ہو گئی ہے، ساتھ ہی اُسے عقل و تمیز کی نعمت سے بہرہ ور کرکے دنیا میں اپنا جانشین (خلیفہ) مقرر کیا ہے۔ اب اس منصب نیز اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اُس کی حاکمیت کو برضا و رغبت تسلیم کرکے اُس کے احکام کے تحت زندگی بسر کرے۔ اُس کے مقرر کئے ہوئے حدود سے تجاوز نہ کرے اور اس طرح اُس کی جانشینی کا حق ادا کرے۔

خلافت راشدہ کے نزدیک ربانی قوانین کے مآخذ صرف دو تھے قرآن مجید اور احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اس لئے تمام تمام قوانین ان ماخذوں سے اخذ کئے جاتے تھے اگر ان دو ماخذوں میں کسی مسئلہ سے متعلق واضح ہدایت موجود نہ ہوتی تو اسلامی ہدایات کے بنیادی اصول کی روشنی میں اُن ماخذوں پر عبور رکھنے والے اصحاب رسولؐ کوئی لائحہ عمل تلاش کرتے جسے اجتہاد کیا جاتا۔ اگر اُس اجتہاد پر مسلمانوں کا اتفاق (اجماع) ہو جاتا تو اُسے قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی۔ اس طرح خلافت راشدہ نے قانون سازی کے بشری حقوق کا انکار کرکے مساوات کی ایک ایسی مثال پیش کی تھی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اُس نے حاکم و محکوم کے فرق کو یکسر ختم کرکے ہر ایک کو احکام خداوندی کے تابع کر دیا تھا۔

اس عدیم المثال مساوات کے ساتھ اُس نے قانون کے دائرہ کے اندر فرد کو ایک مکمل آزادی بھی عطا کی تھی۔ وہ ایک طرف انفرادی آزادی کی ضمانت دیتی تھی تو دوسری طرف وحدت مرکز کی پاسبانی۔ اُس نے کلیت پسندی اور لامرکزیت کے درمیان ایسا توازن قائم کر رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک مثالی فلاحی حکومت بن گئی تھی۔ چونکہ "طاقت و امانت" اُس کے خلقی و لازمی مظاہر تھے اس لئے یہ بات اُسے حاصل ہو سکی تھی۔ وہ ہر قوی کے مقابلہ میں قوی تر تھی اس لئے مظلوموں کی حمایت و دادرسی سے عاجز نہیں رہ سکتی تھی اس کی طاقت قوی سے کمزوروں کا حق وصول کر لیتی تھی۔ ساتھ ہی اُس کی امانتداری خود اُسے تغلب و جبر و دستی سے روکتی تھی۔

مساوات و آزادی یہی دو ثمرے نہ تھے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تصور نے اسلامی معاشرہ کو عطا کئے تھے۔ اُس کا تیسرا اہم ثمرہ "اخوۃ" تھا جس نے رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا کر اہل ایمان کو ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا اور ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ خلافت راشدہ نے اسلامی اخوت کی علمبرداری کرکے جغرافیائی، لسانی، نسلی اور اس طرح کے تمام عوامل کو بے معنی قرار دیدیا تھا اور عملی طور پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا عقیدہ ہی اُس قومیت کو وجود میں لا سکتا ہے جس کا لازمی ثمرہ اخوت و مساوات ہو گا۔

ان خوبیوں کے ساتھ وہ جمہوری انداز کی ایک صالح حکومت تھی یعنی اُس کا سربراہ اپنی طاقت یا غلبہ کے زور سے اُس ادارہ پر قابض و متصرف نہیں ہوتا تھا اور نہ اُسے حق وراثت کا دعویٰ تھا بلکہ مسلمانوں کا ایک باشعور طبقہ اُسے منتخب کرتا تھا۔ یہ طبقہ مہاجرین و انصار کے اکابر پر مشتمل تھا جس نے اس نظریہ کو دل و جان سے قبول کرکے اُس کے تحفظ و بقا کے لئے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ اس طبقہ کے ہاتھ میں خلافت کی باگ ڈور کا ہونا اور خلیفہ کے انتخاب کا حق اُسے تفویض کرنا خلافت کے نظریاتی ہونے کے عین مطابق تھا۔ ساتھ ہی اس تنظیم کے اندر سربراہی کے لئے صرف اُس شخص کو منتخب کیا جا سکتا تھا جو اُس نظریہ کا سب سے بڑا حامی اور علمبردار تھا۔ جو صرف اس نظریہ پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ اُس کی روح، اُس کے مطالبے اور اُس کی تمام تفصیلات سے

باخبر تھا۔ نیز جسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کو نافذ کرنے کے لئے حکمت، و دانش کے ساتھ کن عملی تدبیروں سے کام لینا چاہئیے۔ سب سے بڑھ کر یہ وہ اپنے مقتدیٰ اور پیشوا (نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کا معتمد خاص بھی تھا۔ چنانچہ اس عہد پر پے در پے ایسی ہی چار مقدس شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آتا رہا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کا انتخابی حلقہ صرف اُن لوگوں تک محدود تھا جو اسلامی نظریہ کا پورا شعور رکھتے تھے اُس کے معاملے میں مخلص تھے اور اس کی بقا و تحفظ کے لئے ہر طرح ایثار کر سکتے تھے۔ اسی لحاظ سے یہ کہا جاتا ہے کہ خلافت راشدہ کی جمہوریت خدا ترس اہل علم کی جمہوریت تھی۔ عام جمہوریت اور اُس کے درمیان دوسرا نمایاں فرق یہ تھا کہ اول الذکر اکثریت کو قانون سازی کا ناقابل حق عطا کرتی ہے مگر ثانی الذکر سرے سے اس نظریہ کو ہی کی منکر تھی کہ قانون سازی کا حق کسی بشر کو حاصل ہو سکتا ہے۔

مافوق البشری قانون کا یہی وہ عقیدہ تھا جس نے خلافت راشدہ کو ایک خاص دائرہ کے اندر تنفیذ قانون کے اختیارات تک محدود کر دیئے تھے۔ نہ فرد قانون لے اس دائرہ میں وہ فرد یا اکثریت ہر ایک کی مخالفت سے قطعاً بے نیاز تھی۔ مگر وہ قانون ظاہر ہے کہ خود اُس کا وضع کیا ہوا نہیں بلکہ خدا اور رسولؐ کا عطا کردہ یا ان الہامی احکامات سے مستنبط ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں اس دائرہ کے اندر عوامی خواہشات سے اس کا بے نیاز ہونا خود اُسی نظریہ کا تقاضا تھا۔

اُس کی چھٹی خصوصیت شورائیت تھی جس نے خلافت راشدہ کو آمریت و جمہوریت کا ایک لطیف آمیزہ بنا دیا تھا۔ خلیفہ اپنی مجلس شوریٰ سے مل کر اعلیٰ اختیارات یا قوت حاکمہ حاصل کرتا تھا۔ اس لئے وہ اس کے مشورہ کا پابند ہوتا تھا۔ تمام اہم قومی مسائل اُسی میں طے ہوتے تھے۔ اور وہی حکومت کی پالیسی وضع کرتی تھی ارکین مجلس کو ارباب حل و عقد کہتے تھے جو ہر خلیفہ کو اعتماد ہوتا تھا اور جو خلیفہ پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ اگر خلیفہ اور ارباب حل و عقد کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف ہوجاتا تو خلیفہ اُس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا جب تک کہ وہ اپنی رائے کی تائید میں قرآن کی کوئی آیت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت پیش نہ کر دیتا تھا ایسی صورت میں ارکین مجلس اپنی رائے سے رجوع کرکے خلیفہ کی رائے سے اتفاق کر لیتے تھے۔ یہ اس لئے ممکن تھا چونکہ خلیفہ اور ارباب حل و عقد اسلامی ہدایات پر ایمان رکھتے تھے، اُن کو فلاح دارین کا ضامن سمجھتے تھے اور اُن سے سر مو انحراف کو بھی پسند نہیں کرتے تھے نیز اپنی خدا ترسی کی وجہ سے پورے انشراح صدر کے ساتھ، حق کو قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔

"خلافت راشدہ کی ساتویں خصوصیت اُس کی سادگی تھی۔ وہ ہر طرح کے شاہی آداب، آمرانہ تکلفات اور ترک و احتشام سے آزاد تھی۔ خلیفہ اور اس کے ارباب حل و عقد کے لئے نہ کوئی قصر تھا اور نہ کوئی عالیشان مکان۔ وہ عام شہری کی طرح چھوٹے مکانوں میں رہتے تھے۔ پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے، سادہ ترین کھانا کھاتے تھے۔ حصول معاش کے لئے کسب کیا کرتے تھے لوگوں کی خوشی و غم میں بلا تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ اسلامی ہدایات کے عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔ وہی اپنے وقت کے کامل ترین و صالح ترین افراد تھے اور وہی صاحب اقتدار بھی تھے **گویا اُن کی ذات طاقت و تقویٰ سے عبارت تھی اور یہ تاریخ کا انوکھا اور مثالی واقعہ تھا۔**

خلافت راشدہ کی اسی سادگی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُس عہد تک امراء کا کوئی طبقہ وجود میں نہ آسکا۔ خود خلیفہ اس بات سے بے نیاز تھے کہ وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے کسی امیر کا سہارا لے اور نہ اُس کے دنیوی مطالبات ہی ایسے تھے جو اُنہیں اس طرح کی حمایت حاصل کرنے پر مجبور کرتے۔ ساتھ ہی اس کے ارباب حل و عقد بھی اس پر آمادہ نہ تھے کہ وہ اپنے مقتدا کا نقش قدم چھوڑ کر قیصر و کسریٰ کے نقش قدم پر

چلیں۔ اس صورت حال نے مملکت کے مالی وسائل کو چند ہاتھوں میں سمٹ جانے سے کلیتہً روک دیا تھا جس کا لازمی نتیجہ فارغ البالی و مرفہ الحالی تھی جو خلافت کے ہر گوشہ میں پائی جاتی تھی۔ ایک طرف خلافت اتنی دولتمند تھی کہ لوگوں کی کفالت کی ذمہ داری لیتی تھی اور ان کے وظیفے مقرر کرتی تھی دوسری طرف لوگوں کے اندر خوشحالی تھی یہی خوشحالی و معاشی مساوات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلافت راشدہ معتدل اشتراکیت کا ہلکا سا رنگ لئے ہوئے ایک جمہوریت تھی۔

خلافت راشدہ کی آٹھویں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے بیعت کا طریقہ جاری کیا تھا۔ یہ خلیفہ کی خلافت و امامت کو تسلیم کر لینے کا گویا عملی مظاہرہ تھا۔ پہلے ارباب حل و عقد اس کے بعد عام مسلمان خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ جہاں خود خلیفہ موجود نہ ہوتا وہاں اعلیٰ حکام مثلاً والی و قاضی، اس کے لئے بیعت لیتے تھے۔ بیعت، اس بات کو واضح کر دیتی تھی کہ بیعت کرنے والے نے خلیفہ کی خلافت کو برضا و رغبت قبول کر لیا ہے اور وہ ابن خلدون کے الفاظ میں "اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اپنے اور تمام مسلمانوں کے امور میں اس کے (خلیفہ کے) کلی اختیارات کو تسلیم کرے گا اور کسی معاملہ میں اس سے نزاع نہیں کرے گا۔"

جب ایک بار کسی کے ہاتھ پر سمع و اطاعت کی بیعت کر لی جاتی تو وہ اس وقت تک نہیں توڑی جا سکتی تھی جب تک کہ خود خلیفہ خلافت کے بنیادی نظریہ سے منحرف نہ ہو جاتا یعنی کوئی ایسا حکم یا قانون نافذ کرتا جس سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر کسی لحاظ و نوعیت سے بھی زد پڑتی ہو یا خود اس کا عمل الہامی قوانین کے مخالف ہوتا۔ ان صورتوں میں بیعت کرنے والا خلیفہ کی اطاعت سے آزاد ہو سکتا تھا۔ دین اسلام میں بلا شرط اطاعت صرف خدا اور اس کے رسولؐ کے لئے ہے۔ اس لئے خلافت کی بیعت دوسرے معاہدوں کی طرح بہر حال مشروط تھی۔ اس کی وضاحت خود خلیفہ اول نے اپنے پہلے خطبہ میں کر دی تھی۔

"میں تو صرف پیرو ہوں ہادی نہیں۔ اگر میں راہ راست پر رہوں تو میری اتباع کرنا اگر بھٹک جاؤں تو مجھے سیدھا کرنا۔۔۔۔۔۔ اگر میں شیطان کے اغوا میں آجاؤں تو تم مجھ سے علیحدہ ہو جانا اس وقت میرا تم پر کوئی حق نہ رہیگا۔"

جس طرح اسلام کی سیاسی تنظیم اور اس کے تمام فروعات منطقی اور عقلی طور پر مرکزی عقائد ہی سے مستخرج ہوئے اور ان کے نتائج صریح معلوم ہوتے ہیں اسی طرح بیعت کا یہ سلسلہ بھی اسی نظام کے ایک لازمی نتیجہ کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ جب خلافت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس نظریہ پر قائم تھی کہ انسان اس زمین پر اس کا خلیفہ ہے تو پھر کسی کے حق میں اپنے حق خلافت سے دست بردار ہونا بہر حال ضروری تھا۔ بیعت اس دستبرداری کی واضح علامت تھی۔ ساتھ ہی خلافت چونکہ نیابت عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عبارت تھی اس لئے خلیفہ کی اطاعت عین خدا و رسولؐ کی اطاعت تھی۔ اس لئے اس سے انحراف صرف اسی وقت کیا جا سکتا تھا جب وہ خدا و رسولؐ کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکتا۔

ظاہر ہے کہ بیعت کا سوال انہیں لوگوں سے متعلق ہو سکتا تھا جو نظریہ خلافت پر ایمان رکھتے تھے۔ غیر مسلموں سے نہ بیعت لی جا سکتی تھی اور نہ منطقی طور پر انہیں خلافت ارضی حاصل تھی جس سے وہ بردار ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیعت کا رواج صرف مرکزیت کے استحکام ہی کا ایک ذریعہ نہ تھا بلکہ ہر مسلم شہری کی اہمیت۔ انفرادیت اور اس کی شخصیت کے اعتراف کا ایک نمایاں اور باوقار طریقہ بھی تھا۔

خلافت راشدہ کی خصوصیات کا یہ مختصر سا خاکہ تھا جو پیش کیا گیا اب دوسرے باب سے خلافت بنو امیہ کے کوائف احوال کا آغاز ہوتا ہے۔

نوٹ :۔ دفتر ماہنامہ "فاران" سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیں۔ (منیجر)

مولانا ابوعلی (اعظم گڑھ)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

یوں تو مجھے اپنے زمانہ طالب العلمی میں لاتعداد بزرگوں کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، مثلاً شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب ہندی، مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے شعبۂ عربی کے صدر الاساتذہ، مولانا عبدالماجد صاحب بانی درس نظامیہ اور معقولات کے مشہور استاد آخر میں یہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس ہو گئے تھے، اور بیش قرار تنخواہ پاتے تھے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حمیدالدین فراہی جو اس زمانہ میں ریاست حیدرآباد سے متعلق اور وہاں کے علوم مشرقیہ کے مشہور دارالعلوم کے پرنسپل تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا ابوالحسنات ندوی، رفیق دارالمصنفین، صاحب سیر الصحابیات و سیر الانصار، مولانا سعید انصاری وغیـــرہ۔

ان میں ایک بزرگ مختلف حیثیتوں سے قابل ذکر ہیں۔ یعنی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اڈیٹر ہند جدید کلکتہ، یہ مولانا شبلی متکلم ندوی کے شاگرد اور مولانا نگرامی کے مخلص دوست تھے۔ اور جامع ازہر مصر اور اس کے مقابلہ کی دوسری درسگاہ الدعوۃ والارشاد سے جس کو سید رشید رضا، صاحب المنار نے قائم کیا تھا۔ فارغ ہو کر ابھی ابھی مصر سے آئے تھے، اور ان بزرگوں سے ملنے سرائے میر آیا کرتے تھے، اس تقریب سے امتحان کے لئے جو طلبہ ان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔ وہ زیادہ تر عربی ادب کا امتحان لیتے تھے۔ جس میں ہم سب مولانا نگرامی کے حسن تعلیم اور فیض صحبت کے سبب سے طاق تھے۔ اور بڑی سے بڑی اردو عبارت بجلت تمام عربی میں ترجمہ کر ڈالتے تھے، آخر میں تو اردو کے ان چوٹی کے اشعار کا ترجمہ کرنے لگے تھے۔ جو زبان زد خاص و عام ہیں یا ضرب الامثال بن گئے ہیں، ان میں حضرت انیس لکھنوی کا یہ شعر اب تک یاد ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس سے منتظمین مدرسہ بہت متاثر ہو کر جاتے تھے، مولانا عبدالرزاق پر بھی ہمارے اس ادبی ذوق کا بڑا اثر تھا۔ اس کے کلکتہ کے زمانہ قیام میں مولانا نگرامی کے ہمراہ ملاقات ہوئی۔ اور مولانا نگرامی نے ان سے میرا تعارف کرایا تو فوراً پہچان گئے اور برجستہ فرمایا میں ان کو جانتا ہوں، اور ان کی تحریریں دیکھ چکا ہوں۔ ماشاءاللہ ان میں بڑی صلاحیت ہے، ان سے کلکتہ میں اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور میرے ساتھ بڑے اخلاص اور محبت سے پیش آتے تھے، ان کو اردو میں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن مصر میں رہنے کی وجہ سے اردو شگفتہ نہیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک عربی کتاب کا جو شاید ترکوں کے متعلق تھی۔ ترجمہ کیا تھا۔ جس کی اردو کسی قدر ناہموار تھی، ان کی عدم موجودگی میں ہماری مجلس میں کسی تقریب سے اس کتاب کا ذکر آجاتا، تو ہم سب کو ہنسی آجاتی۔ کہ ایک اردو اخبار کا اڈیٹر، مولانا ابوالکلام آزاد کا رفیق کار اور خود اردو زبان کا مدعی کیسی ناہموار اور سپاٹ اردو لکھتا ہے لیکن بعد میں انھوں نے غیر معمولی ترقی کی اور بہت صاف ستھری اور پاکیزہ اور عام فہم اردو لکھنے لگے۔ اور بحمداللہ بقول ایک جدید نقاد تنقید نگار کے۔ کہ لکھتے لکھتے اور ترجمہ کرتے کرتے ایک خاص اسٹائل کے مالک ہو گئے۔ یعنی بہت سادہ۔ دل کش، دل نشین اور

نام فہم جس کا اب بہت سے لوگ تتبع کرتے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، اور جدید عربی ادب کے بہت سے شاہکار اُردو میں منتقل کئے۔ علامہ ابن تیمیہ کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اتنا رواں، شگفتہ اور آسان کہ ان پر صل کا دھوکا ہوتا ہے، ان کو عربی سے اردو میں، اور اُردو سے عربی میں ترجمہ کرنے پر بے مثال قدرت تھی۔ رسالہ الجامعہ جو ان کی ادارت اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں کلکتہ سے نکلتا تھا۔ اس کے لئے مولانا ابوالکلام مضامین عموماً اُردو میں لکھتے تھے۔ اور یہ ان کا عربی میں ترجمہ کرکے شائع کرتے تھے۔ ثقافت الہند میں بھی مولانا کے نام سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں۔ وہ تمامتر مولانا عبدالرزاق صاحب کے ترجمہ کئے ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی عربی نہیں ہے۔ ملیح آبادی کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "رحلت مصطفیٰ" ہے جو بہت مقبول ہوئی، اور کئی بار چھپی یہ اردو میں اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔ اور بہت رقت انگیز ہے۔ اس کے پڑھنے سے موت کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

ان کے بعض سیاسی عقائد سے مجھے شروع ہی سے اختلاف تھا۔ وہ مارکسزم اور کمیونزم کے حامی ہی نہیں بڑے پُرجوش مبلغ تھے، لیکن میں اس کو قرآن وتعلیمات اسلام کے سخت خلاف اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل سمجھتا ہوں۔

ایک مرتبہ ارباب دارالمصنفین سے ملنے کے لئے اعظم گڈھ آئے تھے۔ سر سے پاؤں تک مکلف کلین شیپ، سرخ وسفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی چکتی ہوئی پیشانی، سید صاحب علیہ الرحمہ نے یہ کہہ کر اُن سے میرا تعارف کرایا کہ یہ آپ کے ہم مسلک ہیں، مسکرانے اور بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ انھوں نے مجھ کو بالکل نہیں پہچانا، اور نہ میں نے اس وقت مزید تعارف کی ضرورت سمجھی۔

ان کا میلان سید صاحب سے کہیں زیادہ مولانا ابوالکلام کی طرف تھا۔ کلکتہ میں ان کے مستقل قیام کے محرک اور داعی مولانا ہی تھے اس کا احساس ہم لوگوں کو اس وقت بھی تھا۔ لیکن بہرحال وہ پورے ندوی اگر نہیں تو نیم ندوی تو ضرور رہے، پھر حدیث کی تکمیل مصر سے واپس آنے کے بعد ندوہ ہی میں مولانا امیر علی محدث سے کی تھی۔ اس لئے مولانا ابوالکلام سے غیر معمولی عقیدت کے باوجود ان کے متعلق۔ ان کی زندگی کے آخر تک یہ خیال تھا، کہ ہم ذوقی، ہم فنی۔ اور علوم ندوہ کے رشتہ سے سید صاحب سے بھی انکو عقیدت اور محبت ضرور رہی ہوگی، لیکن اپنی زندگی کی آخری کتاب ذکر آزاد میں جو ان کی وفات کے بعد، ان کے صاحبزادے احمد سعید صاحب نے شائع کی ہے۔ سید صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق جو تحقیر آمیز خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ انتہائی حیرت انگیز ہیں میں نے ان کی یہ کتاب جب پڑھی تو دارالمصنفین میں سید صاحب کے ساتھ ان کی پوری تصویر میری نگاہوں کے سامنے پھر گئی، اور مجھ پر ایک سکتہ سا طاری ہوگیا، کہ کیا اس کے لکھنے والے وہی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں جن کی صلاحیتوں پر سید صاحب کو فخر تھا، اور مجھ جیسے ہیچ میرز کا یہ کہہ کر ان سے تعارف کرایا تھا۔ کہ یہ آپ کے ہم مسلک ہیں سید صاحب ان کو دیکھ کر اور اپنے درمیان پاکر اتنا خوش اور جذبۂ افتخار سے اتنا بیخود ہوتے تھے کہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، لیکن آہ! اسی شریف ترین سید، اور ندوہ کی [illegible] کا ذکر اتنے رکیک اور گرے ہوئے الفاظ میں جس کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

نام تو اس کتاب کا ذکر آزاد ہے جس سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام کے سوانح وحالات اور ان کی زندگی کے مختلف النوع کارناموں پر مشتمل ہوگی۔ اور اردو اور انگریزی میں [illegible] کتابیں مولانا پر لکھی گئی ہیں۔ ان سب سے بہتر اور [illegible] ہوگی۔ لیکن اس میں مولانا کے حالات [illegible] زندگی [illegible]۔ پیش ہی نہیں کئے گئے ہیں۔ اور نہ اس مقصد کے پیش نظر وہ لکھی ہی گئی ہے۔ بلکہ وہ مولانا ابوالکلام اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کے باہمی تعلقات کی داستان ہے اور اس سلسلہ میں مولانا کے بہت سے غیر مطبوعہ [illegible] تحریریں اور خطوط جو انھوں نے مولوی عبدالرزاق صاحب کو لکھے تھے [illegible] ہیں۔ [illegible] سے وہ کسی

ر دلچسپ اور مفید ضرور ہو گئی ہے لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ ذاتی تعلقات کی اس کہانی میں مولانا شبلی نعمانی مولانا سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے استخفاف اور ان کی منقصت کی آخر کیا ضرورت تھی۔ اور آخر وہ کیا جذبہ انتقام تھا جس کے تحت انھوں نے ایسا کیا۔ اور پھر اس سے علم و ادب کی کیا خدمت بن آئی۔ اور پھر ان میں سے دو بزرگ تو دنیا میں جو دبھی نہیں تھے۔ اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہو چکا تھا۔ البتہ مولانا عبدالماجد دریابادی زندہ تھے۔ اگر ان سے کوئی ٹھیس پہنچا تھا، تو ان کو لکھ کر اس کی صفائی کر سکتے تھے۔ اس سے سابق الذکر بزرگوں کی روحوں کو اور مولانا دریابادی کو قدرتی ور پر جو تکلیف پہنچی ہو گی وہ ظاہر ہے ان میں سے کسی بزرگ کو بھی جہاں تک میرا علم ہے مولانا ابوالکلام سے کوئی چشمک نہیں تھی۔ ر مولانا عبدالماجد دریابادی سے تو زندگی کے آخر تک خط و کتابت اور مراسلت و مکاتبت کا سلسلہ قائم تھا ان کے نام مولانا کے سارے خطوط نیا دور لکھنؤ کے ایک اسپیشل نمبر میں چھپ بھی گئے ہیں۔ جن سے مولانا ابوالکلام کے ساتھ مولانا دریابادی کے خلاص کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس پر ہم انشاء اللہ پھر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالکلام کو ذہانت، بصیرت، جودت اور فہم قرآن کا بہت خاص ذوق بخشا تھا۔ الہلال اور البلاغ کی ۴-۵ سالی جلدیں اور ان کی تفسیر ترجمان القرآن اس کی شاہد عدل ہیں۔ اس اعتبار سے مولانا عبدالماجد دریابادی سے زیادہ ان کا قدر دان اور عظمت شناس دوسرا کون ہو سکتا ہے، ایک ہی ادیب دوران کے دونوں خواجہ تاش ہیں۔ ایک ہی خرمنِ کمال کے دونوں خوشہ چیں ہیں۔ مولانا شبلی کی بارگاہ علمی میں دونوں کا گذر تھا۔ ایک فیض صحبت سے ادیب و فلسفی ہو گیا، اور دوسرا انشا پرداز، اور مدبر و سیاست کا امام۔ ایک نے مشرقی علوم و فنون کے احیاء کا علم بلند کیا، اور دوسرے نے مغربی فلسفہ اور مغربی فلاسفہ و حکماء سے اردو داں طبقہ کو روشناس کیا۔ ایک کی اس دور کی یادگار الہلال کی جلدیں ہیں اور دوسرے کی فلسفۂ جذبات اور تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ۔ پھر شدت ہم ذوقی نے دونوں کو یکے بعد دیگرے قرآن کا خادم بنا دیا، اگر ایک کی تفسیر قرآن قابل ذکر شاہکار ہے، تو دوسرے کا انگریزی ترجمۂ قرآن، اور اس کے حواشی اور فٹ نوٹ بھی اپنی جگہ خوب ہیں، ایک پھیلا اور پھیل کر سارے ہندوستان پر چھا گیا۔ اور دوسرا سمٹا، اور سمٹ کر دریاباد میں معتکف ہو گیا، دونوں کا مقصد زندگی تقریباً ایک تھا اگرچہ راہیں مختلف تھیں، ایک نیشنلزم کی راہ سے مسلمانوں کی خدمت کر رہا تھا جس کا بلاشبہ مسلمانوں کے سواد اعظم نے ساتھ نہیں دیا اور یکہ و تنہا، اسی راہ پر چلتا رہا۔ دوسرا ہر قسم کے ہنگاموں سے یکسو ہو کر خالص علمی طریقہ سے مسلمانوں کے دل و دماغ کی اصلاح کر رہا ہے ایک یورپ اور خصوصاً انگریزوں کی پرکید و فریب سیاست سے خبردار کر رہا تھا۔ اور دوسرا یورپ کے تمدنی، تہذیبی و معاشرتی غلبہ و سطوت سے مسلمانوں کو بچا رہا ہے۔ دونوں ہی کی بحمداللہ ذہنی و فکری قوتیں بے پناہ ہیں۔

بہت عرصہ کی بات ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا دریابادی کے درمیان لذت و الم اور حظ و کرب کے مترادفات یا اضداد پر الہلال ہی کے صفحات میں ایک ادبی و لغوی معرکہ ہوا تھا۔ جو اس قدر دلچسپ تھا کہ ارباب ادب آج تک اس کے مزے لے رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ دونوں الگ الگ طرز انشا اور اسلوب تحریر کے مالک ہیں۔ جن میں سے ایک کا طرز عسیر التتبع ہے، اور دوسرا علم و ادب کے تمام ذوق رکھنے والوں کے لئے لائق تقلید و اتباع، ایک میں غیر معمولی شکوہ، بلندی اور خطابت ہے، اور دوسرے میں کمال درجہ کی عذوبت، سلاست اور روانی، ایک کا ادبی مشغلہ زندگی ہی میں تقریباً منقطع ہو گیا تھا۔ اور دوسرے کا اب تک جاری و ساری ہے۔ اور ایک عالم کو اپنے افادات و افاضات سے مستفیض کر رہا ہے۔ دونوں ہی کے ادب پر مولانا شبلی کے ادب کا پرتو ہے اور میرے اعتبار سے دونوں ان کے سب سے زیادہ متاثر!

مولوی عبدالرزاق سے مولانا ابوالکلام کے تعلق، محبت اور اخلاص کے جہاں اور اسباب تھے۔ ایک سبب یہ بھی تھا، کہ وہ ان کے خیالات و افکار کو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ عربی میں منتقل کر دیتے تھے، مولانا ابوالکلام کو عربی لکھنے پر قدرت تھی۔ اور کبھی کبھی لکھتے بھی تھے۔ لیکن انھوں نے مستقلاً اس کو اپنا ذریعہ اظہارِ خیال نہیں بنایا۔ الہلال والبلاغ کے چند افتتاحیوں کے علاوہ جو بے ساختہ ان کے قلم سے نکل گئے تھے اور جن میں بڑی ادبیت ہے۔ ان کے عربی ادب و انشاء کی کوئی یادگار نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اردو میں سوچتے تھے اور اردو ہی میں لکھتے تھے، اور اپنے اس منفرد اور الہامی طرزِ انشاء سے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو کو پستی سے اٹھا کر فرازِ آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ عربی کی رجزیہ شاعری میں جو خوبی تھی۔ انھوں نے اپنے قلم سے اردو میں پیدا کر دی تھی، اور اس طرح سے وہ عربی جیسی وسیع ہمہ گیر، اور مالدار زبان سے آنکھ ملانے لگی۔ انھوں نے اپنی ساری عمر عربی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

یہ کمی انہی میں نہیں۔ ان کے سارے معاصرین میں تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی عربی ادب کا بڑا اچھا ذوق تھا، عربی ادب کے ندوہ میں معلم تھے۔ جدید عربی کا انھوں نے لغات جدیدہ کے نام سے ایک لغت بھی مدون کیا تھا۔ جو ان کا ایک عظیم اور یادگار لغوی اور ادبی کارنامہ ہے۔ مولانا شبلی نے مصر کے مشہور عیسائی مصنف جرجی زیدان کی کتاب تمدنِ اسلامی کے رد میں عربی میں جو سلسلۂ مضمون لکھا تھا، اور۔ الندوہ میں، اور بعد میں الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا تھا، اس کی تکمیل بھی اُنہی نے کی تھی یعنی اُس میں صفحہ ۴۷ سے ۵۳ تک بنو امیہ کی علمی سرپرستی کا جو باب ہے۔ وہ انہی کے قلم سے ہے جس میں اُستاد و شاگرد کی عبارت اس طرح مل گئی ہے، کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔ اس کے علاوہ عربی کے چھوٹے بچوں کے لئے دروس الادب کے نام سے عربی کی دو ریڈریں بھی لکھی تھیں جو اب تک بعض عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔ لیکن الانتقاد کے چند صفحوں اور ان عربی ریڈروں کے علاوہ ان کی بھی عربی تحریر و انشاء کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے یاد آتا ہے کہ مولانا عبدالرزاق کی فرمائش سے ان کے عربی رسالہ الجامعہ کے لئے عربی میں ایک دو اور بھی مضمون لکھے تھے۔ عربی پر اس درجہ قدرت رکھنے کے باوجود حیرت انگیز طور پر عربی میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اور ساری عمر اردو ہی میں لکھتے پڑھتے رہے۔ یہ امتیاز صرف مولانا عبدالرزاق ہی کو تھا۔ کہ مصر کی چند سالہ تعلیم اور وہاں کے قیام سے ان کا ذہن و دماغ بالکل عربی ہو گیا تھا۔ وہ اکثر عربی ہی میں سوچتے تھے۔ اور عربی ہی میں جب چاہتے تھے بے ساختہ لکھتے تھے، لیکن عدم مزاولت کی وجہ سے آخر میں ان کو بھی عربی لکھنے میں تکلف ہونے لگا تھا۔ مولانا ابوالکلام نے اپنا عربی ہفتہ وار اخبار الجامعہ کلکتہ سے نکالنا چاہا، اور اس کی ادارت کے لئے مولوی عبدالرزاق کو دعوت دی۔ تو انھوں نے ذکر آزاد میں خود لکھا ہے کہ اس ذمہ داری کے قبول کرنے میں مجھے بڑا تردد ہوا، لیکن جب مولانا ابوالکلام نے ہمت بندھائی تو میں تیار ہو گیا۔ اور دو چار اشاعتوں کے بعد میں رفتہ رفتہ اس پر پورے طور پر قادر ہو گیا، اور پھر بے تکلف لکھنے لگا۔

تقی الدین ہلالی مراکشی ایک عراقی ادیب تھے جن کا تقرر ایک زمانہ میں عربی ادب کی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہو گیا تھا۔ انھوں نے شروع شروع میں ہندوستان کے مشاہیر علم و فن سے ملاقاتیں کیں۔ تو ان پر پہلے یہی تاثر طاری ہوا کہ یہاں کے علماء عربی نہیں جانتے۔ گو بعد میں انکے اس خیال میں تبدیلی ہو گئی تھی، لیکن یہ بات سو فیصدی صحیح ہے۔ ہندوستان کے علماء عربی زبان و ادب اور علوم و فنون سے اس درجہ شغف رکھنے کے باوصف عربی لکھنے اور بولنے پر عام طور سے قدرت نہیں رکھتے۔ جو ہمارے نزدیک عربی دان علماء کے لئے ایک ننگ کی بات ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے ۱۴ سال تک مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حدیث کا درس دیا۔ جس کے مخاطب یقیناً زیادہ تر عرب ہی رہے ہونگے

لیکن ان کی عربی دانی کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے، انھوں نے کتابیں اور مضامین تو بہت کم لکھے، کہ اس کا ان کو غالباً فطری ذوق نہیں تھا لیکن احباب واعزا و تلامذہ اور مسترشدین، و وابستگان دامن کو خطوط اتنے زیادہ لکھے۔ کہ اب تک ان کے تین ضخیم مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا زیر ترتیب ہے، لیکن یہ تمامتر اُردو میں ہیں، ان میں چند خط عربی میں بھی ہیں، ان کی عربی کیسی ہے، اور عربی ادب میں ان کا کیا درجہ ہے۔ اس کا فیصلہ تو ارباب ذوق ہی کر سکتے ہیں، جمعیۃ العلمائے ہند کے صدارتی خطبات تک بجائے عربی کے وہ اردو میں لکھتے تھے، حالانکہ ان کو عربی میں ہونا چاہیئے تھا۔ کہ ان کے مخاطب ہندوستان کے عوام و خواص سے زیادہ علماء ہوتے تھے۔ پھر اگر وہ عربی میں لکھتے تو ان سے عربی ممالک کے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے، جن پر مغربی ممالک کے سیاسی، واقتصادی و معاشی استیلا و تغلب کے خلاف بھی ان میں اظہار خیال لازمی طور پر ہوتا تھا۔ جس سے ان کی علمی وادبی و سیاسی شہرت میں مزید اضافہ ہوتا، مگر نہ ان کو خود اس کا احساس ہوا، کہ ان کے مخاطب دراصل علماء ہیں، ان کو عربی میں لکھنا ہی چاہیئے، نہ اُن کے معتقدین اور متوسلین کو اس کا خیال پیدا ہوا، کہ ان کو عربی میں خطبات لکھنے پر آمادہ کرتے۔ یاد آتا ہے، کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جمعیۃ علمائے ہند کے ایک سالانہ اجلاس میں جو غالباً لاہور میں منعقد ہوا تھا، اپنا خطبۂ صدارت عربی میں پڑھا تھا۔

ابھی حال میں مولانا انورشاہ صاحب کی سوانح عمری شائع ہوئی ہے، جو درحقیقت ان کی وفات پر ملک کے مشاہیر اہل قلم کے نقوش و تاثرات اور مضامین کا مجموعہ ہے اس میں ایک مضمون مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا بھی ہے، جس میں انھوں نے نہایت شاندار الفاظ میں شاہ صاحب کے ایک خرق عادت کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے، کہ سید رشید رضا صاحب المنار ہندوستان آئے تھے، تو دیوبند بھی تشریف لے گئے تھے، ان کے خیر مقدم میں وہاں بہت شاندار جلسہ ہوا تھا جس میں مولانا شاہ انور صاحب نے عربی میں برجستہ بڑی فصیح و بلیغ تقریر کی تھی، جس کو سُن کر اور تو اور خود اس فاضل مصر و عرب پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اور اس غیر متوقع طلاقت لسانی پر بے اختیار اُن سے بغل گیر ہو گیا تھا، اور اپنی جوابی تقریر میں اپنے تاثرات کا خاص طور سے ذکر کیا۔ حالانکہ ایک خالص عربی و دینی درسگاہ میں جہاں دینی و عربی علوم و فنون پڑھائے جاتے ہوں، اور دن رات قال اللہ اور قال الرسول کا آوازہ بلند ہوتا ہو، کسی عرب مہمان کی خیر مقدمی تقریب میں عربی میں تقریر کرنا کوئی عجیب اور قابل فخر بات نہیں ہے، لیکن اس معمولی واقعہ کو بھی قابل فخر سمجھا گیا، اور مقرر کے فضائل و محاسن و مناقب کا ایک ضروری جزء قرار دیا گیا، قابل تعریف و قابل ذکر بات تو جب ہوتی، کہ کوئی یورپ نژاد مہمان دیوبند آیا ہوتا اور بغیر کسی مزاولت، ...... ، مدارست، اور ممارست کے اس کا اعزاز واجلال میں کوئی صاحب اس کی خاص ملکی زبان میں تقریر کرتے، اور اپنی درسگاہ کا تعارف کراتے، عربی ہی زبان اور عربی ہی علوم فنون جن لوگوں کا رات دن کا بچھونا ہوں، انھوں نے اگر کسی دن کسی عرب مہمان کی آمد میں چند جملے اور فقرے عربی میں، ساختہ بلبلے ساختہ بول دیئے، تو یہ کونسی فخر کی بات ہے کہ اس طرح کے فنکشن تو آئے دن انگریزی کی یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں میں ہوتے رہتے ہیں، اور تقریریں ہمیشہ انگریزی ہی میں کی جاتی ہیں، لیکن اس پر قطعاً فخر نہیں کیا جاتا، کہ ان اداروں کی تعلیم کا مقصد ہی انگریزی لکھنا، انگریزی پڑھنا اور انگریزی بولنا ہے، اگر اس کے متعلقین معلمین اور متعلمین انگریزی میں اظہار خیال اور اظہار مافی الضمیر نہیں کریں گے، تو آخر کس زبان میں کریں گے، اسی کی تقلید عربی و دینی جوامع اور مدارس میں بلا فخر ہونی چاہیئے اور ان کا پورا ماحول تعلیم کے اعتبار سے دینی اور عربی بنا دینا چاہیئے، تاکہ وہاں کوئی جائے، تو اس کو محسوس ہو کہ وہ ہندوستان کے کسی معہد علمی میں نہیں عرب و مصر و شام کے معہد علمی میں گھوم رہا ہے، جہاں ہر شخص پر دین کے ساتھ عربی زبان ہی غالب ہے۔

اس سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ اتفاق سے ہمارے ان مدارس میں کوئی ذرا عربی لکھنے لگا، تو فوراً اس کا مقابلہ و موازنہ

عرب وشام وحجاز ونجد کے ادبا، واہل قلم سے شروع ہو جاتا ہے، حالانکہ کسی عربی خوان کا یہ کوئی کمال نہیں ہے آنکا تو اپنے ماحول تعلیم اور نصاب کے اعتبار سے عربی ذریعہ اظہار خیال ہونا ہی چاہیئے۔ کس قدر عبرت کی بات ہے کہ انگریزی زبان کی ڈیڑھ سو سالہ تعلیم کا نتیجہ تو یہ ہوا، کہ ہندوستان کے بعض بعض خطوں مثلاً میسور، مدراس، اور کیرالا وغیرہ کی وہ ثانوی زبان ہو گئی۔ اور اس کو لکھنے اور بولنے والے کروڑوں پیدا ہو گئے، جس کے قائم وبرقرار رکھنے پر، ہندی کے ملک کی واحد سرکاری زبان بن جانے کے باوجود آج بھی سی راج گوپال آچاریہ جیسے بزرگوار محض مُصر ہی نہیں، اس کی حمایت میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن عربی زبان، جو عرب مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے اول ہی دن سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، اور جس کے لاتعداد مدارس اور دارالعلوم ملک کے اس سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے ہیں، اور جن میں، ہزاروں اور لاکھوں طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور سینکڑوں ہر سال ہر قسم کے دینی علوم سے فارغ ہو کر نکلتے رہتے ہیں۔ کسی خطہ کی ثانوی زبان تو بڑی بات ہے، دو چار دس، لکھنے والے بھی نہیں پیدا ہوتے۔ آخر ہندوستان وپاکستان نے لاتعداد عربی مدارس اور خصوصاً ہندوستان کے دیوبند، ندوہ اور سہارنپور کی عربی درسگاہوں کا حاصل کیا ہے۔ ندوہ تو غالبا ہندوستان کے علماء میں اس طرح کا ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لئے قائم ہی ہوا تھا اور نصاب اس طرح کا رکھا گیا تھا، کہ وہاں کے طلبہ قدیم عربی ادب کے ساتھ جدید عربی ادب سے بھی اچھی طرح واقف ہو جائیں، اور اس میں سارے ہندوستان میں ممتاز ہوں، لیکن بتایا جائے، اور اس معیار کے کتنے لڑکے پیدا ہوتے ہیں، کیا ان کا ذہن اور دماغ، اور سوچنے کا انداز عربی ہو جاتا ہے، یہ جو چند دنوں سے یک ورقہ اور دو ورقہ عربی اسبوعیے ندوہ اور دیوبند سے نکلنے شروع ہوتے ہیں، وہ بھی ان مدارس کے لئے کوئی فخر کی چیز نہیں ہیں، کہ... ان کے مقابلہ میں انگریزی کالجوں سے بڑے بڑے ضخیم میگزین انگریزی میں نکلتے ہیں، جن میں بڑے تحقیقی اور قابل قدر مضامین ہوتے ہیں۔

یہ سمجھ میں نہیں آتا، کہ آخر عربی پڑھائی کیوں جاتی ہے۔ اگر اس میں لکھنے اور بولنے کا سلیقہ پیدا نہیں ہوتا، اگر اس خیال سے پڑھائی جاتی ہے، کہ ہمارے سامنے دینی علوم فقہ وحدیث وکلام وعقائد وتصوف واخلاق، وغیرہ اسی میں ہیں تو اب تو سارا دفتر اردو میں منتقل ہو گیا ہے۔ اگر محض دینی تعلیم مقصود ہے، تو پھر دین کی تعلیم اردو ہی میں کیوں نہ دی جائے۔ اس طرح سے غیر زبان میں تعلیم دینے کے مقابلہ میں طلبہ کے ذہن پر وہ بار بھی نہ ہوگی، اور وہ دین کا اردو نصاب پڑھ کر لیے ہی انشاء اللہ عالم ہو جائیں گے جیسے کہ آجکل عربی کے پڑھے ہوئے عالم ہوتے ہیں۔

ہماری سنجیدگی سے رائے ہے، کہ یا تو عربی میں سارے دینی وعقلی علوم کی تعلیم ختم کر دی جائے، یا اگر دی جائے، تو خدارا اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے، اور تمام عربی مدرسوں کا ماحول یکسر علمی و دینی وعربی بنا دیا جائے، تاکہ ان کو دیکھ کر قرطبہ و بغداد

[1] مگر مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید محمد ناظم ندوی اور جناب محمد کاظم سباق، کی عربی انشاپردازی کا انداز عربی ادیبوں ہی جیسا ہے، اور نہ صرف انداز، بلکہ زبان وادب کے اعتبار سے بھی، وہ عربوں کے ہم پایہ ہیں! (م - ق)

[2] عربی مدرسے بھی تو انگریزی کالجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ انگریزی درسگاہوں کو جو سہولتیں حاصل ہیں، وہ سہولتیں بیچارے عربی مدرسوں کو کہاں میسر ہیں! یہی وجہ ہے کہ ان مدرسوں اور اداروں کے عربی جرائد، انگریزی کالجوں کے میگزینوں کی برابری نہیں کر سکتے۔

(م - ق)

اور نیشاپور کی یونیورسٹیوں کی یاد تازہ ہو جائے ۔

دکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

کچھ اس قسم کا خیال "عورت اور اسلام" کے مشہور مصنف اور غالبیات کے ماہر خصوصی جناب مالک رام ایم اے نے بھی اپنے ایک مراسلہ میں ظاہر کیا ہے، جو انھوں نے ناظرین صدق جدید میں سے ایک صاحب کے جواب میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کو لکھا ہے اور وہ صدق جدید کی ۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ عربی زبان کا ام الالسنہ ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب ہی کے لئے نہیں، جو ان کے مخاطب اول تھے، بلکہ سارے عالم کے لئے مبعوث ہوئے تھے، دنیا کی تمام زبانیں جو اپنا ادب اور لٹریچر رکھتی ہیں۔ اسی زبان سے نکلی ہیں۔ جب یہ ثابت ہے، تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس دعوے کو قرآن کی حد تک صحیح کر دکھائیں، کہ حضورؐ اور قرآن کی مخاطب ساری دنیا ہے جس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں کئے جائیں، دوسری یہ کہ قرآن کی زبان کی تعلیم وتبلیغ و ترویج اتنی وسیع اور ہمہ گیر ہو کہ اگر یہ جملہ ممالک کی عام بول چال کی زبان نہیں تو کم سے کم علم کی حد تک۔ تمام ممالک کی زبان بن جائے۔

میں اپنے ان معروضات کے ذریعہ مسلمانوں میں یہی احساس پیدا کرنا چاہتا ہوں، لیکن ہندوستان میں اب تک عربی کی تعلیم کا جو طریقہ رہا ہے، اس سے تو یہ ممکن نہیں ہے، مسلمانوں کو جیسا کہ میں نے ابھی اوپر لکھا ہے، انگریزی کی تعلیم سے سبق لینا چاہیے کہ ڈیڑھ دو صدی کے اندر اس نے نہ صرف زبان بدل دی، بلکہ ہندوستانیوں کے دل و دماغ تک کو بدل دیا، انگریزی میں لکھنے والوں کی تعداد اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں تک ضرور پہنچ گئی ہے، اور ان کے سایۂ قلم میں ہر علم وفن سے متعلق اچھی سے اچھی کتابیں چھپتی اور شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن عربی زبان کتنے لوگ لکھتے ہیں، اور عربی میں کتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ عربی مسلمانوں کی دینی زبان ہی نہیں بلکہ ملی اور بین الاقوامی زبان بھی ہے، وہ نہ صرف ایشیا کے عرب ممالک میں بولی جاتی ہے بلکہ براعظم افریقہ کے بڑے حصہ کی سرکاری اور عام بول چال کی زبان ہے اور پھر اپنے لغات، الفاظ، مترادفات، اضداد، محاورات، اور مشتقات وغیرہ کے لحاظ سے دنیا کی دولت مند ترین زبانوں میں اس کا شمار ہے۔ اس لئے اس کو بھی اسی طرح حاصل کرنا چاہیے، اور اس میں کمال بہم پہنچانا چاہیے جس طرح ہم یورپ کی زبانوں کو پڑھتے اور ان میں کمال بہم پہنچاتے ہیں، وہ ہماری نہ صرف دینی و مذہبی زبان ہو بلکہ ہماری علمی وادبی بلکہ عام بول چال کی زبان بھی بن جائے، اور عربی پڑھنے والے لڑکے عربی اس طرح بولیں اور لکھیں کہ گویا ان کی مادری زبان ہے، اور پھر عربی زبان، عربی ماحول اور عربی تہذیب وتمدن سے قریب تر ہونا ہمارے لئے باعث سعادت بھی ہے۔

ہمارا خدانخواستہ یہ منشا نہیں ہے کہ اگر آپ عربی پڑھ رہے ہیں، تو آپ اپنی زبان خواہ وہ کوئی بھی ہو، بالکل چھوڑ دیں، اور اس کے ادب وشاعری میں حصہ نہ لیں، اگر اس میں آپ بے بہرہ رہے، تو یہ اس سے بھی بڑھ کر بدقسمتی کی بات ہوگی اسلام کی جہاں اور بہت سی برکتیں اور نوازشیں ہیں۔ جن کا احصا نہیں کیا جا سکتا، ایک بڑی برکت یہ ہے کہ جس قوم میں جس قسم کی قابلیت ہوتی ہے، وہ اس کو اور چمکا دیتا ہے، مولانا شبلی نے اس کو خوب لکھا ہے۔ آپ انہی کے الفاظ میں سنیئے :۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا، اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا، ترک شجاع تھے شجاع تر ہو گئے ایرانی ہمیشہ سے تہذیب ومعاشرت اور علوم وفنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا" ذہن ہندی بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اسلام کا ابر کرم اس میں بھی اپنے چھینٹوں سے جلا پیدا کر سکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ استعداد بھی ہو اور اس کے ساتھ طلب صادق

ہی ہو، پھر دیکھئے کیا کچھ نہیں ہو جاتا ۔

اس سے خدانخواستہ یہ نہ سمجھا جائے، کہ ان سطور کا لکھنے والا عربی کا کوئی بہت بڑا فاضل اور عربی زبان کا کوئی تیز وطرار مقرر ہے اس کو بد قسمتی سے اس ام الالسنہ سے اب کوئی مس ہی نہیں ہے۔ لیکن اس نے اپنے درد دل سے مجبور ہو کر جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے پورے ہونے کی تمنا ضرور رکھتا ہے، جو عرض کیا گیا ہے۔ صرف اسی پر غور کیجئے ۔ یہ نہ دیکھئے کہ اس کا عرض کرنے والا خود کیا ہے اور کس حیثیت اور قابلیت کا مالک ہے، عربی کا ایک مقولہ بھی ہے ۔

—انظر الی ما قال، ولا تنظر الی من قال—

×

وحیدہ نسیم

تثلیث کے سائے

(کانونٹ اسکولوں کے نام جو نئی نسلوں کا گہوارہ ہیں)

مبارک ہو کلیسا پر نئی نسلوں کی قربانی
مبارک دشمنِ دیں تجھ کو کعبے کی نگہبانی

تری آواز گویا موت ہے روح بلالی کی
تری آغوش میں مُردہ ہے تلقین غزالی کی

لٹا کر دولت، فکر و نظر مغرب کی راہوں میں
اب اپنا دین لائے ہیں تری قربان گاہوں میں

بنام زیور تعلیم خود پہنی ہیں زنجیریں
بدلتی جا رہی ہیں ذہن میں قرآں کی تفسیریں

ترے شعلوں پہ لا کر اپنی شاخ آشیاں رکھ دی
ترے قدموں پہ ہم نے کاٹ کر اپنی زباں رکھ دی

ترے دار و رسن ہم اب بھی سینے سے لگاتے ہیں
صلیبوں پر تری لخت جگر اپنے چڑھاتے ہیں

کتابوں نے تری چھینی ہے یوں آنکھوں کی بینائی
کہ اب ہے دشمن جاں تجھ سے اُمید مسیحائی

بجھائی جا رہی ہے آتشِ توحید سینوں میں
بٹھائی جا رہی ہے قوم کاغذ کے سفینوں میں

لگی ہے آگ اور خاموش ہیں سارے تماشائی!
نہ جانے زلفِ ملت ہم نے سلجھائی کہ اُلجھائی!

روحِ انتخاب

مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے

چند اقتباسات

شریعت ہی تمام سعادتِ دارین کی کفیل ہے۔ ایک مسلمان کو حصولِ مقصد کے لئے شریعت کے علاوہ کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔
جو لوگ اپنی غلط فہمی کی بنا پر احوال و مواجید یا کشف و کرامات کو مقصود سمجھتے ہیں وہ کمالاتِ شریعت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اگر نفس کی ماہیت بدل جائے، تو پھر انسان فرشتہ ہو جائے گا۔ اور اس کی ترقی رُک جائے گی، کیوں کہ روحانی ترقی تو نفس کی مخالفت پر موقوف ہے۔

قیامت کے دن مسلمانوں سے شریعت ہی کے متعلق سوال کیا جائے گا نہ کہ تصوف کے متعلق۔ جنت میں داخلہ اور دوزخ سے رہائی اتباعِ شریعت ہی پر موقوف ہے۔

نفس اَمّارہ حُبِّ جاہ و ریاست پر پیدا کیا گیا ہے یعنی جاہ و منزلت کی محبت اس کی ذات میں داخل ہے۔ اس کی توجہ ہر وقت اس بات کی طرف رہتی ہے کہ اُسے دوسروں پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جائے۔ اور وہ خود کسی کا مطیع اور محتاج نہ ہو۔ غور سے دیکھو تو یہ آرزو نفس کی طرف سے ایک قسم کا دعویٰ الوہیت (خدائی کا دعویٰ) ہے۔

شیطان انسان کو "کرم پروردگار" کا دھوکا دے کر (یعنی اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے بخش دیگا) مُداہنت (منافقت) کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور عفو کو بہانہ بنا کر گناہوں کا ارتکاب کراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جس نے رسول ؐ کی اطاعت کی اُس نے بے شک اللہ ہی کی اطاعت کی) اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول ؐ کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ یعنی جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا وہ اللہ کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ اس بات کو مؤکد کرنے کے لئے کلمۂ "قد" لایا گیا تاکہ کوئی (بوالہوس) ان دونوں اطاعتوں میں فرق نہ کر سکے۔

جب تک عقائد درست نہ ہوں احکامِ شریعت کا علم کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور جب تک عقیدہ اور علم دونوں جمع نہ ہوں عمل نفع نہیں دے سکتا، اور جب تک یہ تینوں جمع نہ ہوں اس وقت تک تزکیۂ نفس نہیں ہو سکتا۔ چار ارکان (عقیدہ، علم، عمل اور تزکیہ) ضروریاتِ دین سے ہیں۔

سعادتِ ابدی اور نجاتِ دائمی انبیائے کرام کی متابعت پر موقوف ہے۔ اگر کوئی شخص ہزار سال تک عبادت کرے لیکن وہ عبادت اگر انبیاء کے طریقے کے مطابق نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ــــــــ اگر عقل بشری معرفتِ صانع کے لئے کافی ہوتی تو یونان کے فلاسفر سب سے زیادہ عارف باللہ ہوتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت میں یہی لوگ سب سے زیادہ جاہل ہیں۔

(باقی ... پر ملاحظہ ...)

ہماری نظر میں!

رُوحِ قرآن (حصہ سوم) از:- عبداللہ یٰسین حسنی ۲۶۸ صفحات (بڑا سائز) قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ:- آستانہ، ویسٹ ماڈل کالونی، کراچی ۲۷

اسلام کے حقیقی تقاضے کیا ہیں، بلکہ اصل اسلام کیا ہے؟ اس کتاب میں قرآنی آیات کی روشنی میں اس کا جواب دیا گیا ہے، قرآن کریم کی سیکڑوں آیتوں کا ترجمہ و تفسیر اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے، انداز تحریر دل نشین ہے، شرک و بدعت کی جگہ جگہ پر زور تردید کی گئی ہے، لکھنے والے کا دینی خلوص اور اُمتِ مسلمہ کے فلاح و بہبود کا جذبہ ایک ایک سطر سے نمایاں ہے!

فاضل مصنف کوئی شک نہیں دینی فکر رکھتے ہیں مگر یورپ کی سائنسی ترقیوں کا ذکر انھوں نے جس ذوق و شوق سے کیا ہے وہ کھٹکتا ہے۔

باطنیوں نے جس طرح ہجری سنین و شہور کی مستقل تقویم (کیلنڈر) تیار کر دی ہے اور رویتِ ہلال کو نظر انداز کر کے اسی تقویم پر عمل کرتے ہیں، جناب عبداللہ یٰسین حسنی نے بھی اپنی کتاب میں اس خیال کا اظہار کیا ہے جس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔

رسولؐ اور سُنّتِ رسولؐ از:- نعیم صدیقی، ضخامت ۲۷۰ صفحات، قیمت:- اعلیٰ مجلد چار روپے چار آنے
عام قسم، مجلد تین روپے چار آنے ملنے کا پتہ: مکتبہ تعمیرِ انسانیت موچی دروازہ، لاہور!

وہ جو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

تو یہ کتاب اس مصرعہ کی ایمان افروز تشریح و تفصیل ہے، مندرجہ ذیل عنوانات سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

الرسولؐ کا منصب ـــــ تبیین کتاب کی وسیع ذمہ داری ـــــ رسالت کی مزید اہم ذمہ داریاں ـــ

رسولؐ ایک مستقل اتھارٹی اور سند ـــــ حقوقِ رسالت سے استشہاد ـــ سُنّتِ رسولؐ کا انسٹی ٹیوشن!

جناب نعیم صدیقی کے قلم کی شگفتگی، اندازِ بیان کی دل آویزی اور استدلال کا زور اس کتاب میں پوری طرح نمایاں ہے، درایت و روایت اور عقل و نقل ہر اعتبار سے یہ کتاب کامیاب ہے، مُدلّل ہے اور دل و دماغ کو اطمینان دلاتی ہے کہ اطاعتِ رسول کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ممکن ہے!

"من یطع الرسول فقد أطاع اللّٰہ"

یہ آیت اس کتاب کا محور، مرکز اور موضوع ہے! جناب نعیم صدیقی کو اللہ تعالیٰ دارین میں اجرِ جزیل عطا فرمائے کہ انھوں نے مثبت انداز میں فتنۂ انکارِ سُنّت کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیے ہیں اور اس ملحدانہ فکر کو پوری طرح عُریاں اور بے نقاب کر دیا ہے!

"رسولؐ اور سُنّتِ رسولؐ" ـــــ زبانؔ، اسلوبِ نگارش اور اظہار و بیان کے اعتبار سے بھی اونچے درجہ کی کتاب ہے!

ملاء اگرچہ اُس نے زنا کی ہو" (صفحہ ۵۲) میں "زنا" بالاتفاق مذکر ہے ـــــ صفحہ ۱۲۵ پر "ناتا" کو "ناطہ" لکھا گیا ہے (م۔ق)

مکتبۂ تعمیر انسانیت نے اس کتاب کو چھاپ کر دین و اخلاق کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

اعجازِ نطق از :- ابوسعید حیرت جلال پوری ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے پچاس پیسے،
ملنے کا پتہ :- تعمیری کتب خانہ، اردو بازار راولپنڈی۔

تعلیمی بورڈ کے سالانہ تقریری مقابلوں کے لئے جو تقریریں جناب ابوسعید حیرت جلال پوری نے طلباء کو لکھ کر دی تھیں، یہ کتاب انہی تقریروں کا مجموعہ ہے، ان تقریروں پر طلباء کو انعامات ملے، اور خاص و عام نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

اس کتاب کے تعارف نگار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب ایڈوکیٹ نے فاضل مصنف کی ادبی اخلاقی اور اصلاحی کوششوں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے :-

"اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے اس میں اگر کوئی خامی نظر آئی ہے، تو وہ اس قدر ہے کہ مرتب شدہ تقریروں میں نوجوان بلکہ کم عمر طلباء کی زبان سے جن خیالات کا اظہار کرایا گیا ہے، وہ اُن کی عمر اور ذہنی استعداد سے بدرجہا زیادہ بلند اور پختہ ہیں، اور پھر تقریروں کی زبان اتنی فصیح اور فصیح و بلیغ ہے کہ سننے والوں کے ذہن لامحالہ بولنے والے طالب علم سے ہٹ کر ایک استادِ کامل کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں ——— میرے خیال میں اگر ان تقریروں کی زبان ثانوی درجہ کے طلباء کی ذہنی سطح اور علمی استعداد کے مطابق سہل سلیس اور عام فہم ہوتی تو بہتر ہوتا۔"

اس کتاب میں لائق مصنف نے "فنِ خطابت" پر جو مقالہ شامل کیا ہے، اُس نے اُن کی تصنیف کی قدر و قیمت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے، نو آموز مقرروں کے لئے کتاب کا یہ باب ہر اعتبار سے مفید اور کارآمد ہے ——— "مقدمہ خطابت" میں پاک و ہند کے جن مشہور و مقبول مقررین کے نام درج کئے گئے ہیں، اُن میں مولانا شوکت علی کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی، مولانا شوکت علی کوئی شک نہیں نامور لیڈر تھے مگر اچھے مقرر نہ تھے! خطابت و تقریر کے ناموروں کی فہرست میں مولانا آزاد سبحانی اور شیعوں کے عالم مولانا سبطِ حسن کا نام ضرور آنا چاہئیے تھا!

"اُن کی آراء اور نکتہ ہائے نظر" (ص۳۲) "نقطہ ہائے نظر لکھنا تھا، جو "Point of View" کا صحیح ترجمہ ہے ——— "اور نہ ہی" . . . یہ "نہ" کے ساتھ "ہی" لکھنے کا جو بُرا رواج پڑ گیا ہے، اس کو مٹانے کی ضرورت ہے ——— "اور آج کل کئی لفظ متروک الاستعمال ہو چکے ہیں، اور کئی الفاظ تمدنی ترقی اور تبدیلی کی بنا پر زبان میں نئے داخل ہو چکے ہیں"۔ (ص۴۹) ایسے موقعوں پر "کئی" نہیں "بعض" لکھنا اور بولنا چاہئیے ——— "بس کیا تھا کہ چشم زدن میں . . ." (ص۵۱) "چشم زدن" میں "م" پر اضافت کاتب کی کارستانی معلوم ہوتی ہے "زدنِ چشم" کو اضافتِ مقلوب کے قاعدہ سے "چشم زدن" بنایا گیا ہے ———
"حضرت عثمان غنی رات کو خود اُٹھ کر وضو کا تہیہ کیا کرتے تھے" (ص۶۸) "خود" کا استعمال اس جملہ میں ٹھیک نہیں ہوا، پھر "تہیہ" بھی زائد ہی ہے اور اردو جاننے والوں کو تشویش میں ڈالنے والا۔ یہ مفہوم یوں ادا ہونا چاہئیے تھا۔

حضرت عثمان غنی تہجد کی نماز کے لئے رات کو اٹھتے تو وضو کے اہتمام کے لئے کسی خدمت گار کو نہ جگاتے . . ."

"بالاتر بلندیوں اور وسعتوں میں" (۱۴۸) "بلندیوں" کے ساتھ "بالاتر" "شب لیلۃ القدر کی رات" والی ترکیب ہے "میں اپنے موضوع کی آخری شق یعنی ذرائع نشر و اشاعت پر کچھ عرض کر کے اپنی گزارشات کو ختم کرتا ہوں (ص۱۵۱) یہ جملہ

ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے۔

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا — ہوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

یہ رُباعی نہیں قطعہ ہے لیکن صفحہ ۱۶۵ پر اس قطعہ کو رُباعی کہا گیا ہے! یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال نے بعض قدیم ایرانی شعراء کے اتباع میں قطعہ کو رُباعی کہا ہے مگر صحیح تر یہی ہے کہ اس قسم کے چار مصرعے، جو رُباعی کے اوزان پر ہوتے ہیں، اُن کو رُباعی ہی کہنا چاہیے
"خوابِ خرگوش میں محوِ استراحت تھا" (صفحہ ۲۰۴) "خوابِ خرگوش" میں "محوِ استراحت ہونا" زبان و محاورہ کے اعتبار سے محلِ غور ہے ——— "مگر اتاترک مصطفےٰ کمال نے اپنے تدبر اور قوتِ عمل کا ثبوت دیتے ہوئے قوم کو بیدار کیا۔۔۔" (صفحہ ۲۱۲) مصطفےٰ کمال پاشا کے ہاتھوں ترکی میں اسلام کی جو گت بنی ہے وہ مدح کی نہیں قدح کی مستحق ہے ——— طلباء کے ناموں کے ساتھ "مسٹر" بھی کھٹکا۔

"اعجازِ نطق" مجموعی طور پر قابلِ تعریف ہے اس کے مطالعہ سے دین داخلاق کے احساسات بیدار ہوتے ہیں، تقریروں میں بڑی روانی اور جوش و ولولہ پایا جاتا ہے

انوارِ مجددی

از :۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ضخامت ۳۸۴ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ :۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور۔

پروفیسر سلیم چشتی کلامِ اقبال کے مشہور شارح ہیں، صاحبِ موصوف علمِ کلام اور تصوف میں عالمانہ بصیرت رکھتے ہیں، اُن کی ساری زندگی "طلبِ علم" میں بسر ہوئی ہے! "انوارِ مجددی" میں انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے منتخب اور چیدہ چیدہ مکتوبات کا سلیس و شگفتہ ترجمہ کیا ہے!

کتاب کے شروع میں حضرت مجدد صاحب کے مختصر سوانحِ حیات ہیں۔ اس سلسلہ میں پروفیسر سلیم چشتی لکھتے ہیں :۔

> "اگرچہ دفترِ اول کے بعض مکتوبات میں حضرت اقدس نے وحدۃ الوجود کی تردید فرمائی ہے، مگر دفترِ سوم کے اکثر و بیشتر مکتوبات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ آخر عمر میں آپ اس مسئلہ میں شیخ اکبر سے متفق ہو گئے تھے اور محض تعبیر کا فرق رہ گیا تھا ——— شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ کائنات تجلی اسماء و صفات ہے، شیخ مجدد فرماتے ہیں کہ کائنات ظلِ اسماء و صفات ہے، وحدۃ الوجود کے اصول و مبادی میں دونوں متفق اللسان ہیں۔۔۔" (صفحہ ۲۷، ۲۸)

"وحدت الوجود" کی بات صحیح بھی ہو تو بھی اس میں خلجانات اور مزلّات کا بہت کچھ احتمال ہے، اور خالق و مخلوقات کے بارے میں سوچنے کا یہ پیچیدہ انداز کتاب و سُنت اور آثارِ صحابہ کی زبان و بیان کی سادگی کے مقابلے میں اجنبی اور عجیب سا لگتا ہے! اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ خلجانات و مزلّات میں پڑنے سے اجتناب کیا جائے! قیامت میں کسی انسان سے یہ ہرگز نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے کائنات کو اسماء و صفات کی تجلی سمجھا تھا یا ظل! حضرت شیخ اکبر جیسے ذہین اور باریک بین لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں، مگر انھوں نے اپنی ذہانت، بصیرت اور قابلیت جن نازک و دقیق مسائل میں صرف کی ہے، اُن مسائل کے جاننے کے نہ وہ مکلف تھے اور نہ اُمت پر اللہ اور رسول نے یہ ذمہ داری ڈالی ہے! شیخ اکبر کے بیش کئے ہوئے ادب میں یُسر کی جگہ شدید عُسرت، دقت اور غموض پایا جاتا ہے! وہ محدث اور فقیہ جس نے کتاب و سنت کی روشنی میں صرف وضو کے مسائل اور آداب بتلائے

یا اُس کی تنہا یہ سعی وحدت الوجود کے پورے ادب پر بھاری اور اللہ اور رسول ؐ کے نزدیک مقبول و مشکور ہے۔

"مکتوب یازدہم دفتر اول میں آپ نے اپنے عروج روحانی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا اس پر بعض علما اور صوفیا نے اعتراضات کئے۔" (ص۱۱۵)

تصوف ہی کا اثر تھا کہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی جیسے عالم حق کی زبان سے بعض ایسی باتیں نکل گئیں جن پر علما تو علما بعض ارباب صرف تک کو لب کشائی کا موقع ملا۔ صحابہ کرام سے بڑھ کر اور کس کو روحانی عروج نصیب ہو سکتا ہے مگر وہ کوئی دعویٰ نہیں تے اور سیر الی اللہ کے رموز اور غموض اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔

صفحہ ۲۴۷ پر اجتہادی احکام کے سلسلہ میں جو بات مجدد صاحب کے قلم سے نکل گئی ہے اس حصہ کو ترجمہ میں حذف کر دینا چاہئے یا بعض اوقات کسی صحیح واقعہ کی توضیح بھی باعث ضرر اور موجب نقصان بن جاتی ہے۔

جو باتیں کھٹکیں انہیں ظاہر کر دیا گیا، مجموعی طور پر یہ مکتوبات ایمان و یقین اور اخلاق و احسان کے سرمایہ گراں قدر ہیں ان کے مطالعہ سے تعلق مع اللہ میں رسوخ و استحکام پیدا ہوتا ہے۔

ابوجہل اور عکرمہؓ

از:۔ رازق الخیری، ضخامت ۲۴۸ صفحات، قیمت: تین روپے آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ:۔ عصمت بک ڈپو کراچی ۳

جناب رازق الخیری کا قلم تقریباً چالیس سال سے ادب و اخلاق کی خدمت انجام دے رہا ہے، ادب و انشا کی فضا میں اُن کی نشو و نما ہوئی ہے اور مولانا راشد الخیری جیسے مایہ ناز ادیب و مصنف باپ کی تربیت کا انہیں موقعہ میسر آیا ہے، موصوف کی متعدد کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں!

اس کتاب میں جناب رازق الخیری نے ابوجہل اور اس کے بیٹے عکرمہؓ کے حالات اردو کی مستند کتابوں سے اخذ کر کے جمع کئے ہیں، اپنا اپنا مقدر اور اپنی اپنی یافت ہے کہ ابوجہل کافر رہا اور کافر ہی مرا۔ مگر اس کے بیٹے عکرمہؓ کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور پوری امت انہیں حضرت اور رضی اللہ عنہ کے لقب کے ساتھ یاد کرتی ہے۔

اس کتاب میں ابوجہل اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے سوانح حیات کے ضمن میں دور نبوت اور عہد خلافت کے بہت سے تاریخی واقعات بھی آ گئے ہیں، مصنف کا قلم رواں اور شگفتہ ہے، کتاب کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

"ہندوستان میں شودروں کے ساتھ برہمنوں کا سلوک انتہائی سفاکانہ اور بہیمانہ تھا، برہمنوں پر ان کا سایہ پڑنا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا یا اُس کی سزا اس طرح ملتی تھی کہ سیسہ پگھلا کر اُن کے کانوں میں ڈالا جاتا تھا (ص۹) کوئی شودر وید کا کوئی اشلوک سن لے، تو یہ سزا اس جرم کے صلہ میں دی جاتی تھی ـــــــ حضرت سعد بن وقاص، حضرت علی، حضرت ابودجانہ، حضرت زبیر بن العوام، اور حضرت ابوطلحہ نے نہیں، مسلمان عورتوں نے بھی اس نازک موقعہ پر اپنے رسول پاکؐ کو کفار کے حملوں سے بچانے کے لئے پوٹ ٹیک دیا۔ (ص۱۰۰) پوٹ ٹیکنا" اُردو روزمرہ ہے مگر جن نفوس قدسیہ کا یہاں ذکر ہے، اُن کے لئے اس محاورہ کا استعمال نامناسب ہے، دوسرے ایڈیشن میں اس جملہ کو بدل دینا چاہئے۔

"اُن میں نسلاً بن نسلاً رقابت چلی آ رہی تھی۔ (ص۱۴۳) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ" بعد کی جگہ "بن" چھپ گیا، مگر اس صورت میں" بعد نسل" لکھا جانا چاہئے تھا ـــــــ حیرت ہے کہ رازق الخیری صاحب بھی" غیظ" کو" غیض" (ص۱۱۰ تا غیض و غضب) لکھتے ہیں ـــــــ اس صفحہ پر" عبداللہ بن قمیہ" کو" عبداللہ بن قیمہ" لکھا گیا ہے!

معیارِ ادب

از:۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت:۔ چار روپے پچاس پیسے (مجلد، خوب صورت رنگین گرد پوش کے ساتھ)

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ اسلوب، ۵۲/۳ مسلم لیگ کوارٹرز، ناظم آباد، کراچی۔

یہ کتاب جناب ڈاکٹر شوکت سبزواری کے چودہ (۱۴) مقالات کا مجموعہ ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف زبان و ادب اور شعر و تنقید میں قابلِ اعتماد نگاہ و بصیرت رکھتے ہیں، اظہارِ خیال میں بھی اُن کے قلم کو کمال درجہ کی پختگی حاصل ہے! اس کتاب کا ہر مقالہ بلند پایہ، جان دار اور معلومات آفریں ہے ——— چند اقتباسات:۔

"زندگی طرب گاہِ خسروی نہیں، کوہِ بے ستون ہے ——— یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ مارکس کے نزدیک تاریخ کا رُخ متعین کرنیوالا عنصر معاشیات ہے، اس کے رفیق اینگلز نے اپنے ایک خط میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے "سیاست، قانون، فلسفیانہ نظریات مذہبی خیالات بھی تاریخی مسابقات پر اثر ڈالتے ہیں۔۔۔"

"سب سے بڑی دقت میرے خیال میں نئے نقادوں کی قدیم عناصر سے بے خبری ہے، وہ بچوں کی طرح نئی چیز کو دیکھ کر مچل جاتے ہیں۔۔۔ "شعر کا تعلق دل سے ہے اور نقد کا دماغ سے، دل تجربات اور جذبات کی عمل گاہ ہے اور دماغ دریافت و ادراک کی، دل کی دنیا میں جو تجربے کئے جاتے ہیں، جذبات کا تانا بانا تیار کیا جاتا ہے، دماغ کے معمل میں ان کو کھول کر اور تار و پود دیکھ کر اُن کی حقیقت دریافت کی جاتی ہے اور ترکیب کے اصول و قوانین معلوم کئے جاتے ہیں، شعر اور اس کی تنقید میں بس اتنا ہی فرق ہے۔"

بعض خیالات تاریک و باریک ہوتے ہیں، جب تک کسی محسوس چیز سے تشبیہ دے کر اُن کی وضاحت نہ کی جائے سُننے والے کے ذہن میں کوئی روشن تصویر نہیں آتی ——— اخلاقی اصول اور اخلاقی قدریں وہ پابندیاں ہیں جو حیات کو اس کے ارتقائی سفر میں بے راہ روی سے باز رکھتی ہیں۔ پانی بھی آزادی کے ساتھ بہتا ہے اگر باغ میں جدولیں بنا کر اُن کو محصور نہ کر دیا جائے تو یقین ہے کہ اطراف و جوانب میں بے نظمی کے ساتھ پھیل کر خشک ہو جائے۔ فنی جمال قید و بند کا محتاج ہے۔ اس کے لئے بھی کانٹ چھانٹ، کتر بیونت کی ضرورت ہے۔ سبزہ جو بے ترتیبی کے ساتھ بڑھ جاتا ہے بدنما ہو جاتا ہے باغبان اپنے تنقیدی عمل سے اسے کتر کر اور کانٹ چھانٹ کر خوب بنا دیتا ہے۔ باغبان کا یہ عمل نخل بندی بھی فنکار کے عملِ حُسن کاری سے کسی طرح بھی کمتر نہیں ہے۔

"اگر اخلاقی قدریں مستقل اور متعین نہ ہوں تو ادب تنقیدِ حیات جیسا نازک فرض انجام نہ دے سکے" ——— انگریزی ادب میں سبھی کچھ تقلید کے لائق نہیں، ہمارے لکھنے والوں نے جو انگریزی ادب سے مرعوب ہیں کچھ ایسے بیان کے پیرایے بھی انگریزی ادب سے لے لئے ہیں، جنہیں خود انگریزی نقادوں نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، مثلاً آہ کے ساتھ ان صفات کا ذکر کرنا، جو درحقیقت ان میں پائی نہیں جاتیں جیسے گاتی ہوئی راہیں اور ہنستے ہوئے خواب، بقول ایک نقاد کے یہ بے جان استعارے ہیں ——— "شاعر اصولوں سے واقف نہیں ہوتا، وہ اصول بناتا ہے، وہ اپنی فطرت سے شعر کہتا ہے، وہ آرٹ کی تخلیق کرتا ہے، اصول اس کے فن پارے کو سامنے رکھ کر وضع کئے جاتے ہیں۔ شاعر نقاد نہیں صناع ہے۔"

"ہم مارکس کے "کیپٹل" کو انسانیت کی انجیل نہیں مانتے، ہمارے خیال میں اسلامی جمہوریت، نظامِ اخلاق اور افعالِ انسانی مساوات کے اصول صحیح معنیٰ میں ترقی کے اصول ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے کہ (امیر و غریب کے فرق کے بغیر) پوری انسانیت کو آگے بڑھا سکیں "اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان کو چاہیے وہ اجتہاد سے کام لے، ان منازل کو دریافت کرے، جوان شعبوں نے خیالات کے ساتھ طے کی ہیں، اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مناسب ترمیم و تنسیخ اور اضافے کرے، یہ قلبِ آگاہ ہے جو قندیل کی طرح باطنِ انسان کو روشن کرتا ہے اس روشنی میں انسان کے سامنے مستقبل کی سب راہیں آئینہ ہو جاتی ہیں اقبال کا یہ قول۔ جز بہ قلبِ خویش قندیلے مجو — صحیح اور سچی تعبیر ہے حضور اکرمؐ کے اس ارشاد مبارک کی — "استفتِ قلبک —" (اپنے قلب سے فتویٰ طلب کر) اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنکھ اور کان کے ساتھ ہی قلب سے بھی قیامت کے روز سوال کیا جائے گا، مسلمان کی شان ہے :-

کیشِ ما، مانندِ موجِ تیز گام

اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

" زندگی کی تضاد کاری کی جھلک ادب میں بھی نظر آتی ہے" (ص۶) "تضاد کاری" کے مقابلہ میں "تضاد آرائی" یا "تضاد آفرینی" زیادہ حسین و موزوں اور مانوس ترکیب ہے — صفحہ ۱۳ پر سرسید، مولوی چراغ علی، نذیر احمد اور مولانا حالی نامور نثر نگاروں کے ساتھ شبلی نعمانی کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی فروگزاشت ہے!

"حافظ سعدی، سنائی، عطار، رومی، جامی، احمد جام، قدسی، فارسی کے بڑے ... شاعر ہیں، انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ اسلامی ہے" (ص۱۱)

"جو کچھ لکھا" یہ بیجا مبالغہ ہے، حافظ کے وہ اشعار جن میں معشوقِ چاردہ سالہ ... کا ذکر ہے، اور شراب نوشی کی کھلی ہوئی ترغیب ہے۔

آں تلخ وش کہ صوفی اُم الخبائثش خواند

اشہیٰ لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارا

کیا اسے "اسلامی" کہا جا سکتا ہے؟!

کوئی شک نہیں "معیارِ ادب" اُردو زبان و ادب کی ایک بلند پایہ کتاب اور معیاری کتاب ہے!

دیوانِ ہاشمی

مرتبہ :- ڈاکٹر حفیظ قتیل، ضخامت ۳۶۴ صفحات، قیمت :- چھ روپے

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر، ایوانِ اُردو، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

ہاشمی بیجاپوری، علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۸ھ — ۱۰۸۳ھ) کے دور کے شاعر ہیں، شاہی دربار میں اُن کا آنا جانا تھا۔ یہاں تک کہ شاہی محلات کی کنیزوں سے اُن کی چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی!! ہاشمی بیجاپوری ریختی گو شاعر تھے۔ انہی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل مرحوم نے اپنے مقدمہ کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔ حیرت ہے کہ اب سے تین سو سال پہلے ہاشمی نے اُردو ریختی میں ایسے صاف اور سلیس شعر کہے ہیں :-

لالن کو جا سہیلی میرا سلام بولو — وہ آرزو ہمارا، دل کا تمام بولو

اونو (وہ) آدیں تو پردے سوں (سے) گھڑی بھر بہار دباہر بیٹھوں گی

بہانہ کر کے موتیاں کے پرو کے ہار بیٹھوں گی

میں ناؤں سے واقف نہیں صورت سے ہوئی ہوں آشنا

پھنا ووں سن معلوم ہوا، کہا جانے کس کی جائی تھی

مری تو اوڑھنی سر کے پیالنے دھیٹ ہو کھینچی　　سو ٹکڑے ہو کے رہ گئی ہے کناری ہاتھ میں میری

اس زمانہ کی زبان کا عام رنگ یہ ہے:-

سیکھ سٹ دے کے کچ کا کچھ منگیا آ ہاشمی کچھ کچھ
سیکھ سٹ دے کے دھن کچھ کچھ دیتی ہے کچھ کا کچھ بخشش

چوری سوں دھن ملی، سو معلوم کسے نہ تھا کچھ
ظاہر یو بات اکثر سجن کدھن تے ہوئی ہے

یہ زبان ہمارے لئے کس قدر اجنبی اور نامانوس ہے۔

کتاب کے آخر میں الفاظ کی "فرہنگ" ہے، چند نمونے:-

چانسد ــــ فریب ــــ اشلوک ــــ شجر ــــ پونگڑا ــــ مرد بچہ ــــ اڈلیا ــــ پسند آیا ــــ
آنٹ ــــ مشکل ــــ لبدانا ــــ فریفتہ کرنا ــــ ہلبل ــــ شور و غوغا ــــ بارا ــــ آندھی ــــ

ہاشمی بیجاپوری کے زمانہ میں "راستہ" کو "مارگ" کہتے تھے، ہندوستان میں "روڈ" کا ترجمہ اب "مارگ" ہی کیا گیا ہے ــــ
ہاشمی نے "سروا" "کٹورے" کے معنی میں استعمال کیا ہے، یو۔ پی کے دیہات میں آج بھی "سروا" انہی معنی میں بولا جاتا ہے ــــ
چن کے معنی "فرہنگ" میں "نیشکر کا رس" لکھے ہیں مگر یو۔ پی میں "نیشکر کو "چن" کہتے ہیں، اب سے چالیس سال پہلے پتلے قسم کا گنا جو بویا جاتا تھا، اس کی فصل کو "چن" بولتے تھے۔

اُردو زبان کیسی کیسی چھلنیوں میں چھن کر اور کس کس عنوان سے مُقطّر ہو کر ہم تک پہونچی ہے!

افعالِ مُرکّبہ از:- مولانا تمنا عمادی مُجیبی پھلواری۔ ضخامت ۱۱۶ صفحات (خوب صورت جلد) قیمت دو روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ:- مکتبۂ اسلوب، ۳/۵۲ مسلم لیگ کوارٹرز، ناظم آباد، کراچی

اس کتاب میں "افعال مرکبہ" کی مختلف حالتوں اور ہیئتوں سے بحث کی گئی ہے، اور اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر وضاحت اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے ــــ چند عنوانات:-

ــــ اصل اسم حالیہ ــــ فعل لازم کا مفعول ــــ دونوں حالیوں کا فرق ــــ فعل مرکب کی تعریف ــــ
حال و تمیز کی مثالیں ــــ افعال متصلہ ــــ متشابہات افعال مرکبہ ــــ افعال توام ــــ افعال مرکبہ کی نوعیتیں۔

"اصل فعل سے پہلے جو فعل رفیق آتے، اس کو میں "نقیب" کہتا ہوں، اور جو فعل اصل فعل کے بعد آتے اُس کا نام میں نے "ردیف" رکھدیا ہے۔" (ص۷)

فاضل مصنف کی وضع کی ہوئی یہ دونوں "اصطلاحیں" قابلِ قبول ہیں، اور یہ دلیل ہے اُن کی خوش ذوقی اور فنی بصیرت کی!
"میں زید سے تمہارا پیغام کہہ آتا ہوں" یعنی "کہہ کے آتا ہوں" (ص۸) مگر "کہہ آتا ہوں" سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ میں زید سے تمہارا پیغام کہہ آیا کرتا ہوں" ــــ "جیسے آنکھیں اُبل آئی ہیں یعنی دُکھنے آگئی ہیں جوش کر آئی ہیں" (ص۹) آنکھوں کے دُکھنے کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ آنکھیں اُبل آئیں، مگر "آنکھوں کا اُبل آنا" ــــ "آنکھیں دُکھنے" کی لازمی شرط نہیں ہے کوئی آدمی کسی کے گلے کو زور سے دبائے، تو آنکھوں کے ڈھیلے اُبل کر باہر آسکتے ہیں، مگر اس کیفیت کو "آنکھیں دُکھنا" نہیں کہہ سکتے
"بھئی! ذرا بازار سے جاتے ہوئے میری طرف سے بھی ہو لینا" (ص۲۳) جس مفہوم کو اس جملہ میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے

اہلِ زبان اس طرح نہیں بولتے۔

"بھئی! بازار جاتے ہوئے میری طرف بھی ہوتے جانا، یا میری طرف بھی ہو جانا"۔

یہ مفہوم، اس طرح ادا کیا جاتا ہے! ——— "میری طرف سے بھی ہو لینا"۔ اس کو یوں بولتے ہیں:۔

"اُن کے گھر میری طرف سے بھی ہو آنا"۔

یعنی اُن کے گھر تمہارا جانا، گویا میری (طرف سے) نمائندگی ہوگی!

"افعالِ توام" کی جو مثالیں دی گئی ہیں (اچھل کود، لوٹ مار، مار کوٹ،) اُن میں "کھوج ڈھونڈ" محلِ نظر ہے!

"توابع مہملہ" میں "بات چیت" اور "گول مول" کی مثالیں تو صحیح ہیں مگر "دھول دھپا" اور "لہولہان" کی مثالیں غلط ہیں "دھپا" ایک مستقل لفظ ہے، یہ "دھول" کا "تابع مہمل" نہیں ہو سکتا اسی طرح "لہولہان" میں "لہان" لہو بہنے اور زخمی ہونے کی کیفیت کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتا ہے، یہ (لہان) "لہو" کا تابع مہمل نہیں ہے ——— سقہ اقہ (ص۵۴) مگر عام طور پر "حقہ وقہ" بولا جاتا ہے، جیسے "برقعہ ورقہ اور" رقعہ وقعہ"!

رنگِ تغزل

از:۔ راسخ عرفانی، ضخامت ۱۵۲ صفحات (مجلد) قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ نور، گوجرانوالہ

جناب راسخ عرفانی کے منظومات کا مجموعہ "خلشِ خار" اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے، اب اُن کی غزلوں کا یہ دوسرا مجموعہ (رنگِ تغزل) منظرِ عام پر آیا ہے، جس پر ملک منظور حسین صاحب منظور (ایم اے، مصنف جنگ نامہ اسلام) نے پیشِ لفظ لکھا ہے، اس "پیشِ لفظ" کا یہ رنگ ہے:۔

"بہر کیف یہ حقیقت ہے کہ راسخ صاحب کی غزل گوئی کا سراغ اس طرح پالینے کے بعد اب زیرِ نظر مجموعہ غزلیات کی صورت میں آج ہم اُن کے ذوقِ تغزل کی انتہائی بلندیوں تک آپہونچے ہیں ——!"

جمالِ رنگیں عیاں ہے، اُس کا مگر وہ پھر بھی عیاں نہیں ہے
عجیب رازِ نہاں بنا ہے، اگرچہ رازِ نہاں نہیں ہے (ص۱۷)

"رازِ نہاں بنا ہے" اس نے شعر کو کتنا کمزور بنا دیا۔

سلاسلِ عشقِ سرمدی میں اُلجھ کے مسرور و شادماں ہوں
خوشا مقدر اِک قلبِ مخلص اسیرِ زلفِ بتاں نہیں ہے

"عشقِ سرمدی کے سلاسل میں اُلجھنا" ہی کچھ کم عجیب نہیں تھا کہ "قلبِ مخلص" نے شعر کو "عجیب تر" بنا کے چھوڑ دیا۔

آج شاید چل بسا ہے راسخ مست و خراب — سر میں ڈالے آ رہے ہیں رند میخانے کی خاک (ص۲۱)

"سر میں" تیل ڈالا جاتا ہے، اور خاک کے لئے "سر پر ڈالنا" بولتے ہیں! اس غلطی کے علاوہ بھی شعر بالکل سپاٹ سا ہے۔

یہ رنگِ اشک بہم آتشِ غم کے شرارے ہیں — پگھل کر آنکھ سے بہتا ہے یہ سوزِ نہاں اپنا (ص۲۰)

اس قسم کے شعر، شاعری کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہیں؟

ترے دشمن نے توقیرِ فلک کو روند ڈالا ہے — ترا بندہ مگر محوِ غمِ ایام ہے ساقی (ص۲۹)

"تموّجِ قیر کو روند ڈال دینا —— یہ کیا اندازِ بیان ہے؟

کوئی بھی قلزمِ دل کی عمیقی کو نہیں پہونچا		اس اک قطرے کو بحرِ بیکراں کہنا ہی پڑتا ہے (ص۳۲)

گہرائی اور عمق کو "عمیقی" کہہ کر شاعر نے فن کا، زبان وادب کا اور اپنے ذوق کا بُرا مظاہرہ کیا۔

رنجیدگی کے لاکھ ارادے ہوں مستقل		لیکن جو تم تر وہ منائے تو کیا کروں (ص۳۵)

مصرعِ اولیٰ میں "تعقید" کے سوا اور کیا رکھا ہے؟

میرے تصورات کی بزم پہ چھا گیا کوئی		رگ رگ میں روحِ زندگی بن کے سما گیا کوئی (ص۴۰)

جس مجموعۂ کلام میں ایسے شعر شامل ہوں اُسے کیا کہا جائے؟ اور یہ!

کس کی بزم میں اے ہم صفیرو!		نہ کام آئی مری جادو نگاری (ص۶۳)

"جادو بیانی" کہنا تھا، مگر قافیہ کی مجبوری کے سبب "جادو نگاری" نظم کر دیا! پھر یہاں "ہم صفیرو!" لانے کا کوئی محل نہ تھا، چمن، قفس، آشیاں اور بہار و خزاں وغیرہ کا جہاں ذکر ہوتا ہے، وہاں "ہم صفیر" کی ترکیب کام دیتی ہے! ہم نشین، رفیق اور ساتھی کے معنی میں ہر جگہ "ہم صفیر" استعمال نہیں ہوتا۔

دشمن رہینِ یاس ہے حیران ہے بوالہوس		اہلِ وفا کا جذبۂ ایثار دیکھ کر (ص۸۷)

مصرعِ اولیٰ میں کتنی ناپختگی پائی جاتی ہے۔

نہیں ہے گوارا ہمیں عاشقی میں		تمیزِ ستم، امتیازِ محبت (ص۸۹)

آخر یہ کیا بات ہوئی؟

اگر تیرے جمالِ پُرضیا کی جلوہ ریزی سے		مری ہستی سراپا نور ہو جائے تو کیا ہوگا (ص۱۰۱)

"جمال" پھر "پُرضیا" اور اس پر طرفہ تماشا اُس کی "جلوہ ریزی"! "شعر" کے نام پر اس قسم کے "جوڑے ہوئے" لفظوں کو پڑھ کر وجدان بڑی اذیت محسوس کرتا ہے۔

حُسنِ جنت ہے کیا سوا اس کے		تیرے کوچے کی خوشنمائی ہے (ص۱۳۰)

بچکانہ اندازِ بیان!

کب تک لے یہ آگ چھپائے		تیرا راز چھپانے والا
میں نے کیا ہے جرمِ محبت کا ارتکاب		یا کچھ خطا ہے اے مرے سرکار اور بھی!
چارہ سازوں کی چارہ گری دیکھئے		درد ہی بڑھتے بڑھتے دوا بن گیا
اہلِ زر بھی ہیں جب گدا اُس کے		پھر گداؤں سے کیا طلب کرنا
گلوں سے چل کے رخسارِ بتاں تک بات پہونچی ہے		کہاں سے بات نکلی تھی، کہاں تک بات پہونچی ہے
غزل میں استعاروں میں، اشاروں میں کنایوں میں
بہ ہر صورت ہمیں رازِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے

کاش! راسخ عرفانی اپنی غزلوں میں کم از کم اس آہنگ کو قائم رکھ سکتے!

آئینۂ تثلیث از :- کوثر نیازی، ضخامت ۲۰۸ صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ دیدہ زیب، سرورق رنگین اور جاذبِ نظر۔ قیمت :- ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- مکتبۂ شہاب شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

پاکستان میں چند سال سے فتنۂ عیسائیت ابھر رہا ہے، اس نے غیرت مند توحید شناسوں کو چونکا دیا ہے، ایک مسلمان کا ارتداد دین و اخلاق کا بہت بڑا المیہ ہے! اس فتنہ کی علمی دلائل کے ذریعہ روک تھام کے لئے اربابِ علم و دانش نے جدوجہد شروع کر دی ہے اور کئی کتابیں عیسائیت کے رد میں آچکی ہیں!

جناب کوثر نیازی کی یہ کتاب (آئینۂ تثلیث) بعض خصوصیات کے سبب اپنی جگہ ممتاز اور منفرد کتاب ہے! اس کے عنوانات:- حیاتِ مسیح علیہ السلام — شجرہ نسب — حضرت مسیح کی پیدائش — انجیل کا بیان — خدا کا بیٹا — حضرت مسیح کی تعلیمات — عیسائیوں کا عمل — معجزاتِ مسیح — رفعِ آسمانی یا صلیب — کچھ انجیلوں کے بارے میں — باہمی تضادات — بائبل میں عریانی و فحاشی — چند اور بوالعجبیاں — بائبل اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم — عقیدۂ تثلیث — اناجیل اور تثلیث — بے جا تاویلات — کفارہ کا مسئلہ — مسیحی علماء کی شہادت —

"آئینۂ تثلیث" — نے عیسائیت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے، عقلی اور نقلی دونوں طرح کے دلائل ہیں اور خاصے وزنی مطمئن کُن دلائل ہیں! اس کتاب کے مطالعہ کے بعد کوئی معقول اور انصاف پسند انسان، عیسائیت کو کسی عنوان سے بھی لائقِ توجہ نہیں سمجھ سکتا۔

مولانا کوثر نیازی نے اس کتاب کی تالیف و ترتیب میں بڑی محنت اور کاوش سے کام لیا ہے، قلم کی شگفتگی اور سلامت کے ساتھ لکھنے والے کا سوزِ دل، خلوص اور غیرت دینی بھی شامل ہے!

کتاب کی ضخامت، اس کے گیٹ اپ، اور بازار کے عام نرخ کے لحاظ سے اس کی قیمت کم از کم دو روپیہ ہونی چاہیے تھی۔ مگر افادۂ عام کے لئے مکتبۂ شہاب نے ایثار سے کام لیا ہے (جزاہم اللہ خیر الجزا)

سورہ یٰس مترجم مکتبہ تعمیرِ انسانیت (موچی دروازہ، لاہور) نے سورہ یٰس کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، آرٹ پیپر سنہری، کتابت دیدہ زیب، طباعت نظر افروز، ہر سطر رنگ برنگ جدولوں سے مزین، جیبی سائز، ہدیہ ۱۴ آنے — دوسری قسم ولایتی کاغذ پر ہدیہ ۹ آنے

مکتبہ تعمیرِ انسانیت نے دیدہ زیب رنگین طغرے بھی شائع کئے ہیں، سائز ۱۴×۱۰، قیمت تین روپیہ درجن — بصورت رنگین کیلنڈر (۲۰×۱۵) قیمت ساڑھے چار روپیہ درجن، تاجروں کے لئے خاص رعایت! یہ طغرے اور کیلنڈر مکان کی دیواروں پر بڑی بہار دیتے ہیں۔

جامع العلوم ملتان اس دینی درسگاہ کے مقاصد اور پروگرام کی تفصیلات ہمیں وصول ہوئی ہیں، جس کے مطالعہ سے بڑی مسرت ہوئی اور جامع العلوم کے کارکنوں کے لئے دل سے دعائیں نکلیں! اس درس گاہ کا مقصد یہ ہے:-

"اس کا مقصد ایسے صالح نوجوان تیار کرنا ہے جو اسلام کے علمبردار بن سکیں اور اس دورِ جدید میں ٹھیک ٹھیک دینِ حق کے مطابق دنیا کی رہنمائی کے لائق ہو سکیں، اس غرض کے لئے نوجوانوں کو

لیں تعلیم دینا مقصود ہے، جس سے اُن کو دین میں بھی پوری بصیرت حاصل ہو اور اُس کے ساتھ
جدید علوم میں بھی وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں سے کسی طرح کم نہ ہوں"۔

یہ دینی مدرسہ ایسے سات سال قبل ایک چھوٹی سی مسجد میں قائم کیا گیا تھا، پھر منتظمین نے شہر کے باہر ۶ کینال زمین خریدلی اور درختوں کے سایہ میں درس و تدریس کا کام شروع کر دیا، پھر اہلِ خیر کے تعاون سے درس و تدریس اور قیام در ہائش کے لئے چند کمرے بھی تعمیر ہو گئے

اب "جامع العلوم" کی تعلیم و تربیت کا نیا نصاب اور جدید تعلیمی خاکہ پیش کیا گیا ہے! یہ جدید نصاب دین و دُنیا کی ضرورتوں کے مُطابق ہے، جماعتِ عاشرہ کی تکمیل اس طرح ہوگی کہ ایک طرف طالب علم کو بی۔ اے کے امتحان میں شریک کرایا جائے گا، دوسری طرف وہ قرآن و حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ، کلام، منطق و فلسفہ اور معاشیات و سیاست کے علوم سے مزین ہوگا۔ طلبا کے سیرت و کردار کی تربیت کے لئے خاص طور سے اہتمام کیا گیا ہے کہ اس درسگاہ سے جو طلباء فارغ ہو کر نکلیں وہ ایک طرف جدید و قدیم علوم سے باخبر ہوں اور دوسری طرف اسلامی اخلاق کا اچھا نمونہ ہوں۔

"جامع العلوم" کا سالانہ بجٹ اس سال تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ کا ہے، درسگاہ اور قیام گاہ کی تعمیر کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے اہلِ خیر حضرات نقد، زرعی و سکنی جائداد، زکوٰۃ و صدقات اور فصل کے موقعہ پر غلہ بھیجکر، اس دینی درسگاہ کے ساتھ تعاون فرما سکتے ہیں! ؎

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا
اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

اس درسگاہ کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، جن کی دیانت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، اور جو خالصاً لوجہ اللہ اس ادارے کو چلا رہے ہیں!

عله جامع العلوم بیرون بوہڑ گیٹ درحلادہ ملتان شہر

مکمل کورس

موسم سرما قدرت کا ایک بہترین عطیہ ہے اس سے صحیح فائدہ اُٹھانے کی صورت یہ ہے کہ مقوی غذاؤں اور دواؤں کو ایک خاص ترتیب اور پروگرام کے تحت اس موسم میں استعمال کیا جائے اور ان تین چار مہینوں میں ایک تو اس نقصان کی تلافی کر لی جائے جو موسم گرما کی سخت دھوپ اور گرمی کے باعث ہوا، اور ثانیاً اعضائے ہضم، اعضائے رئیسہ اور اعضاء منی کو اس موسم میں اتنی قوت بہم پہنچائی جائے جس سے آئندہ موسم سرما تک محنت و مشقت باآسانی برداشت کی جا سکے۔

حصولِ قوت

کا صحیح اور بے ضرر پروگرام اس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ

۱:۔ صبح ماءاللحم طیوری ۵ تولہ یا ماءاللحم طیوری اسپیشل تین تولہ ایک تولہ شہد ملا کر پی لیں۔
۲:۔ سہ پہر لبوب کبیر خاص الخاص ۷ ماشہ (گرم مزاج لبوب کبیر جواہر والا ۴ ماشہ) استعمال کریں۔ نیم گرم دودھ کے ساتھ
۳:۔ رات کو سوتے وقت ۲-۲ گولی مانع اعظم، ۲ تولہ بالائی کے ہمراہ کھائیں۔

نوٹ:۔ اگر بیرونی طور پر کمزوری کی شکایات موجود ہو تو طلاء شباب خاص الخاص سے فائدہ اُٹھائیں!

ان ادویات سے دل، دماغ، اعصاب، قوتِ حافظہ، آلاتِ جنسی اور اعضائے ہضم کو اتنی قوت حاصل ہو جاتی ہے جس سے انسان اپنے کام پوری مستعدی سے ورگرمجوشی کے ساتھ انجام دینے کے باوجود طبیعت میں تروتازگی محسوس کرتا ہے!

اشرف یونانی لیبارٹریز رجسٹرڈ لائلپور

"اشرف"

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
آدمجی کاٹن ملز لانڈھی کراچی

جلد :- ۱۴

فاران
کراچی

شمارہ :- ۲

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ماہِ مئی سنہ ۱۹۶۲ء

ترتیب

قیمت فی پرچہ
باسٹھ پیسے

چندہ سالانہ :-
سات رُوپے

مقامِ اشاعت :- دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی

پرنٹر و پبلشر :- مسرور حسین

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش اوّل

اس حقیقت اور واقعیت سے کوئی ذی ہوش انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دُنیا کا کوئی علم و فن بھی ایسا نہیں ہے جس کے ماننے والوں کے درمیان علمی مسائل پر زبان و قلم کی نزاع و جدال اور معرکہ آرائیاں نہ رہی ہوں، ان علماء میں فہم و دانش اور سیرت و مزاج کے اعتبار سے ہر درجہ اور سطح کے علماء پائے گئے ہیں، ان میں بعض نے بعض کو مطعون بھی کیا ہے اور طعن و طنز کی یہ "لے" زیادتی بلکہ ناانصافی کی حد تک بھی پہونچ گئی ہے! علمِ دین کی طرح ان علوم و فنون میں ——— کفر و اسلام، فاسق و صالح، اور ارتداد و انکار ——— کی اصطلاحیں نہیں ملتیں، مگر طنز و تنقید میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ دین کی ان اصطلاحوں کی معنویت کی کسی نہ کسی عنوان سے ترجمانی ضرور کرتے ہیں۔۔

ایک شخص فلسفہ، منطق، سائنس یا تاریخ کے فن میں چند گمراہ کن غلطیوں یا کسی ایک شدید غلطی کا ارتکاب کرتا ہے، اور اس وقت کے علماء کی اکثریت متفقہ طور پر اُسے "غلط کار" "گمراہ" اور "کافرِ علم و فن" قرار دیتی ہے ——— اس کے جواب میں وہ "گمراہِ علم و فن" گزشتہ علماء کے بعض اقوال اپنی برأت اور صفائی میں پیش کرتا ہے کہ اربابِ فکر و دانش کو تو ہر دور میں غلط کار اور گمراہ بتایا گیا ہے، فنِ تاریخ کے فلاں عظیم المرتبت عالم کو "کاذب" قرار دیا گیا، فلاں فلسفی کو "توہم پرست اور نیم پاگل" کہا گیا، اور علمِ سائنس کے فلاں اتنے بڑے علامۂ وقت پر پھبتیاں کسی گئیں اور اُس کی تضحیک کی گئی! ——— کیا ان اقوال کے پیش کرنے سے اُس گمراہِ علم و فن کی گمراہی "حق" ثابت ہوسکتی ہے ؟؟

اس قسم کے جوابات "الزامی" کہے جاتے ہیں، یعنی "ملزم" اپنی صفائی میں شواہد و دلائل پیش کرنے کے بجائے، دوسروں کے الزامات گنانا شروع کردیتا ہے! ہر ملزم اور مجرم کی ہمیشہ یہی ذہنیت رہی ہے، اور اسی "ٹیکنک" کو یہ لوگ استعمال کرتے رہے ہیں۔

ایک اور واضح مثال :——— کسی بستی میں کسی شخص نے راستہ میں پڑی ہوئی چیز بھولے سے اُٹھالی۔ بعض لوگوں نے اُس پر "چوری" کی تہمت لگادی! ایک شخص بہت زیادہ بھوکا تھا، کسی کے گھر وہ قرض لینے کے لئے گیا، اور وہاں کھانے کی چیز میز پر دھری ہوئی پاکر اُس نے کھالی، اس پر گھر والوں نے اُسے "چور" ٹھیرادیا، ایک چور نے ایک دیانت دار آدمی کے پاس چرایا ہوا زیور امانت کے طور پر رکھدیا، اور وہ امانت دار بیچارہ پکڑا گیا ——— ان تمام معاملات میں کہ فلاں شخص واقعی چور ہے بھی یا نہیں، بستی والوں کے درمیان بڑے اختلافات رہے ہیں بلکہ بعض اوقات لڑائیاں ہوئی ہیں ——— اُسی بستی میں ایک شخص کسی کا مال چراتے ہوئے پکڑا جاتا ہے، اور بستی کے تمام لوگ متفقہ طور پر اُسے چور گردانتے ہیں اور اُسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیتے ہیں ——— یہ شخص (چور) جو اتفاق سے چرب زبان بھی واقع ہوا ہے، بنکارنے لگتا ہے کہ اس بستی کے رہنے والوں کی تو یہ عادت رہی ہے کہ وہ ہر زمانے میں دیانت داروں پر چوری کی تہمتیں لگاتے رہے ہیں۔ فلاں فلاں آدمیوں نے فلاں بیگناہ شخص کو اس طرح پھنسایا، فلاں بھلے مانس کو بھول چوک کی بنا پر "اُٹھائی گیرا" قرار دیا گیا، اس نے یہ کیا، اُس نے وہ کیا۔۔۔۔ ؟؟

اُس بستی میں ایسے اشخاص جو واقعتاً "چور" تو نہ تھے ہاں! اُن کے "اعمال" پر چوری کا اشتباہ ہو سکتا تھا لوگ جلدبازی نہ لیتے یا ظاہری "صورتِ عمل" کو دیکھ کر فیصلہ نہ کر دیتے، تو انہیں "بری" "بے گناہ" یا زیادہ سے زیادہ "غافل" اور "غیر محتاط" قرار جاسکتا تھا ——— تو کیا بعض فیصلہ کرنے والوں کی اس سطح بینی غلط اندیشی اور فروگزاشتوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اُس بستی میں "چوری" ہو ہی نہیں سکتی اور کوئی شخص دیدہ و دانستہ کسی کا مال چرا رہا ہو تو بھی لوگ اُسے "چور" سمجھ کر پکڑ ہی نہیں سکتے! اور اُس بستی میں "چوری" کے جرم کا واقع ہونا، ایک غلط قسم کی تہمت اور مفروضے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

یہی صورتِ حال غلام احمد پرویز کی تکفیر کے سلسلہ میں پیش آئی ہے۔ ہر مکتبۂ فکر و خیال کے علمائے نے بہ اتفاق رائے پرویز صاحب کی جو تکفیر کی ہے، اُس کے جواب میں ماہ اپریل ۶۲ء کے "طلوعِ اسلام" میں بعض اکابر، فقہاء، صوفیا اور علمائے کے نام گنوائے گئے ہیں کہ ان کو بھی کافر، گمراہ، بے دین اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے۔

ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں، جو اپنی پوزیشن کو کمزور سمجھ کر حقائق کی پردہ پوشی سے کام لیتے ہیں، اور واقعات کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں، اپریل کے "فاران" میں ہم نے کسی اشتباہ و ابہام، ذو معنویت اور اینچ پینچ کے بغیر صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ بعض علمائے دین نے ایک دوسرے کی تکفیر اور تفسیق کی ہے، اور اس معاملہ میں بعض غلط اندیشیوں سے بڑی بڑی زیادتیاں اور گھٹیا باتیں بھی ظہور میں آئی ہیں ——— مگر اس سے یہ نتیجہ تو کسی منطق اور علم کلام کی رُو سے بھی نہیں نکالا جاسکتا کہ کوئی شخص چاہے کیسی ہی صریح کفر کی بات کیوں نہ کہہ دے، اُس کے "کفر" کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی! اور ایک وہ مسلمان جو صریح طور پر "کفریات" بکتا ہے اُس کو "کافر" نہیں ٹھیرایا جاسکتا!

یہ منطق ہی اپنی جگہ سرے سے غلط ہے بلکہ کھلی ہوئی گمراہی ہے کہ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے، وہ چاہے کیسے ہی صریح کفر میں کیوں نہ مبتلا ہو جائے، اُس کے کفر کی نہ تو نشاندہی کی جاسکتی ہے اور نہ اُسے کافر قرار دیا جاسکتا ہے ——— اس منطق کو اگر صحیح مان لیا جائے، تو پھر "ایمان و اسلام" کی اصطلاحیں اور اُن کی شرطیں اور تقاضے، مہمل اور بے معنی بن کر رہ جائیں گے۔

پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مسلمان سے ارتداد اور کفر کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ اور تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں! کسی مسلمان کے کفریہ قول و عمل کے سبب اُسے "کافر قرار دینا" نہ تو کوئی اچنبھے کی بات ہے اور نہ عقلِ عمومی اسے ناجائز، غلط اور مستبعد قرار دیتی ہے۔

اور

بعض برگزیدہ شخصیتوں پر بعض لوگوں نے جو کفر و گمراہی، بے دینی اور فسق و ضلالت کی تہمتیں لگائی ہیں، وہ اس بات کی دلیل نہیں بن سکتیں کہ اب نہ کسی مرتکبِ کفر کو "کافر" ٹھیرایا جاسکتا ہے اور نہ کسی گمراہ کو گمراہ کہا جاسکتا ہے، اور ارتداد، کفر اور ضلالت کی نشاندہی کرنے کا اب کوئی مجاز ہی نہیں رہا۔

سوسائٹی میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ بد دیانت اور کینہ لوگوں نے بے گناہ اور سیدھے سچے آدمیوں پر قتل کے بے بنیاد الزامات لگا کر انہیں تختۂ دار تک پہونچوا دیا ہے، مگر کیا اس قسم کے بعض، چند یا بہت سے واقعات اس کے لئے دلیل اور نظیر بن سکتے ہیں کہ اب کسی ایسے شخص کو جس نے واقعتاً کسی کو "قتل" کیا ہے، اُسے قتل کرنے کے جرم میں سرے سے ماخوذ ہی نہیں کیا جاسکتا، اور "قتل" "قاتل" "مقتول" اور "سزائے موت" کی قانونی اصطلاحیں اب بے معنی، غیر موثر، بے وزن اور معطل ہو کر رہ گئی ہیں، اور جرم قتل کے ارتکاب پر احتساب اور باز پرس کا باب ہی بند کر دیا گیا، اب کسی انسان کے مار ڈالنے

خود مستقل کہہ سکتے ہیں اور نہ مرتکب جرم قتل کو "قاتل" کہا جا سکتا ہے!

ان مثالوں پر "مسئلہ تکفیر" کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے! گزشتہ زمانے میں بعض غلط اندیش غیر محتاط اور متشدد علماء نے بعض اکابر کو جو گمراہ اور بے دین قرار دیا ہے یا بعض علماء کے درمیان تفسیق و تکفیر کی گرم بازاری رہی ہے تو ان مثالوں کے ذریعہ اُس شخص کے موقف کو درست اور بے غبار ثابت نہیں کیا جا سکتا جس کی زبان و قلم سے ایسی باتیں نکلی ہوں جن پر حقیقی "ضلالت" اور واقعی "کفر" کا اطلاق ہوتا ہو!

طلوعِ اسلام (اپریل سنہ ۱۹۶۲ء) میں "کافر گری" کے عنوان کے تحت اُن فتاویٰ اور اقوال کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں جن کی رُو سے مسلمانوں کے فرقے یا بعض اکابر کافر اور گمراہ ٹھیرائے گئے ہیں۔

اگر کسی مسلمان کو جس کے قول و عمل پر "کفر" کا اطلاق نہیں ہوتا، کوئی نادان "کافر" ٹھیرا دے، تو یہ فعل بے شک کافر گری بھی ہے اور کافر سازی بھی! مگر کسی مسلمان کے واقعتاً "کفریہ اقوال" کی نشاندہی نہ تو کافر گری ہے اور نہ کافر سازی ہے! پرویز صاحب کے معاملہ میں علماء کرام نے اس شخص کے "کفریات" کی نشاندہی کی ہے اور اس کے "کفریہ اقوال" کی بنا پر اُس کی "تکفیر" کا فتویٰ دیا ہے! انھوں نے کسی مسلمان کو کافر نہیں بنایا، بلکہ ایک وہ مسلمان جس نے کفر کا ارتکاب کیا ہے اُس کے "کفر" کو بتایا اور ظاہر کیا ہے۔

"طلوعِ اسلام" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریر کے ایک اقتباس کو اس باب (کافر گری) کا "حرفِ آغاز" اور "سرنامہ" بنایا گیا ہے! مولانا مودودی نے اپنی تحریر میں بے شک اس کی مذمت کی ہے کہ بعض فروعی مسائل پر مسلمانوں نے ایک دوسرے کو "کافر، فاسق، گمراہ، دوزخی اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا ہے ــــــ" مولانا مودودی نے نہ تو کوئی نئی بات کہی ہے اور نہ کوئی انکشاف فرمایا ہے، بعض فروعی مسائل پر تکفیر و تفسیق کے جو ہنگامے برپا ہوئے ہیں، اُن کو کسی حق پسند نے تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھا، ایسی باتوں کی مذمت ہی کی جاتی رہی ہے، مولانا مودودی نے یہ تو نہیں کہا کہ کوئی بدبخت بد نصیب اور جاہل اگر دین کے بنیادی عقائد و ارکان ہی پر تیشہ چلا دے، قرآن کریم کی آیات کی صریح طور پر تحریف کر ڈالے اور اسلام کی ایک ایک قدر (VALUE) کو مسخ کرنے کی مہم شروع کر دے، تو بھی اُسے گمراہ اور کافر نہیں کہا جا سکتا! پرویز صاحب سے جمہورِ اُمت کا اختلاف "فروعی مسائل" میں نہیں دین کے بنیادی احکام و عقائد میں ہے۔ اُن احکام و عقائد میں جن کے انکار، تخفیف اور توہین سے کفر لازم آتا ہے۔

رفع یدین — آمین — امام کے پیچھے نماز میں سورۂ فاتحہ کی قرأت — بیک وقت تین طلاق دینا — "نکاح" سے صرف "عقدِ نکاح" مراد ہے یا زوجہ سے مباشرت — زیور پر زکوٰۃ دینے یا نہ دینے کا مسئلہ — ایمان اور عمل کا باہمی تعلق — ایمان کا گھٹنا اور بڑھنا — اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں یا خارج از ذات ہیں — رؤیتِ باری — وجودِ باری کی وحدت اور مظاہرِ کائنات کے تعدد و کثرت کے مباحث — اللہ تعالیٰ کے ید، وجہ، ساق اور نفس وغیرہ کی تعبیرات — نزولِ باری اور استواء علی العرش کی تاویل! — قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے۔ — اعیانِ ثابتہ اور علمِ الٰہی کا باہمی ربط و تعلق — "مُدبِّرات امر" سے کیا مراد ہے — "تقلیدِ شخصی" کی دین میں کیا حیثیت ہے؟ (وھلم جرّاً) ــــــ پرویز صاحب سے جمہورِ اُمت کے اختلافات اس قسم کے مباحث و مسائل میں نہیں ہیں، اور نہ ان سے ملتے جلتے مسائل پر علماءِ امت نے اُن کی تکفیر کی ہے، پرویز صاحب سے مسلمانوں کے اختلاف کی نوعیت "فروعِ دین" میں نہیں "اصولِ دین" میں ہے!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تکفیر و تفسیق کے جس المیا اور حزنیہ کا اظہار کیا ہے، اُس کی نوعیت ایسی ہے، مثلاً کوئی ادیب

و ناقد یوں کہتے ہیں :-

"شاعروں کے درمیان گروہ بندی نے زبان وادب کو بڑا نقصان پہونچایا ہے، ایک نے دوسرے کی پگڑی اچھالی ہے، فلاں مصرعہ میں "الف" دبتا ہے، فلاں شاعر کی غزل کے مطلع میں "ایطائے خفی" پائی جاتی ہے، ان صاحب کے یہاں "ضعف تالیف" کا عیب ملتا ہے، ان فروعی مسائل پر شاعروں نے ایک دوسرے کو گالیاں دی ہیں، اور ان استادوں کے شاگردوں کے درمیان باقاعدہ جنگی محاذ قائم ہوتے ہیں ——— اس نزاع اور ہنگاموں نے زبان وادب کی ترقی کو روکا ہے، اور شعر وادب کی رسوائی کے سامان مہیا کئے ہیں۔"

اس تنقید سے کیا یہ نتیجہ نکالنا کسی عنوان بھی درست اور بجا ہے کہ اب کسی شاعر کی کسی واقعی غلطی پر احتساب ہی نہیں ہو سکتا اور کوئی "تک بند" وزن اور بحر سے خارج مصرعے جوڑ دے، تو بھی اسے "کافرِ شعر" یعنی "غیر شاعر" اور "ناموزوں طبع" نہیں قرار دیا جا سکتا ——— مولانا مودودی کی تحریر سے پرویز صاحب نے اپنی برأت، صفائی اور بے گناہی کے لئے جو فائدہ اٹھانے کی مجرمانہ کوشش کی ہے وہ "قیاس مع الفارق" کی بدترین مثال ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جنھوں نے تکفیر و تفسیق کے ہنگاموں پر شدید کرب و اذیت اور ناگواری کا اظہار فرمایا ہے، خود انھوں نے بھی بعض افراد (اہلِ علم) اور فرقوں کی غلطیوں اور لغزشوں پر احتساب کیا ہے، اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ باطنیت، رفض، خروج، قدریت، جبریت، جہمیت، اعتزال اور متشدد اہلِ بدعت کے یہاں کن مسائل میں ضلالت، انکار اور کفر و الحاد کی کس عنوان سے آمیزش پائی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مودودی صاحب منصوص قطعی اور حجت یقینی سمجھتے ہیں! وہ شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے صریحی طور پر انکار کرتا ہے، مودودی صاحب کی نگاہ میں نہ اُس کا ایمان ثابت ہے اور نہ اسلام!

مارچ (سنہ ۶۲ء) کے شمارے میں ہم اس کا اعتراف و اظہار کر چکے ہیں کہ جزوی طور پر تکفیر کی مثالیں شریعت کی تاریخ میں ملتی ہیں، یعنی جمہور علمائے نہیں بلکہ بعض نے بعض کی تکفیر کی ہے، یہی مثالیں "طلوعِ اسلام" میں نقل کی گئی ہیں - ہم اپنے سابق مضمون (نقش اول اپریل سنہ ۶۲ء) میں بھی عرض کر چکے ہیں، اور اسی بات کو قدرے اضافے کے ساتھ پھر دہراتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ، مولانا رومیؒ، مولانا جامیؒ، امام غزالیؒ، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے بزرگوں کی تکفیر وتضلیل بلکہ "تکفیر" کی نوعیت "جزئی" ہے، یعنی یہ تکفیر بعض افراد کی رائے تک محدود ہے، اور اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے بعض کور ذوقوں اور سطح بینوں نے غالب اور اقبال کو شاعر تسلیم نہیں کیا! مقلدین اور غیر مقلدین، بریلویوں اور دیوبندیوں کے درمیان دینی عقائد اور شرعی مسائل پر جو ہنگامے ہوتے رہے ہیں، وہ اپنی جگہ ثابت ہیں، یہاں تک کہ "بعض مسائل میں "تکفیر" تک نوبت پہونچ گئی ہے ——— لیکن مسٹر غلام احمد پرویز کی تکفیر جزئی نہیں ہے، انہیں تو بریلوی، دیوبندی، اہلِ حدیث اور شیعہ تمام فرقوں اور مکاتیبِ فکر کے علماء کی اکثریت نے "کافر" قرار دیا ہے، اُن کی تکفیر پر جمہور علمائے امت کا یہ اجماع بالکل اسی نوعیت کا ہے، جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی کی جمہورِ امت نے تکفیر کی ہے، اس "اجماعی تکفیر" پر "جزئی تکفیر" کا قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور اس سلسلہ میں "جزئی تکفیر" کی مثالیں پیش کرنا ہی سرے سے غلط اور بے اصل اور بے جوڑ بات ہے۔

"طلوعِ اسلام" میں بعض اُن تنقیدوں کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں - جن کی زد جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی

پیش نظر ہے' (سابق) جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر جس جس انداز میں نقد و احتساب کیا گیا ہے، اس کی تمام توجیہات ہمارے علم میں ہے' کس نے کیا کہا؟ کیوں کہا؟ اور کن تحریروں کو وجہ نزاع اور بنیادِ اختلاف بنا کر کہا؟ ان تمام تفصیلات سے ہم باخبر ہیں' اس کا بھی ہمیں علم ہے کہ مودودی صاحب سے بعض غلط باتیں بھی منسوب کی گئی ہیں' اور یہ بھی درست ہے کہ مولانا مودودی انسان ہیں' فرشتہ نہیں ہیں' بہ تقاضائے بشریت اُن کے قلم سے بعض مسائل میں اونچ نیچ بھی ہو گئی ہے وہ اپنی ذات سے نہ سراپا حق واقع ہوئے ہیں اور نہ معیارِ حق ہیں! ان کی رائے سے اختلاف اور اُن کے اجتہاد کو رد بھی کیا جا سکتا ہے' خود ہم نے اُن کی تحریروں کے بعض تسامحات کی طرف توجہ دلائی، تو اُن کی حق پسندی نے عبارتوں کو بدل دیا ہے' کوئی شک نہیں مولانا مودودی کے زبان و قلم نے اس دور میں اللہ تعالیٰ کے دین کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے، شرک ہو' بدعت ہو' اشتراکیت و مغرب زدگی قادیانیت' فتنۂ انکارِ سنت اور تجدد پرستی ہو، مودودی صاحب ہر محاذ پر اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت میں سینہ سپر نظر آتے ہیں' دین کی مدافعت' حفاظت اور خیر خواہی میں اُن کا یہ حال رہا ہے: ؎

آ چکے تھے بجلیوں کی زد میں سب اہلِ چمن
میں نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

مگر اس سعادت اور عزت و شرف کے باوجود یہ نہیں ہو کہ جو کوئی مولانا مودودی سے اختلاف رکھتا ہے، وہ حق کا مخالف اور باطل پرست ہے۔۔

رسالہ "طلوعِ اسلام" میں بعض علماء کے فتاویٰ اور رایوں کے وہ اقتباس دیئے گئے ہیں' جو مولانا مودودی کی ذات سے متعلق ہیں' اُن میں دیوبند کے ایک مفتی صاحب (سید مہدی حسن) کی تحریر کا یہ اقتباس بھی ملتا ہے۔

"اگر کوئی شخص مسجد کا امام مودودی صاحب کا ہم خیال ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔"

اس قسم کے اقتباسات رسالہ "طلوعِ اسلام" میں نقل فرما کر یہ دکھانے اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس طرح مولانا مودودی کو بعض علماء نے مطعون کیا ہے اور اُن پر شدید الزامات عائد کئے ہیں۔ یہی صورتِ حال پرویز صاحب کے معاملہ میں پیش آئی ہے حالانکہ دونوں حالتوں میں زمین، آسمان کا فرق ہے' سامنے کی بات یہ ہے کہ جنازے کی' عید کی' جمعہ کی اور بعض دوسرے اوقات کی نمازیں' ہزاروں مسلمان مولانا مودودی کے پیچھے پڑھتے رہے ہیں' اور امت کے اجتماعی ضمیر نے مولانا مودودی کے ناقدین ہی کے زمانے میں' اُن کی تنقیدوں کو رد کر دیا ہے بعد مودودی صاحب کے ایمان اور اسلام کے بارے میں شک نہیں کیا۔

لیکن

علمائے کرام نے مسٹر غلام احمد پرویز کی تکفیر کا جو فتویٰ دیا ہے' اس سے چند سال پہلے بھی پرویز صاحب کو امتِ مسلمہ کا اجتماعی ضمیر گمراہ سمجھتا تھا، اور وہ کسی مسجد میں امام بننے کی جسارت کرتے، تو مسلمان اُنکے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیتے، اور اب تکفیر کے بعد تو مسجد میں اُن کی امامت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر پرویز صاحب اپنے کفریہ عقائد سے توبہ کئے بغیر اسی کفر کی حالت میں مر گئے' تو اُن کا جنازہ عیسائیوں کے کسی قبرستان یا ہندوؤں کے مسان میں سپردِ خاک ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے قبرستان میں ایک غیر مسلم دفن نہیں ہو سکتا!

جماعتِ اسلامی کے ارکان اور متفقین بعض علماء کے فتووں کے باوجود مسجدوں میں نمازیں پڑھتے بھی ہیں اور پڑھاتے

بھی ہیں، مسلمانوں ہی میں اُن کی بیاہ شادیاں ہوتی ہیں، اور اُن کے جنازے مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن ہوتے ہیں۔

مولانا مودودی کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہی صورتِ حال گزشتہ زمانہ میں بعض اکابر کے ساتھ پیش آئی ہے کہ بعض علمائے نے ان سے ضلالت اور کفر کو منسوب کیا ہے۔ اس قسم کے "بعض متشدد" اور "چند غالی علماء" ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں ـــــ مگر جمہورِ اُمت نے ان "بعض متشدد و غالی علماء" کے تشدد اور غلو کا ساتھ نہیں دیا مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جن کے بارے میں "طلوعِ اسلام" نے لکھا ہے :۔۔۔

"اُن جیسے محقق کو کافر قرار دیا گیا۔"

لیکن

جمہورِ اُمت نے ہر دور میں امام غزالی کو نہ صرف مسلمان بلکہ علمِ دین کا ستون سمجھا ہے!

پرویز صاحب کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، خواص و عوام مسلمانوں میں وہ برسوں سے اپنی خرافات کے سبب "گمراہ" سمجھے جاتے رہے ہیں، اور اب ہر فرقہ کے علمائے نے متفقہ طور پر اُن کی "تکفیر" کا اعلان کر دیا ہے، اگر علماء پرویز صاحب کی تکفیر نہ کرتے، تو بھی جمہورِ اُمت کے نزدیک اُن کی "گمراہی" تو بہرحال مسلّم اور ثابت تھی ـــــ جن اکابر کے نام "طلوعِ اسلام" میں پیش کئے گئے ہیں کہ اُن کو اس اس طرح گمراہ، بے دین اور کافر قرار دیا گیا ہے، اُن میں سے کسی بزرگ کو جمہورِ اُمت نے "بے دین" نہیں سمجھا، اور بعض متشدد علماء کی طرف سے "تکفیر" اور تضلیل کا فتویٰ صادر ہونے کے بعد بھی اُن بزرگوں کے احترام و عقیدت سے مسلمانوں کے قلوب معمور رہے ہیں۔

پرویز صاحب نے "تکفیر" کے سلسلہ میں اپنی مدافعت کے لئے "منیر کمیٹی" کی رپورٹ کی پناہ لینے کی بھی کوشش کی ہے، یہ رپورٹ بدنام سیاست دانوں کے دور کی "باقیات السیئات" کے سوا اور کچھ نہیں ہے، دین دار اربابِ فکر اس رپورٹ کی ایک ایک دفعہ اور شق کی تشریح کر کے بتا چکے ہیں کہ اس رپورٹ کی علمی اور قانونی سطح اور دینی حیثیت کیا ہے ـــــ پرویز صاحب نے انتہائی کمزور سہارا تلاش کیا اور بڑی ہی غیر محفوظ اور مخدوش پناہ گاہ کا انتخاب فرمایا۔

"طلوعِ اسلام" میں مسلمانوں کے فرقوں کی باہمی آویزش و اختلافات کا جو ذکر کیا گیا ہے، وہ کوئی انکشاف و اکتشاف یا کسی پوشیدہ راز کی پردہ دری نہیں ہے۔ ساری دُنیا جانتی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان نزاع و اختلاف پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض فرقوں کی مسجدیں اور قبرستان تک جُدا جُدا ہیں، مگر فرقوں کے اس باہمی نزاع و اختلاف کا ذکر کر کے، پرویز صاحب آخر ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں! اُن کی "تکفیر" پر تو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے اتحاد و اتفاق کی سبیل پیدا ہو گئی ہے، اور یہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے علمائے نے، آپس کے دینی اختلافات کے باوجود، ایک دوسرے کو مسلمان سمجھ کر ہی ایک مرتکبِ کفر کی "تکفیر" پر اتفاق کیا ہے، اور ایک فرقہ کے عالمِ دین نے دوسرے فرقہ کے عالمِ دین کی تصویب اور تائید کی ہم "منیر کمیٹی رپورٹ" کا ایک اقتباس پیش کرنے کے بعد "طلوعِ اسلام" میں یہ عبارت نگاہ سے گزری، فرماتے ہیں :۔

"ہم قوم کے اہلِ فکر طبقہ سے جنھوں نے (اور جن کی آنے والی نسلوں نے) اس ملک میں زندگی گزارنی ہے، دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے، جس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے اور ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے ملک اس قسم کے آئے دن کے

اخوت اور اتحاد کی فضا پیدا ہو۔۔۔۔"

مگر

اس دور میں اُمت کے درمیان تشتت و افتراق کے سب سے بڑے مجرم تو خود مسٹر پرویز ہیں کہ وہ عقائد اور مسائل جن میں مسلمانوں کے تمام فرقے متفق الخیال اور متحد العقیدہ ہیں، اُن کو بھی پرویز صاحب کے خامہ ضلالت رقم نے مجروح کر کے بلکہ اُن کا حلیہ بگاڑ کر "نزاع واختلاف" کا ایک طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ جس شخص نے تمام اُمتِ مسلمہ کے دین کے بارے میں یہ فتویٰ لگایا ہو۔

"۔۔۔۔ اور آج جو اسلام دُنیا میں مُروج ہے، وہ زمانہ قبل قرآن کا مذہب ہو تو ہو، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔۔۔"

(سلیم کے نام پندرھواں خط)

اُسے محبت، اخوت اور اتحاد کی تلقین کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی! کسی کے سینہ میں خنجر بھونک کر اُس کی طرف مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانا، کتنی خوفناک سفاکی ہے۔ مسٹر پرویز نے اپنے گمراہ کن لٹریچر کے ذریعہ مسلمانوں میں جس تشتت و اختلاف کی تخم ریزی کی ہے، اُس کے نتائج جتنے بھی بھیانک نکلیں کم ہیں!

پرویز صاحب نے ملتِ اسلامیہ کو جس اتحاد و اخوت کی دعوت دی ہے، اس کی بس ایک ہی شکل ہے — وہ یہ کہ تفسیر، حدیث، فقہ اور سیر و اخلاق کی تمام کتابوں کو دریا برد کر کے، پرویز صاحب کی لکھی ہوئی کتابوں کو مسلمان پڑھیں، اُن پر عمل کریں، اور اُن کو حق و صداقت کا معیار سمجھیں، بیچارے ابن جریر، زمخشری، رازی، ابن کثیر اور آلوسی کس شمار قطار میں ہیں، قرآنی آیات کی شرح و تفسیر میں تو خلفائے راشدین، زید بن ثابت، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عباس یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال ناقابل اعتناء ہیں، اور وہ اس لئے کہ پرویز صاحب کے بقول احادیث عجمی سازش کا نتیجہ ہیں، اور اُس کے بعد تیرہ سو سال سے تمام امت اور خاص طور سے اکابر اُمت اسی کوشش میں لگے رہے ہیں کہ قرآنی دین کی جگہ نزولِ قرآن سے قبل کے مذہب کو لے آئیں، اور پرویز صاحب کے ارشاد کے مطابق اُمت اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی ہے! اور اب مُسلمان جس مذہب پر ہیں وہ قرآنی دین ہرگز نہیں ہے، بلکہ نزولِ قرآن سے پہلے کا مذہب ہے!

اور

تفسیر اور حدیث و فقہ نے مُسلمانوں میں اختلافات کی راہیں کھولی ہیں، اتحاد و اتفاق کا نسخہ کیمیا اثر تو پرویز صاحب کے پاس ہے، قرآن کی جو تفسیر وہ کر دیں، اور قرآن کے جس حکم کی تعمیل کا طریقہ یہ حضرت بتا دیں، بس وہی عینِ حق ہے، حرفِ آخر ہے، اور اسی طرح مسلمانوں کے اختلافات اتفاق و اتحاد سے بدل سکتے ہیں!

پرویز صاحب فرمائیں کہ "قرآنِ کریم میں جہاں اللہ اور رسول کا ذکر آیا ہے، اُس سے مُراد نظامِ حکومت ہے" — تو تمام مُسلمان ہاتھ جوڑ کر عرض کریں کہ اے "نظامِ ربوبیت کے داعی"! تو نے ٹھیک کہا، ہم اُس خدا کو جسے قرآن "عالم الغیب والشہادۃ، خالق، رازق، حی و قیوم، لطیف و خبیر اور رب العٰلمین کہتا ہے اُسے اب سے "نظامِ حکومت" ہی سمجھا کریں گے سمعنا واطعنا یا پرویز!

پرویز صاحب کہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی اطاعت مسلمانوں پر فرض نہیں رہی، اور اس کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے "صدقت" کا نعرہ بلند ہو اور وہ گزارش کریں کہ اے "صاحب مفہوم القرآن" مرحبا! اطاعتِ رسول کے عقیدے نے کتنی بہت سی بیڑیاں مسلمانوں کو پہنا رکھی تھیں، "اطاعتِ رسول" کے انکار کے بعد یہ تمام بیڑیاں،

چمن چمن ٹوٹ گئیں، اور اس اطاعت سے انکار کی بدولت کتنی بہت سی جھنجھٹوں سے ہم مسلمانوں کو نجات مل گئی! اور حضور پرویز صاحب! شاید آپنے مُلاؤں کی اکثریت کی داب میں آکر برسبیل تنزل یہ بات فرما دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسلمانوں پر آپ کی اطاعت فرض تھی۔ آخر اس تکلف اور خدا کی اطاعت پر غیر خدا کی اطاعت کے اضافہ کی ضرورت کیا ہے ——— (استغفراللہ، خاک بدہن گستاخ، قلم سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں اور ہمارا خون کھول رہا ہے۔ ارے ظالم! ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

اور

شیطان کی اُمید کا حاصل ہیں یہ انکار!

فریب ہی فریب

ماہ اپریل ۱۹۶۲ء کے "فاران" میں مسٹر پرویز کا خط اور اُس کے جواب میں جناب مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ کا مکتوب گرامی دونوں چیزیں شائع ہو چکی ہیں۔ پرویز صاحب نے ایک دوسرا خط حضرت مفتی صاحب موصوف کو بھیجا ہے، جو خاصہ طویل ہے رسالہ "طلوع اسلام" کے نو صفحات اس خط نے سیاہ کئے ہیں! اس خط میں پرویز صاحب نے اپنی تحریروں کے چند اقتباسات درج کئے ہیں، جن سے واقعی یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ "مُنکرِ خدا" نہیں ہیں، ان تحریروں میں پرویز صاحب نے اللہ تعالیٰ کو قیوم، رحمٰن و رحیم، غیب و شہادت کا جاننے والا، تمام قوتوں کا مالک، ہر عیب سے پاکیزہ، مالک الملک اور شہنشاہ حقیقی تسلیم کیا ہے، اور یہ بھی مانا ہے کہ "وہ اُس وقت بھی موجود تھا، جب کوئی تصور کرنے والا ذہن موجود نہیں تھا، اور اُس وقت بھی موجود ہوگا، جب کوئی تصور کرنے والا ذہن موجود نہیں ہوگا۔"

پرویز صاحب نے اپنے خط میں اپنی تحریروں کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"میں پوچھنا چاہتا ہوں "مستند اور معتمد علماء" کی اس جماعت سے جس نے میرے لٹریچر کو "پورے غور اور پوری پوری احتیاط کے ساتھ اس کے اقتباسات پیش کئے" کیا انہیں میرے لٹریچر میں مندرجہ بالا عبارات کہیں دکھائی نہیں دیں (اور اگر دکھائی نہیں دیں تو کیوں؟) اور میں پوچھنا چاہتا ہوں آپ حضرات سے جنھوں نے اس فتویٰ کی توثیق فرما دی کہ جس شخص کا عقیدہ وہ ہو جو مندرجہ بالا عبارات سے روز روشن کی طرح واضح ہے، کیا اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ وہ موجود فی الخارج خدا کی ذات کا منکر ہے؟"

ہم نے ذاتِ باری کے متعلق پرویز صاحب کے اقتباسات کا خلاصہ اور اُن کی تحریر کا ایک اقتباس اس غرض سے پیش کیا ہے کہ عنداللہ اور عندالناس ہم کسی ملزم کی صفائی کے بیان اور اُس کے دلائل کی پردہ پوشی کرنے والے نہ ٹھیریں!

اس خط میں مفتی صاحب موصوف کو پرویز صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:۔

(۶) "اگر آپ ایک مخلصانہ مشورہ پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں تو میں عرض کروں گا کہ اگر آپ فتاویٰ صادر کرنے کی اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں تو آپ کے لئے بہت اچھا ہوگا ــــ اس لئے کہ اس قسم کے فیصلے دینے کے لئے جس تحقیق اور کاوش کی ضرورت ہے وہ

(معاف بفرمائید) آپکے بس کی بات نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے مسٹر پرویز کو اس خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا مگر مفتی صاحب کا خط مختصر ہے، اس لئے پورے کا پورا درج کیا جاتا ہے :۔

جناب پرویز صاحب ۔ السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

بجواب مراسلہ مورخہ ۲۵ ۔ مارچ عرض ہے کہ میں نے اپنے سابقہ مکتوب مورخہ ۱۲ مارچ میں گذارش کی تھی کہ آپ کسی ایسی عبارت کی نشاندہی کریں جو آپ کی جانب غلط منسوب کی گئی ہے یا کوئی اقتباس پیش کریں جو ایسا ناقص اور ادھورا ہے کہ سیاق سباق سے ہٹ کر کوئی بالکل مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے ۔ اگر ایسی کوئی صورت ہے تو یقیناً اس پر غور کیا جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اگر نفس فتویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اس امر کی اشاعت بھی ضرور کیجائے گی ۔ اس قسم کی کوئی عبارت یا کوئی اقتباس آپ پیش نہیں کر سکے ۔ اس صورت میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ آپ کھلے دل سے اس بہتان پر معذرت کرتے جو آپنے علماء پر لگایا ہے کہ :۔

"میری تحریروں سے ایک آیک دو فقرہ اِدھر اُدھر سے اخذ کر لیا گیا ہے اور انہیں مکمل اقتباسات کہہ کر پیش کر دیا گیا ہے ۔ پھر ان منتشر ٹکڑوں سے جو مفہوم مرتب کیا گیا ہے وہ بے حد غلط اور گمراہ کُن ہے ۔"

بجائے اس کے آپ نے پھر غلط بحث کی سعی لاحاصل شروع کر دی اور ایک طویل مراسلہ لکھ مارا جس کا زیادہ سے زیادہ حاصل یہ ہے کہ آپنے اپنی ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تصانیف میں متعدد جگہ ذات باری تعالیٰ کے متعلق صحیح تصور بھی پیش کیا ہے ۔ معلوم نہیں اس کی ضرورت آپ کو کیوں لاحق ہوئی ۔ اس لئے کہ علماء نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ساری عمر میں آپ نے اپنی تحریروں میں کوئی بات یا کوئی عبارت صحیح لکھی ہی نہیں ۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر سو جگہ ایک شخص بالکل صحیح بات کہے اور دس بیس جگہ بالکل غلط بلکہ کافرانہ عقائد کا اظہار کرے تو کیا محض یہ امر کہ اس نے متعدد بار صحیح بات بھی کہی تھی اس کو غلط تصورات رکھنے یا شائع کرنے کی ذمہ داری سے بری قرار دے دیگا ـــــــ آخر مرزا غلام احمد آنجہانی نے بھی تو متعدد جگہ اپنے آپ کو غیر نبی قرار دیا ہے صرف چند ہی مقامات ایسے ہیں جہاں اس نے نبوت کا دعوےٰ کھل کر پیش کیا ہے ۔

اللہ پاک کے متعلق ملّتِ اسلامیہ کے مسلمہ عقیدہ کو لیجئے اور پھر محض نمونہ کے طور پر آپ کی ان چند عبارتوں ہی کو دیکھیئے جو خود اس فتویٰ میں درج ہیں :۔

اللہ رسول سے مراد مرکز ملت ہے (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۲۵ و ۶۲۶)

اللہ و رسول سے مراد ہی مرکز ملت ہے (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۸۶)

"خدا" عبارت ان صفات عالیہ سے ہے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے (معارف ص ۴۲۰)

قرآن کریم میں جہاں اللہ اور رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مرکز نظام حکومت ہے (معارف ج ۴ ص ۶۲۴)

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اللہ و رسول سے مراد مسلمانوں کا امام ہے (معارف ج ۴ ص ۶۲۴)

"قرآن کریم میں مرکز ملت کو اللہ اور رسول کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے" اللہ اور رسول یعنی مرکز نظام ملت کی

اطاعت کی تاکید کی گئی ہے" (معارف ج ۴ صفحہ ۲۶۱)

"اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد مرکزی حکومت کی اطاعت ہے۔ جو قرآنی احکام کو نافذ کرے گی" (اسلامی نظام صفحہ ۵۸)

اب ذرا ہٹ دھرمی اور سخن پروری کے جذبہ سے ہٹ کر غور کیجئے کہ آیا ذات باری تعالیٰ کا یہی وہ مفہوم ہے جو سلف سے لے کر خلف تک اُمّتِ محمدیہ کا بنیادی عقیدہ رہا ہے۔

پھر اللہ پاک کے بارے میں اس طرح کے تصورات آپ کی تصانیف میں شاذ کی حقیقت بھی نہیں رکھتے بلکہ جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور آپ کے عقائد کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں آپ کا یہ کہنا کہ پچیس سال پہلے کی تصانیف میں آپ نے ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق فلاں بات لکھی اور پھر فلاں مقالے میں فلاں تصور پیش کیا تو اس ایک موضوع کا کیا سوال ہے دوسرے بنیادی مسائل مثلاً حجیت حدیث اور اطاعتِ رسول وغیرہ کے متعلق بھی ابتداءً آپنے جو خیالات پیش کئے وہ چنداں قابلِ اعتراض نہ تھے۔ بہ خوفِ طوالت آپ کی سابقہ تحریروں کے اقتباس پیش کرنے سے اجتناب کرنا چاہتا ہوں ورنہ کتنی ہی عبارتیں بتائی جاسکتی ہیں جن میں باہم تضاد و تہافت نمایاں ہے۔

بہت سے مسائل کے متعلق ابتداءً آپنے کچھ مسلک پیش کیا اور پھر بتدریج اُس منزل کی طرف بڑھتے رہے جہاں آپ اب پہونچے ہیں کہ سُنّتِ رسولؐ کے سرمایہ کو عجمی سازش کہنے لگے اور اُسے استخفاف و استہزاء کا ہدف بنانے لگے اور زیادہ سے زیادہ سے تاریخ کا درجہ دے کر نا قابلِ اطاعت قرار دیدیا۔

مراسلہ کے اختتام سے پہلے آپ کی توجہ آپ ہی کی ایک عبارت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ تاکہ "کافر گری" کی جو پھبتی آپ نے چست کرنے کی کوشش کی ہے اس کے متعلق آپ اپنا موقف بھی نظر میں رکھیں۔ آپ ہی کی تحریر ہے کہ "تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا سارا زور اسی میں صرف ہوتا رہا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے کے مذہب میں تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور آج جو اسلام دنیا میں مروج ہے وہ زمانہ قبل قرآن کا مذہب ہو تو ہو قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں" (سلیم کے نام صفحہ ۲۵۲)

اس میں آپ نے تیرہ سو سال کی پوری اُمّتِ محمدیہؐ کے اربوں مسلمانوں کو جن میں ائمہ دین صلحاء۔ اولیاء۔ اتقیاءً بھی لاکھوں کی تعداد میں شامل ہیں یک قلم قرآن کا دشمن اسلام سے خارج قرآنی دین سے بے تعلق۔ جاہلیت کے مذہب کا پیرو قرار دیدیا ہے اس وقت آپ کو اپنے الفاظ میں یہ خیال نہ آیا کہ:-

"خدا شاید یہ تو پوچھ لے کہ تم نے کتنے کافروں کو مسلمان بنایا تھا لیکن یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے کتنے مسلمانوں کو کافر بنایا تھا" (حالیہ خط)

ایک فرد "پرویز صاحب" کی تکفیر و تفسیق سے تو آپ کے نزدیک اُمّت میں زلزلہ آگیا اور ناقابلِ تلافی نقصان پہونچ گیا مگر پوری اُمّت کی تکفیر و تفسیق سے اسلام اور اُمّتِ اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہونچا۔

میں نے اپنے پہلے خط میں بھی لکھا تھا کہ لاطائل بحث و جدال کی نہ مجھے فرصت ہے، نہ اس کا کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ اب آپ کے مکتوب کے فقرہ مختتم میں جو لب و لہجہ استعمال کیا گیا ہے جس سطح پر آکر آپنے گفتگو شروع کی ہے اور جو زبان اختیار کی ہے اس کے پیش نظر اس رجحان کو مزید تقویت ہوئی کہ اس جواب کو اپنی جانب سے آخری جواب تصور کروں اور آپ سے درخواست کروں کہ مجھ سے مزید مراسلت کی زحمت نہ کریں نہ مجھ سے آئندہ کسی مراسلت کے

جواب کی توقع کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت کی راہ دکھائیں ۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ ۔ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ ـــــــــــــ

یہ واقعہ ہے کہ پرویز صاحب اپنی کسی ایسی عبارت کی "نشان دہی" نہیں کرسکے، جسے علماء کرام کے فتویٰ میں توڑ موڑ کر، یا سیاق و سباق سے علیحدہ کرکے اس طرح پیش کیا گیا ہو کہ لکھنے والے کا اصل مفہوم ہی خبط، اُلٹا اور کچھ سے کچھ ہو گیا ہو! پرویز صاحب نے علماء پر اپنی عبارتوں کی تحریف اور مفاہیم کے غلط طور پر اخذ کرنے کی، جو تہمت لگائی تھی۔ اُس تہمت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنی تحریر کا ایک جملہ بھی وہ پیش کرنے سے قاصر رہے! علماء کرام نے اس کا دعویٰ کب کیا تھا کہ پرویز صاحب کی تحریر کا ایک ایک لفظ کفر و ضلالت کے سوا اور کچھ نہیں ہے' اور اُن کے قلم سے کوئی حق بات ہی نہیں نکلی!

ایمان و کفر کے کلمات میں ریاضی کے قاعدے کے مطابق تناسب (Ratio and Proportion) اور شرح اوسط نہیں نکالی جاتی، کسی شخص نے زبان و قلم سے ہزار بار اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کیا ہو۔ لیکن اگر وہ ایک بار بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کی صریحی طور پر نفی کردے تو اُسے کافر قرار دیا جائے گا ـــــــــ سامنے کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ساری عمر کسی حکومت کا وفادار رہا ہو اور اس کے زبان و قلم نے لاکھوں بار اس حکومت کی وفاداری کا اعلان کیا ہو ــــ مگر صرف ایک بار اُس کی زبان سے یہ لفظ نکل جائیں ۔

"میں حکومت کو اور اُس کے قانون کو نہیں مانتا، اس لئے کہ حکومت تو میں خود ہوں"

تو اُس شخص کو اس ایک بار کے اعلان پر حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا!

ایک شخص زندگی بھر کسی کی مدح سرائی، منقبت خوانی اور تکریم و اجلال کرتا رہا ہے مگر صرف ایک بار اُس شخص کو گالیاں سُنا دے ــــــــ تو اس ایک بار کی دُشنام طرازی کو کیا اُس شخص کی "توہین" نہ سمجھا جائے گا۔

پرویز صاحب نے لکھا ہے :-

"خدا عبارت ہے اُن صفاتِ عالیہ سے، جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے"

(معارف القرآن جلد چہارم، ص ۴۲)

یہ ایک مختصر سا جملہ بہت سی غلطیوں اور گمراہیوں کا مجموعہ ہے! اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں یوں کہنا ــــ "کہ وہ فلاں صفات سے عبارت (یعنی مرکب) ہے" قابلِ اعتراض ہے' یہ اندازِ بیان ہی اپنی جگہ "ذاتِ بحت" کی "صفتِ تنزیہہ" اور "شانِ تجرید" کے خلاف ہے! انسان اپنے اندر بندگی، انکسار اور ایثار کی صفات بھی منعکس دیکھنا چاہتا ہے ــــ تو کیا بندگی، انکسار اور ایثار بھی اُن صفات میں داخل ہیں' جن سے پرویز صاحب کے بقول خدا کی ذات عبارت ہے۔

ایک عامی سے عامی مسلمان بھی "اللہ" سے "اللہ" ہی مُراد لیتا ہے' وہ جو اس کائنات کا خالق، سب کا معبود اور رب ہے اور جس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی جنبش نہیں کرسکتا ــــــــ مگر پرویز صاحب نے اپنی کتاب "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے صفحہ ۱۶ پر " لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا " کی شرح کرتے ہوئے "اللہ" سے معاشی زندگی کا قانون مراد لیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :-

"کیا ان لوگوں نے اپنی معاشی زندگی (ارض) کے لئے الگ الگ قوانین تجویز کر رکھے ہیں جن کی یہ اطاعت کرتے ہیں' اور ان کے سہارے اپنے معاشی پروگرام کو عام کرنا چاہتے

ہیں، اگر اُن کی یہی روشِ زندگی ہے، تو اُنہیں سُن رکھنا چاہیئے کہ اگر انسان کی معاشی زندگی
میں کوئی اور قوانین نافذ ہوں، اور کائناتی زندگی میں اور، تو اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ
نہ ہوگا۔"

قرآن کریم کی اس "محکم" آیت کی شرح و تفسیر میں "اللہ" سے "معاشی زندگی کا قانون" مراد لینا "کفر" نہیں تو اور کیا ہے۔
"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کا مطلب قرآن کریم کے اس عجیب و غریب بلکہ نادر الوجود مفسر کی زبان سے سُنیئے:۔

"جس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں وُہی معاشرہ مستحق تعریف و ستائش ہوگا، جو رَبُّ الْعٰلَمِیْن
(تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا۔" (سلیم کے نام بارھواں خط ص۱۹۳)

جس شخص نے قرآنِ کریم کی اس قدر کھلی ہوئی تحریف کی ہو کہ "اللہ" اور "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" تک کے معنی بدل کر "اللہ" کو "معاشی زندگی کا قانون" اور "ربّ العلمین" کو "معاشرہ" بنا ڈالا ہو، اُس کی "تکفیر" نہ کی جائے گی، تو کیا تصویب، تائید اور مدح و ستائش کی جائے گی۔

اس دشمنِ قرآن سے کوئی پوچھے کہ "ربّ العالمین" سے اگر "معاشرہ" مراد ہے، تو پھر سورۂ فاتحہ میں "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" کو جو "مالکِ یوم الدین" کہا گیا ہے، تو کیا "یوم الدین" کا "مالک ہونا" یہ بھی اسی معاشرے کی صفت ہے، اور یہی معاشرہ کیا معبود و مستعان بھی ہے (ایاک نعبد و ایاک نستعین) اور اسی "معاشرے" سے کیا صراطِ مستقیم دکھلانے اور اُس پر چلانے کی دُعا کی جاتی ہے (اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ)

اسی رسالہ میں پرویز صاحب نے "طلوعِ اسلام" کا یعنی اپنا مسلک بیان کیا ہے، جس کا پہلا جملہ یہ ہے:۔

"قرآنِ کریم، تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی کا آخری ضابطۂ حیات
ہے اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔"

جس قرآن کریم کو پرویز صاحب نے یہاں "آخری ضابطۂ حیات" کہا ہے، اُس کی معنوی تحریف کے چند نمونے آپ دیکھ چکے ہیں، اس "آخری ضابطۂ حیات" کی ان کی نظر میں کیا حیثیت ہے، یہ بھی اُن کی زبان سے سُن لیجئے:۔

"اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو قرآن شریف میں وراثت، وغیرہ کے احکام
کس لئے دیئے گئے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن، انسانی معاشرے کو اپنے متعین کردہ
پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول و احکام متعین کرتا ہے، عبوری دور کے لئے بھی ساتھ
ساتھ رہنمائی دیتا چلا جاتا ہے، **وراثت** قرضہ، لین، دین، صدقہ خیرات وغیرہ
کے احکام اُس **عبوری دور** سے متعلق ہیں، جن سے معاشرہ گزر کر انتہائی منزل
تک پہونچتا ہے　　　(نظامِ ربوبیت ص۱۲۵، تعارفِ کتاب)

"وراثت" کے احکام کو "عبوری دور" سے متعلق بتاکر پرویز صاحب نے قرآن کے قانونِ وراثت اور علم الفرائض پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا، یعنی جب "عبوری دور" نہ ہوگا اور معاشرہ اپنی آخری منزل پر پہونچ جائے گا تو اس وقت قرآن کریم میں جو وراثت کے احکام آئے ہیں، وہ ناقابلِ عمل، معطل اور (OUT OF DATE) بن کر رہ جائیں گے ——— اور یہ "کفریات" اس شخص نے اس لئے بکی ہیں کہ کمیونزم جو ذاتی ملکیت کی نفی کرتا ہے، اُس کا جواز ثابت ہو جائے۔

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں"
یہ "طلوعِ اسلام" یعنی پرویز صاحب کا "مسلک" ہے، جو اپریل ۱۹۶۲ء کے شمارے میں پیش کیا گیا ہے ـــــ مگر "سلیم کے نام" پرویز صاحب کا جو پندرھواں خط ہے، اس کے صفحہ ۲۵۰ پر عقیدۂ "ختمِ نبوت" پر اس طرح ہاتھ صاف کیا گیا ہے :-

"لیکن اُمم سابقہ اور نزولِ قرآن کے بعد کے دور میں ایک فرق ان سب سے گہرا اور اہم تھا جس لئے تمہیں کسی گزشتہ خط میں بتایا تھا کہ ختمِ نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں، بلکہ تصورات (Ideologies) کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا، اور انسانی معاشرے کی باگ ڈور اشخاص کی بجائے نظام کے ہاتھ میں ہوا کرے گی، اس خصوصیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نزولِ قرآن (یعنی ختمِ نبوت) کے بعد اشخاص (Individuals) کا دور ختم ہو گیا، اور اُن کی جگہ اُمتوں کا دور شروع ہو گیا، اسی لئے قرآن میں ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد فریضۂ رسالت اور قرآنی معاشرہ کے لئے ایک اُمت کی تشکیل کر دی گئی (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ـــ نیز ـــ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ حضور کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، اس لئے اب قیامت تک بس ایک ہی اُمت پائی جائے گی، مگر پرویز صاحب فرماتے ہیں ــــ "اُمتوں کا دور شروع ہو گیا" یعنی وہ "ایک امت" کی جگہ "بہت سی امتوں" کا امکان تسلیم کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ "بہت سی اُمتیں" اسی وقت ظہور میں آسکتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے نبیوں کا آنا بھی ممکن ہو۔

نبی انسان ہوتا ہے اور اُمت بھی انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے ــــ تو جب انسانوں کا یہ مجموعہ پرویز صاحب کے بقول "فریضۂ رسالت" کو ادا کیا کرے گا (یا ادا کرتا رہا ہے) تو پھر نبوت ختم کہاں ہوئی، فریضۂ رسالت ادا کرنے کے منصب پر تو امت مسلمہ فائز ہے۔

پرویز صاحب کی تحریر کا جو اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے، اس کے ابتدائی جملوں کو ایک بار پھر پڑھئے، ان کی تحریر سے واضح طور پر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ شخصیتوں (یعنی نبیوں) کے ذریعہ جو انقلاب آیا کرتا تھا وہ انقلاب اب بھی آیا کرے گا، مگر وہ انقلاب شخصیتوں کی بجائے "تصورات" کے ذریعہ برپا ہوا کرے گا، اس طرح پرویز صاحب حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد "نبوت" کی ضرورت اور اس کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ ختمِ نبوت کے ساتھ "نبوی انقلاب" کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا، ہدایت و سعادت اور دین و اخلاق کا جو انقلاب آنا تھا وہ آچکا، اس آخری انقلاب میں اب کوئی "تصور" نہ کمی کر سکتا ہے اور نہ اضافہ! اس انقلاب کی ہاں! تجدید ہوتی رہے گی!

پھر پرویز صاحب کا یہ فرمانا کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ "تصورات" (Ideologies) کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا، کس درجہ مضحکہ خیز اور واقعیت کے خلاف ہے، اُن دماغوں کو کیا کہئے جو اس قسم کی بے دانشی اور گمراہی کی باتوں کو پڑھتے ہیں اور اُن سے متنفر اور بیزار ہونے کی بجائے، اُن کا اثر قبول کرتے ہیں۔

بر ایں عقل و دانش بباید گریست

سوال یہ ہے کہ یہ "تصورات" جن کے ذریعہ دنیا میں انقلاب برپا ہوا کرے گا، آخر کیا ہوا میں پائے جائیں گے یا پانی کی موجوں پر!
پھر یہ "تصورات" بادلوں کے ٹکڑوں، درختوں کی چھالوں اور پہاڑوں کی چٹانوں پر لکھے ہوئے ملا کریں گے۔ "تصورات" کا تعلق
بہرحال انسانوں ہی کے ذہن و فکر اور دل و دماغ سے ہے۔

تو پھر
لاب کے لئے شخصیتوں (یعنی نبیوں) کا دور ختم کہاں ہو گیا! یہ "تصورات" تو بہرحال انسانی ذہن و فکر ہی میں پائے جائیں گے
فلسفیانہ نکتوں کے ساتھ مسٹر پرویز نے اُمّتِ مسلمہ کے متفقہ عقیدہ "ختم نبوت" کی نفی اور تردید کی ہے، اس سے اس شخص کے
یدہ، فکر، مزاج، عزائم اور مشن کا اندازہ ہو سکتا ہے "نبوت" کو جاری اور باقی رکھنے کے لئے جو نکتے مسٹر غلام احمد پرویز
سوجھے ہیں وہ نکتے مرزا غلام احمد قادیانی کو کہاں سوجھے تھے؟

"نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ تمام نوعِ انسان کے لئے بلندیٔ اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ (اُسوۂ
حسنہ) ہے، جس کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے۔"
(طلوعِ اسلام کا مسلک نمبر ۳)

گذارش یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "اسوۂ حسنہ" ہے کہاں؟ اُسے کس جگہ تلاش کیا جائے! اس سوال کا صرف
یک جواب ہو سکتا ہے ـــــ یہ کہ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ "احادیث" میں ملتا ہے ـــــ مگر "احادیثِ نبویؐ" کو نا قابلِ اعتماد
ساقط الاعتبار ٹھیرانے کے لئے پرویز صاحب نے برسوں سے باقاعدہ مہم شروع کر رکھی ہے، اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
کی احادیث سے جیسی دشمنی ہے ایسی دشمنی دنیا میں اور کسی چیز سے نہیں ہے! یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ثابت ہو کر
سوۂ حسنہ "سُنّتِ رسولؐ" ہی کا دوسرا نام ہے، اور پرویز صاحب "سُنّتِ رسولؐ" کو دین میں حجّت نہیں سمجھتے!
سنّتِ رسولؐ کی مخالفت میں اس شخص نے سینکڑوں صفحے سیاہ کئے ہیں، اور پاکستان میں جب بھی دستور سازی کا موقعہ آیا ہے
یز صاحب نے "سُنّتِ رسولؐ" کے خلاف منظم مہم چلائی ہے! ایک طرف "سُنّتِ رسولؐ" سے عداوت، نفرت اور بیزاری
ظہار، دوسری طرف اس مسلک کا اعلان کہ "اُسوۂ حسنہ کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے" اتنا شدید نفاق
ور کھلا ہوا دھوکا! اس طبیب کو کیا کہئے جو ایک دوا کے بارے میں ہزاروں بار اس کا اعلان کر چکا ہو کہ یہ دوا "زہرِ قاتل"
مگر جب مستند اور حاذق اطبا، اس کی اس حماقت پر گرفت کریں تو دنیا دکھاوے کے لئے یہ بھی کہہ دے کہ اس "دوا" کے
ل سے جسمانی توانائی وابستہ ہے! اگر اُسوۂ رسولؐ کے اتباع کو پرویز صاحب منصوص اور دین میں حجّت سمجھتے ہیں تو وہ
کا اعلان کریں کہ میں نے اُسوۂ حسنہ اور سُنّتِ رسول کے خلاف اب تک جو کچھ لکھا ہے، اس سے میں توبہ کرتا ہوں، ان
روں کو مجھ سے منسوب نہ کیا جائے۔

"احادیث کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور وضعی بھی، جو روایت
قرآنِ کریم کے خلاف ہو، یا جس سے نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر کسی قسم کا حرف
آتا ہو، وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ (طلوعِ اسلام مسلک نمبر ۳)

پرویز نے "احادیث" کے بارے میں مفاد پرست اور غلط کار سیاست دانوں کی طرح اپنے مسلک کا اعلان کر کے مسلمانوں کی
ں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے ـــــ سوال یہ ہے کہ "صحیح حدیث" کے [illegible]

شخص یہاں چھپا گیا ہے، تاکہ یہ شخص خود اور اس کے حواری نادان مسلمانوں کو دھوکا دے سکیں کہ احادیث کے پرکھنے کا جو معیار
محدثین نے مقرر کیا ہے، اُسی معیار کو پرویز صاحب بھی درست مانتے ہیں ۔

"صلوٰۃ" (جس کا فارسی اور اُردو میں نماز ترجمہ کیا گیا ہے) دین کا ستون ہے، قرآن کریم میں بار بار فریضۂ صلوٰۃ کے
ادا کرنے کا حکم اور تاکید آئی ہے، مگر پرویز صاحب نے دین کے اُس رکن عظیم پر بھی تیشہ چلا دیا، فرماتے ہیں :-

> آج جب کہ مسلمانوں میں صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز، پرستش یا ہندی زبان میں پوجا
> پاٹ ہو کر رہ گیا ہے، یہ سمجھنا ذرا دشوار ہے کہ "قیام صلوٰۃ" کا صحیح مفہوم کیا ہے
> ہمارے ہاں "قیام صلوٰۃ" کا ترجمہ کیا جاتا ہے "نماز قائم کرو" اور اس کا مطلب یہ
> لیا جاتا ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ پڑھو، اور اس سے مقصود ہوتا ہے خدا کی
> پرستش، اس لئے آج یہ بات بمشکل سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس پرستش کو "معاشی امور"
> سے کیا واسطہ! یہ شبہ کوئی نیا نہیں، وحی کی طرف سے ہمیشہ دین (نظام زندگی)
> ملتا تھا، لیکن اسے انسان رفتہ رفتہ مذہب (دھرم) میں بدل دیتے تھے، اس طرح دین کے
> وہ تمام عناصر جو نظام زندگی کے ستون تھے، رفتہ رفتہ پوجا پاٹ میں بدل جاتے تھے، اور اُن کا
> انسانی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تھا، یہی کچھ سابقہ اقوام نے کیا، اور یہی کچھ مسلمانوں
> سے ہوا۔" (قرآنی نظام ربوبیت ص ۱۸۵)

"الصَّلٰوۃ" پر مسٹر پرویز نے یہ جو کچھ لکھا ہے تو یہ ظالم ایک ہی وار میں قرآن کی محکم تعلیم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام
کے دائمی عمل اور امت مسلمہ کے .... ایک لمحہ کی فترت کے بغیر مسلسل اور متواتر مسلک عبادت اور طریق پرستش پر ہاتھ صاف کر گیا
"الصَّلٰوۃ" کو پرستش اور پوجا پاٹ میں بدلنے کا جرم (معاذاللہ - - - استغفراللہ - - - خاک بدہن گستاخ "لعنت بر ایں
فکر و بر آں مفکر) تو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرزد ہوا تھا، اور اسی جرم کا پورے چودہ سو سال سے امت ارتکاب
کرتی چلی آرہی ہے -- ! (توبہ! توبہ)

ایک کافر بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "الصَّلٰوۃ" کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مسجد تعمیر کی
تھی، حضورؐ نماز پڑھتے بھی تھے اور پڑھاتے بھی تھے اور یہی نماز رکوع، سجدہ، قومہ، "ما تیسر من القرآن" کی قرات، اور دوسرے
ارکان سے عبارت ہوتی تھی، اسی نماز کے لئے "اذان" دی جاتی تھی، قرآن کریم ہی میں "تبدیل قبلہ" کا حکم آیا ہے کہ بیت
المقدس کی بجائے کعبۃ اللہ کو نماز ادا کرنے (اقامت صلوٰۃ) کی جہت مقرر کیا گیا۔ تو یہ "جہت قبلہ" نماز کے لئے تبدیل کی گئی تھی
یا عرب کے مروجہ "معاشی نظام" کا رُخ بدلنے کے لئے اس جہت کو بدلا گیا تھا!

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں واضح، صریح اور محکم انداز میں حکم دیتا ہے :-

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ
وَذَرُوا الْبَیْعَ"

(اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے، تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو
اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو)

قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے اسی فریضہ کی تعمیل میں نمازِ جمعہ کے لئے پابندی کے ساتھ اذان دی جاتی ہے اور مسلمان جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے (یعنی خطبہ کے ساتھ نماز ادا کرتے) ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل پر کون صاحبِ ایمان اور ذی ہوش انسان "پوجا پاٹ" کی طنز کر سکتا ہے! ہاں وہ شخص کر سکتا ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کے دین کے ڈھانے کو، اپنی زندگی کا مقصد ٹھیرا لیا ہو!

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ نماز (اللہ کی پرستش) کا تعلق معاشی امور سے ہے، مگر قرآن نماز ادا کرنے کے لئے "معاشی امور" (خرید و فروخت) کو چھوڑنے کا حکم دیتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں برسوں کامل مداومت کے ساتھ آخر دم تک پڑھی ہیں اور پڑھائی ہیں، عہدِ رسالت اور دورِ خلافت میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی مسلمان عمداً نماز ترک بھی کر سکتا ہے، مگر پرویز صاحب قرآنی فریضہ کی اس ادائگی کے عمل کو بھی ایک ایسی غلط اور غیر قرآنی چیز سمجھتے ہیں جسے مسلمانوں نے سابقہ اقوام (یعنی یہودیوں، نصرانیوں اور مجوسیوں) کی طرح "پوجا پاٹ" میں بدل دیا ہے —— (معاذ اللہ)

اللہ۔ آخرت، ملائکہ وغیرہ کے بارے میں پرویز صاحب کے کیا عقائد اور تصورات ہیں ان کو چھوڑیئے، تنہا یہی عبارت جس میں انھوں نے "فریضۂ صلوٰۃ" پر پھبتیاں کسی ہیں، اُن کے کافرانہ تصورات، ملحدانہ عقائد اور اینٹی اسلام پروگرام کا بین ثبوت ہیں۔

نوجوان تعلیم یافتہ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مسٹر پرویز فریب و دغا کا ایک اور کھیل بھی کھیل رہے ہیں، وہ اپنے مضامین میں علامہ اقبالؔ کے اشعار جگہ جگہ نقل کرتے ہیں، اور کلامِ اقبال کے شارحِ اعظم بلکہ اقبال کے معنوی جانشین بن بیٹھے ہیں، تاکہ لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہو جائیں کہ پرویز صاحب کے جو تصورات اور عقائد ہیں یہی عقائد و تصورات علامہ اقبال کے ہونگے۔

اقبال کا کلام اور اُن کے مضامین موجود ہیں، اُن کے دیکھنے والے اور اُن کی صحبت سے استفادہ کرنے والے موجود ہیں، اقبال دین میں وہی مسلک اور موقف رکھتے تھے، جو جمہورِ اُمت کا ہے، "سُنّتِ رسولؐ" کو وہ دین میں حجت سمجھتے تھے، یہاں تک کہ فقہی مسائل میں اسلاف کے طریقہ کار کو پیشِ نظر رکھنے کی انھوں نے تلقین کی ہے —— اقبال کا یہ شعر دین و اخلاق کی دُنیا میں ضرب المثل بن چکا ہے: ؎

به مصطفیٰؐ برساں خویش را که دیں ہمہ اُوست
اگر به اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہماری جانیں سرکار کی خاکِ پا پر قربان ہوں) کو "ہمہ دین" یعنی تمام دین، سراپا دین، مجسم دین، بلکہ عین دین سمجھتے تھے، اور پرویز کا یہ مسلک ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد آپ کی اطاعت ہی سرے سے ساقط ہو گئی! علامہ اقبال اور پرویز کے عقائد و تصورات میں بعد المشرقین ہے! —— اور یہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

اگر به اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

تو

پرویز صاحب ابولہب کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنے اور حضورؐ کے گرد جمع ہونے سے مسلمانوں کو روکتے ہیں اور اس دور میں وہ "بولہبی" مشن کی تبلیغ کر رہے ہیں، اور اقبال کے اس مصرعہ کا صحیح مصداق ہیں۔

عُلماءِ کرام نے پرویز کی جو تکفیر کی ہے، تو اس کی مخالفت قادیانیوں کے حلقہ کے سوا مُسلمانوں کے کسی طبقہ نے

نہیں ہوسکتی (الکفر ملۃ واحدۃ) یا پھر وہ لوگ اس فتویٰ پر ادیبانہ انداز میں ایک آدھ چلتا ہوا فقرہ جڑ سکتے ہیں، جو قادیانیوں کو "گمراہ" سمجھتے ہوئے اُن سے ربط رکھتے ہیں ـــــ بعض ایسے عُلماء دین بھی ہوسکتے ہیں کہ "تکفیر کے معاملہ میں جن کی "شدتِ احتیاط" "وہم" کی حد تک پہونچ گئی ہو" اور وہ پرویز صاحب کی گمراہیوں کو "قریب کفر یا مشابہ کفر" سمجھتے ہوں

اس میں کوئی شک نہیں کہ چودھری غلام احمد پرویز بٹالوی کی گمراہیاں نہ صرف یہ کہ کفر کی حد تک پہونچ گئی ہیں بلکہ کفر کی سرحد کو عبور کرچکی ہیں، اسلئے علماء کرام کی علمی بصیرت، دینی غیرت اور احساسِ ذمہ داری کو اپنا فریضہ انجام دینا پڑا۔

مسٹر پرویز کی گمراہی اور کفریات صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہیں۔ ان صاحب نے اپنے گمراہ کن تصورات اور کفریہ خیالات کی اشاعت کے لئے باقاعدہ ادارہ قائم کیا ہے جس کی شاخیں پاکستان کے مختلف شہروں میں قائم ہیں، ہزاروں صفحے کا لٹریچر ملک میں پھیل چکا ہے، اور اس شخص کو کچھ ہمدرد اور ہم نوا بھی ہاتھ لگ گئے ہیں! وقت کی اس ستم ظریفی کو دیکھئے کہ اس بیت الضلالت اور دارالکفر کا نام "طلوعِ اسلام" رکھا گیا ہے!

اس "دارالکفر" (طلوعِ اسلام) کا پیشوا اور بانی (پرویز) اس زعم اور دعوے کے ساتھ اُٹھا ہے کہ تیرہ سو سال سے مسلمان اسی کوشش میں لگے رہے ہیں کہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے کے مذہب میں تبدیل کردیں، مسلمان اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوگئے، اور آج پوری اُمتِ مسلمہ قرآنی دین سے برگشتہ ہوچکی ہے! (خاک بدہن گستاخ)

ظاہر ہے بلکہ ناگزیر ہے

کہ جس شخص کا یہ دعویٰ ہو تو وہ دین کی ہر قدر، شریعت کے ہر حکم اور قرآن کے ہر مفہوم اور اصطلاح کو اس حالت و ہیئت پر اور مفہوم معنیٰ میں نہ رہنے دے، جس پر اُمتِ مسلمہ کا اجماع رہا ہے، یہاں تک کہ "اللہ" کے مفہوم کو بھی بدل کر رکھدے! قرآن اور دین کی تحریف کا یہی کام یہ شخص انجام دے رہا ہے اور اس نے گمراہی کی باقاعدہ ایجنسی اور کفر و ضلالت کو پھیلانے کی "کمپنی" قائم کر رکھی ہے

اللہ، رسول، قرآن اور دین و شریعت کے خلاف ادارہ "طلوعِ اسلام" جو منظم کوشش کر رہا ہے، وہ اس دور میں شیطان کی سب سے بڑی سازش ہے، مسلمانوں کی دینی غیرت اور دینی حمیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ علمی دلائل اور "اطاعتِ رسولؐ" کی مثبت کوشش کے ساتھ اس سازش کو ناکام بنادیں!

ماہر القادری

۲۷ اپریل ۶۲ء

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

علامہ اقبال اور روایت

بعض حلقوں میں علامہ اقبال پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اپنی شاعری میں وہ روایت کی پابندی کے سلسلے میں بہت زیادہ قدامت پسند نظر آتے ہیں۔ اس قول کا جائزہ لینا ہی اس مضمون کا مقصد ہے۔ علامہ مرحوم کے کلام پر براہ راست گفتگو کرنے سے پہلے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ روایت اور بغاوت کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔ تاکہ بات سمجھنے اور سمجھانے میں ذرا آسان ہو جائے

انسانی زندگی میں ایک اہم کردار زمانے کا ہے۔ اس کی زندگی زمان و مکان میں مُقید کر دی گئی ہے۔ وقت گزرتا ہے اور اس دوران میں کچھ واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالےٰ نے دوسرے جانوروں کے مقابلے میں حافظے کی قوت زیادہ دی ہے اس لئے وہ ہر اہم واقعے کو کلی یا جزوی طور پر یاد رکھنے کی کوشش کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور اسی قوتِ حافظے کی بنا پر اس کو تہذیب و تمدن کی نعمت ملی ہے ورنہ وہ ابھی تک ایک وحشی جانور سے زیادہ نہ ہوتا اس قوتِ حافظ کی بنا پر ماضی اس کے لئے بڑی حد تک حال میں منتقل ہو جاتا ہے اور ماضی کی افادیت باقی رہتی ہے۔ حال کسی طرح بھی ماضی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ برگساں نے بھی اپنے تصورِ زمان میں اس چیز کو بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ماضی کا بہت سا حصہ حال میں منتقل ہو جاتا ہے، اور اسی طرح ماضی اور حال کا بہت سا حصہ مستقبل میں شامل ہو جاتا ہے اس طرح زمانے میں ایک قسم کا تسلسل واقع ہو جاتا ہے اور اس کے نزدیک بنیادی طور پر زمانہ مُسلسل ہے منقسم یا تدریجی نہیں ہے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لئے اس کو دن ہفتوں اور مہینوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ مستقبل بھی امکان کی صورت میں ماضی اور حال میں موجود تھا گو ہمیں اس کا احساس ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مثلاً ایک چھوٹے دانہ میں برگد کا پورا عظیم الشان درخت موجود تھا۔ گو ہمیں نظر نہ آتا تھا۔ صرف اتنا ہوا کہ پانی ہوا اور مرورِ ایام نے اس کی امکانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد دی اور وہ امکان سے وجود میں آیا اور نشو و نما پاکر بڑا ہو گیا اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی شخص کی زندگی کا حال اس کے ماضی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کو خود اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ کہتا ہے کہ اس کا حال ماضی سے بے نیاز ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اس ماضی کے واقعات کی یادگار سے ہی روایات وجود میں آتی ہیں۔ ماضی کے بعض واقعات اپنی کسی اہمیت کی وجہ سے یاد رہ جاتے ہیں اور انہیں کا نام روایت ہو جاتا ہے۔

روایت کا مفہوم متعین کرنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کسی شاعر کا کلام روایت سے یکسر مُبرّا نہیں ہو سکتا کیونکہ روایت ماضی کی چیز ہوتے ہوئے لازمی طور پر حال میں شامل ہو جاتی ہے۔ علامہ کے کلام کے علاوہ کسی دنیا کے شاعر کے کلام کو پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے روایت کا بالکل اثر نہ لیا ہو یا روایت کو بالکل استعمال نہ کیا ہو۔ ہماری زندگی کی نہج ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ ہم بعض روایات کو مُسلمات مان کر آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ البتہ جو روایات فرسودہ اور ناکارہ ہو جائیں اور اپنی افادیت ضائع کر چکی ہوں ان کو ترک کر دیا جاتا ہے اور ترک کر دینا بھی چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ ہر روایت قابلِ ترک ہو جاتی ہے اور اس کے مقابل کی نئی چیز قابلِ اخذ و اکتساب قرار پاتی ہے۔

دوسرا تصور ادب میں بغاوت کا ہے۔ بغاوت کے معنی ادبی تنقید میں پرانی روایات کو ترک کرکے ادب میں نئی قدریں ۔ نیا لہجہ اور نیا اسلوب پیدا کرنا ہیں ۔ یہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ہماری زندگی زمان و مکان میں مقید ہے۔ زمانہ متغیر ہے اس لئے ہماری زندگی بھی فطرتاً تغیر پذیر ہے۔ جس طرح روایت زندگی کا جزو لاینفک ہے اور حال و مستقبل میں جاری وساری رہتی ہے اسی طرح تغیر حال بھی جزو لاینفک ہے۔ ہم مصنوعی طور پر خواہ زندگی میں جمود پیدا کرلیں لیکن فطرت کا تقاضا جمود نہیں ہے ۔ اگر ہم مصنوعی طور پر جمود پیدا کرلیں گے تو فطرت کے خلاف کریں گے ۔ اور فطرت کے خلاف جنگ آزمائی سے کسی نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن بغاوت بھی اسی حد تک مفید ثابت ہوسکتی ہے جس حد تک کہ ضرورت کے مطابق اس کو کام میں لایا جائے یعنی روایت کا جو حصہ ناقص ہوگیا ہو اس کو ترک کردیا جائے اور جو حصہ مفید ہو اس کو برقرار رکھا جائے۔ لیکن ہمارے بعض انقلاب پسند دوست یہ تقاضا کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں کہ روایات کی عمارت کو یکسر ڈھا دیا جائے اور بالکل نئے اسلوب ۔ نئے لہجے اور نئی قدروں کی بنیاد ڈالی جائے۔ یہ ادب کا نظریہ یک رخا ہے' اس سے دوسرا اہم پہلو بالکل نظر انداز ہوجاتا ہے ۔ اس سے ادب میں ہم آہنگی ۔ توازن اور ارتقائی کیفیت باقی نہیں رہتی ۔ کوئی درخت اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی تمام جڑیں کاٹ کر پھینک دی جائیں ۔ ہم اس میں قلم لگا کر اس کی ماہیت اور کیفیت کو بہت کچھ بدل سکتے ہیں لیکن جڑوں پر تیشہ چلا کر تو اس کی کوئی چیز اور کوئی کیفیت یا خصوصیت باقی نہیں رہتی ۔ اور یہ اس سے پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ ماضی کی جڑیں کھود کر ۔ پھینک دینا غلط اور غیر فطری زندگی کی طلب کا مظاہرہ ہوگا اور سراسر تباہ کن ۔ علامہ مرحوم کے متعلق اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ

۱۔ علامہ نے ان روایات کو برقرار رکھا ہے جو مفید اور کارآمد تھیں اور ان کو ترک کردیا ہے جو ناقص اور ناکارہ ہوچکی تھیں اور جن کا باقی رہنا مصلحت کے خلاف تھا ۔

۲ ۔ جن روایات کو باقی رکھا ہے ان کو بھی بالکل نئے لباس میں پیش کیا ہے ۔ اس طرح سے کہ ان میں سے بعض کی اس وقت صورت پہچاننا بھی مشکل ہے ۔

۳ ۔ علامہ بعض روایات کے خود موجد ہیں اور ایسی نئی چیزیں پیش کی ہیں جو اُن سے پہلے کہیں اردو ادب میں کہیں نہیں ملتیں ۔ اور اگر ملتی بھی ہیں تو نہایت خفیف اشاروں کی صورت میں ۔

۱۔ اب ہم ان تینوں نکات کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔ علامہ نے جن روایات کو باقی رکھا ہے ۔ ان میں سے بھی بعض ایسی ہیں جن کو اپنے درمیانی آخری کلام میں ترک کردیا ہے مثلاً غزل کی روایات کو ہی لے لیجئے کہ شروع میں ان کی غزلیات بڑی حد تک پرانی روایات کی حامل ہیں گو ان میں بھی لہجہ اور آہنگ کے اعتبار سے جدت طرازی ضرور نظر آتی ہے لیکن رموز و علائم میں پابندی بھی ہے مثلاً مجاز کے رنگ میں یہ شعر ؎

زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب　　تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

لیکن اسی غزل میں اس قسم کے اشعار بھی مل جاتے ہیں جس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی ؎

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک　　جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

زلفِ آوارہ ۔ والا شعر علامہ نے دوسری اشاعت میں دیوان سے خود نکال دیا تھا ۔ عشق حقیقی سے متعلق بھی علامہ کی غزلیات میں بہت اچھے اچھے اشعار مل جاتے ہیں لیکن وہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ لب ولہجہ میں ایک خاص تیکھا پن ۔ عاشقانہ رکھ رکھاؤ موجود ہے اور روایتی ذلت پسندی اور بیجا خاکساری سے گریز کیا گیا ہے مثلاً :۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا　　وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

لیکن اس قسم کے اشعار کی تعداد بھی بہت کم ہے اور صرف بانگِ درا تک محدود ہے۔ بالِ جبریل میں غزل کی صورت ہی بدل گئی ہے اگر بانگِ درا اور بالِ جبریل کی غزلیات کو مقابل میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ صاف معلوم ہو جائے گا کہ بعض باتوں میں یہ غزلیں آپس میں مشابہت رکھتے ہوئے بڑی حد تک مختلف بھی ہیں۔ طرزِ تخاطب۔ طرزِ ادا۔ تخیل۔ لہجہ۔ انتخاب الفاظ وغیرہ میں کچھ کچھ فرق ضرور نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا　　مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا　　یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے　　جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری　　کہ خاکِ راہ کو میں نے سکھایا رازِ الوندی
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

بلکہ لب و لہجے میں بعض اوقات جدت اور شدت کا اس قدر مظاہرہ بھی ہو گیا ہے کہ افراط و تفریط کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے مثلاً ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے
روزِ حساب جب پیش ہو مرا دفترِ عمل　　آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر
مزی اندر جہانے کور ذوقے　　کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

آخری شعر میں یہ کہنا کہ ایسی جنت میں مت جا جہاں خدا ہو اور شیطان نہ ہو ایک بالکل نئی اور انوکھی بات ہے، اس میں شک نہیں کہ یہاں شیطان اور یزداں کا مقابلہ کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتا اگر اس کی بجائے خیر و شر اور آسائش و کاوش کا مقابلہ ہوتا تو مطلب بھی ہاتھ سے نہ جاتا اور ناگواری کی خلش بھی پیدا نہ ہوتی۔ بہرحال یہاں بھی لہجے کی جدت میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا خواہ الفاظ کا انتخاب بعض کے نزدیک مناسب نہ ہو۔

دوسرا دعویٰ میں نے یہ پیش کیا تھا کہ انھوں نے جن روایات کو قائم بھی رکھا ہے تو ان کی ایسی قلب ماہیئت کر ڈالی ہے کہ ان کی صورت پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً عشق و محبت کی روایات۔ گل و بلبل کے افسانے۔ بعض مروجہ تلمیحات۔ تصوف و معرفت کے بعض تصورات۔ فلسفۂ حیات کے متعلق بعض مسلمات۔ ان تمام چیزوں کو بالکل نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ عشق کا جو تصور علامہ نے ہمیں دیا وہ اردو کے کسی شاعر نے ان سے پہلے پیش نہیں کیا۔ فارسی میں مولانا روم کے یہاں البتہ اس کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ اور علامہ کو ان کے تقدم کا اعتراف ہے۔ انھوں نے مولانا کو "پیرِ رومی" کہہ کر خطاب کیا ہے۔ عشق کی علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں جو تعریف کی اور توجیہہ کی ہے اس کو پوری طرح بیان کرنے کے لئے بڑی طویل بحث کی ضرورت ہے یہاں صرف اجمالی اشاروں پر اکتفا کیا جائے گا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ برگساں کے جوشِ حیات یا (élan vital) کی طرح انھوں نے عشق کو کائنات کے ہر ذرے میں جاری و ساری قرار دیا ہے۔ فرائڈ نے بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے وہ اس جوشِ حیات کو "آرزوئے حیات" یا ([illegible]) کہتا ہے۔ علامہ بھی روایتی آرزوئے مرگ سے زیادہ "آرزوئے حیات" کے قائل اور خواہشمند ہیں۔ میں علامہ کے فلسفۂ عشق کے متعلق یہاں کچھ زیادہ عرض نہیں کر سکتا صرف ایک نیا نکتہ انھوں نے جو پیدا کیا ہے وہ بیان کر دوں گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ علامہ پر روایت پرستی میں قدامت کا الزام کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے اب تک خدا کو معشوق اور انسان کو عاشق قرار دیا جاتا تھا لیکن علامہ نے بالکل پانسہ ہی پلٹ دیا اور انسان یا انسانِ کامل کو محبوب اور خدا کو طالب قرار دیا۔ فارسی کی ایک نہایت مترنم نظم میں اس نکتے کو واضح کیا ہے۔ اس نظم کو بہترین مسلسل غزل کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجو است — چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو است

آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما — بیرون و اندرون و زبر زیر و چار سو است

گاہے ببرگِ لالہ نویسد پیامِ خویش — گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہائے و ہو است

اس کے علاوہ عشقِ حقیقی میں۔ فنا۔ بقا۔ جبر و قدر۔ خیر و شر۔ قبض و بسط۔ حیرت و سکون غرضکہ کسی عنوان کو چھوڑا نہیں ہے جس کو اپنے نئے اور دلکش انداز میں بیان نہ کیا ہو۔ اور اس طرح کہ ہر پرانی چیز نئی معلوم ہوتی ہے اور اس کی قدامت کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے بقول اصغر مرحوم ؎

ہجومِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

اب تیسرے نکتہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یعنی یہ کہ علامہ نے بہت سی باتیں اپنی شاعری میں بالکل نئی پیش کی ہیں، ایک تو وہی عشق کا تصور جس کو میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یعنی عشق ایک ایسا ہمہ گیر اور آفاقی رابطہ ہے جس کے ذریعے سے ہر چیز اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اور لذتِ حیات سے سرشار ہے۔ ہر چیز اپنا اپنا مقررہ وظیفہ ادا کرتی چلی جا رہی ہے بلکہ عشق ہی تخلیقِ کائنات کا بھی بڑا سبب ہے۔ "کُنتُ کنزاً مخفیا" اور "لولاک لما خلقت الافلاک" کے اقوالِ قدسیہ اس دعوے پر دلائلِ قاطع ہیں۔ پھر انسان کو محبوب اور خدا کو ایک طالب بنا دینا اپنی جگہ پر ایک جدّت ہے۔

دوسری اہم چیز جو ایجاد کا درجہ رکھتی ہے وہ ان کا فلسفہ خودی اور انسانی انا کا تصور ہے، اس میں خودی کی دونوں قسمیں یعنی انفرادی خودی اور اجتماعی خودی شامل ہیں۔ انفرادی کا تصور تو مولانا روم کی مثنوی میں کہیں کہیں مل جاتا ہے لیکن اجتماعی خودی کا تصور اردو ادب میں بالکل نیا ہے۔ البتہ مغربی مفکرین سے علامہ اقبال کسی حد تک اجتماعی خودی کے بارے میں متاثر نظر آتے ہیں کیوں کہ انھوں نے مغربی فلسفے کو بڑی تفصیل اور بڑے انہماک سے پڑھا ہے۔ اور مغربی فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بہت بلند ہے۔ چنانچہ آرنلڈ جیسے بلند پایہ مغربی مفکرین نے ان کے مقام کو تسلیم کیا ہے۔ اس فلسفۂ خودی کی ایک شاخ انسانِ کامل کا تصور ہے۔ جو علامہ نے نٹشے اور برگساں سے زیادہ۔ مولانا روم۔ اور عبدالکریم الجیلی سے اخذ کیا ہے۔ اس طرح زندگی کا حرکی تصور۔ تسخیرِ کائنات۔ جمود دشمنی ساری چیزیں علامہ کی روایت اور قدامت پسندی کی دلیل نہیں بلکہ تخلیق اور ایجاد کا ثبوت ہیں۔ علامہ چونکہ بنیادی طور پر زندگی کا یہ تصور رکھتے تھے کہ زندگی ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو ہر لمحہ ایک نئی صورت میں پیش کرتا ہے "کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَاْنٍ" وہ کس طرح فکر و تخیل کے کسی شعبے میں قدامت کے پابند یا کسی روایت کے غیر مشروط طور پر مقلد ہو سکتے تھے۔ بالِ جبریل میں فرماتے ہیں ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یہی نہیں کہ علامہ نے بعض نئے تصورات دیئے ہیں بلکہ بہت سے نئے الفاظ اور نئی تراکیب زبان کو دی ہیں۔ مثلاً شاہین۔ ممولا۔ باز کرگس وغیرہ۔ کتنے الفاظ ہیں جو عموماً ادبِ عالیہ میں استعمال نہیں ہوتے تھے اگر ہوتے بھی تھے تو ان علائم و رموز کے ساتھ نہیں جو علامہ نے ان کے ساتھ وابستہ کر دیئے ہیں۔ علامہ سے پہلے ممولے کو باز سے اور کبوتر کو شاہین سے کس نے لڑایا تھا، اور کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین

کا جگر کس نے پیدا کیا، پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کس نے تراشا، شاہین کا تصور کس نے ایجاد کیا۔ کیا یہ تمام چیزیں تازہ بتازہ نو بہ نو کا حکم نہیں رکھتی ہیں۔ ان میں کتنی جدت، تازگی اور تخلیقی قوت ہے۔ البتہ اگر ان معترضین کا مطلب قدامت پرستی سے یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں مذہب۔ خدا۔ رسولؐ۔ اخلاقی اقدار وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس لئے وہ قدامت پرست ہیں۔ یا اتحادِ اسلامی جسے پین اسلامزم کہتے ہیں اس کا انھوں نے ذکر کیا ہے اس لئے قدامت پرست ہیں تو ان الزامات سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن ہماری نظر میں یہ الزام الزام نہیں۔ ان کو الزام کا رنگ دینے کی زبردستی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ بنیادی روایات اور بنیادی اصولِ حیات کو کوئی معقول شخص نہیں ترک کرسکتا۔ یہ تو مطالبہ ایسا ہی ہے کہ علامہ مسلمان ہونے سے انکار کردیتے۔ اسلامی قدروں کے منکر ہوجاتے تو معترضین کی نظر میں انھیں جدت پسندی کی سند مل سکتی تھی۔ ایسی سند میرے خیال میں کوئی غیرت مند مسلمان لینے کے لئے تیار نہیں ہوگا اور شکریے کے ساتھ واپس کردے گا۔ اس کے علاوہ معترضین دنیا کے کسی ایسے شاعر کی نشاندہی نہیں کرسکتے جس نے ایک بھی پرانی روایت کو باقی نہ رکھا ہو۔ یا اپنے مذہب سے تائب ہوکر شاعری کی ہو۔ یا کسی قسم کی اخلاقی قدروں کو قائم نہ رہنے دیا ہو۔ دنیا کے مشہور شاعروں میں ملٹن۔ گوئٹے۔ شیکسپیر۔ فردوسی۔ ٹیگور وغیرہ ہیں ان میں سے کس نے اپنے مذہب سے توبہ کی۔ اور مذہبی اقدار کی جھلک اپنے کلام میں پیدا نہیں ہونے دی۔ اس کے علاوہ اس الزام کے لگاتے وقت یہ بھی تو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ جہاں اقبالؔ نے مذہب۔ خدا اور رسولؐ وغیرہ کا ذکر کیا ہے وہاں ہزاروں اشعار ایسے بھی تو کہے ہیں جو محض آفاقی قدروں۔ اور انسانی زندگی کے بنیادی اصولوں سے متعلق ہیں۔ ان کو ایک بے انصاف شخص ہی نظر انداز کرسکتا ہے۔ مثلاً جہاں عشق میں مقامیت ہے وہاں آفاقیت بھی ہے، جہاں خودی میں اسلامی عناصر ہیں وہاں آفاقی[1] عناصر بھی کم نہیں اور بسیط عشق اور بسیط انا اور خودی سے بحث کی گئی ہے۔ کیا اقبالؔ کے کلام میں انسانی خودی انفرادی اور اجتماعی۔ بسیط جذبۂ عشق انسانی اور عالمگیر سطح پر موجود نہیں۔ کیا اقبالؔ نے عشق کو برگساںؔ کے جوشِ حیات اور فرائیڈؔ کے آرزوئے حیات کے رنگ میں پیش نہیں کیا۔ اگر کیا ہے اور ضرور کیا ہے تو یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ہر جگہ روایات ہی کی پابندی کی ہے!

[1] مگر اسلام اپنی جگہ آفاق گیر تصورِ حیات ہے، اس لئے جو کوئی اسلام کو شعر و ادب میں پیش کرتا ہے وہ اُس انسانیت کی ترجمانی کرتا ہے جو "آفاق گیر" ہے! برگساںؔ اور فرائیڈؔ بیچارے تو آفاق کی وسعتوں میں ایک چیونٹی سے بھی زیادہ بے حقیقت و کم مایہ ہیں (ماہر القادری)

محمد حسام اللہ شریفی

اسبابِ زوالِ اُمّت

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بڑی ہی پرانی ہے، شاید اتنی ہی جتنی یہ دنیا۔ مختلف زمانوں اور مختلف ادوار کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر قوم کو عروج و زوال سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

ترقی و تنزل اور عروج و انحطاط کے بیان سے پیشتر اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے ایک مثال کے ذریعہ اسے یوں سمجھئے جیسے کوئی شخص کسی دکان میں ملازم ہو وہ جب تک اپنا کام پوری تندہی سے انجام دیتا ہے مالک دوکان اس سے انتہائی محبت اور نرمی سے پیش آتا ہے اُسے اس سے ایک خاص قسم کا لگاؤ جسے ہم اُنس سے تعبیر کرسکتے ہیں، پیدا ہو جاتا ہے، وہ اِس ملازم کو ہر معاملے میں شریکِ مشورہ کرتا ہے اس پر اُسے کامل اعتماد اور بھروسا ہے، اس کی تنخواہ میں بھی برابر اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اسے آپ اُس کے دورِ عروج سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ لیکن جونہی وہ تندہی و جانفشانی کی سرحد سے نکل کر سستی و کاہلی کی طرف قدم بڑھاتا ہے، اپنا کام پوری توجہ اور دیانتداری سے انجام نہیں دیتا بلکہ مالک کے احکام کی خلاف ورزی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے تو ایسی صورت میں اس کو عضوِ معطل سمجھتے ہوئے فی الفور ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ کہاں تو اس کی یہ حالت تھی کہ کوئی کام بھی اُس کے مشورے اور مرضی کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا ہر بات میں اس کی خیر خواہی مدنظر رکھی جاتی تھی اور کہاں یہ حالت کہ اب کوئی اس کی بات تک نہیں پوچھتا، کوئی اُس کا پُرسانِ حال نہیں، سب نے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں، کل تک سب اس سے دبتے تھے۔ اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے تھے اور آج چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب ہی اس پر رعب گانٹھنے کی کوشش میں رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس پر ملازمت کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اس زمانے کو آپ اُس کے دورِ انحطاط یا دورِ زوال سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

مسلمانوں کی حالت بھی کچھ اس قسم کی ہے اور ان پر یہ مثال پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ جناب خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہی امتِ مسلمہ نہیں کہلائی بلکہ امم سابقہ کو بھی اسی لقب سے مخاطب کیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و مرسلین اسی دینِ اسلام کو لے کر آئے اور اُن کی قوم میں سے جن افراد نے اس دعوتِ حق کو لبیک کہا اُن لوگوں سے تشکیل پاکر جو جماعت وجود میں آئی اُسے امتِ مسلمہ ہی کے لقب سے ملقب کیا گیا امتِ مسلمہ یعنی وہ گروہ اور وہ جماعت جس نے اپنے آپ کو کلیتہً قانونِ خداوندی اور اطاعتِ ربانی کے سپرد کر کے اسی قانون کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے کا تہیہ کرلیا ہو اور نہ صرف تہیہ کیا ہو بلکہ اطاعتِ ربانی اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو کہ اس پر عمل کئے بغیر اُسے چین ہی نہ آتا ہو۔

پس جب خداوندِ مجازی کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے صلے میں اسے عروج اور ترقی کے مواقع بہم پہنچاتا ہے اور مدارجِ ترقی کی حدِ کمال پر اس کو فائز المرام کر دے اور بصورتِ دیگر اس سے نہ صرف تمام اختیارات سلب کر لے، بلکہ اُسے

کوڑی کوڑی کے لئے محتاج کر کے اُسے پستی کے عمیق ترین گڑھے میں دھکیل دے تو یقیناً خداوند حقیقی کو بھی جو قادرِ مطلق ہے، ایسا ہی کرنا چاہیے جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا دم بھرے، اسے اپنا دوست بنائے اور ارتقائی منازل طے کرنے میں اس کی اعانت اور رہنمائی کرے اور جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے منہ موڑے اُسے وہ ذلت کے گڑھے میں دھکیل دے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمان مالکِ حقیقی کے مطیع و فرمانبردار رہے، ترقی کی راہوں پر گامزن رہے لیکن جیسے ہی اُنھوں نے اس کی اطاعت و فرماں برداری کا قلادہ اپنی گردن سے اُتارا دیسے ہی اُن کے پاؤں پھسلے اور وہ پستی کی ڈھلانوں میں لڑھکنے شروع ہو گئے تا آنکہ آج وہ ان گڑھوں کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ صرف مالک ہی نہیں نہایت درجہ شفیق و مہربان ہے اور بدرجۂ اتم رحمت و رافت سے کام لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُس کی مملوک میں آپ کسی کو بھوکا ننگا نہیں دیکھیں گے۔ ہر شخص کو کم از کم تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو کھانا ضرور ملتا ہوگا اور اس میں مسلم اور غیر مسلم، موافق اور مخالف کا کوئی امتیاز نہیں۔ وہ اپنے دشمنوں سے بھی جور و ظلم کا سلوک نہیں کرتا۔ تاریخ کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب بھی اس دنیا میں فتنہ و فساد اور سرکشی نے سر اٹھایا تو مالکِ کائنات نے اس کا سر کچلنے کے لئے اپنے خصوصی نمائندوں کو بھیجا جیسے کسی ملک میں شورش اور بغاوت رونما ہو جائے تو اُس ملک کا سربراہِ اعلیٰ اپنے نمائندہ خصوصی کو اُس حصے کی اصلاح اور فتنہ و فساد ختم کرنے کے لئے بھیج دیتا ہے جس کی اطاعت کرنا سارے رعایا کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق حاکمِ کائنات بھی اصلاحِ کائنات کے لئے اپنے خصوصی نمائندے وقتاً فوقتاً بھیجتا رہا ہے جو لوگوں کی اصلاح کی کوششیں کرتے اور اپنی ان کوششوں میں کامیابی حاصل کرتے رہے ہیں۔ فساد ختم ہونے کے بعد جب اس کائنات کے سربراہِ اعلیٰ نے اُنہیں واپس بلا لیا تو کچھ عرصے تک تو لوگ اصلاح پر قائم رہے لیکن پھر حکومتِ ربانی کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے لگے۔ اور جب وہ اپنی سرکشی میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے تو از سرِ نو ان کی اصلاح و ہدایت کے لئے حاکمِ کائنات نے اپنے خاص نمائندوں کو بھیجا اور باغیوں کو ان کی بغاوت و سرکشی کی، ان کے مناسب حال سزا دی گئی اور جب ان کی شورش اور ان کا فتنہ دب گیا تو ان نمائندوں کو واپس بلا لیا گیا۔ غرض نمائندوں کی آمد و رفت اور انسانوں کی بغاوت و سرکشی کا یہ سلسلہ یسے ہی چلتا رہا لیکن ——— اب ——— کہ اس کائنات کے ذرے ذرے میں بغاوت و سرکشی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے اور تمام مخلوق حاکمِ کائنات کے خلاف بغاوت میں حصہ لے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نوع کی بغاوت ایسے منظم طریقے پر اس سے پہلے ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ چنانچہ حسبِ معمول حاکمِ کائنات نے اس بار بھی ان کی اصلاح کرنے اور اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اپنے نمائندگان خصوصی میں سے اُس نمائندے کا انتخاب کیا جو اُن سب میں زیرک اور فہیم تھا، جس کی سوجھ بوجھ کا چرچا تمام نمائندوں میں تھا جس کی فراست و تقدیس کا شہرہ ایوانِ نمائندگان کے در و دیوار میں گونج رہا تھا، ایسی جامع صفات شخصیت یقیناً یہ بارِ گراں اٹھانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھی۔ اُسی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ باغیوں کی بغاوت کو کچل کر رکھ دے اور سرکشوں کی سرکشی کو نیست و نابود کر دے، کائنات میں تمام بسنے والوں کو جنھوں نے بغاوت و سرکشی کی انتہا کر دی تھی۔ یہ آخری موقع دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں اور بغاوت و سرکشی سے باز آ جائیں۔ چنانچہ اس بار کائنات میں سے جو افراد اپنی بغاوت و سرکشی سے باز آ گئے ان سے وہ جماعت وجود میں آئی جسے خیرِ امت کے لقب سے نوازا گیا اور جس کا فریضہ وہی قرار دیا گیا جو اب سے کچھ عرصہ تک پہلے نمائندگانِ خصوصی سے متعلق تھا۔ اُن نمائندگانِ خصوصی سے کہ جنہیں ہم اور آپ نبی اور رسول کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک یہ امت اس فریضے کو پوری تندہی سے انجام دیتی رہی اور اطاعت کی راہ سے انحراف نہیں کیا اور خود دنیا کے سامنے ان تعلیمات کو اپنی عملی زندگی میں نمونتاً پیش کرتی رہی اس وقت تک اس کے اقبال کا ستارہ اوجِ ثریا پر چمکتا اور نہ صرف عالمِ انسانیت بلکہ عالمِ حیوانیت کو بھی اپنی ضوفشانی سے منور کرتا رہا۔ لیکن جونہی اس نے اس عظیم تر فریضے کو پسِ پشت ڈالا اور عملی دنیا سے ہٹ کر مخالف سمت کی طرف قدم بڑھایا اس کی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی چلی گئی اور اس کے اقبال کا ستارہ جو کبھی غروب نہیں ہوا تھا رفتہ رفتہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا اور بالآخر وہ زمانہ بھی آیا کہ جب یہ امت اپنے آپ کو امتِ مسلمہ کہلانے میں ندامت محسوس کرنے لگی اور اسے خود اپنے وجود ہی سے شرم محسوس ہونے لگی۔ اس نے کرتوت بھی کچھ ایسے ہی کئے ہیں جن کی بنا پر اسے شرم آنی بھی چاہیئے۔ نیرنگیٔ زمانہ دیکھئے کہ وہی لوگ جو کل تک ہمارے سامنے سائل کی حیثیت سے پیش ہوتے اور اپنے آپ کو ہمارے خادموں میں شمار کرنا باعثِ صد افتخار سمجھتے تھے آج ہم اپنا دستِ سوال ان کے سامنے دراز کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنا پس خوردہ بطور بھیک ہماری جھولی میں ڈال کر ہم سے دعا ہائے ترقی مال و منال اور شکریہ ہائے بے حد و حساب بطور منافع اور وہ پس خوردہ بطور اصل زر وصول کریں جس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمیں موزوں الفاظ نہیں ملتے۔

کان مملوک فاضحیٰ مالکٖ
ان ھٰذا من اعاجیبِ الزمن

آخر یہ کیوں یہ ایک دم سے کایا پلٹ ہو گئی؟ جو کل تک مالک کہلاتے تھے آج وہ مملوک اور جو کل تک خادموں کے زمرے میں شمار ہوتے تھے آج وہ مخدوم کیوں اور کس طرح بن بیٹھے؟ ان سے کونسا ایسا قصور سرزد ہو گیا جس کی بنا پر انہیں راندۂ درگاہ کر دیا گیا؟

اس سوال پر کہ جو حاصل مضمون ہے۔ توجہ دینے سے پیشتر ترقی کا مفہوم متعین کر لینا مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسی ترقی کو ہم دوسرے لفظوں میں عروج سے تعبیر کر سکتے اور "وبضدھا تتبین الاشیاء" کے تحت اسی کی وساطت سے اسبابِ زوال متعین کر سکتے ہیں۔

ترقی درحقیقت روحانیت اور دنیوی علو مرتبت سے ترکیب پا کر وجود میں آتی ہے یعنی روحانیت، اخلاق و کردار اور اعمالِ حسنہ اور دنیوی بلندی کے امتزاج ہی کو ترقی کہا جا سکتا ہے یا بالفاظِ دیگر دنیا کی نظر میں امتیازی مقام حاصل کر لینا اور روحانیت کا بدرجۂ اتم دلدادہ ہونا اور اس کے تقاضوں کو صحیح طور پر بجا لانا ہی ترقی کہلا سکتا ہے۔ اگر اس روحانی اور مادی اعتبار سے مراتب عالیہ کے امتزاج میں کوئی خاص خامی رہ جائے تو ہم اسے ترقی سے تعبیر نہیں کر سکتے اور مسلم کی یہ صفتِ خصوصی اسی وجہ سے بیان فرمائی گئی کہ وہ روحانیت اور دنیوی علو مرتبت میں ترقی کے لئے ہر وقت اور ہمیشہ کوشاں رہتا ہے ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ۔ (القرآن) (ہم دنیوی ترقی میں بھی تیری عطاء و بخشش کے خواہاں ہیں اور اُخروی ترقی میں بھی جو سرتاسر روحانیت پر مبنی ہے)

ترقی کے اس مفہوم و معنی کے بعد جب ہم دنیا کی کسی قوم کے عروج پر اس زاویئے سے نظر ڈالتے ہیں تو کسی کو بھی ترقی کے اس معیار پر پورا اترتے نہیں دیکھتے۔ دنیا کی عظیم سے عظیم سلطنتیں دونوں میں سے کسی ایک صفت سے ضرور محروم ہیں۔ کسی کو دنیوی بلندی، برتری اور فوقیت حاصل ہے تو روحانیت کے باب میں بالکل کوری ہے اور اگر روحانیت سے کچھ تعلق ہے تو دنیوی بلندی اس سے کوسوں دور ہے غرض آج دنیا کی کوئی قوم اور ملت ایسی نہیں جس کو صحیح معنی میں ترقی یافتہ کہا جا سکے۔

یہ امر باعثِ حیرت نہیں کہ ہم لوگ جنہیں مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے اور جو اپنے آپ کو روحانیت کے علمبردار سمجھتے اور کہلاتے ہیں ایک عرصے سے برابر پستی کے گڑھے میں گرتے چلے جا رہے ہیں اور اس کے برعکس وہ لوگ جنہیں کافر، خدا کا باغی اور دشمنِ اسلام سے تعبیر کیا

جاتا ہے کہ برابر مدارجِ ترقی طے کرتے چلے جا رہے ہیں ــــــــ ہم اسے ترقی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کیوں کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کی بلندی اور دنیوی مراتبِ عالیہ پر فائز ہوئے بغیر ترقی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس ترقی نے دنیا کو تباہی کے گڑھے پر تو ضرور لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ترقی انسانیت کو نابود کرنے میں واقعی ممد و معاون ثابت ہوئی ہے اور اس نے ایٹم کے ذریعے دنیا کو ختم کرنے کا منصوبہ یقیناً بنایا ہے۔ اس نے تخریبی کارروائیاں تو ضرور انجام دی ہیں لیکن مقابلۃً تعمیری کام اس سے بہت ہی کم سرزد ہوئے ہیں اگر آپ اس تباہی کو ترقی کہنے ہی پر مصر ہیں تو ــــــــ سوائے سر پیٹ لینے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے اذہان کی بنیاد غلط قسم کے نظامِ تعلیم پر رکھی گئی ہے اسی بنا پر آپ کے افکار و نظریات مغرب کی دل کشی اور رعنائی میں چکاچوند اور مغربی تہذیب و تمدن کی عینک لگا کر ہر چیز کو دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں، اس میں سب ہی برابر کے حصے دار ہیں۔

اب آیئے اصل موضوع اور اس سوال کے جواب کی طرف ــــــــ جب بھی ہم نے کسی قوم کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالی ہے تو تاریخ کے جھروکوں سے ہمیں یہی نظر آیا ہے کہ جب بھی اس کے حکمران اور رعایا نے میدانِ کارزار کی بجائے عیش و نشاط کی محفلوں کو اپنا منتہائے نظر اور اپنا مقصودِ زندگی بنا لیا تبھی سے اس قوم پر حالتِ نزع طاری ہونی شروع ہو گئی۔ زیادہ دور نہ جایئے برصغیر ہند و پاک کی تاریخ ایسے واقعوں سے بھری پڑی ہے۔ واجد علی شاہ اور پھر محمد شاہ رنگیلا ان ہستیوں سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ پہلا سبب جو کسی قوم کے زوال کا باعث ہوا وہ یہی تھا کہ اس نے میدانِ کارزار کو خیرباد کہہ کر عیش و نشاط کی رنگین محفلوں میں محو ہو کر اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ اور شاید اسی بنا پر اقبال کو کہنا پڑا ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں اپنا شیرازہ بکھیر دیا۔ ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق اور بیگانہ بن گئے اور یہ بالکل ہی بھلا بیٹھے کہ ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں!
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مگر اس کے برعکس غیر مسلم کم از کم اپنی قومیت کو نہیں بھولے، چاہے وہ کسی بھی خطۂ زمین سے تعلق رکھتے ہوں لیکن جب ایک دوسرے سے ملیں گے تو بالکل اپنوں کی طرح، اسے اجنبیت کا قطعاً احساس نہیں ہونے دیں گے۔ ابھی فلسطین کا واقعہ، جسے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ذہنوں میں ضرور موجود ہو گا۔ دنیا بھر کے یہودیوں نے فلسطینی یہودیوں کی امداد کے لئے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا تو چند ہی روز میں دس لاکھ پونڈ جمع کر لئے مگر فلسطینی مسلمانوں کے لئے دنیا بھر کے مسلمان بمشکل صرف تیرہ ہزار پونڈ جمع کر سکے اس تفاوت کو ملحوظ رکھئے اور پھر دنیا کے مسلمانوں اور یہودیوں کی تعداد پیش نظر رکھئے کہ مسلم تقریباً ۶۰ کروڑ اور یہودی صرف دو کروڑ اس دنیا میں بستے ہیں۔

تنزل کا تیسرا اور بڑا سبب یہ بنی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر کے بالکل ہاتھ پیر توڑ بیٹھے اور اسے توکل کا نام دے دیا جب تک انسان خود اپنے دست و بازو سے کام نہ لے تو کیسے ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ محض توکل اور دعائیں کرنا تو کسی صورت بھی مفید اور کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔ خدا بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں اور پھر توکل اس کی تعلیم کب دیتا ہے کہ کرو کچھ نہیں بس خدا پر آس لگائے بیٹھے رہو وہ خود سارا معاملہ درست کر دے گا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کرتا تو سب کچھ وہی

ہے لیکن اس نے یہ بھی فرمادیا ہے کہ تم بھی کچھ ہاتھ پیر ہلاؤ، ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہو۔ لیس للانسان الاما سعیٰ کچھ کرنے کے بعد انجام ہم پر چھوڑ دو ہم یقیناً تمہاری مدد کریں گے اور تم سے تعاون کریں گے۔ مولانا روم کو بھی اسی لئے توکل کی تشریح کرنی پڑی

گفت پیغمبر بہ آواز بلند | با توکل زانوئے اشتر بہ بند
رمز "الکاسب حبیب اللہ" شنو | از توکل در سبب غافل مشو
گر توکل می کنی در کار کن | کشت کن پس تکیہ بر جبار کن

اور اقبال کو بھی عمر بھر اسی کا شکوہ مسلمانوں سے رہا :۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

جہالت و کم علمی بھی ان ہی اسباب میں سے ایک ہے جو کسی قوم کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر تحصیل علم کی امت کو تلقین فرمائی امت نے اسی قدر اس سے بے توجہی اور غفلت برتی اور آج علم سے جس قدر دور امت مسلمہ ہے شاید ہی کوئی قوم ہو جو علم سے اس قدر ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہو۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ علم خواہ کوئی سا ہو اسے صرف ذریعہ معاش بنانا علم کی توہین کے مترادف ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ علم اپنے اندر کوئی برائی نہیں رکھتا اگر اساتذہ صالح ہوں اور نیک کردار ہوں تو یقین کیجئے کہ تعلیم سے اچھے ثمرات ہی برآمد ہوتے ہیں۔ علم ــــــ اور بدی کی تعلیم دے ؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ علم تو ہمیشہ اچھائی اور نیکی ہی کی تعلیم دیتا ہے، اسلام، امت مسلمہ کے دونوں فریق' مرد و زن کی تعلیم کی تلقین کرتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ان دونوں کے دائرہ کار ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں اسے ملحوظ رکھتے ہوئے ہی انہیں تعلیم دلانا مفید اور سود مند ثابت ہو سکے گا ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہ تعلیم مفید ثابت ہونے کی بجائے مضر اور نقصان دہ ثابت ہو ــــــ اور اب کہ ــــ کچھ شوق پیدا ہو چلا ہے تو ارباب تعلیم ناروا طور پر تعلیم پر پابندیاں عائد کرنے کے لئے فکر مند ہیں۔ حالانکہ پابندی کی بجائے تعلیم کو عام کرنے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور مذہبی تعلیم کی تدریس کا ادنیٰ درجے سے اعلےٰ درجے تک نہایت اعلےٰ پیمانے پر انتظام ہونا بھی نہایت ضروری ہے ــــــ خواتین کے لئے طب (ڈاکٹری) اور درس و تدریس کا مشغلہ ہی سود مند ثابت ہو سکے گا۔ وکالت و انجنیرنگ وغیرہ سے ان کی نسوانیت اور اسلامیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے انہیں اپنی نسوانیت کے تحفظ اور بقا کی خاطر اور لفظ "مسلم" کی لاج رکھنے کے لئے اس قسم کی تعلیم اور پیشوں سے قطعاً صرف نظر کر لینا ہوگا اور اس تعلیمی مرحلے میں اختلاط کی بجائے اختلاف زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔ مرد و زن کی تعلیم کے لئے جداگانہ درسگاہیں ہی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ مخلوط طریق تعلیم کسی صورت میں بھی مناسب اور مفید نہیں۔

تنزل کا ایک سبب اخلاق کا فقدان بھی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اخلاق عالیہ کی تلقین فرمائی اور اپنی بعثت کا مقصد بھی درستی اخلاق ہی فرمایا۔ انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ شوقی نے بہت خوب کہا ہے ؎

انما الامم الاخلاق ما بقیت
فان ھم ذہبت اخلاقہم ذہبوا

(جب تک قومیں اخلاقی طور پر بلند ہوتی ہیں تبھی تک وہ زندہ رہتی ہیں اور اخلاقی گراوٹ کے ساتھ ساتھ وہ بھی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوتی چلی جاتی ہیں)

حیرت شملوی اسد ملتانی مرحوم کی نظر میں

(۱۹۵۱ء کا لکھا ہوا ایک تعارف)

کوئی بیس برس کی بات ہوگی، شملے کی مال روڈ پر ایک دکان کے اندر مختصر سی مجلس مشاعرہ گرم تھی، آخر میں ایک منحنی نوجوان اٹھے ننگے سر سادہ کوٹ پتلون پہنے، عینک لگائے، کمزور سی آواز، مگر پُرسوز ترنم کے ساتھ غزل پڑھنی شروع کی "نظر میں" "سفر میں" ایک ایک شعر اثر میں ڈوبا ہوا، دو شعر آج تک نہیں بھولے :-

اے نوحؑ کی کشتی کے نگہبان بچالے — میری بھی ہے اک کشتیٔ اُمید بھنور میں
مل جائے، تو بتلاؤں کہ کیا ڈھونڈ رہا ہوں — شبنم میں، نسیم سحری میں گل تر میں

مجلس اتنی متاثر ہوئی کہ دوسری غزل کا بے اختیار تقاضا ہوا، اب غزل آئی، "دل کے ٹکڑے کر دیئے" اس کے بھی دو شعر آج تک حافظے میں محفوظ ہیں :-

جس کے آغوش وفا میں پرورش پاتی رہی — موجِ مضطر نے اُسی ساحل کے ٹکڑے کر دیئے
اک نئی راحت شکستِ دل سے حاصل ہو گئی — آپ نے اچھا کیا، اس دل کے ٹکڑے کر دیئے

پُر درد کلام، پُر درد آواز، پھر شاعر کی ہمدردی انگیز ہیئت نے اس سے ہم آہنگ ہو کر عجیب سی فضا پیدا کر دی۔ یہ تھا میرے لئے پہلا موقع حیرت شملوی کو دیکھنے اور سننے کا، عرصے کے بعد سید تنویر علی اور محمد احمد ندوی (مرحوم) کے ذریعے ان سے ملاقات ہوئی، تعلقات بڑھے، انہیں بہت قریب سے دیکھا، اور ان کی شاعری سے زیادہ ان کی غیر معمولی طبیعت کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

نام عبدالمجید خاں، تخلص حیرت، شملے میں پیدا ہوئے کچھ عرصہ بعد خواہ مخواہ دہلوی کہلائے، لیکن بعد میں شملوی کی نسبت اختیار کر لی جس سے اب تک مشہور ہیں، دہلوی کی نسبت ترک کرنے کا ایک باعث غالباً حیرت دہلوی سے امتیاز بھی تھا مگر وہ پھر بھی اُن سے متقدم تھے طرفہ یہ کہ معاصرین میں سے متعدد حیرت منظرِ عام پر آگئے، سب سے حیرت انگیز یہ اتفاق کہ بدایوں کے ایک صاحب کے تخلص کے نام کا بھی توارد ہو گیا یعنی وہ بھی عبدالمجید حیرت نکلے، بہر حال حقیقت یہ ہے کہ نام سے زیادہ کلام کی انفرادیت باعث امتیاز رہتی ہے۔

حیرت صاحب نے علیگڑھ سے بی اے کیا، پہلے برطانوی حکومت ہند کے "قومی اخبار" میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ بعد ازاں مرکزی اسمبلی کے دفتر میں چلے گئے، وہیں "اسسٹنٹ" بنے، اور مزید ترقی کا موقع ملنے کو تھا کہ ۱۹۴۴ء میں بیمار پڑ گئے، اب تک اسی حالت میں ہیں، چنانچہ کہتے ہیں کہ :-

جب اس کی ضرورت تھی کہ چلتے کبھی کل — کیا شومیٔ قسمت ہے کہ بیمار پڑے ہیں

بیماری کی وجہ سے خود تو ہندوستان میں رہ گئے مگر ملازمت پاکستان میں منتقل کرالی، تمام رخصت ختم ہونے کے بعد قبل از وقت پنشن لینے پر مجبور ہو گئے۔

۱۹۵۳ء میں والد صاحب کے یکایک انتقال کے سبب ایک طرف تو چھوٹے بہن بھائیوں اور کنبے کی ذمہ داری یک لخت سر پر آپڑی، اور دوسری طرف کاروبار میں شدید نقصان ہوا یہاں تک کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ مالی حالت بہت سقیم ہو گئی اس کا اثر سالہاسال تک رہا قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ جوں ہی مالی حالت ذرا سنبھلنے کو آئی تو جسمانی صحت بگڑ دی۔

مصیبت تنہا نہیں آتی، اسی دوران میں عقد ہوا، ناموافقتِ مزاج کے باعث سال ڈیڑھ سال ہی میں انقطاع کی نوبت آئی آزادی کے بعد پھر شادی کی، اولاد ہوئی مگر ۱۹۶۰ء تک تین بچیوں میں ایک واحد بچے عبدالماجد نے، جو ابھی پورے پانچ سال کا بھی نہ تھا، داغِ جدائی دیا، بعد ازاں مسلسل بیماری، اور بعض باہمی اختلافات نے زندگی کو چنداں خوشگوار نہ رہنے دیا، ایسی حساس طبیعت اور ایسے پیہم حوادث، غرضیکہ سراپا دردِ غم ہو کر رہ گئے ؎

اس بات کا رونا، کبھی اُس بات کا رونا — رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے (حیرت)

یہ مسئلہ البتہ حل طلب ہے کہ طبیعت کی دردمندی، ناخوشگوار واقعات کا نتیجہ ہے یا باعث، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں کہا تھا ؎

ہوں وہ بیمارِ غم کہ مشکل ہے — کر سکے گا کوئی دوا میری

لیکن اس شعر کے حرف بہ حرف مصداق وہ ۱۹۴۴ء میں بنے، اور اب تک ہیں کہا جا سکتا ہے کہ شعر اُس وقت محض رسمی ہوا ہو اور بارہ برس بعد بیماری اتفاقاً لاحق ہوئی ہو لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اندوہگیں طبیعت آنے والے حالات کا حسیاتی پیش خیمہ ہو۔

اِس افتادِ طبیعت کا انہیں خود بھی پورا پورا اندازہ ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

مانا کہ نہیں رونا ہر روز کا کچھ اچھا — مجبور مگر ہم ہیں افتادِ طبیعت سے

یا

چارہ سازی بھی کرے کوئی تو آخر تا بکے — روز پیدا اک نئی افتاد کر لیتا ہوں میں

اسی افتادِ طبیعت کا نتیجہ ہے کہ خانۂ انوری کی طرح ؎

بلائیں ٹوٹتی ہیں جب کہیں سے — تو بسم اللہ ہوتی ہے ہمیں سے

پھر ان حالات کے اثر سے طبیعت میں غم یہاں تک رچ گیا ہے کہ ؎

خوشی میں بھی وہ اک کیفیتِ غم — نہیں جاتی دلِ اندوہگیں سے

مگر اس کیفیت کے باوجود، کیا مجال، کہ ہمت میں ذرا بھی فرق آئے، نہایت وثوق اور اطمینان کے ساتھ کہتے ہیں ؎

کچھ سہی جورِ آسماں لیکن — میری توفیق سے فزوں نہ رہا

عرفی کا معروف شعر ہے ؎

من ازیں درد گرانبار چہ لذت یابم — کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

مضمون دونوں کا ایک ہے، لیکن عرفی کے شعر میں بناوٹی شوخی پائی جاتی ہے، اور یہاں پُر وقار سادگی۔

یہ بھی واضح رہے کہ حیرت کا اظہارِ خیال رسمی شاعری نہیں ہوتا۔ بلکہ ؎

سُن رہے ہیں جو آج حیرت سے — وہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے

اس سیدھی سادی حقیقت کو ایک اور جگہ، ذرا زیادہ شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے، یعنی ؎

کہتا ہوں وہی زبانِ غم سے — جو دیدۂ تر سے دیکھتا ہوں

یہ دیدۂ تر سے دیکھنا" اور "زبانِ غم" سے ادا کرنا حیرت کی شاعری کی صحیح صحیح تصویر ہے۔ اس بنا پر بعض صاحبِ نظر حضرات نے ان کو میر اور درد سے مماثل ٹھیرایا ہے، واقعی ان کے کلام میں یہ مماثلت بہت کچھ ہے' یہی وہ سب سے بڑی خصوصیت ہے، جو کلامِ حیرت کو دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں ایک ممتاز حیثیت دیتی ہے۔

اس رنگ کی کچھ مثالیں تو اوپر آچکی ہیں، کچھ اور ملاحظہ ہوں ؎

اُس کے دل سے پوچھئے، اُس کے جگر سے پوچھئے　　آج جس کی منزلِ مقصود، کل سے دور ہو

یا تو اُمید ہی نہیں ہوتی!　　یا بہت بے ثبات ہوتی ہے

اور اُمید کیا زمانے سے　　جی رہے ہیں' یہی غنیمت ہے

ایک شب کا نہیں فسانۂ غم　　اور غم، ایک دن کی بات نہیں

کاٹے کوئی کس طرح شبِ غم　　جب دیکھئے جب سحر نہیں ہے

نہی اشعار سے چند اور خصوصیات بھی ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ غزلیں زیادہ تر چھوٹی بحروں میں کہی گئیں ہیں، دوسری یہ کہ زبان نہایت سادہ اور ہلکی پھلکی استعمال کی گئی ہے۔ تیسری یہ کہ اشعار میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے کہ نظم و نثر کا فرق ہی باقی نہیں رہتا۔
حیرت کے اشعار میں آورد یا تکلف اگر ہوگا بھی' تو شاذ، مضمون آفرینی کی کوشش بالکل نہیں پائی جاتی، دل کی حقیقی کیفیات نہایت سادگی سے بیان کر دی جاتی ہیں، جس سے اکثر اشعار نہایت لطیف' سہل ممتنع، اور پُر تاثیر ہو جاتے ہیں، بعض ایسی نازک کیفیات کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کچھ کثرت پہ موقوف نہیں　　چبھنے کے لئے اک خار بہت

کچھ بھی ان سے کہا نہ حیرت نے　　جب یہ دیکھا کہ التفات نہیں

مل جائے تو بتلاؤ کہ کیا ڈھونڈ رہا ہوں　　شبنم میں، نسیمِ سحری میں، گُلِ تر میں

جنونِ شوق میں یہ بھی نہ دیکھا　　کوئی ہم پہ کہاں تک مہرباں ہے

بعض اوقات عام' پرانے مضامین کے اندر ایسی بات پیدا کی ہے کہ شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے، اس کی ایک مثال:۔

کہہ رہی ہے یہ خاکِ پروانہ　　شمع کا ایک کام یہ بھی ہے

دیکھئے کس طرح شمع و پروانہ کے پیش پا افتادہ مضمون سے ایک بالکل نیا پہلو نکالا ہے، جو سننے کے بعد عام معلوم ہوتا ہے، مگر اس سے پہلے اس طرف کسی کی توجہ نہیں ہوئی۔

اسی طرح آسمان کی گردش کا مضمون بہت پرانا ہے' لیکن حیرت نے اسے بالکل ایک نئے زاویئے سے پیش کرکے اُستاد ذوق کے ضرب المثل شعر کا جواب دیا ہے ذوق فرماتے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ذوق کو مرنے کے بعد چین ملنے یا نہ ملنے کے بارے میں شبہ ہے لیکن حیرت نہایت وثوق کے ساتھ یہ شبہ دُور کر دیتے ہیں، کہتے ہیں ؎

لحد میں بھی ملے گا چین کیوں کر　　زمیں وہ بھی تو زیرِ آسماں ہے

جورِ آسماں کا شکوہ شعرا کا عام مشغلہ ہے، لیکن حیرت اس سے اجتناب کی کیسی نادر اور معقول توجیہہ پیدا کرتے ہیں۔

آسماں کے جور کا بھی ذکر ہم کرتے نہیں　　کیا خبر' چل کر کہاں سے' بات آجائے کہاں

ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس میں لفظ "احسان" کو اس کے بالکل برعکس معنوں میں استعمال کر کے شعر کو حدِ اعجاز تک پہنچا دیا ہے۔

کہتے ہوئے تکلیف سی ہوتی ہے ورنہ ہیں یاد ہمیں آپ کے احسان ہزاروں

صرف "تکلیف سی ہوتی ہے" سے کام لے کر کیسے لطیف شعر میں کتنی شدید طنز بھر دی ہے۔

حیرت کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی سنجیدگی اور ہمواری ہے تمام غزلیں پڑھ جایئے، کوئی بھی شعر معیار ثقاہت سے گرا ہوا نہ ملے گا، بعض معمولی ہونے کی حد تک سادہ تو نظر آئیں گے لیکن کوئی شعر پست نہ نکلے گا، طبیعت کی سلامت روی نے کلام میں بھی ہمواری پیدا کر دی ہے۔

حیرت کی ایک اور خصوصیت شاعرانہ تعمیم ہے، یعنی اپنی زندگی کے کسی واقعے کو سیدھے سادے الفاظ میں لکھ دیتے، تو وہ محض ایک واقعہ بن کر رہ جاتا، مگر وہ اُسے ایسے الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ واقعہ عمومی اور آفاقی حیثیت حاصل کر لیتا ہے، مثلاً بیماری کے ابتدائی دور میں اکثر یہ ہوا کہ معالج نے کچھ مرض تشخیص کیا، اور دوسرے نے آ کر اس کی تردید کر دی، اور دوسرا علاج تجویز کیا۔ اس اختلاف کو وہ ایک شعر میں اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

تھا جگر کا درد لیکن چارہ گر کے ہاتھ سے ایک مدت تک علاجِ دردِ سر ہوتا رہا

دیکھیے کہ "دردِ جگر" اور "دردِ سر" کے رسمی الفاظ سے ایک مخصوص واقعے کو کس طرح وسعت دے کر تغزل کے آفاقی دائرے میں پہنچا دیا۔

اسی بیماری کی ایک رات، ان کا ملازم (بیوی ان دنوں ایک شادی میں کرنال گئی تھیں) اول شب ہی سے لمبی تان کر سو رہا۔ یہاں غزل ہو رہی تھی کہ سامنے سڑک پر آخر شب بجلی گل ہو گئی، اُدھر بجلی گل ادھر یہ مقطع ہو گیا ؎

اک شمع تھی، سو آخرِ شب وہ بھی بجھ گئی حیرت کے ساتھ کون گزارے تمام رات

یوں تو ایسی تعمیم ہر بڑے شاعر کے یہاں ضروری ہوتی ہے ورنہ شاعری محدود ہو کر رہ جاتی، لیکن حیرت کے کلام میں اس کی مثالیں غیر معمولی ہیں۔

حیرت ایک دیندار اور با اصول انسان ہیں۔ چنانچہ حساس طبیعت اور گہری مذہبیت نے انہیں خوش خلقی کا ایک پیکر بنا دیا ہے اس کا پرتو ان کے کلام پر بھی پڑا ہے جس میں حسنِ اخلاق اور جذبۂ دینی صاف جھلکتا ہے، ان کے اشعار رندانہ مضامین اور مذہب کے استہزا سے بالکل پاک ہیں۔

انھوں نے کبھی نظم بھی کہی ہو گی مگر ان کا خاص میدان غزل ہی رہا ہے جس میں انھوں نے ایک منفرد انداز پیدا کر لیا ہے، معنوی کے علاوہ ظاہری طور پر بھی انھوں نے اپنی انفرادیت اس طرح قائم رکھی ہے کہ طرحی غزل بہت کم کہی ہے بلکہ اکثر غزلوں کے لئے زمینیں بھی نئی اختیار کی ہیں، مجموعی طور پر ان کی غزل پر اس سے بہتر تبصرہ کیا ہو سکتا ہے کہ ؎

جس میں اک ساز بھی ہو سوز بھی ہو اے حیرت اُس سے بڑھ کر کوئی اندازِ غزل کیا ہو گا

موجودہ دور میں ایک عام رسم ہو گئی ہے کہ کسی اچھے شاعر کے تذکرے میں اس کے خاص پیغام کی جستجو کی جاتی ہے، گویا کوئی شاعر بڑا شاعر سمجھا ہی نہیں جاتا، جب تک کہ اس کی شاعری کسی خاص پیغام کی حامل نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ رومی اور اقبال ایسے صاحب پیغام شاعر تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُن سے قطع نظر پیام، شاعر کے کلام کی بہ نسبت بہت کچھ سننے والے کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے، جس طرح اہلِ نظر کو ہر منظر فطرت سے کوئی نہ کوئی پیام مل جاتا ہے اُسی طرح ہر اچھے شعر سے اہلِ دل کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو اثر پذیر ہوتا ہے، دیکھنے والی آنکھ کو تو انسان، ستارے، بادل غرضیکہ ہر چیز سے پیام مل سکتا ہے، اور توجہ نہ ہو تو دیوار پر لکھی ہوئی پند ،

بھی نظر انداز ہو جاتی ہے، چنانچہ حیرتؔ کے کلام میں بھی آپ کو مجموعی طور پر تو کوئی رسمی پیام نہیں ملے گا۔ لیکن انفرادی طور پر شاید ہی کوئی شعر ہو، جس میں کوئی نہ کوئی پیغام نہ ملے۔ خواہ وہ اس قدر واضح ہو کہ ؎

ٹھوکریں کھا رہے ہو کیوں حیرتؔ　　راہ کیوں دیکھ کر نہیں چلتے

یا اتنا لطیف کہ ؎

ہوتا نہیں دل بھی کام کا دل　　جب تک کہ ہلاکِ غم نہ ہولے

حیرتؔ بیان کی سادگی کے ساتھ زبان کی صحت کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ اصولِ فن اور روایاتِ ادب کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ یہی سبب ہے کہ رائج الوقت بے راہ روی سے محفوظ رہے ہیں، شعر میں ان کی نظر ملنے بہت بلند پائی۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح بھی ہوا کہ علالت کے زمانے میں وہ مجھ سے رسائل منگا لیا کرتے تھے۔ جو رسالہ واپس آتا۔ اس میں ان کے پسندیدہ اشعار پر پنسل کا نشان ہوتا، اور جہاں کہیں انہیں زبان کی غلطی نظر آتی، اس کی اصلاح کر دیتے۔ اسی سبب سے ان کا مختصر سا ذخیرۂ کتب بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کیوں کہ ہر کتاب کے حاشیے پر ان کی اصلاحیں اور تبصرے بہت پُر مغز ہوا کرتے تھے۔ معلوم نہیں ہنگامہ تقسیم میں یہ کتابیں تلف ہو گئیں یا بچ رہیں۔

حیرتؔ بہت کم گو شاعر رہے ہیں، کیا ہوا جو سال چھ مہینے میں ایک آدھ غزل ہو گئی۔ نواب سائلؔ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ حیرتؔ شعر کہتا نہیں، شعر جنتا ہے۔ مگر انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ جب سے وہ بیمار پڑے ہیں، شعر گوئی کی رفتار کبھی کبھی بہت تیز ہو گئی ہے۔ چنانچہ گزشتہ تین برس کی غزلوں کی تعداد عمر بھر کے ذخیرے سے کہیں زیادہ ہے۔

ان کی بیماری کی نوعیت بھی قابلِ ذکر ہے۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۴۴ء کو صاحب فراش ہوئے، اور آج تک نہیں اُٹھ سکے کمر کا حصہ سخت ہو گیا ہے، جس سے ٹانگیں ماؤف ہیں۔ فالج نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ حس و حرکت موجود ہے۔

؎ ہے عالمِ حیرتؔ بھی عجب عالمِ حیرت　　بیٹھے ہیں تو بیٹھے ہیں کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں

یونانی، ڈاکٹری، اریو ویدک، ہومیو پیتھک، لوئی کونی، پانی کا علاج، غرضیکہ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں ہر سسٹم کے جو بہترین معالج میسر آسکے سب کو پوری طرح آزما کر دیکھ لیا گیا۔ کسی سے تشخیص صحیح ہو سکی، نہ درست تجویز۔ پھر طرفہ یہ کہ اتنا عرصہ بستر پر پڑے رہنے اور مختلف علاجوں کے تختۂ مشق بننے کے بعد، معدے اور دماغ دونوں، کا فعل بڑی حد تک درست ہے، گویا وہ برسوں سے علوم طبیہ کے لئے ایک معمہ بنے ہوئے ہیں۔ اور موجودہ زمانے کی طبی ترقیات کے لئے ایک چیلنج۔

بیماری کی تو یہ کیفیت ہے، لیکن زندگی برقرار رکھنے میں قدرت کا یہ کرشمہ کہ ماتا سندری روڈ، نئی دہلی، جہاں ان کا قیام تھا۔ ہنگامے کا خاص مرکز رہی۔ کراچی میں جب اس جگہ کے نام کی تخصیص کے ساتھ فساد کی خبریں پہنچیں تو ان کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی، فساد دور ہو جانے پر بعض ہندو احباب سے دریافت کیا تو اتنا معلوم ہوا کہ مکان خالی ہے اس سے گمان یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ لیکن چار مہینے کے بعد ایک صاحب دہلی سے ان کا رقعہ لائے۔ جو پرانے قلعے سے لکھا گیا تھا، معلوم ہوا کہ بیماری کے عالم میں پرانے قلعے کی انتہائی تکالیف برداشت کر کے اپنے بھائی عبدالرشید صاحب کے ہاں احاطہ کالے صاحب پہنچ گئے۔ اور عرصے کے بعد موڑک (کوٹہ، راجستھان) اپنی سسرال چلے گئے۔

حیرتؔ صاحب نے شعر کے علاوہ نثر میں بھی طبع رواں پائی ہے، مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے اُن کی ایک کتاب "بنی اسرائیل"

کا چاند" شائع ہو چکی ہے، جو رائڈر ہیگرڈ کے ایک ناول کا ترجمہ ہے۔ علاوہ ازیں "مخفی" کے نام سے وہ سب سے پہلے "سند باد جہازی" (مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم) کے بلند پایہ مزاحیہ اخبار" شیرازہ" لاہور میں اور اس کے بند ہو جانے پر دوسرے رسائل میں، "یہ دہلی ہے" "یہ شملہ ہے" کے عنوان سے نہایت دلچسپ سلسلۂ مضامین لکھتے رہے، پچھلے دنوں جناب مجید لاہوری کے "نمکدان" کراچی میں "اخبار الموڈرک" کے عنوان سے بھی کچھ لکھا ہے، اور انگریزی زبان کے مشہور مزاحیہ نگار مارک ٹوین کی "چند کہانیوں" کا ترجمہ کر ڈالا ہے، ایک عجیب پہلو یہ بھی قابل ذکر ہے کہ شاعری زیادہ تر حزنیہ ہے اور کلام نثر بیشتر مزاحیہ۔

علاوہ ازیں ان کے خطوط بھی ایک خاص ادبی حیثیت رکھتے ہیں ــــ نہایت بلیغ، شگفتہ اور مختصر، کیا مجال کہ ایک لفظ بھی بے ضرورت استعمال ہو جائے، اگر احباب ان کے خطوط جمع کر کے شائع کر دیں تو یہ یقیناً ادبیات اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔

اب ان کے چند متفرق اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے ان کے مخصوص رنگ طبیعت کے علاوہ، مختلف کیفیات کا اندازہ ہو سکتا ہے: ؎

وہ جو اک بات ہے دلسوزی و دلداری کی　　　کہیں ہوتی ہے بھلا قول و قسم سے پیدا

یا کسی کے حکم کا پابند بن　　　یا طبیعت کی روش آزاد رکھ

مجھے کوئی خود کام سمجھے تو سمجھے　　　مگر میں تو سب کا بھلا چاہتا ہوں

اس فکر میں کہ دل کو کسی طرح کل پڑے　　　کیا کیا نہ اضطراب کے پہلو نکل پڑے

آج بھی جو وفا پہ قائم ہیں　　　وہ بھی ہیں لوگ کس زمانے کے

جوانی میں پابندیاں بڑھ رہی تھیں　　　مگر میں یہ سمجھا کہ آزاد ہوں میں

دکھا کر زخم دل یہ دیکھتا تھا　　　کہ اس کی داد ملتی ہے کدھر سے

غیروں سے نہیں خویش و اقارب ہی سے حیرت　　　جب رنج پہنچتا ہے، تو ہوتا ہے گلہ بھی

کرتا رہا تلافیٔ مافات عمر بھر!　　　پھر بھی گناہگار گنہگار ہی رہا

آج یہ سوچنے بیٹھا ہوں کہ کل کیا ہوگا　　　اس سے بڑھ کر بھی کسی سر میں خلل کیا ہوگا

اب آپ کو ہوئی دلِ مرحوم کی خبر　　　اس بات کو تو ایک زمانہ بھی ہو چکا

سرخوشی اپنی جگہ اچھی ہے، غم اپنی جگہ　　　یعنی وہ اپنی جگہ اچھے ہیں، ہم اپنی جگہ

تم خوش نہ کر سکو تو تمہاری خطا نہیں!　　　ہم خوش نہ رہ سکیں تو ہمارا قصور ہے

آخر میں ان کی دو مکمل غزلیں درج کرتا ہوں، جو میرے نزدیک ان کی بہترین غزلیں ہیں۔ پہلی غزل تو ایک دور میں بہت مقبولِ عام رہی ہے۔ اور دوسری کی بھی بہت سی نقلیں ہوئیں، مگر کوئی اُس مقام کو نہیں پہنچ سکی۔

اُس بزم میں جو گردشِ پیمانہ ہوگئی　　　ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہوگئی

کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور　　　جس پہ نثارِ ہستیٔ پروانہ ہوگئی

یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ سازِ دل　　　یا اب وہی نظر ہے کہ بیگانہ ہوگئی

صد شکر، کچھ تو ان سے ہوئی آج گفتگو　　　یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہوگئی

اللہ رے ، اشکباری شمعِ شبِ فراق ۔ جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہوگئی

حیرت ہے کے غمکدے میں خوشی کا گزر کہاں

تم آ گئے ، تو رونقِ کاشانہ ہوگئی

وقت مشکل سے کٹے گا ، مجھے معلوم نہ تھا ۔ چین دل کو نہ ملے گا ، مجھے معلوم نہ تھا

اور بھی جس سے دلِ زار کو وحشت ہوگی ۔ واسطہ اُس سے پڑے گا مجھے معلوم نہ تھا

ایک مدت کی جگر کاوی و دل سوزی کا ۔ یہ صلہ مجھ کو ملے گا ، مجھے معلوم نہ تھا

کوئی ہمدم مرے ہمراہ مرے دوش بدوش ۔ دو قدم چل نہ سکے گا مجھے معلوم نہ تھا

صبر کرتا ، نہ بر آئی تھی اگر دل کی مراد ۔ صبر بھی ہو نہ سکے گا ، مجھے معلوم نہ تھا

رات دن گردشِ پیہم سے گزرنا ہوگا ۔ دل کا پیمانہ بھرے گا مجھے معلوم نہ تھا

جس کے ہونے کا نہ تھا کوئی بظاہر امکاں ۔ ایک دن ہو کے رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

دامنِ شوق مرے ہاتھ سے چھٹ جائیگا ۔ اس قدر کوئی کھینچے گا مجھے معلوم نہ تھا

دل میں تسکین کا پہلو نہ رہے گا کوئی ۔ گھر یہ اس طرح لٹے گا ، مجھے معلوم نہ تھا

داغِ دل ، داغِ جگر ، داغِ تمنا حسرت

مر کے بھی مٹ نہ سکے گا ، مجھے معلوم نہ تھا

ان غزلوں کے بعد مزید شوق کی تشفی ، مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے ہوگی ، اس ذہنی پس منظر کے ساتھ کچھ اور پہلو بھی روشن نظر آنے لگیں گے ۔ اسد ملتانی ——— کراچی ، جنوری ۱۹۶۲ء ———

مصنف :- اسوالڈ سکارز
مترجم :- وارث سرہندی

جنس کا مفہوم

(زیر ترجمہ کتاب "نفسیاتِ جنس" (Psychology of Sex) کا پہلا باب)

جنسی تعلق بھی، خاندانی روابط، دوستی، کاروباری تعلقات، کسی تفریحی انجمن یا سیاسی جماعت کی رکنیت اور دیگر انواع کے اجتماعی امور کے تعلقات کی مانند انسانی تعلق کی ایک صورت ہے۔ لیکن اس کی تین خصوصیات ایسی ہیں۔ جو اس کو ممتاز و منفرد بنا دیتی ہیں!

اولاً، دیگر تمام روابط کی صورت میں افراد ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور محض ایک مشترک مقصد ان کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتا ہے، خواہ یہ کوئی سائنسی مسئلہ ہو یا ملکی دفاع۔ لیکن جنسی تعلق زن و مرد کی حیثیت انفرادیت کو تبدیل کر دیتا ہے اور من و تو کو ایک نئے قالب میں ڈھال کر "ما" کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

ثانیاً جنسیت انسانی وجود کے تینوں پہلوؤں یعنی روح، ذہن اور جسم کو ملا کر ان میں وحدت عمل پیدا کر دیتی ہے۔

ثالثاً، جنسی ربط اپنی کامل و بالغ شکل یعنی شادی کی صورت میں مستقل و مستحکم ہوتا ہے۔

اگرچہ جنسیت کے ان ہر سہ عناصر ترکیبی پر بحث اس کتاب کے موضوع کا تعین کرتی ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر دوسرے عنصر پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے، تاکہ اس اصول کی وضاحت ہو سکے جو ہماری تمام بحث کی بنیاد ہوگا۔

جنسی تحریک بھی بھوک اور پیاس کی طرح ایک جبلت ہے۔ ہر جبلت کا عمل عضویاتی نظام یا نامیاتی جسم کی کسی نہ کسی حاجت کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً بھوک ہم کو غذا کی ایک خاص مقدار فراہم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جس کی وقت معینہ پر عضوی نظام کو ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جنسی جبلت کس حاجت کو پورا کرتی ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے، کہ بھوک کے علاوہ ہمیں خوراک کے ضمن میں ایک اور احساس سے بھی واسطہ پڑتا ہے، جس کو اشتہائے کاذب کہا جاتا ہے۔ اشتہائے کاذب کو عمدہ خوراک دیکھنے کر انگیخت ہوتی ہے۔ اس کو غذائی اقدار اور احتیاج قوت سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

ہماری جنسی اشتہا یعنی جنسی تحریک کے تاثر میں ہمارے گرد و پیش کی دنیا کو حیرت انگیز طور پر تبدیل کر دینے کی ساحرانہ قابلیت پائی جاتی ہے۔ اور بعض اوقات اس سے بلا کی طاقت ظاہر ہوتی ہے۔ انتہائی غیر متعلق چیزیں بھی جنسی تحریک میں بدل سکتی ہیں، بشرطیکہ ہمارے محبوب سے ان کا کوئی نہ کوئی تعلق ہو یا ان سے اس کی یاد تازہ ہوتی ہو۔ مثلاً کاغذ کا ایک ایک حقیر ٹکڑا جس پر محبوب نے چند محبت آمیز الفاظ رقم کئے ہوں یا محبوب کا استعمال کیا ہوا معمولی سا فیتہ بھی محبت کرنے والوں کے لئے بہت معنی خیز و اہم ہوتا ہے اور طاقتور جنسی تحریک بن سکتا ہے، حالانکہ ایک غیر متعلق شخص کی نگاہ میں اس کی اہمیت اس کی ظاہری قیمت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ واقعتاً اقدار کی یہ معجزانہ نیرنگ سازی و کرشمہ زائی حیاتیاتی شعبہ میں بھی افزائش (Hormone) مدہوشی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تحریک کا مقصد کیا ہے؟ کلیت پسند بعجلت یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس کے باعث جنسی اشتعال سے پیدا شدہ تناؤ کو سکون ملتا ہے۔ اس میں حظ و انبساط کا عنصر شامل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیں بعض حوائج جسمانی کے پورا ہونے سے سکون

لتا ہے، جس میں خوشگواری کا احساس شامل ہوتا ہے، کسی فعل کا ہمارے ارادہ پر جتنا زیادہ انحصار ہوتا ہے، یہ احساس اتنا ہی زیادہ ابھرا ہوتا ہے۔ ہمارے قلب و امعاء کے افعال میں ایسے فرحت و انبساط نہیں پائے جاتے، کیوں کہ یہ افعال خود بخود سرزد ہوتے ہیں اور ان میں ہمارے ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ سانس لینا جو کسی قدر ارادی و اختیاری فعل ہے بعض مواقع پر ہمیں لطف دیتا ہے۔ مثلاً صبح کی ٹھنڈی ہوا میں گہرے سانس لینا۔ تزکیہ و صفائی ایک اختیاری فعل ہے، اس لئے اس سے بعض اشخاص کو ایک خاص حد تک لطف و سکون ملتا ہے۔ جو جسمانی آرام و سکون سے قطعی مختلف و ممتاز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چھوٹے بچے دیر تک اکیلے بیٹھے رہتے ہیں تاکہ وہ خلوت کی اضافی مسرت سے بہرہ ور ہو سکیں۔ چونکہ جنسی عمل تمام تر ارادی و اختیاری ہوتا ہے اور انفرادی وجود کی بقا کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ اس لئے جنسی حظ بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے۔ انیسویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی کے قول یہ فطرت کی چالاکی ہے۔ تاکہ نسل انسانی کے بقاء و تسلسل کے اس تکلیف دہ عمل کو جاری رکھنے کے لئے انسان کو بہلایا اور پھسلایا جا سکے۔ فرائڈ[1] کا بھی یہی خیال ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے کہ جنسی اور اسی قبیل کی دوسری لذتیں اس فرض کی بجا آوری کا انعام ہیں۔ لیکن ایسے نظریات اگر کوئی اہمیت رکھتے بھی ہیں تو بھی ان کا تعلق فلسفۂ فطرت سے ہے۔ سائنس کی عملداری سے یہ خارج ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک عجیب واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تمدن اس وقت معرض وجود میں آیا جب ایک شکاری پہلی بار اپنے شکار کو موقع پر چٹ کر جانے سے باز رہا اور اس کو گھر لے گیا تاکہ پکا کر کھائے اور اس مقصد کے لئے بھوک مٹانے کے فوری لطف کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا۔ لیکن تمدن کے دوران ارتقاء میں حظ (pleasure) کو احتیاج سے جدا کرنا تمدن کی خصوصیت بن گئی اور اس میں اس حد تک غلو کیا گیا کہ اب ہم ہر کام حظ و انبساط کے حصول کے لئے کرتے ہیں اور اس کی غیر منفک فطری اقدار کو نظر انداز کر دیتے ہیں ہم بہت زیادہ کھاتے ہیں، لیکن اس کا خوراک کی غذائی اہمیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم ضرورت سے زیادہ پیتے اور سوتے ہیں۔ ہم نے حظ کو احتیاج سے علیحدہ کرنا سیکھ لیا ہے، اب ہم مصنوعی احتیاج پیدا کرتے ہیں۔ تاکہ اس سے حظ اٹھا سکیں۔ اسی طرح جنسی حظ مقصود بالذات بن چکا ہے۔

جنسی جبلت کن ضرورتوں کو ظاہر کرتی ہے اور ان کے پورا کرنے میں کیا مدد دیتی ہے؟ یہ واضح ہے کہ اس کا تعلق افزائش نسل سے ہے اور یہ اس کا واحد ذریعہ ہے، جواب ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ تحلیل نفسی سے افزائش نسل کے شعوری یا لاشعوری رجحان کا کبھی پتہ نہیں چلا کہ اس کی بنیاد مذہبی، حیاتیاتی اور قبائلی ہے یا حُبِّ وطن؟ یہ امر قطعی خلاف قیاس ہے کہ فرانسیسی مرد شہنشاہ کے لئے نئے سپاہی پیدا کرنے کے مقصد کے تحت اپنی بیویوں سے ہم بستر ہوتے تھے۔

بالآخر ہمیں علم الحیات سے مدد ملتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حیاتیاتی اصول ہے کہ ہمارے جسم کا ہر عضو کام کرتا اور اپنا فرض پورا کرنا چاہتا ہے اگر اس کو کام کرنے سے روک دیا جائے تو مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ عورت کے جسم کا بیشتر حصہ استقرار حمل کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر عورت کے جسمانی و ذہنی نظام کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیا جائے تو وہ پژمردہ ہو جاتی ہے۔ عورت کو ماں کی حیثیت میں ایک ایسا روحانی حُسن ملتا ہے جو اس ضمن میں پیدا ہونے والے تمام جسمانی نقائص اور تکلیفوں کی تلافی کر دیتا ہے۔ ہر طبیب کو بعض ایسے واقعات کا علم ہوتا ہے۔ خواہ وہ استثنائی حیثیت ہی رکھتے ہوں۔ جو ظاہر کرتے ہیں کہ جنسی حظ ہنوز حیاتیاتی عمل سے

[1] پورا نام سگمنڈ فرائڈ۔ ولادت ۱۸۵۶ء۔ وفات ۱۹۳۹ء۔ مشہور ماہر نفسیات اور نفسیاتی علاج کا موجد اور اس موضوع پر متعدد کتب کا مصنف۔ یہ آسٹریا کا باشندہ تھا لیکن نازیوں کی یہود دشمنی کے باعث ۱۹۳۸ء میں انگلینڈ بھاگ آیا اور آخر دم تک وہیں رہا (مترجم)

غیر منفک طور پر وابستہ ہے۔ مجھے ایک عورت یاد ہے جس کی شادی کو کئی سال گزر چکے تھے اور وہ مطمئن بھی تھی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کے شوہر کے نطفہ میں اولاد پیدا کرنے والے جراثیم موجود نہیں اور اس وجہ سے وہ بچے کو جنم نہیں دے سکتی تو اس پر سرد مہری و جمود کی حالت طاری ہوگئی۔

بہرحال یہی وہ مقصد ہے، جو جنسی جبلت حیاتیاتی سطح پر انجام دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ خود غرضانہ کام ہے تو اس کو دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ہم صرف اسی وقت اپنے سے بڑے مقصد کو انجام دے سکتے ہیں جب ہم اپنی تکمیل کر چکے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ داخلی تغیر اور ایثار کی جبلت کے نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ گروہ بندی کی جبلت کا حوالہ دینا یہاں عبث ہوگا کیوں کہ انسانی جماعت قطعی طور پر ایک ریوڑ یا غول سے مختلف ہے۔ اور اسی طرح ایسے ایثار آمیز اعمال کا ذکر بھی فضول ہوگا جو کسی پرہیجان لمحہ کی پیداوار ہوں۔ مثلاً ایک بچے کو ڈوبتے دیکھ کر اس کے ساتھ چھلانگ لگا دینا۔ انسانی اطوار کی یہ اشکال جبلی افعال و انفعال سے پیچیدہ تر ہیں اگر خود نمائی کی جبلت کا وجود ہے (جو شکوک سے بالاتر ہے) تو اس کا اظہار اسی وقت ہوتا ہے جب فرد خود کو کسی نوع کا جزو سمجھتا ہے۔ اسی روش کا تعلق وجود کے مختلف پہلوؤں سے ہے جو خود غرضی و بے غرضی سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔

مرد میں "مامتا" کی جبلت کے مماثل و متبادل کوئی چیز موجود نہیں، کیوں کہ مرد کو اپنی جسمانی و شخصی تکمیل کے لئے بچوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی شخص اس واقعیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ عورت کے تمام جنسی اعضاء جسم کے اندر ہوتے ہیں اور مرد کی جسمانی ساخت کا معاملہ اس کے برعکس ہے مرد کے لئے بچہ اس کی حیاتیاتی تکمیل کے لئے ضروری نہیں۔ اس کی اہمیت کا تعلق سماجی شعبے سے ہے مرد بچے کا اس لئے پیاسا ہوتا ہے کہ وہ اس کے نام اور کاروبار کو زندہ رکھے گا۔ اس کو اکثر و بیشتر یہ امید ہوتی ہے کہ اس کا بچہ اس کے عزائم کی تکمیل بہتر طور پر کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ اس بچے کی پرورش کرتا ہے، جس کو اس کی بیوی نے جنا ہوتا ہے اور اس کی بیوی کے جسم کی یہ تخلیق اس کا ذہنی کارنامہ بن جاتی ہے۔

نسبتہً بہت کم صورتوں میں ہم مرد میں ایک خاص نوع کی جبلت معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ بقائے نام کی تمنا ہے جس کو اولاد کی خواہش کہا جا سکتا ہے۔ جب کامل رفاقت و مقاربت کے باوجود بھی ان کی بیویوں کو حمل قرار نہیں پاتا تو بعض حساس لوگ کس قدر بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔ وہ جس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں وہ ان کی اپنے ساتھی کے ساتھ کامل اتحاد کی خواہش کی تسکین ہے۔

مانع حمل تدابیر کے متعلق صرف چند الفاظ کہوں گا۔ ہمیں اس سوال سے کوئی بحث نہیں کہ مانع حمل تدابیر مذہبی لحاظ سے ناجائز ہیں یہ ایک معاشی ضرورت ہیں یا قیام صحت کی بنا پر مناسب ہیں۔ ہمیں ان سے اسی حد تک دلچسپی ہے۔ جس حد تک جنسی زندگی ان سے متاثر ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب پہلے ہی دیا جا چکا ہے کہ عورتوں کی ایک تھوڑی سی تعداد کی جنسی تسکین، جو بذاتِ خود زندگی بھی ہے، استقرار حمل سے وابستہ ہے۔ ان مستثنیات سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصولاً مانع حمل ادویہ کا استعمال ہماری جنسی زندگی کو قابل غور خلاقی عنصر سے متعارف کراتا ہے۔ یہ حیاتیاتی عمل کو بلند کر کے انسانی کارنامہ کی سطح تک لے آتا ہے۔ غیر محتاط مباشرت سے ہو سکتا ہے حمل ٹھیرے یا نہ ٹھیرے۔ اس کا انحصار علم الابدان اور علم الکیمیا کی خاص شرائط پر ہے اس طرح نئی انسانی ہستی کی تخلیق اتفاقات پر منحصر ہو جاتی ہے، جو انتہائی دل شکن خیالی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔ مانع حمل ادویہ کے استعمال اور بچے کی حقیقی طلب ہونے کی صورت میں ان کو ترک کرنے سے ہم ایک غیر ارادی و اضطراری امر کو اپنے ارادہ کے تحت لے آتے ہیں۔ اس ضرورت کی منصوبہ بندی کے لئے سرد مہری کی ضرورت جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بچے کی پیدائش عورت کے جسم و وجود کی بنیادی ضرورت ہے تو پھر مانع حمل ادویہ کے استعمال سے اس کو اس تکمیلی عمل سے محروم کر دینا ظلم اور انتہائی غیر اخلاقی چیز ہو گی جہاں تک سوال ہے بچے کی طلب انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور یہ ہمیشہ حقیقی ہوتی ہے البتہ اس کو معاشی و اقتصادی بدحالی کا خوف دلا کر دبانے اور مصنوعی بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اقتصادی بدحالی کا یہ علاج نہیں کہ تحدید نسل پر زور دیا جائے بلکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام افرادی قوت کو بروئے کار لا کر معاشی خوشحالی پیدا کی جائے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہماری افرادی قوت ضائع ہو رہی ہے۔ اسی سے کام لے کر ہم فلاحی معاشرہ قائم کر سکتے ہیں۔

نہیں۔ بلکہ یہ جذبات انگیز محبت کے کمال و عروج کا اظہار بھی ہو سکتا ہے اور اس کا مقصد ہماری زندگی کے سب سے اہم لمحہ کی توقیر ہے۔

جنسیت کا دوسرا ترکیبی عنصر جو جذباتی ہے، اس کو بالعموم محبت کہا جاتا ہے۔ اگرچہ عام آدمیوں کا خیال ہے کہ اس شریفانہ جذبہ کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں لیکن ماہرین اس قدر متیقن نہیں ہوتے۔ آئندہ باب میں ہم اس عدم تیقن کے متعلق بہت کچھ عرض کریں گے۔ لیکن یہاں جنسی جبلت اور محبت کے مابین جو تعلق ہے اس کی نشان دہی کر دینا ہی کافی ہے۔

ایک قدیم یونانی روایت سے محبت کی ماہیت نسبتاً زیادہ بہتر انداز میں واضح ہوتی ہے۔ روایت یوں ہے کہ قدیم الایام میں خطۂ ارض پر ایک ایسی مخلوق آباد تھی جو نصف مرد اور نصف عورت تھی۔ یعنی ایک ہی جسم میں مرد اور عورت کی خصوصیات مجتمع تھیں۔ یہ مخلوق بہمہ وجوہ مکمل ہونے کے باعث بہت مغرور تھی ان کا غرور و تمکنت اتنا بڑھا کہ انھوں نے دیوتاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ جس پر عظیم قوت کے مالک دیوتا زیئس (ZEUS) نے برافروختہ ہو کر ان کے دو ٹکڑے کر کے زمین پر منتشر کر دیا۔ اس وقت سے ہر ٹکڑا اپنے دوسرے ٹکڑے کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ وہی آرزوئے تکمیل ہے جس کو ہم محبت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس روایت کی جدید تشکیل یہ ہے کہ یونانی دیوتا ہرمس اور دیوی آر فوڈائٹ کا ایک بیٹا ہرما فوروڈائٹس نامی تھا۔ چاہ سلامی کی حسینہ اس خوبصورت نوجوان کی محبت میں مبتلا تھی اس حسینہ نے دیوتاؤں کے حضور میں وصل محبوب کی التجا کی۔ دیوتاؤں نے اس التجا کو قبول کر لیا اور ان دونوں عاشق و معشوق کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ایک جان اور ایک قالب بنا دیا۔ لیکن دونوں جنسوں کی خصوصیات کو برقرار رہنے دیا گیا۔ اس لئے علم الامراض کی اصطلاح میں ایسے افراد کو جن میں اپنی جنس کے علاوہ جنس مخالف کی خصوصیات بھی پائی جائیں ہرما فوروڈائٹ (زنخا) کہتے ہیں[1]

لفظ "تعلق" کا مفہوم یہ ہے کہ دو مختلف اشیاء ایک دوسرے کی محتاج ہیں لیکن وہ ایک ہی نوع کی نہیں ہوتیں یا احتیاج ان میں قدر مشترک ہوتی ہے جو تعلق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جنسی میلان کا تعلق حیاتیات سے ہے اور محبت کا تعلق ہمارے وجود کے شخصی پہلو سے ہے۔ یہ اختلاف اگرچہ اہم ہے لیکن اسے ابھی عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس نظریہ کی ترویج و ترقی میں اس لئے رکاوٹ پیدا ہوئی کہ بدقسمتی سے دو اشخاص یعنی ہیولاک ایلس[2] اور سگمنڈ فرائڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ محبت کے ارتقاء و تنزل کا دار و مدار جنسی میلان پر ہے۔ اس نظریہ کی تردید میں، میں اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنسی میلان فرد کی ایک ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس لئے یہ اسی شخص تک محدود ہے، جس کو اس ضرورت کا احساس ہو۔ محبت ہمیں اپنے آپ سے دور کر کے ایک دوسری ہستی میں ضم کر دیتی ہے۔ جبلت کا ہیجان اس کی تسکین کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن تنگی و محبت جو تسکین سے بالاتر ہے دائمی ربط کا باعث بنتی ہے، کیوں کہ محبت ایک جامد کیفیت نہیں بلکہ ایسی چیز ہے جو ہمیشہ سرگرم عمل رہتی ہے اور ہمیشہ تازہ بتازہ رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو فی نفسہٖ ایک مقصد بھی ہے۔ اس میں وصل محبوب کے بعد بھی ٹھیراؤ پیدا نہیں ہوتا۔

جسمانی ہیجان کی تسکین محبت کی آرزوئے جاوید سے قطعاً مختلف ہے۔ جسمانی مواصلت کے بعد ہمیشہ تکان اور افسردہ سکون پیدا ہوتا ہے، جب کہ محبت میں اس سرور و مدہوشی سے تازگی پیدا ہوتی ہے اور عاشق و معشوق ایک نوزائیدہ بچے کی طرح حیرت

[1] یونانی صنمیات کے یہ اساطیر چونکہ انسانی تخیل کی تخلیق ہیں اس لئے ان میں عدم توازن اور مبالغہ کی شکایت فضول ہے۔ اسلام نے مرد و زن کی باہمی اہمیت کو جس حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ تمام مباحث کو ختم کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کے ان الفاظ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ میں مرد و زن کے تعلق کو جس طرح انداز میں بیان کیا گیا ہے اس سے بہتر انداز میں اس کی تعبیر ممکن نہیں اور جو روایت اس کلیہ سے جتنی دور ہے وہ حقیقت سے اتنی ہی بعید ہے۔ (مترجم)

[2] پورا نام ہنری ہیولاک ایلس۔ ولادت ۱۸۵۹ء وفات ۱۹۳۹ء۔ ایک مشہور برطانوی ادیب اور ماہر جنسیات تھا۔ اس موضوع پر اس نے بہت سی کتابیں لکھیں اس کی مشہور ترین ضخیم تصنیف "مطالعہ نفسیات جنس" ۔ سات جلدوں پر مشتمل ہے (مترجم)

اور استعجاب سے ایک دوسرے پر نظر ڈالتے ہیں، گویا وہ اس سے پہلے ایک دوسرے سے واقف نہ تھے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوتے۔

جنسی میلان ایک اندھا عمل ہے۔ نر مادہ سے ملتا ہے یا بالفاظ دیگر عورت مرد کے لئے کچھ کرتی ہے اور مرد عورت کے کام آتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس پر مجہولیت طاری رہتی ہے۔ لیکن محبت انسان کی آنکھیں کھول دیتی ہے اور محبوب کی غیر منفک شخصی اقدار سے روشناس کراتی ہے۔ جنسی عمل میں ہم نے دوسری روح کے راز کی جستجو کی ہے۔ پہلا مرد پہلی عورت سے واقف ہوا۔

روایتی نفسیات محبت کو ایک جذبہ کہتی ہے۔ بیشک محبت میں ایک قوی جذباتی عنصر موجود ہے لیکن بنیادی طور پر محبت ایک درکی اور عرفانی عمل ہے اور فی الحقیقت شخصیت کی نہایت پوشیدہ گہرائیوں تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ خالص جسمانی عمل سے تکان اور افسردگی پیدا ہوتی ہے، لیکن وہ جسمانی اتحاد جس کا موجب محبت ہو تازگی و تقویت دیتا ہے۔ وہ تخلیقی عمل جس کی بنیاد جسمانی ہو روحانی تخلیق کی شرط ہے۔ ہر تخلیقی خیال میں محبت کی ہزار ہا فراموش کردہ راتیں زندہ و تابندہ ہو جاتی ہیں اور اس خیال کو شوکت و عظمت بخشتی ہیں۔ (آر۔ ایم۔ ریلکی) کرسٹوفر کاڈویل بھی یہی بات کہتا ہے۔ جنسی محبت جذبات و تجربات کی پیچیدہ تاریخ کر مالا مال ہے جس میں ہزاروں نسلوں نے مشترک طور پر حصہ لیا ہے۔

اگرچہ یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جنسی میلان اور محبت ایک دوسرے کے محتاج اور تکملہ بھی ہیں۔ ایک پوری طرح مکمل اور بالغ انسانی وجود ہی میں جنسی میلان اور محبت کا یہ ناقابل انفکاک اتحاد پایا جاتا ہے اور یہ جنسی نفسیات کا بنیادی اصول ہے۔ اگر کوئی شخص جنس سے صرف جسمانی تسکین ہی حاصل کر سکتا ہے تو اسے درجۂ اعتدال ساقط کہا جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس خالص روحانی محبت کا وجود پایا جاتا ہے اگرچہ افلاطونی محبت ایک غلط اصطلاح ہے۔ لیکن ایک وجہ سے مجھے اس کے وجود کا یقین ہے۔ اس سے میرا مطلب ہے کہ ایک مرد کسی عورت کی روحانی محبت میں مبتلا ہو سکتا ہے، لیکن ایک روح کی محبت میں نہیں، خواہ وہ اتفاقاً کسی عورت کے جسم میں حلول کر گئی ہو۔ عورت کے لئے حقیقت کی ترجمانی کا اعلیٰ ذریعہ اس کی نسائیت ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بیٹرس[1] سے دانتے[2] کی محبت اسی نوعیت کی ہو۔ لیکن قرون وسطیٰ کے شعراء کی محبت مجھے مصنوعی اور بیجان معلوم ہوتی ہے۔ اس ایک نایاب استثناء سے قطع نظر (مقالۂ بالا میں) ہماری جنسیت کی پیچیدگی اور جوان مرد یا عورت میں خالص جسمانی و جنسی رغبت کے عدم وجود کا خیال غیر مسلّم ہے۔

اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو علم امراض جنس بیّن شہادت پیش کر سکتا ہے۔ مردوں میں جو جنسی شکایت بہت عام ہے جسمانی خرابی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی وجہ ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ تحت الشعوری پیچیدگیاں جنسی اعضاء کے معمولی افعال میں مزاحم ہوتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے ایک مکمل بالغ شخص جس کے لئے جسمانی و ذہنی اتحاد ایک زندہ تجربہ کی حیثیت رکھتا ہو، تکمیل کا علم ہونے کے باعث، محبت سے عاری مقاربت میں لازماً ناکام ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ ایسا مظاہرہ ہوتا ہے جو جذباتی معنویت سے محروم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنسیت وہ واحد عمل ہے، جس میں کذب و خیانت کا کوئی دخل نہیں۔ جنسی معاملات میں ہمیں دیانتداری پر مجبور ہونا پڑتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ ظاہری حالات میں ہمارے خلاف ہی کیوں نہ نکلے۔ مجھے اپنے مریضوں

[1] بیٹرس پورٹنری (Beatrice Portinari) ولادت ۱۲۶۶ء وفات ۱۲۹۰ء۔ فلورنس کی ایک خاتون جس کے نام کو دانتے نے زندہ و جاوید بنا دیا۔

[2] ڈانٹے (Dante) مشہور اطالوی شاعر ولادت ۱۲۶۵ء وفات ۱۳۲۱ء۔

میں سے بعض ایسے اشخاص یاد ہیں، جنھوں نے جنگلوں کی ویرانیوں اور آسمان کی تنہائیوں میں جنگیں لڑیں لیکن بستر پر بے بسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کے عظیم جنگی کارناموں کے باوصف ان کے دل کی گہرائیوں میں خوف جاگزیں تھا۔ وہ صحیح معنوں میں مرد نہ تھے اس لئے جنسی ناکامیوں نے ان کو لپسپا کردیا۔ یہ جنس کا بنیادی اخلاق ہے۔

رُوحانی عنصر قدیم الایام سے ہم جنس کو اخلاقیات سے وابستہ دیکھتے آرہے ہیں۔ پیروانِ فلسفۂ ثبوتیت بیان کرتے ہیں کہ ان پابندیوں کا مقصد معاشرہ اور بالخصوص شادی کا تحفظ ہے۔ اور مذہبی شرائط کا نفاذ ان ضوابط کی تقویت کے لئے ہے۔ یقیناً یہ مسئلہ ایک پہلو ہے لیکن اس کو بمشکل سب سے اہم پہلو کہا جاسکتا ہے۔ اس اخلاقیت[1] کے علاوہ جو تاریخی ادوار میں رسوم و رواج کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے، ایک بنیادی اور غیر منفک جنسی اخلاق کا وجود بھی ہے۔ یہ جنسیت کی فطرت سے خود بخود پیدا ہوتا ہے اور حیاتیات انسانی کے دوسرے میلانات کے درمیان جنسی میلان کی استثنائی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ تمدن کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک ایسی حالت ہے، جس میں فطری میلانات کو کسی قدر ضبط میں رکھا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ان کی صورت تک مسخ کردی جاتی ہے۔ اس کا اطلاق تحفظ ذات کی جبلت پر ہوتا ہے۔ جس میں بھوک اور حملہ شامل ہیں۔ اس کے برعکس جنسی جبلت یعنی نر کی مادہ سے ملنے کی لازمی خواہش کو مسخ کرکے یا پابند کرکے رام نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا تعلق جذباتی و روحانی عنصر سے ہے اور اس لئے یہ انسان کی پوری شخصیت میں جاری وساری ہے۔ انسانی فطرت میں رُوح کا اثر و نفوذ پایا جاتا ہے۔ انسانی جنسیت محض ایک حادثہ یا اتفاق نہیں۔ بلکہ ایک ایسا فعل ہے جس کے ہم ذمہ دار ہیں۔ اگر ہم عجز و مسکنت سے جسمانی ترغیب کی اطاعت کرتے ہیں تو ارتکاب جرم کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ انسان کی بنیادی روحانی فطرت کو فریب دینا ہے۔ اس لئے خالص جسمانی مواصلت بنیادی طور پر غیر اخلاقی ہے۔ بے لگام جنسی تحریک ہمیشہ بے اعتدالی کی علامت ہوتی ہے۔ ہمیں تین قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے یعنی نابالغ، پاگل اور مجرم اور تین طریقوں سے اعلیٰ نفسیاتی روحانی عوامل جبلت ضبط و نظم پیدا کرتے ہیں۔ اولاً دلائل سے شعوری ضبط پیدا کیا جاتا ہے، جو محض ایک خاص موقع پر کام دیتا ہے اور ہمیشہ کارآمد نہیں ہوتا۔ ایسی حالت کو ہم حالتِ امتناع وارتفاع کہتے ہیں اور اگر ایسا ضبط تحت الشعوری اور مستقل ہو تو اس کو استرداد و انسداد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہر ماہر نفسیات شخص کو معلوم ہے کہ یہ اس مرضیاتی حالت کا سبب ہے جس کو اعصابی خلل کہا جاتا ہے۔

سب سے اہم تیسری صورت ہے۔ مرد کی جنسی زندگی میں انتہائی حیرت انگیز اختیاری تجرد و رہبانیت ہے، جس پر رومی کلیسا میں عمل ہوتا رہا ہے۔ یا اس کو ان لوگوں نے اختیار کیا۔ جنھوں نے خود کو غیر انفرادی مقاصد کے لئے وقف کردیا۔ اس عجیب حالت کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ امتناع و جبر کا نتیجہ نہیں، کیوں کہ کوئی شخص زندگی بھر ایک زندہ جنسی جبلت کو جبراً دبائے نہیں رکھ سکتا۔ اس عصمت و عفت کو جبر کا نتیجہ قرار دے کر ان مردوں اور عورتوں کو اعصاب زدہ قرار دینا نااہل نفسیات کے جاننے والوں کی بیجا ضد ہے۔ فرائڈ نے اس کو اور اس قسم کے دوسرے مظاہر کو نظریۂ "ارتفاع" کے تحت بیان کیا ہے، جس سے اس کا مطلب یہ ہے کہ جنسی میلان اعلیٰ ذہنی سرگرمیوں میں تبدیل ہوجاتا ہے، مثلاً بہبودیٔ خلق، فن سے محبت اور سائنس وغیرہ میں اشتغال فرائڈ کے خیال میں ثقافت و تہذیب جنس کے کامل ارتفاع کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ نظریہ قرنِ گزشتہ کی مادی نفسیات کی تخلیق ہے۔ فرائڈ کے (دبستان) کے سوا کوئی ماہر نفسیات ایسی نفسیاتی رسائی پر یقین نہیں رکھتا۔ جنس کو روح میں تبدیل کردینے کے امکانات ایک گھٹیا دھات کو۔

[1] اخلاق کے بنیادی اصول کبھی نہیں بدلتے، مثلاً جب سے انسان کا وجود اس دنیا میں مانا جاتا ہے، جھوٹ کو ہر دور میں بُرا اور قابل نفرت ہی سمجھا گیا ہے (م۔ق)

یخالص میں تبدیل کر دینے سے زیادہ نہیں (یعنی جس طرح ایک نکمی دھات سونا نہیں بن سکتی اسی طرح جنس روح میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔
یہ نظریہ ارتفاع جنسی طاقت کے غلط نظریہ پر مبنی ہے۔ طاقت کی اصطلاح میں علم حفظانِ صحت سے ماخوذ ہے۔ جہاں اس کا استعمال درست ہے، کیوں کہ جسمانی طاقت کا مظاہرہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی پیمائش بھی کی جا سکتی ہے، لیکن نام نہاد جنسی طاقت کا یہ معاملہ نہیں اس کو نہ کسی نے دیکھا ہے نہ ناپا ہے اور نہ کوئی اس کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک خیالی مفروضہ سے زیادہ نہیں جس کو غیر معقول نظریات کی تائید کے لئے وضع کر لیا گیا ہو۔ اگر اس غلط فہمی سے افسوسناک نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ تو اس نظریاتی بحث کے اعادہ و تکرار کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

جنسی تعلیم کے موضوع پر شائع ہونے والی کتب میں بھی بعینہٖ اسی قسم کے من گھڑت اور نقصان دہ بیانات ملتے ہیں۔ مثلاً جنسی طاقت وضیاعِ قوت کے بغیر ایسے ذرائع میں منتقل کیا جا سکتا جو براہِ راست جنس سے وابستہ نہیں ہیں۔ یا جنسی زندگی میں سرگرمی ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی اور تجرد کو متوازی حالتیں سمجھنا چاہیے۔ جو ایک ہی قسم کی روحانی ترقی کی طرف لیجاتی ہیں تو صداقت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ جنسیت سے محروم زندگی ہر لحاظ سے ناقص زندگی ہے۔ خواہ ایسے شخص کے کارنامے انسانی سرگرمیوں کے میدان میں کتنے ہی عظیم ہوں۔ کم از کم عام حالات میں تجرد کے ساتھ ایسے کارنامے انجام تو دیئے جا سکتے ہیں، لیکن تجرد کے ذریعہ نہیں۔ مردوں کی نسبت عورتوں پر یہ مثال زیادہ صادق آتی ہے۔

تجرد کی صورت میں ایک مرد اپنی زندگی کی جامعیت اور شانِ تکمیل سے کسی قدر دستبردار ہو جاتا ہے، لیکن عورت کو ایسی صورت میں اپنے وجود کے بنیادی جزو کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ ملکی فوج کے سالار ایونجلین بوتھ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اکیاسی سال کی عمر میں اپنی جوانی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا (وہ میری واحد حقیقی محبوبہ کا تقاضا تھا کہ میں فوج چھوڑ دوں۔ اس لئے ہم جدا ہو گئے۔ میں نے خود کو ایک کی بجائے لاکھوں دلوں کے لئے وقف کر دیا۔ مجھے اس کا افسوس نہیں۔ لیکن یہ بات مجھے یاد ضرور آتی ہے۔ میرے خیال میں کوئی شخص بھی اس کشمکش کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو یاد کرنے والے دل میں صدائے بازگشت بن کر گونجتی رہتی ہے۔

اگر ہم مشکوک بیانات سے دامن بچاتے ہوئے خود کو ان امور تک محدود کر لیں جن کی تصدیق و توثیق ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ اس کے بالعکس صورت بھی موجود ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ جنس کو اظہار کا اخلاقی راستہ نہیں دیا جاتا یا وہ روحانیت میں تبدیل ہو جاتی ہے ـــــ جو فرار کی ایک مبدّل صورت ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب کسی آدمی پر مذہبی عقیدت اور جوش اتنا غالب آجاتا ہے کہ کسی اور چیز کی سمائی کی گنجائش نہیں رہتی، تو جنسی رغبت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو سینٹ انتھونی کی ترغیبات کی کہانی سے اس کی بزرگی میں کسی قدر کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اگر قرونِ وسطیٰ کے راہب کو اپنے حجرۂ تنہائی میں جسمانی ایذا و مشقت سے جسمانی ترغیبات کو ختم کرنا پڑتا تھا، تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی برگزیدہ ہستی نہیں ہوتا تھا۔

ہم جیسے معمولی درجہ کے کمتر انسانوں کو بھی اکثر مواقع پر اس قسم کے پُراسرار حالات کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص خواہ اس کی قوتِ ارادی کتنی ہی زبردست ہو، تمباکو نوشی ترک نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کو ترک کرنے کی شدید ضرورت اس کی نظر میں مشکوک ہو۔ لیکن جونہی ایک شخص کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ عادت ترک کر دینی چاہیئے تو اس کی تمباکو نوشی کی خواہش خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ یا اگر ایک طبیب مشورہ کے کمرے میں ایک دلکش نوجوان عورت کے پاس تخلیہ میں بیٹھا ہے تو عام حالات

میں اس کی اپنے کام میں توجہ اور اپنے پیشہ کی شرافت کا احساس اس کو ہر قسم کی ترغیب سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کو اپنی مریضہ کی دلربائی کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ اسی عورت کو کسی ایسی محفل میں ملتا ہے، جہاں ان ضوابط کا کوئی دخل نہیں، تو حالات یکسر بدل سکتے ہیں۔

گزشتہ مثال بھی اپنی جنسیت کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کی آزادی دیتی ہے، محبت ایک حکمراں اور رہنما قوت ہے جنسی میلان ذریعہ تعمیل ہے اور روحانی عنصر ضبط و نظم قائم رکھنے والی قوت ہے۔ کسی خاص لمحہ میں جنسی تحریک کی موجودگی ہدایت و شدت اور جسمانی تحریک و روحانی ضبط کا ماحصل ہوتا ہے۔ خالص جسمانی تحریک اور مکمل غیر جنسیت دو انتہائی حدود ہیں، جن کے درمیان ان عوامل کے بے شمار امتزاجات کا امکان موجود ہے۔

بلاشبہ متعدد لوگ متذکرہ بالا بیانات پر اعتراض کریں گے۔ ہر شخص کسی ایسے دوست یا دوست کے دوست سے واقف ہو سکتا ہے جس کا جنسی رویہ ان میں سے بعض اصول کے خلاف ہو۔ اور اس سے یہ واضح کیا جائے گا کہ وہ مرد جب بھی چاہے کسی عورت سے قریب ہو سکتا ہے، وہ محبت کی تضحیک کرتا ہے اور روحانی حقائق کو لایعنی اوہام سمجھتا ہے۔ اس کے اس رویے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں، لیکن وجوہ کی کثرت اس بات کا ثبوت نہیں کہ ان میں سے کوئی وجہ قطعی اور فیصلہ کن حیثیت کی حامل نہیں ہے۔

سب سے پہلے کسی شخص کی جنسی پیچیدگیوں کے متعلق قابل اعتماد معلومات حاصل کرنے کے لئے پوری واقفیت ضروری ہے دوم پیشہ ورانہ علوم کی ضرورت ہے تاکہ ان مشاہدات و اعتراضات سے صحیح کام لیا جا سکے۔ سب سے اہم تیسری بات ہے جو کہ در انسان کے ایک نظریے پر مبنی ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق محض ان مردوں اور عورتوں سے ہے جو بحیثیت اشخاص اوج کمال پر ہوں، پوری طرح بالغ اور بنیادی اخلاق سے متصف ہوں۔ جس کی وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے۔ میں ایسے افراد کو مستند اور مثالی کہا کرتا ہوں۔ بہت سے اس معیار سے گر جاتے ہیں، بعض کی رفتار ترقی سست ہوتی ہے جن کے باعث تاخیر سے منزل بلوغت پر پہنچتے ہیں یا مقابلۃً ناقص رہتے ہیں یا کبھی اس منزل پر نہیں پہنچتے۔ وہ اپنی تمام زندگی پستی وانتشار کی حالت میں گزار دیتے ہیں لیکن بہت سے وہ بھی ہیں جو طبی معیار کے مطابق معتدل ہوتے ہیں لیکن مثالیت کے مختلف مدارج تک پہنچتے ہیں۔ اس اختلاف مدارج کی وجہ ان کی صلاحیتوں اور شخصی اقدار کا اختلاف ہوتا ہے۔ سماجی رتبہ، علمیت اور تصنع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا سرچشمہ انسانیت ہے۔ بلا لحاظ صفات اضافیہ واتفاقیہ، ایک ایسی چمکیلی بالائی سطح ہوتی ہے جو ہر چیز کو اپنے حصار میں لے کر اس کو دھندلا کر دیتی ہے۔ مجھے کئی بار حیرت ہوئی ہے بلکہ چونک اٹھا ہوں جب پیشہ ورانہ گفتگو کے دوران کسی معمولی آدمی نے، جو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، فلسفہ و نفسیات کے مطابق ایسی رائے ظاہر کی کہ جو فلاسفہ وماہرین نفسیات کے حاصل کردہ ان نتائج کے ہم پایہ تھی جن کے استخراج کے لئے ان کو پُر محن غور و تفکر سے کام لینا پڑتا ہے، ان مشاہدات سے اس جدید نظریے کی تصدیق ہوتی ہے کہ سائنس کوئی نئی چیز دریافت نہیں کرتا بلکہ ترقی یافتہ فنی اسالیب کے کام سے کر اس کو پُر شوکت بنا دیتا ہے۔

مثال کے طور پر فرائڈ کے انتہائی معرکۃ الآراء نظریات کا ماخذ قدیم اسرائیلی اساطیر، مکالمات افلاطون اور یونانی المیہ "ایڈی پس کی پیچیدگیاں" میں تلاش کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے فرائڈ کی عظمت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسی کے انکشافات کے طفیل ہم ان عبارتوں کے مرموز و پنہاں مطالب کو سمجھ سکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب سے انسان نے غور و فکر سے کام لینا شروع کیا ہے اس کے پاس بنیادی خیالات کا ایک محدود ذخیرہ ہے، اس ذخیرہ میں فی نفسہٖ کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، محض انداز

یاں بدلتا رہتا ہے اساطیر، الہامات اور رزمیات، اسالیب کے تغیر سے سارے نظریات میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

اِن حقیقی مَردوں اور عورتوں کو مکمل جنسیت فطری طرزِ حیات کی حیثیت سے ملتی ہے۔ مذکورہ بالا معترضین ان کے احباب اور حبیب کے احباب کا تعلق اس ورثہ کم پست تر و کمتر مراتب سے ہے۔

اسی مسئلہ پر ایک اور زاویہ سے بھی نگاہ ڈالی جاسکتی ہے:۔ ہماری جسمانی جنسیت لاشیءِ محض ہے۔ یہ صرف ہمارے بطن کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ مثلاً حیا سے چہرے کا سُرخ ہو جانا، ہنسنا، پانی پانی ہو جانا اور چیخ اُٹھنا ایسی کیفیات ہیں جن کا انحصار ہمارے ارادہ پر نہیں۔ کیوں کہ کافی جذبات نہ ہونے کی صورت میں ہم اپنی مرضی سے یہ کیفیات پیدا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ہنسی پر یہ اصول پوری طرح منطبق نہیں ہوتا، کیوں کہ ہنسی جبری اور مصنوعی بھی ہو سکتی ہے لیکن بناوٹی ہنسی کا تصنع بلا تامل ظاہر ہو جاتا ہے۔ جنسی فعل گویائی سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ ہم میں یہ استعداد موجود ہے کہ ہم گفتگو کے ذریعہ اپنے آپ کو، اپنے جذبات کو اور اپنے عزائم کو ظاہر کر سکیں۔ ایک معتدل طبیعت کا شخص اس وقت بولتا ہے جب اس کو کچھ کہنا ہوتا ہے، لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا لیکن بولتے رہتے ہیں۔ وہ محض اس لئے باتیں کرتے ہیں کہ لوگ ان کی باتیں سنتا پسند کرتے ہیں یا وہ دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں یا بعض دیگر بنیادی وجوہ کی بنا پر وہ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح انتشار زدہ جنسی مواصلت بظاہر جذباتی تعلق کے اظہار کے لئے ہوتی ہے، حالانکہ فی الواقع کوئی چیز موجود ہی نہیں ہوتی جس کو ظاہر کیا جائے۔ یہ ایک طرح کا جنسی کھوکھلا پن ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ایسے نظریات کو قائم کرنے اور ان کو اصولِ موضوعہ کی حیثیت دینے کا کیا فائدہ ہے جبکہ ان کا اطلاق محض چند امور پر ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ تو ہے، لیکن اس کو ثابت کرنے کی کوشش میں ہمیں ایک انتہائی مشکل مسئلہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جس کا تعلق انسانی وجود کے حقیقی علم سے ہے یعنی مسئلہ معیار ــــ کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کی مدد سے ہم کسی انسانی رویہ کو معیاری و معتدل کہہ سکتے ہیں؟

اس انتشار کی وجہ سے جو نظریہ معیار کو دھندلا دیتا ہے، اس حقیقت کا ناکافی احساس ہے کہ اس نظریہ کا محض ایک ہی مفہوم نہیں ہر مجموعۂ اشیاء الگ معنیٰ رکھتا ہے جو اس پر منطبق ہوتے ہیں، معیار کی مشہور ترین قسم معیارِ شمار یا معیارِ اوسط ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی خاص آبادی کے مردوں کی کافی تعداد کے قد کی پیمائش کرے یا بچوں کے ایک خاص گروہ کی ذہانت کی جانچ پڑتال کرے تو کہا جاسکتا ہے کہ قد اور ذہانت کے اوسط شمار ان دونوں گروہوں کے معیار کا نمائندہ ہے۔ اور کوئی مرد یا بچہ جو اسی معیار کے مطابق ہے معیاری اور معتدل ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی حقیقت ہے کہ تقریب قریب ہر شخص کے ایک یا زیادہ دانت خراب ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں دانتوں کی خرابی اعتدال کی علامت ہے۔ کیوں کہ معیار کا حیاتیاتی نظریہ شماری نظریہ سے مختلف ہے۔ ایک عضو یا نظامِ عضوی اس وقت حیاتیاتی طور پر معتدل و معیاری ہوتا ہے جب وہ اپنے افعال و وظائف کو کما حقہٗ ادا کر سکے۔ اب اگر ہم انسانی رویہ کو جانچنے کا ارادہ کریں، جس میں اقدار اور بالخصوص اخلاقی اقدار کا عمل دخل ہے۔ تو یہاں نہ تو شماری معیار کافی ہوگا نہ حیاتیاتی معیار۔ ہم اس امر پر قانع نہیں ہو سکتے کہ لوگ معمولاً سچ بولتے ہیں یا اگر شادیاں فسخ نہیں ہوتیں یا بہت سے لوگ ہر اتوار (یا جمعہ) کو گرجا (یا مسجد) جاتے ہیں۔ البتہ ہم اس بات پر اصرار کریں گے کہ اعتدال پسندی یہ ہے کہ کسی معاملہ میں بھی صداقت سے روگردانی نہ کی جائے، شادیوں کو کامیاب بنایا جائے اور ہفتہ وار اپنے اخلاقی قوانین کا اعادہ کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں شخصی اعتدال کا معیار "تکمیل" ہے۔ اور یہ معیار اسی وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک دنیا میں ایک شخص بھی اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ علم اعداد و شمار سے

ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا جسم ہی اکیلا کمزور نہیں بلکہ رُوح بھی کچھ کم کمزور نہیں ہے۔

آج کل ترقی پسند ماہرین تعلیم اور معلمین میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ جنسی معاملات کے لئے مکمل طور پر فطری رویہ اختیار کیا جائے۔ فطری رویہ سے ان کا مطلب یہ ہے کہ جنسی مضامین کے متعلق نہ صرف پریشانی و انتشار سے دور رہا جائے بلکہ اگر ممکن ہو تو ان کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو دوسرے مضامین کی تعلیم و تدریس کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ اور ان کو اسی ٹھوس معلومات کی حیثیت دی جائے جو ہر بچے کو مہیا کی جاسکیں اور کی جانی چاہئیں اسی خارزار کو عبور کرنے کے لئے حیاتیات کو بہترین ذریعہ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے۔

بدقسمتی سے یہ تمام منصوبہ دو مغالطوں پر مبنی ہے۔ پہلے کا تعلق حیاتیاتی رسائی ہے۔ ایسے جملے مثلاً "حیوانات کے ساتھ" یا "حیوانات کی عملداری میں" کوئی معنے نہیں رکھتے۔ کیوں کہ حیوانات کے جنسی رویہ میں ان کے دوسرے رویوں کی طرح بہت بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ ایسے حیوانی جوڑے بھی ہیں جو ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔ مکڑی مقاربت کے بعد مکڑے کو ہلاک کردیتی ہے۔ بعض جانور اپنے بچوں پر اپنی جان تک نثار کردیتے ہیں اور بعض پیدائش کے فوراً بعد اپنے بچوں کو ہڑپ کرجاتے ہیں۔ بعض نر مُقاربت کے بعد مادہ سے فوراً جدا ہوجاتے ہیں، بعض کچھ مدت تک ساتھ رہتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک قسم کا حرم بنالیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہر طرح کے انسانی جنسی رویہ کی مثال جانوروں میں مل سکتی ہے۔ لیکن سب سے اہم جانوروں کے جنسی ادارے یا حلقے ہیں (بشرطیکہ ہم ان کو ادارہ کہہ سکیں) جو انسان کے کم و بیش اسی قسم کے اداروں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ مثلاً اگر ایک بادشاہ کی حرم سرا کو باڑے کے مشابہ قرار نہیں دیا جاسکتا، مادری نظام کے تابع قبیلہ کو شہد کی مکھیوں کا چھتہ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک خاندان کو ریوڑ نہیں کہہ سکتے اور شادی ایک وقتی و ہنگامی ملاپ سے بلند تر چیز ہے۔

ان مقابلوں اور موازنوں کے پس منظر میں یہ نظریہ کار فرما ہے کہ انسان بھی ایک حیوان ہے، جس میں بعض صفات زیادہ ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جو ایک انسان کے شایانِ شان نہ ہو تو ہم کہتے ہیں کہ اس کے اندر چھپا ہوا حیوان باہر آگیا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ انتہائی غلط ہے۔ جتنا حیوانات کے لئے نامناسب ہوسکتا ہے۔ حیوانات ناقص انسان نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی ہر نوع بذات خود کامل و مکمل ہوتی ہے اگر ایک آدمی اس اضافی صفت کو ضائع کردیتا ہے جو اس کو انسان بناتی ہے تو وہ مکمل حیوان نہیں بن جاتا، رہتا تو وہ انسان ہی ہے، لیکن ناقص[1]

حیوانات کی جنسی سرگرمیوں میں خود بخود ضبط و نظم پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ موسم کی حرارت کے سخت پابند ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی خوراک و نسل کشی اور اجتماع و اصراف قوت میں مناسب تغیرات باضابطہ ہوتے ہیں۔ انسان ایسے ضوابط اور پابندیوں سے آزاد ہے۔ ان کی بجائے ہمیں روحانیت عطا ہوئی ہے، جس کے باعث ہمیں اپنے متعلق فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص خود کو اس آزادی سے محروم کرلیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بے لگام جنسی ترغیبات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے،

[1] فاعتبروا یااولی الابصار۔ کچھ مدت پہلے ڈارون کے "نظریۂ ارتقاء" کا اتنا زور شور تھا کہ ہر شخص اپنی اصلیت پر شرمسار ہونے پر مجبور تھا، کیوں کہ ڈارون کے اس نظریہ کے مطابق انسان بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور آج ایک یورپی ماہر ہی اس نظریہ کی تغلیط و تردید کررہا ہے۔ چونکہ یہ نظریات انسانی ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں اس لئے یہ سہو و خطا سے مُبرا نہیں ہوسکتے۔ اس خوبی کا حامل کلامِ خدا ہی ہوسکتا ہے۔ اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے بتلا دیا تھا کہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور اشرف المخلوقات ہے۔ اور ارشاد ربانی ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ انسانی عقل کو آخر بہت ہی ٹھوکریں کھا کر اس قرآنی نظریہ کو تسلیم کرنا پڑا (مترجم)

اور اس کا درجہ حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے [1]

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ انسان کے لئے کیا چیز فطری ہے۔ انسان اور حیوان کا مقابلہ و موازنہ کرنا قطعی غلط ہے۔ "اصلِ انواع" کے مسئلہ سے "اصلِ اخلاق" کے انکشاف میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

دوسرے مغالطہ کی تنقیح ضروری ہے، کیوں کہ اس سے ہمیں انسانی جنسیت کی بنیادی خصوصیت معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے بچوں کو حقائق زندگی سے روشناس کرانے کے لئے، حیوانات کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرانا اور جانوروں کے افعال کی توجیہ و تشریح کرنا ایک اجتہادی لغزش ہے۔ تصورات و تخیلات کے کسی پہلو کی مدد سے بھی ایک بچے کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان عجیب اور صحیح معنوں میں وحشیانہ افعال کو اپنے والدین پر منطبق کرے۔ بچے کو یہ سمجھانا کہ وہ خود بھی ایک نوزائیدہ بلّوں اور بچھڑوں کی طرح گوشت پوست کا ایک لوتھڑا تھا، اس کے جنسی رویہ کے لئے مضر ہے۔ تعجب ہے کہ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا کہ ایک نوجوان آدمی کے لئے بھی یہ انتہائی مشکل بلکہ محال ہے کہ وہ اپنے والدین کو محض ایک جوان جوڑے کی حیثیت سے دیکھے یا عاشق و معشوق سمجھ کر ان کے حال پر چھوڑ دے۔ ہمارے تصورات کی مفید حد بندی ان حقائق کی محافظ ہے۔ ہماری جنسی زندگی کے لئے مکمل فطری رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ انسانی جنسیت خالص فطری مظاہرے سے بلند تر حیثیت کی حامل ہے، انسانی جنسیت حجاب و اسرار کے پردوں میں ملفوف ہے، اس سے میرا مطلب ہے وہ پُرفریب اخلاق کا ذب نہیں جو ماضی میں جنس پر مسلط کر دیا گیا تھا، بلکہ اس سے مقصود وہ بنیادی حجاب و رازداری ہے جو ہماری اصلیت کو محیط ہے یعنی رازِ اصلیت جو رازِ موت کا ہم صفیر ہے یعنی یہ بھید کہ ہم کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں [2]

—×—

[1] اسلام نے یہ بھی قریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے بتا دیا تھا کہ جو انسان روحانیت کو چھوڑ کر اپنے نفس کی پیروی کرتا ہے وہ بہائم کی مانند بلکہ ان سے بھی بدتر ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:۔ "کالانعام بل ھم اضل" اب علوم جدید بھی اسلامی نظریات کی توثیق کرنے پر مجبور ہیں لیکن حیف کہ مسلمان اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے مغرب کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ (مترجم)

[2] کس واسطے ہم آئے ہیں دُنیا میں شیفتہ — اس کا جو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

فردوسِ خیال

ابو محمد امام الدین رام نگری

تیری دُنیا نغمہ و ساز — میری دُنیا سوز و گداز
حسن کی فطرت عشوہ و ناز — عشق کا شیوہ عجز و نیاز
جس کو سب کہتے ہیں مجاز — وہ بھی ہے اک عالم راز
ہر آواز میں شامل ہے — اور کسی کی اک آواز

عروج زیدی

کچھ کھو کے ہی پائی ہے اس قول میں سچائی
انسان تماشا ہے تقدیر تماشائی
کس آس پہ اب اُن کو تکلیف توجہ دوں
سورج کی اُفق تابی، شبنم کو نہ راس آئی
ہم غیب و حضوری میں کچھ فرق نہیں کرتے
دنیا میں وہ آئیں گے، پھر ایسے تماشائی
معمورۂ دُنیا کی نظریں تری جانب ہیں
تو سروِ گلستانی، میں لالۂ صحرائی
کیا کم ہے عروج اُن کی یہ نیم نگاہی بھی
کچھ چشم توجہ نے تکلیف تو فرمائی

نور حسین عزیز

اپنے غموں سے سب ہیں نڈھال
کون کسی کا پوچھے حال
جو تھے اس شہر میں زینت و آرائش کے متوالے
وہی بیزارِ جیب و آستیں معلوم ہوتے ہیں
زمانے کے تقاضے، ہم کو اُس منزل پہ لے آئے
زمانے کے جہاں ہم نکتہ چیں معلوم ہوتے ہیں
خوشی کا مفہوم اور کچھ تھا فریبِ لطف و کرم سے پہلے
یہ زندگی، زندگی نہیں تھی تمہاری اُلفت کے غم سے پہلے

نیاز جالندھری

سکونِ دل لئے ہوئے قرارِ جاں لئے ہوئے
تری نگاہِ معتبر ہے، اک جہاں لئے ہوئے
مری طرف سے ہے صلائے عام برق و باد کو
ابھی چمن کے دوش پہ ہوں آشیاں لئے ہوئے
پسِ فنا چھپی ہوئی ہیں بے شمار منزلیں
ہے پردۂ عبا سے کتنے کارواں لئے ہوئے

وفا براہی

خرد کو چاہیے وحشت نواز ہو جانا
تلاشِ راز میں خود ایک راز ہو جانا
برا ادھر ہدفِ تیرِ ناز ہو جانا
اُدھر وہ پھیر کے منہ بے نیاز ہو جانا
بہار کی یہ وصیت ہے اے چمن والو
خزاں میں بھی کبھی ساغر نواز ہو جانا
سحر کے ہوتے ہی پھر شمع تھی نہ پروانے
وہ ختم مرحلۂ سوز و ساز ہو جانا
جنابِ شیخ کی اے میکشو کرامت ہے
حریفِ بادۂ مینا گداز ہو جانا

مفتون کوٹوی

یہ مانا کوشش و تدبیر سے ہے عروجِ انسانی
مگر رحمت کی بخشش کے بہانے اور ہوتے ہیں
کوئی فرعون جھکا لے اگر سر بھی تو کیا ہوگا
جہاں جھکتے ہیں دل وہ آستانے اور ہوتے ہیں

راسخ عرفانی: — کب تک کھاؤں پیار کے دھوکے کب تک دل پہ جبر کروں
دیکھ لیا ہے پیار تمہارا اب یہ باتیں رہنے دو

ہجر کی شب ہے ہجر کے مارو! اشک نہ پونچھو پلکوں سے
ظلمت کا ہے دور کوئی دم اور چراغاں رہنے دو

ارم لکھنوی

کبھی سر بھی رکھدیں گے اُن کے قدم پر
ابھی صرف نقشِ قدم دیکھتے ہیں
اُس نے فرمایا کہ جا اب رستگاری ہوگئی
فنا کانپوری:— اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہوگئی
یہ عمارت تو عبادت گاہ ہے
اس جگہ اک میکدہ تھا کیا ہوا

میں شرابی نہیں ہوں شاعر ہوں
اصطلاحاً شراب پیتا ہوں

ماہر القادری

بہت رہا ہوں میں جھرمٹ میں خوش اداؤں کے
تمہاری بات کسی میں نظر نہیں آئی
مُسافرانِ عدم تھے، لحد کی منزل تھی
پھر اس کے بعد کسی کی خبر نہیں آئی
سُنا ہے دہر میں غم بھی ہے اور مسرت بھی
یہ دھوپ چھاؤں مگر میرے گھر نہیں آئی

—×—

نخشب جارچوی

بے تعلق ہوں مگر دل میں کھٹک ہوتی ہے
ٹوٹنے پر بھی محبت میں لچک ہوتی ہے

تابش دہلوی

لاکھ تارے خیال نے توڑے
آسماں کھو گئے زمینوں میں

عیش ٹونکی

اس شرط پہ ہم ہوتے ہیں بربادِ محبت
اوروں پہ کبھی پھر یہ ستم ہونے نہ دیجئے

اختر سکندر روی

آوارہ ہیں رم خوردہ غزالوں کی طرح ہیں
ہم لوگ حسینوں کے خیالوں کی طرح ہیں

ارم لکھنوی

کوئی دیکھ کر اُن کو سنبھلے تو جانیں
مگر جن نگاہوں سے ہم دیکھتے ہیں

فنا کانپوری

پرسشِ غم آپ رہنے دیجئے
یہ تماشا ہے مرا دیکھا ہوا

طور نورانی

مرے داغِ جگر روز و شب چمکتے ہیں
یہ ماہتاب ہے کیا، آفتاب کیا شے ہے
متاعِ زندگی ہے اور میں ہوں
مری بے مائگی ہے اور میں ہوں
آہ! وہ دل کے دھڑکنے کی صدائے بازگشت
ہائے! وہ گھبرا کے اُن کا پاس آنا دُور سے

ماہر القادری

سراپا سوز ہوتا ہے، مجسّم ساز ہوتا ہے
وہ نغمہ ہائے وہ نغمہ جو بے آواز ہوتا ہے
گلستاں کی فضا میں تو سبھی پرواز کرتے ہیں
قفس میں امتحانِ جرأت[1] پرواز ہوتا ہے

[1] ”طاقت“ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

—×—

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

روح انتخاب

اگر ہم شناوران طوفانِ نوح کے حالات کا پتہ لگانا چاہیں تو ناکامی کے سوا ہم کو کیا ملے گا؟ اگر ہم معتکفان وادی تیہ کے اخلاق و عادات سے واقف ہونا چاہیں تو خاک بیزی کے سوا کیا حاصل ہوگا؟ اگر ہم حواریین عیسیٰ کی سوانح تلاش کریں تو چند غیر مرئی نقوش کے سوا ہم کو تاریخ کے صفحوں میں کیا نظر آئے گا، لیکن اصحاب محمدؐ کے ایک ایک خط و خال کو ہم تاریخ کے مرقع میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اس مرقع کو مذہبی، علمی، سیاسی، اخلاقی غرض ہر حیثیت سے دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ انسان ہمیشہ صحیح راستہ اس وقت پاتا ہے جب تمام دنیا گمراہی میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ انسان ادب اس وقت سیکھتا ہے جب تمام لوگ بے ادب ہو جاتے ہیں۔ شیخ سعدی نے ایک حکیم کی زبان سے یہی نکتہ دنیا کو سمجھایا ہے کہ

"ادب از کہ آموختی گفت از بے ادبان"

انسان کے سیاستِ مدنی، سیاست منزلی اور فلسفہ اخلاق کے اصول اس وقت قائم ہوئے ہیں جب عملاً ان تمام چیزوں کا نظام خراب ہو چکا ہے۔ لطافت طبع، رقت قلب اور اثر پذیری ایک نیک سرشت انسان کا اصلی جوہر ہیں اور انہی کے ذریعہ سے وہ ہر قسم کے پند و موعظت تعلیم و تربیت، ارشاد و ہدایت کو قبول کر سکتا ہے۔ پھولوں کی پنکھڑیاں نسیم صبح کی خاموش حرکت سے ہل جاتی ہیں۔ لیکن تناور درختوں کو صرصر کے جھونکے بھی نہیں ہلا سکتے۔ شعاع نگاہ آئینہ کے اندر سے گذر جاتی ہے لیکن پہاڑ میں فولادی تیر بھی نفوذ نہیں کرتے، بعینہٖ یہی حال انسان کا بھی ہے۔ ایک لطیف الطبع، رقیق القلب اور اثر پذیر آدمی ہر دعوتِ حق کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن سنگ دل اور غلیظ القلب لوگوں پر بڑے بڑے معجزے بھی اثر نہیں کرتے،،

مادیت دنیا کو مختلف مناظر دکھا دکھا کر اپنا فریفتہ بناتی رہی ہے۔ صبح ہونے کے ساتھ آسمان اپنے ہاتھ میں ایک جام زرنگار لے کر نمایاں ہوتا ہے اور تمام دنیا کو مخمور کر جاتا ہے۔ شام ہوتی ہے تو شفق کی ارغوانی شراب اس جام کو لبریز کر دیتی ہے اور دنیا نشہ میں چور ہو کر سرمست بادہ خواب ہو جاتی ہے۔ بہار آتی ہے تو زمین کی قوت نمو کبھی سبزہ زار کی صورت میں زمین پر چھا جاتی ہے کبھی سرو صنوبر کی شکل میں کنگرۂ فلک سے ٹکر لینا چاہتی ہے۔ اور کبھی پھولوں کے قالب میں تمام فضا کو محیط ہو جاتی ہے۔ غرض دن نہیں نکلتا بلکہ مادیت نئے آن بان سے نکلتی ہے۔ شام نہیں آتی بلکہ مادیت عروس نو بنکر ہمارے سامنے آتی ہے۔ موسم نہیں بدلتے بلکہ مادیت نئے نئے لباس بدل کر ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے۔

خیالات اگرچہ بذاتِ خود مادی نہیں لیکن وہ خود مادیات کے سلسلہ سے الگ نہیں۔ ہمارا دماغ خیالات کا گہوارہ ہے۔ وہ خود مادیات سے گھرا ہوا ہے۔ اس لئے ذرّوں کی جنبش، ہوا کی حرکت، دریا کی موج، مناظر طبیعہ کی دلفریبی، قوس و قزح کی بوقلمونی، تلواروں کی جھنکار، غرض دنیا کی ایک ایک چیز ہمارے دماغ میں ایک غیر محسوس ٹھوکر لگاتی ہے اور اس سے خیالات کی جو لہریں اٹھتی ہیں۔ وہ مختلف علوم، مختلف عقائد اور مختلف مذاہب[1] کی صورت اختیار کر کے بحر بیکراں بن جاتی ہیں۔ نیوٹن کا مسئلہ جذب و کشش عظیم الشان اور کتنا نتیجہ خیز مسئلہ ہے لیکن اس کا رگ و ریشہ صرف انگور کے ایک خوشہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

[1] اس عبارت سے یہ مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا یہ عقیدہ انسانی دماغ کی پیداوار ہے اسی طرح دینی و اخلاقی معتقدات کے بارے میں یہ عبارت ذہن کو الجھن میں ڈال سکتی ہے (م۔ ق)

ہماری نظر میں

سیرت امام مظلوم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ از:۔ سید نورالحسن بخاری، ضخامت ۴٦٦ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت:۔ پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دارالتصنیف والاشاعت محلہ قدیرآباد ملتان شہر۔ ۱۴۔ بی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔

یہ کتاب حضرت سیدنا عثمان غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ خلیفہ سوم کی سیرت ہے، جسے مولانا سید نورالحسن بخاری صاحب نے بڑی کاوش و تحقیق اور عقیدت و محبت کے ساتھ مرتب کیا ہے، حضرت عثمان اور حضرت حسین رض ان دونوں بزرگوں کو مسلمانوں ہی نے شہید کیا، مگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پر تو بے شمار نظمیں کہی گئیں اور ہزاروں صفحوں کی کتابیں لکھی گئیں، لیکن حضرت عثمان شہید مظلوم رضی اللہ عنہ کی سیرت پر اتنا کم لکھا گیا ہے کہ جو نہ لکھنے کے برابر ہے، مولانا سید نورالحسن بخاری کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہیں امت مسلمہ کی اس کوتاہی کا احساس ہوا، اور اس کی تلافی کے لئے انھوں نے زحمت اٹھائی!

اس کتاب میں تاریخی حوالوں کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کئی معرکوں میں حضرت حسن اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہما) نے نانی (؟) جھنڈے کے تلے کافروں سے جنگ کی ہے، یہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رض کے باہمی اختلافات کی روایتیں ناقابلِ اعتبار ہیں، اور یہ ہوائیاں دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہیں۔

"سیدنا حضرت عثمان اور سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی خلافت حق ہے۔" (ص ۳۳)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوگیا، اس لئے حضرت معاویہ رض کے دورِ امارت کو...... خلافتِ راشدہ کی سطح پر رکھنا اور ان کو ایک جیسا سمجھنا درست نہیں، اور حضرت سیدنا علی رض اور حضرت معاویہ رض کے درمیان جو معاملات پیش آئے، ان میں حضرت علی رض کا موقف صحیح اور اقرب الی الحق ہے، یہی جمہور امت کا فیصلہ ہے۔

کتاب میں ایک بات کی کمی محسوس ہوئی ــــ یہ کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان ذی النورین کے مابین جن واقعات کا تاریخ میں ذکر ملتا ہے، ان پر فاضل مصنف کو ضرور روشنی ڈالنی تھی!

اس کتاب کو پڑھ کر قاری کا ذہن اس پر مطمئن ہوجاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دینی خدمات بیش بہا ہیں، وہ اللہ اور رسول سے راضی تھے، اور اللہ اور رسول ان سے راضی تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت رکھنا، ایک مسلمان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے!

تاریخی واقعات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رض اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانے میں، حکومت کا کام جس قدر چست اور منظم تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بہرحال ڈھیل پیدا ہوگئی تھی! حضرت عثمان انسان تھے فرشتہ نہ تھے، مگر تصویر کے اس دھندلے رُخ کے باوجود حضرت عثمان رض کی گرانقدر دینی خدمات، دینی خیرخواہی

اور اُن کا اخلاص آفتاب کی طرح روشن اور ثابت ہے ۔ (رضی اللہ عنہ)

معارف المشکوٰۃ از :- مولانا سید عبدالرؤف حقانی ضخامت ۴۰۲ صفحات (بڑا سائز) کتابت، طباعت اور کاغذ خوب سے خوب تر، رنگین سرورق) قیمت دُو رُو پیہ

(جز اوّل) ملنے کا پتہ :- اشاعت منزل' دیوبند (انڈیا)

"مشکوٰۃ المصابیح" حدیث کی مقبول ترین کتاب ہے' "معارف المشکوٰۃ" اسی کتاب کا عام فہم اردو ترجمہ ہے اترجمہ کے ساتھ فاضل مترجم کی تشریحات نے اس کتاب کو مُفید سے مفید تر بنا دیا ہے ۔

کتاب کا آغاز "پیش سخن" سے ہوتا ہے' اس میں فاضل مترجم و شارح نے کس قدر ایمان افروز باتیں کہی ہیں ۔

"۔ ۔ ۔ ۔ قرآن کا قرآن ہونا، ہمیں اسی وقت معلوم ہوا، جب ہم پہلے قرآن لانے والے کی شخصیت پر ایمان لاچکے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اگر اس قدر معصوم' اتنی مقدس اور اس درجہ قابلِ اعتماد نہ ہوتی، جس درجہ کسی دوسرے کے لئے ہونی ممکن نہیں' تو پھر قرآن کو ایک الہامی کتاب کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا، قرآن پر ایمان لانے سے پہلے قرآن لانے والے پر ایمان لانا ضروری ہے، اس لئے کہ جتنی صداقت، قرآن میں ہے' اتنی قرآن کے پیش کرنے والے میں بھی ہے، بلکہ عقلاً اور عملاً قرآن کی صداقت پر ایمان اس بات کا محتاج ہے کہ قرآن لانے والے کی صداقت کو سب سے پہلے تسلیم کیا جائے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو اگر درمیان سے ہٹا دیا جائے، تو قرآن کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی، کوئی عقل عام رکھنے والا، قرآنی ہدایتوں پر اعتماد نہیں کرسکتا، جب تک صاحبِ قرآن پر اعتماد نہ کرے اور قرآنی اصولوں پر اس وقت تک عمل نہیں کیا جاسکتا جس وقت تک یہ نہ دیکھا جائے کہ ان اصولوں پر صاحب قرآن نے خود کس طرح عمل کیا ہے ؟"

"۔ ۔ ۔ قرآن ایک شمع ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے' اس شمع سے جو فضا تابناک و درخشاں ہے وہ سُنّت کا درجہ رکھتی ہے' ہم اس شمع ہدایت تک نہیں پہونچ سکتے، جب تک اس شمع کے گرد و پیش کی روشن فضا میں قدم نہ رکھیں' سنت اس اعتبار سے اس شمع کی ضوفشانیوں کا دوسرا نام ہے ــــ قرآن اگر صاحب قرآن کی شخصیت کا عملی جامہ نہ پہنتا' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات قرآنی زندگی کا پیکر نہ ہوتی تو قرآن دنیا میں کوئی انقلاب پیدا نہ کرسکتا ۔

یوں سمجھئے کہ قرآن اس اُمت کا دل ہے' اور سُنّت شریانوں میں دوڑنے والا خون" !

اس کتاب میں قرآنی آیات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ مقامِ رسالت کیا ہے ؟ اس کے بعد کے ابواب میں حدیث کی ضرورت' حدیث کی ابتدا، عہدِ رسالت میں ضبط حدیث' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور میں ذخیرۂ حدیث، تدوین حدیث کی نوعیت' احادیث کی اقسام، مشہور محدثین کے مختصر سوانح حیات بیان کئے گئے ہیں اس طرح یہ کتاب علم حدیث کی ایک چھوٹی موٹی انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہے ! آخر میں احادیث نبوی کا متن' ترجمہ اور تشریح کے ساتھ ملتا ہے' پوری کتاب ایمان افروز ہے !

حضرت مولانا سید عبداللطیف رحمۃ اللہ علیہ مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم تھے، وہ جو عربی کی مشہور ضرب المثل ہے کہ "الولد سرٌ لابیہ" تو مولانا سید عبدالرؤف صاحب عالی اس ضرب المثل کے صحیح مصداق ہیں! "معارف المشکوٰۃ" اُن کے علم و فضل تحقیق و تدقیق اور دینی شغف اور عشقِ رسول ؐ کا گرانقدر کارنامہ ہے۔

تاریخ قربانی

از:- مولانا مفتی محمد شفیع، ضخامت ۳۴ صفحات، قیمت چھ آنہ، کراچی میں ملنے کا پتہ:- ادارۃ المعارف اشرف منزل، لسبیلہ چوک کراچی ۵، لاہور میں ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

اس کتاب میں "قربانی" کی مختصر مگر مستند تاریخ بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی "قربانی" کے شرعی فریضہ ہونے کو ثابت کیا گیا ہے اور قربانی کے احکام و مسائل بتائے گئے ہیں! منکرین سنّت نے جو "قربانی" کے خلاف فتنہ کھڑا کیا ہے۔ یہ کتاب اُس فتنہ کا توڑ کرتی ہے۔

ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ کا "عبدالسلام نمبر"

نگران:- سید ظہیرالدین علوی ــ مدیر ــ [illegible] ــ مدیر معاون:- کبیر احمد جائسی ــ ضخامت ۵۶ صفحات۔ قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے۔ سالانہ چندہ سات روپیہ۔

ملنے کا پتہ:- جامعہ اُردو، علی گڑھ ــ پاکستانی پتہ:- ماہنامہ "اچھا ساتھی" پارنس اسٹریٹ، کراچی ۳

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی شخصیت اور اُن کے علمی کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، مولانا مرحوم مصنف بھی تھے مؤلف بھی تھے، مترجم اور ناقد بھی تھے، شعر و سخن کا بلند ذوق رکھتے تھے اور خود شاعر بھی تھے۔

جناب کبیر احمد جائسی نے مولانا مرحوم کی شخصیت اور اُن کے ادبی اور علمی کارناموں پر سیر حاصل مقالہ لکھا ہے یہی مقالہ ماہنامہ "ادیب" کا "عبدالسلام نمبر" ہے! یہ مقالہ ہر اعتبار سے دلچسپ، وزنی اور باوقار ہے، مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی کارناموں کے بارے میں بعض ذہنوں میں جو اُلجھنیں اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اُن کو اس مقالہ میں جاندار دلائل کے ساتھ رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے!

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی زندگی میں قلندریت اور مجذوبیت کی خاصی جھلک پائی جاتی ہے ـــ مگر ادب و انشاء کی دُنیا میں اُن کی ہوشمندی قابلِ داد ہے!

"۔۔۔۔ مولانا مرحوم کے نزدیک معتزلہ منکرِ حدیث نہ تھے، ان کے چند فرقوں نے چند خاص حدیثوں کا انکار کیا تھا، ان کے نزدیک چند حدیثوں کے انکار کرنے سے کوئی شخص یا فرقہ منکرِ حدیث نہیں کہا جاسکتا۔۔۔"

علمی طور پر مولانا مرحوم کی یہ رائے چاہے کتنی ہی محلِ غور کیوں نہ ہو مگر اس ہمارے دور کے "منکرینِ سنّت" کا تو یہ حال ہے کہ یہ کم بخت "سنّتِ رسول" ہی کو سرے سے دین میں حجت اور قابلِ اطاعت نہیں سمجھتے جس طرح ان کی گمراہی کو معتزلہ کی گمراہی سے کوئی نسبت نہیں!

گلبانگِ حرم

از:- زائرِ حرم حمید صدیقی، ضخامت ۳۲۰ صفحات (مجلد، سرورق دلکش، جو کہ بہزاد کے عکسِ جمیل سے مزیّن ہے ـــ کتابت اور طباعت نظر افروز) قیمت مجلد تین روپیے بارہ آنے،

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

زائرِ حرم حضرت حمید صدیقی لکھنوی کی شخصیت "نورٌ علیٰ نور" ہے۔ "نور" اس اعتبار سے کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں اور "علیٰ نور" لحاظ سے کہ ان کی شاعرانہ قوتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت و منقبت میں صرف ہوتی ہیں۔ حمید صاحب اپنی ذات سے خوش کردار پاکیزہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ یہی پاکیزگی ان کی شاعری میں بھی جھلکتی ہے

زائرِ حرم حمید صدیقی کے نعتیہ کلام کی مقبولیت کی یہ دلیل ہے کہ "گلبانگ حرم" کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ چھٹا ڈیشن (اضافہ کے ساتھ) منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس پر حاجی محمد حبیب الحیٰ خاں صاحب، مولانا عبدالماجد دریابادی، علامہ سید سلیمان ندوی، ناسید مناظر احسن گیلانی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، جگر مراد آبادی مرحوم اور حضرت امجد حیدر آبادی مرحوم کی تقریظیں ہیں جس سے ندازہ ہوتا ہے کتنی بڑی بڑی شخصیتیں انکے کلام سے متاثر اور ان کی فن کاری کی معترف ہیں۔

حمید صدیقی کے نعتیہ کلام میں سوز و گداز کے ساتھ اخلاص کی بھی فراوانی ہے۔ مدینہ منورہ اور روضہ رسول کا ذکر کرتے ہیں تو بے خود ہو جاتے ہیں، حضور سرکار رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی سے وہ جس درجہ عقیدت اور شیفتگی رکھتے ہیں وہ رشک کے قابل ہے۔ چند منتخب اشعار:-

تابِ نظارۂ جمال کہاں　　نگۂ شوق کا خدا حافظ

دل جانبِ مدینہ ہے رخ جانبِ حرم　　اب انتہائے کشمکشِ دل نہ پوچھئے

ادھر اہلِ نظر کی ہیں نگاہیں محوِ نظارہ　　اُدھر وہ پردۂ بیت الحرم جنبیدہ جنبیدہ

جبلِ بوقبیس پر ہوں میں　　کس بلندی پہ میری پستی ہے

جبیں کو ہے تلاش اک نقشِ پا کی　　یہ سجدے ہیں حقیقت میں بہانہ

یقین کر دلِ ناشکیبا کہ اب ہم　　مدینے خدا کی قسم جا رہے ہیں

قدایم بجانِ گرامی فدایم　　چنیں شہر خوبی چناں شہر یارے

سکوں کہیں نہ مل سکا ملا تو بس یہیں ملا　　گئے تھے دل کی آرزو کہاں کہاں لئے ہوئے

یک نغمہ نشنیدہ و یک جلوۂ بے رنگ　　سنتے ہیں کبھی اور کبھی دیکھ رہے ہیں

خود ان کی نظر پڑتی ہے اب دیکھئے کس پر　　یوں دیکھنے والے تو سبھی دیکھ رہے ہیں

آج جی بھر کے حمید ان کا نظارہ کر لو　　پھر خدا جانے یہ اندازِ نظر ہو کہ نہ ہو

دل بھر آیا ہے تو جی کھول کے رو لینے دو　　پھر کبھی جوش پہ یوں دیدۂ تر ہو کہ نہ ہو

دیکھ آئے ہیں جو چشمِ حقیقت نگر سے ہم　　کہتے نہیں ہیں حضرت واعظ کے ڈر سے ہم

ہاں! اے نسیمِ صبحِ مدینہ! خوش آمدی　　تیرے ہی انتظار میں تھے رات بھر سے ہم

نزولِ رحمتِ باری کا وقت آیا ہے　　اٹھی وہ جھوم کے کالی گھٹا مدینے سے

ہے نازشِ بہاراں، طیبہ کا باغ ورنہ　　جو باغ ہے جہاں میں ہے وہ خزاں رسیدہ

اے شیخ پاک باطن، توفیق ہو تو پی لے　　یہ جام ہے اچھوتا یہ مے ہے ناچشیدہ

یاد ہے صبحِ حرم یاد ہے گلبانگِ اذاں　　نغمہ مرغِ نواسنج گلستاں کی قسم

چاندنی رات مدینہ کی جو یاد آتی ہے　　اک چمک ہوتی ہے دل میں شبِ ہجراں کی قسم

ہائے اُدہ دل کا دھڑکنا یک بیک وقت سلام
وہ مرا کچھ پڑھتے پڑھتے بھول جانا یاد ہے

میں نے چھیڑا نغمۂ نعت اور ادھر ہر سمت سے
جیسے کانوں میں صدائے مرحبا آنے لگی

حبذا! اہل مدینہ اہلیں سراپا گوش ہوں
مرحبا اہلاً و سہلاً کی صدا آنے لگی

یہ بھی کہتے ہوئے مولا! مجھے شرم آتی ہے
کاش مل جائے غلامیٔ غلامانِ حرم

ہنگامِ مناجات وہ اشکوں کی روانی
"یا شافعِ محشر" کی وہ تکرار کا عالم

چمنِ طیبہ کی جب سیر کیا کرتے تھے
کیا کہیں کون سے عالم میں رہا کرتے تھے

آگے بڑھتے تھے تو بڑھتے ہی چلے جاتے تھے
بیٹھ جاتے تھے تو مشکل سے اٹھا کرتے تھے

ماہ و انجم کی طرح رات کے سناٹے میں
قبہ نور کا نظارا کیا کرتے تھے

آگئی جب یاد محرابِ نبیؐ
ہم ادب سے سر جھکا کر رہ گئے

مزہ ہے روضۂ اقدس پہ کھل کے رونے کا
تری بہار ابھی چشمِ تر نہیں آئی

ہجوم تجلی کے پرکیف منظر
بہت یاد آئے، تو کم یاد آئے

جس سے روشن ہوئے دل ہم سے سیاہ روں کے
اس درِ پاک کی قندیلِ فروزاں کو سلام

عاشقانہ غزلیں :-

او غمِ دردِ محبت میں تڑپنے والے
غم بڑی چیز ہے دردِ غمِ پنہاں کی قسم

سوز ہی دل میں نہیں ساز کہاں سے لاؤں
نالہ ہائے اثر انداز کہاں سے لاؤں

دل نے کسی کی راہ میں رکھا تھا بے قدم
نا آشنائے جادۂ منزل ہے کیا کروں

جو یقین کامل عشق ہو، کوئی چیز وہم و گماں نہیں
مجھے وہ نظر بھی عزیز ہے، جو مری طرف نگراں نہیں

وہ جو محوِ حسنِ صفات ہو، اُسے کچھ سکون سا ہو تو ہو
جو ہلاکِ جلوۂ ذات ہے اُسے خلد میں بھی اماں نہیں

شکر کرتا ہوں ابھی حسرتِ پرواز تو ہے
اب اگر طاقتِ پرواز نہیں ہے تو نہ ہو

آنکھوں آنکھوں ہی میں تو ہے سلسلۂ ناز و نیاز
گفتگو ہوتی ہے آواز نہیں ہے تو نہ ہو

کیوں دعا کیجئے، کیوں دوا لیجئے
دردِ دل کو نہ کیوں دل بنا دیجئے

چل کے دو چار قدم اس لئے رک جاتا ہوں
تاکہ کچھ لطفِ غمِ دوریٔ منزل آئے

کچھ تو ہیں مجبوریاں اے ہم صفیرانِ قفس
اڑ نہیں سکتا ہوں میں گو طاقتِ پرواز ہے[1]

زمانے کی نگاہوں سے چھپا تک گرتا جاتا ہوں
اسی نسبت سے آغوشِ کرم وا ہوتا جاتا ہے

دھڑکن ہے دل میں پاؤں میں لغزش نظر میں کیف
اب غالباً قریب تری بزمِ ناز ہے

پھر مری پیشکش شوق میں کیا رکھا ہے
جب ادھر سے ہی ہوا آغاز خدا خیر کرے

اس لب پہ تبسم کی موجیں، موجوں کا تبسم کیا کہئے
بے لفظ و بیاں، بے ساز و صدا، اندازِ ترنم کیا کہئے

ہم تری چشمِ فسوں کار کو پہچان گئے
لطف کا کام تغافل سے لیا کرتی ہے

---

[1] یہ مصرعہ یوں ہوتا تو شعر میں اور زیادہ قوت پیدا ہو جاتی ؎ اڑ نہیں سکتا ہوں گرچہ طاقتِ پرواز ہے۔

میں جہاں سجدہ کروں، پھر کوئی سجدہ نہ کرے — اپنا ہر نقش قدم آپ مٹاتے چلئے
وہ دردِ محبت کا مارا نہ ہوگا — تراغم جسے دل سے پیارا نہ ہوگا
گرا ہے زمیں پر جو اشکِ ندامت — فلک پر بھی ایسا ستارا نہ ہوگا

دوسرا رُخ:-

جلوۂ کعبہ سے دل بیہوش ہے — کس غضب کا آج کیف و جوش ہے (صفحہ ۶۱)

اس مطلع کو انتخاب میں چھانٹ دینا چاہیئے تھا۔

میں ہوں مکہ کی پاک بستی ہے — آج کچھ اور میری ہستی ہے (صفحہ ۶۲)

یہ مطلع حمید صاحب کی نومشقی کے زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔

زباں پر کبھی نغمۂ نعت ہوگا — تو پڑھتے کسی وقت قرآں ہوں گے (صفحہ ۶۳)

مصرعہ ثانی ؎ کبھی زمزمہ سنج قرآں ہوں گے ——— اس انداز کا ہونا چاہیئے تھا

بہ ذوق و سرورِ اتم جا رہے ہیں — محبان کوئے حرم جا رہے ہیں (صفحہ ۷۱)

"سرورِ اتم" نے شعریت کو غارت کردیا

تیرے کوچے میں حمیدِ خستہ حال آ ہی گیا — اپنے بندے کا تجھے آخر خیال آ ہی گیا (صفحہ ۷۴)

بھرتی کا شعر!

میں پھر رہا ہوں اپنے دل میں بجلیاں لئے ہوئے — کبھی یہاں لئے ہوئے، کبھی وہاں لئے ہوئے (صفحہ ۷۷)

حیرت ہے کہ اس قسم کے شعروں کو شاعر کی نگاہ انتخاب نے کیسے رہنے دیا۔

جذبِ سوادِ شام مدینہ — لرزاں لرزاں خسروِ خاور (صفحہ ۱۰۰)

مفہوم واضح نہیں ہوا! اور جو مفہوم ذہن میں آتا ہے اس کا اظہار موزوں الفاظ میں نہیں ہوسکا۔

جو در کارِ صحت ہو حاضر یہاں ہو — مریضو! دوا ہیں مدینہ کی گلیاں

؎ کہ دار الشفا ہیں مدینہ کی گلیاں ——— کہنا چاہیئے تھا! شہروں، مکانوں، گلیوں اور بیابانوں کو "دوا" کہنا، اس میں کتنی غرابت پائی جاتی ہے

وہ درود پڑھنا مراحرم میں کمال کیف و سرور سے — کبھی جالیوں کے قریب سے کبھی ہٹ کے سامنے دور سے[1] (صفحہ ۱۱۰)

"کمال کیف و سرور سے" یہ ٹکڑا بھرتی کا ہے۔

"جبل احد" کے نظارے کی ہے نگاہِ شوق کو آرزو — نہ خیال باغِ نعیم ہے، نہ ہے ذوق منظرِ طور سے (〃)

ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو کہ "ربط" کی جگہ "ذوق" چھپ گیا ——— "ذوق" کے ساتھ "سے" نہیں "کا" بولتے ہیں

قبا کی وہ راہیں، وہ اپنی نگاہیں — خیاباں خیاباں گلستاں گلستاں (صفحہ ۱۲۱)

"نگاہیں" اس شعر میں "بے ربط" سی لگتی ہیں

اصلاح جو باطن کی چاہو، طیبہ کو چلو طیبہ کو چلو — کام آئیں جو درد و دل میں وہاں ایسی بھی دوائیں ہوتی ہیں

[1] جگر مرادآبادی کی غزل کا مصرعہ ہے ؎ دور جا کر دیکھئے نزدیک آکر دیکھئے

دوسرا مصرعہ کتنا پست اور سطحی ہے، شعریت کا دور دور پتا نہیں۔

تاثیر محبت کیا کہیئے واللہ مدینے والوں کی　　　تا عمر جو دل پہ نقش رہیں وہ ان کی وفائیں ہوتی ہیں

اس شعر میں "تعقید کا عیب سب سے زیادہ کھٹکتا ہے ——— پھر "تا زیست" کی جگہ "تا عمر" نے شعر کی نغمگی کا لطف غارت کردیا ——— پھر "وفائیں" قافیہ کی مجبوری کے سبب لایا گیا ہے ——— "تواضع" یا "مدارات" اس قسم کے الفاظ کا محل تھا۔

اگر معنیٔ دل سمجھتے رہیں گے　　　مدینہ کو منزل سمجھتے رہیں گے　　　(صفحہ ۱۹۰)

"معنیٔ دل"، سمجھ میں آجانے کے بعد، مدینہ کو منزل سمجھنا آخر بات کیا ہوئی۔

وہ دیدارِ خاکِ حجاز اول اول　　　وہ جوشِ جنون نیاز اول اول

"ارض حجاز" کہنا تھا ——— "جوش جنوں" سے مفہوم پورا ہوجاتا ہے "نیاز" قافیہ کی مجبوری کے سبب لانا پڑا، پھر "دیدار" کا

خوشی سے ہر اک کیوں نہ آنکھیں بچھائے　　　جگر صاحب آئے، جگر صاحب آئے　　　(صفحہ ۲۵۱)

سپاٹ اور بے لطف مطلع ——— "یہ مسلسل غزل" پوری کی پوری شعریت سے عاری ہے

کیوں سب اربابِ چمن سہمے سہمے رہتے ہیں　　　ہر نشیمن پہ کہیں برق گرا کرتی ہے　　　(صفحہ ۱۳۸)

مصرعہ ثانی کس قدر شگفتہ، جاندار اور اثر انگیز ہے۔ مگر افسوس پہلا مصرعہ اس کے جوڑ کا نہیں ہے

کوئی شک نہیں "گلبانگ حرم" صنف نعت و منقبت میں انفرادیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے جن کو مدینہ منورہ کی حاضری کی سعادت حاصل ہوچکی ہے اور جو اس سعادت کے لئے دعائیں کر رہے ہیں۔ غرض حضوری اور دوری وصال و فراق دونوں حالتوں میں "گلبانگ حرم" کے مطالعہ سے کیف حاصل ہوتا ہے۔

مہینوں کے نام

از:- حبیب ابراہیم، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۷۵ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر، ایوانِ اردو، خیریت آباد، حیدر آباد دکن

یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے، جس میں ہر انگریزی مہینہ کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے، مثلاً ——— "روم کے لوگ جے نس (JANUS) کو دروازوں اور پھاٹکوں کا دیوتا مانتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اسی مناسبت سے سال کے پہلے مہینہ کا نام اس دیوتا کے نام پر جے نورِس JANURIS رکھا گیا، جو بعد میں جنوری ہوگیا" ——— "قدیم زمانے میں فروری آخری سال کا مہینہ تھا، لیکن بعد میں اسے دوسرا بنا دیا گیا!"

مارچ کا نام جنگ کے دیوتا (MARS) کے نام پر رکھا گیا ہے ——— جون کا نام دیوتاؤں اور انسانوں کے شہنشاہ، جیوپیٹر کی بیوی ملکہ (JUNO) کے نام پر ہے ——— اکتوبر قدیم زمانہ میں سال کا آٹھواں مہینہ تھا، اس لئے (OCTAVE) (آٹھ) سے "اکتوبر" نام رواج پایا۔

یونان و روم کی "دیومالا" قسم کی کہانیوں نے اس کتاب کو دلچسپ بنا دیا ہے، زبان سیدھی سادی اور ہلکی پھلکی ہے!

شوق در بحرمت سے ربط اور درست ہے مگر "جوش جنون نیاز" سے اس کی نسبت درست نہیں۔

دردِسر
دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انلجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیباریٹریز لمیٹڈ ۔ کراچی

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز
لانڈھی کراچی

کے۔ ٹو
کے مستقل قدردان
اوروں سے زیادہ ہیں
کے۔ ٹو سگریٹ ملک بھر میں مقبول ہیں۔ بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے
کے لئے اب یہ سگرٹ بہت زیادہ بننے لگے ہیں۔
کے۔ ٹو چوٹی کے سگریٹ ہیں
پریمیئر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ کراچی
K-2
CIGARETTES

فاران
کراچی

جلد: ۱۴ — شمارہ: ۳

ایڈیٹر:- ماہر القادری — ماہ جون سنہ ۱۹۶۲ء

ترتیب

قیمت فی پرچہ:- باسٹھ پیسے

چندہ سالانہ:- سات روپے

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

مطبوعہ: مطبع سعیدی کراچی

پرنٹر و پبلشر:- مسرور حسین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

نقشِ اوّل!

بنیادی جمہوریت کا کیا غلغلہ تھا۔ کتنی دھوم تھی، ہزار ہا روپیہ اس کے تعارف کرانے میں صرف فرمایا گیا، تاکہ عوام پر اس کے فوائد منکشف ہوجائیں کہ یہ وہ نسخۂ کیمیا تلاش کیا گیا ہے جو بدنام سیاست کے ہر مرض کا علاج ہے' اب تک پارٹی سسٹم کی بنیاد پر انتخاب ہوا کرتے تھے، جس سے بہت سی عصبیتیں اُبھر آتی تھیں' اور جماعتوں کی آپس کی رقابت اور رسہ کشی سے مُلک کی وحدت کو بڑا نقصان پہنچتا تھا، اب ہر شخص اپنی انفرادی اہلیت کی بنیاد پر انتخاب میں کھڑا ہوگا، پھر عام انتخابات میں حکومت کا جو کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا تھا، اُس کی بھی بچت ہوجائے گی۔

بنیادی جمہوریت کے ارکان کی تربیت کے لئے لٹریچر وجود میں آیا، تقریر دل کے ذریعہ اُن کی تربیت کی گئی' اس مقصد کے لئے باقاعدہ اجتماعات ہوئے ــــــــ مگر پاکستان میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے جو انتخابات حال میں ہوئے ہیں، اُس نے حسنِ ظن اور خوش گمانیوں کی دھجیاں اُڑا کر رکھدیں! اُمیدوں کے کیسے کیسے سربفلک قلعے تھے جو پانی کے بلبلوں کی طرح ٹوٹ گئے! ــــ توقعات قائم ہونے کے بعد جب اُن کے بالکل برخلاف صورتیں پیدا ہوتی ہیں اور یہ بساط اُلٹ جاتی ہے، تو ہر کسی کو دُکھ ہوتا ہے' یہی وہ دُکھ اور درد و غم ہے' جس کی ہمارے قلم سے بے اختیار تراوش ہو رہی ہے۔

مشرقی پاکستان میں کیا ہوا؟ اس کی تفصیلات ہم تک نہیں پہونچیں مگر مغربی پاکستان اور خاص طور سے کراچی میں دولت مند اُمیدواروں نے انتخابات میں کامیاب ہونے کے لئے جس گراوٹ اور پستی کا ثبوت دیا ہے' اُس پر افسوس و ملامت کرنے کے لئے افسوس ہے کہ لُغت میں خاطر خواہ الفاظ ہی نہیں مل سکتے۔

قربانی کے بکروں کی طرح ووٹوں کی دھڑلے کے ساتھ خرید و فروخت کی گئی' ان ضمیر فروش رائے دہندوں کو خوش رکھنے اور اُن کا دل بہلانے کے لئے رقص و نغمہ اور شراب کباب کا انتظام بھی کیا گیا۔ بعض ووٹروں کو تاریخ انتخاب سے دو دو تین تین دن پہلے ہی اُن کے گھروں سے نکال کر مخصوص مقامات پر محبوس کر دیا گیا' ضمیروں کا سودا اس عنوان سے کیا گیا کہ ایک ہاتھ میں قرآن تھا، اور دوسرے ہاتھ میں پر امیسری نوٹوں کی گڈیاں! برادری کا دباؤ بھی ڈالا گیا اور طرح طرح کے خطروں اور نقصانوں کی دھمکیاں بھی دی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان انتخابات میں حکومت کے کروڑوں روپیہ کی بچت تو ضرور ہوگئی مگر اس محدود نمائندگی کے سبب اخلاق و دیانت کی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے' اُس کی تلافی چند کروڑ روپیہ کی بچت سے نہیں ہوسکتی! عام انتخابات ہوتے تو سرمایہ دار اُس حالت میں بھی اپنے ہتھکنڈوں سے باز نہ آتے مگر وہ کروڑوں اور اربوں روپیہ دو ووٹوں کی خریداری پر صرف نہیں کرسکتے تھے اور اس گری ہوئی ذہنیت کے لوگوں کو عام طور پر شکست کا سامنا کرنا پڑتا صرف دولت کسی اُمیدوار کو عام انتخابات میں نہ جتا سکتی۔

ان انتخابات میں جو کچھ ہوا وہ عالم آشکارا ہے، ایسے اخبارات جو عام طور پر نقد و احتساب میں "بڑے آدمیوں" کے مزاج و طبیعت اور تیوروں کا لحاظ رکھتے ہیں، وہ تک چیخ اٹھے۔ ان کے اداریوں، فکاہی کالموں اور نظموں میں انتخابات کی بدعنوانیوں پر بہت کچھ لکھا گیا، ان اخبارات کے اسٹاف رپورٹروں نے اپنے عینی مشاہدات اور عوام کے تاثرات پیش کیے کہ انتخابات میں سرمایہ دار اُمیدواروں نے کیسی کیسی مجرمانہ حرکات کا ارتکاب کیا، کس طرح برسرِ راہ دوٹوں کا سودا ہوا! اُمیدواروں کو پرچانے اور رام کرنے کے لئے کیسے کیسے ناجائز اور اخلاق سوز طریقے اختیار کیے گئے! جب راہگیروں اور پان فروشوں تک کو ان تمام باتوں کی خبر ہے! تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حکومت کے کانوں تک یہ تفصیلات نہ پہونچی ہوں، حکومت کے محکمۂ انٹیلیجنس نے تو ان مشہور عالم باتوں کے علاوہ اُن پوشیدہ تفصیلات کو بھی ضرور بھیجا ہوگا، جو عوام کو پوری طرح معلوم نہیں ہو سکتیں۔

سرمایہ دار اُمیدواروں نے دوٹوں کی سودے بازی کے علاوہ ان انتخابات میں جو عام اخراجات کیے ہیں، اُن کا بھی اخبارات میں ذکر آیا ہے، الیکشن کے منظورہ قواعد میں، اخراجات کی جو رقم مقرر کی گئی ہے، اُس کے مقابلہ میں ان لوگوں کے شاہانہ اخراجات دس بیس گنا نہیں بلکہ سینکڑوں گنا زیادہ ہیں۔ درجنوں اسٹیشن ویگن اور موٹر کاریں ہیں، جو ہفتوں دن رات دوڑتی رہی ہیں کئی کئی ہزار روپے تو ایک ایک دن میں لوگوں کی تواضع پر خرچ کیے گئے ہیں! پانی کی طرح دولت بہانے اور کنکریوں کی طرح روپیہ بکھیرنے اور لُٹانے کی کہاوت کتابوں میں پڑھی تھی مگر انتخابات کے دوران اُسے دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے ہوتا اور عمل میں آتے دیکھ بھی لیا۔

حکومت کے علم میں یہ تمام باتیں یقیناً آئی ہوں گی، مگر اس علم و اطلاع کا کوئی اثر اور نتیجہ دیکھنے اور سُننے میں نہیں آیا، اس سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے معاملات میں حکومت فریق نہیں بنا کرتی، وہ اُمیدوار جو ان بےعنوانیوں کے سبب شکست کھا چکے ہیں، اُن کو چاہیے کہ وہ قانونی چارہ جوئی کریں اور ان بےضابطگیوں کا ثبوت فراہم کریں جہاں تک قانون کے رسم و رواج اور مزاج کا تعلق ہے یہ بات نادرست نہیں ہے، انتخابات میں شریک ہونے والے اُمیدوار ہی ایک دوسرے کے خلاف چارہ جوئی کا حق رکھتے ہیں۔

مگر

جو حکومت خود کو اس کا مجاز سمجھتی ہے کہ وہ ملک کی "سیفٹی" کی خاطر اپنے علم و اطلاع اور صوابدید کی بنا پر کسی شہری کو صفائی کا موقعہ دیئے بغیر جیل میں بند کر دے، اُس سے یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس قسم کی مشہور عام بےضابطگیوں اور بےعنوانیوں کی تحقیقات کر کے غلط کاروں کی جھوٹی عظمتوں کے شیش محلوں کو چکنا چور کر دے!

وہ اُمیدوار جنھوں نے انتخابات کے ضوابط و قواعد اور اخلاقی اور اسلامی اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے، وہ اپنے حالات کی تنگی کے سبب قانونی چارہ جوئی کی مشکل ہی سے ہمت کر سکیں گے بلکہ غالباً نہ کر سکیں "اُن" کے سامنے اُن حریفوں کی بےاندازہ دولت ہے جو ہزاروں روپیہ کا محنتانہ دے کر بڑے سے بڑے ماہرین قانون کو اپنی مدافعت میں کھڑا کر سکتے ہیں! پھر انتخابات میں جو مجرمانہ حرکتیں ہوئی ہیں، اس سلسلہ میں اوپر کے طبقہ کا کوئی ایسا تاثر پریس کے ذریعہ سامنے نہیں آیا، جو مجرموں کو مضطرب اور اصول پسندوں کو حوصلہ مند بنا دے، پریس میں جو نیم سرکاری انداز کا سرسری سا تاثر آیا ہے، اس میں ان تمام بےضابطگیوں اور بےعنوانیوں کو "سُنی سنائی باتوں" سے تعبیر کیا گیا ہے ـــــ اس کے بعد:-

؎ کس توقع پہ کوئی نالہ و فریاد کرے

بنیادی جمہوریت کے وہ ارکان جنھوں نے ووٹ فروشی بلکہ یوں کہنا چاہیئے ضمیر فروشی کی ہے، اپنے پاس پڑوس کے لوگوں سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں، اُن کے ضمیر کی ملامت اُنہیں لوگوں کے سامنے آنے اور ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے روکتی ہے اُنہیں دیکھ کر لوگ آوازیں کستے ہیں، ان لالچ کے بندوں نے اپنی ناشائستہ حرکتوں سے بنیادی جمہوریت کے ادارے کی عزت کو بٹہ لگایا ہے اور بی ۔ ڈی (B - D) رفتہ رفتہ گالی بنتی جارہی ہے ۔

لاہور میں پبلک کے اخلاقی دباؤ نے بنیادی جمہوریت کے ایک رُکن سے سات سو روپیہ اُگلوا کر چھوڑا، یہ رقم اس شخص نے اپنے ووٹ کے بدلے حاصل کی تھی، عوام نے یہ رقم وصول کرکے، ایک یتیم خانہ کو دے دی۔

کسی ادارے اور جماعت کا عزت و شرف اُس کے ارکان کی سلامت روی اور باوقار روش پر موقوف ہے، کسی ادارے کی ارکان جب ضمیروں کو بیچنے لگیں تو اُس ادارے کی عزت کہاں باقی رہ سکتی ہے ۔

اچھے لوگ بنیادی جمہوریت کے ارکان سبھی ایک جیسے نہیں ہیں ان میں وہ صاحب کردار افراد بھی ہیں، جن کو کوئی لالچ نہ تو رام کر سکا اور نہ کسی دھمکی سے وہ مرعوب ہو سکے، انھوں نے ہزاروں روپیہ کی پیش کش کو ذلت کے ساتھ ٹھکرادیا، اور اُسی امیدوار کو ووٹ دیا، جس کو وہ اہل سمجھتے تھے! مشہور ضرب المثل ہے کہ "زر بر سر فولاد نہی نرم شود" مگر اللہ کے یہ نیک بندے اس امتحان میں بے لچک ثابت ہوئے، ضمیر فروشی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دیانت و راستبازی، اصول دوستی اور فرض شناسی کی یہ شعاعیں اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں! اس مزاج اور سیرت و کردار کے لوگوں کو جب کوئی ذمہ داری سونپی جائے گی تو بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے، کہ وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اپنے امکان و استطاعت کی حد تک کوشش کریں گے ۔

ان انتخابات میں دو طرح کے کردار سامنے آئے ہیں، ایک وہ لوگ ہیں جنھوں نے سرمایہ دار اُمیدواروں کی تائید، حمایت اور کنویسنگ کرکے اپنی جیبیں گرم کی ہیں۔ عیش و تفریح اور شراب کباب سے لے کر نقد رقوم تک ہر ممکنہ فائدہ اور لذت حاصل کی ہے، سرمایہ داروں کو جاہ و منصب نے اندھا بنادیا تھا۔ اُنھوں نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے تھے، یار لوگوں نے بھی اُنہیں دھڑ دھڑی لوٹا! دوسری طرف وہ غریب مگر اہل اُمیدوار تھے، جن کے لئے کام کرنے والوں نے بھوکا رہ کر اور پیدل چل کر کام کیا ہے، قانونی طور پر دُنیا دکھاوے کے لئے جیت تو ان سرمایہ دار اُمیدواروں کی ہی ہوئی مگر حقیقت میں فتح کا سہرا اُن غریب اُمیدواروں کے سر رہا جن کو بنیادی جمہوریت کے ارکان نے کسی لالچ کے بغیر ووٹ دیئے، اور جنھوں نے اپنی کامیابی کے لئے کوئی ناجائز حربہ استعمال نہیں کیا!

ان انتخابات میں جو حقیقت سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر اُمیدوار نے اپنی اہلیت کے ثبوت اور کامیابی کے امکانات کے لئے "اسلام" کا نام استعمال کیا پاکستان میں "اسلام" اس حیثیت سے تو مظلوم ہے کہ جو لوگ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام کو برپا کرنے کا داعیہ تک نہیں رکھتے، اور جن کی زندگیاں اسلامی اخلاق کی عملاً نفی کرتی ہیں، وہ بھی عوام میں مقبول بننے اور اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لئے "اسلام" "اسلام" کے نعرے لگاتے اور اسی کی پناہ ڈھونڈتے ہیں مگر "اسلام" اس اعتبار سے غالب ہے کہ اسلام کا نام لئے بغیر پاکستان میں کسی کی شخصیت اُبھر نہیں سکتی! یہاں جس کسی کو عزت ملی ہے اسلام ہی کے تصدق میں ملی ہے۔

سیاسی پارٹیاں بحال کی جائیں یا نہ کی جائیں اس سلسلہ میں سرکاری اور نیم سرکاری بیانات آتے رہے ہیں، حالیہ انتخابات

کے ذریعہ حکومت کے لئے اس امر کا فیصلہ کرنے کا بہت ہی اچھا موقعہ میسر آگیا ہے کہ کن لوگوں نے کیا کردار ادا کیا ۔ دیانت اور راست بازی کن افراد کے ساتھ رہی' اور ضمیر فروشی اور مجرمانہ بدعنوانیوں کا ارتکاب کن لوگوں نے کیا !

ناسپاس گزاری ہوگی اگر ہم اس کا اعتراف نہ کریں کہ الیکشن کے سلسلہ میں سرکاری عملے نے بڑی فرض شناسی اور غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے' اور وہ کامیاب اُمیدوار ہوں یا ناکامیاب، کسی کو محکمہ انتخابات کے کارکنوں کے طرزِ عمل سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی !

گزارشیں

ہم کھلے دل سے اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ فوجی اکابر اگر مارشل لا کو مسلسل جاری رکھتے، تو کس کی ہمت تھی جو اُنہیں ٹوکتا، ان سے باز پُرس کرتا اور مشورہ دیتا کہ مارشل لا ہٹا کر جمہوریت قائم کرو ! پاکستان کے محترم صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، آغازِ انقلاب ہی سے جمہوریت کی جانب اپنے رجحان کا اعلان اور اس رجحان کو عمل میں لانے کا وعدہ کرتے رہے ہیں، اور انھوں نے بعض اکابر کی مخالفت کے باوجود اس وعدے کو پُورا بھی کر دکھایا ۔

اس اعتراف کے بعد یہ صورتِ حال بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے کہ آج سے چالیس سال پہلے انگریزی دور میں "مانٹگو چیمسفورڈ اسکیم" کے تحت جو انتخابات ہندوستان میں ہوتے تھے اور ان کے بعد وائسرائے اور صوبہ کے گورنروں نے وزراء کا تقرر اپنی صوابدید سے کیا تھا، تو اس معاملہ میں ۱۹۶۲ء کا پاکستان ۱۹۲۱ء کے ہندوستان کی آئینی اور جمہوری سطح پر کھڑا ہے !

انگریزی دورِ حکومت میں ملک کے سامنے اصل مسئلہ حصولِ آزادی کا تھا، اس لئے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں کانگریس کمیٹی "حزبِ مخالف" بن کر حکومت پر نقد و احتساب کا فریضہ انجام دیتی تھی ! انگریزی دور کے "حزبِ مخالف" کا پاکستان اسمبلیوں میں رنگ پیدا نہ ہونے دینا چاہئیے' ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے آزاد ہیں' کسی بدیسی حاکم کو دیس نکالا دینے کے لئے ہمیں جدوجہد نہیں کرنی ہے ! انگریز کے عہدِ حکومت میں آزادی کی منزل اسی طرح قریب تر ہو سکتی تھی کہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلائی جائے' اور حکومت سے تصادم کے زیادہ سے زیادہ موقعے اور امکانات فراہم کئے جائیں ! پاکستان میں ہمیں تخریب کے لئے نہیں تعمیر کے لئے کام کرنا ہے، ہمارے ہی بھائی بند زمامِ اقتدار کو سنبھالے ہوئے ہیں' انگریزوں کی طرح اُن کی ذات سے ہمیں طبعی عداوت و نفرت اور خدا واسطے کا بیر نہیں ہے ! اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے، حکومت کے تعمیری کاموں سے ہمیں ہمدردی اور تعاون کی روش اختیار کرنی چاہئیے ۔

مگر

ہماری اس گزارش سے کوئی اس دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائے کہ ہم حکومت کے ہر حکم پر ملک و ملت کو "سمعنا و اطعنا" کا مشورہ دے رہے ہیں' اور عوام سے نقد و احتساب کا حق ہی چھینے لے رہے ہیں، حکومت کی اطاعت "معروف" میں ہے، معصیت میں نہیں ہے !

حکومت جہاں غلطی کرے' اس پر نہ ٹوکنا ملک و ملت بلکہ خود اربابِ حکومت کے ساتھ بہت بڑی بدخواہی ہے ! مثلاً کلچرل شو کے نام پر "رقص و نغمہ" کی لغویتیں ملامت و مخالفت کی مستحق ہیں، یہ باتیں اسلامی اخلاق کے مزاج کے خلاف ہیں !

ساری دُنیا جانتی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے بنا ہے، اسمبلیوں کے ارکان کو اسی کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں کہ یہاں اسلام کی چند پرچھائیوں کی بجائے پورے کا پورا اصل اسلام قائم ہو ! اسی طرح ادھوری اور "پابند جمہوریت" (CONTROLLED DEMOCRACY) بھی خاطر خواہ مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتی، قانون و دستور کی

اس انداز پر تشکیل کہ طاقت ایک ہی فرد کی ذات میں سمٹ آئے اور کسی کے اقتدار کی عمر کو زیادہ سے زیادہ طول و درازی نصیب ہو یہ جمہوریت کی اسپرٹ کے خلاف ہے!

سب سے آخری بات

..........ہمیں یہ کہنا ہے کہ عائلی قوانین ہیں، خود پاکستان کا دستور ہے، اسمبلیوں کے ارکان پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان قوانین و دساتیر کو کتاب و سنت کے مطابق متشکل کرنے کی جدوجہد کریں۔ ایسے مسائل کسی دوسرے کے تیور دیکھ کر نہیں، اللہ اور رسولؐ کے احکام کے تیور دیکھ کر اور ان کے تقاضے پہچان کر ہی حل ہو سکتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔

حکومتیں اور ان کے چلانے والے ادلتے بدلتے رہتے ہیں، خود ہم نے ان آنکھوں سے بڑے بڑے لوگوں کے عروج و زوال کے کتنے بہت سے ڈرامے دیکھے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا حکم اور اس کا قانون نہیں بدلتا، جس نے اس قانون کا ساتھ دیا، وہی دین و دنیا میں کامیاب رہا، اگر ایسا نازک موقعہ آجائے کہ جہاں اللہ اور رسولؐ کی وفاداری اور اطاعت کسی دوسرے کی وفاداری اور اطاعت سے ٹکراتی ہو، تو ایک مردِ مومن کو ایمانی جرأت سے کام لے کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و وفاداری کو قبول کرنا چاہیے۔

ماہرالقادری
۱۵ مئی ۶۲

مدیر "فاران" ——— کے نام ———

ایک خط

...... السّلام علیکم ! مزاج گرامی۔ دسمبر کا فاران موصول ہوا۔ مونس نوازی کا شکریہ۔ آپ نے جس انداز سے میری کتابوں پر تبصرہ فرمایا ہے اس کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جناب رئیس احمد جعفری اور ملا واحدی صاحب جیسے ادبا، جب آپ کی تنقید سے نہیں بچ سکے تو میں کیا چیز ہوں۔ میری حیثیت تو ان کے سامنے طفل مکتب کی سی بھی نہیں۔

تبصرہ پڑھتے ہی آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر اپنے اس ارادہ کی تکمیل سے باز رہا۔ آج خدا معلوم کیوں آپ کو اپنے تاثرات سے آگاہ کرنے بیٹھ گیا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت پیر صاحب نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی اور جب وہ وحدت الوجود عالم الغیب اور دیگر عنوانات پر خطاب فرماتے ہیں تو سننے والے دریائے حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں۔ میں نے سنا کہ جب وہ پنڈی آئے تھے تو پہاڑی زبان بولتے تھے۔ وہ زبان پنجابی سے مختلف اور مشکل ہے۔ اور اب تو وہ کافی ادق اُردو بولتے ہیں۔

میں نے کسی کتاب غالباً تذکرہ غوثیہ میں پڑھا تھا کہ ہر پیغمبر کی کوئی نہ کوئی صفت کسی ولی کو تفویض کر دی جاتی ہے۔ اسی کتاب میں کسی بزرگ کے متعلق لکھا تھا کہ انہیں حضرت آدم کی صفت تفویض کر دی گئی تھی چنانچہ وہ جس عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتے تھے وہ حاملہ ہو جاتی تھی۔

حضور سرورِ کائنات صلعم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار کے مجمع سے خطاب کیا اور ہر شخص نے وہ خطبہ سنا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہر شخص نے اپنے کانوں سے وہ خطبہ کیسے سن لیا جب اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر (آلۂ مکبر الصوت) نہیں تھا۔ حضرت غوث الاعظمؒ کے مدرسے میں اسی اسی ہزار کا مجمع ہوتا تھا اور جو لوگ آخری صف میں ہوتے تھے وہ بھی اتنی ہی آسانی سے حضورؒ کی آواز سن لیتے تھے جتنی پہلی صف کے لوگ یہ کیا تھا؟ یہ حضور سرورِ کائنات صلعم کی صفت تھی جو صرف حضرت غوث الاعظم کو عطا کی گئی۔ ان کے بعد یہ صفت کسی کو آج تک تفویض نہیں کی گئی۔

معاف کیجئے گا میرے اس جملے سے کہ حضرت پیر صاحب حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے ہی بیعت فرماتے ہیں آپ کو غلط فہمی ہو گئی۔ میرا مدعا یہ نہیں کہ ہر شخص کو بیعت کرتے وقت اجازت لی جاتی

ہے۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ پیر صاحب نے بیعت کا سلسلہ حضور غوث پاک کی اجازت سے شروع کیا ہے۔

حضرت خواجہ خضر علیہ السلام فرشتے تو یقینی نہیں ہیں ان کی حیثیت اولیاءاللہ کی سی ہے۔ حضور غوث پاک نے بھی خواجۂ بزرگ سے استفادہ کیا۔ حیاتِ خضر کے متعلق میں شجرۂ عالیہ میں حوالے دے چکا ہوں اور یہاں ان کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ اور حضرت امام حسین علیہ السّلام سے فیض پہونچنے کے واقعات اکثر تذکروں میں ملتے ہیں یہ تو خیر بڑی باتیں ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اولیاءاللہ کے مزارات پر جو لوگ جاکر دعا مانگتے ہیں ان کی اکثر دعائیں کیوں قبول ہوجاتی ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کا آنحضرت صلعم سے وصال کے بعد تربیت حاصل کرنے کا سوال اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ حضورؐ اپنی حیات ہی میں ان کو تربیت دے چکے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اہلِ روح حضرات روضۂ اطہر سے استفادہ کرتے رہے ہوں۔

باطنی نظام کے متعلق جو آپ نے طنز فرمایا ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ باطنی اور ظاہری نظام دونوں اللہ تعالیٰ خود ہی چلاتا ہے۔ اس کے سوا کون چلا سکتا ہے مگر جس طرح ظاہر انظام میں خدا کے مقرر کئے ہوئے مختلف سربراہ اور زعما اس نظام کو چلاتے ہیں اسی طرح باطنی نظام کو بھی اس کے منتخب بندے اس کے حکم کے مطابق چلاتے ہوں گے۔ غوث۔ قطب الاقطاب۔ قطب۔ ابدال۔ اوتاد اور رجال الغیب وغیرہ اصطلاحات لایعنی تو نہیں ہیں۔ یہ ہستیاں ضرور ہوتی ہونگی اور ان کے ذمہ کچھ فرائض بھی یقینی ہوتے ہونگے۔

حضرت پیر صاحب کے خواب کے سلسلے میں عرض ہے کہ ہمیشہ یہ سننے میں آیا ہے کہ بادشاہ یا سربراہ پر ساتھ ولیوں کا سایہ ہوتا ہے بعض آدمی بظاہر نااہل معلوم ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ اہل ہوتے ہیں جبھی تو اللہ تعالیٰ انہیں کسی خاص منصب پر فائز کرتا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کیا بیشتر علمائے کرام قائداعظم مرحوم کے مخالف نہیں تھے ؟

آپ نے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ حکومت مغربی پاکستان کے چیف سکریٹری فدا حسین صاحب کے برادر بزرگ (جن کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا) ایک دفعہ گلاس کے ذریعہ روحوں کو بلارہے تھے تو حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی روح آگئی۔ اور وہ انہیں مستقل ان کے دنیادی کاموں میں مشورے دیتی رہی ان مشوروں پر عمل کرکے وہ ایک بہت بڑی مشکل سے عہدہ برآ ہوگئے۔ یہ واقعات انھوں نے تفصیل سے اپنی انگریزی کتاب "عمر بن عبدالعزیز" میں بیان کئے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا اس قسم کے واقعات کے متعلق ؟

"انا الحق" کے الفاظ بظاہر ضرور قابلِ اعتراض ہیں مگر قطع نظر اس کے کہ ان کو کن کیفیات کے ماتحت ادا کیا گیا۔ کہنے والے کو اس کی سزا مل گئی۔ حضرت منصور کا کیا مقام تھا؟ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے یا اہلِ نظر مجھے تو غالبؔ کا یہ شعر یاد ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　　ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

ہاں یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ ان کے خون کے قطروں سے کیوں انا الحق کی صدا بلند ہورہی تھی اور ان کا چہرہ دکھلانے سے دریا کا تموج کیوں ختم ہوگیا۔

حضورِ سرورِ کائنات صلعم کے متعلق حاضر و ناظر کے الفاظ ان معنوں میں نہیں استعمال کئے گئے جن معنوں میں وہ خدا کے متعلق کئے جاتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے یہ الفاظ کسی بھی ذی حیات کے متعلق استعمال ہو سکتے ہیں۔ حضور صلعم کے متعلق یہ الفاظ استعمال کرنے سے حیات النبی صلعم کا مسئلہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔

"ارشاد عالی" میں تلاوت کے لفظ پر آپنے اعتراض کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ عام طور سے یہ لفظ قرآن شریف کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر لغات میں اس کے معنی یوں ہوتے ہیں۔

(۱) المعجم الاعظم

تلاوۃ:— پڑھنا۔ دوسرے کا کلام پڑھنا۔ خچر کا بچہ مول لینا۔

(۲) نور اللغات

تلاوت = پڑھنا۔ تلاوت کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کے پیچھے پیچھے لگے آنا۔ کیوں کہ کسی چیز کے پڑھنے میں بھی پڑھنے والا اصل کلام کی تقلید کرتا ہے یعنی اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے اس لئے اس کا استعمال قرأت اور پڑھنے میں ہونے لگا۔ لہٰذا تلاوت پڑھنے کے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔

آپنے لفظ "ہدیہ" پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ہدیہ کے معنی لغات میں یوں ہیں :۔

(۱) المعجم الاعظم

الْهَدِيَّة = تحفہ۔ ہدیہ۔ نذر۔ نیاز۔ منت

هَدْيه : عطیہ۔ تحفہ۔ نذرانہ۔ نذر۔ انعام۔ ہدیہ کرنا۔ کوئی متبرک چیز فروخت کرنا۔

میں نے ہدیہ کا لفظ اس اعتبار سے استعمال کیا ہے کہ میں خطبات کو یا سوانح مرشد یا وظائف و اوراد کو بیچ نہیں رہا کہ یہ بیچنے کی چیزیں ہی ہیں بلکہ یہ پڑھنے والوں کی نذر ہیں اور طباعت کے اخراجات کے لئے عہ یا ۸ کی حقیر رقم چاہتا ہوں۔

بیعت کے بعد جو کیفیت پیر صاحب کی ہوئی جسے آپنے نقل فرمایا ہے اسی قسم کی کیفیت بیعت کے بعد حضرت خواجہ غریب نواز کی ہوئی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص ہر کام نہیں کر سکتا اور اگر کوشش بھی کرے تو ضروری نہیں ہے کہ ہر کام میں اتنا ہی کامیاب ہو جتنا کہ وہ کسی ایک کام میں ہے۔ پیر صاحب شاعر نہیں ہیں جس نظم کا میں نے حوالہ دیا ہے اس میں انھوں نے ان واقعات کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے جن سے وہ دوچار ہوئے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اکثر لوگ بلا تعلیم حاصل کئے شاعر ہوئے ہیں اور کافی کامیاب۔ مگر حضرت پیر صاحب ان لوگوں میں نہیں ہیں۔

آپ کو کم از کم یہ بتانے کی قطعی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اولیاء اللہ کے وظیفوں اور دعاؤں سے کیسی کیسی مہمات سر ہوئی ہیں۔

جہلم کے مولوی صاحب کے واقعہ کے متعلق میں کچھ عرض نہیں کر سکتا یہ واقعہ انھوں نے ایک مسجد میں اپنی تقریر کے دوران بیان کیا تھا۔ بعد میں میں نے اس کی تصحیح ان سے چاہی تو انھوں نے کہا کہ پیر صاحب کا مقام معلوم کرنے کے لئے انھوں نے جنگل میں چلہ کیا تھا ایک رات یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک دفعہ انہیں مولوی صاحب نے

کہا کہ پیر صاحب مقام قیومیت پر پہونچ گئے ہیں۔ کم از کم میں تو نہیں جانتا کہ یہ کون سا مقام ہے۔
حضرت پیر صاحب کا مقام جو کچھ بھی ہو مگر ان کی روحانیت سے قطع نظر وہ ایک مکمل با اخلاق اور پابند شرع ہیں۔ ان سے ایک دفعہ ملنے والے بھی ان کی تبحر علمی اور بلند اخلاق کے معترف ہو جاتے ہیں۔
اس قدر طویل خط لکھنے کی معذرت چاہتا ہوں۔

نیاز کیش
مونس زبیری عفی عنہ
۲۶ دسمبر ۱۹۶۱ء گلی نادر۔ راولپنڈی

اس خط کو آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے مگر "فاران" کی ترتیب کے علاوہ باہر آنے جانے کی ایسی مصروفیات رہیں کہ جواب دینے کا موقع نہ مل سکا۔ ہر کام کے کرنے اور ہونے کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے کوئی لاکھ چاہے مگر مقررہ وقت سے پہلے کسی کام کو کر نہیں سکتا، اس مکتوب کے جواب کے لئے جو وقت مقرر اور مقدر تھا۔ اسی وقت پر جواب دینے کی توفیق میسر آئی۔ — والامر بیدہ —

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کے معتقدات پر گرفت کی جاتی ہے، تو وہ بُرا مان جاتے ہیں "اس برا ماننے کے" بھی مدارج ہیں جھنجلاہٹ، برہمی خفگی یہاں تک کہ بات بڑھتے بڑھتے ذاتی عناد و مخالفت تک پہونچ جاتی ہے! جناب مونس زبیری نے ہماری تنقید و احتساب کے جواب میں جو نرم و شائستہ لہجہ اختیار فرمایا ہے، اس کا ہم پوری قدر شناسی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں۔

جو حضرات باقاعدگی کے ساتھ "فاران" پڑھتے رہے ہیں، اُن کو اس بات کا احساس ہوگا کہ "فاران" میں کتابوں اور رسالوں پر تنقید بڑی دقتِ نظر اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کی جاتی ہے جس کتاب میں جتنی بھی اچھائی ہوتی ہے، اس کا اظہار کیا جاتا ہے اور جو باتیں قابل گرفت واحتساب ہوتی ہیں، ان پر دلائل کے ساتھ نقد و نظر کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جناب پیر دیول شریف صاحب کے جن ملفوظات اور حالات پر "فاران" میں تبصرہ کیا گیا تھا، یہ خط اُسی سلسلہ میں ہمیں وصول ہوا ہے دسمبر ۱۹۶۱ء کا "فاران" جن حضرات کے پاس محفوظ ہو وہ ہماری تنقید کو ایک بار اور پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں ہم نے پیر صاحب موصوف کے ملفوظات کے بعض اجزا کو "ایمان افروز" بتایا ہے اور نمونہ کے لئے ایک اقتباس درج بھی کر دیا ہے اس اعتراف کے بعد جن باتوں میں کھٹک محسوس ہوئی، اُن پر نقد و احتساب بھی کیا گیا ہے۔

دین و دُنیا کے تمام مسائل اور حقائق کے جانچنے اور پرکھنے کا ایک اور صرف ایک ہی پیمانہ — کتاب و سنت — ہے! کوئی کتنی ہی مقدس و محترم شخصیت اور کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، اگر اُس کا کوئی قول و فعل "کتاب و سنت" کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ تو دین ہی کی خیر خواہی کا یہ تقاضا ہے، کہ اس قول و فعل پر نکیر کی جائے! تمام شخصیتیں چاہے وہ کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہوں اللہ اور رسولؐ سے نیچی اور اُن کی تابع اور فرمانبردار ہی ہیں، اس حقیقت پر جس کی نظر رہے گی تو کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے وہ مرعوب نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے حزم و احتیاط کے ان تقاضوں سے بھی ہم باخبر ہیں کہ اکابر دین کے اقوال و افعال کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے ان کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہئیے، کسی کے قول پر جھٹ سے اعتراض جڑ دینا، معترض کے لئے ندامت و ذلت کا

سبب بھی بن سکتا ہو اکسی کی مدح وستائش میں اتنی احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، جتنی احتیاط کی ضرورت "نقد واحتساب" میں پیش آتی ہے۔ اگر کسی بزرگ کے "قول وفعل" کی مناسب تاویل ہوسکتی ہے تو اس تاویل کے لئے فکر وتدبر کرنا چاہیے!

مگر

اس تصویر کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ دُور ازکار تاویلات اور شعر وافسانہ کے انداز کی نکتہ آفرینیاں اور لطائف وظرائف دینی مسائل کو مضحکہ بنا لیتے ہیں، کسی عظیم شخصیت کے قول وعمل کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے کے لئے اس قسم کی تاویلیں کرنا کہ اُن سے خود دین کے حقائق ومسلمات مُبہم، غبار آلود اور مجروح ہوجائیں، دینی اعتبار سے سخت قابلِ اعتراض فعل ہے!

اعتراف

"تصوف" کی غایت تصفیہ قلب ودماغ اور تزکیہ نفس بتائی گئی ہے، اس غایت کی اہمیت، ضرورت اور افادیت سے کوئی ہوش مند انکار نہیں کرسکتا، عبادات کا اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور تزکیہ نفس ہی ہے ارباب تصوف نے تزکیہ نفس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت وتبلیغ کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، وہ اپنی جگہ مُسلّم ہیں۔ خاص طور سے ہندوستان اور افریقہ میں صُوفیائے کرام نے دین کی تبلیغ کے لئے جو کوششیں، محنتیں اور ریاضتیں کی ہیں، اُن کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔

تزکیہ نفس کے وہ طریقے جو کتاب وسُنّت اور آثارِ صحابہ کے مُطابق ہیں، وہ ہر مسلمان کے سر آنکھوں پر! اُن کی افادیت اور ضرورت ہر دور کے لئے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کی اُن بزرگوں پر رحمتیں ہوں جنھوں نے تزکیہ نفس کے لئے مجاہدے اور ریاضتیں کی ہیں، اور اپنے نفس کے ساتھ، دوسروں کے "نفس وکردار" کو بھی سنوارا اور چمکایا ہے، اور اس جدوجہد میں کتاب وسُنّت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے! اس سلسلہ میں جہاں ایسی باتیں ملتی ہیں، جو راہبوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کے معمولات اور طریقوں سے ملتی جلتی ہیں، اُن میں بعض کی صورت "مُباح" کی ہے، جیسے ہم جسمانی علاج کے لئے کسی غیر مُسلم طبیب کا کوئی نسخہ استعمال کرتے ہیں، مگر "اباحت" سے نیچے کے درجہ کے بعض ایسے طریقے اور معمولات بھی ہیں، جو کتاب وسُنّت کی صاف وسادہ تعلیمات سے میل نہیں کھاتے، ان باتوں کی تحسین اور تائید نہیں کی جاسکتی۔

حدیث اور فقہ

تصوف صرف "تزکیہ نفس" تک محدود نہیں رہا، اس (تصوف) کی بدولت ایک مُستقل لٹریچر وجود میں آیا ہے، اس لٹریچر کی خاص اصطلاحات، مخصوص لب ولہجہ اور مُنفرد رموز واشارات ہیں ــــ اس پر گفتگو کرنے سے پہلے، ہم فقہ وحدیث کے بارے میں اجمالاً کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ علم فقہ نے مسائلِ شریعت کی تدوین کا فریضہ انجام دیا ہے، کتاب وسُنّت اور آثارِ صحابہ سے مسائل مستخرج اور مُستنبط کئے ہیں، اور جہاں کتاب وسُنّت خاموش ہیں، یا کسی مسئلہ میں چند پہلو مشابہ، مساوی یا راجح ومرجوح پائے گئے ہیں، اُن میں اجتہاد سے کام لیا ہے۔ فقہاء کرام کا اُمت پر بہت بڑا احسان ہے کہ اُن کے اخلاص، خدا اور رسول سے محبت اور دینی شغف کی مدد اُن کی بصیرت اور فراست نے اُمت کے لئے بڑی سہولتیں اور آسانیاں مہیا کردی ہیں! فقہاء کرام کی ان مساعی کو اُمت نے ہمیشہ قدر واستحسان کی نگاہ سے دیکھا ہے مگر جہاں فقہی مسائل میں اتنی زیادہ باریک بینی سے کام لیا گیا ہے کہ اُن میں فطری سادگی کی جگہ تکلف اور مُبالغہ پیدا ہوگیا ہے، یا جہاں بعض "مفروضہ مسائل" کی بنیاد پر استنباط واجتہاد کیا گیا اُن پر کتاب وسُنّت کے جاننے والے اہل علم نے نقد واحتساب بھی کیا ہے! پھر اُمت کا ائمہ فقہ کے بارے میں یہ عقیدہ رہا کہ مجتہدین خطاء سے محفوظ اور پاک نہیں ہوتے، عصمت کا شرف صرف انبیاء کرام کے لئے مخصوص ہے، اور ایسی عصمت کا

دوسری یہ" جہاں سہو و نسیان تک کا احتمال و امکان نہ ہو' یہ خصوصیت صرف ذاتِ باری کی ہے!

احادیث نبوی ؐ کے ضبط و تدوین کا آغاز عہد رسالت ہی میں ہو چکا تھا، اور ہونا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اُمت پر اپنی اطاعت کی طرح فرضِ منصوص قرار دیا ہے! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے احادیث رسول ؐ کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ انہیں حرزِ جاں اور ضابطہ حیات بنایا، دل و دماغ کے صفحات اور حافظہ کے اوراق کے علاوہ حضور ؐ کے ارشادات بعض صحابہ نے مدونوشتوں" میں بھی محفوظ کر لئے تھے، صحابۂ کرام سے احادیث رسول ؐ کی یہ امانت تابعین کو ملی' ان کے بعد تبع تابعین کو احادیثِ رسول ؐ کی حفاظت' اشاعت' تدوین اور ساتھ ہی ان پر عمل پیرا ہونے کی سعادت میسر آئی ۔۔

(رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ)

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہم کے قول و عمل کی صحت کو جانچنے کے لئے فنِ حدیث وجود میں آیا۔ ایک روایت کے متعدد راوی ہیں' دوسری روایت کے راوی تعداد میں کم ہیں' کسی روایت کے راویوں کی تعداد صرف دو تک محدود ہے اور کسی روایت کو صرف ایک ہی راوی نے بیان کیا ہے' کوئی راوی عدل و ضبط کی قابل اعتماد صفات رکھتا ہے' دوسرے میں یہ صفات اس درجہ کی نہیں پائی جاتیں ۔۔۔۔۔ (وغیرہ' وغیرہ) اسناد و طرق اور درایت و روایت کے اعتبار سے احادیث کے درجے متعین کئے گئے! آج تک دنیا میں کسی انسان کے قول و عمل کی حفاظت اور اس کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے ہزارویں حصہ برابر بھی اتنی کوشش نہیں کی گئی، جتنی کوشش حضور ختم المرسلین' رحمۃ للعالمین' محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے اقوال و اعمال کی حفاظت اور صحت کے لئے کی گئی! یہ وہ علمی شرف ہے جس میں اُمتِ مسلمہ دنیا کی تمام قوموں اور اُمتوں میں منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے اینہ تو اتفاق ہے اور نہ حُسنِ اتفاق ہے' بلکہ یہ جو کچھ ہوا فطرت کے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے عین مطابق ہوا۔ پوری انسانی تاریخ میں سیدنا محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی وہ ذاتِ گرامی ہے' جس کا اسوۂ حسنہ رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے آخری اور قطعی معیار قرار دیا گیا ہے' پس ضرورت تھی کہ اس اسوۂ حسنہ و سُنّتِ رسول ؐ) کو محفوظ رکھا جائے! محدثین پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں کہ انھوں نے پرکھ کر بتادیا کہ یہ سچے موتی ہیں' یہ جھوٹے نگ ہیں' یہ آبِ زلال ہے اور اس محلول میں صاف و ناصاف کی اتنی آمیزش ہے!

اس گزارش کا مقصود یہ ہے کہ فنِ حدیث و فقہ نے دین کی تفصیلات و جزئیات کو متشکل کیا ہے۔ یہ خالص دینی علوم ہیں۔ یہ علوم نہ ہوتے تو اُمت کو قدم قدم پر بڑی دشواریاں پیش آتیں' ان علوم (حدیث و فقہ) کی فطرت' ساخت ہیئت اور مزاج دین کے عین مطابق ہے! فنِ حدیث و فقہ نے کسی کو گمراہ نہیں کیا، کسی کو غیر ذمہ دار' غیر محتاط' مغلوب الحال اور مست و مجذوب نہیں بنایا، ان مسائل میں تاویل کی بہت ہی کم ضرورت پیش آتی ہے' ان علوم کی زبان سادہ اور بیان واضح ہے' ان میں ایچ پیچ نہیں' رمز و اشارت اور فلسفیانہ نزاکتیں نہیں!

تصوف

جہاں تک عبادت و اعمال میں اخلاص اور صفتِ احسان کا تعلق ہے، اس موضوع پر علم تصوف کی کتابوں میں بڑے کام کی باتیں بلکہ ایمان افروز حقائق بیان کئے گئے ہیں' جن کے مطالعہ سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے اور جہاں یہ صفت پہلے سے پائی جاتی ہے اس صفت کا رنگ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

حلال و حرام میں امتیاز' زخارفِ دُنیا سے اجتناب، مجاہدۂ نفس' اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شغف اور اس میں استغراق ہونا، تقدیر الٰہی پر اس درجہ یقین کہ کسی سخت سے سخت مصیبت کے نزول اور ناخوشگوار سے ناخوشگوار حادثہ کے وقوع

پر بھی صبر کرنا، اور یہ تک نہ کہنا کہ اگر فلاں تدبیر اختیار کی جاتی تو ایسا نہ ہوتا —— نہ زمانہ کا شکوہ اور نہ مقدر کا گلہ!

جس طرح جسمانی امراض میں اشیاء کے استعمال میں پرہیز کرایا جاتا ہے اسی طرح نفس و روح کی بیماریوں میں بھی بعض جائز و مباح لذتوں سے اجتناب کی ضرورت پیش آتی ہے! اس خصوص میں اہلِ تصوف نے دنیا کی چمک دمک اور اس کے ٹھاٹ باٹ سے بے رغبتی کی جو تعلیم دی ہے، اس سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے! جس طرح اسلام میں "رہبانیت" نہیں ہے، اسی طرح اسلام میں "دنیا کی غلامی" بھی تو نہیں ہے۔

شہرت اور نام و نمود کی ہوس اور اس بات کی تمنا کہ کسی نیک کام پر دوسرے لوگ اسے سراہیں۔ اہلِ تصوف نے اسے "ریا" قرار دیا ہے، جو "شرک" کے مشابہ ہے، ایسی باتوں سے ضمیر زنگ آلود ہو جاتا ہے، اور اخلاص کی کیفیت شع اور ریا سے بدل جاتی ہے!

یہ تمام حقائق و کیفیات جن کا اجمالاً اوپر ذکر کیا گیا ہے علم تصوف کے زرین ابواب ہیں، اخلاق اور تزکیۂ نفس کی یہ تعلیم کتاب و سُنّت کے مطابق ہے اور "احسان" کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہے! علم تصوف کا یہ وہ روشن اور تابناک رخ ہے جو ہر حق پسند کو محبوب و حسین اور پسندیدہ ہی نظر آئے گا۔

تصوف کے باب میں "کھٹک" اس نقطہ سے شروع ہوتی ہے، جہاں قرآن، حدیث اور فقہ کے علماء اور ارباب تصوف کے درمیان اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن کا امتیاز پیدا کیا گیا ہے! یہی وہ امتیاز ہے جو علماء دین اور ارباب تصوف کے حالاتِ زندگی اور ملفوظات میں نظر آتا ہے۔ صحابۂ کرام، تابعین عظام اور حدیث و فقہ کے ائمہ کے حالاتِ زندگی میں ظروف و احوال کا فرق پایا جاتا ہے، مگر ان کا مزاج یکساں ہے، یہ سب ایک ہی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں نظر آتی ہیں! مثلاً حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی میں حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مقدس سیرت کی خاص جھلک دکھائی دیتی ہے اور کہیں کہیں تو یک روح و دو قالب کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، اسی طرح حضرت امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کی زندگیوں پر صحابہ کے سیرت و کردار اور ذوق و مزاج کی چھاپ نظر آتی ہے —— حالاتِ زندگی، مزاج و طبیعت سے لے کر زبان و بیان اور سوچنے کے انداز تک، اسلام کی سادگی کی نمود! سیدھی سادی باتیں، فطرت کے مطابق کھلے ہوئے روشن و واضح احوال، کوئی رمز و اشارت، ابہام اور پیچیدگی نہیں۔

آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

مگر

ارباب تصوف کے جو حالات ملتے ہیں، ان کا رنگ اور مزاج ہی کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ بطنِ مادر ہی سے خرق عادت اور کرامات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو کرامات کا ایک دفتر وجود میں آ چکا ہوتا ہے کسی کے ہاتھوں میں سانپوں کا بنا ہوا کوڑا ہے اور وہ شیر کی پیٹھ پر سوار ہیں۔ دوسرے بزرگ اس کرامت کے جواب میں یہ کرامت دکھاتے ہیں کہ وہ جس دیوار پر بیٹھے ہوتے ہیں، وہ دیوار ان کے حکم سے دوڑنے لگتی ہے، کوئی صاحب بارہ برس تک غذا نہیں کھاتے، دوسرے پر ان کے پیر و مرشد کی نگاہ پڑتے ہی ایسا جذب طاری ہو جاتا ہے کہ بستی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتے ہیں اور بھوک درختوں کے پتے کھا کر زندگی بسر کرتے ہیں، اس خلوت گزینی اور مجاہدہ سے ممکن ہے ان پر کچھ امورِ غیب منکشف ہو گئے ہوں۔ مگر ... با جماعت کی محرومی کا [illegible] ہو سکتی

ایک بزرگ ہیں کہ نزع کے وقت ملک الموت سے بحث فرما رہے ہیں بلکہ دونوں کے درمیان خاصی جنگ ہو رہی ہے، دوسرے صاحب مر چکے ہیں، اُن کا جنازہ لوگوں کے کاندھے پر ہے کہ ایکا ایکی اُٹھ کے بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ تلقین فرما کر پھر لیٹ جاتے ہیں، تیسرے بزرگ چوتھے آسمان پر جا کر ملک الموت کے ہاتھ سے وہ زنبیل چھین لیتے ہیں جس میں اس دن کے مُردوں کی روحیں بھری ہوتی ہیں۔ اس چھین جھپٹ میں روحیں بکھر جاتی ہیں اور تمام مُردے جی اٹھتے ہیں۔

ایک شیخ وقت کو جمعہ کی نماز میں لوگ آگے کی صفوں میں کھڑا نہیں ہونے دیتے، تو اس پر وہ بزرگ خفا ہو کر مسجد کی چھت کو سجدہ کرنے کے لئے اشارہ فرماتے ہیں، چھت گر پڑتی ہے اور سیکڑوں نمازی دب کر مرجاتے ہیں ——— شیوخ تصوف کے اس قسم کے حالات نے اچھے خاصے متشرع لوگوں کے ذوق کا یہ حال کر دیا ہے کہ وہ اپنے پیروں کی معمولی معمولی باتوں سے "کرامت" منسوب کرتے ہیں، مثلاً کوئی بزرگ دو تین آدمیوں کی خوراک کی برابر کھانا کھالیں، تو یہ کرامت ہے اور کسی قصبہ میں ریلوے لائن نکل جائے تو اس واقعہ کو بھی اُن بزرگ کی کرامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہم خدانخواستہ انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات کے مُنکر نہیں ہیں، مگر پوری زندگی "کرامات" ہی بن کر رہ جائے یہ بات خاصی کھٹک پیدا کرتی ہے! ایسی زندگیاں جو سراپا معجزہ و کرامت ہوں، عام لوگوں کے لئے نمونہ کہاں بن سکتی ہیں، کیوں کہ پیروی "عادت" کی ہو سکتی ہے، "خرقِ عادت" کی نہیں ہو سکتی۔

صحابۂ کرام سے بڑھ کر خدارسیدہ اور کون ہو سکتا ہے، بڑے سے بڑا صوفی، چھوٹے سے چھوٹے صحابہ کے مقابلہ میں فروتر ہی نظر آتا ہے، مگر صحابۂ کرام کی اتنی بڑی جماعت میں گنتی کے چند صحابہ کی زندگیوں میں کرامتوں اور خرقِ عادت کے چند واقعات ملتے ہیں، اکثر و بیشتر صحابہ کی زندگیوں کے ورق کرامات کے باب میں بالکل سادہ اور معرّیٰ ہیں ——— اسی طرح امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، عبداللہ ابن مُبارکؒ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام بخاری، امام مسلم (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ بزرگوں کے حالاتِ زندگی میں "کرامات" کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔

دریا پر چلنا اور ہوا میں اُڑنا یقیناً "خرقِ عادت" ہے مگر ایک جادوگر بھی یہ کرتب دکھا سکتا ہے ——— لیکن زندگی کی سب سے بڑی کرامت کتاب و سُنّت کا اتباع ہے، دین کے حقیقی خدمت گزار اور انبیاء کے صحیح جانشین وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنھوں نے علمِ دین کی حفاظت اور اشاعت کی ہے، جن کی زندگیوں میں کتاب و سُنّت کی زیادہ سے زیادہ جھلک ملتی ہے، جن کے اقوال و اعمال میں کوئی پیچیدگی، رمز و اشارت، ذومعنویت اور ابہام نہیں، یہی مقدس زندگیاں اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی آیتیں ہیں!

خرقِ عادت و کرامات کے اس ذوق کا یہ نتیجہ نکلا کہ پابندیٔ شریعت اور اتباعِ کتاب و سُنّت کے مقابلہ میں "خرقِ عادت" کے واقعات اور "قلندریت" و "مجذوبیت" کو ترجیح دی گئی۔ بعض ایسے لوگ جن کے ہوش و حواس ہی سرے سے درست نہ تھے، جو لایعقل اور مرفوع القلم تھے، ننگ دھڑنگ، فاترالعقل، نماز، روزے اور دین کے دوسرے ارکان کی پابندی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، دیوانوں جیسے حالات! ان لوگوں سے "جذب و مستی" کا تقدس منسوب کیا گیا اور خاصے متبحر عُلماء تک نے ان کو "سُلطان المجاذیب" کا لقب دے کر ان کے "جذب" کا سلسلہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے حالات سے ملا دیا ——— (استغفر اللہ)

احادیث و سیر میں ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھار بعض صحابہ کی ناپسندیدہ باتوں پر خفگی کا بھی

اظہار فرمایا ہے۔ حضور کا اس سے مقصود انتباہ اور صحابی کے احوال کی اصلاح تھی، مگر یہ کسی ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع حدیث میں بھی نہیں ملتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس صحابی کی ولایت اور روحانیت سلب کرلی ہو، یہی طرح صحابہ کرام تابعین اور حدیث و فقہ کے ائمہ کے یہاں بھی "سلبِ علم و روحانیت" کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ مگر بعض صوفیاء کے سوانح حیات میں ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے کہ فلاں شیخ نے اپنے مُرید یا معاصر ولی کی ولایت سلب کرلی اور وہ بیچارہ بالکل کورا رہ گیا پھر اُسی وقت دوسری نگاہ میں یا چند روز بعد سلب کی ہوئی ولایت کو واپس بھی فرما دیا۔

"سلبِ ولایت و روحانیت" کے ساتھ ایسے واقعات بھی صوفیاء کے حالات میں نگاہ سے گزرے ہیں کہ کسی بزرگ نے کسی مُرید یا طالب پر توجہ کی ایک نگاہ ڈالی، اور اس (معمول) پر چودہ طبق روشن ہوگئے اور وہ آن کی آن میں علمِ لدنی سے باخبر ہوگیا، اور "قطبیت" کا وہ مقام جو دوسروں کو برسوں کے مجاہدے کے بعد حاصل ہوتا ہے، اس شخص کو شیخ وقت کی توجہ سے ذرا سی دیر میں کسی مجاہدے کے بغیر ہی مل گیا۔

اس قسم کے واقعات بزرگانِ دین کے حالات و ملفوظات میں پڑھ کر یا سُن کر بعض لوگ اس جہالت اور غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں کہ ہمیں اپنے خراب اور دینی نقطۂ نگاہ سے ناپسندیدہ حالات کو سُدھارنے کی کوشش کرنے کی بجائے کسی ایسے صاحبِ حال بزرگ کی جستجو کرنی چاہیے۔ جو ایک ہی نگاہِ توجہ میں دل و دماغ اور اعمال و افکار کی کایا پلٹ دے، خاص طور سے صاحبانِ جاہ و دولت کا طبقہ اس غلط اندیشی میں مبتلا رہا ہے! اور کسی بزرگ کے مزار پر چڑھاوا چڑھا کر یا کسی پیر کی خدمت میں نذرانہ پیش کر کے، وہ مطمئن ہوگئے ہیں کہ اس طرح ہماری بد اعمالیوں کا کفارہ ہوگیا۔ اور قیامت کے دن کوئی جو کھم آن پڑی، تو حضرت شاہ صاحب قبلہ جو اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، معاملہ کو سنبھال لیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے روکا ہے کہ خود حضورؐ کی شان میں ایسا مُبالغہ کیا جائے، جیسا مبالغہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی شان میں کیا تھا! اسی موحدانہ تعلیم کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی ایسا لقب اور خطاب تجویز نہیں کیا، جو توحیدِ خالص کی اسپرٹ کو ذرہ برابر غبار آلود بناتا ہو۔ صحابۂ کرامؓ نے حضورؐ کے لئے فریاد رس (غوث) دستگیر، مشکل کشا، غریب نواز، داتا اس قسم کا کوئی لقب اور خطاب نہیں تراشا! مگر تصوف کی فضا میں ان القاب و خطابات کی گونج سُنائی دیتی ہے ــــ یہاں تک کہ "قیوم" جو اللہ تعالیٰ کا ایسا نام ہے جس کا مجاز و استعارہ میں بھی غیر اللہ پر اطلاق نہیں ہو سکتا، یہ نام بھی منصب و مقام کی صورت میں ایک مشہور خانوادۂ تصوف میں ملتا ہے، وہاں کوئی "قیومِ اول" ہے، کوئی "قیومِ ثانی" ہے!

جن کی ضرورت نہ تھی!

"حقیقتِ محمدیہ" کیا تھی؟ صحابہ کے غور و فکر کا سرے سے یہ موضوع ہی نہیں رہا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کچھ فرمایا، حضورؐ اللہ کے بندے تھے آخری نبی تھے، رحمۃ للعالمین تھے، خیر البشر تھے، راہِ ہدایت کے سراجِ مُنیر تھے، اُمّت کے حق میں رؤف و رحیم تھے، آپ کی ذاتِ گرامی اللہ تعالیٰ کی آیتِ کبریٰ تھی، قیامت کے دن حضورؐ گناہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے۔ حضورؐ کی ان تمام صفات و کمالات پر ہم ایمان لاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "حقیقت" معلوم کرنے کی ذمہ داری اُمت پر نہیں ڈالی لیکن اربابِ تصوف نے "حقیقتِ محمدیہ" کو غور و فکر کا موضوع بنا کر انتہائی ژولیدہ، دقیق اور نازک و خطرناک مباحث کا دروازہ کھول دیا ــــ اور یہ خطرناکی اس حد تک پہونچ گئی کہ قرآن کریم کے

مشہور مفسر علامہ آلوسی، جو تصوف کا خاص ذوق رکھتے ہیں، اپنی تفسیر میں یہ تک لکھ گئے کہ حضرت مریم کے رحم میں "حقیقتِ محمدیہ" پھونکی گئی تھی۔ جس کے سبب آپ حاملہ ہو گئیں، اس لئے حضرت عیسیٰ روح اللہ کی "ابنیت" کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں حقیقتِ محمدیہ سے ہے !! (توبہ!)

بعض صوفیاء کرام کے حالات و ملفوظات میں اُن کی عبادات کا اس مبالغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ ایک ایک رات میں دو دو ہزار نوافل کا پڑھنا اُن سے منسوب ہے، یہ بات عقل و تجربہ اور مشاہدہ کی رُو سے بعید از قیاس اور خلاف واقعہ ہے۔ اگر کوئی دو منٹ میں دو رکعتیں بھی پوری کر لے، اور مسلسل بارہ گھنٹے نوافل پڑھتا رہے، تو ساتھ ساڑھے سو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھ سکتا! اسی طرح "ترکِ لذات" کے سلسلہ میں ایسی روایات بھی نظر سے گزریں کہ ایک بزرگ نے کھانا کھایا، اور اُن کی زبان نے جو کھانے کی لذت اور ذائقہ محسوس کیا، تو انھوں نے دانتوں سے اپنی زبان کو چبا کر لہو لہان کر ڈالا۔

سب سے زیادہ خطرناک علم تصوف کی "اصطلاحات" ہیں! خاص طور سے "وحدت الوجود" کا نظریہ انتہائی دقیق غامض اور پیچیدہ ہے، اسلام جس کلمہ کی تعلیم دیتا ہے وہ :-

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

ہے، یعنی یہ کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور الٰہ (یعنی رب، معبود، خالق - - - -) نہیں ہے"۔ اس کلمہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی شے سرے سے پائی ہی نہیں جاتی، اگر یہ بات صحیح بھی ہو کہ "وحدت الوجود" ہی کائنات کی حقیقت ہے، تو بیان و اظہار اور تفصیلات میں جا کر فکر و عقیدہ میں کتنے پیچ پڑ جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو بنایا، انسان کو پیدا کیا، تو اللہ تعالیٰ کا تعلق کائنات سے خلق و ربوبیت کا ہے، یہ ایسی بات ہے جس میں کوئی پیچیدگی اور رمزیت و ابہام نہیں! کائنات عینِ ذات ہے یا غیرِ ذات ہے، اس قسم کے مباحث کچھ "مسئلہ تقدیر" کا مزاج رکھتے ہیں جن میں بحث اور غور و فکر کرنے سے الجھنیں اور بڑھتی ہیں، جو کوئی محکمات کو چھوڑ کر "متشابہات" کے پیچھے پڑے گا، وہ ٹھوکر کھانے سے بچ نہیں سکتا۔

یہی "وحدت الوجود" کا نظریہ ہے، جس نے "نعت" میں جا کر مبالغہ کی یہ صورت اختیار کی :-

تو سلطانِ صاحب سریر آمدی　　علیٰ کُلِّ شیءٍ قدیر آمدی

اور "منقبت" میں مشرکانہ تصورات کا یہ روپ دھار لیا۔

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام　　رکھ لیا خواجہ غریب نواز

اور پھر صوفی شعراء کی شاعری کا عام رنگ یہ ہو گیا :-

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

اور

؎ پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند
؎ ایں محض وحدت است بتکرار آمدہ

یہاں تک کہ

؎ الفقر اذا تم ھو اللہ این است

علامہ شبلی نعمانی نے تصوف کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہی یہ بات لکھی ہے :—

حضرات صوفیہ کے نزدیک عالم اکبر خود انسان ہے اور فرشتہ و شیطان خود اس کی
قوتِ خیر و شر کا نام ہے ؎ در تو یک یک آرزو ابلیس تست" (شعر العجم حصہ پنجم صفحہ ۱۸۱)

"فرشتہ و شیطان" کو انسان کی قوت خیر و شر کہنا، قرآن کو چیلنج کرنا ہے !

منصور حلاج کے "انا الحق" کو بھی وحدت الوجود اور عینیت و غیریت کے مباحث نے تصوف کی "علامت" — (Symbol) بنا دیا ! یہ نعرہ توحید خالص کی اسپرٹ سے کس قدر مغایر ہے' اس میں کتنے اُلجھاوے ہیں، اگر اس میں کوئی بہت ہی دقیق رمزیت ہے' تو فتنہ کے خوف سے' اُس پر سکوت کرنا چاہیئے' اس کی اشاعت و تحسین یا تنقید آمیز تحسین کی ہرگز ضرورت نہ تھی — اس طرح —

؎ تھا انا الحق ، حق مگر اک لفظ گستاخانہ تھا

"انا الحق" ایک ایسے شخص کا قول ہے جو نہ تو قرآن' حدیث اور فقہ کا کوئی قابلِ ذکر عالم ہے' اور نہ علم و اخلاق کی روایات اُس سے وابستہ ہیں' تاریخ کے آئینہ میں منصور کی شخصیت بہت ہی دُھندلی دکھائی دیتی ہے ، مجہول اور متضاد بھی ! مگر اس کو کیا کیجیے کہ بہت کم ارباب تصوف ایسے ہونگے' جن کو منصور اور "انا الحق" سے دل چسپی نہ رہی ہو — آخر یہ مزاج اور ذوق کیا ہے کہ اُن نعروں' اصطلاحوں اور نکتوں سے خاص ربط و شغف ہے' جو متشابہات اور شطحیات کا مزاج رکھتے ہیں ۔ اور جن میں خطرات کے خاصے امکانات اور بڑی گنجائشیں پائی جاتی ہیں۔

یہی وہ "جذبہ منصوری" اور "ذوق انا الحق" ہے' جس نے انتہائی متشرع اور متبع کتاب و سنت علماء سے ایسے اشعار کی شرحیں لکھوائی ہیں' جن میں شراب نوشی اور رندی و ہوسناکی کی تبلیغ و تحسین کی گئی ہے' اور اس قسم کے رندانہ بلکہ فاسقانہ اشعار سے تصوف کے استعارے اور رموز و نکات وابستہ کئے گئے ہیں ! یہ عجیب کارگاہ ہے جس میں شیخ و برہمن ، پاکباز اور شراب خوار زنار اور تسبیح' دیر و حرم اور ایمان و کفران سب کی کھپت ہو جاتی ہے — اور ہر بات یہاں تک کہ "معشوق چار دہ سالہ" کے لئے بھی کوئی نہ کوئی استعارہ اور تاویل موجود ہے ۔

صحابہ کرام' تابعین عظام اور ائمہ حدیث و فقہ کے یہاں روحانیت کے دعوے نہیں ملتے ، مگر تصوف کی دنیا میں حضرت خضر سے مُلاقاتیں ہیں' وفات پائے ہوئے بزرگوں کی روحوں سے ہم کلامی اور اُن کی شبیہوں سے مُصافحے ہیں کسی بزرگ کو سارا کائنات اُن کی ہتھیلی کی مانند نظر آتی ہے' کوئی شیخ وقت کہتے ہیں کہ میں مقامِ فاروقیت و صدیقیت سے بھی آگے کی سیر کر آیا۔ ان تذکروں میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ ایک "صاحب حال بزرگ" (؟) نے کسی خوب صورت نوجوان چھوکرے کا مُنہ چوم لیا، اس پر لوگوں نے لے دے کی ، تو انھوں نے دہکتے ہوئے گرم لوہے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے — اہل ظاہر کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کہ فقیر کسی امرد کے لبوں اور گرم لوہے میں کوئی فرق اور امتیاز محسوس نہیں کرتا ۔

صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ تھے صحابہ کرام سے تابعین نے دینی تعلیم حاصل کی ہے' اور اُن سے تبع تابعین نے ! اسی طرح ائمہ فقہ و حدیث کے شاگرد در شاگردوں کا سلسلہ ملتا ہے — مگر دینی تعلیم و تربیت کی اس دُنیا میں "تجربے مرتب کرنے" اور پھر انہیں "پڑھنے" کا کوئی رواج نہیں ہے بلکہ اس کی کوئی ضعیف مثال بھی نہیں ملتی ! مگر تصوف میں "تجربی

کی رسم عام طور پر پائی جاتی ہے، مُریدوں کو پیر شجرے پڑھنے کی باقاعدہ اجازت دیتا ہے، زبانی بھی اور بعض اوقات تحریری بھی! آخر اس رسم کی دینی اصل کیا ہے؟ "شجروں" کے ساتھ ساتھ اس رسم کی بھی سند کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ سے درکار ہے کہ جب کوئی شخص کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے، تو مٹھائی، روپیہ اور عمامہ وغیرہ بطور نذر گزرانتا ہے۔ یہ رسمیں کسی نہ کسی درجہ میں "مباح" بھی ہوں تو بھی ان "مباحات" نے آگے چل کر بن جانے کتنی "بدعات" کے لئے زمین ہموار کی ہے! جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ائمہ علماء کرام جو کتاب و سنّت کے نہ صرف تقاضوں کو نظری طور پر پہچانتے ہیں بلکہ عملی طور پر ان تقاضوں کو پورا بھی کرتے ہیں، یہ حضرات بھی جب تصوف کی زبان بولتے ہیں، تو اُن کا لہجہ اور انداز بدلا ہوا ہوتا ہے اور وہ "بدعات" پر نکیر کرنے کی بجائے، اُن کی طرح طرح سے تاویلیں فرماتے ہیں! جذب و مستی اور عرفان و عقیدت کے اس شیش محل کے عجیب احوال ہیں۔

فنِ حدیث میں راویوں اور روایتوں پر نقد و جرح کی گئی ہے، محدثین سے روایات کے جانچنے اور پرکھنے میں تسامح ہو گیا ہے۔ تو اس تسامح کو ناقدین نے چھپایا نہیں ہے، ظاہر کر دیا ہے! راویوں کے عیوب اور کمزوریوں کو نمایاں کیا گیا ہے ——
فنِ فقہ میں استادوں کے اجتہادات کی، اُن کے شاگردوں نے مخالفت کی ہے، خاص طور سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد حق گوئی اور حق شناسی کے معاملہ میں مثالی کردار رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث و فقہ کے علوم نکھرتے اور مُجلّیٰ ہوتے چلے گئے! اور اگلوں کی غلطیاں، پچھلوں کے لئے سند نہ بن سکیں،

مگر

فنِ تصوف میں عام طور پر عقیدت کا غلبہ رہا، پیر کا کوئی ایسا قول اور فعل جس میں دینی نقطۂ نگاہ سے اضطراب اور جھول پایا جاتا تھا مُریدوں نے حُسنِ عقیدت کے سبب اُسے معرفت کے کسی نکتہ، تصوف کی کسی رمز اور علم لدنی کے کسی لطیف اشارے پر محمول کیا، کسی عقیدت مند نے بہت زیادہ آزادیٔ فکر کا ثبوت دیا، تو یہ کہہ کر سکوت اختیار کر لیا کہ ہم اس کی نہ تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب! علم فقہ کا یہ کلیہ کہ "مجتہد سے خطا بھی سرزد ہو سکتی ہے"۔

اور

بزمِ تصوف میں اس رجحان و عقیدت کی نمود —— کہ کوئی شیخ کسی خلافِ شریعت بات میں مبتلا ہو —— تو بھی اُس سے حسنِ ظن ہی رکھنا چاہیئے، بدعقیدہ نہ ہونا چاہیے! اس ذوق و مزاج، تعلیم و تربیت اور حُسنِ عقیدت کا یہ نتیجہ نکلا کہ تسامح اور غلطیوں کی تہ پر تہ جمتی چلی گئیں، یہاں تک کہ منصور حلاج اور سرمد جیسے غیر ذمہ دار اور مجہول الحال لوگ اس فن کے مشاہیر اور اکابر قرار پائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سب کے لئے عام تھی۔ یہ تو ضرور ہے کہ صحابۂ کرام نے اپنے اپنے ظرف و استعداد کے مطابق حضورؐ سے کسب فیض کیا، مگر یہ بات سو فیصدی غلط ہے کہ حضورؐ نے کسی ایک یا بعض صحابہ کو تو باطن کی تعلیم دی تھی اور باقی صحابہ کو علم ظاہر سکھایا تھا! صحابۂ کرام میں صرف حضرت حُذیفۃ الیمانی ایک ایسے صحابی ہیں جن کا لقب "صاحب السّر" ہے! مگر اس لقب کا اسرارِ باطن سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بعض منافقین کے حالات حضورؐ نے ان صحابی کو بتا دیئے تھے اس لئے وہ "صاحب السر" کہلائے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، جناب حذیفۃ الیمانی سے منافقین کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے۔

یہ بات کسی ثبوت اور مزید تحقیق کی محتاج نہیں ہے کہ سبائیوں نے جو مجوسی فکر و مزاج رکھتے تھے، حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بڑا غلو کیا، اور اُن سے الوہی صفات منسوب کیں، حضرت علیؓ نے اس قسم کے غالی بلکہ گمراہ معتقدین کو سزائیں دی ہیں! خوارج کو حضرت علی کی عداوت نے اور اہلِ رفض کو علی مرتضیٰ کی محبت نے ہلاک کیا، یہ دونوں انتہائیں ضلالت ہیں ——— بعض ایسے سبائیوں کے حالات تاریخ میں ملتے ہیں کہ وہ چادر اوڑھ کر مراقبے میں بیٹھ جاتے تھے اور اس طرح کے نعرے لگاتے تھے۔۔۔ کہ یہ بجلی نہیں چمک رہی ہے، حضرت علیؓ تجلّی فرما رہے ہیں اور یہ بادل نہیں ہیں، حضرت علیؓ کی سواری جا رہی ہے۔

نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ صحابۂ کرام نے ایسا کہا اور نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کا اعلان کیا کہ میں روحانیت اور ولایت کا امام ہوں، اگر روحانیت اور ولایت اور اُن کی امامت کوئی دینی حیثیت رکھتی ہیں تو تمام اجلّ صحابہ روحانیت و ولایت کے امام تھے، تمام صحابہ میں صرف حضرت علیؓ کو "ولایت و روحانیت" کا امام اور "اسرارِ باطن اور علم لدنی" کا عالم و عارف سمجھنا، اس اختصاص اور امتیاز کے بارے میں یہ کہا جائے کہ عجمیوں اور سبائیوں نے حضرت علی کی شان میں جو غلو کیا تھا، اُس کی جھلک یہاں بھی دکھائی دیتی ہے، تو یہ کوئی غلط بات اور تہمت نہ ہوگی! حضرت علیؓ کو چھوڑ کر باقی تمام صحابہ کی کیا یہ تنقیص نہیں ہے کہ انہیں روحانیت، ولایت، اسرارِ باطن اور علم لدنی سے کورا مانا جائے!

یہ امتیاز جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اربابِ تصوف ہی کا پیدا کیا ہوا ہے ——— پھر ولایت کے بارے میں ایک شوشہ یہ بھی چھوڑا گیا کہ وہ نبوت سے افضل ہوتی ہے اور اولیاء اللہ گناہوں سے "محفوظ" ہوتے ہیں! حالانکہ انبیاء کرام کی "عصمت" کی طرح اولیاء اللہ کی گناہوں سے "حفاظت" کوئی دینی عقیدہ نہیں ہے

ملفوظاتِ خضری اور شجرۂ عالیہ، جن پر دسمبر سنہ ۶۱ء کے "فاران" میں تبصرہ کیا گیا تھا، اُن میں بعض وہ تسامحات نظر اور فرطِ عقیدت نظر آئی، جس کا ذکر اس مضمون کی تمہید میں کیا گیا ہے ——— "فاران" کی اس تنقید کے جواب میں جو خط آیا کہ اس کے بارے میں اب ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

خط کے جواب میں معجزات اور کرامات کے ہم منکر نہیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اُسے اگر پورے مجمع نے، یعنی ایک لاکھ سے زائد صحابۂ کرام نے سُن لیا ہو اور ہر فرد تک اللہ تعالیٰ نے آپ کی آواز پہونچا دی ہو، تو یہ درست ہے، ہم اس میں شک نہیں کرتے! اور یہ بھی متعدد کتابوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہزاروں کے مجمع سے خطاب فرماتے تھے اور تمام سامعین آپ کی آواز کو سُن لیا کرتے تھے ——— مگر اس معجزانہ قدرت کے ساتھ انسانی زندگی کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں جہر کے ساتھ نماز میں قرأت فرماتے تھے، تو مدینہ کے ہر فرد تک حضورؐ کی آواز نہیں پہونچ سکتی تھی! محدثینِ کرام بھی اولیاء اللہ تھے، اُن کے حالات میں ملتا ہے کہ سامعین کے کثیر مجمع میں جب وہ احادیث بیان کرتے تھے، تو اُن کی آواز دور کے لوگوں تک نہ پہونچ سکتی تھی، اس لئے دوسرے بلند آواز لوگ ان کے الفاظ کو زور سے دہراتے تھے، تاکہ پچھلی صفوں کے لوگوں تک احادیث کے الفاظ پہونچ جائیں۔

جناب مونس زبیری اپنے خط میں لکھتے ہیں :—

"معاف کیجئے گا، میرے اس جملے سے کہ حضرت پیر صاحب، حضور غوث پاک رحمۃ اللہ

علیہ کی اجازت سے ہی بیعت فرماتے ہیں' آپ کو غلط فہمی ہو گئی' میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو بیعت کرتے وقت اجازت لی جاتی ہے' بلکہ مدعا یہ ہے کہ پیر صاحب نے بیعت کا سلسلہ حضور غوث پاک کی اجازت سے شروع کیا ہے"۔

جس تحریر پر ہم نے تنقید کی تھی' وہ یہ ہے کہ :۔

"بعد ازاں حضرت خواجہ خضر علیہ السلام اور حضور غوث الصمدانی قطب ربانی غوث الاعظم سیدنا حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز نے آپ کو بیعت اور خلافت سے سرفراز فرمایا اور حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے آپ بیعت فرماتے ہیں" ۔الخ

قارئین "فاران" اس کا فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ مونس زبیری صاحب کی تحریر کو کیا ہم نے غلط سمجھا ہے؟ اور یہ "غلط فہمی" ہم سے ہوئی ہے؟ یا جناب مصنف اپنے مفہوم اور مافی الضمیر کا اظہار ٹھیک طرح نہیں کر سکے؟ ہم ضمیروں اور دلوں کا حال نہیں جانتے، اس لئے جس کی جو تحریر ہمارے سامنے آتی ہے' اس سے وہی مفہوم اخذ کرتے ہیں' جو ان لفظوں سے نکلتا اور ظاہر ہوتا ہے۔

اب رہا خواجہ خضر اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ اور اجازتِ بیعت کا مسئلہ۔ سو اس بات میں بڑا اضطراب نظر آتا ہے! اس بارے میں ہم جو بات پہلے لکھ چکے ہیں' اس کو یہاں دہراتے ہیں ——— اگر قبر و برزخ سے اس قسم کی اجازت و رہنمائی مل سکتی تھی' تو پھر صحابۂ کرام کے ساتھ یہ معاملات ضرور پیش آتے، مثلاً حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا "باغ فدک" کے بارے میں حضور سے اس مسئلہ کی حقیقت دریافت کر لیتیں اور حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ' حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے نام پوچھ لیتے۔ اور اس طرح اُمت کو جمل و صفین کے زخم نہ اٹھانے پڑتے۔

قبر سے لے کر یومِ حشر و نشر تک کا عالم "برزخ" کہلاتا ہے' یہ عالم درحقیقت عالمِ آب و گل اور عالمِ آخرت کے درمیان ایک پردہ ہے' اس عالم میں کیا ہوتا ہے؟ اس کے جاننے کے لئے ہمیں مکلف نہیں بنایا گیا، اور اس کے بارے میں جو تھوڑا بہت علم صحیح احادیث کے ذریعہ ملتا ہے' اس پر اجمالاً یقین رکھنا چاہیئے' اس سے زیادہ علم کی تلاش و جستجو' اس کی کرید اور اس میں عقل لڑانا، خواہ مخواہ اُلجھنوں کو دعوت دینا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث ہماری نظر سے نہیں گزری' جس میں حضورؐ نے فرمایا ہو کہ میں وفات پا جانے کے بعد عالمِ برزخ سے اُمت کی تربیت اور رہنمائی کیا کروں گا۔ صحابۂ کرام کے حالات میں بھی یہ نہیں ملتا کہ کسی سخت سے سخت مشکل اور نازک موقعہ پر انھوں نے عالمِ برزخ سے حضورؐ کی رہنمائی کی تمنا کی ہو! ہاں! اللہ تعالیٰ یہ کر سکتا ہے اور ایسے واقعات مشاہدے میں بھی آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی وفات پائے ہوئے شخص کے ذریعہ خواب میں کوئی خوشخبری' انتباہ یا نصیحت و موعظت کی بات کہلوا دے! ایسے واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ جس وفات پائے ہوئے شخص سے خواب میں ہمکلامی یا بشارت اور عبرت حاصل ہوئی تھی اُس شخص کی رُوح عالم کے تمام احوال کی خبر رکھتی ہے، اور عالمِ برزخ سے لوگوں کو تربیت دینے اور مخلوق کو فیض پہونچانے کی قدرت اسے حاصل ہے! اس قسم کے واقعات سے زیادہ شغف و انہماک رکھنے سے عقیدے کی یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ وفات پائے ہوئے بزرگوں کی روحوں سے استغاثہ کیا جاتا ہے اور ان کی دہائی دی جاتی ہے!

اس ضمن میں ایک بات چلیں (بلا تشبیہ) یہ کہنی ہے کہ غیر مسلم بھی اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ سپنے (خواب) میں فلاں دیوی

جس نے درس (جلوہ) دکھایا، اور یہ یہ خوشخبریاں دیں اور فلاں مرنے کی روح نے خواب میں آکر باتیں اور نصیحتیں کیں اور یہ تک بتایا کہ مکان کے فلاں کونے میں زیور اور روپیہ گڑا ہوا ہے ــــ تو کیا دیویوں دیوتاؤں اور کافر روحوں کو بھی عالم برزخ سے فیض پہونچانے اور لوگوں کی تربیت کرنے کا منصب ملا ہوا ہے۔

سیدھی صاف اور سچی بات یہ ہے کہ وفات پائے ہوئے بزرگوں کی پاک روحوں سے ہمارا تعلق فیض و تربیت کا نہیں ہے، بلکہ ان کی کتاب و سُنّت کے مطابق بسر کی ہوئی زندگیوں میں ہمارے لئے اچھا نمونہ ہے، ہمیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمارا حشر ان نفوسِ قدسیہ کے ساتھ ہو! ہمیں ایک موحد خالص اور مومن مخلص و قانت کی طرح اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے اُمید اور طمع رکھنی چاہیے کہ وہی ہمارا مُربّی، فریاد رس اور مالک و مولا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا "اُسوۂ حسنہ" ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں، فیض، استفادہ اور تربیت و تزکیہ کے لئے حضورؐ کا یہی اُسوۂ حسنہ ہمارے لئے سب کچھ ہے! اور کتاب و سُنّت ہی کا اتباع دین کا مقصود اور حاصل ہے۔

خواجہ خضر اگر انسان تھے، تو انہیں وفات پا جانا چاہیے کیوں کہ اتنی طویل عمریں انسانوں کی نہیں ہوا کرتیں، اور وفات پائے بزرگوں سے فیض و استفادہ کتاب و سُنّت کی رُو سے ثابت نہیں ہے، اگر وہ انسان ہیں اور زندہ ہیں، تو جس طرح انبیاء کرام سب کو نظر آتے تھے اور عام انسانوں کے ساتھ رہتے سہتے تھے، یہی صورت حضرت خضر کے ساتھ بھی پیش آنی چاہیے۔ اسی قسم کے ملفوظات نے حضرت خضر کی زندگی کو ایک عجیب "معمہ" بنا دیا ہے!

صاحبِ مکتوب لکھتے ہیں:—

"حضرت علی کرم اللہ وجہ اور حضرت امام حسین علیہ السلام سے فیض پہونچنے کے واقعات اکثر تذکروں میں ملتے ہیں۔۔۔"

"تذکروں" کے یہ "واقعات" دینی اعتبار سے سند نہیں مانے جا سکتے، دینی عقائد و نظریات کا دارومدار کتاب و سُنّت پر ہے واقعات و کیفیات پر نہیں ہے!! حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت تقدیر کے سامنے انسان کی مجبوری، بےکسی، عجز و بے دست و پائی کی روشن دلیل ہے، اس واضح دلیل کے ہوتے ہوئے، حضرت حسینؓ سے اعانت و دستگیری کی تمنا رکھنا کھلی ہوئی بے دانشی ہے! خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا کے میدان میں اپنے رب اور معبود کے سوا، اور کسی کو نہیں پکارا۔ امام مظلوم نے اپنا دکھ درد اللہ تعالیٰ کے حضور بیان کیا! اور شہادتِ حق کی روشن مثال قائم کر دی۔

سطور بالا میں اس کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ سبائیت نے سب سے پہلے حضرت علیؓ کے بارے میں غلو کیا، اسی غلو کی جھلک جناب زبیری صاحب کے اس اقتباس میں دکھائی دیتی ہے، آخر حضرت علی اور حضرت حسین ہی سے فیض پہونچنے کے واقعات تذکروں میں کیوں ملتے ہیں ــــ کیا حضرت صدیق، حضرت فاروق، حضرت حمزہ، حضرت عثمان، حضرت بلال، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت حمزہ، حضرت معاذ ابن جبل اور عبداللہ ابن عمر جیسے اجلّ صحابہ کو برزخ میں بے اختیار بنا دیا گیا ہے!!

"غور طلب بات یہ ہے کہ اولیاء اللہ کے مزارات پر جو لوگ جا کر دُعا مانگتے ہیں ان کی اکثر دُعائیں کیوں قبول ہو جاتی ہیں؟"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ "زیارت قبور کے بارے میں" حدیث رسولؐ یہ بتاتی ہے کہ قبروں کی زیارت سے پہلے روک دیا

کیا تھا، پھر اجازت دی گئی، اور اس کی یہ غایت بتائی گئی :-

"فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الآخرۃ" (ابن ماجہ، مسلم وغیرہ)

(اس سے (یعنی قبروں کی زیارت سے) دُنیا کی رغبت کم ہوتی ہے اور آخرت کی یاد آتی ہے)

قبروں پر کوئی جائے، تو یہ مسنون دعا کرے :-

اَلسَّلَامُ علیکم اھل دیار قوم مومنین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون!

اس کے علاوہ قبروں پر دُعائیں مانگنے کے لئے جانے کی حضورؐ نے تلقین نہیں فرمائی! قبروں پر جاکر دعائیں مانگنے کا چونکہ کتابؐ و سُنّت میں حکم نہیں ملتا، اس لئے دعائیں مانگنے کی یہ رسم عقیدے کی اس خرابی کی حد تک پہونچ گئی کہ اللہ تعالیٰ کی بجائے خود صاحبِ قبر سے فریاد والتجا کی جانے لگی!

یہ تصور وعقیدہ کہ غوث، قطب، ابدال اور اوتاد باطنی نظام کو چلاتے ہیں، اس کے لئے مکتوب نگار کو کتاب و سنّت سے کوئی دلیل پیش کرنی چاہیئے تھی۔ دین کے معاملات میں جب کوئی کتابؐ سنّت اور آثارِ صحابہ سے دلیل لائے بغیر کسی دوسرے کا قول سند میں پیش کرتا ہے، تو وہ اپنے موقف کے کمزور اور بے اساس ہونے کا خود اعتراف کر لیتا ہے۔ یہ تصورات "باطنیت" سے ماخوذ ومستعار ہیں کہ باطنی امام وقت، دنیا کے کارخانے کو چلایا کرتا ہے۔

یہ قول کہ مملکت کے بادشاہ یا سربراہ پر سات ولیوں کا سایہ ہوتا ہے، کسی ابن الوقت، زمانہ ساز بادشاہ کے خوشامدی کا گھڑا ہوا قول ہے جس کی کوئی اصل نہیں!

جس طرح امام ضامن باندھنے کی رسم مشرکانہ رسم ہے، اسی طرح یہ عقیدہ کہ بادشاہ اور فرمانروا اولیاء اللہ کی حمایت اور حفاظت میں ہوتے ہیں توحید کے نقطۂ نگاہ سے سخت گمراہ کن عقیدہ ہے!

"۔۔۔۔ بعض آدمی بظاہر نااہل معلوم ہوتے ہیں، مگر درحقیقت وہ اہل ہوتے ہیں، جبھی تو اللہ تعالیٰ انہیں کسی خاص منصب پر فائز کرتا ہے"۔

مکتوب نگار نے جو یہ بات "کلیہ" کے طور پر بیان کی ہے کہ جو شخص بھی کسی منصب پر فائز ہوتا ہے، وہ اس منصب کی اہلیت ضرور رکھتا ہے، چاہے اس کی اہلیت ظاہری طور پہ نظر نہ آئے ـــــــ بداہۃً غلط ہے! کیا تاریخ ایسے بادشاہوں، فرمانرواؤں، وزیروں اور سپہ سالاروں اور صاحبانِ جاہ ومنصب کی نشاندہی نہیں کرتی کہ جو ان مناصب کے اہل نہیں تھے مگر طاقت کے زور سے ان مناصب پر قابض ومتمکن رہے، منصب وعہدہ اور اہلیت لازم وملزوم نہیں ہیں کہ جو صاحبِ منصب ہوگا، وہ لازمی طور پر اس کا اہل بھی ہوگا! خود پاکستان کی گزشتہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ کتنے اعلیٰ مناصب تھے جو غلط کار اور نااہل لوگوں کے قبضہ وتصرف میں آگئے تھے۔ دنیا میں علامہ اقبال کے بقول ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقابوں کے نشیمن زاغ وزغن کے قبضہ میں آگئے ہیں۔

مغربی پاکستان کے چیف سکریٹری صاحب کے بھائی صاحب کی جو مثال پیش کی گئی ہے کہ وہ گلاسوں کے ذریعہ روحوں کو بلایا کرتے تھے، اور ایک دفعہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی روح آگئی، اور وہ روح دنیوی کاموں میں مستقل طور پر انہیں مشورے دیتی رہی ـــــ اس قسم کے واقعات دینی نقطۂ نگاہ سے ناقابلِ اعتنا بلکہ ناپسندیدہ ہیں! اسی قسم کے عجیب وغریب تجربے اور مشاہدے ہیں، جنھوں نے اربابِ تصوف کے بعض "ملفوظات" کو روحانیت کی "بدرجات" اد

"طلسم ہوش رُبا" بنادیا ہے۔

"۔۔۔۔۔ ہاں یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ ان (یعنی منصور حلاج) کے خون کے قطروں
سے انا الحق کی صدا بلند ہو رہی تھی، اور ان کا جبہ دکھانے سے دریا کا تموج کیوں ختم ہوگیا"

صاحب مکتوب چونکہ تصوف کا ذوق رکھتے ہیں، اس لئے اس قسم کی مبالغہ آمیز اور یار لوگوں کی اُڑائی ہوئی باتوں کو نقد واحتساب کے بغیر قبول کر لیتے ہیں! اگر اظہارِ حق کے لئے کسی کشتۂ ظلم وستم کے خون سے صدا بلند ہوتی، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خون سے بلند ہونی چاہیے تھی!

یہ شاعروں کی کارستانی ہے کہ "انا الحق" کی تحسین کرکے اُسے بہت کچھ چمکا دیا بلکہ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غیرتِ توحید اس نعرے کو کسی عنوان برداشت نہیں کر سکتی! تصوف کا یہ ہیرو دین وشریعت کی دنیا کا مجرم ہے! اور مجرموں سے اس قسم کی کرامات منسوب کرنا کہ اُن کے جبوں اور کپڑوں کے دکھانے سے طوفان رُک جایا کرتے تھے، یا اُن کا خون بولتا اور نعرے لگاتا تھا ـــــ اس طرح خلافِ شریعت افعال پر لوگوں کو دلیر بناتا ہے۔

لغوی یا معنوی کسی نہج اور عنوان سے بھی "حاضر وناظر" غیر اللہ کی صفت نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی حاضر وناظر نہیں ہے، کوئی شخصیت چاہے وہ کتنی ہی مقدس ومحترم کیوں نہ ہو۔ ہر جگہ نہ تو موجود ہے اور نہ اُس کی معیت ثابت ہے اور نہ تمام کائنات پر اُس کا نظر رکھنا اور دیکھنا درست ہے! پیر دیول شریف صاحب کے بارے میں جو یہ کہا گیا تھا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "حاضر وناظر" ہونے پر دلائل پیش کئے تھے ـــــ اس بات پر "فاران" میں تنقید کی گئی تھی!

"شجرۂ عالیہ قادریہ" کے پڑھنے کو "تلاوت" اور اس کی قیمت کے لئے جو "ہدیہ" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، اُس پر جناب مونس زبیری نے لغات کے حوالوں سے جو باتیں کہی ہیں، وہ درست ہیں! مگر انھوں نے کتاب عربی زبان میں نہیں، اُردو میں لکھی ہے اور اُردو میں "تلاوت" صرف قرآن شریف کے لئے بولا اور لکھا جاتا ہے! اور پاکستان اور ہندوستان میں قرآن کریم کے مصاحف پر قیمت کی بجائے ہدیہ لکھا ہوتا ہے، اور اسی طرح بولتے بھی ہیں! "شجروں" اور "ملفوظات" کی کتابوں سے "تلاوت" اور "ہدیہ" کی تعظیمی اصطلاحات منسوب کرنا، غلو عقیدت کی ناپسندیدہ مثال ہے۔

پیر دیول شریف صاحب کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کسی کے آگے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا، وہ بطنِ مادر ہی سے تعلیم یافتہ پیدا ہوئے ہیں ـــ ۔ تو اتنا وقت اور روپیہ کس کے پاس ہے کہ کوئی پیر صاحب کے گاؤں اور قرب وجوار کے علاقہ میں جاکر اس کی تحقیق کرتا پھرے ـــــ ہم تو اس ضمن میں صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "اُمّی" تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے پڑھائے ہوئے تھے، مگر آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، لیکن پیر صاحب دیول شریف ایسے "اُمّی" ہیں جو لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں۔

پیر صاحب دیول شریف سے ہم ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں، اُن کے کچھ حالات بعض لوگوں کی زبانی سُنے ہیں! ہمارے سامنے اُن کے ملفوظات آئے ہیں، اور یہی کتاب اُن سے غائبانہ تعارف کا ذریعہ بنی ہے! "ملفوظات خضری" اور "شجرۂ عالیہ قادریہ" کو پڑھ کر، ہم نے یہ تاثر قبول کیا ہے کہ پیر صاحب موصوف اس "خانقاہی تصوف" کے شیخ اور داعی ہیں، جو خوابوں کی دُنیا، مکاشفوں اور رموز واسرار کا تصوف ہے!

پیر صاحب موصوف کی زندگی کا آغاز ہی کرامات سے ہوتا ہے، وہ "تعلیم یافتہ" پیدا ہوئے اور کسی سے کچھ سیکھے بغیر لکھنا

پڑھنا جان گئے ـــــ اُن کو خواجہ خضر اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بیعت کیا، اور خلافت سے سرفراز فرمایا ـــــ
انھوں نے حالتِ وجد میں خدا کا نور دیکھا، تمام انبیاء اور کامل اولیاء کا دیدار کیا، فرشتوں کے لشکر دیکھے، تمام زمین و زمن اور
تمام خشک و تر کو دیکھا ـــــ پاکستان میں جو مارشل لاء آیا ہے، وہ پیر صاحب کے "خاص وظیفہ کی برکت سے آیا ہے" ہیبت
یہ پیر صاحب کے دعوے اور احوال و کیفیات ہیں! ـــــ اُن کے مریدین اور معتقدین پیر صاحب موصوف کو "مقامِ قیوم"
پر فائز سمجھتے ہیں اور وہ آسمانوں سے تختیاں اُترتی ہوئی دیکھتے ہیں جن میں سے ایک تختی پر پیر صاحب کا نام، ان لفظوں میں
لکھا ہوتا ہے ـــــ

"محمد عبدالمجید امام رب العلمین"۔

پیر صاحب قبلہ کے ان مکاشفات اور دعووں سے مُریدین اور معتقدین کا اسی قسم کا ذہن اور مزاج بننا چاہیے، جس کی ایک جھلک
ابھی ابھی دکھائی جا چکی ہے!

پیر دیول شریف کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی ہے اور حضورؐ پیر صاحب کے بارے میں توصیفی
کلمات ارشاد فرماتے ہیں ـــــ اور ـــــ

"پھر میں (یعنی پیر صاحب دیول شریف) ڈاکٹر زاہد حسین قریشی، ملک عطا محمد نون،
ملک لقا محمد نون، سلطان صاحب، صدرِ مملکت جنرل محمد ایوب خاں اور میجر امیر حمزہ کو
پیش کرتا ہوں کہ یہ **صالحین** میں سے ہیں، حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں، ان لوگوں کو حوض کی
سیر کراؤ"

ہائے! چودھویں صدی ہجری میں "صالحیت" و تقویٰ کا معیار ہی بدل گیا۔ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟....

ـــــ اُمت کو ایسے شیوخ، درویشوں اور اربابِ حال کی ضرورت ہے، جو کسی دعوے کے بغیر کتاب و سنت
کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے تزکیۂ نفس کی خدمت انجام دیں۔ جن کی زبان، بیان ملفوظات اور سیرت و کردار میں صحابہ
کرام کی زندگیوں سے مطابقت پائی جاتی ہو، جو حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی طرح اپنے غالی معتقدین سے بیزاری کا اظہار
کریں، جن کی تعلیمات کتاب و سنت کا مزاج رکھتی ہوں اور ان تمام صفات کے ساتھ ساتھ ان میں اتنی جرات بھی ہو کہ صاحبِ
جاہ و اقتدار کو اُن کی غلطیوں پر ٹوک سکیں! اور اُن کو "صالحیت" اور "تقویٰ" کے سارٹیفکٹ عطا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیں!

زمین و زمان اور خشک و تر کی سیر کرنے کے واقعات ایک مسلمان کے لئے جاذبِ توجہ نہیں ہو سکتے، وہ تو یہ دیکھنے کی تمنا
رکھتا ہے کہ کس کے ذریعہ کون سی بُرائی مٹی، اور کون سی نیکی قائم ہوئی، کس نے دین کو قائم کرنے کے لئے کیا قربانی دی۔ بدعت
کا مٹانا اور سُنت کا زندہ اور قائم کرنا ہی سب سے بڑی کرامت ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ اُن تمام مکاشفات اور ملفوظات کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے، جو طرح طرح کی اُلجھنیں پیدا کرتے
ہیں، اور جہاں دعووں اور کرامتوں سے سارا کام چلتا ہے ـــــ اُن کی جگہ کتاب و سُنت کی زیادہ سے زیادہ اشاعت
اور تبلیغ کی جائے، کہ یہی اصل دین ہیں!

وارث سرہندی

غالباً گزشتہ سال اپریل یا مئی کی بات ہے کہ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور میں آغا صادق کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا ایک مصرعہ یوں تھا! ؎

سسکتی کلیوں کو لب تشنہ جس نے دیکھا ہے

اس غزل کا شائع ہونا تھا کہ "لیل و نہار" میں لامتناہی بحث چھڑ گئی کہ "لبِ تشنہ" صحیح ترکیب ہے یا غلط ؟ متعدد اصحاب نے اس کی موافقت و مخالفت میں لکھا، لیکن معاملہ سلجھنے کی بجائے زیادہ اُلجھ گیا اور آخر یہ بحث غیر منفصل صورت میں ختم ہو گئی بظاہر اس بحث میں مخالفین کا پلّہ بھاری رہا، کیوں کہ موافقین "لب تشنہ" کی سند میں اساتذہ کے کلام سے نظائر پیش کرنے سے قاصر رہے۔ درصل اسناد کی تلاش بڑا محنت طلب کام ہے اور بسا اوقات ہم ایک بات کو صحیح سمجھنے کے باوجود اس کے ثبوت میں سند پیش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

میں نے یہ مضمون اسی زمانہ میں لکھا تھا، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یہ شائع نہ ہو سکا اور میں بھی مسودہ کو رکھ کر بھول گیا۔ اب اتفاقاً یہ مسودہ دستیاب ہوا تو خیال ہوا کہ اس کو صاف کر کے "فاران" کی نذر کر دوں تاکہ "لب تشنہ" کی صحیح حیثیت نمایاں ہو جائے اور جن اصحاب کو اس نامکمل بحث سے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو' اس کا ازالہ ہو جائے۔

آگے بڑھنے سے قبل یہ مناسب ہو گا کہ میں اس بحث کا لب لباب بیان کر دوں تاکہ اس کے پس منظر سے واقف ہو کر قارئین اس بحث کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال سکیں۔

جب آغا صادق کی یہ غزل شائع ہوئی تو لائل پور کے ایک شاعر صاحب (سلیم بے تاب) نے اعتراض کیا کہ "لب تشنہ" غلط ترکیب ہے۔ صحیح ترکیب "تشنہ لب" ہے۔ اس کے جواب میں وحید الحسن ہاشمی نے اس ترکیب کو صحیح قرار دیتے ہوئے، سند میں مرزا غالب کا یہ مصرعہ پیش کیا ؎ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا۔

جواب الجواب میں متعدد خطوط شائع ہوئے۔ ایک صاحب نے ہاشمی صاحب کی تائید کرتے ہوئے 'سحر دم' کی نظیر پیش کی جو بصورت مستقیم دم سحر ہے۔ لیکن مخالفت میں زیادہ خطوط شائع ہوئے۔ قاضی محمد علیم، شمس نعمان، نجمہ ناہید اور سلیم بیتاب نے قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ قاضی صاحب رقمطراز ہیں :۔ "رہا لب تشنہ کا معاملہ تو غالب کا یہ مصرعہ :۔ ؎

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ان اشعار میں نہیں جن کی تراکیب کی تقلید اردو کے موجودہ ارتقائی دور میں مستحسن قرار دی جائے۔ اگر یہ کہنا درست نہیں تو یہ ضرور ہے کہ اساتذہ کی اس قسم کی غیر معروف تراکیب کا موجودہ دور میں استعمال محلِ نظر ہے۔"

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب "لب تشنہ" کو درست تو سمجھتے ہیں لیکن موجودہ ارتقائی دور میں اس کا استعمال مستحسن خیال نہیں فرماتے۔ لیکن کیوں ؟ کیا ترقی کے یہ معنی ہیں کہ زبان کا دائرہ تنگ کر دیا جائے ؟ اگر نہیں' بلکہ اس کے برخلاف

ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ زبان میں وسعت پیدا کی جائے تو پھر "لب تشنہ" کو غیر مستحسن قرار دینے کے لئے ارتقائی دور کا سہارا کیوں لیا جائے؟ اگر ارتقائی دور ہی کو معیار ٹھیرا جائے تو اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس ترکیب کو صحیح تسلیم کر لیا جائے بلکہ زبان میں اور زیادہ الفاظ و تراکیب کو داخل کیا جائے تاکہ زبان میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا ہو سکے۔ اور ایسا ہوا بھی ہے کہ موجودہ دور میں اردو میں ایسے الفاظ و تراکیب شامل ہو چکے ہیں، جن کا کچھ مدت پہلے پتہ بھی نہ تھا۔ جب ہم ان کو قابلِ اعتراض خیال نہیں کرتے تو "لب تشنہ" کا کیا قصور ہے کہ اس کو بارہ پتھر باہر کر دیا جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کی صحت پر ان کو خود بھی یقین نہیں، کیوں کہ وہ آگے چل کر اپنی بات کی خود ہی تردید کرتے ہوئے اس کو غیر معروف قرار دے کر اس کے استعمال کو محلِ نظر بتاتے ہیں۔ قاضی صاحب کی تحریر سے تذبذب کا اظہار ہوتا ہے اور اس مسئلہ کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

سلیم بے تاب نے شمس نعمانی اور نجمہ ناہید نے کھل کر بات کی ہے اور واضح طور پر اس ترکیب کو غلط قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ترکیب اور اسی قبیل کی دوسری تراکیب، بالاضافت تو درست ہیں لیکن بلا اضافت غلط ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ ترکیب کسی شاعر یا نثر کے کلام میں نہیں دیکھی۔ حالانکہ یہ دلیل ہی سرے سے غلط ہے۔ یہ قطعاً درست نہیں کہ جو چیز ہماری نظر سے نہ گزری ہو ہم اس کے وجود ہی سے انکار کر دیں۔ عدم واقفیت کی صورت میں سکوت لازم ہوتا ہے۔ جب تک کسی معاملے کے تمام پہلو سامنے نہ ہوں کوئی فتویٰ صادر کر لینا کسی طرح بھی درست نہیں اور ان کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انھوں نے فارسی اور اردو کے تمام ادبا و شعرا کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ محترمہ نجمہ ناہید صاحبہ نے تو اس کو بدعت قرار دیا ہے اور نظیر طلب کی ہے۔ اگر یہ بدعت ہے تو تمام اساتذہ بدعتی ہیں اور ہم خود بھی ایسی بدعت سے مبرا نہیں ہیں۔ رہا نظیر پیش کرنے کا معاملہ تو اس مضمون میں ان کو ایک دو نہیں متعدد نظائر ملیں گے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جملہ معترضین نے اپنے دعوےٰ کی تائید میں جتنے اشعار پیش کئے ہیں ان میں "تشنہ لب" استعمال ہوا ہے حالانکہ "تشنہ لب" مسئلہ متنازعہ نہیں اور نہ کسی نے "تشنہ لب" کی صورت سے انکار کیا ہے۔ ایک مسلمہ بات کی تائید میں اسناد و دلائل پیش کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ اگر وہ "لب تشنہ" کے رد میں اساتذہ کے اقوال پیش کر سکتے تو ایک بات تھی۔

مجھے سلیم بیتاب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "تشنہ لب" اور "سحر دم" ایک ہی قبیل کی تراکیب نہیں، کیونکہ "سحر دم" دو اسموں یعنی سحر اور دم سے مل کر بنی ہے اور تشنہ لب ایک صفت اور ایک اسم یعنی تشنہ اور لب سے مل کر بنی ہے، ایسی صورت میں "سحر دم" "لب تشنہ" کے لئے سندِ جواز نہیں بن سکتی۔ لیکن سلیم صاحب کا یہ فرمانا درست نہیں کہ "صفت اور اسم کی مرکب تراکیب (اسم فاعل یا موصوف ترکیبی وغیرہ) میں عموماً صفت پہلے اور اسم بعد میں لکھا اور بولا جاتا ہے، جیسے بخوردہ آشفتہ سر، نیم جاں، خوش آہنگ، پاک دامن اور تشنہ لب وغیرہ۔ اگر ہم ان کو رو خوب، سر آشفتہ، دامنِ پاک یا لب تشنہ لکھیں گے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ ہماری لاعلمی کی دلیل ہوگی اور جہاں تک غالب کے مصرعہ کا تعلق ہے، اس میں "لب تشنہ" مجرد نہیں آیا بلکہ اضافت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ نیز مصرعہ مذکور میں اضافت کی وجہ سے "تشنہ لب" باندھنا ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ اگر مصرعہ یوں ہوتا کہ ۔۔۔۔ "میں تشنہ لب تقریر بھی تھا" تو اس سے مصرعہ کا مفہوم ہی بدل جاتا۔ اضافت کی اس مجبوری کی وجہ سے غالب کو "لب تشنہ تقریر" کہنا پڑا۔ ورنہ مجرد کی صورت میں وہ بھی تشنہ لب ہی لکھتے۔"

بیتاب صاحب کے خط کے اس اقتباس سے مندرجہ ذیل امور سامنے آئے ہیں، جو تنقیح طلب ہیں:۔

(۱) کیا غالب نے ضرورت شعری سے مجبور ہو کر یہ غلط ترکیب استعمال کی ؟

(۲) کیا مقلوب تراکیب اضافت کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں اور بلا اضافت ان کا استعمال غلط ہے ؟

(۳) کیا صفت اور اسم سے مرکب تراکیب یعنی اسمائے صفات مرکبہ مستقیم صورت میں ہی درست ہیں یعنی صفت کا اسم سے مقدم ہونا ضروری اور صورت بالعکس بالکل غلط ہے ؟

۱۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضرورت شعری کسی غلط لفظ یا ترکیب کے استعمال کو جائز قرار دے سکتی ہے ؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ ضرورت شعری سے صرف اتنا تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے، جس کا جواز موجود ہو مثلاً اشباع سے حرکت کو طویل کر دینا، تخفیف و تسکین کرنا علیٰ ہذا القیاس حسب جواز خفیف سا تغیر کیا جا سکتا ہے۔

غالب اس معاملہ میں بہت محتاط تھے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس کو وہ غلط سمجھتے ہوں یا جس کا جواز موجود نہ ہو۔ وہ اپنے اصول پر اس قدر سختی سے کاربند تھے کہ روش عام کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ مثلاً صل علےٰ کے مجرد استعمال کو وہ غلط سمجھتے تھے۔ کیوں کہ قاعدہ کی رُو سے جار بلا مجرور نہیں آسکتا۔ چونکہ علیٰ حرف جار ہے اس لئے جب تک اس کے بعد مجرور نہ آئے اس کا استعمال صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے انھوں نے اس کو کبھی نہ خود استعمال کیا اور نہ اپنے کسی شاگرد کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ بقول حالی مرحوم اگر ان کا کوئی شاگرد صل علےٰ بلا مجرور استعمال کرتا تو وہ اصلاح کرتے وقت اس کو کاٹ کر " نام خدا " یا کوئی اور مناسب لفظ اس کی جگہ رکھ دیتے۔ حالانکہ ان کے معاصرین بلا تامل اس کو استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ذوق معرکہ آرا سہرے کا ایک مصرعہ ہے ؎

وہ کہے صل علےٰ یہ کہے سبحان اللہ

جو شخص صحت لفظی کا اتنا خیال رکھے اور اس معاملہ میں انتہائی محتاط اور سخت گیر ہو۔ اس کے متعلق یہ گمان کرنا کہ اس نے ضرورت شعری سے مجبور ہو کر غلط ترکیب استعمال کی۔ سوئے ظن بلکہ سراسر ناانصافی ہے۔ اس لئے غالب نے "لب تشنہ" کو استعمال کیا ہے تو صحیح سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ اگر وہ اس کو غلط سمجھتے تو ہرگز استعمال نہ کرتے۔ ضرورت شعری قادر الکلام شاعروں کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ نو آموز اور مبتدی حضرات کو یہ پہاڑ نظر آئے تو الگ بات ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ غالب نے "لب تشنہ" کو ضرورت شعری کے تحت استعمال نہیں کیا بلکہ علیٰ حالہ ایک صحیح ترکیب سمجھ کر استعمال کیا ہے۔

۲۔ بیتاب صاحب کو اصرار ہے کہ ترکیب مقلوب بلا اضافت استعمال نہیں ہو سکتی اور غالب نے بھی مصرعہ مذکور میں بالاضافت استعمال کی ہے۔ یہ بیتاب صاحب کا محض ادعا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ترکیب مقلوب و مستقیم دونوں صورتوں میں استعمال ہو سکتی ہے اور مقلوب تراکیب عموماً بلا اضافت ہی استعمال ہوتی ہیں۔ غالب نے اپنے مذکورہ مصرعہ میں "لب تشنہ" کو بفک اضافت استعمال کیا ہے یعنی "لب تشنہ" مرکب توصیفی نہیں جس میں لب موصوف اور تشنہ صفت کی حیثیت سے آئے ہوں بلکہ یہ اسم صفت مرکب بہ ترکیب فاعلی بفک اضافت بصورت مقلوب استعمال ہوا ہے۔ اگر بیتاب صاحب کا مطلب اضافت سے پورے مرکب کی اضافت سے ہے یعنی جہاں مکمل ترکیب مقلوب مضاف کی حیثیت سے آئے۔ تو ایسی مثالیں بھی پیش کی جائیں گی جن میں اس قسم کی اضافتیں بھی نہیں ہونگی۔ حالانکہ اس قسم کی اضافت سے ترکیب میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا اور نہ اس سے ترکیب کی حیثیت میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ یہ ایک لایعنی بحث ہے۔ اس سلسلہ کی اسناد بھی تیسری تنقیح کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی اسناد میں شامل ہونگی، کیونکہ دونوں کا موضوع مشترک ہے۔

۳۔ اب آخری اور سب سے اہم بات جو تنقیح طلب ہے وہ یہ ہے کہ کیا ایسی تراکیب جو صفت اور اسم سے مرکب ہیں

اور اُن سے اسم فاعل یا مفعول کے معنی مستفاد ہوں یعنی اسمائے صفات مرکب بہ ترکیب فاعلی و مفعولی میں صفت پہلے آنی ضروری ہے یا نہیں۔ حق یہ ہے کہ ایسی تراکیب دونوں طرح درست ہیں ان میں صفت مقدم بھی ہو سکتی ہے اور موخر بھی۔ بعض تراکیب ایسی ہیں جو بتقدیم اسم و بتاخیر صفت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں، بعض صورت بالعکس میں اچھی معلوم ہوتی اور بعض دونوں طرح خوشنما لگتی ہیں۔ اساتذہ نے اپنے جمالیاتی ذوق سے کام لے کر بعض تراکیب کو صرف مستقیم صورت میں استعمال کیا ہے، بعض کو صرف مقلوب صورت میں اور بعض کو دونوں طرح۔ اگر ہم محض یہ دیکھ کر کہ اساتذہ نے بعض تراکیب مثلاً خوبرو، نیم جاں، خوش آہنگ اور پاک دامن وغیرہ کو بصورت مستقیم یعنی بتقدیم صفت و بتاخیر اسم ہی استعمال کیا ہے اور بصورت مقلوب استعمال نہیں کیا، یہ حکم لگائیں کہ اس کے برخلاف صورت بالکل غلط ہوگی اور کسی ترکیب کو بصورت مقلوب یعنی بتقدیم اسم بتاخیر صفت استعمال کرنا ناجائز ہوگا۔ تو ہمارا یہ فیصلہ صحیح نہ ہوگا۔ کیوں کہ کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے سے پیشتر اس کے تمام پہلوؤں پر نگاہِ غائر ڈالنا ضروری ہے۔ اگر ایک ہی پہلو کو مدنظر رکھ کر کوئی فیصلہ دیا جا سکتا ہے تو میں اس مسئلہ کے دوسرے پہلو کو مدنظر رکھ کر یہ فیصلہ دے سکتا ہوں کہ ہر اسم صفت مرکب بتقدیم اسم و بتاخیر صفت ہی صحیح ہے اور اس کے برعکس غلط ہے کیوں کہ اساتذہ نے بعض تراکیب مثلاً سر بستہ، دل گرفتہ، دست بستہ، سر زدہ وغیرہ کو بتقدیم اسم و بتاخیر صفت ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن میں یہ فیصلہ نہیں دوں گا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس طرح مسئلہ کا صرف ایک ہی پہلو سامنے آتا ہے اور دوسرے پہلو نظر سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ قاعدہ کی رو سے ہر ترکیب مقلوب و مستقیم دونوں صورتوں میں استعمال ہو سکتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اساتذہ نے اپنے ذوق جمالیات سے کام لے کر بعض تراکیب کو مقلوب صورت میں استعمال کیا اور بعض کو مستقیم صورت میں "لب تشنہ" ایسی ترکیب ہے جس کو اساتذہ نے مستقیم و مقلوب دونوں صورتوں میں استعمال کیا ہے۔

چونکہ معترضین تقدیم صفت و تاخیر اسم کے حق میں ہیں یعنی وہ تراکیب مستقیم کو صحیح سمجھتے ہیں اس لئے تراکیب مستقیم کی تائید میں اسناد پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے میں صرف ایسی مثالیں پیش کروں گا جن میں اسم مقدم اور صفت موخر ہو اور یہ اسم صفت مرکب بفک اضافت استعمال ہوا ہو۔

سب سے پہلے میں "لب تشنہ" کی سند پیش کروں گا کیوں کہ وجہ اختلاف یہی ترکیب ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچہ میں "لب تشنگی" کا استعمال کیا ہے اور اس کی سند میں ایک شعر بھی پیش کیا ہے۔ جس کا اقتباس یہ ہے: "جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح دھتیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا چشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا۔

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما"

لب تشنگی، لب تشنہ سے مشتق ہے۔ فارسی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی اسم صفت مرکب ہائے ہوز پر ختم ہو تو اس سے اسم کیفیت بنانے یا مصدری معنیٰ پیدا کرنے کے لئے ہائے ہوز کو دور کر کے "گی" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً دل گرفتہ سے، دل گرفتگی، دل زدہ سے دل زدگی بلند حوصلہ سے بلند حوصلگی۔ اسی طرح "لب تشنہ" پر "گی" بڑھا کر "لب تشنگی" اسم کیفیت بنا لیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ مولانا آزاد مرحوم صرف مذہبی و سیاسی رہنما ہی نہ تھے بلکہ عربی، فارسی اور اردو کے ماہر اور صاحب طرز انشا پرداز بھی تھے اور پھر پھر انھوں نے اپنی تائید میں ایک فارسی شعر بھی پیش کر دیا ہے، جس کے بعد کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن میں اسی پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ مستند فارسی شعرا کے کلام سے اسناد پیش کروں گا تاکہ بحث کا کوئی پہلو

تشنہ نہ رہے۔ فارسی شعراء کا التزام اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ اور اس قسم کی دوسری تراکیب فارسی ہیں۔ اور فارسی تراکیب کو پرکھنے کا معیار فارسی شعراء کا کلام ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مرزا صائب کا شعر ملاحظہ فرمائیے اس میں ملب تشنہ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور بلا کسی قسم کی اضافت کے ؎

آبے جز آب تیغ کہ از چشم شور خلق
لب تشنہ را کہ ہ نشود در گلو کجاست

اب چند ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں اسمائے صفات مرکب بصورت مقلوب یعنی بتقدیم اسم و بتاخیر صفت استعمال ہوتے ہیں۔

دل سادہ بجائے سادہ دل کی سند میں شیخ سعدیؒ شیرازی کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

یکے راچہ سعدیؒ دل سادہ بود
کہ با سادہ روئی درا فتادہ بود

دل مردہ بجائے مردہ دل مرزا صائب کے کلام میں دیکھئے۔

دل مردہ کہ سر بگریبان خواب برد
کافور ساخت یاسمن آفتاب را

دل افتادہ بجائے افتادہ دل کلام حافظ شیرازی میں ملاحظہ فرمائیے ؎

اجرہا باشدت اے خسرو شیریں دہناں
گر نگاہے سوئے فرہاد دل افتادہ کنی

دل گراں بجائے گراں دل کی سند میر معصوم وجدان کے کلام میں دیکھئے ؎

بے رُخت بادہ نہ کردیم بجام
دل گراں شیشہ (؟) برخاست

لب شیریں بجائے شیریں لب کی سند محمد قلی سلیم کے شعر میں دیکھئے ؎

شراب با تو چہ تلخی دہد کہ از لب تو
بہ جائے بادہ کہ گردد پیالہ لب شیریں

چشم دریدہ کی سند میں حافظ شیرازی کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

شوخی نرگس نگر کہ پیش تو بشکفت
چشم دریدہ ادب نگاہ ندارد

یہاں چشم دریدہ بالاضافت یعنی مرکب توصیفی کی حیثیت سے استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ بلا اضافت اسم صفت مرکب بمعنی گستاخ نرگس کی صفت کے طور پر آیا ہے۔

چشم گشتہ اسم صفت مرکب مقلوب بمعنی کج نظر کا استعمال عنصری کے شعر میں دیکھئے ؎

ہجا کردست بنہال شاعراں   قریع آں کور طعوں چشم گشتہ

سرگزشتہ کی سند میں مرزا صائب کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

از سرگزشتہ اند کریماں دریں زماں
کو سرگزشتۂ کہ زدستار بگزرد

سرزدہ کی سند میں بھی صائب ہی کا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

صائب چو ماہ سرزدۂ بچم بخویشتن
ہوسے اگر بسہو شود پائمال من

مرزا شفیع اثر اور ملا شرحی قزوینی نے بھی سرزدہ کو بمعنی ملامت کردہ استعمال کیا ہے ؎

دی شب رقیب سرزدہ آمد بہ بزم یار
من بادہ خوردم او عرقِ انفعال خورد (شفیع اثر)

بحسبِ خوئے تو شرمندۂ جہاں شدہ ام!
زبسکہ سرزدہ رفتم بہ منزلِ ہمہ کس (ملا شرحی قزوینی)

سربستہ کی سند مرزا صائب اور حافظ شیرازی کے کلام میں دیکھئے ؎

چناں کز شیشۂ سربستہ آید بادہ در ساغر
بہ آں تمکیں در آغوشِ من آں طناز می آید (صائب)

سخن سربستہ گفتی با حریفاں
خدا را زیں معما پردہ دارد (حافظ)

سر بریدہ کی سند میں حاجی محمد جان قزوینی کا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

بر صفحۂ زمانہ سخن راز بیکسی
بر سر بریدہ چو قلم پائمال کرد

سرگرفتہ کی سند میں حافظ شیرازی کے شعر میں دیکھئے ؎

آں شمع سرگرفتہ دگر چہرہ برفروخت
واں پیر سالخوردہ جوانی ز سر گرفت

سرپوشیدہ بجائے پوشیدہ سر کی سند میں میرزا صائب کا شعر سنیئے ؎

دراں محفل کہ مرداں را کلاہ از ترکِ سر باشد
ز سرپوشیدگانست آنکہ با دستار می رقصد

سرشکستہ کی بجائے شکستہ سر کی سند ظہوری کے کلام میں دیکھئے ؎

دہی با شکرش قند اگر کند دعویٰ
بہ سر شکستہ کشندش بہ کوچہ و برزن

سرسبز بجائے سبز سر کا استعمال مرزا صائب کے کلام میں ملاحظہ کیجئے ؎

دریں چمن سر سبزاں برہنہ پادارد
کہ چار موسم چوں سرو یک قبا دارد

دل گرفتہ بجائے گرفتہ دل کی سند میں مفید بلخی کا شعر سنیئے ؎

دُور از تو نیست طاقت دیدار گل مرا
نخل منوبرم زچمن دل گرفتہ ام

اجل گردیدہ بجائے گردیدہ اجل کی سند حکیم زلالی کے شعر میں دیکھئے ؎

ملک از گفتۂ دلبر خجل شد
اجل گردیدہ تقصیرش بحل شد

لب خندہ بجائے خندہ لب کی سند میں ملا سعید اشرف کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

دیدن روئے تو زیبندہ بود آئنہ را
بہ تماشائے تو لب خندہ بود آئنہ را

مندرجہ بالا تمام نظائر ان اسمائے صفات مرکبہ سے متعلق ہیں۔ جن میں اسم مقدم اور صفت موخر ہے اور بلکسر اضافت استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی ترکیب وہی ہے جو "لب تشنہ" کی ہے۔ ان نظائر سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ "لب تشنہ" ایک صحیح ترکیب ہے اور اس کا جواز ضرورت شعری کا محتاج نہیں۔ بات وہی ہے جو میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ اسمائے صفات مرکبہ صفت کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ یعنی مستقیم و مقلوب دونوں صورتوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی ترکیب کو غلط قرار دینے سے پہلے تحقیق و تفحص سے کام لینا ضروری ہے۔ زبان و بیان کے بہت سے گوشے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن تک ہماری نظر نہ پہنچی ہو، اس لئے ان کے وجود ہی سے انکار کر دینا کسی طرح درست نہیں۔ اس کے لئے بڑے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے

—×—

خواجہ راحت حمید

فتنۂ تاتار کا خاتمہ ـ معرکۂ عین جالوت

تاتاریوں نے ایشیا کا بیشتر حصہ اور آدھا یورپ فتح کر لیا تھا اور اُن کی سلطنت بحرِ رُوم سے لیکر بحر الکاہل تک اور کوریا سے پولینڈ تک قائم ہو چکی تھی۔

دنیائے اسلام اس زمانہ میں فرقہ بندی کا بُری طرح شکار ہو رہی تھی۔ یہ فرقہ بندی شروع میں سیاسی اختلافات اور بعض معاشی اور اقتصادی شکایتوں کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ لیکن بعد میں اس کو مذہبی رنگ، دیدیا گیا۔ حکومت وقت اُن فرقوں پر تشدد کرتی جن کا مسلک حکومت کے مفاد سے ٹکراتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ فرقے حکومت کے دشمن ہو جاتے اور خانہ جنگی کی بنیاد قائم ہو جاتی۔

بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کی خلافتوں کو اُن فرقوں کی تائید حاصل تھی جو حکومتوں کے ہم خیال تھے اور جن کو سرکاری فرقہ کہنا چاہیے۔ دوسرے فرقے ان کے مخالف اور دشمن تھے۔ اس چیز نے ان خلافتوں کو کمزور کر دیا۔ غرض یہ کہ تمام دنیائے اسلام میں اس وقت انتہائی انتشار پھیلا ہوا تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ تاتاری غالب آگئے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام دنیا سے مٹ جائیگا۔ ایران اور عراق مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ بغداد کی خلافت ختم ہو چکی تھی۔ شام پر بھی تاتاری قابض تھے۔ ایک مصر باقی تھا۔ اگر مصر کو بھی تاتاری فتح کر لیتے تو شمالی افریقہ کے لئے ان کا راستہ صاف ہو جاتا اور اسپین اور سسلی کی مسیحی فوجیں تاتاریوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیتیں۔

تاتاریوں کا اصلی وطن منگولیا تھا۔ وہ خانہ بدوش تھے اس لئے مہذب دنیا کے شہروں میں بسنے والے آدمیوں سے اُن کو قدرتی طور پر عناد تھا۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر شکار کرنا اور لڑنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں چنگیز خاں نے تاتاریوں کی تنظیم کر کے ایک فوجی حکومت قائم کی۔ تاتاری اگرچہ جاہل تھے لیکن جنگ کی تنظیم خوب جانتے تھے اور چنگیز خاں تجارت انتظامِ ملکی اور صنعت و حرفت کی اہمیت کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ تجارت کے لئے سہولتیں پیدا کرتا اور تجارتی قافلوں کے راستوں کی حفاظت کرتا۔ سڑکوں اور پُلوں کی مرمت کراتا اور رسل و رسائل اور ڈاک کا اس نے اچھا انتظام رکھا۔ اس نے مفتوح قوموں میں سے بہت سے اہلِ کار (کلرک) مقرر کئے اور تاتاریوں کے رسم و رواج اور قانون کو قلم بند کرایا۔ چنگیزی قانون کو یساق کہتے ہیں۔ تیمور لنگ جو ہلاکو کے بھائی قبلئی خاں کا پوتا تھا اسی یساق پر عامل رہا اور بابر نے فتح ہند کی بنیاد اسی یساق پر رکھی۔

چنگیز خاں نے مفتوحہ قوموں میں سے کاریگر اور دستکار تلاش کئے جن سے کثیر مقدار میں وہ ہتھیار اور سامان جنگ بنواتا تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو خوب تربیت دی۔ حتیٰ کہ وہ اس دور کی سب سے زیادہ منظم فوج بن گئی۔ اس کے ساتھ اس نے مفتوح قوموں میں ہیبت اور خوف پیدا کر دیا۔ اگر کوئی شہر آسانی سے ہتھیار ڈال دیتا تھا تو اس کے باشندوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا لیکن اگر مقابلے کے بعد مفتوح ہوتا تو سارے باشندوں کو شہر سے ایک وسیع میدان میں ہانک کر نہایت باقاعدگی سے تہ تیغ کر دیا جاتا اور ہر تاتاری سپاہی کے

لیے حکم ہوتا کہ وہ اتنے آدمی قتل کرے۔ ایسا قتل وغارت دنیا میں کبھی نہیں ہوا۔ ۱۸ اگست سنہ ۱۲۲۷ء کو چنگیز خاں فوت ہوا اور اس کے بعد تیس سال تک تاتاریوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور دنیا کے بڑے حصہ میں تاتاریوں کی دہشت پھیل گئی۔ تاتاریوں کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ ایک ہی وقت میں تاتاری فوج ایک طرف چین میں قتل وغارت کر رہی تھی۔ دوسری جانب پولینڈ جرمنی اور ہنگری میں لڑ رہی تھی۔

تاتاریوں کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ جب ان کا سردار مرتا تو بہت سی لڑکیاں اور گھوڑے ذبح کرکے اس کے ساتھ قبر میں دفن کردیئے جاتے۔ تاتاری غسل نہ کرتے اور جب بھوک لگتی تو کسی گھوڑے کی رگ کاٹ کے اس کا خون پی جاتے۔

اس زمانہ میں دنیا میں تین مذہب ایسے تھے جن کی کوشش یہ تھی کہ تاتاریوں کو اپنے میں شامل کیا جائے۔ عیسائیت، اسلام اور بدھ مت۔

سنہ ۱۲۵۶ء میں تاتاریوں کی فوج نے دریائے جیحون کو عبور کیا اور سب سے پہلے انھوں نے حسن ابن صباح کے پیروؤں کو کوہ البرز کی گھاٹیوں میں چن چن کر ختم کیا۔ اس کے بعد ہلاکو خاں جو تاتاریوں کا سردار تھا بغداد پہنچا۔ خلیفہ مستعصم کی خلافت بہت کمزور ہوچکی تھی۔ خلیفہ کی مدد کے لئے کوئی نہیں آیا اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تاتاریوں نے فروری سنہ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر یورش کی تھی اور آٹھ لاکھ مرد اور عورت اور بچے تہ تیغ کردیئے اور سارے دار الخلافت کو جلا کر خاکستر کردیا۔ سارے محلات مساجد مدارس اور کتب خانے غارت ہوگئے اور خود خلیفہ کو نہایت بے رحمی سے ہلاک کیا گیا۔ اس کو ایک قالین میں لپیٹ کر گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلا گیا کیوں کہ چنگیز خاں کے بنائے ہوئے قانون میں یہ لکھا تھا کہ کسی بادشاہ کے خون سے تلوار رنگین نہیں ہونا چاہیے۔ اس واقعہ کے بعد سارے دنیائے اسلام میں دہشت پھیل گئی اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اسلام مٹ جائے گا۔ سعدیؒ نے اس حزنیہ سے متاثر ہوکر بڑا دردناک مرثیہ لکھا ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین　　بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین

اس کے بعد ہلاکو کو اپنے بھائی منگو کی موت کی خبر ملی جو چین میں تھا اور تاتاریوں کا خاقان تھا۔ ہلاکو کا چچا زاد بھائی برکہ (BEREKE) تھا جو روس میں تاتاریوں کی قیادت کر رہا تھا۔ اس نے اسلام قبول کرلیا تھا اور جب اس کو اس بات کی اطلاع ملی کہ ہلاکو نے خلیفہ بغداد کو قتل کردیا تو اس کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس کو یہ بھی خیال ہوا کہ ہلاکو مغربی ایشیا میں خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ ہلاکو اپنے دوسرے بھائی قبلئی خاں کو منگو کی جگہ خاقان بنانا چاہتا تھا۔ ہلاکو بدھ مت کی طرف مائل تھا مگر اس کی بیوی عیسائی تھی۔

مصر میں اس وقت مملوک حکمران تھے مملوک اصل میں سفید فام غلام تھے جن کو سب سے پہلے بغداد کے خلیفہ معتصم نے اپنے باڈی گارڈ کے طور پر رکھا تھا۔ جب فرقہ بندی کی وجہ سے فوج کا فراہم کرنا دشوار ہوگیا تو فوج کی بھرتی کا مدار صرف ان مملوکوں پر رہ گیا۔

رفتہ رفتہ یہ غلام آقا بن گئے اور غلاموں کی فوج رکھنے لگے۔ مصر کی مملوک مملکت کی فوج تمام تر ان غلاموں پر مشتمل تھی جس نے تاتاریوں کا کامیاب مقابلہ کیا۔

ہلاکو کی فوج جب مصر پر حملہ آور ہوئی تو مصر کے مملوک سلطان نے اس کا مقابلہ کیا۔ مملوک خوب سمجھتے تھے کہ تاتاریوں کے

مقابلہ میں اسلام کی آخری اُمید وہی تھی۔ اس لئے کہ اگر تاتاری مصر کو فتح کر لیتے ہیں تو پھر کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی
مملوک سلطان قطز (Qutuz) تھا۔ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار فوج تیار کی جو فلسطین میں داخل ہوئی۔ اُس نے تاتاری
ایلچیوں کے سر قلم کروا دیئے۔ تاتاریوں کے لئے یہ چیز خلاف امید تھی۔ ۳ ستمبر سنہ ١٢٦٠ء کو عین جالوت (Ain Jalut)
مقام پر دونوں لشکر نبرد آزما ہوئے۔ اس معرکہ میں تاتاریوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگے۔ یہ تاتاریوں کی
پہلی شکست تھی۔ تاتاریوں کا کمانڈر کٹ بوگا (Kitbogha) مارا گیا۔ اس فتح کے بعد قطز کو ایک دوسرے جنرل
بے برس (Baybars) نے قتل کر کے خود اس کی جگہ سلطان بن بیٹھا۔

عین جالوت کا معرکہ دنیا کی فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتا ہے۔ سنہ ١٢٦٢ء میں ہلاکو کی برکے سے جو اس کا عم زاد بھائی تھا اور
مسلمان ہو گیا تھا جنگ ہوئی۔ مملوک سلطان بے برس نے اُس جنگ میں ہلاکو کے خلاف برکے کی امداد کی۔ اس طرح نہ صرف
مصر بلکہ ساری دنیائے اسلام تباہی سے بچ گئی۔ مصر اب عرب ثقافت کی آماجگاہ بن گیا اور قاہرہ نے بغداد کی جگہ لے لی اور
۲ صدی تک اسلامی تہذیب نے یہاں ترقی کی۔ سلطان بے برس نے شہید خلیفہ مستعصم کی جگہ قاہرہ میں اُسی خاندان کے
کے ایک شہزادہ کو خلیفہ بنایا۔ معرکۂ عین جالوت نے تاتاریوں کے دل پر اسلام کا سکہ بٹھا دیا اور اس کے بعد وہ خود جوق در جوق
اسلام میں داخل ہونے لگے اور تیرھویں صدی عیسوی کے آخر تک یہ مسئلہ طے ہو گیا کہ تاتاری کونسا مذہب اختیار کرتے
ہیں۔ مشرق کے تاتاریوں نے تو بدھ مذہب اختیار کر لیا لیکن مغرب کے تاتاری مسلمان ہو گئے۔ یہ چیز زیادہ تر معرکۂ عین
جالوت کا نتیجہ تھی جس نے اسلام کو تباہی سے بچا لیا۔ ایک دوسرا معرکہ حمص میں ہوا اس میں بھی تاتاریوں کو شکست ہوئی اور ان
کا وقار ختم ہو گیا۔ ایشیائے کوچک اور عراق کے جو مسلمان تاجدار ہلاکو زیر نگیں تھے وہ خود مختار ہو گئے۔ اور ان میں سے بعض نے
بے برس کی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ سلجوقی سلطنت کے مغربی حصہ کا تاجدار بھی خود مختار ہو گیا اور اب صرف سلجوقی سلطنت کے
مشرقی حصہ پر تاتاریوں کی سیادت باقی رہ گئی۔

چنگیز کے خاندان میں برکے (Barka) سب سے بڑا تھا۔ وہ اسلام کا زبردست حامی ہو گیا اور سلطان مصر بے برس
نے اس کے ساتھ مکمل اتحاد کر لیا۔ عین جالوت کے معرکہ کے بعد جب ہلاکو نے سلطانِ مصر سے انتقام لینے کے لئے اپنی افواج
مجتمع کیں تو اس وقت برکے کی افواج کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد تھیں۔ اب ہلاکو اور برکے کے درمیان معرکہ کارزار گرم
ہو گیا۔

برکے کا پایۂ تخت سرائے نو اسلامی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ جس میں شاندار محلات مساجد اور حمام تعمیر ہو گئے۔

عین جالوت وہی مقام ہے جہاں سنہ ١١٨٧ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے عیسائی لشکر کو شکست دے کر بیت المقدس
کو فتح کیا تھا۔

ہلاکو دوبارہ مصر پر قبضہ کرنے کی تیاری کرتا رہا۔ بے برس نے حلب سے لے کر عراق تک جتنا جنگل تھا اس کی گھاس میں
آگ لگوا دی تاکہ تاتاریوں کے گھوڑوں کے لئے نہ چارہ رہے اور نہ سواروں کے لئے درختوں کا سایہ اور نہ ایندھن کے لئے لکڑی۔
بے برس بھی اپنی فوج کو برابر تربیت دیتا رہا کیونکہ تیراندازی میں تاتاری بڑھے ہوئے تھے۔ دوسرے ملکوں سے بھی بے برس
نے تاتاریوں کے خلاف اتحادی معاہدے کئے۔

تاتاریوں کے خاقان منگو کی قیادت میں برکے اس بات پہ مجبور تھا کہ ہلاکو کی فتوحات میں ہلاکو کی امداد کرے لیکن برکے

باقی مضمون صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ فرمائیے

محمد ہاشم اسمٰعیل (بمبئی)

بمبئی سے دِلّی تک

آؤ بھیا دلی چلیں۔ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میں آپ کو ریل کا ٹکٹ دے کر دِلّی چلنے کی دعوت دے رہا ہوں، بھلا مجھ غریب کے پاس اتنا روپیہ کہاں کہ آپ کو دِلّی کی سیر کراؤں۔ لیکن اگر لوگ کسی سفرنامے کو پڑھ کر گھر بیٹھے چین وجاپان کی سیر کر لیتے ہیں تو میں بھی آپ کو خیالی اُڑن کھٹولے پر بٹھا کر جامع مسجد کے میناروں کی سیر کرا سکتا ہوں۔ ہُوا یہ کہ پندرہ نومبر کو میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی میں شریک ہونے کے لئے گیا تھا۔ دل چاہتا ہے کہ وہاں کے واقعات کچھ آپ کو بھی سُناؤں۔ جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا وہ تو بیان کر سکتا ہوں مگر مشکل تو یہ ہے کہ جو کچھ دل کی آنکھوں نے دیکھا اور دل کے کانوں نے سُنا اُسے کن الفاظ میں بیان کروں۔ کس زبان میں سُناؤں؟ دل کے راز سمجھنے ہوں تو دل میں آ بیٹھو۔ ۱۵ تاریخ نومبر کو جمعہ کے دن سُورج نکلنے سے پہلے میں ہوائی جہاز میں سوار ہُوا۔ چھ بجے ہوائی جہاز روانہ ہوا۔ رات کے گھونگھٹ کو ہٹا کر سُورج نے مکھڑا دکھایا۔ کرنوں نے مسکراتے ہوئے جھک کر سلام کیا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہوائی جہاز کا منہ چوم لیا۔ مُلائم بادلوں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ ہوائی جہاز جب اُڑنے لگا اور میری نظر نیچے پڑی تو شہر بمبئی کی خوبصورتی، سمندر کا کنارہ، بندرگاہ میں جہازوں کا جمگھٹ دیکھ کر دل کی کلی کھل گئی۔ آنکھوں میں روشنی اور دل میں ٹھنڈک دوبالا ہوگئی کہیں کارخانوں کی چمنیاں نظر آتی تھیں تو کہیں مسجد کے مینارے۔ کہیں دریا کے کنارے ناریل کے درخت لہلہاتے نظر آتے تھے تو کہیں تاج محل ہوٹل کا جلوہ دل لُبھاتا تھا۔ دَم کے دَم میں شہر نظر سے غائب ہوگیا۔ ہوائی جہاز آٹھ ہزار فٹ اونچا ہوگیا اور ایک سو اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگا۔ جنگل، پہاڑ، ندی نالے دُھندلے دُھندلے سے نظر آنے لگے۔ نو بجتے بجتے شہر احمد آباد نظر آنے لگا۔ وہ دیکھئے دُور سے اورنگ زیب اپنی فوج کے آگے گھوڑا دوڑائے احمد آباد فتح کرنے کے لئے چلا آ رہا ہے۔ بادشاہ نے مہینوں کا راستہ دنوں میں طے کیا ہے اور گھوڑے پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں۔ لیکن آج ہم ہوائی جہاز میں بیٹھ کر تین گھنٹوں میں احمد آباد سے دہلی پہنچ جائیں گے۔ ہم آسمان کو چھوڑ کر زمین پر اُتر آئے۔ ناشتہ کیا آدھ گھنٹے کے بعد پھر جہاز روانہ ہوا۔ گیارہ بجتے بجتے اُودے پور نظر آنے لگا۔ پہاڑوں کی گود میں تالاب ہیں اور تالابوں کی گود میں سنگِ مرمر کے بنے ہُوئے محلات ہیں۔ سُورج کی کرنیں پانی پر رقص کرتی ہیں تو محل کی ہر دیوار سے گانے کی آواز آتی ہے۔ ان محلات میں سے ایک محل وہ بھی ہے جہاں بادشاہ جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خرم نے اپنے بھائی شہزادہ پرویز کو قتل کرنے کے بعد اپنے باپ کی فوجوں سے بچتا چھپتا آکر پناہ لی تھی۔ مہاراجہ اودے پور نے اپنے مسلمان مہمان کو عزت اور محبت سے ایک محل میں ٹھیرایا تھا۔ نہ صرف شہزادہ خرم کو پناہ دی اور مہمان رکھا بلکہ شہزادے کے آرام کا ہر طرح خیال رکھا۔ شہزادے کو رہنے کے لئے محل دیا اور محل میں تخت بچھایا تاکہ شہزادے کو یہ خیال نہ ہو کہ وہ غیر ملک میں مہمان ہے۔ شہزادے کے لئے ایک عبادت گاہ بھی بنائی گئی، تاکہ مہمان کھلے دل سے خداوندِ کریم کی عبادت کرے۔ اس طرح ایک راجپوت راجہ نے ایک مغل شہزادے کی دل جوئی کی اور بھائی چارہ قائم کیا۔ کاش! وہ گزرا ہوا زمانہ، وہ اخلاق اور وہ مہمان نوازی کا زمانہ۔ وہ میل ملاپ کا زمانہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا! اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اُنہی زمانے میں بھی ہندو راجوں اور مسلمان

ملہ یہ مضمون ۳۶ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، یہی مقدر تھا کہ ۱۹۲۶ء کا مضمون ۱۹۶۲ء میں اشاعت پذیر ہو!

بادشاہوں میں جنگ ہوتی تھی اور بے شک ہوتی تھی۔ لڑائی جھگڑے حضرت آدم کی اولاد کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور صورِ اسرافیل کی آواز آنے تک قائم رہیں گے۔ اگر انسان لڑائی جھگڑا بالکل چھوڑ دے تو انسان نہ رہے۔ فرشتہ بن جائے۔ لیکن پرانے زمانے میں جو لڑائیاں ہمارے ملک میں ہوتی تھیں، وہ مذہب کی بناء پر نہیں بلکہ سیاست کی بناء پر اور ملک و زر اور تخت و تاج کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ راجپوتانہ اور میواڑ کے راجے مغل بادشاہوں سے مل کر دوسرے راجپوتوں سے لڑتے تھے اور دکھن کے مسلمان بادشاہ مرہٹوں کا ساتھ دے کر دہلی کے مغل بادشاہوں کے ساتھ جنگ کرتے تھے۔ کیا نظام حیدرآباد نے انگریزوں کے ساتھ مل کر میسور کے ٹیپو سلطان سے جنگ نہیں کی؟ خیر چلیے اس بحث کو چھوڑیئے وہ دیکھئے دور سے جامع مسجد کے مینار اپنی شان دکھلا رہے ہیں۔ وہ دیکھئے قطب صاحب کی لاٹھ گذشتہ شان و شوکت کی بھلائی ہوئی یاد یں تازہ کر رہی ہے۔ وہ دیکھئے لال قلعے کی دیواریں انگریزوں کے ظلم و ستم کی داستانیں سنا رہی ہیں۔ اتفاق سے آج جمعہ کا دن ہے اور نمازِ جمعہ کا وقت۔ ذرا آنکھیں بند کر لیجئے تو میں آپ کو خیالی گھوڑے پر بٹھا کر ایک سو سال پہلے لے جاؤں۔ مغلوں کے آخری بدنصیب بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا زمانہ ہے۔ سلطنت کا چراغ بجھنے کو ہے۔ مغلوں کا نام مٹنے کو ہے۔ آزادی کی زندگی کی ڈور کٹنے کو ہے۔ ہر گھر میں صفِ ماتم بچھنے کو ہے۔ بہار گئی، خزاں آنے کو ہے۔ لیکن اس چل چلاؤ کے زمانے میں بھی، اس افراتفری کی حالت میں بھی ایک شان و شوکت باقی ہے۔ آؤ بھائی اس شان و شوکت کی آخری جھلک دیکھ لیں۔ وہ لال قلعے کے دروازے سے بادشاہ سلامت کی سواری نکلی۔ سرخ و سفید چہرہ، چہرے پر شاہی جاہ و جلال، سفید نورانی ڈاڑھی۔ آنکھوں میں رعایا کی محبت کے چھلکتے ہوئے جام۔ آگے گھوڑے، پیچھے پیادوں کی قطار۔ دھیرے دھیرے سواری جامع مسجد کی سیڑھیوں تک پہنچی رعایا نے جھک کر سلام کیا۔ اپنے پیارے بادشاہ کی سلامتی کی دعا مانگی۔ اپنے بادشاہ کو دیکھ کر رعایا خوش ہوئی اور اپنی اولاد کو دیکھ کر بادشاہ کا دل بھی شاد ہوا۔ محبت کا گھر آباد ہوا۔ نماز شروع ہوئی۔ شہنشاہ اور رعایا ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اور امیر و غریب مال دار و محتاج ایک ساتھ سجدے میں گئے۔ سر نے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کو سجدہ کیا تو دل نے سلامتی ایمان کی دعا مانگی۔ اپنے بادشاہ کے ساتھ رعایا نے نماز پڑھی۔ خطبہ پڑھا گیا۔ نماز ختم ہوئی۔ دعا مانگنے کا وقت آیا۔ بادشاہ سلامت نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، دعا مانگتے ہوئے بادشاہ کا چہرہ تمتمانے لگا، جیسے اپنے رب کے سامنے اس نے سچ مچ اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔

چلئے، جلد چلئے، شام ہونے کو ہے، دن ڈھلنے سے پہلے ہمیں جامعہ نگر پہونچنا ہے نئی دلی کی طرف جاتے ہوئے، راستے میں ہمایوں کا مقبرہ پڑتا ہے، یہ وہی تاریخی مقام اور حسرت کدہ ہے، جہاں ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے لال قلعہ کو چھوڑ کر یہاں پناہ لی تھی۔

بادشاہ انگریزی فوج سے پیچھا چھڑانے کے لئے یہاں آئے تھے، لیکن تقدیر سے کیسے پیچھا چھڑاتے۔ قسمت کے لکھے کو کیسے مٹاتے آخر پکڑے گئے اور چند مہینے قید میں رکھنے کے بعد سرکار انگریزی نے بوڑھے بادشاہ کو رنگون بھیج دیا تاکہ مرنے کے بعد بادشاہ کی لاش بھی اپنے وطن میں دفن نہ ہو سکے۔ مرنے سے کچھ دنوں پیشتر بادشاہ سلامت کو ایک ساتھی نے عید کا چاند نظر آنے پر مبارکباد دی۔ بادشاہ کی زبان سے یہ دردناک الفاظ نکلے، "کیا ہندوستان میں عید کا چاند نظر آتا ہوگا"۔ ہمایوں کے مقبرے پر آج بھی اداسی کا عالم ہے۔ اسی راستے پر خونی دروازہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہیں انگریزوں نے مغل شہزادوں کو قتل کیا۔ آگے بڑھ کر سلطان الاولیا حضرت نظام الدین کی درگاہ ہے۔ وہیں پر انکے مرید اور اردو کے جنم داتا امیر خسرو

لی بھی قبر ہے، بھلا اس جگہ سے مرزا غالب کیسے دُور رہتے۔ وہ بھی یہیں آکر ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ دہلی والے جواب گنتی کے رہ گئے ہیں جب دوسری زبانیں اور بولیاں سنتے سنتے تنگ آجاتے ہیں تو یہیں آکر اُردو کے جنم داتا اور اُردو کے آخری بڑے شاعر کی قبر پہ فریاد کرتے ہیں، کہ انگریزی نے تو اُردو کو لُوٹا ہی تھا لیکن جو کچھ رہا سہا تھا اُس کو اس ہندی اُردو کے جھگڑے نے تباہ کر دیا۔ اس مندر کے پجاریوں نے ہی اس مندر کی دیوی ہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ۔ وہ دیکھو جامعہ نگر کی لال لال عمارتیں اپنی سفید بُرجیوں اور منڈیروں پر لئے نظر آنے لگیں۔ پندرہ سال پہلے اس جگہ جنگل تھا۔ جامعہ والوں کی ہمت نے، جامعہ میں پڑھانے والوں کی محبت نے اس جنگل کو گلزار بنا دیا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اس اُجڑے دیار میں جسے " اوکھلا " کہتے ہیں پھر بہار آئے گی۔ پھر سے پھُول پتے لہلہانے لگیں گے، اور نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑ جائے گی۔ دہلی میں قصہ مشہور ہے کہ مُغل بادشاہوں کے خزانے اوکھلا کی زمین میں دبے پڑے ہیں۔ کسی انگریز نے انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی، مگر ہندوستانی جواہرات کی غیرت نے انگریز کے قبضے میں جانا گوارا نہ کیا۔ اب مدت کے بعد اوکھلے کی کان میں سے پھر جواہرات نکلنے لگے ہیں۔ لیکن بجائے الماس، یاقوت، لعل و زُمرّد کے یہ انسانی نگینے ہیں، جنہیں جامعہ ملیہ کے اُستادوں نے اپنی محبت کے ہاتھوں سے تراش کر ملک کے بازاروں میں بھیجا ہے۔

دیکھئے اس طرف کھُلے میدان میں ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ چھوٹے۔ بڑے۔ بچے، جوان اور بوڑھے سبھی ہیں۔ سب کے چہرے علم کے نُور سے چمک رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک خوش صورت بزرگ نے کھڑے ہو کر ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اور جامعہ کا پرچم ہوا میں لہرانے لگا۔ یہ جامعہ کا پرچم نہیں بلکہ ملک کے باشندوں کی ذہنی آزادی کا پرچم ہے۔ ڈیڑھ سو سال کی غلامی کے بعد قوم کے چند ہمت والے لوگوں نے انگریزی حکومت کی تعلیمی پالیسی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ہر طرح کی تکلیف برداشت کی۔ ہر ایک مصیبت سہی۔ خود بھوکے رہے۔ بیوی بچوں کو بھوکا رکھا۔ چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتے جاڑے میں پیدل پھرتے رہے۔ سب کچھ گوارا کیا مگر اپنے اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اپنی دُھن کے پکے تھے۔ مجنوں تھے۔ فرہاد تھے، پیرے کانٹے نکالتے گئے اور چلتے گئے۔ پتھر پھوڑتے رہے اور راستہ بناتے رہے۔ جب کسی نے ہاتھ بٹایا، شکریہ ادا کیا۔ جس نے کچھ مدد نہ کی اُس کی شکایت نہ کی۔ نہ کسی کو جھُوٹی خوشامد سے راضی کیا۔ نہ کسی کی خفگی سے ڈرے۔ انسانوں سے محبت کرنے والا، اپنا سب کچھ دے کر کسی سے کچھ نہ لینے والا ایک شخص تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ آپ نے شاید انہیں نہ پہچانا تو سنئے ان کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین ہے۔ یہی جامعہ کی ناؤ کے کھیون ہار ہیں۔ انھوں نے جس وقت ناؤ کے چپّو سنبھالے، بادبانوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ تختے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ لیکن ان کی ہمت اور ان کے ساتھیوں کی انتھک کوششوں نے طوفان کا مقابلہ کیا، اور ساحلِ مُراد نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے " ان گزرے ہوئے پچاس سالوں کی داستان کیسے سُناؤں جو اس مدت میں ارادے بندھے اور ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ خوشیوں اور اُداسیوں کے دَور رہے۔ کبھی اپنے کام پر بھروسہ ہوا تو کبھی شک و شبہ نے آگھیرا۔ اُمیدیں بندھیں اور ان کو مایوسیوں نے توڑا۔ کسی کی زبان سے ہمت بڑھانے والے الفاظ سُنے اور کسی طرف سے دھمکیوں اور گھُرکیوں کی آواز آئی۔ ان سب کا حال سُناؤں تو کہانی لمبی ہو جائے گی "۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑے وقار و سنجیدگی کے ساتھ فرمایا " ہماری سیاسی زندگی میں آپ لوگ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ آپ ہزاروں بچوں اور کروڑوں لوگوں کے دِلوں میں جگہ کئے ہوئے ہیں۔ میں خدا کے نام پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپس میں مِل جائیے۔ اس آگ کو بجھا دیجئے۔ یہ وقت یہ پُوچھنے کا نہیں کہ چنگاری کس نے چھوڑی " اس کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح اور دُوسرے لیڈروں نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کو اُن کی کامیابی پر مُبارکباد دیتے ہوئے اُن کے کام میں ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا۔

قوم کے امیروں اور غریبوں نے دل کھول کر جامعہ کو روپے دیئے ہیں، ریاست حیدر آباد، بھوپال اور رام پور سے لاکھوں روپے ملے، ہندوستان کی حکومت کی طرف سے شری راج گوپال آچاریہ جی نے کئی لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا، لیکن ہمیں روپے گننے سے غرض نہیں، سونے چاندی سے لگاؤ نہیں، روپے پیسے سے ہم شاندار عمارتیں بنا سکتے ہیں، لیکن کسی درسگاہ میں علم و اخلاق کی روح باقی نہ رہے، تو وہ عمارت مقبرہ بن کر رہ جائے گی۔

ہم جامعہ نگر سے اچھی اُمیدیں لے کر واپس ہو رہے ہیں، آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی ہیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہے! مستقبل کے واقعات کو اللہ تعالیٰ نے دانستہ تاریکی میں رکھا ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہوگا؟ انسان کا فرض اخلاص اور تندہی کے ساتھ کام کرنا اور اپنی کوششوں کے نتائج کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا ہے!

اے جامعہ ملیہ! ہمارا رخصتی سلام لے — فی امان اللہ! خدا حافظ!

—×—

بقیہ مضمون صفحہ ۳۴ سے آگے:—

بیبرس اس موقعہ کی تلاش میں تھا کہ وہ مغربی ایشیا میں تاتاریوں کے حملوں سے علیحدہ ہو جائے۔ جب منگو فوت ہو گیا تو صورتِ حال بدل گئی اور برکہ نے جو چنگیز کے خاندان میں اب سب سے بڑا تھا، ہلاکو کی امداد کرنا بند کر دی، اور اپنی فوج کے اس حصہ کو جو شام کے شمال میں ہلاکو کی مدد کر رہا تھا حکم دیدیا کہ وہ بیبرس سے مل جائے۔ بیبرس نے ان تاتاری فوج کی بہت توقیر و احترام کیا۔

منگو کی وراثت کے لئے اب تاتاریوں میں زبردست خانہ جنگی ہونے لگی جس میں ایک طرف ہلاکو تھا جو اسلام کا دشمن تھا اور دوسری جانب برکہ تھا جو اسلام کا حامی تھا شروع شروع میں ہلاکو فتحیاب ہوا لیکن بعد میں اس کو شکست ہوئی اور وہ محصور ہو گیا لیکن برف باری کی وجہ سے برکہ کو محاصرہ ختم کرنا پڑا۔ یہ خانہ جنگی دو برس تک جاری رہی اور اس عرصہ میں بیبرس نے اچھی طرح تیاری کر لی۔

اب ہلاکو فوت ہو گیا اور اس کا لڑکا اباقا اس کا جانشین ہوا جس کی ماں عیسائی تھی۔ اباقا بھی اسلام کا سخت دشمن تھا برکہ اور بیبرس کے اتحاد کے بعد تمام محاذوں پر اباقا کا مسلمانوں سے مقابلہ رہا۔ ساتھ کے ساتھ بیبرس صلیبی عیسائیوں کبھی برسرِ پیکار رہا اور ان کو شکستیں دیتا رہا کیوں کہ صلیبی عیسائی بھی اباقا کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔

دسمبر سنہ ۱۲۷۳ء میں بیبرس نے شام میں اباقا کو شکست دی اور صلیبی عیسائیوں کا بھی استیصال کر دیا۔ اباقا کے مرنے کے بعد اس کا بھائی تگودر (Tequder) جانشین ہوا۔ لیکن وہ مسلمان ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام احمد تھا۔ اس طرح فتنہ تاتار جو اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گیا تھا اس کا خاتمہ ہو گیا۔

—×—

ماہر القادری

ساقی نامہ!

(۲۱ اپریل سنہ ۶۲ء کو "یوم اقبال" (کراچی) میں شاعر کی زبان سے سنا گیا)

پلا ساقیا! بادۂ لا الٰہ — کہ ہے بے یقینی سے دُنیا تباہ
خرد گرچہ پہلے سے باریک ہے — مگر اس کا ماحول تاریک ہے
توانا بدن، رُوح جھلسی ہوئی — نظر خار و خس میں ہے اُلجھی ہوئی
بھڑکتے ہیں شعلے، سُلگتی ہے برف — ذہانت تباہی میں ہوتی ہے صرف
مہ و مہر پر ڈال دی ہے کمند — دلوں کے دریچے ابھی تک ہیں بند
کتابوں کے ہر سمت انبار ہیں — مگر علم کے سرد بازار ہیں
ادیب اور ادب ہرزباں بے لگام — نہ لطفِ سخن ہے نہ ربطِ کلام
محبت ہوس، حسن ہے خود فروش — نوا سنج کرگس ہیں، بلبل خموش
نہ گرمی لہو میں، نہ سینوں میں دم — غزالوں سے رخصت ہوا ذوقِ رم
ممولوں کی مانند شہباز ہیں — جو تھے تیغ زن صاحب ساز ہیں
تصور کا مرکز ہیں نان و شکم — اسی پھیر میں ہیں زبان و قلم
گناہوں سے یاری ہے نیکی سے جنگ — کہ شاہ و گدا سب کا ہے ایک رنگ
سیاست ہے دھوکا، تمدن فریب — بلندی کے دعوے مگر یہ نشیب
یہ تہذیب جس کی بڑی دھوم ہے — حیا اور غیرت سے محروم ہے
گناہوں سے اُٹھا ہے اس کا خمیر — یہ کم ظرف، بے آبرو، بے ضمیر
کہاں ہے تو اے شیخ آتش بجاں — چراغِ حرم دے رہا ہے دھواں
زمانے کو پاکیزگی سے ہے بیر — ترے نوجوانوں کی عصمت کی خیر
موذن نے دیدی سحر کی اذاں — مگر خوابِ راحت میں ہے کارواں
مجاہد کا سوزِ نوا چاہیئے! — اب ایسے میں بانگِ درا چاہیئے
نئے ولولے ہوں، نئی زندگی — ضرورت ہے پھر بالِ جبریل کی
ہو جس کی نگاہوں میں ضربِ کلیم! — وہ شاعر ہے روح القدس کا ندیم

خدا کے لئے ساقیٔ دلنواز
عطا ہو مئے ارمغانِ حجاز

بدل جائے دُنیا کی آب و ہوا — کہ نانِ جویں پھر ہو خیبر کُشا

خدا کی رضا سب کا مقصود ہو — پھر انساں ملائک کا مسجود ہو
حبابوں کے سینوں سے موجیں اٹھیں — ممولے بھی اب شاہ بازی کریں
بہت مرحلے قابلِ غور ہیں! — ستاروں سے آگے جہاں اور ہیں
سفینے ہوں پھر سوئے اندلس رواں — میسر ہو طارق کا عزمِ جواں
گہے لطفِ شبنم، گہے جوشِ میغ — بہ یک دست قرآں بہ یک دست تیغ
بخواں مطربِ خوش نفس تازہ دم — دو بیت از بیاضِ زبورِ عجم!
یہ ماضی ہے، مستقبل و حال ہے — زمانوں کا دل "یومِ اقبال" ہے

خوشا رازِ دانائے راز آمدہ
نسیم آمدہ . وز حجاز آمدہ

کون ہے؟

جوہر سعدی

پنہاں، چمن چمن کی بہاروں میں کون ہے
سورج میں کون، چاند ستاروں میں کون ہے
ٹھہراؤ کس کی ذات سے ہے کائنات کا
بہتے ہوئے، حیات کے دھاروں میں کون ہے
جو خواب زندگی کے دکھاتے ہیں رات دن
اُن سب نظر فریب نظاروں میں کون ہے
سُنسان وادیوں کا سماں کیوں ہے دلربا
طوفاں بدوش، رہگذاروں میں کون ہے
کس کے لئے ہیں برق کی سیماب پائیاں
بیتاب و بیقرار شراروں میں کون ہے
کیوں مضطربِ حیات کی لے ٹوٹتی نہیں
سازِ ثبات و شوق کے تاروں میں کون ہے
درمانِ دردِ آبلہ پائی بنا ہوا
صحرائے ہست و بود کے خاروں میں کون ہے
دل کھینچتی ہے کس کی کشش، گام گام پر
دامنِ کشِ نگاہ، نظاروں میں کون ہے
جس کے حضور عظمت و حکمت ہیں سرنگوں
[illegible]

شفقت کاظمی

ہو جائیں گے جس گھڑی فسانہ — ڈھونڈے گا بہت ہمیں زمانہ
ہمراہ ابھی جو چل رہے تھے — کیا جانے کدھر ہوئے روانہ
ملتے ہی بچھڑ گئے وہ ہم سے — ترتیب نہ پا سکا فسانہ
پردیس میں جا کے بسنے والو — ممکن ہو کبھی تو لوٹ آنا
کیوں تم نے کہی وہ بات شفقت
جس کو نہ سمجھ سکا زمانہ

آزردہ ملے ہیں جب ملے ہیں — یاروں سے ہمیں بہت گلے ہیں
یاد آئے ہیں دوستوں کے میلے — جب پھول چمن چمن کھلے ہیں
یہ درد یہ رنج بیکسی کے — شاید ترے پیار کے صلے ہیں
کترائے ہیں نظر بچا کے شفقت
وہ راہ میں جب کبھی ملے ہیں

راہی بلند شہری

اُنھیں کا دل، اُنھیں کی جان تھی، اُن پر ہی وار آئے
کہ اک بارِ امانت تھا جسے سر سے اُتار آئے
کبھی تو راستے موجِ نسیمِ عنبریں بھولے
کبھی تو کوئی جھونکا لے کے بوئے زلفِ یار آئے
حرم کے دن تو پھر بھی شیخ صاحب بھول جائیں گے
نہیں بھولیں گے میخانے میں جو لمحے گزار آئے

کوئی خاروں سے اُلجھے پھر بھی اُس کو پھول مل جائیں
کوئی پھولوں کا طالب ہو مگر دامن میں خار آئے

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئینِ گلستاں میں
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

تری محفل کا کیا کہنا، ترے جلووں کا کیا کہنا
ہمیشہ ایک ہی عالم، ہزار اُٹھے ہزار آئے

نفس نفس پہ تجھے پہرے، نہ یاد یار آئے
ہم اہلِ دل، وہ شبِ ہجر بھی گزار آئے

عرشی بھوپالی

شمس وارثی (لکھنوی)

ہر نقشِ کفِ پا کو میں قبلہ نما سمجھا
دنیا مجھے کیا سمجھی دنیا کو میں کیا سمجھا!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

روحِ انتخاب

پس ظاہر میں تو نام یہ ہے کہ یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ ہے۔ مگر حقیقت میں یہ مزدوروں پر کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ ہے۔

اور یہ ڈکٹیٹر شپ بھی کچھ ہلکی پھلکی سی نہیں۔ اجتماعی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے تمام زمیندار ختم کر دیئے گئے اور ایک وحدہٗ لاشریک زمیندار، سارے ملک کی زمین کا مالک ہو گیا۔ سارے کارخانہ دار، تجار اور متاجر بھی ختم ہو گئے اور ان سب کی جگہ ایک ایسے سرمایہ دار نے لے لی جو ذرائع پیداوار کی ہر قسم اور ہر صورت پر قابض ہو گیا۔ اور پھر اسی کے ہاتھ میں سارے ملک کی سیاسی طاقت بھی مرکوز ہو گئی۔ یہ ہے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ۔ اب اگر روس میں بظاہر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اس پوری معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو استعمال کر رہے ہیں وہ عام آبادی کے ووٹوں ہی سے منتخب ہوا کرتے ہیں تو کیا فی الواقع اس کے معنی جمہوریت کے ہیں؟ سارے روس میں کس کی ہمت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے مقابلے پر ووٹ مانگنے کے لئے اٹھ سکے؟ اور اگر کوئی جرأت کرے بھی تو وہ سرزمین روس میں کھائے گا کہاں سے؟ اور اپنی آواز اٹھائے گا کس پریس سے؟ اور اپنی بات سنانے کے لئے ملک میں سفر کن ذرائع سے کرے گا؟ بلکہ یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اس کو زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں دیر کتنی لگے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں حکومت کے پاس اتنی طاقت جمع ہو جاتی ہے جو تاریخ انسانی میں کبھی کسی چنگیز اور ہلاکو اور زار و قیصر کے پاس بھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ جو گروہ ایک دفعہ اس طاقت پر قابض ہو جائے پھر اس کے مقابلہ میں اہل ملک بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ کسی قسم کی بگڑی ہوئی حکومت کو بدل دینا اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر ایک بگڑی ہوئی اشتراکی حکومت کو بدلنا مشکل ہے۔

اس نظامِ حکومت میں برسرِ اقتدار پارٹی ملک کی مجموعی زندگی کے لئے جو منصوبہ (Plan) بناتی ہے اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے وہ پریس کو، ریڈیو کو، سینما کو، مدرسے کو، پوری انتظامی مشینری کو اور پورے ملک کے معاشی کاروبار کو ایک خاص نقشے کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ تمام ملک میں سوچنے اور رائے قائم کرنے کا فیصلہ کرنے والے دماغ صرف وہ چند ہوں جو مرکز میں بیٹھے منصوبہ بنا رہے ہیں۔ باقی سارا ملک صرف عملدرآمد کرنے والے دست و پا پر مشتمل ہو جو "تعمیل و ارشاد" میں چون و چرا تک نہ کریں۔ تنقید اور نکتہ چینی اور رائے زنی کرنے والوں کے لئے اس نظام میں جیل اور تختۂ دار کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اگر ایسے دخل در معقولات دینے والے کو ملک بدر کر دیا جائے تو یہ گویا اس کے ساتھ بڑی رعایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں خود کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے سربرآوردہ کارکنوں اور لیڈروں تک کو جن کی محنتوں اور قابلیتوں ہی کی بدولت اشتراکی تجربہ کامیابی کی منزل تک پہنچا، موت اور حبس دوام اور جلاوطنی کی سزائیں دے ڈالی گئیں۔ صرف اس لئے کہ انھوں نے برسرِ اقتدار گروہ سے اختلاف کی جرأت کی تھی۔ پھر یہ اشتراکی اخلاق کا ظرفہ تماشا ہے کہ جس کو بھی اختلاف کے جرم میں پکڑا گیا اس پر طرح طرح کے ہولناک الزامات بے تحاشا لگا دیئے گئے اور اشتراکی

عدالتوں میں بھی یہ ایک حیرت انگیز کرامت پائی جاتی ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی جس کو بھی ان کے ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے وہ مستقلاً ٹھیک عین منشا کے مطابق اپنے جرائم کی فہرست خود ہی فر فر سناتا چلا جاتا ہے اور کچھ دبی زبان سے نہیں بلکہ پورے زور و شور کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ بڑا غدار اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ اور رُوس کی آستین کا سانپ ہے!

پھر چونکہ یہ نظام انفرادی ملکیتوں اور مذہبی طبقوں کو زبردستی کچل کر قائم کیا گیا ہے اور ابھی وہ سب لوگ دنیا سے اور خود روس کی سرزمین سے مٹ نہیں گئے ہیں جن کے جذبات وحسیات اور حقوق کی قبر پر یہ قصر تعمیر ہوا ہے اس لئے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ کو ہر وقت رُوس میں جوابی انقلاب کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ علاوہ بریں اشتراکی حضرات یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کے انکار کے باوجود انسانی فطرت نام کی ایک چیز موجود ہے جو انفرادی نفع طلبی کا جذبہ رکھتی ہے اور وہ ہر وقت زور لگا رہی ہے کہ پھر انفرادی ملکیت کا نظام واپس آجائے۔ انہی وجوہ سے ایک طرف کمیونسٹ پارٹی خود اپنے نظام کو آئے دن "جلاب" دیتی رہتی ہے تاکہ جن لوگوں میں "رجعت" کی ذرا سی بو بھی پائی جائے انہیں صاف کیا جاتا رہے۔ اور دوسری طرف پارٹی کی حکومت سارے ملک میں جوابی انقلاب کے خطرات، امکانات، بلکہ شبہات اور وہم وگمان تک کو مٹا دینے کے لئے ہر وقت تکی رہتی ہے۔ اسی لئے جاسوسی کا ایک وسیع نظام قائم کر رکھا ہے جس کے بے شمار کارکن ہر ادارے، ہر گھر اور ہر مجمع میں رجعت پسندوں کی بُو کو سونگھتے پھرتے ہیں۔ اس جاسوسی کے پُراسرار جال نے شوہروں اور بیویوں تک کے درمیان شک و شبہ کی دیوار حائل کر دی ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے خلاف خود ان کی اولاد تک سے جاسوسی کی خدمت لینے میں دریغ نہیں کیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور بُرے وقت کی دستگیری کے لئے اشتراکی رُوس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ تو نصیب ہوگی۔ مگر کیا اب پوری نوع انسانی کے لئے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟ کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری رُوئے زمین ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈس اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟

—x—

ہماری نظر میں

بستان المحدثین

تالیف :- حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ترجمہ :- مولانا عبدالسمیع
تصحیح و نظر ثانی :- بشیر محمد دہلوی (مجلد، رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت درج نہیں۔
ملنے کا پتہ :- نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی۔

یہ کتاب حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی گرانقدر تالیف ہے، جس کا ترجمہ ۱۳۱۴ھ میں مولانا عبدالسمیع صاحب نے روضن لریاحین کے نام سے کیا اور ایک اہل خیر بزرگ (حاجی محی الدین صاحب) نے اس ترجمہ کو افادۂ عام کے لئے اپنی طرف سے چھپوایا، یہی ترجمہ جناب بشیر محمد دہلوی کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی نے کتابت، طباعت اور کاغذ کے حسنِ اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

فنِ حدیث پر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی یہ تالیف بہت جامع اور معلومات آفریں ہے، اس کے مطالعہ سے صحاح مسانید، سُنن، مصنفات، معاجم اور حدیث کی دوسری کتابوں کی تفصیلات کا علم ہوتا ہے اور ساتھ ہی اُن کے مولفین و مرتبین کے حالات معلوم ہوتے ہیں، حضرت شاہ صاحب نے فنِ حدیث پر اس کتاب کو تالیف کر کے، سچ مچ کوزے میں سمندر کو بند کر دیا ہے۔

اُردو جاننے والوں کے لئے تو یہ کتاب نعمتِ غیر مترقبہ ہے، نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے اس کتاب کو شائع کر کے دین کی لائق ستائش خدمت انجام دی ہے۔

معیتِ الٰہیہ

افادات :- حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ :- ناظم خانقاہ اشرفیہ، ۱۲ سب بلاک جی، ناظم آباد ۲، کراچی ۱۸

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری مدظلہ صاحب ذکر اور اہل علم بزرگ ہیں، اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء میں شمار کئے جاتے ہیں، حضرت شاہ صاحب متبع سنت شیخ ہیں اور ان کے مُریدوں کے دینی حالات بھی اچھے ہیں۔

یہ کتاب حضرت شاہ صاحب موصوف کے افادات عالیہ سے عبارت ہے، جن کو اُن کے مُرید حکیم محمد اختر صاحب نے مرتب کیا ہے، اس کتاب پر جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ مفتی صاحب قبلہ نے "صاحب افادات کو "عارف باللہ" کہا ہے۔

اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور معیت کو بڑے دل نشین انداز میں بیان کیا گیا ہے، مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ کی معیت کا صحیح احساس پیدا ہو اور یہی احساس ایمان کی پختگی اور اعمال کی درستگی کا سبب بنتا چلا جائے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہر شے پر غالب آجائے۔

گفتگو کے درمیان آیات و احادیث کی تفسیر اور تشریحات بھی آگئی ہیں، اور مولانا روم کے اشعار کی شرح کرتے ہوئے حضرت شاہ پھولپوری نے تصوف و اخلاق کے لطیف نکتے بیان فرمائے ہیں! اس کا بھی ذکر ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اور ہم نشینی سے بڑا فیض پہونچتا ہے!

اللہ تعالیٰ کی معیت کی باتیں کرتے کرتے، منصور حلاج کا ذکر بھی آگیا، اس کی آخر کیا ضرورت تھی' فرماتے ہیں :-

"معیت الٰہی کے اس رفیع مقام پر پہونچ کر، بعض بندے مغلوب ہوگئے اور اس مغلوبیت میں کچھ بول گئے مثلاً حضرت منصور انا الحق کہہ اٹھے یہ غلبۂ حال تھا جس کی وجہ سے معذور تھے ---" (ص۵۹، ۶۰)

کتاب و سنت جاننے والوں اور توحید خالص کے تقاضوں کو پہچاننے والوں کی زبان سے منصور اور اس کے نعرہ "انا الحق" کی مدح و ستائش سن کر سخت اذیت ہوتی ہے! جب تک منصور تصوف کا ہیرو بنا رہے گا، تصوف کا دامن داغدار رہے گا۔

اس کتاب میں ایک بات اور کھٹکی ـــــــ ایک شخص جو مولانا عبدالغنی پھولپوری سے بیعت کر چکا تھا۔ حضرت مولانا تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں' ساتھ ہی اس شخص نے یہ بھی بتا دیا کہ مجھے مولانا پھولپوری سے شرفِ بیعت حاصل ہے' اس پر مولانا تھانوی نے فرمایا، بھائی ان کا ہاتھ (یعنی مولانا پھولپوری کا ہاتھ) میرا ہی ہاتھ ہے!

اس واقعہ کے بعد کی عبارت یہ ہے :-

"میرے لئے حضرت والا کا یہ فرمانا بڑی نعمت ہے' قرآنِ کریم میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کو اپنا ہاتھ فرمایا ہے ـــــــ
اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ـــــــ

اہلِ تصوف کے یہ وہ نکتے اور دعوے ہیں' جنھوں نے خطرات کے دروازے کھولے ہیں! قرآنِ کریم کی اس آیت سے مولانا پھولپوری آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ اس جگہ تثلیث اور مشابہت کا تصور ان کے ذہن میں کیوں کر آیا؟

مسٹر پرویز کا خط اور اس کا جواب

از :- مولانا محمد عبدالرشید نعمانی' ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت تیس نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ :- مدرسہ عربیہ اسلامیہ، جامع مسجد نیوٹاؤن، کراچی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو مسٹر پرویز نے جو دو ورقی خط لکھا تھا جسے پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر ادارہ "طلوعِ اسلام" سے تقسیم کیا گیا ہے، اس خط کا جواب مولانا محمد عبدالرشید نعمانی نے دیا ہے، اور پرویز کی تحریروں کے اقتباس درج کرکے ثابت کر دیا ہے کہ یہ شخص قرآنِ کریم کے معنی میں جان بوجھ کر تحریف کرتا ہے' اور اس کے قلم سے کفر و ضلالت کا پرچار ہو رہا ہے!

یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر مفید ہے! مولانا عبدالرشید نعمانی کی عبارت سیدھی سادی اور تکلف سے پاک ہوتی ہے، "فتنۂ انکارِ سنت" پر اسی طرح مسلسل ضربیں پڑتی رہنی چاہئیں!

حدیثِ اقبال

از :- طیب عثمانی ندوی، ضخامت ۱۶۰ صفحات، (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت تین روپے،
ملنے کا پتہ :- ظفر بک ڈپو، کچہری روڈ، گیا (بھارت)

علامہ اقبال کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مگر پھر بھی تشنگی باقی ہے، اس ذکر و فکر میں بڑی لذت ہے، اس لئے یعنی اس سلسلہ دراز ہونے کی تمنا رکھتا ہے، جناب طیب عثمانی ندوی کی اس کتاب کے ابواب حسب ذیل ہیں :-

حدیث اقبال، فکر اقبال، اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر، اقبال کا نظریہ شعر و ادب، اقبال اور عشق رسول، انسان کامل، اقبال کی نگاہ میں، اشتراکیت اور اقبال، عورت اور اقبال، تعلیم اور اقبال، "فقر اسلامی" اقبال کی نگاہ میں!

لائق مصنف نے افکار اقبال کا تجزیہ دل نشیں انداز میں کیا ہے، ان کا ذہن شعور اور وجدان اقبال کے خیالات سے خاص مناسبت اور ربط و شغف رکھتے ہیں! اس کتاب پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پیش لفظ تحریر فرمایا ہے۔

"اس کی شاعری میں دانائی حکیم اور عصائے کلیم دونوں ہی پائے جاتے ہیں" (ص ١٤) "دانائی حکیم" کے ساتھ "عصائے کلیم" کا کیا جوڑ "جرأت کلیم" لکھنا تھا ـــــ "فکر اقبال نے دل و نگاہ میں مزید تابانی بخشی" (ص ١٩) "میں" کی جگہ "کو" کا محل تھا ـــــ "ایسا فکر بخش جوش در مزیت ہے (ص ٢٧) "فکر بخش" نامانوس اور غریب ترکیب ہے ـــــ "آسمان ادب پر اقبال ایک روشن ستارہ کی طرح نمودار ہوا اور کچھ ہی دنوں کے بعد آفتاب بن کر چمکا اور اپنی تیز روشن کرنوں سے سارے عالم ادب کو ڈھانک لیا" (ص ٢٨) اس قسم کی ناپختگی کتاب میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون

از :- خورشید مصطفٰے رضوی، ضخامت ٥٧٤ صفحات، قیمت سات روپے

ملنے کا پتہ :- مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ٦

اس کتاب کا آغاز ہندوستان کے ایک نقشے سے ہوتا ہے، جن میں وہ مقامات اور علاقے دکھلائے گئے ہیں، جہاں قابل ذکر بغاوتیں ہوئیں! اس کے بعد کتاب کا انتساب ہے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سبھاش چندر بوس کے نام!

اس کتاب پر پیش لفظ ڈاکٹر تاراچند (سابق سفیر ہند برائے ایران) نے تعارف ڈاکٹر کے، ایم اشرف نے اور مقدمہ (حرف آغاز) مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیۃ علمائے ہند نے لکھا ہے۔

١٨٥٧ء کی جنگ آزادی پر یہ کتاب اپنی جامعیت، گوناگوں تفصیلات اور معلومات کے اعتبار سے نہایت ہی گرانقدر تاریخی پیش کش ہے! لائق مصنف نے انگریزی اور اردو کی درجنوں کتابوں سے استفادہ کے بعد کتاب لکھی ہے!

کتاب کا پہلا باب "پس منظر" ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جنگ پلاسی کے کیا اسباب تھے! اس کا کیا انجام ہوا؟ اس کی یاد نے ہندوستانیوں کے ذہنوں پر کیا نقوش قائم کئے، بنگال کو کس المناک تباہی سے گذرنا پڑا؟ اورنگ زیب کے بعد خاندان مغلیہ کے کٹھ پتلی بادشاہوں نے کیا کردار ادا کیا؟ وارن ہسٹنگز سے لے کر لارڈ ڈلہوزی تک ہندوستان کو انگریز کے پنجہ استبداد سے کیسی کیسی اذیتیں ملیں ـــــ ایک اقتباس :-

"یہ نفیس کپڑے (ڈھاکہ کی ململ وغیرہ) انگلینڈ میں اس قدر مقبول ہوئے کہ وہاں کی تجارت خطرے میں پڑ گئی، چنانچہ پارلیمنٹ میں قانون پاس کئے گئے، جس سے ہندوستانی کپڑے کا استعمال نہ صرف ممنوع قرار پایا بلکہ جرم سمجھا جانے لگا، ١٧٦٦ء میں ایک عورت پر دو ہزار پونڈ جرمانہ ہوا، کیوں کہ اس کا رومال ہندوستانی کپڑے کا تھا، اس کے علاوہ

ہندوستانی کپڑے پر ستر اور اسی فیصدی چنگی لگائی گئی، جس سے اس کی کھپت بالکل بند ہوگئی، اس پر ہندوستانی تاجروں نے فریاد کی ۔ ۔ ۔ ۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا، نتیجہ یہ کہ صنعت بالکل تباہ ہوگئی، ساتھ ہی تجارت بھی غارت ہوئی ۔ ۔ ۔"

دوسرے باب کا عنوان "چنگاریاں" ہیں! اس میں "ملک کی عام حالت انگریزی راج میں" اور "بغاوت کے فوری اسباب" بیان کئے گئے ہیں! تیسرا باب —— طوفان کی آمد آمد —— ہے، اس میں بغاوت کے محرکات کی تفصیل ملتی ہے، چوتھے باب (شعلے) میں ۔ بغاوت کے مفصل حالات ہیں کہ میرٹھ، دہلی، آگرہ، پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، بنارس، الٰہ آباد کان پور، اودھ، روہیل کھنڈ، بہار، بنگال، آسام، چھوٹا ناگ پور، کٹک، وسطِ ہند اور جنوبی ہند میں کیا ہوا؟

پانچواں باب —— سرفروشی —— مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے: ۔

انقلابیوں کا انجام —— دلیرانِ وطن —— تحریک ۱۸۵۷ء کے رُدرجِ رواں: ۔

"دلیرانِ وطن" کے تحت ان جانبازوں کے نام اور حالات دیئے گئے ہیں، جنہیں آج کوئی نہیں جانتا —— شاہ مل سنگھ جاٹ، امین گوجر، گلزار علی اور شیر علی، حکیم چندجی اور مرزا شیر، ماڑے خاں، راجہ بینی مادھو سنگھ، دیوان حکمت اللہ راجہ ہنومنت سنگھ، آغا مرزا، محمد شفیع، فضل علی، احمد خاں کھرل، شہزادہ عظیم بیگ، سرنام سنگھ، نشان سنگھ، راجہ جے لال سنگھ، رسول بخش کا کوروی، اور ہری کشن سنگھ کی شخصیتوں پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں، جنہیں اس کتاب کے مصنف نے اُٹھایا ہے ۔

"ناکامی اور انتقام" —— یہ اس کتاب کا سب سے دردانگیز باب ہے آخری باب (نتائج وثمرات) میں بتایا گیا ہے کہ فرانس، روس، اٹلی، امریکہ، چین، انگلینڈ، اور ایران کے لوگوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کا کیا تاثر قبول کیا "بغاوت کے بعد" —— یہ ذیلی باب بھی بہت اہم ہے ۔

دہلی میں انقلابی سپاہیوں کا اعلان، بہادر شاہ کا فرمان، جہاد کا فتویٰ، وغیرہ تاریخی نوشتوں کی نقول اس کتاب کے ضمیمے میں شامل کی گئی ہیں!

اس بغاوت کی کیا نوعیت تھی؟ اس کے بارے میں فاضل مصنف کی یہ رائے ہے: ۔

"جس طرح بغاوت کو خالص "فوجی شورش" یا "غدر" قرار دینا، واقعات کے آئینے میں بالکل غلط ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی حقیقت میں رنگ آمیزی ہے کہ بغاوت کی تہ میں دیش بھگتی کے قومی جذبات پوری طرح کارفرما تھے، یا یہ کہ وہ ملک کی سیاسی آزادی کے حصول کی مکمل اور ملک گیر پیمانے پر پوری طرح منظم جدوجہد تھی، حقیقت یہ ہے کہ تحریک ۱۸۵۷ء ایک ملا جلا کردار پیش کرتی ہے، اس میں مختلف اور متضاد کردار و واقعات کچھ اس طرح پیوست اور خلط ملط ہیں کہ ہر ایک اپنے نقطہ نظر سے نتائج برآمد کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تحریک کا ٹھیک ٹھیک کردار، بعض حضرات کی نگاہ میں ابھی تک متعین نہ ہو سکا۔"

مصنف کا کہنا یہ ہے کہ سنہ اٹھارہ سو ستاون کی تحریک کو روس کے لینن یا امریکہ کے واشنگٹن جیسی شخصیت اور

صلاحیت کے لیڈر میسّر نہ آسکے۔

اور

" انقلابیوں کے سامنے کوئی واضح اور مشترک تعمیری پروگرام نہ تھا۔ صرف انگریزوں کی دشمنی کے جذبات پورے عروج پر تھے . . . "

اور

" بہادر شاہ کو تمام ملک بادشاہ مانتا تھا، اگر اُن میں بابر، ہمایوں اور اکبر جیسی اولوالعزمانہ
صفات کا شائبہ بھی ہوتا، تو شاید انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ دوسرے انداز میں لکھی
جاتی، لیکن . . . . . ضعیف و ناتواں بادشاہ ایک کھلونا سا بن کر رہ گیا، حتیٰ کہ وہ
شکست کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے بخت خاں کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں، اس
تذبذب اور غیر مستقل مزاجی نے تحریک کو زبردست نقصان پہنچایا "

اس تحریک آزادی میں علمائے کرام نے جس جانبازی، سرفروشی اور حق شناسی کا مظاہرہ کیا ہے، یہ اس داستان کا زرین باب ہے!

مصنف کا انداز بیان سنجیدہ اور سُلجھا ہوا ہے، زبان شستہ اور رواں ہے —— وہ گرمی کی شدت سے کلبلا کر بیٹھا کھڑے ہوئے (ص۱۷۱) "کلبلانا" یہاں بالکل بے محل استعمال ہوا ہے، "بدحواس ہو کر" یا "گھبرا کر" لکھنا تھا۔ —— ایک جگہ "بارود" کو مذکر لکھا ہے۔

صفحہ ۱۷ پر محمد شاہ رنگیلے کے باورچی خانہ کا خرچ تین کروڑ روپے ماہوار بتایا گیا ہے' یہ مبالغہ ہے! بادشاہوں کے جود و سخا اور شاہانہ اخراجات کے بارے میں عام طور پر لوگ زیب داستان کے لئے مبالغہ سے کام لیتے ہیں! صفحہ ۲۶۰ پر حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا سنہ وفات ۱۸۶۷ء لکھا گیا ہے' جو درست نہیں!

کتاب اپنی جگہ خوب نہیں، بہت خوب ہے' لائق مصنف نے بڑی محنت تحقیق اور کدوکاوش کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے' نقل کے ساتھ ساتھ اُن کی "عقل" نے بھی ایک تاریخی ناقد کا کردار ادا کیا ہے۔

اُردو میں علمِ ہجا

از:- متین حیدرآبادی' ضخامت ۱۰۴ صفحات' قیمت:- تین روپے
ملنے کا پتہ :- حیدرآباد اُردو اکیڈیمی' سلطان پورہ حیدرآباد دکن (انڈیا)

یہ کتاب حیدرآباد اُردو اکاڈیمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے' جناب سعادت نظیر (ایم اے) نے اسے ترتیب دیا ہے، اور مُصنّفِ کتاب کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں!

مولانا ابوالمحاسن محمد حسن خاں متین شاعر تھے، مقالہ نگار اور مترجم تھے اس کتاب میں مرحوم نے زبان، اختلاف السنہ حروف کی گروہ بندی' صوتیات، ہجا، مخارج، صفات، اسمائے حروف پر جو کچھ لکھا ہے تحقیق و کاوش کے ساتھ لکھا ہے فاضل مصنف کی یہ رائے ہے کہ اُردو زبان کی ہجا کو صوتی و لسانی اصول کے مطابق بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے ——

مولانا متین مرحوم نے اس خطرے کی صحیح اور بروقت نشان دہی فرمائی ہے کہ بعض متجددین اُردو رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدلنے کی کہیں حماقت نہ کر بیٹھیں —— وہ لکھتے ہیں :-

"ادھر ترکوں کی انقلاب کن تجویز نے کہ" ترکی زبان کے حروف ہجا لاطینی حروف میں تبدیل کیے ہیں ۔ ہماری ذہنیتوں پر جو اثر ڈالا ہے' اس سے ہمیں اس بات کا ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس سے متاثر ہونے والے تجدد پرور دماغ ظہر متغلل کی طرح ہماری علمی جدوجہد میں رکاوٹ پیدا کر کے خواہی نخواہی اُردو حروف کو لاطینی ہجا سے بدلنے کی کوشش نہ کریں اور ان ہی وجوہ کے مدنظر اس باب میں اہم لغزش ہو گئی ، اگر ہم اُردو کی ہجا سے ہم آواز حرفوں کے خارج کرنے کی تجویز کو قبول کر لیں گے ، کیوں کہ اس سے زبان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ ہماری موجودہ ہجا کی وسعت و ہمہ گیری سلب ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ "

متاعِ تسکین

از :- تسکین قریشی' ضخامت ۱۶۰ صفحات (مجلد ، رنگین گرد پوش)
قیمت :- تین روپے ، ملنے کا پتہ :- مصنف سے' مجلہ بنی اسرائیل' میرٹھ

جنابِ تسکین قریشی کے مجموعہ کلام ـــــ گلگونہ ـــــ پر " فاران " میں مفصل تبصرہ ہو چکا ہے ، متاعِ تسکین میں گلگونہ کی تمام غزلوں اور نعتیہ نظموں کے علاوہ ، تسکین صاحب کے ابتدائی اور عبوری دور کی خاص خاص منتخب منظومات بھی حذف اور اضافہ و نظرِ ثانی کے بعد شامل کی گئی ہیں' ساتھ ہی گلگونہ کی اشاعت کے بعد شاعر نے جو کچھ کہا ہے' وہ کلام بھی اس کتاب کی زینت ہے ۔

حضرت تسکین قریشی غزل کے شاعر ہیں' اُن کا کلام اصغر ، فانی ، حسرت اور جگر کے تغزل کی صدائے بازگشت ہے' یا یوں کہیے اس سلسلۃ الذہب کی خوب صورت لڑی ہے ، مولانا عبدالماجد دریابادی' پروفیسر آل احمد سرور ، نیاز فتحپوری اور اثر لکھنوی جیسے اہلِ قلم اور ناقدین نے تسکین کے کلام کو بہت کچھ سراہا ہے ، متاعِ تسکین کے مقدمہ نگار مولانا شاہ معین الدین احمد مدیر " معارف " ان کے بارے میں لکھتے ہیں :-

" جنابِ تسکین اس دور کے بہترین غزل گو شاعر ہیں' ان کا تغزل سراپا حسن و لطافت ہے ، ان کا کلام فن کی پختگی ، زبان کی صحت و سلاست ، قدیم و جدید تغزل کے صالح عناصر کی لطیف آمیزش کا نمونہ اور حسرت و جگر کے تغزل کا دو آتشہ ہے ۔ ۔ ۔ "

جنابِ تسکین قریشی کے کلام میں پاکیزگی اور سنجیدگی کے ساتھ رنگینی بھی ملتی ہے ، اُن کی طبیعت اور مزاج سنجیدہ اور باوقار ہیں' شوخ نہیں ہیں ، یہی چیز اُن کی شاعری میں جھلکتی ہے ! زبان و فن کے بارے میں وہ بہت زیادہ محتاط ہیں' اور زبان و بیان اور فکر و خیال کی ایسی آزادی کو تو وہ برتنا ہی نہیں جانتے ، جس سے بے راہ روی کو شہ ملتی ہو ! رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی مرحوم سے ان کے انتہائی اخلاص و محبت کے روابط تھے ، جس طرح تسکین کو جگر نے متاثر کیا ہے ، اسی طرح جگر بھی تسکین سے متاثر ہوئے ہیں !

" نعتیہ کلام " کے یہ چند شعر کتنے وجد آفریں اور ایمان افروز ہیں :-

اشرف الخلق و خیر الانام السلام　　فخرِ آدم علیہ السلام السلام
السلام اے دعائے خلیل و ذبیح　　اے تجلّیِ بیت الحرام السلام

عاشق ذات و محبوب مولائے صفات — بندہ خاص و آقائے عام اسلام
راحتِ جانِ مشتاق روحی فداک — مونسِ قلب ناشاد کامِ اسلام

"مظہر تجلیات" "تمنائے مدینہ" اور "ذوق و شوق" بڑی کیف آفریں نعتیہ نظمیں ہیں۔ تنہا یہ شعر سینکڑوں نعتیہ غزلوں پر بھاری ہے۔

خود راہبرِ منزل و خود منزلِ مقصود — نقشِ قدمِ سید والائے مدینہ

غزلوں کے منتخب اشعار:۔

ہمہ مستی، تمام مدہوشی — عشق ہی کیا جو اعتدال رہا
ذکر ہے تیری بے نیازی کا — اب ہمارا کہاں سوال رہا

اللہ اللہ! یہ مستیِ شوقِ طلب — جتنا سرشار ہوں، اتنا ہی تشنہ لب
پھر یہ دوری ہی کیا، یہ تغافل ہو کیوں — تم سراپا کشش، ہم مجسم طلب

کھوئے ہوئے رہتے ہیں نہ دُنیا ہے نہ دیں یاد — اے دوست! تری یاد ملی کچھ ہم کو نہیں یاد
اک سجدہ ہماری بھی طرف سے سرِ منزل — اے اہلِ طلب! آئیں جو ہم خاک نشیں یاد
کہتے تھے کہ تسکیں کو دہ بھولیں گے کبھی ہم! — سنتا ہوں مرا نام بھی اب اُن کو نہیں یاد

جب سے وہ دامن چھوٹ گیا ہے، دل ایسا کچھ ٹوٹ گیا ہے
اشک ہیں لیکن خشک ہیں آنکھیں غم ہے مگر احساس ہے مشکل

محبت بھی ہے رسوائی کا ڈر بھی — لئے نام محبت کر نہ بدنام
کیا لالہ و گل، کیا ماہ و انجم — سب منتظر ہیں کب آؤ گے تم
ہے عشق زندہ جذبۂ جنوں سے — دریا کی ہستی موج و تلاطم

یہ کیا ادا تھی اے حُسنِ خود بیں! — دیکھا مجھے اور نظریں نہ اُٹھیں
رنگ و نکہت کو نہ دیکھو کہ اسی گلشن میں! — وہ بھی کلیاں ہیں، جنہیں موسمِ گل راس نہیں
بڑھتے ہیں ہاتھ بھی ساقی کی جانب — قدم بھی ڈگمگاتے جا رہے ہیں
نہ ہو جب تک جنوں میں بے نیازی — حقیقت کم، بہت افسانہ سازی

عشق آشفتہ حال جب سے ہے — زندگی نالہائے شب سے ہے
یہ جو دُنیا ہے اور جب سے ہے — بے سبب ہے تو کس سبب سے ہے
اُن سے جتنی ادائیں ہیں منسوب! — دل کو اک ربطِ خاص سب سے ہے

کس سے پوچھیں، ہم نے کہاں وہ جلوۂ روشن دیکھا ہے — محفل محفل ڈھونڈ چکے ہیں، گلشن گلشن دیکھا ہے
آج اُنہیں جو چاہو سمجھ لو ورنہ یہی تسکیں ہیں جنہیں — کل تک ہم نے کوئے بتاں میں خاک بدامن دیکھا ہے

نہ پوچھا مگر حالِ دل سن لیا — نہ دیکھا مگر مسکرانے لگے
ہمیں تو غمِ پائمالی نہ تھا — اُنہیں کے قدم ڈگمگانے لگے

اسیری سے فطرت بدلتی نہیں — چھٹے اور نشیمن بنانے لگے

بات کب آپ کی برہمی تک تھی — اور بھی ظلم اس کے سوا ہو گئے

اُن سے کہنے گئے تھے غمِ دل مگر — جتنے شکوے تھے سب التجا ہو گئے

مستی و میکشی کارِ آساں نہ تھا — ہم نے! وہ رند جو پارسا ہو گئے

پھر کہاں حالِ دل کہا جائے — جب ترا ذکر لب پہ آ جائے

ہے یہ سب کشمکشِ کشتی و دریا مجھ سے — ڈوبتا ہوں میں نہ طوفان ہی کم ہوتا ہے

روشِ عام نہیں، مسلکِ اربابِ جنوں — بچ کے چلتے ہیں جدھر نقشِ قدم ہوتا ہے

بیخودی میں، نہ محبت میں کمی ہے ساقی — دورِ صہبا نہ سہی، دل تو وہی ہے ساقی

زندگی میکدۂ تشنہ لبی ہے ساقی — پیاس دل کی نہ بجھے گی نہ بجھی ہے ساقی

لغزشوں میں بھی قدم اُٹھتے ہیں تیری ہی طرف — کتنی معصوم مری بادہ کشی ہے ساقی

ہر لمحۂ حیات دل و جاں پہ بار ہے — زندہ ہوں اس لئے کہ ترا انتظار ہے

دے چکے دل تو کسی سے ہمیں کیا لینا — عشق در اصل تمنا کا مٹا لینا ہے

مرتے ہیں اور مر نہیں سکتے — جان دیتے ہیں دی نہیں جاتی

جلوہ تا حدِ نظر، حدِ نظر تا شوقِ دل — اس کے آگے جو بھی ہے، سب خود فراموشی میں ہے

محبت میں کسی کی کیا شکایت — جو ہوتا آ رہا ہے، ہو رہا ہے

وہ چھپے جب تک جہاں قائم رہا — وہ نکل آئے قیامت ہو گئی

ہم جہاں شورشِ مستی پہ اتر آتے ہیں — پھر وہ خلوت ہے کہ محفل نہیں دیکھا جاتا

ہستیٔ انساں، بس اک قطرہ ہے لیکن مضطرب — وقت اک دریائے بے پایاں ہے اور خاموش ہے

کہاں تک حسن بھی آخر کرے تاراجِ غم دل کو — محبت روز اک دُنیا نئی آباد کرتی ہے

قامتِ دلجو، فتنۂ دوراں — جسم سمن بُو، روحِ بہاراں

ایک نظم "مُرغابی" ہے، اُس کا ایک بند:—

پہلے اُڑی پھر گر پڑی — گر کر چلی، چل کی بڑھی

اللہ رے پیراکی تری

دم میں کہیں، دم میں کہیں

دوسرا رُخ :—

بے خبر انساں! دل پہ ہے مدارِ کارِ زیست — رُوح کو واصل بہ حق کرتا ہے استعمارِ زیست (ص ۱۱)

استعمار کے معنی ہیں "لوگوں کو بسانا"، "نو آبادی قائم کرنا" (COLONIZATION) اس شعر میں یہ لفظ ثقیل بھی لگتا ہے اور معنوی اعتبار سے بھی اس کا استعمال کھٹکتا ہے۔

لفظ لفظ صفحۂ ہستی کا عشق آموز ہے — موت کہتے ہیں جسے وہ عشق ہی کا سوز ہے

"موت" کو "عشق کا سوز" کہہ دینے سے بات بنی نہیں!

کاہش ہجر رنگ لاکے رہی — دل اُنہیں دیکھتے ہی بھر آیا (ص۳۳)

"کاہش" نے شعر کو کمزور کر دیا۔

تھا بہت شکوۂ تغافل حسن — سو وہ خود منتظر نظر آیا

"سو" یہاں بے محل استعمال ہوا ہے!

سجدوں میں کہیں ہو نہ گئی ہو کوئی لغزش — آیا نہیں کیوں آج وہ غارت گر دیں یاد (ص۴۰)

سجدے کسے کئے جا رہے ہیں؟ پھر سجدوں کی لغزشوں اور محبوب کے یاد نہ آنے میں آخر ربط کیا ہے؟

پھر بھی تو ہی ہے مقصود ہستی — اور دشمن دل غارت گر دیں (ص۵۰)

"ہستی" کی جگہ "الفت" لانا تھا! "دشمن دل" اور "غارت گر دیں" مجازی محبوب کی صفات ہیں، اس لئے "مقصود الفت" لانے سے شعر سے مفہوم کی صحیح ترجمانی ہو جاتی، اور مصرعہ حسین اور چست بھی ہو جاتا۔

دل کا بھی اک مقام ہے زاہد — سجدہ و خانقاہ سے پہلے (ص۶۳)

مسجد و خانقاہ سے پہلے دل کے مقام کا پایا جانا —— آخر یہ بات کیا ہوئی!

اک تجلی سی دل میں ہوتی ہے — اعترافِ گناہ سے پہلے

شاعر کا اپنا کوئی ذاتی تجربہ ہو تو دوسری بات ہے! ورنہ دل میں اُجالا، اعترافِ گناہ اور ندامت و توبہ کے بعد ہونا چاہیے "اعتراف" کے ساتھ "ارادہ" یا "عزم" جیسا کوئی لفظ آ جاتا تو مفہوم درست ہو جاتا۔

بہت دعویٰ دل بری تھا مگر — وہ نیچی نظر جب وہ جانے لگے (ص۶۵)

مفہوم خاصہ گنجلک اور مبہم ہے۔

ہے روا میکشی اُسی کے لئے — جس کو ساقی بھی دیکھتا جائے (ص۶۷)

یہ شعر انتخاب کرتے وقت چھانٹ دینے کے قابل تھا۔

حضرت تسکین قریشی شاعر تغزل ہیں، مگر اُن کی نظمیں بھی خاصی جاندار اور دل کش ہیں! —— "ماہی بے آب" —— طاؤس —— قاز —— مُرغابی —— ان پر اُردو میں نظمیں شاذ و نادر ہی کہی گئی ہیں "قاز" اور "مُرغابی" کی طرف اُردو کے کسی شاعر کا خیال ہی نہیں گیا، تسکین کی یہ نظمیں اُن کے شاعرانہ مطالعہ کی وسعت اور پھر اُس کے اظہار کی قدرت کا ثبوت دیتی ہیں۔

"متاعِ تسکین" نے اُردو شاعری کی ثروت میں اضافہ کیا ہے، افسوس ہے اپنی خاموش طبع اور زمانہ کی قدر ناشناسی کے سبب تسکین قریشی کو وہ شہرت میسر نہ آسکی، جس کے وہ مستحق ہیں۔

ٹھنڈی بجلیاں

از :- بھارت چند کھنہ، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر "ایوانِ اُردو" خیریت آباد، حیدرآباد ۴ (انڈیا)

جناب بھارت چند کھنہ کے چودہ مضامین اس کتاب کی زینت ہیں، ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مختصر سا پیش لفظ لکھا ہے بھارت چند کھنہ کی تحریر میں سنجیدگی و مزاح کا امتزاج پایا جاتا ہے، وہ چٹکیاں بھی لیتے ہیں اور گدگدیاں بھی کرتے ہیں! اُن

کے قلم نے بعض مقامات پر جذبات کی اچھی مصوری کی ہے اور واقعات وحقائق کو نثر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ بیویوں سے اُن کے شوہر باہر آنے جانے اور بیرونی مصروفیات کے بارے میں کیسے کیسے سفید جھوٹ بولتے اور طرح طرح کے حیلے تراشتے ہیں، ایک ایسے موقع پر جب بیوی کی "جرح" اور نفسیاتی دریافت پر میاں کا جھوٹ کھل چکا ہے، مصنف نے شوہر کی اس حالت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے :-

"آپ کی حالت اس انسان کی طرح ہوتی ہے، جس کو تلوار چلانی نہ آتی ہو لیکن جس کو اپنی جان
بچانے کے لئے تلوار پکڑا کر دُنیا کے سب سے اچھے شمشیر زن کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔"

—— "ضمیر کی لعنت سے کیسی اذیت پیدا ہو سکتی ہے"۔ (ص۱۲) "ملامت" لکھنا چاہیے تھا —— "دروغ مصلحت آمیز کا سہارا لیتا ہے اور خطا کھاتا ہے" (ص۳۴) "خطا کھانا" روزمرہ کے خلاف ہے —— "صدر صاحب کو زحمت ہونے کی معذرت مانگتے ہوئے ۔۔۔" (ص۹۸) "معذرت کرتے ہوتے" یا "معافی مانگتے ہوتے" لکھنا تھا —— کہتے ہیں کہ بیوی اور بچے گھر کی رونق ہوتے ہیں، اور اُن کے بنا گھر سُونا پڑ جاتا ہے" (ص۱۳۶) "اور" کی ضرورت نہ تھی، "بیوی بچے" لکھا اور بولا جاتا ہے، پھر "سُونا پڑنا" روزمرہ کے خلاف ہے "گھر سُونا سُونا لگتا ہے" کا محل تھا۔

"ایک جھوٹ ایسا ہوتا ہے جس کو ہر دو ہمکلام دیدہ و دانستہ بولتے ہیں" (ص۲) "ہر دو ہمکلام" نے جملہ کو نامختصر بنا دیا —— "اور ایسی بلند آواز میں اپنے دودھ کے خالص ہونے کے متعلق دعوی کرنے لگتی ہے کہ مشرق سے نکلنے والا سورج بھی ظاہر ہونے سے پہلے لرز اُٹھتا ہے"۔ (ص۱) بالکل بچکانہ انداز بیان —— "نامہ بر کی اب ضرورت نہیں، نہ برگ حنا پر خط لکھنے کی حاجت" (ص۱۱۶) "برگ حنا" پر خط لکھنا، واقعہ کے اعتبار سے غلط ہے —— "سارا گھر دو ندہ آنکھیں ملتے یک لخت اُٹھا" —— "گھر" لکھنا چاہیے تھا! "گھر وندہ" اور "گھر" میں معنوی اعتبار سے بہت فرق ہے —— "جہاں اور ترکیبیں کارگر ثابت نہ ہوں، وہاں یہ آخری نسخہ یعنی سالے کے توسط کو نہ بھولئے"۔ (ص۱۴۷) اس ناہموار اور غیر ادیبانہ جملہ پر کتاب ختم ہوتی ہے —— "یہ آخری" نہیں "اس آخری" لکھنا تھا۔

شراب از :- نواب سید محی الدین علی خاں تصوّر، ضخامت ۲۲۴ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت ۵ روپے ۵۷ پیسے، غیر مجلد تین روپے ۸۷ پیسے، ملنے کا پتہ :- ۲۶۵- جاوید منزل، کلیٹن روڈ، کراچی

سید محی الدین علی خاں تصوّر حیدر آباد دکن کے ایک معزز خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے دادا سردار دلیر الملک بہادر کا دکن کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ تصوّر صاحب کی شاعری کا سنہ آغاز ۱۹۲۹ عیسوی ہے، وہ شاعری کی ہر صنف میں مشق سخن کرتے رہے ہیں! "شراب" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس کا "تعارف" انھوں نے خود ہی لکھا ہے —— ایک اقتباس :-

"میری موجودہ عمر ۴۴ سال ہے، ۵ مارچ ۱۹۲۶ء کو میں نے اپنی شادی
کی کہ چل چلاؤ کے دن قریب ہیں"۔

اگر کوئی دوسرا تعارف نگار، کسی کا ان لفظوں میں تعارف کراتا، تو اسے "ہجو ملیح" سمجھا جاتا۔

"۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں
اُن لوگوں میں ہوں جو حسبِ ضرورت ہمہ قسم کے کام کر لیتے ہیں"۔

اس "نثر پارے" سے تصوّر صاحب کی نثر نگاری کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے! "خود اعتمادی" کی انتہا ہے کہ موصوف

کسی آرٹسٹ کی خدمات حاصل کرنے کی بجائے، اس کتاب کا سرورق خود ہی بنایا ہے، اور اپنے قطعوں کو خود ہی مصوّر فرمایا ہے، اور اپنی خطاطی کا نمونہ بھی پیش کیا ہے! اپنی کسی تصنیف کے ساتھ اس طرح کا مذاق شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

چند منتخب اشعار:۔

تم شانِ غزل، آنِ غزل، جانِ غزل ہو — محبوب ہو، مطلوب ہو، عنوانِ غزل ہو

زندگی ہے بھی تو اک وہم یقیں ہے گویا — ہے جو موجود، وہ موجود نہیں ہے گویا

ہماری داستاں سارے جہاں کی داستاں نکلی — ہمارا رازداں، سارے جہاں کا رازداں نکلا

اپنا نام بتا کر ہم کو — بھول گئے وہ نام ہمارا

اشک بہتے ہیں مگر اب اُن کا — تیرے دامن سے تعلق نہ رہا

تجھے خبر نہیں یہ قلزمِ محبت ہے — پتہ چلے گا تجھے ڈوب کر کناروں کا

اے آرزوئے ترکِ تمنا خبر بھی ہے — کن اُلجھنوں میں کوئی تمنا طلب رہا

ڈھونڈتے ہیں مگر نہیں ملتا — کوئی ہم جیسا مہرباں اپنا

وہ ربط و تعلق جو ابھی غم نہ ہوا تھا — احساسِ محبت تھا جو محکم نہیں ہوا تھا

ہم سے کیوں بگڑی ہے دُنیا — دُنیا کا کیا ہم نے بگاڑا

وہ جو پھولوں سے سبک تر تھی وہ ہستی ہے یہ — آج اک بوجھ ہے اک بارِ الم ہے گویا

اور مشکل میں دل کو ڈال گیا — غم گیا تو خوشی پہ ٹال گیا

دور تک ہاں! نظر گئی لیکن — ماورائے نظر خیال گیا

ہجر کی رات ہائے! کیا آئی — وصلِ محبوب تک خیال گیا

کہنے والے بھی کہہ کے پچھتائے — سُننے والوں کو بھی ملال ہوا

اس نگار خانے میں دو نقوش اُبھرے ہیں — ایک نقشِ سجدہ ہے، ایک نقشِ پائے دوست

اب کریں بھی تو کیا کریں فریاد — کرم دوست ہے ستم ایجاد

دل تو ویرانہ ہے ویرانے میں — تجھ کو آباد کروں، یا نہ کروں

دل میں بھڑکی آنچ کے شعلے، شاید دھیمے پڑ جائیں
ٹھہر ذرا او چھیڑنے والے! رو لوں میں تو بات کروں

مصیبت ہی کو ہم راحت سمجھ لیں تو بُرا کیا ہے — اگر راحت نصیبِ دُشمناں ہے بھی تو ہونے دو

تجھ پہ الزام نہیں سوزِ دروں کے مالک — شمع جلتی ہے تو پروانہ بھی جل جاتا ہے

میرے افسانے کی تم سُرخیِ افسانہ بنے — مے بنے، شیشہ بنے، ساقی و پیمانہ بنے

قصۂ عشق کے دو باب جُداگانہ بنے — میں بھی افسانہ بنا، آپ بھی افسانہ بنے

ہے کرم کی ذرا سی پرچھائیں — بے رُخی کے بہت گھنے سائے

غمِ اُمید ہے، اُمیدِ کرم کیا کہیے — اب ستم گر سے بہ عنوانِ ستم کیا کہیے

ہم تڑپتے ہیں تو ہنستا ہے زمانہ ہم پر　　ہم بچھڑتے ہیں تو چھپتا نہیں غم کیا کہیے
یارا بھی ہے، کچھ اُن سے چھپائیں بھی نہیں　　کچھ نہ کہنے کی بھی کھائی ہے قسم کیا کہیے
حسرتِ دوست بڑھا دی ہے غمِ دوست　　کس مصیبت میں گرفتار رہیں ہم کیا کہیے

سرورق کے ایک قطعہ کے بعد کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے: —

اے تصور یہ تصوف کی شراب　　تو شرابوں میں ملا دے ظالم

شرابوں سے آخر کیا مُراد ہے؟ ——— وہسکی، رم اور شیمپین یا تصوف کی طرح دوسرے علوم و فنون کی شرابیں! اس شعر میں ردیف (ظالم) کتنی اُکھڑی اُکھڑی سی لگتی ہے۔

حُسن بینم کہ خیالِ ما است　　ایں جمالے کہ جمالِ ما است
ایں چراغاں ز چراغِ ہستی　　ایں غزالاں کہ غزالِ ما است

غریب فارسی زبانِ حال سے فریاد کر رہی ہے —

ع مجھ پہ کرتے جو نہ احسان، تو احساں ہوتا

چار مصرعے ہیں، جن کو شاعر نے نہ جانے رُباعی سمجھ کر موزوں کیا ہے، یا قطعہ سمجھا ہے۔

یہ چرخِ کہن گردشِ دوراں ہے شراب　　میری آزردہ نظر، چاک گریباں ہے شراب
ان حسینوں کا یہ اندازِ تکلم یارب　　ان دمکتے ہوئے چہروں میں غزلخواں ہے شراب

شراب "آزردہ نظر" ہے "چاک گریباں" ہے، اور حسینوں کے چہروں میں "غزلخواں" ہے۔ ان بے تکی باتوں پر مزید ستم یہ کہ پہلے مصرعہ کا وزن باقی کے تین مصرعوں سے بالکل مختلف ہے۔

میری اک حسرتِ آزار ہے عشق　　دلِ بے تاب و دل زار ہے عشق
تیری آنکھوں میں ہے کلیوں کا خمار　　تیرے پازیب کی جھنکار ہے عشق

اس انداز کا "اہمال" کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

الفاظ مطالب کی نزاکت کو نہ سمجھیں　　اس حال میں اک سوختہ سامانِ غزل ہو　(ص۱)

مصرعہ اولیٰ کوئی شک نہیں بہت اچھا ہے ——— مگر مصرعہ ثانی نے پورے شعر کو مہمل بنا دیا، "اس حال" سے آخر کونسا حال مُراد ہے! پھر محبوب جو شاعر کا مطلوب ہے، شانِ غزل، جانِ غزل اور عنوانِ غزل ہے، وہ بیچارہ "سوختہ سامانِ غزل" کیسے بن گیا!

دیر و کعبہ سے صنم خانۂ دل میں نکلے　　سجدۂ شوق کوئی ہے تو یہیں ہے گویا　(ص۳)

پہلے تو "سے" کا استعمال ہی وجدان کو کھٹکتا ہے ——— پھر دوسرے مصرعہ میں شاعر کا مفہوم اس کے "بطن" ہی میں گھٹ کر رہ گیا۔

وجۂ تخلیق دو عالم ہوئی اُلفت میری　　عرش پر مجھ سا بھی اک خاک نشیں ہے گویا

دوسرے مصرعہ کو پہلے مصرعہ سے آخر ربط کیا ہے! پھر اللہ تعالیٰ کو اپنا جیسا خاک نشین سمجھنا، کتنی ایمان سوز نکتہ سنجی ہے

میرے جذباتِ محبت سے ہے دُنیائے خیال　　چاند تاروں کی، ستاروں کی زمیں ہے گویا

آخر یہ بات کیا ہوئی ! " چاند تاروں " کے بعد " ستاروں " کہنے کی کیا ضرورت تھی ؟

یہ دلِ حزیں اپنا جو کہ ایک قیامت ہے　　بے قصور ہونے پر ہم نے بے خطا پایا　(ص۷)

دوسرے مصرعہ میں صرف لفظوں کو جوڑ دیا ہے ' اس سے غرض نہیں کہ ان لفظوں سے کوئی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے !

چن رہی تھی ہمیں نگاہِ دوست　　کچھ تعامل بھی انتخاب میں تھا　(ص۸)

شاعر کو " تعامل " کے معنیٰ ہی کا سرے سے پتہ نہیں ہے ! ممکن ہے کہ " تامل " (پس و پیش کے معنی میں) کو " تعامل " املا فرمایا گیا ہو اور یہ بات ہم نے اس بنیاد پر کہی ہے کہ سراساں کو حراساں (ص۲۳) غیظ کو غیض (ص۳۷) تلاطم کو طلاطم (ص۲۴) سلسلہ جنباں سلسلہ مجبباں (ص۳) اور خد و خال کو قد و قال (ص۱۶۲) کتابت کیا گیا ہے ' اور شاعر کی اس " بے خبری " کی تہمت بیچارے کاتب کے سر نہیں ڈالی جا سکتی ۔

کوئی حسرت ترے شباب میں تھی　　کوئی دل بھی ترے شباب میں تھا
یہ تصورِ حیاتِ فانی کا　　زندگی جیسے اضطراب میں تھا

شاعر نے " صنعتِ اہمال " میں ید طولےٰ حاصل کیا ہے ۔

ہمارے دل میں اُن کا عشق گویا　　چراغِ زندگی ہے زندگی کا

" زندگی " کا " چراغِ زندگی " ! یہ شب برات کی رات والی بات ہے ۔

یہ دُنیا کر رہی ہر کس کا ماتم　　کوئی کہہ دے تصور کی کمی کا　(ص۱۱)

کہنا یہ ہے کہ تصور کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد، بزمِ کائنات میں جو کمی آگئی ہے ' دُنیا اس " کمی " کا ماتم کر رہی ہے ــــ مگر اندازِ بیان ! ؟ !

رحم کر وے تابیٔ دل پہ　　رحم کرو اس دل پہ خُدارا　(ص۱۲)

" دندانِ تو جملہ در دہانند " کا مصداق ایسے ہی جوڑے ہوئے الفاظ ہوتے ہیں ۔

ہم نے ٹھانی ہے کہ افلاک کو شرمائیں گے　　اپنے آغوش میں ہے اک مہِ تاباں اپنا　(ص۱۴)

شاعر کا یہ مہِ تاباں ' شاید اُس کی گود میں منہ چھپائے بیٹھا ہے ' جب شاعر اُس کے رُخ سے نقاب الٹ دے گا، اُس وقت فلک نہیں " افلاک " شرما جائیں گے ــــ ! " ہم نے ٹھانی ہے " اس کا محل پھر بھی سمجھ میں نہیں آیا ۔

اس دھڑکتے ہوئے دل میں بصد ایمائے خیال　　کوئی نشتر نہ چبھو دے یہ رگِ جاں اپنا

" بصد ایمائے خیال " ایک ٹکڑا ذہن میں آیا، اور یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کے کیا معنی ہیں ' جھٹ سے شعر میں جوڑ دیا، پھر " رگِ جاں " کو نشتر بنا دینا ، اور اُس کا دھڑکتے ہوئے دل میں چُبھنا ـــــ ایک ایسی " ندرت " ہے جسے پڑھیئے اور شعر و ادب کی قسمت پر ماتم کیجیے ۔

ہمکو اگر خبر ہوتی سانس روک لیتے ہم　　یہ تنفس پیہم آہِ دمبدم سے ہے　(ص۱۶)

اگر سانس روک لیتے تو حضور کی موت واقع ہو جاتی ! پہلی بار اس کا انکشاف ہوا کہ دمبدم آہ کرنے سے " تنفس " کا مرض لاحق ہو جاتا ہے !

تمہاری نظرِ کرم کو کرم کی عادت ہے　　رقیب کو یہ شکایت ہے ہم نصیب ہوا　(ص۲۰)

"تسنیمِ کرم" کو "نذرِ کرم" کے وزن پر نظم کیا ہے یعنی "م" کی حرکت کو شاعر نے "ساکن" فرمادیا، اور "چشمِ کرم" شاعر کے ذہن میں نہیں آیا! رہا مفہوم، سوائس کو بس ڈھونڈتے ہی رہئیے۔

ہوئے بھی گو یا تو گویا نہیں ہوئے ہملوگ — ہوا تو گویا وجودِ عدم نصیب ہوا

شاعری کے ساتھ اور ایسا مذاق —— فریاد!

آپ کا کوئی خیالِ تاباں — آفتابِ شبِ ہجراں نکلا (ص ۳۲)

ایسے بے تکے شعر پڑھ کر وجدان شدید اذیت محسوس کرتا ہے۔

غمِ ہستی کے چراغوں کو جلانے والا — کیا کوئی اور الٰہی صفِ انساں میں نہ تھا
چاندنی رات وہ ظالم ہے کہ اللہ اللہ — رُخِ تاباں کا اُجالا مہِ تاباں میں نہ تھا
چپتو ہم سے کس نے چھینا — ڈوب رہا ہے دل کا سفینہ
یہ محبت مری دُشوار نہ آساں ہوگی — دلِ فرہاد مرا قیس بیاباں ہوگا
یہ نہ سمجھے تھے عشق جیسا رو — دلِ بے تاب مبتلا ہوگا
چھین لی ہے آپ نے کیوں زندگی — دل تو میں نے آپ کا چھینا نہ تھا
کوئی شعلہ رو تھا عجز و التماس — کوئی پروانہ پر پرواز تھا
سینکڑوں پتھر برہمن کے لئے — ایک کعبہ میں غلط انداز تھا
کچھ سنبھلتی نہ تھی یہ حالتِ زار — موت تک میں جسے سنبھال گیا
اک قیامت ہے اقتدار اُن کا — اک قیامت ہے اعتدال اپنا
وہ تصوّر کو سب بتاتے ہیں — پر بتاتے نہیں ہیں حال اپنا
اُن کے لب پر ہمارا نام آیا — بھر گیا ساغرِ شباب اُن کا
اُس حسرتِ وصال کا کیا تذکرہ کریں — وہ حسرتِ وصال جو مرنے لگی ہے اب
فکرِ انساں کو یہ نصیب ہوگی — راہ کے پیچ و خم سے دور ہیں آپ
پھاڑ کر اپنے جیب و داماں کو — سینے پاتے نہیں گریباں کو
گریباں کو چاک کرنے لگے ہیں — خرد کے قرینوں سے جینے نہ پائے
دلِ بے تاب کو دیکھو نگاہِ یاس سے پہلے — دلِ بے تاب جیسی بھی نشانی دیکھ لی تم نے
تھے کبھی جو آشنائے التفات — وہ نوائے بزمِ ماتم ہوگئے
نگاہِ مخمور سے پلاؤ بلندی طور سے پلاؤ! — خمار خانے کی میکدے کی شراب گو بے مزہ نہیں ہے
جتنے پہلو نگاہ کے بدلے — آہ کی ہم نے آہ کے بدلے
ہم ترے نہ ہونے سے کس طرح سنبھل جاتے — اضطراب کے موتی آنسوؤں میں ڈھل جاتے

اس قسم کے شعر جو مبہم ہیں، مہمل ہیں، بے مزہ اور بے کیف ہیں، اس کتاب میں خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

سہارا پوچھ اُن جیسے بے سہاروں کا — کہ جن کی زیست نے پہنا کفن اُدھاروں کا (ص ۱۲۵)

"اشعار" کی جمع آج تک سُننے اور پڑھنے میں نہیں آئی!

آپ نہیں ہیں تو ہے یہ عالم — چُپ ہے دُنیا گھر ہے سُونا (ص۲۴)

"سُونا" — دھونا اور ہونا کے ساتھ قافیہ لایا گیا ہے — دُنیا کیوں چُپ ہے؟ اور چُپ ہے تو شاعر کو اس کی خموشی کیوں بُری لگتی ہے، شعر میں نہ اس کا کوئی ثبوت ہے نہ قرینہ!

نگاہِ شوق کی اک التماسِ شوق پہ اتنا — عتابِ اجتنابِ یار تو اے دل نہیں ہوتا (ص۳۶)

نگاہِ شوق کا "التماسِ شوق" اس قسم کے مکررات کو تصور صاحب آزادی کے ساتھ استعمال فرماتے ہیں! اجتنابِ یار کا "عتاب" اس میں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے۔

ہر لحظہ حیات تنفس طلب رہا — اس دورِ انقلاب میں میں جاں بہ لب رہا (ص۳۸)

نہ جانے "تنفس" کے کیا معنی شاعر کے ذہن میں ہیں اور یہ لفظ انہیں اتنا پسند ہے جسے بار بار لاتے ہیں! معلوم ہوتا ہے کسی "دمہ کے مریض" کو دیکھ کر تصور صاحب اتنے متاثر ہو گئے ہیں۔

آپکے التفات سے شاید — کچھ ہمارا بھی معاملہ ہو گا (ص۴۰)

"معاملہ" (بر وزن مفاعلہ) کو شاعر نے "ماملہ" (بر وزن — حاملہ) نظم کیا ہے! "بھی" مصرعِ ثانی سے نکال دیا جائے تو کم سے کم یہ فاحش غلطی تو نہ رہے گی ۔ ۔ ۔ یوں :-

؎ کچھ ہمارا معاملہ ہو گا

اپنا جینا مرنا کیا ہے — ایک "تنفس" ایک بہانہ (ص۴۴)

شعر میں بار بار "تنفس" لانے کی بیماری کو کیا کہئے!

آئینہ حیات میں یہ عکس کائنات — بے مقصد و بے ارادہ ہوا بے سبب ہوا (ص۴۵)

اول تو "عکس ہونا" زبان و محاورہ کے اعتبار سے غلط ہے! پھر یہ تو منکرینِ خدا کا نظریہ ہے کہ وہ کائنات کے ظہور کو بے شعور و بے ارادہ مادہ کے اتفاقی تصادم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں! کائنات کا ظہور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سبب ہوا ہے! (ما خلقت ھذا باطلا)

ہم نے انکے دل میں گویا — اپنے عشق کا جھنڈا گاڑا (ص۵۳)

غزل کی لطافت "جھنڈے" کے اس بوجھ کو کہاں برداشت کر سکتی ہے! معشوق کے دلِ نرم و نازک کے بارے میں ایک عاشق اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا کہ اُس نے اپنے عشق کا جھنڈا، محبوب کے دل میں گاڑ دیا۔

وہ خُدا جانے کس لئے گُم ہیں! — اوڑھ کر میرے آنسوؤں کا نقاب (ص۶۴)

محبوب کا عاشق کے آنسوؤں کا نقاب اوڑھ کر گم ہو جانا — کوئی جدید قسم کا "شعبدہ" معلوم ہوتا ہے۔

میرے ادراکِ غم سے دُور ہیں آپ — کیا اسی چشمِ نم سے دور ہیں آپ (ص۶۸)

"ادراکِ غم" سے دوری آخر کیا بات ہوئی! مصرعِ ثانی اور زیادہ کمزور ہے! تصور صاحب اظہارِ خیال کے معاملہ میں یا تو بے پروا واقع ہوئے ہیں، یا اس پر قدرت نہیں رکھتے!

روٹھ کر چلے گئے ہم سے — ہم گئے تھے اُنہیں منانے تک (ص۷۵)

کیا معشوق کے روٹھ جانے پر اُس کو منانے کے لئے جانا، اتنا سخت مرحلہ ہے، جس کے لئے "تک" لانا پڑا!

مآلِ عشق کے تیور ہمیں ستاتے ہیں — نگاہِ شوق پلٹ آ کہ ہم بلاتے ہیں

مآلِ عشق کے تیوروں کا ستانا ہی اعجوبہ سے کم نہ تھا ـــ کہ نگاہِ شوق کو شاعر نے جو پلٹ آنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنی جگہ مضحکہ ہے۔

غمِ دعشرت کے جو پیمانے بدل جاتے ہیں — کب نصیبے وہ خدا جانے بدل جاتے ہیں (ص۱۲۲)

اس گورکھ دھندے کا بھلا کوئی جواب ہے؟

میری باہوں سے اُلجھی ہوئی زلفیں توبہ — اپنے مخصوص ابھاروں میں کہو تم کیا ہو (ص۱۳۶)

پورا شعر چیستاں نہیں تو اور کیا ہے!

چھین لی جس نے زندگی میری — آپ کی تھی کہ بے رُخی میری (ص۱۴۰)

بات کہنے کا یہ کوئی قرینہ نہیں ہے کہ کسی کی جفا، ظلم، یا بے رُخی نے زندگی چھین لی! اس پر بھی کسی طرح صبر کر لیا جائے، تو شاعر نے "بے رُخی میری" جو کہا ہے، اس کی کیا توجیہہ کی جائے گی! اس شعر میں ابہام اور سطحیت کے سوا اور کیا ہے!

خدا جانے کتنے تبسم جلائے — مری آہِ سوزاں کی آسودگی نے (ص۱۵۹)

"تبسم" کبھی "جلائے" یا "جلائے" جاتے ہیں ـــ استغفراللہ! اُس پر طرفہ ستم آہِ سوزاں کی آسودگی! شعر کی کوئی کل ہی سیدھی نہیں ہے۔

یہ چشمِ حزیں یہ اُمید درخشاں — یہ پھوٹے مقدر یہ جھوٹے سہارے (ص۱۹۶)

"یہ چشمِ حزیں" اور "اُمیدِ درخشاں" کے درمیان آخر کیا ربط ہے ـــ اچھا فرض کر لیا جائے کہ اُمیدِ درخشاں سے "جھوٹے سہارے" مراد ہیں۔ مگر "یہ پھوٹے مقدر" شعر میں اس ٹکڑے کی کھپت کے لئے کیا توجیہہ کی جائے گی!

تیرے ہونٹوں پہ یہ تبسم جور — جورِ پیہم نہیں تو پھر کیا ہے (ص۱۹۸)

"تبسمِ جور" کی ترکیب ہی بہت کچھ محلِ نظر ہے ـــ پھر "جورِ پیہم" نے شعر کو اور زیادہ ژولیدہ بنا دیا۔

یا تو اپنا ہی پتہ بتلا دے — یا مجھے اپنا بتا دے ظالم! (ص۹۳)

اُن کو کیوں تیری نظر چھیڑ گئی ہے — جن کو ڈستے نہیں زلفوں کے ناگ (ص۸۲)

اس قسم کے شعر پڑھتے ہوئے، وجدان جس قدر بے مزہ ہوا ہے، اُس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا!

انلجین
Opal
کیلئے

فاران کراچی

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

ترتیب

چندہ سالانہ سات روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

مقام اشاعت :- دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

نقشِ اوّل

مارشل لاء پاکستان میں کیوں آیا؟ کن عزائم کے ساتھ کون سے حالات میں لایا گیا؟ پاکستان کے عوام نے مارشل لا کے تحت تین سال آٹھ مہینے کس طرح بسر کئے؟

ع وقت گزرا نہیں، گزارا ہے

اس پہ ہم گفتگو کرنا نہیں چاہتے، جو ہونا تھا سو ہو چکا، مضی ما مضیٰ۔ سفینہ جب کنارے پر آ لگے، تو پھر طوفان کی شدت اور ناخدا کے سلوک کے بارے میں کیا گفتگو کی جائے ــــــ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہوا کہ پاکستان میں مصر عراق اور ترکی کی طرح خونیں انقلاب نہیں آیا، یہاں کے فوجی رہنما امن پسند اور انسانی جانوں کے احترام کرنے والے ثابت ہوتے۔

سب سے بڑا خطرہ جو اس دور میں پیدا ہو گیا تھا وہ رسم الخط کی تبدیلی کا تھا جس طرح انگریزی دورِ حکومت میں فوجی گورے رومن رسم الخط کے ذریعہ اُردو زبان سیکھتے تھے، اسی سطح پر رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں سوچا جا رہا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہوا کہ علماء کے متفقہ احتجاج نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا، اور اب کوئی شخص اس انداز پر سوچنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔

پچھلے چار سال کی اس مدت میں دو فتنے ہیں جو نمایاں طور پر پاکستان میں ابھرے ہیں ــــ ایک عیسائیت کا فتنہ اور دوسرا رقص و سرود کا فتنہ! عیسائیت کا فتنہ ہمارے دین و ایمان کا رہزن ہے اور رقص و سرود کا فتنہ ہمارے کردار و اخلاق کا غارت گر ہے! پاکستان کے دانشوروں کو سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا ہے کہ یہ فتنے کیوں ابھرے؟ وہ کس قسم کا مزاج اور ذہنیت ہے، جو ان ملحدانہ فتنوں میں ناگواری محسوس نہیں کرتی؟ اس مزاج اور ذہنیت کی اصلاح ہونی چاہیئے!

جہاں تک تقسیم کار اور وظیفۂ عمل ([illegible]) کا تعلق ہے فوج اور سول میں فرق پایا جاتا ہے، اور یہ فرق باقی رہنا چاہیئے، فوج کا کام ملک کی حفاظت و مدافعت ہے اور سول کا فریضہ ملک کے نظم و نسق کو چلانا ہے، یہ دونوں خدانخواستہ ایک دوسرے کے رقیب نہیں بلکہ ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں، لیکن اخلاق و کردار کے معاملہ میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے اہلِ قلم ہوں یا اہلِ سیف سب کا کردار اسلامی ہونا چاہیئے، ہمارے معاشرے میں اہلِ قلم اور اہلِ سیف میں، عوام اور خواص میں جہاں کہیں بھی انگریزی فکر و مزاج کی آمیزش پائی جاتی ہے اس کی تطہیر کی ضرورت ہے! اسلام کو کچنر اور رومیل جیسے جنرل نہیں، عبیدہ کرار اور خالد سیف اللہ جیسے عظیم رہنما درکار ہیں! یہ کافرانہ نقطہ نگاہ ہے کہ چاہے تاجر شرابیں پیو، یا بدکاری کرو مگر بہادری، ڈسپلن اور کارکردگی میں فرق نہ آنے پائے، اسلام کی نگاہ میں اُس بہادری، ڈسپلن اور کارکردگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں جہاں تقویٰ معدوم ہوتے ہوں اور جس جگہ پاکبازی اور تقویٰ کی علانیہ نفی کی جاتی ہو!! اسلام کے مجاہد کا فروں کے اہلِ سیف سے بالکل جدا ہوتے ہیں!

یہ چیز بھی غور طلب اور فکر و توجہ کی مستحق ہے کہ دنیا کے نقشے پر آخر دوسری حکومتیں بھی تو پائی جاتی ہیں، اس قسم کا اقتدار

اسلامی حلقوں ہی میں کیوں ملتے ہیں ! جس کے نتیجہ میں دینی جماعتوں اور اسلامی قدروں کو کسی نہ کسی حد تک وزنا صدمہ پہنچتا ہے ! کیا یہ کچھ داخلی حالات کے سبب ظہور میں آرہا ہے، یا خارجی عوامل بھی اپنا کام کر رہے ہیں !

ع ہے سوچنے کی چیز اسے بار بار سوچ

مارشل لا ہٹ جانے کے بعد جمہوریت کی جو صبح طلوع ہوئی ہے، تو اس نے عروج و زوال کے کتنے عبرت خیز مناظر پیش کر دیئے ہیں مسٹر منظور قادر نے آئین و دستور میں اپنے لادینی مزاج کے جو شگوفے چھوڑے تھے اُس کا انہیں ہاتھ کے ہاتھ بدلہ بھی مل گیا اُنہی کے جانشین مسٹر محمد علی بوگرہ نے، سابق وزیر خارجہ کو جو " خراجِ ملامت " پیش کیا ہے، وہ علامہ اقبال کے اس مصرعہ :-

حذر اے چیرہ دستاں ! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کی زندہ تفسیر ہے، جاہ و منصب کی کرسی پر بیٹھ کر اکثر و بیشتر لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ہر جاندار کی چوٹی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اُس کے ہاتھ میں جو قادر و توانا اور شدید العقاب ہے ! وہ جب پکڑتا ہے تو آخرت سے پہلے اسی دُنیا میں غلط کاروں کی ذلت و رُسوائی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں !

پاکستان کے مفلوج اور اپاہج گورنر جنرل غلام محمد کے دورِ حکومت میں مولوی تمیز الدین خاں کو کتنی دردناک پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ! ان پر کیسے سخت وقت آئے ہیں وہ گرفتار ہوتے ہوتے رہ گئے، مگر اُن کی قوتِ ایمانی صدموں کے ان پہاڑوں کو ہنسی خوشی برداشت کر گئی، اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ آزمائش میں پورے اُترے، یہ اسی کا اجر ہے کہ آج پاکستان میں چاروں طرف اُن کی شرافت، نیک نفسی، فراست و تدبر اور دین داری کی دھوم ہے اور اُن کی عزت و ناموری کے پھریرے فضا میں اڑ رہے ہیں !

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء !

اس زمانے میں بعض ایسے اہلِ قلم اور رسالوں کا بھی تجربہ ہوا، جنھوں نے پاکستان کی سیاست کے کسی دور میں بھی سیاسی مسائل سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں رکھا۔ گزشتہ سیاست دانوں کے عہد میں بھی دستور و آئین مرتب ہوئے ہیں مگر ان اشاعتی اداروں نے اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، مگر اب جو دستور تیار ہوا ہے، اُس کی مدح و تعریف میں بہت کچھ فرمایا گیا ہے، اور ایک ماہر السنہ اہلِ قلم نے تو اس دستور کو کتاب و سنت کے عین مطابق ثابت کرنے کی کوشش فرمائی

مگر

پاکستان کی نیشنل اسمبلی سے اسی دستور میں ترمیم و تنسیخ کا آغاز ہو چکا ہے، اُس کی خامیاں ایک ایک کر کے گنوائی جا رہی ہیں یہاں تک کہ اخبارات صدرِ مملکت کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب موصوف پاکستان کے دستور میں مناسب ترمیم اور ضروری تبدیلیوں کے لئے آمادہ ہو جائیں گے ! جن حضرات نے اس دستور کی بڑی شد و مد کے ساتھ تائید ہی نہیں تحسین بھی کی تھی، وہ اپنے دقف کے بارے میں خود سوچ لیں !!

جس محدود پیمانہ پر بھی پاکستان میں انتخابات ہوئے ہیں، اُن میں حصہ لینے اور دوڑ دھوپ کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں اسلام اور جمہوریت کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔

کے بیشتر حصے کا نام لیا جا رہا ہے، اسلام کا، جمہوریت کا اور کتاب و سنت کا غلغلہ تو اسمبلیوں میں بلند ہے، لیکن اس کی صدائے بازگشت سارے ملک میں گونج رہی ہے، جس نے ماحول و فضا میں دینی جھلک کا پیدا کر دی ہے۔ یہ وہ محسوس فائدہ ہے جو انتخابات میں حصہ لینے ہی کے سبب حاصل ہوا ہے

لیکن

اس ملک میں کچھ ایسے "علم و تقویٰ کے امین" بھی پائے جاتے ہیں، جنہیں اس خوش نتیجہ جد و جہد میں فساد نظر آتا ہے! ان کے پاس بس ایک ہی نعرہ ہے اور وہ "انبیائی تعلیم" کا نعرہ ہے، ان کی اپنی افتادِ طبع اور آتشیں مزاج کی ساخت جس چیز سے میل نہیں کھاتی، یا کسی جماعت اور فرد سے وہ ناراض ہوتے ہیں، تو اس کے کام، مسلک اور جد و جہد پر طنز کرنا وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں! الحاد و بے دینی کے دور میں جب کہ دین داروں کو زیادہ سے زیادہ متحد اور ایک دوسرے کا مددگار اور دست و بازو بننا چاہیئے تھا۔ ان کے درمیان تشتت و افتراق کی یہ حالت دیکھ کر بڑا فکر ہوتا ہے! وضعداری بڑی اچھی چیز ہے، مگر دینی نقطۂ نگاہ سے مخالفت کی یہ وضعداری پسندیدہ نہیں ہے ——— ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ یہ جو آپ تبلیغ و اصلاح کے لئے اخبار اور رسالے نکال رہے ہیں، انبیاء کرام نے اخبار اور رسالے کب نکالے تھے! اس کے جواب میں غالباً نہیں یقیناً یہی کہا جائے گا کہ "اخبار اور رسالے تبلیغ و اصلاح کا ذریعہ ہیں اس لئے ضرورت، ماحول اور حالات کے مطابق نیکی کے کام کے لئے ذرائع کا اختیار کرنا انبیائی طریقِ کار کے منافی نہیں ہے ——— اسی صورتِ حال کا اسمبلی کے انتخابات پر قیاس کیا جا سکتا ہے جو اسلامی قدروں کی حفاظت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

تاریخ کا یہ واقعہ چڑھتی ہوئی دھوپ سے بھی زیادہ روشن ہے کہ حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اسلامی ریاست قائم فرمائی تھی، اس لئے ریاست اور سیاست کے امور و مسائل اور انبیاء کرام کے طریقِ کار کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ اسلام راہبوں اور سنیاسیوں کا دھرم نہیں، کشور کشاؤں اور جہاں گیر و جہاں آرا فاتحوں کا دین ہے!

پاکستان میں یہ صورت پیش نہیں آئی کہ یہاں کے اہلِ ایمان خدانخواستہ کافر، مرتد اور بت پرست ہو گئے تھے، پھر ان میں ایک نبی کا ظہور ہوا، اور ایمان لانے کی دعوت سے انبیائی تعلیم کا آغاز کیا گیا، اور جو ایمان لے آئے گئے ان کا تزکیۂ نفس ہوتا رہا، یہاں ایک ایسی مملکت وجود میں آئی، جس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت پہلے سے موجود تھی اور اس مملکت کے وجود میں آنے کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کے دین کا قائم کرنا تھا، ان حالات میں دین دار طبقہ کو کیا کرنا چاہیئے تھا ——— یہ کہ ہماری بلا سے چاہے یہاں کفر کا قانون چلے یا اسلام کا، ہمیں تو پہلے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینی ہے اور مسلمانوں کا تزکیۂ نفس کرنا ہے، ایک مدت تک یہ کام کرنے کے بعد معاشرے کی حکومت و ریاست کے جھمیلوں میں پڑے بغیر اصلاح ہو جائے گی ——— یا یہ کہ یہاں کا دستور اور آئین کتاب و سنت کی اساس پر مرتب اور متشکل ہونا چاہیئے، اور دعوتِ دین معاشرے کی تطہیر، قیامِ معروف اور نہی عن المنکر کے لئے حکومت کو ذریعہ بنانا چاہیئے، اسلام پسند طبقہ میں اخلاق و پاکیزگی کی جتنی بھی مقدار پائی جاتی ہے، اسلامی حکومت کو چلانے کے لئے سرِ دست اسی سے کام لیا جائے۔ وہ حضرات جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے عزیمت، دینی فراست، قرآنی فکر، اور زمانہ کے تقاضوں کا علم رکھتے تھے، انھوں نے پاکستان میں یہاں کے دستور کو کتاب و سنت کی اساس پر بنائے جانے کی جد و جہد شروع کی، اور ساتھ ہی اسمبلیوں کے انتخابات میں اسی مقصد کے تحت حصہ لیا کہ اسمبلیوں میں اسلام پسندوں کی جتنی زیادہ تعداد ہو گی، اتنے ہی قیامِ دین کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں گے! عناد و عداوت اور طنز و استہزاء سے دور رہ کر اگر انصاف کی نظر سے دیکھا اور حق و راستی کے دماغ سے سوچا جائے تو اسلام پسند

جماعت کی یہ روش دینی نقطۂ نگاہ سے طنز کی نہیں تائید و تحسین کی مستحق ہے! اس دینی جدوجہد پر جو کوئی انبیائی طریق کار کی مخالفت کی طنز کرتا ہے، وہ ایسی بات کہتا ہے، جو کسی ہوش مند انسان کو زیب نہیں دیتی۔

یہ کوئی نہیں کہتا کہ پاکستان میں قیامِ دین کی جدوجہد کرنے والے فرشتے تھے۔ اور ان سے کوئی غلطی ہی سرزد نہیں ہوئی، یا ان کے اندر سرے سے "نفس" باقی ہی نہیں رہا تھا —— مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کا کردار دوسری سیاسی جماعتوں کے ارکان کے کردار سے بالکل مختلف رہا، انھوں نے دستور و انتخاب کی جدوجہد کے ساتھ دینی احکام کی تعمیل سے غفلت نہیں برتی، انھوں نے اکل حلال اور صدقِ مقال کے تقاضوں کو اپنی استطاعت کے مطابق پورا کیا۔ ان نیک لوگوں کی پرچھائیں جن نوجوان طالب علموں پر پڑ گئی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے اخلاق و کردار نکھر گئے ہیں اور ان کی سیرتیں مجلا ہو گئی ہیں۔

مارشل لا کے زمانے میں ان نیک لوگوں نے کسی تنظیم کے بغیر مدرسوں، مکتبوں، رسالوں، اخباروں، تقریروں اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ اللہ کے دین کی خدمت انجام دی ہے، جہاں جہاں ان کا بس چلا ہے، انھوں نے رقص و سرود کی تقریبوں کے روکے جانے کی جدوجہد کی ہے، ان کی کوششوں سے سینما ہالوں کی تعمیر تک رک گئی ہے اور اس کی پاداش میں بااثر افراد اور سرکاری حاکموں کی مخالفت کے سبب انہیں مالی نقصانات اٹھانے پڑے ہیں! عائلی قوانین ہوں یا ضبطِ ولادت کا مسئلہ، قادیانیت کا فتنہ ہو یا انکارِ سنت کا المیہ، اس قسم کے تمام فتنوں کی روک تھام کے لئے ان حضرات نے جو کوششیں کی ہیں، وہ ہر حیثیت سے گراں قدر ہیں!

سیاسی جماعتوں کی بحالی اور سیاسی نظر بندوں کی رہائی کی گونج اسمبلیوں میں سنائی دے رہی ہے، یہ مطالبہ جمہوری شعور اور سیاسی بیداری کی علامت ہے، ملزموں کو صفائی کا موقعہ دیئے بغیر قید و بند میں رکھنا، عدل و انصاف کی رو سے جائز نہیں ہے! ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کے تمام سیاسی نظر بندوں کی ایک جیسی نوعیت نہیں ہے، ان میں وہ لوگ بھی ہیں، جو پاکستان کے مخالف ہیں اور جو پاکستان کی حریف حکومتوں اور دشمن ملکوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اس مزاج و ذہنیت کے افراد پاکستان بننے سے پہلے بھی ہندوستان کی تقسیم کے سخت مخالف تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی ان کے نظریوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، بلکہ پاکستان سے ان کی مخالفت شدید تر ہو گئی ہے! حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف عدالت مجاز میں باقاعدہ مقدمہ چلائے، ایمان داری کے ساتھ ان کے خلاف ثبوت مہیا کرے اور ان کو صفائی کا موقعہ دے تاکہ عدالتِ انصاف اپنا فیصلہ صادر کر سکے۔

کسی بے عنوانی کے خلاف احتجاج اور کسی برائی کو مٹانے کے لئے جدوجہد کرنا نہ بغاوت ہے اور نہ غداری ہے! مثلاً کوئی جماعت پاکستان میں شراب نوشی کے خلاف مہم چلاتی ہے تو اس مہم کو "پاکستان دشمنی" یا ملک میں انتشار اور ابتری پھیلانے کا نام نہیں دیا جا سکتا سیاست دانوں کے دور میں بعض ایسے افراد کو نظر بند کیا گیا تھا، جو پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے تھے جو چاہتے تھے اور اسی کوشش میں لگے ہوتے تھے کہ پاکستان میں اللہ کے دین کو سربلندی اور غلبہ نصیب ہو! یہ بہت بڑی ناانصافی تھی، جو خدا کے ان نیک بندوں کے ساتھ کی گئی! مشہور کہاوت ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی رہتی ہے مگر خدا کرے کہ اس قسم کے معاملات اور مسائل میں تاریخ اپنے کو کبھی نہ دہرائے ——

پاکستان میں جمہوریت قائم کرنی ہے تو پھر جمہوری تقاضوں کے پورا کرنے میں تنگ دلی سے کام نہیں لینا چاہیئے، کچھ جمہوریت اور کچھ آمریت اس دوئی کے خاطر خواہ اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے! جمہوریت کے معاملے میں اربابِ اقتدار کو پوری خوش دلی کشادہ خاطری اور وسعتِ ظرف سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ رعایا اور حکومت کے درمیان کش مکش کا آغاز اسی وقت ہوتا ہے جب جمہوریت کے تقاضوں اور عوام کے جائز مطالبات پورا کرنے سے گریز کیا جاتا ہے اور سیاسی آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ جمہوری حکومت میں

سیاسی جماعتیں پابند یا نیم آزاد نہیں رہنی چاہئیں۔

پاکستان کی ہر جماعت اور پارٹی کے موقف اور مسلک کی وضاحت کا ہر شخص کو حق پہنچتا ہے، ہم جماعت اسلامی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، اُس جماعتِ اسلامی کے بارے میں جو ملک کی بدقسمتی سے اس وقت "کالعدم" ہے اور جس کا ذکر "سابق" کے لفظ کیا جاتا ہے۔

(سابق) جماعت اسلامی کا یہ مسلک، مشن اور مقصد و غایت یہ تھی کہ پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے دین کو پُورے کا پورا قائم ہونا چاہئے یہ جماعت کسی دور میں بھی اپنے اس موقف سے بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی، اسی مقصد کے لئے وہ مسلسل جدّوجہد کرتی رہی، سابق سیاست داں اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے نام سے متوحش ہوتے تھے اس لئے جماعتِ اسلامی کو انھوں نے ہمیشہ اپنا حریف اور بدخواہ سمجھا۔

جماعتِ اسلامی پاکستان کے معاشرے کو خالص اسلامی اخلاق کی بنیاد پر قائم کرنے کا عزم رکھتی تھی مگر پاکستان کے اُس وقت کے اربابِ اقتدار انگریزی سوسائٹی سے متاثر تھے بلکہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اس نظریاتی اختلاف نے بھی جماعتِ اسلامی کو حکومت کا معتوب بنا دیا۔

جماعتِ اسلامی کی نگاہ میں عزت و شرف کا معیار ـــــــ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ـــــــ تھا، وہ پاکستان کی عنانِ حکومت کے سنبھالنے والوں کو نیکی اور تقویٰ کا حامل دیکھنا چاہتی تھی کہ قوموں میں بگاڑ اُوپر کے طبقہ سے شروع ہوتا ہے، اگر ملک کے اکابر نیک مزاج، پاکیزہ کردار اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں تو اُس ملک کے معاشرے اور ماحول کو لازمی طور پر صاف ستھرا اور پاکیزہ ہونا چاہئے، مگر سابق اربابِ اقتدار "تقویٰ" کے نام سے چڑتے تھے کہ اس طرح اُن کی شخصیتوں کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے، یہ وہ عوامل و اسباب تھے، جن کے سبب جماعتِ اسلامی گزشتہ حکمرانوں کے قہر و عتاب کا نشانہ بنتی رہی۔

موجودہ حکومت (سابق) جماعتِ اسلامی کے حالات سے یقین ہے کہ پُوری طرح باخبر ہوگی، انٹیلیجنس' ڈپارٹمنٹ کی رپورٹیں بتا سکتی ہیں کہ جماعتِ اسلامی کا ملک میں کیا رول رہا ہے اور اس کے ارکان کس کردار اور اخلاق کے حامل ہیں، حکومت چاہے تو جماعتِ اسلامی کے متعلق آج بھی پوری طرح چھان بین کر سکتی ہے! خاص طور سے حالیہ انتخابات کی خفیہ رپورٹوں سے پتہ چل سکتا ہے کہ ان لوگوں نے کس دیانت، ایمانداری، خوفِ خدا اور حق شناسی کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا ہے۔

جماعتِ اسلامی کا وجود تو پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ کی آیت اور رحمت تھا، اگرچہ سابق فرمانروا اس "رحمت" کو "زحمت" ہی سمجھتے رہے ـــــــ پاکستان کی موجودہ حکومت سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس "رحمت" پر قدغن کے سلسلہ کو جاری نہیں رکھے گی، اگر حکومت جماعتِ اسلامی جیسی فعّال اور با اصول جماعت کو بحال کرنے کے بعد اُس کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو پھر ملک میں انشاء اللہ العزیز اُس دورِ سعید کا آغاز ہوگا۔ جس کے دیکھنے کے لئے صدیوں سے آنکھیں ترس رہی ہیں!

ماہر القادری

۲۷ جون سنہ ۶۲ء

—✱—

شاکر فاروقی

دینِ فطرت

دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے اصول و مبادیات انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں اور یہی وہ دین ہے جس کے لئے کلام اللہ میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بیشتر مقامات پر "دینِ فطرت" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے — فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ یہی وہ خدائی فطرت ہے جس پر انسان کی تخلیق کی گئی ہے۔ اور — اس پیدائش میں (قطعاً) تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور۔ یہی "دینِ قیم" ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ — ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ — کائنات میں۔ حکومت صرف اللہ کی ہے۔ اور۔ اس کا یہ حکم ہے کہ اللہ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو یہی "دینِ قیم" ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں۔ اسی "دینِ قیم" کا نام "اسلام" ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ — اور یہی اسلام تمام کائنات کا بالعموم اور جن وانس کے لئے بالخصوص "ضابطۂ حیات" ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — یعنی کائنات کی ہر چیز اس کے ضابطۂ "اسلام" کی پابند ہے۔ جن وانس کے لئے خصوصیت و تاکید کے ساتھ ارشاد ہوا۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ یعنی جن وانسان کی پیدائش کا اصل مقصد صرف اللہ کی عبادت ہے۔ مرقومہ بالا آیت نمبر ۲ میں "عبادت اللہ" کو "دینِ قیم" کہا گیا ہے اور یہاں انسانوں اور جنات کی تخلیق کی غایت محض "اللہ کی عبادت" قرار دیا گیا ہے گویا "عبادت اللہ" اور "دینِ قیم" ایک ہی چیز ہے۔ پھر اس دینِ قیم کے بغیر کسی دوسرے دین کو قبولیت کے شرف سے محروم قرار دیا اور یہ فیصلہ فرما دیا کہ۔ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ جو کوئی اسلام کے بغیر کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ دین اللہ کے ہاں مقبول نہیں اور اس کا انجام نہایت برا ہوگا کیوں کہ اللہ کا دین تو صرف اسلام ہے۔

جس طرح "دینِ فطرت" یا "دینِ قیم" اپنے اصول و قوانین میں قطعاً غیر مبدل اور اٹل ہے، مرورِ ایام کے اثرات اور انقلاباتِ زمانہ کے تغیرات اس پر کسی طریق سے بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے اسی طرح لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کے واضح الفاظ اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہیں کہ جس کائنات کے لئے عمومی طور پر اور جس مخلوق کے لئے خصوصی طور پر اس "دینِ قیم" کو ضابطۂ حیات قرار دیا گیا ہے اس کائنات میں اصولی طور پر ابتدائے آفرینش سے آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا اور نہ قیامت تک آنے کی توقع کی جا سکتی ہے مثلاً آگ جن خواص و اصول کی آج سے کئی ہزار برس پہلے حامل تھی آج بھی اپنی صفات سے متصف اور اسی اصول پر عمل پیرا ہے پانی کو جن فطری تقاضوں پر پیدا کیا گیا تھا آج بھی اس کے اندر وہی کارفرما ہیں۔ ہوا، ابر، روشنی، چاندنی غرض کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے انہی فطری اصولوں پر اور تخلیقی تقاضوں کے مطابق کام کر رہا ہے جن کے مطابق اس کی تخلیق کی گئی تھی اور اس میں بال برابر تبدیلی کئے بغیر اپنے منصبی فرائض کو پوری تندہی سے انجام دے رہا ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ۔ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ

سُنَاقِ الشَّمَاتِ ۔۔۔ وَّ فِیْ ذٰلِکَ یَسْبَحُوْن ۔۔ یہ آیات بینات واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ "دینِ فطرت" کا پابند اور اصولِ فطرت کے مطابق جادۂ عمل پر گامزن ہے۔ اسی طرح آسمانی کتب اور تاریخ عالم شاہد ہیں کہ انسان کے فطری تقاضے ابتدائے تخلیق سے لے کر آج تک تاریخ کے ہر دور میں ایک ہی صورت پر رہے ہیں اور ان کے بنیادی اصول میں از آدم تا ایندم ذرہ بھر فرق پیدا نہیں ہوا اور نہ تو تہذیب و تمدن کے بدلتے ہوئے رجحانات ان پر کسی صورت میں اثر انداز ہو سکے ہیں اور نہ انقلاباتِ عالم ہی ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا کر سکے ہیں۔ آج سے کئی ہزار برس پہلے کا انسان بھوک، پیاس کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے جس طرح غذا اور پانی وغیرہ کا محتاج تھا بالکل اسی طرح اس دور کا انسان بھی اپنی اشتہاء و عطش کو اسی طریقہ سے مٹاتا اور اسی طرح غذا و آب کا حاجتمند ہے۔ رہائش کے لئے ادوارِ سابقہ کا انسان جس طرح غاروں، کھیتوں، جھونپڑوں اور چھپروں کو اپنا مسکن بناتا تھا بعینہٖ آج کے دورِ تہذیب و تمدن کا بزعم خویش ترقی یافتہ انسان اس فطری تقاضے۔ رہائش۔ کو پورا کرنے کے لئے دیدہ زیب مکانات، مکلف کوٹھیوں اور شاندار عمارت کا محتاج ہے۔ بدن ڈھانپنے کے لئے ....

...... دورِ حجر کے انسان نے درختوں کے پتوں چھالوں اور جانوروں کی کھالوں وغیرہ سے کام لیا اور آج کے ارتقائی دور کا انسان اس تقاضے کو مختلف سوتی، اونی اور ریشمی ملبوسات سے پورا کر رہا ہے۔

ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہیں کہ انسان کے فطری تقاضے بھی ہر زمانہ میں ایک طور پر رہے ہیں اور ان کے بنیادی اصولوں پر حادثاتِ زمانہ، تغیراتِ تہذیب و تمدن اور امتدادِ دوران و مرورِ ایام نے کبھی کوئی اثر نہیں ڈالا نیز سابقہ طویل انسانی تاریخ کے واضح مشاہدات کی بنا پر یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ تا اختتامِ عالم انسانی فطرت کے تقاضے اپنے انہی اصولوں پر قائم رہیں گے اور ان میں ذرہ برابر تغیر و تبدیل کی گنجائش نہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب حقیقت حال اور صورتِ مآل یہ ہے تو پھر ارتقاء و تہذیب و تمدن کے بلند بانگ دعاوی اور انسانی ترقی و عروج کی داستان چہ معنی دارد؟

لیکن اگر ہم غور و فکر سے کام لیں تو اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں! حقیقت یہ ہے کہ انسان کے فطری تقاضوں میں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، کبھی بھی کسی قسم کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوا اور نہ ان میں ارتقاء و نشو و نما ہوا ہے۔ بلکہ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے وسائل و وسائط اور آلات میں مرورِ دوران کے ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہا اور یہ وسائل و آلات۔ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول۔ کے حسب مصداق بتدریج ارتقائی منازل طے کرتے رہے، تو اس صورت میں اسے انسان یا اس کے تقاضہ کی ترقی نہیں بلکہ تقاضائے انسانی کو پورا کرنے کے اسباب و وسائط کی ترقی کہا جا سکتا ہے مثلاً۔ انسان نے قطع مسافت اور تھوڑے وقت میں بآرام زیادہ سفر کرنے کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے سواری کی ضرورت محسوس کی اور اسے کام میں لانے لگا اب مختلف ادوار میں اس نے اس سواری کو کئی متبادل و متباین صورتوں میں تبدیل کیا۔ بہلیوں، بگھیوں اور سائیکل سے لے کر باد رفتار تک، غبارے اور اڑن کھٹولے سے لے کر جیٹ طیارے اور سائنسی راکٹ تک ہیں۔ بادبانی اور چپو دار کشتیوں سے لے کر صبا رفتار سٹیمر اور آبدوز کشتیوں تک، سب ہی سواری کی ارتقائی صورتیں ہیں جنہیں انسان نے خشکی ہوا و پانی بلکہ خلا تک میں سفر کرنے کے لئے تیار کیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی اور کون سی نئی سواریاں تخلیق میں آتی ہیں۔ وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْن ۔۔ اب دیکھئے کہ سواری میں کس قدر تبدیلیاں کی گئیں اور کیا کچھ تغیرات رونما ہوئے لیکن انسان کے تقاضے نے کوئی ترقی نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی رونما واقع ہوئی ہے بلکہ وہ تو ابتک اسی اصلی صورت ابتدائیہ میں "سہولت و آرام قطع مسافت اور طے سفر" کی خواہش کے طور پر موجود ہے اور اسی طرح رہے گا۔

اسلحہ و بارود اور آلاتِ حرب پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ حفاظتِ نفس اور ہلاکتِ دشمن کے تقاضے نے جنگی آلات و اسلحہ کی ایجاد و صنعت کو جنم دیا اور انسان کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ پتھر کے اوزار سے لے کر کیمیاوی و جوہری اسلحہ اور ایٹمی بم کیا اسی خواب کی تعبیر نہیں ہیں؟ تیر و تفنگ اور تیغ و سناں سے لے کر بھاری توپیں (Heavy guns) اور ہائیڈروجن بم کیا اسی تقاضائے انسانی کی تکمیل کے کام نہیں آرہے ہیں؟ لیکن بایں ہمہ یہ ترقی انسانی تقاضا کی نہیں بلکہ اس کی تکمیل کے اسباب و وسائل ہی کی ترقی کہلائے گی۔

انسان کی ترقی تو جب ہوتی کہ ازمنۂ ماضیہ کے انسان کے مقابلہ میں آج کے ترقی یافتہ دور اور نئی روشنی کے زمانہ (New Light) کا انسان اپنے فطری تقاضوں سے بے نیاز ہو چکا ہوتا اور بھوک پیاس وغیرہ سے نجات پاتا، علل و اسقامِ جسمانی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا، زندگی اور موت کے لاینحل مسئلہ کو حل کر چکا ہوتا۔ اور ان تمام احتیاجات و ضروریات سے بے نیاز ہو چکا ہوتا جن کے لئے زمانۂ قبل کا انسان نیازمندی اور احتیاج کا شکار تھا۔ لیکن جب کہ ایسا اب تک نہیں ہو سکا ہے اور صورتِ حالات یہ واضح کرتی ہیں کہ یہ نئی روشنی کا ترقی یافتہ انسان بھی احتیاج و نیازمندی میں ویسے ہی مبتلا ہے جیسے اس دور کا انسان تھا جسے آج کا انسان "تاریکی و وحشت کے زمانہ" اور "غیر ترقی یافتہ دور" کے نام سے یاد کرتا ہے تو پھر وہ کونسا کمال ہے جو دورِ حاضرہ کے انسان نے حاصل کر لیا ہے، اور وہ کون سے ارتقائی مدارج ہیں جنہیں یہ طے کر کے اپنے آپ کو "ترقی یافتہ" کہنے لگا ہے!

مندرجہ بالا واضح دلائل کی روشنی میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ انسان کی حیثیت اور کیفیت میں از آدم تا ایندم ایک رائی برابر بھی کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل رونما نہیں ہوا ہے اور نہ من حیث النوع انسان نے کسی ارتقائی مرحلہ ہی کو طے کیا ہے اور اس میں ترقی کے نام سے کسی قسم کی معمولی سی تبدیلی یا تغیر واقع نہیں ہوا تو ان واضح حقائق کی روشنی میں یہ ٹھوس حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ انسان کی نوعیت، حیثیت، کیفیت فطرت اور فطری تقاضے قطعاً غیر مبدل اور تغیر ناپذیر ہیں اور فطرتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ - کی عملی تفسیر ایسے انسان کی اس غیر متغیرانہ فطرت اور غیر مبدلانہ نوعیت کا۔ تقاضا یہ ہے کہ اس کا ضابطۂ حیات اور زندگی کا لائحہ عمل بھی ایسے مبادی اور اصولوں پر مبنی ہو جو یکسر تغیر ناپذیر اور تبدل ناآشنا ہوں اور جس طرح انسان کی فطرت ٹھوس عناصر کا مجموعہ ہے اسی طرح اس کا ضابطۂ حیات بھی ٹھوس حقائق پر مبنی ہو۔ انسانی فطرت کے اس حقیقی تقاضہ کے پیشِ نظر جب ہم ادیانِ عالم پر نگاہ ڈالتے اور بہ نظرِ غائر ان کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان میں سے صرف اسلام ہی ایک ایسا دین کامل نظر آتا ہے کہ جو فطرت کے اس حقیقی تقاضے کو پورا کر سکتا ہے اور فطرت اپنے فکر کا مداوا اسی کے اصولوں میں پاتی ہے اور اپنی پریشانیوں سے انہی اصولوں کے تحت اطمینان حاصل کر سکتی ہے۔

ذیل میں ہم اسلام کے چند بنیادی اصول انسانی فطرت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ انسانی فطرت اور اسلامی احکام و قوانین باہم کس قدر مربوط و ہم آہنگ ہیں اور فی الحقیقت یہ انسانی فطرت کے ضمیر کی آواز اور اس کے تقاضوں کی روح ہیں۔

اس حقیقت میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اسلامی احکام اور دینِ قیم کے قوانین کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ قوانین و احکام تقاضائے انسانیت کی تکمیل کا دوسرا نام ہے اور دینِ اسلام فی نفسہٖ "دینِ انسانی" ہے۔ اس اجمال کی تفصیل اور اس حقیقتِ منتجہ کی وضاحت کے لئے ذیل میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

دین اسلام کی نگاہوں میں "چوری" ایک خطرناک جرم اور ایک ذلیل فعل ہے جس کی سزا۔ مال کی نوعیت کے اعتبار سے۔ ہاتھ کاٹنا مقرر کی گئی ہے ملاحظہ ہو المائدۃ آیت ۳۸ ۔ والسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰہِ ۔ اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے۔ دنیا کے کسی انسان سے جو کسی بھی مذہب، قوم، ملک اور معاشرہ سے تعلق رکھتا ہو اگر چوری کے جرم ہونے کے متعلق سوال کیا جائے تو یقیناً اس کا جواب اثبات میں ہوگا اور اس کا یہ جواب اس کی فطرت کی نقاب کشائی کرتا ہے کہ انسان فطری طور پر "چوری" کو مذموم و قبیح اور ذلیل فعل جانتا اور مانتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا اگرچہ دنیا کی اکثریت جب کسی نہ کسی صورت میں اس مذموم فعل میں مبتلا ہو جاتی ہے تو وہ اسے مباداً جائز فعل بلکہ "عملِ صالح" قرار دے دیے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے اور کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی فطرت اسے قابلِ نفرین قرار دیتی ہے، اب اس فعل کی تمام ارتقائی صورتوں میں بلیک مارکیٹ اسمگلنگ، اشیاء میں ملاوٹ وغیرہ تمام جرائم اسی نوعیت کے ہیں جنہیں کوئی بھی سلیم الفطرت انسان پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ زنا ۔ ایک ایسا مذموم فعل ہے جسے اسلام "فاحشہ" یعنی کھلی بے حیائی کہتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۔ زنا کے قریب بھی مت جاؤ! یہ کھلی بے حیائی اور نہایت بُرا راستہ ہے۔ ایسا راستہ کہ جس پر چلنے والا انسان فلاح و کامیابی کی جنت میں نہیں بلکہ خسران و نامرادی کے جہنم میں آخرکار جا گرتا ہے۔

زانی زنا کے ارتکاب سے بیک وقت کئی جرائم کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ ایک فعل بد اپنی ذات سے کئی بدترین افعال کا مجموعہ ہے مثلاً چوری۔ ڈاکہ، خیانت، بے حیائی، بے غیرتی اور بے عزتی وغیرہ۔ زانی عموماً زنا کا ارتکاب چوری چھپے ہی کرتا ہے اس لئے وہ "چور" ہے۔ جب وہ اس فعل کو انجام دیتا ہے تو یقیناً کسی انسان کی بہن، بہو، بیٹی، بیوی کی عصمت لوٹتا ہے لہٰذا وہ "لٹیرا" اور "ڈاکو" ہے۔ چونکہ وہ اپنے بھائی کی امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اس لئے وہ "خائن" ہے۔ چونکہ وہ "فاحشہ" یعنی کھلی بے حیائی کو معاشرہ میں رواج دیتا ہے لہٰذا وہ "بے حیا" ہے۔ اس ذلیل و رسواکن فعل کے ارتکاب میں زانی اپنی عزتِ نفس کو چونکہ قطعاً فراموش کر دیتا ہے لہٰذا وہ "بے غیرت" اور "بے عزت" ہے۔

زانی کی سزا دینِ قیم نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر انتہائی سنگین قرار دی ہے اور ارشاد فرمایا کہ۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰہِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النور پ ۲)

زانی اور زانیہ دونوں کو سو سو درّے لگاؤ اور اللہ کے معاملہ میں تمہیں ان پر ذرہ بھر رحم نہ کرنا چاہیے، اگر تم اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو! شارع علیہ السلام نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مجرم کی سزا میں کچھ فرق مقرر کیا ہے چنانچہ غیر شادی شدہ مجرم کو تو مذکورہ بالا سزا ملے گی لیکن شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کیا جائے گا۔ اگر غور سے کام لیا جائے تو یہ سزا عین مناسب و موزوں معلوم ہوتی ہے جب کہ نتیجہ کے لحاظ سے دونوں قسم کے مجرموں، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے جرم میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن نوعیت کے لحاظ سے ایک غیر شادی شدہ کے مقابلہ میں ایک شادی شدہ کا ارتکاب زنا زیادہ گھناؤنا اور بدترین فعل ہے اسی طرح دونوں سزاؤں میں بھی نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتے ہوئے، کیونکہ سو درّے کھانے کے بعد کسی شخص کا جانبر ہو جانا بہت دشوار ہے۔ نوعیت کے لحاظ سے غیر شادی شدہ زانی و زانیہ کی سزا سنگین قرار دی گئی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اسلامی شریعت زنا کے جرم کو انسانی معاشرہ کے لئے ایسا خطرناک نسان قرار دیتا ہے جس کا عدم اس کے وجود سے زیادہ بہتر ہے اور زمین کا پیٹ ایسے منحوس انسان کے لئے زمین کی پیٹھ سے زیادہ موزوں جگہ ہے۔

اب واقعات و حالات کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ انسانیت کا فطری تقاضا اس جرم (زنا) کے مجرم کے لئے طبعی طور پر کونسی سزا کو پسند کرتا ہے؟ ہر آئے دن اخبارات کے ذریعے ہمیں قتل و فساد اور خونریزی اور لڑائی کی اکثر ایسی چیزیں معلوم ہوتی رہتی ہیں جن کے پس منظر میں "زنا" کا ردِ عمل کارفرما ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے روزمرہ کے مشاہدات میں بھی اکثر ایسے واقعات آتے رہتے ہیں کہ "زنا" کی کھلی بے حیائی نے سالہا سال کے باہمی تعلقات کی زرخیز زمین میں خونریزی و قتل کا بیج بویا اس سے پیدا ہونے والے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار نے اپنی مسمومیت سے محلوں، قصبوں اور قوموں، قبیلوں کو مسموم کر کے رکھ دیا اور اس کے نتیجہ میں سالوں تک کے لئے باہمی جنگ و جدل اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ لوگ زنا کے مجرم کو موت کے گھاٹ اتارے بغیر نہیں چھوڑتے اور اس جرم کے نام ہی سے انسانی جذبات اس قدر مشتعل کیوں ہو جاتے ہیں کہ وہ زانی کو اس کے جرم کی پاداش میں قتل کر دینے سے کم سزا پر ٹھنڈے نہیں ہو سکتے؟ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ انسانی فطرت اس جرم کو اس قدر سنگین سمجھتی ہے جس کی پاداش میں مجرم کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دینا ہی ناگزیر اور ضروری خیال کیا جاتا ہے اور زانی کو سنگساری یا دُرّوں کی سنگین سزا دے کر اسلامی قانون انسانی فطرت کے اسی تقاضے کو پورا کرتا ہے۔

ہمارے مشاہدہ میں اس قسم کے واقعات بھی آتے رہتے ہیں کہ کوئی شخص حیوانیت کے تقاضوں سے اندھا ہو کر زناکاری اختیار کرتا ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فعل سے خاص شغف اور دلی محبت رکھتا ہے۔ لیکن جب یہی عمل "زنا" اس کی اپنی عصمت پر وقوع پذیر ہوتا ہے تو اس کی سوئی ہوئی انسانیت ایکدم بیدار ہوتی ہے اور اس بے حیائی کے کھیل کو نہ صرف بری نگاہوں سے دیکھتا ہے بلکہ عام طور پر اسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ خواہ اس سلسلہ میں اُسے تختۂ دار پر ہی چڑھنا پڑے ــــ جن لوگوں کے حیوانی و شیطانی جذبات نے ان کی انسانیت کا گلا گھونٹ دیا ہو اور وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہو، ایسے لوگ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہیں کیوں کہ ایسے لوگ تو خدائی قانون کی نگاہ میں حیوانات سے بھی بدتر ہیں۔ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔

مذکورہ بالا واضح امثلہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح مبرہن ہو جاتی ہے کہ انسان فطرتاً ان تمام جرائم کو جرم جانتا اور مانتا ہے جنہیں اسلامی قانون جرم قرار دیتا ہے اور ان کے لئے جن قسم کی سزاؤں کو مقرر کرتا ہے انہی سزاؤں کا انسانی فطرت بھی تقاضا کرتی ہے ساں کی۔ فطرتِ انسانی اور قانونِ اسلامی ــــ ہم آہنگی اور باہمی ربط و ضبط کی یہ واضح صورت اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ انسانی فطرت اور دینِ قیم باہم لازم و ملزوم ہیں اور تقاضائے فطرت ہی کا دوسرا نام "دینِ قیم" یا "اسلام" ہے اور اسی کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنیوالا شخص یا اشخاص، فرد یا قوم، ملک یا حکومت فی الحقیقت اپنی اصلی فطرت کے مطابق ہی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس طرح تقاضائے فطرت کو باحسن وجوہ پورا کرتے ہیں کیوں کہ اسلام انسان کے فطری تقاضوں کا مظہرِ کامل ہے، اسی طرح اسلام کی خلاف ورزی فی الحقیقت فطرتِ انسانی کی خلاف ورزی ہے۔ اسلام کا مجرم انسانیت کا مجرم ہے اور اسلام سے بغاوت انسانیت سے بغاوت کے مترادف ہے۔

—×—

ابو زید اصلاحی

ضمیر کی اِصلاح اور دُرستی

اس دنیا میں امن و سلامتی کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا جہاں فرد انسانی کا ضمیر امن و سلامتی کے آب حیات سے محروم ہو۔ یہ اسلام کا نقطۂ نظر ہے۔ چنانچہ جب وہ امن عالم کو ایک ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے، تو اس امن کی ابتدا سب سے پہلے وہ نہان خانۂ ضمیر سے کرتا ہے۔ اسلام کے نظامِ اجتماعی کے اندر فرد کو ایک بنیادی پوزیشن عطا کی گئی ہے وہ اجتماعی تعمیر میں سنگِ اول کا مقام رکھتا ہے۔ اسی کے ضمیر میں عقیدے کا پہلا بیج نشو و نما پاتا ہے اور اس کے طریق عمل سے چھپا ہوا عقیدہ ایک نمایاں حقیقت بن کر سامنے آتا ہے بالفاظ دیگر خود اسی کی ذات اس عقیدے کی زندہ ترجمان ہوتی ہے۔

فرد کے ضمیر میں اسلام مثبت امن کا بیج بوتا ہے جو زندگی کو رفعت اور بلندی عطا کرتا ہے۔ منفی امن کا بیج نہیں جس کا طریقہ ہر شے سے مصالحانہ ہوا کرتا ہے اور جو امن و عافیت کی راہ میں مہتم بالشان اصولوں کی پامالی گوارا کر لیتا ہے۔ اسلام اس امن کا قائل ہے جو باہمی توافق کے سرچشمہ سے اُبلتا ہو جو نظام اور شائستگی کا مجموعہ ہوتا ہے جو ٹھوس تعمیری اور صالح قوتوں سے ابھرتا ہے اور تمام چھوٹے بڑے جھگڑوں کو سلجھاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ اسلام اس امن کا قائل نہیں ہے جو دہشت انگیزی مارفیائی انجکشن کے ذریعہ سلا کر اور جذبات کو سرد کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ اسلام اس امن کا علمبردار ہے جو فرد کے وجود اس کے جذبات اور خواہشات کو تسلیم کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جماعت اور اس کے مصالح اور مقاصد کا خیال رکھتا ہے نیز انسانیت اور اس کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کا بھی اعتراف کرتا ہے نیز دین و اخلاق اور اعلیٰ اقدار کو بھی باقی رکھتا ہے غرض تمام چیزوں کو نہایت عدل اور باہمی نظام توافق کے ساتھ تسلیم کرتا ہے۔ اسلام انسانی منطق اور دینی عقیدہ کے مابین پہلے ہی قدم سے رشتہ قائم کرتا ہے۔ اسلام اس طرح ایک واضح اور نہایت ہی سادہ عقیدہ ہے جس کے اندر کسی طرح کا بھی الجھاؤ نہیں پایا جاتا۔

> چنانچہ دیکھئے اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ اس جیسی کوئی شے نہیں وہ ہر شے کا خالق ہے اور محمدؐ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ تمام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں جن کے پاس وحی کی گئی ہے کہ وہ اللہ واحد کی عبادت کی طرف بلا شرکت غیرے بلائیں۔ اللہ تین میں کا ایک ہے اور نہ تین ایک میں ہے اور نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ محمدؐ بشر کے ساتھ ساتھ اللہ نہیں ہیں اور نہ اُن میں یہ بات ہے کہ زمین پر تو رسول ہیں مگر آسمان پر رب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلام میں کوئی بھی ابہام و معمہ نہیں ہے جو روشنی سے دور ہو اور انسانی منطق کے لئے باعث سرگشتگی و حیرانی اور ضمیر فرد کے لئے موجب قلق ہو۔ اگر وہ ایمان لاتا ہے تو اس کی منطق مہمل رہ جاتی ہے اور اگر منطق کو پکڑتا ہے تو وہ اسے کفر و الحاد کی طرف لے جاتی ہے یا پھر عقیدہ و منطق کے جھولوں میں بے قرار و مضطرب جھولتا ہے۔ اسلام میں اس انسان کا تصور مشکل نہیں جو قوت علیٰ سے اتصال رکھتا ہو کیوں کہ روح انسانی کے اندر وہ طاقت موجود ہے جو اسے اس قوت سے وابستہ کر دے چنانچہ جو لوگ عادی ہیں وہ اپنے روزمرہ کے تجربات میں اس تعلق کو محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی روحیں اس تعلق کو صرف چند لمحے باقی رکھ سکتی ہیں۔ رہیں محمد عربی

ابراہیم (علیہم السلام) جیسی روحیں اُن کا اس قوت عظمیٰ تک پہنچ جانا اور اس سے توانائی حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں رہے۔

مذکورہ طرز پر تصور وحی کی دشواری کو ایک طرف رکھئے اور پھر ان دشواریوں کو ذہن میں لایئے جو لاہوتی اور ناسوتی ڈانڈوں کو ملا دینے میں خداؤں کا وجود ایک ذات میں محدود کر دینے اور خدا کا آدم کے گناہ سے ساری انسانیت کو نجات دلانے کی خاطر مصائب و آلام سہنے کے لئے روئے زمین پر اپنے بیٹے کے روپ میں اترنے وغیرہ کے تصورات میں نظر آتی ہیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ پہلا تصور رفتہ رفتہ آسان اور ممکن نظر آتا جا رہا ہے۔

یہ خرافات درحقیقت مسیحیت میں در آمد کر لئے گئے ہیں ورنہ مسیحیت ان سے بالکل پاک ہے کیوں کہ مسیحیت اپنی پہلی شکل میں اس دین واحد کی ایک شکل تھی جسے دے کر اللہ نے اپنے تمام رسولوں کو بھیجا تھا یعنی توحید کا وہ مذہب تھی جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں گردانتا جو بشریت کو دوسروں کی بندگی سے آزاد کرتا ہے مگر وہ رومی جو عیسائیت میں داخل ہو کے اپنے ساتھ متعدد خدا لائے اور یہاں پہنچ کر وہ مسیحیت کی توحید کے لئے اپنی نیتوں کو خالص نہ کر سکے یہیں سے کلیسا اور اس کی پیدا کردہ انجمنوں کی طرف سے پیش کئے جانے والے اوہام و خرافات کا آغاز ہوا اور آہستہ آہستہ یہی خرافات مسیحیت بن گئے جو کنیسہ کے نزدیک معروف ہیں یعنی وہ سرکاری مسیحیت جو اپنے سے اعتقادی اختلاف رکھنے والوں کو پریشان کرتی اور ان کے نام پروانۂ محرومی جاری کرتی ہے۔ لیکن مسیحیت کی اس نئی ساخت نے تعلیم یافتہ عیسائیوں کو روحانی قلق و اضطراب اور مستقل الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ ان کے لئے تین راستے ہیں یا تو یہ اپنی منطق کی آواز پر لبیک کہیں اور پھر مومنین کے زمرہ سے نکل کر ملحدین کی جماعت میں شامل ہو جائیں یا پھر اپنی عقلوں کو معطل کر کے ایسے عقیدہ کو تسلیم کر لیں جس کے خرافات کا کنیسہ حامی ہے یا پھر وہ عقیدہ کی بھوک اور اپنی اس منطق کے مابین جو ان خرافات سے دور رہنا چاہتی ہے اپنے آپ کو ایک مستقل روحانی اضطراب کے حوالہ کر دیں۔

اسلام میں بھی وہی کچھ ہو جاتا جو مسیحیت کے اندر پیش آیا کیوں کہ قصوں اور خرافات کی طرف انسان کی رغبت برابر اسلام کی روشنی اور اس کی سادگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی رہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت خصوصاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہمیشہ ایسے قصے تراشتی رہی ہے جن سے اسلام کی مزاج کی سادگی مطابقت نہیں کرتی۔ یہ باتیں عوام کے نزدیک ایسی مقبولیت بھی حاصل کرتی رہی ہیں جو مقبولیت کہ اسلام کے سادہ اور فطری حقائق کو بھی حاصل نہیں رہی۔ لیکن اسلام کی بنیاد اور اس کے اصول اپنی جگہ سالم اور محفوظ باقی رہے کیوں کہ اسلام کا مزاج ایسا واضح تھا کہ اس طرح کی کہانیاں اور قصے اس کے ارد گرد ہی رہے اور اس کی ساخت کے اندر داخل نہ ہو سکے۔

مسیحیت کے اندر کلیسا نے خود ان قصوں کو آگے بڑھایا اور ان کی تعمیر کی کیوں کہ اس طرح سے عوام اس کا اقتدار اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اور عقیدے کو الجھا دینے اور اس پر غموض کے توبرتو پردے ڈال دینے کے پس پردہ ایک خاص قسم کا محرک کام کر رہا وہ یہ کہ اس طرح کلیسا کی لوگوں کی زندگیوں میں ایک خاص ڈیوٹی باقی رہے گی ورنہ اگر مسیحیت ویسے ہی واضح عام فہم اور سادہ ہوتی جیسا کہ واقعی ہے تو پھر دین کے یہ اجارہ دار حضرات کیا کرتے اور لوگوں کے لئے ان کی کیا ضرورت تھی جبکہ لوگ اس قابل ہوتے کہ دین کا اور دین کی آگہی خود حاصل کر لیتے اور براہِ راست اپنے خالق سے رشتہ قائم کر لیتے۔ چنانچہ یہ اغماض ضروری تھا ایسے خواب کہانیاں اور قصے بھی ضروری تھے تاکہ لوگ کلیسا کے ہمیشہ محتاج رہیں جو ان کے سامنے عقیدے کے رموز و نکات واضح کرتے اور ایک خاص انداز کے ساتھ اسرار دین کو بیان کیا کرے اس طرح کلیسا کا اقتدار پوری طرح باقی رہے تاکہ عوام اس قابل نہ ہوں کہ وہ اپنی دینی اور روحانی زندگی میں ایک قدم بھی کلیسا اور مقدسین کے بغیر اٹھا سکیں۔

اسلام میں کوئی کلیسا نہیں ہے اور نہ یہاں اکلیروس کی کوئی پارٹی ہے کہ جس کے بغیر نہ تو دینی شعائر کا قیام ممکن ہو اور نہ کوئی شخص اپنے خالق سے اس کے بغیر رشتہ جوڑ سکے۔ اسلام فکر انسانی کو اوہام و خرافات سے نجات دلاتا ہے اور زندگی میں عمل خیر سے خرق عادت کو نہیں سیرت و کردار کو تسلیم کرتا ہے چنانچہ اس نے یہ نہیں چاہا کہ انسانی عقل کو خارق عادات معجزات سے کسی حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دے اس نے اپنا پیغام فہم انسانی میں لانے کے لئے واحد ذریعہ صرف اپنی وضاحت، سادگی اور اپنے خالق کو بتایا چنانچہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم کی موت کے دن سورج گرہن کا حادثہ پیش آیا اور لوگوں نے اس کو واقعہ موت کا سبب بتایا تو آپ نے بڑھ کر اس خرافات کی نفی کی تاکہ عقیدہ کی صفائی و سادگی پر پردہ نہ پڑے آپ نے اعلان کیا کہ سورج اللہ کی نشانیوں میں سے ہے وہ کسی آدمی کی موت پر نہیں گہناتا اس غایت درجہ احتیاط اور روشن سچائی نے عوام کو خرافات پسندی کی اس پوشیدہ رغبت کی طرف مائل ہونے سے باز رکھا آپ نے اس نئے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اس خرافات کو آلۂ کار نہیں بنایا کیوں کہ خرافات اپنی اصلیت میں دین کے مزاج کے بالکل مخالف تھی۔ اس طرح کی وضاحت کے تحت اسلام فرد کی منطق اور اس کے عقیدہ کے مابین امن قائم کرتا ہے جس کے بعد اس کے اندر وہ مہلک پریشانی اور الجھن نہیں پیدا ہوتی جو کلیسا کی منحرف عیسائیت پیدا کرتی ہے یعنی وہ عقائد جن میں حقیقت خرافات میں حق باطل میں گم ہو کر رہ گیا ہے، وہ عقائد جو روشنی میں آنے سے گھبراتے رہیں اور صرف اگر بتیوں اور خوش الحانیوں میں سانس لینا پسند کرتے ہیں۔

ہاں! انسانی ریوڑ جس کے سامنے کائنات کی وسیع و عریض مملکت اور قدرت کا ہولناک نظام پھیلا ہوا ہے اس بات کا ضرور خواہشمند ہوتا ہے کہ وہ اپنے خدا کو اپنے قریب تکالیف اور آرزوؤں کو لئے ہوئے محسوس کرے یہی وجہ ہے کہ مسیحیت کے کلیسائی افسانے بہت سارے وجود میں آئے جس سے عوامی خواہش کی تکمیل ہو سکے چنانچہ ان افسانوں نے خدا کو مقام بلند سے اتار بھی دیا کہ وہ گناہِ آدم کا کفارہ بننے کے لئے رنج و الم برداشت کرے یا وہ اپنے اکلوتے فرزند کو بھیجے جو انسانوں پر رحم کرنے کی خاطر مصائب و آلام کی تاب لا سکے۔ یہ اور اسی قسم کے ایسے بہت سے معمے اور گتھیاں ہیں جو عقل و منطق سب کے لئے پریشان کن اور قابل تعجب ہیں۔

عوام کی مذکورہ خواہش کو اسلام بھی پوری کرتا ہے لیکن اس طرح کہ خدا کی الوہیت اور وحدانیت سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہونے پاتا وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ اللہ اس سے قریب تر ہے۔ اس کی سنتا ہے اس کی نگہبانی سے غافل نہیں ہوتا اور نہ اس کو فراموش کرتا ہے۔ واذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون۔ (سورہ بقرہ آیت ۱۸۶) "اور جب میرے بندے میرے بارے میں تجھ سے پوچھتے ہیں تو میں ان سے قریب ہی ہوتا ہوں میں پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے پس لوگوں کو مجھ ہی سے مانگنا چاہیئے اور مجھ ہی پر ایمان لانا چاہیے شاید اس سے لوگ راہ یاب ہوں"۔ مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا (سورہ مجادلہ آیت ۷) تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر یہ کہ انہیں ایک چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ آدمیوں کا نجویٰ ہوتا ہے مگر یہ کہ ان میں ایک چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور اس سے زیادہ پر ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی وہ لوگ ہوں۔ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (سورہ ق آیت ۱۶) "اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں"۔ اس طرح ہر انسان اپنے رب سے ایک مضبوط تعلق پیدا کر سکتا ہے اور اس کی رحمت حفاظت۔ اور نظر کرم کو بغیر کسی محیر العقول افسانے کے محسوس کر سکتا ہے۔

دلچسپیاں اور ضرورتیں

اسی طرح اسلام فرد کی اہم ضرورتوں اور اس کی خوشگوار روحانی دلچسپیوں کے مابین امن قائم کرتا ہے لیکن ایسا نہیں کرتا کہ ضرورتوں کی نیرنگیوں اور روحانی دلچسپیوں میں امن کا کوئی رشتہ پیدا کرے اسلام کا وحدت کلی والا نظریہ فرد انسانی پر اپنی چھاپ ڈالتا ہے اسی طرح اپنا نقطۂ نظر زندگی کے ان عوامل کو بھی بخشتا ہے جو فرد انسانی کے اندر نشاندگی کرتے ہیں اس طور پر ضرورتیں اور خواہشیں سب کی سب ایک نظام کی پابند ہو جاتی ہیں جن کی دافع طاقتوں کو صرف اس نظام سے متعارض قوت اور زندگی کے کامل نمو کو روکنے والی طاقت ہی برباد کر سکتی ہے۔ یہیں سے اسلام پہلے ہی قدم پر زندگی کی ان پوشیدہ بنیادی ضرورتوں کو جو انسان کی فطرت کے اندر ہوتی ہیں تسلیم کرتا ہے اور وہ ان بنیادی ضرورتوں کے اندر بحالت اعتدال کوئی چیز نہیں دیکھتا جو ترقی پسندی کے جذبہ سے متعارض ہوتی ہیں یہ ضرورتیں بعینہٖ انسان کے مزاج کے اندر پوشیدہ رہتی ہیں جس وقت اسلام خواہشات نفسانی کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی دعوت دیتا ہے تو اس وقت وہ حیاتیاتی ولولوں کو ختم کرنے کی دعوت نہیں دیتا اور نہ زندہ طاقتوں کو دفن کر دینے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ وہ صرف اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ انسان اپنے نفس کی قیادت پر قبضہ حاصل کرے اپنی شہوات کا بندہ اور غلام نہ بنے اور نہ ایسا حیوان بنے جس کا اقدام محض اس کے حیوانی جذبات کے زیر اثر ہوتا ہے کیوں کہ ارادہ ہی متاع حیات کے اندر انسان اور حیوان کے مابین چوراہے کی حیثیت رکھتا ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ (سورہ محمد آیت ۱۲) اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ تمتع حاصل کرتے ہیں اور کھاتے ہیں جس طرح کہ جانور کھاتے پیتے ہیں۔

پس جب انسان اپنے معاملہ پر قابو پالیتا ہے تو اس کے بعد اس پر اپنے بدن کے حق کی معرفت واجب ہوتی ہے، اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے نفس کو خوشگوار چیزوں سے لطف اندوز ہونے دے اور اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام نہ کرے اور اللہ کی حلال کردہ لذت و متاع کی وہ تمام ہی چیزیں ہیں جو ایک صحیح اور معتدل ساخت طلب کرتی ہیں زندگی کے فطری ولولے اور جذبات اسلام کے اندر ناپسندیدہ نہیں ہیں اور بڑھنے کی رغبت کوئی ایسی بری چیز نہیں ہے کہ جس سے پاکیزہ لوگ بلند ہوں البتہ زندگی کے بڑھاؤ کی رغبت کو خدا کی مشیت تخلیق سے متفق ہونا چاہیے اور جو کچھ بھی اسلام چاہتا ہے وہ بس زندگی کی ترقی ہے نہ کہ اس کا پھیلاؤ۔ یہ پھیلاؤ ترقی کا وسیلہ ہے نظریہ کا مخالف نہیں ہے یہیں سے اسلام انسان کی حیاتیاتی امنگوں کو انسانی ساخت کے اندر منظم کرتا ہے اور یہیں سے وہ فطرت میں پوشیدہ روحانی دلچسپیوں کو بھی اس ساخت کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، اور ان دونوں سے ایک وحدت ڈھالتا ہے جن کے اندر کوئی افراط اور تفریط نہیں ہوتی اور نہ اس کے داخلی نظام میں کوئی ٹکراؤ اور کشمکش ہوتی ہے اسلام کے نزدیک متاع حیات سے مستفید ہونے کی دعوت، دعوت ترقی کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے جس کی وجہ سے ان کے اندر اعتدال کی ایسی عمومی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو فحش اور حرمان نصیبی سے بالکل پاک ہوتی ہے ۔ يَا بَنِيْ آدَمَ خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (سورہ اعراف آیت ۳۱-۳۳)

"اے بنی آدم ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو۔ اور کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا پوچھو! کس نے اللہ کی ان زیب و زینت کی چیزوں اور پاکیزہ رزق کو حرام کیا ہے؟ جن کو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا۔ کہدو یہ چیزیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو دنیا کی زندگی میں ایمان لاتے ہیں اور یہ قیامت کے روز خاص انہیں کا حصہ ہوں گی اسی طرح ہم اپنی آیات سمجھنے والوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں کہدو کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی چیزوں کو خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ گناہ اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس کو بھی کہ تم خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کوئی علم نہ ہو۔"

فواحش فحش سے نکلا ہے اور اس کا مطلب حد اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں اس کی حقیقت ناحق بغاوت کرنے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے مشابہ ہے یہ تمام باتیں فطرت کے لئے مفسدہ اور عدل و انصاف کے منافی اور متوازن نظام زندگی کے مخالف ہیں، اس ڈھنگ پر تمام انسانی طاقتیں زندگی کی تعمیر اور ترقی کے لئے میدانِ عمل پاتی ہیں اور فرد اپنی بقا اور زندگی کے تحفظ کے میدان میں اور اپنی روحانی دلچسپیوں کے مابین برباد نہیں ہو سکتا، اور اس طرح حفاظت حیات اور ترقی حیات کے مابین باہمی نظام پایہ کمال کو پہنچتا ہے یہ باہمی نظام عقیدہ کے لازمی نتیجہ میں فرد انسانی کے ضمیر میں بھی درجہ کمال حاصل کرتا ہے نیز اس فرد کے طریق عمل کے نتیجہ میں جماعتی زندگی میں بھی اس باہمی نظام و توافق کا کرشمہ دکھائی دینے لگتا ہے اس طرح انسان اپنے ضمیر کے ساتھ ایک اندرونی اطمینان و سلامتی اور دوسروں کے ساتھ بیرونی امن و امان کی فضا پاتا ہے۔

اس طرح اسلام ان نفسیاتی الجھنوں کا بھی علاج کرتا ہے جس پر فرائڈ اور اس کے متبعین کے مذہب کی بنیاد ہے۔ وہ لوگ ان الجھنوں کو ایک ضروری اور لازمی لعنت تصور کرتے ہیں جسے معاشرتی نظام اپنے قیود اور تعلیمات اور دلچسپیوں کا گلا گھونٹ دینے والے احکام کی بدولت فرد پر مسلط کر دیتا ہے یہ نفسیاتی الجھنیں اسلامی معتقدات کی فضائے پرامن میں کم ہو جاتی ہیں یا بالکل نیست و نابود ہو جاتی ہیں کیوں کہ اسلام پہلی ہی منزل پر فرد کی دلچسپیوں اور اس کی ضرورتوں کا اعتراف کرتا ہے اور یہ اس کے نزدیک کوئی پست یا گندی چیزیں نہیں ہیں وہ ان کو موڑ کر ایسے آسان راستے پر لگاتا ہے جو انتہائی محفوظ ہوتا ہے اور اس کی شریعت اس کے حدود اور اس کی نظافت اور ستھرائی کا خیال کرتا ہے ایسے ہی اہمیت کے لائق یہ حقیقت بھی ہے کہ جب تک وہ ان محفوظ و متوازن حدود کے اندر رہے گا جو فرد کی شخصیت کو توڑ نہ سکیں اور نہ معاشرتی فضا کے اندر کوئی بغاوت برپا کر سکیں اس وقت تک وہ اپنی ضرورتوں اور دلچسپیوں کو برقرار رکھ سکے گا۔

اسلام ان پاکیزہ فطری میلانات کو بڑی خوردبینی کے ساتھ دیکھتا ہے وہ اندازہ لگاتا ہے کہ بعض وقت مرد کی خواہشات کے مقابل زیب و زینت کی طرف عورت کی رغبت زیادہ ہوتی ہے چنانچہ وہ اس کی نسوانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے زینت و آرائش کی جن چیزوں کو اس کے لئے حلال کرتا ہے مرد کے لئے حرام کرتا ہے وہ اس کے لئے سونا اور ریشم کو جائز قرار دیتا ہے کہ مرد کو ان سے آراستہ ہونے کو منع کرتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں مرد کے لئے نقصان دہ اور سبب اسراف ہوں گی اور اس میدان آرائش میں عورت کے لئے صرف بے جا نمائش کو حرام قرار دیتا ہے اس لئے کہ یہ چیز یہیں سے زینت کی پاکیزگی سے نکل کر حیوانیت کے رجحانات کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس بنا پر اسلامی عقیدہ کے نزدیک نفسیاتی الجھنوں کے اسباب پسندیدہ شذوذ کے حدوں میں سمٹ آتے ہیں معتدل مزاجوں کے اندر توازن و توافق بدرجہ اتم پیدا ہو جاتا ہے اضطراب و بے چینی کے عوامل دب جاتے ہیں اور فرد مسلم اپنے تئیں

امن وسلامتی کے بیش بہا خزانے سے فیضیاب ہوتا ہے۔

گناہ اور توبہ

اسلام صرف فرد کی ضروریات کو مان لینے اور اس کی دلچسپیوں کو منظم کر دینے کی حد تک ہی نہیں قائم رہتا بلکہ اس کے بعد وہ ایک دوسرا بصیرت افروز قدم اٹھاتا ہے یعنی فرد کے اندر غلطی اور گناہ کرنے کے عوامل کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ بھول چوک کے معاملہ میں بھی اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ وہ معاف ہے رفع عن امتی الخطاء والنسیان میری امت کو بھول چوک سے بری کر دیا گیا ہے۔ ”اس حدیث کو امام قرطبی اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں! ابو محمد عبدالحق نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے یہی خیال اصیلی کے فوائد اور ابن المنذر کی کتاب الامتاع میں ملتا ہے“۔ گناہ کے معاملہ میں اس نے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھول رکھا ہے جسے ہر طالب عفو وطہارت ہر وقت کھٹکھٹا سکتا ہے اللہ کی رحمت سے اسے کوئی جھٹکا نہیں سکتا اور نہ کوئی اس پر دروازے کو بند کر سکتا ہے اور نہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان کسی قسم کے واسطہ یا ذریعہ کی دیوار حائل کی جا سکتی ہے۔ جب فرد سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے لئے راستے بند نہیں ہوتے اور نہ وہ قابل ملامت قرار پاتا ہے اور نہ اس پر تاریکیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھاتا ہے بلکہ اس موقعہ پر بھی روشنی اور راستہ ہے ایک دست رحمت ہے یعنی توبہ کا وہ فیاض ہاتھ جو اسے کلی شفا و عافیت بخشتا ہے اس پر روحانیت کا سایہ عاطفت پوری طرح پھیلاتا ہے قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ۔ ان اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعا۔ انہ ھو الغفور رحیم (سورہ زمر آیت ۵۳) کہہ دو اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتی کی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں خدا تو سب گناہ بخش دیتا ہے بے شک وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ خدائے اسلام کسی گنہگار کو ہمیشہ کے لئے پھٹکار نہیں دیتا اور نہ وہ ایسا کرتا ہے کہ اس کی کسی لغزش کو معاف کرے اور اس کی توبہ کو قبول کرے تا وقتیکہ وہ اپنے آپ کو ہلاک نہ کر دے یا جسم کو بے حد اذیت و تکلیف نہ پہنچا لے یا اس کی روح زمانے تک ناپاک اجسام میں ملوث نہ ہو لے کفارۂ گناہ کا اقتضاء یہ نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ بشر کے گناہ کو دور کرنے کے لئے خود عرش سے اترے صلیب پر چڑھے اور تکلیفیں جھیلے وہ بشر کا پیدا کرنے والا ہے اسے قدرت ہے کہ وہ انسان کو بغیر صلیب پر چڑھے ہوئے پاک کر دے اسی طرح کفارۂ گناہ کسی کاہن یا پروہت کا محتاج نہیں ہے۔ خواہ کوئی بھی انسان ہو بغیر کسی اعراب یا ثالث متوسل کے اپنے رب کے سامنے شرمندگی ندامت اور توبہ کے آنسو لئے ہوتے حاضر ہو سکتا ہے خدا اس کے لئے اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے اور اسے اپنے بندوں میں مقبول بناتا ہے، اس کو عفو و رحمت سے نوازتا ہے اور اس کی رحمت کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے، اللہ کی رحمت اور اس کی امید سے مایوسی کا اسلام میں کوئی سوال ہی نہیں ہر طالب خیر کو اس کا دروازہ، بغیر کسی جھجک اور اذن کے کھٹکھٹانا چاہیئے۔ ولا تیئسوا من روح اللّٰہ انہ لا ییئس من روح اللّٰہ الا القوم الکافرون (سورہ یوسف آیت ۸۷) اور خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو خدا کی رحمت سے بے ایمان لوگ مایوس ہوتے ہیں۔

اسلام اس سلسلہ میں ایک لطیف اور باریک راستہ اختیار کرتا ہے حتیٰ کہ سرسری نظر میں آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ گناہ کو آدمی کے لئے مزین کرتا ہے تاکہ وہ توبہ سے اپنی روح کو صیقل کیا کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کل بنی آدم خطاء وخیر الخطائین التوابون (بحوالہ ترمذی) ہر بنی آدم گنہگار ہے اور بہترین گنہگار توبہ کرنے والے ہیں۔ دوسرا فرمان ہے والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لذھب اللّٰہ بکم ولجاء بقوم یذنبون ویستغفرون فیغفر لہم (بحوالہ مسلم) قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگوں نے گناہ نہ کیا تو تم لوگوں کو اللہ اٹھا لے گا اور ایک دوسری قوم لے آئے گا جو گناہ کرے گی

مغفرت چاہے گی پس اللہ اس کو بخش دے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ کی ہمت افزائی کرتا ہے بلکہ توبہ کے راستہ کو آسان بنا دیا ہے تاکہ گنہگار نا امید نہ ہوں بلکہ اپنی مایوس روحوں کے لئے راستہ کو روشن کریں اور خائف تھکی ہوئی روحوں کو راحت و آرام کا پیغام دے جو یاس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے پریشان و سرگرداں نہیں رہ سکتیں، لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ فرد ضمیر کو بیدار کر دیتا ہے اور اسے نگہبانی کا مکلف بنا دیتا ہے اور حرام خواہشات، مال اولاد اور عورت کے فتنہ سے آگاہ کر دیتا ہے اور اس کی نگاہوں میں شر کو ایک ایسا شیطان قرار دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذہب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذالک متاع الحیاۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب - قل اؤنبئکم بخیر من ذالکم للذین اتقو عند ربہم جنات تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا وازواج مطہرۃ ورضوان من اللہ واللہ بصیر بالعباد - والذین یقولون ربنا آمنا فاغفر لنا ذنوبنا وقنا عذاب النار الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار (سورہ آل عمران آیت ۱۴ تا ۱۷) لوگوں کو خواہشات کی محبت سے یعنی عورتیں بیٹے سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر نشان زدہ گھوڑے مویشی اور کھیتی باڑی کی چیزوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے، مگر یہ سب دنیا کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہترین ٹھکانا ہے ان سے کہو کیا میں تم لوگوں کو اس سے کہیں بہتر چیز بتاؤں ــــ "سنو" جو لوگ پرہیزگار ہیں ان کے لئے خدا کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ عورتیں ہیں اور سب سے بڑھ کر خدا کی خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے جو خدا سے کہتے ہیں اے پروردگار ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور آگ سے بچا لے یہ وہ لوگ ہیں جو مشکلات میں صبر کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں عبادت میں لگے رہتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور سحر کے وقت گناہوں کی معافی مانگا کرتے ہیں)

ویا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ فکلا من حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین فوسوس لہما الشیطان لیبدی لہما ما وری عنہما من سوآتہما وقال ما نہاکما ربکما عن ھذہ الشجرۃ الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخالدین وقاسمہما انی لکما من الناصحین فدلاھما بغرور۔ فلما ذاقا الشجرۃ بدت لہما سوآتہما وطفقا یخصفان علیہما من ورق الجنۃ وناداھما ربہما الم انہکما عن تلکما الشجرۃ واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین ؟ قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین ۔ قال اھبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین (سورہ اعراف)

اور اے آدم تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں رہو پس تم دونوں جہاں سے چاہو اور جو کچھ چاہو کھاؤ پیو مگر اس درخت کے قریب نہ جانا اگر ایسا کیا تو تم گنہگار ہو گے لیکن شیطان دونوں کو بہکانے لگا تاکہ ان کے ستر کو جو ان سے پوشیدہ تھیں کھول دے اور اس نے کہا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے صرف اس لئے منع کیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ جیتے نہ رہو اور اس نے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں غرض اس نے دھوکہ دے کر ان کو معصیت کی طرف کھینچ ہی لیا پس جب انھوں نے درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ان پر ظاہر ہو گئے اور وہ اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھکنے لگے تو پھر ان کے رب نے ان کو پکار کر کہا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں بتایا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے تو پھر انھوں نے کہا اے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اگر تو نے ہمیں نہ معاف کیا اور ہم پر نہ رحم کیا تو ہم تباہ ہو جائیں گے خدا نے کہا تم لوگ جنت سے نکل جاؤ تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لئے ایک وقت خاص تک زمین پر ٹھکانا اور زندگی

کا سامان کر دیا گیا ہے)

لیکن اسلام یہاں پر انسان اور شیطان کے درمیان اس صورت کو باہمی کش مکش کی تصویر کشی کے لئے نہیں پیش کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو دائمی نفسیاتی اضطراب میں مبتلا کر دے اور ان کی شخصیتوں کو ریزہ ریزہ کر دے اور ان کے قویٰ بیکار کر دے بلکہ وہ اس لئے کرتا ہے کہ انہیں شر اور گناہ کے عوامل کو دور کرنے کی طرف دعوت دے اور فرزندان آدم دحوا کو متنبہ کر دے کہ وہ شیطانی اغوا اور تشجیعات کے سامنے جھک نہ جائیں یابنی آدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع عنہما لباسہما لیریہما سوآتہما۔ انہ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونہم انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون (سورہ اعراف آیت ۲۷)

(اے بنی آدم دیکھنا شیطان کہیں بہکانہ دے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکال دیا اور ان سے ان کے کپڑے اتروا دیئے تاکہ ان کے ستر کھول کر دکھا دے وہ اور اس کے بھائی ایسی جگہ سے دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے ہم نے شیطان کو انہیں لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے)

اور اسی وقت اسلام یہ بات بھی صاف کر دیتا ہے کہ آدم کا گناہ سر قلم کر دینے والی تلوار کی طرح ہمیشہ ان کے سروں پر مسلط نہیں رہتا اور نہ ان سے ایسے عجیب و غریب کفارے کا مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے بیٹے کی شکل میں اٹھا لیتا ہے بلکہ اس کے برعکس معاملہ بہت آسان ہے فتلقیٰ آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ انہ ھو التواب الرحیم (سورہ بقرہ آیت ۳۷) پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے پس اس نے معافی مانگی اور اس نے اس کو معاف کر دیا بے شک وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

اتنی آسانی کے بعد بھی وہی چوک سکتا ہے جو اپنے گناہ پر مصر ہو توبہ واستغفار کے یہ تمام دروازے انہیں لوگوں پر بند ہوتے ہیں جو اپنی غلطی پر جمے رہتے ہیں۔ بلیٰ من کسب سیئۃ واحاطت بہ خطیئتہ فاولٰئک اصحاب النار ھم فیہا خالدون (سورہ بقرہ) ہاں جو بُرے کام کرے اور اس کے گناہ اس کو ہر طرف سے گھیر لیں تو ایسے ہی لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس لئے کہ مستقل جاری رہنے والا گناہ دل کو سخت کر دیتا ہے اور ضمیر کی آواز کو دبا دیتا ہے پھر یہیں سے اس پر دروازے بند ہو جاتے ہیں اور عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے اس ملی ہوئی فرصت کو وہی چھوڑ سکتا ہے جو رحمت کا طلبگار نہ ہو اور رہے گنہگار توبہ کرنے والے تو اسلام ان کے دلوں کو تسلی دیتا ہے اور ان کی روحوں کو اطمینان بخشتا ہے اور ان سے بیدار مغزی اور کوشش سے زیادہ اور کوئی مطالبہ نہیں کرتا، بیدار مغزی اور کوشش یہ شخصیت کو انتشار اور پریشانی میں نہیں ڈالتی ہیں اور اسلامی تاریخی واقعات میں بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو اپنی بیداری ضمیر میں بہت آگے نکل گئے تھے لیکن ان کی روحیں پوری طرح مطمئن تھیں اور وہ حقیقی عملی اور فعال ویسے ہی زیادہ تھے جس طرح کہ کوئی آدمی زیادہ سے زیادہ اپنی زندگی کے اندر حقیقی عملی اور فعال ہو سکتا ہے اور ان میں سرفہرست حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اسلام کے کارکن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے دست و بازو نظر آتے ہیں، بے شک یہ دونوں اپنی بیداری ضمیر کے کامل نمونے ہیں نیز یہ دونوں کامل نمونہ تھے شعوری اطمینان اتحاد شخصیت اور میدان زندگی میں اتحاد منزل کے۔

ذمہ داری اور طاقت

اسلام عام طور پر اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ وہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ اپنے شعائر اور قانون کے اندر مکلف نہ ٹھہرائے کیونکہ طاقت سے [illegible] ۔

(۱) یا تو زبردستی اور تنگی ہوگی محرومی اور دباؤ ہوگا اور انسانیت کی خودی کو جبر اور ذلت کی چکی میں پیس ڈالتا ہوگا اور مسلسل حقِ حیات اور زندگی کی وسعت نمو کو روک دیتا ہوگا۔

(۲) یا تو نفرت سرکشی اور امر و نواہی کے خلاف بغاوت ہوگی اور ناقابل تسخیر تجاوز ہوگا جو انسان کو لاقانونیت میں غلو کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ جیسا کہ زبردستی اور دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(۳) یا پھر ہمیشہ کی ذہنی پریشانی ہوگی، اور جن چیزوں میں گناہ اور تقصیر نہ ہو اس پر ہمیشہ گناہ اور تقصیر کا دائمی شعور ہوگا اور یہ ایسا دائمی عذاب ہوگا جو قابل برداشت نہ ہو سکے گا۔

اس لئے اسلام اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کے احکام طاقت کے اندر ہوں اور وہ انسانیت کی فطرت کا ہر طرح خیال رکھتا ہے اور وہ اپنے اندر ایجابی اور منفی دونوں طرح کے قانون رکھتا ہے پھر وہ فطرت انسانی کو اس بات پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر زیادہ سے زیادہ مفروضہ قوانین کے علاوہ حتی المقدور اور پوری طاقت کے ساتھ بغیر کسی مشقت تنگی اور تکلیف کے اطاعت اور فرمانبرداری کے کام کرے اس طرح اسلام انسانیت کو ضائع ہونے سرکشی اور پریشانی سے بچائے رکھتا ہے قرآن اس کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (سورہ بقرہ آیت ۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ پر مجبور نہیں کرتا۔ وما جعل علیکم فی الدین من حرج (سورہ حج آیت ۷۸) اور اس نے دین میں تمہارے لئے کوئی تنگی اور زحمت نہیں پیدا کی اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ان ھذا الدین یسر الاعسر ولن یشاء الدین احد الا غلبہ (بحوالہ بخاری ونسائی) نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین کی تفسیر اور دینی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے سلسلہ میں تشدد سے اجتناب کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں لا تشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم (بحوالہ ابوداؤد) اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ تم پر سخت کر دیا جائے یا یہ کہ ان ھذا الدین متین فاوغل فیہ برفق (بحوالہ بخاری) یہ دین ٹھوس ہے اس پر سنجیدگی کے ساتھ عمل کرو۔ اور حد سے زیادہ اپنے اوپر سختی برتنے کو اس مسافر سے تشبیہ دی ہے جو اپنی سواری کو ضائع کر دیتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے ان المنبت لا ارضا قطع ولا ظھرا ابقی (بحوالہ بخاری) اجڈ آدمی نہ سفر ہی طے کر سکا اور نہ سواری کو باقی رکھ سکا۔

مذکورہ بالا بیان کے اندر میانہ روی اعتدال اور طاقت کے لحاظ میں خاص کر ضرورتوں اور خواہشوں کے درمیان نظم قائم کرنے اور غلطی و گناہ کے اسباب کے اعتراف کی مثالیں موجود ہیں اور اگر ہم اس حقیقت کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیں تو بیجا نہ ہوگا۔

انسان کے اندر غضبی تاثرات اور غم و غصہ کے محرکات کچھ ایسے ہیں کہ نہ ان کو محو کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو نفس انسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں چنانچہ کہیں خودی کا شعور ہوتا ہے کہیں مصلحتی تصادم ہوتا ہے اور بعض دفعہ احساسات و مسلکوں کا اختلاف ہوتا ہے ان حالتوں میں اسلام فیاضی نرم دلی خوش روئی کی دعوت دیتا ہے لیکن وہ اپنی طرف سے اس میں مبالغہ نہیں کرتا ہے کیوں کہ غیظ و غضب کے احساسات فطری ہیں اس لئے وہ لوگوں کو نفس کے اندر سے بالکل ختم کرنے کی دعوت نہیں دیتا ہے اور نہ ان کو اس کے اندر کوئی گناہ سمجھتا ہے بلکہ ان کو ضبط کرنے اور پی جانے کی دعوت دیتا ہے اس طرح نہیں کہ اسکی وجہ سے حقد اور کینہ کے بیج پرورش پانے لگیں بلکہ اس طرح پر کہ ضبط، خندہ پیشانی اور بلند کرداری کے ذریعہ ہو اور وہ اس پر نفس بشر کو ترغیب اور ہمت افزائی کے ذریعہ ابھارتا ہے نہ کہ اس کو تحکم اور جبر کے ساتھ چلاتا ہے ولمن صبر وغفر ان ذالک لمن عزم الامور (سورہ شوریٰ آیت ۴۳) جس نے صبر کیا اور معاف کیا بے شک یہ عزیمت اور پختگی کا مقام ہے والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس (سورہ آل عمران آیت ۱۳۴) "غصہ کو پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے"۔ اس طرح وہ صبر کو غفران کے ساتھ جوڑتا

اور ظلم کو معاف کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ظلم بغیر عفو و درگزر کے حقد اور کینہ کا سبب بنتے ہیں۔ اسلام کو کینہ اور کھوٹ سے شدید نفرت ہے اس لئے اس کی زیادہ ترغیب عفو اور چشم پوشی پر ہے تاکہ غیظ و غضب کو قبل اس کے کہ وہ کینہ اور حقد میں تبدیل ہو دلوں سے پاک کر دے اور مومنین کی یہ محبوب دعا قرار دیتا ہے ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا (سورہ حشر آیت ۱۰) ہمارے دلوں میں مومنین کی طرف سے کھوٹ نہ پیدا ہونے دے) اور جہاں اہل جنت کی رفعت اور ان کی بلندی کی تعریف کرتا ہے وہیں ان کی یہ بھی تعریف کرتا ہے کہ ونزعنا ما فی صدورھم من غل (سورہ اعراف آیت ۴۳) اور ہم ان کے دلوں کو کھوٹ اور کجی سے پاک کر دیں گے اور عباد الرحمٰن کی تعریف میں بتاتا ہے وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما (سورہ فرقان آیت ۶۳) رحمٰن کے وہ بندے جو زمین پر میانہ روی اور سیدھے طریقے سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام کرکے گذر جاتے ہیں۔ یعنی جاہلوں کی اس بے ہودہ طرز گفتگو کو جس میں تہذیب و شائستگی کی بو بھی نہیں ہوتی اس کو چشم پوشی اور اچھے طریقہ سے ٹال جاتے ہیں اسلام کو ناپسند ہے کہ لوگوں کے درمیان جھگڑے پیدا ہوں اور اس کی وجہ سے ان کے درمیان قطع تعلق ہو لیکن وہ سمجھتا ہے کہ غضب کی کیفیت کو مٹانا ناممکن ہے اور محض اس کے وقوع پذیر ہو جانے ہی پر گناہ نہیں سمجھتا اور نہ مسیحیت کی طرح اس کا کہنا ہے کہ "جو شخص اپنے بھائی پر ناحق غصہ ہو وہ قابل سزا ہے" اسلام جب صلح و اتفاق کی دعوت دیتا ہے تو کچھ فرصت بھی دیتا ہے کہ اس میں ہیجانی کیفیت ختم ہو جائے اور اشتعال کی آگ بجھ جائے اور اس درمیان نفس شائستگی اور سکون پر آجائے پس وہ فریقین کو تین روز کی مہلت دیتا ہے کہ صلح سے پہلے ان کے اندر غصہ کی حدت ختم ہو جائے اور نفس کو قرار کامل جائے۔ لا یحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال یلتقیان فیعرض ھذا و یعرض ھذا و خیرھما الذی یبدأ بالسلام (بحوالہ بخاری) کسی مسلم کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین راتوں سے زیادہ بول چال چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ دونوں ملتے رہیں پس انہیں کا ہر ایک شخص ایک دوسرے سے اعراض کرتا ہے ان میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرتا ہو۔ اسلام اس جزع و فزع کو بھی ناپسند کرتا ہے جس سے نفس کے اندر پستی پیدا ہوتی ہے ایمان باللہ متاثر ہوتا ہے اور مصائب برداشت کرنے کی صلاحیت مفلوج ہوتی ہے اس لئے کہ برداشت اور صبر ہی ایمان اور قوت کا بنیاد ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا ہے کہ "لیس منا من ضرب الخدود و شق الجیوب و دعا بدعوی الجاھلیۃ" (بحوالہ بخاری مسلم ترمذی) ہم میں سے نہیں ہے جو چہروں کو نوچتا ہو۔ گریبان پھاڑتا ہو اور جاہلیت کی فضول باتیں بکتا ہو۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آنسو بہانے اور غم کرنے کو جرم سمجھتا ہے اور نفس کو بالکل چپ سادھنے اور خاموش رہنے کا حکم دیتا ہے کیوں کہ یہ طاقت سے باہر ہے اور ایسا ہو سکتا ہے کہ اس سے سخت دلی اور قساوت قلب پیدا ہو بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں اپنے لڑکے ابراہیم کی موت پر اشکبار ہوئی تھیں اور آپ ان سے اس وقت مخاطب ہوتے تھے جب کہ ان پر ایک کپڑا پڑا ہوا تھا "یا ابراھیم ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون (بحوالہ بخاری مسلم) "اے ابراہیم آنکھ رو رہی ہے قلب غمزدہ ہے اور ہم وہی کچھ کہہ سکتے ہیں جس میں ہمارے رب کی رضا ہے اور ہم اے ابراہیم تمہاری جدائی سے بہت ہی غمگین ہیں۔" اسلام جس صبر کا مطالبہ کرتا ہے وہ ہم آنسو بہانے کا اور بحسن خوبی برداشت کرنے کا اللہ کو یاد کرنے اور تکالیف کے وقت معاملے کو اس کے حوالہ کر دینے کا۔ ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون (سورہ بقرہ آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷)

میں خوف اور بھوک، مال جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے، تم صبر کرنے والوں کو بشارت دے دو کہ جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے راستے پر ہیں"۔

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ پر مجبور نہیں کرتا اس لئے ایسا نہیں ہوتا کہ وہ خدمت بارے اطاعت کا جوا گردن سے نکال پھینکے اور اس کے نیچے دب کر گھبرا جائے اور نہ طاقت اور تکلیف کے مقابلے پڑ کر پریشان اور شکستہ دل ہو جاتے بلکہ وہ لبیک کہتا ہے خندہ پیشانی اور قلب کی پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرتا ہے اور اطاعت پر اس کا دل مطمئن رہتا ہے اور اس کی آنکھوں کو قرار اور سکون ملتا ہے۔

اطمینان باللہ

اسلام نفس کے اندر امن اور سکون کو بایں طور پیدا کرتا ہے کہ وہ نفس کو اللہ کی طرف مائل کر دیتا ہے اور اس کے اندر اس کی حفاظت اور نگہبانی کا مکمل یقین پیدا کر دیتا ہے یہ صرف دینی عقیدے کی خاصیت ہے جس میں اسلام تمام سماوی عقائد سے مشترک ہے البتہ اسلام صرف اس طرح پر ممتاز ہوتا ہے کہ اس کے اندر بندے اور رب کے درمیان تعلق براہ راست ہوتا ہے اس تعلق کے درمیان کسی کاہن یا راہب کا دخل نہیں ہوتا اور نہ زمین و آسمان کے اندر کسی مخلوق کے ارادے کا کوئی دخل ہے۔ اس براہ راست تعلق کے سائے میں بندہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسی قوت پر بھروسہ کر رہا ہے جس سے اونچی کوئی طاقت نہیں اور نہ اس کے مقابلہ میں کوئی طاقت لائی جا سکتی ہے اور وہ ہمیشہ حاضر رہنے والی ہے فرد کے امکان میں ہے کہ وہ اس کی طرف جھکے اور اس سے مدد مانگے جب بھی وہ نفس کو اس قوت کے لئے خالص کر دے تو پھر وہ اپنی شعوری حد تک اس میں کسی اور قوت کو شریک نہ کرے اور نہ اس کے علاوہ کسی اور کا اپنے ضمیر کے اندر تصور قائم کرے وقال ربکم ادعونی استجب لکم (سورہ غافر آیت ۶۰) اور تمہارے رب نے کہا کہ مجھے پکارو میں تمہاری سنوں گا، واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون (سورہ بقرہ آیت ۱۸۶) اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دو کہ میں قریب ہی ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو قبول کرتا ہوں پس ان کو میرے احکام ماننے چاہئیں اور مجھ پر ایمان لانا چاہئیے شاید اس سے وہ راہ یاب ہوں" اور اس قوت کے سامنے زمین کی تمام طاقتیں تمام جھوٹی عظمتیں اور دبدبے بے وزن اور بے حقیقت ہو جاتے ہیں اور تمام صاحب طاقت و ثروت صاحب جاہ و عزت اور صاحب اقتدار و سلطنت اس کے سامنے بے حقیقت کمزور اور بے بس ہیں جو نفع اور نقصان کی طاقت نہیں رکھتے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا (سورہ توبہ آیت ۵۱) "کہہ دو ہم کسی چیز سے دوچار نہیں ہو سکتے ہاں مگر جو ہمارے لئے اللہ نے فیصلہ کر دیا ہو وہی ہمارا آقا اور مالک ہے"۔ بلکہ اس کے نزدیک زمین کی تمام طاقتیں ایک ادنیٰ مکھی پر قدرت نہیں رکھتیں۔ وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب (سورہ حج آیت ۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے کس قدر طالب و مطلوب گئے گذرے ہیں

اس قوت کے سایہ میں جس طرح ہر شخص اپنی زندگی کی حفاظت اور اس کی سلامتی کو محفوظ رکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے رزق اور مرتبہ کو محفوظ رکھ سکتا ہے پس کوئی قوت اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس کو اس کے رزق میں اس کے مرتبہ میں اور شہرت کے کسی معاملہ میں نقصان پہنچانے یا کمی کرنے کی طاقت رکھتا ہو وہ خود اپنی جگہ پر ایک صاحب قوت ہے

اور ہر اس قوت کے برابر ہے جو اس سے ٹکرانا چاہتی ہوں کیوں کہ وہ اس بڑی قوت سے اعانت کا طالب رہتا ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مددگار نہیں ہے اور جس کے تصرف میں ساری کائنات ہے اور اس کے سلاطین اور جبابرہ بھی ہیں۔ قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر (آل عمران آیت ۲۶) "کہدو اے خدا بادشاہی کے مالک تو جسے چاہتا ہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی ہے اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ (سورہ آل عمران آیت ۱۶۰) اور اگر اللہ تم لوگوں کی مدد کرتے تو تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں اور اگر تم لوگوں کو ناکام کرے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے گا۔ من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمیعا (سورہ فاطر آیت ۱۰) جو عزت چاہتا ہے تو کہدو اللہ ہی کے لئے ہر عزت ہے۔ وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین (سورہ منافقون آیت ۸) اور اللہ ہی کے لئے اور اس کے رسول اور مؤمنین کے لئے عزت ہے یا ایھا الناس اذکروا نعمۃ اللہ علیکم ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض لا الہ الا ھو فانی تؤفکون (سورہ فاطر آیت ۳) اے لوگو اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو کیا کوئی اللہ کے علاوہ ایسا خالق ہے جو تم کو زمین و آسمان سے رزق دے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس تم کہاں بہکے پھرتے ہو۔

جب زمین کی ساری قوتیں آپس میں متحد ہو کر اسے اذیت پہنچانے کے درپے ہوتی ہیں تو صرف انہیں اللہ کی مشیت کے تحت ہی قدرت حاصل ہوتی ہے اگر اللہ کی مشیت میں اس فرد کی کوئی تکلیف منظور ہوتی ہے تو وہاں خدا کی بہت بڑی حکمت ہوتی ہے اور وہاں فردذات کی بھلائی سے کوئی بلند بھلائی مقصود ہوتی ہے بلکہ اس وقت فرد ہی کے لئے کوئی بھلائی ہوتی ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا ہے البتہ اس کو وہ عظیم خالق جو پوری کائنات پر حاوی ہے جانتا ہے وعسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیئا وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون (سورہ بقرہ آیت ۲۱۶) ممکن ہے جس چیز کو تم لوگ ناپسند کر رہے ہو وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے جس چیز کو تم پسند کر رہے ہو تمہارے لئے بری ہو اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تم لوگ نہیں جانتے فرد کے لئے یہی مناسب ہے کہ اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دے اور اللہ کی رضا کو اپنا مقصود بنائے اور اپنی ساری تگ و دو کو اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنے پر لگا دے اللہ کے حکم اور اس کے ارادہ کو زمین پر چلا دے اور اس سلسلہ میں کسی وقت بھی نرم اور کمزور نہ پڑے نیز اس راہ میں جو کچھ کھو بیٹھے اس پر افسوس یا واویلا نہ مچائے کیوں کہ وہ جو کچھ اس راہ میں کر چکا ہے وہ خدا کے یہاں محفوظ ہے جو کبھی ضائع نہ ہوگا ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون (سورہ آل عمران آیت ۱۶۹) جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں ان کو ان کے رب کے پاس سے رزق دیا جاتا ہے واللہ ولن یترکم اعمالکم (سورہ محمد آیت ۳۵) اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ تم لوگوں کے اعمال کو کم نہ کرے گا ان تمام کے بعد اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں کی بارش کرتا ہے اور اس کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا (سورہ اسراء آیت ۷۰) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی۔

وہ اس پر رحیم اور مہربان ہے اگر وہ گناہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اس کو معاف کرتا ہے یا اس کی برائی پر اسی کے برابر محاسبہ کرتا ہے اگر وہ گمراہ ہوتا ہے تو اس کو ہدایت دیتا ہے اور راہ راست پر لاتا ہے اگر وہ بھلائی کرتا ہے

[illegible] اس کے تحت عذاب کے وہی لوگ مستحق ہوتے ہیں جو گمراہی میں پڑے رہتے ہیں غافر الذنب [illegible] شدید العقاب ذی الطول (گناہ کا بخشنے والا توبہ قبول کرنے والا سخت ترین سزا دینے والا صاحب قدرت من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا ومن جاء بالسیئۃ فلا یجزی الا مثلہا وھم لا یظلمون (سورہ انعام آیت ۱۶۰) جس نے بھلائی کی ہے [illegible] اس جیسا دس گنا ہے اور جس نے برائی کی پس اس کو بدلا نہیں دیا جائے گا مگر اسی جیسا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح [illegible] طمانیت اور سکون پذیر ہو سکتا ہے اور اعتماد کر سکتا ہے اس کے قدم کے حوادث زمانہ ڈگمگا نہیں سکتے۔ وہ کسی چیز سے خوفزدہ [illegible] نہیں سکتا۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورہ رعد آیت ۲۸) جو لوگ ایمان لائے ان کے قلوب اللہ کے [illegible] مطمئن رہتے ہیں بے شک اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ضمانت اسلام اپنے اس کلی نظریئے کے مطابق جو وہ زندگی اس کے جذبات اور داعیات اس کی ضرورتوں اور خواہشات اس کی مادیات اور روحانیات کے بارے میں رکھتا ہے فرد کو محض روحانی عقیدہ ہی دے کر بس نہیں کرتا بلکہ واقعاتی دنیا کے اندر اس عقیدے کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و وسائل کے حصول کی راہ میں معاونت بھی کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک عالم واقعہ ہی دنیائے ضمیر کی عملی تفسیر ہے۔

یہیں سے اسلام فرد کو اطمینان باللہ کی زیادہ سے زیادہ ضمانتیں دے کر ہی ٹھہرا نہیں رکھتا بلکہ اس کی عملی زندگی کے لئے ایسے قانون بناتا ہے جو اس کو اطمینان بخش ضمانتیں دیتا ہے جس کی وجہ سے فرد اپنے ارد گرد امن و عدل ہی کا نظارہ کر سکتا ہے اور اپنی ضروریات کو پورا ہوتا ہوا پا سکتا ہے اسلام ہر اس زیادتی سے جو ایک دوسرے پر ہو یا حاکم کی اس پر ہو اس سے محفوظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ محسوس کر سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہا ہے جو اسے دشمنی بغض حسد کے بجائے مودت و مساوات کا برتاؤ کرتا ہے اور اس کی ذات اس کے مال اور اس کی آبرو کی حفاظت کرتا ہے لا یومن احدکم حتیٰ یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (بحوالہ بخاری مسلم) تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ (بحوالہ) ایک مسلم دوسرے مسلم پر حرام ہے اس کا خون اس کی آبرو اس کا مال۔ واللہ لا یومن واللہ لا یومن واللہ لا یومن قیل من یا رسول اللہ؟ قال الذی لا یامن جارہ بوائقہ۔ قسم خدا کی مومن نہیں ہو سکتا ہے قسم خدا کی مومن نہیں ہو سکتا ہے قسم خدا کی مومن نہیں ہو سکتا ہے پوچھا گیا کون یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا جس کا پڑوسی اس کی ایذا سے محفوظ نہ رہتا ہو۔ حاکم کو اس پر اس الٰہی قانون کے اندر ہی اختیار ہو سکتا ہے جس کے سامنے وہ ویسا ہی جھکا ہوا ہے جیسا کہ اس کے مقابلہ میں حاکم وقت۔ یہ ایسا قانون ہے جو حاکم وقت یا کسی طبقہ اور کسی جماعت کی خواہش سے ماخوذ ہو اور نہ وہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ کسی حاکم یا طبقہ اور جماعت کی مصلحت کو پورا کرے بلکہ وہ اس اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے جو تمام لوگوں کا معبود ہے اور تمام لوگوں کا مالک ہے، جس نے تمام لوگوں کی مصلحت کا خیال رکھ کر بنایا ہے اس قانون کے آگے جھکنا اور اس کا احترام کرنا اللہ کے سامنے جھکنا اور اس کا احترام کرنا ہے نہ کہ کسی بندے کے سامنے، اس میں تمام لوگوں کے لئے [illegible] کیونکہ وہ تمام لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے، شریعت دین اور اس کے قانون کے مطابق حکومت قائم ہونے کی یہی [illegible] [illegible] بندگی رب کے علاوہ زمین کی ساری بندگیوں سے نجات اسی قانون کے سائے میں ممکن ہے اور جب کبھی انسان کسی [illegible] [illegible] کسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہو اپنے اس جیسی جماعت یا انسانوں کے لئے قانون بنائے گی تو اس سے [illegible]

اور عام مصلحتوں کے خیال کی اُمید نہیں کی جا سکتی کیونکہ برسر اقتدار طبقہ ہمیشہ یہی محسوس کرے گا کہ وہ اپنی قانون سازی کی وجہ سے برتر ہے اور اُن حالات میں خود قانون دوسرے طبقے کے مقابل میں ہمیشہ ایک طبقہ کی مصلحت کے پیچھے چلے گا اور اس طرح کبھی بھی عام لوگوں کی مصلحتیں بارآور نہیں ہو سکتیں یہاں قانون کے احترام کے لئے ایک ہی صورت ہے جب کہ فرد کو یہ محسوس ہو کہ قانون اس کی عزت اس کی حریت اور اس کی مصلحت کا پورا پورا خیال رکھ رہا ہے اور یہ صورت اللہ کی شریعت کے مطابق قانون سازی ہی سے ممکن ہو سکتی ہے جس کے علاوہ کوئی حاکم اور صاحب قوت نہیں ہے جس کے نزدیک اس کے لئے کوئی مصلحت نہیں ہے کہ ایک طبقہ کے مقابل میں دوسرے طبقے کی اعانت اور نصرت کی جائے اور ایک طبقہ کو دوسرے طبقے پر غالب کیا جائے پھر اسی وقت فرد کو کامل عدل پر اطمینان ہو سکتا ہے اور وہ آرام اٹھا سکتا ہے اور صرف اسی وقت حاکم اپنی اس کبریائی سے دست بردار ہو سکتا ہے جس کو وہ قانون سازی کی قوت سے حاصل کرتا ہے اور یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس کو اس کے سوا اور کوئی اختیار نہیں کہ وہ قانون الٰہی کو نافذ کر دے جو اس پر اور تمام لوگوں کے لئے برابر فرض ہے۔ یہی مکمل اور صحیح آزادی ہو سکتی ہے۔

اسلام اپنے اس قانون میں فرد کے لئے تمام ضمانتیں دیتا ہے اس کی زندگی اس کی آبرو اور اس کے مال کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے ناحق دخل اندازی نہیں کی جا سکتی ہے اور وہ تحقیر تجسس غیبت اور بدگمانی سے بھی فرد کو محفوظ رکھتا ہے یا ایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منھن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولٰئک ھم الظالمون۔ یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ واتقوا اللہ ان اللہ تواب رحیم

(سورہ حجرات) آیت ۱۱ تا ۱۲ اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اُڑائے ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ اپنے میں عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا کس قدر بُرا ہے جس نے اس سے توبہ نہ کی وہ ظالم ہیں اے ایمان والو بہت اور بے جا گمان سے پرہیز کرو کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس نہ کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کیا کرے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تم ضرور نفرت کروگے۔ اللہ سے ڈرو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اسلام اس کے گھر کی آزادی اور اس کی حرمت کی ضمانت دیتا ہے پس اس کے اندر کوئی پھاند نہیں سکتا اور نہ بغیر اذن کے داخل ہو سکتا ہے یا ایھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتیٰ تستانسوا وتسلموا علیٰ اھلھا ذٰلکم خیر لکم لعلکم تذکرون فان لم تجدوا فیھا احدا فلا تدخلوھا حتیٰ یؤذن لکم وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکیٰ لکم واللہ بما تعملون علیم (سورۂ نور آیت ۲۷ تا ۲۸) اے ایمان والو اپنے گھروں کے علاوہ گھروں میں داخل نہ ہو جہاں تک کہ اجازت نہ لی جائے اور اگر تم سے لوٹ جانے کو کہا جائے تو لوٹ جایا کرو یہ تمہارے لئے پاکیزہ صورت ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو۔"

یہاں تک کہ گناہ یا الزام کو ثابت کرنے کے لئے جائز نہیں ہے کہ گھروں میں چھپ کر پھاندا جائے اور لوگوں کی رہائش گاہوں کا تجسس کیا جائے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے رات کے دورے میں ایک گھر سے گزرے جس کے اندر ایک مرد اور ایک عورت کی آواز سنی آپ کو شبہ ہوا تو دیکھنے کے لئے دیوار کو پھاند گئے۔ دیکھا کہ ایک مرد اور ایک عورت ہے جن کے ساتھ

شرابیں کا شغل ہو رہا ہے حضرت عمرؓ نے کہا اے اللہ کے دشمن کیا تم سمجھ رہے ہو کہ اللہ تمہاری پردہ پوشی کرے گا جب کہ تم اس کی معصیت کر رہے ہو ــــــ اس آدمی نے کہا کہ اے امیر المومنین میں نے تو اللہ کی ایک نافرمانی کی اور آپ نے تو تین نافرمانیاں کیں اللہ کہتا ہے کہ وَلَا تَجَسَّسُوا اور آپ تجسس کر رہے ہیں اللہ کہتا ہے کہ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا اور آپ دیوار پھاند کر آ رہے ہیں اور اللہ کہتا ہے کہ لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا اور آپ نے ایسا نہیں کیا اس طرح پر حضرت عمرؓ نے سکوت اختیار کیا اور اس کو معاف کر دیا۔

انہیں ضمانتوں کی بنیاد پر اسلام فرد کی آزادی اس کے سکون اور اس کی عزتوں کی کفالت کرتا ہے جب بھی کوئی اس کی عزت آبرو اور سکون پر ڈاکہ ڈالے گا تو اس کے لئے قصاص حاضر ہے خواہ وہ ظالم حاکم اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اسلام کے قانون اور اس کے زمانہ حکومت کے تاریخی واقعات کو دیکھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ اس نے قصاص کے معاملہ میں کسی خلیفہ یا امیر کسی عام مسلمان کے مابین کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے آپ کو اس کا پابند رکھتے تھے عمر بن الخطابؓ ایک عام مصری لڑکے کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ حاکم مصر عمرو بن العاص کے شریف زادے بیٹے کو کوڑے لگا کر اپنا بھر پور انتقام لے علی ابن ابی طالب خود ایک نصرانی کے خلاف اپنی زرہ چرانے پر قاضی شریح کے یہاں دعویٰ کرتے ہیں قاضی ان کے خلاف فیصلہ کرتا ہے کیوں کہ وہ چوری کا ثبوت نہیں فراہم کر سکے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر بہت خوش ہوتے اور قاضی کے اس فیصلہ کو پسند کیا، ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں اور ہمارے لئے بس اشارہ ہی کافی ہے۔

اسلام فرد کے رزق کی ضمانت جماعت سے بھی دلاتا ہے قوت کے وقت عمل اور مزدوری میں منصفانہ طریقہ دلا کر ضمانت بخشتا ہے بیماری مجبوری اور بڑھاپے کے وقت اجتماعی ضمانت میں سونپ دیتا ہے وہ نوعمر اور دودھ پینے والے بچوں کی بھی کفالت کرتا ہے جب تک کہ وہ کام کے لائق نہ ہو جائیں۔

غرض اسلام ہی وہ دینِ فطرت ہے، جس نے امن کی کامل ضمانت دی ہے اور انسانیت کا پورا احترام کیا ہے۔

-×-

شہنشاہ جہانگیر کی آپ بیتی

تزکِ جہانگیری کے چند اقتباسات

(ترجمہ و تلخیص :- خواجہ راحت حسین)

یہ ایک مُطلق العنان شہنشاہ کے خود نوشتہ سوانح حیات کی چند جھلکیاں ہیں جن میں عبرت و بصیرت کے اسباب ہیں، اہلِ دل اور اربابِ نظر کے لئے ——— اور علمی آثار ہیں تاریخ کے طالب علموں کے واسطے !

جاہ و دولت کے ہجوم اور قصر و ایوان کے ماحول میں ضمیر کی تابندگی بہت کچھ دُھندلی پڑجاتی ہے مگر پھر بھی اس کی روشنی میں کچھ بھلائی کی باتیں بھی ظہور میں آجاتی ہیں ——
سیاہی اور سپیدی، تاریکی اور روشنی، خیر اور شر ملے جُلے ! (م - ق)

جہانگیر خود لکھتا ہے :-

(۱) تخت نشین ہونے کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ آگرہ کے قلعہ کے بُرج سے زنجیرِ عدل آویزاں کرائی جس کا دوسرا سرا دریائے جمنا کے کنارے ایک پتھر کے ستون میں لگایا گیا۔ مقصود یہ تھا کہ اگر کسی شخص پر ظلم ہو تو وہ اس زنجیر کو ہلادے تو مجھے اطلاع ہو جائے۔ سونے کی زنجیر تھی، ۴۰ گز لمبی، چھ من وزنی جس میں ۸۰ چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

(۲) میں نے رعایا پر سے تین محصول زکوٰۃ، سرمُہری اور تمغہ معاف کردیئے جن کے ذریعہ سے ہر سال سوا سو من سونا خزانہ شاہی میں آیا کرتا تھا۔

(۳) شراب کی کشید اور فروخت کی مطلقاً مُمانعت کردی گئی اگرچہ دُنیا جانتی ہے کہ میں خود سولہ سال کی عمر سے شراب نوشی کا سخت عادی ہوں اور بیس بیس جام روز چڑھاتا رہا ہوں (ایک جام آدھ سیر شراب کا ہوتا تھا)

(۴) ایک دفعہ اپنے باپ سے پوچھا کہ آپ نے بُت پرستوں کے معابد کی تعمیر کو روکنے کی کیوں ممانعت کردی ہے تو انہوں نے جواب دیا :- "بیٹا میں زمین پر خدا کا سایہ ہوں۔ خدائے تعالیٰ بغیر کسی امتیاز کے اپنی رحمتیں ساری مخلوق پر یکساں نازل کرتا ہے اس لئے مجھے بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ میں اپنی بخشش سے کسی طبقۂ انسانیت کو محروم رکھوں۔ ساری نوعِ انسانی سے خدا کی کل مخلوق سے میری صلح و آشتی ہے۔ اس لئے میرے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں کسی پر بھی ظلم روا رکھوں۔ ہندوستان میں ہر چھ آدمیوں میں پانچ ہندو ہیں۔ میری رائے میں دانائی یہ ہے کہ اُن کو اپنے حال پر چھوڑا جائے اور اُن کے مذہبی معاملات میں قطعی مداخلت نہ کی جائے۔

(۵) سید فضل کو جس نے میرے والد کے زمانہ میں قابل قدر خدمات انجام دی تھیں میں نے پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور اُس کو جلیل القدر القابات سے نوازا۔ جب وہ دربار سے چلا گیا تو مجھے بتایا گیا کہ اس کے ملازمین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو لوگوں پر ظلم اور تعدی کے عادی ہیں۔ میں نے فوراً اُس کے پاس آدمی بھیج کر کہلایا کہ میرے لئے ادنیٰ اور اعلیٰ سب برابر ہیں اور میری انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ میں کسی پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا اگر مجھے ذرا بھی اطلاع ملی کہ تمہارے ملازمین میں سے کسی نے کسی پر ظلم کیا ہے تو یاد رکھو اُس کا عبرتناک خمیازہ بھگتنا پڑے گا، اس کا جواب اُس نے بھیجا کہ آپ اطمینان رکھیں اگر میرے ماتحتوں میں سے کسی نے ظلم کیا تو اُس کا سر قلم کر دیا جائیگا۔

(۶) میرے پاس بارہ ہزار ہاتھی تو ایسے ہیں جن سے میدانِ جنگ میں کام لیا جاتا ہے اور ایک لاکھ ایسے ہیں جن پر عماری کسی جاتی ہے اور لشکر کی بار برداری کے کام میں آتے ہیں اُن پر ۴۶۰ لاکھ اشرفی سالانہ صرفہ ہوتا ہے اور ہر ایک ہاتھی کی خدمت کے لئے پندرہ آدمی ملازم رکھے گئے ہیں۔

(۷) میری بیگم نورجہاں میرے حرم کی چار سو عورتوں میں سب سے برتر ہے۔ میں نے اُس کو تیس ہزاری کا منصب دے رکھا ہے۔ ساری سلطنت میں مشکل سے کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں اُس نے کوئی عالیشان قصر یا خوش نما اور وسیع باغ اپنے ذوق اور فیاضی کے ثبوت میں تعمیر نہ کرایا ہو۔ پہلے میرا ارادہ اس سے شادی کا نہیں تھا اس لئے والد کے عہد میں اُس کا عقد شیر افگن سے ہو گیا تھا لیکن جب اُس امیر کا قتل ہو گیا تو میں نے قاضی کو بلا کر نورجہاں سے عقد کر لیا اور جہیز میں اس کو اسی لاکھ اشرفیاں دیں جن کے لئے اُس نے کہا تھا جواہرات کی خرید کے لئے ضروری ہیں۔ میں نے کسی پس و پیش کے بغیر اس کو منظور کر لیا۔ میں نے بیگم کو ایک موتیوں کا ہار نذر کیا جس میں چالیس موتی تھے اور ہر موتی چالیس ہزار روپیہ کی مالیت کا تھا۔ اس بیگم کو میرا پورا اعتماد حاصل ہے اور میں نے اس کے خاندان کو جو بڑے کمالات کا حامل ہے، اپنی سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ بیگم کے والد میرے دیوان ہیں۔ اُن کے بھائی وزیر ہیں اور بیگم میرے افکار میں میری کبھی نہ جُدا ہونے والی رفیق ہیں۔

(۸) رائے رایان راجہ بکرماجیت کو میں نے توپخانہ کا سردار مقرر کیا اور حکم جاری کیا کہ ساٹھ ہزار توپیں اونٹوں پر لادی جانیوالی اور بیس ہزار بڑی توپیں شاہی لشکر کے لئے ہر دم تیار رکھی جائیں رائے رایان کو جو بڑے دولت مند ہیں، وزیر الامرا کے منصب پر فائز کیا گیا۔

(۹) میں نے پہلے احکام جاری کئے تھے کہ جس ہندو بیوہ کے بچے ہوں اس کو ہرگز ستی نہ ہونے دیا جائے چاہے وہ خود رضامند کیوں نہ ہو۔ اب میں نے مزید فرمان جاری کیا ہے کہ اگر کسی کو بہ جبر ستی کیا جانیوالا ہو تو اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دی جائے۔

(۱۰) میں نے ابوالفضل کے لڑکے شیخ عبدالرحمٰن کو دو ہزاری کے منصب پر فائز کیا حالانکہ اس کے باپ کے فسق و فجور کا مجھے اچھی طرح سے علم تھا، میرے والد کے آخر دور میں اُس اثر و رسوخ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جو اُس نے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا تھا وہ اپنے آقا کے دل میں یہ خیال ڈالنا چاہتا تھا کہ حضور رسالت پناہ ختمی مرتبت روحی فداہ محض ایک فصیح و بلیغ عرب تھے قرآن نعوذ باللہ الہامی نہیں ہے بلکہ خود آپ کی تصنیف ہے۔ ان وجوہ سے میں نے ایک شخص کے ذریعہ ابوالفضل کو قتل کرا دیا اور قاتل نے ان کا سر میرے پاس بھیجا جس کی وجہ سے میرے والد مجھ سے انتہا سے زیادہ ناراض ہوئے۔ اور انھوں نے میرے بجائے میرے لڑکے کو خسرو کو اپنا جانشین قرار دیا۔ لیکن ہوا وہی جو خدا نے چاہا۔

ابوالفضل کی وفات کے بعد میرے والد کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور وہ کچھ کچھ راہ راست پر آگئے اور سچے مومن [illegible] گئے۔

(۱۱) اب میں ایک واقعہ لکھتا ہوں جس کی وجہ سے میرے دل کو بڑی اذیت پہنچی کیوں کہ ایک طرف ذاتی دوستی کا جذبہ تھا اور دوسری طرف پبلک فریضہ کا احساس۔ خان اعظم خاں کا لڑکا مرزا نور میرے سامنے قتل کے الزام میں پیش کیا گیا اس نوجوان کو میں والد اپنے لڑکے کی طرح چاہتے تھے۔ میں نے اس کو فوراً قاضی میر عدل کے اجلاس میں بھیج دیا۔ اور ہدایت کر دی کہ اُس کے ساتھ بعد قلمبندی شہادت قانونی کارروائی کی جائے۔ قاضی نے مجھے اطلاع دی کہ ملزم کے خلاف قتل کا جرم ثابت ہو چکا ہے جس کا قصاص سزائے موت ہے۔ باوجود اس کے کہ مجھے ملزم سے محبت تھی اور میں اس کے باپ کا بڑا احترام کرتا تھا میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں شرع کے خلاف عمل کروں۔ اس لئے میں نے بادل ناخواستہ ملزم کو جلاد کے حوالہ کر دیا۔ اس کے بعد ایک مہینہ تک میں انتہائی رنج و ملال میں مبتلا رہا۔ اگر اس معاملہ میں میں اپنا فرض انجام نہ دیتا تو پھر کسی کی جان محفوظ نہ رہتی۔ حاکم کا فرض ہے کہ قانون شکنی کرنے والے کو کیفر کردار تک پہنچائے۔

(۱۲) غربا و مساکین کی امداد کا کام میں نے میران صدر جہان کے سپرد کیا اور حاجی کوکہ کو بیوہ گان کی امداد کا کام تفویض کیا

(۱۳) اس وقت میرے لشکر میں پانچ لاکھ بند وقچی پیدل یا شتر سوار ہیں علاوہ اُن کے جو مختلف قلعہ جات میں متعین ہیں اور جن کی تعداد تیس لاکھ ہے۔

(۱۴) ایک دفعہ میرے دربار میں سات بازیگر آئے بنگال کے جادوگر اور انھوں نے اپنے کرتب دکھائے جو محیر العقول تھے انھوں نے چشم زدن میں زمین میں بیج ڈال کر مختلف اقسام کے درخت پیدا کر دیئے اور ان میں پھل بھی لگا دیئے۔ بغیر آگ کے انھوں نے پلاؤ کی دیگ پکا کر تیار کر دی ایک آدمی کے سب اعضا انھوں نے الگ الگ کر دیئے۔ پھر اُن پر ایک چادر ڈال دی۔ اور کچھ دیر کے بعد اُن ٹکڑوں کا سچ مچ آدمی بن گیا اور باہر نکل آیا۔ ایک تھیلے میں سے طرح طرح کے پرند نکال دیئے ایک حوض کے پانی کو ذرا سی دیر میں جما دیا اور برف میں تبدیل کر دیا ایک خیمہ سے طرح طرح جانور نکالے ایک پھول پانی میں ڈبو ڈبو کر اُس کے رنگ کو تبدیل کر کے دکھایا۔ ایک پنجرہ میں ایک بلبل تھی اُس کو طوطا بنا دیا۔ پھر اس کو تیتر بنایا۔ پھر دوسری چڑیا۔ یہ تماشہ کوئی سو دفعہ دکھایا۔ ہر دفعہ ایک نئی چڑیا نظر آتی تھی۔ ایک قالین کے نقش و نگار اور رنگ لمحہ بہ لمحہ تبدیل کر کے دکھائے تھیلے میں تربوز گالا اور ککڑی برآمد ہوئی۔ انگور ڈالے اور سیب برآمد ہوئے ایک جادوگر نے اپنے منہ سے آٹھ سانپ پے در پے نکالے۔ خالی مرتبانوں میں طرح طرح کے مربّے دکھا دیئے۔ ایک تھیلی میں کلیاتِ سعدی ڈالی اور دیوانِ حافظ برآمد ہوا پھر وہ دیوان سلیمان بن گیا پھر کچھ اور پھر کچھ اور۔ پچاس ہاتھ کی ایک زنجیر نکالی۔ اس کو ہوا میں اچھالا۔ وہ زنجیر اس طرح سے ٹنگ گئی کہ جیسے ہوا میں کسی چیز میں اٹک گئی ہو۔ پھر ایک کتا نکالا جو زنجیر کے اوپر چڑھ گیا اور اوپر جا کر غائب ہو گیا۔ پھر ایک سور شیر چیتا اسی طرح اس زنجیر پر چڑھے اور غائب ہو گئے۔ ایک خالی ڈلیا میں سے طرح طرح کے میوے نکال دیئے۔ انگوٹھی کے نگینے کے رنگ تبدیل کر کے دکھائے۔ کبھی وہ نگ لعل بن جاتا کبھی زمرد، کبھی ہیرا، کبھی فیروزہ۔ سادہ اوراق پر طرح طرح کے نقش و نگار نمایاں کر کے دکھائے۔ یہ وہ کرتب ہیں، جن کو دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

(۱۵) صوبہ گجرات میں خانخانان کی دختر خیر النسا بیگم نے احمد آباد میں اپنے باغ میں میری دعوت کی اس وقت موسم خزاں کا تھا اور درختوں میں نہ پتے تھے نہ پھل۔ لیکن رات کو باغ میں داخل ہوا تو درختوں میں نہ صرف پتے تھے بلکہ پھول اور پھل بھی تھے اور اُن پر چڑیاں پھدک رہی تھیں میں نے جب ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ پتے اور پھل سب کاغذ اور موم کے تھے اُن پر بالکل اصل کا دھوکا ہوتا تھا۔ راتوں رات چار سو صناعوں نے یہ کرشمہ دکھایا تھا۔

(۲۶) ... کا ایک ماہر موسیقی میرے پاس بھیجا گیا جو بانسری بجاتا تھا اس نے اپنے فن کے کمال سے مجھے مسحور کر دیا تو
... نے حکم دیا کہ اُس کو سونے میں تول دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ پھر اس کی لڑکی کو بھی اس کے ساتھ بٹھا کر سونے میں دوبارہ
... گیا اور یہ سب سونا اس کو بخشدیا گیا۔ لیکن یہ شخص بڑا حریص تھا۔ اُس نے اپنی حرص کی وجہ سے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔
... میں نے اُس کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔

—×—

ڈاکٹر محمد صابر
پی۔ایچ۔ڈی

تورکیہ میں تین سال!

بن بر ترکم دینیم جنسیم اولو در
سینم او روحم آتشیلہ طولو در (ترکی شاعر محمد امین)

ترجمہ :- میں ایک ترک ہوں میرا دین اور نسل اعلیٰ ہیں میرے
سینے اور رُوح میں آگ بھری ہوئی ہے ـــــــــ

مسلمانانِ پاک و ہند کو ترکوں سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ترکوں کے شیدائی ہیں ترک بھی ہمیں اسی نظر سے دیکھتے ہیں ہمارے کلچر پر ترکوں کا اتنا گہرا اثر ہوا ہے کہ ہم ترکوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے متمنی اور شائق ہیں۔ علماء یورپ ایک خاص مقصد کے تحت کتابیں لکھتے ہیں اور اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ ترکوں کو عالم اسلام سے کاٹ دیا جائے۔

ترکان اناطولیہ دراصل اوغوز یا ترکمن ترک ہیں جن کو مغربی ترک بھی کہا جاتا ہے۔ آل سلجوق عثمانی تورک، ترکستان سے ہجرت کر کے اناطولیہ پہونچے ہیں۔ ان سے قبل ہندوستان کی جانب دیگر ترکوں نے توجہ کی جس میں محمود غزنوی بہت مشہور ہے جو یاغما قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، ترکوں کے آبائی وطن کو وسط ایشیا (ترکی میں اورتہ آسیا ORTAASYA) کہتے ہیں۔ پھر اس کا نام ترکستان ہو گیا ترک لوگ اسے (TURKİLİ) (مملکتِ تورک) کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام توران بھی ہے اسی مناسبت سے ترکوں کو تورانی بھی کہا جاتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر غالب نے اپنے کو ترک بتایا ہے اور اپنے وطن کو ترکستان کے بجائے توران ہی کہا ہے ملاحظہ ہو ؎

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم
مرزیاں نادۂ سمرقندیم

ہندوستان میں جو ترک آئے وہ عام طور سے مغربی ترکوں سے ذرا مختلف تھے۔ ہندوستان میں ان اتراک نے زبردست سلطنتیں قائم کیں سب سے بڑی اور آخری ترکی سلطنت بابر نے قائم کی جو ترکی زبان کا عظیم شاعر اور ادیب تھا، وہ بارلاس نامی ترکی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، اس کے خاندان کو جہالت کے باعث مغل کہا جاتا ہے جسکی تردید بابر اپنی تورک (بابری) میں کرتا ہے۔

اناطولیہ کے ترک

اگر آپ اناطولیہ کا سفر کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ ترکستان کے ریگستانی اور کوہستانی علاقوں کی سیر کر رہے ہیں جب آپ قونیہ اور انقرہ سے گزریں گے، تو آپ کو سمرقند و بخارا کی آب و ہوا ملے گی ترکوں کی یوں تو بہت سی خصوصیتیں ہیں لیکن میں صرف دو کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ممتاز خصوصیتیں ہیں یعنی ترکوں کا حُسن اور ان کی جسامت و تیزی۔

ترک چھوٹا میانہ قد گول چہرے، ترچھی اور چھوٹی چمکدار آنکھوں والے ہوتے ہیں گال اُبھرے ہوئے سُرخ اور چوڑے، اور پیشانی کشادہ ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دانت، سفید یا تانبے جیسا رنگ۔ ترکی میں مونچھیں رکھنے کا رواج ایک زمانے میں بہت تھا لمبی لمبی عجیب سا ہے لباس آج بھی اناطولیہ کا ترک چپٹی ناک کی وجہ سے کچھ ملکی حضرات خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ حیات [illegible]

ہندوستان تک کا فوری کی لاج ہیں، اناطولیہ میں آپ کو یہی رنگ نظر آئے گا۔ ترکوں میں حسن و وجاہت کے ساتھ ساتھ حسن اخلاق بھی ملتا ہے۔ ترک سارے علاقوں میں عام طور سے حسین ہیں لیکن اوغوز ترکوں کا قبیلہ حسین ترین ہے۔ جو ترکی نشان (روس) سے لے کر ایران عراق شام قبرص بلقانی ریاستوں اور اناطولیہ تک پھیلے ہوئے ہیں، ترکوں کی خوب صورتی ضرب المثل بن گئی ہے۔ مثلاً حافظ شیرازی فرماتے ہیں سہ

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حافظ نے ترک شیرازی اس لئے استعمال کیا ہے کہ شیراز کے قریب وجوار میں مشہور ترکی قبیلہ "قاش قائی" بستا ہے۔ راقم الحروف نے جب شیراز کا دورہ کیا اور شیرازی ترکوں سے ملاقات کی آج بھی ترک حسن کے لئے مشہور ہیں۔

ترکوں کی دوسری خصوصیت جسارت اور بہادری ہے ترکوں کو عام طور سے وحشی اور جاہل اور تندو تیز سمجھا جاتا ہے۔ عربوں نے تو انہیں "اتراک" یے اور اک" کہنا شروع کر دیا یعنی وہ قومیں جن کا مقابلہ ترکوں سے ہوا وہ ان کی بہادری کو دحشت سے تعبیر کرنے لگیں بہادری ترکوں کا امتیازی وصف ہے تاریخ شاہد ہے کہ ترکوں نے اپنے اس جوہر کی ہمیشہ حفاظت کی ہے اور اس کی لاج رکھی ہے، اور وہ اپنی اس مردانگی اور جنگی فراست وچالاکی پر فخر کرتے آئے ہیں۔

مشہور ترکی شاعر اور ہندوستان میں آخری ترکی سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر شاہ (جسے غلطی سے مغل کہا جاتا ہے) اپنی توزک بابری میں اس کا اظہار یوں کرتا ہے: سہ

با ترک دلیری مکن اے میر بسیانہ
چالاکی و مردانگی ترک عیاں است
گر زود نیائی ونصیحت نکنی گوش
آنچہ کہ عیان است چہ حاجت بہ بیان است (توزک بابری، ترکی دیوان بابر)

صرف بابر ہی نہیں بلکہ اناطولیہ کے پہلے ترکی شاعر حضرت مولانا جلال الدین رومی اپنے فارسی کلام میں فرماتے ہیں۔

یک حملہ ویک حملہ کامد شب و تاریکی
ترکی کن وحشی کن نہ نرمی و تاجیکی

اس سلسلہ میں مجھے ایک ایرانی دوست نے ایک واقعہ سنایا کہ بغداد سے جنید ترک استانبول بذریعہ ریل آرہے تھے۔ عربوں نے شام کی سرحد کے قریب اسرائیل کے متعلق بات چیت شروع کر دی اور کہا کہ ترکی نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کے خلاف کچھ نہیں کیا، وہ لوگ پوری طرح اپنی بات بھی ختم نہ کرنے پائے تھے کہ ترکوں نے زنجیر کھینچ کر ریل رکوا دی اور کہا کہ سارے عرب جنگ کے لئے چلیں ساتھ ابھی بلکہ اسی وقت اسرائیلی حدود کی طرف مارچ کریں ہمیں اسلحہ سپلائی کئے جائیں۔۔۔۔ ترکوں کے اس جوش اور جذبہ کو دیکھ کر ٹرین کے مسافر حیران اور پریشان ہو گئے۔ بعض لوگوں نے نرم لہجہ میں کہا کہ جنگ ہی تو اس مسئلہ کا حل نہیں ہے، جنگ کرنے والے تھے لعنت ان مسلمانوں پر جو اپنے لہو کی قربانی دینے سے ڈرتے ہیں۔

تاریخ بھی شاہد ہے کہ آل سلجوق اور عثمانی ترکوں نے اسلامی پرچم کی حفاظت و سربلندی کے لئے لگاتار جنگیں کیں اور عیسائیوں تک پہنچے۔ پہلی جنگ عظیم اور جنگ آزادی کے دوران تقریباً ۲ لاکھ ترک شہید ہوئے اس میں جنگ عظیم سے قبل کی بھی بعض [illegible] ہیں۔ ایک وقت وہ آیا جب بعض علاقوں میں ایک بھی نوجوان مرد زندہ نہیں بچا۔ ایک دردناک [illegible]

میرے ایک فوجی ترک دوست نے سنایا، اُس نے کہا کہ جنگ آزادی کے دوران ہمارا فوجی دستہ ایک گاؤں سے گزرا ہم لوگ رات میں چند گھنٹے کیلئے ٹھہرے۔ چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ بہت سی بوڑھی اور سن رسیدہ خواتین نمودار ہوئیں انھوں نے کہا اللہ کا شکر ہے آپ لوگ آگئے ہیں گاؤں کے سارے نوجوان مرد مارے جاچکے ہیں ہماری تمنا ہے کہ چند نوجوان لڑکیاں گھروں میں ہیں آپ لوگ اُن سے شادی کرلیں تاکہ چند سال بعد اس قوم کو بچانے کے لئے نئی نسل تیار ہو جائے کمانڈر نے یہ باتیں سُنیں اور رو دیا اور کہا کہ آپ لوگ گھبرائیں نہیں صرف چند روز میں ہمیں غلبہ حاصل ہوگا ہم جہاد کررہے ہیں اسلام کے تحفظ کے لئے لڑ رہے ہیں اللہ مدد کرے گا یہ کہہ کر کمانڈر کی اجازت بھی دیدی۔ نہایت ہی عبرت آموز واقعہ ہے زندہ رہنے والی قومیں خون کی قربانی دیتی ہیں۔

ترکی زبان وادب

عام طور سے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ سوالات کرتے ہیں کہ کیا ترک فارسی بولتے ہیں یا عربی کبھی یہ بھی پوچھتے ہیں کہ ترکی زبان سے کیا مراد ہے کیا کوئی الگ زبان ہے یا عربی فارسی سے مشتق ہے۔ اس قسم کے بہت سے احمقانہ سوالات ہوتے رہتے ہیں۔ ترک اپنی زبان کو ترک چہ (TURKCE) یا ترک دلی (TURK DİLİ) کہتے ہیں اس زبان کے بولنے والے دنیا میں تقریباً ۱۰ کروڑ سے زائد ہیں جو سائبیریا سے البانیہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ترکی قدیمی اور الگ ایک مستقل زبان ہے اس میں اس وقت بھی ۵۵ / عربی و فارسی کے الفاظ شامل ہیں اردو دان حضرات کے لیے اس کا سیکھنا نہایت ہی آسان ہے ایک اردو جاننے والے کو ترکی سے لگاؤ ہونا چاہئیے کیونکہ لفظ اردو بذات خود ترکی ہے اور اردو زبان میں بہت سے ترکی الفاظ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ جملوں کی ساخت بالکل اردو جیسی ہے اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ترکی زبان کی گرامر نہایت ہی مختصر ہے صرف جملے بڑے لمبے لمبے ہوتے ہیں اور لاحقے صرف آخر میں لگائے جاتے ہیں جس کی باعث اسے "چپکنے والی" زبان بھی کہتے ہیں۔ ترکی زبان میں "ق" "غ" "چ" اور "ش" "ت" وغیرہ کی بہتات ہے۔ چند ترکی الفاظ ملاحظہ ہوں:-

قولاق (کان) ر[illegible] (پیر - پیالہ) یاناق (رخسار) بولاق (چشمہ) بلاق (دلدل) بارغ (چربی) [illegible] (لقلقا) چاغ (زمانہ) تاغ (پہاڑ) تانگ (سویرا) تنگری (خدا) اوزوم (انگور) قرداش (بھائی)

ترکی زبان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مذکر و مونث کا جھگڑا نہیں ہے۔ بعض آوازیں فارسی اور سنسکرت سے ملتی ہیں یہ صرف مشابہت ہی مشابہت ہے گرامر کے لحاظ سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی ترکی زبان اصول کے اعتبار سے آریائی نہیں ہے جس طرح فارسی اور ہندی اور انگریزی وغیرہ۔

ترکی زبان دراصل تورانی یا یورالی زبان ہے اور اس کا قدیم زبان میں منگولی ہنگری بلغاری فینشی وغیرہ سے گہرا تعلق ہے قبل اسلام ترکوں کا لٹریچر موجود تھا کم تھا تو کیا ہے یہ الزام (خاص کر مسلمان ہونے کے بعد) لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے قبل اسلام کے لٹریچر کو تباہ کردیا یہ دراصل بے بنیاد الزام ہے اور جان بوجھ کر ایسا کہا جاتا ہے جس کی وجہ حسب ذیل ہے (۱) ترکوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ ان کے اجداد (مسلم اجداد) علم و ادب کے دشمن تھے۔ (۲) جدید ترکی کی بنیاد چونکہ لادینی رسم الخط اور لادینی حکومت پر ہے اور کسی حد تک قوم پرستی کا بھی چرچا ہے اس لئے عربی اور اسلام کے خلاف نوجوانوں کو اکسانے کے لئے یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ مشہور انگریز مصنف B. L. EVANS بھی اس غلطی کا شکار ہوگیا ہے۔

اسلام کے بعد [illegible] ترک عام طور سے بدھ مت تھا اور اغوز ترکوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور [illegible] [illegible] KUR K HOAJ [illegible] [illegible] ترکی ادب کا [illegible] [illegible]

بعد میں جب وہ بودھ ہو گئے تو UYGHUR اور سنسکرت رسم الخط بھی استعمال ہونے لگا تھا۔ اسلام کے آغاز کے وقت ترکی زبان سنسکرت الفاظ سے بوجھل تھی اور پوری قوم بدھ مت کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ بعد قبول اسلام ترکوں میں ادبی و علمی فتوحات تیزی سے پیدا ہوا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ عربوں کے اجداد اسلامی تاریخ میں عام طور سے ترک ہی ترک نظر آتے ہیں اسلامی دنیا میں بڑی بڑی حکومتوں کے بانی یہی ترک ہوتے۔ مثلاً غزنوی، قاراخانی، سلجوقی، اتابکی، تیموری، آخشیدی، طولونی اور مملوک وغیرہ۔ جہاں تک ہند کا تعلق ہے دسویں صدی سے ۱۸۵۷ء تک عام طور سے ترک ہی برسر اقتدار رہے۔

ہند کے مشہور شاعر امیر خسرو کا ترک ہونا سب کو معلوم ہے۔ بابر کا خاندان برلاس ترک تھا۔ یہی نہیں بلکہ نظام حیدرآباد بھی ترکی سردار قیلیچ خان کی اولاد ہے۔ ترکی قوم کا سب سے بڑا شاعر امیر علی شیر نوائی ہی ہے جو ملا جامی کا شاگرد دوست اور رفیق بھی تھا۔ فضولی بغدادی بھی مشہور شاعر ہیں لیکن ترکیہ کے اہم شاعر احمد دائی، باقی، نامق کمال، حامد عبد الحق، یحیٰ کمال اور محمد عاکف ارسوئی ہے۔ اس وقت ترکی میں کوئی بڑا اور مشہور شاعر نہیں ہے۔ اناطولیہ کے سلجوقی دور کے شعراء مولانا روم، یونس امرہ دخانی، سلطان ولد وغیرہ ہیں۔ بابر شرقی ترکوں کا عظیم شاعر ہے۔

ترکی ایک ایسا ملک ہے جس کے کسی طرف بھی نکل جائیے تو صرف ترکی بولنے والے کثرت سے ملیں گے مثلاً روس اور ایران کی طرف آخراسی اور کوہ قاف کے ترک ملیں گے۔ عراق اور شام کی سرحد پر ۱½ لاکھ سے زائد ترک ملیں گے۔ بحیرہ روم کے جزیروں اور قبرص میں ترک ملیں گے۔ شمال میں ترک اور مغرب میں یونان اور یوگوسلاویہ اتراک اوغوز سے بھرا ہوا ہے۔ ترکی زبان کی عجیب خاصیت ہے بخارا کا ایک ترک استانبولی ترک سے بآسانی بات چیت کر سکتا ہے۔ ترکی وسیع ملک ہے رقبہ ۲۹۴۲۰۰ مربع میل اور آبادی ۲ کروڑ ۷۵ لاکھ ہے۔

ترکی کی آب و ہوا عموماً سرد اور صحت بخش ہے ترکی ایک جزیرہ نما ہے ترکوں کو دہی اور میٹھی چیزیں مرغوب ہیں۔ (AYRAN) تو جاڑے بھر چلتی رہتی ہے برفباری خوب ہوتی ہے۔ ترک کھانا بہت کھاتے ہیں اور خوب کھلاتے ہیں مشہور دریا دجلہ و فرات اور جیحون اور سیحون ہیں۔

ترک عام طور سے حنفی مذہب رکھتے ہیں اور ان کے ملک میں مسلمانوں کا تناسب ۹۹ فیصد ہے۔ سعودی عرب جیسے ریگستانی علاقے میں صرف سو فیصدی مسلمان ہیں ترکوں کے بارے میں یہ پروپاگنڈا ہے کہ وہ اسلام سے دور ہو گئے ہیں یہ غلط ہے ترک دوسرے مسلمانوں سے زیادہ مذہبی امور کے پابند ہیں صدیوں یہی ترک اسلام کی خاطر خون بہاتے رہے ہیں۔ آخر تاریخ اور ماضی کا بھی تو اثر ہوتا ہے ترکی میں جنگ آزادی اسلام کے نام پر اور خلیفہ کے حقوق کے تحفظ کے نام پر لڑی گئی تھی لیکن غازی کمال پاشا لادینی اور مادی حکومت کے حامی تھے اس لئے برسر اقتدار آنے پر انھوں نے اپنے افکار کو عملی جامہ پہنایا وہ اسلامی حکومت کے طرفدار نہ تھے وہ خالص لادینی اور مادی حکومت کے دلدادہ تھے۔ اگر انھوں نے خلافت وغیرہ کو ختم کیا۔ تو اپنے نظریات کے تحت۔ ۱۹۲۲ء میں ترکی کا جو دستور بنا تھا اس میں ترکی میں اسلام کو سرکاری دین قرار دیا گیا تھا اور حلف وفاداری میں لفظ موجود تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جو قانون بنا اس میں سے "سرکاری مذہب اسلام" کا فقرہ نکال دیا گیا اور حلف وفاداری میں اللہ کے بجائے ناموس کا لفظ لایا گیا دینی مدارس بند کر دیئے گئے وزارت اوقاف کا خاتمہ ہو گیا اذان عربی سے ترکی میں ہو گئی اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب ترکی میں قانوناً مسجدوں کی میناروں سے "اللہ اکبر" کی آواز جرم قرار دی گئی۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی وفات کے بعد دینی اصطلاحات پر نظر ثانی ہوئی ہے اور اب ترک آزادی سے دینی امور میں حصہ لیتے

ہیں۔ ترکی حکومت کی غلطیوں سے ترک دنیا میں بدنام ہو گئے کہ اسلام کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ ترکوں میں زبردست اسلامی جوش موجود ہے مولانا روم اور اقبال کا اثر بھی کافی ہے ترکی میں مولویہ اور قادریہ طریقت کے سلسلے بہت مقبول ہیں۔ تیجانی بھی ایک طریقت ہے مگر اس نے چونکہ کمال پاشا کے بہت سے مجسموں کو شہید کر دیا ہے (لادینی ترکوں کے الفاظ میں) اس لئے مقبول نہیں۔ حکومت نے کمال پاشا کے مجسموں اور اُن کی عزت کی حفاظت کے لئے قانون بنا دیا ہے جس کی رُو سے کمال پاشا پر تنقید اور مجسموں پر گندگی ڈالنا جرم قرار دیا گیا ہے۔

ترک پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں اگرچہ وہ پاکستان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترکی میں دینی رجحانات روز بروز ترقی کر رہے ہیں! اور ترکی کا دین پسند طبقہ یہ جان کر خوش ہوتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نظریہ پر وجود میں آیا ہے۔

ایک گمنام ادیب و مُفکّر کا مکتوب

جناب وارث سرہندی زبان و ادب، تاریخ اور فلسفہ و اخلاق سے گہرا شغف رکھتے ہیں اُن کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے! افسوس ہے کہ موصوف ناسازگار حالات کے سبب گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں! اگر اُن کو کام کرنے کے خاطر خواہ مواقع حاصل ہوں، تو اُن کی علمی صلاحیتوں اور ادبی صلاحیتوں سے معاشرے کو بہت فائدہ پہونچ سکتا ہے! —— اُن کی زندگی اس اعتبار سے ایک "المیہ" ہے کہ اُن کے شاہبازِ فکر کو علم و ادب کی فضا میں پرواز کے مواقع میسر نہیں ہیں۔

صاحب موصوف کا یہ مکتوب کس قدر متوازن اور معلومات آفریں ہے۔

(جزاہ اللہ خیر الجزا) —— م۔ ق۔

حبیبی اللبیب!

سلام مسنون! آج کی ڈاک سے آپکا نوازش نامہ موصول ہوا۔ آپ کی کرم گستری و بندہ نوازی کے لئے بصمیم قلب شکرگزار ہوں میں نے "غلط العام" کے وجود سے انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کے لئے بعض شرائط بیان کی تھیں۔ "شمس" واقعی اُردو میں مذکر استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ عربی میں مونث ہے، میں بھی اس کو اُردو میں مذکر ہی درست اور فصیح سمجھتا ہوں۔ اس کی تذکیر اُردو میں متفق علیہ۔ اسی طرح کتاب اور مسجد عربی میں مذکر ہیں لیکن اردو میں مونث استعمال ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں میں بھی ان کو مونث ہی درست سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر ان کو عربی ترکیب و اضافت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ان کی تذکیر کا لحاظ رکھنا پڑے گا مثلاً آپ مسجد خضرا کہیں تو درست ہوگا لیکن "مسجد الخضراء" غلط ہوگا۔ عربی ترکیب کی صورت میں "مسجد الاخضر" ہی صحیح ہوگا خواہ آپ اس ترکیب کو اُردو میں ہی استعمال کر رہے ہوں۔ آپ کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ پڑھے لکھے لوگ بھی پدر ابراہیمؑ کا نام آذر بذال معجمہ ہی لکھتے ہیں لیکن ان کے اس املا کو سند نہیں سمجھا جا سکتا۔ صحیح آزر بزائے منقوطہ ہی ہوگا کیونکہ یہ غلط املا اُردو میں متفق علیہ نہیں۔ یہی حال طلاطم کا ہے۔ چونکہ میں نے علمائے زبان کو گنبد خضرا لکھتے بھی دیکھا ہے اس لئے میں گنبد خضرا کو متفق علیہ نہیں سمجھ سکتا۔

جون کا فاران مل چکا ہے۔ آپ کا اداریہ بہت خوب ہے۔ آپ نے جس بیباکی اور حق گوئی سے کام لیا ہے اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اعلائے کلمۃ الحق کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔

آپنے نواب سید محی الدین علی خاں کا تصور کے مجموعہ کلام "شراب" پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہے اسے پڑھ کر مجھے اتنی ہنسی آئی کہ ہنستے ہنستے بیدم ہو گیا۔ ماشاء اللہ چشم بد دور! بڑا استہزا آمیز کلام ہے۔ آپنے نواب صاحب کے ان کے اشعار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کا اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ اس کلام بے نظام کو پڑھئے اور مزہ لیجئے۔

بعدت چندر کنسن کی کتاب "شعروشی سے جلیاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے "معذرت مانگنا" کی تغلیط کرکے "معافی مانگنا" کا بدل پیش کیا ہے۔[۱]

"معافی مانگنا" عوامی زبان ہے۔ فصحا "معافی چاہنا" بولتے ہیں۔ نام یاد نہیں لیکن واقعہ یاد ہے کہ دلی کے ایک استاد کے سامنے ان کے شاگرد نے "معافی مانگنا" بولا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میاں بھیک مانگو، معافی کیا مانگتے ہو۔

اسی کتاب میں "خطا کھانا" کو آپ نے روزمرہ کے خلاف کہا ہے۔ خطا کھانا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "نقصان اٹھانا" اور سہو و لغزش کرنا۔ میں نے خطا کھانا[۲] پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے، لیکن اس وقت یاد نہیں کہ کس کتاب میں پڑھا ہے لیکن اتنا یاد ہے کہ کسی اہل زبان کی کتاب میں پڑھا ہے۔ خطا خوردن فارسی میں پایا جاتا ہے۔ فارسی سے اردو میں ترجمہ کرکے خطا کھانا بنالیا گیا ہے۔ فارسی کی سندیں حاضر ہیں ؎

راہ باریک کاسہ لبریز است
دم نگہدار تا خطا نخورد (باقر کاشی)

ہچو آں فردے کہ از وے سہو کاتب حک شود
می خورد ہر کس خطائے ما دل خود میخورم (محسن تاثیر تبریزی)

صحیح لفظ "بلمناہٹ"[۳] ہے جو قاعدہ کے لحاظ سے درست ہے۔

اب روئے سخن مونس زبیری کی طرف ہے۔

جناب مونس صاحب نے اپنے خط میں تذکرۂ غوثیہ کے حوالے سے فرمایا ہے کہ ایک بزرگ جس عورت پر نگاہ ڈال دیتے وہ حاملہ ہو جاتی۔ تذکرۂ غوثیہ میں نے پڑھا ہے اور اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے لیکن اس میں یہ واقعہ درج نہیں۔

تلاوت کے متعلق موصوف نے کتب لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ اس لئے ہر قسم کی تحریر کے لئے یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض الفاظ تو مخصوص معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کا محل استعمال بھی مخصوص ہوتا ہے۔ اسی طرح تلاوت محض قرآن حکیم پڑھنے کے لئے آتا ہے۔ مثلاً شراب لغوی طور پر ہر پینے کی چیز کو کہا جا سکتا ہے، لیکن اردو میں محض "خمر" کے لئے مستعمل ہے کیا کبھی زبیری صاحب نے پانی یا دودھ کو شراب کہا ہے۔ شراب کا نام لیتے ہی ذہن فوراً خمر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تلاوت بھی ایک اصطلاحی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس کو کلام خدا کے سوا کسی اور کے کلام کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ پانی اور دودھ کو شراب نہیں کہا جا سکتا تو ہر قسم کی خواندگی کو تلاوت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً زبیری صاحب کو لسانیات اور علم بیان و معانی سے شغف نہیں۔ ورنہ وہ ایسا نہ کہتے۔ اگر وہ تلاوت کے مفہوم پر ہی غور کرتے تو بھی انہیں معلوم ہو جاتا کہ تلاوت ہر قسم کی نثر و نظم کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ تلاوت میں ایک آہنگ اور غنائیت پائی جاتی ہے۔ تلاوت کا تعلق ایک خاص قسم کے ترنم سے ہے جس کو عربی موسیقی کی اصطلاح میں انشاد کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو نثر نگاری یا نظم کو اس ترنم سے نہیں پڑھا جاتا۔

۱؎ معافی مانگنا عوامی زبان نہیں، روزمرہ ہے (م۔ق) ۲؎ "خطا کھانا" اردو روزمرہ نہیں ہے ۳؎ صحیح املا "بلبلاہٹ" ہے۔ "بلمناہٹ" نہیں ہے! (م۔ق) ۴؎ لیکن "تذکرۂ غوثیہ" میں اس قسم کے "معجزہ" کا پایا جانا مستبعد نہیں ہے (م۔ق)

جن پر تلاوت کا اطلاق ہو سکے۔
تلاوت کا تعلق عربی کی خاص قسم کی نثر سے ہے جس میں نثر مرجز وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن کریم بھی قسم کی باآہنگ نثر ہے
ہدیہ کے متعلق بھی یہی عرض کروں گا کہ وہ اس کے اصطلاحی مفہوم واستعمال پر غور کریں۔
ہر لفظ کا خاص مقام ہوتا ہے ۔ بے محل ہر چیز بری معلوم ہوتی ہے۔

اپنے خط میں زبیری صاحب نے منصور کا بھی ذکر کیا ہے اور منصور کا جُبّہ دکھانے سے تلاطم ختم ہو جانے کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ حسین بن منصور حلاج کے متعلق بہت اختلاف آراء پایا جاتا ہے۔ مگر اکثریت منصور کو ناقص اور گمراہ سمجھتی ہے۔ مذاہب الاسلام کے مولف نے حسین بن منصور حلاج کا ذکر قرامطہ کے داعی کی حیثیت سے اسماعیلیہ فرقہ کے تحت کیا ہے۔ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاء کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ فرقہ قرامطہ کا داعی اور حلول کا قائل تھا۔ ابن خلکان نے اس واقعہ کو لکھتے ہوئے کہا ہے کہ اتفاق سے دجلہ میں پانی بڑھ گیا تو منصور کے معتقدوں نے اس کو منصور کے قتل کا اثر سمجھا۔ معتقد ہمیشہ ایسی تاویلیں کیا ہی کرتے ہیں۔ لیکن کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ جُبّہ دکھانے سے تموج کم ہو گیا۔ بعض کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ حلاج ساحر تھا اور عبداللہ بن املاک کوفی کا شاگرد تھا۔ حلاج کے کفر کے خلاف ثبوت بہم پہنچانے والا بھی اس کا ایک شاگرد تھا اور اس نے ثبوت میں حلاج کی ایک کتاب پیش کی تھی جس میں اُس نے اپنی الوہیت کا اقرار کیا تھا۔ مجدد الف ثانی حلاج کے متعلق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غلبہ حال سے کفر اور اسلام میں تمیز نہ کی جس طرح اہل شریعت کے نزدیک کفر ہے اسی طرح اہل حقیقت کے نزدیک کفر ہے۔ البتہ ابن عربی نے فصوص الحکم میں حلاج کو تجلّی ذات کا حامل اور فرد کامل کہا ہے۔ لیکن اس کی تردید کرتے ہوئے چراغ دہلوی کے خلیفہ سید محمد بن جعفر مکی کہتے ہیں کہ اگر اس کو تجلی ذات ہوتی تو ہرگز انا الحق نہ کہتا۔ کیوں کہ تجلی ذات میں محویت ہوتی ہے اور محو کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امامیہ شیعوں کی مذہبی کتب میں امام محمد بن حسن عسکری کا منصور کے متعلق فرمان لعنت درج ہے۔
تاریخوں میں حلاج کا ایک شعر مندرج ہے جس سے کفر کا ثبوت دیا جاتا ہے شعر یہ ہے ؎

کفرت بدین اللہ والکفر واجب
لدی عند المسلمین قبیح

یعنی میں نے اللہ کے دین سے کفر کیا اور میرے لئے کفر کرنا ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اُسے بُرا سمجھتے ہیں۔ اس شعر کی تشریح میں تاویل سے کام لے کر خواہ کچھ اور مفہوم بیان کیا جاتے، لیکن ایک بات البتہ ظاہر ہے کہ حلاج (یعنی منصور) کے عقائد عامۃ المسلمین کے خلاف تھے جہاں تک بزرگانِ دین کا تعلق ہے کسی نے بھی اسلام کے عام عقائد سے انکار نہیں کیا۔

شیخ فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں عام مورخین سے اختلاف کر کے ایک نئی بات بیان کی ہے کہ منصور دو تھے ایک منصور حلول کا قائل تھا، جو مارا گیا اور دوسرا منصور ولی کامل تھا۔ اگر شیخ عطار کے بیان کو صحیح سمجھا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ جس منصور نے انا الحق کا نعرہ لگایا وہ حلولی منصور تھا، کیوں کہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور ولی کامل سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسا گمراہ کن نعرہ بلند کرے۔ بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کا کام خلق خدا کی رہنمائی ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے حال وقال سے ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہونے دیتے جس میں عوام کی گمراہی کا اندیشہ ہو۔ وہ بہت سیدھے سادے اور عام فہم طریق سے اسلام کو پیش کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنی ژولیدہ بیانی اور فلسفیانہ ایچ پیچ سے بھول بھلیوں میں

بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑتے۔ اس لئے یہ کسی طرح بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ ولی کامل وہی منصور ہوں جنہوں نے الوہیت کا نعرہ بلند کیا اگر شیخ عطار کی تحقیق صحیح ہے اور حلول منصور کوئی اور تھا تو ایک صحیح العقیدہ اور ولی منصور کو انا الحق کا قائل کہنا اتہام ہے، جو انتہائی مذموم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ منصور نے ہی غلبۂ حال میں یہ نعرہ لگایا تو ایک مغلوب الحال اور ہوش و حواس سے محروم شخص کے قول کی تاویل کرنا اور اس کو اولیاء کے زمرہ میں مقامِ بلند کا حامل سمجھنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ جس شخص کے متعلق اتنا اختلاف پایا جائے اس سے صرف نظر کر لینا ہی بہتر ہے۔ دراصل منصور کو اچھالنے میں افسانہ طرازی اور شاعرانہ حاشیہ آرائی کو بہت دخل ہے۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ صوفیہ میں حلاج کے متعلق اتنا اختلاف کیوں ہے؟ کوئی اس کو گمراہ کہتا ہے کوئی ولی، کوئی کامل کہتا ہے اور کوئی ناقص۔ تمام حضرات کشف سے کام لے کر ایک ہی نتیجہ پر کیوں نہیں پہنچے؟ مورخین میں اختلاف کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کیوں کہ ان کے ذرائع اطلاع ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں یہ اختلاف سمجھ میں نہیں آتا کیوں کہ ان سب کا ذریعہ اطلاع و استخبار ایک ہے اور پھر حقیقت بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کشف کوئی اختیاری چیز نہیں۔ بلکہ اللہ جل شانہ جس بات سے اپنے خاص بندوں کو مطلع کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا القاء کر دیتے ہیں۔ اگر کشف اختیاری ہوتا تو تمام بزرگ منصور کے متفق اللفظ ہوتے۔ ان بزرگوں کے مختلف و متضاد بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بزرگ نے قرائن عقلیہ سے کام لے کر نتیجہ نکالا ہے۔

زبیری صاحب نے ایک سوال میں دریافت کیا ہے کہ اگر اخیار، اوتاد، ابدال اور اقطاب وغیرہ اصطلاحیں کیسے مروج ہوئیں اگر ان ہستیوں کا کوئی وجود ہی نہیں۔

زبیری صاحب کے سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے تاریخ تصوف کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ اصطلاحی تصوف اسلام کے شروع کے پانسو سال تک کہیں نظر نہیں آیا۔

قرآن۔ حدیث، آثار صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے اقوال میں اس اصطلاحی تصوف کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ مصطلحات اور نظام تصوف ابوبکر محی الدین بن محمد بن علی بن العربی الطائی الاندلسی (مولود ۵۶۰ھ متوفی ۶۳۸ھ) کے ذہن کی تخلیق ہے۔ ابن العربی بڑے طباع اور ذہین بزرگ تھے اور فلسفہ کی شاخ افلاطونیت جدیدہ سے خاص شغف رکھتے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں اندلس یہودی اور عیسائی فلسفہ کا بھی مرکز تھا۔ اس لئے وہ غیر شعوری طور پر ان مکاتیب فکر سے بھی متاثر ہوئے۔ چونکہ ذہن و ادراک اور تخیل بلند پرواز کے حامل تھے اس لئے انھوں نے اسلام کی فلسفیانہ تشکیل کی کوشش شروع کی اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ تصوف دراصل اسلام کا فلسفیانہ روپ ہے۔ شیخ ابن العربی نے اپنے تخیل سے کام لے کر اوتاد ابدال اور اقطاب وغیرہم مصطلحات وضع کر کے دنیوی نظامِ حکومت کے متوازی ایک باطنی نظام کا تصور پیش کیا اور ہر طرح صوفیہ کی توقیر کی۔ اسی بنا پر المقریزی نے شیخ ابن العربی کو مذہباً باطنی کہا ہے۔ یہ باطنی نظام محض تصوراتی نظام ہوتے ہوئے بھی بڑا دلکش نظام معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے متاخرین صوفیہ نے اس کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا اور اسی طرح یہ مصطلحات رواج پا گئیں۔ شیخ موصوف نے ایک ایسا پیچیدہ تصور پیش کیا ہے جس کو کوئی بھی بہ تمام و کمال سمجھ نہیں سکا۔ لیکن دشوار پسند طبائع کو اس میں بہرحال کشش محسوس ہوتی ہے۔ شیخ کا نظریۂ وحدت الوجود دراصل افلاطونیتِ جدیدہ کے بانی یونانی فیلسوف فلاطینس کے نظریات کا چربہ ہے۔ سب سے پہلے فلاطینس نے "وصل بالحق" کا نظریہ پیش کیا۔ فلاطینس کہتا ہے کہ انسان واصل بالحق ہو سکتا ہے اور جس شخص کو یہ معراج حاصل ہوتی ہے وہ ذات حق سے متحد ہو جاتا ہے اور شاہد و مشہود کا امتیاز باقی نہیں رہتا

اس نظریہ کو شیخ نے فنا فی اللہ کا اسلامی نام دے کر صوفیہ میں رائج کر دیا۔ اس سے نچلا درجہ فلاطینس کے نزدیک عقل اول سے فصل ہے۔ فلاطینس نے عقول ثلاثہ کا نظریہ پیش کیا ہے اور فلاطینس کے اسی نظریہ سے متاثر ہو کر مسیحی فلاسفہ نے تثلیث کا عقیدہ پیش کیا۔ ابن العربی بھی اس نظریہ سے متاثر ہیں۔ چنانچہ وہ رسول اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں کہ حضور اول الافراد الثلاثہ یعنی حضورؐ تینوں افراد میں سے پہلے ہیں۔ افراد ثلاثہ کی تشریح عبدالغنی النابلسی نے یہ کی ہے کہ روح نفس اور صورت افراد ثلاثہ ہیں۔ روح کا مقام عرش، نفس کا مقام افلاک اور صورت کا مقام زمین ہے۔ حضور اکرمؐ کو فرد اول قرار دے کر فنا فی الرسول کا اقرار در اصل فلاطینس کے عقل اول سے وصل کے نظریہ ہی کا اسلامی روپ ہے۔ شیخ ابن العربی بعض اوقات وحدت الوجود کی رو میں بہکر اتنا بڑھ جاتے ہیں کہ حلول کا نظریہ بھی پیش کر جاتے ہیں۔ جو اسلام کی روح کے سراسر منافی ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں۔

"انما سمی الخلیل خلیلاً لتخللہ وحصرہ جمیع ما اتصفت بہ الذات الالٰہیۃ"

یعنی حضرت ابراہیم کا لقب خلیل اس لئے ہے کہ وہ تمام صفات الٰہیہ کے جامع ہیں، بالفاظ دیگر ان میں خدا حلول کر گیا تھا شیخ موصوف کی اسی قسم کی تاویلات کو دیکھ کر بعض اصحاب اُن کو ملحد کہنے لگے تھے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ کہتے ہیں۔

"فجاء الملاحدۃ الذین شارکوا ھؤلاء الملاحدۃ المتفلسفہ وزعموا انھم اولیاء اللہ افضل من انبیاء واللہ یاخذ عن اللہ بلا واسطہ کابن العربی صاحب الفتوحات والفصوص انہٗ یاخذ من المعدن الذی اخذ منہ الملک الذی یوحی الی الرسول۔"

یعنی مشرک ملاحدہ کے بعد ان نام نہاد فلسفی ملاحدہ کا دور آیا جو خود کو ولی اور انبیاء علیہم السلام سے افضل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ سے براہ راست اخذ کرتے ہیں جیسا کہ ابن العربی مصنف فتوحات مکیہ و فصوص الحکم کہتے ہیں کہ میں نے بھی معدن سے فیض حاصل کیا جس سے جبریلؑ کے ذریعہ رسول اللہؐ کو وحی پہنچی۔ ہم شیخ ابن العربی کی اس قسم کے اقوال تاویل کر کے امام ابن تیمیہ کے فتویٰ کو ان کی انتہا پسندانہ روش پر محمول کر سکتے ہیں۔ لیکن وحدت الوجود کا قائل ہو کر ایسی باتیں کہہ جانا کچھ بعید بھی نہیں کیونکہ وحدت الوجود ایک عقیدہ لاینحل ہے۔ آج تک کوئی فلسفی اس کا صحیح جواب نہیں دے سکا کہ وحدت کثرت میں کیسے تبدیل ہوئی اور وجود لافانی کے مظاہر فانی کیوں رہ گئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ نے فلسفیانہ ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لئے اسلام کی فلسفیانہ تشکیل کی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اسلام کو گورکھ دھندا بنا دیا۔ اگر یہ فلسفیانہ روپ مطمئن کن بھی ہو تو بھی عامۃ المسلمین کے لئے مفید نہیں۔ بلکہ ان میں ذہنی انتشار پیدا کرتا ہے۔

والسّلام

—— وارث سرہندی —— کنجروڑ (ضلع سیالکوٹ) ۸ر جون سنہ ۶۲ء

لطائف وظرائف

آپ کے ہوٹل میں رات گزارنے کے لئے ایک کمرہ کا کتنا کرایہ لیا جاتا ہے ـــــ ایک شاعر نے ہوٹل کے منیجر سے دریافت کیا۔
تین روپیہ ـــــــــــــــ منیجر نے جواب دیا
شاعروں کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا ـــــ شاعر نے پوچھا
جی ہاں! شاعروں سے پیشگی کرایہ لیا جاتا ہے ـــــ منیجر نے کہا

×

مامون الرشید کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا، اُسے خلیفہ کے سامنے لایا گیا۔ مامون الرشید نے اُس سے پوچھا کیا تو نبی ہے! اُس نے جواب میں "ہاں" کہا۔ مامون نے پوچھا ـــــ جب تو نبی ہے تو تیرے پاس کیا معجزہ ہے؟ وہ شخص بولا جو آپ چاہیں وہی کرکے دکھا دوں۔ مامون نے کہا۔ "اچھا! زمین سے خربوزہ اُگا دو"۔ اُس شخص نے کہا۔ یا امیر المومنین! تین دن کی مہلت دی جائے، مامون بولا "نہیں ابھی اسی وقت"۔ اس شخص نے جواب دیا۔ یا امیر المومنین! انصاف فرمایئے، آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ تین مہینہ میں خربوزے کو اُگاتا ہے اور میں نے آپ سے صرف تین دن کی مہلت مانگی ہے! مامون الرشید اس پر بے ساختہ ہنس پڑا۔

×

ایک شرابی سے جو نشہ میں دُھت تھا۔ ایک باہر کے آئے ہوئے شخص نے پوچھا کہ جس سڑک پر تم چل رہے ہو اُس کا نام کیا ہے؟ شرابی نے جواب دیا، اس سڑک کا ایک نام نہیں، دو نام ہیں، پہلا نام ہے "وسکی روڈ" اور دوسرا نام ہے "جیل روڈ"۔

×

ایک معلّم بچوں کو پڑھایا کرتا تھا، ایک دن وہ عصر کی نماز پڑھ رہا تھا، جب رکوع کے لئے جھکا، تو اپنا سر اپنی ٹانگوں کے درمیان کرکے، بچوں کو دیکھنے لگا، وہ کھیل میں مشغول تھے، معلّم جھنجلا کر بولا:۔
"ارے بدتمیزو! میں ذرا نماز سے فارغ ہو لوں، پھر تمہاری خبر لوں گا"۔

×

اس مکان کا کرایہ تو سات اشرفی ماہوار ہے مگر کرایہ دار کو تین اشرفیاں بطور ضمانت کے دینی ہوں گی! ـــــ مالک مکان نے کہا
ـــــ خوب! مگر اس مکان میں اصطبل کہاں ہے! ـــــ جو شخص کرایہ پر مکان لینا چاہتا تھا، اس نے جواب دیا۔
ـــــ ایں! اصطبل کس لئے! ـــــ مالک مکان نے کہا۔
ـــــ اصطبل اُس گدھے کے لئے چاہیے، جو مکان کا کرایہ ادا کیا کرے گا ـــــ اُس شخص نے جواب میں کہا۔

×

ابا جان! میں شادی کرنا چاہتا ہوں ـ بیٹے نے کہا ـ نہیں بیٹا! ہرگز نہیں، تم ابھی تک عاقل نہیں ہوئے سا بچے

جواب دیا — میں آخر کب تک عاقل ہو جاؤں گا۔ بیٹے نے دریافت کیا — یہ جو تمہارے سر پر بیاہ کرنے کا بھوت سوار ہے یہ بھوت جب رخصت ہو جائے گا۔ باپ نے جواب دیا۔

*

ایک شاعر اپنی ناداری کے سبب مکان کا کرایہ ادا نہ کر سکا۔ کرایہ دار نے ایک دن بڑی سختی اور درشتی کے ساتھ کرایہ کا تقاضا کیا۔ اس پر شاعر بولا — کیا آپ کو پتہ نہیں جب میں مر جاؤں گا اور لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس مکان میں اتنا عظیم شاعر رہا کرتا تھا، تو لوگ اس کوٹھری کو ہزاروں اشرفیوں میں خریدنا چاہیں گے —— مالک مکان نے کہا — تو میں تمہیں اسی وقت قتل کئے دیتا ہوں تاکہ لوگ آئیں اور میرے مکان کو بھاری قیمت پر خرید لیں۔

*

ایک کنجوس نے اپنے ملازم سے کہا کہ کھانا لاؤ اور مکان کا دروازہ بند کر دو۔ نوکر نے جواب میں عرض کیا۔ حضور! یہ احتیاط کے خلاف بات ہے، پہلے دروازہ بند ہونا چاہیے، اُس کے بعد کھانا لایا جائے!

*

ایک پردیسی (سیاح) نے کسی شہر کے باشندے سے کہا —— اس شہر میں کتے بہت زیادہ ہیں، شہری نے جواب میں کہا — مگر وہ زیادہ تر پردیسی ہیں! (عربی سے ترجمہ)

*

بکھرے ہوئے پھول

فضلِ کریم فضلی :- تم رہو شاد، تم رہو آباد ‏— ہم کو ہونا تھا ہوگئے برباد
برق گرتی ہے گرے، اور آگ لگتی ہے لگے ‏— اِس طرح رُکتا ہے کارِ آشیاں بندی کہیں

مظہر جلیل شوق :- شکوۂ جور تو کیا میری زباں پر شاید ‏— التجا کا بھی کوئی حرف نہ آیا ہوگا
ہم نے دیکھے ہیں بہت عیش طرب کے انجام ‏— دیکھنا ہے مآلِ غمِ دل کیا ہوگا

محمد زکریا مائل :- غنچگی اس کے لبوں کی ہو جب ایمائے سکوت ‏— کون دل سوختہ ایسا ہے جو فریاد کرے
آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوتا ہے بیاں قصۂ دل ‏— یہ کہانی کہیں لفظوں میں کہی جاتی ہے

مفتون کوثری :- اگر شانِ ابراہیمی نہاں ہو ذوقِ ایماں میں ‏— تو آتش بھی مدد دیتی ہے تخلیقِ گلستاں میں
مثل مشہور ہے یہ، زہر کا خود زہر قاتل ہے ‏— جو طوفاں کو دبانا ہے تو خود طوفاں پیدا کر
نہ ہو ربطِ دلی تو پھر بہم وابستگی کیوں ہو ‏— مرے ذکرِ تباہی پر انہیں افسوس ہی کیوں ہو

آثم کرنولی :- جینے کو جئے کیا خاک جئے، بے موت جئے مجبور جئے
سوسن کی طرح خاموش جئے، نرگس کی طرح بے نور جئے
بویا ہے ستم کے ماروں نے، کاٹا ہے کرم فرماؤں نے
پوچھو نہ یہ ہم پر کیا گزری، مزدور مرے مزدور جئے

طور نورانی :- آج اس زمانے میں علم و فن کے دیوانے ‏— روشنی کو بھول گئے تیرگی چرا لائے

ماہر القادری :- دوستو! مجھ کو محبت میں نصیحت نہ کرو ‏— اور کچھ روز اسی طرح گزر جانے دو
خوفِ غم، آرزوئے راحت ہے ‏— یہ محبت نہیں تجارت ہے
اُس نے غم دے کے مجھ سے فرمایا ‏— یہ مری آخری عنایت ہے
دل پہ کیا کیا گزر گئی مت پوچھ ‏— جی رہا ہوں یہی غنیمت ہے
نگاہِ مست کو مصروفِ ناز رہنے دے ‏— کچھ اور روز مجھے پاکباز رہنے دے
دبی زبان سے کلیوں کے لب پہ ہے آداب ‏— گلوں کی تنگ قبائیں سلام کہتی ہیں
درِ قبول سے ٹھکرا دیا گیا جن کو ‏— وہ بدنصیب دُعائیں سلام کہتی ہیں
موسمِ گل نے اسیری کی بنا ڈالی ہے ‏— جب خزاں تھی کوئی طائر بھی تہِ دام نہ تھا
سفاک نے بیداد کی پھر داد نہ چاہی ‏— یہ مجھ پہ ستم اے مری ناکردہ گناہی
ہر حال میں ابھی ہیں تغافل سے جفائیں ‏— یعنی یہ غرض ہے، وہ مجھے بھول نہ جائیں
یہ کون حشر ساماں، رُک رُک کے چل رہا ہے ‏— غلطاں ہے گردِ منزل، لرزاں ہے نبضِ جادہ
جو ڈوب گیا وہ پار اترا، جو سطح پہ تھا وہ تیر نہ سکا
دریائے محبت کا ماہر ساحل بھی ہے اور ساحل بھی نہیں

مولانا امین احسن اصلاحی

رُوحِ انتخاب

ہمیں پرویز صاحب کے ایک پُر زور حامی کی طرف سے ایک مراسلہ موصول ہوا ہے۔ جس میں پہلے تو ان علماء پر بڑی لے دے کی گئی ہے۔ جنھوں نے پرویز صاحب پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے، پھر ہم سے باصرار یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم ان کے مراسلہ کو "میثاق" میں چھاپیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ اس پر اپنی رائے کا اظہار کریں، اگر پرویز صاحب ہمارے نزدیک بھی اسی طرح کافر ہیں، جس طرح دوسرے علماء کے نزدیک وہ کافر ہیں تو ہم بھی علماء کے ہمنوا ہو کر ان کے کفر کا اعلان کریں اور اگر ہم اس فتوے کے بعد بھی پرویز صاحب کو بدستور مسلمان سمجھتے ہیں تو اخلاقی جرأت سے کام لے کر اس فتوے کی پوری طاقت سے تردید کریں۔

اس مراسلے کے علاوہ "میں کافر کیوں" کے عنوان سے خود پرویز صاحب کی طرف سے بھی ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے۔ اس کے بھیجنے سے بھی ان کا مقصود غالبًا یہی ہوگا کہ ہم اس پر اظہار رائے کریں۔ لیکن اس وقت نہ تو ہم اس فتوے پر کوئی رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں نہ پرویز صاحب کے پمفلٹ اور صاحب مراسلہ کے مراسلہ پر۔ ان چیزوں پر کسی اظہار رائے کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ کام ہم بعد میں کریں گے اور انشاء اللہ نہایت تفصیل سے کریں گے، اس اظہار رائے کے بجائے اس وقت ہم پرویز صاحب اور ان کے حامیوں کی خدمت میں اپنے چند مشورے عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ ان مشوروں کو اخلاص پر مبنی سمجھیں گے اور قبول کریں یا نہ کریں لیکن ان پر غور ضرور کریں گے۔

پہلی گزارش یہ ہے کہ وہ یہ موقف اختیار نہ کریں کہ علماء کو کسی پر کفر کا فتوے لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس امر میں تو شبہ نہیں کہ اسلامی نظام میں کسی کے کفر و ارتداد پر اس کو سزا دینا حکومت کا کام ہے۔ لیکن یہ بتانا کہ کیا چیز کفر ہے اور کیا چیز اسلام ہے۔ ہر حال میں علماء ہی کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری ان پر اللہ اور رسول کی طرف سے ڈالی گئی ہے۔ اگر وہ اس کو ادا نہ کریں گے تو اس کے لئے وہ عنداللہ ذمہ دار ٹھہریں گے۔ یہ ذمہ داری یوں تو ان پر ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن خاص طور پر اس زمانہ میں تو اس کے تنہا حامل وہی ہیں، اس لئے کہ اس دور میں مسلمان حکومتوں کو لوگوں کے کفر و ایمان کے معاملہ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے، وہ یا تو سیکولرزم کے پردے میں غیر جانبدار بن کر بیٹھ گئی ہیں۔ یا پھر مغربیت کے زیر اثر آزادی و بے قیدی کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر علماء بھی لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے معاملہ سے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ جائیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ نبی اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت شیطان اور اس کی ذریات کی صرف ایک چراگاہ بن کر رہ جائے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ اس فتوے کے جواب میں تاویل بازی اور مغالطہ انگیزی کی جو روش اختیار کی گئی ہے یہ بالکل غلط ہے، علماء نے جو فتویٰ دیا ہے وہ پرویز صاحب کی کسی مبہم عبارت یا کسی مغلق تحریر یا مجمل قول پر مبنی نہیں ہے کہ اس کی توضیح و تشریح کی ضرورت پیش آئے۔ یہ فتویٰ پرویز صاحب کے ایسے عقائد و نظریات پر مبنی ہے، جن کو وہ ایک مدت دراز سے بیان کر رہے ہیں۔ (بلا مبالغہ ان کی وضاحت میں پرویز صاحب نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں۔) صرف بیان ہی نہیں کئے ہیں بلکہ پورے شد و مد سے لوگوں کو ان کی دعوت بھی دی ہے۔ صرف دعوت ہی نہیں دی ہے بلکہ ان کے پندار میں مسلمان قوم کے تمام،

اسلاف واخلاف کو جاہل اور بیوقوف بھی ٹھہرایا ہے۔ جو داستان اتنے تکرار واعادہ کے ساتھ کہی اور سُنائی جا چکی ہو اور جو تنقید و تردید کے بھی تمام مراحل سے گزر چکی ہو، اس کے متعلق جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ پرویز صاحب کا مطلب یہ نہیں بلکہ یہ ہے تو اس پر ہمدردی کے بجائے آدمی کو غصّہ آتا ہے۔ اس قسم کی روش صرف وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو سخت بزدل ہوتے ہیں۔ بہادر آدمی اس طرح کے حالات میں صرف دو ہی راہیں اختیار کرتا ہے۔ اگر اسے اپنے عقائد و نظریات پر جزم ہوتا ہے تو ان پر ڈٹ جاتا ہے اسے اس بات کا کچھ فکر نہیں ہوتا کہ وہ کن سے کٹ رہا ہے اور کن سے جڑ رہا ہے اور اگر اس پر اپنے نظریات وعقائد کی غلطی واضح ہو جاتی ہے تو برملا اپنی غلطی کا اقرار کر لیتا ہے۔ اس امر کی اسے ذرا پروا نہیں ہوتی کہ دوست اور دشمن اسے کیا کہیں گے۔ یہ روش صرف بے کردار لوگ اختیار کرتے ہیں کہ دعوے تو خم ٹھونک کے کرتے ہیں۔ لیکن جب کسی سخت قسم کی گرفت میں آجاتے ہیں تو لوگوں کی آنکھوں میں تاویلات کی دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری ساری باتوں کو اس وقت ایک طرف رکھیے، یہ بتایئے کہ آپ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے حجت شرعی ہونے کے منکر ہیں یا نہیں، اور حضورؐ کے احکام و ہدایات کو وقتی اور ہنگامی احکام کا درجہ دیتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے (اور اثبات کے سوا آپ کس شکل میں اس کا جواب دے سکتے ہیں؟) تو میں صاف کہتا ہوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دوسرے لفظوں میں انکار ہے۔ قادیانی حضرات نے ختم رسالت کا انکار کرکے رسالت کا انکار کیا۔ آپ حضرات نے سُنّت کا انکار کرکے۔ راستے دونوں کے بظاہر دو ہیں۔ لیکن منزل ایک ہی ہے۔ آخر جو باتیں، آپ لوگوں نے اتنے شد و مد سے کہی ہیں ان کی تاویل کس کس طرح سے کریں گے اور ان تاویلات بارده سے فائدہ کیا؟ اس طرح کی تاویلات کس کو مطمئن کر سکیں گی۔ میں سچ سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے پرویز صاحب سے کبھی کوئی پرخاش نہیں ہوئی۔ پہلے ان کے تعلقات دوستانہ مراسم رہ چکے ہیں۔ مجھے اب بھی ان کے ساتھ ہمدردی ہے۔ میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل و دماغ کو بدل دے اور ان کے زبان و قلم سے اسلام کی خدمت لے۔ لیکن ان کے بارے میں اپنے ان ہمدردانہ جذبات کے باوجود میں یہ امر واقعی بھی واضح کئے دیتا ہوں کہ میں نے جب جب ان کی کوئی تحریر پڑھی ہے (اور اب ایک رسالہ کے ایڈیٹر ہونے کے سبب سے مجھے اکثر ان کی تحریریں طوعاً یا کرہاً پڑھنی پڑتی ہیں) تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ گو بظاہر وہ صرف حدیث کے منکر ہیں لیکن حقیقت میں وہ رسالت کے منکر ہیں۔ جو شخص سُنّت کا منکر ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا رسالت پر ایمان کیا معنی رکھتا ہے؟ قرآن قرآن وہ بہت پکارتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاتھوں قرآن، حدیث سے بھی زیادہ مظلوم ہے۔ انھوں نے عربی لغت اور عربی گرامر سب اپنے گھر میں بیٹھ کر گھڑی ہے۔ ہر قاعدہ اور ضابطہ سے بے نیاز ہو کر مجرد اپنی خواہشات کے تحت تاویل کرنے کے معاملہ میں ان سے زیادہ بے باک آدمی میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ قادیانی حضرات تو کس گنتی میں ہیں۔ انھوں نے تو اکثر معاملات میں اپنے ڈانڈے باطنیہ سے ملا دیئے ہیں

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک ان دوستوں کی یہ کوشش تو بالکل فضول ہے کہ خرافات کے اس مزبلہ پر تاویل کے پردے ڈالیں۔ البتہ اگر ان میں ہمت ہے تو اس کو بالکل دفن کردیں اور از سر نو ایمان واسلام کی صحیح خدمت کا آغاز کریں۔

ہم ان دوستوں کو یہ مشورہ بھی دیں گے کہ وہ اپنے ذہنوں سے یہ مغالطہ بالکل نکال دیں کہ تکفیر کے فتووں سے آدمی ملّت کا ہیرو بن جایا کرتا ہے۔ سرسید وغیرہ جن کا پرویز صاحب نے حوالہ دیا ہے۔ تکفیر کے فتووں سے ہیرو نہیں بنے۔ بلکہ اپنی شاندار قومی خدمات کے سبب سے ہیرو بنے۔ دینی معاملات میں ان سے جو بے اعتدالیاں ہوئیں وہ ہرگز کسی فتنہ پروری اور فرقہ سازی کے شوق میں نہیں ہوئیں، بلکہ محض حمایت اسلام کے جوش میں صادر ہوئیں۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا پورے اخلاص کے ساتھ اسلام

اور مسلمانوں کی حمایت میں مداہنت میں لکھا۔ لیکن چونکہ ان کو دین کا پورا علم نہیں تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے اس راہ میں بہت سی ٹھوکریں بھی کھائیں۔ جن پر کچھ علماء نے ان کی تکفیر کی۔ لیکن مسلمانوں کی حمایت میں چونکہ ان کی خدمات نہایت شاندار تھیں، ان کا اخلاص ہر شبہ سے بالاتر تھا، ان کی ساری زندگی قوم کے لئے ایثار و قربانی کا ایک مرقع تھی۔ اس وجہ سے محتاط طبائع پر ان کی تکفیر شاق گزری، تاہم ان کے مخصوص مذہبی نظریات کو تھوڑے سے مغرب زدہ بے خبروں کے سوا کسی نے قبول نہیں کیا۔

اب موازنہ کیجئے کہ کہاں سرسید اور کہاں پرویز صاحب پہاڑ اور گلہری میں کیا نسبت۔ ان کے صحیفۂ اعمال میں بجز اس کے کہ کتاب فروشی کی، انکار سنت اور انکار رسالت کا فتنہ اٹھایا، دینِ باطنیہ کی تبلیغ کی، کچھ بے خبر مسلمانوں کو گمراہ کیا، اور کون سا کارنامہ درج ہے۔ لیکن اپنی ذات کے ساتھ حسن ظن ملاحظہ ہو کہ محض اس دلیل سے اپنے آپ کو اسلام کو بہت بڑا ہیرو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کفر کے فتوے ابوحنیفہ، احمد بن حنبل اور اسماعیل شہید پر بھی لگ چکے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ہر کشتۂ تیغ حسینؓ بن جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا سر چوری اور ڈکیتی ہی کی راہ میں قلم کیا جائے۔ یہ عجیب و غریب منطق قادیانی حضرات بھی بہت استعمال کرتے رہیں اور ہمیں ان حضرات کی اس بوالفضولی پر ہمیشہ ہنسی آئی ہے۔

دراز دستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

———×———

پرویز صاحب نے مختلف گروہوں کے علماء کے ایک دوسرے کے خلاف فتووں کا جو ریکارڈ شائع کیا ہے، یہ بھی ان کے حق میں کچھ سودمند نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مختلف مسلکوں کے غالی مولویوں نے گروہی تعصبات و تنازعات کے جوش میں ایک دوسرے کے خلاف فتوے دیے ہیں لیکن اس سے اس فتوے کی اہمیت ذرا کم نہیں ہوتی جو انھوں نے پرویز صاحب کے خلاف دیا ہے۔ کچھ بریلویوں کا دیوبندیوں کے خلاف یا کچھ دیوبندیوں کا بریلویوں کے خلاف کوئی فتویٰ دیدینا الگ چیز ہے۔ اور کم و بیش ایک ہزار علماء کا، جن میں مسلمانوں کے ہر مسلک فقہی و کلامی کے علماء شامل ہیں، پرویز صاحب کے کفر پر اجماع کر لینا ایک مختلف چیز ہے۔ اس قسم کا اجماع قادیانیوں کے سوا کسی کفر پر بھی اس ملک میں نہیں ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہم پرویز صاحب اور ان کے ساتھیوں کو نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس معاملہ کی نزاکت پر نہایت سنجیدگی سے غور کریں۔ یہ نہ خیال کریں کہ اس دورِ کفر پرستی میں کوئی ان کا کیا بگاڑ لے گا۔ بگاڑ تو بے شک کوئی ان کا کچھ نہیں لے گا۔ لیکن یہ پیشگوئی ہم کئے دیتے ہیں کہ اگر انھوں نے دانشمندی کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا تو وہ قادیانیوں کی طرح مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے بالکل کٹ جائیں گے اور یہ بات ہمارے لئے بھی غم انگیز ہوگی اور ان کے لئے بھی نہایت افسوسناک ہوگی۔

آخر میں ہم یہ بات بھی واضح کئے دیتے ہیں کہ یاک غلط ہے کہ جن علماء کے اس فتوے پر دستخط ثبت نہیں ہیں ان کو اس فتوے سے الگ خیال کرنا محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے اس پر دستخط نہیں کئے ہیں تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ فتووں پر دستخط کرنا ان کے رجحان طبیعت اور ذوق کے خلاف ہے یا یہ کہ اس دور میں اس چیز کو وہ کچھ زیادہ مفید نہیں پا رہے ہیں۔ میرے جیسے لوگوں کے لئے یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ فتویٰ لکھنا یا اس پر دستخط کرنا اپنے منصب سے ہمیشہ ایک اونچی چیز سمجھا ہے لیکن یہ بات کہنے میں مجھے ذرا حجاب نہیں کہ پرویز صاحب کے خیالات و عقائد کو میں تو کفر و ضلالت سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ وہ زندگی کا صحیح رخ اختیار کریں اور دین سے تا واقفوں کے لئے فتنہ نہ بنیں۔

—×—

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ

تیرہ چودہ سال کی عمر بدوِ شعور کے بعد کی دوسری منزل ہوتی ہے، اُسی وقت سے ماہنامہ "النجم" (لکھنؤ) کے ذریعہ حضرت مولانا عبد الشکور کے نام سے میں واقف تھا۔ ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ جانا ہوا تو مولانا سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے پاٹانالہ پہونچا، مولانا مسجد میں عصر کی نماز پڑھا کر دُعا مانگ رہے تھے، دُور ہی سے اُن کی جھلک دیکھی اور میں وہاں سے چلا آیا کہاں تو شوقِ ملاقات کی وہ شوریدہ سری کہ لوگوں سے پتہ پوچھتا ہوا، دو ڈھائی میل پیدل چل کر پاٹانالہ پہونچا اور پھر یہ بے تکی کہ دور ہی کے سرسری دیدار ہی پر کفایت کر لی اور اس عالم میں واپس ہوا کہ:۔

دیکھا بھی تھا یا جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

غالباً ۱۹۴۳ء میں جب میں حیدر آباد دکن میں مقیم تھا، مولانا مرحوم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے عبد الغنی فاروقی[1] نے مراسلت کا آغاز فرمایا۔ موصوف اُس زمانے میں درسِ نظامی کے طالب علم تھے، یہ مراسلت کئی سال تک جاری رہی، اس خط و کتابت میں شعر و ادب کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی، انہی کی تحریک پر مدحِ صحابہ کے مُشاعرے میں دو بار حیدر آباد دکن سے مجھے بلوایا گیا۔

مدحِ صحابہؓ کا مشاعرہ سال کے سال بڑے اہتمام سے ہوتا تھا۔ ہزاروں روپیہ مشاعرے کی پنڈال کی آرائش پر ہی صرف ہو جاتا ہوگا۔ مشرف حسین مرحوم برف کی فیکٹری کے مالک تھے، انہی کے دولت کدے پر شعراء ٹھیرائے جاتے تھے۔ اور بڑی سیر چشمی کے ساتھ اُن کی تواضع اور مدارات کی جاتی تھی، ایک بار مشاعرے کی صدارت حضرت جگر مراد آبادی مرحوم نے فرمائی۔ اُس مشاعرے میں ہی کا یہ ایک صاحب نے اعلان کیا کہ جگر صاحب آج سے شرعی ڈاڑھی رکھیں گے ۔۔۔ ایک مُشت دو انگل!

حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی قدس سرہٗ سے جب بھی نیاز حاصل ہوا، بڑی شفقت اور محبت کا اظہار فرمایا۔ بے تکلفانہ تواضع جس میں خلوص کے سوا اور کسی شے کی آمیزش نہ تھی! ایک بار اپنی بیس پچیس کتابیں عنایت فرمائیں، اُن کتابوں کے مطالعے سے مجھ کم سواد کو بہت کچھ روشنی ملی، اور معلومات میں اضافہ ہوا، خاص طور سے حدیثِ قرطاس کے بارے میں جو الجھن تھی وہ دور ہو گئی!

بعض لوگوں کی زبان سے یہ باتیں بھی ان کانوں نے سُنیں کہ رفض کی تردید کرتے کرتے مولانا کے مزاج و طبیعت میں خارجیت

[1] مولانا عبد الغنی فاروقی درسِ نظامی کے عالم اور مستند طبیب ہیں، اور راقم الحروف کے اشعار کے حافظ ہیں، ڈیڑھ سال سے کراچی میں قیام ہے، میری لااُبالی طبیعت کی کوتاہیوں کے باوجود، مجھ سے پہلے ہی کی طرح والہانہ روابط خلوص رکھتے ہیں۔

کی جھلک پیدا ہوگئی ہے، مگر مولانا مرحوم نے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے جو حالات لکھے ہیں، اُنہیں پڑھ کر معلوم ہوا کہ اُن کی ذات سے خارجیت کی نسبت بے سروپا تہمت ہے! اہلِ بیتِ کرام سے وہ اُسی طرح محبت اور عقیدت رکھتے تھے جو اہلِ سُنّت کا شعار ہے ــــ بلکہ مجھے تو فضائلِ علیؓ میں ایک دو مقامات پر مولانا کے قلم سے "غلو" کی جھلک نظر آئی!

سنہ ۱۹۴۶ء میں "مدحِ صحابہؓ" کے مشاعرے کی صدارت مجھے کرنی پڑی، لاہور کے ایک صاحب تھے تاج محمد یا تاج الدین علامہ اقبال کے سخت مخالف، علامہ کی نظموں کے جواب میں انھوں نے نظمیں کہی ہیں، اور اس طرح جیتے جی اپنی رُسوائی کے اسباب خود فراہم کئے ہیں، نہ جانے زندہ ہیں یا مرگئے، اور زندہ ہیں تو کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ ہاں! تو ان صاحب نے "مدحِ صحابہ" کے مشاعرے میں نظم پڑھی، مزاج کی طرح آواز میں بھی خشونت تھی، بھرائی ہوئی آواز، غضبناک لہجہ، گلے کی رگیں پھولی ہوئیں ایک شعر کو بار بار پڑھا، جس کا مفہوم یہ تھا کیا قیامت ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتل کا نام اب تک پوشیدہ ہے!

اس شعر کے تیور بتا رہے تھے کہ اس کی رمزیت اور اشاریت میں "ناصبیت" ــ اور "خارجیت" جھلک رہی ہے ــ اُن کی نظم ختم ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی، میں نے کہا کہ ہم تو اہلِ محبت ہیں، صحابہ کرام اور اہلِ بیت عظام سبھی سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور یہ تمام نفوسِ قدسیہ ہمارے مخدوم ہیں، جس طرح "رفض" گمراہی ہے اُسی طرح "خارجیت" بھی گمراہی ہے - - - - - !

اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال تھا کہ میرے اس "انتباہ" کو پسند کیا گیا، اور ہزاروں کے مجمع سے ایک آواز بھی اس کی تردید اور مخالفت میں سُنائی نہیں دی۔ حضرت مولانا عبدالشکور بھی وہاں تشریف فرما تھے۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد میں پاکستان چلا آیا، حضرت مولانا عبدالشکور مرحوم پاکستان بننے کے بعد دو تین بار کراچی تشریف لائے، گزشتہ سال کراچی کے مشہور مخیر سیٹھ عبداللطیف باوانی مرحوم کی نمازِ جنازہ میں مولانا مرحوم سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، اُن کے بڑھاپے کو دیکھ کر دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ دین و اخلاق کی یہ شمع اب زیادہ دن تک نہ بھڑک سکے گی! اس ملاقات کے چند مہینے بعد اخبارات میں اُن کی وفات کی خبر پڑھی!

حضرت مولانا عبدالشکور جیسے ثقہ اور مخلص عالم روز روز پیدا نہیں ہوتے وہ ایک طرف علم و فضل کا کوہِ گراں تھے، تو دوسری طرف نیکوکاری اور تقویٰ کا نور اُن کے چہرے سے جھلکتا تھا، اُن کی ذات سلفِ صالحین کا روشن نمونہ تھی، رہنا سہنا کس قدر سادہ، لباس معمولی اور چال ڈھال کتنی باوقار اور نستعلیق تھی، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عصمت و عزت کی مدافعت میں جو لازوال علمی اور دینی کارنامہ انھوں نے انجام دیا ہے، اُس نے انہیں "امامِ اہلِ سُنّت" بنا دیا ــــ رحمۃ اللہ علیہ و برد اللہ مضجعہ و نور قبرہ!

ہماری نظر میں

علم الفقہ (مسائل طہارت) از :- مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ ، ضخامت ۱۱۲ صفحات ،
قیمت :- دو روپے پچیس پیسے - ملنے کا پتہ :- مرکز اشاعت ۲- اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مسائل طہارت پر یہ کتاب اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جس میں پوری وضاحت کے ساتھ فقہی مسائل بیان کئے گئے ہیں ـــــ ابواب :-

پانی کے مسائل ـــ کنوئیں کے احکام ـــ بابِ نجاست ـــ استنجا کے مسائل ـــ وضو کا بیان ـــ
مسح کا بیان ـــ غسل کا بیان ـــ تیمم کا بیان ـــ

ہر باب اپنے ذیلی عنوانات کے ساتھ مفصل بلکہ عام ضروریات کے لئے مکمل ہے!

کتاب میں کہیں کہیں علم فقہ کے اصول وکلیات آگئے ہیں، جس کے سبب اس کتاب کی علمی حیثیت بلند تر ہوگئی ہے مثلاً ماثبت علیٰ خلاف القیاس فغیرہٗ لایقاس علیہ جو حکم قیاس کے خلاف ہو اُس کو دوسری جگہ جاری نہیں کرتے

مثال :- پانی سے وضو اور غسل درست ہے ، عرق سے جو پانی کے مثل ہو وضو اور غسل کو درست نہ کہیں گے -

الاصل اضافۃ الحادث الیٰ اقرب اوقاتہ ـــ اصل یہ ہے کہ نئی پیدا ہوئی چیز کو کہیں گے کہ اسی وقت پیدا ہوئی ہے

مثال :- کنوئیں میں مرا ہوا چوہا دیکھا جائے اور گرنے کا وقت کسی قرینہ سے معلوم نہ ہو، تو اُس کنوئیں کے پانی کو دیکھنے کے وقت سے ناپاک کہیں گے اور اس سے پیشتر اس پانی سے جو وضو یا غسل کیا گیا ہے سب کو جائز رکھیں گے -

مولانا عبدالشکور مرحوم حنفی عالم ہیں، مگر انھوں نے بعض مقامات پر صاحب ہدایہ تک کی رائے اور اجتہاد سے اختلاف کیا ہے! یہ اس کتاب کا بہت روشن رُخ ہے!

بعض مقامات پر خاصی کھٹک پیدا ہوئی ـــــ یہ کہ ـــ

"جونک یا کھٹمل اور کوئی جانور اگر اس قدر خون پیئے کہ وہ اگر جسم پر چھوڑا جائے - تو اپنی جگہ سے بہ کر دوسری جگہ چلا جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا (صلا)

"کھٹمل" کے خون پینے کا اندازہ دشوار بلکہ محال ہے ، اس جملہ سے "یا کھٹمل" حذف کردینا چاہیے -

"اگر کسی کاغذ یا کسی اور چیز پر جیسے کپڑا جھلی وغیرہ قرآن مجید کی ایک آیت بھی لکھی ہو، تو اس پورے کا چھونا مکروہ تحریمی ہے - خواہ اس مقام کو چھوئے جس میں وہ آیت لکھی ہوئی ہے یا اس مقام کو جو سادہ ہے" (ص۵۳)

اس طرح تو (حدث اصغر کی حالت میں) نہ صرف قرآن کریم بلکہ اُن تمام اخبارات ، رسالوں اور کتابوں کا چھونا مکروہ تحریمی

قرار پائے گا جن میں قرآن کریم کی ایک آیت بھی لکھی ہو ـــــ یہ کتنی تکلیف دہ مشقت اور کس قدر دشوار پابندی ہے

"اگر قرآن مجید کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ہو تو صحیح یہ ہے کہ اس کا بھی وہی حکم ہے جو قرآن مجید کا ہے۔ (بحرالرائق - درمختار) صفحہ ۸۷ ـ

"متن" اور "ترجمہ" کو بالکل ایک حیثیت نہیں دی جا سکتی! یہ مسئلہ ہے تو "قرآن کریم" کے چھونے کے بارے میں مگر "مجددین" اس کو دلیل بنائیں گے کہ قرآن کریم کا ترجمہ نماز میں پڑھا جا سکتا ہے!

عنوان ہے ـــ غسل کا مسنون و مستحب طریقہ ـــ

"اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو مٹی سے مل کر دھوئے، اس کے بعد پورا وضو کرے" (ص ۹۹)

مگر سمنٹ کے بنے ہوئے مکانوں میں "مٹی" کہاں سے آئے گی! یہی وہ مقامات ہیں جہاں فقیہ کو فراست و اجتہاد سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور زمانہ کے تقاضوں کا شرع کے حدود میں رہ کر خیال کرنا پڑتا ہے۔

"علم الفقہ" کوئی شک نہیں، اپنی جگہ انتہائی مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ زبان بہت ہی سادہ ہے اور اندازِ تحریر عام فہم ہے! اس کتاب سے عوام و خواص سبھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

فاتحۃ الکلام فی القرآۃ خلف الامام

از:- شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی۔ ضخامت ۱۵۶ صفحات، قیمت:- ایک روپیہ ۱۲ پیسے

ملنے کا پتہ:- پاکیزہ دارالکتب۔ ٹاور، جیل روڈ، حیدرآباد

علمی اور دینی دُنیا میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، مولانا موصوف کا قابلِ فخر کارنامہ "اعلاء السنن" کی تالیف ہے، جو عربی زبان میں ہے اور بیس جلدوں پر مشتمل ہے!

ایک اہلِ حدیث عالم نے ایک رسالہ ـــ تکمیل البرہان فی قراۃ اُم القرآن ـــ لکھا تھا جس میں اس بات کا ثبوت فراہم کیا گیا تھا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے، ورنہ اُس کی نماز نہیں ہوگی، مولانا ظفر احمد عثمانی نے اس کے جواب میں یہ کتابچہ تحریر فرمایا ہے جس میں کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امام کی اقتدا میں مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ مولانا موصوف نے اس کتابچہ کی تالیف میں بڑی تحقیق و کاوش سے کام لیا ہے!

اس مسئلہ میں احناف اور اہلِ حدیث کے درمیان بڑی کش مکش بلکہ شدید قسم کی نزاع پائی جاتی ہے۔ اہلِ حدیث کا تشدد زیادہ بڑھا ہوا ہے، حق یہ ہے کہ دونوں مسلکوں پر عمل کرنے سے نماز ہو جاتی ہے، جس کسی کا جس مسلک پر اطمینان ہو، اُس پر عمل کر سکتا ہے، دونوں کا مقصد اتباعِ رسولؐ ہی ہے!

درمیانی مسلک یہ بھی ہے کہ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے اور سری نمازوں میں مقتدی سورۂ فاتحہ کی قرات کرے! یہ مسلک احناف اور اہلِ حدیث کے مسلکوں کا سنگم ہے! واللہ اعلم بالصواب

مسئلہ سُود

از:- مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، ضخامت ۸۰ صفحات (قیمت درج نہیں)

ملنے کا پتہ:- ادارۃ المعارف اشرف منزل، لسبیلہ چوک، کراچی ۵

اس کتابچہ میں مدربا کے بارے میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ قرآن و سُنّت کی رُو سے اس کی کیا تعریف ہے؟ اس کے بعد عرب کے دورِ جاہلیت کے "تجارتی ربا" اور "مہاجنی سود" پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے!

آج کل کے "متجددین" جو "ربا" اور "تجارتی سود" میں فرق کرتے ہیں اور بنک کے سُود کو جائز قرار دیتے ہیں، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ان "اجتہاداتِ باطل" کی پُر زور تردید فرمائی ہے۔

مغرب زدہ اہلِ فکر یہ دیکھتے ہیں کہ دُنیا کس راہ پر جا رہی ہے؟ اور دُنیا کی "بے راہ روی" کو سندِ جواز عطا کرنے کے لئے کتاب و سُنّت میں من مانی تاویلیں بلکہ تحریفیں کرتے ہیں، یہی گمراہ ذہنیت "مسئلہ سود" کے بارے میں اپنا کام کر رہی ہے، مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ نے اس فتنہ کے خلاف بر وقت اقدام فرمایا، اور اُن کے قلم نے اثبات و اظہارِ حق اور تردیدِ باطل کی قابلِ ستائش خدمت انجام دی۔

فلسفۂ دُعا

از:- پروفیسر فضل احمد عارف (ایم-اے) ضخامت ۱۸۴ صفحات، مجلد (رنگین وحسین سرورق) قیمت:- چار روپے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ رشیدیہ، غلہ منڈی منٹگمری۔

"فلسفۂ دُعا" پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے، جو اس قدر تفصیل و وضاحت کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے، فاضل مُصنّف نے مغربی مفکرین کے اقوال سے بھی استناد کیا ہے۔ تاکہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اس کی اہمیت کو محسوس کر سکیں اور "فلسفہ دعا" پر "ملائیت" کی طنز کرنے کی ہمت نہ کریں۔

دعا کی حکمت و افادیت ـــ اسلام کا تصورِ دُعا ـــ قبولِ دعا کے طریق ـــ قرآنی دعاؤں کے خصائص ـــ قرآنی دُعائیں ـــ یہ اس کتاب کے زرین ابواب ہیں، کتاب کے پڑھنے سے تعلق مع اللہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا ہے۔

"آخری پیغمبر حضرت محمدؐ نے بھی الخلق عیال اللہ کہہ کر اس امر کی غمازی کر دی ہے"۔ (ص۵۷)

"غمازی" زبان و ادب کا محاورہ ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے اس لفظ (غمازی) کی نسبت درست نہیں ـــ اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے"۔ اس انداز کی عبارت آئندہ ایڈیشن میں درج کر دینی چاہیئے "صالحین سے ملاقات و مُلاپ مُراد ہوتا" (ص۹۶) عربی اور ہندی لفظوں کے درمیان نہ اضافت آتی ہے اور نہ عطف! صفحہ ۱۱۵ پر سہوِ کتابت کے سبب "خیر الغافرین" کی جگہ "خیر النافرین" چھپ گیا۔

"فلسفہ دعا" اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے کامیاب ترین دینی اور علمی پیش کش ہے، فاضل مصنف کو اللہ تعالیٰ دارین میں اجرِ جزیل عطا فرمائے کہ آخرت اور دین سے غفلت و ذہول کے اس زمانے میں انھوں نے ایمان افروز کتاب لکھی ہے جس کے مطالعہ سے خشیتِ الٰہی اور تعلق مع اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے! ہم جیسے ناکارہ لوگ جو صلوٰۃ و دُعائیں غفلت برتتے ہیں اُن کے مرض کے ازالہ کے لئے تو یہ کتاب "نسخۂ شفا" ہے!

رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی

از:- ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ضخامت ۳۲۴ صفحات (بڑا سائز) مُجلد، رنگین گرد پوش قیمت آٹھ روپے، ملنے کا پتہ:- ادارۃ المعارف، اشرف منزل گارڈن ایسٹ، کراچی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں، اُن کی زندگی اپنی جگہ دین کی خاموش تبلیغ ہے اور متحرک پیغام بھی ہے! اُن کی یہ کتاب علمی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتی ہے، ۱۹۵۹ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا، اب یہ تیسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ بعثت نبویؐ کے وقت دُنیا (چین، ہند، ترکستان، روم، ایران، حبش اور عرب) کی کیا حالت تھی؟ اور حضورؐ کی ذاتِ گرامی کو "ختمِ رسالت" کے لئے کیوں منتخب کیا گیا؟ پھر حضورؐ کی ولادت باسعادت

طفولیت، جوانی، تجارتی مشاغل، سماجی اور شہری زندگی کا ذکر ہے یہاں تک کہ آفتابِ رسالت طلوع ہو جاتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)
نبوت کے مکی دور، تبلیغ رسالت اور قریش کے تعلقات کے بعد مختلف قبائل سے سیاسی معاہدات کا ذکر ہے، خاص طور سے بزنطینی حکومت سے جو عربوں کے تعلقات رہے ہیں اور عہد نبوی میں عربی ایرانی روابط کا جو رنگ رہا ہے اور یہود سے جو سیاسی معاملات پیش آتے ہیں، ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ پھر عہد نبوی کی سیاسی دستاویزوں سے بحث کی ہے اور حضور نے فرمانرواؤں کے نام جو فرمان بھیجے تھے، ان کا حال درج ہے، یہاں تک کہ بعض مکتوبات نبوی کا عکس بھی چھاپ دیا گیا ہے۔
فاضل مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں کی سینکڑوں کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ جگہ جگہ تاریخی حوالے ملتے ہیں، اس قدر تحقیق، دیدہ ریزی اور کاوش و محنت کے ساتھ کتابیں کم ہی لکھی جاتی ہیں!
جہاں جہاں یورپ کے مستشرقین نے تاریخی حقائق میں تصرف اور جعل سازی سے کام لیا ہے اور اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے، لائق مصنف نے اُن کی قلعی بھی کھول دی ہے!

"جس میں انتقام جوئی اور معمولی قتل و لوٹ ناجائز سمجھے جاتے تھے۔" (ص۲۵) "قتل اور لوٹ" لکھنا تھا ——— "اس میں ایک بڑا سانپ پیدا ہو گیا تھا، اور اکثر نظر آکر دہشت کا باعث بنا ہوا تھا۔" (صفحہ ۵۸) اوریجنل عبارت میں "ترجمہ کا رنگ" کتاب میں جا بجا نظر آتا ہے ——— "یہاں ایک طویل کٹہ بنا کر سیلاب کے رُخ کو بدلا گیا ہے۔" (ص۶۳) "سیلاب کے رُخ کو پھیر گیا ہے" لکھنا تھا۔ پھر کٹہ (Dam) دکنی زبان میں بولا جاتا ہے معیاری زبان میں اس لفظ کو "پُشتہ" یا "بند" بولتے ہیں۔
"جبریل امین خدا کا پیام پہونچانے یا وحی کا ذریعہ بننے کے لئے حاضر ہوتے اور خاتم النبیین کو عہدۂ رسالت کا چارج دلایا گیا۔" (ص۶۶) یہ دفتری اندازِ بیان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کس نبی اور رسول سے نبوت و رسالت کا عہدے کا چارج (charge) لیا تھا ——— "اسلام کے سخت ترین مخالف بھی راتوں کو چھپ کر مسکنِ نبوی کے پاس جاتے اور تلاوتِ نبوی سے اور کچھ نہیں تو موسیقی کا لُطف اٹھاتے۔" (ص۷) "موسیقی" کی جگہ "خوش الحانی" لکھتے تو احتیاط کا پہلو غالب رہتا۔
"آں حضرت کی استہزاء اور جسمانی ایذا رسانی، اس روز خاص طور پر ابوجہل نے بہت کی۔" (ص۴۳) "استہزا مونث نہیں مذکر ہے، پُورا جملہ کتنا غیر ادیبانہ ہے ——— "یہ آخری شرط قریش نے اپنا بڑہ پن دکھانے کے لئے منظور کی" (ص۹۹) "بڑھ پن" نہیں "بڑاپن" صحیح املا ہے۔ اگر مسٹر ڈنلاپ کی رائے کے مطابق اسے صرف ستر اسی سال قبل کی جعل سمجھیں۔ (صفحہ ۱۳۰) "جعل" بالاتفاق مذکر ہے!
"..... لونڈیوں کو ہراج کرکے اُس کی آمدنی سے ..... اسلحہ اور گھوڑے خریدے۔" (ص۲۳۰) "ہراج" (Auction) دکنی زبان ہے، "نیلام" لکھنا تھا۔
"اطراف کے مفسدوں کی کان گوشی بھی فرمائی" (ص۲۶۰) "گوشمالی" کی جگہ "کان گوشی" یہ کہاں کی زبان ہے؟ ———
"وہ مکا اور مدینہ اور طائف سے بھی تمدن میں پار تھا۔" (ص۲۷۱) یہ بھی مقامی اندازِ گفتگو ہے، "وہ مکہ اور مدینہ اور طائف سے بھی تمدن میں آگے تھا یا فائق تھا" ——— "اور ان کو چودھریت ختم ہو رہی تھی۔" (ص۲۴۲) "چودھریت" نہیں "چودھراہٹ" بولا اور لکھا جاتا ہے۔
حاجز مملکت (Buffer State) کو کاتب نے قریب قریب ہر جگہ "عاجز" (ح کی بجائے ع) کتابت کیا ہے

صفحہ ۲۱۰ پر "مسعرافت" کو "عرافت" اور صفحہ ۲۲۸ پر "السام علیک" کو "السلام علیک" لکھا گیا ہے، اُردو داں طبقہ کو اس نوع کی کتابت کی غلطیاں شدید غلط فہمی میں مبتلا کردیتی ہیں!

"غرض مختلف وجوہ اور سابقہ انبیاء علیہم السّلام کی اصلاحی کوشش اور تبلیغی نتائج کے تجربے کی روشنی میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی مناسب نظر آیا کہ دین و دُنیا عبادت و سیاست، معاد و معاش سب میں باہم ربط پیدا کیا جاتے" (صفحہ ۲۴۲) یہ اندازِ بیان ایک سیاسی قائد و رہنما کے لئے البتہ زیب دیتا ہے، نبی اور رسولؐ کے کارناموں کے لئے وہ زبان اور پیرایہ اختیار کرنا چاہیے، جس سے ---- یہ اِلّا وحی یوحیٰ کے منصب مقدس کی ترجمانی ہوتی ہے۔

"ایک اور آیت قرآن مجید میں دو جگہ خفیف لفظی فرق سے دُہرائی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

یعنی جو لوگ ایمان لاتے (پیغمبرِ اسلامؐ) اور جو لوگ یہودی ہوئے نیز عیسائی اور صابی مذہب والے، غرض جو بھی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے اور نیک کام کرے تو ایسوں کو اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ملے گا، اور نہ اُن پر کوئی خوف کی وجہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

"صلح کل رواداری اور انتہائی وسعتِ قلب کی اس عجیب غریب تعلیم میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہودی، عیسائی اور صابی مذہب اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کو ترک کریں، بلکہ اپنے الہامی مذہب ہی کی تجدید کرتے ہوئے چند بنیادی امور پر عمل کریں۔" (ص ۲۹۰)

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اللہ تعالیٰ کے فضل سے صحیح العقیدہ مسلمان ہیں اور اُن کی زندگی بڑی صاف و سادہ اور پاکیزہ ہے۔ اُن کے قلم سے "وحدت ادیان" کے گمراہ کن مسلک کی تائید میں اس عبارت کو پڑھ کر سخت حیرت ہوئی اور افسوس بھی! قرآن کریم کی اِن آیات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر اور کون سمجھ سکتا تھا، حضورؐ کے زمانے میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی یہودی، عیسائی اور صابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد اپنے مذہب کو ترک نہ کیا ہو اور اس کو مسلمان یا "اجر آخرت" کا مستحق اور "وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" کا مصداق سمجھا گیا ہو، حضورؐ ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ حضورؐ کی لائی ہوئی شریعت پر بھی ایمان لایا جائے۔

بعض اہل مذاہب یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو کوئی جس قوم اور مذہب والوں میں پیدا ہو گیا تو نسب اور قومیت کی طرح اس کا مذہب بھی نہیں بدل سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس عقیدہ کی تردید فرمائی ہے کہ کسی کا چاہے کوئی بھی مذہب رہا ہو "من آمن" (یعنی نبی آخر پر ایمان لانے) کے بعد اُس کا عملِ صالح اللہ تعالیٰ کے یہاں معتبر ہے! اور ہر شخص چاہے کسی مذہب کا پیرو کیوں نہ ہو "مسلم" ہو سکتا ہے، اور مسلمان ہونے کے بعد اُس کے گزشتہ عقائد و اعمال کے بارے میں کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی حق شناسی اور بے نفسی سے توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ان "تسامحات" کی اصلاح فرمادیں گے! مجموعی طور پر یہ کتاب بڑے معرکہ کی کتاب ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی استطاعت و امکان کی حد تک تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔

ذکرِ محمد — از: حکیم عبدالقوی دریابادی (بی اے) ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ :- صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ (انڈیا)

مولوی عبدالمجید دریابادی مرحوم (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) مولانا عبدالماجد دریابادی (مدیر صدق) کے حقیقی بھائی اور حکیم عبدالقوی صاحب منیجر "صدق جدید" کے قابلِ فخر والد تھے۔ حکیم صاحب موصوف نے مرحوم کے سوانحِ حیات سادہ مگر موثر انداز میں لکھے ہیں!

اس کتاب میں مصنف کے علاوہ دوسروں کے لکھے ہوئے تعزیتی مضامین بھی ہیں۔ ناز بردار بھائی، از مولانا عبدالماجد دریابادی — ڈپٹی عبدالمجید صاحب دریابادی — از انیس احمد عباسی، آہ والدِ مرحوم' از حبیب احمد (ایم۔اے) تینوں مضمون اثرانگیز ہیں' خاص طور سے مولانا عبدالماجد دریابادی نے تو اپنے مقالہ میں دل کی دھڑکنوں کو سمو دیا ہے!

تعزیتی جلسوں کی رودادیں' قطعات تاریخ وفات اور تعزیتی خطوط بھی "ذکرِ مجید" میں شامل ہیں' یہ کتاب ایک شریف متواضع' بامروت وضعدار سیر چشم' دیندار مسلمان اور انصاف پسند حاکم کی صاف ستھری زندگی کی آئینہ دار ہے' اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات آخرت میں بلند فرمائے کہ انھوں نے اس مادہ پرست دور میں دین و دُنیا کو اس طرح نبایا کہ "جام و سندان باختن" کی مثال قائم کر دی۔

مکاتیبِ جگر

مُرتبہ :- تسکین قریشی، ضخامت ۲۹۲ صفحات' مجلد (حسین ورنگین گرد پوش)
قیمت پانچ روپے' ۴۰ پیسے۔ ملنے کا پتہ :- ملک اینڈ کمپنی پبلشرز' اُردو بازار دہلی۔

کتاب کے آغاز میں جناب تسکین قریشی نے اپنی زندگی کے حالات اختصار کے ساتھ لکھے ہیں، اُن کا آبائی وطن قصبہ سورون (ضلع ایٹہ) ہے، اور ۱۸۹۹ء یا ۱۸۹۹ء سالِ ولادت ہے! (حیرت ہے کہ اُن کے قلم سے سالِ ولادت کی جگہ "سالِ تولید" کیسے نکل گیا) ۱۹۲۲ء میں موصوف پولس سب انسپکٹر کی حیثیت سے سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں پبلک پروسیکوٹر (کورٹ انسپکٹر) کے عہدے سے پنشن لی۔

ہندوستان اور پاکستان کی پولس کا محکمہ "مابہ الاحتفاظ" کے لئے بہت کچھ بدنام ہے مگر جناب تسکین قریشی اس دلدل میں کنول کی طرح رہے ہیں' اپنی دیانت داری کے بارے میں انھوں نے اپنی تحریر میں کہیں اشارہ تک نہیں کیا' یہ بات ہم نے دوسروں کی زبان سے سُنی ہے — تسکین صاحب کو شاعری میں حضرت عزیز لکھنوی مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل ہے' اور اُن کی چالیس سالہ مشقِ سخن کی یادگار اُن کے کلام کے تین مجموعے ہیں' جو چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

تسکین قریشی نے "تعارف" کے بعد حضرت جگر مرحوم سے اپنے تعلقات کا حال لکھا ہے جگر کے اور اُن کے جتنے گہرے' قریبی اور مخلصانہ تعلقات تھے، ہم میں اُن کا کوئی حریف نہیں ہے! تسکین صاحب نے دُنیائے شعر و ادب پر احسان کیا کہ جگر کے خطوط کو حفاظت کے ساتھ رکھا اور انہیں ضائع نہیں ہونے دیا۔ رئیس المتغزلین کے ستر (۷۰) خطوط اس کتاب کی زینت ہیں حضرت جگر مرحوم نے ۲۳ اگست (۱۹۶۰ء) کو آخری خط لکھا :-

"جانِ جگر' السّلام علیکم' دل آپ کی اور اپنی مجبوریوں پر کس قدر کُڑھ رہا ہے"

پھر اس کے ۱۷ دن بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے! جس کارڈ پر یہ عبارت جگر صاحب کے قلم کی لکھی ہوئی ہے' اس کا عکس تحریر کتاب میں شامل ہے!

"مکتوباتِ جگر" سے جگر مرحوم کی نفسی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے' اور اُن کی زندگی کے بعض گوشے سامنے آتے ہیں جگر صاحب کا اندازِ تحریر خاصہ شگفتہ اور رواں ہے' سنجیدگی کے ساتھ اُن کی تحریر میں کہیں کہیں شوخی بھی ملتی ہے — ایک نمونہ —

"۔۔۔۔ عزیزی شمس صاحب بھی تو لکھنؤ واپس پہونچ گئے۔ بہرحال اُن سے بھی بہت
کچھ تلافی ہوتی رہتی ہوگی، بشرطیکہ "مسلم لیگ" کے کمبل نے انہیں چھوڑ دیا ہو"۔

مکتوباتِ جگر کے بعد مولانا اسعداللہ صاحب (ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور) کے خطوط ہیں جو علم وفضل اور شعروادب کے نکات سے لبریز ہیں، اِن خطوط کے مطالعہ سے وجدان بڑا انشاط محسوس کرتا ہے۔ کتاب کا خاتمہ جناب عزیز لکھنوی کے مکتوبات پر ہوتا ہے۔

جناب تسکین قریشی نے ان مکتوبات کو یکجا کرکے، زبان وادب کی قابلِ ستائش خدمت انجام دی ہے، ناشر (ملک بُک ڈپو) نے بھی اس کتاب کو خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

مرقع عالم

از:۔ خان بہادر عالم علی خاں، ضخامت ۱۰۰ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت:۔ دو روپے
ملنے کا پتہ:۔ مصنف سے، عالم مارکیٹ، بہاول پور

خان بہادر عالم علی خاں کے کلام کا مجموعہ "مرقع عالم" کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے، خان بہادر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دماغ نکتہ رس اور طبیعت موزوں عطا فرمائی ہے۔ اگر اُن کو شعر وسخن کے لئے دوسرے شاعروں کی طرح کافی وقت اور فرصت ملتی تو ان کی طبیعت کے جوہر کھلتے! اس بڑھاپے کے عالم میں بھی اُن کے شعروں میں گرمی پائی جاتی ہے! اُن کی نظموں کے موضوع رنگا رنگ ہیں۔

لے چل بہاکے دُور کہیں موجِ تندوتیز　　اب دل کو شوقِ کشتی وساحل نہیں رہا
غمِ حسینؓ میں ٹپکے جو آنکھ سے آنسو!　　فلک نے چُن لئے گوہر وہ کہکشاں کے لئے
خدا ضائع نہیں کرتا کبھی انسان کی محنت　　یہ نقد النقد سودا ہے، اِدھر محنت اُدھر اُجرت
کرم کیجئے نوازش ہے، ستم کیجئے عنایت ہے　　ہمارا تو سرِ تسلیم خم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اس انداز کے شعروں سے عالمؔ صاحب کی طبیعت کی روانی اور شگفتگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے:۔

پوچھا جو فرطِ شوق سے "گھر پہ کب آؤ گے مرے"　　ٹھینگا ہی بے شعور نے مجھ کو دکھا دیا کہ یوں
جہاں کے مرگئے کیا اور آدمی سارے　　رہا ہوں میں ہی ستانے کو آسماں کے لئے
زخم ممکن ہے کہ بھر جائے کبھی شمشیر کا　　مندمل ہوتا نہیں، لیکن زبانِ تیر کا
مرے مرنے کو یوں سمجھو کہ گویا مرگئی چِڑیا　　جنازے پر فقط نوحہ کناں تھی بیکسی میری
نگاہ و ناز سے دل میں پھر اک طوفان پیدا کر　　مرے جذباتِ فرسودہ میں پھر ہیجان پیدا کر

اس قسم کے اشعار جہاں جہاں آگئے ہیں، انہیں پڑھ کر وجدان بے مزہ ہوتا ہے۔

جناب عالمؔ کے رومانی کلام میں اُس محبت کی شدت ملتی ہے، جس میں زلف ورُخ، جبینِ وذقن اور ساق وساعد، استعارے نہیں حقائق ہیں!

قاسم العلوم

زیر سرپرستی:۔ مولانا گلزار احمد، ادارہ تحریر، حافظ گل حسین، فرید احمد پاچہ۔ ضخامت ۳۲ صفحات
سالانہ چندہ تین روپے، ایک پرچہ کی قیمت ۲۵ پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ دفتر قاسم العلوم سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا

جامعہ قاسم العلوم (سرگودھا) علم دین کی گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے، یہ صرف تعلیم گاہ ہی نہیں تربیت گاہ بھی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس دینی اور علمی ادارے کو بڑے ہی مخلص اور پرجوش کارکن میسر آگئے ہیں! جامعہ قاسم العلوم نے ایک ہلکے پھلکے قسم کے دلچسپ اور مفید ماہنامہ (قاسم العلوم) کی اشاعت کا بھی آغاز کیا ہے!

"قاسم العلوم" کے مضامین بچوں کے ذہن و فکر کی اخلاقی تربیت کے لئے موزوں اور ان کے مزاج کے مطابق ہیں!

کلام بے لگام

از :- این، بی سین ناشاد ضخامت ۲۲۴ صفحات (مجلد، حسین و مصور سرورق)

قیمت چھ روپے ——— ملنے کا پتہ :- نیو بک سوسائٹی آف انڈیا ———

پوسٹ بکس نمبر ۲۵۰، دہلی۔

جناب ناشاد نے اپنے مجموعہ کلام کو سر عبدالقادر مرحوم کی ذات سے منسوب کیا ہے، یہ دلیل ہے ان کی بے تعصبی، وسعت ظرف اور جوہر شناسی کی! ——— ناشاد صاحب نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "کلام بے لگام" کیوں تجویز کیا، اور اپنا تخلص "ناشاد" کس لئے رکھا؟ اس کا حال انہی کی زبان ظرافت ترجمان سے سنیئے :-

"..... میں نے یہ اشعار مختلف موقعوں پر گوناگوں حالات سے متاثر ہو کر کہے ہیں، اس لئے نہ تو ان میں تسلسل ہے اور نہ کوئی تنظیم، لہٰذا اس مجموعہ کا نام "کلام بے لگام" تجویز کیا ہے، اور اپنا تخلص "ناشاد" اس وجہ سے مناسب سمجھا کہ مجھے اس دنیا میں بہت کم شادمانی نصیب ہوئی ہے"!

ناشاد کے قطعات اور نظموں میں ظرافت کی اتنی ہلکی چاشنی ملتی ہے، کہ بعض وقت تو وہ محسوس بھی نہیں ہوتی، ان کے بہت سے قطعات سپاٹ اور سطحی ہیں!

محلے کی کہتی ہے اک چھوکری
کیا آتی ہے پڑھنی جنم تیری
کہ راس اب مری تجھ سے ملتی ہے کیا
کلی کچھ محبت کی کھلتی ہے کیا

اس طرح کی ناپختہ مشقی ان کے قطعات میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

ایک قطعہ کا عنوان "شرنارتھی" ہے۔

نہرو سے کہا راجہ نے تم ہل نہ چلاؤ ——— شرنارتھی بیکس ہیں ذرا دل نہ دکھاؤ
پنجاب کو دلی میں ملانا ہے ملاؤ ——— پنجابیوں کو مٹی میں لیکن نہ ملاؤ

اس قسم کے جوڑے ہوئے الفاظ پر "شعر" کی تعریف ہی صادق نہیں آتی۔

بے شک میاں کے ساتھ رہے بیوی رات دن
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

لیڈری کا شوق جب مجبور کر بیٹھا　　قرضہ لے کر اک الیکشن لڑ گیا
پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں قرض خواہ　　آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

کاش! ناقد صاحب اپنی شاعری میں کم از کم اس "آہنگ" کو قائم رکھ سکتے!

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انلجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
کفنسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیباریٹریز لمٹیڈ - کراچی

کے۔ ٹو کے مستقل قدرداں

اوروں سے زیادہ ہیں

کے۔ ٹو چوٹی کے سگریٹ ہیں!

ریمنے ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

ایڈیٹر:۔ ماہر القادری

ماہ اگست سنہ ۱۹۶۲ء

ترتیب

چندہ سالانہ سات روپے

فی پرچہ ساٹھ پیسے

مقام اشاعت:۔ دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

کس قدر حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ وہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسلام کے لئے بنا ہے، اُس میں اسلام کو نافذ اور برپا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، اختیار و اقتدار کے کسی دور میں بھی قیامِ معروف اور نہی عن المنکر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا گیا! جس کے ہاتھ میں بھی زمامِ حکومت آئی، اُس نے اپنی کرسی کی حفاظت اور اپنے اقتدار کی عمر کو دراز سے دراز تر کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کیں! یہی ذاتی اقتدار کی کشمکش تھی، جس کے ہاتھوں پاکستان کی کشتی ہمیشہ ہچکولے کھاتی رہی! ہندوستان ہمارا ہمسایہ ملک ہے، پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کا آغاز ایک ہی دن اور ساعت سے ہوتا ہے، وہاں کی مرکزی حکومت کو کسی تغیر و انقلاب کا سامنا کبھی نہیں پڑا، پندرہ سال سے ایک ہی شخصیت ہے جو وقار و اطمینان کے ساتھ پورے ملک کے اعتماد کو لئے ہوئے برسرِ کار ہے!

مگر

پاکستان میں حکومتیں جس انداز میں ادلی بدلی ہیں، بنی اور ٹوٹی ہیں، اُس نے یہاں سچ مچ "طوائف الملوکی" کی کیفیت پیدا کر دی تھی، کسی کسی حکومت کی تو دو مہینہ ہی میں ترکی تمام ہو گئی!

یہاں اسلام کی راہ میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنی رہی ہے، وہ ذاتی اقتدار کی خواہش ہے! اسلام ایسے بے غرض اور خدا ترس لوگوں کو اختیار دینا چاہتا ہے، جن کے اندر اقتدار کا داعیہ اور حکومت کرنے کی ہوس نہ ہو، جو اس عظیم ذمہ داری کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر قبول کریں! ایک طرف اسلام کا حکومت کے بارے میں یہ تقاضا اور معیار، دوسری طرف اقتدار کی بے پناہ بھوک، یہ دونوں چیزیں جو آگ اور پانی کا مزاج رکھتی ہیں ایک جگہ جمع کہاں ہو سکتی ہیں۔

وہ ملک اضطراب و انتشار سے محفوظ نہیں رہ سکتا، جہاں کے حکمراں طبقہ اور عوام کے درمیان نظریاتی اختلافات پائے جاتے ہوں، پاکستان کا موجودہ آئین اگر اسلام، جمہوریت اور عوام کی تمناؤں کے مطابق تشکیل پاتا، تو یہ نوبت کاہے کو آتی کہ مرکزی اسمبلی نے اُس کی ترمیم و اصلاح کے لئے ایک محاذ کی پوزیشن اختیار کر لی ہے! ملک و قوم کی کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ برسوں کی جدوجہد کے بعد پاکستان میں دستور بنا بھی، تو فوجی انقلاب نے اُس کا تیا پانچہ کر دیا۔

ع وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

اور مارشل لا کے سایہ میں جو آئین بن کر سامنے آیا ہے، وہ اس قدر ناقص ہے کہ ہر طبقہ اُس میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس کر رہا ہے اُس نومولود کی زندگی کا خدا ہی حافظ ہے، جس کو پیدا ہوتے ہی آپریشنوں کا سامنا کرنا پڑے اور عملِ جراحی کے ذریعہ جس کے اعضا کو درست کیا جائے ——— بہرحال مصلحت اور وقت کی نزاکت کا یہی تقاضا ہے کہ اسی دستور میں مناسب ترمیمیں کی جائیں اور اُسے قابلِ قبول اور قابلِ عمل بنایا جائے۔ دستور کی تنسیخ سے ایک ایسا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوگا جس سے اسلام اور جمہوریت کے تقاضوں کو صدمہ پہنچے گا۔ مطلق العنان شہنشاہوں اور جابر آمروں کے دور میں کسی کو لب کشائی کی ہمت کم ہی ہوتی ہے، ہر دور میں حق کی مثال ہمارے

سامنے موجود ہے، سارا ملک جابرانہ قیود اور ظالمانہ پابندیوں کے ہاتھوں قیدخانہ بنا ہوا ہے۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے

مگر ________

جمہوری دُنیا میں اربابِ جاہ واقتدار تنقید واحتساب سے محفوظ نہیں رہ سکتے، اُنہیں اپنی طبیعت ومزاج کے خلاف بڑی تلخ اور ناگوار باتیں سُننی پڑتی ہیں، جمہوری فضا میں جس کے پاس جتنا بڑا منصب اور عہدہ ہے، اُتنا ہی بڑا ظرف اُسے پیدا کرنا چاہیئے، اگر کسی نے غلط فہمی یا بے خبری کے سبب حکومت پر کوئی بے سروپا قسم کا الزام لگایا ہے، تو معقول دلائل کے ساتھ اُس کی تردید کی جائے ایسا کرنے سے عوام کی نگاہ میں حکومت کا وقار بڑھے گا، اور اس قسم کے تہمت تراش ذلیل وبے وقعت ہوکر رہ جائیں گے اور اُن کی ساکھ گرجائے گی ________ اور اگر کوئی تنقید اور احتجاج واقعی اور کوئی مطالبہ واجبی ہے، تو اعتراض رفع کرنے اور مطالبہ کو پُورا کرنے کی فکر کی جائے، عوام کے احتجاج اور احتساب پر بادشاہوں کی طرح بپھر جانے اور سخت کلامی پر اُتر آنے کی روش اُن لوگوں کو زیب نہیں دیتی، جو کروڑوں انسانوں کی دلدہی اور امن وحفاظت کی ذمہ داری کا بارِ گراں سنبھالے ہوتے ہیں!

جمہوری دُنیا میں عوام کے نظریوں، مطالبوں اور تمناؤں کو نظرانداز کردینا یا اُن سے غفلت برتنا، بہت بڑی بے دانشی کی بات ہے، جس کسی نے حکومت کے نشہ میں سرشار ہوکر عوام کو ٹھکرایا، اُس نے نہ صرف ملک وقوم بلکہ خود اپنے حق میں بھی دُشمنی کی۔

اختیار واقتدار نہ کسی کا خاندانی حق ہے اور نہ کسی کی وراثت اور جاگیر ہے، اگر کسی بڑے آدمی کو اُس کے مشیروں اور حاشیہ برداروں نے اختیار واقتدار کے غیر معمولی حق دیدیئے ہوں، یا اُس نے خود اپنے لئے جاہ واقتدار کے حدود متعین کرلئے ہوں، اور عوام اس کے اختیارات کی وسعتیں کم کرنا چاہیں، تو اُس شخص کو ایسے موقعہ پر غیر متوازن اور بدحواس (UP - SET) نہ ہونا چاہیئے، اور ان معاملات کو نہ اس طرح محسوس کرنا چاہیئے کہ جیسے کسی کی ذاتی ملکیت ہے جو اُس سے چھینی جارہی ہے اور خاندانی حق ہے جس سے کسی کو محروم کیا جارہا ہے!

ایسے موقعوں پر ایک تو "جی حضوری" ٹائپ کے لوگ "مزاجِ شاہانہ" کو عوام اور اُن کے نمائندوں سے بدظن کرنے کا پارٹ ادا کرتے ہیں، دوسرے وہ غلط اندیش کرسی نشین، جن کے اندر اقتدار کی شدید بھوک اور حکومت کرنے کی بے پناہ ہوس ہوتی ہے، وہ حالات کو سنبھالنے کی بجائے، اُن کے بگڑنے سے خوش ہوتے ہیں، تاکہ بگاڑ کا بہانہ بناکر، انہیں "مطلق العنان" بننے اور "آمرانہ انقلاب" لانے کا بہانہ ہاتھ آئے، سرسکندر مرزا کے منحوس دور میں یہ تلخ تجربہ ہوچکا ہے۔

پھر عوام وخواص کی اس نزاع وکشمکش کے ماحول میں کچھ دوسرے لوگ اس لائن پر سوچنے لگتے ہیں کہ ہمیں "نجات دہندے" بن کر حکومت کی مشنری پر کیوں نہ قابض ہوجائیں!

اس قسم کے خطروں اور اندیشوں کو زبان وقلم پر لاتے ہوئے، جتنی اذیت اور تکلیف ہوتی ہے اُس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہوسکتا، قوم نے ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھا تھا، جو ہر اعتبار سے جنت الفردوس کا نمونہ ہوگا، مگر جاہ واقتدار کی ہوس کا برا ہو، جس نے پاکستان کو دوزخ اضطراب بنادیا!

سیاست دان خودغرض تھے نیز بے تدبیر اور ناقص العقل تھے، مگر اہلِ سیف نے ایسا کونسا تیر مارا ہے، جس نے پاکستان کی کایا پلٹ دی ہو اور بین الاقوامی دنیا میں اس کے وقار کو بلند کردیا ہو، انگلستان میں پاکستانیوں کو جس ذلت وخواری کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ اسی دورِ حکومت کے اعمالنامہ کا ایک ورق ہے! کشمیر کا مسئلہ سیاست دانوں کے دور میں جہاں تھا، آج بھی وہیں ہے، مافاری کی

مشہور ضرب المثل ہے "آزمودہ را آزمودن جہل است" مگر آزمائش، تجربہ اور امتحان کے بعد بھی کشمیر کا مسئلہ سر ظفر اللہ کو سونپ دیا گیا!
ہندوستان کے مسلمانوں پر کیسے کیسے شدید مظالم ہوتے ہیں، مگر زبانِ تیغ کو اول تو احتجاج کی بہت ہی کم توفیق نصیب ہوئی، اور ہوئی بھی، تو زبانِ تیغ، زبانِ سیاست ہی کی طرح بے اثر ثابت ہوئی۔

پاکستان کے محترم صدر نے امریکہ کا جب دورہ کیا تھا، تو پاکستانی اخبار نویسوں کی ایک ٹیم اُن کے ساتھ گئی تھی، بلکہ یوں کہیے کہ لے جائی گئی تھی، اس دورے کا کیا طوفانی پروپیگنڈا کیا گیا، کس کس عنوان سے، اس کی کامیابی کو اُچھالا گیا جیسے امریکہ کے عوام اور وہاں کی حکومت پر صدر عالی وقار کی شخصیت اور قابلیت نے جادو کر دیا ہے اور امریکہ پاکستان کا کلمہ پڑھنے لگا ہے! ان تفصیلات کو پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی، اور طرح طرح کی اُمیدیں بندھتی تھیں، مگر یہ حسنِ ظن اور خوش فہمی کے طلسم بہت جلد ٹوٹ گئے، بدنام سیاست دانوں کے دور میں پاکستان کو امریکہ کی جیسی ہمدردی حاصل تھی، کیا پاکستان کو آج ویسی ہی ہمدردی حاصل ہے؟
یہ جو بیٹھے بٹھائے کراچی سے دارالخلافت کو راولپنڈی منتقل کر دیا گیا، کیا اس کے لئے عوام نے کبھی مطالبہ کیا تھا، کیا کسی ایک بڑے آدمی یا چند کرسی نشینوں کی پسند و ناپسند پر ایسے اہم اقدامات کئے جا سکتے ہیں؟ اب جب کہ مارشل لا ہٹ چکا ہے، مشرقی پاکستان کی صدائے احتجاج فضا میں بلند ہو رہی ہے کہ وہاں کی اکثریت اس اقدام کو پسند نہیں کرتی، پھر پاکستان جس کو قدم قدم پر دوسرے ملکوں کے مالی سہارے کی ضرورت ہے، نئے دارالخلافہ کی تعمیر کے لئے اربوں روپیہ کہاں سے لائے گا؟

یہ عائلی قوانین!!

اہلِ تدبیر معاملات کو الجھایا نہیں سلجھایا کرتے ہیں، ایک عقدہ وا ہو گیا، تو دوسری گرہ پر کام شروع کر دیا گیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ گرہیں کھلتی اور الجھنیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں، پاکستان میں یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ یہاں پرانی گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے، نئی اُلجھنیں پیدا کی جا رہی ہیں اور اس طرح یہاں کے حالات پیچ در پیچ ہوتے چلے جا رہے ہیں!

قوم و ملک کی تعمیر و اصلاح اور معاشرے کی تطہیر مقصود تھی، تو سب سے پہلے شراب نوشی، قمار بازی، سود خواری اور زناکاری کو قانونی طور پر جرم قرار دینا تھا اور قرآنِ کریم کے حکم کے مطابق :-

إِنَّ الَّذِيْنَ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ ....

"وہ لوگ اگر ہم ان کو قدرت (حکومت) دیں زمین پر، تو وہ نماز کو قائم کریں"

"قیامِ صلوٰۃ" کے لئے جد و جہد کرنی تھی، مگر ان تمام بنیادی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر، "نکاح و طلاق" کے مسائل سے اصلاح و تعمیر کا آغاز کرنا کونسی عقلمندی کی بات اور دُور اندیشی کی دلیل ہے، زناکاری کے معاملات کو کھلی چھوٹ دے کر تعددِ ازواج پر پابندیاں لگانا، اگر تعمیر و اصلاح ہے، تو :-

بریں عقل و دانش بباید گریست

تعدد ازواج کی جس "اجازت" کا قرآنِ کریم میں ذکر آیا ہے، اُس کو "بُرائی" فرض کر کے، اُس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر کھلی ہوئی طعنہ زنی ہے! اللہ اور رسول نے معاشرے میں عورت کو کیا مقام عطا کیا ہے، اُس کے فرائض و حقوق کیا ہیں؟ عائلی مسائل کو اسلام نے کس طرح حل کیا ہے؟ اس کا صحیح علم اُنہی علماء کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کے سیکھنے، سکھانے اور اُس کے برتنے میں گزاری ہیں، علماء کی غالب اکثریت نے عائلی قوانین کو رد کر دیا، سیاست کے زمانے میں جب عائلی قوانین کی رپورٹ سامنے آئی تھی، تو اُس وقت بھی صاحبِ فکر علماء نے اس کی کمزوریوں غلطیوں

اور رخنوں کی کتاب و سُنت کے دلائل کے ساتھ نشاندہی کی تھی اور مارشل لا کے دور میں جب آرڈی ننس نافذ ہوا، تو اُس وقت بھی عائلی قوانین کا تجزیہ کرکے بتایا گیا کہ اس میں کہاں کہاں اسلامی شریعت سے انحراف پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ مرکزی اسمبلی میں ان قوانین کی تنسیخ کا بل پیش کردیا گیا!

پاکستان میں خواتین کا ایک ایسا گروہ بھی ملک و قوم کی بدقسمتی سے پیدا ہوگیا ہے جس کی بدولت ملک میں "تبرج جاہلیت" کو فروغ ہوا ہے، ان میں سے بعض عورتیں پاکستان بننے سے پہلے بھی اسلامی پردے کی پابند نہیں تھیں، اور اکثر نے پاکستان بننے کے بعد بے پردگی اختیار کی ہے۔ ان خواتین کی سماجی سرگرمیوں کا آغاز "مینا بازاروں" سے ہوا، جس نے ملک میں بے حجابی، اختلاطِ مرد و زن اور بن سنور کر محفلوں کی زینت بننے کے رجحان کو جنم دیا، پہلے چہرے کھلے، پھر بانہیں، اُس کے بعد رفتہ رفتہ صراحیٔ گردن کا حصّہ زیریں بے نقاب ہونے لگا، اور اب معاملہ اس نوبت تک جا پہونچا ہے کہ بازو، بغل اور سینہ کی عُریانی کے ساتھ مہین اور باریک ملبوس نے چھپے ہوئے حصّے کو بھی مستور نہیں رہنے دیا! اس طبقہ کی بعض عورتوں کو کلب گھروں اور کاک ٹیل پارٹیوں میں شراب کے نشہ میں دُھت دیکھا گیا! قوم کی نوخیز اور معصوم لڑکیوں کو بے حجابی اور بیباکی کے ساتھ ناچنے گانے کا جو شوق ہوا ہے، اُس کو شہ اسی لذت چشیدہ اور آزمودہ کار مغرب زدہ طبقہ نے دی ہے۔

کوئی شک نہیں ان میں بعض ایسی بے پردہ خواتین بھی ہیں جو نماز روزے کی پابند ہیں اور رمضان میں تراویح تک جماعت سے پڑھتی ہیں، مگر ان کے فکر و نظر پر بھی یورپ چھایا ہوا ہے۔ کتاب و سُنّت کا اگر انھوں نے تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، تو مغربی افکار کی عینک سے کیا ہے۔

عائلی قوانین کی تنسیخ کا "بل" جب قومی اسمبلی میں پیش ہوا، تو مغرب زدہ خواتین اسلامی شریعت کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا کر میدانِ عمل میں آگئیں، سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ راولپنڈی میں اس طبقہ کی عورتوں نے جو احتجاج اور مظاہرے کئے ہیں، ان کی پشت پناہی حکومت نے کی ہے! اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہماری موجودہ حکومت اور ان تجدد زدہ عورتوں کے مزاجوں میں کتنی مناسبت ہے، اور چند دن تک ہمارا معاشرہ اگر انہی کے زیر سایہ پروان چڑھتا رہا۔ تو پاکستان کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک قریہ پیرس اور ہالی ووڈ بن کر رہ جائے گا۔

پاکستان کے وجود میں آنے کی غرض و غایت تو یہ تھی کہ یہاں کی عورتیں رابعہ بصریؒ، خدیجہؓ، عائشہؓ، اور فاطمہؓ کے مقدس کردار اپنائیں گی، اور اپنی زندگیوں کو اسلامی اخلاق سے سنواریں گی، اُن کے ہاتھوں پر حیا کے جھومر اور کلائیوں میں مہر و وفا کے کنگن ہوں گے مگر کیا قیامت ہے کہ اُس پاکستان میں رابعہؒ اور فاطمہؓ کی بجائے گریٹا گاربوئیں اور دیوکا رانیاں پیدا ہورہی ہیں!

ان آنکھوں نے انگریز کے دورِ غلامی میں وہ زمانہ بھی دیکھا ہے کہ جب ہندوستان کی اسمبلی میں "شاردا بل" پیش ہوا ہے جس کی زد اسلام کے عائلی قانون پر پڑتی تھی، تو مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس کے خلاف میدان میں آگئے تھے، اور کسی ایک مسلمان عورت نے بھی "شاردا بل" کی حمایت میں آواز بلند نہیں کی تھی، اور اب آزاد ہونے کے بعد یہ اذیت کوش نظارہ بھی ان گنہگار آنکھوں کو دیکھنا پڑا کہ عائلی قوانین میں اسلامی شریعت سے صریحاً انحراف کیا جاتا ہے، اور اس کی حمایت مسلمان عورتوں کا ایک گروہ کر رہا ہے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

ان مغرب زدہ خواتین میں کچھ ایسی آبرو باختہ عورتیں بھی ہیں، جو "زناکاری" کو قانون کی ہر پابندی سے آزاد رکھنا

چاہتی ہیں العیاذ باللہ اور رسولؐ کو چیلنج کرتی ہیں کہ مرد کو چار شادیاں کرنے کی جب اجازت مل گئی ہے، تو عورت کو چار خاوند رکھنے کے حق سے کس لئے محروم کیا گیا ہے!

؎ آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

"عائلی قوانین" کی بدولت ملک میں دین پسند خواتین اور مغرب زدہ لیڈیز کے جو دو محاذ قائم ہو گئے ہیں، اس کی ذمہ داری سے پاکستان کی حکومت اپنے کو غیر متعلق اور بری ثابت نہیں کر سکتی! پاکستان کے وہ مسلمان جو کتاب و سنت پر ایمان رکھتے ہیں، پاکستان اور اسلامی شریعت کے وقار اور آبرو بچانے کے لئے جو اپنی جانیں دے سکتے ہیں ان سے اس کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے لئے دعائیں کریں گے جن کے ناخنِ تدبیر سے اسلامی شریعت کو خراشیں اور جراحتیں پہونچی ہیں۔

ایک طرف زنا، شراب، سود اور قمار بازی کو کھلی ہوئی آزادی ملی ہوئی ہے، دوسری طرف رقص و سرود کی سرپرستی کی جا رہی ہے اور ہمارے عائلی قوانین کو مغربیت اور مادہ پرستی کے سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے، اس پر دین پسند طبقہ احتجاج کرتا ہے تو عالم بالا سے ارشاد ہوتا ہے کہ ملک میں اس طرح انتشار پھیلایا جا رہا ہے ——— اور ان پاکستانیوں میں ابھی جمہوری شعور ہی پیدا نہیں ہوا، ان کے لئے تو وہی نظامِ حکومت موزوں ہے، جہاں ایک فرد کے ہاتھ میں ساری طاقت ہو، یہ بھیڑیں تو چرواہے کے ڈنڈے ہی سے درست رہ سکتی ہیں۔

دعوتِ عمل

اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ ان دل شکن حالات کے باوجود ملک میں اللہ، رسولؐ، اسلام، کتاب و سنت اور اخلاق و شریعت کے مقدس ناموں کی گونج سنائی دے رہی ہے، اللہ کرے یہ "گونج" "عمل" کے قالب میں ڈھل جائے، دین دار طبقہ کو اپنے عمل کی رفتار تیز تر کر دینی چاہیے! یہ بات اوپر کے لوگ بھی اچھی طرح جان چکے ہیں کہ یہاں پاکستان میں اسلام کی پناہ لئے بغیر کسی کو عزت و منصب حاصل نہیں ہو سکتا، اور بڑے دل ہی سے سہی "اسلام" کا نعرہ بلند کئے بغیر مفر اور چارہ کار نہیں۔

حالات سازگار ہوں یا ناسازگار، سختی کا وقت ہو یا آسانی کا ماحول، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم، اس کے کلمہ کو بلند اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنی ہے! نتائج کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے، ہم تو عمل و حرکت کے ذمہ دار ہیں کہ صحیح دینی فکر، جائز تدابیر اور خلوصِ نیت کے ساتھ کام ہو، یہاں تک کہ ہم سب اُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کے مصداق بن جائیں! (آمین

آخر میں ہمیں ملک کے لیڈروں اور قومی زعماء کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ حکومت پر نقد و احتساب میں ادب و شائستگی کی حدود کا خیال رکھیں، اور اربابِ اقتدار کے دلوں میں یہ بات اتارنے کی کوشش کریں کہ آپ کی سعی و توجہ سے پاکستان میں اسلام قائم ہو گیا تو عوام آپ لوگوں کی رکابیں تھام کر چلیں گے، اور تاریخ میں تمہارے نام سنہری حرفوں میں لکھے جائیں گے! بہرحال احتجاج مطالبہ اور نقد و احتساب کے باوجود فضا "نزاع و جدال" کی نہیں صلح و آشتی کی پیدا ہونی چاہیے!

ماہر القادری

۲۸ جنوری ۶۲ء

ایک عیسائی مُحقّق اور مُبلّغ کا قبولِ اسلام

سابق عیسائی محقق اور مُبلغ فؤاد فوزان عرب شامی النسل جو آج سے پہلے ایک عرصہ دراز تک مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ بلادِ عرب اور دوسرے ممالک میں کرتے رہے وہ کل دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الٰہ یار پہنچے، ان کی آمد کا مقصد تو بظاہر اپنے سابق مذہب کی اشاعت و تبلیغ تھی۔ اور اس کے ساتھ اسلام کے متعلق جو شکوک و اعتراضات تھے ان کو پیش کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں متعدد حضرات علماء سے ان کی گفتگو ہوتی رہی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور بعد میں حضرت مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی سے طویل گفتگو ہوئی۔ اور مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے بعد بالآخر اسلام کی حقانیت پہچان کر آج صبح مورخہ ۷ ار محرم ۸۳ھ مطابق ۲۱ر جون ۶۳ء اپنے سابق مذہب نصرانیت سے تائب ہوگئے۔ اور حضرت مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی کے ہاتھ پر قبولِ اسلام کیا۔ خداوند عالم ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے اور ہم سب کو دینِ اسلام پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

فؤاد فوزان کا آج سے اسلامی نام عبد الحمید خلیل تجویز کیا گیا ہے۔ عبد الحمید خلیل مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد غسل کرکے مسجد دار العلوم میں پہنچے۔ حضرات علماء و طلباء اور معززین شہر کے مجمع میں موصوف کے قبول اسلام کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی نماز کے طریقہ کی تلقین کرتے رہے اور عبد الحمید خلیل اس کے مطابق دوگانہ نماز ادا کرتے ہوئے بارگاہِ ربّ العزت میں سربسجود ہوئے۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے موصوف کو قبول اسلام پر مبارکباد دی اور حقانیت اسلام پر عربی میں تقریر فرمائی۔

عبد الحمید خلیل نے اسلام لانے کے بعد اپنے تاثرات عربی زبان میں پیش کئے جن میں اس امر کا اعتراف کیا کہ ہدایت صرف خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دین میں ہے —— موصوف کی عربی تقریر کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے:—

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اے میرے معزز و مکرم مسلمان بھائیو۔ میں خدا پر ایمان لایا ہوں اور اس کی اطاعت و بندگی کے واسطے تیار ہوں اور کہہ رہا ہوں "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور اسی طرح یہ بھی اقرار کر رہا ہوں کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (نہ کہ خدا یا خدا کے بیٹے) گواہی دیتا ہوں میں اس بات کی کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں وہی تنہا ایک ہے جس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں میں اس بات کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ایمان لایا میں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے تمام ناموں اور صفات کے ساتھ ہے اور قبول کرتا ہوں۔ اس کے تمام احکام کو۔ ایمان لاتا ہوں اللہ اور اس کے فرشتوں پر اور قیامت کے دن

ہےاور اللہ کی تقدیر پر کہ ہر خیر اور شر اللہ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر بھی ایمان لاتا ہوں۔

برادرانِ مکرم! یقیناً میں بہت بڑی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور خوش ہوں اس عظیم الشان توفیق پر جو بے شک توفیق ہے دین حق کی یعنی قبول اسلام کی جس دین حق نے توحید مقدس کے حقائق سے تمام عالم کو منور کیا۔ کوئی شک نہیں ہے اس میں یقیناً کوئی تردد نہیں ہے اس میں۔ میں اللہ رب العالمین کی حمد و ثناء کرتا ہوں اور اسی کے شکر گزار بندوں میں سے ہوں جس نے مجھ کو ہدایت دی سیدھے راستے کی یہ راستہ ہے ان لوگوں کا جن پر حق تعالیٰ نے انعام فرمایا اور مجھ کو ان لوگوں میں سے نکال دیا جن پر قہر و غضب نازل کیا گیا ہے یعنی یہود اور وہ لوگ جو گمراہوں میں سے ہیں (یعنی نصاریٰ)

پاک ہے وہ ذات جس کے واسطے ہر چیز ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے جس نے سچا ایمان ایک مشتاق کے دل میں ڈالا اور اپنے نور جمیل سے فواد کو منور کر دیا۔ بے شک وہی ہدایت فرمانے والا ہے جس کو چاہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے کوئی شک نہیں اس بات میں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسیح بن مریم (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہیں اور بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ لوگ آخرت میں شرمندہ ہوں گے اور عذاب جہنم میں ہمیشہ کے لئے مبتلا رہیں گے یقیناً کوئی بیٹا اس ذات کے لئے نہیں پایا جاسکتا جس ذات نے آسمانوں اور زمین اور تمام عالم کو پیدا کیا۔ بے شک وہ ذات خداوندی پاک ہے اور بری ہے اس قسم کی ہر چیز سے اور ایسی ہی تمام بیہودہ اور لغو باتوں اور اپنی طرف سے ایجاد کردہ چیزوں سے جو ایجاد کی ہوئی مسیحیت میں پائی جاتی ہیں۔

بے شک موجودہ مسیحیت محض ایک غلط گمان کی پیروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی ہے اے ہمارے پیغمبر آپ کہدیجئے کون اور کر سکتا ہے اللہ کی طرف سے کسی چیز کو اگر ارادہ کرے اللہ اس کا کہ ہلاک کر دے مسیح بن مریم اور ان کی والدہ کو اور ہر اس شخص کو جو روئے زمین میں ہے اللہ کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور جو کچھ ان کے درمیان ہے جو چاہتا ہے اللہ اس کو پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے اور اللہ کا فرمان ہے یقیناً عیسیٰ کی مثال اللہ کے یہاں آدم جیسی ہے کہ ان کو (بلا کسی باپ اور ماں کے) پیدا کر دیا مٹی سے۔

تو جس شخص نے یہ قول اختیار کیا کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں اس نے بہت بڑا کفر کیا۔ اور وہ ذلیل اور ناکام لوگوں میں سے ہوگا اور جس نے یہ تسلیم کر لیا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں (نہ کہ اس کے بیٹے) تو وہ کامیابوں میں سے ہوگا۔

اللہ کا فرمان ہے مسیح بن مریم صرف اللہ کے رسول ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ نے فرمایا یَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا الخ یعنی اہل کتاب یقیناً آچکے تمہارے پاس ہمارے رسول جو ظاہر کرتے ہیں تمہارے سامنے بہت سی وہ باتیں جن کو تم چھپایا کرتے تھے کتاب الٰہی میں سے اور وہ تمہاری بہت سی باتوں سے درگذر بھی کرتے ہیں غرض آگیا اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان نور تمہارے پاس اور ایسی کتاب جو (حق اور باطل کو) کھول دینے والی ہے اے میرے مسلمان بھائیو! بے شک حق کی طرف لوٹ جانا انسان کے لئے بڑی ہی فضیلت اور سعادت ہے دین اور دنیا میں بے شک اسلام ایک روشن دین ہے اور ان لوگوں کا مذہب ہے جنھوں نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی اور اللہ ان سے راضی ہوا۔

یقیناً کوئی دین نہیں ہے سوائے اسلام کے اسی میں اللہ رب العالمین کی اطاعت ہے جس نے اپنے رسول خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا دنیا میں کوئی ہدایت نہیں سوائے سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے۔

بس جو آپ پر ایمان لائے گا وہی کامیاب لوگوں میں سے ہوگا سن لو اللہ کی یقیناً مدد قریب ہے۔

سَلَامُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ أَجْمَعِيْنَ۔ آپ کا بھائی عبد الحمید خلیل

———×———

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

علامہ اقبال کا نظریۂ فن

کسی چیز کی جامع و مانع تعریف کرنا تقریباً امرِ محال سمجھا گیا ہے۔ آج تک کسی چیز کی مکمل تعریف پیش نہیں کی جا سکی ہے۔ اس لئے فن کی جامع تعریف کرنا بھی ممکن نہیں ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ کچھ ایسی باتیں بیان کر دی جائیں جن سے فن کا کچھ دھندلا سا تصور ذہن میں آجائے۔ فن سے درحقیقت مراد یہ ہے کہ کسی کام کو حسن و خوبی سے کیا جائے کسی چیز میں اس طرح حسن پیدا کر دینا جس سے انسان کا ذوقِ جمال تسکین پائے مثلاً ضرورت کے لئے ایک سادہ سی صراحی بنا لینا صناعی ہے۔ لیکن اس صراحی میں حسین بیل بوٹے بنا کر اس کو دلکش بنا دینا فنکاری ہے یا کوئی ایسی تصویر بنا دینا جس کو دیکھ کر کوئی رومانی یاد تازہ ہو جائے۔ اظہارِ فن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں سینکڑوں قسم کے داعیات پیدا کئے ہیں۔ ان کا علیحدہ علیحدہ دائرہ عمل ہے۔ ان داعیات میں ذوقِ جمال بھی ایک اہم داعیہ ہے۔ یہ ذوق انسان میں نرمی، تہذیب، شائستگی اور گداز پیدا کرتا ہے اور انسانی زندگی میں ان چیزوں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ انسان کے خمیر میں دشمن سے مدافعت کے لئے اور بڑی بڑی مہمیں بے خوف و خطر سر کرنے کے لئے غصہ، وحشت، صلابت اور حمیت جیسی چیزیں گوندھ دی گئی ہیں۔ ان کو حدِ اعتدال میں رکھنے کے لئے ذوقِ جمال اور اس سے پیدا شدہ تاثرات کی سخت ضرورت پڑتی ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان کی زندگی سخت وحشت زدہ ہو کر رہ جائے۔ فن انسانی زندگی کے توازن کو اعتدال پر رکھتا ہے۔ اس کو انسانیت، تہذیب اور شائستگی کی طرف مائل کرتا ہے۔

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں اگر ذوقِ جمال اور اس کے توابع یعنی نرمی، گداز اور نزاکت حد سے بڑھ جائیں تو کمزوری اور نسائیت کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں اور زندگی کا توازن خراب ہو جاتا ہے اس لئے ذوقِ جمال کی تسکین کی خاطر ضرورت سے زیادہ انہماک بھی زوالِ اقوام کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس لئے فن کے رجحان اور انہماک کو حدود کا پابند ہونا ضروری ہے۔

فن کے متعلق خود کچھ عرض کر دینے کے بعد رسمی طور پر یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق دو تین مشاہیرِ عالم کے اقوال بھی پیش کر دیئے جائیں۔ سب سے پہلے اس سلسلے میں افلاطون کا ذکر آتا ہے۔ وہ فن کو ایک قسم کی نقالی کہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر وہ چیز جو اس عالم کون میں پیدا کی گئی ہے وہ نقل ہے اس کی اصل عالمِ بالا میں موجود ہے جسے وہ اعیانِ نامشہود کہتا ہے۔ اب فنکار انہی چیزوں کی نقل کرتا ہے۔ گویا ہر فنکار جو تصویر پیش کرتا ہے وہ اصل سے دو درجے دور ہوتی ہے اس لئے اس کی افادیت اور اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے افلاطون اس دنیا کو فریب یا ہندی اصطلاح میں مایا جال کہتا ہے اور غالباً یہیں سے صوفیوں نے اپنا وہ مشہور مقولہ وضع کیا ہے جس میں مرنے سے پہلے مر جانے کا حکم پایا جاتا ہے (موتوا قبل ان تموتوا) اسی وجہ سے افلاطون نے اپنی جمہوریت میں شاعروں اور دوسرے فنکاروں کو رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر بادلِ ناخواستہ برداشت کیا بھی ہے تو چند شرائط کی پابندی کے ساتھ۔ یعنی اخلاقی حدود کی سختی سے پابندی کریں۔ زیادہ خیالی باتیں نہ بنائیں۔ مفید جذبات میں تحریک پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ سفلی جذبات میں اشتعال پیدا نہ کریں۔ لیکن پھر بھی ان کو بہت زیادہ بلند مقام حاصل نہ ہو سکے گا۔ یہ مختصراً افلاطون کا نظریۂ فن ہے۔

ارسطو نے بعض باتوں میں اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے اور بعض باتوں میں ہم نوائی کی ہے۔ مثلاً فن کو اس نے نقالی کہا ہے لیکن نقل کی نقل تسلیم نہیں کیا۔ وہ افلاطون کے اعیانِ ثابتہ کے نظریئے کو نہیں مانتا اور دنیا اور زندگی کو مایا جال یا فریب

اسی طرح اپنے استاد سے اس معاملے میں بھی اختلاف کیا ہے کہ فن کو اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ وہ فن کو ہر قسم کے دباؤ سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔ البتہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ فن بداخلاقی اور فحاشی کا پروپیگنڈا بن کر رہ جائے۔ وہ فن میں حسن پیدا کرنے کا قائل ہے اور حسن بداخلاقی کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ فن کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے اس نے بوطیقہ، یا شعریات میں لکھا ہے کہ انسان کے خمیر میں بہت سے احساسات اور داعیات شامل ہیں۔ اکثر ان داعیات کی تسکین روزمرہ کی زندگی میں نہیں ہوتی اور وہ اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں ان داعیات کو فن کے مصنوعی ذریعے سے تسکین دینا ضروری ہے تاکہ ان کا دباؤ زیادہ نہ بڑھ جائے اور دوسرے جذبات کا توازن بگڑ نہ جائے۔ اس دباؤ کو وہ "کتھارسیس" کہتا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ کم از کم اس کے نزدیک ڈرامہ ہے جہاں بہت سے جذبات محبت۔ نفرت۔ غصہ۔ ہمدردی اور ایثار وغیرہ کی تسکین ہوتی رہتی ہے۔ یہاں ارسطو فرائیڈ کے بہت قریب پہنچ گیا ہے اب ہم علامہ اقبال کے نظریۂ فن کو انہیں دونوں فلاسفہ کے نظریات کے حوالے سے بیان کریں گے۔

علامہ اقبال کو بہت سی باتوں میں ان دونوں سے اختلاف ہے۔ مثلاً علامہ مرحوم افلاطون کی طرح دنیا اور زندگی کو "مایا جال" نہیں خیال کرتے۔ وہ زندگی کو ایک ٹھوس حقیقت سمجھتے ہیں۔ وہ مرنے سے پہلے مرنے کے بھی قائل نہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے اکثر ان صوفیوں سے اس معاملے میں اختلاف کیا ہے جو افلاطون کی پیروی میں دنیا کو مردود اور زندگی کو وبال خیال کرتے ہیں اور زندگی سے فرار اختیار کرنے کو نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اور رہبانیت کی زندگی خانقاہیت کی شکل میں اختیار کر لیتے ہیں۔ علامہ کی نظر میں قرآن کی وہ آیات ہیں جن میں تسخیر کائنات کی دعوت دی گئی ہے۔ اور وہ حدیث ان کو یاد ہے جس میں رہبانیت کی زندگی سے منع کیا گیا ہے "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ"۔ وہ زندگی میں سکون وجمود کو برداشت نہیں کر سکتے وہ سکون کو موت تصور کرتے ہیں۔ وہ متحرک اور طوفانی زندگی کو پسند کرتے ہیں اور اسی قسم کے خیالات سے ان کا سارا کلام بھرا ہوا ہے۔ ہلاکو نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو فتح کر کے تباہ کیا۔ اس حادثے نے دنیا کے مسلمانوں کے دل توڑ دیئے اور اس صدمے کی وجہ سے رہبانی خیالات ان کی زندگی میں نہایت تیزی سے داخل ہو گئے اور بعض صوفیوں نے خانقاہیت کو تمام لوازم کے ساتھ اپنا لیا اور چونکہ صوفیائے کرام کا اثر تمام قوم پر تھا یہ خیالات تمام مسلمان قوم میں پھیل گئے اور ان کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا اور زندگی میں ہر طرف بیزاری اور مایوسی چھا گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پستی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ علامہ کے فن یا ان کی شاعری کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو جمود وسکون کے نشے سے ہشیار کیا۔ خوابِ غفلت سے جگایا ان کے کلام نے اس سوتے ہوئے قافلے کے لئے بانگِ درا کا کام کیا۔ وہ زندگی میں تسخیر کائنات اور سخت کوشی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں جاودانِ پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی۔ وہ زندگی کو افسردہ و مضمحل نہیں دیکھنا چاہتے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

وہ غلامی کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک ایک مسلمان غلامی پر کسی طرح راضی نہیں ہو سکتا ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

چنانچہ خودی کا سلسلہ فلسفہ اور لوئی البشر یا خیر البشر کا تمام تصور اس قسم کے خیالات سے بھرا ہوا ہے ۔ علامہ نے خودی کو اپنا مخصوص فلسفہ قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو اپنی خودی کو بلندی کی انتہا تک پہونچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ذلت و مسکنت کی زندگی سے ان کو سخت نفرت ہے ان کا تو یہ خیال ہے کہ ساری کائنات انسانی تسخیر کے لئے پیدا کی گئی ہے "سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ"

دوسرا بنیادی اختلاف علامہ کو ان فلاسفہ سے یہ ہے کہ وہ شاعری کو نقل یا نقل کی نقل نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک نقل کی کوئی حیثیت نہیں۔ فن دراصل فنکار کے خون جگر سے پیدا ہوتا ہے خالی نقالی سے نہیں۔ کیونکہ نقل میں فنکار اپنے جذبات و تاثر کو دخل نہیں دے سکتا اور جب تک کہ فن پارے میں فنکار کے جذبات و تاثرات شامل نہ ہوں وہ تابانی اور تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی جو خلاق کا فن کرے۔ علامہ کا خیال ہے کہ شاعری میں شاعر کا خون جگر شامل ہونا ضروری ہے ؎

اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے　　　آیا کہاں سے نغمۂ نے میں سرور مے

یعنی خالی چوب نے میں کیا دھرا ہے۔ پھونک مارو تو بے ہنگام سی آوازیں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن گداز اور تاثیر ان آوازوں میں اسی وقت پیدا ہوگی جبکہ نے نواز کا دل جذبات۔ گداز اور سپردگی سے بھرا ہوا اور وہ اپنی روح نغموں میں تحلیل کر دے۔ پھر یہ نغمے دوسروں کو مسحور کرتے ہیں۔ اسی چیز کو بعض لوگوں نے "نگاہ چشم ساقی" سے بھی تعبیر کیا ہے ؎

نگاہِ چشم ساقی تیز تر بود است　　　ولے با بادہ بعضے حریفاں

یعنی بعض شعرا کے کلام میں نگاہ چشم ساقی کی تاثیر بھی گھلی ہوتی ہے جو تاثیر کو دو بالا کر دیتی ہے اسی کو بعض لوگوں نے اس طرح کہا ہے کہ شاعری چیزے دگر ہست۔ علامہ کا شعر ہے ؎

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم !　　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

تیسری اہم چیز جس میں علامہ نے ارسطو سے اختلاف کیا وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک فن یا شاعری کو اخلاقی اصولوں کا پابند ہونا چاہیئے۔ اس معاملے میں وہ افلاطون سے متفق ہیں۔ وہ غیر پابند ادب کو بے ادبی خیال کرتے ہیں۔ ادب اور اخلاق کی بحث افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے شروع ہوئی ہے لیکن آج تک ختم نہیں ہو سکی ہے۔ اس سلسلے میں اب بھی برابر کے دو گروہ موجود ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ادب کو اخلاق سے بالکل آزاد ہونا چاہیئے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ادب کو بہر حال اخلاقی قدروں کا پابند رہنا چاہیئے۔ مغربی شعرا و نقادوں میں بھی ڈرائیڈن۔ رسکن۔ آرنلڈ۔ ایلیٹ وغیرہ اخلاق کے حامی ہیں اور آسکر وائلڈ۔ کیٹس، کروچے، لان جائنس وغیرہ چاہتے ہیں کہ ادب ہر قسم کی پابندی سے آزاد رہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر فنکار پر کسی قسم کی پابندی لگائی گئی تو اس کے تخیل کی پرواز محدود ہو جائے گی اور وہ انتہائی بلندیوں کو چھونے سے قاصر رہے گا۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ پابندی بہر حال پابندی ہے۔ تخیل کے لئے کچھ نہ کچھ رکاوٹ ضرور پیدا ہوگی لیکن یہ پابندی ہٹا لینے سے معاشرتی اور اخلاقی خرابیاں اس قدر پیدا ہو جائیں گی کہ انسان کو اس آزادی کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ بقول امریکن فلاسفر میکڈوگل کے تہذیب پابندی کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان پابندی کو رخصت کرتا ہے تو اس کو تہذیب و شائستگی کو بھی رخصت کرنا پڑے گا۔ زندگی کا کون سا شعبہ ہے جو پابندی سے آزاد ہے جب زندگی کا دوسرا کوئی شعبہ پابندیوں اور قوانین سے آزاد نہیں تو ادب کو اس قدر اہم شعبہ کیسے آزاد کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ بھی فن کو اخلاقی قدروں۔ تہذیب و شائستگی کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسے ادب سے نفرت کرتے ہیں جو آزادی کا سہارا لے کر فحاشی۔ عریانی اور بے راہ روی پھیلائے ؎

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار　　　ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند　　کرتے ہیں رُوح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

علامہ اقبال افلاطون اور ارسطو کی طرح ادب کی افادیت کے قائل ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کو ایک مہمل سی بات سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادب برائے ادب کا وجود ہی نہیں۔ یہ ایک غلط قسم کی اصطلاح رائج ہو گئی ہے۔ وہ ادب برائے زندگی کے طرفدار ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

فرماتے ہیں کہ میری شاعری انتشار کو دور کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ خالی غزل سرائی سے انھوں نے پناہ مانگی ہے ؎

من اے میرِ امم داد از تو خواہم　　مرا یاراں غزل خوانے شمردند

علامہ نے ارسطو سے ایک اور معاملے میں بھی اختلاف کیا ہے۔ ارسطو ڈرامے اور اداکاری کی بڑی قدر کرتا ہے اور اس کو زندگی کے لئے بہت مفید چیز سمجھتا ہے کیوں کہ ڈرامے سے انسان کو جذبات کے فاضل دباؤ سے نجات مل جاتی ہے۔ لیکن علامہ اقبال اپنے فلسفۂ خودی کی وجہ سے تمثیل سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اس چیز کو انسانی خودی کے خلاف خیال کرتے ہیں کہ آدمی اپنی شخصیت کو ختم کر کے دوسرے کی شخصیت کو اختیار کرے یہی وجہ ہے وہ صوفیہ کے عام تصورِ فنا کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے یہاں فنا کے معنی اپنی ذات کو معدوم کر دینے کے نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قطرہ دریا میں مل کر فنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی خودی کو وسعت دیتا ہے وہ اس تشبیہ سے زیادہ ستاروں اور سورج کی تشبیہ کو پسند کرتے ہیں جہاں ستارے فنا نہیں ہوتے صرف ان کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے ؎

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے　　رہا نہ تو تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

علامہ شاعر کو تلمیذ الرحمٰن سمجھتے ہیں لیکن فکر و کاوش کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ حالی سے انہیں اس بات پر اتفاق ہے کہ شاعری فطری ضرور ہے لیکن اس کو انتہائی بلندیوں تک لے جانے کے لئے کسبِ کمال کی بھی ضرورت ہے۔ شاعر کو شعر لکھ کر اس پر نظرِ ثانی ضرور کرنی چاہیے۔ علامہ اس کے قائل نہیں کہ شعر جس صورت میں نازل ہوا ان کو اسی صورت میں رہنے دیا جائے اور حک و اصلاح نہ کی جائے۔

بعض لوگوں کو علامہ سے شکایت ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں جلالی کیفیت کا بہت زیادہ اظہار کیا ہے۔ جمالی کیفیات کا اظہار بہت کم ہے اس وجہ سے کلام میں سنجیدگی کی گرانباری کی وجہ سے کچھ خشونت پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ کے جذبات و احساسات میں نسائیت نہیں ہے۔ وہ جلال کے زیادہ دلدادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ الزام صحیح نہیں کہ جمال کا اس قدر فقدان ہے کہ توازن باقی نہ رہے۔ بلکہ انھوں نے شعوری طور پر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور انہیں برابر اس بات کا احساس رہا ہے کہ ان کے کلام میں جلالی مظاہر کے عناصر زیادہ پیدا ہو رہے ہیں۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ کچھ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے اور کچھ اپنے مزاج کی ساخت کے لحاظ سے علامہ کو مردانگی۔ صلابت سنجیدگی اور رجال سپاری ہی زیادہ پسند ہے۔ لیکن وہ اعلانِ جنگ کے بعد نوائے چنگ کا ذکر بھی ضرور کرتے ہیں۔ علامہ کے یہاں جلال و جمال کا فرق بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کو دیکھ کر آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ کا خیال ہے کہ زندگی میں جلال و جمال دونوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کہیں باطل کے فلک بوس قلعوں کو مسمار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو کہیں نئے خوبصورت محلات کی تعمیر کی کہیں فولاد کی مانند سخت ہونا پڑتا ہے اور کہیں حریر و پرنیاں کی طرح نرم۔ کبھی زندگی آسودگی میں مسرتوں مشغلے میں گزاری جاتی ہے کبھی جان دیدینا ہی زندگی کا تقاضا قرار پاتا ہے ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

بالِ جبریل میں جمالی کیفیات کا مظاہرہ کیا ہے اور ضربِ کلیم میں جلالی کیفیات کا۔ بالِ جبریل میں تغزل کا رنگ غالب ہے اور ضربِ کلیم

میں فلسفہ وحکمت کا۔ بالِ جبریل میں پرواز تخیل ہے اور ضربِ کلیم میں دلائل وبراہین کی ضربیں ہیں جن سے باطل شکنی کا کام لیا گیا ہے بالِ جبریل بزم کی اور ضربِ کلیم رزم کی کتاب ہے۔ بالِ جبریل میں علامہ کا موڈ ہلکا پھلکا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جا بجا خدا سے بھی شوخیاں کی گئی ہیں اور ان کا رنگ خاصا شوخ ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے (معاذ اللہ)

بالِ جبریل میں نغمہ و آہنگ کے بھی وہ کیف آور اشعار ہیں جو دوسری جگہ نظر نہیں آتے ؎

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو — پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ھو

یا ؎ پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — پھر مجھے نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

یہ نغمہ و آہنگ بانگِ درا میں کہیں کہیں نظر آتا ہے مگر وہ پختگی اور بلند آہنگی نہیں۔

علامہ عشق مجازی کے مردِ میدان نہیں تھے۔ جو کچھ کہا ہے حقیقت کے رنگ میں ہی کہا ہے۔ ترجمانِ حقیقت کسی نے موزوں خطاب دیا ہے حسن کے متعلق عموماً دو نظریات پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ حسن ناظر کی نگاہ میں ہوتا ہے منظور میں نہیں۔ اگر ناظر نہ ہو تو رعنائی کسی کام کی نہیں —۔ قدرداں کا التفات دیکھ کر حسن میں رعنائی اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ حسن پژمردہ اور بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ حسرت کہتے ہیں ؎

کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا — حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا

اسی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو صوفیوں میں بہت مقبول ہے "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق" یعنی میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا میری خواہش ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں اس لئے میں نے خلق کو پیدا کیا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حسن دراصل شاہد میں نہیں بلکہ مشہود میں ہوتا ہے اور وہ شاہد کے حسنِ نظر سے بالکل بے نیاز ہے۔ تیسرے گروہ نے یہ درمیان کا راستہ نکالا ہے۔ کہ حسن بذاتہٖ موجود ہے اور ایک مستقل ذاتی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی تخلیق یا وجود کے لئے ناظر کا محتاج نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس میں جلا ناظر کی نگاہِ شوق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ ناظر و منظور لازم و ملزوم قسم کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ اصل شے "طلب" ہے، اور اسی "طلب" کے سبب مطلوب میں حسن اور کشش پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً جب آدمی کھانا کھا کر سیر ہو جاتا ہے، تو کھانے میں اس کے لئے کوئی لذت باقی نہیں رہتی کہ سیراب ہونے کے بعد، طلب کا حسن اور اس کی کشش باقی نہیں رہی۔

فانی بدایونی فرماتے ہیں : ؎

بے ذوقِ طلب بزمِ تماشا نہ رہے گی
چھیڑا مجھے دنیا نے تو دنیا نہ رہے گی

اسی دور کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

جلوے بھی ہیں محتاج مرے ذوقِ نظر کے
جو کچھ ہے مری آنکھ ہے نظارے میں کیا ہے (ماہر القادری)

علامہ اقبال بھی غالب کے "حسنِ طلب" کی اہمیت کے قائل ہیں۔

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے — نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

یہ تو وہ مانتے ہیں کہ گل ولالہ میں پہلے ہی سے حسن وجمال موجود تھا، مگر شاعرِ رنگین نوا کی نگاہ نے گل ولالہ کو حسین تر بنادیا۔

جس بندے نے خدا سے شکوہ کیا ہو: ؎

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

وہ ذاتِ باری سے اس "خطاب" کی بھی جرأت کرسکتا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے اذنِ سفر دیا تھا کیوں　　کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

علامہ اقبال اس عالم میں پھر اس حد تک پہونچ جاتے ہیں ؎

ما ازخدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است

اور یہ وہ نکتہ ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے!

۔۔۔ محمود منظور الحسن ۹۸/۸۸ پریم نگر۔ کانپور

4, RUE DE TOURNON
PARIS VI

ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی کا مکتوب مدیر "فاران" کے نام

پاریس
۱۷ صفر ۱۳۸۲ھ

مکرمی جناب اڈیٹر صاحب فاران

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ؛

آج قطر (مشرقی عرب) سے ایک دوست نے فاران (جولائی ۱۹۶۲ء کے) اوراق (۵۱) تا (۵۳) بھیجے ہیں۔
اگر آپکے اصول کے مغائر نہ ہو تو اِس خط یا اس کے اقتباس کو اپنے ناظرین تک بھی پہنچادیں۔ ممنون ہونگا۔

(۱) رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی" کا پہلا اڈیشن میرے علم واجازت سے شائع ہوا تھا اگرچہ اس میں طباعت کی بھی اور تالیف کی بھی کافی غلطیاں رہ گئی ہیں اور ناشر سے میں نے وعدہ بھی لیا تھا کہ طبع ثانی مجھے بتائے بغیر نہ کریں) اس کے بعد سے میں بے خبر ہوں۔ آپ تیسرے اڈیشن کا ذکر کر رہے ہیں، میں دوسرے سے بھی واقف نہیں۔

(۲) آپنے (صفحہ ۵۳) پر جو تنقید فرمائی ہے (وحدت ادیان کے متعلق) وہ عمداً تو قطعاً نہیں، سہواً واتفاقاً نامکمل اقتباس دینے کے باعث غلط فہمی وغلط فہمائی کا باعث ہوگئی ہے، تیسرا اڈیشن تو میرے سامنے نہیں کتاب کے پہلے اڈیشن میں آپ کی نقل کردہ عبارت "۔۔۔ بنیادی امور پر عمل کریں" کے بعد ہی یہ الفاظ ہیں۔ " یعنی خدا اور رسول کو ماننا " اور اس پر ایک حاشیہ بھی ہے کہ فلاں آیت کے تحت محض خدا پر ایمان کافی نہیں، رسول پر بھی ایمان ضروری ہے" پھر چند سطر ونکے بعد اس مفہوم کو مزید یوں واضح کیا گیا ہے "چونکہ بلا استثناء ہر جگہ اور ہر مذہب وملت میں ایک آخری تسکین دہندے کی بشارت وپیشگوئی موجود ہے" اس لئے اپنے مذہب کی تعمیل میں اس کی اطاعت بھی آجاتی ہے۔ ویسے بھی نجات کے اس طریقے سے استدلال کے لئے نبی عربی کو گواہی میں پیش کرنا نہیں کے لئے ضروری ہوگا۔"

جب تک یہ سارا پیرا گراف نہ پڑھیں' مولف کا مفہوم اور مافی الضمیر پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے گا۔

میں نے دو چیزیں بیان کی ہیں:۔ (۱) صرف خدا پر ایمان کافی نہیں۔ رسول پر بھی ایمان ضروری ہے۔ (۲) ہر الہامی مذہب کے پیرو اپنے دین پر پوری طرح عمل کریں تو نجات ضرور حاصل ہوگی، کیوں کہ ان کے دین میں خاتم النبیینؐ کی بشارت اور اس کی آمد پر اس کی اطاعت کا صریح حکم بھی موجود ہے۔

اور میں اس بیان پر قائم ہوں۔ اس بیان میں کوئی غلطی یا گمراہی ہے تو بیان فرمائی جائے۔ غور کروں گا۔ انشاء اللہ اپنی غلطی کے اعتراف میں کوتاہی نہ کروں گا۔

مخلص: محمد حمید اللہ صدیقی

کرر:۔ میں اگست میں سفر پر رہوں گا
انشاء اللہ ستمبر میں پاریس واپس آؤں گا۔

--x--

محمد عبداللہ خان لدھیانوی
(بی۔اے)

جدید نظریہ ارتقاء کا تحقیقی جائزہ

دورِ حاضر کی تجربہ پسندیوں کا شمار مشکل ہے۔ لیکن علمی میدان میں وہ مفروضے جنھیں تصور۔ نظریہ یا قانون کے نام سے پیش کیا جارہا ہے اور لوگ ان کی صحت کو بلا تحقیق تسلیم کر رہے ہیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے۔ وہ بالکل بے اساس ثابت ہونگے۔ اس وقت ہماری ذہنی پستی اور تنزل کے اسباب خود اس امر کا پتہ دیتے ہیں۔ کہ مادی تہذیب کے نظریات کو خواہ مخواہ خدائی لازوال اصولوں کے ساتھ ملحق کیا جارہا ہے۔

اس قسم کے نظریات جنہیں حقیقت کا نام دے کر دنیا میں پیش کیا جارہا ہے۔ ان کی تہہ میں جو جذبہ کارفرما ہے۔ اسے معلوم کر لینا اہلِ ایمان کے نزدیک کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ مختلف نظریات الحاد میں سے پہلے میں نظریۂ ارتقاء کی مہملیت کا اظہار کروں گا۔ تاکہ قارئین اس نظریہ کی بنیاد سے بخوبی واقف ہوجائیں۔ اور یہ جان لیں کہ اس نظریہ کے پسِ پشت کونسا جذبہ کارفرما ہے۔

مسئلہ ارتقاء کے حامی اس مسئلہ کے ابتدائی تصورات کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بعض مسلمان مفکرین کا نام بھی اس زمرہ میں داخل کر دیتے ہیں، جو مغربی مفکرین پر مشتمل ہے۔ اس سلسلہ میں وہ مسلمان مفکرین میں سے ابنِ طفیل۔ ابنِ باجہ۔ ابو نصر فارابی۔ ابنِ مسکویہ اور مولانا روم کو بھی اس مسئلہ کے ماننے والوں میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی مفکرین و فلاسفہ درصل حیاتیاتی ارتقاء کے قائل ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمان مفکرین نے انسانی استعداد کے بروئے کار آنے اور ان ذہنی اور جذباتی حالات کا شعور حاصل کرکے اس کے مختلف مدارج کی نشان دہی کی ہے۔

اس بنیادی فرق کے پیش نظر دونوں گروہوں کو متحد الخیال نہیں کہا جاسکتا، اسی خلط مبحث کو دور کرنے کیلئے ہم اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ حقیقت واضح ہوکر سامنے آجائے۔ اور التباس باقی نہ رہے۔

مغربی مفکرین میں لیمارک۔ ڈاروِن اور ڈی ورائز کے نظریات زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن ان سب میں جو شہرت ڈاروِن کے نظریئے کو حاصل ہے۔ وہ کسی اور کو نہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس نے مختلف جانوروں اور مختلف انواع کے باہمی ربط و اختلاف کی بنا پر یہ تصور پیش کیا۔ کہ ہر ذی حیات ترقی کی جانب مائل ہے۔ ایک نوع ارتقائی منازل طے کرکے دوسری نوع میں منتقل ہوجاتی ہے۔ اس مسئلہ کا اساسی تصور یہ ہے کہ ابتداء ایک چھوٹے ذرے سے ہوتی ہے۔ جو مختلف شکلیں تبدیل کرکے حیوانی اقلیم میں برزخ کے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں سے اس نے دوسرا قدم حیوانی اقلیم کی طرف بڑھایا۔ اس ساری داستانِ حیات کا مطالعہ کرنے کے بعد انسانی "روح" کے تصور کا ذکر کہیں نہیں پاتا۔

اس مسئلہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے۔ جو حیاتیاتی (BIOLOGICAL) پہلو ہے دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ اس نظریہ سے اخذ شدہ دلائل کیوں کر فکرِ انسانی پر مؤثر ہیں۔ اس سے کیسے کیسے نتائج اخذ کئے گئے اور انہیں کس طرح فکرِ انسانی پر مؤثر ہونے کا موقعہ ملا۔ سب سے اول اس کے حیاتیاتی پہلو کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کائنات کا وجود اور مختلف انواع میں کش مکشِ حیات کی داستانی کا مبہم پہلو، بقولِ قائلینِ ارتقاء یہ ہے کہ ابتدائی خلیات پر

کروڑوں سال کش مکشِ بقا و ارتقا کے گزرے ہیں۔ جو اس کے بعد دفعتاً توالد و تناسل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان کے ساتھ ہی موت کی تخلیق اس فکر کو بالکل ہی باطل کر دیتی ہے۔ کہ اس مقام پر نظریۂ ارتقا کی کیا توجیہہ ہو سکے گی۔ انسانی ذرائع معلومات، اس کے حواسِ خمسہ اور اس کی عقل پر مشتمل ہیں۔ لیکن ان کے بے عیب اور محیط ہونے کا کوئی ثبوت انسان اپنے ذاتی مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر پیش نہیں کر سکتا۔ ہمارے حواس محدود، ہمارے آلات نامکمل اور ہماری کوششیں لاحاصل ہیں۔ اس صورت میں یہ امر تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ کہ حقیقت کے متعلق ہمارے تمام نظریات اضافی ہیں۔ کیوں کہ کائنات کا تصور ہماری فہم سے بہت بلند ہے۔

بقول مادئین یہ کرۂ ارض جو کہ کروڑوں سالوں سے قائم ہے۔ جس پر ارتقاء کا ڈرامہ ہر آن پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے متعلق جو نہایت اہم بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حیات شروع کیسے ہو گئی؟ اب چونکہ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے۔ کہ یہ دنیا ایک حیاتیاتی حادثہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس لئے کسی THEORY کے ذریعے بھی یہ بات دریافت نہ کی جا سکی۔

ابتدائی پروٹوپلازمک خلیوں کی اولین شکل سے موجودہ ارتقائی حالت تک میں جو ایک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جو اس امر کی واضح دلیل ہے۔ کہ عملِ ارتقاء کے اثرات ان پر بالکل نہ ہو سکے۔ قائلینِ نظریہ ارتقاء کا یہ دعویٰ ہے کہ زندگی سادہ حالت میں تھی۔ جو (VIRTEBRA) سے شروع ہو کر انسان کے سیدھے کھڑے ہونے تک کے مختلف مدارج طے کرتی رہی ہے۔ اور اسی کو ترقی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایک قدرتی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا یہ عمل خاص زمانہ سے متعلق تھا۔ یا اب بھی جاری و ساری ہے؟ اب جبکہ زمان و مکان کی تسخیر کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ انسان کے لئے اونچے سے اونچے اور نیچے سے نیچے مقام پر پہنچنا مشکل نہیں رہا۔ کسی نے بھی کسی ایسے جانور کا پتہ نہ دیا جو کہ عبوری دور میں ہو یعنی ایک نوع سے دوسری نوع میں منتقل ہو رہا ہو۔ اس پہلو کی وضاحت خود ذرہ ذرہ کا وجود کر رہا ہے۔ جو ببانگِ دہل یہ پکار رہا ہے کہ الآن کما کان یعنی روزِ آفرینش سے اس وقت تک اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یعنی یہ معلوم کرنا کہ فکرِ انسانی پر اس نظریہ کا کیا اثر ہوا؟ بہت عمیق مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہماری زندگی اور اس کے بسر کرنے کی شاہراہیں متعین ہیں جن کے ترک کرنے یا اس کے متبادل کوئی طریقہ اختراع کرنے پر انسان قادر نہیں۔ لیکن جب انسانی تخیلات کسی قسم کے فاسد افکار سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ تو وہ ایسی بے راہ روی کو جنم دیتے ہیں۔ کہ اس سیلابِ عظیم کے سامنے متاثرہ اذہان خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ اور وہ قوتِ مزاحمت اور جذبۂ تجسس سے سراسر عاری ہو جاتے ہیں۔ اس تصور نے سب سے بڑا حملہ اس قدیم اور سچے عقیدہ پر کیا جو اس حقیقت پر قائم تھا یہ کہ انسان خود بخود پیدا نہیں ہو گیا اور یہ کائنات کسی خالق کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آ گئی۔ بلکہ انسان کی آفرینش و وجود کا تعلق اپنے خالق سے ہے۔ وہ مخلوق ہے۔ ہر شے اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے۔ ڈاروِن کے اس نظریہ اور تعلیم نے اس تصور کو جنم دیا کہ یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جس کا ہر فرد اپنی بقاء کے لئے ہم نوع سے ہر آن مصروفِ پیکار ہے۔ ڈاروِن کا نظریہ "بقائے اصلح" اسی تصور کی صدائے بازگشت ہے۔ کہ زندہ رہنے کے لئے پیکار ایک جزو لازمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک زندہ وہی رہ سکتا ہے۔ جو اپنی قوت سے زندہ رہنے کی صلاحیت کا ثبوت مہیا کر سکے۔ اس تمام حکایت سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کوئی ناظمِ ہستی نہیں بلکہ اس نظام میں قوت ہی ایک عنصر ہے جس سے زندگی قائم رہ سکتی ہے۔ کمزور کو اس نظریہ کے مطابق زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، جس معاشرہ اور سوسائٹی میں اس نظریہ کو بطور حقیقت تسلیم کر لیا ہو۔ وہاں یقینی طور پر رحم و کرم۔ جود و سخاوت اور ایثار و محبت کے تمام مسلمہ جذبات ظلم و ستم۔ ریا اور خود غرضی اور خود پروری میں مبدل ہو جائیں گے۔

پھر اس نظریہ نے یورپ میں انسانی نسل کی اونچ نیچ کا مسئلہ پیدا کیا۔ اس خیال کی تائید میں کہ نسلِ انسانی کی برتری اور کمتری کے جذبات پیدا کرنے کا ذمہ دار یہی نظریہ ہے۔ اگر چند مثالیں پیش کر دی جائیں تو بے جا نہ ہوگا۔ فرانسس۔جی۔کروک شاینک نے ایک کتاب "THE MONGOL IN OUT MIDEST" ۱۹۲۵ء میں شائع کی اس کتاب کو امریکہ اور انگلستان میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی آخری جلد ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں نسلِ انسانی کے متعلق مصنف لکھتا ہے :۔

"دنیا میں بنی نوع انسان تین نسلوں پر مشتمل ہے۔ سفید فام۔ مشرقی اور حبشی ان اقوام کا شجرۂ نسب وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔ کہ سفید فام۔ اقوام کا مورثِ اعلیٰ چیمپنزی قسم کا بن مانس ہے۔ اس سے کم درجہ کا مورثِ اعلیٰ مشرقی اقوام والا بن مانس ہے۔ اور سیاہ فام کا مورث گوریلا کو قرار دیتا ہے"۔

بعض محققین نے انسان کے دماغ کی مختلف جدولیں شائع کیں۔ کہ وہ شاید دماغ کی ساخت میں کچھ تفاوت...... معلوم کر کے ان کے بعض کی نسبت یہ فتویٰ صادر کر سکیں کہ وہ ابھی عبوری دور میں ہیں۔ اور اپنی اصل منزل تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن اس کوشش میں بھی کوئی کامیابی نہیں ہو سکی۔ بہرحال نسلِ انسانی کی کمتری اور برتری کا تخیل زیادہ تر اسی مسئلہ کی پیداوار ہے۔ بالفرض محال اگر موالیدِ ثلاثہ کے ہر فرد میں بمقابلہ دوسرے کے کچھ کمی یا زیادتی پائی بھی جائے تو اس کو اس فیصلہ کی بنیاد کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہ فلاں اعلیٰ ہے اور فلاں ادنیٰ۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ انسان تو اپنی ضروریات کی اشیا کے حصول میں محنت و مشقت کرتا ہے۔ اور کسی چیز کی قیمت اس کی قلت و کثرت کے اعتبار سے مقرر کرتا ہے۔ جہاں پتھر کی ضرورت ہے۔ وہاں سونا بیکار ہے۔ جہاں مٹی کی ضرورت ہے۔ وہاں زعفران سے کام نہیں چل سکتا۔ غرضیکہ ہمارے اعلیٰ و ادنیٰ کے معیار کسی شے کے عدمِ افادیت کے پہلو کو پیش نہیں کر سکتے۔

ان مثالوں سے یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ نظریہ ارتقاء کا مختلف جنسوں کے باہمی اختلافات میں کوئی دخل نہیں۔ بلکہ یہ اسی کارسازِ کریم کی حکمت ہے جس کی حکمت اور کاریگری کو دیکھ کر انسانی فطرت بے اختیار پکار اٹھتی ہے :۔

مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ؕ

مسئلہ ارتقاء کا مذہب پر اثر!

یوں تو مسئلہ ارتقا کو فکر کی بنیاد قرار دے کر ہر شعبہ علم و خیال پر اس کو حاوی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن مذہب کے متعلق اس نے جس قسم کے مباحث کو جنم دیا ہے۔ وہ حد درجہ حیران کن ہیں۔ قانون۔ فلسفہ۔ نفسیات۔ معاشرت، معیشت اور عمرانیات وغیرہ میں جس طرح ارتقائی عمل تسلیم کر لینے کے بعد ان میں سے کسی ایک کے بھی ابتدائی خد و خال پوری طرح قائم نہیں رہ سکے اسی طرح مذہب میں ارتقائی عمل تسلیم کرنے کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ مذہب کی روح کو مجروح کر دیا جائے۔ در اصل عیسائیت کے خلاف انیسویں صدی کے رجحانات اور تحریکِ اصلاح کے ذریعے انجیل کے عقیدہ خالق و تخلیق کی نفی کرنے کی یہ ایک سعی تھی جس کے ذریعے انسانوں کو مذہب سے دور لے جانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مذہب کی ابتداء کیسے ہوئی ؟ یہ سوال جب قائلینِ نظریہ ارتقا کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے مذہب کی بنیاد جذبۂ خوف کو قرار دیا۔ یعنی ان کو مذہب کی ابتدائی حالت کا اندازہ ایسے ظن و تخمین سے کرنا پڑا جس کی تہ میں بجز خوف اور کوئی جذبہ کارگر نظر نہ آئے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ انسان جب غاروں میں رہتا تھا تو وہ فطرت کی

کڑک، بجلی اور مختلف بیماریوں سے خوف زدہ تھا۔ اور ان کو معبود کی حیثیت دے دی۔ انہی کے سامنے نذریں، نیازیں دیتے کرتے گئے حضور قربانیاں پیش کر کے اپنی تکالیف کا ازالہ کرتا رہا ہے۔ یہ تصور ترقی کرتے کرتے "خدائے واحد" کے وجود کے عقیدہ تک پہنچا۔ یہ تمام قیاس آرائی ایک افسانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی علمی شہادت پیش نہیں کی گئی۔ حالانکہ اس کے برخلاف "ایک خدا" کے عقیدے کا ریکارڈ منضبط اور تحریری ضابطہ یعنی صحفِ اولیٰ میں موجود ہے جس کی صحت اس عقیدہ کے متعلق قطعی طور پر ناقابلِ انکار ہے، اور بلا تامل اس کی صحت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

جذبہ خوف جسے علمائے ارتقا نے اساسِ مذہب قرار دیا ہے۔ اس کی مہملیت تو صاف نمایاں ہے۔ تاہم اس جذبہ کے محرکات کا بیان کئے بغیر بحث مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ جذبہ دراصل مشرکانہ ذہنیت کی پیداوار ہے۔ جب کچھ لوگوں نے خواہشاتِ نفسانی کی راہ میں اپنے سامنے کچھ حدود و قیود کو دیکھا۔ تو انھوں نے نفس کے تقاضوں سے دب کر اصل حقیقت سے گریز کیا۔ انسان کی سرکشی اس کو کب اس بات کی اجازت دیتی تھی۔ کہ وہ اپنے آپ کو ان دیکھی ذات کے سامنے جواب دہ سمجھتا۔ اس لئے خدا سے قطعی تعلق توڑ لیا اور خود خدائی کا دعویدار بن بیٹھا۔

انسانی جذبات مشکلات میں چونکہ اپنی تسکین ڈھونڈتے ہیں۔ آدمی نے اپنی ضروریات کے لئے مختلف صنم تلاش لئے۔ ہر چیز کی ابتدائی صورت معلوم کرتے وقت یہ کیوں نہ قرار دیا گیا کہ یہ مسئلہ توحید کی ہی مسخ شدہ صورت ہے۔ ارتقاء کے ساتھ ارتقاءِ معکوس کا تصور بھی موجود ہے۔ جس کی دلیل قانونِ فطرت میں ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ ہر شے پیدا ہوتی ہے۔ جوان ہوتی ہے۔ اور زوال پذیر ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ تو ہر شے تخریب والعدام کے قانون کے تحت اپنے مختلف مدارج طے کرتی ہے۔ یہ امر خلافِ مفروض ہے۔ کہ ارتقاء میں اس کے ارتقاءِ معکوس کو نظر انداز کر دیا جائے۔

خوف ایک فطری جذبہ ہے۔ جس کی ضرورت بہر حال مسلّم ہے۔ لیکن خوف سے مراد قنوطیت و ہراسانی کا مظاہرہ مطلوب نہیں۔ بلکہ احساسِ زیاں ہے چاہے کسی شے اور کسی امر کے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ یہ صرف امید ہی ہے۔ جو انسان کو پابندِ عمل کرتی ہے۔ مقصدیت کے لئے منفی پہلو سے اجتناب ہی دراصل جذبۂ خوف ہے۔ جذبات ہی محرکاتِ عمل ہیں۔ جذبات کی تفصیل خود ایک علیحدہ کتاب کی مقتضی ہے تاہم مختصراً فطرتِ انسانی کے سمجھنے کی کوشش اگر کی جائے۔ تو نفسی حالات کا بیان اور اس کی تشریح بقدرِ طاقت ضروری ہے۔

مشرقی علماء میں سے جن حضرات کو اس مسئلہ کا معتقد یا موید قرار دیا گیا ہے۔ ان کے نظریات رسائل اخوان الصفا، چہار مقالہ، فوز الاصغر اور مثنوی مولانا روم سے اخذ کئے گئے ہیں۔ چہار مقالہ میں ارتقاء کا مسئلہ بیان کرنے میں معدنیات سے ابتدا کی گئی ہے۔ معدنیات کے مختلف افراد ارتقاء کے منازل طے کرتے کرتے جب نباتات کی اقلیم میں داخل ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ تو ان کے لئے کچھ عرصہ برزخ میں رہنا پڑتا ہے۔ اسی طرح نباتات کا معاملہ ہے۔ لیکن حیوانات کے ارتقاء کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صاحب موصوف جمادات اور نباتات کا وسط مرجان (مونگا) کو قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ مرجان جمادات کا ایک فرد ہے۔ لیکن اس کی نشو و نما نباتات کی ظاہری صورتیں اور باطنی استعداد رکھتی ہے۔ گویا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے تو جمادی ہے۔ لیکن باعتبار ہیئت اور نشو و نما ارتقاءِ نباتات میں داخل ہے۔ اسی طرح نباتات میں سے کھجور کو ارتقاءِ نباتات کا برزخ قرار دیا گیا ہے۔ کھجور کا اگر سر کاٹ دیا جائے۔ تو وہ برخلاف دیگر نباتات کے دوبارہ سرسبز نہیں ہو سکتا۔

امام ابن مسکویہ نے اپنی تحقیق میں کسی قسم کے کسی ارتقاء کا ذکر نہیں کیا۔ محض نفسِ انسانی کے ترقی کرنے کی مثالیں ضرور دی ہیں مولانا رومؒ اپنی مثنوی میں مدارجِ حیات کے قانون کے ضمن میں فرماتے ہیں۔ کہ :-

آمدہ اول بہ اقلیم جماد   از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد   وز جمادی یاد ناورد از نبرد
از نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد   نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
ہمچوں میلِ کودکاں با مادراں   سرِّ میلِ خود نہ داند در تہاں

یا دوسرے مقام پر مولانا فرماتے ہیں :-

از جمادی مردم و نامی شدم   وز نما مردم بہ حیواں سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم   پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم
حملۂ دیگر بہ میرم از بشر   پس برآرم از ملائک بال و پر
بازِ دیگر از ملک پراں شوم   آنچہ اندر وہم ناید آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں   گویدم کانا الیہ راجعون

یہ اشعار موجودہ نظریۂ ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں رکھتے - مولانا رومؒ کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کے اندر جمادی نباتی حیوانی انسانی اور ملکوتی صفات بالقوۃ موجود ہیں - ان قوتوں میں تفاوتِ مراتب ضرور موجود ہے - انسان کی رفتارِ حیات اور اس کا داعیۂ عمل ادنیٰ عوامل کو اعلیٰ عوامل کے ماتحت کرتا جاتا ہے - ڈارون کی حسّی توجیہ کا اس روحانی نشو و ارتقاء سے دور کا بھی تعلق نہیں - روح کا تعلق در اصل حظیرۂ قدس سے ہے - جو مولانا رومؒ کے آخری دو شعروں میں بیان کیا گیا ہے - اس لطافتِ بیان سے ہم کسی طرح بھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے - کہ یہ لفظ ارتقاء کی شہرت یافتہ تعریف سے کوئی تعلق رکھتا ہے - اگر لفظِ ارتقاء کے لغوی معنے اختیار کئے جائیں - اور اس کے اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کیا جائے - تو یہ بات قابلِ تسلیم ہوگی - کہ پرانے زمانے کے آدمی سے موجودہ زمانے کے انسان نے صنعتی ترقی بہت زیادہ کی ہے - صنعتی ترقی کا مدار ایجاد و اختراع پر ہے - جس کا سرچشمہ عقلِ انسانی ہے - لیکن عقلِ انسانی کے حدود اس قدر وسیع نہیں کہ وہ حواس کی ہمہ گیری کا دعویٰ کر سکے - جو اس کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں - نہ حواس غیر محدود ہیں - نہ عقل اس لئے ہم یہ سمجھنے سے عاری ہیں - کہ ہمارے یہ دونوں قسم کے عوامل حضور سے غیاب کی طرف ہمیں لے جا سکتے ہیں -

پرانے زمانہ کے آدمی (بالفاظِ علماءِ حاضر) نے اپنی تمام تر توجہ روحانی اور اخلاقی ترقی کی طرف مبذول کی تھی - وہ برگزیدہ انسان شرف و مجد کے اس مقام پر پہنچے تھے - کہ ان کے مثالی کردار بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے بہ منزلہ روشنی کے مینار کے تھے - ہر دل میں اس کی تڑپ تھی کہ کسی طرح وہ بھی اسی کیفیت سے واقف ہو جائے - جو اس کردار کی تخلیق کے محرک ہوں - اس کی بیّن مثال یہ ہے کہ جب ہم صالحین کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں - تو معًا ہم اسی دور کے اعادہ کی تمنا کرتے ہیں -

علماءِ یونان میں سے حکیم دیو جانس کلبی کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے جا رہا تھا - تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ انسان! اس واقعہ کو مولانا رومؒ یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
از ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

اس تمنا کا اظہار دیگر مفکر شعراء نے بھی کیا ہے۔ حافظ فرماتے ہیں :-

آدم خاکی دریں عالم نمی آید بدست
عالمِ دیگر بباید ساخت از نو عالمے

ہمارے دور کے مفکر اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ مرحوم نے ایسے ہی آدمی کی جستجو اور تلاش کے لئے اپنے ہم عصر اہلِ دل کو مشورہ دیا ہے کہ ؎

قدم در جستجوئے آدمی زن
خدا ہم در تلاشِ آدمی ہست

بعض مسائل ایسے ہیں کہ جب تک اُن کا پس منظر معلوم نہ ہو۔ انسان الفاظ کے تشابہ کی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مسئلہ ارتقاء کا سب سے بڑا حملہ تخلیق کائنات کے اس مسئلہ پر تھا جہاں خالقِ کائنات کے وجود کے شواہد میں تخلیقِ کائنات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ استیلا اور غضب جس کی تحریک جذباتِ سفلی ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ اس کی ایفاء کے لئے اس خالقِ اکبر کا تصور یا عقیدہ مزاحم ہوتا ہے اس عقیدے کا انکار کئے بغیر انسان اخلاقی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ دراصل کائنات کے حدوث کے عقیدے پر ضرب لگانے کے لئے قدامت کے خیالِ فاسد کی تائید میں یہ نظریہ ایجاد کیا گیا ہے۔

اس نظریہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تخلیقِ انسانی میں اونچ نیچ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم منوجی کے ذات پات کے مسئلے پر جب غور کرتے ہیں۔ تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہ وہ محض ایک ایسے نظام کو چلانے کی کوشش تھی۔ کہ جس میں تقسیم کار ملحوظ رکھی گئی تھی۔ ورنہ تخلیقی اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ افسوس ہے کہ بعد میں آنے والوں نے معاشرہ انسانی کی تفریق ذات اور اعلیٰ و ادنیٰ پیشوں کے اعتبار سے کر ڈالی۔ لیکن یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اہلِ مغرب میں بھی نسلی امتیاز قائم کیا جاتا ہے اور یہ تمام غیر مساواتی تخیل اسی نظریۂ ارتقاء کی صدائے بازگشت ہے۔ مثال کے طور پر اہلِ جرمن کو لے لیجئے۔ وہ آرین نسل ہونے کے مدعی ہیں۔ ان کے ملک جرمنی میں اسرائیلیوں کی کافی تعداد موجود تھی (جن کا اب اخراج ہو چکا ہے) اسرائیلی چونکہ سامی الاصل تھے اس لئے جرمنوں کی نفرت و عداوت ان سے اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ کہ مارٹن لوتھر نے جو عیسائیت کی نشاۃ الثانیہ کا میر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس امر کی اشاعت جرمن قوم میں کی کہ وہ اسرائیلیوں کو اپنی سرزمین سے بیک بینی و دو گوش نکال دے۔ چنانچہ وہ اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے :-

"یہودیوں کا مسئلہ بالکل سادہ ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ انہیں سرزمین جرمنی سے نکال دو۔ ان کے لئے ملک کی تمام سڑکیں کھلی پڑی ہیں۔ ان کا وجود پلیگ۔ وبا اور بدقسمتی کا مجموعہ ہے۔ محنت اور مشقت کے کام ان کے سپرد کر دو۔ تاکہ وہ پوری جسمانی قوت سے مشقت کے آلات استعمال کر کے اپنی قوت لایموت حاصل کر سکیں"۔

لوتھر کا یہ خواب ہٹلر کے ہاتھوں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ جرمن اہلِ حکم نے اپنی برتری نسل کی بنا پر اپنی فوج پر یہ ظاہر کیا کہ جرمن دنیا کی حکومت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس تفوق کو حاصل کرنے کے لئے دو عالمگیر جنگیں اسی قوم نے لڑیں۔

پروفیسر ہانس ایف۔ کے گنتھر کی شخصیت نازی تحریک میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ جرمن قوم میں یہ صاحب نسلی معاملات کے متعلق جو فتوے صادر فرمادیں، اُسی کو سند مانا جاتا تھا۔ یہ شخص جرمن نسل کی بہتری اور دوسری اقوام کی کہتری کا قائل تھا۔ اس کے

استدلال کی بنا گمراہی ماحول تھا۔ حقیقت اور واقعات اس کے لئے بے معنی تھے۔ یہ نسلی کہتری اور مہتری کے درمیان فرق و امتیاز کی بہترین مثال ہوگی۔ کہ اس قانون پر غور کیا جائے۔ جو جرمنی میں تجویز ہوا۔ جس میں عصمت فروش عورتوں کے معاملے میں بھی قومی برتری کا اصول قائم کیا گیا۔ حکم یہ دیا گیا۔ کہ "یہودی مرد یا عورت کسی جرمن مرد اور عورت سے متمتع نہیں ہو سکتے اور اگر اس حکم کی خلاف ورزی کی جائے۔ تو مرد و زن قابلِ مواخذۂ قانون ہونگے۔ لیکن تنفیذ تعزیر میں یہودی مرد و زن ہی مستوجب سزا ہونگے۔")

اس کتاب میں اسی ضمن میں ایک اور واقعہ لکھا گیا ہے کہ :۔

"ایک یہودی کو اس بنا پر سزا دی گئی۔ کہ اس نے جرمن لڑکی کی خواہش پر اس کا بوسہ لے کر ارتکابِ جرم کیا ہے۔ سزا دیتے ہوئے فاضل جج نے لکھا تھا۔ کہ یہ تنہا لڑکی کی بے حرمتی نہیں ہوئی۔ بلکہ تمام جرمن قوم کی بے حرمتی ہے۔"

نسلِ انسانی کی خرابی کے اسباب میں سے یہ تفریق اس اعتبار سے کہ پیدائشی طور پر انسانوں میں اونچ نیچ موجود ہے۔ سب سے بڑی خرابی ہے۔ اے کاش! دنیا اکرمکم عند اللہ اتقاکم کے فرمانِ الٰہی کو سمجھتی۔

ایک کتاب "The Negro a Beast" ہے۔ جس کے حوالے "[illegible]" کا مصنف لکھتا ہے

"حبشی چوپایوں کے ساتھ پیدا کیا گیا۔ وہ ایک بڑا بن مانس تھا۔ اس کی تخلیق کی غایت یہ تھی۔ کہ وہ آدم اور اس کی ذریات کے لئے تمام محنت کے کام سر انجام دے وہ سانپ جس نے حوا کو بہکایا وہ دراصل حبشی ہی تھا۔ یہ بہت پرانا سوال تھا۔ کہ قابیل کی بیوی کون تھی۔ اس سوال کا حل بہت ہی آسان ہے۔ قابیل نے ایک حبشن سے شادی کر لی تھی۔ یہ دنیا میں اولین نکاح تھا جس سے مخلوط نسل کی بنیاد پڑی، جس کے ذریعے آدمی اور حیوان بطور زن و مرد اکٹھے ہوئے۔"

نسلِ انسانی کی تقسیم اس نقطۂ نگاہ سے کرنے کا سہرا انہی لوگوں کے سر ہے۔ جنھوں نے مسئلہ ارتقاء کے سمجھنے میں سائنٹفک طریقوں کو اختیار کیا ہے۔ اقتباسات بالا اس بات کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ کہ مسئلہ ارتقاء نے کیا گل کھلائے ہیں۔

ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ :۔

"زندگی ایک مسلسل خارجی اور داخلی تعلقات کے توافق کا نام ہے۔" اس قسم کے مقولے ہمیں کوئی ایسی اطلاع بہم نہیں پہنچاتے جس سے ہم ابتدائے آفرینش کے متعلق کچھ سمجھ سکیں۔

اس نظریۂ ارتقاء نے ایک ایسا تصور پیدا کیا جس سے ہر مسئلہ کی گذشتہ تاریخ دریافت کرنے کا سودا پیدا ہو گیا۔ ہر اس اصول زندگی کی ایک تاریخ مرتب ہونی شروع ہو گئی۔ جس نے خیالِ انسانی کو پریشان کر دیا۔ ہربرٹ اسپنسر نے ذاتِ باری کے متعلق یا ابتدائے کائنات کے متعلق یہ کہہ دیا کہ "وہ ناقابلِ تصور اور احاطۂ علم سے باہر ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال اس حد تک بالکل صحیح ہے کہ فکرِ انسانی اس قسم کے حقائق کے کما حقہٗ ادراک سے قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ ربِ العالمین نے بعض امورِ غیب کی اطلاع کے لئے برگزیدہ رسولوں کو مبعوث فرمایا، جو مہبطِ وحی تھے، دنیا کے سب سے بڑے انسان اور انسانیت کے محسنِ اعظم نے انسانی ذرائع معلومات کی محدودیت اور تنگ دامانی کے پیشِ نظر بطورِ حقیقت یہ ارشادِ عالی فرمایا تھا۔ کہ

تفکروا فی صفاتہٖ ولا تفکروا فی ذاتہٖ

عقلی اعتبار سے تصوراتِ مجردہ کا افہام طاقتِ بشری سے باہر ہے۔ اس لئے ہر وہ مسئلہ جسے سائنسی تحقیقات کا نام دے کر شائع کیا جاتا ہے اس کے متعلق یہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ آیا یہ مسئلہ تحت الادراک مسائل میں سے ہے۔ یا فوق الادراک مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

دلاور فگار (ایم۔اے)

نجومی

(۱) آپ کا طالعِ بیدار بہت اونچا ہے
آج کل آپ پہ مریخ چڑھا بیٹھا ہے
برجِ عقرب میں عطارد کو زحل ملتا ہے
ان ستاروں سے ترقی کا پتہ چلتا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۲) آپ کے ہاتھ پہ ہے ایک نشاں مثلِ ہلال
اس کا مطلب یہ ہے نزدیک ہے تاریخ وصال
احتیاطاً کوئی کشتہ نہ کریں استعمال
ورنہ کل جسم بگڑ جانے کا اندیشہ ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۳) آپ کو نیلم و یاقوت نہیں آئیں گے راس
فائدہ مند زمرد ہے نہ لعل و الماس
بے نگینہ کی انگوٹھی جو رہے آپ کے پاس
اس انگوٹھی سے بڑا فائدہ ہو سکتا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۴) اک دفینہ جو ہے موجود قریب کشمیر
آپ کو مل کے رہے گا کہ یہ ہے حکم فقیر
آپ کا نام ہے اس گنج نہاں پہ تحریر
اک مٹکا ہے کہ سونے سے بھرا رکھا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۵) دل پریشاں ہو تو کوئی منورنجن کرنا
ڈالڈا گھی کے دیئے رات کو روشن کرنا
خواب میں فلمی حسیناؤں کے درشن کرنا
آپ کے ذہن میں کچھ دن سے دھواں سا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۶) دیکھئے! آپ سنیچر کو کریں گے جو کام
خیر اور خوبی سے ہو جائے گا اس کا اتمام
جس کو کہتے ہیں سنیچر وہ ہے اُم الایام
خوش نصیبی سے یہ دن آپ کو [illegible]
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۷) آپ کمزور زیادہ ہیں توقع کے خلاف
خوف ہے مجھ کو کہ نہ آپ کا ہو جائے نہ آف
بات میں صاف کہے دیتا ہوں تصریحاً
جنسیت آپ کی تبدیل نہ ہو جائے [illegible]
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۸) نوکری چھوڑ دیں اب شاعری فرمائیں آپ
کسی استاد سے لکھوا کے غزل گائیں آپ
وہ کرے فکرِ سخن، دادِ سخن پائیں آپ
آج کل شعر کے دھندے میں بھی [illegible]
میں نجومی ہوں مرا علم یہی [illegible]

(۹) ترک فرمائیں غزل گوئی بنیں طنز نگار
آپ مشہور بھی ہو جائیں گے با [illegible]
اک تخلص بھی نیا رکھ لیں چوٹ برسی [illegible]
آج کل طنز نگاری کا [illegible]
میں نجومی ہوں [illegible]

(۱۰) آپ کرتے ہیں جو کسی شوخ تنومند سے عشق
اس کے ماں باپ سے خاندانے فرزند [illegible]
اس کے بھیرے دو [illegible]
آپ کے عشق کا [illegible]
[illegible]

(۱۱) قیدِ شادی سے ابھی آپ ہیں بالکل آزاد
لیکن اب جلد بر آئے گی عزیزوں کی مُراد
ایک ہی سال میں ہو جائے گی کافی اولاد
پہلے دس لڑکیاں ہیں، بعد میں اک لڑکا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۲) آپ اِنیس سو پینسٹھ میں بنیں گے شوہر
"میرا سہرا بالا" بنا باندھے گا سہرا سر پر
گاڑی آنے ہی کو ہے، ہو گیا لائن کلیر
یاد رکھئے یہ مثل، صبر کا پھل میٹھا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۳) کچھ بزرگانِ وطن آپ کو دیں گے یہ صلاح
اک ریٹائرڈ طوائف سے کریں آپ نکاح
کہیں ان باتوں سے ہوتی ہے وطن کی اصلاح
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۴) آپ کے واسطے موزوں ہیں کریپ سول کے بوٹ
خوش نمائی کے لئے پہنا کریں زین کا سوٹ
نام میں جن کے ہے "س" کھایا کریں ایسے فروٹ
جیسے امرود ہے، تربوز ہے، خربوزا ہے
میں نجومی ہوں، مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۵) مونگ کی دال نہ کھائیں وہ ہو کیسی ہی بھلی
دودھ پینے سے بھی گھٹ جائیگا خون ایک پلی
آپ کو فائدہ پہونچائے گی بس مونگ پھلی
جسم کو فربہ بنانے کا یہی نسخہ ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۶) آپ حج کرنے کو امسال عرب جائیں گے
واپس اس ارضِ مقدس سے جب آپ آئیں گے
اپنی رومالی میں کچھ گولڈ چھپا لائیں گے
بمبئی آکے پکڑ جانے کا اندیشہ ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۷) آپ تو گیت بھی کہہ لیتے ہیں رنگین و جمیل
آپ اگر فلم میں جانے کی کریں کوئی سبیل
ایک ہی سال میں بن جائیں گے مجروح و شکیل
کار چڑھنے کو ہے رہنے کے لئے بنگلہ ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۸) آپ کے ایک شناسا کا ترنم ہے کرخت
اس سے بچئے کہ وہ شاعر ہے نہایت بدبخت
بیٹھے جس تختِ صدارت پہ اُلٹ جائے وہ تخت
اُس کی تقدیر میں کرسی کی جگہ مونڈھا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۱۹) آپ کی موت جو واقع ہوئے پھانسی ہوگی
نہ بخار آپ کو آئے گا نہ کھانسی ہوگی
آپ کو عشق کے الزام میں پھانسی ہوگی
آپ مر جائیں گے اک روز مرا دعویٰ ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

(۲۰) غیب کا حال بتاتا ہے مرا علم نجوم
پھر بھی تقدیر کے اسرار مجھے کیا معلوم
اصل میں قادرِ مطلق ہے وہ حی و قیوم
"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

پروفیسر [illegible]
گورنمنٹ کالج کوئٹہ

اوہام پرستی

اوہام پرستی تقریباً ہر ملک قوم میں پائی جاتی رہی ہے۔ اب بھی اوہام پرست لوگ ہر قوم اور ملک میں پائے جاتے ہیں خصوصاً یورپ اسلام سے قبل دنیائے عرب میں تو اوہام پرستی دینی معتقدات کا ایک اہم جزو بن گئی تھی۔ "اوہامُ العرب" اس مقالہ کا موضوع ہے۔ اس سے پیشتر کہ اقوامِ عالم کی توہم پرستی کا ضمناً جائزہ لیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے "اوہام" کی اصل حقیقت معلوم کر لی جائے۔

"وہم" (فرانسیسی میں "SUPERSTITION" یا لاطینی میں "SUPERSTITIO") کے اصل معنی کسی شے کے سامنے ساکت کھڑا ہونے کے ہیں۔ اس لئے حیرت یا خوف خصوصاً مافوق الفطرت کا مراد ہے۔ پھر (i) کسی نامعلوم یا پُر اسرار شے کے لئے حیرت یا اس کا خوف یا خصوصاً ایک دینی اعتقاد جو غیر عقلی اور مغالطہ انگیز متصور کیا جائے۔

(ii) یقین، فعل یا کوئی رسم و رواج خصوصاً مذہبی نوعیت کا جو غیر عقلی، ناکارہ یا مضرت رساں متصور ہو۔

(iii) ایسے ہی دیگر افعال، یقینات اور رواج بحیثیت مجموعی (WEBSTER'S COLLIGIATE DICTIONARY طبع سوم لندن ۱۹۲۸ء بذیل مادہ)

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں اس لفظ کی یوں تشریح کی گئی ہے۔ لفظ "وہم" مادی اور غیر مادی دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ چنانچہ ہم ان اجتماعی و انفرادی عقائد، عادات و خیالات کو اوہام کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جو عقلی دلائل پر مبنی نہیں ہوتے۔

توہم کی مادی یا عام اصطلاح اس جبلت کا نام ہے۔ جو پیش آمدہ واقعات کو مافوق الفطرت اور غیر طبعی تاثرات کی طرف منسوب کرے۔ اور ایک ایسے بلاواسطہ تعلق پر بھی دلالت کرے۔ جس کے ذریعہ ان تاثرات سے استفادہ اور نقصانات سے احتراز کیا جا سکے۔

لفظ "SUPERSTITION" کا سابقہ یعنی "SUPER" کے معنی "زیادتی" "EXCESS" کے ہیں۔ یہاں زیادتی سے عام طور پر مافوق الفطرت قوتوں پر اعتقاد میں مبالغہ سے کام لینا۔ اور اس مادی دنیا میں روحانی اور طلسماتی مداخلت کے غیر معتبر روایات کو قبول کرنے میں سریع الاعتقاد ہونا مراد ہے۔

انسان اس بات کا ہمیشہ خواہشمند رہا ہے کہ وہ قابلِ فہم دلائل کے بغیر عالمِ روحانی کے متعلق اپنے مقدور سے زیادہ معلومات حاصل کر سکے۔ اور اس خواہش کے لئے اسے ایسی ہستی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے جو کہ الوہی حقائق کی مظہر بھی نہ ہو۔ تو کم از کم روحانی حقائق کی حامل ضرور ہو۔ ("ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS" جلد دوم)

اب ہم انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کی طرف رجوع کرتے ہیں:۔ "وہم کو عموماً سرسری اور مبہم انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تعریف آسان نہیں ہے۔

کسی شخص کو توہم پرست کہنے سے بہرحال ہمیشہ یہ مراد لی جاتی ہے کہ اس میں کم و بیش ذہنی یا اخلاقی نقص ہے۔

— وہم ایسے معتقدات یا رسوم کا قبول کرنا ہے جو جذبات محض پر مبنی ہوں۔ اور ذہنی روشنی کے اس معیار سے غیر مطابق ہوں

... قوم ... سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہ پہنچ چکی ہوتی ہے۔

(ENCYCLOPAEDIA BRITANICA)

CARVETH READ اپنی کتاب THE ORIGIN OF MAN AND OF HIS SUPERSTITION
کیمبرج ، ۱۹۲۰ء ، ص ۱۷۱ تا ۱۷۲) میں وہم کی یہ تشریح کرتا ہے " مسئلاً (میری رائے میں) وہم کے معنی عام استعمال میں " باطل معتقدات
ہیں ۔ جن کا تعلق مافوق العادت قوتوں سے ہو ۔ خصوصاً ایسے معتقدات جو معاشرتی لحاظ سے مضرت رساں اور عام طور پر ایسے جو جاہلانہ
یا بے معنی ہوں ۔ لیکن اس کے مفہوم میں عموماً اتنی وسعت دی جاتی ہے ۔ جس سے وہ سوفیانہ قسم کے معتقدات پر حاوی ہو جاتا ہے ۔
مثلاً آسن کھٹولے اور پریوں کی کہانیاں یا نئے چاند کو پہلی دفعہ شیشے کے ذریعے دیکھنے کی بدقسمتی ۔ صاف بات یہ ہے ۔ کہ ایک باطل
عقیدے کی ضرر رسانی ہمیشہ معرض نزاع میں رہی ہے ۔ بہرکیف یہ ایک زمان و مکان کا مسئلہ ہے ۔ اوہام کی تعریف تمام باطل
معتقدات پر حاوی ہونی چاہیئے ۔ ان کی افادیت یا مضرت خواہ کچھ بھی ہو "

وہم کی مندرجہ بالا تشریحات کی روشنی میں ہم مفصلہ ذیل نتائج بآسانی مستنبط کر سکتے ہیں :-

۱- وہم چونکہ محض ظنی ہوتا ہے ۔ اس لئے حق و صداقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔

۲- اس کی بنیاد چونکہ محض ظنیات اور تیر تکوں پر ہوتی ہے ۔ اس لئے وہ عقل کا حریف ۔ تحقیق و روشن خیالی کا دشمن اور
حق و صداقت کا مخالف ہوتا ہے ۔

۳- نورِ عقل سے محروم ہونے کی وجہ سے وہ ظلم و جہل کا مظہر ہوتا ہے ۔

۴- اس میں اجتماعی رنگ غالب ہوتا ہے ۔ جو اس قوم کی ذہنی اخلاقی اور دینی پستی پر دلالت کرتا ہے ۔

اب ہم ان اوہام پر ایک اُچٹتی نظر ڈالتے ہیں ، جو مختلف ممالک میں پائے جاتے ہیں ۔

فرانس :- پانی میں ڈوب کر مر جانے والے شخص کی لاش کو روٹیوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے ۔ اسی طرح ماں اپنے کمسن بچے کی
لاش کے ساتھ اس کے کھلونے بھی دفن کر دیتی ہے ۔ تاکہ وہ تنہائی محسوس نہ کرے ۔ جب تک ملاحوں کی لڑکیاں
اور بیویاں پانی کی سطح پر پھول بکھیر کر ڈھانپ نہ دیں ۔ اُس وقت تک کوئی مچھلی شکار نہیں ہو سکے گی ۔

جرمنی :- اگر مکڑی اپنا جالا نیچے کی طرف تمہاری طرف جھکا لائے ۔ تو یہ خوش قسمتی کی دلیل ہے ۔ اور جب وہ آپ کی طرف
اونچا کرے ۔ تو بدقسمتی کی ۔

یونان :- یونانی ماں اپنے بچے کو اس کے جھولے میں لٹانے سے پہلے (آگ کے سامنے) اپنا پسندیدہ گیت گاتے ہوئے تین بار آگ کے
سامنے چکر کاٹتی ہے ۔ تاکہ ارواحِ خبیثہ کو دور کرے ۔

برما :- خیرات دینے والے شخص کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ۔ کیوں کہ خیرات اس امر پر دال ہے ۔ کہ وہ شخص پہلے
ظالم اور گناہگار رہا ہے ۔ اور اب خیرات سے اپنے ظلم و تعدی کی تلافی کر رہا ہے ۔

اطالیہ :- جس نوجوان لڑکی کے نقش پا سے مٹی اٹھا کر ایک طرف سے دوسری طرف پھینک دی جائے اُس کی کبھی شادی
نہیں ہو گی ۔

PERWINKLE (ایک سدا بہار پھول) کو گل مرگ کہتے ہیں ۔

انگلستان :- اٹھارھویں صدی تک انگلستان کے لوگ اسی وہم میں مبتلا تھے ۔ اگر پھانسی دیئے جانے والے شخص کے ...

انگلستان :- اگر پھانسی کے وقت کوئی حسین عورت شادی کا پیغام دے۔ تو وہ شخص پھانسی سے بچ جاتا ہے۔
ایک دیا سلائی سے تین سگریٹیں بہ یک وقت نہیں جلاتے۔ اُن کا خیال ہے کہ تیسرا آدمی مر جاتا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ شہد کی مکھیاں گھر سے بھرے بھرے درخت کی کسی خشک شاخ پر ڈیرہ جمائیں تو اس سال اس خاندان میں کوئی موت واقع ہوگی، گھر کی مالکہ اپنے گھر کے سامنے دروازے سے کبھی مٹی صاف نہیں کرے گی۔ مبادا گھر کی خوش نصیبی جاتی رہے۔

چین :- چینی ازدواج خیش سے بچنے کے لئے اپنے گھروں میں درخت کی ٹہنیاں لٹکا دیتے ہیں۔ ہونے والے میاں بیوی کو غیر مرئی ریشمی دھاگے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ جسے صرف موت ہی جدا کر سکتی ہے۔

کیوبا :- اُلو کی آواز کو منحوس خیال کرتے ہیں۔
لوگ چاندنی رات میں حتیٰ الامکان اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ اگر انہیں مجبوراً نکلنا ہی پڑے۔ تو وہ سر منہ چھپا کر نکلتے ہیں۔ اسی طرح وہ چاندنی میں نہیں سوتے کیوں کہ ان کے خیال و وہم میں چاندنی سے لقوہ ہو جاتا ہے۔

افریقہ :- سانپ کو مار کر درخت سے لٹکا دیا جاتا ہے۔ اور نومولودوں کے ہاتھوں کو سانپ پر ملتے ہیں۔ تاکہ وہ سانپ کی حفاظت میں آجائیں۔

اسکیمو :- (ESKIMOS) جب بچہ مرجاتا۔ تو اُس کے ساتھ وہ زندہ کتا بھی دفن کر دیتے۔ تاکہ آخرت میں وہ اس بچے کی رہنمائی کرے۔ کیوں کہ اُن کا خیال ہے کہ "کتا ہر جگہ اپنا راستہ معلوم کر لیتا ہے"۔

آسٹریلیا :- یہاں کے لوگ مُردے کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے۔ اور اس کے ناخن جڑ سے نکال دیتے مبادا مُردہ اپنے ناخنوں سے قبر کھود کر راستہ بنا کر باہر نکل آئے۔ اور یہ خونخوار چلتا پھرتا مُردہ زندہ انسانوں کا خون پی لے۔

جاپان :- سفر پہ جانے سے قبل ناخن کترانا منحوس سمجھا جاتا ہے۔
آگ میں ناخن پھینکنا کسی ناگہانی آفت کو دعوت دیتا ہے۔

ایران :- مُرغ جب اذان دیتا ہے تو اس کے پنجوں کو چھو کر معلوم کیا جاتا ہے۔ کہ آیا وہ گرم ہیں یا سرد اگر وہ سرد ہیں۔ تو یہ موت کی دلیل ہے اور اگر وہ گرم ہوں۔ تو سعادت مندی کی نشانی ہے

روس :- قدیم روسی مُردے کے ہاتھ میں نیک چال چلن کی سند دے دیا کرتے تھے۔ تاکہ جنت کے دروازے پر اُسے (SAINT PETER) کو دیا جا سکے۔

اسپین :- سولھویں صدی میں اہلِ اسپین کا خیال تھا کہ جہاں مکڑیاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ وہاں سونا موجود ہوتا ہے۔

ترکی :- اگر کوئی شخص گلاب کے پتوں کو گرتے دیکھے۔ تو یہ بدقسمتی کی دلیل ہے۔

امریکہ :- (MASSACHUSETTS) میں یہ عقیدہ ہے کہ گائے اگر آدھی رات کے بعد "مو" (MOO) کی آواز نکالے۔ تو وہ خاندان کے کسی فرد کی موت کی پیشن گوئی ہے۔
اگر مرغ گھر کے سامنے شور مچائے۔ تو یہ کسی شخص کی آمد کی دلیل ہے۔

بھارت :- بھارت کے ہندو تمدن میں "اوہام" کی کوئی حد و نہایت نہیں، کوئی شخص کہیں جا رہا ہو۔ اور سامنے سے بلی راستہ کاٹ کر گزر جائے۔ تو اسے منحوس خیال کیا جاتا ہے (جاتے پہ چھینک آجائے، تو اسے "سفر" کی علامت

کہا جاتا ہے کہ کسی مکان کی دیوار پر کوا بیٹھ کر بولنے لگے تو یہ دلیل ہے کسی مہمان یا گھر سے باہر سفر میں گئے ہوئے آدمی کے آنے کی۔

— اسلام ہی وہ دینِ فطرت ہے، جس نے اس قسم کے تمام اوہام، شگون اور بد فالیوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور انسان کو اوہام کے چکر سے نکال دیا۔

پاکستان کے عوام کا مُطالبہ

• — اسلام — یعنی کتاب و سُنّت کے نظام کو پورے کا پورا قائم کرو

• — معاشرے میں اسلامی اخلاق کی رُوح کو — سمو دو

• — ایسی جمہوریت لاؤ — جو "آمریت" کی نفی کرتی ہو

— اور —

ہم کو وہ قانون اور ایسی حکومت چاہیئے

جس میں اک بُڑھیا خلیفہ کا گریباں تھام لے

غلطیہائے مضامین

فاران ماہ مئی میں پروفیسر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون بعنوان "علامہ اقبال اور روایت" شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں :-

شروع میں ان کی غزلیات بڑی حد تک پرانی روایات کی حامل ہیں۔ گو ان میں بھی لب ولہجہ اور آہنگ
کے اعتبار سے جدت طرازی ضرور نظر آتی ہے لیکن رموز و علائم میں پابندی بھی ہے۔ مثلاً
مجاز کے رنگ میں یہ شعر ؎

زلف آوارہ گریباں چاک اے مست شباب تیری صورت سے تجھے دردآشنا سمجھا تھا میں

لیکن اسی غزل میں اس قسم کے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی ؎

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

زلف آوارہ والا شعر علامہ نے دوسری اشاعت میں دیوان سے خود نکال دیا تھا"

اس عبارت کے پڑھنے کے بعد فوراً کسی کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

عبارت کے اس مختصر سے ٹکڑے میں پروفیسر صاحب سے چند واضح تسامحات ..... ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے
اور جن دو شعروں کو پروفیسر صاحب نے ایک ہی غزل کے اشعار قرار دے دیا ہے انھیں کوئی صاحب ذوق ایک غزل کے شعر
قرار نہیں دے سکتا اس لئے کہ ان دونوں کے قافیے مختلف ہیں۔

یہ دو اشعار نہ صرف یہ کہ ایک غزل کے نہیں ہیں بلکہ ایک شاعر کے بھی نہیں ہیں۔ دوسرا شعر تو حضرت علامہ مرحوم ہی کا ہے لیکن
شعر ڈاکٹر تاثیر کی ایک مشہور غزل کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔ اور اسے ان کے مجموعہ کلام "آتش کدہ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔
پروفیسر صاحب کے خیال کے مطابق علامہ کی وہ غزل جس کا ایک شعر اوپر گزر چکا ہے ابتدائی دور کی ہے۔ یہ درست نہیں۔ یہ غزل بال[illegible]
کی ہے اور تقریبی طور پر معلوم ہے کہ یہ جاوید نامہ کی تکمیل کے بعد کہی گئی اور جاوید نامہ پہلی مرتبہ سنہ ۳۲ء میں شائع ہوا۔ [illegible]
اس کا تعلق ابتدائی دور سے ہرگز نہیں ہے بلکہ آخری یا پروفیسر صاحب کی اصطلاح میں "درمیانی آخری" دور سے ہے۔
استدلال کی وہ عمارت جو پروفیسر صاحب نے زلف آوارہ والے شعر کی بنیاد پر اٹھائی ہے۔ یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ یہ شعر
حضرت علامہ کا نہیں ہے خود بخود منہدم ہو جاتی ہے اور ان کا یہ دعویٰ محتاج ثبوت رہ جاتا ہے کہ علامہ کبھی اس انداز میں بھی شعر [illegible]
جس کی مثالیں انہیں کلام اقبال سے پیش کرنی چاہئیں جس میں شاید انہیں کامیابی نہ ہو۔
پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ اس شعر کو علامہ نے دوسری اشاعت میں دیوان سے خود نکال دیا تھا۔ ایک شعر جسے کبھی علامہ نے [illegible]
کلام میں شامل ہی نہیں کیا تھا اس کے خارج کرنے کا سوال خارج از بحث ہے لیکن پروفیسر صاحب کے ان الفاظ سے ایک [illegible]
پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "دیوان اقبال" نام کی کوئی جامع کتاب موجود ہے جس میں داخل خارج کا عمل ہوا۔ حالانکہ [illegible]

[illegible] اس سے مراد ان کا مجموعہ کلام ہے تو وہ ایک نہیں متعدد ہیں ۔ ان میں سے کس [illegible]
[illegible] اس کا علم ہو [illegible] صاحب کی اس عبارت سے نہیں ہوتا ۔

[illegible] غزل کا ایک شعر خود نکالا تھا لیکن وہ کسی اور کا نہیں بلکہ ان کا اپنا شعر تھا ۔

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی ۔۔۔ داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

[illegible] کی وجہ بھی غالباً ڈاکٹر تاثیر کے بقول یہ تھی کہ علامہ کے خیال میں مقام رازداں کے بجائے رازدار کا تھا اور اس کے لئے یہاں گنجائش نہ تھی ۔ اس وجہ سے انہوں نے اس شعر کو حذف کر دیا

یہ شعر بھی دیوان (۹) کی دوسری اشاعت میں نہیں نکالا گیا تھا ۔ بلکہ علامہ کے دیوان (؟) یا کسی مجموعہ کلام کی پہلی یا دوسری کسی اشاعت میں بھی نہیں چھپا ۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ غزل سب سے پہلے رسالہ کارواں میں شائع ہوئی تھی ۔ اس وقت اس میں یہ شعر چھپا تھا لیکن بالِ جبریل کو ترتیب دیتے ہوئے علامہ نے اسے خارج کر دیا ۔

اس غزل کا ایک خاص شانِ نزول ہے اور ساری غلط فہمیاں یا غلطیاں اپنے وجود کے لئے اس کے حافظہ میں پوری طرح محفوظ نہ [illegible] کے سبب پیدا ہوئی ہیں ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اس کا یہاں تذکرہ کر دیا جائے ۔۔

ایک شام ڈاکٹر تاثیر جہانی اور ان کے دو بھائیوں کی معیت میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے رسالہ "کارواں" کے لئے [illegible] کلام کی درخواست کی ۔ علامہ نے بوجوہ معذرت کی ۔ یہ لوگ بھی ٹلنے والے نہ تھے ۔ آخر علامہ نے تاثیر سے کہا کہ اپنے کچھ [illegible] سناؤ شاید اس طرح کچھ ہو جائے ۔ تاثیر نے اپنی وہ غزل سنائی جس کا ایک شعر ہے

زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب ۔۔۔ تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

[illegible] تاثیر کہتے ہیں کہ علامہ نے بھی اسے پسند کیا اور علامہ کی پسندیدگی سے انہیں بہت خوشی ہوئی ۔ لیکن پھر سوچ میں پڑ گئے کہ علامہ نے اسی [illegible] کہ ہم سا آزاں کی غزل بے حیثیت ہو کر رہ جائے گی ۔ یہ اسی سوچ میں تھے کہ حضرت علامہ نے فرمایا " اگر قافیہ بدل جائے تو " اس پر تاثیر مرحوم کو اطمینان ہوا ۔ اس کے بعد علامہ پر آمد شروع ہو گئی ۔ اب وہ فرما رہے تھے اور تاثیر لکھ رہے تھے ۔ ایک دلچسپ پہلو اس واقعہ کا یہ ہے کہ اس موقع پر جو شعر سب سے پہلے ہوا اسی کو بعد میں علامہ مرحوم نے حذف فرما دیا ۔

حاصلِ مطالعہ

حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلۃ الکنانی رضی اللہ عنہ صحابی رسول تھے جس سال غزوۂ احد واقع ہوا ہے اسی سال پیدا ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت ان کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ اصحاب رسولؐ میں سب سے آخر (سنہ ۱۱۰ھ) میں ان کا انتقال ہوا۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خاص محبین میں سے تھے، جمل و صفین میں علی مرتضیٰ کے ساتھ رہے۔ نہج البلاغہ کے حسب ذیل کلمات ان سے مروی ہیں:-

"ایھا الناس ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان ...."

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کے تشریحی فوائد لکھے۔ حدیث کی مشہور کتاب "موطا" کی فارسی اور عربی میں مجتہدانہ شرحیں تحریر کیں اور فقہی جمود کو توڑا اور حنفی، شافعی حنبلی اور مالکی کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش فرمائی۔

"دہر" اور "زمان" کا امتیاز امام رازی کی "المحصل" میں اور تقریباً ایک ہزار سال سے شیخ ابو علی سینا کے یہاں ملتا ہے سنہ ۱۲۰۰ء میں جرمنی میں کلاک نادر وجود میں آئے، جیبی گھڑیاں ان کے بعد بنیں، مگر اس سے چار سو سال پہلے گھڑیاں عالم دنیا میں وجود میں آچکی تھیں ——— ہارون الرشید نے شارلمین کو تحفہ میں جو گھڑی بھیجی تھی وہ پہلا وقت بتاتا تھا۔ جو سرزمین یورپ میں پہونچا۔ "الوقت سیف قاطع" کے اصول کے تحت مسلمانوں نے غیر معمولی صحت کے ساتھ وقت کی پیمائش پر زور دیا۔

برگساں کا مذہب یہ تھا کہ زمانہ "مدت بحث" (Pure Duration) ہے جس میں تعاقب Succession مگر تغیر (Change) نہیں ہے۔

آٹھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ نے بصرہ کی سیاحت میں مسجد امیر المومنین علی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس مسجد میں حضرت عثمان کا مصحف خاص موجود تھا جس کے اوراق خون آلود تھے۔

"صاحب" کا لفظ ابتدا میں تلمیذ اور شاگرد کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اس کی جمع "اصحاب" تلامذہ کے معنی میں آتی تھی جیسے عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج دمشقی "اعمیٰ صاحب ابی ہریرہ ——— اور اصحاب ابی حنیفہ، اصحاب شافعی اور اصحاب مالک وغیرہ اس (صاحب) کے مقابلہ میں استاد کے لئے شیخ اور شیوخ بولا جاتا تھا ——— "صاحب" کے لقب

[illegible] کے مفہوم سے الگ کر کے سب سے پہلے ابوالقاسم اسمٰعیل بن عباد کے لئے استعمال کیا گیا۔

یونانی علوم کے عربی میں ترجمے کی تحریک کا آغاز منصور نے کیا تھا ـــــ ہارون الرشید کے عہد حکومت میں سرکاری [illegible] کا نام "بیت الحکمۃ" قرار پایا اس کا پہلا ڈائریکٹر ابوسہل فضل بن نوبخت تھا۔

ایک ضروری گذارش

ہندوستان کے خریدار صاحبان، اپنا سالانہ چندہ دفتر "الحسنات" رامپور [illegible] کو روانہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ (منیجر "فاران")

دو غزلیں

پروفیسر عاصی کرنالی

شمعِ محفل تو بنو، آئیں گے پروانے بہت
تم تجلی تو دکھاؤ، آئینہ خانے بہت

کیا میں ضبطِ اشک کی کوشش نہیں کرتا ندیم
خود چھلک اٹھتے ہیں جب بھرتے ہیں پیمانے بہت

اب کہاں جائیں بتا اے عشق تیرے سینہ چاک
بڑھتے جاتے ہیں گریباں چاک دیوانے بہت

بزمِ انجم جب اٹھی، غنچوں کے در وا ہو گئے
دیکھنے والے نہیں ہیں، آئینہ خانے بہت

تو نے آنکھیں پھیر لیں مجھ سے، تو اچھا الوداع
پینے والا چاہیئے، دنیا میں مے خانے بہت

ایک میرا دل ہی تخلیق ادب کرتا نہیں
آپ کی آنکھوں نے تو لکھے ہیں افسانے بہت

دل خدا آباد بھی ہے دل صنم آباد بھی
ہم نے کعبے میں بنا ڈالے ہیں بت خانے بہت

تم کو عاصی جوہرِ سیرت شناسی دے خدا
دوستوں کی مجلس میں ہوتے ہیں بیگانے بہت

راہی بلند شہری

ہم جلوۂ گل رنگِ چمن دیکھنے والے
تجھے معرکۂ دار و رسن دیکھنے والے

وہ لوگ اب آنچل کی طرف دیکھ رہے ہیں
تھے اپنے سروں پر جو کفن دیکھنے والے

بدلے گا یہ نظمِ مے و میخانہ بہت جلد
کہتے ہیں یہ ساقی کا چلن دیکھنے والے

فنکار پہ خونِ جگر بھی تو نہیں کیا
ہم لوگ ہیں گلرنگیٔ فن دیکھنے والے

تدبیر کے تیور بھی کبھی دیکھ لیا کر
تقدیر کے ماتھے پہ شکن دیکھنے والے

پامال نہ کر دے تجھے اس دور کی تہذیب
پامالیٔ تہذیبِ کہن دیکھنے والے

تاراجیٔ گلزار و دمن دیکھ رہے ہیں
مدت سے جو تھے خوابِ چمن دیکھنے والے

خاموش ہیں لیکن تری نیت سے ہیں واقف
اے پیرِ مغاں تیرا چلن دیکھنے والے

روحِ انتخاب

صرف مادیت سے کام نہیں چلتا

(اروِنگ ولیم نابلاخ (ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ ماہر علوم طبیعی)

وہ سائنس داں جنہیں علوم طبعی پر بے جا اعتماد ہے، وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ سائنس میں سارے مسائل کو حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ ان کی نظر میں زندگی محض قوانین طبیعی اور کیمیا کی کرشمہ سازی ہے اور زندگی کے وہ مظاہر جنہیں انسان شروع ہی سے مافوق الطبعی قوتوں کا نتیجہ سمجھتا رہا ہے، وہ علت و معلول کا ایک طلسم ہوشربا ہے، زندگی کا کوئی مقصد و مدعا نہیں، یہ ساری کائنات ایک دن ٹھنڈی ہو کر خود بخود ختم ہو جائے گی۔

برٹنڈرسل نے فطرت کی اس سراسر مادی توجیہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"انسان اندھی بہری قوتوں کے ہاتھ میں ایک ایسا بے بس کھلونا ہے جس کا کوئی مقصد نہیں اس کی پیدائش اور ارتقاء اس کی آرزوئیں اور تمنائیں، اس کے اعتقادات اور تصورات سالمات کے تعامل کا نتیجہ ہیں، اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے اور اس کے بعد کوئی احساس اور کوئی نظریہ اسے زندگی عطا نہیں کر سکتا۔ صدیوں کی جدوجہد، نصب العین سے وابستگی، عبقریت کے کارہائے نمایاں نظام شمسی کے ساتھ ختم ہونے والی چیزیں ہیں۔ جب کائنات زیروزبر ہوگی تو انسانی کمالات بھی اس کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے نظریات متنازع فیہ ہیں مگر ان کا غالب رجحان کائنات کی اسی مادی تعمیر کی طرف ہے اور جو فلسفہ بھی اس توجیہ کو آج تسلیم نہیں کرتا وہ حقائق کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے گا۔"

یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ سارے سائنس داں سائنس کو ایک ایسا ہمہ گیر علم نہیں سمجھتے جس سے سارے مسائل حل کئے جا سکیں سائنس صداقت حسن اور مسرت کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتی۔ سائنس زندگی کی بھی کوئی تسلی بخش تعبیر نہیں کر سکتی اور نہ اس سے زندگی کا مقصد ہی متعین ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ ہم اس بات کا بھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کیا خدا موجود ہے یا نہیں۔

سائنس ہر وقت اپنے نظریات میں تبدیلی کرتی رہتی ہے۔ یہ اس امر کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتی ہے کہ حق اور صداقت کی تلاش کرے۔ لیکن چند قدم اٹھا لینے کے بعد اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی سعی و جہد محض حکایت تشنہ و سراب ہے۔ اس کائنات کے بارے میں ہمارے احساسات اور معلومات کا سرچشمہ ہمارے محدود حواس ہیں جو چند منزلیں طے کر جانے کے بعد اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ ایک امریکی طبیب نے ایک دفعہ یہ کہا "جوں جوں علم ترقی کرتا ہے اسی رفتار سے سائنس کا مذہب پر تفوق ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سائنس سے اگر صحیح کام لیا جائے تو انسان خود بخود خدا پر ایمان لے آتا ہے۔"

سائنس کے پاس اس بات کا کوئی معقول جواب نہیں کہ مادّے کے یہ چھوٹے چھوٹے ذرات کیوں کر معرضِ وجود میں آئے۔ محض اتفاق توان کے وجود کا سبب نہیں ہوسکتے۔ پھر سائنس اس معمے کو بھی حل کرنے سے قاصر ہے کہ ذرات سے زندگی کیوں کر پیدا ہوگئی، وہ فطرت جوش و خروش کے ساتھ اس بات کا دعویدار ہے کہ زندگی کی یہ ترقی یافتہ صورتیں بخت و اتفاق کی رہینِ منت ہیں، ایک قسم کا اندھا اعتقاد ہی ہے سائنس بھی ایمان کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اس مذہب میں ہمیں اپنے حواس، اپنے آلات، اور آلفاقات پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب ایک ہی سطح پر ہیں البتہ سائنس کو ایک یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ وہ اپنے اعتقادات کو تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر رکھ سکتا ہے اور اس طرح تجزیئے اور تحلیل کے ذریعے غلطی کے امکانات کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سائنس کے انکشافات مذہب کی صداقت پر گواہ ہیں۔ اب تک سائنس نے جس قدر تحقیقات کی ہیں، اُن سے کتابِ مقدس کے بہت سے اسرار کھلے ہیں اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جوں جوں سائنس کو ترقی ہوگئی، اسی نسبت سے مذہب کا موقف مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔ علمِ ہیئت اس کائنات کی ابتداء کا پتہ دیتا ہے اور علمِ طبیعات اس کی انتہا کی نشان دہی کرتا ہے۔ جس شخص نے سائنس کے جدید نظریات کا مطالعہ کیا ہے وہ کبھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ یہ کائنات قدیم ہے۔ تغیر و انقلاب اس کائنات کا بنیادی اصول ہے اور اس معاملے میں سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں۔

ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ سائنس نہ تو خدا کے وجود کا اثبات کرتا ہے اور نہ اس کی نفی کرتا ہے۔ لیکن اس غیر جانبدارانہ موقف کے باوجود جن لوگوں نے علمِ ہیئت کا صحیح طور پر مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کوئی اَن دیکھی اور اَن جانی ذات' اس وسیع و عریض کائنات کی خالق ہے۔ جانڈ واش نے ایک موقع پر کہا "ایک شخص سے خواہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہو یا ملحد ہو یہ بات جائز طور پر پوچھی جاسکتی ہے کہ بخت و اتفاق کا توازن اس کے ہاتھ میں کیوں کر دیا جاسکتا ہے۔ طامس ملیحار حقیقت کو ذرا تفصیل سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔ "انسان کا محدود ذہن اور نارسا عقل اگر خدا کی معرفت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اس کا ذریعہ صرف تجربہ ہے اور یہی اس معاملے میں بنیاد کا کام دیتا ہے۔ علم کا رفیع الشان محل اسی اساس پر قائم کیا جاتا ہے"۔

میں اگرچہ سائنس داں ہوں لیکن اس کائنات میں اتفاقات کے وجود کا قائل ہوں۔ روزمرہ زندگی کے بیشتر واقعات ان کی موجودگی کی شہادت دیتے ہیں۔ میں مادیت کا سراسر انکار بھی نہیں کرسکتا کیوں کہ سائنسدانوں کی کامیابی کا واحد معیار یہ ہے کہ وہ زندگی کے مختلف مظاہر کی مادّی تعبیر پیش کرسکیں۔

مجھے خدا پر پختہ یقین ہے۔ میں اُس غیر متزلزل عقیدے پر ایمان رکھتا ہوں، کیوں کہ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ مثبت اور منفی برقیے ابتدائی ذرات، پہلا نغز مایہ، اولین بیج یا سب سے پہلا دماغ یونہی کسی بخت و اتفاق سے پیدا نہیں ہوگئے۔ میں اُسے اس لئے مانتا ہوں، کیوں کہ اُس کی ذات کے ذریعہ ہی اس کائنات کی صحیح اور معقول توجیہہ ممکن ہے۔

(ترجمہ:۔ پروفیسر عبد الحمید صدیقی)

دینِ رحمت

از شاہ معین الدین ندوی

یوں اسلام ہر پہلو سے عالمِ انسانیت کے لئے سراسر رحمت ہے۔ لیکن اس کی بعض تعلیمات ظاہری اور معنوی دونوں پہلو سے

[illegible] رحمت دونوں ان کے رحمت ماننے پر مجبور ہیں۔ مثلاً انسانی مساوات، اخوت، خدمت خلق، انسانی دوستی، عدل و مساوات، حقوق نسوانی وغیرہ۔ ان کے رحمت ہونے سے ایک ملحد بھی انکار نہیں کرسکتا اور بعض معنوی یا داخلی حیثیتیں یعنی اپنے نتائج کے اعتبار سے رحمت ہیں۔ مثلاً توحید، رسالت اور حشر و نشر، جن کے ملحدین سرے سے منکر ہیں اور مشرک تو ہیں بھی توحید و رسالت کی قائل نہیں، اسلئے دونوں کو رحمت نہیں مانتی ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں نتائج کے اعتبار سے سراسر رحمت ہیں۔ توحید ہی نے انسانوں کا درجہ بلند کیا اور ان کو اپنے ابنائے جنس اور معبودانِ باطل کی غلامی سے رہائی دلائی اور دنیا نے انبیا علیہم السلام کے وسیلہ ہی سے خدا کو پہچانا اور آج اخلاق و روحانیت کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ انہی نفوس قدسیہ کا فیض ہے۔ اس لئے یہ دونوں عالم انسانیت کے لئے سراسر رحمت ہیں۔ موجودہ دنیا میں کسی مذہب کے رحمت ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس نے انسانوں کے ساتھ مساوات و مواسات، رحم و کرم اور لطف و مدارات کی کیا تعلیم دی ہے اور اس کی تعلیمات دنیاوی حیثیت سے کہاں تک ان کے لئے رحمت ہیں۔ اس لئے اسلام کی رحمت کے باطنی پہلو دکھانے کے بعد اب اس کے ظاہری پہلوؤں کو پیش کیا جاتا ہے۔ انسانی مساوات کی تعلیم کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ اب اس کے بعض اور پہلو پیش کئے جاتے ہیں۔

اسلام نے ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیا ہے۔ اور خدا کی نگاہ میں وہی انسان پسندیدہ ہے جس کا معاملہ اس کی مخلوق کے ساتھ اچھا ہے۔

الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (طبرانی و بیہقی)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ خلق وہ ہے جو اس کے کنبہ (یعنی مخلوق) کے ساتھ بھلائی کرتا ہے

خدا ہی ان لوگوں پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں

الراحمون یرحمھم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (ترمذی)

رحم کرنے والوں پر خدائے رحمٰن رحم کرتا ہے۔ اس لئے تم زمین والوں پر رحم کرو۔ آسمان والا تم پر رحم کرے گا

ایک دوسری حدیث میں ہے

من لایرحم الناس لایرحمہ اللہ

جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا رحم نہیں کرتا

(ادب المفرد باب من لایرحم لایرحم)

ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تم اس وقت تک مومن نہیں کہلا سکتے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو بتاؤں آپس میں محبت کا ذریعہ کیا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ایک دوسرے کو سلام کیا کرو، تم میں محبت پیدا ہو جائے گی۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس وقت تک تم جنت میں داخل نہ ہوسکو گے جب تک آپس میں محبت کا برتاؤ نہ کرو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سب رحم کرتے ہیں۔ فرمایا کسی ایک شخص کی رحمت نہیں بلکہ رحمت عام مطلوب ہے۔ (مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۶۷، ۱۶۸)

ایک روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہی پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لئے کرتا ہے اور جب تک وہ دوسرے کے ساتھ محض اللہ عزوجل کے لئے محبت نہ کرے۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۲۷۲)

بخاری کی روایت ہے کہ آپس میں بغض و حسد نہ کرو۔ ایکدوسرے سے منہ نہ پھیرو۔ اور سب خدا کے بندے بھائی بھائی ہو جاؤ۔ (بخاری کتاب الادب باب الہجرۃ)

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

پرنسپل عبدالحکیم قریشی (ایم۔ اے) مرحوم

سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے، میں دفتر "فاران" میں بیٹھا ڈاک پڑھ رہا تھا، کہ ایک صاحب تشریف لائے علیک سلیک اور مصافحہ کے بعد اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا، جس میں لکھا تھا:۔

"عبدالحکیم قریشی (ایم۔ اے علیگ
سابق وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی)"

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر وہ مجھ سے کہنے لگے کہ مشرقی پاکستان میں "جماعتِ اسلامی" کا جو لوگ کام کر رہے ہیں اُن کے سربراہ اور اُمراء شہرت و وجاہت کے اعتبار سے اُس درجہ کے نہیں ہیں، جس درجہ کا انہیں ہونا چاہیے، مشرقی پاکستان کی جماعتِ اسلامی کا چارج مجھے دلایا جائے، تو میں اُس کام کو بحسن وخوبی انجام دے سکوں گا! آپ اس مسئلہ میں میری مدد کیجئے!

میں نے عرض کیا کہ میں جماعتِ اسلامی کا صرف ہمدرد ہوں، اُس کی تنظیم سے میرا کارکن کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے میری کوشش اس معاملہ میں موثر نہیں ہوسکتی، پھر "جماعتِ اسلامی" پاکستان کی دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح نہیں ہے، برسوں کی اُمیدواری کے بعد اُس کی رکنیت کا موقعہ ملتا ہے!

گھنٹہ پون گھنٹہ تک صاحبِ موصوف دفتر "فاران" میں تشریف فرما رہے، اُنھوں نے اپنی فارسی اور اُردو غزلوں کی بیاض بھی مجھے پڑھنے کے لئے دی، یہ بھی فرمایا کہ میں جسمانی ورزش میں خاص مہارت رکھتا ہوں، اور اس کا مجھے تجربہ اور مشق ہے کہ تمام کے امراضِ جسمانی ورزشیں کرنے سے دُور ہو جاتے ہیں — اُنھوں نے رُخصت ہوتے ہوئے فرمایا کہ میں لاہور جاکر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملوں گا!

صاحبِ موصوف سے ایک دو بار اور ملنا ہوا، اُن کے ایک دو خط بھی اُسی زمانے میں آئے پانچ مہینہ ہوئے جب اُنھوں نے اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجا تھا، میں نے اُسے دیکھ کر واپس کردیا پھر اُن کا ایک قصیدہ صدرِ پاکستان کی مدح میں آیا، جو بحر سے خارج تھا، اس خط میں اُنھوں نے اس کا افسوس ظاہر کیا کہ صدرِ پاکستان کو بعض شورش پسندوں کی شورش کی وجہ سے راجشاہی کا دورہ ملتوی کرنا پڑا، مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا ہی رہ گئی، اگر میری صحت اجازت دیتی تو میں راولپنڈی حاضر ہوکر صدرِ محترم کی خدمت میں اپنے منظوم جذبات پیش کرتا۔ خط کا مضمون پوری طرح میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہا غالباً اُنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں صدرِ محترم سے اپنی شناسائی کا بھی ذکر کیا تھا!

میں نے وہ قصیدہ واپس کردیا، اور اُنہیں لکھا کہ شاعری کے لئے موزوں طبع ہونا سب سے پہلی شرط ہے، آپکے اشعار بحر اور وزن سے خارج ہیں، اُن پر اصلاح کیا دوں — اور آپ کی فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خاں سے شناسائی اور تعارف ہے تو اُن سے

حکومت سمجھے کہ مرتضیٰ و سروش کے ہنگاموں کو وہ اپنے خصوصی حکم کے ذریعہ روک دیں۔

اس خط کے بعد ان کا پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اخبار میں ان کے انتقال کی خبر نگاہ سے گزری! اور ان کے صاحبزادے (مسٹر عبدالعزیز قریشی) کے خط سے ان کی علالت اور انتقال کی تفصیل معلوم ہوئی۔

جناب عبدالحکیم قریشی علی گڑھ کے "ایم اے" تھے، برسوں ڈھاکہ کالج کے پرنسپل رہے اور اس خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد راجشاہی میں جاکر مستقل طور پر بس گئے، راجشاہی یونیورسٹی کے وہ اعزازی خزانچی بھی رہے اور کچھ دن تک اسی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی خدمت جلیلہ بھی ان سے متعلق رہی! مرحوم عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور بنگالی کے عالم تھے، اور کئی زبانوں میں شعر کہتے تھے! ان کے یہاں ایک عجیب تضاد نظر آیا ——— یہ کہ ان کی فارسی غزلیں بحر و وزن کے اعتبار سے موزوں ہوتی تھیں مگر اردو غزلیں ناموزوں! ان کا خط بہت پاکیزہ تھا، جسم کسرتی اور گٹھا ہوا ... اور اس بڑھاپے میں بھی ان کے قویٰ مضبوط بلکہ فولادی نظر آتے تھے! چہرے پر ڈاڑھی تھی، اسلام کی خیر خواہی اور مسلمانوں کا درد اپنے اندر رکھتے تھے!

مرحوم کو کھیل اور ورزش سے غیر معمولی دلچسپی تھی، وہ پیدائشی کھلاڑی تھے، اور اس معاملہ میں کسی گھر بند نہ تھے، ہر کھیل کے شوقین (ALLROUND SPORTSMAN) طلباء سے انہیں بڑی ہمدردی تھی، نادار طلباء کی مدد کرتے اور کتنوں کو ان کی سعی و سفارش سے بڑے بڑے عہدے مل گئے! مشرقی پاکستان کے دوسرے اکابر کے برخلاف مارشل لاء کی حکومت کے مداح خواں تھے اور مشرقی پاکستان میں طلباء کے احتجاج نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی، اس سے وہ خاصے ملول اور دل گرفتہ تھے۔

• فاران کے مستقل خریدار تھے، اور اسی ذریعہ سے اس ہیچمدان سے متعارف بلکہ قدر دان تھے! اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور لحد سے لے کر روز جزا تک کی ہر منزل آسان ہو (آمین)

—×—

ہماری نظر میں

لُغاتُ القرآن

از :۔ مولانا قاری احمد، ضخامت ۵۹۲ صفحات (مجلد، خوشنا گرد پوش، کاغذ، کتابت اور طباعت خوب تر) قیمت :۔ سات روپے پچاس پیسے ۔ ملنے کا پتہ :۔ قرآن محل، مقابل مولوی مسافرخانہ، کراچی

جناب مولانا قاری احمد صاحب نے قرآن پاک کا یہ لُغت آیت و پارہ کے حوالہ اور ضروری تشریحات کے ساتھ مُرتب فرمایا ہے! اُردو جاننے والوں کے لئے یہ لُغت ہر لحاظ سے مُفید اور کارآمد ہے، عربی داں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، کتاب کے شروع میں تعارف قرآن کے عنوان سے فاضل مولف نے ایک عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔

محمد سعید اینڈ سنز کو اللہ تعالیٰ دارین میں اس کا اجر عطا فرمائے گا کہ انھوں نے "لُغاتُ القرآن" کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ہماری مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ

از :۔ مولانا قمر احمد عثمانی، ضخامت ۲۸۲ صفحات، قیمت :۔ تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :۔ مطبوعات مشرق، ہرمزجی اسٹریٹ، کراچی۔

اس کتاب میں پاکستان کی مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ لیا گیا ہے، اور اس پر مقدمہ وزارت خوراک کے جوائنٹ سکریٹری جناب سلیم اللہ فہمی نے لکھا ہے!

مولانا قمر عثمانی پاکستان کی دینی جماعتوں کا جائزہ لینے سے قبل اگر اپنے افکار کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا فرما لیتے، تو زیادہ اچھا ہوتا! "ضبطِ ولادت" کی حمایت میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اُن کی فکر اور ذہنیت کا اتا پتا ملتا ہے۔

اس کتاب میں کوئی شک نہیں بعض مباحث بڑے جاندار ہیں اور لائق مصنف نے خاصے اچھے انداز میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے! علامہ اقبال کے دینی افکار سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں، کتنے ہی صفحات اقبال کی تحریروں کے اقتباسات کی نذر ہوگئے ہیں۔

احادیثِ رسول کے بارے میں مولانا مودودی کا جو نظریہ اور اعتقاد ہے اس کا صحیح اندازہ رسالہ "ترجمان القرآن" کے "منصبِ رسالت نمبر" سے ہوتا ہے، اس کو قمر عثمانی صاحب اگر پڑھ لیتے، تو زبانِ طعن دراز نہ کرتے!

مسٹر پرویز کو علماء بالاتفاق "کافر" قرار دے چکے ہیں، لہٰذا مولانا قمر عثمانی کو اس شخص کے افکار اور تحریک کا ذکر مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے ساتھ نہیں کرنا چاہئیے تھا! پرویز کسی عنوان بھی داد و ستائش کا مستحق نہیں ہے

مُسافرانِ لندن

از :۔ سرسید احمد خاں مرحوم، مُرتبہ :۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ضخامت ۲۹۶ صفحات (جلی ٹائپ خوشنا دبیز رنگین سرورق) قیمت :۔ تین روپے۔

ملنے کا پتہ :۔ مجلس ترقی ادب، ۲ نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور

مجلس ترقی ادب (لاہور) جس کے رُوحِ رواں جناب سید امتیاز علی تاج ہیں، اُردو کلاسیکی ادب کی اشاعت کا قابلِ قدر کارنامہ انجام دے رہی ہے، اُس نے اب تک بہت سی کتابیں ترتیب و طباعت کے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔

سرسید احمد خاں مرحوم جن دنوں بنارس میں عدالتِ مقدماتِ خفیفہ (Small Cause Court) کے جج تھے تو

۱۸۶۹ء میں بنارس سے یکم اپریل [illegible] کو بمبئی روانہ ہوتے اور بمبئی سے دُخانی جہاز کے ذریعہ پانچ آدمیوں کے اس مختصر سے قافلے نے لندن کو کوچ کیا، سرسید کے علاوہ ان کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود، مرزا خدا داد بیگ، اور ان کا پرانا خدمت گار چھجو اس قافلے میں شریک تھے۔

سرسید احمد خاں نے اپنے سفر میں جو حالات اور خطوط لکھے تھے، وہ بس ایک اخبار میں چھپ کر رہ گئے۔ ان تاریخی اور ادبی فوائد کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔

مجلس ترقی ادب نے ان مضامین کو "کتاب" بنا کر علم و ادب اور فنِ وقائع نگاری کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی جو اس سفرنامہ کے مُرتب ہیں، اُن کی کاوش بھی قابلِ تحسین ہے۔

یہ سفرنامہ دلچسپ ہے، معلومات آفریں ہے اور اب سے ۹۰ سال پہلے کے مغربی تہذیب و تمدن کی جھلکیوں کا آئینہ دار ہے۔ اگر سرسید بڑے ظرف کے انسان تھے، مگر یہ واقعہ ہے کہ یورپ کی چمک دمک دیکھ کر وہ خاصے مرعوب ہو گئے، اس مرعوبیت کی جھلک جا بجا اُن کے سفرنامہ میں ملتی ہے! سرسید مذہبی آدمی تھے، اور اخلاقی اعتبار سے پاک صاف کردار رکھتے تھے، پیرس و لندن کے طوفانِ ہوا و ہوس میں اُن کا سرِ دامن بھی تر نہیں ہونے پایا، مگر یورپ کی مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ انہیں وہاں کی ہر چیز خوش نما اور بھلی لگتی ہے، یہاں تک کہ اُن کا قلم یورپ کی اخلاقی برائیوں پر تنقید کرنے سے گریز کرتا ہے!

سرسید احمد خاں اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:-

"میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے
لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔۔۔"

سرسید کے نہ صرف سفر کا بلکہ اُن کی زندگی کا یہ سب سے زیادہ روشن پہلو ہے کہ سر ولیم میور کی کتاب (LIFE OF MOHAMMAD) کو دیکھ کر وہ تلملا اُٹھے اور اس متعصب اور ادب ناشناس مورخ نے ذاتِ رسالت مآبؐ پر جو نازیبا حملے کئے تھے، اُن کا جواب دینے کے لئے انھوں نے اپنے وقت، صحت اور سرمایہ کی قربانی دی!

سرسید نے جب لندن کا سفر کیا ہے، تو وہ بہت سستے کا زمانہ تھا، موٹریں اُس وقت تک نہیں چلی تھیں، بگھیوں میں سفر ہوتا تھا سرسید کو ایک دن سواری کے کرایہ میں دس روپیہ خرچ کرنے پڑے، تو انھوں نے اس رقم کو محسوس کیا، کہ اُن کی جیب اس شاہ خرچی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ لکھتے ہیں:-

"آپ کو معلوم ہے کرایہ کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہے؟ دس روپے روز! مرے! اس لئے
دوبارہ نہیں گیا، پھر کسی روز جاؤں گا"

"اس محدودہ ملک میں جس قدر نہروں کی کثرت دیکھی" (ص۱) عربی اور ٹھیٹ ہندی لفظ کے درمیان اضافت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ——— "انگوروں کی تاکوں کی بیلیں ابھی تک بڑھی نہیں ہوئی تھیں" (ص۱۳۹) "تاک" انگور کی بیل اور درخت کو کہتے ہیں، اس لئے "انگور کی تاکوں کی بیلیں" "شب قدر کی رات" والی بات ہوئی، سرسید کی دوسری کتابوں میں "مثل کا انگریزہ" اور "ہاتھ کی ہتھیلی" بھی ہماری نظر سے گزر چکا ہے ——— "میں نے یہاں بڑی غل مچائی" (ص۱۲۹) حالانکہ "غل" بالاتفاق مذکر ہے، بہادر ظفر کا شعر ہے ؎

کیا گئے فریاد میری وہ گل نازک دماغ   باغ میں غنچہ اگر چٹکے کہے کیوں غل ہوا

جانصاحب کہتے ہیں۔ لٹے تھیں محل میں پر غل اُٹھا   لینا آنا دُلہن کو بے دکہ لیا

سرسید جگہ جگہ انگریزوں کے نام کے ساتھ "مسٹر" اور اُس کے بعد "صاحب" لکھتے ہیں (مسٹر ہالک صاحب) ! مسٹر کے ساتھ "صاحب" حشو وزائد ہے !

"ایک بڑا کمرہ آراستہ ہے، جو سٹنگ روم کہلاتا ہے، یعنی ملاقات کا کمرہ (ص۱۹۲) مگر اب اس زمانہ میں اس سٹنگ روم کو "ڈرائنگ روم" کہتے ہیں !

صفحہ ۳، پر "ریلوے سٹیشن بنارس" درج ہے، سرسید احمد خاں نے "سٹیشن" نہیں "اسٹیشن" لکھا ہوگا، حرف "الف" کا حذف مجلس ترقی ادب کے پروف ریڈر نے کیا ہو۔

حیاتِ سعدی

از:۔ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی، مرتبہ:۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ضخامت ۲۵۶ صفحات

قیمت:۔ دو روپے پچاس پیسے (جلی ٹائپ، سرِورق (دیدہ زیب)

ملنے کا پتہ :۔ مجلس ترقی ادب ۲ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور

حیاتِ سعدی مولانا حالی نے اُس زمانے میں لکھی تھی، جب تنقید و سیرت نگاری کا کوئی قابلِ ذکر نمونہ اُردو زبان میں موجود تھا، اُن کی یہ کتاب سب سے پہلے مطبع انصاری دہلی میں ۱۸۸۶ء میں چھپی اور اُس کے بعد سے اب تک حیاتِ سعدی کے لاتعداد ایڈیشن نکل چکے ہیں، یہ کتاب علمی اداروں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ اب سے تقریباً ستر سال قبل اس کا فارسی ترجمہ بھی تہران میں شائع ہوا۔

حیاتِ سعدی کو مجلسِ ترقی ادب لاہور نے صحتِ کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اس کی ترتیب اور تصحیح میں بڑی کاوش اور محنت کی ہے !

"۱۷ سال کی عمر میں آپ کا عقد نکاح ایک دولت مند گھرانے میں ہوا لیکن یہ بندھن آپ کو تحصیلِ علم کے لئے مانع آیا۔"

"اور آپ کو اکتسابِ علم کا شوق کشاں کشاں دہلی لے پہنچا، جہاں ۱۸۵۵ء تک علوم منطق و فلسفہ اور عربی کی سندِ فضیلت حاصل کی" !

یہ "حالاتِ مولف" کے دو جملے ہیں جو اوپر نقل کئے گئے ہیں، ان میں پہلے جملہ کی یہ عبارت "یہ بندھن آپ کو تحصیلِ علم کے لئے مانع آیا" کتنی نا پختہ ہے، دوسرے جملہ میں "تک" کا کس قدر غلط استعمال ہوا ہے۔

حیرت ہے کہ "حالاتِ مولف" میں فاضل مولف نے غالب سے حالی کے تلمذ کا کہیں ذکر تک نہیں کیا، پھر اختصار کا یہ عالم ہے کہ صرف تین صفحات میں حالی کے حالاتِ زندگی ہی نہیں اُن کی نظم و نثر پر بھی تبصرہ فرما دیا ہے !

مولانا حالی نے شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا ذکر فعل مفرد اور ضمیر مفرد کے ساتھ کیا ہے (شیخ آیا، شیخ گیا۔۔۔) اس کی وجہ حالی نے خود لکھ دی ہے :۔

"میری رائے یہ ہے کہ جو شخص کسی کتاب کا موضوع یا ہیرو ہو اُس کو خاص خاص حالتوں کے سوا، ہمیشہ صیغہ مفرد کے ساتھ ذکر کرنا ہی اُس کی بڑی تعظیم ہے۔۔۔"

مگر

ہم ابن جوزی کا ذکر کس طرح کرتا۔

[illegible] ابن جوزی جیسے [illegible] کو سماع سے منع کیا گیا تھا۔" (ص۱۹)

[illegible] وجدان کو کھٹکتا ہے۔

[illegible] روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رسمی اور سیدھا سادہ تھا۔ (ص۱۶)

[illegible] "سرسری سا" معلوم ہوتا ہے، پھر کھانے کی صفت "سیدھا سادہ" بھی محلِ نظر ہے!

"اہلِ مذاق جانتے ہیں کہ ہیگر کی تحقیق کیسی پھسڈی ہے۔" (صفحہ ۶۴)

[illegible] کی جگہ "اہلِ مذاق" پڑھ کر بھی وجدان کھٹکتا ہے اور ہیگر کی تحقیق کو پھسڈی کہنا اور زیادہ کھلا! "پھسڈی" ۔ "میری" (بر وزن بیری) کی

[illegible] ہے۔ اس طرح :— "ایک میل کی دوڑ میں احمد تو میری رہا، مگر مقبول پھسڈی نکلا۔"

"پھسڈی" انسان کی صفت ہے، کسی تحقیق اور علمی کوشش کی صفت کے لئے نہیں بولی جاتی۔

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثے است صحیح
نتواں مُرد بسختی کہ من ایں جا زادم

[illegible]:۔ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آ گیا، اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو، اے سعدی! وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں، سختی سے مرا نہیں جاتا۔" (صفحہ ۱۵)

[illegible] ترجمہ صحیح ہے اور خاصہ رواں ہے مگر شبلی اس شعر کا ترجمہ کرتے تو کچھ اور بات ہوتی "مگر اس ضرورت سے" اس ٹکڑے نے

[illegible] کی لطافت کو بہت کچھ کم کر دیا۔

صفحہ ۵ پر لوتھر (LUTHER) جو ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا تھا، اس کا سنِ ولادت ۱۸۴۳ء اور سنِ وفات ۱۹۴۶ء لکھا ہے

[illegible] سے اس قسم کی فاحش بلکہ مضحکہ انگیز غلطی کا ارتکاب حیرت انگیز ہے۔

"مسٹر گورا دسلی نے آپ (شیخ سعدی) کی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں لکھی ہے۔" (ص۱۳)

[illegible] سنہ ٹائپ میں غلط چھپا ہے!

صفحہ ۵۸ پر "معیت" کی "ی" پر تشدید نظر آئی، جو غلط ہے، صفحہ ۶۸ پر "گیتی منتر" "گیتی منتر" چھپ گیا اور صفحہ ۱۰۶ پر "مہدو ہزل" کی جگہ "جد و ہزل" پڑھنا پڑتا، اس قسم کی کتابت اور کمپوزیشن کی غلطیاں طالب علموں اور کم لکھے پڑھے لوگوں کو شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

"حیاتِ سعدی" مولانا حالی کا لازوال ادبی اور تاریخی کارنامہ ہے، یہ کتاب اُردو زبان کی ترقی کے ہر دور میں قدر و منزلت اور شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ "مجلس ترقی ادب" نے اس کتاب کو چھاپ کر شعر و ادب اور تاریخ و تنقید کی مفید خدمت انجام دی ہے۔

رومیو جولیٹ

از:۔ ولیم شیکسپیئر، مترجم:۔ عزیز احمد (بی۔ اے آنرز) ضخامت ۲۶۸ صفحات (مجلد) قیمت:۔ پانچ روپے، ملنے کا پتہ:۔ کل پاکستان انجمن ترقی اُردو، اُردو روڈ کراچی۔

شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامہ "رومیو جولیٹ" کا اُردو ترجمہ جناب عزیز احمد نے کیا ہے اور ساتھ ہی اس کتاب پر ایک [illegible] مقدمہ تحریر فرمایا ہے! اس مقدمہ سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ شیکسپیئر نے اپنے اس ڈرامہ میں [illegible] [illegible] سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے بلکہ بقول مقدمہ نگار بعض بعض حصے تو ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے شیکسپیئر نے الفاظ [illegible]

تقریباً وہی محکوشے اپنے ڈرامے میں رکھ لئے ہیں" ——— اور موت اور قبرستان کی وحشت و ہیبت کا نقشہ اُس نے ویبسٹر کی بروک سے اخذ کیا ہے"

فاضل مقدمہ نگار شیکسپیر کے آرٹ کے جہاں مداح ہیں، وہاں اُن کی نگاہ میں "رومیو جولیٹ" کے نقائص بھی ہیں۔ مثلاً

- ——— "دوسرے منظر میں جولیٹ رات کا اور اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی کہ انا کسی کے قتل ہونے کی خبر لائی، پہلے تو جولیٹ یہ سمجھی کہ غالباً رومیو مارا گیا، یہاں قصے کے بیان کرنے میں شیکسپیر نے ایسی غلطی کی ہے، جو کسی طرح قابلِ معافی نہیں ———" (ص ۲۷)
- ——— "رومیو جولیٹ کے اسلوب اور طرزِ بیان میں یکسانیت اور ہم آہنگی نہیں پستش بغایت پست است و بلندش بغایت بلند است" اگر شیکسپیر کے کسی ڈرامہ پر سب سے زیادہ صادق آتا ہے، تو اسی ڈرامہ پر۔" (ص ۳۸)
- ——— "انا جب کسی کے مارے جانے کی خبر دیتی ہے، تو جولیٹ یہ سمجھتی ہے کہ رومیو قتل ہوا ہے، اپنے غم کا اظہار وہ ابہام اور تلازمۂ لفظی سے کرتی ہے" "Eye" (آئی) "Ay" اور "I" کا لفظی کھیل اس موقعہ پر ایسا بے محل ہے کہ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، شیکسپیر نے یہ ظلم صرف اپنے آپ پر ہی نہیں کیا، بلکہ وہ تمام ایکٹریسیں جو جولیٹ کا پارٹ کرتی ہیں اور وہ تمام مترجمین جو اس ڈرامے کا ترجمہ کرتے ہیں، اس ظلم سے آج تک پریشان ہیں۔" (ص ۴۳)
- ——— "رومیو اور جولیٹ" میں کرداروں کی سیرتوں کو نشو و نما کا موقعہ نہیں ملتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈرامہ کے عمل کی مدت بہت مختصر ہے۔"

اگر کتابوں پر مقدمے اسی دیدہ ریزی کے ساتھ نقد و نظر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے لکھے جائیں تو پڑھنے والے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کا مقدمہ جس قدر بلند ہے، اس کا ترجمہ اُسی قدر پست ہے۔ مترجم فطری شاعر نہیں ہیں، ہاں! موزوں طبع ضرور ہیں، انہیں آزاد شاعری کی بجائے شگفتہ نثر میں "رومیو جولیٹ" کا ترجمہ کرنا چاہئے تھا۔ ایک نمونہ:-

بھلا دم کیسے پھولا ہے؟ یہ سارے بہانے
جو کرتی ہے لگانے کے لئے تو دیر قصے سے زیادہ
لمبے چوڑے ہیں، کہ جس کے ٹالنے کے یہ بہانے ہیں
بتا مجھ کو، خبر چلائی ہے تو بد ہے کہ اچھی ہے
بس اتنا تو بتا دے اور باقی اور تفصیلیں
سنوں گی، میں ٹھہر کے صبر کر لوں گی۔۔۔

اس قسم کے ترجمے میں پڑھنے والے کو کیا لطف مل سکتا ہے؟

"اگر کچھ تصویر سی سرسری مری ظرافت باقی رہ جاتی ہے" (صفحہ ۹۸) "سرسری مری ظرافت" قیمہ ہو ۔۔۔

"نہیں کالا کہ وہ چڑھا تو ہم تو تلواریں سونت لیں گے۔"

[illegible]، مگر اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ "کالا غصہ" (کرودھ) بھی ہوتا ہے۔

"اگر جان ہے، تو ذرا کالر سے گردن تو باہر نکال" (ص۹)

[illegible] ہے "کالا" بیان کیا اصل تھا۔

"یہ لے جو عورتیں کمزور برتنوں کی سی ہیں، دیواروں سے اڑائی جاتی ہیں، مانٹیگو کے نوکروں کو دھکیل کے دیواروں سے بٹھاؤں گا، اور اس کی چھوکریوں کو دیواروں سے جا لڑاؤں گا۔" (ص۸)

[illegible] کہیں کسی ایکٹ کا ترجمہ نثر میں بھی فرمایا ہے، اس کا ایک نمونہ اوپر درج کیا گیا ہے، یہ ترجمہ زبان و ادب کے ساتھ مذاق ہے!

"یہاں نفرت بہت کچھ ہے، محبت اس سے زیادہ ہے" (ص۸)

[illegible] بروزن "زادہ" اور "سادہ" نہیں بروزن "لبادہ" ہے!

"پلٹ کر پھر سنبھل جاؤ، اگر تم کھا گئے گردش" (ص۹)

"گردش کھانا" کہاں کی زبان ہے!

"بڑا طیش ہے تو لڑکے!" (ص۱۱)

[illegible] یا غصہ ور کو "طیشی" کہا ہے!! جدت مگر وجدان کے لئے ناقابلِ قبول!

اس ڈرامہ کو پڑھ کر شیکسپیئر کے اصل ڈرامے کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

ابن الوقت

از:۔ ڈاکٹر ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، ضخامت ۳۶۶ صفحات (سرورق رنگین و خوشنما)
قیمت:۔ تین روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا شمار اُردو زبان و ادب کے محسنوں میں ہوتا ہے، اس قابلیت اور ذہنیت کے لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں، اُردو زبان میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد نے ہی کیا تھا، اُن کی مشہور کتاب "ابن الوقت" سب سے پہلے [illegible] چھپی تھی، اب اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے صحت و ترتیب کے ساتھ شائع کیا ہے، سید سبط حسن جو اس کتاب کے مرتب ہیں اُنھوں نے مختصر مگر ایک جامع دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

سر سید احمد خان مرحوم کوئی شک نہیں مسلمانوں کی ترقی و فلاح کا بے پناہ جذبہ اور قومی درد اپنے اندر رکھتے تھے، مگر اصلاح و ترقی کے جوش میں اُن سے بعض ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں جن کو مذہبی طبقے نے پسند نہیں کیا، ڈپٹی نذیر احمد بھی علماء اور اہلِ فکر کے اسی طبقہ میں شامل تھے، جو سرسید کے غیر معتدل مذہبی معتقدات کا مخالف تھا، ڈپٹی صاحب مرحوم نے اپنی اس کتاب میں [illegible] پیرایہ بدل بدل کر سرسید کے مذہبی عقائد اور نظریات کا مذاق اُڑایا ہے اور خوب کس کر تنقید کی ہے۔

"ابن الوقت" میں کردار نگاری کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں، زبان کتنی شیریں اور رواں ہے، پیرایہ بیان کس قدر [illegible] [illegible] سلیقہ اور حسن کے ساتھ کہی ہے۔

"او ہو ہو [illegible] وہ جا کس وقت فیرسن پڑی تھی وہ بیہی باڑ ہو گی (ص۲۲)

[illegible] آج کل اس دور میں شاید ہوتا ہوگا، یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ "فیرہ" جو بالاتفاق مذکر ہے [illegible]

زمانے میں وہ مونث بولا جاتا تھا۔

اسی طرح :-

"مجھے پڑھی یہ کتاب اُن سے صاحب سے ٹھہری خصوصیت" (ص۱۸)

ہمارے لئے یہ اندازِ بیان کس قدر نامانوس ہے۔

- "انتقام لینا تو البقائے رُعب اور سیاست کے لئے ضرور ہوگا مگر تعمم کے تھا نہیں (صفحہ ۲۹)
- "سارا خرچ میرے پندار میں ہے" (صفحہ ۶۷)
- "انگریزوں سے میری معرفت ہے" (" ")
- "اب بھی اُن کے سروں میں تعزز کے خیالات بھرے ہوئے ہیں (صفحہ ۸۱)

"البقائے رُعب" اور "تعمم" اس عربی آمیز اُردو کا دور مولانا ابوالکلام آزاد پر ختم ہوگیا۔

جن معنی میں ڈپٹی نذیر احمد نے "پندار" اور "معرفت" استعمال کیا ہے، اب ان معنی میں یہ لفظ نہیں بولے جاتے اب یوں بولتے ہیں :-

"سارا خرچ میرے علم میں ہے"۔

"انگریزوں سے میرا تعارف ہے"!

"تعزز" بھی اب اُردو روزمرہ نہیں رہا، اس کی جگہ اب عزت، شہرت اور ناموری وغیرہ الفاظ موقع محل کے لحاظ سے بولتے ہیں۔

"خدا گواہ ہے کہ صرف متھا پھٹول" (ص۷۳)

یہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے، اصل کتاب میں "متھا پٹول" ہوگا، "پٹول" پیٹنے سے مشتق ہے۔ جب کسی سے سلام و بندگی کے صرف مراسم رہ جائیں کہ کبھی آمنا سامنا ہوگیا تو ملتے پر رسماً ہاتھ رکھ دیا اسے "متھا پٹول" کہتے ہیں!

"اگر کوئی مجبور کرتا کہ جیتے ہوئے سانپ کو پکڑ لو تو شاید کر بھی گزرتے" (ص۱۶۹)

زندہ سانپ کو "جیتا سانپ" کہتے ہیں "جیتا ہوا سانپ" نہیں کہتے!

روزمرہ کی ایک مثال :- "جیتی مکھی کسی سے نہیں نگلی جاتی"۔

صفحہ ۲۹۱ پر یہ عبارت نظر آئی :-

"تم کو دختا بھر اجھتولا گھر چھوڑ کر شہر سے نکل جانا پڑا" (ص۲۹۱)

ایسے موقعوں پر روزمرہ "بھرا پُرا" آتا ہے! "آباد گھر کے معنی میں جس میں ہر طرح کا ساز و سامان ہو! "نور اللغات" میں یہ لفظ نہیں ملا، اور نہ فرہنگ آصفیہ میں! ڈپٹی نذیر احمد ضلع بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اور جب خوب جوان ہوگئے تو اپنے والد کے ساتھ دہلی گئے، سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ دہلی میں پیدا ہوئے، اور یہیں نشو و نما پائی۔ سید صاحب ڈپٹی نذیر احمد سے عمر میں صرف دس سال چھوٹے تھے! فرہنگ آصفیہ میں "بھتولا" کا نہ آنا اس کی دلیل ہے کہ دلی میں یہ لفظ نہیں بولا جاتا تھا، ضلع بجنور کے کسی گاؤں میں بولا جاتا ہوگا۔

"اس وقت تک کے مختصر اقتباسات :-

• —— "سچ ہے انسان بھی عجیب قسم کا مخلوق ہے، پھیلنا چاہے تو یہاں تک کہ "دو بادشاہے در اقلیمے نگنجند" اور سکڑنے پر آئے تو اتنا کہ "دہ درویش در گلیمے بخسپند"۔
• —— ارے بھا! غدر کے دنوں میں کچھ دیسی گھڑی کا پہر اس ہوتے فرنگی کا آیا تھا کہ بچے کی مت پھیر دی ہم سے تو ایسا چھپایا ایسا چھپایا کہ دن کو گورے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے غدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا، جس وقت فرنگی کو لاتے تھے اگر ذرا بھی مجھ کو معلوم ہو تو میں اس کو کھڑا پانی نہ پینے دوں، خدا جانے کم بخت کہاں سے آمرا تھا، نہ آتا نہ بچہ ہاتھ سے جاتا۔
• —— بحث مت کرو، میں تو مذہب کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کا سخت مخالف ہوں اور میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ دین حجت و تکرار سے حاصل ہونے والی چیز نہیں، دین دوا ہے بیمار کی، تسلی ہے بیقرار کی، متاع ہے خریدار کی، بشارت ہے امیدوار کی، نجات ہے گناہگار کی، یعنی عنایت ہے پروردگار کی۔
"ابن الوقت" اردو زبان و ادب کی بلند پایہ کتاب ہے، جس کی اشاعت پر مجلس ترقی ادب لاہور داد و تحسین کی مستحق ہے۔

شکستِ شب

از:- حسن بخت، ضخامت ۱۷۶ صفحات، (مجلد، رنگین سرورق) (جلی کتابت)
قیمت:- تین روپے ۷۵ پیسے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ الممتاز ۱۱ - گاندھی اسکوائر روڈ، گوالمنڈی، لاہور
جناب حسن بخت کی غزلوں کے اس مجموعہ (شکستِ شب) پر خواجہ صادق حسین صاحب نے پیش لفظ اور جناب عارف عبدالمتین نے مقدمہ لکھا ہے —— مقدمہ دو صفحے کا ہے، جس کی عبارت کا یہ رنگ ہے:-
"ہم جواں ولولوں کی ریل پیل، حسین امنگوں کا خروش اور البیلی آرزوؤں کی ہماہمی کا نزول متواتر محسوس کرتے رہیں"۔
"حسین امنگوں کے خروش" کی کسی نہ کسی طرح تاویل کر بھی لی جائے مگر "البیلی آرزوؤں کی ہماہمی کے نزول" کو کیا کیجئے گا۔
"اور میں سوچتا ہوں کہ جب انسان پر اجتماعی حیثیت میں آسمان پر پرواز کرنے کے دوران چاند تاروں نے موتی برسائے، تو انفرادی حیثیت میں جب وہ اپنا کلام اپنے ان ہم قدموں کے سامنے پیش کرے گا جن کی آفاق گیر جدوجہد کی دلآویز مدح سرائی کے فرائض اس نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں، تو وہ اس پر داد و تحسین کے پھولوں کی بارش کیوں نہ کریں گے"۔
اس عبارت میں کس قدر ناپختگی اور جھول پایا جاتا ہے، چاند تاروں کا موتی برسانا یہ نہ جانے ادب کا کوئی انکشاف ہے یا علم الافلاک کی ریسرچ ہے! حیرت ہے کہ لوگ کتابوں پر مقدمے لکھنے کی جرأت کرتے ہیں، اور چند سطریں بھی ٹھیک طرح سے نہیں لکھ سکتے۔
حسن بخت کے کلام میں گرمی اور جوش پایا جاتا ہے، ان کی طبیعت جدّت پسند بھی ہے، کیا اچھا ہوتا اگر وہ کچھ دن اور صبر کر لیتے، اور جب کلام میں خاصی پختگی پیدا ہو جاتی، اس وقت اپنے کلام کو کتابی شکل میں منظرِ عام پر لاتے:-
منتخب اشعار:-

میں اب بھی تلخیٔ دوراں پہ مسکراتا ہوں — کہ اعتبارِ غمِ روزگار باقی ہے
حادثاتِ جہاں کو دو آواز — عزمِ گردوں شکار لایا ہوں

دل پہ داغ ہو جہاں نہیں اے دوست   آفتابِ بہار لایا ہوں
تم ستارے تلاش کرتے ہو   میں کہ مشتِ غبار لایا ہوں

یارب! یہ کیا تضاد ہے بزمِ حیات میں   کوئی ہے غم کے ساتھ تو کوئی خوشی کے ساتھ
لوگ کانٹے بکھیر دیتے ہیں   آرزو کی حسین راہوں میں

ابھی نہ اظہارِ مدعا کر، ابھی نہ کر جراتِ تکلّم
ابھی محبت ہے بے سلیقہ، ابھی تمنا ہے بے قرینہ

طویل ہے منزلِ محبت، مگر سفر خوشگوار ہوگا
ہزاروں جلوے ہیں رہگذر میں کوئی ادھر ہے کوئی اُدھر ہے

—x—

رُسوائیِ حیات کہاں تک چلی گئی   اک مختصر سی بات، کہاں تک چلی گئی
دلِ بہار سے نکلا، کبھی نہ خوفِ خزاں   شگوفے کھل کے بھی کچھ اہتمام کر نہ سکے
گلوں کی شوخ ہنسی پر یہ تبصرے کب تک   کبھی تو گریۂ شبنم کی ہم سے بات کرو
منزلِ لامکاں سے لوٹ آیا   آدمی بھی کہاں سے لوٹ آیا
راستے ختم ہو نہ سکتے تھے   قافلہ درمیاں سے لوٹ آیا
بزمِ جہاں میں گردشِ دوراں کا ساتھ دو   موجوں کا ساتھ دو، کبھی طوفاں کا ساتھ دو

(موجوں کی جگہ کشتی یا ساحل ہوتا، تو شعر معنوی اعتبار سے زیادہ مربوط ہو جاتا)

خزاں زدہ گلستاں صلہ ہے ہماری بے خوف جستجو کا
حضور ہم نے بھی کیا مقدس فریب کھایا ہے رنگ و بُو کا

ہر رات بسر کر لیتا ہوں، ہر رات بسر ہو جاتی ہے
خوشیوں کے سنہری خوابوں میں، ہر غم کی سحر ہو جاتی ہے

اپنے ہی خون کی اس میں جھلکتی ہیں سُرخیاں   ہر جلوۂ بہار کو پہچانتے ہیں ہم
مرا مذاقِ محبت بھی ہے جداگانہ   گلوں سے عشق نہیں خار سے محبت ہے
یہ اور بات ہے کہ اُنہیں ضد سی ہوگئی   ہم حسنِ التفات کے قابل ضرور تھے
اس آستاں پہ ایک بھی سجدہ نہیں قبول   کیا مقبول ہوگئی دلِ طاعت گزار سے
لاکھ پہلو ہوں ضبط کے لیکن   کوئی آنسو نکل ہی جاتا ہے
ہم قفس کو تلاش کرتے ہیں   آشیانہ تو جل ہی جاتا ہے

دُوسرا رُخ:—

نظر میں نورِ نظر نہیں ہے جگر میں ضبط و سکوں نہیں ہے
دلِ حزیں اب جو ساعتِ انتظار آئی تو کیا کریں گے

... تو نہیں ہے کہنا کافی تھا۔ "منظر میں زیرِ نظر" تو شب لیلۃ القدر کی رات والی بات ہوئی!

اس قدر تازگی افروز ہے زلفِ برہم   باہمی ربط کے اسباب سے ڈر لگتا ہے (ص۶)

... شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا ہے :-

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

خزاں کی گرد نے ڈھانپا ہزار بار مگر   دلوں پہ صدمۂ فصلِ بہار باقی ہے (ص۸)

خزاں کی گرد اور فصلِ بہار کے صدمہ کو ڈھانپ لے ... یہ کتنی بے تکی بات ہے۔

چند اشکوں سے، چند آہوں سے   رخِ ہستی سنوار لایا ہوں (ص۹)

یہ کیا الجھی ہوئی فکر اور کس قدر کا واک انداز بیان ہے۔

نہ غنچہ چٹکا، نہ پھول مہکا، نہ سبزہ لہکا نہ دل ہی چہکا

نئے چمن کی نئی بہارو! یہ کیسی ظلمت برس رہی ہے (ص۱۱)

غنچہ، پھول اور سبزہ کے ساتھ "دل کے چہکنے کا" کیا محل تھا! یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا :-

"پرند چہکے، نہ پھول مہکے، نہ غنچے چٹکے، نہ سبزہ لہکا"

چھپ گئی ہیں غلط پناہوں میں   گم تھے آفاق جن نگاہوں میں (ص۱۵)

"نگاہوں کا غلط پناہوں میں چھپنا" کتنی مضحکہ انگیز فکر ہے!

ترے ستم نے تراشا مرے لئے جن کو   بصد خلوص وہ احسان سمیٹ لایا ہوں (ص۱۷)

محبوب کا ستم "احسان تراشا کرتا ہے" ! خوب! پھر ان احسانوں کو شاعر صاحب سمیٹ کر بھی لے گئے!! "احسان" نہ ہوئے کانچ کے ٹکڑے اور ریزے ہوئے!

بہت ہی دشوار ہو گیا ہے وفا کی دنیا میں مسکرانا

یہاں تمنا سنور رہی ہے، وہاں اشارے الجھ رہے ہیں (ص۱۹)

"تمنا کے سنورنے" سے شاعر کا کیا مطلب ہے، پھر "اشاروں کا الجھنا" اس پر مستزاد! اچھا ایسا ہو بھی جاتا ہو تو وفا کی دنیا میں مسکرانا کیوں دشوار ہو گیا! شعر کی کوئی کل بھی سیدھی ہے ؟؟

ہم بھی ہزار عشق سمیٹے ہیں دم بخود   آئیں گے آپ حسن بداماں سنا تو ہے (ص۲۲)

"ہزار عشق کا سمیٹنا" اور اس کے بعد مصرعہ میں جس نابختہ انداز میں "دم بخود" آیا ہے، اسے پڑھ کر وجدان کس قدر بے مزہ ہو گیا

بحرِ مجبوری ڈوب جاتی ہے جس میں بیچارگیِ انساں

کبھی تو سہانے مرگ سے بھی ٹپک پڑے گا وہی پسینہ (ص۲۶)

جس طرح بچے تختی پر الف بے بناتے ہیں، یہ اسی طرح کا شاعر کی نو مشقی کا شعر ہے!

ایک جلوے کی آبرو کے لئے   کتنے ارمان مل کے لٹے ہیں (ص۲۷)

... کی اعتبار سے چیستاں اور اظہار و بیان کے لحاظ سے شاعری کا بُرا نمونہ ہے!

کوئی شگفتہ سی آرزو لیکے تیری محفل کو ہم رواں ہوں + چراغِ احساس بجھ رہا ہے اسے جلاؤ کہ رات کم ہے (ص۲۳)

اس شعر میں اُلجھاؤ کے سوا اور کیا دھرا ہے۔

جمالِ لالہ و گل سے کلام کر نہ سکے   ہم اپنے ذوقِ تکلم کو عام نہ کر سکے (صفحہ ۴۴)

معلوم ہوا کہ اسکی ضرورت تھی تو "لالہ و گل" کے ساتھ "جمال" کا دم چھلا لگا دیا۔ کیا لالہ و گل کے جمال سے گفتگو کرنے کے بعد شاعر کا ذوقِ تکلم عام ہو جاتا ——— !! بات کہنے کا سلیقہ شاعری میں بڑی چیز ہے اور اسی چیز کا اس قسم کے شعروں میں فقدان ہے۔

ہر ایک درسے میں علتِ مسافرت تھا نہاں   قیام ہو نہ سکا ہم قیام کر نہ سکے (ص۴۶)

اس "درسِ مسافرت" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے !! دوسرے مصرعہ میں "ہم" کی جگہ "یا" ہوتا تو شعر کی تھوڑی بہت چول تو سیدھی بیٹھ جاتی۔

مسافرو ہر خلوص والا فریبِ مطلق کا ہے ہیولا
خلوص کی بات زندگی کے سفر میں بارِ گراں بنے گی (ص۴۹)

ذوقِ صحیح ایسی بے تکی اور انمل بے جوڑ باتوں کو بھلا گوارا کر سکتا ہے ! لاحول ولا قوۃ !

شکستِ شب کا ہر اک تاثر، سحر کی آغوش میں رہے گا
سحر کی آغوش اک اک دن متاعِ ظلمت بجاں بنے گی (ص۵۰)

یہ کیا گورکھ دھندا ہے !!

ہم جشنِ بہاراں کی وضاحت نہ کریں گے   اے جلوۂ گل تیری بھی حسرت نہ کریں گے (ص۵۵)

کیا جلوۂ گل کی حسرت کرنے سے جشنِ بہاراں کی وضاحت ہو جاتی ہے ! یہ کیا کہ جو خیال ذہن میں آیا اسے لکھ مارا !

ہر پھول کے سینے پہ ہیں ناسورِ تغیر   ہم صحنِ گلستاں میں اقامت نہ کریں گے (ص۵۵)

"ناسورِ تغیر" کتنی غیر شاعرانہ ترکیب ہے ! یہ بات کہ کسی پھول کو بھی ثبات نہیں ہے، اچھے لفظوں میں بیان کرنی چاہیئے تھی !

زخموں کی فراوانی ہے مقصودِ طبیعت   مر جائیں گے تکلیفِ جراحت نہ کریں گے (ص۵۵)

اول تو "مقصودِ طبیعت" ہی اس شعر میں اکھڑا اکھڑا لگتا ہے، پھر "تکلیفِ جراحت" نے شعر میں ابہام بلکہ اہمال پیدا کر دیا!
"تکلیفِ جراحت" سے شاید شاعر کی مراد زخموں کی مرہم پٹی اور اُن پر عملِ جراحی کرنا ہے۔ مگر "تکلیفِ جراحت" سے یہ معنی کہاں پیدا ہوتے ہیں ! اس سے تو زخموں کو کریدنا، اُن کو چھیڑنا اور جراحت کاری کا مفہوم نکلتا ہے۔ جو شاعر کی طبیعت کا عین مقصود ہے پھر اس کی تمنا کیوں نہیں کریں گے ؟؟ ان سامنے کی غلطیوں کے علاوہ ناسور سینے میں ہوتا ہے سینے پر نہیں ہوتا۔

ثناہی بخت کے ہمراہ کچھ لوگ   شعورِ خام لے کر آ رہے ہیں (ص۶۳)

دوسرا مصرعہ بالکل بچکانہ ہے۔

آیا سکون قریب تو دامن بچا گئے   لیکن ہر اضطرار سے بے ساختہ ملے (ص۶۵)

یہاں "اضطرار" کو "اضطراب" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ شاعر کو دونوں لفظوں کا معنوی فرق ہی معلوم نہیں ہے۔

یہ کس کے حسن نے بخشا مجھے مقامِ اثر   اُلجھ رہی ہے ستاروں سے آج میری نظر (ص۶۷)

ستاروں سے نگاہیں لڑانے کا "مقامِ اثر" سے آخر کیا تعلق ہے ! "اثر" کی جگہ "بلندی" وغیرہ کوئی موزوں لفظ آنا چاہیئے تھا

کچھ تغیر پسند دیوانے   ربطِ لوح و قلم سنواریں گے (صفحہ ۸۰)

لوح و قلم کے ربط کو سنوارنا ——— یہ آخر کہاں کی زبان ہے کیا اندازِ بیان ہے، ایسی باتوں سے شاعر کے شاعرانہ ذوق کا پتا...

میں ڈھونڈتا ہوں خیالوں کی بے پناہیوں میں — کبھی تو مجھ سے وہ جانِ تخیلات ملے (ص۸۶)

"خیالوں کی بے پناہی" کیا بات ہوئی، پھر اُس میں محبوب کو ڈھونڈنا! کیسی بے تکی باتیں ہیں!

دل مطمئن ہے غم کی اذیت کے تحفظ تھا

غم کی حسیں پناہ بھی کتنی جمیل تھی (ص۹۲)

ایسے شعروں کو کتابوں میں چھپوانا، شاعری کے ساتھ کتنا ظلم ہے!

یہ دور کیا ہے کہ زندگی کی خنک پناہیں سلگ رہی ہیں

تمام ذرّے ہیں شعلہ ساماں، تمام راہیں سلگ رہی ہیں (ص۹۵)

"پناہ" کا "شکستِ شب" میں اس بُرے طریقہ سے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے کہ خدا کی پناہ!

وہ تلخیاں جو ترے حسن نے تراشی تھیں — ہر ایک تارِ نفس میں پرو گئے ہیں ہم (ص۱۰۹)

حسن کا تلخیاں تراشنا ہی کم عجیب نہ تھا، کہ شاعر نے ان تراشیدہ تلخیوں کو تارِ نفس میں پرو بھی دیا — توبہ!

مری نگاہوں کی تیز بینی بھٹک گئی ہے وگرنہ ظالم

تری نگاہوں کی اوٹ میں بھی کئی اشارے تڑپ رہے ہیں (ص۱۳۹)

نگاہیں تو بھٹک جاتی ہیں مگر شاعر نے نگاہوں کی تیز بینی کو بھٹکایا ہے؟

دوسرا مصرعہ اس سے زیادہ غیر شاعرانہ اور مہمل ہے۔

جہاں جہاں ہے سحر کا عالم وہیں وہیں روشنی نہیں ہے

ہزار شمعیں ہوئی ہیں روشن مگر کہیں روشنی نہیں ہے (ص۱۶۷)

اس خیال کو جناب نازش حیدری نے کتنے اچھے پیرایہ میں ادا کیا ہے کہ پڑھیے اور وجد کیجیے:-

فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے

وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اُجالا ہے

"ترقی پسند شاعری" نے ہمارے نوجوان شاعروں کے ذہن و فکر کو جو "اعجوبہ" بنا دیا ہے، "شکستِ شب" میں اُس اعجوبگی کی فراوانی ملتی ہے۔ احسن بخت صاحب میں ترقی کرنے اور متوازن سانچے میں ڈھل جانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، اُن کے اندر جذبات کی ایک ہلچل ہے جو شعر کی زبان میں ظاہر ہونا چاہتی ہے، مگر اُن کی مشق ابھی خاصی ناپختہ ہے، فکر اور اظہار میں وہ نام نہاد ترقی پسندوں سے متاثر ہیں، اس لئے اُن کا مجموعۂ کلام عجیب سے عجیب تر بن کر رہ گیا ہے!

سرکشی ضلع بجنور

مصنف:- سر سید احمد خاں، حالاتِ مصنف و حواشی:- از:- ڈاکٹر سید معین الحق، ضخامت ۳۱۰ صفحات (مجلد، دیدہ زیب سرورق) قیمت:- چھ روپے

ملنے کا پتہ:- سلمان اکیڈمی ۲۳ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی

سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں سر سید احمد خاں مرحوم بجنور میں صدر امین تھے، اُس نواح میں کیا حالات پیش آئے، سر سید نے انگریزوں کو کس طرح بچایا؟ اور اس کوشش میں خود اُن پر کیا گزری؟ اِن کی تفصیل "سرکشی ضلع بجنور" میں ملتی ہے۔

یہ کتاب ۱۸۵۸ء میں چھپی تھی مگر اس کے تقریباً تمام نسخے تلف ہوگئے۔ اس کا ایک نسخہ تو علی گڑھ کی لائبریری میں محفوظ اور دوسرا نسخہ حسنِ اتفاق سے مشہور مؤرخ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کے بھتیجے مولوی محمد ایوب خاں کے پاس نکل آیا۔ اسی کو سلمان اکیڈیمی نے شائع کیا ہے، اور ڈاکٹر سید معین الحق نے مصنف کے حالات اور ضروری حواشی تحریر فرمائے ہیں۔

ڈاکٹر سید معین الحق نے بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ سر سید احمد خاں مرحوم کے حالات لکھے ہیں، ان واقعات کا زیادہ تر ماخذ تو حالی کی کتاب "حیاتِ جاوید" ہے، مگر دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

سنہ ستاون کے غدر میں سر سید کو یہ نظر آرہا تھا کہ یہ شورش چند دنوں کی مہمان ہے۔ انگریزی راج ہندوستان میں باقی رہے گا۔ کو اس ہنگامے سے الگ تھلگ رہنا چاہیے، ورنہ وہ نقصان اُٹھائیں گے ——— اسی لئے انھوں نے انگریزی حکومت کے قیام کا ثبوت دیا، انگریزوں کو جان پر کھیل کر بچایا، اور جنگِ آزادی کے مجاہدین کی مخالفت کی۔

اس کتاب میں انگریزوں کی مرعوبیت اور اُن سے وفاداری کے جابجا نمونے نظر آتے ہیں ——— شیکسپیر جو اُن دنوں بجنور کا کلکٹر تھا، اُس کے بیٹے کے نام کے ساتھ سر سید نے "سلمہ اللہ تعالیٰ" لکھا ہے (ص ۱۳۲) محمود خاں، جو نواحِ بجنور میں جنگ کی کمان سنبھالے ہوئے تھے، ان کو سر سید اپنی کتاب میں جگہ جگہ "نامحمود خاں" لکھتے ہیں۔

وقائع نگاری میں بھی سر سید احمد خاں دفتری زبان استعمال کرتے ہیں ——— مثلاً "نگینہ میں تو یہ آفت ہو رہی تھی ہم تینوں افسر حضور جناب صاحب کلکٹر بہادر حاضر تھے۔" (ص ۱۴۳) انگریز عہدیداروں کے ناموں کے ساتھ "دام اقبالہٗ" لکھا گیا۔ ہندوستانی فوج جس نے انگریزی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا، اُس کو سر سید "نمک حرام" کہتے ہیں (ص ۱۶۴)

صفحہ ۲۰۲ پر یہ عبارت بھی نظر سے گزری:۔

"درحقیقت میں خود نہیں لکھتا، بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں، اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے، کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو، میں کیوں نہ اس کو کہوں، اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہوتا، اور اُس کو بیان کر کے اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے" (ص ۲۰۲)

انگریز کو "آقا" سمجھنے کی ذہنیت نے سر سید کے علمی افکار تک کو متاثر کیا ہے۔

اور دیکھئے

"جب ضلع ہمارے سپرد ہوا، تو میری یہ رائے تھی کہ پہلے الفاظ منادی کے یعنی خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی صاحب بہادر کا بدلے جاویں، اور بجائے "ملک بادشاہ" کے پکارا جاوے کہ ملک وکٹوریہ شاہ لندن کا۔۔۔" (ص ۲۰۶)

انگریزوں کی فتح ہوتی ہے تو سر سید خوشی کے مارے باغ باغ ہو جاتے ہیں:۔

"بہت سے ہتھیار اور گھوڑے سواروں کے جو مارے گئے تھے اور ایک تھیلا میگزین کا جو بھرا ہوا تھا فوجِ سرکاری کے ہاتھ آیا، اور فتح و نصرت نصیب اولیائے دولت سرکار ہوئی، اس معرکہ میں چار سو آدمی تخمیناً باغیوں کا مارا گیا۔" (ص ۲۶۳)

جو باغی انگریزوں کے خلاف مورچے جاتے ہوتے تھے، ان کی توپوں کی گولہ اندازی پر سر سید اس طرح طنز کرتے ہیں:۔

"۔۔۔ گولہ انداز ایسے خوب تھے کہ گویا سالیہ پہاڑ نشانہ کی جگہ رکھ کر اُس سے کہا جاوے کہ

اس پہ گولی مارو تو خدا سے امید یہی ہے کہ ہمیشہ خطا کرے گا۔۔۔" (ص۱۹۲)

کتاب کی زبان سیدھی سادی اور سہل و عام فہم ہے، عنوانات کا یہ قدیم انداز ہے:۔

- ـــــــ" رائے اس امر میں کہ ان لڑائیوں کو لوگ کیا سمجھتے تھے"
- ـــــــ" جناب کلکٹر صاحب کے خط کا چودھریوں کے نام آنا"
- ـــــــ"چودھریوں کی کمک اور توپوں کے ہاتھ نہ لگنے کا ذکر"

سرکشی ضلع بجنور" ایک اہم تاریخی یادداشت ہے، جس کے مطالعہ سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اسباب و محرکات کے سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے!

گنجینۂ عبرت

از:۔ عزیز لدھیانوی، ضخامت ۱۹۶ صفحات، قیمت:۔ تین روپے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ شگوفہ گوجرانوالہ

یہ منظوم کتاب سچ مچ عبرت و نصیحت کا گنجینہ ہے، اخلاق و نیکوکاری اور پند و نصیحت کے سینکڑوں موضوعات پر چار مصرعوں کے قطعے ہیں، کوئی شک نہیں شاعر کی نیت بخیر اور جذبہ مصلحانہ ہے، انھوں نے دماغی محنت بھی کی ہے مگر جہاں تک "شعریت" کا تعلق ہے، اُس کا دُور دُور پتہ نہیں۔

ہے حلیمی عزیز وہ ہتھیار	جس سے دُشمن بھی زیر ہوتا ہے
اپنے بیگانے کہتے ہیں تو قیر	سنگ و آہن بھی زیر ہوتا ہے
جی لگا کر پڑھا ہو جب پڑھنے کا وقت	کھیل جس دم کھیلنے کا وقت ہو
دوست اہر کام کا موسم ہر ایک	موسم گندم میں تو چاول نہ لو
گر طبیعت میں غصہ و غم ہو	جب کبھی دل پہ رنج ہو تیرے
تجھ کو لازم ہے اے عزیز حزیں	ایسے میں مت کسی کو خط لکھیے

اس طرح کے لفظوں کے جوڑ دینے کو کیا "شاعری" کہہ سکتے ہیں، نہ کوئی فکر، نہ کسی قسم کا لطفِ بیان!

اے ہم نشین تو رنج والم کو نہ ساتھ رکھ	ہر دم رہے گا ورنہ مصائب کا سر پہ تاج
فرما گئے ہیں خوب جناب طبیب عزیز	یہ وہ مرض ہے جس کا نہیں ہے کوئی علاج

اس قطعہ کا مصرعِ اولیٰ سیدھا سادہ ہے، مگر دوسرے مصرعہ میں "مصائب کا تاج" کہہ کر شاعر نے اپنی بے ذوقی کا ثبوت دیا نہ اس طرح بولتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں کہ فلاں کام کرنے سے سر پہ غموں اور مصیبتوں کا تاج رہا کرے گا ـــــــ توبہ! پھر تیسرے مصرعہ میں "عزیز" کا "ع" تقطیع سے غائب ہے! اس قسم کے "مکتبی تک بند" کم سے کم عروض تو صحیح کرتے ہیں، مگر یہاں یہ "صفت" بھی غائب ہے۔

ایک قطعہ کا عنوان "دُنیوی محبت" ہے:۔

اے دوست! نہ ہو اس پہ دل و جان سے قرباں	دُنیا میں با فراط ہیں ریزے بھی گہر بھی
ہر بات نہیں ہوتی ہے فیضان کا مرکز	ہر چیز چمکتی ہوئی سونا نہیں ہوتی

کم سے کم عزیز صاحب اس آہنگ کو تو اپنے قطعات میں قائم رکھ سکتے۔

قولِ سدید از: مولوی ضیاء احمد بدایونی (ایم۔ اے) ضخامت ۲۲۰ صفحات، قیمت: ایک روپیہ،
ملنے کا پتہ: مشتاق بک ڈپو، نزد اُردو کالج، شلڈن روڈ، کراچی نمبر ۱

یہ کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کے رد میں لکھی گئی ہے، اور "می قوال واو بہ شمشیر جواب شمشیر" کا رنگ اس میں نظر آتا ہے۔ محمود عباسی نے اپنی کتاب میں جو "مغالطے" دیئے ہیں، اُن میں سے بعض کے شکست اور دندان شکن جوابات دیئے گئے ہیں۔

طبری کی روایت کا یہ ٹکڑا "فاضع یدہ فی یدہ" (میں (یعنی حسین) اُس کے (یعنی یزید) کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں) — "قولِ سدید" کے مصنف کی تحقیق کے مطابق "نواصب" کا بڑھایا ہوا ہے، کیونکہ عقبہ بن سمعان جو شروع سے آخر تک امام کے رفیق و ہمسفر رہے، اور آپ کے تمام مخاطبات کے گواہ ہیں، قسم کھاتے ہیں کہ "واللہ ما اعطاہم ما یزعمون ان یضع یدہ فی ید یزید" بخدا آپ (حضرت حسین) نے ہرگز یہ صورت جیسا کہ مخالفوں نے پیش کر رکھی ہے، پیش نہیں فرمائی کہ آپ یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں گے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول درج کیا ہے:۔

اہلِ سنت قاطبۃً اجماع دارند برآنکہ معاویہ ابن ابی سفیان از ابتدائے امامت حضرت امیر تا غایت تفویض حضرت امام حسن بہ اُو از بغاۃ بود کہ اطاعت امام وقت نہ داشت۔

اہلِ سنت سب اس امر پر متفق ہیں کہ معاویہ ابن ابی سفیان، حضرت علیؓ کی ابتدائے خلافت سے حضرت حسنؓ کی تفویض حکومت تک باغیوں میں سے تھے کہ امام وقت کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔

یزید کے بارے میں الاغانی نے تو بے شک "شراب" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی عربی زبان میں "سکر و خمر" کے نہیں ہیں مگر علامہ ذہبی نے صریحی طور پر "مسکر" کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور بقول صاحب قولِ سدید حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ، یزید کو "سکیر و خمیر" (چھٹا ہوا رند اور پکا شرابی) کہتے تھے!

یزید کی روایتِ حدیث کے بارے میں علامہ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں "لیس باہل ان یروی عنہ" یزید اس کا اہل نہیں کہ اس سے روایت لی جائے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں "ا دمقدوح فی عدالتہ ولیس باھل ان یروی عنہ" اس کی عدالت پر اعتراض کیا گیا ہے اور وہ اس لائق نہیں کہ اس کی روایت قبول کی جائے۔ امام احمد کا ارشاد ہے: "لا ینبغی ان یروی عنہ" اُس سے روایت کرنا جائز نہیں۔

یزید کی مغفوریت کے بارے میں جس حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے، اُس کے راویوں (اسحٰق، یحییٰ، ثور، خالد بن معدان) کو علمائے فن حدیث کے اقوال کے حوالوں کے ساتھ مجروح و مقدوح ثابت کیا گیا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

محمود عباسی نے اپنی تائید میں بعض مستشرقین کی عبارتوں کے حوالے دیئے ہیں، مولانا ضیاء احمد بدایونی بھی گبن، سر ولیم میور اور براؤن کی تحریروں کے اقتباسات دے کر، یزید کے فسق و فجور پر دلیلیں لائے ہیں۔

"خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں اموی فرمانرواؤں کے مناقب بیان کئے گئے ہیں، اور "قولِ سدید" میں مثالب!

"قولِ سدید" کے مصنف کا قلب اہلِ بیتِ کرام کی محبت سے معمور ہے، اس کی جھلکیاں پوری کتاب میں نظر آتی ہیں، اس سلسلہ میں اس انداز کا غلو بھی ہو گیا ہے:۔

"ابنِ عساکر نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ تین سو آیات علیؓ کی شان میں نازل ہوئی ہیں"۔

اسی قسم کی روایات کے سبب تو ابنِ عساکر کا شمار نچلے درجے کے محدثین میں کیا گیا ہے۔

حیرت ہے کہ ... سے اس کتاب پر مقدمہ لکھوایا گیا ہے یہ تو وہ شخص ہے جس کے قلم نے اسلام کو جتنا نقصان پہونچایا ہے اتنا نقصان یہودی اور عیسائی اہلِ قلم نے بھی نہیں پہونچایا۔

پیاری نظمیں

مرتبہ :- فضل حسین (ایم۔اے۔ ایل۔ ٹی) ضخامت ۳۲ صفحات (کاغذ، لکھائی، چھپائی اور سرورق ہر چیز خوبصورت اور خوشنما) قیمت :- چار آنہ

حصہ دوم ملنے کا پتہ :- مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند، رامپور (انڈیا)

اس کتابچے میں بچوں اور بچیوں کے لئے نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ نظمیں انتہائی سادہ اور مترنم ہیں کہ بچے شوق سے پڑھیں اور ایک دوسرے کو سنائیں!

خود سلام کر کے اُن کو اپنے پاس بُلاتے تھے (صفحہ ۳)

مصرعِ اولیٰ بحر سے خارج ہے!

شرفو غریب بچہ اک دن چلا مدرسہ (صفحہ ۱۱)

عام طور پر مدرسہ کو مَدَرسہ ہی بولتے ہیں، مگر بچوں کو شروع ہی سے الفاظ کے صحیح تلفظ ہی کی مشق کیوں نہ کرائی جائے!

"پیاری نظمیں" اخلاق کے انمول موتی ہیں، جن کے پڑھنے سے ایک طرف بچوں میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن کے ذہن و فکر کی تربیت ہوتی ہے۔

مجلس
مولوی عبدالحق نمبر

ایڈیٹر :- محمد منظور احمد، ضخامت ۲۴۲ صفحات - (بڑا سائز، سفید چکنا کاغذ)
زرِ سالانہ :- تین روپے، اس خاص نمبر کی قیمت تین روپے (علاوہ محصول ڈاک)
ملنے کا پتہ :- اُردو مجلس، اُردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد (آندھرا پردیش بھارت)

اُردو مجلس اس پُرآشوب دور میں بھی اُردو زبان و ادب کی خدمت جوش و بیباکی کے ساتھ انجام دے رہی ہے، اسی ادارے کی جانب سے سہ ماہی رسالہ (مجلس) بھی شائع ہوتا ہے جس کا "مولوی عبدالحق نمبر" بڑی آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔

"مولوی عبدالحق نمبر" نے مضامین، ٹائپ، کاغذ اور سائز کے اعتبار سے مولوی عبدالحق مرحوم کے رسالہ "اُردو" کی یاد تازہ کر دی ہے! مضامین بلند پایہ اور متنوع ہیں ہر لکھنے والے نے بڑے خلوص کے ساتھ بابائے اُردو کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

منظومات بھی خوب ہیں، یہ رسالہ کہنے کو تو "مولوی عبدالحق نمبر" ہے مگر در اصل اُردو زبان کی پچاس سالہ تاریخ ہے! "اُردو مجلس" اس شمارۂ خاص کی اشاعت پر اُردو دُنیا کی طرف سے مُبارکباد اور شکریہ کی مستحق ہے!

وکرم اروسی

مصنف :- مہاکوی کالی داس، ترجمہ :- محمد عزیز مرزا لکھنوی، مُرتبہ :- عشرت رحمانی،
ضخامت ۱۶۸ صفحات، قیمت :- ایک روپیہ پچھتر پیسے۔
ملنے کا پتہ :- مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور۔

مہاکوی (ملک الشعراء) کالی داس کے ڈرامہ "وکرم اروسی" کا اُردو ترجمہ محمد عزیز مرزا نے ۱۸۹۱ء میں کیا تھا

اس ترجمہ کو مجلس ترقی ادب، لاہور نے شائع کیا ہے! "ڈرامہ اور ناٹک" کی تاریخ پر فاضل مترجم نے جو مقدمہ لکھا ہے۔ معلومات آفریں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "سنسکرت ادب" پر کتنی مترجم کی نگاہ تھی!

"وکرم اُروسی" ایک رُومانی ڈرامہ ہے۔ جس میں محبوب و محب کی نفسیات کی نہایت ہی دلکش ترجمانی پائی جا... "رومان" کی یہ "لے" کہیں کہیں خاصی تیز بلکہ شوخ بھی ہو گئی ہے، اور شاعر ہوس آمیز جذبات کی رو میں بہہ گیا ہے۔

چند اقتباسات:—

- میں قدم قدم پر دیکھ رہا ہوں، کیوں کر کروکی کے پھول کسی البیلے کے ناخنوں کی طرح سُرخی میں سپیدی کی جھلک دکھ... ہیں اور یہ اشوک کی سُرخ کلیاں جن کے کناروں پر سیاہ دھاریاں ہیں، اور یہ پنکھڑیوں کے بجاؤ سے اور بھی شوخ رنگ ہو... ہیں، کھلنے کے لئے پھٹی پڑتی ہیں، اور آم کے درخت نوخیز ابھرے سے لدے ہوئے ہیں۔"
- —"افسوس مجھے مور کے پہلے دھوکا دیا، جو چر مُر ہو کر، کیسر کا مرجھایا ہوا پھول سا بن گیا ہے۔"
- —"ماس کا جانا، آپ کے حق میں تو بہت ہی اچھا ہوا، جس شخص کی آنکھیں دکھتی ہوں، وہ چراغ کی تاب نہیں لا سکتا۔"
- —"دوپہر کی تیز دھوپ سے بیقرار ہو کر مور درختوں کے تھالوں میں بیٹھے ہوئے آرام لے رہے ہیں، بھونرا، پانگ... کلی کھول کر گنبد کل میں اینڈ رہا ہے، اور بگلا تالاب کے گرم پانی سے نکل کر کنارے پر کنول کی بیلوں کے پاس ستا رہا ہے۔"
- —"جو خوشی مصیبت کے بعد حاصل ہوتی ہے، وہ زیادہ دلکش ہوتی ہے، کیوں کہ درختوں کے سائے کا لُطف دھوپ کا مُسافر ہی جانتا ہے۔"
- او شوخ رفتار! ایک ... پارۂ ابر کے غبارے میں لے چل، جس پر دھنک کی خوش رنگ کمانیاں ہوں، اور طرف بجلی کی جھنڈیاں لہرا رہی ہوں۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے ترجمہ کی روانی اور سلاست کا اندازہ کیا جا سکتا ہے! کہیں کہیں "ترجمہ" میں "آورد" کا یہ رنگ بھی نظر آیا۔

"عورتوں کی اپنے عشاق پر ایسی حکومت نہیں ہوتی کہ ناراضی کے لئے ان کے صدق و صفا سے ہٹنے کی ضرورت ہو"۔ (ص ۱۳۳)

"یہ تو خاص پریوں کا تفریح گاہ ہے"۔ (ص ۱۳۷)

"گاہ" کے ساتھ جو الفاظ (عیدگاہ، مسرت گاہ، سیرگاہ ...) اُردو میں بولے جاتے ہیں وہ مونث ہیں!

سوغات

مدیر:- غلام احمد، مُرتب:- محمود ایاز، ضخامت ..۳ صفحات

ملنے کا پتہ:- دفتر ساہی "سوغات" بی، ۲۹ ساتٹ، منگو پیر روڈ کراچی ۱۶

ہندوستان میں:- ۲۷ کلائن روڈ، بنگلور ۵

یہ ساہی مجلہ بڑے سلیقہ کے ساتھ مُرتب کیا جاتا ہے، اس کے مضامین متنوع اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ سطحیت... بلند، اونچے درجے کے مضامین! اس کا جو شمارہ (۲ - ۱۰) ہمارے سامنے ہے، اس میں باقر مہدی اور ممتاز حسین کے مضامین بہت خوب ہیں!

—— مگر افسوس ہے کہ ——

س کا حصۂ نظم، نثر کے مقابلہ میں بہت پست ہے!

میرے خدا نے بہت صبر کیا میرے ساتھ ورنہ کیوں سانحہ کیا نہ ہوا میرے ساتھ (قمر جمیل)

اس مطلع میں اہمال کے سوا اور کیا رکھا ہے! اگر یہ سہو کتابت ہے کہ "جبر" کی بجائے "صبر" چھپ گیا۔ تو پھر شعر دولخت ہو جاتا ہے۔

یہ پیالہ ہے کہ دل ہے، شراب ہے کہ جاں ہے یہ درخت ہے کہ سائے کسی دستِ مہرباں کے

گیا "پیالۂ دل" میں "جان" بھری ہوتی ہے، جو "جان" کو "شراب" سے تشبیہ دی گئی ہے —— ! پھر پیالہ، اور شراب کے بعد "درختوں کے سائے" کی طرف شاعر کے ذہن کا ایکا ایکی انتقال، کس قدر بے جوڑ ہے!

خرد یقیں کے سکون زار کی تلاش میں ہے یہ دھوپ سایہ دیوار کی تلاش میں ہے (محب عارفی)

غزل کے اس مطلع کا مصرعہ ثانی بہت خوب ہے، مگر مصرعہ اولیٰ میں "سکون زار" نے شعر کے سارے لطف ہی کو غارت کر دیا۔ "یقیں" کا "سکون زار" کتنا نامانوس اندازِ بیان ہے!

آنگن کے نلکے پہ کس کے کومل گجرے کھنکے ہیں
گونج اٹھا ہے میری زخمی روح میں ٹھہرا سناٹا (ناصر شہزاد)

کوئی شک نہیں اس غزل کی ہیئت اور آہنگ میں نیا پن پایا جاتا ہے، مگر شاعر اس "جدت" کو غزل میں پوری طرح نباہ نہیں سکا، اسی شعر میں "کومل گجرے کا کھنکنا" کتنی غیر واقعی بات ہے جو کہی گئی ہے۔ ہاتھوں کی چوڑیاں کھنکتی اور بجتی ہیں، "گجرے" جو کلیوں اور پھولوں کے بنے ہوتے ہیں۔ ان میں "کھنک" پیدا نہیں ہو سکتی! مصرعہ ثانی بھی محلِ نظر ہے —— کہ روح میں کسی آواز کا گونجنا، کہاں تک صحیح ہے!

ایک نظم کا عنوان ہے "آدھی رات کا سورج" یہ تیلے سروپا "نظم" ہے: ۔

کسی چوکھٹ پہ چوکیدار لاٹھی کھٹکھٹاتا ہے
وہ کھڑکی کھل گئی
اک ریلوے انجن، تھکی ہاری بسیں موٹریں
تمہاری الجھنیں، محرومیاں، کج بحث گتے
پھر قطار اندر قطار آئے
وہ کھڑکی کھل گئی
پھر زمہریری موت دراتی چلی آئی (اسد محمد خاں)

اگر اس قسم کی نظمیں اردو زبان و ادب میں رواج پا گئیں تو "اردو زبان" سے لوگ نفرت کرنے لگیں گے! "کتوں" کو جو کوئی "کج بحث" کہتا ہے، اس کے دل و دماغ میں "کجی" پائی جاتی ہے! پھر یہ "زمہریری موت" کیا ہوتی ہے، شاید اس سے مراد ہمقانی سرد ہوا ہو!

"مُردہ خانہ" ایک نئے آدر "نظم" ہے! نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ۔

مری رگوں میں خنک سوئیاں پروتا ہوا	برہنہ لاشوں کے انبار پر سے ہوتا ہوا
ہوا کا ہاتھ بہت سرد، موت جیسا سرد	وہ جا رہا ہے وہ دروازے سر پٹکنے لگے

"سوئیاں" پڑھتے ہوئے زبان کتنی ثقالت محسوس کرتی ہے، پھر "ہوا کے ہاتھ" کا یہاں کیا محل تھا، اور سب سے زیادہ مضحکہ انگیز "ہوا کے ہاتھ کا جانا" ہے۔

ہر ایک تجربے کے جلو میں اب تو	پہچان کے دھندلے سے نشان ملتے ہیں	(باقر مہدی)

شاعر کو "تجربے" کا صحیح تلفظ تک نہیں معلوم! پھر یہ بات کیا ہوئی، کہ تجربے کے جلو میں پہچان کے دھندلے سے نشان اب ملنے لگے ہیں ــــ!

Life and Prayer of Imam Zainul Abideen

پیش کردہ :۔ ایم عباس اورنگ آبادی، ضخامت ۴۴ صفحات (جیبی سائز) قیمت درج نہیں)

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ :۔ مصنف، مٹھائی کمپاؤنڈ، کراچی

انگریزی کے اس کتابچے میں حضرت سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی مقدس زندگی کے مختصر حالات درج ہیں، اور آخر میں وہ دعائیں ہیں جو جناب امام نے قیدِ شام میں اور دمشق کے قید خانہ میں آدھی رات کو پڑھی تھیں، ان دعاؤں کا انگریزی ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے! یہ دعائیں بندگی کے عجز و تذلل اور تضرع و زاری کے جذبات و کیفیات سے لبریز ہیں ان کو پڑھ کر ایک مسلمان کے یہ سامنے حقیقت آنی چاہیئے کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی روح یا قبر سے التجا کرنا اور مدد چاہنا ایک موحد کو زیب نہیں دیتا۔

اس کتاب میں جو یہ لکھا گیا ہے کہ امام زین العابدین کی والدہ کا نام شہربانو تھا جو نوشیرواں کی پوتی تھیں اس کی تائید مستند کتب تاریخ سے نہیں ہوتی! غالباً سب سے پہلے زمخشری نے اپنی کتاب ـــ ربیع الابرار ـــ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے! زمخشری کوئی شک نہیں عربی لغت اور معانی و بیان کے امام ہیں، مگر فنِ تاریخ میں اُن کا کوئی درجہ اور حیثیت نہیں ہے، ابن خلکان نے بھی زمخشری کے حوالے سے یہ روایت نقل کر دی۔ دوسرے اکابر مورخین طبری، ابن اثیر، یعقوبی، بلاذری اور ابن قتیبہ نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا، اور ان مورخین کا ذکر نہ کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ اس واقعہ کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے۔

ابن قتیبہ جو زمخشری سے تین سو سال پہلے ہوتے ہیں، حضرت امام زین العابدین کے نسب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ ان امہ سندیہ یقال لھا سلامہ ویقال غزالہ۔۔"

(اُن (زین العابدینؓ) کی ماں سندھی تھیں جن کو سلامہ (یا سلافہ) کہا جاتا تھا۔ (یعنی اُن کا نام سلامہ تھا) اور "غزالہ" کے نام سے مشہور تھیں (یعنی ان کو "غزالہ" بھی کہتے تھے، یہ اُن کا عُرف تھا)

شعر و ادب اور حکایت و قصص (محاضرات) کی کتابوں میں لکھے ہوئے واقعات کس قدر ہمہ گیر غلط فہمی کا سبب بن جاتے ہیں ــ

درد سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری نجات کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور توانائی کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال

پاکستان کی معاشی ترقی کے لئے
چھوٹی اور بڑی صنعتوں کی
متوازن ترقی ضروری ہے۔
اشیائے صرف کی وسیع پیمانے پر
پیداوار میں جو دشواریاں پیش آتی
ہیں جدید صنعتی مشینیں ان کا
بہترین حل ہیں۔
چھوٹی صنعتیں موروثی فنون لطیفہ کی
پرورش و سرپرستی کرنے کے علاوہ
فنکاروں اور دستکاروں کیلئے وسیع
ذرائع روزگار مہیا کرکے زندگی کے
معیار کو بلند کرتی ہیں۔

چھوٹی صنعتیں

معاشی خوشحالی کی مضبوط بنیادیں!

آج تک پی۔آئی۔ڈی۔سی کی کوششیں
صرف بڑی صنعتوں کے فروغ تک ہی
محدود تھیں لیکن اب مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کو چھوٹی
صنعتوں کی جدید طریق پر ترقی کی
ذمہ داری بھی سونپ دی گئی ہے۔
یہ صنعتیں بھی اہل ملک کی خوشحالی کیلئے
پوری طرح کارگر ہونی چاہئیں۔
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
اس غرض پر اپنے گزشتہ تجربات
روایات کے مطابق مصروف ہے

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
کی نئی اور اہم مہم
چھوٹی اور بڑی دونوں
صنعتوں کی
یکساں ترقی

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

آدم جی کے پارچہ جات
ہوتے ہیں
آدم جی کاٹن ملز
لاہور کراچی

کے-ٹو
ان کے مستقل قدرداں
اوروں سے زیادہ ہیں
K-2
CIGARETTES

فاران کراچی

جلد ۱۴ — شمارہ ۶

ایڈیٹر: ماہر القادری — ماہِ ستمبر ۱۹۶۲ء

ترتیب

سالانہ چندہ سات روپے

فی پرچہ ۶۲ پیسے

مقام اشاعت: — دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

پرنٹر پبلشر مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اس مہینہ لاہور کی سیرت کانفرنس اور نعتیہ مشاعرے میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جلسہ گاہ کو بڑے قرینہ کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا، سامعین کی وہ کثرت کہ حدِ نگاہ تک سر ہی سر اور چہرے ہی چہرے دکھائی دیتے تھے۔ منتظمین نے بڑی حوصلہ مندی، فراخ دلی، سلیقہ اور خوش ذوقی کے ساتھ کانفرنس کے انتظامات کئے تھے، تلاوتِ قرآن، حمد و نعت کے نغمے، صلوٰۃ و سلام کے زمزمے انسانیت کے محسن صلعم کی سیرتِ مقدسہ کا ایمان افروز اور دل نشیں بیان "ورفعنا لک ذکرک" کی زندہ شہادت! کانفرنس کی تمام فضا کو اللہ تعالیٰ کی رحمت نے گھیر لیا تھا، ہر شخص کو بقدرِ ذوق و شوق سعادت و برکت حاصل ہو رہی تھی (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس کانفرنس میں شریک ہو کر جتنی مسرت ہوئی اور دل و نگاہ نے جس قدر فرحت و کشادگی محسوس کی، اُس سے زیادہ اذیت و کوفت ۱۲ ربیع الاول کے جلوس کو دیکھ کر ہوئی! اللہ تعالیٰ کا وہ آخری نبی جو رقص و سرود اور ناچ رنگ کو مٹانے کے لئے دُنیا میں مبعوث ہوا، اُس کی ولادتِ با سعادت پر خوشی کا اظہار گانے بجانے اور باجے گاجے سے کیا جا رہا تھا، جو مقدس ترین انسان حمیت و حیا اور وقار و سنجیدگی کا پیکر تھا اور جس نے دُنیا کو شائستگی سکھائی تھی، اُس کے نام لیوا، اُس کا جشنِ ولادت ان بازاری حرکتوں کے ساتھ منا رہے تھے کہ کوئی ٹولی تالیاں بجا بجا کر فلمی گانے گا رہی تھی، کچھ لوگ ٹھیلوں پر رکھی ہوئی چوکیوں اور تختوں پر کھڑے ہو کر تھرک رہے تھے۔ ہاتھوں کو لچکا رہے تھے اور کولھے مٹکا مٹکا کر بھانڈوں اور نقالوں جیسی حرکتیں کر رہے تھے، تماشائی عورتوں کا جہاں زیادہ ہجوم ہوتا، وہاں یہ "عاشقانِ رسولؐ" اور زیادہ گراوٹ پر اتر آتے، کسی کسی جگہ خواتین پر کاغذ کی گولیاں بنا بنا کر بھی پھینکی گئیں!

تقسیمِ ہند سے پہلے ہندوستان میں رام لیلا اور ہولی کے تیوہاروں پر ہندو اس طرح کے سوانگ بھرا کرتے تھے اور ہم مسلمان اس قسم کی ناشائستہ اور بازاری حرکتیں کرتے دیکھ کر ہنستے تھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے تھے اور اپنے مہذب و شائستہ دین پر فخر کرتے تھے کہ اسلامی تقریبات اس قسم کی خرافات سے پاک ہیں! مگر یہ گنہگار اور بدنصیب آنکھیں پاکستان میں کیا دیکھ رہی ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جشنِ ولادت کو رام لیلا، ہولی، دوالی اور جنم اشٹمی بنا دینے کی یہ کوششیں اور تدبیریں کس شرک و بدعت پرور دماغ کی اُپج ہیں، "عشقِ رسولؐ" کے نام پر اتنا دردناک مذاق، جشنِ ولادت کی آڑ میں ہوا و ہوس کا اتنے حیاسوز مظاہرے! سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی عظمت اور حضورؐ کے ذکر کی تقدیس کی سر بازار شرمناک رُسوائی!

یہاں تک سننے میں آیا اور معتبر و ثقہ راویوں کے واسطوں سے یہ روایت پہونچی ہے کہ گنبدِ خضرا کے نقشہ کا ایک تابوت تیار کیا گیا، جس کے اندر تین قبریں بھی بنائی گئیں! آہ! مدعیانِ توحید ہی جب توحید کا اس طرح مضحکہ اڑائیں، تو کوئی کس منہ سے مشرکوں اور بُت پرستوں کو ٹوکے اور ان کے گمراہ عقائد پر احتساب کرنے کی جرأت کرے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو گمراہی قرار دیا ہے (کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ) اور حضورؐ نے بدعت کے

معاملہ میں "سیئہ" اور "حسنہ" کی تقسیم نہیں فرمائی، بر سبیل تنزل فرض کیجئے کہ بدعت کی ایک قسم "حسنہ" بھی ہے، مگر جشنِ ولادت کے نام پر لاہور یا دوسرے جن شہروں اور قصبوں میں بھی اس قسم کی خرافات اور ناشائستہ حرکتیں ہوتی ہیں ان کو جو کوئی "بدعتِ حسنہ" سمجھتا ہے، وہ نہ صرف دین و شریعت سے بلکہ عام انسانی اخلاق سے بھی بے خبر ہے! جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے جلوس نکال کر اور ڈھول تاشے بجا کر وہابیت اور دیوبندیت کو شکست دی جا رہی ہے، تو اس مزاج اور ذہنیت کے اشخاص کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان خرافات سے خود مسلمان اسلام کو بے دخل کرنے اور دینِ مبین کو شکست دینے کے اسباب فراہم کر رہے ہیں۔

صحابۂ کرام سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدائی، عاشق اور جاں نثار کون ہو سکتا ہے، کسی کمزور سے کمزور بلکہ موضوع روایت میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یومِ ولادت پر ان نفوسِ قدسیہ نے جلوس نکالا، شہروں کو سجایا ہو اور گا بجا کر اپنی مسرت اور محبتِ رسول کا مظاہرہ کیا ہو، اس قسم کی تفریحات راگ رنگ، لہو و لعب اور بازاری حرکتیں تو یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا شعار ہیں! پارسیوں کی طرح مسلمانوں کے یہاں کوئی جشنِ نوروز نہیں ہندوؤں کی مانند نہ دیوالی کا چراغاں ہے، نہ ہولی کی رنگ پاشی اور رقص و سرود ہے، نہ رام لیلا کا سوانگ ہے، نہ عیسائیوں کے انداز پر کرسمس ڈے" اور عید الفصح کی خوش فعلیاں ہیں! نہ مشاہیر کی سالگرہ کے جشن ہیں، مسلمانوں کے خوشی کے دونوں تہوار (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) اس کی زندہ مثال ہیں کہ ان تقریبوں میں شکر کے سجدوں اور تکبیر و تہلیل کے زمزموں سے خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے!

حج بیت اللہ کی تقریب کتنی مبارک و مقدس اور روح پرور تقریب ہے، مگر اس اجتماع اور تقریب پر نہ تو مکہ اور مدینہ کو سجایا جاتا ہے نہ رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، نہ ان مقدس شہروں میں چراغاں ہوتا ہے! مسرت و خوشی کے اظہار کا سب سے بڑا موقعہ مکہ کی فتح تھی، یہ وہ مبارک اور مسرت آگیں دن ہے جب کفر و شرک پر فیصلہ کن ضرب پڑی تھی اور اسلام کو غلبہ اور سربلندی میسر آئی تھی، مگر اس خوشی کے موقعہ پر نہ چراغاں ہوا، نہ گانے بجانے کی کوئی محفل جمی یہاں تک کہ مکہ کی فضا میں کسی صحابی کی تالی اور سیٹی تک کی آواز نہیں سنی گئی! اس دن مسرت کا اظہار اللہ تعالیٰ کے حضور شکر کے سجدوں سے کیا گیا۔

عقیدہ کی خرابی کے علاوہ اس قسم کے جشن و تقاریب اجتماعوں، جلسہ جلوسوں اور میلوں ٹھیلوں میں اخلاق و شائستگی کو جو صدمہ پہونچتا ہے، اس کی دردناکی کا اظہار لفظوں میں نہیں کیا جا سکتا، پردہ نشین عورتیں تک اس قسم کے میلوں ٹھیلوں میں پردے سے غفلت برتتی ہیں، اور احتیاط کے باوجود نیم بے پردہ تو ہو ہی جاتی ہیں۔ پھر ان کا اجنبی مردوں سے خلط ملط، ان کے جسموں سے ٹکرانا اور مس کرتے ہوئے گزرنا، نہ مردوں کو غضِ بصر کی توفیق، نہ عورتوں کو بے حجابی کا احساس، اس ماحول میں جس کسی سے جو بے حیائی بھی ظہور میں آجائے، کم ہے! تعزیہ کے جلوسوں کا ہمیں تجربہ ہے کہ ان کے نکالنے اور اٹھانے والے نماز سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں اور عورتوں کے پرے کے پرے آوارہ گردوں کی طرح گھومتے پھرتے ہیں!

— اگر —

عید میلاد النبی بھی رفتہ رفتہ میلہ بن گئی، تو ملتِ اسلامیہ جو پہلے ہی سے :—

؎ تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

کا مصداق بنی ہوئی ہے، فسادِ عقیدہ اور خرابیٔ اخلاق کے اس تازہ زخم کے بعد کیا سے کیا ہو جائے گی۔

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حالت پر کبھی قناعت نہیں کرتی، اس بناء فاسد پر ہر آنے والے دور میں رَدّے پر رَدّے رکھے جاتے ہیں، اور اس طرح دین میں جو نئی بات ابتداء میں بہت ہی سادہ، معمولی اور بظاہر بے ضرر نظر آتی تھی، رفتہ رفتہ شاخ در شاخ اور خطرناک سے خطرناک تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ بدعت وہ ضلالت بن جاتی ہے، جس کے ارتکاب و پسندیدگی پر "فی النّار" کی وعید زبانِ رسالت سے سُنی گئی ہے۔

کوئی شک نہیں کہ ملت کو اُن کی بداعمالیوں اور بداخلاقیوں نے سخت نقصان پہونچایا ہے مگر اس سے کروڑ گنا زائد نقصان شرک و بدعت کے مظاہر نے پہونچایا ہے، اقبالؔ نے اللہ تعالیٰ سے بڑی دردمندی کے ساتھ شکوہ کیا تھا:۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

مگر ـــ وہ مسلمان جو توحید خالص کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر شرک و بدعت کے مظاہر میں مبتلا ہو جائیں، اُن پر برق غضب نہ گرے گی تو کیا اللہ کی رحمت کے پھولوں کی بارش ہوگی! اُمّتِ مسلمہ کے مقہور، معتوب اور پست و ذلیل ہونے کا سب سے بڑا سبب اُن کی وہ محبوب رسمیں پسندیدہ تقریبیں اور عقائد ہیں جن میں شرک و بدعت کی آمیزش پائی جاتی ہے! شرک و بدعت اللہ تعالیٰ کی غیرت کو براہِ راست چیلنج ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو چیلنج دے کر کوئی رحمت و مغفرت اور انعام و کرم کی امید رکھتا ہے۔ تو وہ جنت الحمقاء میں رہتا ہے۔

عید میلاد کے نام پر جلوسوں کی یہ بدعت نئی نئی شروع ہوئی ہے اس نے ابھی جڑیں نہیں پکڑیں اور دلوں میں گھر نہیں کیا، اس لئے اس نوبت آغاز پر اس فتنہ کی روک تھام ممکن ہے! ہمیں ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے کہ جب کسی مسلمان کے دل میں یہ بات اُتار دی گئی ہے کہ تمہارا فلاں کام اللہ اور رسول ؐ کی خوشنودی کی بجائے، اللہ اور رسول ؐ کی ناپسندیدگی اور ناراضی کا سبب بن جائے گا، تو اُس نے اپنے ذہن و فکر کی دُنیا میں ایک دھماکا سا محسوس کیا ہے، اور اسی طرح مسلسل تبلیغ و تلقین کرتے رہنے سے اُس کے حالات بدل گئے ہیں!

کسی شہر، بستی یا محلّہ میں کسی بھی تحریک کے، بانی مبانی چند افراد ہوتے ہیں، ان کی دیکھا دیکھی، دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں، رفق و نرمی اور ہمدردی و خیر خواہی کے لہجہ میں مسلسل وعظ و تلقین کے ذریعہ ان افراد کی اگر اصلاح ہو جائے، تو کسی غلط قسم کی نئی بات یا کسی جدید فتنہ کو ثبات و قرار حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو حضرات مشرکانہ رسوم اور بدعات کی ضلالت و مضرت کا احساس رکھتے ہیں اور توحید خالص کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ وہ محلّوں اور بستیوں کے اُن لوگوں پر اپنا وقت صرف کریں، جنھوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اس قسم کے غیر اسلامی مظاہروں اور کھیل تماشوں کو دین کی شوکت کے اظہار کی علامت سمجھ رکھا ہے۔ وعظ و تذکیر اور تبلیغ و موعظت کا کام بڑا صبر آزما ہے، اس کام میں سچ مچ لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں، لوگوں کی جھڑکیاں اور طعنے ہی نہیں سخت قسم کی گالیاں بھی سُننی پڑتی ہیں، اس منزل میں دوستوں کو دشمن اور یگانوں کو بیگانہ ہوتے بھی دیکھا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ توحید خالص کے مُبلغ کا پورا محلّہ در پے آزار ہو جائے! کیا عجب ہے کہ حضرت بلال ؓ کی طرح کسی مُبلّغِ حق اور داعی توحید کو بستی کے لوگ گلیوں میں گھسیٹتے پھریں، یہ کام عزتِ نفس کی، مال کی، بدن کی، اور وقت کی قربانی چاہتا ہے!

جو توحید شناس علماء سیرت النبیؐ کے جلسوں میں وعظ و تقریر کرتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو توحیدِ خالص کی تلقین فرمائیں اور اُن پر شرک و بدعت کی مضرتیں اور گمراہیاں واضح کریں، اور اس خوف کو دل سے نکال دیں کہ ایسا کہنے سے اُن کی ہمہ گیر مقبولیت کو صدمہ پہونچے گا، ہر مسلک و مشرب کے لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش اپنی جگہ ریاکاری ہی نہیں منافقت بھی ہے صوفی صدری لوگ نبیوں اور رسولوں تک سے بھی خوش نہیں تھے، ان نفوسِ قدسیہ کو بھی حق گوئی اور خاص طور سے توحیدِ خاص کی تبلیغ اور شرک و بدعات کی تردید کے سبب لوگوں کی مخالفت برداشت کرنی پڑی۔

ہماری آخری گزارش یہ ہے کہ شرک و بدعت پر کسی سے سمجھوتا، اور اتحاد و اتفاق نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کی توحید سے متوحش ہو کر کوئی جڑنے کی بجائے کٹنے اور کنارہ کشی اختیار کرنے کو پسند کرے، تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے، مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کا اصل رشتہ توحید ہے، جو کوئی اس رشتہ میں گرہیں ڈالے یا اُسے صدمہ پہونچاتے تو ایسے بدبخت سے ایک توحید شناس قلب لگاؤ نہیں رکھ سکتا۔

مشرکانہ رسوم اور بدعات کی جڑیں مسلمانوں میں مضبوط ہونے کا یہی سبب ہے کہ نااتفاقی کے خوف اور لوگوں کی خفگی و دل آزاری کے ڈر سے ان پر خاطر خواہ نکیر نہیں کی گئی! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کو پیش فرمایا تھا، اور بت پرستی کی تردید کی تھی، تو مشرکین مکہ توحید کے اس داعیِ اعظم پر یہی الزام لگاتے تھے کہ یہ شخص ہماری قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے اور ہمارے اپنے آدمیوں کو ہم سے کاٹ کر اپنی بنائی ہوئی جماعت میں شامل کر رہا ہے!!

ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلمان پتھر کے بنے ہوئے بتوں کو پوجتے ہیں، ہمارا کہنا یہ ہے نہ جانے کتنے مسلمانوں نے ایسی رسمیں اور عقیدے اختیار کر لئے ہیں، جن میں شرک کی آمیزش پائی جاتی ہے اور توحیدِ خالص کی اہمیت اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے ضرورت ہے کہ شرک کی آمیزش اور توحید خالص کو اُن کے سامنے اس انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ ان دونوں میں امتیاز کر سکیں جو کوئی اخلاص، دردمندی اور مسلمانوں کی دینی خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ اس مہم کا آغاز کرے گا اسے ان شاء اللہ کامیابی ہوگی! مشرکین مکہ حق سے نفرت کرتے تھے مگر مسلمان فطری طور پر حق سے محبت کرتا ہے، حق واضح ہونے کے بعد، پھر وہ تاریکی میں رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔

-×-

مولانا عبد الباری ندوی (سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ)

خیر امۃ کا نقشہ

قرآن مجید کے آئینہ میں

پہلے یہ نقشہ ذرا اجمالاً حکیم الامت (علیہ الرحمۃ) کے قلم سے ملاحظہ ہو :-

"اسلام کا مقصود کامل نجات ہے۔ اور وہ حاصل ہوتی ہے کامل اسلام سے۔ جیسے مالداری سے مقصود عیش و آرام ہے اور وہ حاصل ہوتا ہے خوب مالدار ہونے سے نہ کہ پیسہ دو پیسہ ہونے سے۔"

لیکن ہمارے مسلمان بھائیوں خصوصاً نئی تعلیم والوں نے اسلام کے عقائد و اعمال سب ہی کا طرح طرح سے

"ست نکالا ہے۔ مگر ست کا ست نہیں نکلا کرتا۔ دین (اسلام) تو سارا کا سارا خود ہی ست ہے، اس کا ہر جز ضروری ہے۔ اب آپ دوبارہ اس کا ست نہیں نکال سکتے۔ ورنہ وہ ست نہ ہوگا۔ اصل اجزا کا فوت کرنا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ست اُس چیز کا نکالا جاتا ہے، جس میں کوئی فضول جز ہو، اسلام کے اوامر و نواہی میں معاذ اللہ کیا کوئی فضول جز ہے!

"حضرت عبد اللہ ابن سلام کو خیال ہوا کہ اگر میں اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف تو ہے نہیں۔ کیوں کہ کھانا فرض نہیں۔ اور توریت پر عمل ہو جائے گا، جس میں اونٹ کا گوشت کھانا منع ہے۔ اس پر یہ آیت اتری یا ایہا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃً کہ اے مسلمانو پورے پورے مسلمان بنو ادھورے نہ رہو۔

"اسلام کی حلال کی ہوئی چیز سے پرہیز کرنا (عمل ہی نہیں) در اصل ایمان کا نقص ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی (بظاہر) کوئی ہلکی چیز بھی چھوڑنے کے قابل نہیں (یوں بھول چوک یا کم ہمتی کی اور بات ہے) پھر اس کا ست کیسے نکل سکتا ہے"[1]

دوسری جگہ :-

"اس زمانہ میں اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اسلام نے صرف نماز روزہ اور چند غیبی چیزیں (قیامت وغیرہ کی) بتلائی ہیں۔ اور انسان کے باقی ظاہری و باطنی حالات متعلقہ سے اس کو کچھ تعلق نہیں۔ اللہ و رسولؐ کو جیسا چاہو سمجھو (ان کے ایمانی و قرآنی تصورات تک میں جو چاہو کتر بیونت کر لو علیٰ ہذا معاملات یا لین دین میں) جو چاہو معاملہ کرو۔ تجارت جس طرح چاہو کرو۔ لوگوں سے جس طرح چاہو برتاؤ رکھو۔ جو چاہو کھاؤ جو چاہو پہنو نشست برخاست ملاقات و معاشرت کے طریقے جو چاہو اختیار کرو۔ اپنے نفس کو جن صفات سے چاہو متصف

[1] تجدید دین کامل صلہ!

رکھو۔ غرض تم کو اور امور میں ہر طرح کی آزادی ہے[1]۔

اس "خیر امۃ" کو عوام و خواص کے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خواص سے مراد وہ ہونگے جن کو عوام کسی نہ کسی طرح اپنا متبوع یا بڑا جان کر ان کی ریس اور اتباع و تقلید کرتے ہیں۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں ان خواص کے موٹے موٹے تین طبقے قرار دیئے جا سکتے ہیں (۱) ایک علماء و مشائخ کا، جو دینی مقتدا و متبوع ہونے کے لحاظ سے اسلامی معاشرہ میں اخص خواص کا مقام رکھتے ہیں یعنی اُن کو اپنے علم ہی میں نہیں عمل میں بھی اتباع و ہدایت کا ایسا ممتاز و نمایاں نمونہ یا اسلام و رسول اسلام کی زندگی کا ایسا "اسوہ حسنہ" ہونا چاہیئے کہ دوسرے بے کھٹکے اُن کے قدم بہ قدم چل سکیں (۲) دوسرا ہر بڑی چھوٹی آبادی میں کچھ نہ کچھ جاہ و دولت کے اعتبار سے ایک نسبتاً خوش حال اونچا "رواجی شرفا" کا طبقہ پایا جاتا ہے۔ ان سے نیچے کے لوگ فطری طور پر ان کی ریس اور پیروی کرتے ہیں (۳) تیسرا آج کے نئے زمانہ میں نئی تعلیم و تہذیب والوں کا ایک طبقہ اُبھر آیا ہے جس نے متعدد دنیوی حیثیتوں سے کہنا چاہیئے کہ سب سے اونچا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ آیئے ان سب کو پہلے ۔ کتاب ہذا کے مقدمہ میں ہی میں ۔ ہدایت و ضلالت کی کسوٹی پر کس کر ذرا دیکھتے چلیں جو خود کتاب اسلام نے اپنے دیباچہ و مقدمہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی خصوصاً سولہویں آیت (وما کانوا مھتدین) تک ہمارے ہاتھ میں دیدی ہے۔

کفر سے نکل کر ایمان کے دائرہ میں داخلہ کا پہلا قدم "لا الٰہ الا اللہ" کی توحید کا قول و اقرار ہے۔ پھر اسی قول و اقرار کو دن رات بار بار نمازوں میں ایاك نعبد و ایاك نستعین کے عہد و اقرار کی صورت میں دہراتے رہنا فرض ٹھہرا دیا گیا۔ یعنی توحید الٰہ کو قبول کرنے کے بعد جس طرح "ایاك نعبد" کے انحصاری عہد کے ساتھ صرف خدا ہی کو واحد معبود ماننا لازم ہو جاتا ہے، اسی طرح "ایاك نستعین" کے انحصاری عہد کے بعد کسی غیر خدا کو بالذات مستعان یا مددگار ماننے کا بھی کوئی حق قطعاً نہیں رہ جاتا۔ بالفاظ دیگر مسلمان ہونے کے معنی اسی یہ ہیں کہ دین و دنیا کی ہر چھوٹی بڑی حاجت، ضرورت ہر انفرادی و اجتماعی نفع و ضرر مسئلہ و مشکل میں ہم کو حقیقی مددگار و کارساز صرف خدا کو جاننے کا حق رہ جاتا ہے۔ پھر وہی علیم مسبب الاسباب اپنی غیبی حکمت و مشیت کے موافق غیبی تائید کے ظاہری اسباب و تدابیر بھی ضرور بظاہر فرماتا ہے۔ یہی اس کی انتظامی سنت و عادت پورے کارخانۂ عالم کے سارے کاروبار میں جاری ہے۔ اور یہی اسلامی زندگی کی صاف سیدھی شاہ راہ ہے۔ اسی لئے "ایاك نستعین" کے بعد سب سے پہلے اسی راہ کی رہنمائی میں مدد مانگنے کی درخواست کرائی گئی۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ اور اسی لئے رسول اسلامؐ کی دعائی تعلیمات میں دین و دنیا کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی احتیاج ایسی نہ ملے گی جس کے پورا کرنے کی درخواست اللہ تعالیٰ ہی سے نہ کرائی گئی ہو۔ اور اسی کی عطا کو بالذات اسی کی طرف نہ منسوب کیا گیا ہو۔ حد یہ ہے کہ نمک کی ضرورت ہو تو جوتی ٹوٹ جائے تو اس کے لئے بھی خدا ہی سے عرض کرو۔ کچھ کھاؤ پیو تب بھی یہی جان کر خدا ہی کا شکر و تعریف کرو اسی نے کھلایا پلایا الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا۔ یہی مسلمان ہونے کا مطلب ہے "وجعلنا من المسلمین" لیکن اب ان دعاؤں کو بھی زیادہ تر محض وظیفہ کے طور پر پڑھ لیا جاتا ہے۔ ورنہ اعتماد و توکلِ خدا کے بجائے ہمارے عوام و خواص کم و بیش سب ہی کا اسباب ہی اسباب پر اتنا زیادہ رہ گیا ہے کہ مسبب الاسباب پر سب سے پہلے اور بالذات کیا سب سے آخر میں اور بالواسطہ نظر رکھنے والے بھی شاذ و نادر ملیں گے۔

ثبوت اس کا یہ ہے کہ اسباب و تدابیر کے اتباع و اختیار میں خدا و رسولؐ کی رضا و ناراضی پسند و ناپسند یا جائز و ناجائز حلال و حرام کا اہتمام نام نہاد خواص اہلِ دین ۔ اور علماء و مشائخ ۔ تک میں کم ہی نظر آئے گا بلکہ بعضے تو حرام کو حلال بنانے

[1] تمہید تعلیم الدین۔

میں اپنے علم و دین کا سارا زور لگا دیتے ہیں۔ جس کا مطلب ان کے سوا کیا ہے، نفع وضرر عطا ومنع دینے لینے کے حقیقی مالک و مختار (اللّٰھم لا معطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت) پر ان خواص کا توکل کیا ایمان ہی کتنے پانی میں ہے۔ پھر ان نوے فیصد اکثریت والے مسلمان عوام وجہلا کا کیا پوچھنا۔ ان میں بہتیروں کو توحید الٰہ کا کلمہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ) ہی یاد نہیں ہوتا تو اس کا مطلب ومطالبہ کیا جانیں۔ ان سے بڑھ کر بہت بڑی تعداد ایسے عوام کی ہے، جو کھلے کھلے شرکیات میں اس درجہ مبتلا ہیں کہ درگاہوں میں جو کچھ کرتے ہیں، اس میں اور مندروں میں جو کچھ کیا جاتا ہے کوئی فرق مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ غضب پر غضب کہ خود ہمارے علماء کی ایک جماعت کی جماعت کم وبیش ہر جگہ ان کھلے کھلے شرکیات وبدعات کی کتاب وسنت سے کھلے میدان میں پشت پناہی فرماتی ملے گی۔ الف ثانی کے حضرت مجددؒ کو جب اس دوسرے ہزارہ کے اوائل ہی میں فرمانا پڑتا تھا کہ "اس زمانہ کے اکثر علما نے بدعات کو رواج دیا اور سنت کو مٹایا ہے"۔ تو اب چودھویں صدی کے اواخر کا یہ نقشہ آنکھوں کے سامنے ہی ہے۔ باقی بدعات وشرکیات سے چشم پوشی اور ان کو مٹانے کی کوئی مناسب ومنضبط جد وجہد سے اعراض خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آج کی بہتر سے بہتر فعال اسلامی وتبلیغی جماعتیں کیسے گوارا فرما رہی ہیں! جس شرک کے متعلق خدائے اسلام کا اعلان ہو کہ اس کو وہ کسی حال میں نہ بخشے گا ماسوا جو چاہے بخش دے، اس کے تو سایہ سے بھی بچانے کی جد وجہد پہلا فرض تھا اس کے ہوتے خدا کی ناراضی وقہر کے بجائے کسی رحمت ونصرت کی توقع ونظر کا ہم کو حق ہی کیا رہ جاتا ہے!

یہ تو دین کی جان ہمارے ایمان کا بہت سرسری نقشہ تھا۔ آگے اسی ایمان کے لوازم اعمال صالحہ یا اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ـــ جن کی کلی تعبیر اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق سے فرمائی گئی ہے۔ ان کی بھی ایک سرسری فہرست ملاحظہ ہو۔ نماز نہ صرف بنیاد ایمان یا توحید الٰہ کے قلبی وباطنی ایمان کا قالبی مظہر ہے۔ بلکہ دن رات مسلمان کے مسلمان ہونے کا جو چیز اظہار واعلان اور نمائندگی کرتی یا مسلمان یا غیر مسلمان میں فرق وامتیاز کو نمایاں کرتی رہتی ہے وہ نماز ہی ہے۔ حدیث کی مختلف روایات میں کفر وایمان میں عملی فارق نماز ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرات صحابہ ترک نماز کے سوا کسی اور عمل کے ترک کو کفر نہیں خیال فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعود حضرت عبداللہ ابن عباس حضرت ابوہریرہ وغیرہ رضوان اللہ علیہم اجلہ صحابہ عمداً نماز چھوڑنے والے کو سرے سے کافر ہی قرار دیتے ہیں۔ ائمہ اربعہ میں حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام شافعیؒ کافر نہیں کہتے لیکن قتل کا حکم فرمایا ہے۔ سب سے نرم مسلک امام اعظمؒ کا ہے کہ کفر وقتل کے بجائے قید سخت اور اتنی مار کا حکم دیا ہے کہ اگر باز نہ آئے یا توبہ نہ کرے تو مار کھاتے کھاتے مر جائے۔ اس زمانہ میں حبس وقید کی قوت نہیں، تو کم از کم ایسے شخص سے ملنے جلنے وغیرہ کے معاشرتی تعلقات ہی اتنے ترک کر دیئے جا سکتے ہیں کہ تنگ ہو کر توبہ کرے۔ باقی جن حضرات صحابہ وائمہ کے نزدیک تارک صلوٰۃ کافر ہو جاتا ہے ان کے مسلک کے مطابق تو نکاح بھی باقی نہیں رہتا اور اولاد ناجائز وحرام ٹھہرتی ہے۔ اعاذنا اللہ!

اصل بات یہ ہے کہ نماز کی معنوی وصوری حقیقت پر اگر غور کیا جائے، تو جیسا کہ حدیث میں ہے یہ دین کا وہ ستون ہے جس کے ترک وہدم سے دین کی پوری عمارت ہی ڈھ جاتی ہے۔[1]

پھر معنوی تو معنوی صوری حقیقت اتنی منہدم ہو چکی ہے کہ بہت بڑی اکثریت نماز کی اور اس سے بھی زیادہ جماعت کی حرمت سے تارک ہے۔ یا نیادہ سے زیادہ عید بقر عید بطور عبادت نہیں تہوار کے عیدگاہ کے میلے کے ساتھ دوگانہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی ایک تعداد ایسوں کی ہوتی ہے، جو نہ روزہ رکھتے ہیں نہ استطاعت کے باوجود قربانی کرتے ہیں۔ باقی جو تھوڑے بہت صورت نماز کے

[1] جامع بیان العقائد جلد اول ص ۲۲ لے الصلوٰۃ عماد الدین فمن اقامہا اقام الدین ومن ھدمہا ھدم الدین۔

پابند ہیں اُن میں بہتوں کی نماز ویسی ہی ٹھونگوں والی ہوتی ہے کہ حضورؐ دیکھتے تو یہ فرما کر بار بار دہرواتے کہ "ٹھیک نہیں پڑھی پھر سے پڑھو" (صل فانک لم تصل) ابھی مغرب میں ایک صاحب بغل میں آ کر پہلی رکعت کے رکوع میں شریک ہوئے۔ ماشاء اللہ وضع سے بھی تھے اور پابندی سے نماز پڑھنے والے۔ عمر بھی ساٹھ سے اوپر ہوگی۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ رکوع مل جانے سے رکعت مل جاتی ہے از سر نو پوری تین رکعتیں پڑھ ڈالیں۔ عام پابند نمازیوں کی اکثریت کا حال یہی ہے کہ سجدۂ سہو، مسبوق ولاحق وغیرہ کے ایسے مسائل تک سے ناواقف ہوتے ہیں کہ پڑھی نماز بھی بار ہا بے پڑھی بنا لیتے ہیں۔ باقی ناقص ومکروہ بنانے والی باتوں سے بچنے والے تو اور بھی کم ہوتے ہیں۔ نماز کی اس صورت کے بعد اس کی معنویت کا پوچھنا ہی کیا۔ چہ جائیکہ اُس کی اُمید کہ ساری یہ نمازیں اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال والی اُس یاد (ولذکر اللہ اکبر) کی کوئی روح رکھتی ہوں گی جو زندگی میں اُس کی نافرمانیوں یا فحشاء ومنکر سے بچاتی ہو۔ صبح سے لے کر رات کو سونے تک پانچ پانچ مرتبہ نماز اگر اپنی اس روح ومعنویت یا خدا کی عظمت وکبریائی اور اپنے عجز وبندگی کی کچھ یاد واستحضار کے ساتھ پڑھی جائے تو کیا پھر بھی درمیانی وقفوں کے چند گھنٹوں میں اپنے کبر وجاہ کی فکر طلب کا سودا سوار ہو سکتا یا معاصی ومنکرات کا بے دھڑک ارتکاب جاری رہ سکتا ہے۔ لیکن بظاہر اچھے اچھے صرف پنج وقتہ نماز کے نہیں تہجد واشراق اور لمبے لمبے اوراد ووظائف تک کے اکثر پابندوں کو بالعموم جائز وناجائز حلال وحرام کی تمیز کے بغیر جاہ ومال کے حصول اور معاملات واخلاق سب کی گندگیوں میں آلودہ پائیں گے۔ ایسی نمازوں والے مولوی اور مسٹر اکثر اس حمام میں ننگے ملیں گے۔

اقامتِ صلوٰۃ کے اس بالکل سرسری جائزہ کے بعد ایک سرسری ہی، نظر انفاق پر ڈال دیکھیں۔ ہم مسلمانوں کی ایک طرف عام ذہنیت بنیوں کی سی پیٹ کاٹ کاٹ کر پیسہ پیسہ جمع کرنے کی نہیں۔ بلکہ آمدنی وحیثیت سے زیادہ خرچ کی ہے۔ لیکن یہ خرچ محض کھانے پینے رہن سہن وغیرہ ضروریات زندگی کے ٹھاٹ باٹ نمود ونمائش، فیشن اور فرنیچر وغیرہ میں فضول خرچی یا اسراف تک محدود نہیں کھلے محرمات ومنکرات کی شیطانی تبذیرات میں بھی ہم دوسروں سے پیش پیش ملیں گے۔ عیاشی وآوارگی قماربازی وسینمابینی جیسے ہر میدان میں ہماری تعداد ہمارے تناسب آبادی سے عموماً بڑھی چڑھی رہتی ہے۔ دوسری طرف دین واسلام کے عائد کئے ہوئے موٹے موٹے مالی حقوق وواجبات ادا کرنے والے بڑے بڑے تسبیح ومصلے والوں اور مشہور مشہور دینی اداروں اور حلقوں سے تعلق رکھنے والوں تک میں کم ملیں گے۔ بظاہر انتہائی عجیب بات ہے کہ دینی اداروں مدرسوں یتیم خانوں مسجدوں وغیرہ کے لئے اچھے اچھے چندے دینے والوں میں بھی زکات ادا کرنے ترکہ کو شریعت کے موافق تقسیم کرنے والے شاذ ونادر ہوتے ہیں۔

باقی چلی ہوئی عام بددیانتیوں، بدمعاملگیوں، بدعہدیوں، خیانتوں رشوتوں کے سے معاملات میں حرام وحلال جائز وناجائز ہونے کا تصور بھی کتنے مسلمانوں میں زندہ پایا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے مال کو ہڑپ کرنے کے لئے عدالتوں میں مقدمات وہ بھی جھوٹی گواہیوں اور حلفوں کے ساتھ غیر مسلموں ہی کی طرح بے دھڑک مسلمانوں کو لڑتے لڑاتے پائیں گے۔ گویا شیطان بخیر آج کل روزے چل رہے ہیں جن کی خاص حکمت ہی پرہیزگار (متقی) بننا یا معاصی ومنکرات سے پرہیز کی تربیت دینا اور عادت ڈالنا ہے۔ جب کھانا پینا جو اور دنوں میں بالکل جائز ہے اس سے دن بھر کی خدا کی رضا وحکم کی بنا پر پرہیز کیا جاتا ہے تو جو معاصی ومنکرات ہمیشہ کے لئے خدا کی ناراضی وحکم عدولی کا باعث ہیں ان سے روزہ میں پرہیز نہ کیا روزہ کو اسی طرح بے جان بنا دینا نہیں جس طرح "فحشاء ومنکر" کے ارتکاب سے دن رات کی نمازیں بے جان بن جاتی ہیں۔

اسلام کا دعویٰ ہے اس کی کتاب کی پہلی ہی صورت میں خاص طور پر مسلمانوں ہی کو خطاب کرکے سرے سے یہ حکم ہے نہیں کرتے آپس میں ایک دوسرے کے مالوں کو ناحق یا ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ جھوٹے مقدمے حاکموں کے پاس اس لئے لے جاؤ کہ لوگوں کا مال ظلم و زیادتی کے گناہوں کے ساتھ کھا جاؤ وہ بھی جان بوجھ کر۔ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرہ ع ۲۳)

غرض غیر مسلموں کی طرح کیا معنی تجربات تو اُلٹے اپنے دوسروں کے سب کے یہ ہیں کہ ہر طرح کی باطل خوریوں یا اموالی و معاملاتی گندگیوں کا بہار اکثر بڑھ چڑھ کر ہی ملتا ہے لیے عوام و غربا سے بڑھ کر خواص و امراء یا رواجی شرفا کا خود راقم الحروف کے ذاتی علم میں ایک دو نہیں بہت سی مثالیں ایسے امیروں رئیسوں اور کھاتے پیتے "رواجی شریفوں" کی ہیں جو ایک طرف ہر طرح کی چھوٹی بڑی فریب دہیوں اور حرام خوریوں کو بالکل شیر مادر جانتے اور دوسری طرف زکات کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض ایسے صوم و صلوٰۃ والے دینداروں کو جب ان دو طرفہ کوتاہیوں کی طرف اشارۃً و لجاجتۃً بھی توجہ دلائی تو اُلٹے چیں بچیں ہوئے یا کنی کترا کر دی۔ ابھی کل ہی ایک بڑے صاحب علم و صلاح ثقہ دوست نے آپ بیتی سنائی۔ کوئی بڑے تاجر ہیں جو حج پہ حج تو برابر کرتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ماشاء اللہ ایک بڑی وسیع تبلیغی جماعت کے بڑے سرگرم کارکن ہیں۔ مگر ایک ذرا بڑا قرض جو اُن کی حیثیت سے بہر حال بڑا نہیں سالہا سال سے یاد دہانیوں کو ٹالتے اور سُنی اَن سُنی کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب صاحب حق "بچارے" بالکل مایوس ہو بیٹھے ہیں آخر عمر میں ادھر کوئی ۱۰، ۱۲ سال سے اور اپنی شامت اعمال ہی سے کچھ اموالی فتنوں میں گھر گیا ہوں۔ خصوصاً ایک نجی وقف اور سلسلہ جدید کی کتابوں کی بدولت۔ پھر نہ پوچھئے اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے معاملات و مقدمات کے کیسے کیسے تجربے ہوئے اور برابر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تفصیل بجائے خود ایک کتاب چاہتی ہے۔ عبرت کے لئے "مشتے نمونہ از خروارے"۔ صرف ایک ہی جزء وہ بھی صرف اجمالاً سن لیں۔

ایک دو نہیں بیسوں مسلمان غیر مسلمان ہندو عیسائی کرایہ داروں سے سابقہ پڑا۔ دونوں کے عوام سے بھی اور خواص سے بھی۔ قریب ترین عزیزوں سے بھی۔ مولویوں سے بھی مسٹروں سے بھی۔ مگر جہاں تک یاد آتا ہے دو مستثنیات کے سوا جیسی جیسی انتہائی شرمناکیوں والی بدمعاملگیوں کے تلخ تجربات بڑے بڑے نمازیوں وظیفوں اور اونچے اونچے عہدہ والوں تک سے ہوئے کسی ایک غیر مسلم سے بھی نہیں ہوئے۔ حد یہ کہ بعض مسلمانوں نے اپنی شرارتوں میں غیر مسلمانوں کو شریک کرنا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ اور تو اور بالکل غیر متعلق بھی "رواجی شریف" و نمازی اور حجوں پر حج والے بھائیوں کو سراسر جھوٹ فریب کا طوفان جوتنے والوں سے تعاون کرتے دیکھا۔

ابتدا میں ان چیزوں کو تمام تر اپنی شامت اعمال جانتا رہا اب بھی جانتا اور ان شاء اللہ کفارۂ سیأت کی اُمید رکھتا ہوں۔ لیکن جب دوسروں سے ذکر آیا خصوصاً فرشتہ صفت حضرت مرحوم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب جن سے بڑھ کر دین و دنیا کا جامع مثالی مسلمان دیکھنے میں نہیں آیا ان سے جن کا بڑا معاملاتی سابقہ لگ بھگ چوتھائی صدی رہا۔ اس سے بھی طویل تجربہ وہ اپنے نجی باغات وغیرہ کے علاوہ ندوہ کی چالیس سالہ نظامت و ادارس کے ایک بڑے وقف کے معاملات و مقدمات سے آخر دم تک گذرتے رہے وہ "مرگ انبوہ جشنے دارد" والی تسلی فرماتے کہ تمہارے ہی نہیں میرے بھی ہو بہو ایسے ہی تجربات ہیں کہ معاملات میں مسلمان غیر مسلمانوں سے بدتر ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ایک اور مولانا مسعود علی سابق ناظم دار المصنفین کے تجربات کا خلاصہ سن لیں کہ ہر شخص کو بدمعاش سمجھو جب تک وہ اپنے کو نیک معاش سمجھنے پر مجبور نہ کر دے" انا للہ!

ایک بڑے مسلمان عہدہ دار سے ان کے ایک خواجہ تاشش ہی کی بدمعاملگیوں سے عاجز آکر استعانت کے سلسلہ میں نقل کیا تو برجستہ فرمایا کہ مسلمان! یعنی ان کے انگریزوں کے زمانہ سے لے کر آزادی کے زمانہ تک کے مختلف عدالتی و انتظامی عہدوں کے تجربات کا یہ نچوڑ ہے کہ ہم مسلمانوں کی معاملاتی و اخلاقی گراوٹ غیر مسلمانوں سے ہر طرح بڑھی چڑھی ہے۔ انا للہ۔ ثم انا للہ!!

نماز روزہ حج یا اللہ تعالیٰ کے عباداتی حقوق ادا کرنے والے مسلمان ہو کر اس کے بندوں کے معاملاتی حقوق میں یہ ناقابلِ
فہم وناقابلِ معافی حیرت انگیز کوتاہیاں وگمراہیاں نتیجہ آخر کس چیز کا ہیں؟ اس کا ناک خود خدا کی اپنی کتاب ہدایت سے ہدایت
کے لئے "یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ" کے ساتھ ساتھ ہی "مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ" یا انفاقی ذہنیت پیدا کرنے کرانے کی جو شدید
ہے اس کا فقدان ہی فقدان۔ آگے بھی اس کتاب ہدایت میں رکوع کے رکوع اور آخر تک جا بجا طرح طرح کے ترغیبی وتہدیدی
عنوانات سے ایک طرف انفاق ہی انفاق یا دینے ہی دینے پر اصرار اور دوسری طرف لینے ہی لینے کی خصوصاً مادی حرص آمیز
کی کوئی ترغیب کیا معمولی تعلیم کی ایک آیت تک نہیں ملتی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ انفرادی حفاظت نفس وبقائے حیات کے
کسب واخذ کا داعیہ فطرت میں اتنا زبردست رکھ دیا گیا ہے، کہ اب اس کو ابھارنے کی نہیں لگام لگانے کی ضرورت ہے۔[1]

انفاقی ذہنیت وتربیت صرف لین دین یا مالی معاملات ہی کی صحت واصلاح کی مقدم شرط نہیں۔ اخلاق ومعاشرت
تہذیب وتمدن زندگی کے کم وبیش سارے انفرادی واجتماعی تعلقات کی درستی وخوش گواری کے لئے ناگزیر ہے۔ کیوں کہ انفاقی
تعلیم وتربیت کے معنی ہی یہ ہیں کہ فرد اپنی ذات وحیات کی جائز وواجبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اپنے تن من دھن
تمام صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ دوسروں کی صلاح وفلاح میں لگاتا ہے۔ قرآن مجید میں مال کی ایک خاص تعبیر ہی لفظ خیر سے
فرمائی گئی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ دنیا میں ظاہری ومادی خیر وفلاح یا نیکی اور نیکوکاری کا ظاہری ومادی بڑا ذریعہ مال ہی ہے
دوسرے مال بھی وہی خیر ہوگا جو خیر کی یا جائز راہوں سے حاصل ہوا ہو۔ ورنہ اصل نعمت کی روح شر کے بالمقابل ہر طرح کی نفع
رسانی کے کام سب خیر ہی خیر ہیں۔ اس لئے اس سوال کے جواب میں کہ کیا خرچ کریں؟ (مَاذَا یُنْفِقُوْنَ؟) پہلے تو یہ تنبیہ ہوئی
کہ اصل سوال کیا خرچ کرنے کا نہیں، بلکہ کس پر خرچ کرنے کا ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ بھی خرچ کرو۔ والدین اور قریب
بعید عزیزوں، یتیموں مسکینوں، مسافروں وغیرہ اہلِ استحقاق کی ضروریات پر (نہ کہ اپنی ذات کے فضولیات پر) کرو۔ اتفاق
حقیقتِ انفاق کی تعمیم وتوسیع اس طرح واضح کر دی کہ مال ہی پر کیا موقوف جو کچھ بھی تم خیر یا نیکی کا کام کرو (وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ)
اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔ پھر چند ہی آیات بعد ایسے ہی سوال کے جواب میں کہ کیا یا کتنا خرچ کریں۔ ارشاد ہوا کہ جو کچھ
واقعی ضرورتوں سے فاضل (العفو) ہو سب کا صحیح مصرف دوسروں ہی پر صرف کرنا ہے اور آخر قرآن کی چھوٹی چھوٹی
روزانہ نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں ان میں سورۂ ماعون میں تو اہل استحقاق پر خرچ کرنے ہی کو نہیں دوسروں کو اس کی ترغیب
دینے تک کو نفس دین یا یوم دین کی تکذیب ٹھیرایا گیا ہے (اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ
عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ) اور ایسے مکذبین دین جو بظاہر نماز بھی پڑھتے رہتے ہیں ان کو حقیقتِ نماز کے لحاظ سے نماز کا بھولنے والا
اور ریاکار قرار دیا گیا ہے۔ جن کی نماز کے حق میں لئے خرابی ہی خرابی کا سامان ہے ——— فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ
صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ——— اور آخر میں پھر ایسے نمازیوں کی خاص شناخت یا انتہائی عدم انفاقی ذہنیت
بتائی گئی ہے کہ معمولی سی معمولی چیز بھی کسی کو دینے میں بخل کرتے ہیں۔ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔ ماعون کی تفسیر زکات سے بھی
ہے۔ یعنی اور تو ایسے ظاہری نماز روزہ والے کیا خرچ کرتے فرض زکات تک ادا نہیں کرتے۔

یہ ہے وہ خاص وخالص قرآنی انفاقی ذہنیت جو نہ دنیا پرستانہ حرص وہوس، نفس ونفسانیت نمود ونمائش
غرض نفس پروری، کبر وریا، جاہ طلبی وغیرہ طرح طرح کے رذائل اخلاق کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے اور نہ خدا پرستانہ فضائل اخلاق
توکل وقناعت، عفاف، بے حرصی، صبر وشکر، اخلاص، دل ٓلہیت، ایثار، تواضع، رحم وشفقت وغیرہ بلا اس انفاقی ذہنیت کے پیدا

[1] ان تمام مباحث کی پوری تفصیل "تحریر معاشیات" میں کی گئی ہے۔

ظاہری نماز روزہ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہی بڑا المیہ ہے کہ ہم برائے نام خدا کا نام لینے والے ہی نہیں تمام کے نماز روزہ والے مسلمان بھی ہر طرح کی اخلاقی و معاشرتی گراوٹوں میں غیروں سے کم نہیں بڑھے ہی ہوئے ہیں۔ جاہ و مال کی حرص و ہوس میں بھی' ریا و تفاخر میں بھی، جعل و فریب میں بھی، دروغ و دغابازی میں بھی' غیبت و تہمت تراشی میں بھی، بغض و حسد میں بھی' بدنگاہی و بدزبانی میں بھی' کھلی کھلی بدچلنی و آوارگی میں بھی' فساد انگیزی و فتنہ پردازی میں بھی، نفاق و شقاق میں بھی۔ غرض ہمارے معاشرہ کا کوئی گھر' کوئی طبقہ، اونچا نیچا، امیر و غریب عالم و جاہل بلکہ بہتیرے روزے نماز کے ظاہری دینداروں تک میں ایسا نہ ملے گا جس میں ظاہری باطنی کی اخلاقی بیماریاں کم و بیش وباہی کی طرح نہ پھیلی ہوں۔ مستثنیات بس مستثنیات ہی کے درجہ میں نظر آئیں گے۔ وہ بھی نام کے پیشوں سے زیادہ چھوٹوں میں اور امیروں سے زیادہ غریبوں میں۔

یہ مغرب زدہ !!! اب لیجئے نئی نسل یا مغربی تعلیم والوں کو۔ یہ غریب قدرتاً نیم چڑھا کریلا بنا دیئے گئے ہیں۔ جس مسلمان معاشرہ میں ان کی پیدائش و پرورش ہوئی اس میں گھر باہر ایمان و عمل صالح کی اسلامی زندگی کی ہمہ گیر ابتری کا اجمالی نقشہ آپ دیکھ چکے۔ ایسے معاشرہ کے جن افراد کو ایسی تعلیم و تہذیب، فضا و ماحول کے منجدھار میں ڈال دیا جائے، جو اپنی عین ذات و فطرت ہی سے ایمان و اسلام کیا سرے سے دین و مذہب کی ہر طرح نفی کرتی ہو' ان سے نام و نسل کے اسلام سے بھی دست بردار ہو کر فکراً و عملاً بھی ارتداد کی راہ پر پڑ جانے کے سوا توقع ہی کیا کی جانی چاہیئے۔ یوں شدید سے شدید جانی وباؤں میں گھر کر بھی بعض سخت جان' جان بر ہی ہو جاتے ہیں۔

اس ارتداد کی شدت و نوعیت کی کھل کر پوری نشان دہی کا حق پہلے پہل پوری طرح اس اعلیٰ تعلیم کے ایک اعلیٰ فرد (شھد شاھد من اھلہ) نے ادا کیا[1] یہ عبرت ناک شہادت خود اس گھر والے شاہد کی زبانی سنائے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

> "نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نوعیت اور اس پیمانہ کا فتنۂ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود شاید مسلمان کبھی کسی قومی خطرہ سے اتنے بے پرواہ کبھی نہیں ہوئے، جس قدر اس سے -----
>
> اب کفر و ارتداد ایک اور لباس میں اسلام کے مقابلہ پر آیا ہے۔ اس دفعہ اس کا لباس (آریہ و عیسائی) مذہب کا لباس نہیں' بلکہ فلسفہ (یا علم و عقل) کا لباس ہے۔ اس لباس میں وہ اسلام کو ہی نہیں سارے مذاہب کو ملیامیٹ کر دینا چاہتا ہے ------ اس نے (عیسائیت وغیرہ باطل) مذاہب کی طرح صرف چند لاکھوں مسلمانوں کو مرتد بنایا ہے اور اس کی فاتحانہ یلغار برابر بڑھ رہی ہے"۔

بڑے ہی پتہ کی بات کہ باطل مذہب :-

> سیدھا اور راست اور بلا واسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتا تھا ------ (بخلاف اس کے) باطل فلسفہ علم و عقل کے نام سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ جب اسلام کی تردید کرتا ہے تو اسلام کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے گویا اس کو معلوم ہی نہیں کہ اسلام اس کے حریف کی حیثیت سے دنیا میں موجود ہے --- بلکہ وہ علمی تحقیق و عقلی استدلال

[1] مضمون "قرآن اور علم جدید" ڈاکٹر رفیع الدین صاحب [illegible]

کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح کرتا ہے جس میں خدا و رسالت کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ۔ ۔"

ماشاءاللہ ماشاءاللہ وجزاہ اللہ، خوب ہی خوب چورپکڑے ہیں اور پتہ کی بات سنئے :۔

"باطل مذہب جب اسلام کی مخالفت کرتا تھا تو ہماری دینی غیرت جوش میں آتی تھی ہمارا جائز غصہ بھڑکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں ذرہ بھر شک نہیں ہوتا تھا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے لیکن باطل فلسفہ جب اسلام کی مخالفت کرتا ہے تو ہماری غیرت دینی کا جوش کم ہوتا ہے۔ ۔ ۔ جب ہم اس (باطل فلسفہ) کے فریب میں پھنستے ہیں تو (درحقیقت) بے علمی و جہالت قبول کرتے ہیں۔ لیکن نام اس کو علم کا دیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہم اس کی باتوں کو (اس طرح) جانتے ہیں کہ ہمارے دل میں یہ بات کھٹکتی تک نہیں کہ ان کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہم اس کو دشمن نہیں دوست سمجھتے ہیں اور اس سے تعاون کرتے ہیں۔

پھر :۔

"باطل مذہب کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا تھا، تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جاکر شدھی یا بپتسمہ کی رسمی کارروائی سے گزرے، اس کے بعد وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جاتا تھا، اور اس کا کفر الم نشرح ہو جاتا تھا۔ اسلام سے اس کی دشمنی آشکارا ہو جاتی تھی اور مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار و بیدار ہو جاتا تھا۔"

اور بہت بڑا فتنہ یہ ہے کہ :۔

"اسلام کے اس نئے دشمن نے اپنے پرستاروں کو اجازت دے رکھی ہے کہ تم مذہب بے زاد ہوکر خدا اور رسول کے دشمن بن کر رہو تو۔ ۔ ۔ ۔ بھی اسلام ہی کے دائرہ کے اندر رہو چنانچہ اس دشمن دین و اسلام سے رشتہ جوڑنے والے آج نصف سے بھی زیادہ مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر ہیں یا وحی کے یا رسالت یا حیات بعد الممات کے یا جزا و سزا کے یا ان سب کے"

"ان مسلمانوں میں بعض ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام اس زمانہ میں ناقابل عمل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سارا مذہب ایک ڈھکوسلا ہے۔ ۔ ۔ ۔ پھر ان میں کوئی اسلام کے معاشی نظام کو فرسودہ و بے کار سمجھتا ہے۔ کوئی اسلامی ریاست کو مضحکہ قرار دیتا ہے۔ کوئی جنسی تعلقات پر اسلام کی عائد کی ہوئی پابندیوں کو ایک فطری حیاتیاتی عمل کی ناجائز و مضر صحت اور خارج از وقت رکاوٹ سمجھ کر انکار و استخفاف کرتا ہے۔ کوئی اسلام کی عبادت کے طریقوں کو بے معنی سمجھتا ہے۔ کوئی زکوٰت کو موقوف کرنا چاہتا ہے، کوئی حج کو کوئی قربانی کو، کوئی نماز کو اور کوئی روزہ کو، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام سے اسلام کی اساسیات تک کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اپنے غیر اسلامی تصورات کو اسلام کا نام دیتے ہیں۔ اور اکثر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ

> اسلام سے الگ ہو چکے ہیں۔ بلکہ ایسی راہ اختیار کر چکے ہیں، جو اسلام سے بالکل مخالف سمت میں جاتی ہے۔"

ایک اور بڑا خطرناک پہلو یہ ہے کہ۔

> "ان ساری باتوں کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت ہی میں مسلمان بن کر رہتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، دوستی رشتہ داری، میل ملاپ اور کھانے پینے کے تعلقات رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کے جنازے پڑھتے ہیں، ان کی عبادتوں میں شریک ہوتے ہیں۔"

بلکہ بہتیرے خود دل سے نماز روزہ کے پابند ہوتے ہیں۔ مگر اسلام کے اساسی ایمانیات و عقائد میں خدا و آخرت وحی و نبوت تک سے متعلق قرآنی منصوصات و اسلامی مسلمات سے اتنے اور ایسے ہٹے ہوتے ہیں، کہ ایمان ہی کی خیر نہیں رہتی۔

لیکن نئی تعلیم کے اس نئے ارتدادی فتنہ کا سب سے مہلک متعدی و بائی پہلو یہ ہے کہ اسلام کے یہ "ماڈرن مرتد" فقط اپنی ذات ہی تک ایسی راہ نہیں اختیار کرتے "جو اسلام سے بالکل برعکس سمت جاتی ہے"۔ بلکہ وقت کے حالات نے ان پر یہ چار رکھی ہے، کہ ماڈرن سیاست و حکومت کی کلرکیوں سے لے کر اسمبلیوں کونسلوں وزارتوں، صدارتوں کی اونچی سے اونچی قیادتی کرسیوں تک پہنچ کر اسلام کے یہ چھپے دشمن اسلام کی علانیہ قیادت و نمائندگی کے صرف خود ہی دعویدار نہیں بن جاتے دوسرے اسلام کے کھلے دشمن ان کو اپنی اسلام دشمنی کا بہترین نمائندہ پا کر پورے جوش و خروش سے ان کی پذیرائی کرتے ہیں پھر یہ اسلام اور مسلمانوں کے نمائندہ یا لیڈر بن کر اسلام کے ایمان و عمل سب کا ۔۔۔ حریت و جمہوریت سوشلزم اور کلچر وغیرہ کے پردہ میں ۔۔۔ ایسا علیہ بگاڑتے ہیں کہ نہ مسلمان حکومتوں کے بدتر سے بدتر مسلمان بادشاہوں یا شخصی حکمرانوں کو کبھی اس کی جرأت ہوئی تھی۔ نہ مصر و عراق انڈونیشیا و ہندوستان کہیں غلامی کے دور میں وہاں کے بیرونی آقاؤں نے وہ بے باکیاں اسلام کے حق میں برتیں، جو آج آزادی کے بعد ان نئی تعلیم کے حکمراں اور لیڈر برت رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر عبرت کا ملک پاکستان ہے، جس کا مطالبہ اسلام ہی اسلام کے نام اور نعروں سے آسمان سر پر اٹھا کر درحقیقت ان ہی نئی تعلیم والوں کی طرف سے کیا گیا تھا۔

ایک طرف ہزاروں ہزار کے جلوس ان نئی تعلیم والوں کی قیادت میں "پاکستان زندہ باد" ۔۔۔ "جناح زندہ باد" کے نعرے لگاتے گزرتے تھے، دوسری طرف عین مغرب کے وقت اسلام کا منادی اسلام کے خدا کی بڑائی (اللہ اکبر اللہ اکبر) کا واسطہ دے کر خدا کی بندگی و فرمانبرداری (حی علی الصلوٰۃ) اور اس کے طفیل دین و دنیا کی حقیقی کامیابی و کامرانی (حی علی الفلاح) کی طرف پکارتا ہوتا، مگر اس پکار پہ کان دھرنے اور مسجد کا رخ کرنے والے ہزاروں میں سیکڑوں نہیں دس بیس بھی مشکل سے دیکھے جاتے۔ ایک نامی دینی دارالعلوم کی مسجد میں ایک طرف مغرب کی اذان و نماز ہو رہی ہے۔ دوسری طرف بالکل متصل مسجد کے "زیر سایہ" صف اول کے لیڈر پوری بے تعلقی سے سگریٹ کا دھواں اڑانے میں مشغول ہیں۔ یہ توحیث تھا خود خدا کے پہلو میں خود خدا کے ساتھ بے باکی ہے۔ باقی خدا کے بندوں کے ساتھ ان ہی کا معاملہ یہ ہے کہ قرض لیتے اور ادا کرنے [illegible] برجستہ فرما دیا کہتے کہ کیا دیتے وقت معلوم نہ تھا کہ کہاں سے دو گا۔ دیکھتے نہیں کہ قوم کے کاموں سے دم مارنے کی فرصت کہاں جو کسی دوسری طرف توجہ کروں! خود راقم ہذا کو ایسے جوابات سننے کا تجربہ ہوا۔ ان ہی کا مذکورہ بالا دینی دارالعلوم [illegible] کے سب سے بڑے ذمہ دار بڑے متقی و متدین ثقہ راوی نے یہ واقعہ سنایا کہ کسی چالاکی سے ایک بینک [illegible]

ل فرمالیا۔ اور اس کارنامہ کا ذکر فخریہ فرماتے۔ دستانیوں کی ایسی انتہائی مثالیں کم سہی تاہم جو کھلے چھپے ارتداد کی راہ پر لگ نہیں
چکے۔ نقشہ ان نئی تعلیم والوں کے عملی دین وایمان سب کا کم وبیش یہی ہے۔ الا ما شاء اللہ۔
ان کے اسی رنگ کو دیکھ دیکھ کر راقم ناکارہ کہا کرتا تھا کہ جن لوگوں نے خود اپنی ذات پر اسلام کی حکومت قائم نہیں کی آخر
ن سے یہ کیسے توقع کی جائے کہ کسی خطہ وملک کا اقتدار پاکر وہاں اسلام کا اقتدار یا خدا ورسول کی حکومت قائم کردیں گے۔

کستان میں!

بڑی ردوکد اور انقلابات کے بعد دستور بنا، تو اس میں یہ فرمایا کہ "پاکستان کے مسلمانوں کو
انفرادی واجتماعی طور پر اس کا اہل بنانا چاہیئے اور اپنی زندگیاں اسلام کے بنیادی اصولوں اور
یادی تصورات کے مطابق سنوارنے میں انھیں ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ جن کی مدد سے وہ ان تصورات اور اصولوں
ے مطابق زندگی سنوارنے کا مطلب ذہن نشین کرسکیں" ۔ غالباً ان سہولتوں میں مخلوط معاشرہ رقص وسرود والا کلچر، فلمی
نعت کی سرکاری سرپرستی، شراب نوشی سود خواری، حرام کاری سب ہی کی بلا روک ٹوک گرم بازاری حسب سابق مدد
ں مدد دیتی رہے گی۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا!
بات ایک ہی ہے کہ خود ہمارے ان مغربی نو تعلیم یافتہ ذہنوں کے "بنیادی اصول اور بنیادی تصورات" تو تمام تر مغربی
ن چکے ہیں۔ اس لئے دستور میں کسی سیاسی مصلحت ومجبوری اور اپر بچھیرے اسلام کا نام لینا پڑا ہو تو بھی کام تو پہلے ہی کی
رح مغربی اُستادوں کے پڑھاتے ہوتے ہی ہوتے رہیں گے۔ جن کی بدولت یہی نہیں کہ ان مغربی استادوں کی غلامی کے دور
ے بھی بڑھ چڑھ کر ہر طرح کے صرف عملی فسق وفجور ہی کی آزادیوں کا دور دورہ نہیں۔ کتاب وسنت کے ایمانی واعتقادی مسلمات
سلمات تک کے خلاف مستقل تحریفی تحریکوں کو کھلی چھوٹ حاصل ہے۔ اور تازہ تازہ اخباری اور نجی اطلاعات سے یہم علانیہ
تداد کی ترقیوں نے تو دل ہی ہلاکر رکھدیا!
خود پاکستان کے وزیر داخلہ کے بیان کے مطابق تازہ سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں "عیسائیوں کا اضافہ ۲۳ فیصد تک پہنچ
چکا ہے۔ اور کناڈا کے رسالہ اسپکٹیٹر کے پیش کردہ اعداد وشمار کی رو سے روزآنہ ستر سے زیادہ پاکستانی عیسائی ہو رہے ہیں مزید
یہ مقام کرسُن لیں کہ "رومن کیتھولک دارہ کو پاکستان میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سب سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے" ایک
ے صاحب علم وصلاح ثقہ دوست اپنی ۱۲ مارچ (سنہ ۱۹۶۲ء) کے گرامی نامہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"پاکستان میں عیسائیت کے فروغ کی روح فرسا خبریں پڑھتے ہونگے۔۔۔۔ ایک طبقہ
میں ارتداد کی یہ ہوا چھوٹ پڑی ہے۔ دوسرے طبقہ میں الحاد وبے دینی اور ضلالت
کی ہوا چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی پاکستان کے مسلمانوں کے ایمان واسلام کی حفاظت فرمائے!

ں حالیکہ مسلمان خود ایمان واسلام سب کو غارت ہی غارت کرنے پر تلے ہوں!! آگے اسی سلسلہ میں بعض دوسرے طبقات کا رنگ
ی مرشتے نمونہ از خروارے" یہ درج ہے کہ "ایک طبقہ کو دولت کی فراوانی یورپ وامریکہ کے سامان تعیش اور مغربی ثقافت وتہذیب نے
[illegible] اور دین بیزار بنادیا ہے"
[illegible] کی ان سطروں کی روشنی اپنی خشک بھی نہ ہو پائی تھی کہ پاکستان کی دعوت ودعوے کے سب سے پہلے اور بڑے محرک کا
ہ یہ اقتباسات تازہ صدق (۳۰ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء) سے بحوالہ رہنمائے دکن ماخوذ ہیں۔
[illegible] "بشریۃ المعارف" منشی عبدالرحمن خاں صاحب ملتان کے ایک گشتی عبرت نامہ سے

کراچی کے روزنامہ [illegible] (۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء) کا اسی مسئلہ ارتداد پر متین کا علمی اداریہ کا کچھ اقتباس سامنے آگیا۔ یہ اداریہ جشن یوم پاکستان کی ؟ سالگرہ منانے کے موقع پر شائع ہوا ہے۔ چونکہ فکری آزادی کے مدعی ہمارے "ماڈرن" تعلیم یافتوں کو دین کی کسی بھی بات کے قبول اور تقلید کرنے میں ہچکچاہٹ کم ہو جاتی ہے، جس کی کچھ بھی سند ان کے ماڈرن مغربی ائمہ کے ہاں مل جائے۔ یہی اپیل قرآن نے کی ہے کہ :-

"مگر یونائیٹڈ کنگڈم جیسی ماڈرن اور ترقی پسند جمہوریت کا فرماں روا حامی دین (عیسائیت) کے لقب پر فخر کر سکتا ہے تو پھر پاکستان ایسے ملک کے سربراہ حکومت کے لئے جس کی بنیاد ہی علانیہ دعویٰ کے ساتھ اسلام کے نصب العین پر رکھی گئی ہے، یہ تمام و کمال عین جمہوریت و ترقی پسندانہ ہی ہوگا کہ اس کی حکومت دین اسلام کے حامی کی طرح کام کرے۔ اور پاکستان کو پاک بنائے رکھنے کی خاطر ہر ممکن اقدام سے کام لے۔"

آگے روزنامہ مذکور نے عیسائی مشنریوں پر الزام لگایا ہے، کہ یہ پاکستان بننے کے بعد سے خصوصاً مسلمانوں کو روز افزوں تعداد میں مرتد کرنے کے لئے ہر طرح کے جارحانہ اور قابل اعتراض طریقوں سے کام لے رہا ہے۔ یہ اپنے ارتدادی مشن کو پورا کرنے کے لئے بالواسطہ اور بلا واسطہ ایسی زیادتیاں کرتے ہیں، جس کی اجازت ان کو کسی دوسرے مسلمان ملک میں نہیں دی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان دنیا میں وہ واحد ملک ہے جس نے اقتدار و استقلال حاصل ڈنکے کی چوٹ مذہب ہی کی خاطر کیا ہے۔ آگے تازہ مردم شماری کے اعداد سے بتایا گیا ہے کہ عیسائیوں کی تعداد پاکستان میں سات لاکھ بتیس ہزار سات سو ستاسی (۷۳۲۷۸۷) تک پہنچ چکی ہے اور مغربی پاکستان میں پوری کی پوری عیسائی بستیاں بنتی جا رہی ہیں۔ آخر میں مسئلہ کی پوری تحقیقات کے لئے باقاعدہ طور پر ایک کمیشن کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

مگر جس پاکستان کو "پاک" بنانے کے بجائے فلم جیسی، طرح طرح کی دینی و اخلاقی ناپاکیوں کی سرچشمہ صنعت کو بقول صدق "فلم نواز سرکار" اس طرح سرکاری طور پر نوازتی ہو کہ خود ایک فلمی ماہ نامہ اس سرکار کی شکر گزارانہ داد اس شد و مد سے دیتا ہو کہ :-

"حکومت نے کسی دوسری صنعت کو اتنی مراعات نہیں دیں۔ حکومت نے کسی دوسری صنعت سے تعلق رکھنے والوں کی اس قدر عزت افزائی نہیں کی، جتنی فلمی صنعت کو مراعات دیں اور فلم کاروں کی صدارتی ایوارڈ سے عزت افزائی کر رہی ہے۔"

آگے خود صاحب صدق کا نوٹ کہ :-

"خوب نوٹ کر لیجئے کہ یہ داد ہندوستان کی سیکولر سرکار کو نہیں پاکستان کی اسلامی یا نیم اسلامی سرکار کو خود فلمی حلقہ سے مل رہی ہے۔"

فرمائیے کہ اس "اسلامی" "صنعت" کی ان شاہانہ سرپرستیوں پر کوئی مسلمان تبصرہ کرے تو آخر کیا اور کن لفظوں میں؟

ذکر خصوصیت سے نئی تعلیم والوں کی دین دشمن ذہنیت کا چل رہا تھا۔ یہی نہیں کہ جہاں ان کے ہاتھوں میں حکومت و سیاست کی طاقت آجاتی ہے تو دانستہ یا نادانستہ زیادہ تر دین کے بگاڑ ہی بگاڑ کے کارنامے انجام دینے میں خود لگ جاتے ہیں بلکہ دینی رجحانات والی خصوصاً سیاسی انداز کی تحریکوں یا جماعتوں کو پنپتے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اور زیادہ ہمت والے تو ان کو [illegible]

۱؎ جو کل ۲۳ مارچ کے روزنامہ نیشنل ہیرالڈ (لکھنؤ) میں چھپا ہے۔

خوان کی طرح ٹھکانے لگا کر ہی دم لیتے ہیں۔

طرفہ یہ کہ اس دین بیزاری سے ان کی خالص دنیا پرستی والی سیاست کی عقل بھی اتنی کھو جاتی ہے کہ خود ماڈرن سیاست کی موٹی موٹی باتیں تک سمجھ اور برت نہیں پاتے۔ اس سیاست کا یہ مزاج کس سے ڈھکا چھپا ہے، کہ وہ لوہا صرف طاقت کلاشنی ہے۔ ذلوا یمی اسلحہ کی ہو، خواہ آئینی و غیر آئینی علانیہ و خفیہ انقلابی تحریکوں کی۔ نفس حق وانصاف کا نہ انسانوں کی من مانی خود ساختہ جمہوری واشتراکی کسی سیاست میں کوئی معیار و تصور ممکن ہے، نہ اس پر عمل۔ بس جو جتنا حربی یا نام نہاد آئینی و غیر آئینی حربوں کی طاقت سے دبا کر حاصل کر لے سکے وہی اس کے حق میں حق وانصاف سب کچھ بن جاتا ہے۔ کل تک جو باغی و مجرم، دار ورسن کے سزاوار تھے وہی آج حکومت واقتدار کے سب سے بڑے حقدار قرار پاتے ہیں۔ اور اُن ہی کے ہاتھوں جو کل تک ان کو جیلوں میں سڑاتے اور پھانسیوں پر چڑھاتے تھے۔ خدا چھوڑی زندگی میں چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشی ہو یا سیاسی، لاٹھی اور بھینس یا جنگل کے قانون کے سوا دوسرا قانون چل ہی کیسے سکتا ہے۔ قومی اور بین اقوامی سیاست کے ہر میدان میں اقوام متحدہ تک میں قانون کا بول بالا کرتے[1]

اس سے بڑھ کر موٹی بات، دین و دانش دونوں کے خلاف، اتفاق واتحاد کی طاقت سے غفلت ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں دور و نزدیک آج بھی مسلمانوں کی چھوٹی بڑی بیسیوں اپنے اپنے ملک میں اقتدار رکھنے والی حکومتیں موجود ہیں۔ اور جن عوام کی رائے و رضا کا کلمہ پڑھتا ماڈرن سیاست والوں نے اپنا سب سے بڑا چلتا سکہ بنا رکھا ہے، اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمان عوام کو اسلام کے کلمۂ وحدت پر جس آسانی سے جمع کیا جا سکتا ہے قومیت و وطنیت، جمہوریت واشتراکیت کی کسی دعوت پر نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ مسلمان عوام ہم نوا و ہم آہنگ ہو کر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اگر اسلامی حکومت وسیاست تہذیب و ثقافت کا مطالبہ کرتے تو وہ عین ماڈرن سیاست و جمہوریت کی رُو سے بھی ویسا ہی قابلِ قبول ہوتا، جیسا کہ "پاکستان" بنانے کا مطالبہ تھا۔ کچھ حد ہے ہمارے نوتعلیم یافتہ سیاست کے دیوالیہ پن کی کہ "پاکستان" کا مطالبہ اس عوامی طاقت سے پورا کر کے بھی اس کو ناپاک ہی بنانے پر تل گئے! نتیجہ یہ ہے کہ دوسری مسلمان حکومتوں کے لئے پاکستان کو اسلام پسندی کا نمونہ بنانے کا بہترین موقع پا کر ان کو اسلامیت پر جمع کرنے کی جگہ الٹی ایسی صورتیں پیدا کر دیں کہ آج اُن میں سے بہتیری غیر مسلمان حکومتوں کے ساتھ تو، اتفاق اتحاد کے نعرے لگا رہی ہیں لیکن پاکستان سے بیزاری بلکہ اجنبیت ہے بلکہ دُشمنی ہے۔

جس کی ذمہ داری سب سے زیادہ پاکستان کی نئی تعلیم والی قیادت پر ہے۔ اس بیسویں صدی کی "سکولر" سیاست کے دور دورہ میں، جب کہ رہی سہی نام کی اسلامی خلافت بھی دم توڑ چکی تھی، جدید تعلیم والوں ہی نے ازسرِ نو اسلام کے نام پر ایک مستقل حکومت کا بیڑا اٹھایا۔ پس پردہ نہیں۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کو گواہ بنا کر اور کروڑوں غیر مسلمانوں کو چیلنج کر کے، بلکہ پوری دنیا کے اربوں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے سامنے اعلان اور دعویٰ کر کے۔ پھر ایمان و اسلام کے تقاضوں سے قطع نظر کیا ایک زندہ ضمیر انسان کے لئے اپنے ایسے بلند بانگ اعلانوں اور دعووں کی لاج رکھنا لازم نہ تھا جن کی بدولت بالآخر لاکھوں مسلمانوں، مردوں عورتوں بچوں کو شہید، بیوہ اور یتیم اور بے خانماں تک ہونا پڑا۔ اگر ہندوستان عوام ہی کا نام لے کر سکولر یا مذہبی دستور و جمہوریت و دھڑلے سے بنا سکتا ہے تو پاکستان اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر عین پاکستان طلبی ہی کے عوامی و جمہوری دعوؤں کی بنا اور

---

[1] خدا چھوڑی سیاست کے اس گر کو ہندوستان کے علی الاعلان خدا چھوڑے وزیر اعظم نے خوب ہی سمجھا ہے۔ اپنی "مثبت جانبداری" کے حربہ یا دباؤ سے کام لے کر دونوں موذیوں کی کھٹ پٹ سے خوب ہی خوب مثبت فائدے اٹھا رہے ہیں۔ مگر پاکستان کے فوجی و غیر فوجی سیاست والوں کی سمجھ میں سیاست کی اتنی موٹی بات بھی نہ آئی!

مسلمان عوام و جمہور ہی کے نام پر مذہبی اور صحیح معنی میں حقیقی اسلامی جمہوریت پر مبنی دستور و حکمت آخر کیوں نہیں بنا سکتا تھا؟ اور کیا اس کے بعد دوسرے مسلمان ملکوں کے عام مسلمانوں کی ہمدردیاں پاکستان کو قدرتاً بہت زیادہ حاصل نہ ہوتیں جیسا کہ پاکستان بننے کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان و پاکستان دونوں دونوں کے حج سے لوٹنے والوں سے سنا جاتا تھا کہ حرمین میں جمع ہونے والے عرب و عجم کے سب ہی مسلمان پاکستانیوں کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے اور بڑے اسلامی جوش و خروش سے ملتے تھے۔ اب سنا جاتا ہے کہ معاملہ برعکس ہے۔ اور کیا ایسی صورت میں دوسرے مسلمان ملکوں کے اسلام بیزار لیڈروں کے لئے بھی اپنے عوام کے جذبہ کو بالکلیہ نظر انداز کر کے پاکستان کی دشمنی اور اس کے دشمنوں کی دوستی کا سودا کرنا آسان رہتا۔ بس "مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد" ایک ہی مردانہ قدم اُٹھانا کافی تھا۔ جو دیندارانہ ہی نہیں دنیا دارانہ لحاظ سے بھی عین دانشمندانہ ہوتا۔ ان موٹی موٹی حقیقتوں کو سوچنے سمجھنے کا وقت گیا اب بھی نہیں ہے۔ اس ایک مردانہ قدم کی بدولت پاکستان جیسے سب سے بڑے مسلمان آبادی کے ملک میں ذرا سعودی عرب ہی کی سی اسلامی اصول و قوانین کی حکومت قائم ہو جاتی، تو نہ صرف دوسرے مسلمان ملکوں کے عوام و خواص سب کے لئے ایک بہت بڑی ہمت افزا مثال اور پاکستان کی ساکھ قائم کرنے والی ہوتی، بلکہ غیر مسلمان ملکوں اور حکومتوں میں از سر نو اسلام کا بھرم قائم ہو جاتا، اور مسلمان ملکوں کے عوام و خواص حاکموں اور محکوموں سب میں جو افرا تفری انتشار و پراگندگی پھیلی ہوئی ہے، اس کو ایک مرکز ثقل نصیب ہو جاتا۔ کچھ انتہا ہے اس نفاق و شقاق کی کہ بہ لئے نام ترکی خلافت کے رشتہ سے عرب ممالک میں جو ایک جمعیت پیدا تھی وہ بھی ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح ایسے بکھر گئے ہیں کہ نہ کوئی نام کی "عرب لیگ" ان میں کوئی مستحکم جمعیت اور مرکزیت پیدا کر سکی اور نہ نرے دعوے کی "متحدہ عرب جمہوریہ" ساری عرب حکومتوں کو متحد کر سکی۔ شام کے ساتھ محض کچھ سیاسی چالوں سے اتحاد ہو گیا تھا اس کی بھی چھ مہینے پہلے صبح ہو گئی۔ اور اب چار ہی دن ہوئے کہ ۲۸ مارچ سنہ ۶۲ء کو شام کے فوجی انقلاب نے اچانک اس صبح کی پھر شام کر دی! اس کے بعد خبر آئی کہ ان فوجی انقلابیوں میں بھی باہم پھوٹ پڑ کر طوائف الملوکی کا سامنا ہے!

مسلمان یاد رکھیں کہ اسلام نے ان کو رنگ و نسل ملک و وطن کی مادی تنگیوں اور تعصبات سے اونچا کر کے جو ہمہ گیر کلمۂ توحید و اتحاد عطا کیا تھا، اس سے روگردانی کر کے قومیت و وطنیت کے نام پر وہ اتنا بھی ہرگز جمع و متحد نہیں ہو سکتے، جتنا غیر مسلمان ملک اور حکومتیں ان مادی بنیادوں پر ہو جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض ذرا اسلام پسند اور ہوش مند مسلمان نسی تعلیم اور مسلمان ملکوں کے حکمراں لیڈروں ہی نے یہ چاہا کہ مسلمان حکومتیں اپنا ایک وفاق ہی بنا لیں یا کم از کم انگریزوں کی سی ایک دولت مشترکہ ہی بنا کر اس میں شریک ہو جائیں تو یہ آواز تک صدا بصحرا رہی! غضب یہ کہ بلا استثنا عرب ملکوں ہی نے خصوصاً اس سے سرد مہری برتی[1] بلکہ عرب لیگ کے ہندوستان میں مستقل نمائندے کو تو "مسرد مقصود" ہیں اُنھوں نے دولت مشترکہ کی تجویز کے سلسلہ میں اپنی "مسرد مہری" کا حق نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہ فرما کر ادا فرمایا کہ "عرب لیگ کے ممبر ممالک عرب کے باہمی سیاسی تعلقات کے درمیان میں مذہب کو نہیں کھینچنا چاہیئے"[2] "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی" کے کیسے کیسے شرمناک و عبرتناک مظاہر ہمیں دیکھنا پڑ رہے ہیں! حالانکہ اس کا آئے دن ہی تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ "مذہب کو درمیان میں کھینچے بغیر

---

[1] جیسا کہ اس تجویز کے خود مجوز ملایا کے وزیر اعظم ٹنکو عبدالرحمٰن نے لاہور میں بتایا کہ "مشرق وسطیٰ کے ایک ملک نے بھی اس پر دھیان نہیں دیا" (قومی آواز ۱۸ نومبر سنہ ۶۱ء)

[2] قومی آواز ۲۲ مارچ سنہ ۶۱ء

مسلمان روز بروز آپس میں ایک دوسرے سے اور کھنچے جا رہے ہیں۔ ایک تو اسلام کی تعلیمات و روایات نے ہزار بارہ سو سال کی طویل مدت میں ان کا عالمگیر اسلامی اخوت کا ایک مزاج بنا دیا ہے، اس کے اثرات کو سو ڈیڑھ سو سال سے چلی ہوئی قومی و وطنی دعوت کیسے مغلوب کر سکتی ہے۔ دوسرا اصلی حقیقی و ایمانی راز اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں نے چونکہ اسلام اور اس کے خدا سے اپنا رشتہ بالکل توڑ نہیں لیا ہے۔ اس لئے ان کے خدا نے بھی اُن کو بالکل چھوڑا نہیں کہ غیر اسلامی طریقوں سے ان کو دنیاوی کامیابیاں غیروں ہی کی سی اتنی حاصل ہونے دی جائیں کہ رہے سہے اسلام کے نام سے ہی کاموں پر ہاتھ دھرنے لگیں۔ اس ایمانی و اسلامی حقیقت کو ذرا اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

حضرات انبیا یا خدا کے رسولوں اور پیامیوں کی دعوت و پیام کو قبول کرنے والے درحقیقت ان پیام بروں کے واسطہ سے خود خدا سے بے چون وچرا اطاعت و فرمانبرداری کا عہد و پیمان باندھتے اور قول و قرار کرتے یا حلف وفاداری لیتے ہیں۔ قرآن میں اس عہدِ وفا کو میثاق کہا گیا ہے۔ جس کے معنی کامل وثوق و اعتماد والے مضبوط سے مضبوط عہد و پیمان ہی کے ہیں اور مسلمان ہونے کا مطلب خاتم النبیینؐ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے ایسا ہی واثق و استوار ابدی عہد باندھنے کے سوا اور کچھ نہیں اس لئے خود حضورؐ ہی کو خطاب فرما کر ارشاد ہے کہ "جو لوگ آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت یا قول و قرار کر رہے ہیں وہ دراصل خود اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہاتھ دے رہے ہیں" اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ) پھر لازماً ایسے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا ہاتھ ہو جاتا ہے"۔ (یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ) یعنی اُن کا دست گیر و مددگار تمام معاملات میں خود اللہ تعالیٰ ہی بن جاتا ہے۔ دوسری طرف عہد شکنی کا وبال بھی لازماً عہد شکنوں ہی پہ پڑ کر رہ جاتا ہے۔ (فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ) باقی جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے اپنے اس عہد کو پورا کرتے ہیں ان کو وہ جلد ہی بڑا اجر دے کر رہے گا (ومن اوفی بما عٰھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجراً عظیماً)

مسلمان ہونے کے بعد دین و دنیا کے تمام معاملات میں اہم و اقدام اس ایمانی و اسلامی حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہے، کہ اگر ہم اپنی وفاداریوں کے ساتھ خدا کے ہو گئے تو خدا ہمارا ہو کر رہے گا (من کان للہ کان اللہ لہ) اور اگر ہم نے اس وفاداری کا حق اس کی یعنی اس کے احکام و شرائع یا اس کے دین و اسلام کی نصرت و مدد سے ادا کیا، تو اس کی دست گیری بھی قدم قدم پر ہمارے ساتھ ہو گی۔ ان تنصر اللہ ینصرکم)

اسلام کے شرائع و احکام یا اوامر و نواہی زیادہ تر کتاب اسلام کی ابتدائی بڑی بڑی سورتوں میں بیان فرما دیئے گئے۔ سورہ مائدہ جس سے پہلے ان احکام کا بہت بڑا حصہ بیان ہو چکا ہے۔ اس کی ابتدا میں خصوصیت سے مسلمانوں کو خطاب کر کے انکے اتباع کا حکم ایفائے عہد ہی کے عنوان سے دیا گیا ہے۔ "یا ایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود" "عقود" جیسا کہ مفسر تھانویؒ نے مفسر قرآن حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل فرمایا ہے۔ اسلام کے تمام احکام و شرائع کو محیط ہے۔ اور خود سورۃ مائدہ حضرت تھانوی کے نزدیک "اوفوا بالعقود" ہی کے متن کی شرح ہے۔ نیز اس ایفائے عہد۔ بالفاظ دیگر اسلام کے احکام و تعلیمات کی عملی پیروی و پابندی کا مسلمانوں سے مطالبہ ان کے دعوت اسلام کو قبول کرنے ہی کا یعنی لازمہ و مقتضا ہے۔ جیسا "اے ایمان لانے والو" (یا ایھا الذین آمنوا) کے خصوصی خطاب سے ظاہر ہے۔

اپنے حالات کا جائزہ

اس سورہ کی ساتویں آیت میں اور مسلمانوں ہی کو دین اسلام کی تکمیل اور اتمام نعمت کے انعام و احسان کی یاد دہانی کے ساتھ وہ عہد و میثاق بھی یاد دلایا گیا ہے، جو خدا نے ان سے مضبوطی کے

ساتھ باندھا ہے اور جو یہ کہہ کر وہ قبول کر چکے ہیں کہ ہاں ہم نے سن اور مان لیا ــــــ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہ اذ قلتم سمعنا واطعنا ــــ یہ وہی "سمعنا واطعنا" والا قول و قرار ہے، جو سب سے پہلی اور احکام کی سب سے بڑی سورۂ بقرہ کے آخر میں قیامت تک ایمان لانے والے ہم سب مسلمان کرچکے ہیں (آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ---- وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا) اس عہد و میثاق سے مراد خدا اور بندوں سب ہی کے ان حقوق کی خصوصًا ادائی ہے جو خدا و رسول نے عائد فرمادیئے ہیں اور یہاں مائدہ میں "سن اور مان لینے" کے اس عہد کی مزید یاددہانی کے ساتھ ساتھ خوب کان کھول کر سننے سنانے اور یاد رکھنے والی یہ تنبیہ و آگاہی بھی فرمادی گئی کہ اس عہد و پیمان کے بعد خدا سے پوری طرح ڈرتے یا عہد شکنی وغداری کے وبال سے بچتے رہو۔ کیونکہ خدا تمہارے دلوں تک کا حال پوری طرح جانتا ہے۔ اس کے سامنے تمہاری بدعہدیوں یا نافرمانیوں کے بناوٹی عذر یا چکنی چپڑی باتیں کبھی نہیں چلیں گی۔ واتقوا اللہ، ان اللہ علیم بذات الصدور۔ آگے اس خدائی عہد و میثاق کو توڑنے والی سابقہ امتوں میں خصوصیت سے بنی اسرائیل کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ خدا نے ان کو عہد شکنی ہی کی سزا میں ملعون و مردود یا اپنی رحمت و نصرت سے دور و محروم کر دیا۔ فبما نقضہم میثاقہم لعنّاہم ----

قرآن مجید نہ کوئی تاریخی قصوں کی کتاب ہے، نہ دیومالائی افسانوں کی۔ وہ صرف کتاب ہدایت یا زندگی کا صحیح راستہ بتلانے والی کتاب ہے۔ اس میں مختلف انبیاء اور اُن کی امتوں اور قوموں کے جو واقعات وحالات یا قصص وحکایات بیان کئے گئے ہیں، وہ تمام ہدایت و ضلالت ہی کے پہلو سے۔ اس اعتبار سے سورۂ فاتحہ یا کتاب ہدایت کے افتتاحیہ ہی میں انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے ــ (۱) "منعم علیہم" کا جن کے ساتھ خدا کا تعلق انعام واحسان یا رضا و رحمت کا ہوتا ہے (۲) دوسرا "مغضوب علیہم" کا جن سے غضب و ناراضی کا معاملہ ہوتا ہے۔ اور (۳) تیسرا "ضالین" کا جن کی ہدایت کی توقع کی جاسکتی ہے یا جن کی ضلالت وگمراہی مغضوبیت کی انتہا کو نہیں پہنچ چکی ہے۔

اس انتہا کو پہنچے ہوئے قرآن کی نظر میں خصوصیت سے بنی اسرائیل یا یہود ہیں۔ یہ ایک مسلّم اُولوالعزم نبی کی امت تھے ایسے نبی کہ نبی الاسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے خود کو ان کا "مثیل" یا ان جیسا بتلایا ہے۔ پھر بار بار ان پر قرآن ہی میں جو لعنت اور پھٹکار فرمائی گئی ہے، ان کا قصور کیا تھا؟ یہی ناکہ اپنے نبی کے واسطے سے خدا کی وفاداری وفرماں برداری کا عہد و پیمان باندھ چکنے پر بھی عملاً اس کو توڑتے رہتے۔ اس کے بعد خدا کی لعنت کے سوا اس کی معیت و نصرت کا جو وعدہ تھا وہ بھی کیسے قائم رہتا۔ اس صورتِ حال کا نقشہ سورۂ مائدہ کی مذکورۂ بالا آیت ہی کے سلسلہ میں ذرا آگے پڑھیں :-

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ	اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور ان میں سے بارہ نگراں بھی مقرر کردیئے تھے (کہ وہ اس عہد کی نگرانی کرتے رہیں) اور (تھا یہی) اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا تھا کہ میں تمہارا ساتھ دیتا رہوں گا۔ (بشرطیکہ تم اپنے عہد پر قائم رہے یعنی) نماز کی پابندی رکھی۔ زکوٰۃ دیتے رہے۔ نیز میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی مدد کرتے

اور اللہ کو اچھی طرح قرض دیتے رہے (یعنی اس کی راہ و رضا میں اچھی طرح خرچ کرتے رہے) تو ان بڑی بڑی نیکیوں کی بدولت تمہاری غفلت یا بھول چوک کے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو مٹاتا بھی رہوں گا اور (آخرت میں) ضرور ایسے باغ

عطا کروں گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی لیکن جو (اس خدائی وعدہ کے بعد بھی اپنے عہد سے پھر گئے، یا کفر کی راہ و روش اختیار کی تو وہ یقیناً خدا کی رحمت و نصرت والی زندگی کی) راہِ راست سے گمراہ ہوگئے۔

مگر اس کے بعد ہی آگے راہِ راست سے اس گم رہی یا خدا سے کئے ہوئے عہد کو توڑنے کا خمیازہ خوب کان کھول کر سن لیا جائے کہ

"اُن کی اس عہد شکنی کی سزا میں ہم نے اُن کو ملعون و مردود (یا اپنی رحمت و معیت سے دور محروم اور ایسا سنگ دل بنا دیا کہ بد عملی تو بد عملی) خدا کے کلام کی تحریف تک کرنے (یعنی توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا بنانے) لگے۔ اور جو کچھ اُن سے یاد رکھنے کو کہا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ (کم از کم عملاً) بھلا دیا۔ (حتیٰ کہ) آئے دن اُن کی اس طرح کی کوئی نہ کوئی نئی خیانت آپ کے سامنے آتی رہتی ہے۔ جس سے اِنے گنے بس کچھ ہی ان میں مستثنیٰ ملیں گے (جب اُن کی ڈھٹائی عام طور پر اس انتہا کو جا پہنچی تو ان کی ہدایت کی کیا توقع) لہٰذا آپ ان سے درگزر اور قطع نظر ہی سے کام لیں کہ (ایسی صورت میں یہی مصلحت و مستحسن ہے) اور اللہ تعالیٰ ایسا مستحسن طرز اختیار کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔"

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ ع ۳)

اس آئینہ میں ہم مسلمانوں کے کم و بیش ہر طبقہ کی ایمانی و عملی عہد شکنیوں ہی نہیں انتہا تک پہنچی ہوئی "پرویزی" رنگ کی تحریفی ڈھٹائیوں کی تفصیل دیکھنے دکھلانے کے لئے تو دفتر کے دفتر چاہئیں۔ کتاب و سنت یا دین کے پورے دفتر کو مسخ کر ڈالنے کی ایسی جہل مرکب کی ڈھٹائیوں سے کام لیا گیا ہے کہ اسرائیلی تحریفات بھی اُن کے سامنے گرد ہیں!

ایک جگہ نہیں، جگہ جگہ بنی اسرائیل کی اس ملعونیت و مردودیت کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ اور صرف خدا ہی کی طرف سے نہیں خدا کے فرشتوں اور انسانوں سب ہی کی طرف سے۔ پھر انتہائی ملعونیت کی یہ سزا اس جرم کی بتلائی گئی ہے کہ جو قوم ایمان لانے اور رسول کے رسول برحق ہونے کی گواہی دینے کے بعد بھی کفر کی باتیں کرتی ہو وہ خدا کی ہدایت کی مستحق ہی کب رہ جاتی ہے۔ نہ خدا ایسی ظالم قوم کو ہدایت دیتا ہے۔ وہ تو خدا فرشتوں اور انسانوں سب کی طرف سے دائمی لعنت ہی لعنت کے سزاوار ہیں۔ اس سزا کے عذاب میں تخفیف کی گنجائش ہے، نہ مزید مہلت کی۔ ہاں جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کرلی تو خدا کی مغفرت و رحمت کا دروازہ بند نہیں۔ البتہ جنھوں نے ایمان کے عہد و پیمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کی۔ پھر کفر ہی کفر کی باتوں میں (مرتے دم تک) بڑھتے چلے گئے توایسوں کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔ وہ تو پکے گمراہ ہیں ہی۔

کیا آج ہم مسلمانوں کا کم و بیش یہی نقشہ نہیں کہ ایک طرف خدا پر ایمان اور رسول کو رسول برحق جاننے کا دعویٰ کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف خدا و رسول کے احکام کی کم و بیش ہر طرح کی عملی نافرمانیوں کے علاوہ شرک و کفر بدعات و تحریفات تک کی انتہائی بے باکیوں میں ہمارے اکثر افراد و طبقات مرنے کے دم تک بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اعاذنا اللّٰہ منہ

حدیث میں ہم مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے اسی طرح قدم بہ قدم چلنے پر پیمبرانہ پیش گوئی کے ساتھ آگاہ و متنبہ فرمایا گیا ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

كيف يهدي الله قوما كفروا بعد ايمانهم وشهدوا ان الرسول حق وجاءهم البينات ... اولئك جزاؤهم ان عليهم لعنة الله والملائكة [illegible]
[illegible] خالدين فيها لا يخفف عنهم العذاب ولا هم ينظرون الا الذين تابوا من بعد ذلك واصلحوا فان الله غفور رحيم

"میری اُمّت بنی اسرائیل کے حالات سے قدم سے قدم ملا کر گذرے گی، حتیٰ کہ اگر ان میں کسی نے علانیہ اپنی ماں سے بدکاری کی ہے، تو یقیناً میری اُمّت کا بھی کوئی نہ کوئی (بدبخت) ایسا ضرور کرے گا۔"

یہ تو انفرادی بدبختی و بداعمالی کی انتہا ہوگی۔ اجتماعی پھوٹ اور تفرقہ پسندی میں بھی بنی اسرائیل سے آگے ہی نکل جائیں گے۔ اگر
"بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے تو میری اُمّت پارہ پارہ ہوکر ایک ملت کی (۷۳) ملتیں بن جائیں گی جن میں سے ایک کے سوا سب ناری ہونگی۔"

یعنی باقی سب کی سب اسلام کا نام لینے والی ملتیں عملاً کام کافروں ہی کے کریں گی۔ مسلمان کہلانے والی کوئی دو جماعتوں یا دو ملتوں کا کیا ذکر کوئی دو گھر بلکہ دو دل بھی ہمارے ملے ہوئے آج شاذ و نادر ہی ملیں گے۔ تاہم اسلام کو جس خدا نے رہتی دنیا تک دنیا بھر کا دین ٹھہرا دیا ہے، اس نے جس طرح اسلام کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت و اسوہ کو کتابی یا نظری طور پر محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود لے لی ہے اسی طرح کم از کم کسی نہ کسی ایک جماعت یا ملت کو اسلام کی عملی تعلیمات کا دوسروں کے لئے نمونہ یا اسوہ بناتے رکھنا اور اس کی پہچان بتا دینا بھی ضروری تھا۔ اسی لئے جب صحابہؓ نے عرض کیا کہ وہ ایک جماعت کون ہوگی تو ارشاد ہوا کہ "جو میرے اور میرے اصحاب کی راہ و روش پر ہو"۔

یہ تو ترمذی کی روایت تھی ایک دوسری احمد ابن حنبلؒ اور ابو داؤد کی روایت میں اس طرح ہے کہ:-
"آگے چل کر میری اُمّت میں ایسے گروہ در گروہ نکل پڑیں گے، جن کے رگ و پے میں ہوا پرستی یا نفس و نفسانیت اس طرح سرایت کر جائے گی، جس طرح کتے کے کاٹنے کی بیماری کتے کے کاٹے ہوئے (سگ گزیدہ) میں سرایت کر جاتی ہے کہ کوئی رگ و ریشہ اور جوڑ بند اس سے بچا نہیں رہتا۔"

اس روایت کے ذیل میں محدث دہلوی حضرت شیخ عبدالحق رحؒ اپنی شرح لمعات میں تحریر فرماتے ہیں کہ "پاگل کتے کے کاٹنے کی بیماری متعدی ہوتی ہے، اور اس کا بیمار پانی نہیں دیکھ سکتا اور اگر دیکھتا ہے تو بھونکنے لگتا ہے مگر پی نہیں سکتا اور بالآخر تڑپ تڑپ کر ہوتے ہوتے پیاسا ہی مر جاتا ہے ------ اہل ہوا یا نفس پرستوں کی وجہ تشبیہ اس بیماری کے ساتھ ظاہر ہے کہ جس طرح یہ بیماری آدمی پر مسلط ہوکر ------ اس کو پانی سے ایسا بیزار کر دیتی ہے کہ دیکھتا ہے مگر پی نہیں سکتا اور پیاسا ہی پیاسا مر جاتا ہے۔ اسی طرح اہل بدعت واہل ہوا صحیح علم دین کو کھلی آنکھوں دیکھنے پر بھی اس سے مستفید نہیں ہوتے اور محروم رہ کر جہل و بدعت کے صحرا میں بھٹک بھٹک کر جان دیتے ہیں۔ اللہم کو اس سے بچائے۔"

کیا کہوں مجھ کو یہ سگ گزیدگی اس زمانہ میں اہل بدعت سے بھی بڑھ چڑھ کر اہل سیاست پر مسلط دکھائی دیتی ہے، کہ یہی خود پرستیوں، قوم پرستیوں، وطن پرستیوں، حریت پرستیوں، نام نہاد جمہوریت پرستیوں، سوشلزم پرستیوں وغیرہ طرح طرح کی من مانی ہوا پرستیوں کے مختلف سیاسی پلیٹ فارموں پر صدارتوں وزارتوں ممبریوں وغیرہ نیچے سے اوپر تک کی کرسیوں کی پیاس میں بھونکتے بھونکتے بالآخر پیاسے ہی پیاسے مرتے ہیں کہ "حریص کی حرص قبر ہی میں جاکر ختم ہوتی ہے" کاسۂ حریصاں پُر نہ شد۔

سب سے زیادہ حیرت در حسرت عرب و عجم سب کے مسلمان اہل سیاست پر ہے، کہ ان کے لئے آج بھی مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ والی

سیاست یا خلافتِ راشدہ کا صاف شفاف پانی گھر ہی میں آنکھوں کے سامنے موجود و محفوظ ہے جو آجکل کی اور نام نہاد جمہوریت واشتراکیت (یا سوشلزم) سب کی افراط و تفریط کی گندگیوں سے بحمد اللہ پاک ہے۔ پھر بھی ماڈرن سیاسی سگ گزیدوں ہی کی طرح ہم بھی مصر سے لے کر انڈونیشیا تک ماڈرن نعروں ہی کی آواز میں آواز ملا کر بھونکتے رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ عبرت پاکستان کی اپنے گھر ہی کی اس دولت سے محرومیوں پر ہے کہ از سرِ نو اس کی بازیافت کا دعویٰ کرکے پھر کھو دیا! خیر یہ تو دکھے دل کی آواز کا جملہ معترضہ تھا، کہ اخبار پڑھ کر بہت زیادہ دل پاکستان ہی کی کسی نہ کسی ناپاک خبر سے ہر آئے دن دکھتا رہتا ہے!

"کتابُ اللہ کے اسرائیلی آئینہ میں ہم مسلمانوں کا جو سراپا دکھایا گیا ہے اصل ذکر اس کا چل رہا تھا، اور اس کی شرح میں کچھ کتاب الرسول سامنے آگئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ذہنیت و سیرت اور کردار کا جو قدِ آدم آئینہ خود ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے اس میں ہم مسلمان اپنے "تن ہمہ داغ داغ" کا سراپا ہی کھلی آنکھوں نہیں دیکھ سکتے۔ چاہیں تو ان داغوں کو ایک ایک کرکے مٹا بھی سکتے ہیں"

واقعی کلام اللہ نامحدود علم و حکمت والے اللہ ہی کا کلام ہے، جتنا تفکر و تدبر سے کام لیجئے اس کے نامحدود عجائب کھلتے ہی کھلتے چلے جائیں گے اور قیامت تک ختم نہ ہوں گے۔ ابھی بنی اسرائیل کے احوال و قصص کے قرآنی نقشہ پر کچھ خود ہی فکر کر رہا تھا کہ سورہ بقرہ کے اوائل میں بنی اسرائیل کا مسلسل کئی رکوع تک ذکر جو چلا گیا ہے اچانک اس کی ایک عجیب معنویت و بلاغت بحمد للہ تعالیٰ سامنے آگئی۔ سوال یہ ہوا کہ حضرت آدمؑ کے قصہ کے مابعد درمیان کے بیسیوں بڑے بڑے انبیاءؑ اور اُن کی اُمتوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل ہی کا ذکر اور پھر اتنی تفصیل سے کیوں چھڑ گیا؟

بات صاف ہے کہ کتابِ سلام "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی درخواست ہدایت کرانے کے بعد سے لے کر "والنّاس" تک پوری کتاب صرف ہدایت ہی ہدایت کی کتاب ہے۔ یعنی اس کا اصلی و محوری موضوع نوعِ انسان کی زندگی کی وہ صاف سیدھی راہ دکھاتا ہے جس پر چل چلا کر وہ اپنی تخلیق کی نوعی و خصوصی منزل و مقصد کو پا سکے۔ یا انسانی خلقت و فطرت کی صحیح طور سے تربیت و تکمیل ہو سکے۔ ساتھ ہی ساتھ "رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" کی عام و خاص رحمت یا "رحمانیت و رحیمیت" کا تقاضا تھا کہ عمومی و خصوصی اجتماعی و انفرادی ہر طرح کی ہدایت و ضلالت کے افکار و اعمال کو صرف خشک قانونی ضابطوں یا دفعات کی صورت میں بیان نہ کر دیا جائے بلکہ دلنشین تمثیلات اور گذشتہ نبیوں اور اُمتوں کے اہل ہدایت و ضلالت کے ترغیبی و ترہیبی قصص و حکایات کے ذریعہ راہ یابوں کی حوصلہ افزائی گمراہوں (ضالین) کو آگاہی اور بدراہوں (مغضوب علیہم) پر اتمام حجت ہوتی ہے۔

بدراہوں کی خصوصیت اس لئے کہ نفس بے راہی یا گمراہی جس کا منشا زیادہ تر غفلت و نادانی ہو اس کے مقابلہ میں وہ جرم بہت سنگین و ناقابلِ معافی بلکہ قدرتاً دل و دماغ سب کو سرے سے مختوم و ماؤف کر دینے والا ہوتا ہے جس میں مال و جاہ کی حرص و ہوس، خود پرستی و خود رائی کی بدولت حق گریزی و باطل پسندی کی راہوں کو اختیار کیا گیا ہو۔ یہ تو ضد و شرارت سے حق و ہدایت کے راستوں کو اپنے اوپر بند کر لینا اور باطل و حق کے دروازوں کو چوپٹ کھول لینا ہے۔ ظاہر ہے ہدایت یابی سے مانع سب سے خطرناک یہی ابائی ذہنیت و استکباری نفسیات ہوتی ہے۔

حضرت آدم اور ابلیس کے قرآنی قصہ کا جوہری خلاصہ یہی دونوں تقابلی نفسیات ہیں۔ آدمؑ کی "آدمیت" یا بشریت وقتی لغزش و غفلت یا بھول چوک تھی۔ لہٰذا تنبیہ و تذکیر کے بعد سراپا عجز و نیاز اور اعتراف و انابت بن گئی۔ بخلاف ابلیس کے کہ اس کی ابلیسی و شیطانی یا ابائی و استکباری ذہنیت نے نافرمانی ہی پر بس نہیں کی۔ اُلٹے خدا سے مناظرہ و مجادلہ پر تل گئی۔ اور اپنی سرکشانہ ذہنیت کی تاویل و توجیہ میں منطق چھانٹنے لگی۔ اسی قصہ کے آخر میں اولادِ آدم کو یہ بھی بتلا دیا گیا کہ خدا کی طرف سے تو

ہماری ہدایت کا انتظام وقتاً فوقتاً برابر ہوتا رہے گا۔ اس کا اتباع کرنے والے ابدی فلاح پائیں گے اور انکار کرنے یا دنیا الیسی نطق اختیار کرنے والے ابدی ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا۔ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اس کے بعد ہی سے بنی اسرائیل کے واقعات حالات کا جو مُرقع کھینچا گیا ہے، اس کا لب لباب بھی ابا و استکبار کی انکاری و تکذیبی ذہنیت ہی ہے۔ حد یہ ہے کہ جس طرح شیطان خدا کے حضور اور عین ہم کلامی کے وقت اپنی نافرمانی پر بجائے کسی ندامت و انابت کے اس کی توجیہ و تائید کے لئے مناظرانہ حجت بازی پر اُتر آتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بنی اسرائیل ایک طرف خدا و رسول اور اس کی کتاب و تعلیم پر ایمان کا دعویٰ کئے جاتے ہیں، دوسری طرف خود اپنے مانے ہوئے نبیوں یا خدا کے نمائندوں کے روبرو خدا سے کئے ہوئے عہد یا اس کے احکام سے سرتابیوں کے لئے طرح طرح سے فرار کی راہیں پیدا کرتے جاتے ہیں اس لئے اپنے انعام و احسان کی یاددہانی کے ساتھ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو وفائے عہد کی طرف متوجہ فرمایا کہ تم نے ایمان و اطاعت کا جو عہد اللہ سے باندھا ہے اُس کو پورا کرو تو میں اس کے صلہ میں تم سے کئے ہوئے انعام و احسان کے عہد و وعدہ کو آئندہ بھی پورا کرتا رہوں گا (یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ) آگے اس عہد کے ایمانی و عملی تقاضوں کی کچھ تفصیل و تشریح ہے پھر ان کو پورا نہ کرنے کی ابائی و استکباری ذہنیت سے دینی و دنیوی وبال و نکال کے جو نتائج پیدا ہوئے اُن کا ذکر آخر پارہ تک کوئی ۱۲ رکوعوں میں کم و بیش بنی اسرائیل ہی کو مرکز و محور بنا کر چلا گیا ہے۔ اس پر پوری بحث تو پوری کتاب بن جائے گی۔ ذیل میں صرف بعض ایسی چیزوں کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں جن سے خاص طور پر ہم مسلمان چاہیں تو بہت کچھ سبق و عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔

اسلام کے ظہور کے وقت دنیا میں صرف بنی اسرائیل ہی کے پاس خدا کے عہد کی کتاب یا عہد نامہ —— جس کو آج بھی عہد نامہ قدیم کہا جاتا ہے[1] —— کم از کم اس حد تک صحیح حالت میں موجود تھی، کہ اس کے ذریعہ سے اسلام کی کتاب و رسول کو بھی خدا کی کتاب و رسول ہونا جان پہچان سکتے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی فن کا عالم اپنے فن کی کسی نئی کتاب کو بے تکلف جان جاتا ہے کہ یہ اُس فن کی کتاب ہے اس لئے ان سے کہا گیا کہ جس کتاب پر تم کو سب سے پہلے ایمان لانا تھا، اس کے تم ہی سب سے پہلے کافر و منکر تو نہ بنو (وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍۢ بِهٖ۔) اور اس کفر و انکار کا محرک کیا تھا؟ دین و آخرت کے ابدی منافع کے مقابلہ میں اور خدا سے نڈر ہو کر دنیا کے جاہ و مال کے کچھ عارضی و حقیر فوائد کا سودا کر لیا (وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ —— یہ سودا کس طرح کیا جاتا تھا؟ جان بوجھ کر حق کو چھپانے اور حق و باطل کو خلط ملط کرنے کی خیانتوں سے —— وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

یہ تو ان عہد فراموش بنی اسرائیل کا کتاب اسلام کے تئیں معاملہ تھا، جو اس کے "کتاب اللہ" ہونے کے بہر حال منکر ہی تھے۔ لیکن ہم مسلمان جو بہر حال اس کو خدا کی کتاب کم از کم زبان سے تو مانتے ہی ہیں پھر بھی عملاً کم و بیش ہمارا ہر طبقہ دنیا کے ادنیٰ سے ادنیٰ منافع کے لئے دین و ایمان کا سودا کھلے بازاروں میں دن رات ہی کرتا ملتا ہے!

آگے ایسے نہ نام کے بلکہ بدنام کرنے والے ایمان کو کام کا بنانے کے لئے وہی دو کام بنی اسرائیل کو خطاب کر کے در اصل مسلمانوں کی

[1] اس عہد نامہ کی کچھ تفصیل خود توریت سے مولانا عبد الماجد دریابادی کی تفسیر میں ملاحظہ ہو کہ "تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے۔ اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرطوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ۔۔۔ اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا ۔۔۔ کہ اگر تم میری آواز فی الحقیقت سننے والے ہو گے اور میرے عہد کو حفظ کرو گے تو تم ساری قوموں سے زیادہ میرے ایک خزانہ خاص ہو گے" (تفسیر ماجدی، صفحہ ۱۹)

سبق دینے کے لئے بتائے گئے ہیں جو ابتدا ہی میں "ذٰلِکَ الْکِتَابُ" لینے سے ہدایت پانے کی پانچ شرطوں میں دو عملی شرطیں قرار دی جا چکی ہے۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکات، یا انفاق (وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ) نماز سے خدا کے ساتھ تعلق درست ہو کر خصوصیت سے کبر و جاہ کے موانع ہدایت کا علاج ہوتا ہے، اور انفاق سے حُبِ مال کے مرض کا جس سے خصوصیت سے بندوں کے ساتھ تعلقات دُرست ہوتے ہیں۔ اس طرح جاہ و مال یا دنیوی منافع کی حرص و ہوس جو حق بینی اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکتی تھی وہ دُور یا مغلوب ہو کر ہدایت یابی یا دین کے راستہ چلنا چلانا آپ سے آپ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کفر و انکار اور تلبیس و کتمانِ حق کی ایمانی بیماریوں کا عملی علاج اقامتِ صلوٰۃ خصوصًا با جماعت اور ایتائے زکات بتایا گیا۔ ہم مسلمانوں میں ٹوٹی پھوٹی نماز وہ بھی زیادہ تر بے جماعت پڑھنے والوں کی ایک اقل قلیل اقلیت یا جماعت تو نکل آئے گی لیکن زکات کے ساتھ اچھے اچھے مالدار نمازی کیا تہجد گذاروں تک کا معاملہ الا ماشاء اللہ "گر ز طلبی سخن درین است" ہی کا پائیں گے۔ بندوں کے حقوق میں ہماری معاملاتی گندگیاں اور کوتاہیاں زیادہ تر نتیجہ اسی "سخن دریں است" اور اس کے لوازم کا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد ارشاد کہ "کیا غضب ہے دوسروں کو نیکی کا حکم وہدایت کرتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے [1]۔ حالانکہ تم کتاب اللہ کی تلاوت بھی کرتے رہتے ہو، کیا اس سے "اوّل خویش بعدہ درویش" کی سی موٹی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی (اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتَابَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) یہ عام بنی اسرائیل سے زیادہ اُن کے علما کو خطاب معلوم ہوتا ہے۔ اور آج ہمارے عام علما کا ہو بہو یہی نقشہ ہے۔ بلکہ ہمارے علما تو اب دوسروں کو نیکی کے حکم کا بھی حق ادا کم ہی کرتے ہیں۔ پھر مزید تاکید کے لئے پہلے صبر اور پھر نماز ہی کے ذریعہ مدد حاصل کرنے کی فرمائی گئی ہے۔ یعنی اگر دنیا میں تم کو انفرادی واجتماعی طور پر کچھ ناموافق حالات سے دوچار ہونا پڑے تو ادھر اُدھر نظر دوڑانے کی بجائے خدا ہی پر بھروسہ کر کے صبر و ضبط سے کام لو اور ساتھ ہی نماز کے ذریعہ خدا سے تعلق بڑھانے پر اور زیادہ توجہ کرو اور یہ نماز گراں ایسوں ہی پر ہوتی ہے، جو اس کی حقیقت خدا کے سامنے حضوری کو مدِ نظر رکھ کر دل کے حضور وسکون کے ساتھ نہیں پڑھتے اور یہ حضوری وعاجزی کا حال انہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، جو روزمرہ کی زندگی میں تھوڑا بہت اس بات کا خیال کرتے رہتے ہیں۔ کہ جس خدا کے حضور آج نماز کی صورت میں غائبانہ حاضری کا حکم ہے، بالآخر ایک دن اس کا آمنا سامنا اور اُس کی طرف واپسی ہو کر رہے گی۔ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّهَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلَاقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

---

[1] یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اپنی خبر نہ لینے کی صورت میں بھی حسبِ تعلق دوسروں کی خبر نہ لینے سے مسلمان آزاد یا بے تعلق نہیں ہو جاتے دوسروں کی اصلاح مقدور بھر بجائے خود مستقل فرض ہے، بالکل ویسے ہی، جیسے کوئی بیمار اگر اپنی بیماری کی خبر نہیں لیتا۔ تو محض اس عذر سے اپنے اہل وعیال کے دوا علاج سے معذور نہیں سمجھا جائے گا۔

—×—

"پر" یا "میں"

لفظی تحقیق!

اگر کسی شہر میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی ہو، تو تمام اطباء اس مرض کے ازالہ کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کریں گے، اور ہر نسخہ میں اس وبا کی روک تھام کی رعایت کا ضرور لحاظ رکھیں گے۔

اردو ادب میں آجکل "زبان" محاورہ اور روزمرہ سے غفلت اور بے پروائی کی رو چل پڑی ہے اور یہ مرض اب وبا کی شکل ..... اختیار کرتا جا رہا ہے، اس لئے "فاران" میں جن کتابوں پر تبصرہ ہوتا ہے اُن میں زبان و روزمرہ کے تسامحات پر خاص طور سے گرفت کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے کہ "فاران" کے اس نقد و احتساب کو عوام و خواص میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے مفید نتائج اور اچھے اثرات ظہور میں آ رہے ہیں!

جن اہلِ قلم، ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر "فاران" میں تبصرہ کیا جاتا ہے، اُن میں بعض ایسے نازک مزاج بھی ہیں، جو ہم سے خفا ہو جاتے ہیں، اور اُن کی یہ خفگی طرح طرح کے رُوپ دھار لیتی ہے! یہ خفگی ہمیں برداشت کرنی پڑتی ہے، کوئی محتسب اور ناقد اس قسم کی ناگواریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا! لیکن ہمیں ایسے انصاف پسند اور حق دوست ادیبوں اور شاعروں سے بھی واسطہ پڑا ہے، جنہوں نے "فاران" کی تنقید کو نہ صرف یہ کہ برداشت کیا ہے بلکہ ہمیں شکریہ کے خطوط لکھے ہیں!

یہ اپنے اپنے ظرف و طبیعت کی بات ہے

زبان و روزمرہ کی ان نزاکتوں پر نظر رکھنے کے باوجود خود ہم سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں، جو کوئی ہمارے تسامحات پر گرفت کرتا ہے، اُس کے ہم شکر گزار ہوتے ہیں۔

جناب اوصاف علی صاحب (ہمدرد بلڈنگ۔ دہلی ۶) نے فاران کی تنقید کے سلسلہ میں ایک خط ہمیں بھیجا ہے، جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"..... السلام علیکم، میں آپ کا رسالہ "فاران" بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، خصوصاً آپ کے تبصرے بعنوان "ہماری نظر میں"! بلاشبہ آپ کی تنقید وزن دار ہوتی ہے، لیکن کبھی کبھی آپ سے بھی لغزشیں ہو جاتی ہیں، مثال کے طور پر اپریل کے "فاران" میں جسے پڑھنے کا موقع ابھی حال ہی میں مجھے ملا، راسخؔ کا یہ شعر آپ نے لیا ہے

آج شاید چل بسا ہے راسخِ خستہ و خراب

سر میں ڈالے آ رہے ہیں رند میخانے کی خاک

اس پر اعتراض ان الفاظ میں کیا:۔

"سر میں تیل ڈالا جاتا ہے اور خاک کے لئے "سر پر ڈالنا" بولتے ہیں" آپ کا اعتراض درست ...

راسخ عرفانی (گوجرانوالہ)

نہیں، ثبوت میں مومنؔ کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

سرمگیں چشم کی گردش جو نہ بھا جاتی تو
خاک یوں کاہے کو ہم ڈالتے سر میں پھرتے

اُمید ہے آپ آئندہ تبصرہ کرتے وقت ذرا اور احتیاط سے کام لیں گے' اس وقت میری نظر میں فاران کے علاوہ کوئی ایسا رسالہ نہیں ہے، جس میں غیر جانب دارانہ دقتِ نظر سے تبصرے کئے جاتے ہوں۔

مومنؔ کے اس شعر نے ہمیں چونکا دیا، ہم نے اس محاورہ کی مزید تحقیق شروع کر دی' کراچی میں بہت سے اربابِ نظر اور اہلِ زبان سے پوچھا، اور دوسرے شہروں کے اہل الرائے ادیبوں اور شاعروں کو خط لکھے!

افسوس ہے کہ مشاہیر کے خطوط ہم نے حفاظت سے نہیں رکھے، وہ سب کے سب تلف ہو گئے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان خطوط میں ہمارے بارے میں بہت کچھ کہا گیا تھا، اس لئے ان "مدحت ناموں" کی حفاظت ہم سے نہ ہو سکی!

مگر ــــ ہمارے استفسار کے سلسلہ میں جو خطوط آئے ہیں' وہ پورے کے پورے درج کئے جاتے ہیں' اس طرح بعض مشاہیر کے خطوط محفوظ بھی ہو جائیں گے' اور اس لفظی تحقیق کے مختلف گوشے بھی سامنے آجائیں گے!

ہم نے ان حضرات سے یہ دریافت کیا تھا کہ "سر پر خاک ڈالنا" اور "سر میں خاک ڈالنا" ان میں زبان و روزمرہ کے اعتبار سے کون سا محاورہ درست اور فصیح تر ہے ــ جوابات آئے کہ :ــ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی :ــ آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ میں ہمیشہ "سر پر خاک ڈالنا" ہی سنتا رہا ہوں، "سر میں خاک ڈالنا" میں نے کسی فصیح اللسان آدمی سے نہیں سُنا ــ

حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی (بی۔ اے) منیجر "صدقِ جدید" کو لکھا گیا تھا، کہ نواب جعفر علی خاں اثرؔ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائیں اس بارے میں حاصل کر کے بھیجی جائیں، موصوف نے جواب میں تحریر فرمایا :ــ

مولانا عبدالماجد دریابادی اور نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی "اثر صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب دونوں نے متفقہ طور پر فرمایا ہے کہ "خاک سر پر ڈالنا ہی صحیح ہے" "خاک سر میں ڈالنا" ہم نے نہیں سُنا، مولانا عبدالماجد نے فرمایا کہ ایک دوسرا محاورہ "منہ میں خاک" تو استعمال ہوتا ہے، لیکن سر میں خاک ڈالنا نہ سننے میں آیا، اور نہ کسی لُغت اُردو میں نظر سے گزرا۔

علامہ زارؔ زتشی دہلوی جانشین داغؔ "سر پر خاک ڈالنا" ہی صحیح اور فصیح ہے، "میں" کا دھوکا خاکم بدہن کے لفظی ترجمے (جو غلط ہے) "منہ میں خاک" سے ہو سکتا ہے جس کا اس محاورے سے کوئی تعلق نہیں!

فصیح العصر یادگار و جانشین داغؔ حضرت نوحؔ ناروی ایک مدت کے بعد آپ کو میری یاد آئی، خیر یہ بھی غنیمت ہے، میں نے کسی زمانے میں آپ کو لکھا تھا کہ "فاران" کو دُنیا دیکھتی ہے، لیکن میں محروم ہوں، جواب میں آپ نے لکھا تھا کہ فاران اب ماہوار آپ کے پاس پہنچتا رہے گا لیکن اب تک نہ آیا۔

"سر پر خاک ڈالنا" درست' "سر میں خاک ڈالنا" غلط، اس صورت میں کیا آپ سر کے اندر خاک ڈالیں گے، ظرف کی صورت میں مجھے اپنی تحقیقات پر بھروسا تھا مگر آپکے خیال سے فرہنگ آصفیہ بھی دیکھا تیسری جلد صفحہ

یہ ایک شعر معروف دہلوی اور ایک شعر میر کا ملا، وہ درج کرتا ہوں :ـ

یاد کر صبحِ چمن میں نفسِ سرد مرے — سر پہ خاک اپنے اُڑاتی ہے صبا میرے بعد

یہ شعر معروف کا ہے۔

کوئی سر پہ ڈالے ہے اس غم سے خاک — کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک

یہ شعر میر کا ہے۔

میں اپنا حالِ زار کیا لکھوں، ۸۰ برس کا ہوگیا، کمر سے اُٹھا بیٹھا نہیں جاتا، دورانِ سر کی شکایت ہر وقت ہے، دونوں پاؤں میں ایک قسم کی ایسی لغزش ہے کہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے، اب گرا، اب گرا۔ ناطق صاحب نے "سبع سیارہ"؎ میں جو مضمون آپ کے متعلق لکھا ہے، وہ آپ نے دیکھا ہوگا، میری عادت تو یہ ہے کہ مشاعروں میں اگر کوئی شعر پسند آتا ہے، تو بے تامل داد دیتا ہوں اور نہیں پسند آتا تو خاموش رہتا ہوں، کسی غلط شعر پر اعتراض کرکے چھپوانا بھی بُرا جانتا ہوں۔

لکھنے پڑھنے سے مجبوری ہے، یہ خط دوسرے سے لکھوا رہا ہوں، اُمید ہے کہ آپ کبھی کبھی مجھے اپنی خیریت لکھتے رہیں گے۔ آپ کے ہندوستان سے جانے کے بعد میں نے ایک بڑے شاعر کی کمی محسوس کی، بمبئی کی ملاقات آخری ملاقات تھی، اب کیا اُمید ہے کہ آپ مجھ سے اور میں آپ سے مل سکوں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی محاورے کے اعتبار سے اور اظہارِ رنج و غم و الم کے مفہوم میں "سر پر خاک ڈالنا" "سر پہ خاک اُڑانا" اور "سر میں خاک ڈالنا" تینوں صحیح مانے جاتے ہیں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں خاک بر سر یا خاک بہ سر کہ فارسی کا اُردو ترجمہ ہے مثلاً :ـ

خاک بر سر کن غمِ ایام را

اردو اساتذہ نے متذکرہ صدر تینوں مفہوم میں اس کو استعمال کیا ہے۔ لیکن زبان، روزمرہ اور محاورہ کے معاملے میں اپنے آپ کو میں نے نہ پہلے کبھی قابلِ اعتبار پایا، نہ اب پاتا ہوں، اس لئے اس پر اصرار نہیں کرتا کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، اس پر آپ صاد کریں۔ اس طرح کے مسائل میں آپ کو سب سے نہیں، تو خود اپنے سے یقیناً زیادہ مستند سمجھتا ہوں۔

خود مجھے "سر پر خاک ڈالنا" بہتر معلوم ہوتا ہے، شاید اس سبب سے کہ رہ رہ کر غالب کا مشہور شعر یاد آنے لگتا ہے :ـ

سر پہ ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالئے — وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

یوں مفتیانِ شعر و ادب کا جو حکم ہو، وہ سر پر ہی نہیں آنکھوں پر بھی، اُمید ہے محاورے کے ساتھ میری یہ بے تکلفی، آپکی برہمی کا باعث نہ ہوگی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ
پرنسپل و یونیورسٹی پروفیسر (اردو) لاہور

میں نے تو "سر پر خاک ڈالنا" ہی پڑھا اور سنا ہے، اور غالب کا یہ شعر بھی اسکی تائید میں ہے

سر پہ ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالئے — وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

سر میں خاک ڈالنا ممکن ہے کسی دوسرے معنی میں ہو، مگر مجھے نہیں معلوم۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری "سر پر خاک ڈالنا" میر تقی میر کے یہاں استعمال ہوا ہے :ـ

کوئی سر پہ ڈالے ہے اس غم میں خاک — کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک

؎ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری، مگر سُنا ہے کہ جناب ناطق گلاؤٹھوی نے مجھے خوب صلاحیاں سُنائی ہیں! (ماہر)

اور "سر میں خاک ڈالنا" میرامن کی "باغ و بہار" میں ہے۔

"خواصیں اور ترکنیاں اور اردا بیگنیاں اور محلی خرچے "سر میں خاک ڈالتے ہوئے" باہر نکل آئے"

(باغ و بہار — صفحہ ۲۴۰)

اس لئے زبان و روزمرہ کے اعتبار سے دونوں صحیح ہیں، لیکن میں ذاتی طور سے "سر پہ خاک ڈالنا" کو زیادہ صحیح اور فصیح سمجھتا ہوں، سر پہ خاک ڈالی جاتی ہے اور سر میں تیل!

مولانا شاہ معین الدین ندوی مدیر "معارف" اعظم گڑھ آپ کا خط ملا۔ اس بارے میں آپ کو کسی دوسرے کی جانب رجوع کرنے کی ضرورت کیا تھی، آپ تو ماشاء اللہ خود ہی اردو زبان کے مزاج شناس اور اس کا نہایت بلند مذاق رکھتے ہیں، خود آپ کا ذوق قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے، محض تعمیل ارشاد میں گزارش ہے کہ محاورہ "سر پہ خاک ڈالنا" ہے "سر میں خاک ڈالنا" نہیں اور یہی فصیح بھی ہے، ممکن ہے سر میں خاک ڈالنا لغت کے لحاظ سے غلط نہ ہو، لیکن محاورہ اور روزمرہ کے خلاف ہے، شعرائے بھی "سر پہ خاک ڈالنا" باندھا ہے، میر صاحب فرماتے ہیں

کوئی سر پہ ڈالے ہے اس غم میں خاک   کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک

رند کا شعر ہے ؎

پایا نہ جب کہ اس گل رعنا کو باغ میں   گلشن میں سر پہ خاک اُڑانے لگی صبا

گو اس شعر میں خاک ڈالنے کی بجائے، خاک اُڑانا ہے، لیکن سر پہ ہے، سر میں نہیں ہے! فارسی کا محاورہ بھی خاک برسر کردن ہے، اردو محاورہ غالباً ترجمہ ہے، حافظ شیرازی فرماتے ہیں:-

ساقیا! بر خیز در دہ جام را   خاک بر سر کن غم ایام را

ملا واحدی دہلوی میرے کانوں نے "سر پہ خاک ڈالنا" سنا ہے "سر میں خاک ڈالنا" نہیں!

امتیاز علی خاں عرشی رامپوری "سر پہ خاک ڈالنا" اور "سر میں خاک ڈالنا" دونوں کو فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات میں رونا، پیٹنا، ماتم کرنا، ماتم زدہ بننا، ماتم کی صورت بنانا وغیرہ کا ہم معنی بتایا ہے مگر شہادت میں شعر صرف "سر پہ خاک ڈالنا" سے پیش کئے ہیں، مثلاً ؎

یاد کر صبح چمن میں نفس سرد مرے

سر پہ خاک اپنے اڑاتی ہے صبا میرے بعد   (معروف)

میں نے یہاں رامپور میں کسی کو "سر میں خاک ڈالنا" "سر پہ خاک ڈالنا" کے معنی میں بولتے نہیں سُنا۔

خواجہ محمد شفیع دہلوی احقر کی رائے میں "سر پہ خاک ڈالنا" زیادہ فصیح اور روزمرہ کے مطابق ہے۔

شاہد احمد دہلوی مدیر "ساقی" "سر پہ خاک ڈالنا" بھی بولتے ہیں اور "سر میں خاک ڈالنا" بھی، ثانی الذکر زیادہ بولا جاتا ہے شاید اسی وجہ سے "خاک بہ سر کن" کے معنیٰ "چولہے میں ڈالو" غارت کرو، پرے پھینکو، دفع کرو وغیرہ کے ہیں۔ "سر میں خاک ڈالنا" میں جوگ لینا، فقیری اختیار کرنا، سر بصحرا نکل جانا وغیرہ کا مفہوم میرے پاس کوئی لغت نہیں، آپ تحقیق کر لیں ——— "بھرا بتولا"[1] آج پچاس برس پہلے دلی میں بولا جاتا تھا۔ حیدرآباد دکن میں "بھر بتولا" اب تک بولا جاتا ہے، دلی کے بڑے بوڑھوں کا یہ بیان ہے اور ایک حیدرآبادی کا!

---

[1] "فاران" میں ڈپٹی نذیر احمد کے مشہور ناول "ابن الوقت" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ "بھرا بھتولا" دلی کی زبان نہیں ہے

میکش اکبرآبادی "سر پر خاک ڈالنا" اور "سر میں خاک ڈالنا" میں ہم معنی ہونے کے ساتھ کچھ فرق بھی ہے، لیکن جہاں تک آپکے سوال کا تعلق ہے، اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ "سر پر خاک ڈالنا" صحیح تر ہے کیوں کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہ فارسی سے آیا ہے، اور فارسی میں "خاک بر سر" کہتے ہیں ؎

کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ اُو

ظریف دہلوی آپ کا کارڈ (بغیر تاریخ) آج ابھی ابھی ملا، جواب فوراً حاضر کر رہا ہوں، بھئی ماہر! تم مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہو، میں ہمت کر کے سورج کو چراغ دکھاتا ہوں، محض اس خیال سے کہ "گاہ باشد کہ کودکِ ناداں"

خیر اپنی عقل و قابلیت کے مطابق جواب لکھ رہا ہوں، سر میں تیل ڈالا جاتا ہے اور وہ رگڑنے سے اندر پہونچ جاتا ہے مگر جو چیزیں سر کے اندر نہیں پہونچ سکتیں وہ سر کے اندر ڈالی جاتی ہیں، جیسے پانی، اسی طرح پگڑی، ٹوپی، تاج وغیرہ آپنے پڑھا ہوگا ؎ خاک بر سر کن غم ایام را

خاک اوپر ہی رہتی ہے اندر نہیں پہونچتی، ہاں سر میں درد ہوتا ہے، سودا ہوتا ہے، یہ چیزیں اندر ہوتی ہیں۔

کئی باتیں ایسی ہیں، جو اس استدلال پر پوری نہیں اُترتیں، جیسے بھئی! اُس کے سر میں جوئیں پڑ گئیں، سر میں پھنسیاں ہو گئیں اب یہاں سر کے اوپر والا، استدلال بے کار ہو جاتا ہے، بھئی! یہ تو اُردو زبان ہے، بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو غور طلب ہیں، نیز انیس کے مراثی میں سر پر خاک ڈالنا، کئی جگہ ہے مگر کوئی شعر یاد نہیں رہا، میری رائے میں "خاک سر پر ڈالنا" صحیح ہے ہر حال میں ہیچمداں ہوں، آپ کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے اطمینان کر لیں!

نسیم مینائی (نبیرہ حضرت امیر مینائی) "سر پر خاک ڈالنا" صحیح ہے، میں نے "سر میں خاک ڈالنا" نہ سُنا نہ پڑھا۔ میری دانست میں یہ اس مفہوم میں صحیح نہیں ہے، جس کے لئے "سر پر خاک ڈالنا" بولتے ہیں۔

تابش دہلوی سر میں صرف تیل وغیرہ ڈالتے ہیں، لیکن خاک "سر پر" ڈالنا بولتے ہیں مثلاً:۔

سر پہ ہجوم دردِ غریبی سے ڈالئے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی "سر پہ خاک ڈالنا" اور "سر میں خاک ڈالنا" دونوں درست ہیں۔

کوئی سر پہ ڈالے ہے اس غم میں خاک ؎ کسو نے کیا ہے گریباں کو چاک (میر)

خاک ڈالی ہے جو سر میں تو اُسی کوچے کی ؎ یوں بھی دیوانہ ہوں ہر کام میں اپنے ہشیار (مومن)

اگرچہ میں پہلی صورت کو زیادہ صحیح سمجھتا ہوں اور وہی میری زبان پر ہے، تاہم دوسری بھی غلط نہیں۔

جناب محمد عمر سلفی (ٹونک) سر پہ خاک ڈالنا، اور سر میں خاک ڈالنا، اہلِ لغت نے دونوں صحیح مانے ہیں۔

(۱) نسیم اللغات میں "سر پر خاک ڈالنا یا اُڑانا" کے معنی غم کو ظاہر کرنا، سوگ منانا لکھا ہے ص۵۵۶

اسی طرح "سر میں خاک ڈالنا" کے معنی سوگ کی صورت بنانا، سر ننگا کرنا لکھا ہے ص۵۵۵

(۲) "مخزن المحاورات" از چرنجی لال دریا گنج دہلی، مطبوعہ ۱۸۸۶ء میں اس طرح لکھا ہے:۔

(الف) سر پہ خاک ڈالنا یا اُڑانا ـــ نوحہ گری کرنا، رونا پیٹنا، ماتم کرنا ص۲۲۴ ـ

(ب) سر میں خاک ڈالنا ـ ماتم کرنا، رونا، خاک اُڑانا ص۲۹ھ

(س) سعید یہ ڈکشنری نے صرف "سر پر خاک ڈالنا یا "اُڑانا" ہی لکھا ہے' اور معنیٰ یہی دیتے ہیں جو دوسروں نے دیئے ہیں ۔ سر میں خاک ڈالنا، نہیں لکھا۔

اس تحقیق سے قطع نظر۔ جب ہم دونوں جملوں پر غور کرتے ہیں' تو سر میں خاک ڈالنا " ویسے ہی وجدان پر گراں گزرتا ہے' اور اس کے مقابلہ میں سر پہ خاک ڈالنا، یا اُڑانا ہر طرح فصیح اور بھلا معلوم ہوتا ہے، بچپن میں گانے والوں سے ایک شعر سُنا تھا، پتہ نہیں معلوم کس کا ہے مگر شعر مشہور بہت ہے، شاید "لیلیٰ مجنوں" کے ڈرامے سے متعلق ہو:۔

اڑاتا خاک سر پہ جھومتا مستانہ آتا ہے　　　نہیں معلوم کس دُھن میں ترا دیوانہ آتا ہے

اسی طرح ایک شعر کیفؔ صاحب مرحوم کا بھی یاد ہے' فرماتے ہیں: ؎

غشی کے بعد ہوش آتے ہی سر پہ خاک اُڑاتا ہوں

سمجھ بھی تو بنانے کے لئے دیوانہ آتی ہے

دراصل اُردو میں یہ محاورہ فارسی زبان سے آیا ہے، اس کی اصل فارسی میں ہے، اور فارسی میں یہ محاورہ کس طرح استعمال ہوا ہے مثلاً:- خاک بر سر افگندن، خاک بر سر ریختن، خاک بر سر افشاندن، خاک بر سر زدن، خاک بر سر نہادن اور خاک بر سر کشیدن، اتنے مصادر کے ساتھ استعمال ہوتے رہنے کے باوجود" خاک در سر" کی ترکیب نظر نہیں آئی!

(اس کے بعد فارسی شعرا کے متعدد اشعار ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں، جن میں "خاک بر سر" ہی استعمال ہوا ہے)۔

اس تمام تحقیق اور معلومات سے میرے نزدیک یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ یہ محاورہ فارسی الاصل ہے اور سر پہ خاک ڈالنا یا اُڑانا ہی صحیح و فصیح ہے، بمقابلہ "سر میں خاک ڈالنا" کے!

فاران:- اگر تنہا مومن خاں مومنؔ ہی کا شعر "سر میں خاک ڈالنا" کی سند میں پیش کیا جاتا، تو کہا جا سکتا تھا ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو، یا مومنؔ سے سہو ہو گیا ہو، مگر جناب ڈاکٹر شوکت سبزواری نے میرامن کی تحریر کا اقتباس دے کر مومنؔ کے شعر کی سند کو قوی اور مستند تر بنا دیا۔

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ "سر میں خاک ڈالنا" کی سند اُردو زبان میں شاذ ہی سہی مگر ملتی تو ہے، اب سے سوا سو ڈیڑھ سو برس پہلے اس طرح بولتے اور لکھتے تھے، میں اس سے بے خبر تھا، اور اپنی اس بے خبری کا اعتراف کرتا ہوں۔

مگر

اب "سر پہ خاک ڈالنا" بولتے اور لکھتے ہیں' اور یہی محاورہ (خاک سر میں ڈالنا کے مقابلہ میں) مشہور، مانوس، زیادہ صحیح اور فصیح تر ہے (ماہرؔ القادری)

بہارِ تغزل

شفقت کاظمی

کوئی اُمید بر نہ آئیگی
عمر خوابوں میں بیت جائیگی

اپنا ویرانہ یاد آئیگا
جب چمن میں بہار آئیگی

دن کی صورت نہ دیکھ پائینگے
رات آئیگی رات جائیگی

دل سے یوں جا رہی ہے یادِ ان کی
جیسے پھر لوٹ کر نہ آئیگی

سادگی ہم وفا شعار کی
اُن سے اک بار فریب کھائیگی

ذکر اُن کا نہ آئیگا جب تک
داستاں رنگ پہ نہ آئیگی

کاظمی غم کی رات کٹنے تک
دل پہ کیا کیا نہ بیت جائیگی

عروج زیدی

اللہ رے انقلاب کہ انسان بدل گیا
بدلا بشر تو عالمِ امکاں بدل گیا

موجیں دبی دبی سی ہیں وہ شورش ہے نہ جوش
مجھکو ڈبو کے خود رُخِ طوفاں بدل گیا

جھکنے لگا بشر کا دریا سوا پہ سر
ایماں کے ساتھ قبلۂ ایماں بدل گیا

چشمِ عتاب میں بھی توجہ کی شان ہے
افسانہ برقرار ہے عنواں بدل گیا

آزاد کب ہوں قیدِ عناصر سے چھوٹ کر
اتنا ہوا ضرور کہ زنداں بدل گیا

بعدِ شباب سرد ہیں جذبات اے عروج
بدلی ہوا تو رنگِ گلستاں بدل گیا

حشمت جلالی

آغازِ سفر یاد نہ انجامِ سفر یاد
کیا خاک زمانے کو کریں خاک بسر یاد

ہر نقشِ قدم یاد نہ ہر اک راہ گزر یاد
انساں کو نہیں منزلِ مقصد ہی مگر یاد

یوں منہمک جشنِ بہاراں ہے زمانہ
جیسے کہ نہیں حادثۂ برق و شرر یاد

ہر قصۂ غم پر یہ گماں ہے کہ جہاں کو
میرا ہی فسانہ ہے بہ الفاظِ دگر یاد

اللہ رے مجبوریٔ احساسِ محبت
ہرچند بھلاتا ہوں وہ آتے ہیں مگر یاد

عشرت میں سمجھتا ہوں کہ ہر اہلِ سخن کو
آئیگا بہر دورِ غزل، دورِ جگر یاد!!!

عطا جیوری (مقیم حال جے پور)

یہ فروغِ عیش و طرب ترا مرے درد و غم کے اثر سے ہے
تری بزمِ ناز میں روشنی مرے داغہائے جگر سے ہے

یہ غمِ زمانہ ہے کیا بلا؟ کہ وہ مطمئن نہ مجھے سکوں
وہ پیامِ شوق کا سلسلہ نہ اِدھر سے ہے نہ اُدھر سے ہے

نہ رہے وہ ملتفت اب اِدھر، مگر اپنے دل کو میں کیا کروں
جو اُمید اُن کی نظر سے تھی وہی اب بھی اُن کی نظر سے ہے

یہ انقلابِ جہاں کوئی نہ مٹا سکا، نہ مٹا سکے
مجھے ایک نسبتِ خاص جو ترے در سے تھی ترے در سے ہے

دار کے نزدیک آپہونچے ہیں دیوانے بہت
ہو گئے رُسوا قدِ جاناں کے افسانے بہت

کیا کریں ایسی محبت کا نہ ہو جس میں وفا
تم اگر اپنے نہیں بنتے تو بیگانے بہت

درحقیقت جو کبھی افسانہ بن سکتے نہیں!
زندگی میں ایسے بھی ہوتے ہیں افسانے بہت

دلِ تمنا آشنا اور ہر تمنا وجہِ غم!
زندگی ہے تو ابھی باقی ہیں افسانے بہت
میکدے والوں کو اندازہ نہیں اس بات کا
تشنہ کامی پر مری چھلکے ہیں پیمانے بہت

رشید اثر

لذتِ راحت و آلام سے آگے نہ بڑھے
ہم رہِ شوق میں دو گام سے آگے نہ بڑھے
تو اگر جلوہ فگن ہو تو اس انداز کے ساتھ
روشنی میرے در و بام سے آگے نہ بڑھے
ہر نئی راہ بتاتی رہی منزل کے نشاں
پھر بھی ہم گردشِ ایام سے آگے نہ بڑھے
زلف و رخ سے کئی مفہوم عبارت تھے مگر
ہم طلسمِ سحر و شام سے آگے نہ بڑھے

صبح کے رخ پہ یہ مستی، یہ تبسم، یہ فسوں
رات شاید تری محفل میں گذار آئی ہے
اپنے ہونٹوں میں چھپالوں ترے رخسار کا رنگ
یہ شرارت مرے دل میں کئی بار آئی ہے
یہی کشتی کہ حوادث ہیں مقدر جس کا
ایک عالم کو کنارے پہ اتار آئی ہے
میرے ساقی تو کہاں ہے کہ مری تشنہ لبی
میکدہ میں تجھے ہر سمت پکار آئی ہے

غم سے ہراساں اک عالم	لیکن ہم آسودۂ غم
کوئی تو سمجھے دردِ مرا	کوئی تو ہو مائل بہ کرم
پھول ہیں اب تک پژمردہ	رات کہاں سوئی شبنم
میرے شانوں کا ارمان	تیری زلف کا پیچ و خم
توڑ نہ دینا عہدِ وفا	بھول نہ جانا اپنی قسم
صبح ابھی تک نیند میں ہے	کب سے جاگ رہے ہیں ہم

مے خانے مت جاؤ اثر
بڑھ جائے گا اور بھی غم

زکی زاکانی

جس ذرّے پہ ہو جائے عیاں اپنی حقیقت
اُس ذرّے کی وسعت میں سما سکتے ہیں آکاش
مشکل ہے بہت دل کے لئے ضبطِ معانی
ہونے کو تو ہو جاتے ہیں اسرارِ جہاں فاش
ٹھکرا کے چلے آئے ہیں کونین کی دولت
ہم اہلِ زمانہ کو نظر آتے ہیں قلاش

سید آلِ احمد

وہ آرہے ہیں، وہ آئیں گے، اُن کو آنا ہے
کوئی فریب تو کھاؤ کہ رات کٹ جائے
اے دوست! نہ تو شیوۂ بیداد سے باز آ
باقی رہیں فریاد تو ہم کرتے رہیں گے

قوسی ٹونکی

آگے بڑھے تو حدِ نظر اور بڑھ گئی	وارفتگیٔ شوقِ سفر اور بڑھ گئی
مانا کہ بزمِ حسن میں ہم باریاب ہیں	دیوانگیٔ عشق مگر اور بڑھ گئی
اللہ رے! معاملۂ حسن و ذوقِ دید	دیکھا تو تشنگیٔ نظر اور بڑھ گئی

یہ رنگ، یہ نکہت، یہ بہاریں، یہ تبسم
کیا لطف ہو ایسے میں چلے آؤ اگر تم
ہم کھو گئے اُس سمت، اُدھر ہو گئے وہ گم
آتا ہے قوسی یاد ابھی تک وہ تصادم

اعجاز خورشید کاشمیری

جن کو اندازۂ طوفاں ہے نہ ساحل کی خبر
ایسے کچھ ہاتھ بھی پتوار تک آپہونچے ہیں

مسعود تابش دہلوی

کیجئے فرقِ گل و گلزار کیا	سرخوشی میں اندک و بسیار کیا
لیجئے دنیا کی شکایت بھی نہیں	ہو گئے ہیں ہم بھی دنیا دار کیا

ماہر القادری

جب چھڑ گئی ہے کاکلِ شب رنگ کی غزل
ایسے میں اک قصیدۂ رخسار بھی سہی!

ماہر القادری

یادِ رفتگاں!

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نور اللہ مرقدہٗ

لب سے بتیس اکتیس سال پہلے کا واقعہ ہے جب حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے، اور ہاں کے مشہور دیندار وکیل مولوی فیض الدین[1] مرحوم کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ اُنہی کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن حیدرآباد پہلی مرتبہ ئے، اس وقت انہیں عوام بہت ہی کم جانتے تھے۔ یہ اُن کی شہرت کے آغاز کا زمانہ تھا، پھر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی ظیم شخصیت کے ہوتے ہوئے، مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف عوام اور خواص کے متوجہ اور رجوع ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا!

میں نے انہیں حیدرآباد میں دو بار دیکھا، مولوی فیض الدین کے یہاں اور عابد شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے کھدر کا رتہ، کھدر کا پاجامہ اور اسی کی ٹوپی گھنی ڈاڑھی اُن کی صورت، چال ڈھال اور وضع قطع کو دیکھ کر اُن کی طرف دل کھنچتا تھا!

تقریباً چودہ سال کے بعد جب میں حیدرآباد چھوڑ کر اور بمبئی میں فلم کے چکر سے نکل کر دلی　آگیا، تو مولانا حفظ الرحمٰن رحوم سے حصولِ نیاز کے بارہا موقعے ملے! وہ جب بھی ملتے بڑی خندہ پیشانی اور تپاک کے ساتھ ملتے! دلی کی جامع مسجد کے امنے بالاخانہ پر ادارہ مشرقیہ تھا، وہاں ہر جمعہ کو ندوۃ المصنفین کے ارکان اور دوسرے اہلِ علم اور احباب جمع ہوتے، ائے کا دور چلتا، اور　دو چار شاعر آجاتے تو چھوٹی سی بزم شعر و سخن بھی منعقد ہوجاتی! اسی بزم احباب میں مولانا رحوم سے ملاقات ہوتی رہتی۔ شعر کا وہ خاص ذوق رکھتے تھے اور اچھے شعروں پر اُن کے داد دینے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ خن فہم ہی نہیں، شعر کے ناقد بھی ہیں، اور کیا عجب ہے کہ اپنی جوانی کے آغاز میں انھوں نے شعر بھی کہے ہوں!

مولانا مرحوم سے میری مفصل اور طویل ملاقات آگرہ میں ہوئی، یہ (غالباً) ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے، میں اپنے ایک عزیز کے یہاں ریاست رام پور میں مقیم تھا۔ اُن دنوں وہاں بڑی دھوم دھام کی نمائش ہو رہی تھی، آل انڈیا مشاعرہ بھی تھا جناب اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" کا دعوت نامہ ملا کہ سال کے سال قصر الادب کی جانب سے سیرت النبیؐ کا جلسہ اور نعتیہ شاعرہ ہوا کرتا ہے، تمہیں اس میں ضرور شریک ہونا پڑے گا ــــ میں نے جواب دیا کہ مشاعرے میں شریک نہ ہوسکوں گا، ہاں! سیرت کے جلسے میں شرکت کی سعادت ضرور حاصل کروں گا، اور جو نعتیہ کلام میں مشاعرے میں سناتا، وہ جلسے میں

[1] مولوی فیض الدین مرحوم عدالتِ مال کے کامیاب ترین وکیل تھے، اپنی استطاعت کی حد تک پورا اطمینان کرلیتے کہ مقدمہ بنایا ہوا نہیں ہے جب اُسے ہاتھ میں لیتے، معاملہ کے کھرے اور بات کے سچے، لاگ لپیٹ کی باتیں اُنہیں آتی ہی نہ تھیں، سچ تو یہ ہے کہ وکالت کے پیشے کی اُن کے دم سے عزت و آبرو تھی! چالیس سال سے کیا کم عمر ہوگی جب اُنھوں نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا، اور　درسِ نظامی کی سبقاً سبقاً تکمیل کی! مسلمانوں کے خیر خواہ، ملت کے دردمند، شریعت کے پابند، مہمان نواز، سیر چشم! لوگوں کی نظروں سے چھپا کر ضرورت مندوں کی امداد کرنے والے! اُن کی کوٹھی عربوں کی مہمان داری کے لئے مشہور تھی، حجاز، حضرموت، بحرین، اور شحر و مکلا سے کوئی عرب بلدہ حیدرآباد میں نیا نیا آتا اور سرائے یا ہوٹل کا پتہ پوچھتا، تو تانگے اور جھٹکے والے اُسے فیض الدین مرحوم کے یہاں پہونچا آتے، اور وہ مہینوں اُن کے یہاں مہمان رہتا ــــ دین اور دُنیا دونوں اچھی اور کامیاب! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے!

نادوں گا، بات پکی ہوگئی۔ میں رام پور سے آگرہ پہونچا اور مجھے ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھیرایا گیا، اُس میں مولانا حفظ الرحمٰن
حوم پہلے سے قیام فرما تھے، علیک سلیک کے بعد مصافحہ اور معانقہ ہوا!

یہ وہ دور تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلافات کی خلیج اتنی گہری تھی کہ اس کی تھاہ نہ ملتی تھی، مولانا
ں جمعیۃ علماء کی رُوحِ رواں تھے، جو کانگریس کی ردیف بلکہ اُس کا دستِ بازو تھی، جمعیۃ علما اُس کا ساتھ چھوڑ
یتی تو "آل انڈیا کانگریس" ــ "آل ہندو کانگریس" بن کر رہ جاتی ـــــ مولانا مرحوم سے اُس وقت کے سیاسی
سائل پر تبادلہ خیال ہوتا رہا، بعض اکابر دیوبند اور جمعیۃ العلماء سے جماعتِ اسلامی کے اختلافات اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
ابھی ذکر آیا، اُن کی عالی ظرفی تھی کہ میری بعض تند و تیز باتوں پر وہ چیں بہ جبیں تک نہیں ہوئے! شب کا کھانا ساتھ ہی کھایا،
ہرہم ساتھ ہی جلسہ گاہ میں پہونچے، شعیب محمدیہ ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں شامیانہ تنا ہوا تھا، حاضرین کی تعداد خاصی تھی!

اس جلسہ کا یہ واقعہ جب بھی یاد آجاتا ہے، تو ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے کہ قصر الادب (اکبرآباد) کے
یر اہتمام سیرۃ النبی کا یہ جلسہ شروع ہی ہونے والا تھا کہ ایک صاحب خوش پوش، خوش شکل، ہاتھ میں موٹی سی چھڑی لئے ہوئے
یٹیج پر پہونچے اور پہونچ کیا خود ہی لمبی لمبی ڈگیں بھرتے دَرّاتے ہوئے علماء کی صف میں جا دھمکے، اور فرمایا کہ میں تقریر
روں گا! اُن کا چہرہ خاصہ وجیہہ تھا۔ ڈاڑھی سے، لباس سے اور وضع قطع سے عالم نظر آتے تھے، اُن کا نام پوچھا گیا تو بڑے
وازمیں ارشاد ہوا:۔

"اورنگ زیب عالمگیر"

رآن کریم کی تلاوت کے بعد، وہ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، اور آغاز ہی بے ربط جملوں سے کیا، اہمال و بے ربطی کی
ہ "لے" بڑھتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ مجمع کے اضطراب اور ناپسندیدگی کو دیکھ کر، اُنہیں تقریر کرنے سے روک دیا گیا! بعض
یہ تکے شاعروں کو تو مشاعروں میں ذلیل ہوتے دیکھا ہے مگر کسی مقرر کی ایسی ذلّت دیکھنے میں نہیں آئی!

اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے سر رہا، ایسی دل آویز اور کیف انگیز تقریر کی کہ سننے والے جھوم جھوم گئے

اس واقعہ کے دو سال بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی اور ملک کے طول و عرض میں وہ خونیں ہنگامہ برپا ہوا جس کی مثال تاریخ میں
م ہی ملے گی! اس کو ہجرت کہئے، فرار سے تعبیر کیجئے، لاکھوں مسلمانوں کی طرح میں بھی پاکستان چلا آیا، یہ ۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے،
ب ۱۹۶۲ء ہے، اس پندرہ سال کی مدت میں، مشاعروں کے طفیل تین بار ہندوستان جانا ہوا، مگر کہاں؟ مدراس، بمبئی، احمد آباد
اپنے وطن کے دیکھنے کے لئے اب تک دل و نگاہ ترس رہے ہیں .... ضلع بلند شہر اور دلی کا سواد قریب قریب ملا ہوا
ہے، دلی سے ریل میں چلے، شاہدرہ پہونچے، پھر غازی آباد آیا، اس کے بعد بلند شہر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، اُدھر جانا ہوجاتا تو دلی ضرور جاتا اور
ولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے لازمی طور پر نیاز حاصل کرتا! یہ تمنا دل کے دل ہی میں رہ گئی! عالمِ برزخ میں روحوں کا ایک دوسرے
سے ملنا ملانا ہوتا ہوگا، تو یہ تمنا مرنے کے بعد ہی پوری ہو سکے گی!

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی، طالب علمی کے زمانہ ہی سے وہ اپنی ذہانت، تقریر اور علمی شغف
کی بدولت دینی حلقوں میں متعارف ہو گئے تھے! اور اُن کا شمار ممتاز ترین طلبا میں ہوتا تھا، درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد
نھوں نے درس و تدریس اور دینی علوم کے مطالعہ کے سلسلہ کو جاری رکھا! اُن کی شخصیت میں بڑی جامعیت پائی جاتی تھی، وہ دینی
رہنما تھے، سیاسی لیڈر تھے، شعلہ بیان مقرر تھے اور ساتھ ہی بلند پایہ مصنف بھی! ندوۃ المصنفین جیسے اونچے درجہ کے علمی

اسے کی بنا انہی نے ڈالی، اُن کی تحریر میں علمی سنجیدگی اور دینی فکر کے ساتھ ادبی دل کشی بھی پائی جاتی تھی، اُن کی تصانیف میں "قصص آن" کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی! تقریر و خطابت میں وہ آپ اپنا جواب تھے، شعلہ نوا بھی اور شبنم فشاں بھی! ریر، تحریر اور ذہانت میں مولانا ابوالکلام آزاد سے کم مگر دینی شغف اور ارکانِ شریعت کی پابندی میں اُن سے بڑھ کر! گریزی دورِ حکومت میں آزادی و بے باکی اور حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں! سیاسی مسلک میں ضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے قدم بہ قدم پیرو، مسلم لیگ کی مخالفت کی مگر شائستگی کے ساتھ! تقسیم ہند کی مخالفت انھوں نے کسی لالچ میں آکر نہیں کی، وہ نیک نیتی کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ ملک کے اس بٹوارے سے مسلمانانِ ہند کو نقصان پہنچے گا۔ پاکستان بن گیا، تو دینی اخوت کی بنا پر اُس کے استحکام و بقا کے متمنی اور خیر خواہ رہے!

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف اُٹھتی تھیں، اور لانا آزاد کی وفات کے بعد تو انہی کی تنہا ذات وہاں کے مسلمانوں کا مرجع سمجھی جاتی تھی، آخری زمانے میں انھوں نے بھارت کی پارلیمنٹ اپنی تقریروں سے ہلا ہلا دیا، کس قدر جرأت و بیباکی کے ساتھ حکومت پر تنقید کی! خاص طور سے اردو زبان کی حمایت میں کا جوشِ عمل اور سرگرمی مثال اور یادگار بن کر رہے گی ——— چند سال سے تو وہ ملک و ملت کی ملکیت و متاع اور سراپا خدمت بن کر رہ گئے تھے، دن رات کا زیادہ وقت دوسروں ہی کے کام آتا، اُنکی صحت لوگوں کی غمخواری ہی کی نذر ہو گئی!

انگریزی دورِ حکومت میں اصل مسئلہ ملک کی آزادی کا تھا، اس تحریکِ آزادی میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا، اسی لئے وہ حکومت کے معتوب و مقہور رہے، مگر ہندو راج میں جسے سیکولر گورنمنٹ کا نام دیدیا گیا ہے، سلمانوں کے جان و مال پر ہی نہیں تہذیب و تمدن، عصمت و آبرو، زبان و ادب اور دین و ایمان پر قیامت گزر گئی ——— مگر حالات میں ہندو راج کے قہر و عتاب کی سعادت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور اُن کے ہم مسلک علما اور رفقا کی بجائے دوسرے ، داعیانِ حق کے حصہ میں آئی!

علم و ادب ہو، شاعری ہو، سیاست ہو ان کی شہرت کے ساتھ خوشحالی بھی آتی ہے، مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی اللہ تعالیٰ نے شہرت اور زت کے ساتھ معاشی فراغت اور خوشحالی بھی عطا فرمائی۔ لازم زندگی کی کوئی بڑی سے بڑی تمنا اور اُن کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہتی ! بھارت کے سب سے بڑے نیتا پنڈت جواہر لال نہرو سے اُن کے انتہائی خوشگوار تعلقات تھے، ہندوستانی حکومت میں مولانا وم کی بڑی عزت تھی، اُن کی بلند پایہ شخصیت کے سامنے حکومت کے وزیر تک کچھ نہ کچھ دبتے ہوئے ہی نظر آتے تھے۔

آہ! وہ اس وقت دُنیا سے رُخصت ہوئے، جب ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن کی بہت زیادہ ضرورت تھی، اُن کی موت نے وڑوں دلوں کو سوگوار بنا دیا، اللہ تعالیٰ آخرت میں اُن کے درجات بلند فرمائے (آمین)

ہماری نظر میں!

فیوض الحرمین تصنیف :- حضرت شاہ ولی اللہ، ترجمہ :- مولانا عبدالرحمٰن صدیقی کاندھلوی، ضخامت ۳۲۸ صفحات (مجلد، خوب صورت رنگین گرد پوش، قیمت چار روپے پچاس پیسے،

ملنے کا پتہ :- قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

اللہ تعالیٰ کا دین کتاب و سنت سے عبارت ہے، اس کے بعد آثارِ صحابہ کا درجہ ہے، کہ ان نفوسِ قدسیہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت فرمائی تھی اور ان کے اقوال و اعمال کتاب و سنت کے معتبر شارح اور مستند مفسر ہیں! اب کوئی فقیہ یا محدث کا امام ہو، یا تصوف کا شیخ الشیوخ یا علم اخلاق کا معلم، غرض ہر شخص کے اقوال، ملفوظات اور حالات کو کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کی کسوٹی پر کس کر دیکھا جائے گا، اور جہاں کہیں بھی یہ نظر آئے گا کہ کسی کے قول و فعل اور احوال کی اس معیار و محک سے مطابقت نہیں ہو رہی ہے تو اس قول و فعل کو چاہے وہ کسی کا ہو بلا دریغ چھوڑ دیا جائے گا، اور اس کی تحسین نہیں کی جائے گی، یہی سبب ہے کہ منصور حلاج کا نعرہ "انا الحق" جو سخت فتنہ میں ڈالنے والا اور کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کے مزاج کے خلاف ہے، نہ تحسین کا مستحق ہے اور نہ تائید کا! کسی کو اس نعرے میں عرفان و روحانیت کی کوئی نازک رمزیت اور دقیق اشاریت نظر آئے، تو بھی شریعت کے آداب کا یہی تقاضا ہے کہ وہ خاموش رہے۔

یہ چیز کہ کسی کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا القا ہو رہا ہے۔ یا خواب میں کسی بزرگ کی روح نے کوئی ہدایت اور تلقین کی ہے، یا جاگتے میں کچھ آثار، علائم یا انوار نظر آئے ہیں ــــ تو اس قسم کے القا کا، خوابوں کا، مشاہدہ باطنی کا اور اس ذریعہ سے ملی ہوئی ہدایات و اشارات کا دین میں کوئی درجہ نہیں ہے! جن حضرات کو یہ احوال و کیفیات پیش آئی ہیں ان کو چاہیے تھا کہ اس قسم کی باتوں کو اپنی ذات ہی تک محدود رکھتے، ان کی اشاعت نہ کرتے کہ اس طرح دین و شریعت کے مستند و مکتوب اور مشہود مسائل کے مقابلہ میں ایک ایسا "علم" وجود میں آتا ہے جس کا دار و مدار بعض لوگوں کے ذاتی کشف اور مشاہدۂ باطن پر ہے یہی سبب ہے کہ صاحبانِ عرفان و تصوف کے ملفوظات میں سخت غلط بیانات پائے جاتے ہیں!

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دینی اور علمی خدمات آفتاب کی طرح روشن ہیں، دینی مسائل میں شاہ صاحب کی مجتہدانہ بصیرت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، وہ مفسر تھے، محدث تھے، فقیہ تھے، متکلم تھے، ادیب و شاعر تھے اور ساتھ ہی صاحبِ تدبیر و سیاست بھی تھے! ولی اللّٰہی فکر کے آگے کہیں کہیں تو افکارِ غزالی ٹھہرتے ہوئے نظر آتے ہیں، شاہ صاحب کے خانوادے کا ہندوستان کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے،

دینی علوم کے تبحر کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ صاحب ولی اللہ قدس سرہٗ کو تصوف کا بھی خاصہ ذوق تھا، یہی سبب ہے کہ جب شاہ صاحب تصوف کی زبان بولتے ہیں، تو وہ بڑی دقیق، پیچیدہ اور عسیر الفہم ہوتی ہے! حیرت ہے کہ جس شخص نے شرک و بدعت کے خلاف ہندوستان میں مورچہ قائم کیا ہو۔ اس کے یہاں ایسی تحریریں بھی پائی جائیں، جن سے اہلِ بدعت

کو اپنے مسلک کی تائید میں از کی سند، دلیل اور تاویل ہاتھ آجائے۔

صحابہ کرام اور تابعین عظام کے حالات میں یہ نہیں ملتا کہ وہ روضہ رسولؐ پر حاضر ہوکر عرض و معروض کرتے ہوں اور دینی مسائل پوچھتے ہوں، اور پھر قبر رسولؐ سے اُن کا جواب ملتا ہو، یا حضورؐ روحانی طور پہ التفات و توجہ فرماکر بعض دینی مسائل اور حکومت و سیاست کے معاملات میں صحابہ اور تابعین کی ذہنی اُلجھنیں دور فرمادیتے ہوں!

مگر

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں :-

"جب تیسرا روز ہوا، تو میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پہ اور آپ کے صاحبین یعنی ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضؓ پر سلام بھیجا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہؐ! ہمیں بھی ان علوم سے کچھ عنایت ہو، جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے ہیں، ہم آپ کی عطاؤں کے شوق و رغبت میں حاضر ہوئے ہیں اور آپ رحمۃ اللعالمین ہیں ــــ تو آپ نے میری جانب بکمالِ التفات فرمایا۔ حتیٰ کہ میں نے خیال کیا کہ آپ کی عنایت کی چادر نے مجھے لپیٹ اور گھیر لیا، اور مجھ پر اسرار و معارف کا اظہار فرمایا، اور بذاتِ خود ان چیزوں کی معرفت کرائی۔" (اُردو ترجمہ)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے امام بنایا اور میرے طریقہ اور مذہب کو اصل و فروع کے اعتبار سے دُرست فرمادیا (وجعلنی اماماً وصوّب طریقتی ومذھبی اصلاً وفرعاً)

اس صورت میں شاہ ولی اللہ، فقہ و حدیث کے تمام ائمہ سے بڑھ گئے کہ ان کو اُمت نے اپنا امام تسلیم کیا، اس لئے وہ ا[مام] بنے اور کہلائے اور شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "امام" بنایا!

اور

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کا مطلب دریافت کیا آدم علیہ السلام ابھی آب و گل ہی میں تھے اور میں نبی ہوچکا تھا[1] ــــ بعد میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر قوت اور طاقت تھی، آپ کی صورت مثالیہ کے قریب ملا، سو آپ نے مجھے اپنی صورت کریمہ اور مثالیہ دکھلائی جو عالمِ اجسام سے پہلے پائی جاتی تھی۔ اس کے بعد مجھے عالم مثال سے اس عالم میں آنے کی کیفیت بتلائی اور مجھے انبیاء مبعوثین کی شکلیں بتلائیں"

کتاب اللہ، احادیثِ رسولؐ، اور تاریخ و سیرہ بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام انسانوں کی فطری ولادت کے مطابق ولادت ہوئی تھی، آپ کے ماں باپ تھے، اور آپ کی صورتِ مثالی نے بروز نہیں فرمایا تھا، پیدا ہونے کے بعد آپ پر رضاعت، طفولیت، مراہقت، جوانی اور بڑھاپے کے دَور گزرے، پھر آپؐ بیمار ہوئے اور بیماری کی شدت کا یہ عالم ہوگیا کہ دوسرے سہارے کے بغیر چل بھی نہ سکتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "انک میت" پورا ہوکر رہا (ارواحنالہ الفداء)

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا، حتیٰ کہ میرا نفس وسیع ہوگیا ــــــ

اور اس وقت میرا نام ترکی اور آخری نقاطِ علم سکھا گیا"

"مجھے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سالک بنایا، اور آپ نے خود میری تربیت فرمائی لہٰذا

[1] ابن تیمیہ نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔

میں کسی واسطے کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا شاگرد ہوں، اور اویسی ہوں۔۔۔"

حضرت شاہ ولی اللہ کے بارے میں ہم بدگمانی نہیں کرتے کہ انھوں نے صرف لطائف و ظرائف کے طور پر یہ باتیں "مشاہدات" کے عنوان سے لکھ دی ہیں۔ ہم تو یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کے ان مکاشفات، مشاہدات اور دعووں کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے! اس لئے ہم پر اُن کے ماننے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی! جہاں تک کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ کا تعلق ہے اُن میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ اس قسم کے ذرائع سے بھی علم مل سکتا ہے اور نفس و روح اور فکر و خیال تدلی اور مشاہدہ بن کر رہ جاتے ہیں، دینی نقطۂ نگاہ سے یہ انداز بیان یہ اصطلاحات یہ طریقِ فکر تکلف سے خالی نہیں بلکہ اس قسم کی باتوں سے طرح طرح کے غلط رجحانات اُبھرتے ہیں:۔

هَلْ تَعْرِفُ لِمَ كَانَ الشيخان رضي الله عنهما افضل من علي كرم الله وجهه مع انه اول صوفي واول مجذوب واول عارف في هذه الامة۔

تمہیں معلوم ہے کہ حضرت صدیق اور حضرت عمرؓ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر کیوں فضیلت حاصل ہے۔ باوجودیکہ حضرت علی اس اُمت میں سب سے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو "صُوفی" کہنا ہی دل کو بہت کچھ کھٹکتا ہے، چہ جائیکہ اُنہیں "مجذوب" کہا جائے! فاتح خیبر سیدنا علی مرتضیٰؓ کی ذاتِ گرامی سے "مجذوبیت" کی نسبت کتنی ناگوار اور غیر واقعی محسوس ہوتی ہے، پھر اُن کو تمام صحابہ میں "پہلا عارف" کہنا بھی صحیح نہیں، آخر انہیں کس چیز کا عرفان ہوا تھا جس سے دوسرے صحابہ عاری تھے! ہزار احتیاط کے باوجود صوفی کسی نہ کسی درجہ میں "تفضیلی" ضرور ہوتا ہے! حیرت ہے کہ "ازالۃ الخفا" کے مصنف کے قلم سے ایسی بات نکل گئی!

بہت سے اولیاء اللہ کو اس بات کا الہام ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے تکلیف شرعی کو معاف کر دیا، تمہیں طاعات کے معاملہ میں اختیار ہے چاہے کرو ورنہ نہ کرو! قبلہ والدِ محترم نے مجھ سے اپنا واقعہ بیان کیا کہ انہیں بھی اس چیز کا الہام ہوا انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ تکلیف شرعی اُن پر باقی رہے (اُردو ترجمہ — صـ۱۷)

"تکلیفاتِ شرعی" ایک بالغ و عاقل مسلمان سے مرتے دم تک ساقط اور معاف نہیں ہوتیں، جس کے دل میں بھی ایسا خطرہ گزرتا ہے اُسے الہام سمجھنا نفس کا فریب ہے "کاملین کو تکلیفاتِ شرعی معاف کر دی جاتی ہیں" یہ عقیدہ، تصور یا مسئلہ بھی تصوف کے زلات اور شطحیات میں شمار ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے "ان الانبیاء لا یموتون —" (انبیاء کرام کو موت نہیں آیا کرتی) کو حدیثِ رسول بتایا ہے، یہ قول قرآنِ کریم کی اس آیت (انک میت وانہم میتون) سے صریحی طور پر ٹکراتا ہے، اس لئے اسے رد کر دیا جائے گا!

"حیات النبی" کا یہی وہ تصور ہے، جس کو مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نے عقیدہ بنا لیا، اور "ولی اللّٰہی تصوف" کا یہی وہ مزاج ہے جس کو اکابر دیوبند نے اپنا لیا، اور اس طرح جو لوگ شرک و بدعت کے خلاف علمِ جہاد لے کر اُٹھے تھے "توحید خالص" کے معاملے میں خود اُن کے افکار پر کہیں کہیں غبار نظر آتا ہے۔ تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔

"فیوض الحرمین" میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں، وہ انتہائی دقیق، غامض اور مشکل ہیں، ترجمے سے بھی ان عقدوں کے پیچیدہ و دُشوار گرہ نہیں کھلتی!

DIPLOMACY OF ISLAM

از:۔ فضل اقبال، پیش لفظ:۔ جسٹس ایس اے رحمان، ضخامت ۲۷۶ صفحات (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، کلب روڈ لاہور!

جناب افضل اقبال کی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک کامیاب تاریخی، علمی، سیاسی اور دینی پیش کش ہے! فاضل مصنف نے اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ اُن معاہدوں کا ذکر کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش یہود کے مابین ہوئے تھے اسلام کی حکمتِ عملی (DIPLOMACY) کی تفصیل بیان کرتے ہوئے، مصنف نے حضورؐ کی مقدس سیرت کو خاصے دلکش اور اثر انگیز انداز میں پیش کیا ہے، اسلوبِ نگارش بڑا جاندار اور طریقِ استدلال سنجیدہ اور وزنی ہے! لائق مصنف کا اشہبِ خامہ جادۂ اعتدال پر رواں دواں رہا ہے۔

حیرت ہے کہ تاریخ و سیر سے اس قدر خبر و آگہی کے باوجود ابوجہل کو کئی مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا لکھا گیا۔ حضورؐ کا چچا ابوجہل نہیں ابولہب تھا۔ ابوجہل بنو ہاشم سے نہیں بنو مخزوم سے تعلق رکھتا تھا۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ مغربی دُنیا میں اس کی خاطر خواہ اشاعت کا اہتمام کیا جائے، اس کے مطالعہ سے ذہنِ مغرب کا دُھندلکا چھٹے گا۔

"ATIQ'S ENGLISH TRANSLATION"

از:۔ ایس۔ آر خاں، ضخامت ۳۵۲ صفحات، قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:۔ رحمٰن برادرس، فریر روڈ کراچی ۱

عتیق انگلش ٹرانسلیشن
انگلش اُردو۔ اُردو انگلش

انگریزی بول چال، انگریزی گرامر اور انگریزی میں خطوط نویسی اور مضمون نگاری کی مشق بہم پہونچانے کے لئے رحمٰن برادرس نے ایک درجن کتابیں شائع کی ہیں، جن کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ادھر کتابیں چھپیں، اور اُدھر ہاتھوں ہاتھ بک گئیں یہ کتاب بھی اسی مُفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب انگریزی سیکھنے والوں کی مشکلات کا اندازہ کرکے ان کی نفسیات کے مُطابق مُرتب کی گئی ہے، مشقوں (EXERCISE) میں طالب علموں کی تدریجی تعلیمی ترقی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جو کوئی طالب علم اس کتاب کو سمجھ کر پڑھے گا اور تحریری طور پر اس کی مشقوں کا حل کرے گا، اُسے انگریزی سے اردو اور اُردو سے انگریزی ترجمہ کی خاصی مہارت ہو جائے گی۔

یہاں بہت سے آدمی آتے ہیں۔ MANY A MAN HAS COME HERE.

یہاں بہت آدمی آئے ہوئے ہیں A MANY MEN HAVE COME HERE.

انگریزی روز مرہ کے ایسے "نازک فرق" اور اُن کی مثالیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔

وہ غصّے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا HE WAS BESIDE HIMSELF WITH RAGE.

سارا دن (ALL THE DAY LONG) سارا سال (ALL THE YEAR ROUND)

سارا ہفتہ (ALL THE WEEK THROUGH)

نیشنل بینک کے حصوں کی قیمت بڑھ رہی ہے THE NATIONAL BANK SHARES ARE LOOKING UP.

انگریزی زبان و روز مرہ کی یہ وہ نزاکتیں ہیں جن سے غیر اہل زبان کم ہی واقف ہوتے ہیں!

وہ چارپائی پر لیٹا ہے (صفحہ ۲۴) HE IS LYING IN THE BED.

اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے تھا ـــ وہ بستر پہ لیٹا ہے ـــ چارپائی کو انگریزی میں "COTT" کہتے ہیں! بستر (BED) ایک عام لفظ ہے، کوئی شخص، چارپائی، تخت، یا مسہری پر لیٹا ہو اور اس کا بستر سونے پر بھی ہو اُسے "BED" ہی کہیں گے!

میرے پاس تین پیسے ہیں (صفحہ ۸۹) I HAVE THREE PICE.

اب "پیسے" کو " PICE " نہیں " PAISA " ہی کہتے ہیں!

مسلم قوم آزادی پسند ہے (صفحہ ۹۴) THE MUSLIM ARE LIBERTY LOVING

LIBERTY کی جگہ " FREEDOM " موزوں تھا۔

وہ ہاتھ کا سخت ہے (صفحہ ۱۲۵) HE IS A BAD PAYMASTER.

یہ گورا شاہی ترجمہ ہے!

INVESTIGATE کا ترجمہ "جانچ کرنا" (صفحہ ۱۸۰) درست ہے، مگر اس کے ساتھ "تحقیقات کرنا" "پتہ لگانا" بھی لکھ دینا چاہیے تھا اس لئے کہ جب کوئی ممتحن کسی طالب کی کاپی کی "جانچ کرتا ہے تو اُسے" INVESTIGATION " نہیں کہہ سکتے

میری نظر اچھی نہیں چلتی (صفحہ ۲۸۷) I CANNOT SEE CLEARLY

یہ ترجمہ بھی اُردو روزمرہ کے خلاف ہے۔ "میں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا" یہ ہے انگریزی کے اس جملہ کا سیدھا سادہ ترجمہ!

اس کو جوتا لگتا ہے (صفحہ ۲۸۶) THE SHOE PINCHES HIM

یہ (اس کو جوتا لگتا ہے) کہاں کی زبان ہے! ایسے موقعوں پر "جوتا کاٹتا ہے" بولتے ہیں۔

ایک ٹوکری پکا آم لاؤ (صفحہ ۲۹۷) BRING A BASKET OF RIPE MANGOES

"ایک ٹوکری پکے آم لاؤ" صحیح ترجمہ ہے۔

یہ زیور پکے (کھرے) سونے کے ہیں (صفحہ ۲۹۸) THESE ORNAMENTS ARE OF PURE GOLD.

" PURE " کو "پکا" نہیں "کھرا" کہتے ہیں "پکے" ترجمہ سے نکال دینا چاہیے۔

دوسرے ایڈیشن میں، اُردو ترجمہ پر نظر ثانی ضرور کر لینی چاہیے، کتاب اپنی جگہ طالب علموں کے لئے انتہائی مفید اور کارآمد ہے! رحمٰن برادرس نے اس کتاب کو چھاپ کر انگریزی زبان سیکھنے کے لئے درس و تدریس اور تعلیم کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

فردوسِ بریں

مصنف:- مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، مرتبہ:- سید وقار عظیم، ضخامت ۲۲۳ صفحات (دیدہ زیب ٹائپ) قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:- مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور۔

مجلس ترقی ادب (لاہور) نے اُردو کلاسیکی ادب کو سلیقہ اور صحت کے ساتھ منظرِ عام پر لانے کا جو مفید منصوبہ بنایا ہے، یہ اُسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے!

"فردوسِ بریں" مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کا شاہکار ناول ہے! یہ ناول اس قدر دلچسپ ہے کہ کتاب ہاتھ میں لے کر اُسے ختم کئے بغیر کوئی دوسرا کام کرنا گراں گزرتا ہے، کس قدر نرم و شیریں زبان ہے، کتنا پُر لطف اندازِ بیان ہے، پلاٹ کس درجہ مربوط ہے! حسین اور زمرد کے مکالمے کتنے اثر انگیز اور رومان آفریں ہیں!

شیخ علی وجودی باطنیوں کا امام اور مجتہد جب حسین کو امام نجم الدین کے قتل کی تلقین کرتا ہے، تو یہ مکالمے کس قدر نفسیاتی اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے کس درجہ عجیب اور پُر اسرار ہیں!

اس ناول کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ "باطنی تحریک" اسلام کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی اور حشیشین کا گروہ کتنا سنگدل، ظالم اور انسانیت کُش تھا! باطنی علماء اور اس تحریک کے نمائندوں نے زبان اور اصطلاحات اور دینیت

اشاریت کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ "تصوف" کے انداز بیان سے کس قدر ملتا جلتا ہے!

اس کتاب پر سید وقار عظیم نے سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے، مولانا شرر کے حالات میں وہ لکھتے ہیں:-

"اسی سال شرر نواب وقار الملک کے ملازم ہو کر حیدر آباد چلے گئے"۔ (صفحہ ۷۰)

شرر نواب وقار الملک کے نہیں، نواب سر وقار الامراء (صاحب پایگاہ) کے ملازم اور اُن کے بیٹے نواب ولی الدولہ کے اتالیق تھے۔

"یہ خوشنما طیور کپڑوں میں لپٹے ہوئے کبابوں کی پوٹلیاں بھی لاتے ہیں" (صفحہ ۶۷) باطنیوں کی بنائی ہوئی جنت (فردوسِ بریں) کا جو نقشہ ناول نگار نے پیش کیا ہے۔ اور جس قدر حسین، نرم و شیریں الفاظ استعمال کئے ہیں، اُن کے ساتھ "پوٹلیاں" کا کوئی جوڑ نہیں! پھر وہ پرند جو خوش نما اور دیدہ زیب بھی ہوں، اُن کا اپنی نازک منقاروں میں "پوٹلیاں" اُٹھانا عجیب لگتا ہے۔

"ہم نے گناہ کئے مگر ثواب سمجھ لے کہ ہمارے قدم کو لغزشیں ہوئیں"۔ (صفحہ ۹۱)

یہ "دعا" کی عبارت کا ایک ٹکڑا ہے، اس میں "مگر ثواب سمجھ لے" نے عبارت کی روانی اور لطف کو غارت کر دیا۔ کیا عجیب ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہو، اور اصل عبارت یوں ہو ـــــ "مگر ثواب سمجھ کر ـ ـ ـ ـ" "چند روز اپنے شہر آمل میں رہے اور باقی ماندہ زندگی قراقرم میں جا کے شہزادی بلغان خاتون کی صحبت میں صرف کر دی (صفحہ ۱۹۱) اسی جملہ پر یہ کتاب ختم ہوتی ہے، کاش "صرف کر دی" کی بجائے "گزار دی" ہوتا!

صفحہ ۲۹ پر "شعاعیں" کی جگہ "شعائیں" پڑھنا پڑا، صفحہ ۹۴ پر "تمغہ" کی بجائے "تغمہ" چھپ گیا۔ صفحہ ۸۶ پر "موتو قبل ان تموتو" ثانتپ ہوا ہے، یوں چھپنا چاہیے تھا۔

"موتوا قبل ان تموتوا"

باطنیوں کے قلعہ کو ہر جگہ "التمونت" لکھا گیا ہے مگر "المنجد" ہمارے سامنے ہے اُس میں "قلعہ الاموت" درج ہے۔ (فاران: پڑھنے والے تحقیق کر کے ہمیں مطلع فرمائیں کہ صحیح نام کیا ہے؟)

یہ کتاب (فردوسِ بریں) خاص طور سے اس دور کے "ترقی پسند ادیبوں اور ناول نگاروں" کو پڑھنی چاہیے، تاکہ انھیں معلوم ہو کہ بات اس سلیقہ سے کہی جاتی ہے، اور مفہوم کی ترجمانی کے لئے یہ پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے! اس کتاب میں رومان، سحر، نفسیات ہے، منظر کشی ہے، "رمز و اسرار ہے" مگر ہر چیز اپنی جگہ فکر و خیال اور زبان و بیان کے اعتبار سے موزوں، متناسب اور دلکش و حسین ہے! یہ وہ کلاسیکی ادب ہے، جس سے اُردو زبان و ادب کا رشتہ ہر دور میں باقی رہنا چاہیے!

مضامین سلیم (جلد اول)

از:- مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی ـ مرتبہ:- شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ـــــ ضخامت ۲۲۴ صفحات (پائدار خوب صورت جلد) قیمت:- چار روپے پچاس پیسے ـ

ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ، کراچی ۱

مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کا نام "وضع اصطلاحات" کی نسبت سے اُردو دُنیا میں شہرت دوام حاصل کر چکا ہے، موصوف عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے، شاعر تھے اور اُردو نثر نگاری میں بلند مقام رکھتے تھے! شیخ محمد اسمٰعیل نے اُن کے مضامین کو یکجا فرمایا ہے اور انجمن ترقی اردو پاکستان نے ان ادبی اور علمی نوادر کو شائع کیا ہے، پہلی جلد مولوی سلیم پانی پتی کے آٹھ مضامین پر مشتمل ہے:-

(۱) اُردو شاعری کا مطالعہ (۲) سچی شاعری (۳) انسان نے اول اول بولنا کیوں کر شروع کیا (۴) حیاتِ جاوید پر ریویو۔

زندہ قوم کی علامات (۶) فلسفہ تاریخ پر ایک سرسری نظر (۷) حامیانِ ہندی اور اُن کا مطالعہ (۸) مسلمانوں کا تمدن۔

اس پہلی جلد میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) کا وہ مضمون بھی شامل ہے، جو انھوں نے سلیم پانی پتی کے سانحۂ وفات پر لکھا تھا، اس میں اُن کی زندگی کے جستہ جستہ حالات بھی آگئے ہیں!

اس کتاب کے تمام مضامین مفید، بلند پایہ اور معلومات آفریں ہیں خاص طور سے —— مسلمانوں کا تمدن —— جس کا عنوان ہے، اُس میں فاضل مضمون نگار نے مسلمانوں کی علمی ترقیوں کی جو تفصیل بیان کی ہے، اُس پر "دریا کے کوزے میں بند ہونے کی" مثل صادق آتی ہے۔

سرسید احمد خاں کی طرح مولوی سلیم پانی پتی انگریزی حکومت کے مدح خواں ہیں فرماتے ہیں:-

"... ہم کو فخر ہے کہ ہم ایسی آزاد اور روشن خیال گورنمنٹ کے سایہ میں رہتے ہیں، جو ہماری شکایتوں پر کان لگاتی ہے، ہماری تکلیفوں کا علاج کرتی ہے ..." (ص ۱۶۳)

"ہماری شکایتوں پر کان دھرتی ہے" موزوں تر انداز بیان ہو سکتا تھا۔

"عربوں نے جب ایشیا کے ملکوں پر حملہ کیا، تو فارس میں اُن کے وہ اصول تمدن ہاتھ آئے، جو ان حکما کے باعث عام ہو گئے ہیں"۔ (صفحہ ۱۸۱)

"باعث" نے عبارت میں "ترجمہ" کا سا رنگ پیدا کر دیا۔

صفحہ ۱۸۲ پر لکھا ہے کہ مامون رشید نے شارلیمن شاہ فرانس کو گھڑی کا تحفہ بھیجا مگر ہم نے تاریخ و ادب کی کتابوں میں ہارون الرشید کا نام پڑھا ہے۔

اب سے پچاس برس (سنہ ۱۹۱۳ء میں) پہلے مسلم لیگ کیا تھی، اس کا ماجرا مولانا سلیم پانی پتی کی زبان سے سنیے:-

"مسلم لیگ کی موجودہ پالیسی کے لحاظ سے اگر اس کو انگلش لیگ کہا جائے تو کچھ بھی بیجا نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر معاملہ کو انگریزوں کی عینک سے دیکھتی رہی ہے نہ کہ مسلمانوں کی عینک سے گویا اس کی نظر میں ہندوستان صرف انگریزوں سے آباد ہے، اور مسلم لیگ اُسکی نمائندہ ہے" (ص ۱۵۱)

اسکالرشپ (SCHOLARSHIP) کا املا "اس کالرشپ" اگرچہ انجمن ترقی اُردو کی جدت ہے مگر پڑھنے والوں کو التباس میں ڈالنے والی جدت ہے۔

(۲) مضامین سلیم جلد دوم۔ ضخامت ۲۱۴ صفحات۔ قیمت چار روپے

دوسری جلد میں مولوی سلیم پانی پتی کے سولہ (۱۶) مضامین شامل ہیں۔ یوں تو سارے کے سارے مضامین علم و ادب کے اچھے ہیں، مگر "تمدن عرب پر ریویو" یہ مقالہ زبان و ادب کی خوبیوں کے ساتھ دینی فکر کا بھی حامل ہے۔

ڈریپر نے اعتراض کیا تھا:-

"اگر قرآن مجید درحقیقت خدا کا کلام ہوتا، تو اس میں وہ تمام علمی نتائج آج سے تیرہ صدی پہلے مذکور ہوتے، جو صدیوں کی انسانی محنتوں اور کاوشوں نے پیدا کئے ہیں"۔

مولوی سلیم اُس کا جواب دیتے ہیں:-

"مگر اُس نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ نبوت کا مقصد انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی سے

متعلق ہے، اس لئے کوئی الہام یہ نہیں بتاتا کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے
کوئی آسمانی کتاب یہ نہیں سکھاتی کہ جمادات و نباتات کے خواص کیا ہیں؟ کوئی پیغمبر
یہ تعلیم نہیں دیتا کہ فوٹوگراف میں آواز کیوں کر بند ہو سکتی ہے؟ یا ہم عکسی تصویر کس طرح
کھینچ سکتے ہیں؟ کوئی فرشتہ یہ بتانے نہیں آتا کہ بجلی کے تار پر خبر کیوں کر جا سکتی ہے؟
مذہب یہی بتاتا ہے کہ اخلاق کی اصلاح کیونکر ہو؟ الہام یہی سکھاتا ہے کہ انسان کی نجات
کن باتوں پر منحصر ہے؟ مذہب بلند آواز سے پکارتا ہے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم "۔

"۔۔۔ جناب امیر علیہ السلام کے وہ اشعار اکثر لوگوں کو یاد ہوں گے" (صفحہ ۵)

یہ شیعوں کے پروپیگنڈے کا کمال ہے کہ بہت سے مسلمان ادیب اور شعراء حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کو "امیر یا جناب امیر" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، شیعہ حضرات چونکہ تینوں خلافتوں کو جائز تسلیم نہیں کرتے، اس لئے وہ صرف حضرت علی رضؓ کو "امیر" کہتے ہیں حالانکہ چاروں خلفاء "امیرالمومنین" تھے!

دق و سل اور اس کا علاج

مولفہ:۔ ڈاکٹر سلیم الدین احمد صدیقی (ایم۔ اے علیگ ہومیوپیتھ) ضخامت ۱۲۸ صفحات (کتابت جلی، طباعت دیدہ زیب، سرورق رنگین و جاذب نظر) قیمت تین روپے،
ملنے کا پتہ:۔ قمر ہومیو چیمبر آرام باغ روڈ، کراچی نمبر۱۔

جناب ڈاکٹر سلیم الدین احمد صدیقی نصف درجن کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی یہ کتابیں:۔ مبادیات ہومیو پیتھی — جدید بایو کیمک سائنس — پاک ہربڈی — غذائی علاج — مجربات ہومیو پیتھی — آسان خواص الادویہ — شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں، اور طبیبوں اور مریضوں نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے دق اور سل کے علاج اور اس کے متعلقات سے بحث کی ہے باب اول میں اعضا کی تشریح وافعال اور نظام تنفس کا بیان ہے، دوسرا باب دق کے کیڑوں کی تفصیل پیش کرتا ہے، تیسرے باب میں دق و سل کے علامات و نشانات کی تفصیل ملتی ہے، باب چہارم تشخیص اور باب پنجم معاملات سے عبارت ہے!

ڈاکٹر صاحب موصوف کا نقطۂ نظر "ہومیوپیتھک" ہے، پوری کتاب مفید کارآمد اور معلومات آفریں ہے! ڈاکٹر صاحب نہ صرف تجربہ کار "ہومیو پیتھ" ہیں بلکہ اس "طب" کے مبلغ بھی ہیں، جس طریقہ علاج کو انھوں نے آزمایا ہے اور ہزاروں مریض جس سے شفایاب ہو چکے ہیں، ڈاکٹر سلیم الدین صدیقی کو اس کا حق حاصل ہے کہ اس کی تبلیغ کریں، اور دوسروں کو اس کے فوائد بتائیں جناب حکیم اقبال حسین (ایم۔ اے) نے اس کتاب پر "تعارف" لکھ کر اس وسعت ظرف اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے کہ ایلوپیتھی ہو، ہومیو پیتھی ہو، طب یونانی یا ویدک طریقہ علاج ہو، یہ سب سب انسانوں کے فائدے کے لئے وجود میں آئے ہیں، اور ان "علوم" کے جاننے والوں کے درمیان رقابت نہیں پائی جانی چاہیے ہاں! ایک طریق علاج کا ماہر دوسرے طریق علاج پر اپنے طریق علاج کے اسباب ترجیح ظاہر کر سکتا ہے!

سوانح مولانا رومؒ

از:۔ شبلی نعمانی، مرتبہ:۔ سید عابد علی عابد، ضخامت ۲۴۲ صفحات۔ قیمت:۔ دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اردو کے "محسنِ اعظم" ہیں۔ ان کی کتابوں نے اردو کی آبرو بڑھائی اور اس زبان اور اس کے

ادب کو بلندی، عظمت اور جامعیت عطا کی ہے، گزشتہ نصف صدی میں جتنے ادیب اور نقد نگار اُردو زبان وادب میں پیدا اور مشہور ہوتے ہیں، اُن میں سے ہر ادیب شبلیؔ سے متاثر ہے! جہاں تک شعر وادب کے صحیح ذوق کا تعلق ہے، شبلی نعمانی کا ذوق اپنی جگہ نہ صرف یہ کہ معتبر بلکہ مثالی ذوق ہے!

یہ کتاب (سوانح مولانا رومؒ) بھی شبلی نعمانی کی دوسری کتابوں کی طرح ہر اعتبار سے اونچے درجہ کی کتاب ہے، اس کے مطالعہ سے ایک طرف شعر وسخن کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے، دوسری طرف علمِ کلام اور تصوف کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کتاب پڑھتے میں ایسا محسوس ہوا، جیسے دل ودماغ کے آئینے مجلّا ہوتے چلے جارہے ہیں اور کوئی گھونٹ گھونٹ کرکے اخلاق وادب کا آبِ حیات پلا رہا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی ادب واخلاق اور دینی علوم ہی میں نہیں، فلسفہ اور کلام میں بھی تبحر رکھتے تھے، اُن کا یہی علمی تبحر ہے جو بوعلی سینا جیسے عظیم فلسفی پر بھی تنقید کرنے سے نہیں ہچکچاتا، فرماتے ہیں:-

"بوعلی سینا نے "اشارات" وغیرہ میں روح کے ثبات کے بہت سے دلائل لکھے ہیں جن کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے ----" (ص ۱۶۵)

اشاعرہ کی مشہور اصطلاح "کسب" پر بھی مولانا نے طنز کی ہے، فرماتے ہیں:-

"اشاعرہ نے اپنی دانست میں ایک تیسری صورت یہ اختیار کی کہ افعال انسانی خدا کی قدرت سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن چونکہ انسان کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، اس لئے انسان کو ان سے کسب کا تعلق ہے، لیکن کسب محض ایک مہمل لفظ ہے، جس کی کچھ تعبیر نہیں کی جاسکتی (ص ۱۹۹)

"جبر اور قدر" یہ دونوں غلط انتہائیں ہیں، ان سے بچنے کے لئے "اشاعرہ" نے "کسب" کی صورت نکالی تاکہ تکلیفاتِ شرعی سے دامن چھڑانے کا حیلہ ہاتھ نہ آئے، انسان جمادات کی طرح نہ تو "مجبورِ محض" ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی مانند "مختارِ مطلق" ہے، اس صورت میں اشاعرہ کا "کسب" ہی اعتدال کی صورت پیدا کرتا ہے "کسب" کو "جبر واختیار" کا برزخ سمجھنا چاہیئے، اور اشاعرہ نے یہ صورت (کسب) پیدا کرکے بہت سے فتنوں سے اُمت کو بچایا ہے۔

موسیا آدابِ داناں دیگراند   سوختہ جاں را رواناں دیگراند (صفحہ ۹۹)

مولانا رومؒ رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کا یہ وہ مشہور شعر ہے جسے بعض ایسے علماء تک غلط پڑھتے ہیں جو مثنوی سے غیر معمولی شغف رکھتے ہیں — یعنی "آداب داناں" کی جگہ "آدابِ داناں" (آداب اور داناں کے درمیان اضافت لاتے ہیں) اس شعر کا دوسرا مصرعہ ہمارے خیال میں مثنوی کے اصل نسخہ میں (غالباً) یوں ہوگا ؎

سوختہ جاناں رواناں دیگراند

(اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے خطاب فرماتا ہے کہ اے موسیٰ! جو لوگ ادب شناس اور ادب داں ہیں، وہ دوسرے ہی مزاج اور ذوق وفکر کے لوگ ہوتے ہیں اور سوختہ جانوں کے انفس وارواح (رواناں) کا بھی دوسرا ہی عالم ہوتا ہے)

اس کتاب کے دیباچے کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے:-

"پروفیسر شبلی نعمانی کی تالیف سوانح مولانا روم کے نثری متن کی تصحیح کوئی دشوار امر نہیں ----"

مولانا شبلی پروفیسر بھی رہے ہیں مگران کے نام کے ساتھ "پروفیسر" نہیں لکھا جاتا! بلکہ یہ نسبت اور لقب (پروفیسر) علامہ شبلی نعمانی کے نام کے ساتھ اجنبی سا لگتا ہے۔

اس کتاب میں پروفیسر سید عابد علی عابد کے حواشی ان کی فارسی دانی اور وسعتِ مطالعہ کی شہادت دیتے ہیں ——— مجلس ترقی ادب (لاہور) "سوانح مولانا روم" کی اشاعت پر تبریک و تحسین کی مستحق ہے۔

علم و عمل
وقائع عبدالقادر خانی
جلد دوم

ترجمہ:- مولوی معین الدین فضل گڑھی، ترتیب و حواشی:- محمد ایوب قادری (بی اے)

تعارف:- نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔

ضخامت ۴۳۲ صفحات (بڑا سائز) مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت آٹھ روپے

ملنے کا پتہ:- اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، بی روڈ، سعیدہ منزل، متصل سرسید گرلس کالج، ناظم آباد، کراچی۔

وقائع عبدالقادر خانی کی پہلی جلد پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے، اس کی دوسری جلد بھی اسی اہتمام اور آن بان کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے، مولوی محمد ایوب قادری نے اس کتاب پر جو پیش لفظ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالقادر مرادآباد میں دس سال (۱۸۴۰ - ۱۸۳۱) تک صدر الصدور رہے ہیں، اس کے بعد انھوں نے اس عہدے سے اس بات پر استعفا دیدیا کہ مرادآباد کے انگریز جج مسٹر اوگڈون نے مولوی صاحب کی شان میں کوئی ایسی بات کہدی تھی جو انھیں ناگوار ہوئی!

مولوی عبدالقادر کو سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر نے بلا کر عہدۂ وزارت عطا کیا، اور ساتھ ہی خطابات اور خلعت فاخرہ سے نوازا، مولوی عبدالقادر خاں نے وزارت کے فرائض بڑی سوجھ بوجھ احساسِ ذمہ داری اور فرض شناسی کے تحت انجام دیئے، مگر چند مہینے کے بعد جب بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ تمام مقدمات بعض دوسرے معاملات اور حسابات نواب زینت محل کے حضور پیش ہوا کریں، تو مولوی صاحب مستعفی ہو گئے اور قلعہ معلیٰ سے اُن کا تعلق منقطع ہو گیا۔

مولوی عبدالقادر خاں مرحوم اللہ تعالیٰ کے فضل سے توحیدِ خالص کے تقاضوں کو پہچانتے تھے، اس لئے جہاں کہیں شرک و بدعت کی بات دیکھتے ہیں، تو اس سے صرفِ نظر نہیں کرتے ——— چند اقتباسات :—

"یہ لوگ (رسول شاہیوں کا گروہ) خدا کی خدائی، رسول کی رسالت اور قیامت کے منکر ہیں، لیکن صاف اور کھلم کھلا نہیں، ورنہ یہ پیری میری نہیں رہ سکتی بلکہ دوسرے طریقے سے اپنے اُصولوں کی تبلیغ کرتے ہیں مثلاً اگر کوئی مُرید پیشہ ور ہے تو اُس سے کہتے ہیں کہ کسبِ معیشت تک نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن ضرور کرنی چاہیئے، البتہ توکل اور صبر کے بعد ان چیزوں کی ضرورت نہیں رہتی، مگر بھنگ ہر حال میں کھانی چاہیئے[1] کیوں کہ یہ کشف کا راستہ کھول دیتی ہے (صـــ۱۳۱)

"اس درگاہ (اجمیر شریف) کے آداب جو ہندو مسلمانوں میں جاری ہیں، وہ یہ ہیں، جس وقت گھنٹی بجتی ہے، یا نقارہ پر چوٹ پڑتی ہے، تو ہر شخص جہاں بھی سنتا ہے، درگاہ کی طرف رُخ کر کے تسلیم کرتا ہے ——— چھ گھڑی رات گئے درگاہ کے ملازم قوال کر کا گاتے ہیں

[1] افیون اور کوکین کھائی جاتی ہے اور بھنگ پی جاتی ہے (م - ق)

گانا ختم ہونے کے بعد بعض لوگ زمین پر سر رکھ دیتے ہیں، بعض رکوع کی طرح جھک جاتے ہیں اور تسلیمات بجالاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اکثر لوگ گنبد کے گرد چکر لگاتے ہیں، جس کا نام طواف ہے۔ ۔" (ص۹۵)

"خلاصہ یہ کہ جدت پسندوں نے ہزاروں برس میں بت خانوں میں جو ایجادیں کی ہیں شہر کے گور پرستوں نے تمام بزرگوں کی قبروں پر اس تھوڑی سی مدت میں ایسی ہنا وٹیں جاری کردیں کہ بجائے ہیکل کے نقل بھی رشکِ برہمناں بن گئی (ص۹۶)

اس مجلد کا دوسرا حصہ مولوی عبدالقادر خاں کے پوتے مرزا نصیر الدین محمود کے خود نوشت حالات پر مشتمل ہے، اس کتاب سے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نسباً "شیخ" نہیں "مغل" تھے!

صفحہ ۸۸ پر فاضل حاشیہ نگار نے ضلع بدایوں کے مشہور قصبہ گنور کے حالات کے ضمن میں جو وہاں کے مسلمانوں کی ذات (شیخ) کا ذکر کیا ہے، اس میں یہ نہیں لکھا کہ قصبہ گنور میں "انصاری" بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

صاحب وقائع نصیر خانی، مرزا نصیر الدین محمد شاعر بھی تھے اور علیل تخلص کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کو مرزا غالب سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، کتاب کے آخر میں ان کی نظمیں اور غزلیں درج ہیں، علیل کی مثنویوں میں خاصی روانی ملتی ہے! صفحہ ۱۴۰ پر "صیحہ" کا ترجمہ "عذاب" کیا گیا ہے، کوئی شک نہیں کہ "صیحہ" عذاب کی ایک شکل ہے مگر "صیحہ" کے لغوی معنی عذاب کے نہیں، دردناک اور ہولناک چیخ کے ہیں۔

یہ کتاب اپنے دور کے تمدن کی عکاسی کرتی ہے، کتنی بہت سی شخصیتیں، شہر، قصبے، بستیاں، رسوم و رواج اور دوسری چیزیں ہیں جن سے اس کتاب کی بدولت آگاہی ہو جاتی ہے!

(باقی مضمون صفحہ ۵۵ پر ملاحظہ کیجئے)

گلبانگ از: حسن یحییٰ عندلیب میرٹھی (ایم اے، ایل، ایل بی) ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد رنگین سرورق) قیمت: چار روپے
ملنے کا پتہ: علمی ادارہ، ۳۰۔ راج گڑھ روڈ، شیام نگر، لاہور (۲)

مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا (مصنف مرآۃ الشعراء و سیر المصنفین) کا نام علم و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ صاحب گلبانگ (جناب عندلیب میرٹھی) اُنہی کے لائق فرزند اور اسی علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں!

گلبانگ پر پیش لفظ سید رضا علی وحشت مرحوم نے آج سے دس سال قبل ۱۹۵۲ء میں تحریر فرمایا تھا۔ وحشت مرحوم نے عندلیب صاحب کے کلام کو سراہا ہے۔ کتاب کا دیباچہ خود شاعر کا لکھا ہوا ہے، جس میں انھوں نے "بلینک ورس" (یعنی غیر مقفیٰ شاعری) پر تنقید کی ہے!

اس کتاب میں سب سے زیادہ جاندار اور قیمتی چیز عندلیب صاحب کا مقدمہ ہے، اس میں انھوں نے شاعری اور اس کی خصوصیات و متعلقات کے بارے میں بڑے کام کی باتیں کہی ہیں ——— ایک اقتباس:-

"جیسے ایک چابکدست مصور تصویر بنانے میں کہیں ہلکے رنگ سے کام لیتا ہے، اور کہیں گہرے سے، اس طرح منظر کشی کے موقع پر شاعر بعض چیزیں اخذ کر لیتا ہے اور بعض کو نظر انداز کر دیتا ہے، جس سے وہ ہر معمولی سے معمولی چیز کی تفصیل بیان کئے بغیر تمام واقعہ کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ لہٰذا جس طرح ایک شاعر کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تصویر کھینچتے وقت اُسے کیا کیا چیزیں بیان کرنی ہیں، اور کیا کیا ترک کر دینی ہیں، ایک نقادِ فن کے پیشِ نظر ان تمام باتوں کا ہونا لازم ہے۔"

نثرے سرد یا شاعری" (بلینک ورس) وغیرہ کے بارے میں عندلیب صاحب کی تنقید کس قدر وزنی اور بصیرت افروز ہے:-

"میں نے جہاں تک غور کیا ہے، ان نظموں کو ترویج دینے کے حامی زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو نہ زبان پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں نہ بحر کی پابندی اُن کے بس کی بات ہے، جس کے باعث کہیں تو بحر اُن کے لئے اتنی تنگ داماں ہو جاتی ہے کہ پورا مضمون مصرع میں ادا نہیں ہو پاتا اور کہیں اتنی دریائے بیکراں بن جاتی ہے کہ الفاظ سے مصرع کا وزن پورا کرنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ——— اسی طرح بعض دلدادگان مغرب کی خواہش ہے کہ ہماری شاعری کو قافیہ کی قید سے آزاد کر دیا جائے۔ تاکہ شاعر بلا تکلف اظہار خیال کر سکے اور قافیہ کی پابندی اس راہ سے مانع نہ ہو، چنانچہ گزشتہ پچیس تیس سال سے خاص طور پر یہ کوشش کی جا رہی ہے، اسی عرصہ میں غیر مقفیٰ نظمیں لکھی گئی ہیں، لیکن فقدان موسیقیت سے قطع نظر نہ ان میں حسنِ بیان پایا جاتا ہے، نہ جدت خیال بلکہ ابہام و اہمال قدم قدم پر نظر آتا ہے، اور انداز بیان عموماً پیچیدہ، ژولیدہ اور الجھا ہوا ملتا ہے اور یہ حال معمولی شعراء کا نہیں، بلکہ ان حضرات کا ہے جو اس قسم کی شاعری میں امامِ فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اُردو زبان میں شاعروں کی کثرت سے عندلیب صاحب بجا طور پر بیزار ہیں:-

"...... مذاق شعر و ادب کو اور زیادہ عام کرنے کے لئے اب بر چھوٹے بڑے قصبے

گاؤں میں انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں اور ایک ہل چلانے والے کسان کی طرح منتظمین انجمن امید کر رہے ہیں کہ جیسے تخم ریزی کے بعد ہر کھیت سے خوشۂ گندم نمودار ہوتا ہے ما آخر وہ ہر قریے سے ادیب و شاعر پیدا ہوا کریں گے۔۔۔"

بعض ایسے لوگ جو فطری طور پر شاعر نہیں ہیں صرف موزوں مصرعے جوڑ لیتے ہیں، ان کو ادبی محفلوں اور مشاعروں میں جو داد ملتی ہے اور رسالوں میں ان کا کلام (؟) چھپتا ہے، اس نے بھی شعر و ادب میں بڑا فساد پیدا کیا ہے۔ جناب عندلیب نے اس خرابی کو شدت کے ساتھ محسوس فرمایا ہے:-

"افسوس ہے کہ ہم آج تک سب شاعروں کو ایک ہی طبقہ میں رکھتے چلے آئے ہیں، اور انکی شاعرانہ قابلیت کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ مسلّم الثبوت استاد ہو یا مبتدی دونوں لفظ "شاعر" سے موسوم کیے جاتے ہیں، حالانکہ اوائل عمر کا تو کیا ذکر سنِ رشد کو پہنچ کر بھی صحیح معنی میں کوئی شخص شعر کہنے لگے تو بڑی بات ہے، کیوں کہ بعض لوگوں کی تمام عمر شعر کہتے گزر جاتی ہے مگر شعر کہنا نہیں آتا، تاہم نہ صرف یہ کہ ہم سب ان لوگوں کو "شاعر" کے موقر لقب سے یاد کرتے ہیں، بلکہ اُن کا ذکر فخر سے تذکرۃ الشعراء میں کرتے ہیں۔"

"۔۔۔۔ اب سوال یہ ہے کہ شعراء کی تکثیر کو تقلیل میں کیوں کر تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ غور کیجئے تو اس تکثیر کا سبب ہی شعراء کی بیجا ہمت افزائی اور تعریف و توصیف ہے، اور بیجا تعریف کا سبب ذوقِ انتقاد کا فقدان ہے۔"

عندلیب صاحب افادیت کے لحاظ سے نظم کو غزل پر ترجیح دیتے ہیں، نظم و غزل کے بارے میں ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا ہر شاعر اور ناقد کو حق حاصل ہے ـــــ مگر انھوں نے یہ جو فرمایا ہے:-

"۔۔۔۔ نظم میں بعض خیالات جس قدر صفائی سے بآسانی ادا کئے جا سکتے ہیں، غزل میں اُن کا اظہار بیحد دشوار ہے۔"

اس سے ہم اختلاف رکھتے ہیں، غزل کا ایجاز و اجمال نظم کی تفصیل و اطناب سے بہت زیادہ حسین، دلکش اور اثر انگیز ہوتا ہے!

؎ نظم ہے اپنی جگہ خوب مگر ہائے! غزل

جناب عندلیب شیر محمد کی نظموں میں کوئی شک نہیں جوش اور روانی پائی جاتی ہے، خاص طور سے فارسی تراکیب کو اردو نظم میں سمونے کا وہ خاص سلیقہ رکھتے ہیں، مگر بہت سے مقامات پر ایسا محسوس ہوا کہ اُن کی شاعری ابھی بلوغ کو نہیں پہنچی!

"صبح انقلاب" کے یہ شعر کتنے شگفتہ ہیں:-

ظلمت کی شہ نشین پہ سر چشمۂ بقا	بجھتا ہوا چراغِ خضر دیکھتا ہوں میں
روشن ولاں دہر میں ظلمت کدے میں گم	ناقدری متاع ہنر دیکھتا ہوں میں
خورشید زر نگار سے لینے کو انتقام	شبنم کے دل میں رقص شرر دیکھتا ہوں میں

"کب تک" ـــــ اس نظم کا ایک شعر ہے ؎

یہی خار و مغیلاں ہیں یہی گرد باد یہ گرد سی	لیے جی پائے غول آوارگی عاشق بیاباں کب تک

مگر "شنے" مصرعِ اولیٰ کی شعریت کو غارت کر دیا، یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا :-

یہی خارِ مغیلاں ہیں، یہی صحرا نوردی ہے

"ایک جانِ بہار کی سرکار میں" (ہنگامِ رخصت) عندلیب میرٹھی کی یہ نظم اختر شیرانی کی مشہور نظم کے انداز پر کہی گئی ہے اس کا یہ آخری بند خاصہ رواں ہے :-

تمہیں سوادِ وطن سے سفر مبارک ہو
جدا تو ہوتی ہو ہم سے مگر مبارک ہو
رہو جہاں بھی عروسِ بہار بن کے رہو

مگر نظم کے دوسرے ٹکڑوں میں بڑا تکلف اور آورد پائی جاتی ہے۔

بٹھا کے نقشِ گل افشانیِ تکلم سے
جلا کے خرمنِ غم شعلۂ تبسم سے

دوسرے مصرعہ میں "بناوٹ" کے سوا اور کیا رکھا ہے! مسکراہٹ کے شعلہ سے خرمنِ غم کا جلا دینا —— یہ اندازِ بیان ہی غیر شاعرانہ ہے!

مثالِ گوہرِ سفتہ کسی کی گردن میں
جگا کے طالعِ خفتہ کسی کی گردن میں
شگوفہ ہائے مسرت کا ہار بن کے رہو

اگرچہ "شگفتہ" اور "خفتہ" نے مصرعوں کی موسیقیت کو بڑھا دیا۔ مگر "جگا کے طالعِ خفتہ" یہاں کتنا بے جوڑ لگتا ہے۔

لئے ہوئے یہ سبک، سیمگوں حسیں پیکر
بہارِ باغِ جوانی کا عنبریں پیکر
جہاں میں گلبدن و گلعذار بن کے رہو

"لئے ہوئے" نے حسن کی شان میں ذم کا پہلو پیدا کر دیا، کسی پر طنز کرنی ہوتی ہے تو یوں بولتے ہیں "وہ اپنا بھاری ڈیل ڈول اور فربہ جسم لئے پھرتا ہے" —— دوسرے مصرعہ "بہارِ باغِ جوانی کا عنبریں پیکر" میں صرف الفاظ جوڑ دیئے گئے ہیں اور یہ نہیں سوچا کہ "عنبریں پیکر" میں محبوب کے جسم کی خوشبو کی تعریف کے علاوہ اُس کی رنگت پر طنز کا پہلو نکلتا ہے۔

تمہارے حُسن کی عالم میں فتح و نصرت ہو
تمہارے حسنِ جہاں سوز کی حکومت ہو
مُدام شعلۂ روئے نگار بن کے رہو!

محبوب کے لئے یہ دعا کرنا کہ تمہارے حسن کو فتح و نصرت نصیب ہو عجیب و غریب اور غیرتِ عاشقی کے منافی ہے اور پھر حسنِ محبوب کو "جہاں سوز" کہنا اس سے زیادہ لغو ہے! جو حسن تمام زمانہ کو پھونک ڈالے اور ساری دنیا کو اجاڑ کر رکھ دے، وہ "حکومت" پھر کس پر کرے گا "جہاں سوز" ایک ظالم بادشاہ کا لقب بھی ہے، جو بستیوں کو آگ لگوا دیا کرتا تھا۔

"حجاز کے نام" —— اس نظم کا پہلا شعر ہے :-

تجھے بساطِ عرب پر سحاب ہونا تھا　　کہ لالہ زارِ سخن فیضیاب ہونا تھا

مصرعِ ثانی نوآموزوں کے کہنے کا ہے!

وہ بزم جس میں نہ روح الامین کو راہ ملے — اُس انجمن میں تجھے باریاب ہونا تھا

محلِ مراد "تمہیں" "بار" کا تھا!

روا نہیں ہے متاعِ خودی ہو یوں ارزاں — بغیر مے تجھے مستِ شباب ہونا تھا
ریاضِ دہر میں رہنا تھا بن کے بادِ صبا — نہ یہ کہ اپنے لئے خود عذاب ہونا تھا

اسرار الحق مجاز ردولوی مرحوم کو عذر کیجئے اُن کی زندگی میں ایک عزیز دوست کی حیثیت سے خیرخواہانہ نصیحت کی تھی مگر وہ غریب کچھ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں رہ کر تباہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ شراب نوشی کی کثرت نے اُس کی جان لے لی (دیکھئے جریدۂ عبرت گاہ)

"خوش آمدید" —— میں ایسے اچھے شعر بھی ملتے ہیں:-

مشقِ جفائے ناز پہ خود ہو کے منفعل — عزمِ تلافیِ غمِ ہجراں کئے ہوئے
نکھرا ہوا انگوں کی طرح پیکرِ لطیف — زلفوں کے خم میں نکہتِ بستاں لئے ہوئے

مگر ان شعروں کے ساتھ اس شعر میں ۔

سرشاریوں کے جام عطا کرتا پے بہ پے — چشمِ سیاہ میکدہ ساماں لئے ہوئے

"کرتا" کے لفظ پر زبان کو جھٹکا لگتا ہے۔

"بغاوت" —— میں بڑا جلال اور جوش پایا جاتا ہے، مگر افسوس ہے کہ شاعر کو اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل سکے۔

کچل دیتی ہوں بے رحمی سے جو جدت مقابل ہو — کہ میں دیوانۂ تقلیدِ اندازِ شقاوت ہوں

دوسرا مصرعہ "آورد" کی بری سی مثال ہے۔

یہی حال، اس مصرعہ کا ہے:-

صدائے بازگشتِ جادۂ پیمائے اذیت ہوں

اور سنئے:-

نقیبِ حشر ہوں میں، برق ساماں ہے نظر میری — میں اس شورش کدہ میں قاطعِ دامانِ عشرت ہوں

"قاطعِ اسبابِ عشرت" کہئے تو مفہوم کی کسی نہ کسی حد تک ترجمانی ہو جاتی:-

تغیر کام ہے میرا ترانہ "انقلابِ دہر" — کہ میں برہم زنِ ہنگامۂ بزمِ قدامت ہوں

بغاوت کی زبان سے یوں کہلوایا جاتا کہ میرا کام تغیر ہے اور میرا نعرہ انقلاب ہے، تو کوئی تک کی بات ہوتی "انقلابِ دہر" میرا ارشاد ہے۔ اس نے شعر میں کس قدر جھول پیدا کر دیا، پھر صوتی لحاظ سے "انقلابِ دہر" زبان سے دہراتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر نے دم توڑ دیا۔

گرج ہے بادلوں کی، موج میں گردابوں کا غصہ ہوں — تڑپ ہوں شعلۂ جوالہ کی، طوفاں کی عظمت ہوں
سر اک مجبور سرافراز ہوتا ہے مرے دم سے — خزاں منظر چمن میں جلوۂ گل کی بشارت ہوں
شکست آمادہ رہتی ہے بنائے کاخِ سلطانی — علمبردارِ آزادی ہوں، یعنی میں بغاوت ہوں

کاش! پوری نظم میں یہی آہنگ قائم رہ سکتا۔
اس نظم میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے ایک طرف "بغاوت" کو پیامِ رنج و کلفت "شیرازۂ مجموعۂ ہستی کا پریشان کرنے والا تصویرِ وحشت، شرارتِ اہرمن، تباہ کار، غارت گر اور خزاں پرور کہا گیا ہے جس کا مقصد ہی تخریب و بربادی ہے دوسری طرف

اسیروں کو عطا کرتی ہوں میں نیلائے آزادی
افق پر انقلابِ نو کے جلووں کی لطافت ہوں

"ایک مسلمان خاتون سے" — اس نظم کے اس شعر:

دیارِ ظلمت و افسردگی آباد میں بن کر
فروغِ چشمۂ آبِ خضر جاتی تو اچھا تھا

میں کس قدر ناگوار قبیح تعقید پائی جاتی ہے۔

وطن کی خاتمِ زریں میں دستِ قدرت نے　　　بہت ہی خوب بٹھایا نگینۂ اردو
نثار اس کی نزاکت پر شیشہ حلبی　　　یہ جامِ جم ہے کہ ہے آبگینۂ اردو

ان مترنم و رواں شعروں کے ساتھ، اس نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

رہینِ ذوق، جمالِ حسینۂ اردو　　　پیامِ شوق و تلطف قرینۂ اردو

"رہینِ ذوق" اور "قرینۂ اردو" نے اس شعر میں خاصہ اہمال پیدا کر دیا۔

یہاں لطافتِ شبنم بھی نزہتِ گل بھی　　　رہا نہ سینۂ دشمن میں کینۂ اردو

دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا

ہے پھر بھی سینۂ دشمن میں کینۂ اردو

"ہدیۂ نمازت" کے یہ شعر! —

فضائے ہند جب تاریک تھی کفر و ضلالت سے　　　منور نامِ حق سے کر دیا وہ ذات ہے تیری

"نام" کی جگہ کوئی دوسرا لفظ لانا چاہیے تھا!

دلِ عالم حیاتِ نو تری درگاہ سے پائے　　　فرازِ شہہائے بے پایاں کا یہ اثبات ہے تیری

کس قدر "وجدان آزار تعقید"! توبہ!

سرِ منزل دیارِ عشق میں وہ سوز ہو پیدا　　　کہ آہِ دل ہو برقِ طور سرگرمِ فغاں ہو کر

"آہِ دل" کا "سرگرمِ فغاں ہونا" "آبِ نہر کا پانی" والی بات ہوتی! عندلیب صاحب کو اپنی نومشقی کے زمانہ کی نظمیں چھانٹ دینی چاہیے تھیں۔

"اصنامِ دلستاں" کے ان شعروں میں کس قدر نغمگی اور کیفیت پایا جاتا ہے: —

چند پیکر کچھ سبک سے، چند پیکر کچھ گداز　　　چند آنکھوں میں تغافل، چند نظریں دلنواز
چند بالا قد نمونے قامتِ شمشاد کے　　　چند قاتل رُخ مُرقعے مانی و بہزاد کے
کفر ساماں بت کدوں کے نو تراشیدہ صنم　　　کچھ کلیساؤں کے آہو، کچھ غزالانِ حرم

اُس کے خال و خد جمالِ ماہِ کنعانی لئے — اُس کے چہرہ کی نزاکت حسنِ یونانی لئے
دیدۂ میگوں علاجِ تلخیٔ دوراں لئے — شوق کی نازک حکایت جنبشِ مژگاں لئے

مگر ان شعروں کے ساتھ ایسے شعر بھی پڑھنے پڑے :۔

نبضِ خار و خس میں رقصاں زندگانی کے شرار — ذرہ ذرہ سے نکلتے کامرانی کے شرار

"کامرانی کے شرار" —— یہ کیا بات ہوئی؟

؎ چند چہروں پر تبسم، چند رُخ پر تمکنت

"چند چہروں" کے ساتھ "چند رُخ" (بصورتِ واحد) اس مصرعہ میں کتنا اکھڑا اکھڑا لگتا ہے ۔

اس میں سلمیٰ کی لطافت، اس میں عذرا کا نکھار — اس میں پدما کی صباحت، اُس میں سیتا کا نکھار

"عذرا کا نکھار" کے بعد "سیتا کا نکھار" کی تکرار نے شعریت کو مجروح کر دیا ۔

مست آنکھوں میں پرافشاں دلستانی کا سرور — لغزشِ پا میں نمایاں کامرانی کا سرور

اس طرح لفظوں کے جوڑ دینے سے کیا فائدہ ؟

نگاہِ قہر ساماں جس کی تمہیدِ ستم رانی — جبیں پرشکن آمادۂ خونِ وفاداری
ہولئے تند جولانِ خزاں تارِ نفس جس کا — زبانِ شعلہ پرور جس کی خرمنِ سوزِ دلداری

"خونِ وفاداری" —— "خرمن سوزِ دل داری" میں کس قدر غرابت پائی جاتی ہے ، دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ سراپا آمد ہے

"مطربہ" سے شاعر خطاب کرتا ہے :۔

مطربہ! جب ساز پر زخمہ لگا دیتی ہے تو — کل فضا میں سیلِ موسیقی بہا دیتی ہے تو

"کل" اور "سیل" مصرعِ ثانی میں خاصے کھٹکتے ہیں ۔

بام و در پر دوڑتا ہے ایک کیفِ بیخودی — خرمنِ ادراک پر بجلی گرا دیتی ہے تو

بام و در پر کیفِ بیخودی کا دوڑنا ، کوئی مانوس اور دل پسند اندازِ بیان نہیں ہے —— دوسرے مصرعہ میں "خرمنِ ادراک" بے جوڑ سا لگتا ہے "خرمنِ ہوش" کہتے تو ایک بات تھی !

"قیامِ پاکستان" —— اس نظم کا یہ شعر بہت خوب ہے ۔

چھڑا نہیں ہے ابھی سازِ نغمہ ریز دل — کہ ارتعاش دلِ اہرمن میں ہے پیدا

مگر

قرینِ نزع کی ہے نبض میں پیامِ حیات — شمیمِ غنچۂ ہستی کفن میں ہے پیدا
بغیر جس کے تڑپتی تھی چشمِ کور ابتک — نوید ہو کہ وہ بوئے پیرہن میں ہے پیدا

یہ دونوں شعر کس قدر بے مزہ ہیں! "چشم" اور وہ بھی "کور" تڑپا بھی کرتی ہے ، یا للعجب !!

"زندگی" کے ان شعروں میں :۔

بزم کو ساقی ملا، شیشہ کو صہبا مل گئی — قیس کو صحرا ملا ، محمل کو لیلا مل گئی
شمع روشن کی جگہ کے شعلۂ مستور نے — تابناکی صبح کی پائی شبِ دیجور نے

مرحبا! پہنچی زلیخا کے حریم ناز تک　　حسنِ کنعانی کی تابش مصر کے بازار سے

روانی پائی جاتی ہے۔

اسی نظم میں یہ شعر بھی نظر آئے:-

طاقِ عشرت میں جلا کر شمعِ روحِ سرخوشی　　انقطاعِ رشتۂ شامِ غمِ ہجراں کیا

"شمعِ روحِ سرخوشی" اور "انقطاعِ رشتۂ شامِ غمِ ہجراں" کس قدر نامانوس ترکیبیں ہیں۔

پتیوں کو مستیاں دے کر گلوں کو سرخیاں　　ہر کلی کو رشکِ رخسار و لبِ خوباں کیا

"پتیوں" سے "مستیوں" کی نسبت کس قدر غریب ہے، مستیوں کی جگہ "نازکی" کہتے تو بات بن جاتی۔

خارزارِ غم ہوا لذت کشِ خوابِ نشاط　　چھائی وہ مستی چمن پر نرگسِ بیمار سے

خارزارِ غم کا لذت کشِ خوابِ نشاط ہونا ہی عجیب تھا کہ دوسرے مصرع میں "نرگسِ بیمار سے" مستی کا چھا جانا عجیب تر نکلا۔

پا رہی ہے پرورش صبحِ ازل سے آج تک　　خاطرِ بے مائگی میں تاجِ زر کی آرزو

آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے! غالباً یہ کہ غریب اور نادار لوگ ازل کے دن سے آج تک صاحبِ سیم و زر بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں! لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ شاعر کو نہ مل سکے! "خاطر" اور "تاجِ زر" نے شعر کو عجوبہ سا بنا دیا۔

مضطرب رکھتی ہو مانندِ صبا شام و سحر　　دیدۂ بے نور کو چشم و نظر کی آرزو

"چشم" لانے کا یہاں کیا محل تھا۔

صحنِ چمن میں ابر کو دے رخصتِ خرام　　پژمردگیٔ سنبل و ریحاں کا واسطہ
غنچوں کو پھر عطا ہو نویدِ شگفتگی　　آب و ہوائے ارضِ خیاباں کا واسطہ

ان اچھے شعروں کے ساتھ اس شعر کا کیا جوڑ:-

پائے طلب کو بڑھنے دے سوئے درِ طرب　　افسردگیٔ خاطرِ ویراں کا واسطہ

مصرع اولیٰ کس قدر بے لطف ہے!

"دریوزۂ نظر" کا یہ شعر کتنا اچھا ہے۔

نہ پوچھ ہجر کی راتیں گزرتی ہیں کیونکر　　فغانِ نیم شبی پر مدار رہتا ہے

"یاد کر وہ دن" کے چند شعر:-

یاد کر وہ دن کہ برنائی خیال و خواب تھی　　حسن کے اوصاف تجھ میں دلبری نایاب تھی

"برنائی" تو جوانی کو کہتے ہیں۔ پھر وہ "خیال و خواب" کیوں تھی! شاید اس تنقید پر یہ کہا جائے کہ محبوب کی جوانی سے پہلے کے زمانہ کا شاعر ذکر کر رہا ہے ــــ اچھا! مانے لیتے ہیں! لیکن اس کے بعد بھی "جوانی کے خیال و خواب" ہونے کی کیا توجیہہ کی جائے گی۔

غنچۂ باغِ وقار! اے گہرِ موجِ حشم　　دیکھتا ہے مجھے کیا! اپنا یہ انداز تو دیکھ

حنذ لیب صاحب جہاں فارسی کی مانوس ترکیبیں وضع فرماتے ہیں، وہاں "غنچۂ باغِ وقار" اور "گہرِ موجِ حشم" جیسی ناپسندیدہ ترکیبیں شعر میں لاکر اپنے شاعرانہ ذوق کو عیب دار بناتے ہیں۔

خاکِ میرٹھ! اے سکونِ زار سراپا! الوداع
اے شبستانِ طرب! اے شہرِ زیبا الوداع

"سکونِ زار سراپا" مہمل ترکیب ہے۔

کوئی طوفاں شمعِ اُلفت کو بجھا سکتا نہیں
تیرے سودائے محبت کو مٹا سکتا نہیں

مصرعِ ثانی کس قدر سطحی اور بے لطف ہے!

ہے اجل گر پاسباں تو آبِ حیواں کیا رہا!
اب ترے آغوش میں جینے کا ساماں کیا رہا!

مصرعِ ثانی جس قدر چُست ہے، مصرعِ اولیٰ اسی قدر سُست ہے!

سعیِ لاحاصل علاجِ زخمِ صمصامِ فراق
ماسوائے ہجر کیا درمانِ آلامِ فراق

یہ شاعری نہیں "ساعری" ہے! شاعر لفظوں کے پتھر ڈھونے لگے، تو اُسے کیا کیا جائے!!

مرکزِ اہلِ ادب! اے بزمِ ساغر الفراق
الفراق! اے مجلسِ رنگین قیصر الفراق

شہر میرٹھ کو "بزمِ ساغر" سے تشبیہ دینا بے تکی سی بات ہے! یہ نظم عندلیب صاحب نے ۱۹۴۷ء میں کہی ہے، جب وہ اپنے محبوب وطن —— میرٹھ —— سے رُخصت ہو رہے تھے! اور ساغر نظامی تقسیمِ ہند سے کئی سال پہلے میرٹھ چھوڑ چکے تھے!

"چراغِ راہ گزر" رومان آفریں نظم ہے۔

وہ ابروئے خمیدہ کہ تیغیں کھنچی ہوئیں
وہ چشمِ فتنہ خیز کہ جادو اثر کہوں

ہونٹوں کی اُف! اداے تبسم نوازو
بیجا نہیں جو مرہمِ زخمِ جگر کہوں

اسی نظم کا ایک شعر یہ بھی ہے:—

وہ زلفِ مشک فام، وہ رُخسارِ سیمگوں
اجماعِ ظلمتِ شب و نورِ سحر کہوں

اس "اجماع" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے!؟—!؟

"ترانۂ تخریب" —— کا یہ مصرعہ جو شیب کا مصرعہ ہے:—

اک سیلِ کرم ہو جائے گا غم پرور یہ ادغام مرا

مُبہم نہیں مہمل ہے۔

اے کہ روشن تجھ سے ہے میرا چراغِ آرزو
بادۂ اُلفت سے تیری ہے ایاغِ آرزو

"بادہ" اور "ایاغ" دونوں مذکر ہیں، "تیری" کا پھر یہاں کیا محل تھا!

اک گدا ہوگا مگر تیرا شریکِ زندگی
کرو بیٹھ لیتی ہے جس کے دل میں غم کی راگنی

اس نظم میں "ہونے والی بیوی" سے مخاطبت ہے! اس شعر میں "گدا" لانے کی تُک سمجھ میں نہیں آتی، دوسرا مصرعہ نرا بچکانہ ہے۔

بھاگتا ہے جو کمندِ دیوعیاری سے دُور
آشیانہ جس کا ہے دشتِ ریاکاری سے دُور

یہ بھلا کونسی شاعری ہے؟!

قائداعظم مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر ایک مرثیہ ہے، جس کا سب سے اچھا شعر یہ ہے:—

جستجو چشمۂ بقا کی ہے مگر
شبِ ظلمت ہے اور خضر نہ رہا

یوں تو ہوں گے بہت دُر لیکن گوہرِ بے بہا عدن میں نہیں

دُر کی عربی جمع "دُرَر" اس اُردو شعر میں وجدان کو "روڑے" کی مانند سخت و گراں محسوس ہوتی ہے۔

جو ادا اُس کی فہم و فکر میں تھی جوشِ محمود بت شکن میں نہیں

"فہم و فکر" میں بھی "ادا" ہوتی ہے ۔ کوئی کہے تو کیا کہیے! پھر مسٹر محمد جناح مرحوم اور محمود غزنوی کا تقابل، طُرفہ تماشا!!

شوقِ منزل رسیدنی کا جواب جذبہ قیس و کوہکن میں نہیں

واقعی اس "شوقِ منزل رسیدنی" کا کوئی جواب نہیں!

حاملِ نغمۂ دلائل تھا قیصری کے کا وہ رباب نہ تھا

لوگ ایسے مصرعے جوڑ کر شاعری کی توہین کرتے ہیں۔

"ماتمِ اقبال" کا پہلا شعر ہی سراپا اہمال ہے ۔

دہر نے پی وہ مئے دیرینۂ افسردگی ذرہ ذرہ بن گیا آئینۂ افسردگی

جناب عندلیب میرٹھی نے اپنی اس کتاب پر جو فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے، اُسے پڑھ کر توقع قائم ہوئی کہ اُن کی شاعری بھی اُن کی نثر کی طرح شگفتہ اور سادہ و پرکار ہوگی مگر افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ اس توقع اور خوش فہمی کو جگہ جگہ سخت دھچکے برداشت کرنے پڑے

—*—

خوبی
پر نظر
کیجئے
قیمت پر نہیں
کے ٹو
اعلیٰ قدر و قیمت کا نشان ہے
کم خرچ بالا نشین کی
بہترین مثال
K-2
CIGARETTES
S
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
P.T-30/N29

فاران کراچی

جلد ۱۴

شمارہ ۷

ایڈیٹر
ماہر القادری

ماہِ اکتوبر ۶۲ء

چندہ سالانہ
سات روپے

فی پرچہ
باسٹھ پیسے

ترتیب

مقام اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

پرنٹر و پبلشر :- مسرور حسین

مطبوعہ مطبع سعودی کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

حق کا پہلا تقاضا اور اولین شرط اُس کا لوگوں تک پہونچا دینا ہے، اور حق کا یہی اعلان اُس کی پہلی کامیابی ہے، حالات چاہے کتنے ہی ناسامد اور ماحول کتنا ہی اجنبی اور ناموافق کیوں نہ ہو، حق کا اعلان اور اس کی تبلیغ بہرحال ہوتی رہنی چاہئے! کلمۂ حق نے کیا تاثیر دکھائی، اُسے کتنے دلوں نے قبول کیا، اس جد و جہد کے کیا نتائج برآمد ہوتے! اس کا تمام تر تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، کہ دلوں کو بدلنا اور ہدایت دینا اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، انبیاء کرام مُبلغ، مبشّر اور منذر تھے مگر "مقلب القلوب" نہ تھے، دلوں کا پھیر دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، قرآنِ کریم میں اس حقیقت کو بار بار دُہرایا گیا ہے!

"فاران" کے گزشتہ شمارے میں عید میلاد النبی کے جلوس کو عنوان بناکر اور موضوع گزارش قرار دے کر ہم نے جو اداریہ لکھا تھا، اُس کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پسند کیا گیا۔ متعدد اخباروں اور رسالوں نے اُسے نمایاں طور پر نقل کیا، اور اس کے بارے میں اچھی رائیں سُننے میں آئیں!

اس حقیقت پر کسی دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے کہ "توحید" ہی اصل دین ہے، یہ اگر خدانخواستہ مجروح اور غبار آلود ہوگئی تو پھر نہ ایمان کی خیر ہے اور نہ اسلام کی! قرآنِ پاک میں شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے! یعنی یہ کہ انسانیت کے لئے سب سے بڑی آفت، مُصیبت بلکہ لعنت "شرک" ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر گناہ کی بخشش اور معافی ہے مگر "شرک" وہ ظلمِ عظیم ہے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دروازہ بند کردیا گیا ہے، ایک زانی، چور، جوارى، شرابی، چور اور ڈاکو کو اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت سے حصہ مل سکتا ہے، مگر ایک مُشرک کے لئے اس باب میں کاتبِ ازل نے حرمان و ناامیدی لکھدی ہے۔

کوئی شک نہیں بدعتی عُلماء کی بازاری تقریروں اور گلے بازیوں نے عوام مسلمانوں کے عقائد کو خاصہ متاثر کردیا ہے، وہ بیچارے اپنی لاعلمی اور بے خبری کے سبب یہی سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں پڑھ کر جو شرح کی جا رہی ہے اور جو کچھ بیان ہو رہا ہے یہ غلط اور ناحق کاہے کو ہونے لگا، اُسے حق ہی ہونا چاہئے! اس مزاج اور عقائد کے علماء سیرۃ النبی کے جلسوں میں سیرت پر تو برائے نام بولتے ہیں، وہ زیادہ تر اپنے اُن عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں جن میں شرک و بدعت کی آمیزش ہوتی ہے، وہ قرآنِ کریم کی آیت پڑھ کر اُس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور آفتاب و ماہتاب کو انسان کے لئے مسخر کردیا ہے اور اس آیت سے یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء کو کائنات کی تسخیر اور اُس میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے! اس توجیہ اور تاویل کے بعد یہ حضرات انبیاء اور اولیاء سے رزق و اولاد دینے، مشکلات دور کرنے، علمِ غیب اور دلوں کے حالات جاننے کی تمام الوہی صفات منسوب کردیتے ہیں، اور پھر گلے کی رگیں پھلا پھلا چیلنج کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بزرگانِ دین کو جو مراتب و مناصب اور اختیار و اقتدار دیئے ہیں، اُن کو جو کوئی نہیں مانتا وہ ان بزرگوں کی تنقیص کرتا اور اُن کی شان کو گھٹاتا ہے، اور ایسی جاہلانہ اور بے سر و پا باتیں بیان کرنے کے بعد یہ لوگ اُن

اکابر دین کو نام لے لے کر گمراہ اور بے دین بتاتے ہیں جو توحید خالص کے داعی اور سنت رسول کو قائم کرنے والے تھے، اور جن کی زندگیاں کتاب و سنت کے اتباع میں بسر ہوئی ہیں۔ اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نرے عقیدت مند ہی نہیں بلکہ حضور کے فرمانبردار اور اطاعت گزار بھی تھے، اور جن کا مشن اور مقصد زندگی یہی تھا کہ کتاب اللہ، سنت رسول اور آثار صحابہ کو دنیا میں قیام و نفاذ میسر اور غلبہ و فروغ حاصل ہو۔

آیات قرآنی کی اہل بدعت جس انداز پر شرح و تفسیر کرتے ہیں، اس کا ایک نمونہ آپ نے دیکھ لیا۔ اپنے مزعومہ معتقدات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ان لوگوں کا یہی سلوک احادیث نبوی کے ساتھ ہے، مثلاً یہ حدیث کہ حضور کہیں سے گزر رہے تھے، دو قبروں پر حضور نے ہری شاخیں گاڑ دیں اور فرمایا کہ ان قبروں پر عذاب ہو رہا ہے، یہ شاخیں جب تک ہری رہیں گی، اہل قبر کے لئے دعائے مغفرت کرتی رہیں گی، اس حدیث سے قبروں پر پھول چڑھانے کے لئے دلیل لائی جاتی ہے، حالانکہ اس حدیث کا قبروں پر پھول چڑھانے کی رسم اور واقعہ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن قبروں پر پھول نہیں چڑھائے تھے بلکہ ہری شاخیں نصب کی تھیں، پھر شاخوں کے گاڑنے میں قبروں کا یا اُن اہل قبور کی عقیدت و احترام کا جذبہ شامل نہیں تھا بلکہ تخفیف عذاب کے لئے حضور نے ایسا کیا تھا! قبروں پر جو لوگ پھول چڑھاتے ہیں وہ تخفیف عذاب کی نیت سے نہیں بلکہ احترام و عقیدت کی نیت اور جذبہ کے ساتھ چڑھاتے ہیں! اور اس کے لئے حدیث اور صحابہ کے قول و عمل میں کوئی دلیل نہیں ملتی۔

یہ تو اہل بدعت کا کتاب و سنت کے ساتھ سلوک ہے، عام عقلی دلائل کا یہ حال ہے —— بھرے جلسہ میں فرماتے ہیں۔
بھائیو! ہم سب اس جلسہ میں موجود ہیں، یعنی حاضر ہیں، بولو جواب دو، جلسہ سے آوازیں آتی ہیں، بے شک ہم "حاضر ہیں"
اس کے بعد واعظ صاحب کا ارشاد ہوتا ہے، ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی رہے ہیں، یعنی ناظر ہیں —— جلسہ کے حاضرین کہتے ہیں ہاں! "ناظر ہیں! اس پر تخت و منبر سے چیخنے کی آواز آتی ہے، غیظ و غضب کے عالم میں! ارے دیکھا، جب ہم رسول اللہ کے غلام اور امتی "حاضر و ناظر" ہیں، تو کیا ہمارے آقا اللہ کے محبوب اور کونین کے شہنشاہ "حاضر و ناظر" نہ ہونگے اُن کو "حاضر و ناظر" جو نہیں جانتا وہ ملعون اور بے دین ہے! اور سننے والے اس شرکانہ نکتہ آفرینی پر سبحان اللہ! اور صلِ علیٰ کے نعرے بلند کرتے ہیں کہ وہابیوں اور دیوبندیوں کا کیسا منہ توڑ جواب دیا ہے ہمارے شیر نے!

ایک اور نکتہ —— دو چار شعر خوش الحانی کے ساتھ سنانے کے بعد ارشاد ہوا۔ ریڈیو کا اگر جو لوہے کا بنا ہوتا ہے۔ وہ ساری دنیا کو خبریں پہونچاتا اور جہان بھر کی خبریں حاصل کرتا ہے، جب لوہے میں اتنی طاقت ہے، تو بزرگان دین جو ہر حال میں لوہے سے افضل ہیں اور سراپا روحانیت ہیں کیا دنیا جہان کی خبریں معلوم نہیں کر سکتے بے شک کر سکتے ہیں، ساری دنیا کے حالات اُن پر روشن ہیں۔ (نعرۂ تکبیر —— اللہ اکبر —— نعرۂ رسالت —— یا رسول اللہ —— فضا میں گونج پیدا ہوتی، اور حاضرین ایک دوسرے کو اس فاتحانہ انداز میں دیکھنے لگے کہ وہابیت اور دیوبندیت کا قلعہ ہم نے توڑا جاتا ہے، اور عاشقان رسول ان بے ادب وہابڑوں پر اس انداز میں فتح اور غلبہ حاصل کرتے ہیں)

ماہ قبل کی ایک مجلس میں ایک مجتہد صاحب نے فرمایا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں، اُن کی شہادت کا فیض نانا کو بھلا کس طرح پہونچ سکتا ہے —— ہم کہتے ہیں بے شک پہونچ سکتا ہے، سنئے! اور توجہ سے سنئے۔ آپکے بیٹا، پوتا، یا نواسہ پیدا ہوتا ہے، عزیز رشتہ دار اُسے دیکھتے اور گود میں لیتے ہیں،

اسکے کچھ روپیہ دیتے ہیں، توکیا اس روپیہ کا فیض آپ کو نہیں پہونچتا، دیکھا آپنے آپ کا وہ بیٹا پوتا یا نواسہ اس فیض اور فائدہ کا سبب قرار پایا (نعرۂ صلوات ----)

اہل بدعت کا بالکل یہی مزاج ہے اور شرک و بدعت کی رسموں اور عقیدوں کے معاملے میں یہ دونوں گروہ بڑی مماثلت رکھتے ہیں اور کتاب و سنت سے اور عقل عمومی سے اسی قسم کی پوچ دلیلیں لاتے اور مضحکہ خیز نکتے تراشتے ہیں۔

اس قسم کے لغو مواعظ اور بے سرو پا تقریروں نے عوام کے عقائد و معتقدات میں فساد پیدا کر رکھا ہے اور شرک و بدعت کی رسمیں اور طور طریق مسلمانوں میں پھیلتے اور مقبول ہوتے چلے جا رہے ہیں! ان حالات میں توحید شناس علماء کا فرض ہے کہ وہ کسی خوف اور ہچکچاہٹ کے بغیر زبان و قلم سے شرک و بدعت پر نکیر کریں اور عوام کے سامنے توحید خالص کو پیش فرمائیں سیرت کے جلسوں میں خاص طور سے شرک و بدعت کے مفاسد اور توحید کے تقاضوں کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

عوام سے!

عوام کے سامنے حکمت و نرمی کے ساتھ دل نشین انداز میں اگر توحید خالص کو پیش کیا جائے، تو اُس کے خاطر خواہ مُفید نتائج برآمد ہوں گے! جس طرح بدعتی علماء نے ان بیچاروں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی ہے کہ فلاں فلاں رسموں کے ادا کرنے سے اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں اگر اُن کے دلوں میں اس حقیقت کو اُتار دیا جائے کہ شرک و بدعت کے ان عقائد اور کھیل تماشوں سے اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی نہیں بلکہ ناراضگی میسر آتی ہے تو پھر یہ لوگ تاریکی میں رہنا پسند نہیں کریں گے، ان کے معتقدات و اعمال میں دینی انقلاب برپا ہو کر رہے گا۔

انہیں بتایا جائے کہ انسان مخلوقات میں سب سے زیادہ افضل و اشرف اور اللہ تعالیٰ کا اس زمین پر نائب ہے! مگر اس تمام شرف و فضل کے باوجود چیل کوؤں کی طرح آدمی ہوا میں اُڑ نہیں سکتا اور مچھلیوں کی مانند پانی میں زندگی بسر نہیں کر سکتا ہرن اور چیتے اُس سے زیادہ تیز دوڑتے ہیں اور شیر اور ہاتھی اُس سے کہیں زیادہ جسمانی طاقت رکھتے ہیں! جانوروں کے مقابلہ میں ان طاقتوں میں کم ہونے کے باوجود "انسان اشرف المخلوقات ہے" کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے شعور و عقل کی دولت سے نوازا ہے اور اسی عقل کی بدولت وہ ہاتھیوں اور شیروں سے سرکس میں غلاموں کی طرح کام لیتا اور طرح طرح کے کرتب دکھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کا وظیفۂ حیات مقرر کر دیا ہے، جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتی ہے، اور ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے خاص صفات اور قابلیتیں عطا فرمائی ہیں مثلاً لوہے کے ستون پر ہتھوڑے کی ضرب کا کوئی اثر نہیں ہوتا مگر کسی آدمی کے بدن پر تو ہتھوڑا مار کر دیکھئے، وہ چیخنے لگے گا اور اس کے جسم کے نہ جانے کس عضو کو کس قدر صدمہ پہونچے گا، تو لوہے کے مقابلہ میں انسان کے جسم کا کم سخت اور نرم ہونا، انسان کے لئے کوئی نقص کی بات نہیں ہے، غم و اندوہ کے تحمل میں وہ اس قدر سخت و توانا واقع ہوا ہے، کہ اگر سنگ و فولاد کو انسان کے غم و الم کا سامنا کرنا پڑے، تو وہ چُور چُور ہو جائیں۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

قرآن کریم کہتا ہے:-

فَقَالَ اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ (النمل)

کہا میں لے آیا ایک خبر جس کی تجھ کو خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے خبر لے کر۔

یہ ہدہد پرندہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہہ رہا ہے، کہ میں ملک سبا کی جو خبر لے کر آیا ہوں اس کی آپ کو خبر نہیں ہے ———— تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملک سبا کے حالات کا نہ جاننا ان کے لئے کسی نقص کا سبب نہیں ہے، اور وہ اس سے کہ دنیا جہان کے تمام حالات کی خبر رکھنا، یہ نبی اور رسول کی نہ صفت ہے نہ فریضہ ہے اور نہ اس کام کے لئے ان کو مبعوث کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ انبیائے کرام کے فرائض و مناصب کا ذکر ہے کہ وہ کن فرائض کو بجالانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کئے گئے تھے، نبی آخر سید الاولین والآخرین سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں قرآن کریم بتاتا ہے :————

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ۔

وہی ہے جس نے امیوں میں خود انہی میں ایک رسول کو مبعوث کیا جو ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ ہیں وہ فرائض جن کے انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی آخر کو مبعوث فرمایا تھا۔ پورے قرآن میں کہیں بھی حضور کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ آپ لوگوں کو رزق اور اولاد دینے کے لئے مامور کئے گئے ہیں، یا دنیا میں جہاں کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے اور وہ آپ کو پکارتا ہے تو حضور اس کی پکار سن کر اس کی مصیبت کو دور کر دیتے ہیں یا تمام کائنات آپ پر اس طرح روشن ہے کہ کوئی ذرہ بھی آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

رزق دینا، اولاد عطا کرنا، زمین و آسمان کے کارخانے اور نظام کو سنبھالنا، غیب و شہادت کا علم، ہر کسی کی فریاد کو سننا اور ہر پکارنے والے کی مصیبت کو دور کرنا یہ نبی کا نہیں اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ مارنے والا اور جلانے والا اور ساری دنیا کی خبر گیری رکھنے والا اور انہیں پالنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ وہ "رب العالمین" ہے۔ دنیا کا پالنا پوسنا، رزق اور اولاد دینا، ہر کسی کی بیماری کو اچھا کرنا، سب کی فریاد کو پہونچنا یہ "نبوت" کی نہیں "ربوبیت" کی صفت ہے!

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے :—

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ

بھلا کون پہونچتا ہے بیکس کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے اور دور کر دیتا ہے مصیبت کو

یہ صفت کہ دنیا میں جہاں بھی پکارا جائے اور ایک وقت میں کروڑوں نفوس اللہ تعالیٰ کو پکاریں تو وہ سب کی فریاد اور پکار کو سن کر ان کی مصیبتوں کو دور فرما دے یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے

قرآن کریم بتاتا ہے کہ انبیاء کرام کو پریشانیاں بھی لاحق ہوتی تھیں اور ان نفوس قدسیہ نے اس عالم میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات غم، پریشانی، اضطرار اور مصیبت سے پاک اور منزہ ہے، اس لئے تمام جہان کی پریشانیوں کو وہی دور کر سکتا ہے وہ بندے جن کو غم اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں (اور ان میں نبی رسول اور ولی بھی شامل ہیں) ان سے نہ یہ فریضہ متعلق ہے اور نہ اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ سارے جہان کی پکار کو سن سکیں اور اس کی فریاد کو پہنچ سکیں۔

———— قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے کہلوایا گیا ہے۔

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ

کہہ میں مالک نہیں ہوں اپنے واسطے برے کا نہ بھلے کا مگر جو اللہ چاہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندوں تک اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچاتے تھے اور ان کو ہدایت و نجات کے طریقے بتاتے تھے مگر ہدایت کا دینا یہ آپ کے ہاتھ میں نہ تھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

تو راہ پر نہیں لاتا (یعنی ہدایت نہیں دے سکتا) جس کو تو چاہے، مگر اللہ راہ پر لاتا ہے جس کو وہ چاہے، اور وہی (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کون راہ پر آئیں گے !

ہدایت دینے پر قدرت نہ رکھنا اور نفع و نقصان کا مالک نہ ہونا اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ تو شان گھٹتی ہے اور نہ حضور کی تنقیص ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ صفات اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہیں۔

صحابہ کرام بے شک حضور کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور آپ سے درخواست کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہمارے لئے دعا کیجئے، مگر تاریخ و سیر اور تفسیر و حدیث میں ایک واقعہ بھی اس قسم کا نہیں ملتا کہ انھوں نے دور دراز کے مقاموں میں رہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدد یا دعا کرنے کے لئے پکارا ہو

انبیاء کرام کے حالات اور قرآن کریم اس کی تعلیم دیتے ہیں کہ مخلوق اور بندہ چاہے وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو احتیاج رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے! احتیاج سے قطعاً منزہ اور "صمد و غنی" ہونا یہ بندہ کی نہیں اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حضور "عبد کامل" تھے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور نے جس قدر بندگی اور عجز و تذلل کا اظہار اور اعتراف کیا ہے۔ کائنات میں اور کسی مخلوق نے نہیں کیا۔

نہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا کہ لوگ مصائب اور پریشانیوں میں رسول اللہ کو پکاریں اور اس عقیدے کے ساتھ پکاریں کہ حضور ہر جگہ سے بلند کی ہوئی آواز اور پکار کو سن لیتے ہیں اور پکار سن کر لوگوں کی مصیبتیں دور فرما دیا کرتے ہیں! یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے وہ دور و نزدیک کی ہر آواز کو سنتا، سب کے دلوں کے حالوں کو جانتا کائنات کے ایک ذرہ ذرہ پر نگاہ رکھتا اور سب کی حاجت روائی اور مشکل کشائی فرماتا ہے

ـــــــ نوجوئی ـــــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دہائی دینا، اور حضور کو "سمیع و بصیر" "عالم الغیب والشہادہ" اور دنیا کا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں اس کے بندے کو شریک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت میں کسی بندے کو چاہے وہ نبی و رسول ہی کیوں نہ ہو، شریک اور ساتھی بنانے کا فعل اللہ اور رسول کے نزدیک صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ "ظلم عظیم" ہے جس طرح قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے جاہل امتیوں اور گمراہ عقیدت مندوں سے بیزاری کا اظہار فرمائیں گے کہ بار الہا! میں نے تو ان کے سامنے اپنے کو تیرے بندے اور رسول کی حیثیت سے پیش کیا تھا، ان کم بختوں نے مجھے "ابن اللہ" اور نہ جانے کیا کیا بنا ڈالا! اسی طرح حضور نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے ان ضلالت سرشت مدعیان عشق و محبت سے نفرت و بیزاری کا اظہار فرمائیں گے کہ انہوں نے میری شان میں جو مبالغہ کیا اور مجھ سے الوہی صفات منسوب کیں۔ ان کی میں نے ان کو ہرگز ہرگز تعلیم نہیں دی تھی۔

عوام کے دلمیں یہی بات اتار دینے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ بدعت و شرک کے عقائد اور اس قسم کی تمام رسمیں اللہ اور رسول کو خوش کرنے کی بجائے انھیں بیزار کرنے والی ہیں!

آج قبروں پر بزرگان دین کی محبت و عقیدت کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی کوئی سند کتاب و سنت، آثار صحابہ، اور

حدیث و فقہ کی کتب کے قول و عمل سے نہیں ملتی، یہ سب بعد کے لوگوں کی نکالی ہوئی رسمیں ہیں، جو بُت پرستوں سے لی گئی ہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ٹوک لفظوں میں واضح طور پر قبروں کو پختہ بنانے، ان پر چراغ جلانے اور میلے لگانے سے منع فرمایا ہے، جو کوئی اس قسم کی رسموں میں مبتلا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ صریح کی مخالفت کرتا ہے" اور حضورؐ کی مخالفت کر کے، کوئی شخص دین و دنیا میں فلاح نہیں پا سکتا۔

عوام میں اس انداز پر وعظ و تقریر کرنے کی ضرورت ہے کہ دو گروہ ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ خیر و شر، گناہ و ثواب اور نیک و بد کا معیار کتاب و سُنّت ہیں، جو رسم، قول اور عمل کتاب و سُنّت کے مطابق ہے، وہ درست ہے، اور جو کتاب و سنّت کے معیار پر پورا نہیں اُترتا، وہ رد کر دینے کے قابل ہے! ہم تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے تابع فرمان ہیں!

اس جماعت کے مقابلہ میں دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تم اُن رسموں کو دین سمجھو، جو فلاں بزرگ اور فلاں بادشاہ کی نکالی ہوئی ہیں! اس گروہ کے علماء ان رسموں اور عقیدوں کو درست ثابت کرنے کے لئے کتاب و سُنّت سے ان کا جوڑ ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ جوڑ کسی طرح نہیں ملتا، بلکہ ایسا کرنے میں کتاب و سنّت کی معنوی تحریف کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں ——— ایک معمولی عقل والا انسان بھی دونوں گروہوں کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس کا موقف درست اور کس کا مسلک حق ہے! خواہ کے جو نیک بندے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، وہ حق پر ہیں، یا وہ گروہ جو اللہ اور رسولؐ کو چھوڑ کر دوسرے افراد کی طرف اُمت کو بلاتا ہے!

اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ درخت جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں صحابہ سے بیعت لی تھی، اس درخت کے ارد گرد لوگ جمع ہونے لگے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ رفتہ رفتہ کہیں یہ درخت نشانِ عبادت نہ بن جائے اس لئے آپ نے اس درخت کو کٹوا دیا! یہ ہے وہ توحید شناس مزاج اور مذاقِ توحید، جو صحابۂ کرام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت و تربیت اور حضورؐ کی تعلیم سے پیدا ہوا تھا

نصاریٰ اور یہودیوں نے اپنے نبیوں کی شان میں انتہائی غلو سے کام لیا، اور ان کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا، ان اُمتوں کی گمراہیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر تھیں، اسی لئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

لَا تُطْرُوْنِیْ — مجھے میری حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ

اور

انی لا اُرِیدُ ان ترفعونی فوق منزلتی

بے شک میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے رُتبے سے زیادہ بڑھاؤ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حد سے بڑھانا یہی ہے کہ حضورؐ سے الوہی صفات منسوب کئے جائیں! اور "ذاتی اور عطا" کی آڑ لے کر خدا کی صفات حضورؐ سے متصف کر دی جائیں! وہ شخص رسول اللہؐ کا عاشق نہیں بلکہ آپ کا نافرمان ہے جو حضورؐ کے مرتبہ میں اتنا غلو کرتا ہے کہ شانِ رسالت، شانِ ربوبیت سے جا کر مل جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس کی شاہد ہے کہ حضورؐ نے بندوں کی بجائے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کی طرف لوگوں کو دعوت دی، اور اپنے ہر قول و فعل سے بندے اور اللہ کے درمیان فرقِ مراتب کو باقی رکھا۔ آپ رحمۃ اللعالمین

ہیں، سراج منیر ہیں، افضل البشر ہیں، شافع محشر اور ساقی کوثر ہیں، انسان کامل ہیں، سید الاولین والآخرین ہیں، خاتم النبیین ہیں، انسانوں کے لئے کامل ترین نمونہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے محبوب انسانیت کے مقصود اور مطلوب ہیں مگر بشر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے "بندے" ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں شریک نہیں ہیں اور بندے ہونے کی حیثیت سے، جس طرح آپ اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگتے اور اپنا دکھ درد پیش کرتے تھے، ایسا کرنے کی ہمیں بھی تعلیم دی گئی ہے حضور نے یہ نہیں فرمایا نہ اس کی تعلیم دی، نہ اس بارے میں کوئی اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مختار کل بنا دیا ہے اور لوگ مجھے پکاریں، مجھ سے امداد چاہیں! اور مجھے حاجت روا اور مشکل کشا سمجھیں۔

پس جو کوئی ایسا کام کرتا ہے اور اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا وہ حضورؐ کا نافرمان ہے، حضورؐ کا ارشاد ہے:۔

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ امرنا فهو ردٌّ

(جس نے کوئی کام کیا اور اُس کام کے کرنے کا میرا حکم نہیں ہے، وہ مردود ہے)

قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" کو کس قدر واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ!

اے نبی! تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے معاف کر دینے کی درخواست کروگے، تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔

قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے بعد بھی کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قادر، مالک اور مختار کل سمجھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کو چیلنج دیتا ہے۔

موعظت و حکمت

علم کو بتانا چاہیئے کہ صحابہ کرامؓ اپنی محفلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے حالات بیان کیا کرتے تھے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی ہر صحبت اور نشست سیرت النبی کا جلسہ ہوا کرتی تھی، اس لئے حضورؐ کی سیرت کے لئے جلسوں کا اہتمام بڑی سعادت کی بات ہے، حضورؐ کی سیرت کے تذکرے ہمیشہ ہوتے رہنے چاہئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے بغیر قرآنی احکام کی تعمیل ہو ہی نہیں سکتی، اور قرآن کا صحیح مفہوم تو سُنّتِ نبوی کے واسطہ کے بغیر واضح ہونا ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو "کتاب اللہ" کا معلّم بنا کر بھیجا تھا!

لیکن صحابہ کرام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی اور جاں نثار تھے، انھوں نے حضورؐ کے یوم ولادت پر کوئی جشن نہ منایا، اُن کی نگاہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت سے اُن کا ایک دن، بارہ دن یا ایک مہینہ کا نہیں بلکہ چوبیس گھنٹوں کا تعلق تھا! اپنے نبیوں اور پیشواؤں کے دن تو عیسائی اور یہودی منایا کرتے ہیں! یا پھر سالگرہ منانے کی رسم بادشاہوں کی سُنّت ہے!

صحابہ کرام کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت، حضورؐ کے بچپن اور جوانی کے واقعات کا بھی ذکر آتا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں کرتے تھے کہ ہر نشست میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بیان کرنے کو لازمی اور ضروری سمجھیں، اور اس تذکرہ کے بعد کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنے لگیں، صحابہ نے، تابعین نے، تبع تابعین نے فقہ

اور حدیث کے اماموں نے، یہاں تک جنید و شبلی اور بایزید (رحمہا اللہ تعالیٰ) جیسے اکابر صوفیاء نے بھی ایسا نہیں کیا۔

"میلاد شریف" کی رسم سلجوقی بادشاہوں کی نکالی ہوئی ہے، اور دین میں کسی بادشاہ کی ایجاد کی ہوئی رسم پر کاہ کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتی! ــــــ تو جو کوئی خدا کا بندہ "میلاد شریف" پر نکیر کرتا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ایسا کرتا ہے کہ حضور نے ایسا کرنے کے لئے کوئی حکم نہیں دیا اور نہ صحابہ کرام نے ایسا عمل کیا۔

اہلِ بدعت نے اپنا یہ شعار بنا لیا ہے کہ سیرت کے ہر جلسہ میں "میلادِ رسول" کا ذکر کرنے کو لازم جانتے ہیں، اور اس کے بعد صلوٰۃ و سلام کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں! اس کے لئے وہ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے کوئی سند اور دلیل نہیں لا سکتے!

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ بدعت چاہے وہ مسلمانوں کے نزدیک کتنی ہی مقبول و محبوب کیوں نہ ہو سعادت و فلاح کا سبب نہیں بن سکتی، بدعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" سے تعبیر فرمایا ہے!

"میلاد و قیام" پر نکیر سیرتِ رسول کے ذکر پر نکیر نہیں ہے، سیرتِ رسول کا ذکر تو زیادہ سے زیادہ ہونا بلکہ ہوتے رہنا چاہیئے، اس سے تو مسلمان کے ایمان و اسلام کا تعلق ہے! تنقید اس عمل پر کی جاتی ہے کہ اہل بدعت نے "ذکرِ میلاد" اور قیام کو واجب قرار دے لیا ہے، اس کے ترک کرنے کو وہ دین کا نقصان سمجھتے ہیں!

یہ نہیں ہے کہ اسی زمانے میں "مولود و قیام" پر نقد و احتساب کیا جا رہا ہے، جب سے بھی یہ رسمیں جاری ہوئی ہیں، دلائل میں کتاب و سنت کے تقاضوں کو پہچاننے والے علماء نے ان رسموں کو بدعت قرار دیا ہے، اب سے چار سو سال پہلے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں "مولود" کی رسم پر نکیر فرمائی ہے!

بالکل سامنے کی بات ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہے، یہ کہ قرآنِ پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اگر انبیاء کرام کے ذکرِ ولادت کے وقت تعظیم کے لئے اٹھنا واجب، مستحب یا کوئی ثواب کا کام ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے قیام فرماتے یا صحابہ کو قیامِ تعظیم کا حکم دیتے!

نہ تو کتاب و سنت میں اس کا حکم ہے، نہ صحابہ کرام اور تابعین نے ایسا عمل فرمایا، اور نہ حدیث و فقہ کے اماموں کا یہ معمول رہا ہے کہ ہر دینی اجتماع میں ولادتِ رسول کا ذکر کر کے صلوٰۃ و سلام کے لئے کھڑے ہو جائیں، اس لئے یہ رسمیں دینی اعتبار سے بے سند ہیں، اور ان کے کرنے پر کوئی ثواب نہیں مل سکتا۔

"قیامِ میلاد" کے سلسلہ میں ایک عجیب و غریب دلیل پیش کی جاتی ہے ــــ یہ کہ کیا ہم ایک دوسرے کی تعظیم کے لئے کھڑے نہیں ہوتے ــــ بیشک کھڑے ہوتے ہیں، مگر ہم یہ تو نہیں کرتے کہ آپس میں ایک دوسرے کی ولادت کا یا اپنے بزرگوں کی پیدائش کا ذکر کر کے تعظیم کے لئے کھڑے ہو جائیں پھر "ذکرِ ولادت" کے وقت محفل میں کون آتا ہے، جس کی تعظیم کے لئے قیام کیا جائے! جو کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ذکرِ ولادت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اس محفل میں آتی ہے تو وہ ایک غلط عقیدہ رکھتا ہے۔

وہ بدبخت سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے جو رسول اللہ علیہ والسلام کی تنقیص کا معاذ اللہ اپنے اندر ذرہ برابر بھی شائبہ رکھتا ہو، بدعات پر جو ٹوکا جاتا ہے، وہ حضور کی محبت اور اطاعت میں ٹوکا جاتا ہے کہ حضور نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا، اس لئے ایسے کاموں کے کرنے میں کوئی دینی خیر و فلاح نہیں ہے، ہر عقیدہ اور رسم وہی معتبر ہے جس پر کتاب و سنت کی چھاپ لگی ہوئی ہو، اپنے دل سے نکال کر کسی رسم اور عقیدہ کو دین سمجھنا، گمراہی ہے!

یہ ہم توحید اشارے کر دینا چاہتے ہیں کہ ان خطوط پر اور اس انداز میں عوام کے سامنے اگر توحید خالص کو پیش کیا جائے اور شرک و بدعات کی خرابیاں اُن پر واضح کی جائیں، اور کلام و تقریر اور موعظت میں حکمت و نرمی اور رفق و ہمدردی کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے، تو انشاء اللہ اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے!

آخری گزارش یہ ہے کہ مشرکانہ عقائد و رسوم اور بدعات کی جب گرم بازاری ہو تو توحید شناس علماء اور اربابِ فکر کا فرض ہے کہ وہ سکوت و درگزر اور مصلحت کی بجائے، ان گمراہیوں کی زبان و قلم سے تردید فرمائیں!

ماہر القادری
نومبر ۱۹۶۲ء

توحید شناسوں کو مژدہ ہو کہ

"فاران" کا عظیم الشان

"توحید نمبر"

جس کی ہر طرف مانگ ہے

کتابت کی منزل میں ہے۔ انشاء اللہ "فاران" کی کسی قریبی اشاعت میں قیمت وغیرہ کا مفصل اعلان کیا جائیگا

خریدار حضرات اور ایجنٹ صاحبان اگر ابھی سے آرڈر بھیج دیں، تو ان کے لئے اور ہمارے لئے سہولت کا باعث ہوگا

"توحید نمبر" تیسری بار اللہ تعالیٰ کے فضل سے شائع ہو رہا ہے اور اس کے مطالعہ سے بہت سے لوگوں کو فاسد عقائد سے رجوع کرنے کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔

مہتمم ماہنامہ "فاران" کراچی

ابو محمد امام الدین
رام نگری

ہفت روزہ "ایشیا"
اور "خلافت معاویہؓ و یزید"

صحابہ کرام آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں اُن کی اقتدا اُمت کے لئے باعثِ فوز و سعادت ہے، جو کوئی فرد یا گروہ ان نفوسِ قدسیہ پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے۔ وہ اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ صحابہ کرام کی محبت ہمارے ایمان کا تقاضا اور اُن کی عداوت نفاق کی نشانی ہے، یہی وہ پاک نہاد اور قدسی صفات انسان ہیں جن سے اللہ تعالیٰ راضی تھا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی تھے۔

حق و صداقت اور انسانیت کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک گروہ گنتی کے چند صحابہ کو چھوڑ کر صحابہ کرام کی غالب اکثریت کو (خاک بدہن گستاخ) گمراہ سمجھتا ہے، اور اُن کی تنقیص کو ذریعہ نجات خیال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس ضلالت سے ہر صاحبِ ایمان کو محفوظ رکھے۔

اسلامی تاریخ ایک ایسے المناک دور کو بھی ہمارے سامنے لاتی ہے جب صحابہ کرام کے درمیان خونریز جنگیں ہوئی ہیں، اس دور کے واقعات کے بارے میں ایک روش تو "کفِ لسان" کی روش ہے۔ یہ کہ جمل و صفین کے متعلق ہم سے قیامت کے دن باز پرس نہیں کی جائے گی کہ تم نے کس کو حق پر سمجھا تھا، اور تم اُس زمانے میں ہوتے تو کس کا ساتھ دیتے؛ کوئی شک نہیں یہ روش احتیاط اور سلامتی کی روش ہے!

دوسری طرف اسلامی تاریخ کے واقعات ہیں، ان واقعات کی مختلف نوعیتیں ہیں یعنی یہ واقعات واضح بھی ہیں، تاریک اور پیچیدہ بھی ہیں اور غبار آلود بھی ہیں! ان تمام واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اُمت کے اجماع نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جمل و صفین میں حق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تو اظہارِ ندامت فرما کر اپنے موقف کو بے بنیاد بنا دیا مگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آخر دم تک اپنے موقف پر جمے رہے، یہاں تک کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنا کر، خلافت کی جگہ ملوکیت کی بنا قائم کر گئے، مورخین کے علاوہ فقہاء اُمت نے حضرت علی خلیفہ راشد کے مقابلہ میں امیر معاویہ کو "باغی" ٹھہرایا ہے، امیر معاویہؓ کی غلطی کو "اجتہادی" قرار دینا، یہ وہ نرم سے نرم بات ہے جو اُن کے بارے میں کہی جاتی ہے!

محمود عباسی نے اپنی کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں اُمت کے اس اجماع اور ائمہ فقہ اور ارباب سیر و تاریخ کے متفقہ فیصلہ کے برخلاف حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں گرانے کی کوشش کی ہے، یہ رُسوائے عالم کتاب علی مرتضیٰؓ کے مقدس کردار کو بگاڑ کر اور مسخ کر کے پیش کرتی ہے۔ حضرت علی زہد و تقویٰ میں، تزکیہ نفس میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ربط و تعلق میں اور دوسری دینی خدمات میں، امیر معاویہؓ سے اس قدر فائق و برتر ہیں کہ اُن کے درمیان تقابل کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، حضرت علیؓ کا شمار ان اجلّ صحابہ میں ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کے بعد اُمت کے لئے نمونہ ہیں! اس لئے وہ شخص مفسد ہے، جو اس مقدس نمونہ کو گرانے، مجروح کرنے اور غلط کار ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے!

اُمت کا ہر دور میں اس پر بھی اجماع رہا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت مظلومیت کی شہادت ہے، اُن کی شخصیت اُمت کی محبوب و پسندیدہ شخصیت ہے، کربلا میں حضرت حسینؓ نے جس ثبات و استقامت کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی

کے طور پر پیش کیا جاتا ہے؛ اس کے مقابلے میں یزید کی شخصیت کو اُمت نے ہمیشہ ناپسندیدہ سمجھا ہے، مبالغہ اور پروپیگنڈے کا زیادہ سے زیادہ الاؤنس دینے کے بعد بھی یزید سے ظلم کی نسبت کو جدا نہیں کیا جا سکتا، اور ایک مسلمان یزید جیسے سیرت و کردار کے آدمی سے محبت لگاؤ اور دلچسپی نہیں رکھ سکتا۔ کربلا کے المیہ کے علاوہ مدینہ اور مکہ میں یزید کے دور میں جو انسانیت سوز مظالم ہوئے ہیں وہ یزید کے ظالم ہونے کی معتبر شہادت دیتے ہیں!

محمود عباسی نے "خلافت معاویہؓ و یزید" میں حقیقت کو بالکل اُلٹ کر پیش کیا ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فضل و شرف کو اس "مورخ بے بدل" (؟) نے مجروح کرنے کی اپنی امکانی حد تک پوری کوشش کی ہے اور معرکۂ کربلا میں حضرت حسینؓ کی صحیح روش اور حق پسندانہ موقف کو غلط اور ناحق ثابت کیا ہے، اُن کی اس کتاب کا کتنا بہت سا حصہ ہے جو یزید کے مناقب سے لبریز ہے! یزید جو ساری اُمت کے نزدیک ناپسندیدہ اور مبغوض ہے، وہ محمود عباسی کی پسندیدہ اور محبوب شخصیت ہے، حضرت حسینؓ جن کو پوری اُمت پسندیدہ اور محبوب سمجھتی ہے، ان پر عباسی صاحب نے جگہ جگہ زبانِ طعن دراز کی ہے اور اُمت کی نگاہ میں انہیں ناپسندیدہ ٹھیرانے کے لئے اپنے قلم اور تاریخی تحقیق کا پورا زور صرف کر دیا ہے۔

یہ کتاب اُمت کے ضمیر کو، اس کے اجماع کو اور اس کے تاریخی فیصلہ کو کھلا ہوا چیلنج ہے! اس کتاب میں تاریخی حوالے اور اقتباسات پیش کرنے میں دانستہ طور پر خیانت سے کام لیا گیا ہے، یہ کتاب تاریخ نویسی اور سیرت نگاری کا بُرا نمونہ ہے! حیرت ہے کہ بعض لوگ صرف یہ دیکھ کر کہ اس کتاب میں حضرت حسینؓ کے سفرِ کربلا کی منزلیں اور تاریخیں پیش کی گئیں، اور اس کی تحقیق کی گئی ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد علیؓ کی اولاد اور بنو اُمیہ کے درمیان بیاہ شادیاں ہوئی ہیں، متاثر ہو جاتے ہیں! اور کتاب کے اصل تاثر کو نظر انداز کر دیتے ہیں

ہم سے ثقہ لوگوں نے خود بیان کیا ہے کہ یہ شخص (محمود عباسی) اپنی پرائیویٹ صحبتوں میں حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو بُرے لفظوں سے یاد کرتا ہے، اس شخص کو آلِ رسولؐ کے ساتھ بغض و عداوت ہے، یہی وہ زہر ہے جو اس کتاب کے صفحات میں سرایت کر گیا ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ محمود عباسی نے اپنی کتاب میں جو درود لکھا ہے، اس میں "وعلیٰ آلہٖ" کو حذف کر دیا ہے!

"خلافت معاویہ و یزید" کسی عنوان بھی قدر و ستائش کی مستحق نہیں ہے، اس کتاب نے اُمت میں بیٹھے بٹھائے ایک فتنہ کھڑا کر دیا ہے! اگر یہ "تاریخی ریسرچ" ہے، تو خدا کی قسم فساد انگیز ریسرچ ہے، اس کتاب کی سب سے زیادہ حمایت، مدافعت اور ستائش رسالہ "تجلی" (دیوبند) نے کی ہے! یا پھر اہلِ حدیث کے بعض رسالوں نے کہیں کھل کر اور کہیں دبے لفظوں میں "خلافت معاویہؓ و یزید" کو سراہا ہے، حال ہی میں ماہنامہ "میثاق" کی مدح آمیز تنقید نظر سے گزری، ان کے علاوہ عام طور پر دینی طبقوں میں اس کتاب کو پسند نہیں کیا گیا، اس کے رد میں مقالے ہی نہیں کتابیں لکھی گئی ہیں!

جناب ملک نصر اللہ خاں عزیز (مدیر ایشیا) کی محبت و احترام سے ہمارا قلب معمور ہے، ان کا قلم سالہا سال سے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت انجام دے رہا ہے، موصوف "تحریک اقامتِ دین" کے پُرجوش مبلغ ہیں! ان کی وہ تحریریں بھی ہم نے سہ روزہ "مدینہ" میں پڑھی ہیں، جن میں انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بارگاہِ اقدس میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور معرکۂ کربلا کو حق و صداقت کا نشان بتایا ہے۔ حیرت ہے کہ وہ "خلافت معاویہ و یزید" سے کیسے متاثر ہو گئے! ہم تو مولانا نصر اللہ خاں عزیز سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اس بدنام کتاب پر خوب کس کر تنقید کریں گے، مگر افسوس ہے کہ اُن کا اشہبِ خامہ اس منزل میں متوازن نہ رہ سکا!

"خلافت معاویہؓ و یزید" میں جن مسائل کو چھیڑا گیا ہے، ان مسائل میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جن افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ صحیح ہیں، متوازن ہیں اور اُمت کے اجماع کے عین مطابق ہیں! مولانا مودودی کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں

کہی جاسکتی کہ وہ سبائی پروپیگنڈے سے متاثر ہوگئے ہیں؟ ملک صاحب موصوف اگر ان مسائل میں مودودی صاحب کے علم و تحقیق پر اعتماد کر لیتے، تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے، ہم یہ مضمون سخت کش مکش کے عالم میں شائع کر رہے ہیں، جن پر جرح و تنقید کی گئی ہے ان کی محبت و احترام کا یہ مطالبہ تھا کہ اس مضمون کو "فاران" میں جگہ نہ دی جائے مگر احقاقِ حق کے فریضہ اور داعیہ نے مجبور کیا کہ اس جرعۂ تلخ کو تو گوارا ہی کرنا ہوگا! ملک نصر اللہ خاں عزیز کی حق پسندی سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ ان پر جو یہ مجبوراً اساذہول طاری ہو گیا ہے وہ انشاء اللہ دور ہو جائے گا اور صاحب موصوف اس مسئلہ میں رجوع فرما کر اجماعِ امت کا ساتھ دیں گے (م۔ ق)

—×—

دو شخصیتیں پیدا ہوئیں مشترک ہندوستان میں اور نمایاں ہوئیں ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستان میں، یہ شخصیتیں ہیں چودھری غلام احمد پرویز اور محمود احمد عباسی کی، پرویز صاحب یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ آج تک کوئی قرآن اور اسلامی تعلیمات کو سمجھا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلام کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ عباسی صاحب نے یہ دعویٰ کیا کہ آج تک کسی نے اسلامی تاریخ کی تحقیق ہی نہیں کی، اور انہوں نے اپنی تحقیق و ریسرچ سے اسلامی تاریخ کا حلیہ بگاڑ دیا۔ ان دونوں محققین میں عباسی صاحب بڑے خوش نصیب ہیں کہ پرویز صاحب پر تو ہر مسلک کے ایک ہزار علما نے متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ عائد کر دیا لیکن عباسی صاحب کی کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کے رد میں اگر ہند و پاک میں بہت سے مقالات و مضامین لکھے گئے اور متعدد کتابیں شائع ہوئیں تو بعض اہلِ علم اور اہلِ قلم نے ان کی تائید و حمایت میں بھی مقالات اور مضامین لکھے اور ان میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، ان میں خصوصیت کے ساتھ میرے پیشِ نظر جناب نصر اللہ خاں صاحب عزیز مدیر "ایشیا" لاہور ہیں جنھوں نے ۳۱ رجون ۱۹۶۲ء کے ماہنامہ "ایشیا" کا افتتاحیہ نشاناتِ منزل ـــــ ثقیفہ سے کربلا تک کے عنوان سے سپردِ قلم کیا ہے۔ "خلافتِ معاویہ و یزید" کو دیکھ کر کسی صاحبِ علم و بصیرت کے لئے یہ سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں کہ یہ کوئی علمی و تحقیقی کتاب نہیں ہے کسی نہایت غلط مقصد یا انتہائی معاندانہ جذبے سے لکھی گئی ہے اور تحقیق و ریسرچ کے نام سے صریح دھوکا دیا گیا ہے اور واقعات و حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیا گیا ہے، حوالوں میں بھی سخت قطع و برید کی گئی ہے اور ائمہ و محدثین کے حوالے بھی اس طرح پیش کر گئے ہیں کہ ان کی غرض کچھ ہے، اور ان کو پیش کیا گیا ہے ان کی غرض کے خلاف اپنے انداز میں، عوام تو عوام اہلِ علم نے بھی خود تحقیق کی زحمت نہ کی، اور ان حوالوں کو دیکھ کر "خلافتِ معاویہ و یزید" کو سندِ تحقیق بخش دی، اس غلط بخشی پر سب سے زیادہ تعجب مجھے جناب مدیر ایشیا پر ہے۔

اسلامی سیاست اور خلافت کا ایک اصول و معیار ہے اور وہ ہے خلافتِ راشدہ کا اصول و معیار جس پر کس کر امت کسی حکومت کے متعلق اس کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے، خواہ وہ حضرت معاویہؓ کی حکومت ہو خواہ یزید کی، یا کسی اور کی حکومت ہو۔ خلافتِ راشدہ امت کا مسلمہ و متفقہ معیار ہے۔

جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز غیر منقسم ہندوستان کے زمانے سے جماعتِ اسلامی کے ترجمان اور اقامتِ دین کے علمبردار ہیں جماعتِ اسلامی پاکستان کے تعلق کے زمانے میں بھی وہ نظامِ اسلامی کے قیام کے علمبردار رہے ہیں، جب وہ "خلافتِ معاویہ و یزید" کے حامیوں کی صف میں داخل ہو جائیں تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا تصورِ اقامتِ دین کیا ہے؟

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نقطۂ نظر حضرت معاویہؓ اور یزید کی حکومت کے متعلق کیا ہے؟ یہ امر جناب مدیر ایشیا پر مخفی نہ ہوگا۔ مختلف زمانوں میں اس مسئلے کے متعلق ان سے مفصل اور مجمل سوالات کئے گئے ہیں اور انھوں نے ہر سوال کے اعتبار سے اس کا جواب دیا کہ خلافت کے تمام جوابات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اور یزید کی حکومتیں خلافتِ راشدہ کے اصول و مناہج کے مطابق نہیں

خواہ مولانا عامر عثمانی مدیر تجلی دیوبند ہوں یا جناب نصر اللہ خان عزیز مدیر ایشیا ۔ ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ان میں کوئی بھی مولانا مودودی کی کسی غلط بات میں تائید کرے، لیکن حضرت معاویہؓ اور یزید کے بارے میں مولانا مودودی وہی بات کہتے ہیں جو ائمہ و اکابر کا عام فیصلہ ہے۔ ایسے مسئلے میں جماعتِ اسلامی کے کسی بھی متوسل اور حامی کا مولانا مودودی سے اختلاف خلافت راشدہ کے اصول و معیار سے اختلاف ہے جسے دوسرے لفظوں میں اسلام کے اصولِ سیاست و حکومت سے انحراف کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اگر حضرت معاویہؓ اور یزید کی حکومت کو بھی اسلامی اصول و معیار کی حکومت کی سند دیدی جائے تو خلافت راشدہ کی معیاری خصوصیت کا خاتمہ ہو جائے گا، اور جتنی اموی اور عباسی حکومتیں گذری ہیں سب کو معیاری اسلامی حکومت ماننا پڑے گا اور اسلام کا کوئی اصول و معیار سیاست و حکومت باقی نہ رہے گا، اور یہی ہے عباسی صاحب کی "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کا مقصدِ تحقیق و ریسرچ ؟

ہمیں اس موضوع پر قلم اٹھانے کی بالکل فرصت نہ تھی، ہمیں اپنے ماہنامہ انوارِ اسلام کے لئے زیادہ تر مضامین خود لکھنے پڑتے ہیں اس کام کے علاوہ بے شمار مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے بھی عہدہ برآ ہونا تاریخ کا ایسا مطالبہ ہے جس سے صرف نظر ممکن نہیں ہے ان سب کے علاوہ ہم سوامی دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" کے آخری باب کا تحقیقی جائزہ لکھ رہے ہیں جو بہت بڑا کام ہے، مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی کتاب "حق پرکاش" مسلمانوں کو مطمئن اور خوش کر دے تو کر دے مگر وہ اس لائق نہیں کہ ایسے غیر مسلموں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ زمانہ بالکل بدل چکا ہے۔ اتنی شدید مصروفیتوں کے باوجود جناب مدیر ایشیا کے افتتاحیہ کے خلاف اس لئے قلم اٹھانا ناگزیر ہوگیا کہ ایک بڑے اسلامی حلقے میں ان کی اسلامی فکر و نظر کو درجۂ اعتماد حاصل ہے، اور ان کا افتتاحیہ سخت غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، اور ایشیا کا یہ افتتاحیہ اس اعتبار سے اور زیادہ افسوسناک اور قابلِ اعتراض ہوگیا ہے کہ ایشیا کے اسی شمارے میں مولانا مودودی کی ایک تقریر بھی انہیں مسائل و مباحث پر خود ادارۂ ایشیا کے اہتمام سے شائع کی گئی ہے، مولانا کی یہ تقریر اسی نقطۂ نظر پر مبنی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور یزید کی حکومتیں اسلامی اصول و معیار کے مطابق نہ تھیں، مدیر ایشیا نے مولانا مودودی کی تقریر کی تائید و تحسین بھی کی ہے اور محمود احمد عباسی کی تصدیق و توثیق بھی لیکن بحیثیت مجموعی افتتاحیہ سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ عباسی صاحب کی موافقت اور مولانا مودودی کی مخالفت میں جاتا ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ مدیر ایشیا نے اپنے مختصر لفظوں میں وہی کچھ لکھتے ہوئے جو عباسی صاحب نے مسائل و مباحث شرح و بسط کے ساتھ تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں :۔

"محمود احمد صاحب عباسی نے حال ہی میں جو دو کتابیں شائع کی ہیں "خلافتِ معاویہؓ و یزید" اور "تحقیق مزید" ان کی قدر و قیمت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں"۔

ہم نہیں سمجھتے کہ عباسی صاحب کی تحقیق اور ریسرچ اور ان کی کتابوں کے متعلق مدیر ایشیا کے اس اعتراف کے بعد مولانا مودودی کے فکر و نظر کی کیا قدر و قیمت باقی رہ جاتی ہے اور انھوں نے مولانا کے کن افکار و نظریات کی تائید و تحسین کی ہے؟ یہ فن تحریر عباسی صاحب کے یہاں پایا جائے تو جائے تعجب نہیں لیکن مدیر ایشیا کے یہاں اس انداز تحریر کا پایا جانا موجب حیرت ہی نہیں افسوسناک بھی ہے۔ ان سے زیادہ صاف رویہ تو مدیر تجلی کا ہے کہ انھوں نے یزید کی حمایت میں کھل کر مولانا مودودی پر جرح و قدح کی ۔ آگے بڑھنے سے پہلے موقع ہے کہ ایک پس پردہ حقیقت کو بھی پیش کر دیا جائے، ہماری کتاب "حضرت امام حسین شہیدؓ بہ تردید خلافتِ معاویہؓ و یزید" اور اس کے حصہ دوم "حضرت امام حسین شہیدؓ جرح و تنقید پر تجلی و خلافتِ معاویہؓ و یزید" کا اشتہار ایشیا میں شائع ہوا تھا جناب مدیر ایشیا نے تقریباً کوئی تین چار مہینے قبل ہمیں لکھا کہ خلافتِ معاویہؓ و یزید تبصرہ کے لئے ہمارے پاس آئی ہے، ہم نے اسے دیکھا نہیں ہے لیکن وہ باتیں نظر نہ آئیں جو آپ نے اپنے اشتہار میں "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کے متعلق لکھی ہیں، تم [illegible]

اب جس کا جی چاہے وہ خلافت معاویہؓ و یزیدؒ کو دیکھ لے، عباسی صاحب نے حضرت علیؓ کی خلافت پر طرح طرح سے کلام کیا ہے اور ان کی خلافت راشدہ کی خلافت کی تنقیص و تحقیر کی ہے اور یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر خلافت علی منہاج النبوۃ کا خاتمہ ہوگیا اور ملک عضوض آگیا۔ (خلافت معاویہؓ و یزید ص۳۲)

عباسی صاحب نے یہ بات حضرت شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء کے حوالے سے لکھی ہے لوگ ایسے حوالوں سے فریب کھا جاتے ہیں وہ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ کیا حضرت شاہ صاحبؒ حضرت علیؓ کو خلیفۂ راشد نہیں ملک عضوض مانتے ہیں؟ عباسی صاحب کا یہ حال ہے کہ جانے کس ساتھ حضرت علیؓ کو تو ملک عضوض بھی ثابت کر دکھاتے ہیں اور جب حضرت معاویہؓ اور یزید کو خلیفہ راشد ثابت کرنے پر آتے ہیں تو حضرت معاویہؓ اور یزید کو پانچواں اور چھٹا خلیفۂ راشد بناتے ہیں۔ یعنی چوتھی کڑی بیچ سے ہو جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کی خلافت منعقد ہی نہیں ہوئی۔ وہ سبائیوں کے جور و جبر سے عمل میں آئی تھی۔ حضرت علیؓ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی تھے اور ان کی خلافت انہیں کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی، پھر بھی حضرت معاویہؓ اور یزید پانچویں اور چھٹے خلیفۂ راشد ہو جاتے ہیں۔

(دیکھئے خلافت معاویہؓ و یزید ص۱۰۱ اور (ص۲۲۲ اور ص۲۲۵) یہ تحقیق عباسی صاحب کے مخصوصات کا ایک نمونہ ہے)

یہاں ہمارا مقصد عباسی صاحب کی تحقیق اور ان کے پیش کردہ حوالوں سے بحث نہیں، بحث تو ہماری کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مولانا مودودی کی فکر و نظر ہمیں کعبہ کی طرف لے جاتی ہے تو عباسی صاحب کی تحقیق و ریسرچ ترکستان کی طرف، اور جب مدیر ایشیا کچھ چھپے چھپے اور کچھ کھلے کھلے حدیث نبویؐ کے سہارے عباسی صاحب ہی کے حق میں نکتہ آفرینی کرتے ہوئے ہمیں اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ صاف لفظوں میں پکار اٹھتے ہیں کہ:۔

"اس معاملے میں محمود احمد عباسی نے حال ہی میں جو دو کتابیں شائع کی ہیں — خلافت معاویہؓ اور یزیدؒ اور تحقیق مزید۔ ان کی قدر و قیمت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔۔۔ تو ہمیں نظر آتا ہے کہ مدیر ایشیا کعبہ لے جانے والے رہنما کے ساتھ نہیں، وہ ترکستان لے جانے والے رہنما کے ہم نوا اور ہم قدم ہیں۔

حضرت علیؓ نے امت کے لئے کونسا نمونہ پیش کیا؟ اس کے متعلق مولانا مودودی نے فرمایا:۔

"تین گروہوں سے ان کی جنگ ہوئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، اور خوارج، ان تینوں صورتوں میں حضرت علیؓ نے اس وقت تک تلوار نہیں اٹھائی جب تک وہ مطمئن نہیں ہو گئے کہ وہ تلوار اٹھانے میں حق بجانب ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جنگ ہوئی، جنگ جمل میں، حضرت علیؓ کو فتح ہوئی۔ خود حضرت عائشہؓ نے تسلیم کیا کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا۔ چنانچہ جنگ جمل کو یاد کر کے وہ رو پڑتی تھیں۔"

(جنگ جمل کی مفصل بحث ہماری کتاب میں دیکھئے۔ امام الدین)

"حضرت علیؓ کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ان کی حکومت ابھی ابھی قائم ہوئی ہے۔ جب تک وہ اپنا نظام قائم نہ کر لیں اس وقت تک قاتلین عثمانؓ کی تحقیق نہیں ہو سکتی اور اس کے لئے یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ قاتلین عثمانؓ کو پکڑ کر سزا دی جائے دوسرے اگر یہ کارروائی ضروری بھی ہو تو ملک کے چند یا زیادہ آدمیوں کو سزا دلوانے کیلئے تلوار کے زور سے مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، چند آدمیوں کو یہ حق نہیں کہ وہ تلوار لے کر کھڑے ہو جائیں کہ فلاں لوگوں کو سزا دی جائے۔ حضرت علیؓ کو یقین ہو جائے کہ یہ مطالبہ غلط ہے۔ جنگ صفین کے معاملے میں ایک علاقے کا گورنر مطالبہ کرتا ہے کہ چونکہ میں مقتول کا رشتہ دار ہوں اس لئے قاتلوں کو میرے حوالے کیا جائے اور دوسرے یہ کہ وہ معزول کئے جانے پر لڑنا

اُٹھائے حضرت معاویہؓ کے یہ دونوں مطالبے غلط تھے۔ گورنری کوئی موروثی جاگیر نہیں ہے اور ۲۰-۲۲ برس تک حضرت معاویہؓ کا گورنر رہنا بھی دُرست نہیں تھا۔ پھر ان کا مطالبہ قاتلینِ عثمانؓ کا شخصی ہو سکتا تھا گورنر کی حیثیت سے نہیں۔ لہٰذا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حق معاویہؓ کے ساتھ تھا۔"

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مباحث میں آپ نے مولانا مودودی کا نقطۂ نظر دیکھ لیا اب جو شخص چاہے عباسی صاحب کی دونوں کتابوں کو دیکھے، وہ مولانا مودودی کے اس نقطۂ نظر کے صریحاً خلاف ہیں اور مدیر ایشیا ان دونوں کتابوں کے منارۂ قدر و قیمت کے سامنے سرخمیدہ اور ساتھ ہی مولانا مودودی کی فکر و نظر کے بھی مداح اور قدّاح بھی۔ کیا ایسا فکری عجوبہ بھی کسی نے دیکھا ہوگا؟ مدیر ایشیا کا افتتاحیہ دیکھئے، ان کا دل تو عباسی کے ساتھ ہے۔ مگر اُن کے قلم سے مولانا مودودی کا بھی ساتھ نہیں چھوڑا جاتا۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

کسی کو غلط فہمی نہ ہو اس لئے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مباحث میں مولانا مودودی اپنے نقطۂ نظر میں منفرد نہیں ہیں، عام طور پر ائمہ اور اکابر اُمّت کی یہی رائے ہے ہم نے اپنی کتاب میں ائمہ و اکابر اُمت کی رائیں جمع کردی ہیں۔

مدیر تجلّی نے حضرت معاویہؓ کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے اور خون پسینہ ایک کرتے ہوئے حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب کا طویل اقتباس پیش کیا ہے خود اس میں حضرت معاویہؓ کے باغی ہونے کا ثبوت موجود ہے "خلافت معاویہؓ و یزید" ایسی مسحورکن کتاب ہے جس پر اس کا اثر ہوا اس کی بصیرت ہی زائل ہو جاتی ہے۔ ناحق کو حق ثابت کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ جس سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ بڑا سانحہ ہے کہ مدیر ایشیا اس حادثے کی زد میں آگئے، اور ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ جس دلدل میں جا پھنسے ہیں اس سے نکلنے کی بجائے وہ اس میں دھنستے ہی جانے کی کوشش کریں گے۔ خدا کرے ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو۔ ہم مدیر تجلّی کا یہی حال دیکھ رہے ہیں، حق کو مولانا مودودی کی حمایت میں انہیں اپنے اکابر سے بھی ٹکر لینے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی یزیدیت پسندی نے انہیں خود مولانا مودودی سے ٹکرا دیا۔ لیکن ہم نے کبھی یہ تصور بھی نہ کیا تھا کہ جناب مدیر ایشیا پر عباسی صاحب کا جادو چل جائے گا اور ہمیں مدیر تجلّی کے بعد ان کے خلاف قلم اٹھانا پڑے گا۔

مولانا مودودی نے حضرت امام حسینؓ اور یزید کے معاملے میں فرمایا:-

"اگر کسی مسلمان حکومت کا بگاڑ جزئیات میں ہو تو نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کی کوشش روا نہ ہوگی، مگر جب بادشاہ یا ٹولے نے اس حکومت کو موروثی بنانے کی کوشش کی تو اصولی تغیر واقع ہو گیا، ایک خاندان نے حکومت کو اپنی جائداد بنانے کا فیصلہ کر لیا تو حضرت حسینؓ نے ان کو روکنے کا فیصلہ کر لیا خواہ اس میں ان کی جان چلی جائے اور ان کا بچّہ بچّہ کٹ جائے۔"

اس کے بعد مولانا نے اسلامی حکومت کے اصول و اساس کی اس طرح نشان دہی فرمائی ہے۔

(۱) ملک اللہ تعالیٰ کا ہے۔
(۲) اس ملک پر حکومت مسلمانوں کی ہے۔
(۳) جس حکومت سے مسلمان راضی ہوں، وہ صحیح حکومت ہے۔
(۴) جس کے ہاتھ میں حکومت ہو وہ ملک کے بیت المال اور خزانے میں اس طرح تصرف کرے جس طرح یتیم کے مال میں تصرف کرنے کا حکم ہے یعنی اگر مفلس ہے تو بقدر کفاف اس میں سے لے اور غنی ہے تو اس سے اجتناب کرے۔"

"حضرت معاویہؓ بغیر رضامندی عوام کے حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ ان کی حکومت میں مسلمانوں کی رضامندی کو کوئی دخل نہ تھا اور ملک کے مال میں بھی تصرف شروع ہو گیا تھا۔ تاہم حضرت حسینؓ نے برداشت کیا۔ مگر جب اس میں یہ تغیر ہو گیا کہ حکومت کو موروثی بنا دیا جائے تو حضرت حسینؓ نے ولی عہدی اور ولی عہد کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"حضرت حسینؓ نے یہ نمونہ پیش کیا کہ اگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور وہ غلط راہ پر جا رہی ہو تو اس کے خلاف جد و جہد درست ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ صحابہ نے تو بیعت کر لی تھی۔ حضرت حسینؓ نے کیوں نہ کی۔ اور وہ ان کو مطعون کرتے ہیں۔ ۔۔۔ جو لوگ ایسی بات کہتے ہیں ان کو صحابہ کی طرف سے صفائی پیش کرنی چاہیے، نہ کہ حضرت حسینؓ کو مطعون کرنا۔ اٹھنے والے سے صفائی پیش کرنے کا مطالبہ کرنے کا کیا موقع ہے؟"

"حضرت حسینؓ ہی کا نمونہ ہے جو مسلمان حکومت کے بگاڑ کے وقت مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے اگر اس نمونے کو بھی بگاڑ دیا جائے تو نمونہ کہاں سے آئے گا؟"

"حضرت علیؓ کا نمونہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اختلاف ہو (یعنی مسلمان حکومت صالحہ کے خلاف بغاوت کریں امام الدین) تو کیا کرنا چاہیے اور حضرت حسینؓ کا نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حکومت بگڑ رہی ہو تو مسلمان کا کام تماشائی بن کر بیٹھا رہنا نہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اصلاح کے لئے کھڑا ہو جائے خواہ اکیلا ہو اور خواہ نتیجہ کچھ ہو۔"

یہ نقطۂ نظر ہے یزید کے مقابلے میں حضرت امام حسینؓ کے متعلق مولانا مودودی کا۔ اب ہم ایک بار پھر "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کی طرف اشارہ کریں گے، عباسی صاحب نے یزید کے فاسق و فاجر اور خود سر حکمران ہونے کے خلاف اس کو اسلامی علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں یزیدی حکومت کو خلافتِ راشدہ قرار دیا ہے۔ اور حضرت امام حسینؓ کو غلط کار اور حکومت کا حریص ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

واقعہ کربلا کی تفصیلات میں صحیح کیا ہے اور کیا غلط ہے، یہ سب دور از کار الجھاوے ہیں۔ اصل بحث تو اس کی حکومت کے نہج کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کی ہے۔ اور اس بارے میں یہ بات دیکھ لی گئی کہ مولانا مودودی کے نزدیک حضرت امام حسینؓ برسر حق تھے اور یزید کی حکومت اسلامی معیارِ حکومت و خلافت سے اس قدر گر چکی تھی کہ ایک مردِ حق کا اس کے خلاف اٹھنا ناگزیر ہو گیا تھا خواہ اس فرض کی ادائیگی میں اس کا سب کچھ قربان ہو جائے، لیکن جب مدیر ایشیا کے نزدیک عباسی صاحب کی فکر و تحقیق اس قدر حق ہے کہ اس کے اعتراف کے بغیر چارہ نہیں تو ان کی نگاہ میں مولانا مودودی کی فکر و نظر اور حضرت امام حسینؓ کے نمونے کی کیا قدر و قیمت باقی رہی اور کس چیز میں وہ عباسی کی تحقیق کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور کس چیز میں مولانا مودودی کے مؤید اور مداح؟

؎ یہ معمہ کون سمجھے بن کہے

حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ اور حضرت حسینؓ و یزید کے معاملے میں اصولی مباحث تو یہی ہیں جن پر مولانا مودودی نے بحث فرمائی ہے، واقعہ کربلا کی تفصیلات کی صحت و عدم صحت تو اصل مباحث سے ایک زائد بات ہے۔ اس کے بارے میں بھی ہم حامیان عباسی سے جن میں مدیر ایشیا بھی داخل ہیں اتنا دریافت کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جو تفصیلات مشہور و مروج ہیں وہ تو سبائیوں شیعوں اور رافضیوں کا پروپیگنڈا ہیں، پھر صحیح واقعات کیا ہیں؟ کیا بس وہی جو محقق اول و اعظم عباسی صاحب نے "خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں لکھا ہے؟ مدیر ایشیا نے بھی بڑے مصلحانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔

"یہ جس دور کی تاریخ ہے وہ سخت تناصی پروپیگنڈے کا دور ہے، اور ایسی روایتوں کو بڑی احتیاط سے

قبول کرنا چاہیئے جن کی زد صحابہ رضی اللہ عنہم پر پڑتی ہے۔ اور اسی لئے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور امام غزالی جیسے بالغ نظر ائمہ نے واقعات کربلا کی داستان سرائی کو ناپسند کیا ہے۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ سبِّ صحابہ ہے۔

ہم مدیر ایشیا جیسے تمام مصلحین سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وعظ و پند کی یہ لگام عباسی صاحب کے بے لگام قلم کو کیوں نہیں لگائی جاتی؟ وہ مرفوع القلم ہیں کہ وہ واقعات کربلا کو بحث میں لائیں، یزید اور یزید کی سفاکیوں کی پردہ پوشی کے لئے صحابہ کو درمیان میں لاکر کھڑا کر دیں، حقائق تک کا انکار کر دیں۔ ان ناکردنیوں کی مذمت کی بجائے ان کی مدح سرائی کی جائے۔ ان کے دست تحقیق پر اعتراف تحقیق کی بیعت کر لی جائے۔ ان کو اس کے لئے کوئی ملامت نہ کی جائے کہ انھوں نے بیٹھے بٹھائے ایک فتنے کو بیدار کر کے مسلمانوں میں اختلاف و انتشار پیدا کیا۔ ان کو آزادی حاصل ہو کہ وہ جس طرح چاہیں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کو تنقیص اور تنقید کا ہدف بنائیں، وہ نہ صحابی ہیں اور نہ امت کے لئے ان کا اعزاز و احترام لازم ہے۔ جو لوگ عباسی صاحب کے جواب میں قلم کو حرکت دیں ان کو حضرت شیخ جیلانیؒ اور امام غزالیؒ کے حوالوں سے وعظ فرمایا جائے۔ آخر وعظ و پند کا یہ کونسا اصول ہے؟

جو لوگ یزید کی ولی عہدی اور اس کی حکومت کے جواز میں صحابہؓ کو لاکر سامنے کھڑا کر دیتے ہیں وہ عباسی صاحب کا پڑھایا ہوا سبق دہراتے ہیں۔

عباسی صاحب نے یزید کے فضائل و محامد شمار کراتے ہوئے بتایا کہ صحابہ کرامؓ نے یزید کی امارت میں حج و جہاد کیا اور اس کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ اور سادہ لوح عوام ہی نہیں اہل علم بھی اس فریب کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس پر کسی نے غور کرنے کی زحمت ہی نہ اٹھائی کہ یہ منصب حکمراں باپ نے بیٹے کو عطا کیا تھا، صحابہ کو تو حج اور جہاد کرنا تھا وہ کرتے تو کیا کرتے اور جب یزید کو امیر الحج اور امیر العسکر بنا دیا گیا تھا تو صحابہ نماز کس کی اقتدا میں پڑھتے؟ اسی کے ساتھ اس معاملے پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیقؓ و حضرت فاروقؓ کیسے بزرگوں کو امیر حج اور سپہ سالار بنایا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب خالص اسلامی طریقے پر پہلا حج ادا کرنا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے افضل الامت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امارت حج کا منصب عطا فرمایا۔ یہ ہے سنت نبوی، حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ نے امین الامت حضرت عبیدہ بن الجراح رضؓ اور سیف اللہ حضرت خالدؓ جیسے بزرگوں کو سپہ سالار بنایا۔ یزید کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف بھی حاصل نہ تھا۔ خود عباسی کے قول کے بموجب اس وقت اصحاب بدر اور اصحاب شجرہ تک موجود تھے۔ پھر کیا حق تھا یزید کو حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ، اور دوسرے اکابر صحابہؓ کی موجودگی میں کہ اسے امیر الحج بنایا گیا؟ اور جن حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جہاد کیا تھا ان کے ہوتے ہوئے یزید جیسے لونڈے میں کہاں سے وہ عسکری قابلیت و صلاحیت پھوٹ پڑی تھی کہ ان پر یزید کو سپہ سالار مقرر کیا گیا؟ یہ سب اسی لئے تو ہوا کہ اب حکومت منہاج اسلامی حکومت نہ تھی جو اسلامی خصائص و مراتب کا لحاظ رکھا جاتا۔ یزید فرمانروائے وقت کا بیٹا تھا، اور اس کا سب سے بڑا استحقاق یہی تھا۔ پھر صحابہ کو زبردستی لاکر سامنے کھڑا کر دینا کہاں کی معقولیت ہے، جب صحابہ نے اس مرحلے پر بولنا مناسب سمجھا تو یزید کی ولیعہدی اور اس کی حکومت کے حق و جائز ہونے پر صحابہ کے خاموش رہنے کو وہی لوگ دلیل مان سکتے ہیں جن کی بصرت پر عباسی نے جادو کر دیا ہو۔

علامہ ابن خلدون دنیا ہی کے نہیں عباسی کے بھی مانے ہوئے مستند مورخ ہیں۔ ان کا مقدمہ تاریخ دیکھئے۔ اور وہ اقتباس دیکھئے جسے خود عباسی صاحب نے یزید کی ولی عہدی کی بحث میں پیش کیا ہے۔

اس کا ضروری حصہ یہ ہے:۔

"اہل حل و عقد نہ صرف یزید ہی کو ولی عہد بنانے پر متفق ہو سکتے تھے، کیونکہ وہ عموماً بنی امیہ سے تھے۔ اور بنی امیہ اس وقت

اپنے علاوہ سے باہر کسی اور کی خلافت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، اس وقت قریش کا سب سے بڑا طاقتور گروہ انہیں کا تھا، اور قریش کی جمعیت سارے عرب میں سب سے زیادہ تھی، ان نزاکتوں کے پیش نظر حضرت معاویہؓ نے یزید کو ولی عہدی کے لئے ان لوگوں پر ترجیح دی جو اس کے زیادہ مستحق سمجھے جا سکتے تھے۔ فاضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا تاکہ مسلمانوں میں جمعیت اور اتفاق رہے۔" (خلافت معاویہؓ و یزید)۔ ص ۳۸

یعنی صحابہ کرام کی خموشی کی وجہ اس کو کہتے ہیں جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اسلامی حکومت بنوامیہ کی خاندانی حکومت بن چکی تھی تو صحابہ کرام کی رائے اور پسند کا سوال کہاں باقی رہ گیا تھا جو ڈھائی سو صحابہ کو جن میں اصحاب عشرہ مبشرہ، اصحاب بدر اور اصحاب بھی موجود تھے یزید کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے؟ اور "میثاق" کے فاضل اور مبصر تک لگتے ہیں صحابہ کو گنا گنا کر یزید کو خلیفہ برحق ثابت کرنے؟ اور عباسی صاحب کو بانس پر چڑھا کر امام تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں بٹھا دیتے ہیں، اور یہ تبصرہ مدیر تجلی کے لئے ایک سند بن جاتا ہے جو کھرے کھوٹے کی جگہ تجلی میں نقل ہوتا ہے۔ یزید پسندی کی یہ للک اور ہوڑ کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی، جیسے اموی دور نے جنم لے لیا ہو یا تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہو۔

اسی طرح حضرت امام حسینؓ اور یزید کے معاملے میں علامہ ابن خلدون کا مقدمہ دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صحابہ حضرت امام کو حق پر سمجھتے تھے۔ وہ خاموش اس لئے تھے کہ یزید کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کے ظلم و استبداد اور خونریزی اور سفاکی کا بازار اور گرم ہو جائے گا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ بربنائے مصلحت اندیشی صحابہ نے عزیمت کے مقابلہ میں خاموشی کو گوارا کیا تو اول تو یہ بات ہم نہیں علامہ ابن خلدون کہتے ہیں۔ دوم یہ کہ اگر یہ بات نہیں ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ یزید کی امارت حج، امارت جہاد، اس کی ولی عہدی اور اس کی حکومت سب کے بارے میں صحابہ نے سکوت سے کام لیا تو کیا اس لئے کہ تمام عشرہ مبشرہ، اصحاب بدر اور اصحاب شجرہ کے مقابلے میں یزید ہی ان تمام مناصب کے لئے اہل تر تھا؟ اگر نہیں تو صحابہ نے ان تمام حالات میں کیوں خاموشی سے کام لیا؟ ہمیں ان لوگوں پر سخت اعتراض ہے جو اپنی کمزوری کے لئے حق کا سہارا نہیں پاتے تو خواہ مخواہ صحابہ کی آڑ پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

واقعات و حقائق کے سامنے آجانے کے بعد اب دیکھنا چاہیئے کہ جناب مدیر "ایشیا" نے "سقیفہ سے کربلا تک" میں منزل کی جو نشاندہی کی ہے وہ ہمیں کس نتیجے پر پہونچاتی ہے۔

جناب مدیر ایشیا کی رہنمائی کی بنیاد یہ ہے:-

"ہادیٔ برحق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مشہور ارشاد ہے کہ میرے ساتھی (صحابہ) ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے تم جس کی پیروی کروگے راہ ہدایت پاؤگے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے) اہل ایمان کی منزل مقصود کو صاف متعین کر کے بتا دیا تھا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر چل کر تم فلاح دارین حاصل کر سکتے ہو لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اس راہ پر جو مقامات ایسے آنے والے تھے جن کا ظہور دور نبوت میں نہ ہو سکتا تھا ان کی نشان دہی بھی فرما دی جاتی اللہ تعالیٰ نے یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر چھوڑ دیا۔"

اس کے بعد مدیر ایشیا نے بتایا ہے کہ کس صحابی نے کس معاملے میں کیا رہنمائی فرمائی اور وہی ہمارے دیکھنے کی چیز ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق جناب مدیر لکھتے ہیں:-

"قرآن وسنت نے یہ بنیادی تعلیم بیان کردی تھی کہ مسلمانوں کا نظام شورائی ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے مقرر کردہ حکمران تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تقرر مسلمانوں کے مشورے سے نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا اس تعلیم کے مطابق عملی نمونہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کردیا گیا۔"

اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ اسلام کا نظام حکومت شورائی ہے اور اس کا عملی نمونہ حضرت ابوبکرؓ کے ذریعہ وجود میں آیا، اور یہیں یہ بھی یاد کر لیجئے کہ کیا حضرت معاویہؓ کی حکومت حضرت ابوبکرؓ کی خلافت ہی جیسے شورائی تھی؟ حضرت ابوبکرؓ کا دوسرا نمونہ۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے امت میں کوئی مدعی نبوت نہ اٹھا اس امر کا نمونہ پیش آنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص مدعی نبوت ہو تو اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔"

حضرت ابوبکرؓ کا تیسرا نمونہ :-

"اپنی وفات سے قبل امت میں بہترین فرد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے نامزد کرکے اور اس کی نامزدگی کی منظوری کو رائے عامہ پر منحصر کرکے یہ نشان منزل قائم کردیا کہ اگر ضرورت ہو تو خلیفہ نامزد بھی کیا جاسکتا ہے مگر اس کا تقرر قوت کی منظوری کا محتاج ہے، تقرر بہرحال امت کا حق ہے یہ کوئی موروثی جائداد نہیں کہ باپ سے بیٹے تک خود بخود پہنچے"

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس نمونے کو دیکھئے اور پھر دیکھئے کہ ڈھائی سو صحابہ میں یزید بہترین فرد تھا یا موروثی جائداد کی طرح حکومت باپ سے بیٹے کو پہونچی؟

حضرت ابوبکرؓ کا چوتھا نمونہ :-

"آپ نے خلیفہ کے اختیارات اور بیت المال میں تصرف کے بارے میں واضح نشانات قائم کردیئے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا جفاکش خلیفہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ خدا ابوبکر پر رحم کرے انھوں نے اپنے بعد آنے والے خلفا کے لئے بڑا سخت معیار قائم کردیا ہے"۔

سوچ لیجئے کہ بیت المال کے بارے میں کیا حضرت معاویہؓ کا یہی اصول وعمل تھا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہر قدم کو ایک نشانِ منزل قرار دیتے ہوئے بطورِ مثال جناب مدیران کا ایک نمونہ اس طرح پیش کرتے ہیں :-

"سفرِ آخرت درپیش ہوا تو انتخاب امیر کے متعلق وہ ایک نیا نشانِ منزل قائم کرگئے۔ انھوں نے ایک مجلس انتخاب اہل حل وعقد کی مقرر کرکے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا رکن تو مقرر کیا مگر ان کو امیدواری انتخاب سے محروم کردیا اس طرح انھوں نے اسلامی حکومت کو ایک موروثی نظام بننے سے قطعیت کے ساتھ رد کردیا۔ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا آخری کارنامہ تھا......... ورنہ اس امر کا امکان تھا کہ ان کی جلالت قدر اور اسلامی خدمات کی بنا پر ان کے بیٹے کو خلیفہ بنا لیا جاتا اور اسلام کا قافلہ راستے سے بھٹک جاتا۔"

......یہ ہے حضرت فاروق اعظمؓ کا قائم کردہ نشانِ منزل، لیکن حضرت معاویہؓ نے کیا اسے قائم رہنے دیا؟

اب حضرت عثمانؓ کا نمونہ عمل دیکھئے، جناب مدیر ایشیا لکھتے ہیں۔

"اگر کسی وقت خلیفہ اور امت میں اختلاف پیدا ہوجائے اور امت کے کچھ لوگ خلیفہ کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کرنے کی بنا پر اس کو معزول کرنے کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو جائیں تو خلیفہ کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ کیا ان سے اختلاف کرنے

والوں کو باغی قرار دے کر ان کے خلاف فوج کشی کر دینی چاہئیے؟ اور اس طرح امت میں منصب خلافت پر فائز رہنے کے لئے خونریزی کی بنیاد ڈال دینی چاہئیے؟ یہ سوال پہلے دو خلفا کے زمانے میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر سوال ایسا تھا کہ بعد کے ادوار میں ہر وقت پیدا ہو سکتا تھا۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا۔"

آگے لکھتے ہیں: —

"اگر بعد کے ادوار میں بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نمونے کو نشانِ منزل بنالیا جاتا تو وہ المناک حوادث پیش نہ آتے جنہوں نے قافلۂ اسلام کا رخ بالکل بدل دیا۔"

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے جو نمونے جناب مدیر ایشیا نے پیش کئے ہیں ان پر تو ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ "خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں ان نمونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ اور کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" پہلے ان خلفاء کے متعلق کیا بتاتی ہے اور کہاں تک اس لائق ہے کہ کوئی صاحبِ علم و نظر اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کرے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نمونے پر پہلے غور کر لینا ضروری ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کن حالات میں ہوئی؟ تفصیل معلوم ہے۔ حضرت عثمانؓ کے بعض امراء کے طرزِ عمل کے خلاف صوبوں کے عوام کو سخت شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں جس کے نتیجے میں بغاوت پھوٹ پڑی، باغی دارالخلافہ مدینہ منورہ پر چڑھ آئے اور مطالبہ کیا کہ حضرت عثمانؓ خلافت سے دست بردار ہو جائیں لیکن آپؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب باغی آپ کے قتل کے درپے ہوئے تو صحابہؓ نے آپ سے درخواست کی کہ آپ ان کو باغیوں سے لڑنے کی اجازت دیں، لیکن جس قطعیت سے آپ نے خلافت سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا تھا اسی قطعیت کے ساتھ باغیوں سے لڑنے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں نے آپ کو شہید کر دیا۔

جناب مدیر ایشیا نے نہ جانے کس ضرورت کے تحت حضرت عثمانؓ اور حضرت حسینؓ کی شہادتوں کا مقابلہ کیا ہے اور دلیل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی مظلومیت حضرت حسینؓ سے بڑھی ہوئی تھی، اور دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی پشت پر خلافت کی طاقت تھی اور حضرت حسینؓ بے کس تھے۔ اس بحث سے قطع نظر کر کے پھر اس دلیل کی رو سے زیادہ مظلومیت کی شہادت کس کی قرار دی جا سکتی ہے، اصل طریقہ شہادت پر غور کیجئے جسے جناب مدیر نے بعد کے ادوار والوں کے لئے نشانِ منزل قرار دیا ہے: بغاوت ہمیشہ بر بنائے حق ہی نہیں ہوتی اہلِ غرض اور شر پسند فاسد اغراض اور اپنی شر پسند سرشت کی بنا پر بھی فتنہ و فساد برپا کیا کرتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو بغاوت ہوئی اُسے بھی امت نے جائز قرار نہیں دیا۔ پھر اگر بعد کے ادوار والے حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل کو نشانِ منزل مان لیتے تو دنیا میں اسلامی حکومتیں بھلا کیسے کرتیں اور ان کا حشر کیا ہوا کرتا؟ اہلِ غرض اور سرکش لوگوں کو تو معلوم ہوتا کہ اسلامی اصولِ حکومت یہ ہے کہ صاحبِ حکومت کے خلاف بغاوت ہو تو وہ باغیوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرے۔ فوج مقابلہ بھی کرنا چاہے تو اسے روک دے یہاں تک کہ خود قتل ہو جائے لیکن بغاوت کو فرو کرنے کے لئے تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دے۔ ایسی صورت میں باغی اور سرکش اٹھا کرتے اور بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کی نکسیر بھی پھوٹے حکومت کو درہم برہم کر دیا کرتے۔ پھر کیا جناب مدیر کا حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل کو قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے نشانِ منزل قرار دینا صحیح ہے؟

(ایشیا)

واضح رہے کہ ہمارا سوال نہ حدیث نبویؐ کے متعلق تھا نہ حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل کے متعلق، ہمارے سوالوں کا تعلق جناب مدیر سے تھا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کربلا کے سانحے کے شہداء اور ماتم وگریہ کے مقابلہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا تذکرہ بہت کچھ دب کر رہ گیا ہے۔ (فاران)

کی فکر و فہم اور ان کی نکتہ سنجی اور رہنمائی سے ہے جو انھوں نے اُمتِ اسلامیہ کو فرمائی ہے اور جس پر تحسین و مرحبا کی بارش ہو رہی ہے۔ اور مولانا مودودیؒ کی تقریر کے حق میں کسی کے لب بھی نہیں ملتے، جس کی خود جناب مدیر ایشیا نے تائید و تحسین کی ہے۔

جناب مدیر کی رہنمائی اس ایک پہلو سے قابلِ غور نہیں ہے، انھوں نے حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل سے جو نتیجہ نکالا ہے اس کی زد خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی پڑتی ہے۔ وہ حضرت عثمان رضؓ کے بعد ہی خلیفہ ہوئے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ کے پیش کردہ نشانِ منزل کو اپنا رہنما نہیں بنایا۔ اگر وہ حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل کی پیروی کرتے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فوج کشی کے وقت خاموش بیٹھے رہتے۔ یا پھر حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل کے خلاف خلافت سے دست بردار ہو جاتے یا ان کے نشانِ منزل کی پابندی میں شہید! اس طرح حضرت عائشہ رضؓ کی مہم کے بعد حضرت معاویہؓ کے طرزِ عمل کے خلاف تلوار نہ اٹھاتے تو نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ شام پر اپنی آزاد حکومت قائم کر لیتے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے بعد مدینہ منورہ پر فوج کشی کرکے اس سے قبل ہی خلافتِ راشدہ کا خاتمہ کر دیتے جیسا ان کے ہاتھ سے وہ ختم ہوئی، اور اگر یہ نہ ہوتا، تو یہ ہو سکتا تھا۔ شام کی طرح دوسرے صوبے بھی آزاد ہو جاتے۔ اور خلافتِ راشدہ پارہ پارہ ہو جاتی

ہم نے اوپر کہا ہے کہ جناب مدیر نے حضرت عثمانؓ کے طرزِ عمل سے جو نتیجہ نکالا ہے اس کی زد حضرت علیؓ پر بھی پڑتی ہے، اس کی تفصیل آپ نے دیکھ لی۔ سوال جناب مدیر کی نیت کا نہیں۔ ان کی فکر و نظر کا ہے۔ اور وہ شاہد ہے کہ حضرت علیؓ اس کی زد میں آتے ہیں، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے بعد والوں کا گلہ کرتے ہوئے کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کے نمونے کی پیروی نہیں کی جناب مدیر تحریر فرماتے ہیں

”وہ (حضرت عثمانؓ) برسرِ اقتدار خلیفہ تھے۔ پورا نظام حکومت ان کے دست تصرف میں تھا۔ چند سو باغیوں کے علاوہ پوری امت اور تمام صحابہ ان کی پشت پر تھے۔ پوری فوجی طاقت ان کے اشارے کی منتظر تھی، مگر انھوں نے اس سارے سر و سامان سے مطلق کام نہ لیا۔ خلافت کے لئے تلوار اٹھانا تو در کنار انھوں نے اپنی جان بچانے کی کوشش بھی نہ کی، مدینہ چھوڑ کر دمشق نہ گئے، بلکہ اپنی قصرِ خلافت سے باہر بھی نہ نکلے۔ اور انتہائی بے بسی کے عالم میں شہید ہو گئے اور آنے والے مسلمان اربابِ اختیار کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ کے طرزِ عمل میں بہترین نمونہ ہے، انھوں نے بتایا کہ خدا اور اسی بات پر تلوار کو میان سے نکال لینا اور مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو پر آفت لے آنا سخت معیوب اور شرمناک ہے، اقتدار کی امانت اس لئے نہیں کہ اس کے لئے تمام مسلمانوں کا خون بہا دو۔“

بالکل سامنے کی بات ہے کہ حضرت عثمانؓ کے بعد ہی حضرت علی رضؓ خلیفہ ہوئے۔ انھوں نے ہی اپنی خلافت کے لئے بغاوت کے مقابلے میں تلوار اٹھائی، اور وہی مدینہ چھوڑ کر کوفہ گئے، انہیں پر یہ فتویٰ عائد ہوتا ہے کہ انھوں نے سکوت و درگزر کے مقابلے میں اُمت کی خونریزی کو ترجیح دی۔ یہی وہ فکر و نظر ہے اور اسلوب بیان ہے جس سے عباسی صاحب نے کام لیا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کو ہدف بھی بناؤ اور انہیں خطاکار بھی ٹھہراؤ۔ اور مسلمانوں سے خراجِ تحسین بھی وصول کرو۔

ابھی جناب مدیر ایشیا کے اس نشانِ منزل کا جائزہ ختم نہیں ہوا، موصوف نے حدیث نبویؐ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے

”مسلمانوں کی باہمی کش مکش میں اور آپس کے معاملات میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے، یہ کام کارِ نبوت سے زائد تھا اس کو صحابہ نے سرانجام دیا۔ ہر صحابی اس لحاظ سے ایک نشانِ منزل ہے“۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حضرت علیؓ بھی صحابی تھے، عشرہ مبشرہ، اصحاب بدر، اصحاب شجرہ، قدوۃ اصحاب خیبر، خلیفہ راشد، اور انھوں نے نہ صرف ایسے مسلمانوں کے خلاف جن کے خلاف حضرت عثمانؓ نے تلوار نہیں اٹھائی، بلکہ باستثنائے منصب خلافت ایسے بزرگوں کے خلاف تلوار اٹھائی جو مراتب و مدارج میں ان کے ہمسر تھے، اب غور کیجئے کہ ہر صحابی ایک نشانِ منزل ہے۔

اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں بزرگ جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور دونوں بزرگوں کا نشانِ منزل مسلمانوں کی ایک ہی سمت میں رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ اس حالت میں مسلمان کیا کریں؟ ذرا سوچئے تو سہی جناب مدیر ایشیا نے حدیث نبویؐ اور اسوۂ صحابہ کے نام سے مسلمانوں کو کس مقام پر لاکر ڈال دیا ہے؟ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن!

—×—

مسلمانوں کی راہ منزل کی دشواریاں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ مولانا مودودی نے اپنی تقریر میں بتایا ہے کہ اسلام کا اصولِ حکومت کیا ہے۔ اور جناب مدیر ایشیا کو بھی اس سے اختلاف نہیں بلکہ انہوں نے بھی اپنے لفظوں میں وہی بات بتائی ہے۔ بلکہ بعض تفصیلات و تعینات کے اضافے کے ساتھ بتائی ہے اب یہ دیکھئے کہ حضرت معاویہؓ بھی صحابی ہیں اور بقول جناب مدیر ایشیا ہر صحابی بجائے خود ایک نشانِ منزل ہے لیکن حضرت ابو بکرؓ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد نہیں کرتے، نامزد کرتے ہیں حضرت عمرؓ کو اور منظوری کا حق دیدیتے ہیں صحابہ کو، حضرت عمرؓ بھی اپنے صاحبزادے کو انتخابی کمیٹی میں داخل کرنے کے باوجود خلافت کی امیدواری کے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بھی اپنے بیٹے کو نہ صرف اپنا ولی عہد مقرر نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کی منظوری کی شرط کے ساتھ بھی نامزد نہیں کرتے مگر حضرت معاویہؓ یزید کو اپنا ولی عہد بنانے کے لئے اپنی شخصیت اور اپنی حکومت کے تمام وسائل کو استعمال کر ڈالتے ہیں یہاں تک کہ یزید ان کے بعد مسلمانوں کے کسی مشورہ کے بغیر مملکتِ اسلامیہ کا مختارِ مطلق مالک بن جاتا ہے اور اسلام کے شورائی اصولِ حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اب سوچئے کہ امت کے لئے خلفائے راشدین کا نمونۂ عمل نشانِ منزل ہے یا حضرت معاویہؓ کا؟ سمجھ کر جواب دیجئے، حضرت معاویہؓ بھی صحابی ہیں اور ہر صحابی نشانِ منزل ہے اب مسلمان کدھر چلیں؟ آپ دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اور دونوں راستوں پر نشانِ منزل نصب ہے، ایک خلفائے راشدین کا اور دوسرا حضرت معاویہؓ کا، بعد کے ادوار والے کس نشان کی طرف قدم بڑھائیں؟ ایک نشانِ منزل کو غلط مانے بغیر چارہ نہیں۔

لیجئے بیت المال کے مسئلے کو، وہ یتیموں کے مال کی طرح مسلمانوں کی امانت ہے، خلیفہ اس کا مالک نہیں، امین اور محافظ ہے، چاروں خلفائے راشدین نے بیت المال کو مسلمانوں ہی کا مال سمجھا، اسی کے مطابق عمل کیا، دوا کے لئے شہد بھی بیت المال سے لیا تو مسلمانوں کی منظوری سے لیا، مگر حضرت معاویہؓ کا طرز عمل بیت المال کے ساتھ ایسا نہیں رہا۔ اور بقول امام تیمیہؒ سمجھا یہ امت یہی طریقۂ تصرف نشانِ منزل بن گیا کہ جو بیت المال پر حق تصرف رکھتا ہے کہ جسے چاہے عطا کرے اور جسے چاہے محروم رکھے وہ امام ہے (خلافتِ معاویہؓ و یزید ص)

اب جناب مدیر ایشیا ہی بتا سکتے ہیں کہ بیت المال کے مسئلے میں خلفائے راشدین کا طرز عمل نشانِ منزل ہے یا حضرت معاویہؓ کا؟ اگر دونوں نشانِ منزل ہیں تو اسلامی اصولِ خلافت و حکومت کا کیا بنے گا جو خود جناب مدیر ایشیا کا تسلیم کردہ بلکہ پیش کردہ ہے؟

—×—

اب باری ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی، ان کے متعلق دیکھئے جناب مدیر کیا فرماتے ہیں اور کس انداز میں فرماتے ہیں:—

"خلفائے ثلٰثہ کے بعد امت کے لئے نہایت نازک موڑوں پر ہدایت کے نشانِ منزل قائم کرنے کا سہرا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر بندھتا ہے، اس موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔۔۔۔۔ نے جو تقریر کی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کے تمام ارشادات سے اتفاق ضروری نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے"

لہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسوہ بھی امت کے لئے نشانِ منزل ہے، اور کسی مسلمان فرمانروا اور حاکم کو ایسے حالات پیش آجائیں جو حضرت عثمانؓ کو پیش آئے تو ان حالات میں اسوۂ عثمان نشانِ منزل ہے (فاران)

حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے کارناموں کو بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور ان سے جو ہدایت و رہنمائی ملتی ہے اس کو بڑے
بچے تلے انداز میں امت کے سامنے رکھ دیا ہے۔

کیا اچھا ہوتا کہ جناب مدیر مولانا مودودی کی تقریر کا سہارا نہ لیتے اور جس تفصیل و وضاحت سے انھوں نے خلفائے ثلثہؓ کے نمونوں کو
کیا ہے خود اپنے لفظوں میں حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کے نمونوں کو بھی پیش کرتے تو بات بالکل واضح اور صاف ہو جاتی۔ لیکن انھوں
سا کی بجائے مولانا مودودی کی تقریر کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ان کی تائید و تحسین کرتے ہوئے ان سے اختلاف کرنے کی گنجائش بھی
لی ہے، پھر یہ کیسے سمجھا جائے کہ جناب مدیر کو مولانا کی کن باتوں سے اتفاق ہے اور کن باتوں سے اختلاف؟ اور اس طرح انھوں نے حضرت علیؓ
ضرت امام حسینؓ کے نشانِ ہائے منزل کو خود مشتبہ کر دیا ہے، خصوصاً اس لئے کہ اسی سلسلۂ بحث میں عباسی صاحب کی "خلافتِ معاویہؓ
ید" اور "تحقیق مزید" کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے کہ "ان کی قدر و قیمت کا اعتراف کئے بغیر بھی چارہ نہیں" اس مرحلے پر ہم پھر کہیں گے
نا مودودی اور عباسی صاحب کا نقطۂ نظر یکساں نہیں بلکہ متضاد ہے، مولانا مودودی مشرق کی کہتے ہیں اور عباسی صاحب مغرب
م اپنی بات کی ذرا وضاحت کر دیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کے جس نشانِ منزل کا سہرا باندھتا ہے اور ان دونوں بزرگوں کے
کارنامے ہیں وہ یہ ہیں:-

حضرت علیؓ نے خلافتِ حقہ کے تحفظ کے لئے ہر اس طاقت کے خلاف جنگ کی جس سے اس کو خطرہ لاحق ہوا۔ یہاں تک کہ ایک خارجی نے
شہید کر دیا۔

حضرت امام حسینؓ حکومتِ باطلہ کو ہٹا کر اس کے مقام پر خلافت حقہ قائم کرنے کے لئے اٹھے اور اس راہ میں انھوں نے سب کچھ قربان کر دیا
صل ہے مولانا مودودی کی تقریر کا، اور عباسی صاحب کی "خلافتِ معاویہؓ و یزید" اور "تحقیقِ مزید" از صفحہ اول تا صفحہ آخر
علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کے انہیں سہروں اور کارناموں کی نوچ کھسوٹ تنقیص و تکذیب اور تحقیر و توہین ہے، اس سے صاف نظر
جناب مدیر الشیا ایک پاؤں سے حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ اور مولانا مودودی کے ہم رکاب ہیں اور دوسرے پاؤں سے حضرت
یزید اور عباسی صاحب کے ساتھ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جناب مدیر حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے سروں پر نشانِ منزل
ے باندھنے والے بھی ہیں اور ان سہروں کو نوچ کر پھینک دینے والوں کے بھی ہم نوا ہیں۔

ہم یہ بات بطور نتیجہ نہیں کہتے، جناب مدیر نے جو مولانا مودودی کی تائید و تحسین کے ساتھ ان سے اختلاف کی گنجائش نکالی ہے
پورا پورا کام لیا ہے اور ایک طویل بحث کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے باہمی اختلاف
میں اندر وئے حق دونوں طرف کے پلڑے برابر تھے اگر حضرت علیؓ اپنی خلافت منوانے میں برسرِ حق تھے تو خلافتِ معاویہؓ بھی طلب
اور حضرت علیؓ کی خلافت کے انعقاد سے انکار کرنے اور ان کو خلیفہ نہ ماننے میں برسرِ حق تھے۔ بلکہ جناب مدیر کی بحث کی رُو سے
علیؓ کا دعویٰ بے دلیل تھا اور حضرت معاویہؓ کے دعوے کے ساتھ دلائل تھے۔ پتہ نہیں اس بحث کے بعد وہ کونسا سہرا ہے جو جناب
رت علیؓ کے سر پر دیکھتے ہیں اور وہ کونسی بات ہے جس میں وہ مولانا مودودی کی تائید و ستائش کرتے ہیں؟ موصوف کی یہ بحث
ودودی کی تقریر سے بر ملا اختلاف ہے۔ ایسی ہی بحث عباسی صاحب کے حامی مدیر تجلی وغیرہ فاضلین بھی کیا کرتے ہیں حضرت
حضرت امام حسینؓ کی فضیلت و بزرگی کا اقرار بھی کرتے جاتے ہیں اور حضرت معاویہؓ کی صحابیت کے سہارے ان کی کسرِ شان اور
ہی۔ یہی وجہ ہے کہ جو ہم جیسے لوگوں کو اس بحث میں حصہ لینا پڑتا ہے، اگر وہ اس سے بچ کر حضرت معاویہؓ کے فضائل و محامد
یں تو ہم خود ان کی ہمنوائی کر سکتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مولانا مودودی سے کوئی اختلاف نہ کرے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ حق دو نہیں ہوتا، وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اور وہ صرف حضرت علیؓ کے ساتھ تھا۔ مولانا مودودی اپنی رائے میں تنہا نہیں، عام علمائے امت کی یہی رائے ہے۔ اب جس سے جس کو اتفاق یا اختلاف کرنا ہو وہ دل و دماغ اور فکر و نظر کی یکسوئی کے ساتھ عمل کرے۔

جناب مدیر ایشیا جنگ جمل اور جنگ صفین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بالآخر ثالثی کے ذریعے ان کا خاتمہ اس بات پر ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے زیر نگیں علاقے پر حاکم رہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے زیر نگیں علاقے پر، اور امت کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہو جائے۔"

"اب دیکھئے اس بارے میں عباسی صاحب کی تحقیق کیا بتاتی ہے، لکھتے ہیں:۔

ثالثوں نے باتفاق رائے سے حضرت علیؓ کو منصب خلافت سے معزول کر کے نئے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اہل حل و عقد کے مشورے پر منحصر کر دیا۔ اور یہ قرار دیا کہ جب تک انتخاب خلیفہ کی کارروائی مکمل نہ ہو فریقین اپنے اپنے مقبوضہ علاقے پر قائم رہیں۔"

یہ ہے عباسی صاحب کی تحقیق کہ ثالثوں نے اتفاق رائے سے حضرت علیؓ کو معزول کر کے۔ ان کا اپنے مقبوضہ علاقے پر قائم رہنا محض عارضی اور عبوری زمانے تک کے لئے تھا۔ اور یہی وہ تحقیق ہے جس کی قدر و قیمت کا اعتراف کئے بغیر مدیر ایشیا کو چارہ نظر نہیں آتا۔ حالانکہ محقق ابن خلدون نے جو صورت واقعہ بیان کی ہے وہ جناب مدیر اور عباسی صاحب دونوں کے بیان کے خلاف ہے۔ حضرت علیؓ کے نمائندے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ کے نمائندے حضرت عمرو بن العاصؓ تھے، دونوں صاحبوں نے پہلے تخلئے میں گفتگو کی۔ ابن العاصؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو معزول کر کے کسی تیسرے کے انتخاب کا معاملہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ فیصلہ کر کے دونوں حضرات باہر نکلے، حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ سے کہا۔ آپ بزرگ ہیں۔ پہلے آپ فیصلہ سنایئے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے کھڑے ہو کر فیصلہ سنا دیا۔ ان کے بعد حضرت ابن العاصؓ نے کھڑے ہوتے اور کہا۔ آپ لوگوں نے سنا۔ علیؓ کے نمائندے نے ان کو معزول کر دیا۔ میں معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔ اس پر حضرت ابو موسیٰؓ نے ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ دوسری طرف سے بھی برابر کا جواب دیا گیا۔ بعض لوگوں نے بیچ بچاؤ نہ کر دیا ہوتا تو وہیں تلوار چل جاتی۔ اس طرح ثالثی بے نتیجہ ختم ہو گئی اور دونوں فریق اپنے اپنے مقبوضات پر قائم رہ گئے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جناب مدیر ایشیا نے نہ معلوم کس جذبہ اور کس تاثر کے تحت جس طرح حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے معاملے میں بھی لیپا پوتی سے کام لیا ہے اسی طرح حضرت امام حسینؓ اور یزید کے معاملے میں بھی غلط بحث کیا ہے۔ انھوں نے حضرت شیخ جیلانیؒ اور امام غزالیؒ کے حوالوں کے ساتھ جو نصیحت فرمائی ہے اس کی گفتگو سلسلہ کلام میں اوپر آ چکی ہے۔ ان کے انداز بحث کا ایک نمونہ یہاں دیکھئے۔ فرماتے ہیں:۔

"کربلا کے واقعے سے لے کر صدیوں تک اس دور کی تاریخ سیاسی پروپیگنڈے کا موضوع رہی ہے، اور جیسا کہ امام تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور مورخ ابن خلدون نے اور بعض دوسرے جلیل القدر ائمہ نے صراحت کی ہے صورت حال کی نزاکت وہ نہیں جو شیعی مبلغوں، واعظوں اور کذاب راویوں نے اپنے مخصوص اغراض کے لئے تیار کر دی۔ سادہ لوحی یا بے علم مورخوں نے اس کو تاریخ کا نام دے دیا یہاں تک کہ اہل سنت بھی اس سے متاثر ہو گئے اور وہ بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت

محسوس کرنے لگے کہ حضرت معاویہؓ کی مذمت کریں اور یزید کے فسق و فجور پر کس طرح ایمان لائیں گویا انھوں نے بچشم خود یزید کو شراب پیتے زنا کرتے، کتے پالتے، اور بندر کھیلتے دیکھا ہے۔

حضرت امام حسینؓ کے طرزِ عمل کو نشانِ منزل قرار دینا اور اس کے ساتھ ہی یزید کی یہ وکالت دشمنِ علما اور اکابر تک کو ڈانٹ پھٹکار لیا جاتی، واقعہ کربلا اور آلِ رسولؐ کی قربانیوں کی قدر و قیمت کو گھٹانا اور یزید کو پاک صاف ثابت کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی عباسی صاحب نے بھی کیا ہے، اور ہمیں یہ کہنے کے لئے معذور سمجھئے کہ جناب مدیر ایشیا نے عباسی صاحب کی مکھی ہی پر مکھی ماری ہے، سبائیوں، رافضیوں اور کذابوں کے نام سے کہ جو لوگ سانحۂ کربلا کی اہمیت کو گھٹانے اور آلِ رسولؐ کے پاک خون کی قدر و قیمت کو بے قدر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ سبائیوں، رافضیوں اور کذابوں نے سانحۂ کربلا کی تفصیلات میں مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کی ہے یا سرے سے سانحۂ کربلا ہی کذب و افتراء ہے؟ کیا میدانِ کربلا میں حضور رحمۃ للعالمین کے جگر گوشوں، حضرت سیدۃ الزہراؓ کے کلیجے کے ٹکڑوں، حضرت علی مرتضیٰؓ کے نونہالوں کو بے دریغ تہ تیغ نہیں کیا گیا؟ کیا حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی اولاد ذبح نہیں کی گئی؟ کیا حضرت امام حسینؓ کا سرِ مبارک کاٹا نہیں گیا؟ کیا ابنِ زیاد کے دربار میں اس کے ساتھ بے ادبی نہیں کی گئی؟ کیا بحیثیتِ مجموعی آلِ رسولؐ کے لہلہاتے ہوئے چمن کو تاخت و تاراج کر کے رکھ نہیں دیا گیا؟ کیا یہ سب کذب و افترا ہے؟ خالص پروپیگنڈا ہے؟ اس کا ذکر و بیان مکھی پر مکھی مارنا ہے؟ آخر کس سنی نے حضرت معاویہؓ کی مذمت کرنے کے لئے کونسا جھوٹ گھڑا ہے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے خلافتِ راشدہ کے خلاف بغاوت کی اور بالآخر وہ انھیں کے ہاتھ پر ختم ہو گئی؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے خلافت کی جگہ ملوکیت قائم کی، اور اس کو خاندانی میراث بنا کر یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ اصحابِ عشرہ مبشرہ، اصحابِ بدر اور اصحابِ شجرہ حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے ہوتے ہوئے یزید کو امیر المومنین، امیرِ جہاد اور خلیفہ بنایا جو ان حضرات کی موجودگی میں کسی طرح ان مناصب کا اہل نہ تھا؟

جناب مدیر ایشیا کو کیا معلوم ہے کہ علامہ ابن خلدون نے واقعہ کربلا کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ انھوں نے عباسی صاحب کی "خلافتِ معاویہ و یزید" کو بھی دیکھنے کی طرح نہ دیکھا اور اس کی قدر و قیمت کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس میں بالوضاحت لکھا ہوا ہے کہ ابن خلدون کی تاریخ سے واقعہ کربلا کا حصہ ہی اڑا دیا گیا۔ آخر جناب مدیر کے ہاتھ وہ کہاں سے آ گیا؟ البتہ اگر موصوف نے ہماری کتاب کو دیکھا ہوتا تو ان کو اس میں نظر آ جاتا کہ خلدون نے اپنے مقدمہ میں حضرت امام حسینؓ کو مظلوم، برسرِ حق اور شہید لکھا ہے اور یزید کو ظالم فاسق، فاجر اور نا مستحقِ خلافت قرار دیا ہے، انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یزید اس لائق نہ تھا کہ اس کی حکومت کے تحت جہاد جائز ہو۔

جناب مدیر ایشیا نے جس انداز میں یزید کی صفائی پیش کی ہے اور اس پر الزام لگانے والوں کے متعلق لکھا ہے کہ گویا انھوں نے یزید کو ان افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کرتے دیکھا ہو اس انداز میں صفائی پیش کرنے والوں کے متعلق ہم بھی لکھ سکتے ہیں کہ گویا وہ یزید کے پرائیویٹ سکریٹری رہ چکے ہوں۔ قلمی کیمیا سازی سے مس خام کو کندن نہیں بنایا جا سکتا۔ عباسی صاحب کی ہم نوائی میں یہ کہنے والے تو ملتے ہیں کہ واقعات کربلا سے متعلق روایات سبائی اور رافضی کذابوں کا پروپیگنڈا ہے مگر ایسا کوئی بندۂ حق نہیں ملتا جو صحیح تاریخی حقائق کی روشنی میں صحیح واقعات پیش کرے۔ وہ آلِ رسولؐ کے خون کو یزید اور یزیدیوں کے دامن سے مٹانے ہی کو سب سے بڑا حق سمجھتا ہے، عباسی صاحب نے بھی یہی کوشش کی ہے۔ یہ کتنی بڑی ناحق کوشی ہے اسے میری کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جناب مدیر ایشیا نے "خلافتِ معاویہؓ و یزید" اور "تحقیقِ مزید" کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے کے بعد متصلاً تحریر فرمایا ہے:

"جس نازک دور سے اس وقت امت گذر رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ پہلے دور کے سیاسی پروپگنڈے بغض وعناد اور اختلاف و انشقاق کی جو زہریلی دھول اڑائی ہے اس کو سراسر نظر انداز کر کے اتحادِ امت کے لئے وہ نقطۂ نگاہ رائج کیا جائے جس سے نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اصل کارنامے کی اہمیت کم ہو اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق بدگمانی پیدا ہو۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیر ایشیا نے کس عالم میں یہ افتتاحیہ لکھا ہے۔ جن نازک دور سے امت گذر رہی ہے اس میں بغض وعناد اور اختلاف وانشقاق سے بھری ہوئی کتابیں تو عباسی صاحب نے شائع کی ہیں جن سے پاک و ہند دونوں ملکوں کی فضا زہر آلود ہوگئی ہے، شیعوں سے قطع نظر سنیوں میں ایک شدید اضطراب پیدا ہو گیا ہے، اور جن علمائے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے معاملے میں کبھی ایک لفظ نہ لکھا تھا وہ پوری پوری بحث اور مستقل کتاب لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ اور یزید کے معاملات سے تو صحابہؓ کا کوئی تعلق ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ یزید کو برسرِ حق اور حضرت امام حسینؓ کو برسرِ ناحق ثابت کرنے کے لئے صحابہؓ کو تو عباسی صاحب نے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے یزید ہی کو خلیفۂ راشد ثابت کرنے کے لئے تاکہ جس اُمّ مطلق کے ہاتھ بھی اقتدار کی زمام آجائے اسے مرکزِ ملت قرار دینے کے لئے عباسی صاحب نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو بھی ذریعہ بنایا ہے ۲۷۴ صفحے کی کتاب میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ سے متعلق صرف ۱۶ صفحے ہیں باقی کتاب یزید کے فضائل و محامد میں ہے۔ جناب مدیر ایشیا کی بالغ نظری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ عباسی صاحب کی کتابوں کی دھجیاں اُڑا دیتے۔ اور ان کو بدترین فتنہ انگیز ثابت کر کے اس لائق نہ رہنے دیتے کہ کوئی مسلمان ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھتا۔ لیکن وہ اُلٹے ان کے حامی اور ہم نوا ہو گئے۔ ہم جناب مدیر ایشیا سے درخواست کریں گے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ کیا عباسی صاحب کی کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" سے پہلے بھی سنیوں میں حضرت معاویہؓ کی ذات اس طرح زیر بحث آئی تھی اور جرح و تنقید بنی تھی جس طرح اس کتاب کی بدولت بنی؟ وہ فتنے کی جڑ کا تو استیصال نہیں کرتے اسکے اثرات پر برس پڑتے ہیں "خلافتِ معاویہؓ و یزید" کی اشاعت ان کو خوبی نظر آتی ہے۔ مگر وہ عام طور پر کیسا تاثر پیدا کرتی ہے اسے ہم جانتے ہیں ہماری کتابوں کو پڑھ کر لوگوں نے ہمیں لکھا ہے کہ وہ "خلافتِ معاویہؓ و یزید" پڑھ کر حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے سخت بدعقیدہ ہو گئے تھے، ہماری کتابوں کے مطالعہ سے ان کی غلط فہمی دور ہوئی، مشہور شاعرِ اسلام فاروق بانس پاری صاحب سے جناب مدیر ایشیا خوب واقف ہیں انھوں نے بھی حال ہی میں بیان کیا کہ بنارس کے انہیں کے ایک دوست سے ایک ہندو وکیل نے واقعہ کربلا سے متعلق کتاب مانگی۔ انھوں نے "خلافتِ معاویہؓ و یزید" اٹھا کر دے دی۔ اس وکیل نے کتاب واپس کرتے ہوئے اپنا تاثر ظاہر کیا تو کہا۔ ہم تو علیؓ اور حسینؓ کو بزرگ اور نہایت نیک انسان سمجھتے تھے۔ مگر اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ تو ڈاکو اور لٹیرے قسم کے انسان تھے؟

صحابہ کرامؓ کے متعلق ہدایت کرتے ہوئے جناب مدیر نے افتتاحیہ کا اختتام اس طرح کیا ہے:۔

"ان میں سے اگر کسی سے کوئی غلطی بھی سرزد ہوئی تو پوری نیک نیتی کے ساتھ، اور ان کی اجتہادی غلطیاں بھی ہمارے لئے سامانِ ہدایت نہیں، نشاناتِ منزل ہیں۔ رضی اللہ عنہم۔"

جنابِ مدیر کی اس رائے سے اصولاً کسی کو اختلاف نہ ہوگا، لیکن یہ امت کا عقیدہ ہے کہ معصوم ذات صرف رسولؐ کی ہے حضورؐ ہی معیارِ حق ہیں۔ اس اصول پر برسوں جماعتِ اسلامی کی مخالفت ہوئی ہے اور جماعت اس موقف پر آج تک قائم ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے اللہ اور رسول اور اولوالامر کی اطاعت کرو مگر اولوالامر سے کسی بات میں نزاع ہو جائے تو فیصلے کے لئے اس نزاع کو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹا دو۔ اسی حق سے خلفائے راشدین سے بھی وقت کے حضرات نے اختلاف کیا ہے اور ان کو بعض اوقات

اللہ و رسول کا فیصلہ ماننا پڑتا ہے، قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے یہی اصول ہے، جب صحابہ کے درمیان اختلاف پایا جائے تو اس فریق کی بات مان لی جائے گی جس کی بات اللہ و رسول کی بات سے زیادہ قریب ہوگی، صحابہ کی نیت کا کوئی سوال نہیں، نیت کا تعلق اللہ سے ہے، لیکن کسی سے حسن ظن کی بنا پر اسلامی اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا نہ ان کو توڑا موڑا جاسکتا ہے، اگر اسلام کی حرمت قائم نہ رہی تو کسی کی حرمت باقی نہ رہے گی۔ سب محترم اسلام ہی کی وجہ سے محترم ہیں۔ یہ بات صاف ہوجانی چاہیئے کہ ہمارے محترمین کی اجتہادی غلطیوں میں خواہ وہ صحابہؓ ہوں یا ائمہ جو نیک نیتی سے ہوئیں ہمارے لئے کیا سامانِ ہدایت اور کیا نشاناتِ منزل ہیں؟ کیا ہمیں ان کی اجتہادی غلطیوں کی بھی تائید اور ان کی بھی پیروی کرنی چاہیئے؟

سامنے کی بات یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ نے حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت کے احیاء کی تمنا نہیں کی' وہ خلافتِ راشدہ کے احیاء کی ہمیشہ تمنا کرتی رہی ہے۔ اور اُمت کے اس اجماع نے خلافتِ راشدہ اور ملوکیتِ معاویہؓ کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے!

-×-

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

جواب میں!

مکرمی۔ السّلام علیکم!

اگست کا فاران کل ایک دوست سے لے کر پڑھا۔ غالباً آپ نے بھی دوسرا مجھے بھیجدیا ہوگا شاید آجکل میں مل جائے گا پہلا معلوم کہاں غائب ہوگیا۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے ورنہ برابر ملتا رہا ہے۔

اس شمارے میں شریف حسن صاحب کا اعتراض نامہ "غلطیہائے مضامین" بھی نظر سے گزرا۔ اس کی وجہ سے یہ خط آپ کو لکھنا پڑا میں شریف صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کسی صورت میں بھی ہو میرے مضمون اور مجھے لائق التفات سمجھا بقول غالب

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یہ انکا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے میری ایک بہت پرانی غلطی سے مجھے آگاہ کردیا۔ اور میں ایک مخلص آدمی سے یہی توقع رکھتا ہوں۔ شریف صاحب نے میری غلطیوں سے لطف بھی خوب اٹھایا ہے اور مجھے ایک "صید زبوں" سمجھ کر کچوکے بھی خوب دیئے ہیں۔ یہ بھی شکر کا مقام ہی ہے میں نے ان کے طنزیہ جملوں سے بھی لطف اٹھایا ہے۔

بہرحال شریف صاحب کی یہ توجہ اور التفات میرے لئے باعث مسرت ہے۔ اگر وہ مجھے لائق اعتنا ہی نہ سمجھتے تو میں کیا کر لیتا۔

اب میں شریف صاحب کے اعتراضات کا جواب پیش کرتا ہوں:۔

(۱) میں نے یہ شعر علامہ اقبال سے منسوب کیا تھا:۔

زلفِ آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب تیری صورت سے تجھے دردآشنا سمجھا تھا میں

دراصل ہوا یہ کہ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے کسی رسالے میں یہ بحث پڑھی تھی کہ آشنا اور کارواں کا قافیہ جائز ہوسکتا ہے یا نہیں کسی صاحب نے یہ لکھا تھا کہ اگر پہلے جائز نہیں تھا تو اب جائز ہے کیوں کہ علامہ نے کارواں کے ساتھ آشنا کو باندھا، غالباً یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے، اس مضمون میں یہ بھی تھا کہ علامہ مرحوم نے یہ شعر دوسری اشاعت میں غزل سے نکال دیا۔ وہیں سے یہ غلط فہمی میرے ذہن میں راسخ ہوگئی جو آج شریف صاحب کی وجہ سے دور ہوئی، تاشیر صاحب کا مجموعہ "آتش کدہ" ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ ورنہ یہ غلطی رفع ہوجاتی۔

(۲) شریف صاحب نے فرمایا کہ میں نے مذکورہ شعر کو ابتدائی دور کا لکھا ہے۔ حالانکہ وہ "بالِ جبریل" کا شعر ہے۔ یہ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ یہ شعر بالِ جبریل کا ہے۔ میں نے اس کو اس جملے کے بعد پیش کیا ہے "مثلاً مجاز کے رنگ میں یہ شعر" میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ابتدائی دور کا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ مجاز کے رنگ میں ہے۔ میں نے اپنی تحریر میں اس جملے کے بعد "لیکن رموز و علائم کی پابندی کبھی جملے کے اختتام کی نشانی لگائی ہوگی۔

(۳) شریف احسن صاحب نے یہ فرمایا کہ "استدلال کی وہ عمارت جو زلف آوارہ والے شعر کی بنیاد پر اٹھائی گئی خود بخود منہدم ہوجاتی ہے۔ آشنا اور کارواں ہم قافیہ نہیں ہوسکتے (م۔ ق)

ہادران کا یہ دعویٰ محتاج ثبوت رہ جاتا ہے کہ علامہ کبھی اس انداز میں شعر کہتے تھے۔ اس کی مثالیں نہیں کلامِ اقبال سے پیش کرنی
ہئیں جن میں شاید انہیں کامیابی نہ ہوتی۔ مجھے تعجب ہے کہ علامہ کے کلام سے اس قدر شغف رکھنے والے شریف صاحب کو جو کہ ایک
شعر کے متعلق استدلال کے لئے ایک دلچسپ واقعہ بیان کر سکتے ہیں (گو اس واقعہ کی کوئی سند یا حوالہ پیش نہیں کیا) اور پورا ایک
دلچسپ مضمون لکھ سکتے ہیں وہ یہ دعوےٰ کر ڈالیں کہ میں کلامِ اقبالؔ میں سے ایک شعر بھی مجاز کے رنگ میں پیش نہیں کر سکتا۔ استدلال
یطور پر چند اشعار غزل کے اور چند نظم کے پیش کرتا ہوں۔ شاید ان کی تشریح کسی طرح حقیقت کے رنگ میں ممکن نہیں۔ یوں عقیدت
مند لوگ حافظ کے اس شعر کو بھی حقیقت کے رنگ میں ہی بیان کرتے ہیں۔ جس کا کوئی علاج نہیں ؎

مئے دو سالہ و معشوقِ چاردہ سالہ   مرا بس است ہمیں صحبتِ صغیر و کبیر

علامہ کے مجازی رنگ میں غزل کے اشعار حسب ذیل بانگِ درا میں موجود ہیں: ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی   مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا   تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبالؔ تیرا   فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

—×—

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی   کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیوں کر ہوا
موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق   چارہ گر دیوانہ ہے میں لا دوا کیوں کر ہوا
علاجِ درد میں بھی لذتِ سوزن پہ مرتا ہوں   جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی   نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق ہم نشیں   پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی
جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی لطفِ تمنا بھی   ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے
زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی   سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

میرا خیال ہے کہ نظموں کے اشعار کا حوالہ دوں گا تو خط بہت طویل ہو جائے گا۔ صرف یہ عرض کر دوں کہ بانگِ درا کی نظم "۔۔۔" کی
دمیں بلّی دیکھ کر" کی توجیہ عرفانی رنگ میں کس طرح ہوگی۔ اسی طرح "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" اور "سلیمیٰ" بھی شریف صاحب
کی توجہ کی طالب ہیں۔

(۴) شریف حسن صاحب نے میرے لفظ دیوان لکھنے پر خوب خوب طنز کی ہے۔ غالباً علامہ کے کلام میں مجاز کا ایک بھی شعر نہ ہونے
کے دعویٰ اور دیوان لکھنے پر مذاق اڑانے کا شوق فتح مندی کے جذبے کے زور میں پیدا ہو گیا۔ مجھے اس میں بھی لطف آیا اور اس کے
لئے میں شریف حسن صاحب کا شکر گزار ہوں۔ اس سلسلے میں یہ عرض کر دوں گا کہ یہ لفظ میں نے سہواً یا جہالت کی وجہ سے نہیں لکھا
تھا۔ میں نے بعض معتبر لغات میں دیوان کے معنی مجموعۂ کلام کے دیکھے ہیں۔ کوئی بہت اچھی اور مستند لغت تو اس وقت
میرے پاس نہیں ہے۔ کالج کی لائبریری بند ہے ورنہ وہاں دیکھتا البتہ دو لغات میرے پاس ہیں ان کا حوالہ میں سردست پیش

کر سکتا ہوں ان میں سے ایک ہے۔ معجم العربیہ ولیم ٹامسن کی جس کو "پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس" نے شائع کیا ہے۔ اس میں دیوان کے معنی دفتر۔ مجموعۂ اشعار۔ کسی مصنف کا (دیوان) موجود ہیں۔

دوسری ایک بہت پرانی لغت میرے پاس ہے۔ فارسی الفاظ کے معنی انگریزی میں دیتے ہیں نام اس کا معلوم نہیں شروع اور آخر کے چند اوراق غائب ہیں لیکن کوئی اچھی لغت معلوم ہوتی ہے بڑے سائز کے ڈیڑھ ہزار صفحات ہیں۔ ایک صفحے کے تین تین کالم ہیں۔ اس میں دیوان کے معنی حسب ذیل دیتے ہیں۔

'A complete series of odes or other poems by one author .. also the collection of the works of one author in prose as well ..'

(یعنی کسی شاعر کی غزلیات یا دوسری نظموں کا مجموعہ۔ نیز کسی مصنف کے کلام و نثر و نظم کا مجموعہ)

اس کے علاوہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر وحید صاحب قریشی پروفیسر اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور پر بھی کسی نے اسی قسم کا اعتراض کیا تھا تو انھوں نے مجھے دو لغات میں دیوان کے معنی دکھائے تھے۔ ان میں بھی یہ لکھا ہوا تھا کہ دیوان میں غزل کے علاوہ دوسری نظمیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک لغت تہران کی چھپی ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر صاحب نے قتیل اور آنندراج کا نام لیا تھا۔ اگر شریف صاحب چاہیں گے تو میں ڈاکٹر صاحب سے دریافت کر کے انہیں لکھ دوں گا۔ اس کے علاوہ علامہ کی غزلیں علیحدہ تو چھپی نہیں ہیں۔ جس کتاب میں غزلیں چھپی ہیں اس کو اگر میں نے شریف صاحب کے معنی میں لیتے ہوئے دیوان لکھ دیا تو کوئی ایسی بڑی تقصیر نہیں معلوم ہوتی کہ اس کو مختصر سی عبارت میں سات آٹھ دفعہ دہرایا گیا اور طنز میں تیزی پیدا کرنے کے لئے بریکٹ لگا کر سوالیہ نشان سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔

محمد حسام اللہ قریشی

مہابھارت کی اخلاقی تعلیمات

ایک عرصے سے تاریخ ہند کی کتابوں میں مہابھارت کا تذکرہ پڑھتے چلے آئے تھے کہ اس کتاب پر بڑی حد تک ہندوستان کی قدیم تاریخ کا انحصار ہے۔ اسی وقت سے مسلسل یہ خیال رہتا تھا کہ اگر کہیں سے یہ کتاب دستیاب ہوجائے تو اس کا مطالعہ کرکے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اب ایک خلیلِ صادق اور حبیبِ مخلص کے ذریعے اس حسرتِ دیرینہ اور اس ذوقِ قدیم کی تکمیل ہوئی تو ارادہ ہوا کہ اپنے اس استفادہ سے دوسرے لوگوں کو بھی مستفید کیا جاسکے۔

ہنود، مہابھارت کو قریب قریب وہی درجہ دیتے ہیں جو اہلِ اسلام میں انبیاء کے قصص کو حاصل ہے۔ اس میں وعظ و نصیحت بھی ہے اور احکام و قوانین کا تذکرہ بھی بڑی خوبی اور وضاحت سے موجود ہے اور اسی حصہ کتاب میں سے میں نے بعض باتیں اخذ کرکے آپ تک پہنچانے کی ناکام سی کوشش کی ہے ـــــ ہندوؤں میں ہر زمانے میں اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ مشہور ہندو عالم پنڈت وشیم پائن فرماتے ہیں :۔ "مہابھارت میں علم، معرفت، مواعظ و نصائح کے جواہرات بیش بہا ملتے ہیں۔ یہ پرانوں اور بیدوں کا خلاصہ ہے۔ اس میں ایسی باتیں، جو انسان کو اس کے مقصدِ اصلی تک پہنچا دیتی ہیں، موجود ہیں۔" ایک دوسرے ہندو عالم اور اردو کے مشہور شاعر ادیب جناب پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی اپنی کتاب "مضامینِ چکبست" میں جگہ جگہ مہابھارت کا تذکرہ بڑی عقیدت اور ایک مقدس اور مذہبی کتاب کی حیثیت سے کرتے ہیں ـــــ علامہ البیرونی اپنی مشہور زمانہ تصنیف "کتاب الہند" میں کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے مستند مجموعہ ہے، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ذیل میں ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں :۔

"ولہم کتاب یبلغ من تفخیمہم شانہ انہم یبتون الحکم بان ما یوجد فی غیرہ فہو لا محالۃ موجود فیہ ولیس کل ما فیہ بموجود فی غیرہ ثم اسمہ بھارت عملہ بیاس بن پراشر فی ایام الحرب الکبیر بین اولاد پانڈو وبین اولاد کورو ویشار الی تلک الایام بہذا الاسم ایضاً والکتاب مائۃ الف شلوک فی ثمان عشرہ قطعۃ تسمی کل واحدۃ پرب"

کتاب الہند صفحہ ۶۴ مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء

"ہندوؤں میں ایک کتاب ہے جس کی عظمت ان لوگوں میں اس درجہ ہے کہ ان کا قطعی فیصلہ ہے کہ جو کچھ دوسری کتابوں میں ہے، وہ سب اس میں یقیناً موجود ہے لیکن جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے وہ سب کسی دوسری کتاب میں موجود نہیں۔ اس کتاب کا نام بھارت ہے اس کو پراشر کے بیٹے بیاس نے پانڈو اور کورو کی اولاد کی بڑی جنگ یعنی مہابھارت کے زمانے میں تصنیف کیا ہے۔ آج تک مہابھارت ہی کے نام سے اس زمانے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اٹھارہ حصوں کے اندر ایک لاکھ اشلوک ہیں۔ ہر حصے کو "پرب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔"

ایک بات یہ بھی ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ مہابھارت کا زمانہ تصنیف آج سے قریباً پانچ ہزار باسٹھ برس بیشتر کا ہے۔

فرمانروائے ہند اکبر کی مجلسِ علمی کے رکن عظیم فیضی نے مہابھارت کو سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا اور اس کے بعد ایک ترجمہ انگریزی میں اور چند تراجم اردو میں شائع ہوئے۔ اگرچہ بعض اردو ترجمے مسلمانوں کے قلم سے بھی نکلے لیکن نشر و اشاعت کا سارا کام

ہندوؤں نے ہی سرانجام دیا۔
فیضی کے ترجمے ہی سے میں نے استفادہ کیا ہے رسالہ طباعت ۱۹۱۹ء اور لاہور سے شائع کیا گیا ہے۔
اس مختصر سے تعارف کے بعد مہابھارت کی اخلاقی تعلیمات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا ——— لیجئے ملاحظہ فرمائیے:۔

"یہ شراب ایسی بُری چیز ہے کہ جو کوئی اسے استعمال کرتا ہے اس کی عقل زائل ہوجاتی ہے۔ میں آج سے برہمنوں پر شراب حرام کرتا ہوں۔ اور شری نرائن جی سے درخواست کرتا ہوں کہ اب اگر آئندہ کوئی برہمن شراب پیئے تو اُس کی ساری عمر کی نیکیاں بیکار اور ضائع ہوجائیں"۔ (پہلا پرب صفحہ ۱۲۳)

"پانچ مقامات ایسے ہیں جہاں جھوٹ بولنا جائز ہے اور اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک ساتھیوں اور دوستوں کی مجلس میں بطور ہنسی مذاق۔ دوسرے بیوی کی خوشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ تیسرے شادی بیاہ میں سمدھیوں کا ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے وقت۔ چوتھے اُس وقت جب ظالم کو کسی پر ظلم کرتے دیکھے اور وہ اُس مظلوم کے قتل کے درپے ہو، اُس مظلوم کی جان بچانے کے لئے، پانچویں کسی عام فتنے کے فرو کرنے کے لئے۔ ان پانچوں صورتوں میں جھوٹ بولنا دُرست ہے"۔ (پہلا باب صفحہ ۱۳۵-۱۳۴)

"ہمارے مذہب میں حصولِ فرزند کے کئی طریقے ہیں۔ اول شوہر اپنی بیوی سے اولاد حاصل کرے۔ دوم، شوہر اپنی بیوی کو اُس کی پسند کے مطابق کھلی چھٹی دیدے کہ جس سے چاہے اپنی خواہش نفس پُوری کرے لیکن شوہر اُس شخص سے کہدے کہ میری بیوی سے تم میرے لئے فرزند پیدا کرو۔ سوم۔ اپنی قوم کے کسی بچے کو اُس کے والدین سے خریدلے، چہارم' ایک عورت ایک شوہر کے بعد دوسرا شوہر کرے اُس دوسرے شوہر کی اولاد پہلے شوہر کی اولاد شمار ہوگی۔ پنجم، نواسہ بشرطیکہ یہ عہد کرلیا ہو کہ جو لڑکا میری اپنی لڑکی سے پیدا ہوگا وہ میرا ہی فرزند ہوگا۔ ششم، شادی کرنے کے لئے جس عورت کو منتخب کیا ہو، شادی سے پیشتر ہی اُس سے لطف اندوز ہوکر اولاد حاصل کرلی جائے۔ ہفتم، کسی ایسے بچے کی پرورش کرنا جس کے والدین نے تنگدستی کی بنا پر اُس بچے کو کہیں چھوڑ دیا ہو اور یہ بچہ اُس کی قوم سے ہی تعلق رکھتا ہو۔ اس صورت میں بھی بچہ پرورش کرنے والے ہی کا سمجھا جائے گا۔ ہشتم، کوئی شخص اپنا بیٹا کسی کو یہ کہہ کر بخشدے کہ میں تیرتھوں کے درشن کو جاتا ہوں اور یہ تیرا ہی بیٹا ہے۔ نہم۔ اپنی قوم میں سے کسی لڑکے کو متبنّی بنا کر پرورش کرے۔ دہم، کوئی لڑکا خود آ کر اُس کی اولاد میں سے ہونے کا اقرار کرے۔ ان کے علاوہ بھی بعض طریقے ہیں کہ جن کے ذریعے اولاد حاصل کی جاسکتی ہے" (پہلا باب صفحہ ۲۰۶)

"ہر شخص پر لازم ہے کہ علی الصبح نیند سے بیدار ہوکر پرمیشور کو یاد کرے اور اپنا کچھ وقت اس میں صرف کرے تاکہ اس کو پاکیزہ روزی ملے پھر جو کام درپیش ہو حسبِ معمول کرے۔ ہر شخص پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ بیکار نہ رہے بلکہ کچھ کیا کرے اور اگر کوئی کام نہ جانتا ہو یا کوئی کام اسے نہ ملے تو اس عرصہ میں پرمیشور کو خوب یاد کرے ـــ جو شخص شری نرائن جی کی یاد سے غافل رہے وہ پرمیشور کا نافرمان اور لوگوں کو گمراہ کرنے والا ہے۔ اگرچہ سب کام تقدیر سے وابستہ ہیں مگر تقدیر کا پابند ہوکر ہاتھ پیر توڑ کر بیکار ہوکر نہ بیٹھ جائے بلکہ بزرگوں کے ارشادات کو سُنے اور اس پر کاربند رہے"۔ (بارھواں پرب صفحہ ۱۶)

"منصف ایسا شخص ہونا چاہیئے جو راست گفتار اور راست کردار ہو اور معاملات کے سمجھنے میں کامل مہارت رکھتا ہو۔ خوش خلق، شیریں زبان اور مدعی اور مدعا علیہ کے بیان لیتے وقت ان دونوں کو ایک نظر سے دیکھنے والا ہو۔ کم اصل اور رذیل لوگوں کی شہادت منظور نہ کرے۔ گواہ اگر معتبر ہوں تب بھی اُن کے چال چلن کی تحقیقات ضرور کرے" (بارھواں پرب صفحہ ۵۳)

"تین شخص کبھی سُرگ میں نہیں جائیں گے ایک پھل دار درخت کا کاٹنے والا، دوسرا گائے کو ہلاک کرنے والا، تیسرا حد سے بڑھ کر

کوئی ٹھکانا نہیں۔ تیسرا وہ شخص ہے جو ماں باپ کی نافرمانی کرے (بارھواں پرب صفحہ ۵۴)

"ماں باپ انسان کی حیاتِ ظاہری کا وسیلہ ہیں اور استاد حیاتِ معنوی کا ذریعہ۔ جو شخص ان تینوں کی خدمت کرتا ہے وہ ترقی کی منزل میں مظفر و منصور ہے۔ اور جو شخص ان تینوں کی وجہ سے ان کے اعزہ و اقارب سے حسن سلوک سے پیش آتا ہے وہ بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔ اگر والدین اور استاد کم حیثیت ہوں اور فرزند عالی مرتبہ ہو جائے تو اُسے چاہیئے کہ وہ انہیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھے اور تکبر اور استغنا نہ برتے اور ان کی خدمت کرنے میں تنگ دل نہ ہو جائے کہ یہ شقاوت و بدبختی کی علامت ہے۔ ان تینوں بزرگوں کی خدمت گزاری اور فرمانبرداری ہرگز رائیگاں اور ضائع نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا بدلا نیکی کی صورت میں کبھی دس کبھی سو کبھی ہزار ملتا ہے۔ اور جو نام والدین رکھ دیں اس میں تغیر و تبدل نہ کرے۔ جو شخص استاد کو ستاتا ہے وہ گویا پرمیشور کو غضب ناک کرتا ہے۔ استاد کا حق والدین کے حق سے بڑھ کر ہے۔ استاد کو ستانے کا گناہ کسی ننھی منی جان کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ دنیا میں یہ چار گناہ بہت بڑے ہیں۔ اول، دوست ہوتے ہوئے نفاق سے کام لینا اور اس کے ساتھ برائی سے پیش آنا۔ دوم، احسان فراموشی۔ سوم، بزرگوں کی کتابوں کو کوئی وقعت نہ دینا۔ چہارم، چغلی اور عیب جوئی سے کام لینا۔ ان کو نجات کی امید ہے، مگر ماں، باپ اور استاد کے نافرمان کو نجات کی توقع نہیں۔ اور یہ گناہ ان چاروں میں سب سے بڑھ کر ہے۔" (بارھواں پرب صفحہ ۵۹)

"اگر کسی مجلس میں جانے کا اتفاق ہو تو پھر تمہارے لئے خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر گفتگو کا موقع مل جائے تو پھر حق و صداقت اور راستی کے سوا کچھ نہ کہے۔ خاموشی بہر صورت بہتر ہے کہ اس میں کسی قسم کا بھی ضرر نہیں۔ اگر کوئی شخص عمر بھر بروں کی صحبت میں رہ کر جھوٹ بولنے کا عادی بن چکا ہو اور عمر کی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے اُسے نیک کردار لوگوں کا ساتھ نصیب ہو جائے۔ تو اس پر لازم ہے کہ وہ توبہ کرے اور اپنے سابقہ گناہوں پر پشیمان اور نادم ہو۔ اور اُسے اپنے باپ، دادا اور استاد کی وساطت سے جو ہدایتیں پہنچی ہیں۔ ان پر عمل کرنے کو اپنے لئے لازم قرار دے لے۔ دن میں سویا نہ کرے اور خیرات اور صدقات سے دوسرے لوگوں کی امداد کیا کرے۔ علماء و صلحا کی صحبت اختیار کرے اور کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس پر عمل کرے۔ اس طریقے سے امید ہے کہ اس کے گناہ نیکیوں سے مبدل ہو جائیں گے، اور ایسا شخص سُرگ میں پہنچ کر آرام و سکون کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھرے گا" (بارھواں پرب صفحہ ۶۰)

"جو شخص شراب کا عاشق اور دلدادہ ہو اُسے اس سے توبہ کر لینی چاہئے اور شراب پی لینے کی صورت میں وہ مہینے بھر تک اپنی غذا میں سے ایک ایک لقمہ کم کرتا ہے اور مسافروں کے واسطے سر راہ پانی پینے کے لئے کنوئیں تیار کرائے اور بازاروں اور شاہراہوں پر پانی پلانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہے" (بارھواں پرب صفحہ ۶۳)

"گناہوں کی سزا دینے کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ برہمن سے گناہ سرزد ہو جانے پر اُسے چار گنا سزا، چھتری کو تین گنا، ویش کو دوگنا اور شودر کو ایک حصہ ہی سزا دے جائے گی۔ اور ہر ایک سے جرم کا تدارک مجرم کی حیثیت کے مطابق ہوگا" (بارھواں پرب صفحہ ۶۳)

"آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہئیے۔ توکل کر کے بیٹھ رہنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ آدم کا جسم زمین کی جگہ اور تخم بمنزلہ نصیب کے ہے۔ جو بیج بوئے گا ضرور اس کا ثمرہ حاصل کرے گا۔ جو شخص زمین شور میں بیج بوئے گا اُسے وہ کتنا ہی پانی دے لے مگر محنت، پانی اور بیج ضائع ہونے کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ زمین شور سے مراد یہ ہے کہ پرمیشور کی بندگی میں ہوا و ہوس کو دخل دے۔ ایسا شخص کیسے ہی نیک کام کرے کبھی بھی اچھا پھل نہیں پائے گا بلکہ اس کی محنت بھی رائیگاں جائے گی" (تیرھواں پرب صفحہ ۸)

زمین شور سنبل نبار د
درو تخم عمل ضائع مگرداں"

گناہ کبیرہ دس ہیں۔ ان میں سے تین افعال اعضا و جوارح سے تعلق رکھتے ہیں :۔

"۱۔ زنا (۲) خونِ ناحق (۳) اور چوری ——— چار زبان سے عمل میں آتے ہیں۔ (۱) دروغ گوئی (۲) فحش (۳) دشنام (۴) بیہودہ گفتگو جس میں نہ سننے والے کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ اُس گفتگو کرنے والے کو۔ اور تین اعمال دل کے ساتھ ہیں (۱) حسد (۲) بے رحمی اور (۳) اپنے اعمال ہی کو سب کچھ سمجھنا اور پرمیشور کی بخشش اور مغفرت کو نظر انداز کر دینا۔ ان گناہوں سے جو شخص پرہیز کریگا دونوں جہان میں نیک بخت اور سعادت مند ہوگا۔" (تیرھواں پرب صفحہ ۱۲)

"راجہ کو چاہئیے وہ بہت غصہ نہ کرے اور سچ بولا کرے۔ دسترخوان پر بیٹھے تو سب لوگوں کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرے اور تکبر نہ کرے۔ بیگانہ عورتوں کو چشمِ خیانت سے نہ دیکھے۔ ہر روز ایک مرتبہ اشنان کیا کرے اور اگر ممکن ہو تو شجاع اور بہادر غلام کثرت سے اپنی خدمت میں رکھے۔ ہمیشہ حالاتِ رعایا کی جستجو کرتا رہے اور ایسی تدابیر اختیار کرے جن سے خزانہ معمور رہے" (بارھواں پرب صفحہ ۲۸)

"راجاؤں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قہر و غضب اور رحمت و شفقت سے حسبِ ضرورت کام لیں۔ اگر ہر وقت غضب ناک اور غصے میں بھرے بیٹھے رہیں گے تو کسی کو مارے خوف کے اُن سے عرض و معروض کرنے کی جراٗت بھی نہ ہوگی۔ اور انتظامِ مملکت میں وہ اُلجھاؤ پیدا ہوگا جس کا سلجھنا کبھی ممکن نہ ہوگا اور اگر ہر وقت نرمی اختیار کئے رکھیں گے تو اُن کا رعب اور دبدبہ جاتا رہے گا اور نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ تمام دنیا کا خون بہا دینے کے باوجود بھی اُن کا رعب قائم نہیں ہو سکے گا۔ (بارھواں پرب صفحہ ۱۷)

راجاؤں کے لئے یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ وہ شراب سے کلیتہً پرہیز کریں" (بارھواں پرب صفحہ ۱۸)

سب سے اچھی عبادت کبھو کا رہنا ہے (تیرھواں پرب صفحہ ۸۲)

"راجہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس پر غالب ہو اور ہوا و ہوس کو ترک کر دے۔ پرمیشور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔ اور رعایا کے زن و فرزند اور اطفال کو اپنا اہل و عیال تصور کرے اور اُن سے رحمت و شفقت کا سلوک کرے۔ انصاف کرتے وقت ظالموں اور زبردستوں کی پاسداری نہ کرے۔ پرمیشور کے احکام کو لہو و لعب کی نگاہ سے نہ دیکھے اور حواسِ خمسہ کو جو قوتِ سامعہ، باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ پر مشتمل ہے، اپنے قابو میں رکھے۔ ایسی لذتوں سے کنارہ کش رہے جو پرمیشور کی مرضی کے خلاف ہوں" (بارھواں پرب صفحہ ۳۶)

"اپنی اولاد کی تربیت راجہ ایسے طریقے سے کرے کہ سب سے پہلے انہیں علم پڑھائے۔ وید کے معانی سے انہیں آگاہ کرے۔ اخلاقِ حمیدہ کی طرف متوجہ ہو اور انہیں ایسے علوم و فنون سکھائے جن سے عقل و دانش میں ترقی ہو اور بزرگوں کی رسموں اور طریقوں سے بھی واقف کرے" (بارھواں پرب صفحہ ۳۸)

"راجاؤں کو ان صفات سے متصف ہونا چاہئیے وہ پاک دامن اور پرہیزگار ہوں۔ جو کام بھی کریں عقل و دانش سے کام لے کر کریں ہر کام کرنے سے پیشتر خوب غور و خوض کر لیں کہ پرمیشور نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے یا نہیں۔ اور دنیا کی اُسی قدر خواہش مند ہوں جو انتہائی ضروری ہو اور جس کے بغیر چارہ کار نہ ہو۔ ان کا خلق اور تواضع اس درجہ کامل ہو کہ وہ تمام لوگوں کے دل اپنے ہاتھ میں لے لیں" (بارھواں پرب صفحہ ۳۹)

"جن لوگوں میں یہ صفات پائی جائیں وہ ضرور سُرگ میں جائیں گے۔ نیک لوگ جن سے سب خوش ہوں اور دوسرے لوگوں کو گناہوں سے باز رکھے اور بھکاریوں اور فقیروں اور غریبوں کی دستگیری اور بیماروں کی خبر گیری کرتے ہوں اور اپنے دوستوں اور اعزہ و اقارب سے اچھا برتاؤ اور ہر معاملے میں اُن کے ساتھ رعایت برتتے ہوں اور جو اپنے آقا اور ولی نعمت کے ہمرکاب ہو کر جنگ کرتے ہوں اور لوگوں

کے سر سے بلا ٹالتے ہوں اور راجاؤں کی خدمت میں رہ کر لوگوں کی مشکلات سے انہیں آگاہ کرتے اور راجا کو ہر وقت اور ہر موقع پر نیک صلاح اور اچھا مشورہ دیتے ہوں"۔ (تیرھواں پرب صفحہ ۱۷)

"شوہر نیک ہو یا بد، عورت اُس کو اپنا سرتاج جانے اور اس کی فرماں برداری سے قدم باہر نہ رکھے (تیرھواں باب صفحہ ۱۱۳)

لڑکی ایسے شخص سے بیاہی جائے جو عالی خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور اُس کی ماں بھی اچھے قبیلے سے ہو اور وہ خود بھی نیک چلن ہو۔ جب لڑکی کی نسبت کرنا ہو تو پہلے اُس لڑکے کے والدین کا چال چلن دیکھ لینا چاہیے اگر وہ نیک چلن ہوں گے تو یقین ہے کہ لڑکا بھی ایسا ہی ہوگا۔ لڑکے کے چال چلن میں ان باتوں کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ وہ پڑھا لکھا، شجاع اور سخی اور حسنِ خلق سے آراستہ ہو۔ چغل خور اور چور اچکا نہ ہو۔ نیک لوگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہو اس کے سب اعضا بھی صحیح سلامت ہوں اور وہ اپنے متعلقین کی ضروری کفالت کر سکتا ہو" (تیرھواں پرب صفحہ ۲۵)

"یہ بھی جائز ہے کہ تیس سال کی عمر کا مرد چودہ سال کی لڑکی سے شادی کر لے۔ لیکن اکیس سال عورت سے شادی کرنا بہتر ہے والدین پر لازم ہے لڑکی کی اس سے کم عمر میں شادی نہ کریں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بارہ سال لڑکی کی شادی کر سکتے ہیں مگر بہتر یہ ہے کہ تیرہ چودہ سال سے کم عمر میں شادی نہ کریں اگر وہ ایسا کرنا چاہیں تو راجہ یا حاکم پر فرض ہے کہ اُسے اس کام سے روکے اور تین سال تک انتظار کر کے کسی مناسب اور لائق شخص کے ساتھ باختیارِ خود اُس کی شادی کرے۔ اگر تین سال تک راجہ یا حاکم اس کام کو انجام نہ دے سکیں تو لڑکی کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے مناسب شوہر تلاش کرے" (تیرھواں پرب صفحہ ۲۶)

"اور دیوتاؤں کی پرستش کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ رکھے البتہ ماں باپ اور استاد اور گورو کی خدمت میں دیوتاؤں کی پوجا کے بغیر بھی جانا درست ہے۔ آئینے میں اپنے منہ کا رنگ نہ دیکھے کہ اس سے سستی اور نحوست پیدا ہو جاتی ہے۔ اور حاملہ عورت کے ساتھ صحبت نہ کرے۔ سوتے وقت سر پچھم اور اُتر کی طرف نہ کرے بلکہ مشرق یا دکن کی طرف کرنا چاہیے۔ اشنان کرنے کے بعد بدن کو کپڑے سے صاف کرے۔ ٹوٹی ہوئی چارپائی پر یا جس کے بان ٹوٹے ہوں نہ سوئے۔ (تیرھواں پرب صفحہ ۸۵)

پانی، دودھ، چاول، کھیر، دہی اور گھی اور شہد اُسی قدر کھانے کے برتن میں نکالنا چاہیے جتنا کھا سکیں اور باقی نہ بچے کھانے کے بعد وہی نہ کھائے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر تر ہاتھ پیٹ پر پھیرے اور تھوڑا سا پانی لے کر داہنے ہاتھ سے پاؤں کے انگوٹھے پر چھڑکنا چاہیے" (تیرھواں پرب صفحہ ۸۷)

"جو شخص مکروہات کی طرف مائل ہے اور اس میں کینہ و جہالت ہے یاد رکھنا چاہیے کہ وہی بُرا ہے اور بد ہے اور جس کا چال چلن اچھا ہو اور رحمدل اور بردبار اور تحصیل علم کا شائق ہو سمجھ لینا چاہیے کہ وہی نیک ہے (تیرھواں پرب صفحہ ۱۲۹)

کسی کا پس خوردہ کھانا نہیں کھانا چاہیے اگر کسی نے ناموافق طبع سمجھ کر کھانا چھوڑ دیا ہو وہ کھانا بھی اپنے استعمال میں لائے اور اسی طرح اگر اوپر اوپر سے اچھی قسم کا کھانا نکال لیا گیا ہو اور ردی قسم کا رہ گیا ہو وہ بھی نہیں کھانا چاہیے۔ اگر کوئی شخص دسترخوان پر بغیر اشنان کئے یا بغیر منہ ہاتھ دھوئے آنا چاہے تو اُسے اس کی اجازت نہ دی جائے۔ پیپل اور بڑ اور گولر کا پھل بھی نہیں کھانا چاہیے" (تیرھواں پرب صفحہ ۸۶)

"جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ تدبیر کوئی شے نہیں وہ غلطی پر ہے کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ بغیر تخم افشانی کئے اور بوئے جوتے بغیر کوئی شخص کھلیان اٹھالے۔ البتہ یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ ہستی مطلق کو بالکل معطل اور بیکار سمجھ کر تدبیر ہی پر بھروسہ کر بیٹھے بلکہ دونوں پلڑے مساوی رکھنے چاہئیں"۔ (تیرھواں پرب صفحہ ۱۳۱ - ۱۳۰)

مردوں پر لازم ہے کہ اپنے زنان خانے کے آس پاس کسی بیگانے مرد کو نہ پھٹکنے دیں۔ کسی ناواقف عورت کو نا سوا معتمد خدمتگار عورت کے، گھر کے اندر نہ آنے دیں جب لڑکے کی عمر سات برس کی ہو گئی ہو اُسے بھی عورتوں کی مجلس میں نہ آنے دیں" تیرھواں باب ص ۲۱)

ستیارتھ پرکاش سے چند اقتباسات، جن سے پانچ ہزار برس پیشتر کی اخلاقی تعلیمات اور اخلاقی حالت کا اندازہ لگایا جاسکے ترجمہ کی صورت میں جس میں نہ اپنی طرف سے کمی اور نہ کسی قسم کی زیادتی کی گئی، پیش کر دیئے گئے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں آج کے تمدن و تہذیب کا جائزہ لینے سے حقیقت زیادہ واضح ہو سکے گی۔

قرآنِ کریم اس پر شاہد ہے کہ دُنیا کا سب سے پہلا انسان "مُسلم" تھا، اس لئے یہ بات آپ ہی آپ ثابت ہوجاتی ہے کہ "اسلام" ہی دینِ فطرت ہے اور یہی ایک "دین" انسانیت کا سب سے پہلا اور دوامی ضابطہ حیات ہے! بعد میں چل کر لوگوں اور قوموں نے اپنے لئے پوجا پاٹ وغیرہ کے دوسرے راستے نکال لئے اور انسان نظریوں اور عقیدوں کے اعتبار سے متفرق ہو گئے! ہندوازم ہو یا عیسائیت، یا کوئی دوسرا مذہب، جن مذہب میں بھی اخلاق و پاکیزگی کی تعلیمات پائی جاتی ہیں، وہ اسلام ہی کی "باقیات الصالحات" ہیں!

مذاہب میں اخلاقی تعلیمات کے اشتراک کو دیکھ کر، جو لوگ "وحدتِ ادیان" کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں وہ بڑی گمراہی کی بات سوچتے ہیں، "دینِ فطرت" صرف ایک ہے اور وہ "اسلام" ہے! گندے، نجس اور گدلے پانی اور صاف و شفاف اور طاہر پانی پر جو کوئی ایک جیسا حکم لگاتا ہے، وہ شدید گمراہی میں مبتلا ہے!

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

یہ ہے اللہ تعالیٰ کا ناطق فیصلہ! مبارک ہیں وہ لوگ جو ایمان اور اسلام کی دولت سے مالا مال ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کی روشنی میں صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں!

—x—

تصحیح

اگست ۱۹۶۲ء کے "فاران" میں جناب دلاور فگار (ایم ۔ اے) کی نظم "نجومی" کے ساتویں بند کا یہ مصرعہ:-

جنسیت آپ کی تبدیل نہ ہو جائے مجھے خطرا ہے

غلط چھپ گیا، صحیح مصرعہ یہ ہے:-

جنسیت آپ کی تبدیل نہ ہو خطرا ہے

شعر و نغمہ

تسکین قریشی

جب تری رہگذر سے گزرے ہیں
ہم تو کچھ بے خبر سے گزرے ہیں
کیا یوں ہی مل گیا ہے منصب عشق
اُن کی ایک اک نظر سے گزرے ہیں
کتنے چہروں سے اُٹھ گئی ہے نقاب
ہم جنوں میں جدھر سے گزرے ہیں
خود انہیں بھی خبر نہیں جن کی
وہ بھی جلوے نظر سے گزرے ہیں
ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں تسکیں
ہم سنبھل کر جدھر سے گزرے ہیں

راہی بلند شہری (از بھارت)

سرفروشو عظمتِ دار و رسن خطرے میں ہے
سرمدو اُٹھو کہ تاریخِ کہن خطرے میں ہے
کوثر و زمزم کی حُرمت پر جو ہنستے تھے کبھی!
اُن سے کہہ دو عزّتِ گنگ و جمن خطرے میں ہے
جس نے ہر خطرے سے دنیا کو دلائی تھی نجات
آج خود وہ فاتحِ شام و یمن خطرے میں ہے
شاعرانِ قوم ہیں ملبوسِ جاناں پر نثار
اور ادھر اپنے بزرگوں کا کفن خطرے میں ہے
آبروئے نونہالانِ چمن کیسی کہ اب
خود وجودِ نونہالانِ چمن خطرے میں ہے
کل ہمیں الزام مت دینا نگہبانو کہ ہم
آج ہی بتلائے دیتے ہیں وطن خطرے میں ہے

چل رہی ہیں آج کچھ ایسی ہوائیں باغباں
چند غنچے ہی نہیں، سارا چمن خطرے میں ہے
راہ میں حرص و ہوس کے خار بھی شعلے بھی ہیں
آج ہر گلگوں بدن، گل پیرہن خطرے میں ہے

عمرآن انصاری

میرا سرمایہ شاعری بن گیا
شعر جب جزوِ پیغمبری بن گیا
اُن کے جلووں میں گم ہو گئی زندگی
میں خود اپنے لئے اجنبی بن گیا
وسعتِ دو جہاں میں سما تا نہیں
یہ غنیمت ہوا آدمی بن گیا
عقل سے عشق کا علم حاصل ہوا
عشق سے آدمی آدمی بن گیا

محسن انصاری

گرچہ تھی وہ نظر غلط انداز
بن گئی اک فسانہ کا آغاز
بڑھتی جاتی ہے بیکلی دل کی
ہوتی جاتی ہے راہِ شوق دراز

عشرت جلالی

تغافل ہے مگر مبہم نہیں ہے
یہ اندازِ توجہ کم نہیں ہے
نکل آتے ہیں ہنستے ہنستے آنسو
خوشی بھی بے نیازِ غم نہیں ہے
خموشی، سرخوشی، نغمہ، تبسم
کوئی بھی پردہ دارِ غم نہیں ہے

ماہر القادری

اُن کی خوشی یہی ہے تو اچھا یونہی سہی — اُلفت کا نام آج سے دیوانگی سہی
ہرچند نامراد ہوں پھر بھی ہوں کامیاب — کوشش تو کی ہے کوشش بربادی سہی
جب چھڑ گئی ہو کاکل شب رنگ کی غزل — ایسے میں اک قصیدۂ رخسار بھی سہی
غنچوں کے دل سے پوچھیے لطفِ کشادگی — بادِ صبا پہ تہمت آوارگی سہی
ماہر سے اجتناب نہ فرمائیں اہلِ دل — اچھوں کے ساتھ ایک گنہگار بھی سہی

—— x ——

تابش دہلوی کا منظوم خط

—— ماہر القادری کے نام

ماہر القادری کو میرا سلام — بعد اس کے یہ شوق کا پیغام
تم بچھڑ کر گئے ہو جب دم سے — پھنک رہا ہوں میں آتشِ غم سے
مُبتلائے تپِ فراق ہوں میں — عشرتِ زندگی کو شاق ہوں میں
ہر نفس ایک شعلۂ غم ہے — دل ہے پہلو میں یا جہنم ہے
دردِ سر نے حریف سمجھا ہے — نزلہ، عضوِ ضعیف سمجھا ہے
جسم پر چھوٹتے ہیں پتھر سے — رُوح میں ٹوٹتے ہیں خنجر سے
خفقاں ہے مزاج پر طاری — دیکھنا غفلتوں کی ہشیاری
محو دل سے خیالِ خوباں ہے — ہر نظر ایک خلدِ ویراں ہے
اتنے ہوش و حواس ہیں ماؤف — ذہن میں اب صفت نہ ہی موصوف
دُور نظروں سے اب معاد نہیں — جان و تن باتوں پہ یاد نہیں
بزم آرائیاں ہوئی ہیں خواب — ماہوش ہیں نہ چادرِ مہتاب
سحرِ رخ، نہ شامِ گیسو ہے — طبع بے رنگ "عالمِ ہُو" ہے
کیا سے اب کیا ہوا ہے دم میرا — تم میں اٹکا ہوا ہے دم میرا
اب تم آؤ تو جاں براری ہو
اور تابش کی رستگاری ہو

۶ر ستمبر ۱۹۶۲ء

رئیس احمد جعفری

رُوحِ انتخاب

کسی زبان کو فروغ پانے میں اور مٹنے میں، ترقی کرنے اور زوال آشنا ہونے میں، جڑ پکڑنے اور جڑ سے اکھڑ دینے میں مدتیں گزر جاتی ہیں۔ عربوں نے اندلس پر حکومت کی، وہاں کی سرکاری زبان عربی ہو گئی۔ عربوں نے سسلی پر قبضہ کیا، وہاں بھی عربی رائج ہوئی پھر اندلس اور سسلی سے بیک بینی و دو گوش عربوں کو نکلنا پڑا۔ عرب وہاں سے نکال دیئے گئے، ختم ہو گئے، مٹا دیئے گئے، لیکن اندلس اور سسلی سے عربی کو ختم کرنے اور مٹانے میں جگ بیت گئے۔ ان دونوں ملکوں کے عیسائی فاتح عرصہ دراز تک عربی کو دفتری اور سرکاری زبان بنائے رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ہندوستان میں مسلمان فاتح کی حیثیت سے جب آئے تو اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے۔ اور یہ زبان سرکاری زبان بن گئی۔ لیکن جب مسلمانوں کا آفتاب اقبال گہنایا، اور انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں کے اقتدار اور سطوت کو فنا کر چکنے کے باوجود ایک عرصہ دراز تک وہ فارسی کو سرکاری اور دفتری زبان بنائے رکھنے پر مجبور رہے۔ وائسرائے کے مراسلات فارسی زبان میں ہوتے تھے۔ حکومت کے فرامین کی زبان فارسی تھی۔ برطانوی حکومت سے ہندوستان کے والیانِ ریاست سے، عام اس کے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، جو معاہدے کئے، وہ فارسی زبان میں تھے۔ فرنگی استعمار کی طرف سے والیانِ ریاست کو جو خطابات عطا کئے گئے وہ بھی فارسی الفاظ کے جامے میں تھے۔ ہندوستان کی سربرآوردہ شخصیتوں کے لئے جو خطابات تجویز کئے گئے وہ بھی خانصاحب، خان بہادر، شمس العلماء تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انگریزی حاوی ہو گئی اور بالآخر فارسی ختم ہو گئی اور انگریزی نے اس کی جگہ لے لی۔

لیکن گو فارسی مغلوں کے دورِ حکومت میں دفتری اور سرکاری زبان تھی مگر چونکہ انھوں نے فاتح ہونے کے بعد اپنی قومیت تبدیل کر لی تھی یعنی وہ ہندوستانی ہو گئے تھے اس لئے کچھ ان کی شہ سے، کچھ عام میل جول سے، ایک عوامی زبان کی طرح پڑ گئی جس نے اردو نام پایا اور بہت جلد یہ زبان سارے ہندوستان کی "لنگوا فرینکا" بن گئی۔ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، پنجابی، سندھی، بلوچی اور دوسری صوبائی و علاقائی زبانیں اپنی حدود تک محدود رہیں مگر اُردو ہر حصہ کی عام فہم زبان بن گئی۔ ایک اردو بولنے والا ہندوستان کے ہر صوبے میں اپنا مطلب دوسروں کو سمجھا سکتا تھا۔ یہ اس کی ہمہ گیریت کی انتہا تھی۔ چنانچہ انگریز فارسی کو مٹا دینے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن کوششِ بسیار کے باوجود اُردو کو نہ مٹا سکے۔

تقسیم ہند کے وقت تک اُردو سارے ہندوستان کی عوامی زبان بنی رہی، ہندو ریاستوں، گوالیار، بھرت پور، بیکانیر، جودھ پور، بوندی وغیرہ میں اُردو ہی کا راج رہا۔ کانگریس کے مسلمانوں سے اور مسلم لیگ سے لاکھ اختلافات تھے، مگر گاندھی جی، جواہر لال اور پٹیل سب نے یہ طے کر لیا اور اعلان کر دیا کہ آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان "ہندوستانی" ہو گی۔ اور ہندوستانی زبان کی یہ تشریح کی کہ وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور فارسی و ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ——— اور "ہندوستانی" نام بھی نیا نہیں ہے، اُردو کے کئی نام ہیں، ان میں ایک ہندوستانی بھی چلا آ رہا ہے۔

لیکن تقسیم ہند کے معاً بعد ہندوؤں نے ہندوستانی یعنی اُردو کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا اور اس اعلان کے ساتھ ہی اُردو کا قتلِ عام بھی شروع کر دیا۔ وہ اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں سے نکالی گئی، اسٹیشنوں سے

کم کر دی گئی، تختوں پر سے اسے ہٹا دیا گیا۔ غرض اسے فنا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان جن باتوں پر ستیزہ آزما تھے ان میں ایک اردو کا مسئلہ بھی تھا، بنگال کے فضل الحق، اور یو۔پی کے لیاقت علی خاں دونوں اس بارے میں بالکل ہم زبان تھے، چنانچہ تقسیم ہند کے بعد قائد اعظم نے ان گزشتہ مواعید کی روشنی میں اعلان کر دیا کہ اردو، صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ لیاقت علی خاں بھی جب تک زندہ رہے اس اعلان کا اعادہ کرتے رہے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں عنان اقتدار آئی انھوں نے اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان بنا لیا۔ اس طرح پاکستان کی دو قومی زبانیں ہوگئیں اردو اور بنگالی۔

لیکن پندرہ سال کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود اور اردو کو قومی زبان تسلیم کر چکنے کے باوجود اب تک اسے سرکاری دفتروں میں داخلے کی اجازت نہیں ملی ہے اب تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسے ذریعہ تعلیم نہیں بنایا گیا ہے۔ اب تک ہمارے وزراء اور حکام والا مقام عام طور پر نہ اردو میں تقریر کرتے ہیں اور نہ اردو میں مضامین لکھتے ہیں۔ اب تک عدالتوں کے فیصلے انگریزی میں ہوتے ہیں سکریٹریوں کے نوٹ انگریزی میں تحریر کئے جاتے ہیں، حکومت کے سرکاری اعلانات، اطلاعات، بیانات، سب انگریزی میں ہوتے ہیں، دستور پہلے انگریزی میں چھپا، پھر اس کا ترجمہ شائع ہوا، یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اردو کو قومی زبان تسلیم کر چکنے کے باوجود اب تک اس کا مقام نہیں ملا۔ جب پاکستان میں یہ حالت ہے تو ہم کسی دوسرے کی شکایت کیا کر سکتے ہیں۔

بعض حلقوں سے اب تک کبھی مدھم سروں میں کبھی بلند آہنگی کے ساتھ فرمایا جاتا ہے کہ ابھی اردو میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہوئی ہے کہ وہ دفتری زبان بن سکے یا اسے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا جا سکے اور یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں جن کے سامنے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے کارنامے موجود ہیں۔ حیدر آباد کی سرکاری زبان اردو تھی اور وہاں کا سارا دفتری کاروبار اردو میں ہوتا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے کالجوں میں اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ ڈاکٹری، انجنیری، فلسفہ، سائنس، جملہ علوم و فنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اسی طرح جامعہ ملیہ میں بھی۔ اور ان دونوں یونیورسٹیوں کے اردو میں پڑھے ہوئے گریجویٹ امریکہ، لندن، پیرس اور برلن سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر امتیاز و اختصاص کے ساتھ اپنے وطن آتے تھے اور جس سرکاری منصب پر بھی متعین ہوتے تھے ان لوگوں سے بہتر طور پر کام کرتے تھے جنھوں نے انگریزی کو اپنی زبان بنا لیا تھا اگر عثمانیہ یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جا سکتا تھا تو سندھ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، پشاور یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی میں ایسا کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

اس تاخیر اور تذبذب کا ایک نہایت افسوسناک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب اردو کے خلاف محاذ قائم ہو رہے ہیں اور بعض حلقے اس کی قومی حیثیت کو چیلنج کر رہے ہیں، اگر پندرہ سال اس تذبذب اور گومگو میں اور گزر گئے تو یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں کہ شاید پاکستان میں بھی اردو کا وہی حشر ہوگا جو ہندوستان میں ہو چکا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت، ایک حقیقت پسند حکومت ہے وہ سطحی مفادات اور سطحی جذبات کی آڑ لے کر حقائق کی روگردانی نہیں کرتی لہٰذا بجا طور پر اس سے یہ مطالبہ کرنے کا اہل پاکستان کو حق ہے کہ بغیر کسی تاخیر اور تعویق کے اردو کو اس کا حق دیا جائے۔

—×—

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

شاہد صدیقی

مولانا حمید الدین قمر فاروقی جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے دیوبند میں ہم جماعت اور ہم سبق رہ چکے ہیں، اور آجکل حیدرآباد دکن میں جمعیۃ العلماء کے صدر ہیں، انھوں نے اُردو فارسی اور عربی کے امتحانات کی تیاری کے لئے "ادارۂ شرقیہ" قائم کیا تھا جس نے دکن میں برسوں مشرقی علوم کی خدمت انجام دی ہے، اس ادارے میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے، جن دنوں پتھر گٹی کے بنی خانہ میں ادارۂ شرقیہ قائم تھا تو وہاں شب میں مشاعرہ ہوا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے، تو یہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے، چند شعراء اپنا کلام سُنا چکے تو شاہد صدیقی اکبرآبادی کا نام ہی تعارف کے ساتھ پکارا گیا کہ ابھی حال ہی میں اکبرآباد آگرہ سے تشریف لاتے ہیں! اس وقت ان کی عمر بہت سے بہت بیس سال کی ہوگی، ملگجی سی شیروانی پہنے تھے جس کے اُوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے، چہرہ مہرہ نہ وجیہ تھا نہ حسین! وہ اسٹیج پر آئے تو سُننے والوں نے اُن کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا، مگر جب انھوں نے رباعی پڑھی ہے، تو لوگ چونک پڑے، انھوں نے سامعین کے اصرار پر متعدد رباعیاں اور غزلیں سُنائیں! حیدرآباد دکن میں یہ اُن کا پہلا تعارف تھا! اُس کے بعد وہ مشاعروں، دعوتوں اور ادبی نشستوں میں شریک ہونے لگے!

حیدرآباد دکن سے ہفتہ وار اخبار "الاعظم" نکلتا تھا، کچھ دنوں بعد اُس کی ادارت شاہد صدیقی سے متعلق ہوگئی۔ سستے کا زمانہ تھا تھوڑی سی تنخواہ میں بھی کام چل جاتا تھا۔ فراغت میسر نہ تھی، آدمی ننگا بھوکا تو نہ رہتا تھا۔

وہ جو علامہ اقبال نے "جگنو" کی تعریف میں کہا ہے کہ :-

غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

تو دکن کی سرزمین نے نہ جانے کتنے گمنام غربت زدوں کو چمکا دیا اور نام آور بنا دیا، شاہد صدیقی مرحوم کو بھی دکن ہی میں شہرت ملی، انھوں نے بھی سرزمین دکن کے ساتھ دوستی، وفاداری اور احسان مندی کا حق ادا کر دیا کہ اُسی زمین کا پیوند ہو کر رہ گئے! اور جہاں امیرؔ، داغؔ، جلیلؔ اور فانیؔ محوِ خواب ہیں اُسی خطہ میں وہ بھی قیامت کی نیند سو گئے!

بلدہ حیدرآباد میں شاہد صدیقی سے یوں تو ملنا جلنا رہتا ہی تھا مگر زیادہ بے تکلفی اُس زمانے میں ہوئی، جب نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں آنا جانا ہوا، نواب معظم جاہ کے یہاں مجھے بلانے کے لئے پہلے دن شاہد صدیقی ہی آئے تھے اور اُن کے ہمراہ آفتاب علی تھے جو معظم جاہ کے دربار کے خاص آدمی تھے! اس دربار سے شاہد صدیقی کا تعلق ٹوٹتا اور جڑتا رہتا، کبھی معتوب، کبھی محبوب! سعدیؔ شیرازی نے تجربہ کے بعد ہی فرمایا ہے —— "آزاد کودکاں و طبع پادشاہاں اعتبار ندارد۔"

زمانہ گزرتا گیا، شاہد صدیقی کی شاعری کی شہرت ہوتی گئی، کلام میں ترقی اور مسلسل ترقی، یہاں تک کہ شعر و ادب کی دنیا میں اُن کی ایک حیثیت قائم ہوگئی جس کا دوست دشمن ہر کوئی معترف تھا۔

پاکستان میں وہ صرف ایک بار آئے، یہاں اُن کی خاصی پذیرائی ہوئی مگر زندگی کا رنگ مجازؔ لکھنوی جیسا تھا، ملاقات کا وقت

ہے اور وہ سرشکول پرمست و سرشار پھر رہے ہیں اور بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں یہ امتیاز اور محبوبیت تو جگر مرآبادی مرحوم ہی کو حاصل تھی کہ لوگوں نے برسوں اُن کی رندی و سرشاری کو گوارا کیا ہے ، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جگر اس چکر سے ہمیشہ کے لئے نکل گئے۔

کراچی میں شاہد صدیقی کا قیام اور زیادہ تر اُٹھنا بیٹھنا حسرت ملیح ترمذی کے فلیٹ میں رہتا ، جو اُن دنوں پاکستانی حکومت میں ڈپٹی ڈائرکٹر تھے ! ہم تینوں کبھی کبھار شطرنج بھی کھیلتے اور خوب مزے مزے کی باتیں رہتیں !

اتفاق بلکہ حسن اتفاق کہیے کہ چار سال کے عرصے میں شاہد صدیقی سے تین بار بمبئی کے مشاعروں میں ملاقات رہی ، ایک دن میں نخشب جارچوی کے یہاں اس حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ بال بکھرے ہوئے تھے ، اور کرتہ اور پاجامہ خوب شکن آلود ، شاہد صدیقی مجھ سے بولے کہ اسی ہیئت کے ساتھ تمہاری تصویر کھنچوائی جائے گی ، میں نے انکار کیا ، باتوں باتوں میں ٹالتا چاہا ، مگر وہ بضد تھے آخر کار ہم تینوں کا گروپ فوٹو کھنچا اور عجیب اتفاق ہے کہ میں نے کوئی تصویر اور فوٹو گروپ سنبھال کر نہیں رکھا ، مگر شاہد صدیقی کی دی ہوئی یہ نشانی میرے پاس نہ جانے کیسے رہ گئی ؟

اُن سے آخری بار ملاقات فروری ۱۹۶۱ء میں ہوئی ، بمبئی میں " جشنِ شاعر" کے سلسلہ میں " پاک و ہند مشاعرہ " اور ادبی مذاکرہ بھی تھا ، مذاکرہ میں جن ادیبوں کو مقالے پڑھنے تھے ، اُن میں میرا نام نہ تھا ، مگر شاہد صدیقی کی تحریک پر میں نے تقریر کی اور کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں ، اُن کے ادبی نظریوں کا تجزیہ کیا ، اس پر علی سردار جعفری نے فرمایا۔

"۔۔۔ جس طرح آپ نے مسلمانوں کے بہتر (۷۲) فرقوں کو گوارا کر لیا ہے ، اس طرح ہم کمیونسٹوں کو بھی گوارا کر لیجئے ۔۔۔۔ !"

"جشنِ شاعر" کے دوسرے یا تیسرے دن میں کرافٹ مارکیٹ کے سامنے کھڑا تھا ، دور سے مخدوم محی الدین اور شاہد صدیقی آتے ہوئے نظر آئے ، آمنا سامنا ہوا ، کچھ وہ بڑھے کچھ میں بڑھا ، میں نے کہا کہ چلو سامنے کے ریسٹوران میں چائے یا کافی پئیں گے ! چائے پیتے ہوئے میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ کیا پروگرام ہے ، بولے جھانسی میں مشاعرہ ہے ، وہاں جا رہا ہے ، میں نے مخدوم محی الدین سے کہا کہ تمہارا نام "محی الدین" ہے ، تمہیں تو دینِ اسلام کی خدمت کرنی چاہیے ! مخدوم محی الدین ہنس کر بولے :۔

"ہم اسلام ہی کی خدمت کر رہے ہیں "۔

شاہد صدیقی مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات تھی ۔ ایسے بیس پچیس دن پہلے اُن کے انتقال کی خبر اخبار "جنگ" میں پڑھی تو کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا ! بہادر یار جنگ اسکول (کراچی) میں تین چار دن کے بعد تعزیتی جلسہ ہوا ، حمید الدین شاہد اور ابراہیم جلیس نے شاہد کی شاعری اور اُن کی شخصیت پر مقالے پڑھے ، دو تین تقریریں بھی ہوئیں ، نظر حیدرآبادی نے نظم سنائی ، میں نے آخر میں صدارتی تقریر میں اپنے تاثرات پیش کئے ۔۔۔ سامعین پر سکوت غم کا عالم چھایا ہوا تھا ، شاہد مرحوم کے بڑے بھائی صابر القادری جلسہ کے آغاز سے لے کر ختم ہونے تک روتے رہے ، بھائی قوتِ بازو ہوتا ہے ، اور اپنے بازو کے ٹوٹ جانے کا کس کو غم نہیں ہوتا ۔

شاہد صدیقی مرحوم نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے ، اُن کی غزلوں میں ایک انفرادی شان پائی جاتی تھی ، اور تو اور شاہد اچھے غزل گو ہیں مگر کراچی میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ، ان کے دو شعر :-

رہائی کی تمنا کرنے والا ۔۔۔ اسیرِ خیال ہے اور کیا ہے
کبھی تنہا ہی کوئی بھی نہیں کوئی کبھی تنہا نہیں ۔۔۔ اے غمِ بیکسی مری محفل تو دیکھنا

کمیونسٹ لیڈر اور شاعر۔

حضرت جگر مرادآبادی، جو اپنے دور میں غزل کے امام تھے، شاہد کی غزل گوئی کے معترف اور ثنا خواں تھے! افسوس! وہ اپنی شہرت کے شباب کی بہاریں پوری طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمیشہ کے لئے ان کی آنکھیں بند ہوگئیں ـــــ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

عبدالحمید اسمٰعیل مرحوم

جناب عبدالحمید اسماعیل سے سب سے پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی، مرحوم نے کسی قومی فنڈ (غالباً بہار فنڈ تھا) کے سلسلہ میں، مشاعرے کا اہتمام کیا تھا سر کاؤس جی جہانگیر ہال میں دوپہر کے بعد مشاعرہ منعقد ہوا، اور توقع سے زیادہ کامیاب ہا فلمی ستارے نظروں کے سامنے ہوں تو کریہہ الصورت شاعر بھی بلبل کی طرح چہکنے کی کوشش کرتا ہے! مسٹر عبدالحمید اسماعیل ان دنوں کسی جہاز راں کمپنی میں بہت بڑے افسر تھے!

تقسیم ہند کے بعد وہ بھی کراچی چلے آئے، اور یہاں "پان اسلامک کمپنی" قائم کردی، اس کمپنی کی طرف سے دو بار بڑے شاندار پیمانہ پر تقریبیں ہوئیں، مرحوم نے مجھے اُن میں خاص طور سے بلوایا، میں نے ان جلسوں میں نظمیں پڑھیں، جنہیں خاصے اہتمام سے چھپوایا گیا۔
ان پارٹیوں میں قریب دو دو ہزار مہمانوں نے شرکت کی، کیسا سلیقہ اور کیا حسنِ انتظام تھا! ہر طرف شہر کے منتخب افراد اور اعلیٰ حکام ہی نظر آتے تھے
سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین جب پہلی بار پاکستان تشریف لائے تھے تو "پان اسلامک اسٹیم شپ کمپنی" کی طرف سے بیچ لگژری ہوٹل میں اُن کے اعزاز میں شاندار لنچ دیا گیا تھا۔

۱۹۵۵ء میں مجھے زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہوئی پان اسلامک کمپنی کے جہاز سے ڈیک کے ٹکٹ خریدے تھے مستورات بھی ساتھ تھیں، قلی ہمارا سامان ڈیک پر پہونچا چکے تھے میں سیڑھیوں پر چڑھ کر جہاز میں داخل ہوا، تو عبدالحمید اسماعیل مرحوم کھڑے ہوئے ملے، علیک سلیک ہوئی، بولے یہاں کیسے! میں نے کہا حج کا قصد ہے، فرمایا، کس درجہ میں سفر کر رہے ہو، میں نے جواب دیا، ڈیک میں!! اس پر قدرے متحیر ہوکر بولے: ـــــ "اہیں! آپ اور ڈیک میں۔۔ یہ کیا!" اُن کے قریب ہی جہاز کے افسر کھڑے تھے حکم دیا کہ افسروں کا کمرہ کھلوا کر انہیں دیا جائے، اُن کے حکم کی ذرا سی دیر میں تعمیل ہوگئی، یہ کمرہ فرسٹ کلاس کے بالکل محاذ میں تھا، ہمارا سامان بھی تیسرے درجہ سے اوپر آگیا، اور آن کی آن میں فرش والے عرش نشین بن گئے! مرحوم کی مہربانی سے بڑا آرام ملا، حجاز مقدس سے واپسی میں جناب ضیاءالدین احمد برنی کے توسط اور مرحوم کے حکم اور منظوری سے پھر اسی کمرے میں انتظام ہوگیا! اُن کے لئے بار بار دل سے دعائیں نکلیں! شیطان نے اس وسوسہ میں مبتلا کرنا چاہا کہ یہ تمہاری شاعرانہ شہرت کے سبب سب کچھ ہو رہا ہے، مگر ضمیر نے لاحول پڑھی کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے!

اہلِ غرض، ضرورت مند اور بے روزگار بڑے آدمیوں سے لوگوں کے تعلقات و روابط کا پتہ لگا لیتے ہیں، مجھ سے بھی نہ جانے کتنے اُمیدوار مرحوم کے نام سفارشی خطوط لیکر اُن سے ملے جن کی قسمت نے یاوری کی اُنہیں جگہ بھی مل گئی! سفارشوں کی بھرمار سفارش کو بے وزن بنا دیتی ہے، اہلِ غرض کو یہ بات سمجھاؤ، تو وہ یہ تاثر قبول کرتے ہیں کہ ہمارے ٹالنے کے لئے یہ فلسفہ بگھارا جارہا ہے۔
عبدالحمید اسماعیل مرحوم برسوں سے دل کے مریض تھے، اُن کی صورت کو دیکھ کر ترس آتا تھا، اسی بیماری اور نقاہت کے عالم میں کمپنی کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے، دوسرے ملکوں میں جاکر کروڑوں روپیہ کی قیمت کے جہازوں کا سودا کرتے، بحری جہازوں کے نظم و نسق میں وہ مہارت تامہ اور یدِ طولیٰ رکھتے تھے، پان اسلامک کمپنی کو انہی کی خداداد ذہانت اور حسنِ انتظام کی بدولت

کہاں سے کہاں پہونچا دیا، اس کمپنی کے وہ سب سے بڑے افسر بھی تھے اور حصہ دار بھی! کئی کئی ہزار روپیہ کی تنخواہ کے عہدیدار اُن کے نیچے
کام کرتے تھے، اس عزت اور جاہ و دولت کے ہوتے ہوئے، متواضع اور منکسر المزاج تھے۔

اُن کے بڑے بھائی محمد ہاشم اسمٰعیل مرحوم بمبئی سے پاکستان آتے رہتے، واہ (W A H) کی کسی کمپنی سے اُن کا تعلق تھا، ہاشم
اسمٰعیل کو شاعری کا خاص ذوق تھا، اردو کے پسندیدہ اور منتخب اشعار کا انتخاب بھی انھوں نے چھپوایا تھا۔ اس کتاب کی زیب و زینت
[illegible] ہے، جس پر انھوں نے ہزاروں روپیہ خرچ کئے!

ہاشم اسمٰعیل مرحوم اپنے چھوٹے بھائی عبدالحمید اسمٰعیل مرحوم کے مکان میں ٹھیرتے، یہ مکان نہیں قصر ہے، کراچی کی سب سے اُونچی
پہاڑی پر بلند و بالا عمارت، پائیں باغ میں کھڑے ہو کر دیکھئے تو کراچی کس قدر خوش منظر لگتا ہے، اس مکان کا باغیچہ، برآمدے، صحن
کمرے، فرنیچر، صفائی، سلیقہ، خوش انتظامی غرض ہر چیز دامنِ دل کو کھینچتی ہے کہ "جا ایں جا است"۔ ہاشم اسمٰعیل نے کئی بار راقم الحروف
کو اس مکان میں کھانے پر بلایا، وہ فرماتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہوں، اُن کا اصرار تھا کہ
میں اپنے کلام کا انتخاب چھپواؤں، ایک بار بمبئی سے شیروانی کا کپڑا لا کر دیا، ابھی چند ماہ قبل کراچی تشریف لائے تو کہتے تھے کہ گرمی کا
زمانہ یورپ میں گزاروں گا، یورپ کے بڑے بڑے لوگوں سے اُن کے تعلقات تھے، افسوس ہے کہ لندن کے کسی ہوٹل میں
اُن کا ہارٹ فیل ہوگیا! منتخب شعروں کی بیاض اور "فاران" میں چھپے ہوئے مضامین! اپنی علمی اور ادبی یادگار چھوڑے!
بڑے بھائی کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا، کہ چھوٹے بھائی (عبدالحمید اسمٰعیل) کو اپنی خوش نما، خوش منظر بلند و بالا کوٹھی
چھوڑ کر قبر کا گوشہ بسانا پڑا! رہے نام اللہ کا! (اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے)

جو آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن اس دُنیا سے جانا ہے، موت ہر نفس کے لئے مقدر ہو چکی ہے ؎
وہ بھی نہ رہیں گے، جو رہے ہیں

حیوان اور ڈھور ڈنگر موت و ہلاکت سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے اور کرتے بھی ہوں تو ہم اُسے سمجھ نہیں سکتے۔
مگر انسانوں کو موت سے عبرت ملتی ہے، اور جو دُنیا کو "مزرعۂ آخرت" سمجھ کر، نیکیوں کی تخم ریزی میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے
ہیں، وہی کامیاب اور بامراد ہیں۔

ہماری نظر میں!

زجاجۃ المصابیح

تالیف :- مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ حیدرآبادی - ضخامت ۵۹۰ صفحات، قیمت :- چھ روپے
ملنے کا پتہ :- محلہ حسینی علم، جوبلی پوسٹ آفس (۲) حیدرآباد دکن (ہند)
(الجزء الاول) پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :- نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی۔

حضرت مولانا سید عبداللہ نقشبندی حیدرآبادی نے "مشکوٰۃ شریف" کے طرز پر احادیث نبوی کو جمع کیا ہے، اس کتاب کے ابواب و عنوانات بھی "مشکوٰۃ" ہی سے لئے گئے ہیں! فرق یہ ہے کہ تدوین و تالیف احادیث میں صاحب مشکوٰۃ کے پیش نظر فقہ شافعی رہا ہے اور اس کتاب کے فاضل مولف نے فقہ حنفی کے مسائل کی رعایت سے اس عظیم الشان کارنامہ کو انجام دیا ہے، کوئی شک نہیں کہ لائق مولف اس دینی اور علمی پیش کش پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں! اس کتاب کے سبب دینی طبقوں میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا!

اس کتاب کا "تعارف" اس عبارت پر ختم ہوتا ہے:-

"مختصر یہ ہے کہ جس طرح مشکوٰۃ شافعی مذہب والوں کے لئے ایک نعمت ہے
بالکل اسی طرح یہ کتاب حنفی حضرات کے لئے ایک بہترین اور نادر تحفہ ہے"۔

حالانکہ حق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث کا تعلق کسی ایک فقہی مذہب یا مخصوص کلامی مکتبہ فکر سے نہیں ہے مشکوٰۃ ہو یا زجاجہ یہ دونوں کتابیں پوری امت کے لئے دلیل راہ ہیں، اور ان سے سب کو یکساں طور پر استفادہ کرنا چاہیئے۔

اور

حق تمام فقہی مذاہب میں دائر و سائر ہے، اس قسم کے مختلف فیہ فقہی مسائل کی نوعیت راجح و مرجوح کی ہے، حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی اور اہل حدیث مذاہب میں کسی کے یہاں کوئی مسئلہ راجح ہے، کسی کے ---- یہاں کوئی مسئلہ مرجوح ہے!

نور المصابیح

تالیف :- مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ نقشبندی مجددی قادری
ضخامت ۳۵۰ صفحات، قیمت پانچ روپے۔
حصہ اول - جلد اول ملنے کا پتہ :- مکتبہ نقشبندیہ ۴۲۳، حسینی علم، حیدرآباد دکن ۲ (آندھرا)
پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :- نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی۔

یہ "زجاجۃ المصابیح" کے پہلے حصہ کا (باب المستحاضۃ تک) اردو ترجمہ ہے، اردو جاننے والوں کے لئے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے، زبان آسان اور سہل ہے، مگر بعض مقامات پر دکن کی زبان استعمال کی گئی ہے:-

"آدم علیہ السلام بھول گئے اور درخت (ممنوعہ) کو تناول کرلئے" (صفحہ ۱۰۲) "تناول کرلیا" لکھنا چاہیئے تھا۔
"ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور عذاب قبر کا ذکر کی اور کہی" (صفحہ ۱۰۸) "عذاب قبر کا ذکر کیا اور کہا" روزمرہ ہے۔

"ایک انصاری نے ایک تھیلی درہم یا دینار کی اٹھالائی" (صفحہ ۱۴۷) ایسے موقعوں پر "اٹھا لی" بولتے ہیں ــــ "حضورؐ نے بھی تناول فرمایا اور ہم بھی کھاتے" (صفحہ ۱۸۳) "اور ہم نے بھی کھایا" صحیح زبان ہے ــــ "ایک بلی آئی اور اس سے کچھ کھائی" (موطا) "اور اس میں سے کچھ کھالیا" لکھنا تھا۔

صفحہ ۸۷ پر "وما تشاؤن" کا ترجمہ "تم کوئی بات نہیں چاہ سکتے" کی جگہ "تم کوئی بات نہیں جان سکتے" کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ــــ صفحہ ۲۲۰ پر "فوثب علیہ عمر فوطئہ وطأ شدیدا" کا ترجمہ کیا ہے "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر حملہ کیا اور ان کو خوب روندا" ــــ ایسے موقعوں پر اردو میں "کھدیڑا" بولتے ہیں۔

صفحہ ۱۳۶ پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو یہ قول نقل کیا گیا ہے "کہ حنفیہ کے نزدیک ثابت ہے کہ حدیث بھی کتاب اللہ کی ناسخ ہوتی ہے"۔ سخت خلجان میں ڈالنے والا ہے، حدیث کتاب اللہ کی ناسخ نہیں، شارح ہوتی ہے! حدیث نبوی کے جانچنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ سے متصادم و معارض نہ ہو، فاضل مولف نے شاہ عبدالحق دہلوی کے اس قول کے ثبوت میں کتنی کمزور بات کہی ہے، فرماتے ہیں :-

"اس کی دوسری مثال قولِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "نحن معاشر الانبیاء لا نورث" (ہم انبیاء کی جماعت کسی کو وارث نہیں بناتے) یہ حدیث بھی آیت میراث کے ایک خاص حکم کی جو نبیوں سے متعلق ہے، ناسخ ہوتی ہے، اور باقی آیت اپنے حال پر باقی رہے گی"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی نبی کی شریعت میں بھی نبی کا کوئی وارث قرار نہیں پایا، جہاں تک وراثت کا تعلق ہے انبیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ازلی و ابدی قانون ہے! اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کرام کی وراثت کے بارے میں اسی تخصیص کا ذکر کیا ہے! تو حدیث قرآن کے کسی حکم میں جو تخصیص کرتی ہے، اُسے "نسخ" پر محمول نہیں کرنا چاہیے! سُنّتِ رسول بے شک دین میں حجت ہے، مگر کتاب اللہ کے مقابلے میں بہرحال "ظن" ہے اور "ظن" "یقین" کا ناسخ نہیں ہو سکتا۔

فقہ حنفی میں وضو کی نیت کئے بغیر وضو کرلیا جائے تو وضو درست ہو جاتا ہے، امام شافعی کے نزدیک نیت وضو میں فرض ہے! یہاں ہم دونوں مسلکوں پر کوئی محاکمہ کرنا نہیں چاہتے، اس لئے بھی کہ اس طرح بات بہت لمبی ہو جائے گی، اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ ــ ایاز قدرِ خود بشناس! اس سلسلہ میں فاضل مولف نے مسلک حنفی کی تائید میں جو دلیل پیش فرمائی ہے وہ کوئی وزن نہیں رکھتی، یہ کہ :-

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن ہاتھ میں لینا چاہا، تو آپ کی بہن نے فرمایا اگر قرآن ہاتھ میں لینا چاہتے ہو تو غسل کرو یا وضو کرو، اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وضو نیت کے بغیر صحیح ہے اور یہی حنفی مذہب ہے"۔ (ص۲۲)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ابھی تک مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے، اس صورت میں وضو میں اُن کی نیت کرلینے یا نہ کرنے سے استدلال کرنا ہی بے معنیٰ ہے۔

بعض ایسی احادیث بھی اس کتاب میں آئی ہیں، جو اپنے مطالب و معانی کی شرح و تفصیل چاہتی تھیں، فاضل مولف نے کہیں کہیں جزوی مسائل پر تو "فوائد" لکھے ہیں، مگر ان احادیث کی تشریح کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

• نورالمصابیح کی افادیت میں کون صاحبِ ایمان شک کرسکتا ہے، یہ کتاب ہمارے لئے سعادت وہدایت اور نجات و مغفرت کا وثیقہ ہے اور زندگی کا مقدس ضابطہ، منشور اور پروگرام ہے!

خاتم الرسل

مولف وناشر:۔ الحاج محمد عزیزاللہ (بی، ٹی، ایس) ضخامت ۴۰ صفحات

صرف محصول ڈاک (نو پیسے) بھیجنے پر ڈاکٹر احسان علوی ڈینٹل سرجن آرام باغ روڈ کراچی سے یہ کتاب مفت مل سکتی ہے

اس کتابچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کے بعض گوشوں کو سلیس اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس میں صحابۂ کرامؓ کی جاں نثاری کے بعض واقعات بھی ہیں، اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ابوسفیانؓ اور وحشی (رضی اللہ عنہما) جیسے شدید دشمنوں کو آخرکار حضورؐ کی تعلیم و اخلاق اور کریمانہ سلوک سے متاثر ہوکر اسلام لانا پڑا!

کتاب کے آخر میں یورپ کے علماء اور اربابِ فکر کی تحریروں کے جو اقتباسات دیئے ہیں، اس نے اس کتابچہ کی افادیت میں اضافہ کردیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح دشمنوں کی زبان سے، یہ کتنی بڑی شہادتِ حق ہے!

"جب آفتاب اُفقِ جہاں پر نمودار ہوتا ہے، چراغ گل کر دیئے جاتے ہیں اسی طرح انوارِ محمدیؐ کے سامنے کسی اور نبی کی روشنی ٹھیر نہیں سکتی (ص ۱۳)

اس عبارت کو آئندہ ایڈیشن میں ضرور حذف کردینا چاہیے کہ حضورؐ کا اس انداز میں دوسرے نبیوں سے مقابلہ ادب شناس وجدان کو کھٹکتا ہے، اور ایسا کرنے کی ممانعت آئی ہے!

خاتونِ پاکستان کا رسول نمبر

مدیر:۔ شفیق بریلوی، ادارہ:۔ مسرت جہاں، طلعت شہناز
ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت:۔ دو روپے، سالانہ چندہ:۔ چھ روپے
طالبات سے:۔ پانچ روپے، ملنے کا پتہ:۔
دفتر "خاتونِ پاکستان" ۵ گاندھی گارڈن روڈ، کراچی۔

"خاتونِ پاکستان" پاکستانی خواتین کا مشہور اور مقبول ماہنامہ ہے، جس کے متعدد "خاص نمبر" شائع ہوچکے ہیں، اس کا اگست کا شمارہ "رسولؐ نمبر" ہے، اس شمارے کے مضامین ایمان افروز بھی ہیں، اور دلچسپ بھی ہیں! خاص طور سے نظموں کا حصہ بہت متنوع ہے! سرورق گنبدِ خضرا کے مبارک نقشہ سے مزین ہے! جو انتہائی دید، زیب اور جاذبِ نظر ہے۔

جناب شفیق بریلوی کو "رسولؐ نمبر" کی اشاعت پر دین و دنیا میں صلہ ملے گا، اس سعادت کے لئے انہیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

حیات عبداللہ ابن مسعودؓ

از:۔ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی (پروفیسر شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی)
ضخامت ۴۷ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش)
ملنے کا پتہ:۔ محمد سراج الآفاق اینڈ برادرز، ۱۶۶ شاہ گنج، الہ آباد

جناب ڈاکٹر محمد احمد صدیقی، عربی، فارسی اور اردو کی بہت سی کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں، موصوف کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں! انھوں نے اپنی اس کتاب میں جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی عربی زبان میں لکھے ہیں، احادیث اور تاریخ کی کتابیں جو ان کی اس تالیف کا ماخذ ہیں، ان کے حوالے جگہ جگہ درج ہیں! اللہ تعالیٰ

اس محنت پر انہیں دارین میں اجر عطا فرمائے گا کہ صحابۂ کرامؓ کی مقدس زندگیوں کے حالات پڑھنے اور ان کے چرچا کرنے سے دلوں کا تزکیہ ہوتا ہے!

حقوق الاسلام

از:۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ۔ ترجمہ:۔ وحید الدین سلیم پانی پتی
ضخامت ۱۲۸ صفحات (مجلد رنگین سرورق) قیمت:۔ دو روپے
ملنے کا پتہ:۔ پاک اکیڈمی ۱/۱۴۲ وحید آباد، گولی مار، کراچی ۱۸

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بلند پایہ کتاب "تفسیر مظہری" کے واسطہ سے علمی اور دینی طبقوں میں متعارف مشہور اور مقبول ہیں۔ آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ سے تلمذ اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ سے بیعت طریقت کا شرف حاصل تھا، حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ آپ کے معاصر تھے، متاخرین علماء میں قاضی صاحب بہت بڑے درجے اور ممتاز شخصیت کے حامل ہیں۔

حضرت قاضی صاحب نے "حقوق العباد" پر فارسی زبان میں ایک رسالہ لکھا تھا جس کا اردو زبان میں ترجمہ مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی نے کیا تھا جو پانی پت کے حالی پریس سے ۱۹۱۰ء میں "حقیقت الاسلام" کے نام سے شائع ہوا تھا اب اسے پاک اکیڈمی نے مسلمانوں کے عام استفادے کے لئے چھاپا ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر مفید ہی نہیں ضروری بھی ہے کہ ہم مسلمان "حقوق اللہ" کی طرح "حقوق العباد" کے ادا کرنے میں بھی کوتاہی برتتے ہیں، اور اس چیز نے ہمارے معاشرے میں انتشار اور ابتری پیدا کر دی ہے! حق یہ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ساتھ ساتھ چلنے چاہئیں اس طرح معاشرہ متوازن رہے گا۔

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن پاک کی اس آیت:۔

"قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى"

کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔ "اے پیغمبر! مسلمانوں سے کہو کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کی کچھ مزدوری تو مانگتا ہی نہیں مگر میرے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ محبت تو قائم رکھو"!

اس آیت کا ترجمہ اور اس کی تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے اس طرح کی ہے:۔

> "یعنی قرآن جیسی دولت تم کو دے رہا ہوں، اور ابدی نجات و فلاح کا راستہ بتلاتا اور جنت کی خوش خبری سناتا ہوں، یہ سب محض لوجہ اللہ ہے، اس خیر خواہی اور احسان کا تم سے کچھ بدلہ نہیں مانگتا، صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ تم سے جو میرے نسبی اور خاندانی تعلقات ہیں کم از کم ان کو نظر انداز نہ کرو، آخر تمہارا معاملہ اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے، بسا اوقات ان کی بے موقع حمایت کرتے ہو، میرا کہنا یہ ہے کہ تم اگر میری بات نہیں مانتے نہ مانو، میرا دین قبول نہیں کرتے یا میری تائید و حمایت میں کھڑے نہیں ہوتے، نہ سہی، لیکن کم از کم قرابت و رحم کا خیال کر کے ظلم و اذیت رسانی سے باز رہو، اور مجھ کو اتنی آزادی دو کہ میں اپنے پروردگار کا پیغام دنیا کو پہنچاتا رہوں، کیا اتنی دوستی اور فطری محبت کا بھی میں مستحق نہیں ہوں (تفسیر) آیت کے یہی معنی ہیں

میں حضرت عباسؓ سے منقول ہیں، بعض سلف نے "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی" کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو اور حقِ قرابت کو پہچانو اور بعض نے "قُرْبٰی" سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب اور نزدیکی مراد لی ہے۔ یعنی اُن کاموں کی محبت جو خدا سے قریب کرنے والے ہونگے، مگر صحیح اور راجح تفسیر وہی ہے جو ہم نے اول نقل کی ہے۔"

"بعض علما نے "مَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی" سے اہلِ بیت نبویؐ کی محبت مراد لے کر یوں معنی کئے ہیں کہ میں تم سے تبلیغ پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا، بس اتنا چاہتا ہوں کہ میرے اقارب کے ساتھ محبت کرو، کوئی شبہ نہیں کہ اہلِ بیت اور اقارب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و تعظیم اور حقوق شناسی اُمت پر واجب اور جزءِ ایمان ہے اور اُن سے درجہ بدرجہ محبت رکھنا حقیقت میں حضورؐ کی محبت پر متفرع ہے، لیکن آیت ہٰذا کی تفسیر اس طرح کرنا شانِ نزول اور روایاتِ صحیحہ کے خلاف ہونے کے علاوہ حضورؐ کی شانِ رفیع کے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"

صفحہ ۱۶ پر "رزین" کو کاتب نے "زرین" لکھ دیا، اس قسم کی سہو کتابت کے سبب ناواقف لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ——— کتاب کے آخر میں "رسالہ سماع و مزامیر" شامل کیا گیا ہے، جس میں حضرت مصنف نے سماع و مزامیر کے بارے میں مخالف و موافق اقوال درج کر دیئے ہیں، سچی بات یہ ہے راگ رنگ اور گانا بجانا اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، بعض صوفیا نے جن سخت شرائط کے ساتھ سماع کو جائز رکھا تھا، اس کو آج کل کی موسیقی اور گانے بجانے پر دلیل لانا پہلے درجہ کی حماقت اور دین کے ساتھ مذاق ہے۔

اخبارِ رنگین

از:- سعادت یار خاں رنگین، مقدمہ و تعلیقات - ڈاکٹر سید معین الحق -
ضخامت ۱۳۲ صفحات (بڑا سائز) مجلد، رنگین سرورق! قیمت چھ روپیہ -
ملنے کا پتہ:- پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۳۰ - نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبرہ

سعادت یار خاں رنگین (ولادت ۱۷۵۶ء وفات ۱۸۳۵ء) شاعر تھے، نثر نگار تھے، زباں دان اور عالم تھے اور ساتھ ہی فن شہسواری و سپہ گری میں مہارت رکھتے تھے، ان کی جامعیت اور وسعتِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ عربی، فارسی، ترکی، اُردو، پنجابی، پوربی، گجراتی، مرہٹی اور پشتو زبانیں نہ صرف یہ کہ جانتے تھے بلکہ اُن میں شاعری کرتے تھے۔

"اخبارِ رنگین" اُن کی نثر کی مشہور کتاب ہے، اس کتاب میں:-

"مصنف نے ایک دلچسپ طریقہ بیان اختیار کیا ہے، خود اپنے ضمیر کو بادشاہِ وقت متصور کر کے اس دور کے وہ واقعات جس سے وہ متاثر ہوتے تھے، بطور رپورٹ اس بادشاہ کے دربار میں پیش کئے ہیں، اس کے بعد اپنے ردِ عمل کو بادشاہی فیصلہ اور حکم کی شکل میں بیان کیا ہے، یوں سمجھنا چاہیئے کہ بادشاہ کا فیصلہ درحقیقت سعادت یار خاں رنگین کا تبصرہ ہے۔" (دیباچہ)

[1] افسوس ہے کہ ٹائپ پرانی چال کا ہے، اُردو کے بڑے دیدہ زیب اور جلی ٹائپ تیار ہو چکے ہیں، اُنہی کو استعمال کرنا چاہیئے تھا۔

اس کتاب کے پڑھنے سے شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کی دلی کا تمدن، سیاسی ماحول، دربار شاہی کا رنگ اور عام حالات کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، زبان انتہائی سلیس و سادہ ہے، کیا عجب ہے کہ مرزا غالب نے بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھایا ہو، غالب کے خطوط کے انداز تحریر کی سادگی اور بیان کی بے تکلفی میں "اخبار رنگین" کی کسی نہ کسی حد تک جھلک پائی جاتی ہے۔ تحریر کا ایک نمونہ :-

"خبر گزری کہ فیروز پور جھرکہ میں نواب احمد بخش خاں سے سعادت یار خاں رنگین ایک مغل تمونز ولایتی کی بہت سی تعریف کی، انھوں نے کہا کہ انسان کا احوال سالہا سال میں دریافت نہیں ہوتا، تم نے چند روز میں اس کی اتنی خوبیاں معلوم کرلیں اور ہم سے بہت مبالغہ کرکے کہدیں بھیا! تمہاری دانائی سے یہ بات نہایت بعید ہے"۔

"اخبار رنگین" میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر "خبر" اور "واقعہ" کے آخر میں کسی شاعر کا فارسی شعر ہے، پھر فارسی اور ہندی کی ضرب الامثال ہیں، اس کے بعد خود رنگین کا کہا ہوا، اس واقعہ سے متعلق شعر ہے اور آخر میں سعدی شیرازی کا قطعہ ہے!

رنگین کے بیشتر اشعار میں "آورد" پائی جاتی ہے، اس قسم کے :-

کب تلک مقرا کے پیڑے کھائے گا　　موت کے آخر تھپیڑے کھائے گا

ایک دن آخر کو سب مر جائیں گے　　باغ دنیا سے گزر کر جائیں گے

عشق کے مکتب کی بابت اور ہے　　تو سمجھتا ہے یہ بابت اور ہے

شعروں میں کوئی لطف اور چٹخارہ نہیں، مگر جہاں کہیں اس طرح کے :-

یار کے اس ابروئے خمدار سے ڈرتے نہیں　　ہم سپاہی ہیں کھنچی تلوار سے ڈرتے نہیں

اشعار آگئے ہیں، نثر کا لطف دوبالا ہوگیا ہے!

رنگین کی تحریر میں "املا" کی غلطیاں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، وہ صیغے کو صیغے، امرد پرستی کو عمرد پرستی، صمم کو ثم، عیال کو لیال، امر بیل کو عمر بیل لکھتے ہیں! صفحہ ۷۰ پر "دھتکارا" کی جگہ "دکارا" نظر سے گزرا!

اب سے تین چار سو سال پہلے دکن کے شعراء تو اپنے کلام میں متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کردیا کرتے تھے مگر حیرت ہے کہ رنگین نے "گرم" کو "گرم" "ر" کو حرکت کے ساتھ بروزن "اَلَم" باندھا ہے -

شمع ساں ہجر میں اپنا سر و سامان جلا　　اشک آنکھوں سے گرم آئے کہ دامان جلا

سعادت یار خاں رنگین کے افکار و معتقدات میں "توحید خالص" کا رنگ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا، فرماتے ہیں :-

خبر گزری کہ رام گنگا میں کشتی غرق ہونے لگی، قریب دو تین سو ہندو و مسلمان اس میں بیٹھے تھے، مسلمان اپنے اولیاء انبیاء کو اور ہندو اپنی دیبی بھوانی اور کالکا کو رو رو کر یاد کرتے لگے، غرض بہ ہر صورت حق سبحانہٗ جل شانہٗ نے اس بلا سے نجات دی، دریا کے پار گاؤں کے پاس ایک تکیہ تھا، وہاں آکر سب بیٹھے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے، مسلمان اپنے بزرگوں کا نام لے لے کہنے لگے، کسی نے کہا حضرت مرتضیٰ علیؓ نے مدد کی، کسی نے کہا حضرت عباسؓ نے پرورش کی، کسی نے کہا حضرت پیران پیر کی مہربانی ہوئی، غرض ہر ہر بزرگ کا نام ایک لیتا تھا، اور ہندو اپنے دیوتا اور اوتاروں کا نام لے کر کہتے تھے کہ بھوانی

کالکادیبی اور بھدرکالی نے کیا گی دگرنہ مر ہی چکے تھے، اس مجمع میں سعادت یار خاں رنگین
یعنی یہ مصنف بھی تھا اُس نے ہنس کر کہا کہ یارو! تم سب مخلوق ہو اور عجب تعجب ہے کہ
تم کو مخلوق نے بچایا، اور خالق کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ تمہارے کسی کے کام نہ آیا۔ یہ کیا
ستم ہے کہ خالق کو معطل جانتے ہو اور اُس کی جگہ مخلوق کو مانتے ہو۔ جو کہ مشرک تھے وہ تو
اس بات کو سن کر گھبرائے، اور جو خدا پرست تھے وہ اس رمز کو پاگئے، بادشاہ نے سن کر
فرمایا کہ وہ سب کا خالق ہے اور سب اس کی مخلوق ہیں، وہی جو چاہے وہ ہو سکتا ہے وہ لغو
ہے جو اور کوئی کچھ بکتا ہے"۔ (صفحہ ۴۱ — ۴۲)

بقول فاضل دیباچہ نگار سعادت یار خاں رنگین کے خیالات پر ولی اللّٰہی فکر کا کس قدر اثر تھا۔

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے مجلّہ (جرنل) کی چند اشاعتوں میں "اخبار رنگین" کا متن اشاعت پذیر ہو چکا ہے اب
اُسے کتابی صورت میں چھاپا گیا ہے، جناب ڈاکٹر معین الحق نے مقدمہ لکھا ہے اور تعلیقات و حواشی تحریر فرمائے ہیں! ڈاکٹر
صاحب موصوف کا مقدمہ خوب نہیں بہت خوب ہے، جو اُن کے علمی و تاریخی تبحر کی زندہ شہادت ہے! انھوں نے تاریخی حوالوں کے
ساتھ ثابت کیا ہے کہ مغلیہ سلطنت کو ختم کرنے کے لئے انگریزوں نے کیسی کیسی شاطرانہ چالیں چلی ہیں، اور کس ڈپلومیسی سے کام لیا
ہے! انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اکبر شاہ ثانی نے جو رام موہن رائے کو لندن اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا، تو اس شخص نے کردار کی پستی کا
مظاہرہ کیا، اور ایسی حرکتیں کیں جو ایک بھلے مانس کو کسی طرح زیب نہیں دیتیں۔

"اخبار رنگین" پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سلسلہ مطبوعات کی اُنتیسویں کتاب ہے، یہ ادارہ خاموشی کے ساتھ فنِ تاریخ
کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

اوس اور کرنیں

از:— ع، س، مُسلم، ضخامت ۲۴۰ صفحات، (مجلد، رنگین دیدہ زیب گرد پوش)

قیمت:— تین روپے — ۵۰ پیسے —

ملنے کا پتہ:— مکتبہ نیا راہی، کراچی ۱۸

اس سے پہلے جناب مُسلم کے افسانوں کا مجموعہ (ایک ٹہنی کے پھول) شائع ہو چکا ہے، اب اُن کا کلام کتابی صورت میں منظرِ عام
پر آیا ہے! جناب عزیز علوی نے مُسلم صاحب کی زندگی کے حالات لکھے ہیں، جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ذات سے ایک
"مستقل ہنگامہ" واقع ہوئے ہیں، کتنی بہت سی سیاسی اور مذہبی تحریکوں سے اُن کی وابستگی رہی ہے، اور اُن کی زندگی تجربوں کے
کیسے کیسے عجیب و متضاد مرحلوں سے گزری ہے! جناب مُسلم مزدوروں کے جمعدار بھی رہے ہیں، اُن کی ہمت کو ہزار آفریں کہ ان مشکلات
و مصائب اور ہنگاموں میں انھوں نے تعلیم کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا اور گریجویٹ ہو گئے، اب وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے
خوشحال ہیں!

اس کتاب پر دیباچہ جناب رفیق خاور نے تحریر فرمایا ہے! رفیق خاور صاحب اپنے افکار و خیالات اور نثر و نظم
کے "شہ پاروں" (؟) کے لحاظ سے "عجیب چیز" واقع ہوئے ہیں،

؎ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس دیباچہ میں انھوں نے مُسلم کی شاعری کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے، اور بعض مقامات پر خاصی نازک باتیں بیان

کی ہیں —— مگر جب وہ یوں فرماتے ہیں :-

• اور اب ذہنی ارتقائی مرحلے ناپنے کا شوق، جس کا مجھے کچھ ایسا مشتاق تو نہیں، تاہم ذہنی جراحی بھی تو ایک مشغلہ ہے . . . " (صفحہ ۵۶)

— تو —

وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے ہیں۔

جناب ع ۔ س مُسلم کی شاعری میں جذبات کی شدت پائی جاتی ہے، اُن کا چوٹ کھایا ہوا دل منظوم فریاد کرتا ہے اور غالب کے علی الرغم "لے" کے ساتھ فریاد کرتا ہے۔ انھوں نے غزل، نظم، گیت اور قطعہ سبھی کچھ کہا ہے، جن میں اُن کا اپنا رنگ جھلکتا ہے —— ان اشعار کو پڑھئے اور لطف اٹھایئے :—

ٹوٹ جاتے ہیں لاکھ پیمانے ایک دل کی شکستگی کیا ہے

ستم ظریفیِ برق چمن کو کیسا کہئے وہیں گری ہے، جہاں میرا آشیانہ تھا

نوائے تلخ پہ دُنیا نے کر دیا مجبور لبوں پہ ورنہ محبت بھی کا ترانہ تھا

جن پر ہم کو مان بہت تھا، بول وہ اپنے ہارے
نہیں بھیرے بھئے پرائے ساتھی سنگی پیارے

پریت وہ ہم راہی ٹھیرے، میل بھلا ہو کیسے
ساجن رنگ محل کے راجہ، ہم جوگی بنجارے

اب ہوائے گل چلے صرصر چلے ہم تو دُنیا سے کنارہ کر چلے

تو نے ہر بار عہد توڑا ہے میں نے ہر بار اعتبار کیا

میکدے کی خیر ہوا ے دوستو! اس قدر پیتے نہیں ہم بالعموم

ترکِ تعلقات ہے ناصح کا مشورہ گو میرے اختیار سے باہر ہی کیوں نہ ہو

صبحدم صحن گلستاں میں ہوا میرا گزر محوِ حمدِ حق تھے مرغانِ چمن سب سربسر

چند غنچے بے محابا مسکرا دیتے کو تھے جس طرح بچے مآل کار سے ہوں بے خبر

برسرِ عام نمائش ہے جگر پاروں کی کس قدر بھیڑ ہے دیکھو تو خریداروں کی

زندگی اضطراب ہے مُسلم
رُوح پارے میں ڈالدی کس نے

دُوسرا رُخ :—

دیکھ کر غیر حال مُسلم کا ہنس کے بولے کہ تو نے پی کیا ہے (صفحہ ۶۶)

"پی کیا ہے" کے تیور کس قدر غیر شاعرانہ ہیں۔

بہ تنجیر فریب زر، تو آزاد طلب مردم
غلام رنگ و بو ہے یہ خودی تیری فسانہ طرازی (صفحہ ...)

ملے کتاب میں "محبت کا ہی ترانہ" چھپا ہے —

"تو آزادی طلب مردم" ہوگا، یہ کتابت کی غلطی ہے۔ "نخچیر فریبِ زر" کی ترکیب کس قدر نامانوس ہے! پھر دوسرا مصرعہ اور زیادہ الجھا ہوا "رنگ و بُو" لانے کا اس شعر میں کیا محل تھا!

یہ دورِ مکر و عیاری، ترا اندازِ بے باکی		جواں مردوں کو کیوں ہو نسبتِ قانونِ روباہی (ص۲۹)

"نسبت قانونِ روباہی" نے سارے شعر کا لُطف غارت کر دیا!

جیون کی یہ کشٹ ڈگریا، میں ہوں ایک اکیلی

مَن پاپی بھی چھوٹا جائے، چھوٹے اور سہارے (ص۳۵)

"اکیلی" کے بعد "ایک" کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس کی کسی نہ کسی عنوان توجیہہ ہو سکتی ہے مگر "کشٹ ڈگریا" دوسرے بولوں کے ساتھ کتنا بے جوڑ سا لگتا ہے! گیت کے یہ بول یوں ہو سکتے تھے۔

جیون کی اس پگڈنڈی پر، میں ہوں آج (یا ہائے) اکیلی

دوسرے مصرعہ میں "من پاپی بھی چھوٹا جائے"۔ یہ بھی کمزور اندازِ بیان ہے!

آدم و حوّا سے مشیت کو یہ اچھی سوجھی		بازیٔ زیست بچھا دی کہ وہ کھیلیں باہم (صفحہ ۸۰)

"خیال" اچھا ہے، مگر اظہار و بیان نے خیال کی نزاکت کو مجروح کر دیا!

من مندر کے کھول دوارے
راہ تکوں بیٹھی پٹ لاگے
اب ناں اور وجوگ بڑھاؤ، سانجھ بھئی گھر آؤ (ص۸۸)

پہلے "بول" میں اول تو ناگوار تعقید پائی جاتی ہے پھر "دوارے کا کھولنا" غریب اندازِ بیان ہے، اس مفہوم کا ساغر نظامی کے گیت کا ایک مصرعہ ہے۔

پٹ مندر کے کھول پجارن!

دوسرے "بول" میں "پٹ لاگے" سے شاعر آخر کس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ "پٹ لاگے" سے یہ مفہوم تو ظاہر نہیں ہوتا کہ دروازے کو کھولے ہوئے آنے والے کا انتظار کیا جا رہا ہے! پھر تیسرے مصرعہ میں "بجوگ" کو سنسکرت بنانے یعنی "وجوگ" لکھنے کی کیا ضرورت آپڑی تھی! اس کے ماسوا "بجوگ بڑھانا" بھی محلِ غور ہے،

ایک قطعہ کا عنوان "بحر محبت" ہے ——

ء ان "بولوں" نے یک واقعہ یاد دلا دیا —— سر رضا علی مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اب سے سوا سترہ سال پہلے کی بات ہے دلی کی جامع مسجد کے سامنے اُردو بازار میں کتابوں کی ایک دکان (نگارستان) پر میں بیٹھا تھا سر رضا علی اپنی کار میں تشریف لائے قریب ہی مچھلی والے کی دکان تھی، وہاں سے مچھلی خریدی، کار میں بیٹھنے لگے تو مجھے اشارہ کیا، میں ان کے پاس دوڑ کر پہونچا، مجھے دیکھتے ہی بولے "سانجھ بھئی گھر آیو" اس سے کیا سمجھے، میں سوچ میں پڑ گیا، پھر وہ خود ہی بولے "ٹھگوں" کی اصطلاح! یعنی جب کوئی مسافر ان کے چنگل میں پھنس جاتا تھا تو ٹھگ آپس میں کہتے تھے "سانجھ بھئی گھر آیو" مطلب یہ تھا کہ رات اس مسافر کو اپنے یہاں مہمان رکھیں گے اور سوتے میں اُسے مار کر اس کا روپیہ پیسہ چھین لیں گے۔ (م۔ق)

ڈوبا ہوا ہوں بحرِ محبت میں سربسر
اب کشتیٔ حیات کنارے اُتار دو

راتوں کی نیند ہے نہ مجھے دن کو چین ہے
دلِ بے قرار ہے، اُسے آکر قرار دو (صفحہ ۴۲)

اس قطعہ میں شعریت کا دور دور پتہ نہیں!

پت جھڑ کے سوکھے رُکھ
جیسے ساجھ کریں میرا دکھ
اوس بھی ساتھ میں نیر بہائے

پت جھڑ مورے من کو بھائے
پھولن رُتوا کا سُن آئے (صفحہ ۱۰۸)

"دُکھ" کا قافیہ لانا تھا، اُس کے لئے "روکھ" کو "رُکھ" بنا دیا۔

ہاں! مگر اے آشنائے لذّتِ غمِ جانِ جاں — نالہ زاری کی ہے تسکیں کا یہی سِرِ نہاں (صفحہ ۱۱۰)

اس "نالہ زاری" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے؟ توبہ!

کسی سے محبت کیا چاہتا ہوں — سزاوارِ غم ہوں سزا چاہتا ہوں (صفحہ ۱۳۱)

ایسے بچکانہ شعر بھلا مجموعۂ کلام میں رکھنے کے قابل تھے۔

اس کے اک عارضی تبسم پر — زندگی وقفِ دام کردی ہے (صفحہ ۱۳۶)

"دام" لانے کی یہاں آخر کیا تُک تھی۔

آجا مورے نین ملا جا — جیون بھر تک مست بنا جا
جیون بھر کی پیاس مٹا جا — اک سندر جھنکار سنا جا
تیری پائل چھم چھم

"جیون بھر" کی تکرار کتنی گراں گزرتی ہے! "سندر" کی جگہ "مدھر" کہنا تھا (ایک مدھر جھنکار سنا جا)

اُٹھ رہے ہیں آرزوؤں کے ہجوم — گھوم اب اے چرخِ نیلی فام گھوم (صفحہ ۱۴۱)

"ہجوم" کا اُٹھنا" یہ کہاں کی زبان ہے؟

دردِ پیہم بڑھا رہے ہو تم — کیسے کہہ دوں بھلا رہے ہو تم
یوں نظر سے ملا رہے ہو نظر — جیسے مجھ کو جلا رہے ہو تم (صفحہ ۱۸۱)

یہ شاعری کے ساتھ مذاق، اور سننے اور پڑھنے والوں پر ظلم ہے۔

جیسے کُتّے سے چمٹ جائے کوئی مکھی کہیں — ایسے تیرے ذہن پر چھائی ہے تیری مہ جبیں (صفحہ ۲۱۶)

اس "ترقی پسند ادب" پر خدا کی پھٹکار ہو، اس نے دل و دماغ اور ذہن و فکر کو کس بُری طرح بگاڑا ہے — استغفر اللہ!

گجرے اُمید کے ٹُوٹے، ہم نے ترے خیال — اشک کے تار میں مایۂ غم پرو گئے (صفحہ ۲۲۲)

گجرے بنتے نہیں گوندھے جاتے ہیں! "مایہ غم" کا پرونا اس پر مستزاد!

ایک نظم "مبارکباد" ہے، جو "ناظرہ" اور "ممتاز" کی امتحان میں کامیابی پر کہی گئی ہے، اس کے دو شعر ہیں۔

رہو تم ناظرہ! باسر بلندی　　قدم چومے ہمیشہ ارجمندی
رہو ممتاز، یوں ممتازِ عالم　　کرو ٹوٹیں بادشاہوں کے دم خم

پہلے شعر میں "باسر بلندی" نے شعریت کا خون کردیا، اور دوسرے مصرعہ کا تو جواب ہی نہیں!! آخر بادشاہوں کے دم خم ٹوٹنے کا یہاں محل اور قرینہ کیا تھا! یہ کیا کہ جو جی میں آیا، لکھ مارا!

ہیں ان کے التفات کے یارو عجیب رنگ　　بخشش ہے یہ بھی گرچہ تہور ہی کیوں نہ ہو　(صفحہ ۲۳۸)

اسی کا نام "صنعتِ اہمال" ہے!

مسلم صاحب کو "بے سر و پا" نظموں (بلینک ورس) سے خاص شغف ہے، یہ نظمیں کیسی ہیں، اس کا تھوڑا بہت اندازہ اس ایک بند سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ انسانی لاشیں
یہ لاشوں کے ڈھیروں پہ کتوں کے انبوہ
لئے اپنی چونچوں میں گدھ اور کوے
یہ انساں کی بے نور آنکھوں کے ڈھیلے
بچوڑی کی ہڈیوں کے لئے جنگ یہ گیدڑوں کی
تعفن سے بھرپور بستی کی یہ گلیاں!

گزرتی شب

از:- حاذق الخیری، ضخامت ۲۲۴ صفحات (مجلد، رنگین و مصور گردپوش)
قیمت:- تین روپے، ملنے کا پتہ:- عصمت بک ڈپو، کراچی ۱

حاذق الخیری، اردو زبان کے مشہور ادیب مصورِ غم حضرت راشد الخیری کے پوتے اور جناب رازق الخیری مدیر "عصمت" کے فرزند ارجمند ہیں، انشا پردازی اور مضمون نگاری انہیں ورثہ میں ملی ہے! ان کے افسانوں کی یہ پہلی کتاب ہے جو منظرِ عام پر آئی ہے۔

اس کتاب میں جناب حاذق الخیری کے چودہ افسانے شامل ہیں، ان افسانوں کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ موصوف میں افسانہ نویسی کی فطری صلاحیت موجود ہے اور اس مشق کو جاری رکھیں تو افسانہ نویس کی حیثیت سے وہ شہرت اور قبولِ عام حاصل کریں گے!

ان کے افسانوں کی صورت یہ ہے کہ پلاٹ اور بیان کے لحاظ سے ان میں خاصی یکسانی نظر آتی ہے، ان میں "کردار نگاری" سے زیادہ "حکایت و بیان" (NARRATION) سے کام لیا گیا ہے، مناظر اور بعض کیفیات کی تفصیل بھی ضرورت سے زیادہ طوالت اختیار کر گئی ہے، افسانہ نگار جوان ادیب ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان کے جذبات کی گرمی رومان کے قالب میں ڈھل کر خاصی تیز اور شدید ہوگئی ہے! وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ جسموں کے چھونے، چومنے اور بھینچنے کا ذکر کرتے ہیں، اور

اور اس طرح اپنے پڑھنے والوں کو "لمس و تقبیل" کے چٹخاروں میں چھوڑ دیتے ہیں ـــــ اور

؎ ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو

"اس نے چندھیا چندھیا کر پوچھا" (صفحہ ۱۰) "چندھیانا" تو آنکھوں کی صفت ہے، افسانہ نگار "چندرانا" کی جگہ "چندھیانا" لکھ گئے ـــــ "یہ نازک جھنکار اُسے یاد آیا" (ص۱۷) "جھنکار" بالاتفاق مونث ہے ـــــ "سنہری کمر پر اس کی انگلیاں تیرنے لگیں" (صفحہ ۲۲) "انگلیوں کا تیرنا" نامانوس اندازِ بیان ہے ـــــ "وہ ہی جن کی ملائمت تم کو اتنی عزیز تھی (ص۲۹) "نرمی" لکھنا چاہیے تھا۔ "تمہارے ایک ایک عضو کو ترتیب میں لاؤں" (ص۳۲) یہ کیا اندازِ بیان ہے، "وہ اسے ٹھنڈی نظروں سے دیکھنے لگا" (ص۴۹) "گرم نظروں" کے مقابلہ میں افسانہ نگار نے "ٹھنڈی نظروں" کی ترکیب ایجاد کی ہے مگر یہ ایجاد دل کو نہیں لگی ـ

(ص۶۹)

"وہ خیالوں سے چونک کر بولا" (صفحہ ۵۱) اس طرح کون بولتا ہے؟ "اس کا ہاتھ بڑی اپنائیت سے تھام کر بولی" "اپنائیت" ہی اول تو محلِ نظر ہے، اور اس کو درست بھی مان لیا جائے تو جملے کی ساخت اس سے مختلف ہونی چاہیے ـ "۔۔۔ ممی کی طرح باسی نظر آتی ہے" (صفحہ ۷۳) "باسی" کھانے پینے کی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے! گڑیوں، ممیوں، کتابوں اور انسانوں سے "باسی" کی نسبت کسی طرح درست نہیں ـــ "نہ معلوم کس قسم کی بھینی بھینی اور نئی خوشبو، جو نعیمہ کے ملائم چہرے اور شفاف گردن سے اُمنڈ رہی تھی" (صفحہ ۹۹) "خوشبو" کے لئے "امنڈنا" کہنا "وجدان کو کس قدر گراں گزرتا ہے" "امنڈنے" سے خوشبو کی لطافت مجروح ہو جاتی ہے ـــ "کہیں اس نے قابوں میں سرخ پھول سجائے تھے اور کسی میں اس کی چٹیاں سامنے پڑی تھیں" (ص۱۰۱) "چٹیا" کی جمع "چٹیاں" غلط ہے! اور چوٹی کی جمع چوٹیاں ہے، پھر "کسی" سے اگر "پھول" مراد ہے تو ان میں "چٹیا کا پڑنا" ایک تو زبان و روزمرہ کے خلاف ہے، دوسرے یہ واقعہ اور منظر کی بھی صحیح ترجمانی نہیں ہے ـ

"وہ اس کے سینہ میں چھپ جاتی" (صفحہ ۱۴۲) "سینہ میں چھپ جانا" یہ کیا بات ہوئی؟ ـــ "اس کے دل میں کتنی گدگدی مچے گی" (صفحہ ۱۵۰) گدگدی، کپکپی، اور سنسنی کے ساتھ "مچنا" عام طور پر اردو میں مستعمل نہیں ہے! "بڑھتی ہوئی اونچان کی طرف" (صفحہ ۱۵۰) اونچان، نیچان، چوڑان اس قسم کے تمام الفاظ مذکر ہیں ـ

"بھوتوں کے گراں بار تصورات" (ص۱۲۵) کیا افسانہ نگار کے بھوت بھی تصور کیا کرتے ہیں ـــ "اور باہر خاصی سردی تھی اور مالی کے خراٹے آ رہے تھے" "مالی خراٹے لے رہا تھا، یا "مالی کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی" لکھنا تھا! "اخبارات اور رسالے تیز ہوا آنے کی وجہ سے پھڑپھڑا رہے ہیں" (ص۱۴۲) "پھڑپھڑانا" جاندار کی صفت ہے! "زندگی نے ہولے سے اپنی گردن بے بسی سی ڈال دی" (ص۱۸۵) کیسی غلط زبان ہے

افسانہ نگار نے انگریزی کے الفاظ مثلاً ڈائیو (DIVE) کین (CANE) سوفٹ ڈرنک (SOFT DRINK) مائیل سٹون (MILE STONE) فلرٹ (FLIRT) جگہ جگہ استعمال کئے ہیں! اور حیرت ہے کہ وہ "انہی" کو "ان ہی" "اسی" کی بجائے "اس ہی" اور "مجھی" کو "مجھ ہی" لکھتے ہیں ـ

جناب حاذق الخیری اپنے دادا مولانا راشد الخیری کے اندازِ تحریر کو اپنائیں اور بامقصد افسانے لکھیں، تو اُن کے قلم سے ملک و ملت، معاشرے اور زبان و ادب کو فائدہ پہونچے گا!

—x—

خوبی
پر نظر
کیجئے
قیمت پر نہیں
کے ٹو
اعلیٰ قدر و قیمت کا نشان ہے
کم خرچ بالا نشین کی
بہترین مثال
K-2
CIGARETTES
S
پریمیر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

جلد:- ۱۴

کراچی

فاران

شمارہ:- ۸

ایڈیٹر:- ماہر القادری

ماہِ نومبر ۱۹۶۲ء

ترتیب

چندہ سالانہ سات روپے

فی پرچہ باسٹھ پیسے

مقامِ اشاعت:- دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

فرانس میں اِن دنوں جو انتشار پایا جاتا ہے اُس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے بعض طبقے مسٹر ڈیگال (صدر) سے اس لئے بیزار اور خفا ہیں کہ اُنھوں نے الجزائر کا آزاد ہونا کس طرح گوارا کرلیا —— بھارت میں تعصب زدہ ہندوؤں کا بہت بڑا طبقہ مُسلم اقلیت کے درپئے آزار ہے اور وہاں کی حکومت سے اس لئے خفا ہے کہ اُن کے پروگرام کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں وہاں کی حکومت پُوری طرح اُن کا ساتھ کیوں نہیں دیتی —— پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر قسم کا کوئی انتشار اور اختلاف نہیں پایا جاتا۔ یہاں کے عوام اور حکومت دونوں فراخ دل اور وسیع النظر ہیں پاکستان میں ہندو اقلیت عزت و آبرو اور اطمینان و خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کررہی ہے اسلام کی اس رواداری پر ہم فخر کرتے ہیں —— تمام انسانی آبادی خُدا کا کُنبہ ہے (الخلق عیال اللہ) کسی امتیاز کے بغیر عام انسانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے احترام کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے

مصر کے "جمہوری ڈکٹیٹر" جمال ناصر کی حفاظت پر کروروں پونڈ صرف ہوتے ہیں جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اسلامی اخوت کے مقابلہ میں "عرب قومیت" کے اس موجد اور نقیب کی پالیسی اور جابرانہ آمریت نے خود اُس کے ضمیر کے اندر اپنے بارے میں بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کردی ہے —— اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ پاکستان کی فضا اس قسم کے وسوسوں اور اندیشوں سے محفوظ ہے اور پاکستان کے صدرِ محترم کی حکومت سے بعض اختلافات کے باوجود عوام کی زبان سے کتنے ہی اجتماعات میں "صدر ایوب زندہ باد" کے نعرے سُنے گئے ہیں۔

اس اعتراف کے بعد ہم پوری سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ نرم سے نرم الفاظ میں پاکستان کی صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ دل کا حال جانتا ہے کہ مقصود نہ کسی پر طنز ہے اور نہ کسی سے نزاع و تصادم کا جذبہ شریکِ قلم ہے!

یہ بات عالم آشکارا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے وجود میں آیا ہے اس ملک کو فوجوں نے تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کیا۔ یہ ایک خالص نظریاتی حکومت ہے! یہ ریاست اس لئے بنی ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کا دین قائم ہوگا!

متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے "مطالبۂ پاکستان" کو ہندو اپنے لئے سب سے بڑی گالی سمجھتا تھا۔ اور پاکستان کا نام سُن کر اُس کے مرچیں لگ جاتی تھیں، دونوں قوموں کے درمیان شدید ترین کشمکش اور انتہائی نفرت و عداوت کی فضا میں مُلک تقسیم ہوا۔ انگریز کم بخت نے بھی جاتے جاتے مُسلمانوں سے انتقام لیا، اور ایسے حالات پیدا کردیئے گئے کہ مُسلمانوں کو آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا جان مال، عزت، آبرو ان میں سے کون سی ایسی چیز ہے جس کی قربانی نہیں دی گئی، مسجدیں جلائی گئیں، خانقاہیں اور دینی مدرسے ویران و برباد کئے گئے۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری اور بے آبروئی ہوئی، قرآنی اوراق کی توہین کی گئی، غرض وہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اس تباہی کو المیۂ حزنیہ اور شرمناک کہہ دینے سے بھی ان ہولناک حادثات کی ٹھیک طرح ترجمانی نہیں ہوتی، یہ وہ شدتِ غم ہے جس کے اظہار سے لفظ و بیان اور زبان و قلم قاصر ہیں!

متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ تمنائیں اس توقع پر گوارا کیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام واحیا ان تمام زحمتوں جراحتوں اور چوٹوں کی تلافی کر دے گا، اور یہ خطۂ پاک ساری دنیا کے لئے ہدایت و سعادت کا مینارۂ نور اور شمعِ عالم افروز ثابت ہوگا

مگر

پاکستان بننے کے بعد محسوس ہوا کہ اوپر کا طبقہ یہاں اسلامی نظامِ حکومت کو برپا کرنے اور دینی و اخلاقی معاشرے کو وجود میں لانے کا اپنے اندر کوئی داعیہ نہیں رکھتا۔ یہاں شروع ہی سے کسی معروف کو قائم کرنے اور کسی منکر کو مٹانے کی سرے سے کوشش ہی نہیں کی گئی یہ حالت دیکھ کر عوام میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ پاکستان جس مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے، اُس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا جارہا ہے، خدا، رسول، اسلام اور قرآن کا نام لے لے کر متحدہ ہندوستان میں جو وعدے کئے گئے تھے، پاکستان بن جانے کے بعد وہ وعدے مرزا غالب کی زبان میں سچ مچ "نقش ونگارِ طاقِ نسیاں" بن کر رہ گئے!

ان حالات کو دیکھ کر اُس دور میں عوام کے قلوب میں جو تکدر اور ملال پیدا ہوا اس کا سبب اسلام اور پاکستان کی محبت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی! اس کے بعد "جمہوری سفارشات" منظرِ عام پر آئیں، تو عوام کے اس تکدر، ملال، بدگمانی اور حیرت میں اور اضافہ ہو گیا ان سفارشات میں اسلامی رنگ بہت ہی دھندلا اور پھیکا تھا، جیسے اسلامی حکومت کی بجائے نیشنل گورنمنٹ کے انداز کی حکومت بنانے کے لئے زمین ہموار کی جارہی ہو! عوام نے اس موقعہ پر احتجاج کیا، —— پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا "احتجاج" ہے جو عوام کی طرف سے کیا گیا، جمہوری فضا میں عوام کی رائے اور احتجاج بڑا وزن رکھتا ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ حکومت نے ان جمہوری سفارشات کو واپس لے لیا۔

ایک طرف دستور و آئین کے معاملے میں اربابِ اقتدار کی یہ روش دوسری طرف اوپر کے طبقہ کی بیگمات نے "عزار پارٹیوں" کا آغاز کیا، جن میں نامحرم مرد و زن ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف ہو کر ملتے جلتے تھے، پھر "مینا بازاروں" کی بدعت شروع ہوئی! ان حالات میں پاکستان کے کرسی نشینوں سے عوام کے دلوں میں جو جذبۂ بیزاری پیدا ہوا وہ فطرت، غیرت، شرافت اور پاکستان اور اسلام کی خیرخواہی کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ اربابِ اقتدار سے نہ پاکستانیوں کو دشمنی تھی، نہ وہ کسی کے بہکانے میں آگئے تھے، اس قسم کے بیزاری، بدگمانی اور بے اعتمادی کے جذبات کی نمود کی ذمہ دار خود اُس دور کے اہلِ حکومت کی روش تھی۔

پاکستانی عوام نے یہ بھی دیکھا کہ اربابِ حکومت اپنی پارٹی اور پوزیشن کو مستحکم کرنے اور کرسیٔ اقتدار پر جمے رہنے کے لئے بعض ناپسند افراد کو اپنا مشیر اور رفیق کار بنا لیتے ہیں، ان غرض کے بندوں اور موقعہ پرستوں نے حکومت میں دخیل ہو کر حالات کو اور زیادہ بدتر بنادیا۔ ان میں سے بعض نے خود اپنے محسنوں اور سرپرستوں ہی کی جڑیں کاٹنی شروع کیں خاص طور سے سندھ کی وزارت میں جو طوائف الملوکی کی کیفیت رہی ہے، وہ کرسی نشینوں کی ہوسِ حکومت اور جنگِ اقتدار کی روشن شہادت ہے!

پاکستان کے عوام کے سامنے اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ یہاں حکومت کس طرز کی قائم ہونی چاہئیے اور یہاں کے آئین و دستور کی اساس اور ماخذ کیا ہو؟ اس کے لئے عوام نے مطالبہ کیا، جد و جہد کی بلکہ احتجاج بھی کیا؟ دستور و آئین کے لئے عوام کی یہ جد و جہد پاکستان میں انتشار پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے تھی! وہ یہ سمجھتے تھے اور آج بھی یہی سمجھتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کے بغیر پاکستان کا عدم و وجود برابر ہے!

مگر

اربابِ حکومت نے خدا کے اُن نیک بندوں کو جو اسلامی دستور کی مہم ڈسپلن اور اخلاق کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھتے

ہوتے چلا رہے تھے، جیلوں میں ٹھونس دیا، اُن کے بارے میں عوام کو یہ تاثر دینے کی پوری کوشش فرمائی گئی جیسے یہ لوگ پاکستان کے دشمن ہیں اور "اسلامی دستور" کی آڑ میں انتشار پھیلا رہے ہیں، اور حکومت کی باگ ڈور کو ہتھیا لینے کے لئے ساری دوڑ دھوپ کر رہے ہیں!

یہ خرابیاں اسی حد پہ جا کر نہیں ٹھہر گئیں، مسلم لیگ کے ٹکڑے ہوئے جس کے نتیجہ میں عوامی لیگ، نیشنل عوامی گروپ، اور ری پبلکن پارٹی وجود میں آئیں، اور ارباب اقتدار سیاست کی اس بساط پہ حاضر اور غائب دونوں طرح کی شطرنج کھیلتے رہے کسی کو اُتارا، کسی کو بٹھایا، کوئی معتوب، کوئی محبوب! اُونچے طبقہ کے لوگوں نے کیسے کیسے پینترے بدلے ہیں، کیا کیا چالیں چلی ہیں، ایسی بازی گری اور شعبدہ بازی دنیا نے کم ہی دیکھی ہوگی اور شاید نہ بھی دیکھی ہو!

خدا خدا کرکے آئین و دستور کے مسائل تکمیل کو پہونچے، تو اُس دور کے حاکم اعلیٰ غلام محمد نے اسمبلی کو توڑ دیا، پھر دوبارہ دستور متشکل ہوا تو اسکندر مرزا نے اس بساط ہی کو اُلٹ دیا، اور مارشل لاء نے نزولِ اجلال فرما کر آئین و دستور پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ لوگ حیرت میں رہ گئے بلکہ سناٹے میں آ گئے، کہ یہ کیا ہوا؟

یہ پاکستان کے دس سالہ دور کا سرسری جائزہ ہے، اس زمانہ میں پاکستان میں جو افراتفری رہی ہے، اور جس عنوان سے حالات کو ذاتی اغراض کے لئے بگاڑا گیا ہے، اور جان بوجھ کر خرابیاں پیدا کی گئی ہیں، اُس کی ساری ذمہ داری اربابِ اقتدار کے سر عائد ہوتی ہے عوام جن میں اس مضمون کا لکھنے والا بھی شامل ہے اخلاق و کردار کی کمزوریوں اور خرابیوں سے مبرا نہیں ہیں مگر حکومت کی مشنری میں بگاڑ کے ذمہ دار، عوام نہیں، پاکستان کے اونچے طبقہ کے لوگ ہیں! ان میں سے جو بھی برسرِ اقتدار آیا، اُس نے اس کی کوشش کی کہ وہ منصب کی جس کرسی پہ ایک بار بیٹھ گیا ہے، مرتے دم تک اُس پر بیٹھا رہے، اس ہوسِ اقتدار کے ہاتھوں جمہوریت اسلام اور عام اخلاق کے اصولوں کی مٹی پلید ہوتی رہی!

پاکستان میں ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا رہا جس کی براہِ راست زد عوام کی جیب و شکم پر پڑتی رہی مگر عوام کی امن پسندی اور صبر و تحمل کا یہ عالم رہا ہے کہ انھوں نے ٹیکسوں کے اضافہ پہ احتجاج نہیں کیا، انہیں اس کا حق حاصل تھا کہ وہ کرسی نشینوں کی شاہ خرچیوں کے بارے میں باز پُرس کرتے، لیکن عوام نے اس معاملہ میں بھی درگزر سے کام لیا! غرض حکومت کے نظم و نسق اور اُس کے داخلی اور خارجی معاملات میں عوام کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ ان میں جو خرابیاں بھی پیدا ہوئی ہیں، اُس کے ذمہ دار صاحبانِ جاہ و منصب ہیں ــــ وہ جن کے ناموں کے ساتھ "فضیلت مآب" اور "عزت مآب" کے القاب لکھے جاتے تھے۔

عوام نے جس چیز کا مطالبہ کیا وہ "اسلامی حکومت" کے قیام کا مطالبہ تھا کہ اسی کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا مگر اربابِ اقتدار "اسلامی نظام" کے نام سے وحشت کرتے اور کانوں پہ ہاتھ دھرتے تھے اور یہ جاہ پسند اسلامی حکومت کو اپنے جاہ و اقتدار کی موت سمجھتے تھے، انہیں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اسلامی نظام پاکستان میں برپا اور قائم ہو گیا، تو ہماری کرسیاں چھن جائیں گی! اس لئے ان غلط کاروں نے اسلام کی راہ روکنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا، خواص و عوام کے نظریات کی یہی وہ کش مکش تھی جس نے پاکستان کے شیرازہ کو یکجا نہیں ہونے دیا! اور ملک کے طول و عرض میں انتشار اور بے اطمینانی کی حالت پیدا ہو گئی۔

پاکستان کے اربابِ اقتدار کو "اسلام" کے نام سے جو چڑ رہی ہے، اُس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ سکندر مرزا صاحب نے اقتدار کے بعد جو پہلا قدم اُٹھایا، وہ یہ تھا کہ "اسلامیہ جمہوریہ پاکستان" سے لفظ "اسلامیہ" خارج کر دیا گیا!

انقلاب کے بعد!

وہ جو فارسی کی مشہور ضرب المثل ہے:-

چاہ کن را چاہ درپیش

تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ سکندر مرزا نے جمہوریت کو دفن کرنے کے لئے جو گڑھا کھودا تھا اُس گڑھے سے خود اُن کو سابقہ پڑا۔ آٹھ دس دن ہی میں اُن کی ترکی تمام ہوگئی، اُنھوں نے اپنے دورِ حکومت میں جو کرتوت کئے تھے اُس کی سزا اُنہیں اس دُنیا میں ہاتھ کے ہاتھ مِل گئی، اب رہی آخرت کی سزا، سو وہ دُنیا کی سزا سے شدید تر ہی ہوگی! اس انقلاب کے بعد پاکستان میں تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

سکندر مرزا کی برطرفی اور حدودِ پاکستان سے اُس کا اخراج، ہمارے فوجی رہنماؤں کا قابلِ قدر کارنامہ ہے! ہم کسی کی نیت پر شک نہیں کرتے، اپنے مسلمان بھائیوں سے ہمیں حُسنِ ظن رکھنے ہی کی ہدایت کی گئی ہے۔ پاکستان کے انقلابی قائدین نے ملک کی خیر خواہی کے پیشِ نظر حکومت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لی، اور اُن کے برسرِ اقتدار آتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے حکومت کے نظم و نسق کی مشنری کل میں بجلی دوڑ گئی —— دفتروں کا عملہ ٹھیک وقت پر دفتروں میں پہونچنے لگا، کارکردگی کی رفتار بھی خاصی تیز ہوگئی، دفتر کے اہلکار یہ محسوس کرنے لگے کہ خویش پروری اور سفارشوں کا زمانہ لدگیا، اب کام کرنے والوں کی اہلیت، صلاحیت اور اُن کا کام ترقی کا معیار ہوگا۔

شہروں میں دن نکلنے سے پہلے سڑکیں اور گلیاں دُھلنے لگیں، جہاں کوڑے کرکٹ کے انبار لگے رہتے تھے وہاں صفائی کی چاندنی پھیلی ہوئی نظر آنے لگی، چیزوں میں ملاوٹ کرنے والوں پر دار و گیر ہوئی اور گراں فروشوں پر احتساب ہوا، چیزوں کے نرخ مقرر ہوئے اور دُکانوں پر نرخوں کی تختیاں لگائی گئیں، اسمگلروں کو جا بجا پکڑا گیا، اور اُن کا غیر ملکوں سے لایا ہوا منوں سونا سمندر سے برآمد کرکے سرکاری خزانہ میں داخل کیا گیا۔

عوام نے انقلابی حکومت کے کسی اقدام اور منصوبہ میں کوئی کھنڈت نہیں ڈالی، عوام کی یہ روش رہی —— سکوت و تماشہ یا پھر تعاون و اطاعت! عوام نے اس انقلاب کو اس اعتبار سے سراہا، کہ کسی خون و خرابے کے بغیر امن و سکون کے ساتھ اتنا بڑا انقلاب رُونما ہوا۔

انقلابی حکومت نے اُن جھونپڑی والوں کے لئے جو خانہ بدوش جیسی زندگی گزار رہے تھے ہزارہا کوارٹر بھی تعمیر کئے، سڑکیں بھی بنائیں، اُن پر سبزہ اور درخت بھی لگائے، زمینداری اور کاشتکاری کی دُنیا میں بھی انقلاب آیا، خانقاہوں اور مزاروں کی آمدنی کو بھی سرکار نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔

—— مگر ——

ان میں سے بعض اصلاحات اور ترقی پسندانہ اقدامات بہت دن تک اپنی حالت پر نہ رہ سکے، چیزیں پھر بھی گراں بکنے لگیں، ان میں ملاوٹ بھی ہونے لگی، صفائی ستھرائی کے معاملہ میں بھی ڈھیل پیدا ہوگئی اور مارشل لا کے زمانے میں رشوت کی کمیت میں تو ایک حد تک بے شک کمی ہوئی، مگر اس کی کیفیت میں اضافہ ہوگیا، رشوت کا نرخ بالا اور اُس کا معیار اُونچا ہوا، رشوت لینے والے یہ کہہ کر اور جتا کر رشوت لیتے تھے کہ ہم "مارشل لا" کا خطرہ مول لے رہے ہیں، رشوت کے عام نرخ کے علاوہ اس خطرے کا معاوضہ بھی تو ملنا چاہیے۔

انقلابی حکومت نے تجارت، زراعت، تعلیم، عائلی مسائل، ان سب میں اصلاح و انقلاب کے لئے قدم اُٹھایا مگر اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں فرمائی گئی کہ اب سے پہلے اربابِ حکومت اور عوام کے درمیان جو نظریاتی کشمکش پائی جاتی تھی اور جو کہ

سارے انتشار کی ذمہ دار تھی، اس کش مکش کو کس طرح ختم کیا جائے!

آبادیوں کی صفائی ستھرائی، دفتروں میں وقت کی پابندی اور اچھی کارکردگی، ریلوں اور ہوائی جہازوں کا ٹھیک طرح چلنا، ٹیکسوں کی بروقت وصولیابی، حکومت کے بجٹ کا توازن ----- یہ تمام باتیں تو دنیا کی ہر حکومت میں ہوا کرتی ہیں، متحدہ ہندوستان میں بھی یہی سب کچھ ہوتا، اور روس، امریکہ اور انگلستان کی حکومتوں میں یہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں! پاکستان، حکومت کے نظم ونسق کی صرف ان خوبیوں کے لئے وجود میں نہیں آیا تھا، یہ خوبیاں تو کافروں کی حکومتوں میں بھی پائی جاتی ہیں، پاکستان اس لئے بنا تھا کہ حکومت کی تمام متمدن جائز خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا! یہی وہ خواب ہے جو اہلِ سیاست کے دورِ حکومت میں شرمندۂ تعبیر ہوا، اور نہ اہلِ تیغ کے عہد فرمانروائی میں!

پاکستان کے معاشرے کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنے کی بجائے اس دور میں "آرٹ کونسل" قائم ہوئی اور اسکولوں اور کالجوں میں رقص وسرود کو رواج دیا گیا، والدین کی مرضی کے برخلاف اُن کی معصوم بچیوں کو اسٹیجوں پر نچوایا گیا، اور اس طرح "کلچرل ترقی" کے نام پر وہ وہ حرکتیں ہوئیں، جن سے اسلامی اخلاق پناہ مانگتا ہے، جہاں تک عورتوں کی بے حجابی، بے باکی، آزادی اور مرد وزن کے مغرب زدہ اختلاط کا تعلق ہے، ان چند سالوں میں جو کچھ ہوا، وہ اس دورِ انقلاب سے پہلے دس سالوں میں بھی نہیں ہوا تھا۔ یہی صورتِ حال "شراب نوشی" کے سلسلہ میں پیش آئی، اُس پر پابندی لگنا تو درکنار، اس "رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" کے ٹیکس میں کمی کی گئی، جس نے شراب نوش مردوں کے دوش بدوش شراب نوش عورتوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا! جس معاشرے میں شراب، زنا اور قمار پر کوئی پابندی نہ ہو اور رقص وسرود کی جہاں حوصلہ افزائی کی جارہی ہو اور مرد وزن کے بے باکانہ اختلاط کی جس ملک میں ارزانی ہو ----- وہاں کے عوام ان باتوں پر حکومت سے اگر احتجاج کرتے ہیں، تو کیا اس احتجاج کو "انتشار" کا نام دیا جاسکتا ہے؟ صورتِ حال اگر اس کے برخلاف ہوتی کہ حکومت شراب، زنا اور قمار پر پابندی لگاتی، اور عوام اس پابندی کے خلاف احتجاج کرتے تو اس نامعقول احتجاج پر انتشار کا صحیح اطلاق ہوسکتا تھا۔ اور اُس وقت حکومت کو اس کا حق حاصل تھا کہ وہ ایسے انتشار پسندوں کو ڈنڈے کے زور سے ٹھیک کرتی اور ان شراب خواروں، زناکاروں اور قمار بازوں پر شرعی حدود جاری کی جاتیں ----- مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، نیکی اور اسلامی اخلاق کے اُصولوں پر معاشرے کو اُستوار کرنے کا مطالبہ عوام کر رہے ہیں ----- اور وہ چاہتے ہیں کہ جن کاموں کو اللہ اور رسولؐ نے "مُنکرات" (E V I L S) ٹھیرایا ہے، اُن پر قانونی پابندیاں عائد کی جائیں اور ان کے ارتکاب کرنے والوں کو سزائیں دی جائیں۔

"اصلاح وانقلاب" کے لفظ بہت خوشنما ہیں، مگر اُن کا عمل میں آنا بڑی حکمت، فراست، دُور اندیشی اور حالات کی نباضی چاہتا ہے! پاکستان کا موجودہ تعلیمی نظام انگریزی دور کے فرسودہ اور "کلرک ساز دور" کی یادگار ہے، اس کو یقیناً بدلنا چاہیے اور پاکستان جس نظریہ کی بنا پر وجود میں آیا ہے، اس نظریہ کے مطابق تبدیلی ہونی چاہیے، مگر انقلابی حکومت کے دور میں یہاں کے تعلیمی نظام کی جس انداز میں مرمت اور اوور ہالنگ ہوئی ہے، اُس کے نتائج خود حکومت کے سامنے ہیں، ملک کے تمام دانشور چیخ رہے ہیں کہ اس انقلابی اقدام نے تعلیمی مسائل کو پیچیدہ اور دشوار بنادیا ہے! یہاں تک کہ طلباء کے احتجاج سے مجبور ہو کر جزوی ترمیم تو خود حکومت نے قبول کرلی ہے۔

؎ چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

حکومتوں کو بے شک اصلاح وانقلاب کے اقدامات کرنے کا حق حاصل ہے، مگر عقلمند حکومتیں عوام کے مزاج، اُن کی پسندیدگی اور

بڑھ کر یہ کہ ملک و ملت کے نظریوں کا لحاظ رکھ کر منصوبے بناتی اور اسکیمیں تیار کرتی ہیں! جس حکومت نے طاقت و اقتدار کے زعم میں ان نزاکتوں کو نظر انداز کردیا، اُس کی بنائی ہوئی اسکیموں اور منصوبوں کا حشر بُرا ہی ہوتا ہے۔ اصلاح و انقلاب کے قدم ایسے اُٹھنے چاہئیں کہ عوام کی زبانوں سے بے ساختہ مرحبا، جزاک اللہ، لبیک اور سمعنا و اطعنا کے نعرے بلند ہوں' یہ پالیسی اپنے مزاج کے لحاظ سے بڑی خطرناک اور مُضر ہے کہ جب تک عوام کی طرف سے احتجاج نہ ہو' اُس وقت تک تو کوئی مطالبہ پورا کیا جائے اور نہ کسی غلط قدم کو واپس لیا جائے! کسی کمیشن یا کمیٹی کا تقرر ہو، کسی قانون میں تنسیخ، ترمیم یا اضافہ مطلوب ہو' کوئی تعمیری منصوبہ اور اسکیم ہو، حکومت کا قدم ایسا اُٹھنا چاہیئے جس سے احتجاج کی بجائے، عوام کے اطمینان و اعتماد میں اضافہ ہو اور عوام کا تعاون و تائید حکومت کو حاصل ہو، عوام کا تعاون ہی وہ قوت ہے' جس سے کسی حکومت کو واقعی استحکام میسّر آتا ہے' اور اُنہی حکومتوں کا بین الاقوامی دُنیا میں وزن محسوس کیا جاتا ہے، جن کی پُشت پر عوام کی تائید و تعاون کی قوت ہوتی ہے!

یہ کیا؟؟

جس طرح تعلیمی کمیشن کے "کارنامہ" (؟) کو عوام نے پسند نہیں کیا، یہی حال عائلی کمیشن کی کارگزاری کا ہے' کہ اُس کی سفارشات کی بنیاد پر جو قوانین بنے ہیں' اُن کو علماءِ دین کی غالب اکثریت نے رد کردیا ہے' اور کتاب و سُنت کے دلائل کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ فلاں قانون اور فلاں دفعہ میں دینی اعتبار سے یہ سُقم اور یہ کوتاہی پائی جاتی ہے۔ کُھلی ہوئی بات ہے کہ دینی مسائل میں پاکستان کے عوام عُلماء کی رہنمائی، ہدایت اور رائے پر اعتماد رکھتے ہیں، اس لئے یہ کہنا صورتِ حال کی صحیح ترجمانی ہے کہ عائلی قوانین کی تنسیخ کے مُطالبہ میں علماء کو پاکستان کے عوام کی تائید بھی حاصل ہے!

اگر یہ "احتجاج" اربابِ حکومت پر گراں گزرتا ہے' تو اس گرانی اور تکدّر کے وہ خود ذمہ دار ہیں' وہ ایسا قدم ہی کیوں اُٹھاتے ہیں جو عوام کو احتجاج پر مجبور کرتا ہے ——— اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا کہ اُردو رسم الخط کو رومن رسم الخط سے بدل دینے کی بلا ٹل گئی ورنہ اس معاملے میں کچھ اور ہی ارادے تھے! اُردو زبان کی قسمت اچھی تھی کہ اُس غریب کی جان بچ گئی! آخر یہ سوچنے کا انداز کیا ہے کہ جس کے نتیجہ میں احتجاج اور نزاع و اختلاف کی صُورتیں پیدا ہوں اور لوگ بیٹھے بٹھائے ذہنی کش مکش میں مُبتلا ہو جائیں!

سیاسیات کی بدعنوانیوں کے خارزار سے قوم کو بچانے کے لئے بنیادی جمہوریت کا جو نسخۂ کیمیا تجویز فرمایا گیا تھا ——— اسمبلیوں کے الیکشن میں اس کے اثرات و نتائج بھی عوام و خواص سب نے دیکھ لئے! ووٹ فروشی بلکہ یُوں کہیئے ضمیر فروشی کے ایسے گھناؤنے مناظر چشمِ فلک نے کم ہی دیکھے ہوں گے۔

انتخابات کے بعد مرکزی اسمبلی کی صدارت کے سلسلہ میں عالمِ بالا میں جو دوڑ دھوپ ہوئی، وہ اب راز نہیں رہی' اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مشرقی پاکستان کے ارکان کے اتفاق و اتحاد نے مغربی پاکستان کے بعض اُن ارکان تک کو اکثریت کا ساتھ دینے پر مجبور کردیا جو ہر معاملہ میں قصرِ و ایوان کے ایما اور اشارہ پر نظر رکھتے ہیں۔

عدلیہ کی تاریخ میں شاید یہ پہلا واقعہ ظہور میں آیا ہے کہ چیف جسٹس کے تقرر کی سُن گُن پاکر پاکستان کی متعدد بار ایسوسی ایشنوں نے پُر زور احتجاج کیا! ان واقعات نے باہر کی دُنیا کی نظروں میں ہمیں کیا بنا دیا ہے؟

مُسلم لیگ کے معاملات میں اربابِ حکومت کا جو رول رہا ہے' وہ بچکانہ قسم کی سیاست کا کتنا بھونڈا نمونہ ہے' اور اس کے بعد سے اخباروں میں آئے دن حکومت کے وزیروں اور سیاسی لیڈروں کے درمیان مُسلسل بیان بازی ہوتی رہتی ہے اور ایک دوسرے کو غلط اور انتشار پسند ٹھیرا رہا ہے۔

آج بھی قصر و ایوان میں اُن مرغانِ باد نُما کو بار حاصل ہے' اور اُن پر اعتماد کیا جا رہا ہے' جو غلام محمد اور سکندر مرزا کے

[illegible] کی صف میں شامل تھے" اور جن کا مسلک ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرنا ہے! ایسے موقعہ پرستوں اور غرض کے بندوں کی اشاعت گنا ہی اور شیرازہ بندی ریت کی دیوار سے بھی زیادہ بودی اور کمزور ثابت ہوتی ہے اس مزاج، ذہنیت اور کردار کے لوگوں کو مند [illegible] سے قصر نشین بدنام ہوتے ہیں!

اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل نے سکندر مرزا کے مقرر کئے ہوئے عائلی کمیشن کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اس کونسل اور اس کمیشن کی تشکیل میں یہ قدر مشترک واضح طور پر نظر آتی ہے کہ ایسے افراد کی اکثریت اُن میں شامل کر دی جائے، جو "اسلام" کا کوئی علم نہ رکھتے ہوں، اور جن کے مزاج و فکر میں مغربی افکار رچے ہوئے ہوں ——— نتیجہ؟ وہی کش مکش، بے اعتمادی، احتجاج! اور یہی پشیمانی جس کا تعلیمی اصلاحات کے معاملہ میں حکومت کو سابقہ پڑ رہا ہے۔

دوسری طرف مُلک کے ڈسپلن اور انتظامی مسائل میں بے دانشی اور فراست و تدبر کی کمی کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ اپنے ذاتی کردار کے سبب پبلک میں کوئی خاص وقار نہیں رکھتے تھے، اُن کو جیل میں بند کر کے قوم کے ہیرو بننے کا موقعہ فراہم کر دیا، اور جو ہنگامی تحریکیں تھوڑی سی فراست اور سمجھ بوجھ سے ہموار ہو سکتی تھیں، اُن کو اس انداز میں دبانے کی کوشش کی گئی کہ وہ دبنے کی بجائے حکومت کے لئے مستقل دردِ سر بن گئیں۔

رہی باہر کی دُنیا اور بین الاقوامی روابط، وہاں پاکستان کا اول تو تعارف ہی برائے نام ہے، بعض ملکوں میں اب تک پاکستان کو ہندوستان کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے! اور جن ملکوں میں پاکستان کو لوگ جانتے ہیں تو بُرے تعارف کے ساتھ جانتے ہیں! اس خرابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ غیر ملکوں میں سفارت خانوں کے ذریعہ باوقار روابط قائم ہوتے ہیں، اور اچھے تعارف کے مواقع میسر آتے ہیں، سو اُس کا یہ حال ہے کہ پاکستان کے اکثر و بیشتر سفارت خانے "شراب خانے" بنے ہوئے ہیں وہاں رنگ رلیاں اور عیش سامانیاں ہیں، فرض کا احساس ہے بھی تو وہ خانہ پُری کے لئے ہے! دوسری طرف ہندوستان کے سفارت خانے ہیں، جن میں شراب نوشی ممنوع ہے، اُن کا ایک ایک فرد فرض شناس ہے، ہندوستان کے سفارت خانوں نے غیر ملکوں میں ہندوستان کی ساکھ اور وقار کو قائم اور بلند کر دیا ہے۔ مگر ہمارے سفارت خانے پاکستان کے بُرے تعارف کا سبب بن رہے ہیں!

انگلستان میں پاکستانیوں کے ساتھ جو ذلت آمیز سلوک کیا جا رہا ہے، اُس کی ذمہ داری سے وہاں کا سفارتی نظام کیا بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہمارے محترم صدر وہاں تشریف لے جاتے ہیں، تو لندن کے اخبار اس دورے کی کوئی اہمیت ہی محسوس نہیں کرتے! اس دورے کی کوئی خبر چھپتی بھی ہے تو وہ غیر نمایاں انداز میں!

ہماری خارجہ پالیسی کا یہ عالم ہے کہ ہم دوسرے ملکوں کے جن "بڑے آدمیوں" کو اپنے یہاں بُلاتے ہیں اور اُن کی تواضع و ضیافت پر لاکھوں روپیہ صرف کرتے ہیں وہ کشمیر کے مسئلہ میں ایک حرف اپنی زبان سے نہیں کہتے! حد یہ ہے کہ غیر مُلکوں کے مُسلم صدر اور وزیر اعظم تک کو دعوت دیتے وقت اس کے لئے تیار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کشمیر کے مسئلہ کی حمایت نہ کریں، تو کم سے کم عام سیاسی انداز میں اس طرح کی کوئی بات فرما سکتے ہیں:—

"کشمیر کے مسئلہ کو پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو مل کر طے کرنا چاہیئے، تاکہ دو ہمسایہ ملکوں کے تعلقات خوشگوار رہ سکیں"۔

اس کے بر خلاف یہ ہمارے مہمان مُسلم اکابر، پاکستان میں نزولِ اجلال سے پہلے اس کا اعلان فرما دیتے ہیں کہ کشمیر کے مسئلہ میں پاکستان

کہ کسی ذمہ دار شخص سے ہم کسی قسم کی کوئی گفتگو ہی نہیں کریں گے ـــــــ اس قسم کے اعلانات سے کشمیر کے مسئلہ میں ہندوستان کے موقف کو فائدہ اور پاکستان کے موقف کو نقصان پہونچتا ہے۔

حرفِ آخر

یہ وہ افسوسناک اور پریشان کن حالات ہیں جن سے پاکستان دوچار ہے۔ ان حالات کو چھپانا، اُن کی لیپا پوتی کرنا اور دل کو خوش کرنے اور فریب دینے کے لئے اس انتشار و پراگندگی کی کوئی تاویل گھڑ لینا ملک و ملت کے حق میں سب سے بڑی دشمنی ہے۔

ہم نے جو باتیں اُوپر عرض کی ہیں وہ اس ذمہ داری کے احساس کے تحت عرض کی ہیں کہ اپنی کہی ہوئی باتوں کا اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دینا ہے! ہم نے کسی واقعہ کو مبالغہ کے ساتھ بھی بیان نہیں کیا، ہم نے قریب قریب اُنہی باتوں کو دُہرایا ہے جو ملک کے مختلف اخباروں میں وقتاً فوقتاً آتی رہی ہیں، اگر ہمارے قلم سے کوئی خلافِ واقعہ بات نکل گئی ہے، اُس پر ہمیں دلائل کے ساتھ متنبہ فرمایا جائے، تو اپنی غلطی کے اعتراف میں ہم کسی جھجک اور اینچ پیچ سے ہرگز کام نہیں لیں گے ـــــــ اربابِ اقتدار اپنے ہی بھائی بند ہیں، کوئی غیر نہیں ہیں، اُن کی عزت ہماری عزت ہے۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے اپنے ان کرسی نشین بھائیوں کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ہی کہا ہے۔ مقصود کسی کو بدنام اور مطعون کرنا نہیں، بلکہ اصلاحِ حال ہے!

اپنا فائدہ دُنیا میں کون نہیں چاہتا، ہم بھی چاہیں تو قلم و زبان میں لچک پیدا کر کے، حکومت سے بہت سے فائدے حاصل کر سکتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اُس دن کے لئے ہمیں اس دُنیا سے اٹھا لے، جس دن ہم اسلام اور پاکستان کے مقابلہ میں اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیں، اور خوشامد اور نیاز مندی کی اُس روش سے کام لیں، جس نے فرمانرواؤں کو اپنی غلط کاریوں پر دلیر اور مغرور بنا دیا ہے۔

ہم ان واقعات سے بے خبر نہیں ہیں کہ بلوچستان اور سرحد میں پاکستان دُشمن عناصر کیا کارستانیاں کر رہے ہیں اور مشرقی پاکستان میں کمیونسٹوں کی سرگرمیاں کس رُخ پر ہیں؟ ہم اُن لیڈروں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، جنھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلام کے لئے کچھ نہیں کیا، جن کے کردار انتہائی داغدار ہیں ـــــــ مگر آج وہ "جمہوریت" کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ـــــــ ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ بعض جائز مطالبوں کے لئے جو ہنگامی تحریکیں اٹھتی ہیں جلوس نکلتے اور ہڑتالیں ہوتی ہیں، اُن میں بعض انتشار پسند لوگ کس چالاکی کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں، اور ان حالات میں حکومت کی مشکلات کس قدر نازک ہو جاتی ہیں، اور بعض اوقات انتشار پسندوں اور اصلاح پسندوں میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے ـــــــ تصویر کے یہ تمام رُخ ہمارے سامنے ہیں۔

مگر

ان تمام دشواریوں، مشکلوں اور انتشار و پراگندگی کے باوجود عزیمت، جرأت، اخلاص اور خدا خوفی سے کام لیا جائے تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں!

پہلی چیز تو یہ ہے کہ جس کسی کے دل میں اقتدار کی ہوس جتنی زیادہ ہے اتنی ہی زیادہ مشکلات اُس کی اس ہوس کے سبب پیدا ہو رہی ہیں، یہ ہوس باقی نہ رہے تو نہ کسی کرسی کے ارد گرد خوشامدی لوگ جمع ہو سکتے ہیں۔ نہ کسی معاملہ کو اپنے ذاتی پرسٹیج کے نقطہ نگاہ سے دیکھا اور سوچا جا سکتا ہے، نہ دستور و آئین میں اختیارات کی کمی بیشی پر کوئی جھگڑا اُٹھ سکتا ہے! یہ سوچ کر اور سمجھ کر ملک و ملت کی خدمت کی جائے کہ کرسی چاہے کسی وقت چھن جائے، مگر ادائے فرض میں کسی قسم کی کمزوری اور غفلت پیدا نہ ہونے پائے۔

[illegible] سب سے زیادہ اہم ہے اور نہ صرف اہم بلکہ جس پر پاکستان کے وجود کا انحصار ہے، وہ یہ ہے کہ بلا کم و کاست پوری، آنحضرت [illegible] کمی بیشی، تاویل و نکتہ تراشی کے بغیر "اسلام" کو قائم کیا جائے، اُس "ماڈرن اسلام" کو نہیں، جسے [illegible] کے مغرب زدہ ذہن نے تراشا تھا، ہم اُس "اسلام" کا نام لے رہے ہیں جسے خلفائے راشدین نے اپنی انفرادی زندگی میں، معاشرے میں اور حکومت میں برتا تھا، اور اسی "اسلام" کی بدولت مسلمان تمام دُنیا پر غالب تھے، اور اُن کا وجود انسانیت کے لئے باعث رحمت تھا! اسلام ہی نے ہمیں پہلے معزز، سربلند اور غالب بنایا تھا، اور اب بھی اسلام ہی کے ذریعہ ہمیں عزت ملے گی!

ماہر القادری

۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء

"فاران"

کا

عظیم الشان "توحید نمبر"

تیسری بار شائع ہو رہا ہے

اس کے پڑھنے سے "توحیدِ خالص" کے تقاضے اُبھر کر دل و نگاہ کو روشن کرتے ہیں

اور

شرک و بدعت کے مفاسد بے نقاب ہوتے ہیں!

ماہر القادری

اقامتِ دین کے داعیٔ کبیر کے ساتھ

قدرت کی طرف سے انسان کا اس طرح بھی امتحان لیا جاتا ہے کہ جب اسے زیادہ سے زیادہ فرصت کے اوقات کی ضرورت ہوتی ہے، اس زمانے میں اوید اکثر کاموں کا ہجوم ہوتا ہے! یہ کام اور مشغولیتیں اتنی اہم ہوتی ہیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہوتا ہے کہ کس کام کو پہلے نیبٹایا جائے، اور کسے بعد میں! گزشتہ اگست کے آخری دنوں میں دعوتوں، پارٹیوں اور سیرت النبی کے جلسوں کا وہ ہجوم رہا کہ ایک ایک لمحہ شدید مصروفیت میں گزرا۔ "فاران" کی ترتیب و تکمیل اس پر مستزاد! ایک آدمی کہاں کہاں جائے اور کیا کیا کرے! مگر یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے رزق کی طرح میرے لئے وقت میں بھی وسعت عطا فرما دی ہے۔ ۲۰ اگست کی شام تک ستمبر میں شائع ہونے والے شمارے کی کاپیوں کی تصحیح کرتا رہا۔ پھر اسی دن مغرب سے قبل اور عشاء سے پہلے دو جلسوں میں جانا تھا۔ شب میں دس بجے کے بعد گھر واپس آیا، اور اس عالم میں بستر پر لیٹا کہ صبح سویرے تین بجے اٹھنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ٹھیک وقت پر طبعی ضروریات سے فارغ ہو کر پاکستان کی بین الاقوامی ہوائی سروس (P. I. A) کے دفتر پہنچا، وہاں دن کی سی چہل پہل کہاں ہو سکتی تھی، دو چپراسی، ایک کلرک اور ایک دو مسافر اتنی بڑی عمارت میں تنہا تنہا نظر آتے تھے! پندرہ بیس منٹ کے بعد مسافروں کی آمد شروع ہوئی، کمپنی کے عملہ کے لوگوں میں اضافہ ہونے لگا، میں نے فجر کی نماز جھٹ پٹے کے وقت ادا کی، ہم دو جا کے عالم اور کلی کا ایرپورٹ جانے والی بس ایک آدھ منٹ میں روانہ ہوا چاہتی تھی!

آرام دہ بس، جگہ کی فراغت، صبح کا سہانا وقت، ایرپورٹ تک کا یہ آدھ گھنٹہ کا سفر، لطف کے ساتھ بسر ہوا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شجر و حجر، در و دیوار، خنک ہوائیں ابر پارے غرض پوری فضا اور تمام ماحول اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں زمزمہ سنج ہیں!

ایرپورٹ پر جناب شجاعت علی صدیقی ملے، وہ رات ہی کو اپنے بنگلے سے ایرپورٹ آ گئے تھے، اور شب بھر بیداری، انہوں نے کراچی کے ایک کروڑ پتی تاجر سے میرا تعارف کرایا، جس کا مجھے نام یاد نہیں رہا۔ سات بجے کے قریب ہوائی جہاز روانہ ہوا، زمین سے اوپر اٹھتے ہی ایک آن میں نہ جانے کتنے ہزار فٹ بلند ہو گیا، یہاں تک کہ بادل تو اس سے بہت نیچے رہ گئے!

ہوائی جہاز کا سب سے بڑا فتنہ میزبان خاتون (AIR-HOSTESS) کا وجود ہے جسے مسافروں کی خاطر و مدارات اور تواضع (ENTERTAINMENT) کے لئے رکھا جاتا ہے، اس تواضع کے سلسلہ میں جن مشاغل سے دو چار ہونا پڑتا ہے، سب سے زیادہ دکھ یہ دیکھ کر ہوا کہ پاکستان کی یہ مسلمان میزبان عورتیں ساقی گری کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں، یہ کیسا ... مغرب کی تقلید نے ہماری زندگی کے کسی شعبہ کو بھی پاک صاف نہیں رہنے دیا!

مجھ کا ... ہوائی جہاز میں کیا، اب ہم زمین سے کئی میل اونچے ہوا میں اڑ رہے ہیں، مگر صرف اجسام بلندی ... ... سے کسی ... ... اتنی بلند نہیں ہوئی ... کہ ...

خدا ... ... بڑا ...

ہوائی جہاز کا سفر بڑے خطرے کا سفر ہے، اُترتے چڑھتے، بادلوں سے گزرتے، ذرا سی اُونچ نیچ ہوجائے، تو زندگی کے تماشے کے ڈراپ سین ہونے میں کیا دیر لگتی ہے، سائنس کو شاید اپنی ترقی پر ناز ہو کہ اُس نے ہواؤں کو قابو میں کر رکھا ہے اور اب ہوائی جہازوں کے حادثے ریل گاڑیوں کے حادثوں سے بھی کم ہوتے ہیں، لیکن سائنس کی یہ بھول ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جس نے انسانوں کے لئے آفتاب و مہتاب، بروج و کواکب، ہوا اور پانی کو مسخر کردیا ہے، مادہ پرست دماغ اس حقیقت کو بھولا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتوں، بندروں، شیر، چیتوں اور دوسرے درندوں اور چوپایوں کو روک رکھا ہے، اور آدمیوں کا رعب ان کے دلوں میں بٹھا دیا ہے، ورنہ ان کو اگر کہیں چھوٹ دے دی جائے اور ڈھیل مل جائے، تو یہ جانور ہی پوری انسانی آبادی کا تیاپانچہ کرکے رکھ دیں! قرآن شہادت دیتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو چڑیوں کی چونچوں سے گری ہوئی کنکریوں نے ہاتھیوں اور ہاتھی والوں کو کھائے ہوئے بھُس اور روندی ہوئی فصل کی طرح ہلاک و برباد کرکے رکھدیا، یہ شانِ قہر و جلال تھی، شانِ مہر و جمال کی ایک جھلک نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ میں نظر آتی ہے، جسے حضرت ابراہیم خلیلؑ پر گلزار بنا دیا، اور اللہ کے برگزیدہ بندے کے جسم کے ایک رونگٹے کو بھی صدمہ نہیں پہونچنے دیا۔ (جل جلالہٗ وعم نوالہٗ، ہو یفعل مایشاء)

پھر جہاز کی دیوار پر سُرخ حروف اُبھر آئے، مسافروں کو ہدایت کی گئی کہ سگرٹ نہ پئیں اور اپنی اپنی پیٹیاں باندھ لیں ہوائی جہاز نیچا ہونا شروع ہوگیا، راولپنڈی کی آبادی نظر آنے لگی، اُوپر سے ایسا لگتا ہے جیسے ہم زمین پر "بالشتیے" آباد ہیں بڑے بڑے دریا تو پانی کی لکیر کی مانند دکھائی دیتے ہیں!

چک لالہ ہوائی اڈہ پر جہاز ٹھیک وقت پر اُترا اور بڑے رسان کے ساتھ اُترا، نہ کوئی جھٹکا لگا، نہ جہاز کو جنبش ہوئی اور نہ پہیوں میں اُچھال پیدا ہوا۔ پائلٹ کی تجربہ کاری، مشاقی اور چابکدستی ہوائی جہاز کے اُترنے کے وقت ہی ظاہر ہوتی ہے۔

چک لالہ ایرپورٹ پر حکومتِ پاکستان کی کار پہلے سے موجود تھی، وہ ہمیں راولپنڈی کے سب سے بڑے ہوٹل فلیش مین لے کر پہونچی، وہاں ہمارے قیام کے لئے کمرہ ریزرو تھا، ہوٹل میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد روزنامہ "جنگ" کے دفتر پہونچا، وہاں مشہور ظرافت نگار و صحافی شوکت تھانوی سے ملا، وہ باتیں کیا کرتے ہیں پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں، میرے اور اُن کے درمیان خاصی بے تکلفی ہے، چند ساعتیں اُن کے ساتھ ہنسی خوشی میں گزریں! "کوہستان" کے دفتر بھی جانا ضروری تھا، وہاں ابو صالح اصلاحی صاحب سے تو ملاقات ہوگئی مگر جناب نسیم حجازی اور مظہر الدین صابری سے ملنے کی حسرت ہی رہ گئی! دفتر "کوہستان" سے تانگہ میں سوار ہوا، اور تانگہ نے سید صدیق الحسن گیلانی امیر جماعت حلقہ راولپنڈی کے مطب کے قریب اُتار دیا، اُن سے مصافحہ کے بعد معانقہ ہوا، جماعت کے بعض دوسرے وابستگان و متعلقین بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، گیلانی صاحب میں عزیمت کے ساتھ شانِ جلال بھی پائی جاتی ہے، یہ کہ حق کسی سے دب کر نہیں رہ سکتا! یہاں آنے کی غرض ملاقات کے علاوہ مولانا مودودی کے آنے کا وقت اور پروگرام معلوم کرنا تھا!

شام کا وقت ہے، گرمی بھی ہے، حبس بھی ہے، مگر مولانا مودودی کے استقبال کے لئے لوگ کس شوق و محبت کے تھا اسٹیشن کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں، یہ لو ریلوے کے ملازم نے گھنٹی بجادی، ٹن ٹن کی یہ آواز ریل گاڑی کی آمد آمد کا اعلان ہے کہ بس اب کچھ دیر میں ٹرین آیا ہی چاہتی ہے، استقبال کرنے والے بڑے قرینے کے ساتھ قطاروں میں کھڑے ہوگئے، راولپنڈی اسٹیشن پر ٹرینیں تو روزانہ آیا ہی کرتی ہیں، مگر یہ ٹرین دُنیائے اسلام کے اُس عظیم مفکر کو لے کر آرہی ہے، جس کے دینی افکار کی عظمت کو عرب و عجم تسلیم کرچکے ہیں، حق کے خلاف جو فکری اور علمی محاذ بھی آج کی دُنیا میں قائم ہے، وہاں مولانا مودودی تشریف لاسکے؟

نظر آنے لگے ۔۔۔۔ یہاں تک کہ :۔

مردِ حق کو ظل کے تیور کہیں ہوتے ہیں ملول
موت کا حکم سنانے بھی کیا ہوتا ہے !

تشریف آوری، سید ابوالاعلیٰ مودودی، قیم جماعتِ اسلامی خلیل محمد صاحب کی معیت میں ریل گاڑی سے اُترے اور اسٹیشن کی فضا "اللہ اکبر ۔۔۔۔ اسلامی حکومت کا داعی زندہ باد" "مفکرِ اسلام زندہ باد" کے پُرجوش نعروں سے گونج اُٹھی، بعض عقیدتمندوں نے انہیں پھولوں کے ہار بھی پہنائے! اسٹیشن سے باہر احاطہ میں جب مولانا موصوف کار میں بیٹھنے لگے، تو اخباروں کے نمائندوں نے انہیں گھیر لیا، کوئی آدھ گھنٹہ تک سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری رہا، صحافتی دُنیا کے ان کراماکاتبین سے کسی لیڈر کو مفر نہیں!

آج اگست کی ۲۷ تاریخ ہے صبح نو بجے "I do not agree club" کے پہلے اجلاس کی صدارت مولانا موصوف نے فرمائی، اور ڈیڑھ گھنٹہ تک ۔۔۔ "اسلام کی اب کیا حالت ہے" ۔۔۔۔ کے دیئے ہوئے موضوع پر سیر حاصل تقریر کی، تقریر کے بعد اُن سے بہت سے سوالات کئے گئے، ایک صاحب اپنی کرسی سے قدرے اُچھل کر اُٹھے اور مولانا مودودی سے دریافت کیا کہ آپ تقسیم ہند سے قبل پاکستان کے مخالف کیوں تھے؟ مولانا نے فرمایا کہ میں نے پاکستان کی مخالفت کبھی نہیں کی، بلکہ میں نے تو ہندوستان میں مسلمانوں کے جداگانہ مستقل قوم ہونے پر مضامین لکھے ہیں جن کو "دو قومی نظریہ" والے اپنی تائید میں پیش کیا کرتے تھے، ہاں! میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ جو لیڈر پاکستان کا مطالبہ کر اُٹھے ہیں، وہ پاکستان میں اسلامی حکومت کی جگہ نیشنل گورنمنٹ قائم کریں گے، مولانا کے اس جواب پر کسی نے کوئی استفسار اور اعتراض نہیں کیا۔ مولانا کی تقریر کا خلاصہ اور لب لباب میں نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

اس "کلب" کے مذاکرہ کے تین اجلاس ہوئے، اس میں مسلمانوں کے نمائندوں کے علاوہ عیسائی اور ہندو نمائندے بھی شریک تھے، نمائندگی کے تنوع کا یہ عالم کہ مشرقی پاکستان کی بدھوں کی جماعت کے صدر بھی تشریف فرما تھے جنہوں نے ایک مقالہ پڑھ کر سُنایا؛ لاہور کی قادیانی جماعت کے نمائندے کو بھی بلوایا گیا، یہاں تک کہ منکرینِ سنت کے لیڈر مسٹر غلام احمد پرویز نے "قرآن میں عورت کے مقام" کے عنوان پر تقریر کی، اور اپنے نظریات کے مطابق حسبِ عادت آیاتِ قرآنی کے معنی میں تحریف سے کام لیا، میں نے کئی بار اُنہیں ٹوکا! پرویز صاحب کو زندگی بھر میں پہلی بار دیکھا اور طبیعت نے شدید تکدر اور انقباض محسوس کیا، ان کے چہرے سے وہ سب کچھ نمایاں تھا بلکہ برس رہا تھا جو اُن کے دل میں ہے!

جناب محمد جمیل صاحب نے آخری اجلاس کی صدارت فرمائی، انھوں نے اپنے مقالہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا کہ رومن کیتھولک نے اپنے ناقدین اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر کتنے دردناک مظالم توڑے ہیں۔ عیسائی نمائندوں نے بھی بڑی جرأت کے ساتھ تقریریں کیں اور پاکستان میں اپنے موقف کی وضاحت کی!

یہ "مذاکرہ" سکریٹریٹ حکومت پاکستان کے ایک چھوٹے سے ہال میں ہوا، مس دل نشین سراج الدین کی طرف سے دعوت نامے بھیجے گئے تھے، شریک ہونے والوں کی تعداد بہت سے بہت تیس ہوگی اخباروں کے نمائندوں تک کو اس میں نہیں بلایا گیا، مسٹر قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ہوئی، تو وہ خود ہی بڑھ کر بغل گیر ہوگئے، اس "کلب" I do not agree club کے نام کا ذکر چھڑا، تو میں نے کہا یہ نام "عجیب" ہی نہیں۔ پُراسرار بھی ہے!

بریگیڈیر گلزار احمد بڑے تپاک اور محبت کے ساتھ ملے اُن کے یہاں دوپہر کا کھانا بھی کھایا۔ مولانا مودودی بھی اس دعوت میں شریک تھے، بریگیڈیر موصوف علم و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں [illegible] کے ذاتی کتب خانہ کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا، [illegible]

تاسکنائیں بھی اُن کی لائبریری کی زینت ہیں، کتابوں کے ہجوم میں میرے منہ سے بے ساختہ فارسی کا یہ شعر نکلا :-

چہ خواہم درین گلستاں گر نہ خواہم
شرابے، کتابے، ربابے، نگارے

پھر میں نے خود ہی اس شعر پر تنقید کی کہ شراب، رباب اور نگار کے ساتھ کتابوں کے مطالعہ کا شغل کہاں چل سکتا ہے! بریگیڈیر صاحب نے ایک کتاب دکھائی، جس کا موصوف نے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے، گفتگو کے دوران میں وہ فرمانے لگے کہ انگریزی کے دورِ حکومت میں جنگی محاذوں پر بھی میں رہا ہوں، مگر اللہ تعالیٰ سے یہی دُعا کرتا رہا کہ وہ مجھ سے دین کا کام لے اور اسلام کی خدمت کے لئے زندہ رکھے!

۲۸ اگست کو شب میں جماعتِ اسلامی کا جلسہ عام منعقد ہوا، مغرب کے بعد ہی سے لوگ جلسہ گاہ کی طرف سڑکوں پر جاتے ہوئے نظر آنے لگے،

نو بجے سے پہلے پہلے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے، جماعتِ اسلامی کے جلسے ضبط و نظم کے اعتبار سے مثالی جلسے ہوتے ہیں اور وقت کی پوری پابندی کے ساتھ شروع ہوتے ہیں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وقتِ مقررہ سے چند منٹ قبل اسٹیج کے عقب کے کھیتوں میں ہوتے ہوئے تشریف لائے، وہ لوگوں کے "زندہ باد" کے نعروں اور عقیدت کے مظاہروں سے اپنی حد تک بچنے کی کوشش کرتے ہیں، جماعت کے ایک ذمہ دار رکن سے میں نے اُنھیں کہتے ہوئے سُنا۔

"میرے لئے "زندہ باد" کے نعرے بھی اب لگنے لگے ؟!"

جلسہ شروع ہونے سے قبل بھی اور مولانا کی تقریر کے دوران میں بھی بجلی کا سلسلہ کئی بار منقطع ہوا، مگر لوگ صبر و سکون کے ساتھ بیٹھے رہے، کچھ دیر تک تو ہیڈ میکسوں ہی سے کام چلتا رہا۔

تلاوتِ قرآن کے بعد میں نے اپنی نظم "قرآن کی فریاد" سُنائی، اس نظم کے لئے لوگوں کا اصرار اور تقاضا تھا، پھر مولانا مودودی نے تقریر فرمائی، کتنی دل نشین تقریر تھی، کس قدر زورِ استدلال تھا، پاکستان کے حالات کا کس دیدہ ریزی کے ساتھ تجزیہ کیا، مجمع کا عالم یہ تھا ــــــ کہ :-

؎ اب دل کے دھڑکنے کا بھی ہنگام نہیں ہے

سب کی نظریں مولانا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، اور نظارے کو بچ بچ "جنبیدنِ مژگاں" سے گلہ تھا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نہ تو شعلہ بیان خطیب ہیں اور نہ پُر جوش مقرر ہیں، اُن کی تقریر کا انداز سب سے جُدا ہے، نہ شعر پڑھتے ہیں، نہ لطیفے اور چٹکلے بیان کرتے ہیں، نہ سننے والوں کو خوش کرنے اور اُن سے داد و ستائش حاصل کرنے کے لئے اُن کے ذوق کے مطابق اسلوبِ بیان اختیار فرماتے ہیں! شروع سے آخر تک سنجیدہ تقریر، پُر عظمت اور باوقار انداز، وزنی دلائل، صاحب جوامع الکلم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طرزِ کلام کے اتباع میں ایک ایک لفظ اس قدر واضح طور پر خاص ٹھہراؤ کے ساتھ بولتے ہیں کہ کوئی چاہے تو پوری تقریر لفظ بہ لفظ لکھ سکتا ہے، اُن کی تقریر سننے والے بستروں پر جاکر چین کی نیند نہیں سو سکتے، مولانا کی تقریر لوگوں کے اندر ایک ایسی خلش اور احساس کو بیدار کر دیتی ہے، جو اُنہیں سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے! مولانا مودودی لوگوں کو مسحور نہیں کرتے بلکہ اپنے افکار کے ہاتھوں کا شاہانہ سامعین کے دل و دماغ پر ثبت [illegible] اگر [illegible] کسی کے دل و دماغ [illegible] تو ضرور کچھ نہ کچھ [illegible] جائے گا۔

پشاور اور ڈھوڈیال میں جماعت کے جلسے ہونے والے تھے، ان میں شرکت کے لئے کارکنوں نے مجھ سے کہا اور اصرار کیا، میں نے ہامی بھر لی، حسنِ اتفاق کہ وقت کے وقت ہوائی جہاز کی نشست بھی مل گئی!

فلیش مین ہوٹل کی یہ آخری صبح ہے، میرے ساتھی شجاعت علی صاحب صدیقی بھی آج ہی گیارہ بجے کے جہاز سے کراچی جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں، ہوٹل میں اب تک کھانے کا "زر محترم" والا معاملہ تھا، آج صبح ناشتہ میں دم پخت گوشت آیا، تو طبیعت خوش ہو گئی، کھانے کے اعتبار سے اس ہوٹل کی تواضع اور مدارات کا انجام (finishing touch) بخیر رہا۔

پشاور میں

صبح نو بجے کے قریب ہوائی جہاز چک لالہ ایرپورٹ سے روانہ ہوا، ہوائی سفر میں مولانا مودودی کی معیت پہلی بار میسر آئی، پورا آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ جہاز نیچا ہونے لگا، کہاں کراچی کہاں پشاور ایک ہزار میل بھی دور کا فاصلہ! ریل گاڑی نے مہینوں کے سفر کو گھنٹوں میں بدلا، اور ہوائی جہاز کی بدولت یہ گھنٹے منٹوں میں تبدیل ہو گئے!

پشاور کے ہوائی اڈے پر بھی مولانا کو لوگوں کے جوشِ خیر مقدم اور اخباروں کے نمائندوں کے سوالات سے سابقہ پڑا، ہم پشاور شہر سے گزر کر قیام گاہ پر پہنچے، ہمیں ایک عالیشان مکان میں ٹھیرایا گیا، یہ نئی وضع کا بنگلا اور کوٹھی نہیں کم و بیش نصف صدی پہلے کی بنی ہوئی حویلی ہے، کشادہ صحن، خوش نما محرابیں، دالانوں کی منقش چھتیں، مکان کیا ہے اچھا خاصا شیش محل ہے! لوازم آرائش بھی اسی عمارت کی وضع قطع کے لحاظ سے موزوں ہیں!

شام میں یہاں کی جماعتِ اسلامی کی طرف سے مولانا مودودی کو میونسپل آفس کے احاطہ میں عصرانہ دیا گیا، ہر طبقہ کے لوگ اس میں شریک تھے، مولانا نے مختصر سی تقریر کی، آخر میں فرمایا:۔

"ہمارے کسی کام کو آپ کتاب و سنت کے خلاف پائیں، تو ہمیں ٹوک دیں۔۔۔۔"

مولانا کی اس مختصر سی تقریر نے اپنوں سے زیادہ دوسروں کو متاثر کیا۔ رات کا کھانا ڈاکٹر بشیر احمد (ایم، بی، بی، ایس) کے مکان پر کھایا، موصوف اسلامی جمعیۃ طلبہ کے پُرجوش رُکن رہ چکے ہیں ۔۔۔۔۔ مجھے شدید زکام ہو گیا ہے، چھینکوں کی وہ کثرت ہے کہ محفل میں بیٹھ کر مجھے خود ندامت سی محسوس ہوتی ہے کہ میری وجہ سے لطفِ محفل منغض ہوتا ہے۔

شب میں چوک یادگار میں جلسہ عام ہوا، میں نے کئی نظمیں پڑھیں، مگر زکام کی وجہ سے میں خود پڑھنے میں بے لطفی محسوس کر رہا تھا، اس شعر پر:۔

مدت سے کشاکش جاری ہے، صیادوں اور گل چینوں میں
تنظیمِ گلستاں ہونے تک انجامِ گلستاں کیا ہوگا

مجمع کو چونکتا ہوا محسوس کیا گیا، مولانا مودودی کی تقریر لوگوں نے انتہائی سکون اور شوق و دلچسپی کے عالم میں سُنی، جو جہاں بھی تھا۔ تصویر کی طرح خاموش بیٹھا اور بُت بنا کھڑا تھا، کئی آدمیوں نے کہا کہ پشاور میں اتنا بڑا مجمع کم ہی دیکھنے میں آیا ہے،

[1] صاحب موصوف حکومتِ پاکستان کے ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل رہے ہیں، پاکستان کے وہ فوجی عہدیدار جو آج سب سے بڑے ہیں بارہ تیرہ سال پہلے وہ ان سے نیچے ہی تھے، صورت، سیرت، وضع قطع اور چال ڈھال سے سیدھے سچے مسلمان نظر آتے ہیں عشاء کی نماز کے بعد سے تہجد کے اول وقت تک اوراد و وظائف پڑھتے رہتے ہیں اور تہجد کی نماز پڑھ کر سوتے ہیں! انکے تدین و عبادت گذاری کو دیکھ کر مجھے اپنی بے دلی کی نمازوں پر بڑی ندامت ہوئی! موصوف کے ہمراہ تین دن اچھی رفاقت کے ساتھ بسر ہوئے، یہ سکون پسند، میں مضطرب! مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سکون و اضطراب میں ہم رنگی اور دوستی قائم رہی!

جماعتِ اسلامی کے رکن ارباب محمد سعید صاحب بہت بڑے زمیندار ہیں ان کا مکان سعید آباد میں پشاور سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے، رات وہیں قیام کیا، برسوں کے بعد گاؤں کی فضا اور کھلے ہوئے صحن میں بانوں کی بُنی ہوئی چارپائی پر رات کو سونا نصیب ہوا۔ تکیہ پر سر رکھتے ہی نیند آگئی اور فجر کے وقت آنکھ کھلی!

مولانا مودودی فجر کی نماز پڑھ کر سونے کے عادی ہیں، وہ سو ہی رہے تھے کہ آس پاس کے گاؤں اور بستیوں کے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی، ہر پٹھان اپنی ڈاڑھی نیچے کرتے، عبا قبا اور شرعی پاجامے سے عالم بلکہ مجتہد ہی نظر آتا ہے، مولانا موصوف کے ساتھ تمام مہمانوں نے مل کر ناشتہ کیا، ناشتہ میں مرغ بھی تھا، مچھلی بھی تھی، گھی میں تر بتر پراٹھے بھی تھے! نو بجے کے بعد یہاں سے سوات کے لئے روانہ ہوئے! سردار علی خاں صاحب[1] کی موٹر میں، وہ خود ہیں، مولانا ہیں، میں ہوں، ایک اور صاحب ہیں خان صاحب موصوف کے صاحبزادے موٹر چلا رہے ہیں!

آہ! تاج الملوک مرحوم

مولانا مودودی پشاور سے سوات سیر و تفریح کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے رفیق، ڈاکٹر تاج الملوک مرحوم کی تعزیت کے لئے جا رہے ہیں! اس علاقہ میں جماعتِ اسلامی کا تعارف تاج الملوک ہی کی مخلصانہ کوششوں سے ہوا، اقامتِ دین کی تحریک کے ساتھ اُن کا اخلاص، جوش، سرگرمی، انہماک اور ایثار اپنی آپ ہی مثال تھا! مرحوم خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔ اُنہیں پتہ لگتا کہ اُن کے مستقر سے دس میل پر کوئی غریب و نادار آدمی بیمار ہے تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر موٹر سائیکل پر بیٹھے اور بیمار کے یہاں پہونچ کر دم لیا۔ مریض کی نبض دیکھی۔ تسلی دی اور دوا بھی! اس نواح کا بچہ بچہ اُن سے واقف ہے، انہیں یاد کر کر کے لوگ آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

اور تاج الملوک نے اپنی زندگی کی ایک ایک گھڑی کو غنیمت جان کر نیکیوں کا بہت کچھ سرمایہ جمع کر لیا، جس دن موٹر لاری کے حادثہ سے وہ جاں بحق ہوتے ہیں، سُنتا ہے کہ یہاں کا سارا علاقہ اُس دن ماتم کدہ بنا ہوا تھا؟

تاج الملوک مرحوم نے اقامتِ دین کی جدوجہد کے جرم میں چودہ سال جلا وطنی میں بسر کئے، ہم جب وادیٔ سوات سے

---

[1] سردار علی خاں صاحب جماعتِ اسلامی کے پُرجوش مخلص کارکن ہیں اور اس حلقہ کے امیر ہیں بہت بڑے زمیندار ہیں، روپیہ پیسہ، جائداد، اولاد، موٹر کار، نوکر چاکر، عزت اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا ہے، اور سب سے بڑی نعمت اُن کے حصہ میں یہ آئی ہے کہ تحریکِ اقامتِ دین کے داعیوں کے رفیق ہیں! عبدالغفار خاں اور خانصاحب موصوف ایک ہی گاؤں اُتمانزئی کے رہنے والے ہیں ان دونوں خان سرداروں کی اراضی کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں! مگر اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی یافت ہے کہ ایک "سرحدی گاندھی" کہلاتا ہے اور دوسرا اس علاقے میں جماعتِ اسلامی کا نقیب ہے!

سردار علی خاں صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ آپ جماعتِ اسلامی سے کس طرح متاثر ہوئے، جواب میں فرمایا کہ مولانا مودودی کے خطبات نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا، پھر اُن کی جو کتاب بھی پڑھی اپنا نقش چھوڑ تی گئی، اس کے بعد پٹھان کوٹ میں مولانا مودودی سے مل کر اور اُن کی سادگی کو دیکھ کر طبیعت نے اور زیادہ اثر قبول کیا اور میں نے اپنے اندر دینی تغیر محسوس کیا! موصوف بڑے خوش مزاج اور ہنس مکھ ہیں، شعر و شاعری سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں!

گزر رہے تھے تو ایک صاحب نے اشارہ کرکے بتایا کہ یہ قلعہ (سرمینا) ہے جہاں تاج الملوک دس مہینے تک قیدِ تنہائی میں رکھے گئے حکومتِ سوات کے ان تمام مظالم کے باوجود تاج الملوک اپنے دینی موقف سے بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئے، عزیمت اور ایسی عزیمت جو ہر قسم کی جھجک اور ہچکچاہٹ سے ناآشنا تھی، استقامت اور مسلسل استقامت جو کسی لچک اور جھکاؤ کو گوارا نہیں کر سکتی تھی، اس دورِ انحطاط میں اقبال کے مردِ مومن کی شان تاج الملوک میں پائی جاتی تھی!

مولانا مودودی نے فرمایا کہ جب سے تاج الملوک کا انتقال ہوا ہے اُن کی صورت میری نظروں کے سامنے پھرتی رہتی ہے مولانا مودودی جذباتی آدمی نہیں ہیں اُن کے اس تاثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاج الملوک کی موت کو انھوں نے کس شدت کے ساتھ محسوس کیا (رحمہ اللہ تعالیٰ)

وادیٔ سوات میں

مولانا مودودی کے اِدھر آنے کی خبر یہاں کے گرد و پیش میں پھیل گئی ہے، جس بستی سے گزر ہوتا ہے، لوگ کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں! تخت بھائی میں لوگوں کا خاصہ ہجوم تھا، یہاں کی مسجد میں مولانا نے مختصر سی تقریر فرمائی اور دعا کی! پھر سخاکوٹ میں چائے اور ناشتے سے مولانا اور اُن کے ساتھیوں کی تواضع کی گئی، یہاں کے مسلمان فرطِ عقیدت و تواضع سے بچھے جاتے تھے!

تھانہ خاصی آباد بستی اور بڑی آبادی ہے، یہاں صبح ہی سے لوگ مولانا مودودی کے خیر مقدم کے لئے راستوں میں کھڑے تھے، عقیدت مندوں نے ایک دروازہ ([illegible]) بھی بنایا تھا، جس پر مفکرِ اسلام مولانا مودودی زندہ باد لکھا تھا۔ وہاں ایک سپاسنامہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا، اُس میں لکھا تھا:—

سپاسنامہ

بخدمت جناب حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان مدظلہٗ

جنابِ والا،

آج ہم اہالیانِ ملاکنڈ ایجنسی اور خصوصاً تھانہ گاؤں کے باشندے آپ کے ورودِ مسعود پر بہت مسرور ہیں، اور آپ کو اپنے درمیان دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے احسان مند ہیں، اگرچہ آپ کی تشریف آوری ایک بہت ہی قابلِ افسوس واقعے کے پیشِ نظر عمل میں آئی ہے اور ہم سب ڈاکٹر تاج الملوک مرحوم کی وفات حسرت آیات پر سوگوار ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کی تشریف آوری اُس مقصد کی تکمیل کے جانب ایک اہم قدم تصور کرتے ہیں جس کے لئے انھوں نے آپ کی رہنمائی میں اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور ہمیں یقین ہے کہ اس موقع پر مرحوم کی روح کو بھی بے حد خوشی ہوگی۔ لہٰذا ہم آپ کی تشریف آوری پر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

جنابِ عالی! آج ہم مسلمانانِ پاکستان جس دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ ہم سب پر واضح ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جاہلیت اپنی پوری طاقت سے ہم پر چاروں طرف سے حملہ کر رہی ہے۔ مگر ایک جماعت ہے جو تنہا [illegible]…

نہرو کے حامی - تو دوسری جانب سے منکرینِ حدیث ہماری جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں - عیسائی مشنری ادارے مسلمانوں پر ڈاکے ڈال رہے ہیں - اور ہم بے بس و بے حس - دینی و ملی حمیت سے عاری مغربیت کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں - ان کے علاوہ ہم جاہلی و غیر اسلامی رسم و رواج کے چکر میں بھی پھنسے ہوئے ہیں - ان حالات میں ہمیں آپ کی اور آپ جیسے اور دینی و ملی شعور رکھنے والے رہنماؤں کی ضرورت ہے - جو اس پُر آشوب دور میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکیں -

آخر میں ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں - کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ نکال کر ہمیں یہ سعادت بخشی - کہ آپ کے فرمودات سے استفادہ کر سکیں -

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

منجانب :- اہالیانِ تھانہ - ملاکنڈ ایجنسی

۳۰ / اگست ۱۹۶۳ء ــــــــــ بمطابق ۲۸ / ربیع الاول ۱۳۸۲ھ

—×—

مولانا نے سپاسنامہ کے جواب میں چند جملے فرمائے بہت برمحل اور تاثر انگیز ! انھوں نے کہا کہ آپ حضرات کو میری ذات سے جو دلچسپی اور محبت ہے، اس میں آپ کی کوئی دنیوی غرض شریک نہیں ہے، یہ محبت اللہ، رسول اور دین کے لئے ہے، اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تھوڑی سی بہت خدمت انجام دے رہا ہوں، اللہ تعالیٰ ہماری دینی کوششوں کو مشکور فرمائے ۔۔۔۔ !

وادیٔ سوات سچ مچ مینو سواد بلکہ جنت نشاں ہے، پہاڑیوں کو قدرتِ الٰہی نے ہری بانات کی خوش منظر خلعت پہنادی ہے، سڑک پر خرد سالا اور چنار کے درختوں کی دور دور تک قطاریں ، یہ دھان کے کھیت، بادِ صبا کے نرم جھونکوں سے پودوں میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے، تو ایسا لگتا ہے جیسے سبز دوپٹے ہوائیں لہرا رہے ہیں، اونچائی پر چڑھتے ہوئے پہاڑیوں کے موڑ پر بلندی سے نیچے کی طرف دیکھئے تو حدِ نگاہ تک ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیتی ہے، اس وادی کا نام سوات نہیں سبزوار ہونا چاہیے تھا - اس قدر شاداب سبزہ کہ دیکھنے سے دکھتی آنکھیں اچھی ہو جائیں ، میں نے کہا کہ سبزہ کے اس رنگ کو "فاقع اللون" کہہ سکتے ہیں، مولانا مودودی برجستہ بولے، قرآن پاک میں سبزے کی اس قسم گہری رنگت کو ' مُدْهَآمَّتٰن ' کہا گیا ہے -

راستہ میں دور سے درگئی میں نہر کا آبشار نظر آیا، پاکستان بننے کے بعد پہاڑ کاٹ کر نہر نکالی گئی ہے، پانی کے دباؤ کا یہ اعجاز پہلی بار دیکھنے میں آیا کہ نہر ڈھلوان سے اونچائی کی طرف چڑھتی چلی جاتی ہے - یہ نہر آبپاشی کے لئے نہیں بجلی گھر کے لئے بنائی گئی ہے !

سرحد ، سوات ، دیر و چترال سے لے کر افغانستان سے بھی آگے تک کا خطہ بودھ مذہب سے متاثر رہا ہے ، راستہ میں ایک چٹان پر مہاتما بدھ کی شبیہ ابھری ہوئی نظر آئی ! اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب ان علاقوں کی تمام کی تمام آبادی مسلمان ہے سوات کی سرحد پر بہت سے لوگ موٹروں اور لاریوں میں مولانا مودودی کے استقبال کے لئے آئے تھے انھوں نے منگورا [illegible] میں مولانا موصوف کے قیام اور سیر و تفریح کا پروگرام بنایا ہے ، سوات میں دیکھنے کے بہت مقامات ہیں مگر [illegible] کا اہم شہر تعارف نہیں لکھا کہ اس کے املا اور تلفظ میں شدید ذم پایا جاتا ہے -

مولانا نے فرمایا کہ میں یہاں تفریح و سیاحت کے لئے نہیں آیا، میرے آنے کی غرض تعزیت اپنے رفیق تاج الملوک مرحوم کے اعزہ اور اقرباء کو پُرسا دینا ہے! ان عقیدت مندوں نے شدید اصرار کیا، معاملہ اُن کی خفگی اور بددلی کی حد تک پہونچ گیا، مگر مولانا راضی نہیں ہوتے!

اب ہم تاج الملوک مرحوم کے وطن چنداخورہ کی سرحد پر پہونچ چکے ہیں آگے آگے مولانا کی کار اور اس کے پیچھے موٹروں کی قطار ہے، تاج الملوک کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھی، جس نے سینکڑوں سوتے ہوؤں کو جگایا، اب وہ خود محوِ خواب ہے! وادیٔ سوات میں سونے والے مجاہد تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، تو حق کے لئے جیا اور حق کی راہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا!

تاج الملوک مرحوم کے چھوٹے بھائی، جو اس حادثہ میں زخمی ہو چکے ہیں اور ابھی تک ٹھیک طرح چل بھی نہیں سکتے، اُن کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اُن کا نو تعمیر مکان مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، یہ لوگ مولانا مودودی کو دیکھنے اور اُن سے ملنے کے لئے آئے تھے؟

ڈاکٹر تاج الملوک مرحوم کے ایک اور بھائی سیف الملوک ہیں، یہ سوات کے حاکم (ڈپٹی کمشنر) ہیں۔ والیٔ سوات کے خاص آدمی اور انتہائی معتمد علیہ! دونوں بھائیوں کے مزاج و کردار کے فرق بلکہ تضاد کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تاج الملوک مرحوم والیٔ سوات کے معتوب رہے اور سیف الملوک صاحب کو خوشنودیٔ شاہانہ حاصل ہے، انھوں نے مولانا مودودی صاحب سے کہا کہ ہمارے یہاں کی یہ رسم ہے کہ جب کوئی مہمان باہر سے آتا ہے تو اُسے سرحد تک چھوڑنے کے لئے احتراماً جاتے ہیں، مولانا نے کہا اس تکلف کی ضرورت نہیں، مگر ان صاحب نے اس قدر اصرار کیا اور اس درجہ بضد ہوئے کہ مولانا کو اُن کی موٹر میں سوار ہونا پڑا! بعض رمز شناسوں نے بعد میں مولانا سے عرض کیا کہ اس شخص کی ڈپلومیسی کامیاب رہی، یہ صاحب دربار میں جا کر اپنی حکمت و تدبیر کی کامیابی کے افسانے سنائیں گے کہ حضور! میں نے مولانا مودودی کو ریاست میں چند گھنٹے سے زیادہ نہیں رہنے دیا، وہ ہمارے گھر کے سوا اور کسی جگہ جا ہی نہیں سکے، اور میں نے اپنی موٹر کار میں بٹھا کر انہیں سرحد پار کر دیا، یہاں سوات میں مودودی نام کا ایک ہوا کا جھونکا آیا تھا، جو آیا اور گزر گیا۔

والیٔ سوات کے بارے میں سننے میں آیا کہ وہ ریاست کے ایک ایک محکمہ کی جزئیات تک پر نگاہ رکھتے ہیں، اُن کی باخبری اور اُن کی خفیہ پولیس کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ انہیں یہ تک معلوم ہو جائے گا کہ مولانا مودودی ریاستِ سوات کے کس مقام سے کس وقت گزرے، کتنے لوگ اُن سے ملنے کے لئے آئے، کس نے کیا کہا اور کس انداز میں مصافحہ اور معانقہ کیا! اطلاع و آگہی اور باخبری کی یہ [illegible] کی چندری کس لئے؟ کس چیز کا تحفظ مقصود ہے، آخر کس بات کا دھڑکا لگا ہوا ہے؟

واپسی شام کے چار بج چکے ہیں، اب ہم واپس ہو رہے ہیں، جن راستوں، وادیوں اور مناظر سے گزر چکے ہیں، وہ سب کے سب پھر پذیرائی کے لئے موجود ہیں، راستہ میں ایک چھوٹی سی بستی آئی، وہاں کی مسجد میں عصر کی نماز ادا کی! شام ہو چلی ہے، غروب آفتاب کے دھندلکے اور شام کے جھٹپٹے میں سبزہ زار کا منظر حسین سے زیادہ عجیب ہو جاتا ہے، جیسے ایک ایک [illegible] استغراق کے عالم میں ہے! اب مردان کا علاقہ شروع ہو گیا، اتنی شاداب فصل میں نے آج تک نہیں دیکھی، یہاں کی زمین گویا سونا اگلتی ہے، میلوں تک مسلسل نیشکر کے کھیت نظر آئے! یہاں کے کسانوں اور زمینداروں کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ گنّے کی پیداوار ہے، اس نواح میں شکر کے کئی کارخانے ہیں۔

مغرب سے پہلے سردار علی خاں صاحب کے گاؤں پہونچے، اس علاقہ میں ہر بڑے زمیندار کا اپنا گاؤں ہوتا ہے [illegible]

کی طرح ایک آس پاس مزاروں اور لوگ جا کر دل کے کچے اور خس پوش مکانات ہوتے ہیں! سردار علی خاں صاحب کے مکان کا رقبہ ڈیڑھ دو فرلانگ سے کیا کم ہوگا۔ وسیع و کشادہ صحن، مردانہ نشست اور قیام گاہ آرام دہ اور صوفوں اور قالینوں سے آراستہ! مردانہ نشست سے زنانہ حصہ کوٹھیوں اور بنگلوں کی طرح ملا ہوا نہیں، بلکہ دور بہت دور! پٹھان اس معاملہ میں بہت زیادہ غیرت مند ہوتا ہے! صحن کے ایک گوشہ میں مسجد! مکان سے متصل ہی بہت بڑا باغ، جو پھلدار درختوں سے بھرا ہوا ہے! اسی باغ میں خس پوش نشست ہے جسے سردار صاحب، کا ڈرائنگ روم سمجھئے، گرمی کا زمانہ، آس پاس ہریالی، زمین نرم اور بھیگی ہوئی، یہاں چارپائی بچھا کے لیٹنے میں بڑا لطف آیا!

سرحد و سوات میں جہاں بھی دعوت ہوئی۔ میزبانوں نے اپنے ذوق و استطاعت کی حد تک بڑی فراخدلی کے ساتھ انتظامات کئے۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں مرغ اور ناشتہ میں بھی اسی صبح کے موذن سے سابقہ پڑا، مولانا مودودی نے فرمایا ----- کہ مسلمانوں کو بکرے سے اور پٹھانوں کو مرغے سے دشمنی ہے"۔ سب لوگ اس پر بے ساختہ مسکرا دیئے اور کوئی کوئی ہنس بھی دیا! میں نے اس پورے سفر میں کھانے کے معاملہ میں زبانِ تنقید کو بند رکھا، مغلیہ بادشاہوں کے ایجاد کئے ہوئے کھانوں نے یو۔پی کے رہنے والوں کے ذوقِ طعام کو اتنا چٹخارہ دار بنا دیا ہے کہ قوتِ ذائقہ کو نہ جانے کتنی بڑی بڑی دعوتوں میں ضبط و صبر سے کام لینا پڑا ہو گا

مولانا مودودی کمالِ سنجیدگی کے باوجود خوش طبع بھی ہیں، وہ چپکے سے ایسا چٹکلا بیان کر جاتے ہیں کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے، فرمانے لگے کہ سرحد کے پٹھان جلسوں میں مجھے دیکھ کر "سغاتے رغامے" کہتے ہیں۔

مولانا نیند کے معاملہ میں مفلس اور میں نیند کا بادشاہ ہوں، کوئی وقت ہو کیسا ہی عالم ہو، تکیہ پر سر رکھا اور غائب! مولانا مودودی بہت بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں اور نیند نہیں آتی، بعض اوقات نیند آنے کے لئے خواب آور گولیاں استعمال کرنی پڑتی ہیں، دلِ بیدار کی طرح قدرت نے انہیں چشمِ بیدار بھی عطا کی ہے!

جب ہم سوات کو جا رہے تھے، تو مولانا مودودی جونگے کی سیٹ پر بیٹھے تھے، سردار علی خاں صاحب، پوچھتے جاتے تھے کہ آپ سو تو نہیں گئے، وہ جواب دیتے کہ ابھی ابھی غنودگی کے عالم میں تھے، اور ابھی چونکے ہیں، میں نے عرض کیا مناظر زیادہ دلچسپ نہیں ہوتے تو سو جاتا ہوں، اور جب حسین مناظر آتے ہیں تو جاگ اٹھتا ہوں!

مولانا مودودی پان کے بہت شوقین ہیں، تمباکو بہت زیادہ مقدار میں کھاتے ہیں، ان کی پانوں کی ڈبیہ سے پان ملنے کی سعادت کم ہی لوگوں کو میسر آتی ہے، مگر میں ان کے حضور و غیاب میں ان کی اجازت کے بغیر ان کی ڈبیہ پر دست درازی کرتا ہوں!

مولانا موصوف کے ساتھ ان کے رفقاء اور عقیدت مندوں کا تعلق انس و بے تکلفی کا ہے، وہ کھڑے ہیں، ہم بیٹھے ہیں، نہ انہیں قبلہ کہہ کر پکارتے ہیں نہ حضرت والا کے لقب سے خطاب کرتے ہیں، نہ اس کا اہتمام ہے کہ "پیر و مرشد" کی طرف پیٹھ کا رخ نہ ہونے پائے! مولانا موصوف بھی جس طرح گھر میں رہتے ہیں، اسی طرح باہر رہتے ہیں، ان کی زندگی میں دکھاوا اور بناوٹ نہیں اور نہ ان کی زندگی پراسرار ہے!

سردار علی خاں صاحب کے یہاں ہی میں ۳۰ اگست کو عشاء کی نماز کے بعد لوگوں کا اجتماع ہوا، شعر سننے کے لئے! میں نے دو چار نظمیں اور غزلیں کسی وقفہ کے بغیر سنا ڈالیں، مولانا مودودی بھی شعر سننے کے موڈ میں تھے!

[illegible] "سغاتے رغامے" بولتے ہیں "ہ" کا اظہار پوری طرح نہیں ہوتا، جس کے معنی ہیں "یہ ہے وہ شخص"...!

میں نے یہاں کے ثقہ اور باخبر لوگوں سے خان عبدالغفار خاں کے بارے میں دریافت کیا کہ کانگریس کے زمانہ میں عبدالغفار خاں اور
اُن کی سرخ پوشوں کی جماعت نے جو قربانی دی ہے اُس کے اثرات لوگوں کے دلوں میں باقی ہیں! عبدالغفار خاں نے انگریز کے
خلاف جو مسلسل جدوجہد کی ہے اور اس کی پاداش میں مصائب برداشت کئے ہیں، اُس کا اثر ذہن وفکر پر چھایا ہوا ہے،
عبدالغفار کی تعلیم پانچویں چھٹی کلاس سے زیادہ نہیں ہے، مگر اپنی قربانی اور ایثار کی بدولت وہ تقسیم ہند سے پہلے سرحد کے
سب سے زیادہ مقبول اور ہردلعزیز لیڈر تھے۔ اب بھی تحصیل چارسدہ اور تحصیل صوابی جن کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے کی
آبادی خان عبدالغفار سے پچانوے فیصدی متاثر ہے، کوہاٹ اور بنوں میں بھی اُن کے اثرات ہیں! عبدالغفار خاں تقسیم ہند کے
سخت مخالف تھے، اور پاکستان بننے کے بعد بھی متحدہ ہندوستان کا تخیل اُن کے ذہن وفکر پر مسلط ہے، اسلامی حکومت اور
دینی نظام سے وہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، اُن کے مزاج اور فطرت نے پاکستان کو قبول ہی نہیں کیا، پاکستان بننے کے بعد اگر وہ
بھارت چلے جاتے، تو خود اُن کے حق میں اور پاکستان کے حق میں بہتر ہوتا۔

خان عبدالقیوم خاں نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں سرخ پوشوں کے دبانے کی بہت کوشش کی، ساتھ ہی جماعتِ اسلامی
پر بھی سختی کی! اُن کے مستبد دور میں جماعتِ اسلامی کا کوئی اخبار یا رسالہ کسی شخص کے پاس ہوتا، تو سی آئی ڈی والے اس سے
بازپرس کرتے!

سیر و سیاحت کا پرلطف ذکر چھوڑ کر میں کیسی ناخوشگوار باتیں کرنے لگا! لیجئے قلم پھر اپنے مرکز پر آگیا، ۳۱ اگست کو جمعہ
کی نماز کے بعد چودھری طفیل محمد صاحب قیم جماعتِ اسلامی اور میں موٹر کار کے ذریعہ نوشہرہ کے لئے روانہ ہوئے، وہاں
آج شب میں مقامی جماعتِ اسلامی نے ایک جلسہ کا انتظام کیا ہے! ہوتی مردان کا نام بچپن سے سنتے آئے ہیں، آج اُسے دیکھ
بھی لیا، نوشہرہ تک فوجی چھاؤنی کا سلسلہ چلا گیا ہے! انگریز نے سرحد میں فوج کی متعدد چھاؤنیاں قائم کی تھیں، یہ تو خم کر
جمرود ہے، یہ لنڈی کوتل ہے، یہ پشاور ہے، یہ مردان اور نوشہرہ ہے، یہ رسالپور ہے! فوجی چھاؤنیوں کے اس جال بچھانے
کے دو سبب تھے، ایک تو قبائلیوں کی چھیڑ چھاڑ، دوسرے افغانستان کا خوف! انگریز چلا گیا، پاکستان وجود میں آگیا مگر
حکومتِ افغانستان کو انگریز سے اتنی دشمنی نہ تھی، جتنی دشمنی پاکستان سے ہے! وہاں کے عوام پاکستان سے محبت کرتے ہیں مگر
اربابِ حکومت دشمنی پر اُترے ہوئے ہیں! انھوں نے اسلامی اخوت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور روس اور بھارت کے
ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں!

عصر کی نماز کے وقت نوشہرہ پہونچنا ہوا، مشہور شاعر ادیب سہارنپوری کے بڑے بھائی آدم جی مل میں اکاؤنٹنٹ ہیں، اُنھیں
میرے آنے کی اطلاع ملی، تو جیپ کار بھیج دی، آج اُن کی طبیعت ایکا ایکی خراب ہوگئی، پھر بھی اپنی محبت سے اُسی بیماری کی حالت میں
دیر تک صوفے پر بیٹھے رہے، چائے اور اس کے لوازم سے تواضع کی، حیدرآباد دکن کے دو نوجوانوں سے اُنھی کے یہاں ملاقات ہوئی
جو اُس زمانے کا ذکر بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ کرتے رہے جب حیدرآباد کے ہر بڑے جلسہ میں نواب بہادر یار جنگ تقریر
کرتے تھے اور میں نظم پڑھتا تھا۔

یہاں سے واپس ہوکر کھانا کھایا، عشاء کی نماز پڑھی اس کے بعد جلسہ گاہ میں پہونچے، نوشہرہ کی آبادی کو دیکھتے ہوئے مجمع
اچھا تھا، میں نے نظم سنائی، اس کے بعد طفیل محمد صاحب نے تقریر کی، ان کے بعد میری باری آئی!

بعض مذہبی پیشواؤں نے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کو بدنام اور مطعون کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے، یہ لوگ جھوٹے الزام

اللہ بے سروپا تہمتیں تراش کر، نہ تو خدا سے شرماتے ہیں اور نہ بندوں سے! مولانا مودودی کے خلاف اشتہار لگے ہوئے نظر آئے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آپ حضرات پوسٹروں اور فتووں سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کیجئے، جماعت اسلامی کا لٹریچر موجود ہے اُسے پڑھئے، پھر جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کی زندگیوں کو دیکھئے کہ خدا سے اور بندوں سے ان کے کیسے معاملات ہیں! اسکے بعد آپ اُن کے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں اور جس نتیجہ پر پہونچیں، آپ کو اختیار ہے مولانا مودودی کو "ملحد" کہنا حقیقت کا منہ چڑانا ہے، حکومتِ شام کے سابق وزیر اور مشہور ادیب و مفکر مصطفےٰ زرقاء نے تو مولانا مودودی کے متعلق کھلے اجلاس میں اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ یہ شخص غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ کی صف کا آدمی ہے!

میں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ پاکستان کے عوام اپنی بداعمالیوں کے باوجود اپنے اوپر نیکی اور اخلاق کے نظام کو برپا کرنے کی بے پناہ خواہش رکھتے ہیں، کتنے اچھے ہیں یہاں کے عوام! مگر افسوس ہے کہ اوپر کے لوگ اس نظام کو قائم و برپا نہیں ہونے دیتے! آخر یہ کش مکش کب تک؟

صبح کی نماز کے بعد ناشتہ ہوا۔ پھر ہم ریلوے اسٹیشن پہونچے۔ چند رفقاءؓ نے اسٹیشن تک مشایعت کی، نوشہرہ سے چل کر ڈھائی گھنٹہ میں ریل گاڑی کیمبل پور پہونچ گئی، طفیل محمد صاحب نے بغل گیر ہوکر رخصت کیا، کیمبل پور میں چند گھنٹے ٹھیرا، اپنے ایک عزیز کی بیمار پرسی کرنی تھی، شام کے تین بجے لاری سے روانہ ہوکر راولپنڈی پہونچا، راستہ میں واہ سے گذرنا ہوا، تقسیم ہند سے پہلے یہ جنگل بیابان تھا اور آہ بھرتا تھا، پاکستان بننے کے بعد یہ اس انداز پر آباد ہوا کہ اس کی آبادی پر بمبئی اور کلکتہ کا دھوکا ہوتا ہے، اور اب اس کے لبوں پر "آہ" کی جگہ "واہ" ہے!

چک لالہ کے ایرپورٹ سے مغرب کے بعد ہوائی جہاز روانہ ہوا، اور ایک ہی فرلانگ میں لاہور جا پہونچا۔ یہاں بیس پچیس منٹ ٹھیرا رہا، لاہور کے مسافر اُترے، کراچی جانے والے سوار ہوئے، رات کا وقت ہے، ہم ہوائیں اُڑے چلے جارہے ہیں! سائنس کی ترقی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دی ہیں، مگر علامہ اقبال عالمِ خیال میں اب سے بہت پہلے ستاروں کو چھو گئے، اور اس پرواز کے بعد بے اختیار پکار اٹھے۔

ــــہ ستاروں سے آگے جہاں اور ہیں!

فضا کے کائنات بے حد و بے کراں ہے ـــ

ــــہ جس قدر بڑھتے گئے حدِ نظر بڑھتی گئی

آج جتنے مسافر ہوائی جہاز سے سفر کر رہے ہیں، اتنے مسافر میں نے کسی سفر میں نہیں دیکھے، جہاز کی شاید ایک نشست بھی خالی نہیں ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ کل اتوار ہے کراچی میں گھوڑ دوڑ ہے، جہاں کی لا اُبالیانہ اور تباہ کن قماربازی کو کوئی روک ٹوک نہیں، حکومت خوش اور مطمئن ہے کہ اس قماربازی کے ٹیکس سے خاصی رقم وصول ہو جاتی ہے!

ــــہ نظر کی نامسلمانی سے فریاد

رات کا کھانا ہوائی جہاز میں کھایا، لذیذ کھانوں کے بعد گرم کافی نے اور مزہ دیا، ہوائی جہاز [illegible] ہوئے تھوڑی دیر بعد کراچی کی روشنی نظر آنے لگی، اور یہ ایسا محسوس ہوا، جیسے سارے شہر میں چراغاں ہو رہا ہے! [illegible] کا سفر خاصہ پُرلطف اور دلچسپ رہا، اللہ تعالیٰ کا [illegible] شکر ہے کہ اس نے خیر و خوبی کے [illegible]

جہاں سے چلا تھا، وہیں آگیا

[illegible]
[illegible] کی خدمت کرتے رہیں، اور کرتا رہوں!

حافظ ظہور الحسن برلچہ

ایک تشکیک پسند دوست کے نام

محترمی بندہ! یہ خط ایک ایسے دوست کے خط کا جواب ہے جو مذہب سے متعلق
چند شکوک و شبہات رکھتے تھے۔ بعض احباب کا اصرار تھا کہ افادۂ عام کے لئے
یہ ضرور شائع ہو۔ اس ناچیز نے آپ کے موقر رسالہ کو پسند کیا ہے۔

میرے اچھے دوست

آپ کے دو عدد خط ملے، پہلا خط جن ارشادات پر مشتمل تھا انہیں پڑھ کر تعجب سا ہوا۔ آپ نے لکھا ہے کہ "ہم اپنی مجبوریوں اور ناکامیوں کو تقدیر کا نام دے لیتے ہیں" ٹھیک ہے مگر آپ کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ اپنی ناکامیوں اور مجبوریوں کو تدبیر کا نقص، جدوجہد کی کمی، سعی و عمل کی کوتاہی سمجھتے ہیں تو پھر دونوں کا نتیجہ کیا ہوا؟ میری پہنچ اور آپ کی رسائی دونوں کا حاصل ناکامی ہی تو ہوا۔ ممکن ہے آپ ارشاد فرمائیں کہ ہم اس کے بعد پھر جدوجہد کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ تو عرض ہے کہ ہم کب اس سے پیچھے رہتے ہیں۔ خدا نے جدوجہد سے کب منع کیا ہے؟ بلکہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہوں کہ آپ اپنی ناکامیوں کو جدوجہد کا نقص قرار دے کر بے قرار ہو جاتے ہیں، دل جمعی، اضطراب سے، چین بے چینی سے بدل جاتا ہے۔ اس سے تو میں بہتر ہوں کہ معاملے کو تقدیر کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتا ہوں اور آگے دل جمعی اور مضبوطی سے دوبارہ جدوجہد شروع کر دیتا ہوں۔ میرا اعتقاد ہے کہ میرا خدا نہ کسی کی سعی رائگاں کرتا ہے نہ کسی کے حق میں برا فیصلہ کرتا ہے۔ دیکھا آپ نے فرق؟ آپ ناکامیوں سے مضطرب ہو جاتے ہیں۔ یقیناً اس کا اثر آپ کے آئندہ عمل پر بھی پڑتا ہے۔ گزشتہ ناکامی دوبارہ اقدام کی جرأت کو کمزور کر دیتی ہے؎

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

مگر میرا حال آپ سے مختلف ہے میری ناکامی چونکہ ایک سب سے اعلیٰ اور مقتدر ہستی کی مصلحت کا نتیجہ ہے اس لئے میرا دوبارہ اقدام عمل پہلے سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہمت کی بلندی اور استقلال کی خوبی ہمہ دم ہوتی ہے۔

۲۔ برادر عزیز! حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کبھی تقدیر کے مسئلہ کو قرآن حکیم کے ذریعہ سمجھا ہی نہیں۔ قرآن میں جو آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر کا عقیدہ مافات کے افسوس و غم اور بزدلانہ اثرات سے بچا کر آئندہ کے لئے اقدام عمل پر ابھارتا ہے۔ یعنی جو کچھ ہوا اس کا غم نہ کرو اور آئندہ جم کر کوشش کرو۔ قرآن کا تقدیری نظریہ جسے آپ نے یاس انگیز، کاہل اور سست بنانے والا قرار دیا ہے کیا صحیح ہے؟ آپ نے تاریخ پر ایک اور ظلم عظیم یہ کیا ہے کہ لکھا ہے کہ "یہی وجہ ہے کہ جدوجہد کا جذبہ بے انتہا قدامت پسند انسانوں میں مفقود ہوتا ہے۔" سچ بتائیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی زندگی سراپا عمل تھی یا بے عملی کی زندگی تھی۔ تاریخی شہادت تو یہ ہے کہ مذہب کے اعلیٰ عملی نمونے بخت و وقت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر زمانہ کا رخ جدھر چاہا موڑتے رہے۔ "زمانہ با تو نہ سازد" کی بزدلانہ مصلحت کو مضحکہ خیز ثابت کر دکھایا۔ قرآن کی مشہور آیت ہے لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ انسان کے لئے صرف وہی کچھ ہے جس کے لئے وہ جدوجہد کرے۔ یہ آیت آپ کے سارے اعتراض کا جواب ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیل کا موقع نہیں ورنہ میں ایک سے زیادہ آیات پیش کرتا۔

۴۔ آپ کی بھوک والی نظمیں پڑھیں۔ یہ بھی عجیب معاملہ ہے کہ آج کل ہمارے جدید اور ترقی پسند شعراء بھوک اور مزدور کا مرثیہ پڑھتے ہیں یا پھر ان مزدوروں کے پیدا کرنے والے خدا کو خوب کوستے ہیں۔ معاف کیجیے میں نے ان مرثیہ خوانوں میں ایک فرد بھی ایسا نہیں دیکھا جو غریب اور مفلس جاہل اور گنوار طبقے کے لئے عملی جدوجہد کرتا ہو۔ یہ تو محض "مالوسیانا" ہوتا ہے یا پھر "سرخ سویرے" کے "شہدائیں" نام لکھوانا ہوتا ہے۔ میرے دوست خدا کا نہیں بلکہ کسی کا نہیں ہوتا خود غرضی اور نفسانیت کی بندگی کرتی بنی نوع انسان کی ہمدردی کا نام دینا دھوکا ہے فریب ہے۔ شعر کہنے کے لئے یہ نعرے اچھے ہیں۔ مگر افلاس کے پچھاڑ کھانے والے شیر دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا نہ ان اشعار سے کسی غریب کو روٹی ملتی ہے۔ نہ اس گرمئی سخن سے کسی مفلس کا چولہا گرم ہوتا ہے نہ ان الفاظ کی بارشوں سے کسی بھوکے کا پیٹ ٹھنڈا ہوتا ہے مصیبت یہ ہے کہ ان غریبوں نے اصل مسئلہ کو سامنے رکھا ہی نہیں اس مشکل کا حل کیا تلاش کرتے کی بجائے ہواؤں کی طرح نوحہ کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دولت کی تقسیم کس طرح ہو۔ آج دولت بڑھانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ صرف دولت پر غور کرنا ہو آپ کو اس کا حل کیمونزم میں نظر آتا ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ سب سے اچھی کسوٹی ہے۔ آج روس میں اور تو کیا عرض کروں، زبان و بیان کی آزادی تک حاصل نہیں۔ "تاج محل" پر اعتراض کرنے والے لینن کے مقبرے پر کیوں پھول چڑھاتے ہیں۔ سچ مانو یہ سب کھوکھلی آوازیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ روس اپنی برتری چاہتا ہے۔ امریکہ اپنی، بنی نوع انسان جنت میں جائیں یا جہنم میں۔ انھیں حکومت چاہیئے۔ وہ لاشوں پر ہو یا خون کے خشک تودوں پر۔ انسان کا سچا ہمدرد صرف اسلام ہے۔ حدیث میں ہے "الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ" "تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال (اولاد) ہے۔ پس لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کرے"۔ ع عبادت بجز خدمت خلق نیست۔ یہی نہیں بلکہ اس ارشاد کا قائل آپ کے سامنے ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پڑھیئے اور دیکھئے کہ آپ سے زیادہ اللہ کی مخلوق کا بے غرض محسن اور خدمت گار کوئی ہوا ہے؟ انسانیت کا احترام اس انسان کامل سے زیادہ کسی نے کیا ہے؟ اس سلسلے میں گذارش یہ ہے کہ آپ قرآن حکیم اور سیرت رسول کا مطالعہ فرمائیں۔ دولت کے صرف سے متعلق آپ پڑھیں گے کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے "یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو۔" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں تو کہدیجیے کہ جو کچھ تمہاری ضروریات سے فاضل ہو" یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسلام دو چیزوں کو الگ الگ قرار دیتا ہے حظوظ اور حقوق۔ تمام ضروریات حقوق میں داخل ہیں اور زوائدات حظوظ میں شامل ہیں۔ اسلام کا معاشرے سے اخلاقی مطالبہ یہ ہے کہ اپنی ضروریات پر دوسرے کی ضروریات کو ترجیح دو چہ جائیکہ ضروریات میں تعیشات کو داخل کر کے موج کرو۔ یاد رکھیے کہ اخلاقی قدروں کی بنیاد کے بغیر کوئی تمدن اور کوئی معاشرہ مطمئن اور پر مسرت حیات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اسلامی اخلاقی قدروں کا مطالعہ کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا دامن مسرت و اطمینان کے بے خار پھولوں سے بھرا ہوا ہے جس تک ہر کس و ناکس کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے۔ یہ نہ روس کے قبضے میں ہے، نہ امریکہ کے اختیار میں۔ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی دس برس کی زندگی میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں کامیاب ہو گئے جو خوش حال و مطمئن تھا۔ آپ کے ذرائع کیا تھے؟ یہ بھی غور طلب ہے۔ بارہ لاکھ مربع میل آپ کے دامن رحمت کے زیر سایہ پورا معاشرہ امن و امان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ آج امریکہ اور روس کے ذرائع کتنے وسیع ہیں لیکن انکی طاقتیں حیات انسانی کی تعمیر میں صرف ہو رہی ہیں یا تخریب میں؟ دنیا میں امن و سکون بڑھ رہا ہے یا اضطراب و پریشانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ترقی درندگی کا نام ہے تو پھر گاندھی گارڈن کے پنجرے کھول دینا چاہئیں بہیں یقین ہے کہ دنیا کے تمام درندے اور زہریلے جانور پوری آزادی پا کر بھی موجودہ انسانی زندگی کا ادنیٰ سا جواب بھی نہ بن سکیں۔ یہ تو صرف اسلامی نظام ہی کا حصہ ہے کہ اگر شیشہ پھسل کر گرے تو پتھر اسے تھام لے۔ عدل و انصاف فطری مساوات یہاں اور صرف یہاں موجود ہے۔

میرے بھائی یہ سب ہوش کی باتیں ہیں جوش کی نہیں۔ غور کیجیے اگر سچائی ہے تو قبول کر لیجیے۔ بحث کیا کروں آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور میں معمولی پڑھا لکھا ہوں۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

عزیز الرحمن
(بی اے)

کلچر کا مفہوم

آج کل یہ رجحان عام ہو گیا ہے۔ کہ لوگ مغربی الفاظ کو اپنی زبان میں درآمد کر کے اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ کہ ہم نے زبان کو وسعت دے کر ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ لیکن اسلام کے معاملے میں یہ روش کوئی کارِ خدمت نہیں بلکہ سیدھی سادھی باتوں کو چیستاں بنانے کی ایک کوشش ہے۔ CULTURE کے موضوع پر اکثر مضامین نظر سے گذرتے ہیں۔ جن میں مقالہ نگار اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی دستورِ حیات میں مغربی مشاغل داخل کر کے انہیں جزوِ مذہب بنا دیا جائے۔ جن حضرات نے مغربی علوم کا مطالعہ کیا ہے ان کی تگ و دو اس مطالعے کی وجہ سے یہی ہوتی ہے۔ کہ وہ ان مضامین کو جن سے خود متاثر ہوئے ہیں۔ اُردو زبان میں منتقل کر کے ایک خدمت سرانجام دیں۔ لیکن جس طرح کائنات کے ہر ذی رُوح میں انفرادیت ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر لفظ کے لئے انسانی ذہن میں اس کے لئے ایک خاص تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اسے باقی الفاظ سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔ اب جو شخص CULTURE کے عنوان سے کوئی مضمون پڑھے گا اس کے ذہن میں وہی مغربی تصورِ حیات پیدا ہو جائے گا۔ جس کے لئے یہ لفظ مروج ہو چکا ہے۔ جس شخص نے مغربی تصور سے واقفیت حاصل نہیں کی وہ مضمون نگار کے ادعا اور تفصیلات کے مطالعہ کے بعد کبھی اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ کہ آیا یہ مضمون مفید ہے یا ضرر رساں؟ لیکن جو شخص تقابلی مطالعہ کا مالک ہو۔ وہ غور و خوض کے بعد کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ جائے گا۔

لفظ CULTURE جس کی معنوی وسعت میں ہر روز مغربی مفکرین اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس کے مبداء پر غور کیا جائے۔ تو یہ لفظ اتنا خوفناک نہیں جتنا کہ اس کو مغربی مفکرین نے اصطلاحی معنوں میں استعمال کر کے اور اس کے ساتھ نظریات منسلک کر کے اس کو خطرناک صورت دے دی ہے۔ مبداء کے لحاظ سے یہ لفظ CULT سے مشتق ہے۔ جس کے معنی مذہبی رسوم کے ہیں۔ ان معانی سے لامحالہ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مذہب اور CULTURE دو لازم و ملزوم الفاظ ہیں۔ جن کے تعلق پر بعد میں بحث کی جائے گی۔ یہ لفظ جرمن زبان میں CULTUR سے ماخوذ ہے جو فرانسیسی لفظ ([illegible]) کا ہم معنی ہے۔ انگریزی زبان میں یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ من جملہ دیگر معانی کے اس کے معنی علم و ہنر۔ اصلاح و ترقی اور مذاق اور تحمل کے بھی لئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں اس کے موجودہ استعمال کے مغربی نقطۂ نظر کو سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ مغربی مفکرین کے نزدیک لفظ CULTURE میں معنوی لحاظ سے رہن سہن کے طریقے اور زندگی کے مختلف مقتضیات و اصول شامل ہیں۔ آدابِ اخلاق، معیشت و معاشرت اور تہذیب و تمدن کے جزئیات بھی اب CULTURE میں دخل پا رہے ہیں۔ مغربی مفکرین کو یہ کوششیں اس لئے کرنی پڑ رہی ہیں کیونکہ زندگی کے نصب العین یا استواریٔ اخلاق کے اصولوں کے لئے ان الفاظ کا استعمال ان کے لئے پسندیدہ نہیں جن کا سرچشمہ مذہب ہو۔ موجودہ مفہوم سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ لفظ اتنا جامع ہے۔ کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی تمام ضرورتوں پر حاوی ہے۔

علاوہ ازیں اب CULTURE میں تہذیب کے اصول بھی آہستہ آہستہ سمونے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تہذیب کے لفظی معانی کھوٹ نکالنا اور صاف کرنا ہیں۔ دراصل تہذیب کی بنیاد ان اخلاقیات پر تھی۔ جو مذہب سے ماخوذ تھے۔ لیکن مادی دنیا میں تہذیب کے اس مفہوم کو اپنانا آج "جمود" تصور کیا جاتا ہے۔ نشو و ارتقا کے معنی یہ لئے جا رہے ہیں کہ ہم اپنی خواہشات کے تقاضا

ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے جس قسم کے طریقے بھی استعمال کریں وہ ہمارا حق ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے کہ مغربی ممالک میں خواب آور گولیوں کی ایجاد تھی۔ روزنامہ کوہستان مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۶۲ء میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "امریکی اور یورپی ممالک میں اپاہج بچوں کی پیدائش قومی المیہ ہے"۔ اس مضمون کا ملخص یہ ہے کہ خواب آور گولیاں یا اعصابی سکون پہنچانے والی گولیاں استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ مضمون میں لکھا ہے۔ کہ ان گولیوں کے استعمال سے ہزاروں بچے اپاہج پیدا ہوتے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ وقتی سکون کے حصول کے لئے ان گولیوں کو جن مستورات نے استعمال کیا ان کے ہاں اپاہج بچے پیدا ہوتے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ ایسی ادویہ کے موجد کی نظر محض وقتی سکون کے حصول پر تو تھی لیکن اس کے انجام کی اسے کوئی خبر نہ تھی۔ اس مثال کے پیش نظر CULTURE کا مغربی مفہوم اور اس کے داعیات کی بنا پر انسان کو اسی قسم کی آزادی دیتی ہے۔ جو وقتی طور پر تو تفریحات و تعیش کے سامان مہیا کرے۔ لیکن انجام کے طور پر اس کا اثر الٹا ہو۔ دنیا میں عمل و ردِ عمل کا مشاہدہ ہر نفس ہر آن کر رہا ہے۔ ایسے ان گنت واقعات انسانی مشاہدے میں آتے ہیں کہ جنھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں خوب گل چھرے اڑائے لیکن انجام کار وہ ہر آسائش و آرام حتیٰ کہ معمولی صحت و تندرستی سے یکسر محروم ہو گئے۔ اس مشاہدہ کے پیش نظر اگر ہم مغربی کلچر پر غور کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ فرداً اور اجتماعاً اس کا اثر انہی گولیوں جیسا ہو رہا ہے جن کا ابھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

آج کل اس عنوان پر لکھنے والے عام طور پر CULTURE کی ضرورت کے بڑی شدت سے قائل ہیں۔ وہ مغربی افکار سے مرعوب ہو کر اسلام میں بھی انہی چیزوں کے متعلق مختلف دلائل فراہم کر رہے ہیں۔ جو مغربی طرز فکر و عمل سے ہم آہنگ کر سکیں لیکن مسئلہ یہیں پر حل نہیں ہو جاتا۔ بلکہ مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ CULTURE کو اس قدر وسعت دے دی جاتی ہے کہ آرٹ جس میں مصوری نقاشی اور موسیقی کے مختلف اقسام کی تفصیل ہو اور ادب جس میں طنز و مزاح۔ افسانہ نگاری اور شعر و شاعری وغیرہ شامل ہیں۔ اس CULTURE کے ضروری اور لازمی جزا قرار دے دیئے جائیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ لباس خوراک اور زبان کا اختلاف ایک قدرتی امر ہے۔ ایک ملک کی زبان اس کے باشندوں کی خوراک اور لباس دوسرے ملک سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن اہل مغرب، یہ چاہتے ہیں کہ ان کی سیاسی برتری کے ساتھ ساتھ ان کی طرز زندگی ان کے مرغوبات و مکروہات۔ اور ان کی عادات و اطوار بھی ہر قوم میں رواج پا جائیں۔ کیوں کہ مغربی طرز زندگی اختیار کرنے سے مغربی صنائین کے کاروبار میں بڑے اضافے کی گنجائش ہے۔ اس نقطہ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے Albert Schweitzer اپنی کتاب The Decay & Restoration of Civilization میں مغربی اقوام کو متنبہ کرتا ہے کہ:-

"ہمیں اپنی مصنوعات کی منڈیوں کے ساتھ اپنی تہذیب کی منڈیاں بھی قائم کرنی ہیں"۔

اور یہی وجہ اس امر کی ہے کہ مغرب زدہ لوگوں کی طرف سے لفظ CULTURE کو اس پورے مطلب و مدعا کے ساتھ من و عن اپنے ہاں رائج کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا ہمیں CULTURE کو انہی معنوں میں اپنا لینا چاہیئے جن میں کہ وہ پیش کیا جاتا ہے۔ یا کہ اس پر کچھ پابندیاں لگا کر اس کو مشرقی مزاج کے مطابق بنانا چاہیئے پیشتر ازیں کہ اس سوال کو سلجھایا جائے۔ ہمیں CULTURE کے اصل و مبدء پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے متعلق کچھ تو بتایا جا چکا ہے۔ مزید تحقیق کے لئے ہمیں ڈاکٹر میر ولی الدین سابق پروفیسر فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی کے مضمون شائع شدہ "ترجمان القرآن" جلد ۳۲ شمارہ ۱ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ موصوف کے نزدیک CULTURE کا لفظ agriculture سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا فعل ہے to cultivate یعنی زراعت کرنا ــــــ لیکن اس پہلی کو

غور کیا جائے۔ تو ایک نہایت ہی دقیق نکتہ واضح ہوتا ہے۔ کہ جس طرح زراعت کے لئے ایک صحیح سالم بیج کی ضرورت ہے۔ اسی طرح انسانی نشو ارتقا کے لئے ایمان کی ضرورت ہے۔ ایمان ہی ان تمام محرکات کا سرچشمہ ہے۔ جو مضر داعیات کو دفع کرتا ہے اور صالح عناصر کو پروان چڑھاتا ہے۔ ایمان کا لفظ انہی معلومہ معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جو اسلام کا مقتضا ہیں۔ جس دل میں قوت عمل کی آب پاشیوں سے ایمان جڑ پکڑ گیا، اس کے نشو و ارتقا کے کوئی حدود نہیں۔ جس قسم کے کردار کی تخلیق ایمان کرتا ہے۔ ان کی تفصیل کے لئے اور مثالوں کی ضرورت نہیں۔ مورخین نے شرح و بسط کے ساتھ ان کی زندگیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

ہماری تہذیب میں اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور چلنے پھرنے سے لے کر کردار کی انتہائی بلندیوں تک کا ضابطہ موجود ہے اس ضابطے کی موجودگی میں کسی غیر ملکی لفظ کو اپنے ادب کا جزو بنا کر سامانِ پریشانی مہیا نہیں کرنا چاہیے۔

لباس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ مغربی لباس میں ملبوس لوگوں کو دیکھ کر اس کا پورا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے اکثر انگریزی خواں دوست اس امر کو معرضِ بحث میں لاتے ہیں۔ کہ اسلام کا [illegible] کردہ لباس کونسا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اسلام کسی خاص خطے قوم یا ملک کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ اس کا مخاطب ہر بنی نوع انسان ہے۔ اسلام کا تقاضہ ایک خاص قسم کے کردار کی تشکیل ہے نہ کہ فیشن پرستیوں اور نفسانی تقاضوں کی غیر محدود تسکین کی اجازت دینا۔ صرف لباس اور خوراک ہی بلکہ ہر دنیوی تقاضے کے سلسلے میں یہ امر ملحوظِ خاطر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ مسلمان کا مقصدِ حیات تو رضائے الہٰی اور عقبیٰ میں سرخروئی کا حصول ہے۔ نہ کہ اس دنیا میں زیب و زینت کی تلاش کرنا۔ اس بات کی تشریح حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں ہوتی ہے:۔

مالی وللدنیا وما انا والدنیا الا کراکب استظل	مجھے دنیا سے کیا سروکار میری مثال تو ایسے سوار کی سی ہے جس نے
تحت شجرۃ ثم راح وترکھا۔	کچھ دیر ایک درخت کے سایہ میں آرام کیا پھر اٹھا اور اسے چھوڑ

کر چل دیا۔

حضرت علیؓ کی تعریف کرتے ہوئے ان کے ایک رفیق یوں لکھتے ہیں:۔

یستوحش من الدنیا وزھرتھا ویستانس باللیل	بہارِ دنیا سے ان کو وحشت ہوتی۔ رات کی تاریکی میں
وظلمتہ کان واللہ غزیز العبرۃ طویل الفکرۃ	ان کا دل لگتا تھا۔ آنکھیں پُر آب ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے
من اللباس ما خشن ومن الطعام ما خشب	ہوئے رفتارِ زمانہ پر متعجب نفس سے ہر وقت مخاطب کپڑا

وہ پسند جو موٹا ہو اور غذا وہ مرغوب جو غریبانہ اور سادہ ہو۔

مندرجہ بالا دو مثالوں سے یہ ظاہر ہے۔ کہ دنیا اور اس کی مبالغہ آمیز زیب و زینت اور ہمارے نفسانی خواہشات اور شیطانی تقاضوں کی تکمیل کو ہماری تہذیب میں کیا مقام حاصل ہے مغربی CULTURE میں آرٹ کے ماتحت جو لوازم مقرر کئے گئے ہیں یعنی مصوری موسیقی اور رقص وغیرہ ان کا ہماری تہذیب میں کہیں وجود بھی نہیں پایا جاتا۔ خدا کا فرشتہ اس گھر میں کبھی داخل نہیں ہوتا۔ دنیا کو تو "مزرعۃ الآخرۃ" فرمایا گیا ہے، اس لئے اُسے نہیں چھوڑا جا سکتا، اسلام میں "رہبانیت" نہیں ہے، پھر دین کی طرح ہمیں دنیا کی بھلائی "(حسنۃ)" کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

کتاب و سنت اور آثارِ صحابہؓ میں جہاں کہیں سے بے رغبتی کا ذکر آیا ہے وہاں اس سے دُنیا کی وہ مبالغہ آمیز زیب و زینت اور بے جا خواہشیں مراد ہیں جو انسان کو خدا اور آخرت سے غافل کرتی ہیں۔ اور آدمی انہی خواہشوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے (م۔ق)

جہاں کتے یا تصویریں موجود ہوں۔ اسلام میں مصوری کے لئے بڑی سخت تہدید موجود ہے۔ اگر کوئی شخص مسلمان کہلاتا ہے۔ اور اس کے بعد حضور کی حدیث کا دلدادہ ہے۔ تو اس کو اپنے مشاغل اپنی ذات تک ہی محدود رکھنے چاہئیں جن کے لئے وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اسے اپنے اس ناجائز فعل کے جواز میں شریعت سے تاویل بازی کا کھیل نہیں کھیلنا چاہئیے۔

اب اگر مشرقی سرمایہ الفاظ کی طرف نگاہ دوڑائی جائے۔ تو لفظ "ثقافت" کو CULTURE کی بجائے استعمال کرتے پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر ان دونوں الفاظ کو ہم معنی تصور کیا جائے۔ تو اسلام میں اس لفظ کی ایزادی خطرے سے خالی نہیں لفظ "ثقافت" کا تاریخی جائزہ اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اس لفظ کا قدیم عربی میں ان معنوں میں مستعمل ہونا نہیں پایا جاتا۔ جن معنوں میں اسے آج کل استعمال کیا جا رہا ہے۔ درصل "ثقافة" اس شکنجے کو کہتے ہیں جس میں ایک جلد ساز نئی جلدوں کو کس کر انہیں سوکھنے کے دوران ٹیڑھا ہونے سے بچاتا ہے۔ ادھر مغربی اقوام نے اپنی تہذیب کے لئے CULTURE کا استعمال شروع کیا۔ تو ادھر جھٹ اس کا ترجمہ ہم عربی لفظ سے کر دیا گیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی زبان میں بالخصوص زبانِ عربی میں ترادفات کا کوئی وجود نہیں۔ کسی شے کی مختلف حالتوں کے بیان کے لئے جو مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں معنوی طور پر وہی فرق پایا جاتا ہے۔ جو ان حالتوں کو مستلزم ہے یعنی جن معانی کے لئے الفاظ وضع کئے گئے ہوں۔ اس لئے یہ بات بادثوق طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ دو لفظ ہم معنی ہوں۔ قریب المعنی تو ہو سکتے ہیں۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ وہ ایک ہی شے کے مختلف اطوار کے اظہار کا ذریعہ ہوں۔ اور ان میں اتحاد و اشتراک باعتبار حالت پایا جائے۔ لفظ ثقافت کے کچھ ہی معنی کیوں نہ ہوں لیکن جو تصور یہ پیش کرتا ہے۔ اس کے متعلق اس تجزیہ کی ضرورت ہے۔ کہ اس کا اصل اطلاق کن حالات و معاملات پر ہونا چاہئیے۔ کیا یہ لفظ ہمارے مروجہ لفظ "تہذیب" کا ہم پلہ ہے یا نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری ضروریاتِ زندگی محض مادیات پر ہی منحصر نہیں۔ اخلاقی لحاظ سے اطمینانِ قلب اور تسکینِ روح کو انسانی زندگی میں مقصدِ اولین کی حیثیت حاصل ہے۔ مادی ضروریات اَن گنت اور خواہشات لامتناہی ہیں۔ لیکن ان کی تکمیل کے لئے ہم جس قدر زیادہ کوشش کریں گے۔ اسی قدر ہم میں اور اس روحانی مقصد میں بُعد ہوتا چلا جائے گا۔ روحانیت کی ضرورت انسان کا اپنا ضمیر ہر آن اس پر ظاہر کر رہا ہے حتیٰ کہ خدائے ذوالجلال کی ذات کی معرفت کے لئے ہمارے انفس و آفاق میں نشانیاں رکھ دی گئی ہیں۔ غیر مذہبی مغربی تہذیب یعنی CULTURE جسے محض مادی تہذیب یا ثقافت کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہماری روحانی ضروریات سے ہمیں یکسر بیگانہ بنا دینا چاہتی ہے۔ دنیا، اس کی زیب و زینت اور اس کے نفسانی خواہشات اور شیطانی تقاضوں کو ہماری تہذیب میں کوئی مقام حاصل نہیں۔

ہماری تہذیب میں شمولیت کی اولین شرط یہ ہے کہ انسانی زندگی کے افعال و کردار اسلام کے احکام اور اس کے اصول و قوانین یعنی اسلامی نظامِ حیات سے پوری طرح مطابقت رکھیں۔ اور وہ انسانی عوامل مبنی بر اوامر و نواہی ہوں۔ جو صالحین امت اور خود سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ حسنہ کا نمونہ ہوں۔ وہی ہماری تہذیب ہے۔ خواہ ہم اسے ثقافت سے موسوم کریں یا کسی اور لفظ سے ـــــ لیکن یہاں یہ بات مدِنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ کہ جو الفاظ شرعی اصطلاحی زبان خداوندی میں وضع ہو چکے ہیں۔ ان کی بجائے ایسے الفاظ کا استعمال جن کا مقصد شرعی الفاظ سے متضاد یا مخالف تصورات پیش کرتا ہو اور خود ان کے معنی بھی مشکوک ہوں ایسے فکر و عمل کی راہیں تبدیل کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ اہلِ یورپ اسی تہذیب یعنی ثقافت سے نالاں ہیں۔ جسے وہ خود CULTURE کے نام سے پکارتے ہیں۔

—×—

جلال الدین
([illegible])

قلعہ "الموت" کی تحقیق!

فاران ماہِ ستمبر سنہ رواں کے صفحہ ۴۴ پر فرقۂ باطنیہ کے قلعہ کے نام کی بابت آپ نے جو تحقیق چاہی ہے اس سلسلہ میں عرض ہے کہ۔

اس قلعہ کا صحیح نام "اَلَمُوت" بروزن "جَبَرُوت" ہے۔ اصل میں اس کا نام "اَلَہ آمُوت" تھا یعنی بہ فتحتین و ہائے مختفی۔ بعدہٗ الف ممدودہ و میم مضموم و واو ساکن اور اخیر میں تائے مثناۃ فوقانی۔ مگر کثرتِ استعمال سے ہائے مختفی اور الف ممدودہ گر کر "الموت" رہ گیا۔

ہر دو امور مندرجہ بالا "برہانِ قاطع" مولفہ محمد حسین دکنی و "دائرۃ المعارف" (مطبوعہ بیروت ۱۸۸۰ء جلد رابع صفحہ ۳۲۱) "نظام الملک طوسی" مولفہ عبد الرزاق کانپوری سے پوری طرح ثابت ہیں۔ برہان میں لفظ "اَلَموت" کے تحت اس کی املا بصراحت دی گئی ہے اور اسی سے صاحبِ غیاث اللغات نے بھی یہی املا اور صاحب جامع اللغات اُردو نے بھی "اَلَموت" ہی لکھ کر نیچے اس لفظ کو دیا ہے۔

دائرۃ المعارف میں اس لفظ کی انگریزی املا بھی دی ہے، اور وہ ہے " ALAMOUT " مگر یہ املا مبہم ہے اس کو جس طرح "اَلَموت" پڑھا جا سکتا ہے اسی طرح "اَلاَموت" اور "اَلاموت" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی کتاب اخیر الذکر میں املا "اَلَمُوت" بھی دی گئی ہے (جو آپ کو المنجد میں بھی ملی) مگر اس املا کا ضعف ظاہر کرنے کے لئے یہ الفاظ لکھے ہیں "وَقَد تُکتَبُ آلَا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متعارف املا صرف "اَلَموت" ہے۔

نظام الملک طوسی میں بے شمار جگہ اس قلعہ کا نام آیا ہے اور ہر موقع پر "اَلَموت" ہی لکھا ہے اور اس کو علاقہ طالقان میں بتا کر بڑی تفصیل سے اس کے حالات لکھے ہیں مگر آپ کو تو صرف نام اور صحیح املا سے بحث ہے۔

برہان۔ دائرۃ المعارف اور نظام الملک طوسی سے اس قلعہ کی وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ پر بہت بلندی پر واقع تھا اور عقاب کے لئے مشہور ہے کہ وہ بڑی بلندی پر بسیرا لیتا ہے اس لئے جب دیلمی نے اس کو فتح کیا تو اس کا نام "اَلَہ آموت" رکھا کیونکہ دیلمی زبان میں "اَلَہ" عقاب کو اور "آموت" آشیانہ کو کہتے ہیں۔ بعد ازاں کثرتِ استعمال سے "ہ" اور "آ" ساقط ہو کر "اَلَموت" رہ گیا۔ نظام الملک اور دائرۃ المعارف میں اور بھی وجہ تسمیہ دی گئی ہے مگر سب میں عقاب اور آشیانہ کا تعلق موجود ہے ——— ایک البتہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک فریق کے نزدیک حسن بن صباح کا قبضہ اس قلعہ پر ۴۸۳ھ میں ہوا تھا اور دوسرے گروہ کے نزدیک ۴۸۳ھ میں اور ہر دو فریق اس بات پر متفق ہیں کہ اس قلعہ کے نام کے اعداد سے حسن کے قبضہ کی تاریخ نکلتی ہے پس جو لوگ اس قلعہ کا نام "اَلَموت" بتاتے ہیں وہ قبضہ کا ۴۸۳ھ میں ہونا کہتے ہیں اور جو "اَلَہ آموت" کہتے ہیں ان کے نزدیک قبضہ ۴۸۳ھ میں ہوا ہے۔

بہر حال قلعہ کا نام "اَلَہ آموت" اور "اَلَموت" دونوں صحیح ہیں اور اب تو صحیح املا "اَلَموت" ہی ہے۔

اگر "اَلاَموت" لکھا جائے تب بھی یہ "اَل" تعریف کا نہیں ہوگا بلکہ لام مفتوح ہوگا اور لام کے بعد کا الف صرف لام کا فتحہ بتانے کو ہوگا
"اس قلعہ کا نام التموت ہو جانا کہیں بھی نہیں ملتا۔ ثمر تو بڑے لکھے آدمی تھے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں صحیح نام معلوم نہ ہو غالباً "الموت" کو "التموت" بنا [illegible]
میں بتنا [illegible]
[illegible]
[illegible] اس کا نام "اَلَموت" لکھا ہے۔　　　واللہ اعلم!

اوراقِ گل

شفقت کاظمی

کبھی جو ترکِ وفا کا خیال آتا ہے
مرا نصیب کہ با وصفِ جستجو نہ ملا
زمانہ اس کی تباہی پہ کس لئے روئے
ترا کرم کہ ہمیں تو نے یاد فرمایا

ترا جمال مجھے آئینہ دکھاتا ہے
وہ راستہ جو ترے آستاں کو جاتا ہے
جو آپ اپنی تباہی پہ مسکراتا ہے
وگرنہ کون فقیروں کے پاس آتا ہے

درد سعیدی

راتوں کو طویل کر گیا ہے
احساسِ سحر، سحر سے پہلے
اتنے بھی قریب سے نہ گزرو
دل چونک پڑے نظر سے پہلے
مقصودِ طلب نہیں ہے منزل
اُٹھتے ہیں قدم نظر سے پہلے

فصیح اکمل قادری

ہماری قوتِ شعر و سخن کی آزمائش ہے
جہاں میں آج گویا اہلِ فن کی آزمائش ہے
سزائے دار ہم سے ناتوانوں کے لئے کیسی
مرے اللہ کیا دار و رسن کی آزمائش ہے؟
زبانِ حال سے کہتی ہے یہ نرگس کی حیرانی
خزاں کے دور میں رنگِ چمن کی آزمائش ہے

بہار کوٹی

وہ تجربے جو غمِ بال و پر میں ہوتے ہیں
چراغِ جادۂ منزل سفر میں ہوتے ہیں
مفر فریب سے ممکن نہیں محبت میں
ہزار زاویے اِک اِک نظر میں ہوتے ہیں
نہ خواب سے نہ فسانوں سے جی بہلتا ہے
بڑے عذاب اُمیدِ سحر میں ہوتے ہیں
بہار میں بھی رہینِ غمِ بہار ہیں ہم
کچھ اہلِ فکر بھی اہلِ نظر میں ہوتے ہیں
اگر سمجھتے تو وہی ہونگے فاتحِ منزل
جو پائمال تری رہگذر میں ہوتے ہیں
یہ کون مژدۂ فصلِ بہار لایا ہے
ہم ان دنوں تو غمِ بال و پر میں ہوتے ہیں
ہزار قلزمِ رحمت ہیں موجزن ان میں
وہ چند اشک جو دامانِ تر میں ہوتے ہیں

ذوقی رامپوری

ہر توجہ میں تغافل کی ادا ہے کہ نہیں
وہی ناقدریٔ اربابِ وفا ہے کہ نہیں
سانولی شام جبیں رات۔ درخشندہ سحر
سچ بتا بندۂ الحاد اخدا ہے کہ نہیں؟
حق ہمارا بھی ہے پھولوں سے لدی شاخوں پر
ہم نے بھی خونِ بہاروں کو دیا ہے کہ نہیں
اے صبا دِل کسی مجبور کا رکھ لیتے ہیں
یہ بتا اس نے مجھے یاد کیا ہے کہ نہیں

احمد حمید

غمِ دولت کہ نہیں ہے غمِ راحت جاں ہے
ہم اہلِ نظر غم کا گلہ کر نہیں سکتے
اے گردشِ دوراں درِ میخانہ سلامت
کیا ہم غمِ پنہاں کی دوا کر نہیں سکتے

—✻—

روح انتخاب

امام ربانی حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

کا

مکتوب شریف

مکتوب (۱۹) میر محب اللہ کے نام　(اتباعِ سُنّت واجتناب از بدعت کی تاکید میں)

بعد الحمد والصّلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ـــــ سیادت پناہ برادرم میر محب اللہ کو لکھتا ہوں کہ اس طرف کے فقراء کے احوال لائق حمد ہیں　میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری سلامتی اور ثابت قدمی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اس عرصے میں تم نے اپنی طرف کے احوال سے مطلع نہیں کیا، مسافت کی دُوری بھی کچھ مانع ہے ـــــ ہماری نصیحت بس یہی ہے کہ احکامِ دین کی پابندی اپنے اوپر لازم قرار دے لی جائے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلّم کی تابعداری اور پیروی ہوتی ہے۔ سُنّتِ سنیّہ کو ادا کیا جائے۔ بدعتِ غیر مرضیہ سے پرہیز ہو اگرچہ بدعت کی روشنی صبح کی طرح کیوں نہ دکھلائی دیتی ہو۔ اس لئے کہ بدعت میں درحقیقت کوئی بھی نور نہیں ہے۔ نہ بیمار کے لئے اُس کے اندر کوئی شفا ہے۔ نہ مرض کے واسطے اس میں کوئی دوا ہے۔ (بدعت میں کیسے کوئی نور ہو جب کہ وہ) دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو وہ سنّت کو اٹھا دینے اور دُور کرنے والی ہے یا اس سے ساکت ہے اگر ساکت ہے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سُنّت سے زائد ایک چیز ہو۔ جب زائد ہوئی تو وہ درحقیقت سنّت کی ناسخ ہوئی۔ لہٰذا بدعت کسی قسم کی بھی ہو سُنّت کو اٹھا دینے والی اور سُنّت کی نقیض ہی ہوگی۔ پس بدعت میں کوئی بھلائی اور حُسن نہیں ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ دینِ کامل اور اسلام پسندیدہ کے اندر پیدا کی ہوئی بدعت میں حُسن کا حکم کہاں سے لگا دیا گیا جب کہ نعمتِ دین مکمل ہو چکی ـــــ ان لوگوں نے یہ نہ جانا کہ دین کے کامل، مکمل اور پسندیدہ ہونے کے بعد بدعت کو تراشنا، حُسن وخوبی سے کوسوں دُور ہے ـــــ حق کے بعد ضلالت وگمراہی کے علاوہ اور کون شے ہو سکتی ہے؟ اگر اہلِ بدعت یہ سمجھ لیں کہ دینِ کامل میں کوئی بدعت نکال کر اُس بدعت کو حسنہ بتانا عدمِ کمالِ دین اور عدمِ اتمامِ نعمت کی اطلاع دیتا ہے۔ تو وہ ہرگز بدعت کو حسنہ قرار دینے کی جرأت نہ کریں!

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَعَلٰى مَن لَدَيْكُم

ترجمہ: مولانا نسیم احمد فریدی

—×—

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم!

میں جن دنوں حیدر آباد دکن پہونچا ہوں، اُن دنوں ڈاکٹر زور ہند آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے۔ ۱۹۳۰ء سنہ ۱۹۳۰ء میں وہ یورپ سے "ڈاکٹریٹ" لے کر واپس ہوئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے! حیدر آباد جانے سے پہلے میں نے اُن کا بس نام سنا تھا، وہاں جا کر اُن کے "کام" سے بھی آشنائی ہوئی، رسالوں میں اُن کے مضامین پڑھے، ادبی محفلوں میں اُن کے چرچے سُنے، جامعہ عثمانیہ کے نامور طلبہ میں شیخ محمد چاند مرحوم کے بعد ڈاکٹر زور ہی کا نام لیا جاتا تھا۔۔۔۔ اس کے بعد دعوتوں، جلسوں، پارٹیوں مشاعروں اور ادبی نشستوں میں ڈاکٹر زور سے ملاقاتیں ہوتی رہیں!

اسے خوش ذوقی سمجھئے یا کمزوری سے تعبیر کیجئے، شاعر خوش شکل انسانوں سے ضرور متاثر ہوتا ہے، ڈاکٹر زور کی شخصیت کے اس رُخ نے مجھے پہلی ملاقات ہی میں متاثر کیا، بات کرتے وقت اُن کا سنجیدہ و شگفتہ تبسم بڑی کشش رکھتا تھا!

غالباً سنہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے، سنگاریڈی میں مشاعرہ تھا، ڈاکٹر زور اُس کے صدر تھے، میں نے اپنی غزل جو مشاعرہ سے دو تین دن پہلے کہی تھی۔ خاص تاثر کے ساتھ سنائی، اس غزل کا ایک شعر یہ تھا:۔

ڈرتا ہوں کہیں پھول کی پتی نہ لچک جائے
شبنم کو جو کرنوں کی کشاکش سے چھڑا دوں

ڈاکٹر صاحب مرحوم اچھے شعر پہ داد دیتے مگر "بیساختہ اور والہانہ" نہیں، متانت و سنجیدگی کے ساتھ! "رُوحِ تنقید" کے مُصنف کی دلچسپی کا انداز سنجیدہ ہی ہونا چاہیے تھا۔

حیدر آباد دکن میں جب ملکی اور غیر ملکی کی تحریک نے زور پکڑا، تو شروع شروع میں اُس سے نواب بہادر یار جنگ مرحوم تک متاثر ہو گئے، مگر اُن کا یہ ذہول بہت جلد دُور ہو گیا اور پھر وہ اسلامی اخوت کے نقیب بن گئے! ملکی اور غیر ملکی کی یہ تحریک وطنی عصبیت کو اُبھارتی رہی، اور بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک جا پہونچی کہ بابائے اُردو مولوی عبد الحق اور خود انجمن ترقی اُردو "غیر ملکی" ہونے کے سبب اس لپیٹ میں آگئے! ڈاکٹر زور "ادارۂ ادبیات اُردو" کے بانی اور رُوحِ رواں تھے، حیدر آبادی ادیبوں کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو اپنے ملک کے ادارہ کی ترقی و توسیع پر پوری توجہ دینی چاہیے! مگر مولوی عبد الحق کی شخصیت سچ مچ کوہِ گراں ثابت ہوئی، اور یہ اوچھے وار اُن کا اور انجمن ترقی اُردو کا کچھ بگاڑ نہ سکے!

جن دنوں حیدر آباد دکن میں یہ کش مکش برپا تھی۔ ڈاکٹر زور کی طرف سے میری طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا، مگر تقسیم ہند کے بعد ڈاکٹر زور مرحوم نے ہندوستان میں اُردو زبان و ادب کی ترقی اور بقا کے لئے جو کوششیں کی ہیں اور جو کارنامے انجام دیئے ہیں، انھوں نے اس تکدر کو نہ صرف یہ کہ زائل کر دیا بلکہ اُن کی عزت اور محبت میرے دل میں ڈال دی، اور اُن کی ذات اور شخصیت سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔

"فاران" میں تبصرے کے لئے ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں آتیں، تو کبھی کبھار ڈاکٹر زور مرحوم کا عنایت نامہ بھی آجاتا یا

پھر ڈاکٹر صاحب کے معتمد علیہ نائب اور دست راست خواجہ حمید الدین شاہد کے خطوں سے پیام و سلام کا سلسلہ جاری رہتا۔ ہندوستان کی "ساہتیہ اکیڈیمی" نے جب اردو شعراء کا تذکرہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تو ڈاکٹر زور کو یہ کام سونپا گیا۔ انھوں نے شعرائے کرام اس تذکرے کے لئے میرا کلام اور حالاتِ زندگی بھیجنے کے لئے مجھے لکھا اور میں نے اُن کے حکم کی تعمیل کردی۔ یہ "تذکرہ" تو مجھے دیکھنے کو نہیں ملا مگر اس پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں، وہ میں نے پڑھی ہیں بعض تنقیدیں جتنی معقول تھیں اُس سے زیادہ سخت تھیں۔

ماہنامہ "شاعر" جو تقسیم ہند سے قبل ارض تاج سے طلوع ہوتا تھا۔ اب بمبئی سے نکلتا ہے۔ جناب اعجاز صدیقی کو ہزار آفریں کہ وہ اپنی مسلسل بیماری اور طرح طرح کی پریشانیوں کے باوجود قصر الادب اور ماہنامہ "شاعر" کی روایتوں کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ انہی کی دعوت بلکہ اصرار پر مجھے گزشتہ سال (۱۹۶۱ء) بمبئی جانا پڑا۔ "شاعر" کا سی سالہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ ادبی مذاکرہ بھی ہوا اور مشاعرہ بھی! مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر زور مرحوم نے فرمائی!

بمبئی میں میرا قیام حکیم مرزا حیدر بیگ (مالک حیدری دواخانہ) کے یہاں تھا۔ ڈاکٹر زور اپنی محبت سے مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ ڈاکٹر مظہیر الدین مدنی اُن کے ہمراہ تھے۔ اُن سے مل کر ایسا محسوس ہوا جیسے حیدرآباد دکن کے تمدن و تہذیب اور مسلمانوں کی اقبال مندی کی تاریخ مجسّم ہوکر سامنے آگئی ہے، ہائے! کتنی بہت سی چوٹیں اُبھر آئیں اور کتنے زخم ہرے ہوگئے!

حکیم مرزا حیدر بیگ صاحب نے ڈاکٹر زور کو کھانے پر بلایا، اُسی دن جناب لطفی رضوانی اور اُن کے بعض احباب کے زیرِ اہتمام مہالکشمی کے قریب ایک بنگلہ میں مخصوص شعری نشست کا انتظام تھا، اور ساتھ ہی پرتکلف عشائیہ بھی تھا! میرے لئے بڑی مشکل تھی دونوں دعوتوں میں شریک ہونا ضروری تھا۔ اس مشکل کو میں نے اس طرح حل کیا کہ یہاں نمکین کھانوں سے لطف اندوز ہوا اور حکیم صاحب کے یہاں میٹھا کھایا اور چائے پی! پھر ہم حکیم صاحب کے مکان سے مہالکشمی آئے، ڈاکٹر زور مرحوم نے سامعین کی درخواست پر کرسیٔ صدارت کو شرف بخشا اور مشاعرہ کا آغاز ہوگیا، احباب نے میری ہی خاطر یہ سب کچھ اہتمام کیا تھا۔ اس لئے شعر خوانی کا زیادہ تر بار مجھی کو اٹھانا پڑا، رات بھیگنے لگی، برآمدہ جہاں سامعین کی نشست تھی، ہرے بھرے پودوں اور سبزے کے بالکل محاذ میں تھا۔ ہوا رفتہ رفتہ اتنی خنک ہوگئی کہ ڈاکٹر زور کو تو اونی دُلائی اوڑھنی پڑی! موسم کی خنکی اور شعروں کی گرمی کا امتزاج بڑا ہی پُرلطف اور شوخ ہوتا ہے، ڈیڑھ دو بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہوئی! ڈاکٹر زور مرحوم سے یہ میری آخری ملاقات تھی!

چند دن ہوئے میں اپنے مکان میں بیٹھا ہوا مضمون لکھ رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی میں نے رسیور اٹھایا۔

جی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں آہستہ سے بولا

میں حمید الدین شاہد بول رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ آواز آئی

السلام علیکم! ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

آج کا اخبار "جنگ" کیا آپ نے نہیں پڑھا۔ ڈاکٹر زور کا کشمیر میں انتقال ہوگیا۔۔۔۔۔۔ خواجہ حمید الدین شاہد نے فرمایا اور اس خبر کو سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ دل و دماغ کو سخت دھچکا لگا۔ ہندوستان میں اردو پر جو وقت آن پڑا ہے، اُس کی مظلومیت اور غریب الوطنی کی پرچھائیاں اُبھر کر سامنے آگئیں اور فضا میں دُھندسی چھا گئی۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نسباً رفاعی خانوادۂ تصوف سے تعلق رکھتے تھے، جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کے امتحان میں بڑی شان سے کامیابی حاصل کی کہ یونیورسٹی میں اول آئے، پھر انھوں نے یورپ جاکر لسانی تحقیقات اور صوتیات میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، جامعہ عثمانیہ میں انھوں نے تقریباً تیس سال تک شعبۂ اُردو کے صدر و نگران کی حیثیت سے کام کیا اور طلبہ میں مقبول و ہردلعزیز

وہ دلچسپ تحقیق و جستجو کی کتابوں کے مصنف اور مولف تھے۔ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان غزل گو (محمد قلی قطب شاہ) کا تفصیلی تعارف مرتب کرایا۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے ڈاکٹر زور کی سرپرستی اور نگرانی میں اُردو زبان و ادب کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اُس سبب ڈاکٹر زور کا نام اُردو کے محسنوں کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔

کوئی شک نہیں تقسیم ہند سے قبل بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اُردو کے لئے جو کچھ کیا وہ اُن کا لازوال کارنامہ ہے مگر پاکستان بننے کے بعد اُن کی پیرانہ سالی کے سبب انجمن ترقی اُردو پاکستان اور اُردو کالج کو جس خارزار سے گزرنا پڑا۔ اُس کے تذکرے سے دل اُکتا ہوتا ہے! اس کے مقابلہ میں ڈاکٹر زور نے پندرہ سال کی اس مدت میں اُردو زبان و ادب کی بقا اور ترقی کے لئے جو کوششیں کیں اُن کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ انھوں نے اُردو کے ہر خدمت گزار اور محب کو سینہ سے لگایا اور سب کو جوڑے اور ملائے رکھا۔ انتشار، اختلاف اور نفسا نفسی نہیں! ایوانِ اُردو کی شاندار عمارت۔ ادبیاتِ اُردو کے کتب خانے، ماہنامہ سب رس کی فائلوں اور ادارہ کی شائع ہونی کتابوں کو اُردو کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ایک نظر دیکھا تو وہ مرعوب ہو کر رہ گیا! شمالی ہند میں ڈاکٹر زور نے اُردو کی ساکھ کو گرنے نہیں دیا بلکہ اُسے بہت کچھ اونچا کر دیا!

سال سوا سال ہوا کہ ڈاکٹر زور مقبوضہ حکومت کشمیر کے محکمۂ تعلیمات میں شعبۂ اُردو کے صدر اور مشیر مقرر ہوئے تھے اور ان عارضی کی ایک فصلِ بہار ہی دیکھنے پاتے تھے کہ اُردو زبان کا یہ مجاہد شاہ بلوط، دیودار اور چناروں کے سایہ میں ایسی نیند سو یا کہ قیامت ہی کے دن آنکھ کھلے گی! اللہ تعالیٰ اُس کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے اور آخرت میں شفاعت و مغفرت نصیب ہو! (آمین)

—×—

قابل اجمیری مرحوم

غزل سرا بھی رہا، ذکرِ یار بھی نہ کیا (قابل)

اجمیر شریف میں مشاعرہ تھا، یہ اب سے سترہ (۱۷) سال پہلے کی بات ہے، اسی سلسلہ میں میرا وہاں جانا ہو گیا حکیم نصیرالدین ندوی جن کا نظامی دواخانہ کراچی میں خاصی شہرت رکھتا ہے، اُن سے پہلی ملاقات اسی مشاعرے میں ہوئی، مشاعرے کے دوسرے دن صبح ہی حکیم صاحب موصوف میری قیام گاہ پر تشریف لائے، اور اصرار کر کے اپنے یہاں لے گئے!

ایک دن شام کو چند احباب کے ساتھ میں حکیم نصیر میاں کے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں تین چار نوجوان آئے، علیک سلیک کے بعد معلوم ہوا ان میں سے ایک صاحب بولے کہ میں فلم لائن میں جانا چاہتا ہوں، آپ اس سلسلہ میں میری مدد کریں! میں نے اس پر لمبا لیکچر دے ڈالا کہ میں فلمی دُنیا سے کنارہ کش ہو چکا ہوں، اس لائن میں کوئی شک نہیں دھن برستا ہے، روپیہ پیسہ کی بڑی ریل پیل رہتی ہے، شہرت کا لطف اور عیش میسر آتا ہے لیکن اخلاقی اعتبار سے آدمی گھاٹے ہی میں رہتا ہے اور شاعر کی شعریت اور ادیب کی ادبیت کو نقصان پہونچتا ہے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس چکر میں نہ پڑیں، رزق کے لئے اور بہت سی راہیں کھلی ہوئی ہیں!

اس پر وہ نوجوان ایک خاص تاثر کے ساتھ بولا:—

"یہ تو میری موت اور زندگی کا سوال ہے، مجھے اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو خودکشی کر لوں گا۔"

اس پر سب لوگ مسکرانے لگے، اور اس نوجوان کی یہ گفتگو جب بھی ہماری بے تکلف صحبتوں میں دہرائی جاتی، تو سننے والے [illegible] مسکرا دیتے اور کوئی کوئی من چلا قہقہہ بھی لگا دیتا۔

اس واقعہ کے دو ڈھائی سال بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی، پاکستان بنا اور اس طرح بناکہ مسلمانوں کو آگ اور خون کے دریا سے گزرنا پڑا۔ اسے ہجرت سمجھئے یا فرار کہئے میں بھی وطن عزیز کو چھوڑ کر کراچی آگیا۔ کس بے سروسامانی کے عالم میں گھر سے بے گھر ہوئے مگر ———

یہ کہہ کے چل دیجئے کہ خدا کارساز ہے

اللہ تعالیٰ کی کارسازی اور اس کی بندہ نوازی کے قربان جائیے سب کام بنتے اور تمام سلسلے جڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ماہنامہ فاران بھی شائع ہونے لگا! انہی دنوں دفتر "فاران" میں ایک صاحب تشریف لائے، اور کہا کہ میں اجمیر کا رہنے والا ہوں، قابلؔ تخلص ہے آپ سے حکیم نصیر میاں کے مکان پر ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی شکل وصورت اور چہرے مہرے کی یاد جو چار پانچ سال کی مدت میں دھندلی پڑ گئی تھی اور دب سی گئی تھی ان کے یاد دلانے پر ایکا ایکی ابھر آئی۔ انھوں نے پھر اپنی کئی غزلیں سنائیں، ان کے کلام کو سن کر ایسا معلوم ہوا کہ یہ تو آہنگ ہی عجیب ہے اور شاعر کی پیشانی سے سچ مچ "ستارۂ ہوش مندی" طلوع ہو رہا ہے، اب نہ وہ [illegible] کا تذکرہ تھا نہ اس قسم کی کوئی ادبیات تھی۔ سنجیدہ گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں شائستگی کا انداز! ان سے مل کر طبیعت نے مسرت بلکہ قربت [illegible] سی محسوس کی!

حیدرآباد پہونچ کر انھوں نے خط لکھا، غزل بھیجی، اور اس طرح خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا، پھر وہ کراچی تشریف لائے تو "حالِ زار" تشریف لائے کہ منہ سے خون آتا تھا، دو چار قدم چلتے تو لڑکھڑا جاتے۔ آواز بہت ہی کمزور اور نحیف ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر باتفاق رائے "دق" (T. B) تجویز کر چکے تھے! اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا! "برا ہے عاشقانِ بر شاخ آہو" والا معاملہ تھا!

قابلؔ اجمیری کئی مہینے دفتر "فاران" میں رہے، میرے چھوٹے بھائی (مسرور) نے ان کی بڑی دلسوزی کے ساتھ ٹہل اور تیمارداری کی جب وہ حیدرآباد کو واپس گئے ہیں تو ان کی حالت بہتر تھی۔ [illegible] بھی ایک حد تک افاقہ تھا اور اپنے قوا میں بھی وہ پہلے کے مقابلے میں توانائی محسوس کرنے لگے تھے۔

ڈاکٹروں نے بعض امراض کی "چھوت" سے بڑا ڈرا رکھا ہے، مگر قابلؔ اجمیری کی تیمارداری اور بیماری کے تجربے نے اس چھوت کو بھی ایک وہم ثابت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے گھر کے ایک فرد کو بھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور دق کا ایک جرثومہ بھی کسی دوسرے کو متاثر نہ کر سکا۔

حیدرآباد میں چند دن تو وہ اچھے رہے، مگر پھر مرض عود کر آیا، دق کے مریض کے لئے دوا کے علاوہ سب سے پہلی چیز جو چاہئے وہ اچھی خوراک ہے! اس کا بھی اللہ تعالیٰ کے کرم سے کچھ دنوں کے لئے بندوبست ہوگیا، اس کارِ خیر میں سب سے زیادہ حصہ جناب اسمٰعیل احمد نعیم عثمانی نے لیا، خود بھی مدد کی اور اپنے احباب سے بھی رقمیں بھجوائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ قابلؔ اجمیری اپنے کلام کی بدولت خاصے متعارف ہو چکے تھے اور لوگوں کے دلوں میں انھوں نے عزت و محبت کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اخبارات میں ان کے لئے اپیلیں شائع ہوئیں کہ حکومتِ پاکستان کو اس جوہر قابل کی مدد کرنی چاہئے [illegible] [illegible] جو ان دنوں پاکستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تھے قابلؔ اجمیری کے علاج اور گزر بسر کے لئے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور کراچی کے ادیبوں کے ساتھ جمع آ [illegible]

ماہانہ وظیفہ [illegible] کیا ـــــ مگر اس اعلان کو عمل میں لانے کی توفیق میسر نہ آسکی، خود قابل صاحب اور اُن کے ہمدرد بس وقتی طور پر خوش ہو کر رہ گئے! مارشل لا کے دور میں البتہ اتنا ہوا کہ رائٹرز گلڈ کی سفارش پر محترم صدر پاکستان نے ان کے علاج کے لئے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ مرحوم کوئٹہ سینی ٹوریم میں داخل ہوئے اور وہاں سے خاصے توانا اور صحت مند ہو کر واپس ہوئے!

قابل اجمیری شاعر تھے اور شاعر کی زندگی کو کسی نہ کسی عنوان سے "رومان" سے ضرور سابقہ پڑتا ہے، قابل مرحوم کے کردار کی یہ خوبی تھی کہ اُن کے "رومان" کا انجام بخیر ہوا، ایک عیسائی نرس کو اُن کی شریکِ زندگی بن کر ایمان و اسلام کی سعادت نصیب ہوئی اُن کے دو سال پسندیدہ بیوی کی رفاقت میں مسرت و اطمینان کے ساتھ بسر ہوئے، اور اب سے چند مہینے پہلے بچے کی ولادت نے مودت و محبت کے اس رشتہ کو قوی تر بنا دیا۔

اسی سال اگست کے مہینہ میں ٹنڈو آدم میں جناب ورد سعیدی کے زیرِ اہتمام مشاعرہ ہوا۔ قابل اجمیری مرحوم سے آخری بار اسی اجتماع میں ملاقات ہوئی، انھوں نے سامعین کے اصرار پر کئی غزلیں[1] سنائیں! مشاعرے کے بعد مجھ سے دیر تک گفتگو کرتے رہے، اس گفتگو میں انھوں نے حیدرآباد کے چند شاعروں کے نام لے کر گلہ کیا کہ وہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں اور اُن کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم ہو چکا ہے، جام شورو کے کسی مشاعرے کی روداد بھی انھوں نے سنائی۔

قابل اجمیری اب شہرت اور ہر دلعزیزی کے اُس دور سے گزر رہے تھے کہ رسالوں اور اخباروں میں اُن کی غزلیں اہلِ ذوق تلاش کر کے پڑھتے تھے، شعر و ادب کی محفلوں میں اُن کا چرچا ہوتا تھا۔ غزل میں اُن کی انفرادیت کو بڑے بڑے اساتذہ اور فنکار تسلیم کرتے تھے، شاعرانہ شہرت کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر اُن کی حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی ـــــ انھوں نے تغزل کے جس باغ کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا، اُس کی بہار سے لطف اندوز ہونے کا وقت آیا، تو موت نے اُن کی کتابِ زندگی پر خاتمہ کی مہر لگا دی ـــــ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے (آمین)

—×—

[1] قابل مرحوم کی غزل کا ایک شعر یاد رہ گیا: ـــ

میں نے اُس کے لب و رخسار کو چھو کر دیکھا
حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

اسی مشاعرے میں ایک شاعر کی غزل کے مطلع نے مشاعرے کو لوٹ لیا۔

ٹھہر بھی جا درِ ساقی پہ دو گھڑی کے لئے　　تمام عمر پڑی ہے روا روی کے لئے

افسوس ہے کہ ان کا تخلص یاد نہیں رہا، جب یہ صاحب اسٹیج پر آئے تو قابل مرحوم نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ان کو سنئیے"!

ہماری نظر میں!

ة الحدیث

مولف :- مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو، اعظم گڑھ)

ضخامت ۲۱۴ صفحات ، قیمت دو روپے آٹھ آنہ ،

ملنے کا پتہ :- مفتاحی بک ایجنسی مئو، ضلع اعظم گڑھ (بھارت)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اب سے چھ سال پہلے شائع ہوا تھا، جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن "جدید مقدمہ" کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے، ظاہری ہیئت (GET UP) کاغذ، کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب دیدہ زیب ہے۔ "نصرۃ الحدیث" کے فاضلانہ مقدمہ نے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے "خطبات مدراس" کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اس میں حدیث کے مستند حوالوں کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ عہدِ رسالت، دورِ صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانوں میں احادیثِ نبویؐ کو نہ صرف سینوں میں بلکہ ... میں محفوظ رکھا گیا ہے، اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ احادیثِ نبویؐ دو سو سال کے بعد لکھی گئی ہیں، وہ جھوٹ بکتا ہے!

احادیثِ نبویؐ کو مجروح کرنے اور انہیں (معاذ اللہ) ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لئے منکرینِ رسالت جو وسوسے مسلمانوں کے دلوں میں ... ہیں، اور جو نکتے تراش رہے ہیں اس کتاب نے ان کا نہ صرف ازالہ کیا ہے بلکہ اس قسم کے تمام شیطانی وساوس اور منافقانہ ... کی کاٹ کر رکھ دی ہیں ـــــ اس دور کا ایک منافق جو ادب و صحافت کی دنیا میں "ملّا حق گو" کے نام سے مشہور ہے، اس کے ... الزام کے فاضل مؤلف نے پرخچے اڑا دیئے ہیں!

"نصرۃ الحدیث" کے مطالعہ سے احادیثِ رسولؐ کی اہمیت، افادیت، ضرورت بلکہ اس کے منصوص ہونے پر دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ کتاب کا ایک ایک ورق ایمان افروز ہے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر اور اجرِ جزیل عطا فرمائے کہ ... نے اس دور کے سب سے بڑے فتنہ (انکارِ حدیث) کا رد فرمایا ہے، اور ان کے قلم نے "عصائے موسویؑ" بن کر ان فرعونی ... کو توڑا ہے!

ان الحجاج

از :- مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ضخامت ۲۳۲ صفحات ، قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے ـــــ غیر مجلد :- تین روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ :- مکتبہ اعظمی مئو، ضلع اعظم گڑھ (بھارت)

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء کرام، خلفاء راشدین، صحابہ، تابعین اور علماء و صلحاء کو حج بیت اللہ سے کس قدر شغف رہا ... نفوسِ قدسیہ فریضۂ حج ادا کرنے ہی پر کفایت نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بار بار حج اور عمرے کئے ہیں! اور صدیوں تک ... کی تحصیل و اشاعت سفرِ حج کے ذریعہ ہوتی رہی ہے۔

تاریخ اسلام کے بلند پایہ حجاج کے حالات جس دل نشین انداز میں جمع کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے ... مؤلف نے بجا شکایت کی ہے کہ "منکرینِ حدیث" کا یہ رسالہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی زندگی میں ان کے "شانِ ... لیس" میں طبع ہوا ہے ـــــ حیرت بھی اور افسوس بھی! (م-ق)

اور حسن شفقت میں اضافہ ہوتا ہے! اس کتاب کو پڑھتے ہوئے خود ہمارے دل و دماغ کو جلا اور پاکیزگی محسوس کی اور دینی معاملات میں اپنے تساہل و تغافل کا احساس ہوا، اور مطالعہ کے دوران ضمیر مسلسل چٹکیاں لیتا رہا۔

"۔۔۔ابراہیم نے کہا اچھا اپنی ساری رقم اس پر انڈیل دو" (ص ۱۲۱)

"الٹ دو" لکھنا چاہیے تھا۔ "انڈیلنا" کسی رقیق شے کو ایک ظرف سے دوسرے ظرف میں گرانے اور ڈالنے کے معنی میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔
حضرت الیاس و حضرت خضر کا حج کے موقعہ پر ایک دوسرے سے ملنا اور بعض اولیاء اللہ کا حضرت خضر سے ملاقات کرنا، یہ واقعات زیادہ تر "قصہ و حکایت" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فاضل مصنف کو پوری تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کہنی تھی یا پھر اس کا ذکر ہی نہ کرتے!

"۔۔۔عیسائی قحط کے وقت آپ (یعنی حضرت ابوایوب انصاریؓ) کے مزار کی طرف رجوع کرتے تھے، اُس کی برکت سے بارش ہو جاتی تھی۔۔۔" (صفحہ ۵۷)

عیسائیوں کے اس مشرکانہ فعل کا تذکرہ اگر کسی کتاب میں ملتا ہے، تو اُس کے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ اُس سے قبر پرستوں کو شہہ ملے گی!

"اعیان الحجاج" اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے مفید اور بلند پایہ کتاب ہے! مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اس کا پیش لفظ لکھا ہے، جو مختصر ہے مگر خوب ہے!

خدا ہے

از:۔ سید حامد علی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت فی نسخہ ۳۲ نئے پیسے۔ قیمت سالانہ تین روپے پچیس پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ شہادتِ حق، ذکاتی محلہ، بریلی (یو۔پی)

یہ کتاب نہیں کتابچہ ہے مگر اس کوزے میں سچ مچ دریا سمویا ہوا ہے۔ سید حامد علی صاحب نے وجودِ باری پر جو عقلی دلائل پیش کئے ہیں، وہ دل و دماغ پر یقین و اطمینان کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ــــ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ:۔

- ــــ صانع مصنوعات کے اندر نہیں پایا جاتا۔
- ــــ صانع کو ہم عقل سے جانتے ہیں۔
- ــــ کائنات واہمہ کی پیداوار نہیں ہے۔

ــــــــــــ اور ــــــــــــ

- ــــ نہ کائنات ازلی و ابدی ہے اور نہ مادہ!
- ــــ "کائنات اتفاق سے پیدا نہیں ہوئی اور نہ اتفاقات کے بل بوتے پر چل رہی ہے، ایک خالق و منتظم اور منصوبہ ساز ہستی کا وجود خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اس کو ہم "خدا" کہتے ہیں۔"

اس دورِ تشکیک و الحاد میں یہ کتابچہ زیادہ سے زیادہ اشاعت کا مستحق ہے!

اسلام اور مسیحیت

از:۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم، ضخامت ۲۳۲ صفحات، قیمت:۔ دو روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:۔ مولانا محمد رمضان اے/۲۵۹ راسی شاہ عالمی گیٹ لاہور

برکت اللہ نام کے ایک پادری نے مسیحیت کی تائید اور اسلام کی تردید میں تین کتابیں ــــ توضیح القرآن، مسیحیت کی عالمگیری اور دینِ فطرت ــــ لکھی تھیں، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری نے ان کا جواب دیا۔ اور ایسا جواب دیا۔ جو اپنی جگہ

مسکت بھی ہے، دندان شکن بھی ہے اور مطمئن کن بھی ہے! مولانا مرحوم نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دین فطرت مسیحیت نہیں "اسلام" ہے!

صحبت صالح ترا صالح کند	صحبت طالح ترا طالح کند (صفحہ ۴۲)

یہ کتابت کا سہو ہے کہ "صالح" (حائے حطی کے ساتھ) کی جگہ "طالح" چھپ گیا۔

دختراں راہمہ جنگ است و جدل با مادر	پسراں راہمہ بدخواہ پدر می بینم (ص ۱۴۳)

اس شعر کو امیر خسرو دہلوی سے منسوب کیا گیا ہے، حالانکہ یہ مشہور شعر حافظ شیرازی کا ہے۔

"۔۔۔ یہ انجیلی جواب اپنے اندر جو تلخی رکھتا ہے، وہ جامع مسجد دہلی کے کبابوں سے بھی زیادہ ہے"۔ (صفحہ ۱۸۰)

دلی کی جامع مسجد کے کباب تلخ نہیں چٹ پٹے ہوتے ہیں۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم مسرور بیٹھے ہیں (ص ۲۰۲)

حیرت ہے کہ "بیزار" کی جگہ "مسرور" فاضل مصنف کو کیسے یاد رہ گیا۔

کوئی شک نہیں مسیحیت کے باطل عقائد کو مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بیچ چوراہے پر ننگا کر دیا ہے۔ ہائے وہ احمق اور نادان لوگ جو ان بے سروپا معتقدات کا اثر قبول کرتے ہیں! جمعیۃ اہل حدیث نے اس کتاب کو شائع کر کے، وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے!

ترتیل القرآن

تالیف :۔ خدیجہ بنت "سیدنا" طاہر سیف الدین۔ ضخامت ۴۸ صفحات (مکاتیب کیلئے نمونہ بلاقیمت صرف پوسٹیج کے آٹھ نئے پیسے بھیج کر منگوایا جا سکتا ہے)

• ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامع لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، جے جے ہسپتال بمبئی نمبر ۳!

جناب طاہر سیف الدین، بوہرہ جماعت کے امام اور قائد ہیں۔ انہی کی صاحبزادی محترمہ خدیجہ خاتون نے یہ کتاب تالیف کی ہے جس میں فن ترتیل کے آسان اور ضروری قاعدوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

قرآن کریم کو بہت کم لوگ ترتیل و تجوید کے ساتھ پڑھتے ہیں، عوام کو چھوڑیئے بہت سے علماء تک فن قرأت سے ناواقف پائے گئے!

وقف کے کیا قواعد ہیں؟ ادغام، اظہار اور اخفاء قرأت میں کس طرح کیا جاتا ہے؟ مد کسے کہتے ہیں؟ ص، ز، س، ذ اور ث کے پڑھنے کے کیا طریقے ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتابچہ میں ملتی ہے!

"ترتیل القرآن" میں نہایت ہی سہل اور آسان انداز میں ترتیل کے قاعدے بیان کئے گئے ہیں! "ادارۂ ثقافت اسلامیہ" اس پہلی پیش کش پر مبارکباد کا مستحق ہے!

قرآنی نظریہ حیات

از :۔ صاحبزادہ محمد عمر، ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت بارہ آنے۔
ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ تصوف، موہنی روڈ، نظام بلڈنگ لاہور۔

اس کتابچہ میں اس مفہوم کو پھیلا کر بیان کیا گیا ہے :۔

"معلوم نہیں دنیا نے آج تصوف کو کیوں اسلام کے سوا کچھ اور سمجھ رکھا ہے، جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے۔ تصوف اسلام کی روح کے سوا کچھ نہیں ہے۔۔۔" (ص ۱)

صفحہ پر "تربیت ذاتِ اقدس" کے عنوان کے تحت یہ عبارت پڑھنے میں آئی: ـ

"اور اس کے بعد خود ذاتِ اقدس اپنے خاص بندے کی تربیت اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں لہذا براہِ راست الہامات اور کشف اور رویائے صادقہ سے تربیت شروع ہوتی ہے، یہاں تک کے تمام مراحل بشریت سے نکل کر جیسے پہلے لکھا ہے سراسر بندۂ مولیٰ کریم ہوجاتا ہے اور "بی یسمع وبی یبصر" مجھ سے سنتا ہے اور مجھ سے دیکھتا ہے، کا کامل نمونہ بن جاتا ہے' اور حق الیقین تک پہونچ جاتا ہے' اس وقت شاہِ ولایت کی نوری خلعت اور قبولیت عام سے سرفرازی بخشی جاتی ہے' اور دنیا کے منہ اس طرف پھیر دیئے جاتے ہیں، اور چھوٹے بڑے کا مرکز توجہ ہوجاتا ہے' اور ایک دنیا، اس سے فیض ظاہری و باطنی اٹھاتی ہے اور نیکی بدی کا مالک خیال کیا جاتا ہے ــــ"

"مراحل بشریت سے نکل جاتا" یہ کس قدر غلط اور خلجان میں ڈالنے والا فلسفہ ہے' بندہ چاہے وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو، ہر حال میں "بشر" اور "عبد" ہی رہتا ہے! اُس وقت بھی جب وہ "قاب قوسین او ادنیٰ" کے مقام پر فائز ہوتا ہے ــــ پھر یہ "شاہِ ولایت" کون سا دینی عہدہ ہے، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے!! سب سے زیادہ گمراہ کن بات اس عبارت میں یہ کہی گئی ہے کہ ــــ "نیکی بدی کا مالک خیال کیا جاتا ہے"۔

یہ عقیدہ اور تصور قرآن کریم کی اس آیت کی نفی اور تردید کرتا ہے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے کہلوایا گیا ہے: ـ

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ـــ

یہ اولیاء اللہ کی روحوں اور قبروں سے جہلا ما استمداد کرتے ہیں، اُس کے ثبوت میں یہ کہنا: ـــ

"حضرت سلیمانؑ کے اس کہنے پر کہ کون ہے تم سے اس کے آنے سے پہلے اس کا تخت میرے سامنے لائے، قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِیْ بِعَرْشِهَا سے مسئلہ استمداد حل ہوجاتا ہے (ص۵۵)

کس قدر پوچ بات اور غلط فہم کا استدلال ہے! نبی اور رسول بھی عام انسانوں کی طرح زندگی کی ضروریات رکھتے تھے، اور ان میں لوگوں سے مدد لیتے تھے' یہ "مدد" دین و شریعت اور عقل عمومی کے عین مطابق ہے، لیکن جہلا ء جو ارواح کو مدد کے لئے پکارتے اور ان کی دہائی دیتے ہیں' یہ سراسر خلاف شریعت ہے!

میلادالنبیؐ

ڈاکٹر شیخ علیم الدین قادری ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت: ـ ۵۰ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ: ـ ادارہ مدینۃ العلم ۲۳ زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۱

مولانا فضل رسول بدایونی کا فتویٰ

پر

مولانا فضل رسول (سیف المسلول) عثمانی بدایونی اس نسبت سے خاص شہرت رکھتے ہیں کہ انھوں نے "احیاء سنت اور امحاء بدعت" کی مقدس تحریک کی بنا قلم سے مخالفت کی اور اس پر "وہابیت" کی تہمت دھر کر بدنام مطعون کیا! انہی مولانا فضل رسول صاحب کی خدمت میں ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ نے سوالنامہ بھیجا جس [illegible]

میلاد، قیام، طعام وشیرینی پر فاتحہ دینے اور اولیاء اللہ سے مدد چاہنے کے بارے میں دین متین اور شرع متین کی رُو سے استفتاء کیا مولانا فضل رسول بدایونی ان تمام عقائد اور رسوم پر نہ صرف عامل بلکہ اُن کے پُر جوش مبلغ تھے، اس لئے اُن سے ان تمام بدعات کی تائید کے علاوہ اور کسی بات کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کا ذکر سعادت ونجات کا باعث ہے۔ یہ ذکر تو ہمیشہ ہوتے رہنا چاہیے کہ حضورؐ کی مقدس زندگی انسانیت کے لئے کامل ترین نمونہ ہے، گفتگو اس میں کی جاتی ہے کہ بارہ ربیع الاول کو "یوم میلاد" منانا یا سیرت کے ہر جلسہ کو "مولود" کا نام دینا، کہاں تک صحیح ہے! کتاب وسنّت اور آثارِ صحابہ میں اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی، اس فتویٰ میں بھی کتاب وسنّت اور آثارِ صحابہ سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی، ہاں! صاحب مواہب لدنیہ، ابوشامہ، ظہیرالدین، منصور بشا وغیرہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ چونکہ اصل عبارتیں نہیں دی گئیں، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ ان بزرگوں نے "محفلِ میلاد" کے بارے میں کیا لکھا ہے؟!

"علامہ فاکہانی نے شیخ جلال الدین سیوطی کا کلام نقل کیا کہ میلاد شریف کو ملک عادل نے ایجاد کیا، اور اس کے ذریعہ خداوند تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرنا چاہی، پھر اس کے پاس علماء وصلحاء کی جماعت حاضر ہوئی، سب نے بالاتفاق بغیر کسی اختلاف کے محفلِ میلاد کو پسند کیا۔" (ص)

ایک بادشاہ کی "ایجاد" کو "دین" بنادینا، یہ "بدعت" نہیں تو اور کیا ہے؟ بادشاہ وقت کی اس "ایجاد" پر بعض علماء وصلحاء کا نکیر نہ کرنا، اس کے مستحسن ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا! پاکستان کی صورتِ حال آج ہمارے سامنے ہے کہ بعض بدعات پر حکام کا اسباب اقتدار کر رہے ہیں، علماء عام طور پر سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں، تو کیا علماء کا یہ سکوت ان "بدعات" کے جواز کی دلیل بن سکتا ہے؟

محفلِ میلاد میں جو قیام کیا جاتا ہے، اُس کے لئے بھی کتاب وسنّت، آثارِ صحابہ اور فقہ وحدیث کے ائمہ کے اقوال سے کوئی دلیل نہیں لائی گئی، صاحب عقد الجواہر (برزنجی) اور مولانا حسن دمیاطی وغیرہ علماء کے حوالے سے کچھ قول نقل کئے گئے ہیں، دین میں اصل اعتبار کتاب وسنّت کا ہے! خود ہی کتابچہ میں لکھا ہے کہ صاحب سیرۃ شامی نے "قیام میلاد" کو بدعت کہا ہے مگر اس کے ساتھ صاحب سیرۃ کی یہ تاویل بھی نقل کردی گئی ہے کہ یہ "بدعتِ حسنہ ہے، کیوں کہ ہر بدعت مذموم نہیں ہے" حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت (کُلُّ بِدْعَةٍ) کو گمراہی (ضلالت) قرار دیا ہے اور حضورؐ نے "بدعت" کی کوئی تقسیم نہیں فرمائی!

یہ جو مسلمانوں میں شیرینی اور طعام پر بزرگوں کی فاتحہ دینے کی رسم چل پڑی ہے، اس کے لئے بھی اس فتویٰ میں کتاب وسنّت اور آثارِ صحابہ سے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا، بعض علماء متاخرین کے اقوال نقل کر دیئے ہیں!

"اولیاء اللہ سے مدد چاہنے کے لئے بھی قرآن وحدیث اور صحابہ کے آثار وعمل سے کوئی دلیل نہیں دی گئی ــــــ اس لئے یہ "فتویٰ" پورے کا پورا دینی اعتبار سے بے وزن اور بے دلیل ہے! جہاں تک علماء کے اقوال اور صوفیوں کے اشغال ومعمولات کا تعلق ہے کتابوں میں کیا نہیں ملتا؟ یہاں تک کہ بعض مشائخ کے یہاں "سجدۂ تعظیمی" بجالانے کی رسم تک ملتی ہے، مگر یہ اقوال دین میں حجت نہیں ہیں! برزنجی نے یہ کہا، دمیاطی نے یوں لکھا، سیوطی نے یہ فرمایا، سبکی کا اس بارے میں یہ قول ہے، ہر کسی کے ان اقوال کی اصل حقیقت کوئی حیثیت متعین ہوسکتی ہے جب کتاب وسنّت اور آثارِ صحابہ سے ان کی تائید ہوتی ہو، سبکی اور برزنجی کے مقابلے میں دلائل سے اعلیٰ فہم کی بات کیوں نہ مانی جائے!

اس کتابچے میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ کہی گئی ہے :-

"... ۔ ایک حدیث ہی صحاح وغیرہ کی پیش کردے کہ میلاد کا عمل گناہ کبیرہ ہے اور مستحسن نہیں ہے ..."

کیا قیامت تک ہونے والی تمام بدعات اور مشرکانہ رسوم کی نام بہ نام فہرست احادیث میں ہونی چاہیئے تھی؟ حدیث نبوی اس سلسلہ میں "بدعت" کی جامع اصطلاح پیش کرتی ہے! مثلاً کوئی شخص عیدین میں نماز سے قبل یا نماز کے بعد عیدگاہ میں نوافل پڑھنے لگے، تو یہ "بدعت" ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے ایسا عمل نہیں فرمایا، اسی پر دوسری بدعات کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اس کتابچے کے ناشر اور مترجم ڈاکٹر علیم الدین قادری سخت قسم کے بدعتی مسلمان ہیں۔ انھوں نے مقدمہ میں "اغثنی وامددنی یارسول اللہ" اور "اعطینی یاحبیب اللہ" لکھ کر اپنے اس "مشرکانہ فعل" پر فخر کیا ہے (نحن نسئل اللہ ۔ ایاک نعبد وایاک نستعین)

معلم العربیہ

از :- قاضی عبدالرزاق، ضخامت ۴۴ اصفحات ۔ قیمت :- ایک روپیہ چار آنہ ۔۔۔ الجزء الثانی ۔

الجزء الاول ضخامت ۱۹۲ صفحات ۔ قیمت :- ایک روپیہ بارہ آنہ ۔

ملنے کا پتہ :- اقبال بک ڈپو، ٹرام جنکشن صدر، کراچی (۳)

عربی زبان سیکھنے والوں کو اس کتاب کے دونوں حصے سچ مچ "معلم" بن کر فائدہ پہنچاتے اور ان میں عربی دانی کی استعداد اور ذوق پیدا کرتے ہیں، اس کتاب کے "سبق و تمرین" ([illegible]) دونوں مفید ہیں! قاضی عبدالرزاق صاحب تیس سال سے طلباء کو عربی پڑھا رہے ہیں، انھوں نے اپنے تجربہ کا نچوڑ اس کتاب (معلم العربیہ) میں پیش کردیا ہے خاص طور سے عربی گرامر کی تعلیم کے لئے انتہائی سہل اور دل نشین انداز اختیار کیا گیا ہے اور باتوں باتوں میں صرف ونحو کے قواعد بیان کردیئے ہیں

تنویرات

از :- حافظ نور محمد انور ضخامت ۶۴ صفحات (بڑا سائز) قیمت :- پچاس پیسے ۔

ملنے کا پتہ :- دارالتصنیف والاشاعت ۱۴ ۔ بی شاہ عالم، لاہور ۔

اس کتاب کی دینی اور اخلاقی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ حمد، نعت اور مناقب صحابہؓ کا مجموعہ ہے، اور اس کا ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے، جس کو ہوس اور مجاز پر محمول کیا جاسکے، "توحید خالص" کا یہ رنگ ہے :-

نہیں جز خدا کوئی فریاد رس ہے سب سے بڑا غوث اعظم خدا

بیشک اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مشکل کشا ہے، نہ فریاد رس اور داتا ہے!

شعر وادب کے اعتبار سے اس کتاب کی نظمیں سادہ اور سنجیدہ تو ضرور ہیں مگر بہت کچھ پست اور سطحی ہیں ۔

سلام اس پر زمانہ جس کی دربانی پہ مرتا ہو سلام اس پر ثنا جس کی خدا خود آپ کرتا ہے (ص۱)

"دربانی پہ مرتا ہے" یہ غیر شاعرانہ انداز بیان ہے ۔

سلام اس پر جو سارے بیکسوں کا رحم فرما تھا سلام اس پر مصیبت میں جو سب کے کام آتا تھا

"سارے بیکسوں کا رحم فرما تھا" مصرعہ کے اس ٹکڑے میں کوئی لطف بیان نہیں!

سلام اے صاحب لولاک! اے محبوب یزدانی سلام اے رہبر بے باک! اے مطلوب سبحانی (ص۱۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "رہبر بے باک" کہنا ادب شناس وجدان کو کس قدر کھٹکتا ہے!

آج کے میمون دن شاہ جہاں پیدا ہوئے جن کی آمد سے ہوتے ہیں شادماں قلب حزیں (ص۱۶)

اس "مضمون" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے؟ اور پھر "شاہجہانی" اس پر مستزاد!

اس گنبدِ خضریٰ پہ بسر عمر ہو ساری ۔۔۔ حاصل ہے ہر دم مجھے دیدارِ مدینہ (ص۲۱)

"دربنی آبرؔ" یا "گنبدِ خضریٰ کے سایہ میں" "عمر بسر ہو" کہنا چاہیے تھا "گنبدِ خضریٰ پر عمر بسر ہو"۔ کہہ شاعر نے زبان و بیان کے علاوہ اپنے ذوق کا برا نمونہ پیش کیا ـــــــ "ہی" شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے، جو حشو و زائد ہے۔

خاتم جس نے مُسلم مفتری کا کر دیا ۔۔۔ دافع الاشرار بے شک حضرت صدیق ہیں (ص۳۰)

یہ کیا شاعری ہے؟

تھا ارادہ قتل کا لیکن یہ کس کو علم تھا ۔۔۔ مصطفٰےؐ سے نوش فرمائے گا توحید کا جام (ص۳۱)

شعریت ان لفظوں کو چھو بھی نہیں گئی!!

یکایک آنِ واحد میں کیا فی النار مرحب کو ۔۔۔ دو عالم کو کیا تھا تو نے اس دم وقفِ حیرانی (ص۳۹)

اس طرح لفظوں کو بدسلیقگی کے ساتھ جوڑ دینے کو "شاعری" نہیں کہتے۔

گونجی تھی جب جہاں میں تیری آوازِ اذاں ۔۔۔ لرز اُٹھا تھا جہانِ کفر اس دم بے گماں (ص۴۳)

صبر و استقلال سے تو یہ ظلم سہتا رہا ۔۔۔ سامنے آنکھوں کے دریا خون کا بہتا رہا (ص۵۳)

جن صاحب کو "لرز" اور "ظلم" کا تلفظ تک معلوم نہ ہو، اُن کو شعر کہنے اور پھر انہیں چھپوانے کی جرأت کیوں کر ہوئی!

ایضاحِ سخن از: ـ مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواری، ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔
ملنے کا پتہ: ـ ۶۴ عبدالعزیز لین، نواب گنج ڈاک خانہ پیل خانہ ڈھاکہ ۱

بتوضیح اصلاحِ سخن

ایک صاحب تھے شوق سندیلوی، اُنھوں نے اساتذہ کے ساتھ بڑا ہی پُر لطف مذاق کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی شوخیٔ طبع کا ثبوت دیا کہ اپنی ایک ہی غزل مختلف اساتذہ کے یہاں اصلاح کے لئے بھیج اور جب یہ "اصلاحیں" اُن کے پاس آچکیں تو انہیں یکجا کرکے "اصلاحِ سخن" کے نام سے کتابی صورت میں چھپوا بھی دیا۔ اُردو رسالوں میں کئی سال تک اس کتاب پر نہ صرف مذاکرے بلکہ معرکے اور ہنگامے رہے!

مولانا تمنا عمادی نے جو عالمِ دین بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، ناقد و ادیب اور زبان داں بھی ہیں، نواب سر علی امام مرحوم کی فرمائش پر اس کتاب کی "اصلاحوں" پر تنقید فرمائی اور ۱۹۳۶ء میں اس تنقید کو شائع کر دیا۔ اب یہ کتاب دوبارہ منظرِ عام پر آئی ہے۔

"ایضاحِ سخن" مولانا تمنا عمادی کی خوش ذوقی، نکتہ رسی، استادانہ مہارت اور زباں دانی کی جیتی جاگتی شہادت ہے۔ صاحبِ موصوف نے اساتذہ کی اصلاحوں پر جو تنقیدیں کی ہیں، اُن تنقیدوں کے وجوہ بھی بتاتے ہیں اور اس طرح گفتگو کے درمیان قواعد، لغت اور زبان و بیان کے بہت سے نکتے حل ہوئے اور بہت سے پیچ کھلتے چلے گئے ہیں۔

شوق سندیلوی کا شعر تھا: ـ

دلِ بیمار ہیں یہ دُشمنِ صحت آثار ۔۔۔ اک خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جاتا

مولانا تمنا عمادی نے اس پر کتنی موزوں اور شگفتہ اصلاح دی ہے: ـ

دلِ بیمار یہ آثار تو صحت کے نہیں ۔۔۔ کچھ خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جاتا

"مقدمہ" کی عبارت کا ایک جملہ: ـ

"...... وہ یہ جان کر کہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں اور اُن کی کوئی بات اُٹھاتا نہیں ہوں۔"

"محلِ غور ہے "بات ٹالنے کے معنی میں" بات اُٹھانا " قدیم اُردو میں بولا جاتا ہوگا مگر اب "بات اٹھانا" برداشت اور تحمل کے معنی میں بولتے ہیں۔ یوں :۔

"میں تمہاری ذراسی بات بھی نہیں اُٹھاسکتا۔"

داغ کا شعر ہے :۔

واہ رے ! اُن کی نازکی کی بات — اُن سے اُٹھتی نہیں کسی کی بات

"بات اُٹھانا" تذکرہ چھیڑنے اور گفتگو کی ابتدا کرنے کو بھی کہتے ہیں :۔

"میاں ! تمہیں نے تو بات اُٹھائی اور اب تمہیں چُپ سادھے بیٹھے ہو۔"

صفحہ ۲ پر اظہر ہاپوڑی کا نام " عاشق حسین " لکھا ہے ' ان کا نام ' عاشق حسین نہیں "معشوق حسین" ہے۔

شوق سندیلوی کے اس شعر ؎

بوئے خونِ دل عاشق تو نہیں چھپنے کی — گو بہت سہل ہے ہم رنگِ حنا ہو جانا

کو مولانا تمنا عمادی نے اس طرح درست فرمایا ہے۔

بوئے خونِ دلِ پامال چھپائے کیونکر — ورنہ کچھ بات ہے تلووں کا حنا ہو جانا

شوق سندیلوی کا یہ ' پورا شعر " قلمزد " کر دینے کے قابل تھا ! حیرت ہے کہ جناب تمنا عمادی کو "بوئے خون دل عاشق" ناگوار نہیں گزرا ! وہ "خون دل" جس میں "بو" (یعنی بدبو) آنے لگے ' کسی سڑے ہوئے زخم ہی کا ہو سکتا ہے ' اس کا ذکر دیوان اور غزل میں ! توبہ ! "خونِ دل" کے ساتھ خوشبو یا بدبو کی صفت ہی قبیح ہے۔

کار ناپاکاں را قیاس از خود مگیر — گو بماند در نوشتن شیر شیر (ص۲۱)

ہم نے تو مولانا روم کی مثنوی کے اس شعر میں "کار پاکاں" پڑھا ہے۔

کتاب کے آخر میں بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں اور رائیں شامل ہیں۔ جن میں اس کتاب کو سراہا گیا ہے یہ کتاب تحسین و قدر شناسی کی مستحق بھی ہے۔

رگِ سنگ

از :۔ دانش فرازی ، ضخامت ۹۲ صفحات ، قیمت ایک روپیہ ،
ملنے کا پتہ :۔ اسٹار نیوز مارٹ ، اسٹار ٹاکیز مدراس نمبر ۵ (انڈیا)

اس کتابچہ کا پہلا مضمون :۔

"صوبہ مدراس میں ترقی پسند ادب کی رفتار اور دانش۔"

جناب کاوش بدری کا لکھا ہوا ہے ، دوسرے مقالہ میں مولانا سروش داؤدی عمری نے دانش فرازی کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر تبصرہ فرمایا ہے۔

"رگِ سنگ" جناب دانش فرازی کے قطعات و رباعیات کا مجموعہ ہے ، اُن کی شاعری ایک پرجوش و حساس مگر چوٹ کھائے ہوئے دل کی پکار ہے ! فرماتے ہیں۔

اے دوست بدل جائیں گے حالات ضرور — ٹوٹے گا یہ افسونِ روایات ضرور

ہوں صبح کے رستے پر اگر گرم سفر — ہو جائے گی سورج سے ملاقات ضرور
چند اور بھی جلوے ہیں پسِ پردۂ شب — دھندلے سے چراغوں کے تبسم کے سوا
دریوزہ گرانِ شبِ غم نے لیکن — مانگا نہیں شاید مہ و انجم کے سوا

کہتے ہیں سارے کشت زارِ حیات — گریہ ابر ہی نے سینچے ہیں
جانے کیا رنگ لائے گی تصویر — آنسوؤں نے خطوط کھینچے ہیں

"کشتِ زارِ حیات" کی جگہ کاش موزوں تر الفاظ ہوتے!

یہ سنگ کی قسمت کہ بنا تاج محل — یہ خاک کی تقدیر بنے دیر و حرم
اُٹھ سکتی ہے دیوار بلندی کی طرف — اور خاک بسر ہستیٔ ابن آدم!

چوتھے مصرعہ نے اس رُباعی کے لُطف کو غارت کر دیا!

میرے خوابوں کے آبگینوں کو — تم نے توڑا بڑی نوازش کی
پھر بھی اکثر یہ سوچتا ہوں میں — کیا فرشتوں نے کوئی سازش کی

آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟ "خوابوں کے آبگینوں کے توڑنے" سے شاید یہ مراد ہو کہ محبوب نے شاعر کی نیندیں حرام کر دیں! نیند آتی بھی ہے تو اُچٹ جاتی ہے ——— مگر "فرشتوں کی سازش" کا یہاں کیا محل تھا!

سانچے میں خرابات نے ڈھالا ہم کو — صہبائے شفق رنگ نے پالا ہم کو
جب بارِ حوادث سے تھے گرنے کے قریب — انگور کی بیلوں نے سنبھالا ہم کو

چوتھا مصرعہ مضمون کے اعتبار سے نیا بھی ہے اور شگفتہ بھی ہے بلکہ اُردو شاعری میں اضافہ ہے۔

اب غسل کو صہبائے کہن لے آؤ — کافور نہیں خاکِ چمن لے آؤ
اک رند نے میخانے میں دم توڑا ہے — انگور کے پتوں کا کفن لے آؤ

کتنی کیف انگیز ہے یہ رُباعی! رندی و مے پرستی کے معاملات میں عرب کے مشہور شاعر طرفہ کا بھی یہی مزاج اور ذوق تھا، پہلے مصرعہ میں "اب" کی جگہ "ہاں" ہونا چاہیے۔

گدرائے ہوئے جسم سے چھنتی ہوئی جوت — نس نس سے اُمڈتی ہوئی خوشبو کی گھٹا
وہ پاس سے گزرے کہ گلستاں کی سحر — یا یوں بھی نئے روپ میں آتی ہے صبا

خوشبو محسوس تو ہوتی ہے مگر مشاہدہ میں نہیں آسکتی، اس لئے خوشبو کے ساتھ گھٹا کا تلازمہ خلافِ واقعہ ہے! گھٹائیں لاکھ سہی سہی مگر خوشبو کے ساتھ اُس کو نسبت دینے سے خوشبو کی لطافت جاتی رہی! چوتھا مصرعہ کمزور ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ خود بینائی تاریک میں — اوڑھ لیتی روحِ فطرت کاش کرنوں کی ردا
وقت کی مخمور آنکھوں میں چمک سی آگئی — وادیٔ مشرق سے اُجلا سا دھواں اُٹھنے لگا

اِن قطعوں میں "ابہام" کے سوا اور کیا رکھا ہے! ——— "رُوحِ فطرت" تاریک ہے؟ کیا یہ نفسیات کا کوئی مسئلہ ہے، پھر سُورج کی کرنوں کی چادر سا اوڑھ لینے سے کیا رُوحِ فطرت کی تاریکی جاتی رہے گی؟ شاعر کے اِس ارادے کی بِن گِن پاکر آخر وقت کی آنکھوں میں چمک کیوں آگئی! اور اس چمک کے آتے ہی، وادیٔ شرق سے اجلا سا دھواں کیوں اُٹھنے لگا ——— کوئی ثبوت، دلیل

کونی تلمیح ——؟؟؟

آج کو ندے کی لپک سے ہے نشیمن بے ہراس　　　آج دونوں نے اُڑایا ہے مذاقِ آفتاب
آج کانٹوں نے بہن رکھا ہے پھولوں کا لباس　　　ہوش کے زانو پہ خوابیدہ ہے وحشت کا شباب

اوپر کے دونوں مصرعے تو صاف ہیں، مگر آخر کے دونوں مصرعے ایک دوسرے سے اور اس قطعہ کے مرکزی تخیل سے مربوط نہیں ہیں! چوتھا مصرعہ نری آورد اور سراپا ابہام ہے۔

اب درد ہی بنتے ہیں دوا بن جائے　　　خود سربط ہستی کی صدا بن جائے
ملتا جو گریبانِ مشیت لے دوست　　　انسان یقیناً یہ خدا بن جائے

چاروں مصرعوں میں "نومشقی" اور "خامی" نظر آتی ہے! "گریبانِ مشیت" سے شاعر کی آخر کیا مراد ہے؟ کیا گریبانِ مشیت کے ملنے اور ہاتھ آجانے سے انسان خدا بن جایا کرتے ہیں! چوتھے مصرعہ میں "یہ" کی تعقید کس قدر ناگوار ہے۔

تم سن نہ سکوگے یہ خرافات بہت ہیں　　　اس دفترِ ہستی کی حکایات بہت ہیں
ہر غنچۂ گلشن کا مقدر نہیں کھلنا　　　تا منزلِ گل راہ میں آفات بہت ہیں

تیسرا مصرعہ کس قدر جاندار اور شگفتہ ہے، مگر باقی تین مصرعے اس کے جوڑ کے نہیں ہیں! اس قطعہ کا مرکزی تصور غالب کے اس مصرعہ:-

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم

سے مستفاد ہے!

آئینۂ حیرت

از:- حیرت شملوی، ضخامت ۱۳۶ صفحات، قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ "الحسنات" رام پور (انڈیا)

جناب عبدالمجید حیرت شملوی اپنی غزلوں کی سادگی و پرکاری کے سبب اُردو دنیا میں نہ صرف یہ کہ متعارف ہیں بلکہ اُن کا کلام شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، خاص طور سے چھوٹی بحروں میں اُن کی طبیعت کے جوہر کھلتے ہیں اور اُن کی شاعرانہ قوتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

"آئینۂ حیرت" —— حیرت شملوی کی ابتدائی ایک سو بیس غزلوں کا انتخاب ہے، "انتخاب" کے یہ اشعار کتنے اثر انگیز اور نشاط آفریں ہیں:-

اب گرفتارِ محبت کی رہائی معلوم　　　ایسے مجرم کہیں آزاد کئے جاتے ہیں
یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ سازِ دل　　　یا اب وہی نظر ہے کہ بیگانہ ہو گئی
صد شکر کچھ تو اُن سے ہوئی آج گفتگو　　　یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی

حیرت کے غم کدے میں خوشی کا گزر کہاں
تم آگئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

اس غزل کا مطلع ہے:-

اُس بزم میں جو گردشِ پیمانہ ہو گئی　　　ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی

اس شعر میں "گردشِ پیمانہ ہو گئی" زبان و روزمرہ کے اعتبار سے محلِ نظر ہے، یوں تو بولتے ہیں کہ پیمانہ کو گردش ہوئی مگر "گردش ہو

ہوئی یا ہو گئی، عام طور سے نہیں بولتے۔

دل میں ہر لحظہ خدا کی یاد رکھ
دیکھ اس گھر کو نہ غیر آباد رکھ

دل شاد تھا تو حیرت تھا لطفِ انجمن بھی
اب حال ہے دگرگوں، مل کر کسی سے کیا لوں

دشمنوں نے کیا بُرائی کی اگر کی دشمنی
دوستوں نے دوستی میں دل کے ٹکڑے کر دیئے

اُٹھا رہا ہوں زمانے کی سختیاں لیکن
زبانِ شکوہ و فریاد بند رکھتا ہوں

بندۂ آزاد کی اللہ رے! مجبوریاں
رُخصتِ فریاد بھی چاہے تو نامنظور ہو

دامنِ شوق مرے ہاتھ سے چھُٹ جائے گا
اس قدر کوئی کھچے گا مجھے معلوم نہ تھا

کوئی انصاف بھی ہے دنیا میں
بڑھ گئی جرم سے سزا میری

اس طرح جس کی سزا دی جائے
وہ خطا بھی تو بتا دی جائے

کام آئے گا کسی کے کوئی!
یہ توقع بھی اُٹھا دی جائے

تماشا یہ بھی گزرا ہے نظر سے
گھٹا اُٹھی مگر بادل نہ برسے

نیت ہو اگر پاک تو ملتا ہے صلہ بھی
شیشہ ہو اگر صاف تو آتی ہے جلا بھی

کرتا رہا تلافیٔ مافات عمر بھر
پھر بھی گناہگار گناہگار ہی رہا

کہتا ہوں وہی زبانِ غم سے
جو دیدۂ تر سے دیکھتا ہوں

آسماں کے جور کا بھی ذکر ہم کرتے نہیں
کیا خبر چل کر کہاں سے بات آ جائے کہاں

حاصل نہیں توفیق اگر چارہ گری کی
بیٹھے ہوئے نشتر بھی چبھویا نہیں کرتے

کسی کی تمنا کئے جایئے
اسی آرزو میں جئے جایئے

ہم جس کے انتظار میں اب تک رہا کئے
وہ قافلہ تو کب کے روانہ بھی ہو چکا!

وائے قسمت! کہ بے بصر ہی نہیں
دوستو! تم تو بے خبر بھی ہو

ہے دل میں عجیب ایک اُلجھن
ہے کون جو اس گرہ کو کھولے

ہدفِ ناوکِ بیداد سہی
کیسی قابل تو یہ سینہ نکلا

دلدادگانِ بادہ و ساغر کو کیا خبر
ہم کو پئے بغیر ہی کتنا سرور ہے

کس پیچ و تاب میں ہے دلِ زار کہہ تو دوں
شاید کسی کو یاد مری داستاں بھی ہے

طائر کوئی آزاد اگر ہے بھی تو کیا ہے
محرومِ پر و بال ہے پہلے سے زیادہ

رہ کر قریب بھی تو کوئی دور دور ہے
یہ دل اسی لئے تو پریشاں ہے آج کل

کس کس کو دعا دیجئے، کس کس کو تسلی
ہیں اُن کی عنایت سے پریشاں ہزاروں

کوئی فصلِ گل کے آنے کی خبر لایا تو تھا
پھر یہ ہنگامہ خدا جانے کدھر ہوتا رہا

پوچھا ہے مدت سے بُلایا ہے کسی نے
اس طرح ہمیں دل سے بھُلایا ہے کسی نے

اس دلِ حسرت زدہ کا پوچھتے ہو حال کیا
وہ تو جس محفل میں پہلے تھا کسی محفل میں ہے

پھر کون کرے گا دلنوازی — جب آپ ہی دل دکھائیے گا
آپ بھی کیا کسی کی مجبوری — نظر انداز کر نہیں سکتے
دل مگر پھر بھی خوش نہیں اپنا — آج حالانکہ وہ خفا بھی نہیں
اب اور آپ کے یہ گنہگار کیا کریں — مشکل میں اپنے آپ کو ڈالے ہوئے تو ہیں
اس کی خبر نہیں کہ اثر کیا ہوا[1] مگر — موزوں کبھی کبھی مرے نالے ہوئے تو ہیں
پیرانِ پارسا سے تو یہ بھی نہ ہو سکا — ہم اپنی آبرو کو سنبھالے ہوئے تو ہیں
واسطہ ہے نیا نیا اُن سے — ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتا ہوں
پوچھے گا نہ کوئی کیا کسی کو — دیکھے گا نہ کوئی کیا اِدھر بھی
آغاز ہی معتبر نہیں ہے — رکھئے گا نظرِ مآل پر بھی
کچھ بات تو ہے کہ دل نہیں خوش — گلشن میں بہار دیکھ کر بھی
پہونچا دیا کہاں سے کہاں یہ تو دیکھئے — دریائے غم کے ایک ہی سیلاب نے مجھے
دیکھا جو مزاجِ یار برہم — پھر کس کی مجال تھی کہ بولے
بات یہ اور ہے کہ ٹوٹ گیا — ورنہ ہر عہد پائدار ہی تھا
ستم و جور کی شکایت کیا — یہ تو اُس شوخ کا شعار ہی تھا
چھوڑیئے شکوۂ اربابِ جفا — دیکھئے چیں بہ جبیں ہے کوئی
حالِ دل کس کو سنائیں حیرت — سننے والا بھی کہیں ہے کوئی
اگر گل ہیں ابھی سے چاک داماں — نہیں معلوم کیا گزرے خزاں تک ـــــ
ایک شب کا نہیں فسانۂ غم — اور غم، ایک دن کی بات نہیں!

دوسرا رُخ :ـــ

کچھ قفس ہی میں تڑپنے دے مجھے — بے بس اتنا بھی نہ اے صیاد رکھ (ص۱۱)

نومشقی کے زمانے کے اس شعر کو غزل میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی!

مقصود ہے تو وہ ہے مطلوب ہے تو وہ ہے — کیسے کسی کو اپنا اُس کے سوا بنا لوں (ص۱۲)

دوسرا مصرعہ کمزور ہے۔ کہنا یہ چاہیے تھا کہ اُس کے سوا کسی دوسرے کی تمنا کس طرح کروں؟!

جس کے آغوشِ وفا میں پرورش پاتی رہی — موجِ مضطر نے اُسی ساحل کے ٹکڑے کر دیئے (ص۱۵)

اُردو میں "مضطرب" کے معنی میں "مضطر" بھی بعض شاعروں نے نظم کیا ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ مضطرب (بیقرار) اور مضطر (مجبور) کے معنی میں فرق کیا جائے! اس شعر میں خاص طور سے موج کو مضطر نہیں مضطرب اور بے چین ہی کہنا چاہیے تھا۔

کس طرح دیکھنا، چمکتا ہے — ذرے کو آفتاب ہونے دو (ص۲۲)

یہ آخر بات کیا ہوئی!

[1] یہ مصرعہ "اثر کس پہ کیا ہوا" اس ٹکڑے کی مانگ رہا ہے۔ (م-ق)

حد سے گزری ہے ابتلا میری　　اب تو سن لے مری خدا میری　(ص۲۳)

"ابتلا" آزمائش اور "بلا" میں پڑنے کو کہتے ہیں، اس شعر میں "ابتلا" مصیبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، دوسرا مصرعہ خاصا رواں ہے، اس کے مقابلہ میں پہلے مصرعہ کے اس ٹکڑے ——— ابتلا میری ——— میں روانی اور بے ساختگی نہیں پائی جاتی

آج بیگانہ وہ نگاہیں ہیں　　تھیں جو مدت سے آشنا میری　(ص۲۳)

یہ شعر انتخاب میں آنے کے قابل نہ تھا۔

باغ اور راغ ہی نہیں ہم بھی　　منتظر ہیں بہار آنے کے　(ص۲۹)

نہ خیال میں ندرت، نہ اندازِ بیان میں کوئی لطف!

ان لبوں پر جو بات ہوتی ہے　　قلب کی واردات ہوتی ہے　(ص۳۲)

غزل کا مطلع، اور اتنا سپاٹ!

محمود وہ اور ہم ایازی　　اللہ رے، شانِ بے نیازی　(ص۳)

محمود و ایاز کی "تلمیح" سے شعر میں آخر کیا فائدہ اٹھایا گیا ہے؟ محمود اور ایاز کے درمیان "بے نیازی" کا کوئی معاملہ کب تھا!

جب کنجِ قفس میں بھی پر کاٹ دیئے جائیں　　پھر صبر کا پیمانہ کیوں کر نہ چھلک جائے　(ص۳۱)

بے مزہ شعر!

ہلاکِ غمزۂ باطل نہیں ہے!　　مرے سینہ میں ایسا دل نہیں ہے　(ص۳۵)

"غمزۂ باطل" نے شعر میں آورد پیدا کر دی۔

ہر فتنۂ صبحِ شب سے پہلے　　گزرا ہوا سر سے دیکھتا ہوں　(ص۳۶)

اول تو اس شعر میں "تعقید" پائی جاتی ہے۔ پھر فتنہ کا سر سے "گزرنا"[1] بھی کھٹکتا ہے!

کیا یہ مجبوریوں کی بات نہیں　　دن اگر کٹ گیا تو رات نہیں　(ص۵۰)

شعر کے مرکزی تصور اور مفہوم سے "مجبوریوں" کا پیوند نہیں لگا۔ دوسرے مصرعہ میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ دن اگر کٹ گیا تو رات کسی طرح نہیں کٹتی اس لئے "رات نہیں" کہہ کر جو خلا چھوڑ دیا گیا ہے وہ وجدان کو ناگوار گزرتا ہے۔

کیسی کے ظلم ہائے ناروا کی　　جو پہلے تھی وہی رفتار کیوں ہے　(ص۵۱)

"ظلم" میں خود "ناروا" کا مفہوم شامل ہے، اس لئے "ظلم" کے ساتھ "ناروا" کا اضافہ حشو و زائد ہے، پھر ظلم کی جمع (ظلم ہائے ناروا) بھی کھٹکتی ہے! "رفتار" نے شعر میں "ترجمہ" کا سا رنگ پیدا کر دیا۔

ہم تو اس آستیں کے قائل ہیں　　سانپ جس میں کبھی نہیں پلتے　(ص۵۲)

حیرت شملوی کے مجموعہ کلام میں، ایسا پست اور سپاٹ شعر! حیرت ہے!

سوچا الزام ہے آغازِ سفر سے پیشتر!　　شام ہو جائے کہاں، یا رات آجائے کہاں

[1] راقم الحروف کا ایک شعر ہے:—

ضبطِ گریہ کی کش مکش توبہ
کتنے طوفاں گزر گئے سر سے　(م۔ق)

"یا کی جگہ "سا" ہوتا تو شعر بیان وہاں واضح ہو جاتا۔

آہستہ آہستہ جوانی کا خمار آہستہ آہستہ — نظر سے دور ہوتا ہے غبار آہستہ آہستہ (ص…)

"آئینۂ نظر" کہتے تو "غبار" کا تلازمہ درست ہو جاتا۔

گرانے میں کسی کے دل پہ بجلی — زمیں بھی کم نہیں ہے آسماں سے

"آئینۂ حیرت" کو اس انداز کے سطحی شعروں نے غبار آلود بنا دیا۔

کسی کی زندگی آساں بھی ہوگی — یہاں تو ہر نفس اک امتحاں ہے (ص۶۱)

زندگی کے ساتھ "دشوار" تو بولتے ہیں، مگر یوں نہیں بولتے کہ اس کی زندگی آسان ہے یا آسان ہو جائے گی یا آسان گزری ہے اور گزر رہی ہے!

فطرت کو عتاب کی حیرت جب لائے — اب تک تو نظر ایسا اعجاز نہیں آیا (ص۶۲)

اس شعر کو تغزل چھو بھی نہیں گیا۔

کچھ کثرت پر موقوف نہیں — چبھنے کے لئے اک خار بہت (ص۶۷)

پہلا مصرع، دوسرے مصرع کے جوڑ کا ہونا چاہیے تھا۔

کس طرح کوئی دل کو سمجھائے — جب تڑپتا ہوا جگر بھی ہو (ص۶۸)

جگر جب تڑپتا ہوتا ہے، تو دل کو سمجھانا ممکن نہیں ہوتا — یہ آخر کیا بات ہوئی!

اُن کو یہ کد کہ کھینچ کے لے جائیں دور تک — ہم کو یہ ضد کہ بات جہاں ہے وہاں رہے (ص۷۵)

بات بھی کوئی رسی ہے جسے دور تک کھینچ کر لے جایا جا سکتا ہے!!

سرد ہو جائے یہ ممکن ہی نہیں — لے کے وہ سوزِ جگر آئے ہیں

ہم دن کو بھی سمجھیں گے کہ اچھا ہی گزارا — آفت نہ اگر اور کوئی رات میں گزری (ص۷۷)

ایسے سطحی شعروں کا "انتخاب" میں باقی رہ جانا "حیرت انگیز" ہے۔

چلتی ہوئی قضا کی جو شمشیر دیکھ لی — ہم نے بھی اپنے خواب کی تعبیر دیکھ لی (ص۸۰)

مصرعِ اولیٰ کے سراپا آورد ہونے کے علاوہ، شعر کا مفہوم بھی گنجلک ہے۔

ایسا بھی ایک درد کسی کے جگر میں ہو — جس کا کوئی علاج، نہ درماں ہے آجکل (ص۸۲)

جس طرح پہلے نوازا تھا دلِ ناشاد کو — پھر اُسی انداز سے بن کر کہیں آ جائیے (ص۸۴)

یہ بھی مسکن آپ کا ہے، وہ بھی مسکن آپ کا — دیدہ و دل دونوں حاضر ہیں کہیں آ جائیے

ان شعروں میں آخر کیا خوبی نظر آئی کہ مجموعۂ کلام میں ان کو شامل فرما لیا گیا!

تھا جگر کا درد لیکن چارہ گر کے ہاتھ سے — ایک مدت تک علاجِ دردِ سر ہوتا رہا (ص۸۸)

ہاتھ سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ چارہ گر بیمار کے سر کی مالش کرتا رہا۔

کس کس کو بنا دیا نہ مجنوں — یا اُن کی ادائے دلبری نے (ص۹۶)

یا اُن کی "ادائے دلبری" ہی محلِ غور ہے پھر اُن کی ادائے "لوگوں کو مجنوں بنا دیا" یہ اور زیادہ کھٹکتا ہے۔

غیرسے ساز کر نہیں سکتے ہم یہ دمساز نہیں کر سکتے (ص۹۹)

"ساز باز کرنا" روزمرہ ہے! دوسرے مصرعہ (ہم یہ دمساز کر نہیں سکتے ہیں) ——— کہنے تکلف کے ساتھ مفہوم کی ترجمانی کی گئی ہے!

یہ شکایت کہ میں نے کچھ نہ کیا میرے دمساز کر نہیں سکتے (ص۹۹)

ایسی تنقید جو ناگوار ہے!

اس شب مہ روز کی پہیلی میں امتحاں ہے کسی کی دانش کا (ص۱۱۴)

مفہوم تو سمجھ میں آگیا، مگر بات کہنے کے انداز میں کس بلا کا تکلف پایا جاتا ہے۔

حاشا کہ نہیں کشیدگی میں جو بات ہے صلح و آشتی میں (ص۱۱۵)

"سخندانِ تو جملہ وردہ ماند" کا اطلاق اسی قسم کے شعروں پر ہوتا ہے۔

اپنی ہی اگر فکر میں سرکار نہ ہوتے سرکار کے یوں خوا خطرت وارد ہوتے

شعر صاف ہے، مفہوم واضح ہے، زبان و بیان کی بھی کوئی غلطی نہیں، مگر شعریت ؟!؟

گرتے نہ اگر دانۂ تزویر پہ طائر صیاد کے پنجے میں گرفتار نہ ہوتے (ص۱۱۶)

شعر سپاٹ اور بے نمک ہے، اس کے علاوہ "دامِ تزویر" تو سنا اور پڑھا ہے مگر "دانۂ تزویر" پہلی بار دیکھنے میں آیا۔

دوسرا خود بگاڑ لیتے ہیں ایک گیسو اگر سنورتا ہے (ص۱۱۸)

حیرت صاحب کی لطافتِ ذوق نے اس شعر کو کس طرح گوارا کر لیا!

کیجئے کیا کہ دل کا شیرازہ باندھتے باندھتے بکھرتا ہے (ص۱۱۸)

"شیرازہ بندھ گیا اور بکھر گیا" یہ روزمرہ ہے! مگر اس شعر میں "باندھتے باندھتے" جو آیا ہے اُس نے زبان کے لطف کو غارت

آپکا بخت آپکی تقدیر آپکے ہاتھ جو مقام آئے (ص۱۱۹)

اس قسم کے شعروں کو پڑھ کر وجدان بے مزہ ہوتا ہے۔

کس کو معلوم تھا کہ یہ بیداد پہلے ہی سے قرار دادہ ہے (ص۱۲۰)

"قرار دادہ" غزل کی زبان نہیں!

ہم نولائے دل شاد نہیں ہم نے مانا کہ حسیں ہے کوئی (ص۱۲۱)

اس طرح مصرعہ جوڑ دینے کو شعر ہی نہیں کہتے۔

کام کی بات اگر ذہن میں آئے تو کہیے ورنہ بے کار کوئی سر کو کھپاتا نہ رہے (ص۱۲۲)

حیرت صاحب برسوں سے مریض اور صاحبِ فراش ہیں، غزلوں کے انتخاب میں اس کا اثر آگیا کہ ایسے بیکار شعر مجموعہ میں جگہ پاگئے۔

کوئی اس دل کو سمجھائے کہاں تک شکایت آہی جاتی ہے زباں تک (ص۱۲۳)

شکایت زباں پر آجاتی ہے ——— تو اس پر دل کو سمجھانے کی کیا ضرورت تھی ؟!

وہاں مہر و وفا کے تذکروں میں نہیں ہوتی ہماری داستاں تک (ص۱۲۵)

اس شعر میں ردیف (تک) بے کار جا رہی ہے، اگر یوں کہتے کہ ہمارا "نام تک" نہیں آتا، تو ایک بات تھی!

ذرا سا بھی اگر ملتا ہے موقع ۔ گرا دیتے ہیں دل پہ بجلیاں تک (ص ۱۲۵)

چونکا دینے والا انداز بیان!

جناب حیرت شملوی کی ان غزلوں کے کتابی صورت میں آنے کے ہم منتظر ہیں، جن کو ہم نے بار بار پڑھا ہے اور ہر بار نیا لطف محسوس کیا ہے۔

تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی

تالیف:- مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ مرتبہ:- محمد ایوب قادری۔

ضخامت ۳۰۴ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت:- چار روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ:- سلیمان اکیڈمی حق نشان ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۵۔

یہ کتاب مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم کی تالیف ہے، جسے جناب محمد ایوب قادری (بی اے) نے مرتب فرمایا ہے، جا بجا ضروری حواشی تحریر کئے ہیں اور "تذکرہ رجال کے تحت" ۲۹ نامور شخصیتوں کے مختصر حالات لکھے ہیں، صاحب موصوف تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کو مرتب کرنے اور ان پر حواشی لکھنے کا خاص ذوق اور سلیقہ رکھتے ہیں، اس صنف میں ان کی معلومات بہت وسیع ہیں!

اس کتاب پر جناب ڈاکٹر محمود حسین (وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی) نے تعارف اور جناب جمیل جالبی نے پیش لفظ لکھا ہے مقدمہ جناب محمد ایوب قادری نے تحریر فرمایا ہے جو معلومات آفریں ہے ___ مولوی محمد جعفر تھانیسری کا اس مقدمہ میں تعارف کرایا گیا ہے:-

"مولوی محمد جعفر تھانیسری سید احمد شہید کی تحریک کے خاص اراکین میں سے ہیں، انھوں نے اپنے مقاصد کے تحت جانی اور مالی قربانیاں پیش کیں، معرکہ امبیلا کے بعد ۱۸۶۴ء میں ان پر بغاوت اور سازش کے الزام میں مقدمہ چلا، جائداد ضبط اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی، مگر انھوں نے فرنگی استبداد کے خلاف استقامت کا پورا پورا ثبوت دیا ___"

مولانا فضل حق خیر آبادی کے بارے میں مقدمہ نگار لکھتے ہیں:-

"مولانا فضل حق خیر آبادی (وفات ۱۸۶۱ء) نے سب سے پہلے تقویۃ الایمان کی ایک عبارت ___ "اس شہنشاہ کی تو یہ شان ---- کی بنا پر پیدا کر ڈالے" پر امتناع نظیر اور امکان نظیر کی بحث چھیڑی اور ایک مختصر رسالہ اس عبارت کے رد میں لکھا پھر تو اس سلسلہ میں بہت سے رسالے قلم بند ہوئے، اور تقویۃ الایمان کے مستقل رد میں لکھے گئے، غرض کہ اس تحریک کی مخالفت کے آغاز کا سہرا مولانا فضل حق خیر آبادی کے سر ہے!

اور

"جس وقت اللہ تعالیٰ کے یہ فرمانبردار بندے دین و ملت کی خاطر جہاد میں اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے، اس زمانہ میں اس تحریک کے سب سے زیادہ مخالف مولانا فضل حق خیر آبادی ایجنٹ دہلی کے محکمہ میں سررشتہ دار تھے اور مولوی فضل رسول بدایونی (وفات ۱۸۷۲ء) کھل کر رہی،

بدایوں (سہسوان) میں سررشتہ دار تھے۔۔۔

اس کتاب میں مولوی محمد جعفر تھانیسری نے "معرکۂ امبیلا" کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے! اس کے بعد مولوی صاحب موصوف کی خانہ تلاشی ہوتی ہے، ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوتا ہے اور وہ دہلی اور علی گڑھ کا رخ کرتے ہیں، یہاں تک کہ چند دن بعد علی گڑھ میں گرفتار ہو جاتے ہیں! اس گرفتاری سے لے کر انڈمان جانے، وہاں رہنے اور پھر ہندوستان واپس آنے تک کے سب حالات "تواریخ عجیب" میں ملتے ہیں۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری صاحب تقویٰ اور صاحب عزیمت مسلمان تھے، لکھتے ہیں:۔

"بیوی کی وفات کے بعد میں دو برس مجرد رہا، مگر بد قسمتی سے جہاں اس حالت تجرد میں میرا قیام تھا، عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سی عورتوں نے مجھ کو اپنا شکار کرنا چاہا، مگر حفاظت و حسنات غیبی میرے شامل حال رہی، کیوں کہ رب العزت نے مجھ کو ہلاک نہ ہونے دیا گو میرے عہدہ کے سبب سے رات دن مجھ کو فاحشاؤں کے ساتھ ملنا پڑتا، اور طرح طرح کے ایسے سرکاری کام لینا پڑتے تھے کہ وہ اکثر میرے گھر میں بھی آتیں اور میرے پھنسانے کی کوشش بھی کرتیں لیکن جس کو خدا بچاوے اس کو کون مارے"۔ (ص ۱۵۲)

مولوی محمد جعفر تھانیسری کی قبر پہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے پھولوں کی بارش ہو، وہ بدکاری کو "ہلاکت" اور "موت" سے تعبیر کرتے ہیں! بے شک جس نے زنا کیا وہ ہلاک ہو گیا۔

مولوی صاحب مرحوم نے انڈمان میں انگریزی کتابیں پڑھنی شروع کیں، ان کا ان پر کیا اثر ہوا؟ یہ خود انہی کی زبان بقت ترجمان سے سنیئے:۔

"جس طرح یہ زبان (انگریزی) دنیوی فوائد سے بھری ہوئی ہے اس سے زیادہ دین کے واسطے مضر بلکہ سم قاتل ہے، کوئی جوان لڑکا جس نے پہلے قرآن، حدیث اور سلوک راہ نبوت میں خوب مہارت اور مشق نہ کر لی ہو۔ اگر اس زبان کو سیکھ کر میری طرح ہر قلم اور ہر علم کی کتابیں مطالعہ کرے گا ضرور پہلے سرے کا بے حد آزاد بد دین بے ادب ملحد ہو جاوے گا، بلکہ ایسا ملحد اور بے دین ہوگا کہ جس کا سنورنا محال کیا بلکہ غیر ممکن ہے"۔

صاحب تذکرہ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ انگریزی علوم سے جیرا فسنت بڑھا تو تہجد کی نماز چھوٹ گئی اور قریب تھا کہ نماز اور روزہ سے بیگانہ ہو جاؤں۔ یہاں تک کہ شیطان، دل میں اس طرح کے وسوسے ڈالنے لگا کہ مجھ میں اور کفر میں صرف چند انگشت کا فرق باقی رہ گیا۔ مگر بیماری کے حادثہ نے دل میں سوز و گداز پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی توفیق نصیب ہوئی اور دل کی حالت پہلے ہی کی طرح ہو گئی۔

"تواریخ عجیب" کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے، جس کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت نے حدیث کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے۔ "آمین بالجہر" کہنے پر اہل حدیث جیل جاتے ہیں، ان کی مسجدیں ضبط کی گئی ہیں، نواب صاحب نے ایک غیر مقلد کو حدود ریاست سے پٹوا کر نکلوا دیا اور حکم دیا کہ کوئی غیر مقلد ہمارے شہر میں نہ رہنے پاوے! رام پور میں بھی وہاں کے والی نے حضرت شاہ اسماعیل شہید کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" کے ماننے والوں کو ڈرایا دھمکایا اور بعض کو قید تک میں ڈال دیا۔

کتاب و سنت کے قائم کرنے والوں اور توحید فراموشوں کے ساتھ یہ سلوک! تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

جارحانہ فرقہ پرستی

مرتبہ :- ابوالفہیم وحید حیدرآبادی، ضخامت ۲۴۰ صفحات ۔ قیمت :- دو روپے پچیس پیسے۔
ملنے کا پتہ :- مکتبہ تجلی، دیوبند (یوپی) پاکستان میں :- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۱ - شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔

اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور مغربی یو۔پی۔ میں متعصب ہندوؤں نے کس عنوان سے جارحانہ فرقہ پرستی کا مظاہرہ کیا اور بیچارے بے گناہ مسلمانوں پر کیا قیامت گزر گئی۔

بھارت میں ایک منظم اسکیم کے تحت مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے اور انہیں اکھاڑنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں، فساد کی ابتدا ہندوؤں کی جانب سے ہوتی ہے، مسلمان مدافعت کرتے ہیں، تو خود پولیس مفسدوں کی پشت پناہی کرتی ہے اس طرح بیچارے مسلمانوں پر دہری مار پڑتی ہے، اُن کے گھروں کو آگ لگائی جاتی ہے، مال و اسباب لوٹا جاتا ہے، قبرستانوں کی مسجدوں کی یہاں تک کہ قرآن کریم کی بے حرمتی کی جاتی ہے، اُن کے ننگ و ناموس پر حملے ہوتے ہیں، وہ زخمی اور قتل کئے جاتے ہیں، اور اس تمام مظلومیت کے باوجود انہی کو مجرم اور فسادی ٹھیرا کر گرفتار کیا جاتا ہے اور وہ مہینوں قید و بند کی مصیبتیں اٹھاتے رہتے ہیں، یہ اُس ہندوستان میں ہو رہا ہے جہاں گاندھی جی نے شانتی اور "اہنسا" کی تعلیم دی تھی!

اس کتاب میں ان فسادات پر بھارت کے ہندو نیتاؤں کے بیانات درج کئے گئے ہیں :-

مسٹر چرن سنگھ وزیر داخلہ اتر پردیش :-

"ریاست میں فرقہ وارانہ ہنگاموں کی موجودہ لہر میں ایک فرقہ ہمیشہ جارحیت اور دوسرا فرقہ دفاع کرتا رہا۔ انھوں نے کہا اب تک ان فسادات میں جتنے آدمی مرے وہ سب ایک ہی فرقے کے ہیں، ریاست کے تمام فسادات ایک ہی طرز پر ہوئے۔"

چودھری سنگھ :-

"جبلپور کی یہ حرکتیں ہمارے سماج کے اس طبقہ کے نوجوانوں نے کیں جس کے افراد خون دیکھ کر بے ہوش ہو جایا کرتے تھے، اور اس طرح گویا انھوں نے قتل کرنے کے ہنر کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔"

راج نرائن سنگھ :-

"ایک تالا فیکٹری کے مالک نے جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان قفل ساز علی گڑھ چھوڑ کر بھاگ جائیں اور اس کے کارخانہ کی آمدنی اس طرح بڑھ جائے سارا جھگڑا کیا۔ ہندو طلبا مارت بعد اس کے لما طے میں اکٹھا ہے، آپ نے اس کارخانہ کے مالک کا نام لیتے ہوئے بتایا کہ اس کی ساری سرگرمیاں ضلع مجسٹریٹ کے علم میں تھیں، لیکن اُس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔"

مسٹر کیشن داس :-

"میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ہندوستان کی پولیس آزادی کی دشمن ہے، جو اپنے برتاؤ سے کسی وقت بھی ملک کو غلام بنا سکتی ہے، مزے کی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو قتل کیا گیا تھا اور بعد میں پولیس افسروں نے ان محلوں سے جہاں برابر امن رہا تھا

سے شریف مسلمانوں کو زبردستی گرفتار کرکے جیل بھیج دیا۔"

شری جمنا داس دہلی :-

"اگر حکومت سختی سے کام لیتی تو یہ فتنہ علی گڑھ میں ہی ختم ہو جاتا۔ لیکن ہمارے علی گڑھ میں حکام نے عوام کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جو پہلے روز پریس نوٹ شائع کیا وہ نہایت گمراہ کن تھا۔۔۔"

دنیا کی کوئی حکومت چاہے وہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ ظلم پر قائم نہیں رہ سکتی، یہ تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے کاش! بھارت کے صاحب زندہ ہندو سوچ سکیں اور اس روز بروز بڑھتے ظالموں کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب میں فرقہ پرست ہندوؤں کی زیادتیوں اور سفاکیوں کے ساتھ قصبہ بڑوت ضلع میرٹھ کے ایک امن پسند ہندو (چمن لال جی) کی انسانی شرافت کا یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ طلبا جب مسجد پر حملہ کرنے کے لئے پہونچے، تو مسٹر چمن لال اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر مسجد کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے، انھوں نے طلبا سے کہا کہ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے، میں تمہیں مسجد کے اندر نہیں جانے دوں گا! (چمن لال زندہ باد)

ہمارے تعلیمی مسائل

مرتبہ :- خلیفہ صلاح الدین سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ ضخامت :- ۸۰ صفحات
ملنے کا پتہ :- ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور (۸)

مذاکرہ طلبہ امتحان میں کیوں فیل ہوتے ہیں

اس مذاکرے میں پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر غلام یٰسین خاں نیازی، شیخ عطاءاللہ، ڈاکٹر رفیق احمد خاں، مس حمید خواجہ، صدیق محمد جمال اللہ، جسٹس سجاد احمد جان اور خلیفہ صلاح الدین جیسے نامور اور تجربہ کار ماہرینِ تعلیم نے حصہ لیا تھا انہی کی تقریریں اور مطالعے اس کتاب کی زینت ہیں۔

اس "مذاکرہ" میں جو کچھ کہا گیا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُستاد اور شاگرد کے مابین جو رابطہ ہونا چاہیئے، اُس کا فقدان نظر آتا ہے، اساتذہ عام طور پر تنخواہ حاصل کرنے کے لئے تعلیم دیتے ہیں اور ذہن و فکر کی اخلاقی تربیت تو سرے سے ناپید ہے نصاب میں اخلاقیات کا کہیں سراغ نہیں ملتا ـــــ اپنی قومی زبان کو نظر انداز کرکے ابھی تک انگریزی لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہے ـــــ ریڈیو، سینما عریاں تصاویر، فحش لٹریچر اور مخلوط تعلیم نے ہمارے معاشرے کو خراب کر رکھا ہے!

اور

"طلبہ کے نتائج امتحان کے انحطاط کا مرکزی باعث اساتذہ کی کمزوری اور اُن کا تغافل ہے اور اساتذہ کی اصلاح اسی وقت ممکن ہے کہ ان کے معاوضۂ محنت اور صلۂ کد و کاوش کو بڑھایا جائے تاکہ وہ شوق دل سے کام کریں۔"

حیرت ہے کہ ماہرینِ تعلیم کے ان مشوروں کے بعد بھی حکومت کو اپنے تعلیمی نظام پر نظرِ ثانی کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

ماہنامہ ادیب علی گڑھ نصاب نمبر

نگراں :- سید ظہیر الدین علوی، مدیر :- ابن فرید، مدیر معاون کبیر احمد جائسی
ضخامت ۲۳۱ صفحات، قیمت :- دو روپیہ پچاس نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ :- ماہنامہ ادیب جامعہ اُردو علی گڑھ

ماہنامہ "ادیب" جامعہ اُردو (علی گڑھ) کا آرگن ہے، یہ جامعہ بھی مبارک اور اُس کا ادبی ترجمان (ادیب) بھی مستحق قدر، ورنہ حالات کس ناسازگار ماحول میں، کتنا بڑا کام ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی نصرت زبان و ادب کے ان خدمت گزاروں کو حاصل ہو (آمین)

ماہنامہ "ادیب" کے "نصاب نمبر" (حصہ دوم) نے جامعہ اُردو کے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے نصاب پر اچھے مضامین پیش کئے ہیں کہ یہ شمارہ اپنی جگہ ایک بلند پایہ ادبی پیش کش بن گیا ہے، مضامین اپنی ترتیب، تنوع اور معنویت کے اعتبار سے اونچے درجہ کے ہیں اور طلباء، اساتذہ اور عوام و خواص سب کے کام کے!

ندائے ملت ——— سبحان اللہ! جیسا نام ویسا کام! ہندوستان کے مسلمانوں کا بیباک ترجمان ان کے دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز، سیاسیات کا نبض شناس! اداریہ، نوٹس، مضامین، بیانات، خبریں ——— ہر چیز ایک سے خوب تر! سرورق دلکش اور کتابت دیدہ زیب! اللہ تعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے کہ آغاز ہی میں یہ مجلّہ ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے! اور جو ایک بار پڑھ لیتا ہے وہ گرویدہ ہو جاتا ہے۔

اردو زبان و ادب کا نیا سنگِ میل

سالنامہ ۱۹۶۲ء

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور

نومبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہو رہا ہے!

معلومات ، دلچسپیوں اور رنگینیوں کا حسین مرقع

چند لکھنے والے:

ڈاکٹر سید عبداللہ ○ جسٹس ایم آر کیانی ○ جسٹس ایس اے رحمٰن ○ کرشن چندر ○ چوہدری نذیر احمد خان ○ پروفیسر حمید احمد خان ○ شفیق الرحمٰن ملک نصراللہ خان عزیز ○ ماہر القادری ○ حکیم نیّر واسطی ○ الطاف فاطمہ ○ اثر صہبائی ○ جعفر شاہ پھلواری ○ مرزا ادیب علی ناصر زیدی ○ عبدالرحمٰن چغتائی

مضامین کی ایک جھلک

شخصیات ★ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ★ ناصر اور اس کا خالق (افسانہ ناولسٹ)

سائنس کے کمالات ★ سنے راما ★ سائنس کے کمالات ★ زحل!

اقتباسات معلومات ★ بابا عرب ★ تین صداقتیں ★ دنیا کا بادشاہ ★ آپ کا پہناوا ★ کچھ کے قصے ★ ناکام طالب علم

حیوانات ★ خون آشام چمگادڑ ★ ننھی منی مخلوق ★ تعلیم یافتہ جانور

دلچسپ واقعات ★ سمندر کی بے رحم لہریں ★ ایک جرنل کا اغوا!

شکاریات ★ تین شکاری تین درندے!

زندگی کے اہم لمحات ★ زندگی کے اہم لمحات کے متعلق کی اہم شخصیتوں کی تحریریں

نثر کے کارٹون اور لطیفے۔ مذہب۔ تاریخ۔ طب اور دلچسپ مضامین

اس کے علاوہ ابن الوقت ، حصہ سوم

اس کے سالنامے میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی آپ اردو ڈائجسٹ سے توقع رکھتے ہیں!

- چار رنگا حسین سرورق
- آفسٹ کی حسین طباعت
- ۳۰۰ سے زائد صفحات

مینیجر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ

ماہنامہ نگارش کراچی
حسبِ معمول اس سال بھی
جنوری ۶۳ء میں شاندار و ضخیم
افسانہ نمبر
شائع کرے گا
ماہنامہ نگارش کراچی

جلد ۱۴

فاران

کراچی

شمارہ ۹

ایڈیٹر:- ماہر القادری

ماہِ دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء

ترتیب

چندہ سالانہ سات روپے

فی پرچہ

پرنٹر پبلشر:- سرور حسین

مقامِ اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

مطبوعہ:- مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاک و ہند کے مسلمانوں کو دو قسم کی جماعتوں کا تجربہ ہے، اور انہی جماعتوں اور تنظیموں سے عام طور پر اُن کا واسطہ رہا ہے ـــ سیاسی جماعتیں اور مذہبی جماعتیں ـــ ! مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کے پروگرام میں "دین" شامل نہیں رہا، یہاں تک کہ ان جماعتوں میں شامل ہونے والوں پر نماز روزے کی پابندی بھی ضروری اور لازمی نہ تھی! ملّت کی اصلاح و ترقی کے کسی ایک نعرے پر یہ پارٹیاں مسلمانوں کو جمع اور منظم کرتی رہی ہیں، اس سے اُن کو کوئی سروکار نہیں کہ اُن کے ارکان کیا عقائد رکھتے ہیں؟ وہ حلال و حرام میں تمیز کرتے بھی ہیں یا نہیں؟ اُن کے اخلاق و کردار کی کیا حالت ہے؟ ان سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے والے عوام تو بیچارے پھر عوام ٹھیرے، ان کے خواص تک نے دینی احکام کی پابندی کو کوئی اہمیت نہیں دی!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی یہ سیاسی تنظیمیں اور پارٹیاں مسلمانوں کی خیر خواہی اور فلاح و بہبود کے جذبہ کے تحت وجود میں آئیں، اور انھوں نے اپنے پروگرام کے مطابق کام کر کے بھی دکھایا، مگر اس کام کی نوعیت دینی نہیں قومی تھی، دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی پارٹیوں نے مسلمانوں کی مادی ترقیوں کے لئے کام کیا ہے، مسلمانوں کی دینی زندگی اور اسلام کے تقاضوں سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

دوسری طرف مسلمانوں کی مذہبی جماعتیں ہیں، جنھوں نے دین کے کسی ایک جزء کو منتخب کیا اور اُس کے لئے جدوجہد کی، مثلاً مسلمانوں کو "نمازی" بنانے کا کام! کسی دینی مدرسہ کو چلانے کے لئے کسی تنظیم کا وجود میں آنا، مسلمانوں میں دین کے نام پر جو غلط قسم کی رسمیں رواج پا گئی ہیں، اُن کی اصلاح! ہم مسلمانوں کی ان مذہبی جماعتوں کی جدوجہد اور کوششوں کو قدر و استحسان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، دین کی راہ میں جو کوئی ایک قدم بھی اُٹھاتا ہے، اور کسی مسلمان کو قرآنِ کریم کی ایک آیت بھی ٹھیک طور پر پڑھا دیتا ہے، تو اس کا بھی اُسے اجر ملے گا، اور دین کی اس جزئی اور یک رُخی جدوجہد سے بھی مسلمانوں کو دینی اعتبار سے فائدہ پہونچتا ہے۔

ایک طرف یہ سیاسی پارٹیاں اور مذہبی جماعتیں ہیں، اور دوسری طرف "جماعتِ اسلامی" ہے جو اس مقصد اور اساس پر قائم ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو پورے کا پورا اللہ کی زمین میں قائم اور برپا کرنا ہے! اسلام میں دین و دُنیا اور دین و سیاست کی دوئی نہیں پائی جاتی، اور نہ اسلام کو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اسلام اپنی ذات سے مکمل ترین وحدت ہے، جسے اکائیوں میں نہیں بانٹ سکتے! دوسرے مذہبوں کی طرح اسلام صرف پوجا پاٹ کی چند رسموں کا نام نہیں ہے، اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے، اور زندگی کے کسی شعبہ کو بھی اسلام سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا!

دین کا یہ جامع تصور اور ہمہ گیر عقیدہ ہے، جسے لے کر جماعتِ اسلامی اُٹھی ہے، اس لئے وہ سیاست و حکومت کو بھی دنیا داری کا نہیں دین ہی کا کام سمجھتی ہے، اور وہ اس راہبانہ اور غیر اسلامی تصور کی سخت مخالف ہے کہ دین دار لوگ سیاست و حکومت سے کوئی سروکار نہ رکھیں، وہ تو بس نمازیں پڑھتے، اِلاَّ اللہ کی ضربیں لگاتے اور تسبیحیں گھماتے رہیں، سیاست و حکومت کا کام دوسروں کے

لئے چھوڑ دیں۔

جماعتِ اسلامی سیاست وحکومت کو دین ہی کا کام سمجھتی ہے اس لئے اُس کی یہ کوشش ہے کہ حکومت وسلطنت کی زمام اُن صاحبِ فہم ودانش اور اہلِ فراست کے ہاتھوں میں آئے جو اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے اندر رکھتے ہیں، جن کو ہر بات میں روزِ قیامت کی جواب دہی کی فکر رہتی ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے ہیں! سیاست وحکومت کو خالص دُنیاداری کا کام سمجھ کر اُسے فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں میں چھوڑ دینا —— یہ فکر جوگیوں، سنیاسیوں، بھکشوؤں اور پادریوں کو زیب دیتی ہے۔

جماعتِ اسلامی کی نگاہ میں اسلام مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں اور حالتوں سے سروکار رکھتا ہے، یعنی ایک مسلمان خود اپنی انفرادی اور ذاتی زندگی میں اسلام کو قائم کرے، اُس کی پُوری زندگی اسلام کے تقاضوں کے مطابق بسر ہو تو تمام ہی مُسلمان مل جُل کر پاکیزہ معاشرے کو وجود میں لائیں، اور کتاب و سُنّت کے احکام و قوانین کو قوتِ قاہرہ (حکومت) کے ذریعہ نافذ کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ نصیب ہو۔

جماعتِ اسلامی کے پاس کوئی خود ساختہ پروگرام نہیں ہے اور نہ وہ کسی جدید دعوت اور نئی اسکیم کو لے کر اُٹھی ہے، اُس نے تو مسلمانوں کو اُن کے بھُولے ہوئے سبق کو یاد دلایا ہے، اور دین کے حقیقی اور بنیادی مقاصد کے اُن نقوش اور خطوط کو اُبھار دیا ہے، جو صدیوں سے غبار آلود ہو گئے تھے! اور جو اب مُدت کے بعد چمک کر اور اُبھر کر سامنے آئے ہیں، تو بعض نگاہوں کو وہ اجنبی لگ رہے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کے سامنے سید الاوّلین والآخرین، خاتم النبیین سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی مقدس زندگی ہے، جس میں طائف ومکہ کی مظلومیت، مکہ سے مدینہ کو ہجرت، بدر واحد اور خیبر وحُنین، صُلح حدیبیہ اور فتح مکہ بھی ہے! اس مثالی زندگی اور معصوم ومُبارک اُسوۂ حسنہ میں شب کی عبادت گزاری کے ساتھ، وفود کی باریابی اور بادشاہوں اور حاکموں کے نام فرمانِ نبوی کا بھیجا بھی ملتا ہے، یہاں مجرموں پر حدیں بھی جاری ہو رہی ہیں، زکوٰۃ بھی وصول کی جارہی ہے، یہاں تک کہ عرب کے طول وعرض میں ایسی معیاری دینی حکومت وجود میں آجاتی ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم چلتا تھا، رسول اللہؐ کی سُنّت پر عمل ہوتا تھا اور پورا معاشرہ اخلاق یعنی صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

خلافتِ راشدہ کا قافلہ انہی خطوط پر جادہ پیما ہوا، اور اخلاق وسیاست کے صحیح امتزاج، دین ودنیا کے مناسب اعتدال اور ذکر وتقویٰ اور صبر وعزیمت کے آمیزے نے دنیا کے بہت بڑے حصہ پر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کر دیا، مسلمانوں کے لشکرِ قاہرہ نے روم وفارس کے دھوئیں اڑا دیئے، دنیا میں بس وہ ہی منظر آتے تھے اس دور میں اخلاق کی پاکیزگی اور سیرت وکردار کی تقدیس کے ساتھ عوام کو امن وامان اور خوشحالی بھی نصیب ہوئی! مسلمانوں کی تلواروں نے قلعوں کو اور اُن کے اخلاق نے دلوں کو فتح کیا! یہاں تک کہ دُنیا یہ سمجھنے لگی کہ مسلمان اور نیکی، مسلمان اور سچائی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں!۔۔

جماعتِ اسلامی اسی مقدس ومبارک دور کے واپس لانے کی کوشش اور جدوجہد کر رہی ہے، اُس کا مطمحِ نظر اور مُنتہائے مقصود اسی مثالی حکومت کا قیام اور اسی پاکیزہ معاشرے کی تجدید واحیا ہے —— مگر ترکشوں، کمانوں اور اُونٹوں کے کجاووں کے ساتھ نہیں بلکہ سائنس کی تمام ترقیوں اور ایجادوں اور تہذیب وتمدن کے تمام جائز ساز وسامان کے ساتھ!

مسلمان اپنی ذات سے "پیامِ امن" بھی ہے اور "اعلانِ جنگ" بھی! پیامِ امن نیکوں، سچوں، مظلوموں اور پریشان حالوں کے لئے اور "اعلانِ جنگ" ظالموں، عاصیوں، فاسقوں، خدا کے باغیوں اور انسانیت آزاروں کے لئے! غالب ہونا اور چھا جانا ہے جس مردِ مومن کی فطرت اور اُس کا مزاج!

سہ ایام کا مرکب نہیں راکب ہے مسلماں

حضرت حسن البنا شہیدؒ نے فرمایا تھا ——— مسلمان دُنیا کی قیادت سے کم کسی چیز پر رضامند نہیں ہوسکتا ——— جماعت اسلامی اُمتِ مسلمہ میں اسی عزیمت مزاج اور حوصلہ کو پیدا کرنا چاہتی ہے!

جماعتِ اسلامی نے لوگوں کے ذہن و فکر کی تربیت کے لئے نہایت ہی مفید ضروری کارآمد اور یقین افروز لٹریچر مہیا کیا ہے، کتاب اللہ احادیثِ نبوی، فقہ، اخلاق اور اسلامی تاریخ غرض ہر دینی موضوع پر جماعت کے اکابر نے کتابیں لکھی ہیں، یہ کتابیں جس قدر عام فہم ہیں، اُسی قدر اُونچے درجے کی ہیں، خاص طور سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بعض کتابیں اتنی مقبول ہوئی ہیں کہ ایک لاکھ سے بھی زیادہ تعداد میں چھپی ہیں اور کم سے کم دس بارہ غیر زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوا ہے، عربی دنیا کے چوٹی کے ادیب اہلِ فکر اور علماء نے ان کو پسند کیا ہے بلکہ سراہا ہے اور وہ مولانا مودودی کی دینی فکر و بصیرت کے بہت زیادہ مداح ہیں۔

ان کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاد، غلامی، پردہ، قتل مرتد، تعدد ازواج، بنکوں کے سود وغیرہ جیسے مسائل پر "معذرت" (apology) آمیز انداز اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ پوری جرأت اور صداقت و بیباکی اور اطمینان و ایقان کے ساتھ ان مسائل کو حقائق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے لٹریچر نے لاکھوں زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، کمیونزم، الحاد، بے یقینی، شرک و بدعت اور رفض و تجدد پرستی کے مارے ہوئے لوگ، ان کتابوں کو پڑھ کر صحیح العقیدہ بنے ہیں اور فکر و عقیدہ کی تبدیلی کے ساتھ اُن کی زندگیوں میں بھی انقلاب آیا ہے۔

ہم ایسے متعدد علماء کو جانتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے توحید کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں اور شرک و بدعت کی تردید و مخالفت میں بہت شدید ہیں مگر جب وہ تصوف کی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں تو "توحیدِ خالص" غبار آلود سی ہوجاتی ہے، جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کی سب سے نمایاں اور ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شرک و بدعت کے عقائد و رسوم کی جھائیں تک نظر نہیں آتی، توحید اور عین خالص توحید!

یہ دور جس سے ہم گزر رہے ہیں "ریب و تشکیک" کا دور ہے، آج کا آدمی دینی عقائد، اخلاقی اقدار، روحانی تصورات اور وحی و الہام کے لئے عقلی دلائل چاہتا ہے، اُسے صرف "منقولات" سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا، جماعتِ اسلامی نے منقولات کے ساتھ ساتھ عقلی دلائل کو جس انداز میں سلیقہ اور حکمت کے ساتھ برتا ہے، اس کی مثال اسلامی تاریخ میں کم ہی ملے گی! جماعتِ اسلامی کی کتابیں پڑھنے والوں نے بتایا ہے کہ وہ دین کے بارے میں کیسے کیسے خلجانات اور شکوک و شبہات میں اُلجھے ہوئے تھے، مگر ان کتابوں کے مطالعے نے اُن کی ذہن و فکر کی ایک ایک اُلجھن کو دُور کر دیا اور شکوک کے ایک ایک کانٹے کو نکال دیا۔

جماعتِ اسلامی کا لٹریچر مغرب زدگی اور مادی افکار و تہذیب کے خلاف اعلانِ جہاد ہے، جس نے جماعت کا لٹریچر پڑھ لیا ہے وہ پھر مغرب سے مرعوب و متاثر نہیں رہا، بلکہ مغربیت میں اُسے بچکانہ پن نظر آنے لگتا ہے، جس میں کسی قسم کی سنجیدگی اور معقولیت نہیں! جماعتِ اسلامی کے لٹریچر نے کارل مارکس، فرائڈ اور ڈارون کے نظریات اور فلسفہ کی غلطیاں ظاہر کی ہیں، اور کمیونزم کو تو بیچ چوراہے میں ننگا کر دیا ہے۔

جماعتِ اسلامی کا لٹریچر یاس، قنوطیت، مُردہ دلی اور بے حوصلگی کی جگہ عزیمت، اُمید اور ولولہ پیدا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دین کو جما کرنے کا ولولہ! اس بات کی اُمید کہ حق ہی کو ایک دن غالب اور سربلند ہونا ہے! باطل کے مقابلہ میں شمشیر برہنہ ہونے کا عزم ——!

اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان لٹانے کا جذبہ! سر بلا سے کٹ جائے مگر باطل کے آگے نگونسار نہ ہو! اس پر پورا اطمینان اور یقین کہ اللہ تعالیٰ کا دین ہی سچا دین ہے، اس کے علاوہ جو بھی مذہب، ازم، فلسفہ، اور طریقہ ہے، وہ باطل ہے! حالات کیسے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، دعوتِ دین کے کام کو جاری رکھنا ہے، مال، وقت، شخصیت اور جان غرض ہر قسم کی قربانی کے لئے تیاری اور آمادگی! باطل سے کسی قیمت پر مصالحت نہیں! نانِ شعیر کے ساتھ خیبر کشائی کا عزم، فقر و استغنا کے ساتھ فرمانروائی اور دُنیا کی قیادت کا حوصلہ، یہاں تک کہ صفہ کی حدیں فتحِ مکہ اور فتحِ خیبر سے جا کر مل جائیں! صرف خدا کا خوف، ایسا خوف کہ باطل کے قیصر و کسریٰ بھنگوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ بے حقیقت اور ذلیل نظر آئیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی کے ہر شعبہ میں کامل اتباع، حضورؐ کی ذاتِ گرامی سے بے پایاں محبت! اور اس پر ایمان کہ :-

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

جماعتِ اسلامی کا لٹریچر یہ بات دل میں اُتارتا ہے کہ جس راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں، بس وہی صراطِ مستقیم ہے، منزلِ نجات اور راہِ مغفرت ہے!

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

باطن کے نام پر رمزیت و اشاریت اور جذب و غلبہ کی باتیں یہ جماعتِ اسلامی کا مزاج ہی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا دین روزِ روشن کی طرح واضح اور کھلا ہوا - (مُبین) ہے! صحابۂ کرامؓ نے جس طرح دین کو سمجھا اور برتا ہے، وہی اُسوہ اُمت کو اختیار کرنا چاہیئے -

جماعتِ اسلامی میں تصوف کے خانوادوں کی طرح اشغال و اوراد اور رسوم کا تنوع اور فقہی تحزب اور گروہ بندی نہیں پائی جاتی، اس میں احناف، شوافع اور اہلِ حدیث دوش بدوش نظر آتے ہیں، فقہی جزئیات میں اُن کے درمیان کوئی تصادم و نزاع نہیں! آمین بالجہر اور رفع یدین پر وہاں پیشانی پر بل نہیں پڑتے اور تراویح کی بیس رکعتوں پر کوئی زبانِ طعن دراز نہیں کرتا -

جماعتِ اسلامی سائنس کی مفید ایجادات کے برتنے میں تنگی، وہم، موشگافی اور تفقہ کی ہندی کی چندی سے کام نہیں لیتی، مثلاً لاؤڈ اسپیکر کے نماز میں استعمال کرنے میں اس نے شروع ہی سے کراہت محسوس نہیں کی، اور اس بارے میں حرمت و کراہت کا کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا کہ آگے چل کر اپنے پہلے موقف سے رجوع کرنے کی نوبت آئے! جماعتِ اسلامی اجتہاد کی تمام شرائط کے ساتھ اجتہاد کی ضرورت اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتی ہے اور اس باب میں اس سختی اور احتیاط کو روا نہیں رکھتی، جس پر "وہم" کا اطلاق ہوتا ہے -

قرآنی تعلیم کے مُطابق، جماعتِ اسلامی کے نزدیک حق کا معیار کتاب و سُنت ہیں، اس معیار پر جس کسی کا بھی قول و عمل پورا نہ اُترتا ہو، اُسے کسی جھجک کے بغیر رد کر دیتی ہے، جماعتِ اسلامی کے نزدیک تاریخِ اسلام کی کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند مُطاع اور معیارِ حق اور دین کی آخری سند اور قطعی حُجت نہیں ہے! اور عصمت نبوت کی صفت ہے علم و تقویٰ کی صفت نہیں ہے -

جماعتِ اسلامی تزکیہ نفس کی ضرورت پر شرحِ صدر کے ساتھ ایمان رکھتی ہے، ذہن و فکر کی صیقل، قلب کا تصفیہ اور نفس کا تزکیہ مُسلسل اور پیہم ہوتا رہنا چاہیئے، لیکن اس باب میں اس کے نزدیک معیار اور نمونہ خانقاہوں کی ریاضتیں نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت اور صحابۂ کرام کے آثار ہیں! جماعتِ اسلامی کا تزکیۂ نفس نصلوٰۃ معکوس سے آشنا ہے اور نہ چلّہ کشی سے!

قادیانیت، انکارِ حدیث، اشتراکیت، مغربی زندگی، بے پردگی، قوم پرستی، غرض دورِ حاضر کے جتنے فتنے ہیں، جماعتِ اسلامی کے لٹریچر نے ان تمام فتنوں کا رد کیا ہے، ان کی قلعی کھولی ہے اور ان پر ضربیں لگائی ہیں! تعددِ ازدواج ہو، ضبطِ ولادت ہو، بے پردگی ہو، بینکوں کا سود ہو، ثقافت کے نام پر رقص و موسیقی کے پروگرام ہوں، جماعتِ اسلامی نے ان تمام غلط کاریوں اور غلط اندیشیوں پر احتساب کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان مسائل میں اسلام کا نقطۂ نگاہ کیا ہے!

مخالفت! مخالفت! مخالفت!

جماعتِ اسلامی اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے دین کو برپا کرنے کے لئے اٹھی ہے، اس لئے اس کی دعوت ہمہ گیر اور اس کی اصلاح و انقلاب کا پروگرام بھی جامع ہے، اسی نسبت سے اس کی مخالفت بھی ہمہ گیر ہے ——— جہاں جہاں پانی مرتا ہے اور جماعتِ اسلامی اس کی نشان دہی کرتی ہے، بس وہیں سے مخالفت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اربابِ حکومت جماعتِ اسلامی سے اس لئے خفا ہیں اگر جماعت کے پروگرام اور منصوبے کے مطابق اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ہماری کرسیوں کی خیر نہیں ——— کوٹھیوں، بنگلوں اور شبستانوں کے رہنے والے اس لئے ناراض ہیں کہ معاشرے پر اسلامی اخلاق چھا گیا اور غالب آگیا تو ہمارے کلب گھروں، رقص خانوں اور آرٹ سرکلوں کی عیش و تفریح کے ہنگامے جاتے رہیں گے، نہ ریس کورس کی قمار بازی رہے گی اور نہ مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط کے لطف میسر آئیں گے! کتنی خشک اور بے کیف ہو گی یہ زندگی!!!

مغرب زدہ طبقہ کے ساتھ قادیانی اور منکرینِ سنت جماعت کی دشمنی میں سب سے زیادہ سرگرم اور فعال ہیں، ان کا جہاں جہاں بس چلتا ہے، جماعت کی مخالفت کرتے اور اسے نقصان پہنچانے سے باز نہیں رکتے!

جماعتِ اسلامی تقلیدِ جامد پر احتساب کرتی اور دوسرے فقہی مذاہب کی طرح اہلِ حدیث کے مسلک کو بھی حق بتاتی ہے تو علماء اہلِ تقلید کی بھویں تن جاتی ہیں اور تقلید کے جائز حدود کی نشان دہی کرتی ہے، تو اہلِ حدیث بدک جاتے ہیں۔

پھر ان پیشہ ور علماء اور خانقاہی شیوخ کا طبقہ جماعتِ اسلامی کو کس طرح انگیز کر سکتا ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی طرف اگر عوام مسلمان ڈھل گئے تو ہمارے حلوے مانڈے کی خیر نہیں! ہمارا تو سارا کاروبار عوام کی عقیدت کے سہارے چل رہا ہے اس عقیدت میں کھنڈت پڑ گئی، تو ہمارے کاروبار کو جو گھم پہنچے گی! خانقاہوں کے لنگر اور سماع کے نام پر جو نذریں آتی ہیں، مزاروں پر چراغاں، گلپوشی اور صندل مالی کے لئے جو رقمیں وصول ہوتی ہیں، اور اس یافت اور وصولیابی کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے یہ اگر بند ہو گئیں، تو ہمارے شاہانہ مصارف کی کون کفالت کرے گا۔

جماعتِ اسلامی معاذ اللہ نبیوں کی جماعت نہیں ہے اور نہ اس کے ارکان صحابہ کا درجہ رکھتے ہیں، وہ ہم جیسے انسان ہیں، جماعتِ اسلامی والے نہ غلطیوں سے پاک و معصوم ہیں اور نہ لغزشوں سے محفوظ ہیں! ان سے بھی فکر و رائے کی غلطیاں ہوتی ہیں اور ان میں بھی کمزوریاں پائی جاتی ہیں ——— مگر یہی واقعیت کی صحیح ترجمانی ہے کہ مجموعی طور پر جماعتِ اسلامی اسلام کی مفید خدمت انجام دے رہی ہے، اس کے ارکان دین کے معاملہ میں بڑے ہی مخلص اور فرض شناس ہیں کوتاہیاں اور کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں، جماعتِ اسلامی اور اس کے کارکن بھی ان سے مبرا نہیں ہیں مگر نتائج کے اعتبار سے جماعتِ اسلامی کا کام دین، ملت اور مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ہی ثابت ہوا ہے، جماعت کی کوششوں نے کام کو لگا ڈا نہیں بنایا ہے، کشتیوں کو اُلجھا نہیں ٹھیلا ہوا ہے، جماعت کا لٹریچر پڑھ کر لاکھوں انسان دین کے قریب آگئے ہیں، اور جو نماز کا مذاق اڑاتے تھے، ان کی پیشانیوں پر جماعتِ اسلامی سے متاثر ہونے کے بعد سجدوں کے نشان دیکھے گئے ہیں!

جماعتِ اسلامی کا کوئی عقیدہ اس قسم کا نہیں ہے، جو کتاب و سنت اور اجماعِ اُمت، سوادِ اعظم اور سلفِ صالحین کے عقائد کے خلاف
ورنہ اسلام کے کسی دینی رُکن کے بارے میں جماعتِ اسلامی کسی غلط روش پر گامزن ہے! فقہ کی بعض جزئیات میں جماعت سے
ف کیا جاسکتا ہے، اور ہر مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جن مسائل میں جماعت کو صحیح نہیں سمجھتا، اُن پر احتساب اور اُن کی
ن دہی کرے۔ اگر کوئی چاہے تو فقہی مسائل میں جماعت کے اکابر کی غلطیوں پر کتاب لکھ کر چھپوا دے!

مگر

ت پر اس طرح احتساب کرنا، جیسے یہ کوئی گمراہ ٹولی ہے، جو دین میں رخنہ اندازی کے لئے پیدا ہوگئی ہے، اس کو قادیانی جماعت کے
ل قرار دینا اور اُس سے خارجیت کو منسوب کرنا، اس قسم کا احتساب شر پسندی اور بدنیتی کی دلیل ہے!

جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں بعض اچھے خاصے اہلِ علم اخلاق و دیانت کی حدود سے متجاوز ہوگئے ہیں، جماعت کے لٹریچر
بارتوں میں جان بوجھ کر کتر بیونت کی گئی ہے، نہ صرف کتر بیونت بلکہ کہیں کہیں الفاظ بدل کر اثبات کو نفی اور نفی کو اثبات
یا گیا ہے، ــــــ جماعت کی کتابوں سے ایسے مفاہیم و مطالب اخذ کئے گئے ہیں، جو نہ اُن عبارتوں سے نکلتے ہیں اور نہ لکھنے
ں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔

اور آج کل پاکستان میں بعض علماء جماعتِ اسلامی کی مخالفت اس انداز میں کر رہے ہیں، جیسے یہ دینی فریضہ ہے جو اُن پر
اور رسولؐ کی طرف سے عائد کیا گیا ہے! وہ جن کے چہروں پر لمبی ڈاڑھیاں ہیں اور زبانوں پر "قال اللہ" اور "قال الرسولؐ"
، دینی درسگاہوں سے جن کو فضیلت کی دستاریں اور تکمیل و فراغت کی سندیں بھی مل چکی ہیں، جن کے علم و تقویٰ پر کچھ لوگ
اد بھی رکھتے ہیں ــــــ اس قسم کے بزرگانِ دین (؟) اور حامیانِ شرعِ متین (؟) جب جماعتِ اسلامی اور اس کے کار
بتیں جوڑتے ہیں، اور جھوٹے الزامات تصنیف فرماتے ہیں، تو بڑا دکھ ہوتا ہے، ملّت کی بدنصیبی کی انتہا ہے کہ علم و تقویٰ (؟)
ری سطح پر آکر جھوٹ گھڑنے اور بے سروپا تہمتیں تراشنے کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں!

اللہ تعالیٰ کا محض فضل و کرم ہے کہ مخالفتوں کے ان طوفانوں میں جماعتِ اسلامی زندہ و پائندہ ہے اور اپنا کام کئے جا رہی ہے
مقصد میں غیر مخلص اور خام کار لوگ ہوتے تو ان مخالفتوں کو دیکھ کر ہی چھوڑ جاتے اور ہمت ہار بیٹھتے! مگر یہاں تو راستے کے
انٹے کی جراحت ذوقِ سفر میں اور گرمی اور تیزی پیدا کر رہی ہے اور اس راہ کی تمام دشواریوں، رکاوٹوں اور ناہمواریوں کے
جود یہ کاروانِ حق و صداقت بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے!

عالِق پاکستان بننے کے بعد جماعتِ اسلامی نے دینی نظام کے قیام کے لئے مسلسل جدوجہد کی ہے، اور اس بارے میں اس کا
جو موقف اب سے پندرہ سال پہلے تھا، وہی آج بھی ہے! پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے جو چولے بدلے ہیں، اور
جماعتوں کے جس طرح ٹکڑے ہوئے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ان پارٹیوں کے بعض اونچے درجہ کے لیڈروں نے اپنی
عتوں سے جو غداریاں کی ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں، مگر جماعتِ اسلامی اپنے موقف سے بال برابر ادھر سے اُدھر نہیں ہوئی!

دوسری سیاسی پارٹیوں میں عہدوں کے لئے کیا توڑ جوڑ اور کیسی کیسی رسّہ کشی ہوتی ہے مگر جماعتِ اسلامی کے عہدوں کے
نہ کوئی اُمیدوار کھڑا ہوتا ہے، نہ کوئی اپنی ذات کے لئے کنویسنگ کرتا ہے، جماعت کے انتخابات جس اطمینان و سکون اور
ں اعتماد و محبت کی فضا میں ہوتے ہیں، اُن کی آج کی غرض پرست اور جاہ طلب دنیا میں مثال ملنی مشکل ہے۔

پاکستان بننے کے بعد یہاں کے اربابِ حل و عقد "نیشنل گورنمنٹ" بنانے کا عزم رکھتے تھے، یہ جماعتِ اسلامی ہے جس کی

جدوجہد سے ان عزائم کو بروئے کار نہیں آنے دیا۔ اور آج ہر طرف سے "اسلامی حکومت" کی صدائے بازگشت آرہی ہے! اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے کہ پاکستان کا ہر بڑا آدمی طوعاً و کرہاً "اسلام" کا نام لینے پر مجبور ہے! "اسلام" کا نعرہ لگائے بغیر یہاں کسی کو عزت اور منصب نہیں مل سکتا!

وہ منیر رپورٹ ہو، عائلی کمیشن کی رپورٹ یا تعلیمی منصوبہ بندی کی رپورٹ ہو، جب بھی ایسے مواقع آئے ہیں، جماعتِ اسلامی آگے بڑھی ہے، اور اس نے علمی، عقلی اور دینی دلائل کے ساتھ ان رپورٹوں کی خامیاں ظاہر کی ہیں اور بڑی جرأت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے فرض کو ادا کیا ہے۔

ایک طرف تنہا جماعتِ اسلامی ہے اور دوسری طرف "ادارۂ طلوعِ اسلام" "ادارۂ ثقافتِ اسلامی" اور "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" ہیں جو مغرب زدگی اور تجدد و آزاد خیالی کو غذا اور کمک پہونچا رہے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر علمی محاذ پر جماعتِ اسلامی نے ترکی بہ ترکی جواب دے کر ان فتنوں کو بے اثر بنا دیا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے توڑ پر اس کے مقابلہ کے لئے پاکستان میں کتنے ہی علمی ادارے قائم کئے گئے ہیں، جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو رہا ہے، ایسی کتابیں جن میں جماعتِ اسلامی پر تنقید و احتساب کیا گیا ہے، سرکاری دفتروں میں مفت تقسیم کی گئی ہیں! ادارۂ "طلوعِ اسلام" کے لٹریچر کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی، یہ "کفریات" ہر دفتر میں بار پا سکتی ہیں مگر جماعتِ اسلامی کے لٹریچر پر قدغن! کتنے ملازمین کو جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے کے جرم میں لگے لگائے روزگار سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں!

جماعتِ اسلامی کا اس کے سوا اور کیا قصور ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام اور اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر چاہتی ہے اور اسی کے لئے وہ جدوجہد کر رہی ہے! اس جرم کی پاداش میں اس کے اکابر اور کارکنوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی ہیں، اس کے بعض وابستگان و متعلقین کی پولیس نے اخلاقی مجرموں کی طرح نگرانی کی ہے! اور ختمِ نبوت کی تحریک کے سلسلہ میں اس تماشے کو بھی چشمِ فلک نے دیکھ لیا کہ جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا، مگر جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے!

جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے کے جرم میں اس کے بعض کارکنوں اور ہم نواؤں کو ملازمت، سرکاری ٹھیکوں اور تجارتی کاروبار میں طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑے ہیں! ان تمام مصیبتوں اور آفتوں کو خدا کے ان نیک بندوں نے صبر و شکر اور عزیمت کے ساتھ برداشت کیا ہے۔

سوچئے!! جماعتِ اسلامی نے یہ کبھی نہیں کیا کہ کسی سیاسی نعرہ کو "اسٹنٹ" بنا کر بس اسی کے پیچھے لگی رہے! جب وہ اسمبلیوں کے لئے الیکشن کے لئے تیاری کرتی ہے، تو اس وقت بھی اس کی شاخوں میں باضابطگی کے ساتھ قرآن و حدیث کا درس ہوتا ہے! الیکشن کے کیمپوں میں بھی اس کے ارکان پابندی کے ساتھ وقت پر نمازیں پڑھتے ہیں، جب ان پر مالی پریشانی اور تنگی ترشی کے وقت آتے ہیں، اس وقت بھی وہ حرام و حلال میں امتیاز کرتے ہیں۔

مذہبی لوگوں کو مغربی طبقہ دُنیا کے کاموں میں بے عقل، بے سلیقہ، ناکارہ اور کودن و غبی سمجھتا ہے، جماعتِ اسلامی نے اپنے طرزِ عمل، سلیقہ، ضبط و نظم اور فراست و شائستگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دین دار دُنیا کو برتنے کا بھی سلیقہ رکھتے ہیں،

جماعتِ اسلامی کے جلسے کس قرینہ اور سلیقہ کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں، لوگ آئیں نہ آئیں، جو وقت مقرر ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی وقت پر جلسے شروع ہو جاتے ہیں! جماعتِ اسلامی کے جلسوں نے لوگوں میں وقت کی پابندی کا احساس پیدا کر دیا ہے! جماعت

کے جلسوں میں کسی قسم کی نعرہ بازی نہیں ہوتی، شروع سے لے کر آخر تک سکون اور ضبط و نظم !!

جماعت کے دفتر اور دفتروں کے فائل، کتابیں اور رجسٹر کس قدر مرتب اور مہذب ہوتے ہیں، ہر شعبہ آئینہ کی طرح روشن! خاص طور سے روپیہ پیسہ میں انتہائی دیانت داری کا معاملہ! کوئی گڑبڑ، کسی قسم کا گھپلا اور گول مال نہیں! کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ کام! خدمتِ خلق کا کام جماعت نے اپنے ہاتھ میں لیا اور مریضوں کی امداد کے سلسلہ میں ایک مثال قائم کر دی! حکومتیں جو کام لاکھوں کے خرچے سے کیا کرتی ہیں، جماعت نے ہزاروں کے مصارف سے اُس کام کو اور زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ کر کے دکھا [illegible]

جماعت نے مزدوروں کے شعبہ پر توجہ کی تو " کامریڈ لیڈر " بوریا بستر باندھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ! کام کرنے والوں کے حقوق کے لئے پوری جد و جہد کی مگر کوئی ہڑتال نہیں ہونے دی ــــــ جماعتِ اسلامی نے طلبا پر دینی اخلاق کا اثر ڈالا، تو اُن کو شریف، باحیا اور فرض شناس بنا دیا۔ یہاں تک کہ اسکولوں اور کالجوں کے کیمونسٹ طلبا اپنے مشن کی ترقی کو جامد و ساکن محسوس کرنے لگے ــ جو ہائی اسکول جماعتِ اسلامی کے زیرِ نگرانی چل رہے ہیں اُنکے طلبا ایک طرف تو اخلاقی طور پر دوسرے اسکولوں کے طلبا سے ممتاز ہیں دوسری طرف امتحانات کے نتائج [illegible]

جماعتِ اسلامی کے مقاصد، پروگرام اور اُس کے کاموں کا جو جائزہ ہم نے لیا ہے، اُس میں کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ ہم نے دینی خیر خواہی کا فریضہ سمجھ کر اپنا وقت اور دماغ اس کام میں صرف کیا ہے! جماعت موجود ہے، اُس کا لٹریچر موجود ہے اور اس کے اکابر اور کارکن زندہ ہیں، عوام و خواص چاہیں تو اپنے اطمینان کے لئے ہر چیز کا خود مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کر سکتے ہیں

ہم پاکستان میں برسوں سے اس کا تماشا دیکھ رہے ہیں کہ جو " بڑے لوگ " کیمونزم اور اسلام دونوں سے ڈرتے ہیں، اُن سے عجیب و غریب بدحواسیاں سرزد ہوتی ہیں۔ کیمونسٹ بڑے چالاک ہیں، وہ رقص و سُرود اور اس قسم کے دوسرے بداخلاقی کے مظاہروں کو شہ دے کر اپنے مقصد میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں اس لئے کہ اسلامی اخلاق کو جہاں بھی، جس عنوان سے بھی نقصان پہونچتا ہے، اس میں کیمونزم ہی کی جیت ہوتی ہے ـــــ مگر اسلام غریب کیا کرے! وہ تو ان لغویات میں قصر و ایوان کا ساتھ نہیں دے سکتا! یہی سبب ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں کیمونسٹ اور عیش پسند مغرب زدہ طبقہ بالآخر ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے!

جماعتِ اسلامی اپنے محدود ذرائع و وسائل کے باوجود ان نامحدود مخالفتوں سے ہراساں نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر اُس کے دین کو برپا کرنے کے لئے جد و جہد کر رہی ہے! اس راہ کی مشکلات جماعتِ اسلامی کے لئے غیر متوقع نہیں ہیں ـــــ اُس نے آغاز ہی میں اس تصور کے ساتھ اس راہ میں قدم بڑھایا تھا ؎

یہ قدم قدم قیامت، یہ سوادِ کوئے جاناں

وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

ماہر القادری ۲۶ نومبر ۶۲ء

غلام مصطفےٰ بسمل انصاری

فصاحت جانِ تغزل ہے

اور

حقیقت روحِ شعر

یہ دعویٰ بے دلیل و بے ثبوت نہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف طبائع مختلف مضامین کے اشعار کو اپنے اپنے رجحانِ طبع کے اعتبار سے پسند کرتے ہیں ۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ یہ سوال نفسیاتی تجزیہ سے متعلق ہے جس پر موشگافی کی نہ یہاں گنجائش ہے نہ ضرورت ۔ مگر چاہے جس مضمون کا شعر ہو سلاستِ کلام اور خیال کا حقیقت پر مبنی ہونا عام طور پر پسندیدگی کا باعث ہوتا ہے ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ ظاہر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ ۔ شعر یا کلام منظوم کیا ہے ؟ اہلِ عروض کے نزدیک شعر کلام مخیل موزوں ہے جو مقررہ اوزانِ عروضی میں سے کسی وزن سالم یا اسی کی کسی فرع میں ہونا چاہیے ۔ مزید وضاحت یہ کرتے ہیں کہ وہ کلام موزوں بہ انبساط یا بہ انقباض اثر کرے ۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ شعر کلام موزوں یعنی کسی اصول کے ماتحت الفاظ کو دو برابر کے حصوں میں یوں جمع کرنا ہے جن سے ترنم پیدا ہو ۔ مگر یہ کہنا کہ معینہ اوزان کی حد ہی میں کلام موزوں رہے گا یک طرفہ فیصلہ ہے ۔ کیوں کہ سات طرح کے ارکان کو مختلف طریقوں سے ترکیب دے کر ان سات بحروں کے علاوہ خود عروضیوں نے بارہ بحریں اور بنائی ہیں اور پھر زحافات سے ان کی متعدد فرعیں بھی بنا ڈالی ہیں ۔ تو اسی طرح اور بحور بننے کی بھی گنجائش ہے ۔ مثلاً متدارک مخبون اور متقارب سالم کے ارکان سے ایک بحر مسدس الارکان یہ بنتی ہے ۔ "نغمہ کرم کی نئی زندگانی" اس کے علاوہ اور مترنم بحریں بھی ہو سکتی ہیں ۔ اور اثر بہ انبساط یا بہ انقباض نثر سے بھی ہوتا ہے ۔ نظم ہی میں کیا خصوصیت ہے خیر اس الجھن میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ دراصل ترنم یعنی موسیقیت الفاظ کو ترکیبِ خاص دینے سے پیدا ہونے پر کلام موزوں کہا جاتا ہے کلام موزوں گنگنانے کے اصول سے گلے سے ادا کیا جائے گا تو موسیقی کا عنصر غالب ہوگا اور اگر سادہ پڑھا جائے گا تو تحت اللفظ کہلائے گا ۔ گانے کا اثر ہر جاندار پر ہوتا ہے ۔ لیکن انسانی دماغ چونکہ تمام دوسری مخلوق سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے یہ کلام موزوں سے چاہے سادہ پڑھا جائے چاہے گا کر ہر طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے ۔ لیکن انسان کے لیے تنہا موزونیت ہی لطف خاص کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ کلام مترنم میں ایسے مفہوم کی بھی ضرورت ہے ۔ جو لائق اظہار ہونے کے ساتھ بلند و لطیف خیال کا حامل ہو ۔ اور صحیح بامحل نرم و شائستہ الفاظ بھی لازمی ہیں کہ الفاظ ہی مطلب ادا کرنے کا ذریعہ ہیں ۔ ورنہ کہنا کچھ ہوگا اور الفاظ کچھ ظاہر کریں گے ۔ اگر بے محل و ثقیل الفاظ ہوں گے تو فصاحت کا خون ہوگا ۔ ناشائستہ الفاظ سے وقار کلام مٹ جائے گا ۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اچھے شعر کے لئے لازمی ہے کہ اس میں کوئی اچھا مفہوم ہو اور وہ مفہوم صحیح ۔ بامحل ۔ نرم روزمرہ میں ادا کیا جائے ۔ اس سب کے بعد ایک ضرورت اور باقی رہتی ہے ۔ یعنی اصول فصاحت کے اندر بیان میں جدت جو تاثیر کے لئے بہت ہی خاص چیز ہے ۔ یہی ایک فطری شاعر کی وہ طاقت ہے جو سننے والوں کو بے اختیار جھومنے پر مجبور کر دیتی ہے یہاں نمونہ کے طور پر سات ایسے ہی قادر الکلام شعرا کے علیحدہ علیحدہ چند اشعار پیش کئے جاتے

ہیں جن کو پڑھ کر اہلِ نظر خود فیصلہ فرمائیں کہ یہ دعویٰ کے صحیح ثبوت ہیں یا نہیں۔ ان شعراء میں تین دہلوی ہیں اور تین لکھنوی۔ ایک ایسے ہیں جو پیدائش کی بنا پر نہ دہلوی ہیں نہ لکھنوی ہیں اور پھر دہلوی بھی ہیں اور لکھنوی بھی۔ کیوں کہ ان کی آدھی زندگی چمنستان دہلی میں گزری اور آدھی بوستان لکھنؤ میں ان دونوں گلستانوں ہی سے ان کی طبیعت نے رنگ و بو حاصل کیا جس کے بعد وہ خود مستند اُستاد بن گئے۔ اس میں جناب مصحفی کی طبیعت داری اور دونوں ادبستانوں کے فیضانِ ادب برابر کے شریک ہیں۔ اب سب سے پہلے خواجہ میر درد علیہ الرحمان کے تین شعر یادداشت سے پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:—

یک بیک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کیا اُس کے آ گیا ہوگا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

مت عبادت پہ پھولیو زاہد — سب طفیلِ گناہِ آدم ہے

پہلے شعر میں اگر تفصیل سے بیان کیا جائے تو بھی شعر کے لطف کا بیان مشکل ہے نہ کہ جب اختصار مقصود ہو۔ تو کچھ اشارہ ہی کئے جا سکتے ہیں اب نفسیاتی بنا پر راہ خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے۔ باوجود سادگی الفاظ ان کی جرأت اور معنویت پر غور کیا جائے معلوم ہوتا ہے کوزہ میں دریا بھر دیا ہے یعنی ایک عاشق نامراد اچانک لبِ محبوب پر اس کا نام آ جانے سے طرح طرح کا مطلب اپنے دل میں پیدا کر رہا ہے۔ سوچتا ہے وہ معشوق جو مجھ سے بے اعتنائی کا برتاؤ ہی نہیں کرتا تھا بلکہ میرے متعلق ذکر سے بھی کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا۔ اس کی زبان پر یکایک بلا سبب میرا نام کیوں کر آ گیا۔ یہاں "جی میں کیا اس کے آ گیا ہوگا" کہہ کر شاعر نے سوچنے کے لئے بڑی وسعت چھوڑی ہے۔ یہی فصاحت کے ساتھ بیان کی جدت ہے۔ صرف شک اور یقین کے درمیان کی حالت کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ نہیں کہا کہ معلوم ہوتا ہے محبوب کے دل میں بھی حساس محبت موجود ہے مگر شانِ خودداری اُسے ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ آج بے خیالی میں جو اس کے منہ سے نکل گیا اس سے مایوس دل میں روشنی کی لہر دوڑ گئی۔ سادے الفاظ میں اتنا کچھ کہہ دینا۔ زبان پر قدرت اور بیان پر قابو کا بہترین مظاہرہ ہے۔

دوسرے شعر میں بندش کی چستی اور بیان کی صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں۔ کہ جب تک انسان تندرستی کی زندگی بسر کرتا رہتا ہے سمجھتا ہے کہ بس میں یوں ہی زندہ و سلامت رہوں گا اور جو لطیف زیست ہے اس کو ہمیشگی حاصل ہے۔ لیکن جب موت آنکھوں کے سامنے اپنی بھیانک صورت میں سامنے آتی ہے تو ہوش آتا ہے اور حقیقتِ حال کو سمجھ کے کہتا ہے کہ اب معلوم ہوا جو ابھی تک دیکھتا تھا وہ خواب دیکھ رہا تھا اور جو سن رہا تھا وہ بھی اسی عالم رویا میں جیسے کوئی جھوٹی کہانی سنا رہا ہو یہ حالت تھی۔ افسوس کہ اس سے پہلے یہ نہ سمجھ سکا۔

تیسرے شعر میں۔ اپنی عبادت و ریاضت پر ناز کرنے والوں اور غیر عبادت گزاروں کو بنگاہ حقارت دیکھنے والوں سے۔ شوخی کے ساتھ رندانہ خطاب ہے۔ کہ اے عبادت پر مغرور زاہد یہ سمجھ لے اگر ابوالبشر آدم شجرِ ممنوعہ کے پاس جانے کی غلطی نہ کرتے تو جنت ہی میں رہتے اور خرابہ ہستی میں نہ بھیجے جاتے۔ نہ یہ گناہ و ثواب کا فرق پیدا ہوتا۔ تو عبادت کر کے ملک صفت ہو گیا تو ہو جا۔ لیکن یاد رکھ کہ گناہِ آدم ہی کے صدقے میں یہ زہد کی توفیق ہوئی جس پر تو اتراتا ہے۔ یہاں لفظ آدم اس حسن سے استعمال ہوا ہے جس سے آدم ابوالبشر اور بنی آدم دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ اسی سے شعر میں خاص تنوع پیدا ہوا ہے۔ اب چند اشعار جناب میر تقی میر کے ملاحظہ ہوں:—

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

آتا ہے جی میں حال دل اپنا بھلا کہوں — پھر آپ آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

فرصتِ زندگی کو مت پوچھو — سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے

صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں — گویا متاعِ دل کے خریدار مر گئے

دیکھئے پہلے شعر میں کوئی لفظ غیر اردو نہیں مگر سبحان اللہ کلام میں کیا شیرینی ہے۔ مفہوم پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کوئی بہ آواز بلند سوچ رہا ہے۔ اور یوں دل سے باتیں کرنے میں اُس جذبہ کو بیان کرتا ہے جو محبوب سے ملنے پر سب دل کا حال بیان کرنے کے متعلق خیال ہوتا ہے۔ یعنی دل ہی دل میں چاہنے والا سوچا رہتا ہے کہ محبوب ملے گا تو اس طرح اپنا حالِ غم بیان کرونگا اور یوں اثر کرنے والے الفاظ میں اپنا دکھ درد کہوں گا۔ مگر پھر بارہا تجربہ شدہ ایسے ہی واقعات یاد کرکے خود ہی کہتا ہے۔ کچھ نہیں یہ سب دل کو ڈھارس دینے کی باتیں ہیں۔ اس سے ملنے پہ ان باتوں کا ہوش ہی کب رہے گا۔ اس سے ملنے کی خوشی منز کمیل دے گی سانس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کروں گا۔ ایک حرفِ مطلب بھی زبان سے نہ نکلے گا اور یوں ہی وہ وقفہ ختم ہو جائے گا۔ آنا اور جانا کا استعمال قابلِ غور ہے۔ ان الفاظ سے جو زمانہ ظاہر ہوتا ہے وہ دیکھنے کا ہے۔

دوسرے شعر میں بات کہنے کا انداز ویسا ہی ہے۔ لیکن مفہوم جدا ہے۔ جس سے فیصلہ کی قوت کے ساتھ شانِ خودداری کی بھی نمود ہے۔ فرماتے ہیں اُس ناآشنائے درد و محبت سے اپنے دل کا حال۔ کیا بیان کر دوں ؟ پھر خود ہی کچھ سوچ کے فیصلہ کرتے ہیں کہ اپنا درد دکھ کہنے میں سوائے بے اعتنائی کی ذلت کے اور کچھ حاصل نہیں۔ یہ مفہوم نظم کر دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن ان الفاظ میں مفہوم ادا ہونے سے جو بات پیدا ہو گئی وہ دیکھنے کی ہے۔ اول لفظ " بھلا " کا محلِ استعمال جس سے معنوی حسن کے علاوہ کیفیتِ بیان میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ " پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں " کا کہنا زبان کی لطافت کا نمونہ ہے اور " کیا کہوں " کے لہجہ کی تو کوئی پناہ ہی نہیں۔ انہیں باتوں سے میرؔ خدائے سخن کہے جاتے ہیں۔

تیسرے شعر میں وقفۂ زندگی کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھو۔ کیونکہ یہ عالم ہے۔ ابھی ہم سانس بھی نہ لینے پائے تھے۔ کہ پیکِ اجل نے کہا بس چلئے فرصتِ حیات ختم۔ آخری الفاظ شعر میں نہیں لیکن دوسرا مصرعہ اسے اس طرح بتا رہا ہے کہ ابہام حسن بن گیا۔ اور لفظ " سانس " کے حسنِ استعمال کا کیا کہنا۔ یہ مضمون سبھی نے کہا اور شاعر کہتے رہتے ہیں لیکن اس طرح کا اندازِ بیان کہاں نصیب ہوتا ہے۔

چوتھے شعر میں خلوص و محبت کی بے قدری پر مایوسانہ گلہ سنجی اور آخر میں جھنجھلاہٹ کے ساتھ طنز ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ وفا کو دنیا پہچانتی ہی نہیں ہے یا یہ الفاظِ دیگر سر فروش تو کار رواں در کارواں ہیں۔ لیکن اس جنسِ گراں کا خریدار کیسا۔ یہ بھی کوئی نہیں پوچھتا تم بیچتے کیا ہو۔ اس کساد بازاری سے اُکتا کر کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس چیز کے خریدار ہی دنیا سے اُٹھ گئے۔ " گویا متاعِ دل کے خریدار مر گئے " ، بالکل ایسے ہی کہا ہے۔ جیسے بازار ٹھنڈا ہونے پر دوکاندار جھلا کے کہا کرتے ہیں۔ کہ بازار میں ایسا سناٹا ہے کہ جیسے سب گاہک مر گئے۔ شعر میں دوکانداروں کی اصطلاحیں استعمال ہوئیں مگر کمال یہ ہے کہ سوقیانہ پن نہیں آنے پایا۔ ادبی وقار حسن کے ساتھ قائم رہا۔ اس کے بعد چند اشعار شیخ مصحفی ہمدانی کے ملاحظہ ہوں :۔

تیرے در پہ اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

چلی بھی چل جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

پہلا شعر اُس پرانے ہندوستانی معاشرہ کے رسم و رواج کا آئینہ دار ہے جس میں چاہے جان جاتی رہے مگر رازِ عشق نہ افشا ہو۔ اسی ماحول کے ایک عاشقِ زار کی حالت کا غزل کی زبان میں نقشہ کھینچتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ دل کی لگی سے مجبور تیرے دروازہ کے سامنے صبح سے رات تک اس امید میں کہ شاید تیری جھلک ہی نظر آ جائے۔ ہم چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ لیکن ہر وقت وہیں موجود رہنے کے لئے کوئی بہانہ چاہئے تھا۔ اس لئے یہ راہ نکالی کہ کبھی کسی سے کبھی کسی سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ یوں اپنے کو

چشم نمائی اور تجھے رُسوائی سے بچالے ہیں۔ اس طرح حال میں محبوب کے اس کی بے پروائی کا شکوہ بھی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم تو تیرے لئے کچھ کا کچھ کر یوں زندگی گزار رہے ہیں اور تو ہے کہ خبر بھی نہیں لیتا۔ ایک بات جو یقینی ممکن الوقوع ہے اس کو کس عمدہ پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ اور الفاظ کی نرمی۔ کلام کی فصاحت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

دوسرے شعر میں کس حسین انداز سے ہمت دلائی جا رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے نسیم (سانس سے مُراد ہے) یعنی دل کی آواز پر بڑھتی چل۔ آخر کاروانِ موسمِ گل جس کے پیچھے تو دوڑ رہی ہے کہیں تو قیام کرے گا یعنی کبھی تو منزل آخر ملے گی۔ جلد ہی نتیجہ نکلنے کی امید نہ رکھ۔ کیونکہ جیسا عظیم مدعا ہوتا ہے ویسی ہی بڑی بڑی مشکلیں بھی ہوتی ہیں۔ حسن بیان پر غور کیجئے تو سبحان اللہ۔ کلی کے چٹکنے کی فرضی آواز کو جرس غنچہ کی صدا کہہ کے انہونی بات کو حقیقت کر دکھایا ہے اور لوازم موسم گل کو قافلہ بہار کہہ کر اُسے اور مضبوط کیا۔ پھر غنچہ دل سے مشابہ اور جرس ان دونوں سے ملتا جلتا یوں تشبیہ تام کا بھی لطف پیدا کیا۔ اور تیزی سے گزر جانے والے وقفہ کو "کہیں تو ٹھہرے گا" سے ظاہر کیا۔ سُبحان اللہ!

تیسرا شعر۔ اس شعر میں صرف ارود الفاظ سے ایک بڑا سا مطلب ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ رونے والے کے آنسو رکتے رکتے رکتے ہیں۔ یعنی خوشی کے مقابلہ میں غم بہت دیر پا ہوتا ہے۔ اس بات کو ذو معنی الفاظ میں کہا ہے جس سے شعر میں اور کیفیت پیدا ہو گئی۔ یعنی یہ رونا ہے ہنسی نہیں کہ لب بند کئے اور ہنسی غائب۔ رونے میں آنکھیں بند کر لینے پر بھی آنسو بہتے رہے ہیں دوسرے معنی یہ کہ غم جس سے دل کا خون پانی ہو کر بہ نکلا ہے، اس کا فوراً خاتمہ ہو جاتا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ وہ غم جاتے جاتے جائے گا اب تین شعر خواجہ آتش کے بھی ملاحظہ ہوں:

پار اُترا وہ جو ڈوب گیا بحرِ عشق میں — وہ داغ ہے جو دامن ساحل میں رہ گیا

اے موجِ بے لحاظ سمجھ کر مٹائیو — دریا بھی ہے اسیر طلسم حباب کا

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

پہلا شعر الفاظ کی نشست کے اعتبار سے مرصع کاری کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ ہر لفظ سے زورِ بیان ظاہر ہے اور خواجہ آتش کے مزاج میں جو ایک بانکپن تھا اس کی بھی جھلک صاف نظر آ رہی ہے۔ فرماتے ہیں عشق و محبت کے سمندر میں جو غرق ہو گیا اُسی کو سمجھنا چاہیے اس بحرِ ناپیدا کنار کو عبور کر گیا اور جو کنارے کی فکر میں رہا وہ دامن ساحل میں ایک دھبا ہے۔ یعنی کسی شے کی طلب کے یہ معنی ہیں کہ اپنے کو اُس کی تلاش میں گم کر دے۔ جو ایسا نہیں کر سکتا وہ شوقِ طلب کے مقدس دامن میں ایک بدنما داغ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ داغ پر لہجہ کا ایسا زور ہے کہ "داغ" کا لفظ گویا گالی بن گیا۔

دوسرے شعر میں عجیب ترکیب سے مفہوم ادا کیا ہے جس سے ہر سمجھنے والا بھی اپنے مزاج کے موافق معنی لگا سکتا ہے۔ ایک غیر ذی رُوح یعنی موج سے خطاب ہے اور اسے بے لحاظ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "اے موجِ بے لحاظ" یعنی کسی سے رعایت نہ کرنے والی موت ذرا دیکھ بھال کے۔ کیونکہ "حباب" یعنی بے اعتبار زندگی کے طلسم میں محیط کائنات بھی پھنسا ہوا ہے۔ یعنی حیات اور ہستی عالم لازم و ملزوم ہیں۔ ہم نہیں تو کائنات بیکار۔ حباب کی شکل نظر میں رکھتے ہوئے لفظ طلسم کا لفظ سوچئے پھر دریا اور حباب کا تعلق ملحوظ رکھتے ہوئے "اسیر طلسم حباب" کے اس ٹکڑے کو دیکھئے۔

تیسرے شعر میں ایک ایسی حقیقت بیان کر دی ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ لیکن یہی بات اگر نثر میں کہی جاتی تو صفحے کے صفحے سیاہ کر لئے جاتے پھر بھی یہ تاثیر نہ پیدا ہوتی۔ جو شاعرِ فصیح البیان نے دو مصرعوں میں بیان کر کے دکھا دی ہے۔ ایسے ہر اشعار زبان زد

خاص معلوم ہوجاتے ہیں فرماتے ہیں کہ قدرتی حسن کے لئے سجاوٹ یا سنگار کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں تو فطری زیب و زینت موجود ہے۔ تکلفاتِ آرائش سے تو فطری حسن کی توہین ہوتی ہے۔ پھر جدت بھی کیسا پکا دیا ہے۔ کہ گل کے لباس میں۔ پھول بوٹے نقش و نگار کب ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ کتنا دل کش معلوم ہوتا ہے۔ ہر کس و ناکس اس کی خوبی کا معترف نظر آتا ہے۔

مرزا غالب کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان کی طبیعت کا عجیب رنگ ہے۔ یہ ہر معمولی سے معمولی بات کو بڑے گھماؤ پھراؤ سے کہتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے ان کو توالی اضافات سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہرحال جو کہتے ہیں سو اس انداز سے کہتے ہیں کہ بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سبب ان کی جدت پسند طبیعت ہے نہ کہ غیر معتدل الفاظ۔ جیسا عام طور سے سمجھا جاتا ہے اسی لیے صرف زبان کی نقالی سے ابھی تک وہ کامیابی کسی کو حاصل نہ ہوسکی اور مرزا صاحب کی جگہ الگ قائم ہے۔ اب ملاحظہ ہو کہ ہوس ناکی اور پاک محبت کا فرق، بہت کچھ موضوع شعر رہا ہے۔ وہی بات مرزا صاحب اپنے انداز سے فرماتے ہیں:-

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

پہلے مصرع میں ہوس کی حقیقت یہ بتا کے کہ جیسے گھاس پھونس کے شعلہ کی لپک یا تیزی ایک سانس کے وقفہ کی ہوتی ہے۔ وہی حال اہل ہوس کا ہے۔ کہ زبانۂ آتش ہوس بلند ہوا اور سہات کی بات میں بجھ گیا۔ یہاں دیرپا سچی محبت کے سوز وفا کی حرمت کا لحاظ کہاں یہ کام یعنی پاک محبت کی عزت کا خیال رکھنے والے بات کے دھنی اور ہوتے ہیں۔ مصرع لگانے کی عجیب ترکیب ہے۔ ہوس کاری کے لمحۂ جوش و خروش کو خس و خاشاک میں آگ دینے سے شعلہ اٹھنے اور ختم ہوجانے کے وقفہ سے پہلے ہی مناسبت دے کر بتاتے ہیں کہ ہوس پرستی میں تسلسل کے ساتھ آتش شوق کی گرمی کا قائم رہنا ممکن ہی نہیں۔ دو شعر مختلف موضوعات پر اور ملاحظہ ہوں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پہلے شعر میں مشاہدہ پر اسی حقیقت نہ کھلنے کا راز یوں ظاہر فرماتے ہیں۔ کہ جس کو ہم سب مشاہدہ سمجھتے ہیں۔ وہ نامعلوم کی نامعلوم صورت حال ہے جس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ عالم امکاں میں دکھائی تو بہت چیزیں دیتی ہیں مگر صرف دیکھنے سے اشیاء کا علم نہیں ہوتا۔ یہ دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے نیند میں خواب دیکھتے ہیں کہ ہم جاگے ہوئے ہیں حالانکہ درحقیقت سو رہے ہیں اور جو دیکھ رہے ہیں وہ اصل میں تجربات دید کی بنا پر خیال کا پیش کیا ہوا نظارہ ہے۔

دوسرا شعر سادہ الفاظ میں قادر الکلامی کا مظاہرہ ہے۔ جس سے مرزا صاحب کی قدرت فصیح البیانی ظاہر ہوتی ہے شعر کیا ہے معجزۂ حسنِ بیان ہے۔ اس سب پر مزہ یہ کہ حقیقت ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ محبوب کے حسنِ کلام کی خوبی دیکھو۔ کہ جو بات اس کے منہ سے نکلا میں ہر بات کو یہی سمجھتا رہا کہ ہاں۔ یہ بھی میرے دل کی بات۔ وہ بھی میرے دل کی بات یعنی موافق و مخالف جو الفاظ اُس کی زبان سے ادا ہوگیا اس میں ایسا مزہ تھا کہ اچھائی برائی کا خیال کیسا مجھے تو یہ معلوم ہو رہا تھا یہی میرا مدعا ہے۔ سبحان اللہ اپنے مفہوم کا منفرد شعر ہے۔

جناب صفی لکھنوی غزل اور نظم دونوں اصناف کے زبردست شاعر تھے۔ افسوس کہ ان کا پورا دیوان چھپا ہی نہیں جو چند اوراق دیوان کے نام سے چھپے ہیں اس میں بہت سے مشاعروں کی کامیاب غزلیں بھی نہیں ہیں۔ کل دیوان کے مسودہ کی ضخامت ہزار ہا اوراق سے کم نہ تھی۔ آخر زمانہ میں جب وہ اپنے کلام پر نظر ثانی فرما رہے تھے تو میں نے اپنی آنکھوں سے اس مسودہ کی ضخامت دیکھی تھی۔ یہ سب [illegible] تعجب ہے کہ ان کی زندگی میں دیوان نہیں چھپ سکا۔ بہرحال یہ چار مطلع ہی ظاہر کر دیں گے کہ وہ کیسے [illegible] تھے

شاعر تھے اور بڑے شعرا کی صف میں ان کی جگہ کہاں ہے۔ فرماتے ہیں ؎

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا
میں زنجیرِ گیرِ محبت ہوں پرِ پرواز دو ہمصفیرو اک ذرا آواز پہ آواز دو
دنیا کا ورق بینش اربابِ نظر میں اک تاش کا پتا ہے کفِ شعبدہ گر میں
کل ہم آئینہ میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کئے کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

پہلا مطلع اُس حالت کی ترجمانی ہے جب ایک مدتوں کے ہجراں دیدہ عاشق کو اس کے محبوب سے ملنے کا موقع ملے۔ لفظ غزل کے معنی ہیں (حکایت کردن از جوانی وحدیث صحبت وعشق زناں) تو اب جب کہ اتنی عمر فراق میں گزر چکی معشوق نے پرانی باتیں یاد دلانا شروع کیں۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے مجھے بھی ساز چاہیے۔ لہٰذا وہ ساز یعنی گزرے ہوئے دورِ زندگی کو واپس بلانے کی التجا نا قابل وقوع سمجھتے ہوئے کھلے الفاظ میں بطور طنز فرماتے ہیں کہ ذرا جوانی کو بلا تو لینا۔ گویا وہ قریب ہی ہے اور پکارنے کی دیر ہے واپس آجائے گی۔ یا یوں کہیے کہ مطلوب کے ملنے اور ابتدائے عشق وجوانی کی باتیں کرنے پر ہوش ہی کب رہا کہ موجودہ حالت کا احساس کر سکیں۔ اس لئے جو عمل ہے سو اضطراری ہے علہ

دوسرے مطلع میں فرماتے ہیں۔ "میں زنجیرِ گیرِ محبت ہوں۔ یعنی دام بلائے محبتِ صیاد میں پھنسا ہوا پھڑک رہا ہوں۔ اے ساتھیو مجھے اڑ کے بلند ہونے کا سہارا دو۔ وہ یوں کہ میری آواز پر تم بھی آواز دیتے رہو جس سے ہمت قائم رہے گی۔ مطلب یہ کہ جس مصیبت میں مبتلا ہوں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انفرادی کوشش سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ ہمت ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا حقیقی جد وجہد نہ سہی شور وغل ہی مچاتے رہو تو ڈھارس بندھی رہنے سے کوششِ آزادی جاری رہے گی۔ اس مفہوم کو کس حسن سے غزل کی زبان میں بیان فرمایا ہے۔ یہ استادی ہے کہ صرف الفاظ سے ایسا رنگ تغزل شعر میں بھر دیا ہے۔

تیسرا مطلع۔ قریب قریب ہر شاعر نے مختلف طریقوں سے دنیا کی بے ثباتی بیان کی ہے اور یہاں جو کچھ نظر آتا ہے اُسے دھوکے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی بات کو جناب صفیؔ نے بالکل اچھوتے انداز میں فرمایا ہے۔ جس سے کیفیت کے ساتھ نیا پن پیدا ہو گیا فرماتے ہیں ہستی کی نیرنگیوں سے لوگ طرح طرح کے مطالب پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اہلِ فکر کی نظر میں صفحۂ ہستی کی یہ حقیقت ہے جیسے کوئی شعبدہ باز تاش کے پتوں کا کھیل دکھا رہا ہو۔ کہ ہاتھ کی صفائی سے جو پتا دکھاتا ہے وہ فوراً تبدیل ہو کر کچھ اور ہو جاتا ہے جس سے دیکھنے والے متحیر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصلیت کچھ نہیں ہوتی سب اپنی ہی نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔

چوتھا مطلع۔ فرماتے ہیں۔ جوانی گزر گئی۔ بڑھاپا آگیا۔ اب کاروانِ عمرِ رواں اس منزل پر ہے کہ ہوش آیا۔ آئینہ دیکھا تو چہرہ پہ ہر جگہ جھرّیاں ہی جھرّیاں نظر آئیں۔ جنہیں بہ نگاہِ حسرت وعبرت دیکھا کئے (یہاں استمرار قابلِ لحاظ ہے) اور انہیں عمرِ رفتہ کی منزلوں کے نشانوں کو دیکھتے دیکھتے ہم کھو گئے۔ کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشانوں سے مراد۔ وہ تمام غم وخوشی کے ہنگامے جو سفرِ زندگی میں ہمسفر تھے۔

جناب صفیؔ کی نظم کا ایک شعر یاد آگیا وہ بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ اس سے کچھ مرحوم کی نظم گوئی میں اندازِ فکر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ڈوب کے کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو یہ تماشا آکے گنگا کے کنارے دیکھ لو

ان اساتذہ کے بعد ایک ایسے استادِ باکمال کا کلام پیش کرتا ہوں جو اپنے دور کے مجتہدِ فن وموجدِ زبان ہونے کے علاوہ نئے نئے

علہ اس شعر کی یہ شرح محلِ نظر ہے (م۔ ق)

اسالیب بیان پیدا کرنے میں یکتائے روزگار تھے۔ ان کا نام نامی حضرت انور حسین اور تخلص آرزو تھا۔ لکھنؤ کے قدیم باشندے اور جناب جلال لکھنوی مرحوم کے جانشین تھے۔ طبعاً پرانے لوگوں کی طرح نہایت شریف النفس اور سادہ مزاج تھے۔ مرحوم بمبئی سے پاکستان کی محبت میں ۱۹۵۰ء میں تشریف لائے اور چند ماہ زندہ رہکر رحلت فرمائی۔ ان کے چند اشعار پہلے اس پاکیزہ زبان اردو میں ملاحظہ ہوں۔ جن میں بالارادہ کوئی فارسی و عربی کا لفظ شامل نہیں کیا گیا۔ اور جس زبان کے لئے خود ایک مقطع میں فرمایا ہے کہ۔

اپنی یہ اردو آرزو ہند و عجم کے بیچ میں آپ ہے اک اپنی جری تیغ ہے اور نہ داؤ ہے

پھر اس مقید زبان میں بھی اشعار نہیں بلکہ پورا دیوان کہہ ڈالا جو سُریلی بانسری کے نام سے دو بار چھپ چکا ہے۔ وقار کلام کے ساتھ زور بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:۔

کہاں نبھ سکا بن کے انجان جانا جھجکنا مرا اُن کا پہچان جانا

مرقومہ بالا مطلع میں ایک نفسیاتی الجھن کی حالت عجیب ڈرامائی انداز سے ظاہر فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں باوجود بے اعتنائی دل کی لگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انجان آدمی کے بھیس میں بھی جانے سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ کیونکہ ظاہری بھیس بدلنے سے اپنے دل کی یوں چھپ کے جانے میں پہچان لئے جانے کے اندیشہ سے جو گھبراہٹ کی بنا پر فطری طور پر جھجک ہونا چاہیئے۔ وہ تھی۔ آخر کو جھجکا۔ بس فوراً وہ پہچان گیا اور جو منصوبہ باندھ کے گیا تھا کہ اجنبی سمجھ کے محبوب لطف سے پیش آئے گا اور یوں لطفِ دید کے علاوہ ہمکلامی کے بھی مزے حاصل ہوں گے۔ وہ خاک میں مل کر رہ گیا۔ ایسی قیدیں اپنے اوپر عائد کر کے اتنا بڑا مفہوم ادا کر دینا غور کیا جائے تو ایک لسانی معجزہ ہی نہیں۔ خیال کے لئے راہیں پیدا کرنے کے بھی سبق ہیں۔

دوسرا شعر۔ فرماتے ہیں:۔

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ کس کا سہارا ٹوٹا ہے

تارے کا ٹوٹنا۔ یعنی شہاب ثاقب کا گرنا ایک فضائی واقعہ ہے۔ جس سے اہلِ دنیا کا بظاہر کوئی فائدہ یا نقصان نہیں۔ صرف اچانک واقع ہونے سے سب دیکھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اسباب شہرت کچھ ہوں۔ لیکن ایک مشہور شخص کے متعلق کوئی بات ہو تو بہت جلد عام خبر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گو کہ عوام کو اس سے عموماً براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن نظروں سے دور کسی بے کس مگر اہلِ دل کی دنیا لئے اُمید اجڑ جانے پر جو اشکِ حسرت مثل شہاب ثاقب گرتا ہے تو کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی حالانکہ یہ واقعہ انسانی زندگی سے براہِ راست تعلق رکھنے والا ہے۔ یہ معاشرہ کے نظام پر سنجیدگی کے ساتھ نہایت کڑی نکتہ چینی ہے۔ پھر فنکاری کے اعتبار سے جو مزہ ہے اس کا کیا کہنا۔ یعنی تارا ٹوٹنے سے آسمان پر روشنی کی لکیر۔ آنسو کا تار۔ اور رشتۂ اُمید ان تینوں کو ایک کر دکھایا ہے۔ اور ارشاد ہوتا ہے۔

اس من لُبھا کے آرزو۔ بدلی ہے مجھ سے آنکھ یوں جیسے کوئی چھڑک کے تیل۔ آگ لگا کے چھوڑ دے

اپنے دل کی خطا نہ سمجھنے والے دیوانۂ عشق کو جو شکایت ہے اس کا بیان یوں ہوتا ہے۔ کہ اس فریبندہ نے اپنے جذب حسن سے میرے دل پر قبضہ کر کے اس طرح نظر پھیری ہے۔ یا نگاہ لطف کا رشتہ قطع کیا ہے۔ کہ مجھے سوزِ غم سے ویسی ہی بے بسی میں جلنے کی حالت محسوس ہو رہی ہے۔ جیسے کسی پر تیل چھڑک کے اور آگ لگا کے جلتا ہوا چھوڑ دیا جائے۔ اور وہ سر و چراغاں بنا ہوا بیقراری میں دوڑتا پھرے۔ نہ تیل کی وجہ سے آگ کو بجھا سکے اور نہ ہر حصۂ جسم پھنکنے کے سبب اتنی قوت برداشت باقی رہے کہ کپڑوں کو تن سے جدا کر سکنے کے وقفہ تک ضبط کر سکے۔ کس غضب کی شدت بیان ہے۔ جلنے والے کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

اس سلسلہ کا آخری شعر:-

کالی گھٹاؤں میں کوندا لپکا رو رو کے جو کوئل کوک گئی　　جتنی لمبی سانس کھینچی تھی اتنی گہری ہوک گئی

اس مطلع میں استعمال الفاظ کے حسنِ صرف اور سادے کلمات کو جو معنی عطا کر دیتے ہیں۔ ان کا بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ کالی گھٹاؤں میں کوندا لپکنے۔ یعنی رہ رہ کے بجلی چمکنے کا سبب کوئل کے رو رو کر کوکنے۔ یعنی نالۂ غم۔ کو قرار دے کر فرماتے ہیں کہ جیسا تو اندوہ یا جیسی زوردار چوٹیلے دل کی ہائے تھی۔ اتنی ہی لمبی ہوک۔ یعنی درد کی چمک بھی اتنی ہی دیر تک رہنے والی اور دور تک پھیلنے والی تھی۔

قید کو توڑ کے سمجھا کہ سہارا توڑا　　ہاتھ میں پاؤں کی زنجیر لئے بیٹھا ہوں

سرِ شوریدہ کی گرمی کو ہے پیغامِ عمل　　یہ کڑی دھوپ جو پھیلی ہے بیابانوں میں

کہہ کے یہ اور کچھ کہا نہ گیا　　کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے

اک چھپ کر دیکھنے والے کی کیا جانیئے کیا حالت دیکھی

آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور پھر کے مری صورت دیکھی

سوادِ منزلِ موہوم گردِ راہ کی ہے　　نظر میں جلوۂ رنگین تھکن نگاہ کی ہے

پہلے شعر میں ایک نئے اور انوکھے انداز سے بیان نہ ہو سکنے والی حالت کی تصویر کشی کی ہے۔ یعنی محبت کے تعلق کا رشتہ جو قید معلوم ہوتا تھا اُسے توڑ کر سمجھ میں آیا کہ وہی قید تو زندہ رہنے کا سہارا تھی لہٰذا بطور ردِ عمل پاؤں کی زنجیر جسے خود توڑ ڈالا تھا اُسے ہاتھ میں لئے اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے سوچ میں بیٹھا ہوں۔ کہ یہ میں نے کیا کیا۔ بعینہٖ کوئی چیز اپنی بے خیالی یا نادانی کی وجہ سے ٹوٹ جائے پھر ایسا ہی ہوتا بھی ہے۔ ایسی حالتوں کے بیان کرنے کا ایسا خوب صورت طریقہ ایسے ہی قادر الکلام لوگوں کا کام ہے۔ ورنہ عام طور سے کہنا کچھ ہوتا ہے اور الفاظ کچھ ظاہر کرتے ہیں۔

دوسرا شعر۔ اس شعر میں نہایت لطیف طریقہ سے عمل کی ترغیب ہے۔ جو انفرادی اور قومی دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے فرماتے ہیں شوقِ طلب کے دیوانوں کو بیابانِ ہستی کی سختیاں اور مشکلیں جو عام نظر میں ناقابلِ برداشت ہیں عمل کی ترغیب ہیں۔ کیونکہ وہی لوگ ہیں جو ایسی سختیاں جھیل کے جواہرِ مقصود حاصل کرتے ہیں۔ آسانیاں ڈھونڈھنے والوں کو یہ عزت نہیں حاصل ہو سکتی لہٰذا اے ہمت بلند رکھنے والے جوانمردو شکست خوردہ ذہنیت کے طلسم کو توڑ کے اور آلام و مصائب کی منزل آخر تک پہنچنے اور کامیابی کا لعل بے بہا حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرو۔ کیونکہ حیات کی مدت کم ہے اور ؎

یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ محمل دور شد

تیسرا شعر۔ یہ اُس ہجراں دیدہ آفت رسیدہ عاشق کی حالت کا بیان ہے۔ جو دل میں شکووں کے دفتر لئے ہوئے ہو اور جوشِ غم کے طوفان میں زیادہ کچھ کہنے کی تاب بھی نہ رکھتا ہو۔

چوتھا شعر۔ یہ عجیب و غریب ہے، راہِ خیال میں عجب عجب بھول بھلیاں نظر آتی ہیں۔ اسلوبِ بیان ایسا دلکش اور نرالا ہے کہ سبحان اللہ۔ فرماتے ہیں۔ بھولے بھالے معشوق نے ایک چھپ کر دیکھنے والے یعنی آئینہ میں خود اپنے عکس کی نہ جانے کیا حالت دیکھی کہ آئینہ ہاتھ سے چھوٹ کے گر گیا اور اسی الجھن میں پلٹ کے میری صورت دیکھنے لگا۔ کہ میں نے تو کچھ نہیں کر دیا ہے۔ بظاہر یہی معنی ہیں۔ مگر جو معنی الفاظ میں پنہاں ہیں وہ عجب مفاہیم ظاہر کر رہے ہیں۔ جن کی یوں تصریح کی جا سکتی ہے کہ اپنے جمال اور اثرِ حسن

نا واقفِ معشوق پری وش نے ۔ آئینہ میں اپنے رُخِ بے مثال کا عکس دیکھا۔ اور چونکہ ایسا لاثانی حُسن اپنے جمالِ بے مثال سے بے خبر نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لہٰذا تڑپ گیا۔ اور اس طرح کا حسن دیکھ کے جو کیفیت طاری ہونا چاہیئے تھی سو ہوئی۔ تو عکس میں بھی وہی حالت نظر آئی۔ اب اور استعجاب ہوا۔ پھر جب یہ سمجھ میں آیا کہ آئینہ میں مرا ہی جلوۂ جمال تھا۔ تو اپنی جو حالت ہو گئی تھی اُس کا خیال کرنے سے یہ سوچا کہ کہیں عاشق نے تو وہ حال نہیں دیکھ لیا۔ اس عالم میں اضطراری کیفیت پیدا ہوئی۔ گھبراہٹ میں آئینہ ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہوا اور پھر پلٹ کے میری طرف دیکھا تو مجھے بھی اُسی طرح دیوانہ وار محوِ جمال پایا۔

پانچواں شعر ایک غزل کا مطلع ہے۔ جس میں فریبِ خیال کے تاثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

غلط تصورات کی راہ آخر کے دھندلے نشان جو خیال کی بے راہ روی کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔ یہ سوادِ منزل نہیں۔ رستے کی اُڑتی ہوئی گرد ہے۔ اور اس گرد کو منزل آخر کے نشان سمجھ کر جو دلکش نظارہ خام خیالی پیش کر رہی ہے۔ وہ اور کچھ نہیں بس نگاہ کے تھک جانے کا نتیجہ ہے۔

از:۔
مولانا محمد تقی صاحب
(مدرس دارالعلوم کراچی)

اصلاح و ترمیم:۔
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
(صدر مجلس منتظمہ دارالعلوم، کراچی)

تجارتی سُود

عقل اور شرع کی روشنی میں!

حرفِ آغاز

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی

کافی عرصہ ہوا جناب یعقوب شاہ صاحب آڈیٹر جنرل پاکستان نے "سود سے متعلق چند سوالات" کے نام سے ایک سوالنامہ مرتب کیا تھا جس میں انھوں نے مختلف علماء کرام کے سامنے اپنے وہ اشکالات پیش کئے تھے جو انہیں تجارتی سود کی حرمت پر پیش آگئے، انھوں نے بلیغ جستجو اور تحقیق و تفتیش کر لینے کے بعد اپنے وہ تمام نکات اس سوالنامے میں لکھ دیئے تھے جن کے تحت وہ یہ سمجھتے تھے کہ تجارتی سود حلال ہونا چاہیے۔

اس سوالنامے کی ایک کاپی میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مد ظلہم العالی کے پاس بھی آئی۔ یہ سوالنامہ عرصہ تک والد صاحب مد ظلہم کے پاس رکھا رہا اور آپ اس پر ہجوم مشاغل کے سبب کچھ تحریر نہ فرما سکے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جناب ماہر القادری (مدیر فاران کراچی) نے اسی مسئلہ پر ایک اور کتاب والد صاحب مد ظلہم کو تبصرے کے لئے دی جو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے رفیق جناب محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی کی تالیف کردہ تھی، اس کا ایک جزء جناب یعقوب شاہ صاحب کا سوالنامہ بھی تھا، اور پھر جناب جعفر شاہ صاحب نے اسی کے جواب میں تجارتی سود کی فقہی حیثیت سے بحث کی تھی اور یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ تجارتی سود حرام نہیں۔

یہ کتاب بھی کافی دنوں تک والد صاحب قبلہ کے پاس رکھی رہی اور بیشمار مصروفیات کے سبب والد صاحب اس پر بھی کچھ تحریر نہ فرما سکے، بالآخر یہ دونوں چیزیں احقر کو عنایت فرمائیں، اور حکم دیا کہ اس پر میں کچھ لکھوں، علمی بے مائگی کے باوجود تعمیلِ حکم کے لئے احقر نے اپنی بساط کے مطابق غور و فکر اور تحقیق کر کے کچھ لکھدیا۔ اب یہ موصوف کی نظر ثانی اور اصلاح و ترمیم کے بعد آپکے سامنے ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ آج کل دنیا میں سود کی دو صورتیں معروف ہیں:۔

(۱) مہاجنی سود، جو کسی وقتی اور شخصی ضرورت کے واسطے لئے ہوئے قرض (USERY) پر لیا جائے۔

(۲) تجارتی سود، جو کسی نفع آور (PRODUCTIVE) کام کے واسطے لئے ہوئے قرض پر لیا جائے۔

قرآن و حدیث کی نصوص اور اجماعِ اُمت سود کی ہر قسم اور ہر شعبے کو سخت ترین حرام قرار دیتے ہیں، اور پہلی قسم کو تو سود کو حلال قرار

دینے والے حضرات بھی حرام ہی کہتے ہیں، محترم یعقوب شاہ صاحب اور محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی کو سود کی جس صورت کے حرام ہونے میں شبہ ہوا وہ سود کی دوسری صورت یعنی تجارتی سود ہے۔ اس لئے ہم بھی اپنے اس مقالہ میں تجارتی سود ہی سے بحث کریں گے۔ مہاجنی سود ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔

ان صفحات میں اُن دلائل کا جائزہ لینا مقصود ہے جو تجارتی سود کے جواز پر پیش کئے ہیں۔ واللہ المستعان !!!

۲۶ / اگست ۱۹۶۱ء - محمد تقی عثمانی (۱۷/۸، گارڈن ایسٹ کراچی)

فقہی دلائل

پہلے اُن دلائل کو لیجئے جو تجارتی سود کو جائز قرار دینے والے حضرات فقہی زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں، ان حضرات کے دو گروہ ہو گئے ہیں بعض تو وہ ہیں جو اپنے استدلال کی بنیاد اس بات پر رکھتے ہیں کہ تجارتی سود عہدِ رسالت میں رائج تھا یا نہیں ؟ اُن کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم میں حرام سود کے لئے "الربوٰا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مُراد سُود کی وہ مخصوص شکل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یا آپؐ سے پہلے عہدِ جاہلیت میں رائج تھی، ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے بلا واسطہ مخاطب اہلِ عرب ہیں اُن کے سامنے جب "الربوٰا" کا ذکر کیا جائے گا تو مراد وہی "ربوٰا" ہوگا جو ان کی نگاہوں میں جانا پہچانا اور معروف ہوا اور جب ہم اس زمانے میں سود کی مروجہ صورتیں جمع کرتے ہیں، تو ہمیں کہیں تجارتی سود کی شکل نہیں دکھائی دیتی، تجارتی سُود اہلِ یورپ کی ایجاد ہے اور صنعتی انقلاب کے بعد جب صنعت و تجارت کو بڑا فروغ نصیب ہوا ہے اُس وقت تجارتی سُود (Commercial Interest) کا لین دین شروع ہوا ہے لہٰذا جن آیات سے سُود کی حرمت معلوم ہوتی ہے ان سے تجارتی سود کے حرام ہونے پر استدلال صحیح نہیں،

ہم پہلے اسی گروہ کے اس استدلال کو جائزہ لیتے ہیں :-

ہماری نظر میں ان حضرات کا یہ استدلال بہت سطحی ہے، اس لئے کہ ان حضرات نے اپنی اس دلیل کی اس عمارت کو دو ہی ستونوں پر کھڑا کیا ہے، ایک تو یہ کہ "الربوٰا" سے مُراد "ربا" کی وہی شکل و صورت ہے جو زمانۂ رسالتؐ میں رائج تھی، اور دُوسرے یہ کہ تجارتی سُود اُس زمانے میں رائج نہیں تھا، اور ان ستونوں کو ذرا سی توجہ سے ٹھونک بجا کر دیکھئے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ دونوں کھوکھلے ہیں

اوّل تو یہ بات ہی بے وزن ہے کہ "ربوٰا" کی جو شکل و صورت عہدِ جاہلیت میں رائج نہ ہو وہ حرام نہیں، اس لئے کہ اسلام کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت سامنے ہوتی ہے۔ اسی پر احکام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ شکل و صورت کے بدلنے سے احکام میں کوئی فرق نہیں آتا، قرآن نے "الخمر" (شراب) کو حرام قرار دیا ہے، زمانۂ نبوتؐ میں وہ جس شکل و صورت کے تھی معروف تھی اور اس کے بنانے کے جو طریقے رائج تھے وہ سب بدل گئے مگر چونکہ حقیقت نہیں بدلی، اس لئے حکم بھی نہیں بدلا، وہ بدستور حرام رہی ہے "الفحشاءُ" (بدکاری) کی صورتیں اس زمانے میں کچھ اور تھیں آج کچھ اور ہیں، زمین و آسمان کا تفاوت ہے مگر بدکاری بدکاری ہے اور قرآن کے وہی احکام اس پر نافذ ہیں، سُود اور قمار کا بھی یہی حال ہے اُس زمانے میں اس کی جو شکل و صورت معروف تھی، آج اس سے بہت مختلف صورتیں رائج ہیں، مگر جس طرح مشینوں اور سائنٹفک طریقوں سے [illegible] شراب، اور سینماؤں اور کلبوں کے ذریعہ پیدا کی ہوئی آشنائیاں اور ان کے نتیجہ میں بدکاریاں "بدکاریاں" ہی ہیں تو اگر سود اور قمار کوئی نئی شکل اختیار کرلیں تو

یا لوگوں کا نام جدید یا جائے تو اس سے اس کے احکام کیوں بدلیں؟ یہ تو ایسا ہی ہوگیا جیسے کسی ہندوستانی ماہر موسیقی نے عرب کے بدوؤں کا گانا سُن کر کہا تھا کہ قوالیاں جائیے اپنے نبی کے حضور میں ان لوگوں کا گانا سُنا اس لئے حرام قرار دیدیا، بیشک حرام ہی ہونا چاہئیے مگر ہمارا گانا سنتے تو کبھی حرام نہ کہتے۔

قرآن نے جو سود کی حرمت کا حکم دیا ہے اُسے احتیاجی اور صرفی سود کے ساتھ مخصوص کرنے کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں

کیا تجارتی سود عہدِ رسالت میں رائج نہ تھا؟

پھر اس دلیل کا دُوسرا مقدمہ بھی درست نہیں کہ کمرشیل انٹرسٹ عہد جاہلیت میں رائج نہ تھا۔ یہ کہنا دراصل تاریخ اور روایات سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ جاہلیت عرب اور پھر اسلامی دور کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں سود کا لین دین صرف احتیاجی اور صرفی قرضوں پر نہیں تھا بلکہ تجارتی اغراض اور نفع بخش مقاصد کے لئے بھی قرض لئے اور دیئے جاتے تھے۔ ذرا ان روایتوں کو خوب غور سے دیکھئے:۔

(۱) كانت بنو عمرو بن عامر يأخذون الربا من بني المغيرة وكانت بنو المغيرة يربون لهم في الجاهلية فجاء الاسلام ولهم عليهم مال كثير۔

جاہلیت کے زمانے میں بنو عمرو بن عامر، بنو مغیرہ سے سود لیتے تھے اور بنو مغیرہ انہیں سود دیتے تھے چنانچہ جب اسلام آیا تو اُن پر ایک بھاری مال واجب تھا۔

(در منثور بحوالہ ابن جریر عن ابن جریج ص ۳۶۶ جلد اول)

اس روایت میں عرب کے دو قبیلوں کے درمیان سودی لین دین کا ذکر کیا گیا ہے، یہ بات ذہن میں رکھئے کہ ان قبیلوں کی حیثیت تجارتی کمپنیوں جیسی تھی۔ ایک قبیلے کے افراد اپنا مال ایک جگہ جمع کر کے اجتماعی انداز میں اس سے تجارت کیا کرتے تھے، پھر یہ قبیلے اچھے خاصے مالدار بھی تھے، اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا دو مالدار قبیلوں کے درمیان سود کا مسلسل کاروبار کسی ہنگامی ضرورت کے لئے ہو سکتا ہے؟ ——— یقیناً یہ لین دین تجارتی بنیادوں پر تھا،

اس دلیل پر جناب یعقوب شاہ صاحب نے دسمبر ۱۹۶۰ء کے ماہنامہ ثقافت میں یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ قرض تجارتی نہیں زراعتی ہوتے تھے، اس پر انھوں نے ایک روایتی تائید بھی پیش کی ہے مگر ہماری نظر میں اول تو ابوسفیان کے قافلہ تجارت سے اس کی صاف تردید ہو جاتی ہے اور اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ قرض خواہ تجارتی ہو یا زراعتی، بہرحال نفع آور تھا اور اگر نفع بخش اغراض کے لئے زراعتی سود ناجائز ہو سکتا ہے تو تجارتی سود کی وجہ جواز اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یورپ کی منڈیوں میں اب زیادہ ضرورت تجارتی سود ہی کی ہے اس لئے اسے حلال کرنا پیش نظر ہے۔

رہا یہ کہنا کہ یہ طرز فکر آجکل کے ترقی یافتہ طریقۂ زراعت کا آئینہ دار ہے جس میں مشینوں اور مصنوعی کھاد پر زور دیا جاتا ہے ورنہ پرانے زمانے میں کاشتکار جو قرض لیتے تھے وہ احتیاجی اور صرفی ہی ہوتے تھے۔ تو یہ بہت بعید سی بات ہے اس لئے کہ قدیم زمانے میں بھی ملہ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو جنگ بدر کا محرک بنا، ابوسفیانؓ (حالتِ کفر میں) ایک تجارتی قافلہ شام سے لے کر آرہے تھے اور اس کے بارے میں تاریخ لکھتی ہے کہ اس میں مکہ کے ہر فرد کا حصہ تھا۔ علامہ زرقانی نے اپنی مشہور کتاب شرح المواہب اللدنیہ" میں لکھتے ہیں:۔

لم يبق قرشي ولا قرشية له مثقال الا بعث به في العير (ص ۳۱۱ ج اول)

کوئی قریشی مرد ہو یا عورت ایسا نہ تھا جس کے پاس ایک درہم ہو اور جسے اس نے قافلہ میں نہ بھیجا ہو۔

زراعت پیشہ لوگ بڑے مالدار ہوتے تھے اور بڑے اونچے پیمانے پر بھی زراعت کی جاتی تھی، پھر اس روایت میں تو قبیلوں کے اجتماعی قرض کا ذکر ہے "انفرادی قرض کا نہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پورے کے پورے قبیلے کے قرض کو "صرفی اور احتیاجی" کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک بہت واضح دلیل

(۲) درمنثور ہی میں علامہ سیوطیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے:۔

من لم یترک المخابرة فلیؤذن بحرب من اللہ و رسولہ (ابو داؤد و حاکم)

جو شخص "مخابرہ" نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لے۔

اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "مخابرہ" کو سود ہی کی ایک صورت قرار دے کر ناجائز قرار دیا اور جس طرح سود خوار کے خلاف خدا اور رسولؐ نے اعلانِ جنگ کیا ہے۔ اسی طرح "مخابرہ" کرنے والے کے خلاف بھی کیا۔

اس روایت سے استدلال سمجھنے کے لئے پہلے "مخابرہ" کا مطلب سمجھ لیجئے۔

"مخابرہ" بٹائی کی ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ زمیندار کسی کاشتکار کو اپنی زمین اس معاہدے پر دے کہ کاشتکار اس کو غلہ کی ایک معین مقدار دیا کرے، فرض کیجئے کہ آپ کی ایک زمین ہے۔ اور آپ وہ زید کو اس معاہدے پر کاشت کے لئے دیں کہ وہ غلہ کی ایک معین مقدار مثلاً پانچ من ہر فصل پر آپ کو دیتا رہے گا۔ خواہ اس کی پیداوار کم ہو یا زیادہ یا بالکل نہ ہو۔ یا مثلاً یہ معاہدہ طے ہو کہ جتنی پیداوار پانی کی نالیوں کے قریبی حصوں پر ہوگی وہ آپ کو دیدے اور باقی کاشتکار کا ہے۔ یہ معاملہ "مخابرہ" کہلاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے کو "ربوا" کی ایک شکل قرار دے کر حرام فرمایا ہے اب آپ ہی غور فرمائیں کہ یہ معاملہ ربوا کی کونسی صورت سے متعلق ہے؟ صرفی اور احتیاجی سود سے یا تجارتی سود سے؟ ظاہر ہے کہ یہ صورت تجارتی سود سے مشابہ ہے جس طرح تجارتی سود میں قرض لینے والا قرض کی رقم کسی نفع آور کام میں لگاتا ہے اسی طرح مخابرہ میں کاشتکار زمین کو نفع آور کام میں لگا دیتا ہے، صرفی اور احتیاجی سود میں ایسا نہیں ہوتا۔

پھر جو علتِ تحریم "مخابرہ" کو ناجائز قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کاشت کے بعد کُل پیداوار پانچ من ہی ہو اور بیچارے کاشتکار کو کچھ بھی نہ ملے، یہی علت تجارتی سود میں بھی پائی جاتی ہے کہ ممکن ہے جو رقم قرض لے کر تجارت میں لگائی گئی ہے اس سے صرف اتنا ہی نفع ہو جتنا کہ اسے سود میں دیدینا ہے۔ یا اتنا بھی نہ ہو (جس کی پوری تفصیل آگے رہی ہے) اور یہ علت صرفی اور احتیاجی سود میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ مقروض قرض کی رقم کسی تجارت میں نہیں لگاتا۔ اس کے حرام ہونے کی علت کچھ اور ہے۔

خلاصہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "مخابرہ" کو "ربوا" میں داخل فرمایا اور مخابرہ صرفی سود کے مشابہ نہیں ہو سکتا وہ تجارتی سود کے مشابہ ہے، اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ عہدِ رسالتؐ میں نفع بخش کاموں میں لگانے کے لئے سودی لین دین کا رواج تھا، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ سود حرام ہے۔

ایک اور دلیل

(۳) اب آپ ایک اور روایت پر غور فرمایئے:۔

عن ابی ھریرةؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیأتین علی الناس زمان لا یبقیٰ احدٌ الا اکل الربوا فمن لم یاکلہ اصابہ من غبارہ۔
(درمنثور بحوالہ ابو داؤد و ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ ضرور آئے گا جس میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جس نے سود نہ کھایا ہو اور اگر کسی نے نہ کھایا ہو گا تو اس کا غبار اُس تک ضرور پہنچا ہو گا۔

اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے زمانے کی خبر دی ہے، جس میں سُود خواری بہت عام ہو جائے گی مگر اس سے مُراد موجودہ زمانہ ہے (جیسا کہ ظاہر بھی ہے) تو آپ غور فرمایئے کہ اس زمانے میں کون سے سُود کو اس قدر عموم حاصل ہوا ہے جس سے بچنا مشکل ہے ہر شخص جانتا ہے کہ اس زمانے میں تجارتی سود عام ہو رہا ہے اور مہاجنی سود گھٹتا جا رہا ہے ۔

اور اگر حدیث میں جس زمانے کی پیشگوئی کی گئی ہے اس سے مراد کوئی آئندہ زمانہ ہے تو اول تو بظاہر تجارتی سود ہی بڑھے گا اور مہاجنی سود گھٹتا رہے گا ، اور دوسرے عقلاً بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مہاجنی سود کے رواج عام سے ہر شخص تک اس کا اثر ضرور پہنچے ، یہ بات بہت بعید ہے کہ دنیا میں لینے والوں کی اکثریت مہاجن بن جائے اور سود لے کر کھاتی رہے ، اور پھر اگر ایسا ہو بھی تو جو لوگ سود پر قرض لیں گے کم از کم وہ تو سُود کا غبار کھانے سے بھی بچے رہیں گے ، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کو اس کا غبار تو ضرور ہی پہنچے گا ۔

سُود کا ایسا رواجِ عام جس سے کہ ہر کس و ناکس کو اس کا کچھ نہ کچھ غبار ضرور پہنچے - تجارتی سُود ہی میں ممکن ہے جیسا کہ بینکنگ کے موجودہ نظام میں ہو رہا ہے ۔ تقریباً آدھی دنیا کا روپیہ بینکوں میں جمع رہتا ہے جس پر انہیں سود دیا جاتا ہے ۔ بڑے سرمایہ داران بینکوں سے سُود کا لین دین کرتے ہیں اور چھوٹے تاجر بینک میں روپیہ جمع رکھتے ہیں' پھر بینکنگ کچھ اتنے بڑے پیمانے پر ہونے لگی ہے کہ ہر ایک بینک میں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ نوکری کرتے ہیں ۔ اس طرح کسی نہ کسی درجہ میں سُود کی نجاست سے ملوث ہو جاتے ہیں ، اور جو براہ راست ملوث نہیں ہوتے تو وہ مال جو بذریعہ سود حاصل کیا جاتا ہے' جب اس کی گردش ملک میں ہوتی ہے تو بالواسطہ ہی سہی مگر سُود کے پیسہ سے ہر شخص ملوث ہو جاتا ہے جس کو حدیث میں سُود کا غبار کہا گیا ہے اور جس سے بچنے کا دعویٰ کوئی بڑے سے بڑا متقی بھی نہیں کر سکتا ۔

اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا ارشاد تجارتی سود ہی کے بارے میں ہو سکتا ہے ۔

حضرت زبیر بن عوّام رضؓ

(۲) اس کے علاوہ حضرت زبیر بن عوامؓ کا جو طرز عمل اس سلسلے میں روایات سے ثابت ہوتا ہے وہ بڑی حد تک اس طریقے سے مشابہ ہے جو آج بینکنگ کے نظام میں رائج ہے ۔

[illegible] امانت و دیانت کے اعتبار سے بہت مشہور تھے ، اس لئے بڑے بڑے لوگ ان کے پاس اپنی امانتیں جمع کرایا کرتے تھے اور اپنی مختلف ضروریات کی بنا پر وہ اپنی پوری یا تھوڑی رقمیں واپس بھی لیتے رہتے تھے ۔ حضرت زبیرؓ کے بارے میں بخاری کتاب الجہاد باب برکۃ الغازی فی حالہ اور طبقات ابن سعد میں بذیل طبقات البدریین من المہاجرین یہ تصریح موجود ہے کہ وہ لوگوں کی رقموں کو بطور امانت رکھنا منظور نہیں کرتے تھے بلکہ کہہ دیا کرتے تھے :-

لَا وَلٰکن ھو سلف — یہ امانت نہیں' قرض ہے ۔

اس کا مقصد کیا تھا ؟ شارح بخاری حافظ ابن حجرؒ کی زبانی سُنیئے :-

وکان غرضہ بذالک انہ کان یخشی علی المال أن یضیع فیظن بہ التقصیر فی حفظہ فرأی ان یجعلہ مضمونا فیکون اوثق لصاحب المال وابقی لمروتہ ، وزاد ابن بطال لیطیب لہ ربح ذالک المال

(فتح الباری ص ۱۷۵ ، ج ۶)

اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں مال ضائع نہ ہو جائے اور یہ سمجھا جائے کہ انھوں نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی ہو گی اس لئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اُسے (قرض بنا کر) بہر صورت واجب الادا قرار دے لیں تاکہ مال والے کو بھروسہ زیادہ رہے اور ان کی ساکھ بھی قائم رہے' ابن بطالؒ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ ایسا اس لئے بھی کرتے تھے تاکہ اس مال سے تجارت کرنا اور فائدہ کمانا ان کے لئے جائز ہو جائے

اس طریقہ سے حضرت زبیرؓ کے پاس کتنی بڑی بڑی رقمیں ہو جاتی تھیں؟ اس کا اندازہ طبقات ابن سعد کی اس روایت سے کیجئے۔

قال عبد اللّٰہ بن زبیرؓ فحسبت ما علیہ من الدیون فوجدتہ ألفی ألف ومائتی ألف

حضرت زبیرؓ کے بیٹے عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کے ذمہ واجب الادا قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ نکلے۔

(طبقات صفحہ ۱۰۹ ج ۳)

حضرت زبیرؓ جیسے متمول صحابی پر یہ بائیس لاکھ روپیہ کا قرض ظاہر ہے کہ کسی صرفی اور وقتی ضرورت کے لئے نہیں تھا، بلکہ یہ امانتوں کا سرمایہ تھا اور یہ تمام سرمایہ کاروبار ہی میں مشغول تھا، کیونکہ حضرت زبیرؓ نے وفات سے قبل اپنے صاحبزادے حضرت عبد اللہ کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ ہماری تمام املاک کو فروخت کر کے یہ رقم ادا کی جائے، اس کی تصریح بھی طبقات ابن سعدؒ ہی میں موجود ہے

یا بنیّ بع مالنا واقض دینی (بیٹے! ہمارا مال فروخت کر کے قرضہ ادا کرنا) (بحوالہ بالا)

کیا حضرت زبیرؓ کے اس طریق کار کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی اس دعوے کی لغویت محتاجِ تشریح رہ جاتی ہے کہ اہل عرب میں، نفع آور قرضوں کا رواج نہ تھا؟

پانچویں شہادت

امام بغویؒ نے بروایتِ عطاءؒ وعکرمہؒ ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت عثمانؓ کی ایک سودی رقم کسی تاجر کے ذمہ واجب تھی، اس کا مطالبہ کیا گیا تو حرمتِ ربوا کی آیات کے تحت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے روکدیا، اور سود کی رقم چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

اس روایت میں تصریح ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت عثمانؓ نے یہ رقم ایک تاجر کو قرض دی تھی۔

ہند بنت عتبہ کا واقعہ

(۶) علامہ طبریؒ نے ۲۳ھ کے واقعات میں ایک واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ:-

إن هند بنت عتبة قامت الی عمر بن الخطابؓ فاستقرضته من بیت المال أربعة آلاف تتجر فیها وتضمنها فأقرضها فخرجت الی بلاد کلب فاشترت وباعت الخ

ہند بنت عتبہ حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور بیت المال سے چار ہزار قرض مانگے تاکہ ان سے تجارت کرے اور ان کی ضامن ہو، حضرت عمرؓ نے دیدیئے چنانچہ وہ بلادِ کلب میں گئی اور مال خرید کر فروخت کیا۔

اس خاص تجارت کے لئے تجارت کے نام سے روپیہ قرض لینے اور دینے کا ذکر ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں تجارت کے لئے قرض لینے دینے کا رواج نہ تھا، ہاں یہ صحیح ہے کہ اس قرض پر سود لینے دینے کا رواج احکام قرآنی نازل ہونے کے بعد نہ رہا تھا۔ جیسا کہ اس واقعہ میں چار ہزار قرض بلا سود دینا مذکور ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ

مؤطا امام مالکؒ میں ایک لمبی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبد اللہؓ اور حضرت عبید اللہؓ ایک لشکر کے ساتھ عراق گئے۔ لوٹتے وقت حضرت ابو موسیٰ سے ملنے گئے انھوں نے فرمایا کہ اگر میرے لئے آپ کو کوئی نفع پہنچانا ممکن ہوا تو ضرور پہنچاؤں گا، پھر فرمایا کہ میرے پاس بیت المال کی ایک رقم ہے جس کو امیر المؤمنین کو بھیجنا چاہتا ہوں وہ میں آپ کو قرض دیتا ہوں آپ اس سے مالِ تجارت لے کر جائیں اور مدینہ جا کر فروخت کریں اور اصل رقم امیر المؤمنین کو پہنچا کر منافع خود رکھ لیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا (موطا مالکؒ ص ۲۸۵ کتاب القراض)

اس واقعہ میں بھی تجارت ہی کے لئے قرض لیا گیا ہے۔

عہدِ رسالت کے یہ چند واقعات سرسری نظر میں سامنے آئے، اگر باقاعدہ جستجو کی جائے تو اور بھی بہت مل سکتے ہیں لیکن ان سب کو جمع کرکے مضمون کو طول دینا بے حاصل ہی ہوگا، مذکورہ سات پختہ شہادتیں ایک منصف مزاج انسان کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ تجارتی قرضے اس نئے دورِ تہذیب ہی کی ایجاد نہیں بلکہ ان کا رواج اہلِ عرب میں قدیم زمانے سے تھا۔ ہم نے جو روایات اوپر پیش کی ہیں ان سے قدرِ مشترک کے طور پر یہ بات بوضاحت سامنے آجاتی ہے کہ تجارتی قرض اور ان پر سود کا لین دین اہلِ عرب کے معاشرے میں کوئی نامانوس اور اچنبھے کی بات نہ تھی بلکہ اس کا بھی اسی طرح عام رواج تھا جس طرح حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں کا۔

قرآنِ کریم سے ایک لطیف استدلال

ماہنامہ تجلی دیوبند کے مدیر جناب عامر عثمانی صاحب نے ایک قرآنی استدلال کی طرف توجہ دلائی ہے جو بہت لطیف ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا

یہ لوگ کہتے ہیں کہ بیع ربوا ہی کی طرح تو ہے اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام۔

یہاں کفارِ عرب نے بیع کو ربوٰ کے مثل قرار دیا ہے، اگر اس زمانے میں صرف حاجتمندانہ اور صرفی قرضوں کا رواج ہوتا تو سوچئے کہ مشرکین کے اس قول کا کیا تک تھا؟ بیع میں طرفین کی رضامندی ہوتی ہے اور حاجتی سود میں قرضدار کسی طرح رضامند نہیں ہوتا بلکہ وہ محض اپنی مفلسی کے دباؤ میں آکر سود دیتا ہے، اگر حاجتی سود ہی اس زمانے میں "الربوا" کہلاتا تھا تو وہ یہ بات اس قدر جزم و ایقان کے ساتھ کیسے کہتے کہ "اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" استدلال کی کوئی تو وجہ ہونا چاہیئے۔

پھر اگر وہ یہ بے تکی بات کہتے ہی تھے تو اللہ تعالیٰ جواب میں صرف یہ نہ فرماتا کہ "اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کیا ہے" بلکہ یہ کہتا کہ دیوانو! بیع تو رضامندی کا سودا ہے، سود میں رضامندی کہاں سے آگئی؟ اس کے بجائے اللہ نے ان کی بات کا جواب الزامی دیا ہے کہ ہاں بیع اور ربوا بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں مگر ہم نے ایک کو حرام کردیا اور ایک کو حلال۔

دوسرا گروہ

تجارتی سود کو جائز کہنے والوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے استدلال کی بنیاد سود کے عہدِ جاہلیت میں رائج ہونے یا نہ ہونے پر نہیں رکھتا بلکہ وہ اس کے جواز پر کچھ اور ایجابی دلائل پیش کرتا ہے، اس گروہ نے کئی دلائل پیش کئے ہیں، ہم ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ لیتے ہیں۔

کیا تجارتی سود میں ظلم نہیں؟

انکی پہلی دلیل یہ ہے کہ اس بات کا تو واقعی نفسِ مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کہ تجارتی سود کا رواج عہدِ رسالت میں تھا یا نہیں، لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ سود کی روح تجارتی سود میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟

ان کا کہنا یہ ہے کہ سود کے حرام ہونے کی علت یہ ہے کہ اس میں قرض لینے والے کا نقصان ہوتا ہے، اس بیچارے کو محض اپنی مجبوری کے "جرم" میں ایک چیز کی قیمت "اس کی اصل قیمت سے زائد دینی پڑتی ہے اور دوسری طرف قرض دینے والا اپنے فاضل سرمایہ سے بغیر کسی محنت کے مزید مال وصول کرتا ہے جو سراسر ظلم ہے، لیکن یہ علت تجارتی سود میں نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں قرضدار اور قرضخواہ دونوں کا فائدہ ہے۔ قرضدار قرض کی رقم کو تجارت میں لگاکر نفع حاصل کرلیتا ہے اور قرضخواہ قرض کی رقم پر سود لے کر کما لیتا ہے، اس میں کسی کے ساتھ ناانصافی اور ظلم نہیں ہوتا۔

یہ دلیل آجکل لوگوں کو بہت اپیل کرتی ہے اور بظاہر بڑی خوشنما ہے، لیکن آپ تھوڑا سا غور وفکر کیجئے تو آپ پر واضح ہو جائیگا کہ یہ بھی اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی، اس دلیل کا سارا دار ومدار اس بات پر ہے کہ تجارتی سود میں کسی کا نقصان نہیں، کیونکہ حرمت سود کی تحت صرف وہ نہیں جو حامیانِ تجارتی سود نے پیش کی ہے، اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ منجملہ ان کے ایک حکمت وہ بھی ہے کہ کسی فریق کا نقصان اس میں ضرور ہوتا ہے، اور نقصان والا معاملہ ناجائز ہوتا ہے، مگر تھوڑے سے تغیر کے ساتھ۔ ان حضرات نے تو بات یہیں تک ختم کر دی ہے کہ ایک فریق کا نقصان اور دوسرے کا فائدہ ہو تو معاملہ ناجائز ہوتا ہے اور دونوں کا فائدہ ہو تو جائز۔ حالانکہ بات یہیں تک محدود نہیں بلکہ اگر دونوں کا فائدہ ہو سکتا ہو مگر ایک کا فائدہ یقینی ہو اور دوسرے کا یقینی نہ ہو مشتبہ ہو، تب بھی معاملہ ناجائز ہوتا ہے جیسا کہ مخابرہ کی صورت میں آپ معلوم کر چکے۔

جناب یعقوب شاہ صاحب دسمبر ۱۹۶۱ء کے ماہنامہ "ثقافت" میں اس پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"کیا قرآن مجید میں کوئی ایسا حکم موجود ہے جو اس منافعہ کی رقم کو مشتبہ رکھ لینے کی جگہ متعین کر لینے کو ممنوع قرار دیتا ہے؟"

ہم اس کے جواب میں ان سے بصد ادب یہ پوچھیں گے کہ "مخابرہ" کے ناجائز ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلانِ جنگ کیوں قرار دیا ہے؟ صرف اور صرف اس لئے تاکہ اس میں ایک فریق کا متعین نفع ہے اور ایک کا مشتبہ۔

اب دیکھ لیجئے کہ یہ علت تجارتی سود میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ قرض لینے والا جو مال تجارت میں لگاتا ہے اس میں یہ کوئی ضروری نہیں کہ اسے نفع ہی ہو۔ یا نفع ہو تو اتنی مقدار میں کہ وہ سود ادا کرنے کے بعد بھی بچ رہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے تجارت میں خسارہ آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نفع اتنا کم ہو کہ سود ادا کرنے کے بعد کچھ نہ بچے، یا نفع تو زیادہ ہو مگر اس کے حاصل کرنے میں اتنی مدت صرف ہو جائے کہ اس کی وجہ سے سود کی رقم اصل مال سے بھی بڑھ گئی ہو۔

فرض کیجئے کہ آپ نے کسی شخص سے ایک ہزار روپیہ، تین روپیہ فیصد سالانہ کی شرح سود سے قرض لیا اور کسی تجارت میں لگا دیا، اب اس میں مندرجہ ذیل عقلی احتمالات ہیں:۔

(۱) آپ کو ایک ہی سال میں پانچ سو روپیہ کا فائدہ ہو گیا تو آپ فائدہ میں رہے کہ تیس روپے قرض خواہ کو دیکر باقی سب آپ نے لے لیا۔
(۲) آپ کو ایک سال میں کل ساٹھ روپیہ کا نفع ہوا۔ اس میں سے تیس آپ قرضخواہ کو دیں گے اور تیس اپنے پاس رکھیں گے۔
(۳) آپ کو پانچ سال میں دو سو روپیہ کا فائدہ ہوا، اس میں سے ڈیڑھ سو قرضخواہ کو دیدیں گے، اور پچاس آپ کے پاس بچیں گے۔
(۴) آپ کو پانچ سال میں ڈیڑھ سو ہی کا فائدہ ہوا تو آپ سارا نفع سود ہی میں دیدیں گے آپ کے پاس کچھ نہ بچیگا۔
(۵) آپ کو ایک سال میں کل تیس روپیہ کا فائدہ ہوا تب بھی آپ وہ سارا سود میں دیدیں گے آپ کے پاس ایک پیسہ بھی نہ بچیگا
(۶) آپ کو ایک سال ہی میں کل دس روپیہ کا فائدہ ہوا تو آپ وہ تو ساہوکار کو دینگے ہی، آپ کو اپنی جیب سے بیس روپے مزید دینے پڑیں گے۔
(۷) آپ نے ایک سال تک تجارت کی مگر ایک پیسے کا نفع بھی نہ ہوا تو محنت بھی بیکار گئی اور تیس روپے اپنی جیب سے دینے پڑے۔
(۸) اور اگر آپ نے دس سال تک تجارت کی اور پھر بھی کوئی نفع نہ ہوا تو آپ کو تین سو روپے بھگتنے پڑیں گے۔

(۹) آپنے ایک سال تک تجارت کی مگر اس میں سو روپے کا نقصان ہوگیا تو آپ کو یہ نقصان بھی بھگتنا ہوگا اور بیس روپے علیحدہ دینے ہونگے۔

(۱۰) آپنے دس سال تک تجارت کی اور اس میں سو روپے کا نقصان ہوگیا تو نقصان بھی آپ کی گردن پر رہا اور تین سو روپے، سود کے اس کے علاوہ ہیں۔

ان دس صورتوں میں سے صرف پہلی اور دوسری صورت تو ایسی ہے جس میں دونوں کا فائدہ ہے کسی کا نقصان نہیں باقی تمام صورتوں میں آپ کا نقصان ہے کہیں آپ کو ساہوکار سے کم نفع ہوا، کہیں کچھ بھی نہ ہوا اور کہیں الٹا نقصان ہوا، کہیں اس وجہ سے کہ تجارت بارآور نہ ہوئی، کہیں اس وجہ سے کہ نفع تو ہوا مگر سود میں چلا گیا۔ لیکن ان تمام صورتوں میں ساہوکار کا فائدہ کہیں نہیں گیا اسے ہر جگہ نفع ملتا رہا ہے۔

اب آپ بنظر انصاف غور فرمائیے کہ یہ بھی کوئی معقول معاملہ ہے جس میں دو ایک ہی جیسے افراد میں سے ایک کا کبھی نقصان ہوتا ہے کبھی نفع اور دوسرا نفع ہی سمیٹتا رہتا ہے؟ اس معاملہ کو کونسی شریعت اور کونسی عقل گوارا کر سکتی ہے؟

اس پر جناب یعقوب شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

> "تجارت کے لئے روپیہ سود پر اس واسطے لیا جاتا ہے کہ قرض لینے والے کو شرح سود سے کئی گنا زائد نفع کی اُمید ہوتی ہے اور اکثر یہ اُمید برآتی ہے ورنہ پیداواری سود کو اس قدر فروغ حاصل نہ رہتا۔ ایسے قرض دینے والے کو ایک چھوٹی رقم مقررہ وقت پر ملتی رہتی ہے اور اس کے برخلاف قرض لینے والا اکثر اس رقم سے کئی گنا فائدہ کما لیتا ہے اور کبھی اس کو نقصان بھی ہوتا ہے مگر اس خطرہ کو قبول کرنا تجارت کا عام مسلک ہے اور یہ ایسی چیز نہیں اور اس سے ایسی خرابیاں پیدا نہیں ہوئیں کہ فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ کی سزا کی مستحق ہو"
>
> (ماہنامہ ثقافت دسمبر ۱۹۶۱ء)

اس کے جواب میں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ نفع کی اُمید ہونا اس بات کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا کہ وہ معاملہ جائز ہے، اس لئے کہ نفع کی اُمید تو کاشتکار کو "مخابرہ" کی صورت میں بھی ہوتی ہے اسی لئے تو وہ یہ معاملہ کر لیتا ہے، مگر اس کے باوجود بصراحت حدیث "مخابرہ" ناجائز ہے اور اس کے بارے میں "فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ" الخ کی وعید آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں پڑھ چکے کہ:۔

من لم يترك المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله (ابوداؤد و حاکم)	جو مخابرہ نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے اعلان جنگ سن لے۔

سرمایہ اور محنت کے اشتراک کا اسلامی تصوّر

اسلامی شریعت نے سرمایہ اور محنت کے اشتراک کی ایک سیدھی سادی، آسان اور مفید شکل "مضاربت" تجویز کر دی ہے کہ ایک کا سرمایہ ہو، دوسرے کی محنت ہو اور نفع و نقصان میں دونوں کی شرکت تناسبی طور پر ایک ہی نوعیت کی ہو، نہ اس سے کسی کی حق تلفی ہوتی ہے نہ کسی پر ظلم ہے، دونوں ہر حیثیت سے برابر ہیں۔ نفع ہے تو دونوں کا برابر ہے، نقصان ہے تو دونوں کو ہے، مگر نہ جانے اسلامی شریعت سے خدا واسطے کا بیر پیدا ہو گیا ہے یا سرمایہ دارانہ نظام نے عقلوں پر ایسے قفل دیئے ہیں کہ لوگ اس سیدھی

سودی صورت اشتراک کو چھوڑ کر اس بُری اور مُضر صورت کو اختیار کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں،

جناب محمد جعفر شاہ صاحب نے "کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت" میں مضاربت کی شکل پر یہ اشکال پیش کیا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص غلّے کی تجارت کرتا ہے اور اس کے پاس خاصی رقم بھی موجود ہے، ایک دوسرا شخص اس سے یہ کہتا ہے کہ میں "بس سروس" کا تجربہ رکھتا ہوں مگر میرے پاس سرمایہ نہیں، اگر تم رقم لگاؤ تو اس میں خاصا منافع ہو سکتا ہے، جس میں ہم دونوں شریک ہونگے، اب ظاہر ہے کہ غلّے کی تجارت کرنے والا اپنی تجارت میں روپیہ لگا سکتا ہے لیکن وہ ساتھ ہی اس شخص کا نفع بھی چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ میں موٹر سروس کا کام بھی شرکت میں کروں لیکن اسے یہ بھی خیال ہے کہ میں خود موٹر کے کام سے نابلد ہوں اور یہ میری ناواقفیت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے کہ مضاربت میں میرے اصل حصے میں بڑے بازی سے کام لے، اور مجھے پورا حصہ نہ مل سکے، نیز میں اس کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے لئے وقت نہیں نکال سکتا۔ اس صورت میں اس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ اُسے سود پر قرض دیدے اور ایک قلیل مگر معین نفع پر قناعت کرے،

مگر ہمیں افسوس ہے کہ ان حضرات نے بہت تلاش و جستجو کے بعد ایک لمبی چوڑی شکل نکالی، مگر اس میں مضاربت کے طریقے کو چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ کوئی بیوقوف بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتا کہ صرف فریب میں آجانے کے موہوم خطرے سے اپنے زیادہ نفع کو چھوڑ دے اور کم پر راضی ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر بالفرض اس کا شریک دھوکہ دے کر اس کے حصے میں سے مال کم بھی کرے تو اس کے لئے سود کی قلیل شرح لینا اور حصہ کم لینا دونوں برابر ہیں۔ پھر اُسے خواہ مخواہ ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر اُسے اپنے شریک کی دیانت کے بارے میں اس قدر بدگمانی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ دھوکہ دے کر تجارت میں نقصان ظاہر کرے گا حالانکہ درحقیقت اس میں نفع ہوگا تو پھر ایسے شخص کے ساتھ معاملہ کر کے اس کی ہمت افزائی کرنے کا اُسے کس ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے؟

ہاں البتہ یہ خیال اس شخص کے دل میں ضرور پیدا ہوگا جو نفع کی صورت میں تو مسلسل شریک رہنا چاہتا ہو لیکن ساتھ ہی نقصان کی زد سے دامن بچا لینے کا بھی خواہشمند ہو، اس کے دل میں یہ کھوٹ ہو کہ میرے لئے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اور نقصان ہو تو نہ صرف یہ کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے بلکہ میرا نفع کہیں نہ جائے۔

اسلام کا انصاف پسند مزاج اُسے اس عیاری اور خود غرضی کی ہرگز اجازت نہیں دے گا۔

اس تشریح سے حامیانِ سود کا ایک وہ استدلال بھی ختم ہو جاتا ہے جس میں انھوں نے تجارتی سود کو مضاربت کے مشابہ قرار دے کر جائز کہا ہے۔ گذشتہ صفحات کی بحث سے تجارتی سود اور مضاربت کا عظیم فرق آپ کے ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ مضاربت میں دونوں شریک نفع اور نقصان دونوں میں شریک رہتے ہیں، اور تجارتی سود ایک کا نفع معین رکھتا ہے اور دوسرے کا مشتبہ اور موہوم۔ اس لئے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

تجارتی سود رضامندی کا سودا ہے

(۲) اس گروہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکل بالباطل سے منع کیا ہے (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ الخ) لہٰذا تجارت کے جن جن طریقوں میں اکل بالباطل ہے وہ حرام ہیں، اور ظاہر ہے کہ جہاں اکل باطل ہوگا وہاں ایک فریق کی عدمِ رضا ضرور ہوگی، اکل بالباطل میں کھانیوالا تو راضی ہوتا ہے لیکن جسے کھایا جاتا ہے وہ کبھی راضی نہیں ہوتا وہ اسے محض اپنی مجبوری سے برداشت کرتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایسی تجارت ہو جس میں دونوں فریقوں کی رضامندی اور خوشدلی ہو تو وہ یقیناً اکل بالباطل نہ ہوگا۔ اب آپ بینک سے کمرشل انٹرسٹ (تجارتی سود) کو دیکھئے کہ اس میں قرض لینے والا

ہے اور نقصان نہیں ہوتا اسی لئے دو دوسرے کے نفع سے ناخوش بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو ربا حرام ہے وہ وہی ہے جس میں ایک فریق کا فائدہ دوسرے فریق کا نقصان ہے۔ کمرشل انٹرسٹ پر جو تجارت کی جاتی ہے اس میں دونوں کی باہمی رضامندی اور خوش دلی ہوتی ہے۔

(کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت از جعفر شاہ صاحب)

ہم نے ان حضرات کا یہ استدلال من وعن نقل کر دیا ہے، آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ کیا آج تک کسی عقلمند نے فریقین کی رضامندی کو ایک حرام چیز کے حلال ہونے کے لئے سبب قرار دیا ہے؟ کیا فریقین رضامند ہوں تو زنا کو جائز کہا جا سکتا ہے؟ اور وہ جیسے کی بیع ہیں، خود تجارت ہی میں بہت سی انواع آپ کو ایسی ملیں گی جن میں دونوں فریق رضامند اور خوش ہوتے ہیں مگر وہ ناجائز ہیں۔ کتب حدیث کے "ابواب البیوع الباطلۃ" کھول کر دیکھئے۔ محاقلہ، مزابنہ، تلقی الجلب، بیع کی ان تمام صورتوں میں فریقین کی رضامندی اور خوشدلی ہوتی ہے مگر ہر ایک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے۔

دراصل اسلام کی حکیمانہ نظر سطحی چیزوں پر نہیں ہوتی وہ عام قوم کی خوش حالی اور اس کا فائدہ چاہتا ہے۔ اسی لئے اس نے فریقین کی رضامندی اور خوشدلی کو کہیں جائز یا حرام ہونے کا معیار نہیں ٹھہرایا، اس لئے کہ ان کی رضامندی اپنے حق میں تو مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ وہ عام قوم کے لئے زہر ہو۔ مذکورہ بیوع کی بعض صورتوں میں کسی کا نقصان نہیں دونوں کا فائدہ ہے اور دونوں رضامند بھی ہیں مگر اس کی وجہ سے پوری قوم افلاس، اقتصادی بدحالی اور اخلاقی بیماریوں کا شکار ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے انہیں ممنوع قرار دیا ہے، وہ ہر معاملہ کا اسی وسیع نظر سے تجزیہ کرتا ہے اور جہاں خرابی دیکھتا ہے وہاں بند باندھ دیتا ہے مثال کے طور پر ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ — کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔

اس حدیث کے ذریعہ اسلام نے آڑھتی (MIDDLE MAN) کا تمام کاروبار ممنوع قرار دیا ہے، جو لوگ ہر معاملہ کو سطحی انداز میں اور تنگ نظری سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ اس حکم کی حکمت سمجھنے سے ضرور محروم رہیں گے۔ ان کو یہ حکم ظلم نظر آئے گا اس لئے کہ ان کے نزدیک معاملات کے جائز یا ناجائز ہونے کا مدار اور رضامندی اور خوشدلی پر ہے، وہ سوچیں گے کہ ایک دیہاتی گاؤں سے مال لے کر آتا ہے اور وہ ایک شہری کو اپنا مال بیچنے کے لئے وکیل بنا دیتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ دیہاتی کا بھی فائدہ ہے کہ اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی، اور اس کا مال بھی اچھے داموں بک جائے گا، اور آڑھتی کا بھی نفع ہے کہ اسے مال بیچنے پر کمیشن ملے گا۔ ان کا ذہن شخصی مفاد اور خوش دلی کی اس بھول بھلیاں میں الجھ کر رہ جائے گا۔

لیکن جو شخص اسلامی شریعت کے مزاج سے واقف ہے وہ اس حکم کی تہ میں پوری قوم کا اجتماعی مفاد دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے گا۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ اسلام نے یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ اس سے پوری قوم کا فائدہ ہے۔ اگر دیہاتی نے آڑھتی کو اپنا وکیل بنایا تو وہ مال کو بازار کا رنگ دیکھ کر نکالے گا۔ جس وقت نرخ سستے ہوں گے اس وقت مال کو چھپا کر رکھے گا اور جب بازار میں مال ختم ہو جائے گا اس وقت اسے نکال کر من مانے بھاؤ پر فروخت کرے گا جس سے پوری قوم گرانی کا شکار ہوگی اور وہ ان کا مال بیچتا رہے گا، یہاں تک کہ قوم مفلس سے مفلس ہوتی چلی جائے گی اور اس سرمایہ دار کی جیب بھرتی چلی جائے گی، اس کے برعکس اگر دیہاتی خود اپنا مال فروخت کرے گا تو اتنا بیوقوف تو وہ بھی نہیں ہو گا کہ اپنا نقصان کر کے بیچے، ہر حال نفع ہی سے فروخت کرے گا، لیکن بہر حال آڑھتی کی بہ نسبت اس کے لگائے ہوئے دام بہت سستے ہوں گے اور وہ روک کر نہیں رکھے گا، جس کی وجہ سے بھاؤ بازار سستا ہو جائے گا اور عام قوم خوشحالی سے بسر کرے گی۔

بہرکیف

صرف فریقین کی رضامندی اور خوش دلی معاملہ کی حلت و حرمت پر کوئی اثر مرتب نہیں کرتی اس لئے کہ بعض اوقات دونوں کی رضامندی پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہی حال تجارتی سود کا ہے کہ اگرچہ اس میں دونوں فریق راضی اور خوش ہوتے ہیں مگر وہ جائز نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ وہ پوری قوم کو تباہی کی راہ پر لگا دیتا ہے۔

ہم نے جو بات اوپر کہی ہے وہ خود اس آیت سے ماخوذ ہے جو جعفر شاہ صاحب نے پیش کی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق
بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ	طریقے سے نہ کھاؤ، الآیہ کہ وہ تجارت ہو اور آپس کی رضامندی سے ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے معاملہ کے جائز ہونے کے لئے دو شرطیں ذکر فرمائی ہیں ایک تو یہ کہ وہ معاملہ تجارت ہو، دوسرے یہ کہ آپس کی رضامندی سے ہو، نہ صرف آپس کی رضامندی معاملہ کی حلت کے لئے کافی ہے، اور نہ صرف تجارت ہونا، دونوں باتیں پائی جائیں گی تو معاملہ جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

تجارتی سود میں فریقین کی رضامندی تو ہے مگر چونکہ وہ اجتماعی طور پر مضر ہے اس لئے اسلام اُسے تجارت نہیں کہتا، ربٰا کا نام دیتا ہے۔ لہٰذا وہ جائز نہیں۔

کیا روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟

تجارتی سود کو جائز کہنے والے حضرات اپنی اس دلیل کی تائید میں کچھ روایات بھی پیش کرتے ہیں جن سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سود میں اگر خوش دلی ہو، جابرانہ دباؤ نہ ہو تو وہ جائز ہوسکتا ہے، مثلاً احادیث ذیل:۔

(۱) حضرت علیؓ نے اپنا ایک "عصیفیر" نامی اونٹ بیس (چھوٹے) اونٹوں کے عوض فروخت کیا ہے اور وہ بھی اُدھار (رواہ مالکؒ)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کچھ دراہم قرض لئے پھر ان سے اچھے واپس کئے تو دائن نے لینے سے انکار کیا کہ یہ میرے دیئے ہوئے دراہم سے اچھے ہیں، حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے مگر میں خوش دلی سے دے رہا ہوں (رواہ مالک)

(۳) حضورؐ نے حضرت جابرؓ سے قرض لے کر زیادہ واپس کیا۔

(۴) حضورؐ نے فرمایا "خیارکم احاسنکم قضاءً" بہتر طریقے سے قرض ادا کرنے والے تم میں زیادہ بہتر ہیں۔ (ابوداؤد عن ابی ہریرۃ)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان روایتوں سے مذکورہ دعوے پر دلیل نہیں لی جاسکتی،

(۱) جہاں تک حضرت علیؓ کے عمل کا تعلق ہے تو اس پر کسی معاملہ کی حلت و حرمت کی بنیاد اس لئے نہیں رکھی جاسکتی کہ اس کے برخلاف ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا واضح فتویٰ موجود ہے:۔

عن سمرةؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت سمرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
نهى عن بيع الحيوان بالحيوان نسيئة۔	حیوان کو حیوان کے بدلے اُدھار بیچنے سے منع فرمایا۔

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

یہ ایک صحیح حدیث ہے اور حضرت جابرؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ سے بھی اسی مضمون کی احادیث منقول ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ بالکل واضح اور صاف ہے، اسے چھوڑ کر حضرت علیؓ کے ایک عملی واقعہ کو جس کا پورا پس منظر بھی معلوم
، فتوی کی اساس بنا لینا اصول حدیث و فقہ کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس عمل صحابی کو حدیث مرفوع کی برابر کی حیثیت
دے دی جائے تو جب حلت اور حرمت میں تعارض ہو تو متفقہ اصول ہے کہ اسی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے جو حرام قرار دے رہی ہو
رہا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل تو اس سے کسی درجہ میں بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے خوشدلی کی وجہ سے سود
کو قرار دیا ہے، وہاں تو معاملہ یہ تھا کہ انھوں نے جو دراہم قرض لئے تھے وہ کیفیت کے اعتبار سے ویسے نہ تھے جیسے واپس کئے
زیادتی محض کیفیت میں تھی، ایسا نہ تھا کہ دس لئے ہوں اور گیارہ واپس کئے ہوں "مخایر" کا لفظ اس بات پر شاہد ہے، اس کے
چونکہ قرض لیتے وقت دونوں کے درمیان زیادتی کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا اور اس وقت دونوں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ
نہ تھی اس لئے بعد میں زیادہ ادا کرنے کی حیثیت ایسی ہو گئی جیسے کوئی کسی کے احسان کا بدلہ کرنے کے لئے اسے کچھ تحفہ دیدے۔

اور یہی صورت حضرت جابرؓ کے واقعہ میں ہے کہ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرض دیتے وقت کوئی زیادتی کا معاہدہ
کیا تھا۔ حدیث کے الفاظ نے یہ بتلایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق کریمانہ کی بنا پر ادائیگی کے وقت ان کو
کچھ زیادہ دیدیا، زیادتی کیسی اور کتنی تھی؟ حدیث اس کے بیان سے خاموش ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ زیادتی بھی صرف کیفیت
زیادتی ہو اور اگر تعداد کی زیادتی بھی تسلیم کی جائے تو چونکہ وہ کسی شرط اور معاہدہ کے ماتحت نہ تھی اس لئے وہ بھی حسن
اور احسان کی مکافات ہی کے درجہ میں ہو سکتی ہے جس کی طرف خود احادیث میں ترغیب دی گئی ہے، چنانچہ شیخ الاسلام
رحمۃ اللہ علیہ نے ابو رافعؓ کی حدیث کے ماتحت یہی لکھا کہ :-

لیس ھو من قرض جر منفعۃ فانہ منھی عنہ لان المنھی عنہ ، ما کان مشروطا فی العقد ۔

یہ صورت اس قرض میں داخل نہیں جس کے ذریعہ کچھ نفع حاصل کیا گیا ہو کیونکہ وہ ناجائز ہے اور ناجائز صورت وہی ہے کہ زیادتی کو عقد کرتے وقت معاہدہ کیا گیا ہو۔

(نووی شرح مسلم ص ۳۰ ج ۲)

اس لئے اگر کسی شخص نے کسی پر احسان کیا کہ وقت پر قرض دیدیا اور اس نے قرض ادا کرنے کے وقت اس کے احسان کا بدلہ
کرنے کے لئے کوئی رقم یا چیز اپنی خوشی سے بغیر کسی سابق معاہدہ کے دیدی، تو یہ آج بھی جائز ہے، سود حرام سے اس کا کوئی واسطہ
،، اگرچہ حضرت امام مالکؒ اس وقت بھی عددی زیادتی کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور حضرت جابرؓ کے واقعہ کو کیفیت کی
زیادتی پر محمول فرماتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس معاملہ کی حقیقت میں غور کیا جائے تو اس میں ربوٰا کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال شرعی سے ان کا قرض دیا اور قرض سے زیادہ بھی کچھ عطا فرمایا، یہ ظاہر ہے کہ بیت المال
سب مسلمانوں کا حق ہے خصوصاً علماء امت جو دین کی خدمت میں مشغول ہوں، تو حضرت جابرؓ کا بیت المال میں
پہلے سے متعین اور معلوم تھا جس میں امام و امیر کو اختیار ہوتا ہے وہ زیادتی اس حق میں سے دی گئی نہ کہ قرض کے معاوضہ میں
) اور جو تھی روایت کا تو مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں، اس لئے کہ اس میں "حسن ادا" کی ترغیب ہے جس کا مطلب یہ نہیں
زیادہ ادا کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ "اچھی طرح ادا کرو، ٹال مٹول نہ کرو، قرضخواہ کو بار بار آنے جانے کی تکلیف مت دو اور چیز ایسا
دو، ایسا نہ ہو کہ اچھی چیز لو اور خراب واپس کرو۔

تجارتی سود اور اجارہ

تجارتی سود کے وکلاء تیسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ کمرشل انٹرسٹ کی حیثیت بھی ایسی ہے جیسے ایک شخص اپنا رکشہ، تانگہ یا ٹیکسی لوگوں کو اس شرط پہ دیتا ہے کہ تم مجھے اتنی رقم روزانہ دیدیا کرو۔ یہ معاملہ بالاتفاق جائز ہے اور یہی صورت تجارتی سود کی ہے کہ اس میں سرمایہ دار بھی شرط پہ اپنا سرمایہ دیتا ہے کہ مجھے ایک معینہ رقم سال بہ سال ملتی رہے۔

لیکن آپ خود ہی ذرا غور سے دیکھئے کہ دونوں میں کتنا فرق ہے؟ رکشہ، تانگہ اور ٹیکسی کو کرایہ پہ دیا جاسکتا ہے مگر نقد کو کرایہ پہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے کہ کرایہ اور اجارہ کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے اس کے منافع حاصل کئے جائیں۔ آپ کسی سے ٹیکسی کرایہ پہ لیتے ہیں تو ٹیکسی جوں کی توں باقی رہتی ہے صرف اس کے منافع آپ حاصل کر لیتے ہیں اور نقد میں یہ بات نہیں، کیونکہ اس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ———— اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اُسے خرچ کرنا پڑتا ہے، اس لئے اس میں اجارہ کی کوئی شکل نہیں ملتی۔

اور اس سے بھی تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیجئے اور غور کیجئے کہ اگر اجارہ پہ تجارتی سود کو قیاس کرنا صحیح ہے تو اس معاملہ میں مہاجنی اور تجارتی دونوں سود برابر ہیں، جس طرح تجارتی سود اجارہ کے مشابہ ہے اسی طرح مہاجنی سود بھی ہے، ظاہر ہے کہ کرایہ پہ لینے والا ہمیشہ نفع آور کام میں لگانے کے لئے کوئی چیز کرایہ پہ نہیں لیتا۔ بسا اوقات اپنی وقتی ضرورت کے لئے لیتا ہے۔ آپ روزانہ ٹیکسی کرائے پہ لیتے ہیں تو وہ وقتی ضرورت ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اجارہ پہ سود کو قیاس کرنا صحیح ہے تو مہاجنی سود کو بھی جائز کہنا پڑے گا حالانکہ اس سود کو وہ لوگ بھی جائز نہیں کہتے جو تجارتی سود کے جواز کے قائل ہیں، بلکہ قرآن کریم میں اس کی حرمت کی تصریح موجود ہے اس سے خود اندازہ کر لیجئے کہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے، اگر صحیح ہوتا تو قرآن اسے ناجائز قرار نہ دیتا

بیعِ سلم اور تجارتی سود

تجارتی سود کو جائز بتلانے والے حضرات اسے بیع سلم پہ بھی قیاس کرتے ہیں، پہلے بیع سلم کا مطلب سمجھ لیجئے۔

سلم کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ایک کاشتکار ایک شخص کے پاس آکر کہتا ہے کہ میں اس وقت گندم کی فصل بو رہا ہوں تھوڑے دنوں میں وہ پک جائیگی مگر میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں، تم مجھے پیسے اب دیدو اور جب فصل تیار ہوجائے گی تو میں تمہیں اتنا گندم دیدوں گا۔

لیکن ذرا سوچئے کہ بیع سلم ایک قسم کی بیع ہے جسے چند شرائط کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً جائز رکھا اور اسے بیع کے اندر داخل قرار دیا جسے اللہ تعالیٰ نے أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ فرما کر حلال کیا ہے اور اس کے بالمقابل ربوا کو حرام فرمایا ہے جو حضرات ربوا کو بھی نصِ قرآن و حدیث کے خلاف بیع ہی میں داخل کہتے ہیں، کیا وہ اپنے آپ کو مخالفین قرآن و اسلام کی صف میں کھڑا نہیں کر رہے جنہوں نے إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَوٰا کہا تھا اور قرآن نے ان کی تردید و وعید سنائی۔

پھر عقدِ سلم اور ربوا میں اس حیثیت سے زمین آسمان کا تفاوت ہے کہ سلم میں پہلے پیسے لینے کی بناء پہ سامان زیادہ حاصل کرنے کی شرط نہیں لگائی جاتی، چنانچہ فقہ کی ساری معتبر کتابوں میں سلم کی تعریف "بیع الآجل بالعاجل" (یعنی ایک دیر میں ملنے والی چیز کی بیع فوری قیمت کے معاوضہ میں) بغیر کسی شرط و تفصیل کے لکھی ہوئی ہے۔ عرفی مفہوم بھی غیر مشروط بیع کا ہے، اور کسی معتبر عالم یا فقیہ نے کہیں یہ شرط نہیں لگائی کہ اس عقد میں مال چونکہ دیر میں ملتا ہے اس لئے زیادہ ملنا چاہیئے، اس کے برخلاف تجارتی سود کی بنیاد ہی اس شرط پہ قائم ہے۔

مدت کی قیمت

ان کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ بعض فقہاء کرامؒ نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ ایک تاجر اپنا مال قیمت کے نقد ہونے کی صورت میں مثلاً دس روپیہ میں دیتا ہے اور اُدھار کی صورت میں پندرہ روپیہ میں، اس صورت میں تاجر نے محض مدت کی زیادتی کی وجہ سے پانچ روپے زیادہ کئے ہیں، چنانچہ ہدایہ باب المرابحہ میں ہے۔

أَلا یریٰ انّہٗ یزاد فی الثمن لأجل الأجل	کیا یہ مشاہدہ نہیں ہے کہ مدت کے سبب سے قیمت میں زیادتی کی جاتی ہے؟

ہدایہ کی اس عبارت پر یہ تعمیر کھڑی کی گئی ہے کہ جب مدت کے معاوضہ میں زیادتی لینا جائز ہوا تو تجارتی سود میں بھی یہی شکل ہے کہ مدت کے عوض پیسے زیادہ لئے جاتے ہیں۔

لیکن نہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ جس ہدایہ میں مذکورالصدر جملہ لکھا ہے اسی کی کتاب الصلح میں نہایت واضح الفاظ میں یہی لکھا ہے

وذالک اعتیاض عن الاجل وھو حرام	یہ مدت کی قیمت لینا ہے، اور وہ حرام ہے (باب الصلح فی الدین)

اور اس کے تحت علامہ اکمل الدین بابرتیؒ نے ہدایہ کی شرح عنایہ میں لکھا ہے کہ:۔

روی ان رجلا سأل ابن عمر رضی اللہ عنھما عن ذالک ثم سألہٗ، فقال إنّ ھذا أن اطعمہٗ الربا (عنایہ علی ہامش نتائج الافکار ص ۴۲ ج ۷)	روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے (مدت پر قیمت لینے کے سلسلے میں) سوال کیا تو آپؓ نے اسے منع فرمایا، اُس نے پھر پوچھا تو آپؓ نے فرمایا کہ یہ چاہتا ہے کہ میں اسے سود کھانے کی اجازت دیدوں۔

یہ نقل کرنے کے بعد صاحب عنایہ نے لکھا ہے "حضرت ابن عمرؓ نے یہاں لئے فرمایا کہ سود کی حرمت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس میں صرف مدت سے مال کے تبادلہ کا شبہ ہے تو جہاں یہ بات شبہ کی حدود سے آگے بڑھ کر حقیقت بن گئی ہو وہاں تو حرمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟"

اس کے علاوہ فقہ حنفی کے ایک بلند پایہ عالم قاضیخانؒ جو صاحب ہدایہ ہی کے ہم رتبہ ہیں انھوں نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کرنا بھی جائز نہیں۔

لا یجوز بیع الحنطۃ بثمن النسیئۃ أقل من سعر البلد فانّہٗ فاسد واخذ ثمنہ حرام۔	گندم کی بیع اگر ادھار ہونے کی بنا پر شہر کے عام نرخ سے کم قیمت پر کی جاتی ہے تو وہ فاسد ہے اور اس کی قیمت لینا حرام ہے۔

عالمگیریہ وغیرہ میں بھی اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں۔

البتہ اہل علم کے لئے یہ بات قابلِ غور رہ جاتی ہے کہ ہدایہ کی دو عبارتیں متضاد کیوں ہیں؟ پہلی عبارت سے مدت کے معاوضہ میں زیادتی لینے کا جواز معلوم ہوتا ہے اور دوسری عبارت سے اس کا حرام ہونا واضح ہے۔

اس کا جواب اہل علم کے لئے سمجھنا مشکل نہیں، اب صرف اس سامان کے سودے میں ادھار کا خیال کر کے کچھ قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے تو وہ براہِ راست مدت کا معاوضہ نہیں بلکہ اس سامان ہی کی قیمت ہے، بخلاف اس کے کہ براہِ راست مدت ہی کا معاوضہ سالانہ یا ماہوار طے کیا جائے، یہ وہی ہے جسے ہدایہ کی کتاب الصلح والی عبارت میں حرام کہا گیا ہے۔

جن حضرات کو فقہ سے کچھ بھی مناسبت ہوگی ان کو اس فرق کے سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس کی نظیریں بے شمار ہیں کہ بعض اوقات بعض چیزوں کا معاوضہ لینا براہِ راست جائز نہیں ہوتا اور کسی دوسرے سامان کے ضمن میں جائز ہو جاتا ہے، اس کی ایک نظیر یہ ہے کہ ہر مکان و دکان اور زمین کی قیمت پر اس کے محلِ وقوع اور پڑوس کا بڑا اثر ہوتا ہے حتیٰ

وہ علاقہ کی قیمت میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ ایک محلہ میں ایک مکان دس ہزار روپیہ کا ہے تو وسط شہر میں بالکل اسی طرح کا ہے لیکن وہ مکان ایک لاکھ میں بھی سستا سمجھا جاتا ہے۔ یہ قیمت کی زیادتی ظاہر ہے کہ مکان کی ذات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کی خاص کیفیت اور محلِ وقوع کے اعتبار سے ہے اور جب کوئی آدمی یہ مکان بیچتا یا خریدتا ہے تو اس کی یہ کیفیت بھی فروخت ہو جاتی ہے، اور قیمت کی جتنی زیادتی ہے وہ اسی کیفیت کے مقابلہ میں ہے حالانکہ یہ کیفیت اور صفت کوئی مال نہیں جس کا معاوضہ لیا جائے۔ مگر مکان یا زمین کی بیع کے ضمن میں اس کیفیت وصفت کا معاوضہ بھی شامل ہو کر جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح ہر مکان کے لئے ایک گذرگاہ اور راستہ کا حق ہوتا ہے، ہر زرعی زمین کے لئے آبیاری کا حق ہوتا ہے اگر کوئی شخص ان حقوق کو تنہا بغیر مکان یا زمین کے فروخت کرنے لگے تو بیع ناجائز ہے کیونکہ حقوق خود تو کوئی مال نہیں، مگر مکان یا زمین فروخت کرے گا تو یہ حقوق ضمنی طور پر خود بخود فروخت ہو جائیں گے اور مکان زمین کی قیمت میں ان کا معاوضہ بھی شامل ہو جائے گا۔

ہمارے زیر بحث مسئلہ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر ادھار کی وجہ سے سامان کی قیمت میں زیادتی کو جائز تسلیم کیا جائے۔ تو اس کی نوعیت وہی ہے کہ ضمنی طور پر مدت کی رعایت سے سامان کی قیمت بڑھ گئی۔ اور براہِ راست صرف مدت کا معاوضہ لیا جائے تو وہ ربا میں داخل ہو کر ناجائز ہوگا۔ چنانچہ جہاں صاحبِ ہدایہ نے مدت کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کو جائز کہا ہے وہاں پہلی صورت مراد ہے اور انھوں نے مذکورہ صورت کو اس لئے جائز قرار دیا ہے کہ وہاں مدت پر جو قیمت لی جا رہی ہے وہ اصلاً اور براہِ راست نہیں بلکہ ضمناً ہے (اگرچہ قاضی خاںؒ وغیرہ نے اسے بھی ناجائز کہا ہے) اور جہاں پر صاحبِ ہدایہ نے مدت کے مقابلہ میں عوض لینے کو حرام کہا ہے وہاں ان کا مطلب یہ ہے کہ براہِ راست مدت کی قیمت نہیں لی جا سکتی۔

تجارتی سود میں چونکہ مدت کی قیمت ضمنی طور سے نہیں براہِ راست لی جاتی ہے، اس لئے یہ صورت باتفاقِ فقہاء حرام ہے۔

چند ضمنی دلائل

یہ دلیلیں تو بڑی اور اہم تھیں، اب آپ ان حضرات کے ان ضمنی دلائل پر بھی ایک نظر ڈالتے چلئے جو بذاتِ خود تو کسی نظریہ کی بنیاد نہیں بن سکتے لیکن بڑی دلیلوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام دلائل گزشتہ اہم دلائل کے ختم ہو جانے کے بعد خود بخود بے معنیٰ ہو جاتے ہیں، ہم پورے اطمینان کے لئے ہم ان پر بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

(۱) پہلی چیز جناب یعقوب شاہ صاحب نے پیش کی ہے کہ حدیثوں کی تدوین کے متعلق محدثین حضرات نے درایت کے اصول منضبط کئے ہیں۔ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو، مخدوش ہے، قرآن کریم نے جس قدر سزا سود خور کے لئے رکھی ہے وہ شاید کسی اور مجرم کے لئے تجویز نہیں فرمائی یہ عظیم سزا حاجتمند اور صرفی (USURY) قرضوں پر لئے جانے والے کئی گنا کئی سود پر تو بالکل ٹھیک ٹھیک اترتی ہے لیکن تجارتی سود اتنا زیادہ نقصان دہ فعل نہیں ہے جس پر خدا اور رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔ ایک حاجتمند سے سود لینا سنگدلی ہے اور اس کی ممانعت سختی سے ہونی چاہیئے لیکن تجارتی سود پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، اس کے لینے والے مفلس نہیں ہوتے وہ قرض نفع کمانے کی غرض سے لیتے ہیں اور عام طور پر نفع شرحِ سود سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

اس دلیل کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ تجارتی سود کوئی نقصان دہ چیز نہیں ہے حامیانِ تجارتی سود کی اکثر دلیلوں میں جا بجا یہی ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے اس لئے ہم یہاں قدرے تفصیل کے ساتھ تجارتی سود کے انفرادی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی نقصانات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ!

نقصانات!

اخلاقی نقصانات

سود کے حرام ہونے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ وہ تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرکے خود غرضی، بے رحمی، سنگدلی، زر پرستی اور کنجوسی کی صفات پیدا کرتا ہے، اس کے برعکس اسلام ایک ایسے صحت مند معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتا ہے جو رحم و کرم، محبت و مودت، ایثار، تعاون اور بھائی چارے کی بنیاد پر قائم ہو، جس میں تمام انسان مل جل کر زندگی گذاریں، ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آئیں، غریبوں اور ناداروں کی امداد کریں، دوسرے کے نفع کو اپنا نفع اور دوسرے کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں۔ رحمدلی اور سخاوت کو اپنا شعار بنائیں اور اجتماعی مفاد کے آگے اپنے ذاتی مفاد کو کچھ نہ سمجھیں! انسانوں میں یہ تمام صفات پیدا کرکے اسلام انہیں انسانیت اور شرافت کا اس اوج کمال تک پہنچانا چاہتا ہے جہاں سے انہیں "اشرف المخلوقات" کا خطاب عطا ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف سود (خواہ وہ تجارتی ہو یا مہاجنی) جس ذہنیت کو جنم دیتا ہے اس میں ان اخلاقی اوصاف کی کوئی جگہ نہیں قرض دینے والے ساہوکار کو بس اپنے سود کی تو پرواہ ہوتی ہے، آگے اسے اس سے کچھ سروکار نہیں کہ مقروض کو نفع ہوا یا نقصان ؟ نفع ہوا تو کتنا؟ کتنی مدت میں؟ اور کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد؟ وہ مسلسل اپنے دیئے ہوئے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے، اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مقروض کو جتنا ہو سکے دیر میں نفع ہو تاکہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا سود بڑھتا اور چڑھتا رہے۔ اسے مدیون کے نقصان کا بھی کوئی غم نہیں ہوتا کیونکہ نفع نقصان کی ہر شکل میں اس کا نفع کھرا رہتا ہے۔ یہ چیز خود غرضی کو اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ ایک سرمایہ دار کسی حاجتمندانہ قرضہ میں بھی اپنی رقم کو بلا سود لگانے پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ میں یہ فاضل رقم کسی تجارت کو کیوں نہ دوں تاکہ گھر بیٹھے ایک معین نفع مجھے حاصل ہوتا رہے، اس خیال کے پیش نظر اگر ایک شخص کے گھر میں بے گور و کفن لاش پڑی ہے یا اس کا کوئی عزیز دم توڑ رہا ہے وہ بھی اس کے پاس آکر اس سے قرض مانگے گا تو وہ یا تو انکار کر دے گا یا تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر اس سے بھی سود کا مطالبہ کرے گا۔ ایسے مواقع پر بالعموم حرام کھاتے کھاتے قساوتِ قلب کی یہ صفت اس درجہ رنگ جمالیتی ہے کہ اس وقت آپکے مدلل لکچر اور پر اثر مواعظ کچھ کام نہیں آتے۔ سود خوار دولت مند کو اپنے چاروں طرف پیسہ ہی ناچتا نظر آتا ہے اس لئے اس وقت آپ کو اس سے یہ شکایت ہونی بھی نہ چاہیئے کہ وہ ہماری بات کیوں نہیں سنتا؟ اور ہمارے مواعظ کیوں اثر نہیں لیتا؟ اس کے پاس بزبانِ حال یہ جواب ہے کہ ؎

اندرونِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

پھر جب لوگ دیکھتے ہیں کہ فاضل سرمایہ اس قدر نفع بخش ہے کہ اس سے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر بھی ایک یقینی نفع حاصل ہو سکتا ہے تو ان میں زر اندوزی کا جذبہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے اور وہ پیسہ بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور بسا اوقات حد سے آگے حرص کے نشے میں ناجائز ذرائع سے روپیہ کمانے کی فکر کرتے ہیں اور کچھ نہیں تو یہ چیز ان میں کنجوسی تو ضرور ہی پیدا کر دیتی ہے، اور اس مرحلہ پر زر اندوزی کے میدان میں ریس شروع ہوتی ہے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں دوسرے سے زیادہ روپیہ جمع کر لوں اور پھر یہ ریس حسد، بغض اور عداوت کو جنم دیتی ہے، بھائی سے بھائی کی لڑائی ہوتی ہے، دوست سے دوست جلنے لگتا ہے، باپ کو بیٹے کے اور بیٹے کو باپ کے نقصان کی کوئی پرواہ نہیں رہتی یہاں تک کہ نفسی نفسی کے اس محشر میں انسانیت سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔

یہ محض خیالی باتیں نہیں ہیں، آپ اپنے گردوپیش پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ کیا آج یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے؟ آپ کو جب اثبات میں جواب ملے گا اور اگر آپ نے انصاف سے کام لیا تو آپ پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ یہ سب کچھ "سود" ہی کے شجرۂ خبیثہ کے پھل پھول ہیں اور اگر ہمیں ان تمام ناہمواریوں کو دور کرنا ہے تو ہمیں ہمت کر کے اسی شجرۂ خبیثہ پر کلہاڑا چلانا پڑے گا۔ اور اگر ہم اصلاح و تبلیغ کے صرف لفظی طریقے اختیار کرتے رہے تو ہماری مثال اس احمق سے مختلف نہ ہوگی جو بدن پر جابجا نکلی ہوئی پھنسیوں کا علاج صرف پاؤڈر چھڑک کر کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح اس شخص کو کبھی شفاء حاصل نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ وہ بیماری کی اصل جڑ کو پکڑ کر اسے ختم نہ کر ڈالے اسی طرح ہم بھی اپنے معاشرے کو اس وقت تک صحتمند نہیں بنا سکتے جب تک کہ سود کی لعنت سے چھٹکارا نہ پالیں۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ سودی کاروبار میں روپیہ جمع کرنے کی خواہش سے لے کر کاروبار کے مختلف مرحلوں تک کا پورا عمل، خودغرضی، بخل، سنگدلی، زرپرستی، حسد، بغض اور عداوت جیسی صفات کے زیر اثر شروع ہوتا ہے اور انہی صفات کے زیر اثر جاری رہتا ہے اور جوں جوں آدمی اس کاروبار میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اسی نسبت سے ان صفات کے طول و عرض میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

معاشی اور اقتصادی نقصانات

اس کے بعد معاشی نقصانات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے، معاشیات میں بصیرت رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں کہ تجارت، صنعت، زراعت اور تمام نفع آور (Productive) کاموں کی معاشی بہتری یہ چاہتی ہے کہ جتنے لوگ کسی کاروبار میں کسی بھی نوعیت سے شریک ہوں وہ سب کے سب اپنے مشترکہ کاروبار کے فروغ سے پوری پوری دلچسپی رکھتے ہوں، ان کی دلی خواہش یہ ہو کہ ہمارا کاروبار بڑھتا اور چڑھتا رہے، کاروبار کے نقصان کو وہ اپنا ہی نقصان تصور کریں تاکہ ہر خطرے کے موقعہ پر اس کے دفعیہ کے لئے اجتماعی کوشش کریں اور کاروبار کے فائدہ کو وہ اپنا فائدہ خیال کریں تاکہ اسے پروان چڑھانے میں ان کی پوری پوری طاقت صرف ہو۔

اس نقطۂ نظر سے عام معاشی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ کاروبار میں صرف سرمایہ ہی کی حیثیت سے شریک ہوں وہ بھی کاروبار کے نفع و نقصان سے پوری پوری دلچسپی رکھیں۔ لیکن سودی کاروبار میں ان مفید جذبات کی کوئی رعایت نہیں بلکہ بعض اوقات معاملہ اس کے بالکل برخلاف رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں سودخوار سرمایہ دار کو صرف اپنے نفع سے سروکار ہوتا ہے، آگے لگنے اس کی کوئی پروا نہیں کہ کاروبار ترقی پر ہے یا تنزل پر؟ اس میں نفع ہو رہا ہے یا نقصان؟ وہ مسلسل اپنے دیئے ہوئے روپیہ پر منافع وصول کرتا رہتا ہے اور بسا اوقات اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کاروبار کو جتنا ہو سکے دیر میں نفع ہو تاکہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا نفع بڑھتا رہے۔ اسی بناء پر اگر کاروبار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو تاجر اپنی پوری محنت اور کوشش اس کے دفعیہ پر صرف کرے گا لیکن سرمایہ دار اس وقت تک ٹس سے مس نہ ہوگا جب تک کہ کاروبار کے بالکل ہی دیوالیہ ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ اس غلط طریق کار نے سرمایہ اور محنت کے درمیان ہمدردانہ رفاقت کی بجائے ایک سو فیصد خودغرضی کا تعلق قائم کر دیا ہے، جس کے نتیجہ میں بے شمار نقصانات جنم لیتے ہیں، انہیں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:۔

(۱) سرمایہ کا ایک بڑا حصہ محض اس وجہ سے کام میں نہیں لگتا کہ اس کا مالک شرح سود کے بڑھنے کا انتظار کرتا ہے باوجودیکہ اس کے بہت سے مصارف موجود ہوتے ہیں اور بیشمار آدمی کسی کاروبار کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ملکی تجارت و صنعت کو بھی بڑا نقصان پہنچتا ہے اور عام قوم کی معاشی حالت بھی گر جاتی ہے۔

(۲) چونکہ ساہوکار کو زیادہ شرح سود کا لالچ ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے سرمایہ کو کاروبار کی واقعی ضرورت اور طبعی مانگ کے اعتبار سے

نہیں لگاتا بلکہ وہ محض اپنی اغراض کو سامنے رکھ کر سرمایہ کو روکنے یا لگانے کا فیصلہ کرتا ہے، اس صورت میں اگر سرمایہ دار کے سامنے دو صورتیں ہوں کہ یا تو وہ اپنا سرمایہ کسی فلم کمپنی میں لگائے یا بے خانماں لوگوں کے لئے مکانات بنوا کر انہیں کرایہ پر دے، اور اسے فلم کمپنی کی صورت میں زیادہ نفع کی امید ہو تو وہ یقیناً فلم کمپنی میں سرمایہ لگا دے گا۔ بے خانماں افراد کی اسے کوئی پرواہ نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت عام ملکی مفاد کے لئے کس قدر خطرناک ہے؟

اس پر جناب یعقوب شاہ صاحب اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس نقصان کی وجہ سود نہیں انفرادی ملکیت ہے جب تک سرمایہ افراد کی ملکیت ہے اس وقت تک سرمایہ دار طبقہ اس کے بہاؤ کو اپنے مفاد کے لحاظ سے روکتا اور کھولتا رہے گا۔

(ماہنامہ "ثقافت" دسمبر ۱۹۶۱ء)

ہمیں جناب یعقوب شاہ صاحب سے یہ عجیب سی بات سُن کر بڑی حیرت ہوتی ہے، جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس خرابی کی وجہ انفرادی ملکیت ہے تو ایک بڑی اہم قید کو نظر انداز کر جاتے ہیں، صرف "انفرادی ملکیت" اس کا سبب نہیں، "بے لگام اور خود غرض انفرادی ملکیت" اس کا سبب ضرور ہے، جو ملکیت کسی قسم کی کوئی قید اور پابندی برداشت نہ کرتی ہو وہی سرمایہ کے بہاؤ کا رُخ ذاتی مفاد کی جانب پھیر دیتی ہے، لیکن ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھئے کہ اس "بے لگام اور خود غرض انفرادی ملکیت" کا سبب کیا ہے؟

آپ بنظرِ انصاف غور کریں گے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ اس کا سبب ہے ــــــ سود اور سرمایہ داری نظام! ــــ سود کا لالچ ہی انسان میں وہ خود غرضی پیدا کرتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنی املاک کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد کر دیتا ہے، اور ہر وقت ذاتی منافع کے تصور میں مگن رہتا ہے، کسی بھلائی اور بہبود کے کام میں پیسہ لگانے کا خیال بھی اسے نہیں آتا، اب واقعات کی منطقی ترتیب اس طرح ہو گئی کہ:۔

سرمایہ کا ذاتی مفاد کے پابند ہو جانا خود غرض انفرادی ملکیت سے پیدا
ہوتا ہے اور اس قسم کی انفرادی ملکیت کا سبب سود اور سرمایہ دارانہ نظام ہے!

نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ اس خرابی کا اصل سبب سود اور سرمایہ داری نظام ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ یہ بات کیسی غلط ہو جاتی ہے کہ "ذاتی مفاد پر سرمایہ کا رکنا اور کھلنا سود سے نہیں انفرادی ملکیت سے ہوتا ہے"۔

اگر واقعی مذکورہ خرابی (یعنی سرمایہ کا ذاتی مفاد کے پابند ہو جانے) کا ازالہ منظور ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے سود اور سرمایہ داری نظام پر ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔ جب تک یہ نہ ہوگا ملکیت میں وہی خود غرضی اور بے لگامی باقی رہے گی جو مذکورہ خرابی کا اصل سبب ہے۔

اس خرابی کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سودی اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو ختم کر کے اسلامی نظام معیشت کو بروئے کار لایا جائے، جس میں سود، قمار اور سٹے کی ممانعت، زکوٰۃ، عُشر، صدقات، خیرات اور میراث کے احکام اس قسم کی خود غرضانہ ذہنیت پیدا ہونے ہی نہیں دیتے، اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو عام کیا جائے اور لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیا جائے جو انہیں باہمی تعاون اور اجتماعی بہبود کے کاموں میں سرگرم بناتے،

سود اور سرمایہ داری نظام ــــ جو خود غرض انفرادی ملکیت کے سرچشمے ہیں، ان کی حمایت کرتے ہوئے صرف یہ کہہ کر فارغ ہو جانا کہ "ان خرابیوں کا اصل سبب انفرادی ملکیت ہے"۔ اس مسئلے کا حل کیسے بن سکتا ہے؟

(۳) سود خوار دولت مند چونکہ سیدھے سادے طریقے پر کاروباری آدمی سے شرکت کا معاملہ نہیں کرتا کہ اس کے نفع و نقصان میں برابر کا شریک رہے، اس لئے وہ یہ اندازہ لگاتا ہے کہ اس کاروبار میں تاجر کو کتنا نفع ہوگا؟ اسی نسبت سے وہ اپنی شرح سود متعین

کرتا ہے اور عام طور سے وہ اس کے منافع کا اندازہ لگانے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے۔

دوسری طرف قرض لینے والا اپنے سامنے نفع و نقصان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر بات کرتا ہے چنانچہ جب کاروباری شخص کو نفع کی امید ہوتی ہے وہ سرمایہ دار سے قرض لینے آتا ہے سرمایہ دار معاملہ کو بھانپ کر سود کی شرح اس حد تک بڑھاتا چلا جاتا ہے کہ تاجر اس شرح پر قرض لینا اپنے لئے بالکل بیکار سمجھتا ہے۔ دائن اور مدیون کی اس کشمکش سے سرمایہ کا کام میں لگنا بند ہو جاتا ہے اور وہ بیکار پڑا رہ جاتا ہے، پھر جب کساد بازاری اپنی آخری حدوں تک پہنچ جاتی ہے اور سرمایہ دار کو خود اپنی ہلاکت نظر آنے لگتی ہے تو وہ شرح سود گھٹا دیتا ہے یہاں تک کہ کاروباری آدمیوں کو اس پر نفع کی اُمید ہو جاتی ہے، پھر بازار میں سرمایہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ اگر سیدھی اور معقول شرائط پر سرمایہ اور محنت کا اشتراک ہوتا تو معاشی نظام ایک متناسب اور ہموار طریقے سے چلتا رہتا، اس میں یہ اونچ نیچ اور ناہمواری پیدا نہ ہوتی لیکن جب قانون ہی "سود" کی پشت پناہی کرتا ہو تو پوری تجارتی زندگی کا جسم "تجارتی چکر" کی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے اس پر بار بار کساد بازاری کے دورے پڑتے ہیں۔

(۴) پھر بعض اوقات بڑی بڑی صنعتی اور تجارتی اسکیموں کے لئے سرمایہ بطور قرض لیا جاتا ہے اور اس پر بھی ایک خاص شرح کے مطابق سود عائد کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے قرضے عام طور پر دس بیس یا تیس سال کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں اور تمام مدت کے لئے ایک ہی شرح سود مقرر ہوتی ہے اس وقت اس بات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ آئندہ بازار کے نرخ میں کیا اتار چڑھاؤ پیدا ہوگا، اور ظاہر ہے کہ جب تک فریقین کے پاس علم غیب نہ ہو اس وقت تک وہ یہ جان بھی نہیں سکتے۔

فرض کیجئے کہ ۱۹۶۲ء میں ایک شخص بیس سال کے لئے سات فیصد شرح سود پر ایک بھاری رقم بطور قرض لیتا ہے اور اس سے کوئی بڑا کام شروع کرتا ہے، اب وہ مجبور ہے کہ ۱۹۸۲ء تک ہر سال باقاعدگی کے ساتھ اسی طے شدہ شرح کے مطابق سود دیتا رہے لیکن اگر ۱۹۷۲ء تک پہنچتے پہنچتے قیمتیں گر کر موجودہ نرخ سے نصف رہ جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص جب تک موجودہ حالت کی بہ نسبت دوگنا مال نہ بیچے وہ نہ اس رقم کا سود ادا کر سکتا ہے اور نہ قسط، اس کا یہ لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ارزانی کے دور میں یا تو اس قسم کے قرض داروں کے دیوالے نکل جائیں گے یا وہ اس مصیبت سے بچنے کے لئے معاشی نظام کو خراب کرنے والی نا جائز حرکات میں سے کوئی حرکت کریں گے۔

اس معاملہ پر غور کیجئے ہر انصاف پسند اور معقول آدمی پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف زمانوں کی گرتی اور چڑھتی قیمتوں کے درمیان ساہوکار کا ایک متعین اور یکساں نفع نہ تو قرین انصاف ہی ہے اور نہ معاشی اصولوں کے لحاظ سے اسے درست کہا جا سکتا ہے آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی تجارتی کمپنی یہ معاہدہ کرلے کہ وہ آئندہ بیس یا تیس سال تک خریدار کو ایک ہی متعین وقت پر اشیاء فراہم کرتے رہے گی —— جب یہ معاملہ صحیح نہیں تو آخر سود خوار دولت مندوں میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کے نفع پر قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا کوئی اثر نہیں پڑتا؟

جدید بینکنگ

نئی مغربی تہذیب نے یوں تو بہت سی مہلک چیزوں پر چند سطحی فوائد کا ملمع چڑھا کر پیش کیا ہے مگر اس کا یہ کارنامہ سب سے زیادہ قابل داد ہے کہ "سود" جیسی گھناؤنی اور قابل نفرت چیز کو جدید بینکنگ سسٹم کا دلکش اور نظر فریب لبادہ پہنا کر پیش کیا اور اس

اس طرح پیش کیا کہ اچھے خاصے سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس نظام کو نہایت معصوم اور بے ضرر سمجھنے لگے۔

مغربی تہذیب کے اس بدترین مظہر کی خوبیاں لوگوں کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح طرح چھا چکی ہیں کہ وہ اس کے خلاف کچھ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اس کو بے ضرر بلکہ نفع بخش جائز بلکہ قطعاً ناگزیر سمجھتے ہیں، حالانکہ اگر تقلید مغرب کی نحوست بینک آف کر واقعات کا جائزہ لیا جائے تو ایک سلیم الفکر انسان کا ذہن سو فیصد اسی نتیجہ پر پہنچیگا کہ عام قوم کے لئے معاشی ناہمواریاں پیدا کرنے میں جس قدر بڑی ذمہ داری بینکنگ کے موجودہ نظام پر ہے اتنی کسی اور چیز پر نہیں حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظام ساہوکاری کے نقصانات پھر اتنے زیادہ نہیں تھے جتنے کہ اس جدید نظام سے پیدا ہوتے ہیں، ہم پہلے مختصراً بینکنگ کا طریق کار ذکر کرتے ہیں تاکہ بات کو سمجھنے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے میں کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔

ہوتا یہ ہے کہ چند سرمایہ دار مل کر ایک ادارہ ساہوکاری قائم کر لیتے ہیں جس کا دوسرا نام بینک ہے، یہ لوگ مشترک طور پر ساہوکاری کا کاروبار کرتے ہیں۔

شروع میں کام چلانے کے لئے یہ لوگ کچھ اپنا سرمایہ لگاتے ہیں لیکن بینک کے مجموعی سرمایہ میں اس کا تناسب بہت کم ہوتا ہے بینک کا زیادہ تر سرمایہ وہ رقم ہوتی ہے جو امانت دار لوگ (depositors) بینک میں رکھواتے ہیں، در اصل بینک کی ترقی کے لئے سب سے اہم یہی سرمایہ ہوتا ہے، جس بینک میں جتنا زیادہ سرمایہ امانت داروں کا ہوتا ہے اتنا ہی وہ طاقتور سمجھا جاتا ہے، لیکن اگرچہ امانتداروں کا سرمایہ بینک کی اصل روح رواں ہوتی ہے مگر ان لوگوں کو بینک کی پالیسی میں کوئی دخل نہیں ہوتا، روپیہ کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ شرح سود کیا مقرر ہو؟ منتظم کسے رکھا جائے؟ ان تمام چیزوں کا تعین صرف سرمایہ داروں کی صوابدید پر ہوتا ہے، امانت داروں کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ پیسہ رکھوا کر معمولی شرح سے سود لیتے رہیں اور پھر اگرچہ کہنے کو تو بینک کے بہت سے حصہ دار (shareholders) ہوتے ہیں مگر بینک کی پالیسی میں تمام عمل و دخل ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے حصص (shares) زیادہ ہوں، رہے چھوٹے حصہ دار تو ان کا تعلق بینک سے صرف اس قدر ہوتا ہے کہ جب نفع کی تقسیم کا وقت آئے تو ان کا حصہ رسد ان کو پہنچ جائے اور بس۔

اب یہ چند بڑے سرمایہ دار اپنی مرضی کے مطابق بینک کا روپیہ سود پر دیتے ہیں، سرمایہ کا ایک حصہ یہ لوگ روزمرہ کی ضروریات کے لئے اپنے پاس رکھتے ہیں، کچھ صراف بازار کو قرض دیا جاتا ہے، اور کچھ دوسرے قلیل المیعاد قرضوں میں صرف کیا جاتا ہے، ان قرضوں پر بینک کو ایک سے لے کر تین چار فی صد تک سود مل جاتا ہے۔

پھر ایک بڑا حصہ کاروباری لوگوں، بڑی بڑی کمپنیوں اور دوسرے اجتماعی اداروں کو دیا جاتا ہے جو بالعموم مجموعی رقم کا ۳۰٪ سے لے کر ۶۰٪ تک ہوتا ہے۔ بینک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی قرضے ہیں، ہر بینک کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ ان قرضوں میں لگے اس لئے کہ ان قرضوں پر سب سے زیادہ شرح سے سود ملتا ہے، اس طرز پر جو آمدنی بینک کو حاصل ہوتی ہے وہ بینک کے تمام شرکاء کے درمیان اسی انداز سے تقسیم کر دی جاتی ہے جیسے عام تجارتی کمپنیوں کا دستور ہے

اس دام ہمرنگ زمین کو پھیلانے میں جس چالاکی اور ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے وہ واقعۃً عجیب ہے، عوام تو سود کے لالچ میں اپنی رقمیں ایک ایک کر کے بینک کی تجوریوں میں بھرتے رہتے ہیں، اور اس سے پورا نفع چند سرمایہ دار اٹھاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ساہوکار غریب اور کم دولت مند تجار کو تو پیسہ دینے سے رہے، وہ تو ہمیشہ یہ روپیہ ان بڑے بڑے سرمایہ داروں کو دیتے ہیں جو انہیں اچھی شرح سے سود دے سکیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری قوم کا سرمایہ چند مٹھی بھر سرمایہ داروں کے پاس جمع ہوتا

ہے اور یہ دولت کے اس خزانے کے بل پر پوری پوری قوموں کی قسمت سے کھیلتے ہیں۔ دنیا کے سیاسی معاملات سے لے کر قوم کے معاشی معاملات تک ان ہی کے رحم و کرم پر ہوتی ہے اور یہ پوری دنیا کی سیاسی، معاشی اور تمدنی زندگی پر پوری خود غرضی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ایک تاجر صرف دس ہزار کا مالک ہوتے ہوئے دس لاکھ کے سرمایہ سے تجارت کرتا ہے تو اگر اسے نفع پہنچ جائے تو وہ سود کے چند ٹکوں کے سوا پورا اسی کو ملا۔ اور اگر اسے نقصان ہو تو اس کے صرف دس ہزار ڈوبے، باقی نو لاکھ نوے ہزار روپیہ تو پوری قوم کا گیا جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں پھر اسی پر بس نہیں ان سرمایہ داروں نے یہاں بھی دس ہزار کے نقصان سے بچ نکلنے کی یہ راہ نکال لی ہے کہ اگر یہ خسارہ کسی حادثہ کے سبب ہوتا ہے تو یہ اپنا پورا انشورنس کمپنی سے وصول کر لیتے ہیں جو درحقیقت قوم ہی کا سرمایہ ہوتا ہے گویا ان سرمایہ داروں کے نقصان کی تلافی بھی ان ہی غریبوں پر فرض ہو جاتی ہے جو اپنا روپیہ انشورنس کمپنیوں میں جمع رکھتے ہیں اور نہ کبھی ان کا کوئی جہاز ڈوبتا ہے نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اور اگر یہ نقصان بازار کے نرخ گر جانے سے ہوتا ہے تو سرمایہ دار سٹہ کے ذریعہ اپنا نفع ڈٹا برابر کر لیتے ہیں۔

اب اس معمولی نفع کا حال بھی سنیے جو بینک اپنے لاانتدار عوام کو دیتا ہے، کہنے کو تو بینک عوام کو ہر سال ایک سو کے عوض ایک سو تین دیتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ تین روپیہ بھی مزید کچھ سود دے کر پھر انہی سرمایہ داروں کی جیب میں پہنچ جاتے ہیں۔

جو سرمایہ دار بینکوں سے بڑی بڑی رقمیں لے کر تجارت کرتے ہیں وہ اس دولت کی وجہ سے پورے بازار پر قابض ہو جاتے ہیں چنانچہ جب وہ چاہتے ہیں نرخ بڑھا دیتے ہیں، جب چاہتے ہیں گھٹا دیتے ہیں جب اور جہاں جی میں آتا ہے قحط برپا کر دیتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں اشیاء کی فراوانی ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں انہیں اپنے نفع میں کچھ کمی ہوتی نظر آئی انہوں نے بازار میں اشیاء کے نرخ بڑھا دیئے، اشیاء گراں ہو گئیں اور بیچارے عوام نے خود اپنے ہاتھوں سے وہ سود کی رقم جو بینک سے حاصل کی تھی پھر انہی سرمایہ داروں کے حوالہ کر دی اس طرح ہمارے بینک درحقیقت پوری قوم کے (Blood Bank) بنے ہوئے ہیں جہاں سے سرمایہ دار پوری قوم کا خون چوس چوس کر پھولتے رہتے ہیں اور پوری قوم اقتصادی اعتبار سے نیم جان لاش رہ جاتی ہے۔

یہ تھی اس بینکنگ کی اصلیت جسے آج کل بہت معصوم اور بے گناہ تصور کیا جاتا ہے اور جس کے بارے میں ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ کمرشل انٹرسٹ کی یہ صورت فائدوں سے بھرپور ہے اس لئے اسے حلال طیب ہونا چاہیئے۔

اس بینکنگ کی اصلیت معلوم کرنے کے بعد بھی کیا کسی سلیم الفکر انسان پر یہ بات مخفی رہ سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود کے لین دین کرنے والے کے لئے خدا اور رسول کے اعلان جنگ کی سخت وعید کیوں سنائی؟

ایک اور ضمنی دلیل

جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی لکھتے ہیں:۔

فرض کیجئے ایک شخص آٹھ سو روپے کی ایک بھینس خریدتا ہے جو روزانہ دس پانچ سیر دودھ دیتی ہو یہ اپنی بھینس ایک شخص کو اس شرط پر دیتا ہے کہ تم اس کی خدمت کرو اور اس کے دودھ دہی مکھن سے فائدہ اٹھاؤ، اور مجھے چار پانچ سیر دودھ روزانہ دیا کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کی شرائط پر وہ بھینس کسی کے حوالے کر دے اور وہ ان شرائط کو قبول کر لے تو کیا یہ سودا کسی فقہ کی رو سے ناجائز ہوگا؟

اس سلسلے میں ہم سوائے اظہار حیرت کے اور کیا کر سکتے ہیں، نجانے جعفر شاہ صاحب کو اس صورت کے ناجائز ہونے میں کیا شبہ ہے؟ ہمارے نزدیک سوال یہ نہیں کہ یہ صورت کون سے فقہ کی رو سے ناجائز ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ کون سے فقہ کی رو سے جائز ہے؟ اگر کسی فقہ کی رو سے جائز ہے تو براہ کرم نشاندہی فرمائیے! اس صورت میں بھی چونکہ ایک شخص کا نفع متعین اور ایک کا موہوم اور مشتبہ ہے اس لئے یہ معاملہ ہر فقہ میں ناجائز ہے ہو سکتا ہے کہ کبھی بھینس صرف پانچ سیر دودھ دے اور سارا بھینس کا مالک لے اور خدمت کرنے والے کی محنت اور پیسہ بیکار جاتے!

گلہائے نعت

حکیم مرزا حیدر بیگ (بمبئی)

مطلعِ دیوانِ امکاں رحمۃ اللعالمیں — مقطعِ نظمِ رسولاں رحمۃ اللعٰلمیں
پیکرِ انوارِ یزداں رحمۃ اللعالمیں — سربسر تفسیرِ قرآں رحمۃ اللعٰلمیں
محسنِ کونین، نازِ انبیا، فخرِ رُسل — نائبِ خلاقِ دوراں رحمۃ اللعٰلمیں
آپؐ کی ذاتِ گرامی چشمۂ فضل و کرم — آپ کو کہتا ہے قرآں رحمۃ اللعٰلمین
آپؐ کے روضہ پہ مجھ کو باریابی ہو نصیب — ہے مرے دل میں یہ ارماں رحمۃ اللعٰلمین؟
عالمِ علمِ لدنی، سید اُن کا لقب — ہیں بہارِ باغِ عرفاں رحمۃ اللعٰلمین

دونوں عالم پر فضیلت کیوں نہ ہو حیدر انہیں
دونوں عالم کے ہیں سلطاں رحمۃ اللعٰلمیں

ماہر القادری

تو مقصدِ تخلیق ہے، تو حاصلِ ایماں — جو تجھ سے گریزاں، وہ خدا سے ہے گریزاں
کردار کا یہ حال صداقت ہی صداقت — اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآں
کیا نام ہے شامل ہے جو تکبیر و اذاں میں — اس نام کی عظمت کے ہیں قربان دل و جاں
اشکوں سے ترے دین کی کھیتی ہوئی سیراب — فاقوں نے ترے دہر کو بخشا سر و ساماں
انسان کو شائستہ و خوددار بنایا — تہذیب و تمدن ترے شرمندۂ احساں

رحمت کا یہ عالم ہے، مروت کا یہ انداز
ماہر سا گنہ گار رہے وابستۂ داماں

اتنا ہو فزوں شوق و تمنائے مدینہ — جس سمت نظر جائے، نظر آئے مدینہ
جیسے کہ ابھی عرش سے اترے ہیں فرشتے — اللہ رے! یہ صبح تجلائے مدینہ
یہ کنجِ چمن، یہ روشِ گل، یہ لبِ جو — دل چسپ مناظر ہیں مگر ہائے! مدینہ
یہ بزمِ قدس دربارِ نبی ہے — یہاں تو روشنی ہی روشنی ہے
مبارک! رہروانِ راہِ طیبہ — یہ منزل جا کے جنت سے ملی ہے
مدینہ کے فقیروں کی نہ پوچھو — فقیری میں بھی شانِ خسروی ہے
یہ سیرت اور یہ کردار اللہ اللہ! — تواضع ہے، کرم ہے، سادگی ہے

یہ بزمِ آپ وہ گل جس کی کہ برہم ہو تی جاتی ہے
محمدؐ کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے
سرِ محشر مری فردِ عمل پر ہے نظر اُن کی
طلوعِ مہر سے خود جذب شبنم ہو جاتی ہے

سوز و ساز

شفقت کاظمی

وہ حادثہ جو ترے بعد ہم پہ گذرا ہے
زمانے بھر میں اُسی حادثے کا چرچا ہے
ترے کرم نے کیا تھا کبھی جنہیں برباد
زمانہ آج بھی اُن بیکسوں کو روتا ہے
تری جفا بھی ترے دوستوں کو بھول گئی
تری جفا سے ترے دوستوں کو شکوا ہے
تری ادائے کرم لاکھ دل فریب سہی
مگر وہ دل جو تری بے رُخی پہ مرتا ہے
کسی کی چشم توجہ ادھر نہیں ہوتی
کسی نے ہم کو متاعِ حقیر سمجھا ہے
اُسی خیال کو اے کاظمی ترستا ہوں
وہی خیال کہ سو بار دل میں آیا ہے

ساجد برنی ٹونکی

مآلِ چشمک برقِ دخسر دیکھا نہیں جاتا
جہاں کل آشیانہ تھا، اُدھر دیکھا نہیں جاتا
سراپا دل ہی دل بن جا حریمِ حسنِ جاناں ہیں
کہاں دُنیا میں معیارِ نظر دیکھا نہیں جاتا

شاد عارفی

بُتوں کو نرم دل کہا ہے اور سہارا کہا
مگر یقین کیجئے - خلافِ ماجرا کہا
بہار کو خزاں کہا، خزاں کو مرحبا کہا
سبھی کو حق ہے جس کی جو سمجھ میں آگیا کہا
حقیقتاً یہی تو آپ ہم سے چاہتے بھی تھے
اگر قفس کو آشیاں کہا تو کیا بُرا کہا
یہ سنگ اک دیکھنے سے اور کیا مُراد تھی
جو تم نے آسرا دیا تو میں نے مُدعا کہا
جو حالِ دل وہ کوششوں کے بعد بھی نہ سُن سکے
تو پھر اسی میں مصلحت بھی تھی کہ جابجا کہا
وہی ہوا وہاں وہاں نقاب اُٹھ کے رہ گئی
جہاں جہاں نقابِ رُخ کو میں نے خوشنما کہا
وہ اپنی کج روی پہ اپنے جی میں کٹ کے رہ گیا
جسے بڑے ادب کے ساتھ ہم نے رہنما کہا
جنابِ شاد آپ میں خلوص ہے تو کیا ہوا
غریب کے خلوص کو کسی نے بھی بھلا کہا

بہ یاد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

حمید رونق :- گولکنڈے کی نئی تاریخ کے ترتیب کار ÷ ہر ورق پہ ہیں تری تحقیق کے نقش دلگار
کیا خبر تھی جاگتا جیتا کوئی سو جائے گا ÷ گوہرِ ارضِ دکن کشمیر میں کھو جائے گا

نصیر عارف :- گل پوش وادیوں میں تری روح کھو گئی ÷ اہلِ دکن کی زندگی بے لطف ہو گئی
پیوندِ خاکِ وادیٔ کشمیر ہو گیا ÷ اک کوہِ نور تھا جو نگاہوں سے کھو گیا

رحلتِ زور سے خدا کی قسم ... آج ہر آنکھ ہو گئی پرنم
واقعی تھے زبانِ اُردو کے ... ڈاکٹر "زورِ محسنِ اعظم"
۱۳۸۲ھ

مظہر کامل :—— اُردو کے فدائی مونس کو کشمیر نے ہم سے چھین لیا

مولانا محمد منظور نعمانی
مدیر "الفرقان"
لکھنؤ

روحِ انتخاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت اور آپ کے تشریعی ارشادات کے "حجّتِ دینی" ہونے سے انکار کرنے والے اور اسلام اور قرآن کی اس دور میں بالکل نئی تشریح کرنے والے غلام احمد پرویز اور ان کے خاص خیالات سے ہمارے اکثر ناظرین کرام واقف ہوں گے۔ ادھر کچھ عرصہ سے پاکستان کے دینی اخبارات و رسائل میں ان سے متعلق ایک تکفیری فتوے کا بہت چرچا ہو رہا ہے جو مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے قریباً تقریباً ایک ہزار علماء کی تصدیق اور توثیق کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اگرچہ اس فتوے سے متعلق بعض مباحث اور پرویز صاحب اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی ایک مختصر سی مراسلت بعض رسائل میں ہم نے پڑھی ہے۔ لیکن وہ اصل فتویٰ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے اور نہ پرویز صاحب کے بارے میں رائے قائم کرنے یا رائے ظاہر کرنے کے لئے ہمیں اس خاص فتوے کے مطالعہ کی ضرورت ہے ہم پرویز صاحب کے خاص نظریات و خیالات سے جس حد تک بطور خود واقف ہیں، انہی کی بنیاد پر پورے شرح صدر کے ساتھ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اسلام میں ایسے خیالات کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جس شخص کے یہ خیالات ہوں اس کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام سے یقیناً کوئی تعلق نہیں ہے، اگر ان افکار و خیالات کے بعد بھی آدمی مسلمان ہی رہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلام کوئی متعین اعتقادی و فکری نظام نہیں ہے بلکہ ہندوازم کی طرح اس میں بھی ہر مثبت و منفی عقیدہ کی گنجائش ہے۔

ہمارے ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اب سے بہت پہلے (جب وہ وزیر اعظم نہیں بلکہ صرف سیاسی لیڈر تھے) اپنے خاص دلچسپ انداز میں لکھا تھا کہ ہندو مذہب بھی عجیب مذہب ہے وہ آدمی کا پیچھا کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں، میں کسی مذہب پر بلکہ خدا پر بھی یقین نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود ہندو ہوں اور ہندو مذہب میرے ساتھ چمٹا ہوا ہے[1]

ہمیں بڑا تعجب اور رنج ہی دکھ ہوتا ہے جب ہم کسی ایسے صاحب سے جن کو ہم دین سے ناواقف اور نابلد نہیں قرار دے سکتے ایسی بات سنتے ہیں جس کا حاصل اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی شخص جب تک اپنے کو مسلمان کہے اور توحید و رسالت کا اقرار کرے خواہ دین کی اساسی حقیقتوں کے بارے میں بھی اس کے خیالات میں کتنا ہی زیغ اور انحراف آ جائے اور حقائق دینی کی وہ کیسی ہی دُور از کار طرح تاویلیں کرے وہ مسلمان ہی رہتا ہے اور اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسلام کی سرحد اور اس کے دائرہ سے نکل گیا۔

ہم بار بار غور کرنے کے بعد بھی بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اس مسئلہ میں ایسے حضرات کا واقعی موقف کیا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے۔ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا اقرار کرتا ہے لیکن کہتا ہے کہ وہ اللہ جس کی وحدانیت کا میں کلمہ میں اقرار کرتا ہوں مختلف زمانوں میں مختلف انسانی ہستیوں کے روپ میں آتا رہا ہے اور ہمارے اس زمانے میں فلاں ہستی کی شکل میں اس نے ظہور کیا ہے اس لئے میں اسی ہستی کی پرستش کرتا ہوں—

خدا را بتایا جائے کیا اس گمراہانہ عقیدہ کے بعد بھی یہ کہا جائے گا کہ اس کا کلمہ شریف پر ایمان ہے اور یہ اب بھی مسلمان اور ملت

محمدیہ کا ایک جزو ہے؟ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور کلمہ کے دونوں جزو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو واحد معبود اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی و رسول مانتا ہے لیکن کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنے فرسودہ اور دقیانوسی خیالات کی بنا پر نبی و رسول کے معنی بالکل غلط سمجھے اور توہم پرستی کے تحت جبرئیلؑ، فرشتے اور وحی کا ایک خاص تصور اس کے ساتھ جوڑ لیا۔ حقیقت میں رسول بس قوم کا روشن ضمیر لیڈر اور مصلح ہوتا ہے اور خداداد عقل اور فہم و فراست سے قوم کی رہنمائی کرتا ہے اور ایک دستورِ حیات وضع کرکے اس کو دیتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے سارے نبیوں، رسولوں کی اصل حیثیت بس یہی تھی۔ اعجوبہ پسند اور توہم پرست لوگوں نے نبوت و رسالت کا ایک محیر العقول اور توہم پرستانہ تصور گھڑ کے اسلام میں داخل کر دیا۔ صحیح اسلامی عقیدہ وہ ہے جو میں پیش کر رہا ہوں اور سچا مسلمان میں ہی ہوں۔ فرمایا جائے کیا اس ملحدانہ عقیدے کے بعد بھی اس کو مسلمان ہی کہا جائے گا کیوں کہ اپنے کو وہ مسلمان ہی کہتا ہے اور کلمہ کا انکاری بھی نہیں ہے؟

اسی طرح فرض کیجئے ایک شخص کلمہ پڑھتا ہے اپنے کو مسلمان کہتا ہے۔ قرآن کو "خدا کی کتاب" بھی مانتا ہے لیکن کہتا ہے کہ قرآن کے بارے میں "کلام اللہ" اور "وحیِ الٰہی" ہونے کا جو تصور عام مسلمانوں کا ہے وہ بالکل غلط اور جاہلانہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو نیک خیالات اور اچھی تجویزیں آتی تھیں آپ اُن کو ایک خاص خطیبانہ انداز سے مرتب کر کے قلمبند کرا دیتے تھے اور اس کو خدا کی طرف نسبت کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے کیوں کہ ہر اچھائی کا سرچشمہ خدا ہی کی ذات ہے۔ قرآن کے "کتاب اللہ" ہونے کا مطلب بس اتنا ہی ہے اور عام مولویوں اور مسلمانوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے وہ انکی جہالت ہے۔

فرمایا جائے کیا اس شخص کے اس عقیدہ کے باوجود یہ کہا جائے گا کہ قرآن کے کتاب اللہ ہونے پر اس کا ایمان ہے اور وہ صاحبِ ایمان اور مسلمان ہے؟

یہ خیال ہے کہ کوئی صاحب بھی جن کو دین کی ابجد کا بھی علم ہو ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دیں گے اور مندرجہ بالا گمراہانہ خیالات رکھنے والے لوگوں کو مسلمان نہیں کہیں گے حالانکہ یہ سب اپنے کو مسلمان کہتے اور کلمہ پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

جن لوگوں نے غور نہ کیا ہو انھیں سوچنا چاہئے کہ دعوائے اسلام اور بظاہر کلمہ کے اقرار کے باوجود ایسے لوگوں کو مسلمان کیوں نہیں کہا جا سکتا؟ وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے دین کی ایسی مسلّم باتوں کا انکار کیا ہے جن کا دینی حقیقت اور دینی عقیدہ ہونا پورے یقین اور قطعیت کے ساتھ امت کو معلوم ہے اگرچہ انھوں نے یہ انکار تاویل کے پردہ میں کیا ہے۔

علماء و مصنفین کی خاص اصطلاح میں دین کی ایسی حقیقتوں کو "ضروریاتِ دین" کہتے ہیں۔ یہاں ضروریات کے معنیٰ فرائض و واجبات کے نہیں ہیں بلکہ "ناقابلِ شک یقینیات" اور "بدیہیات" کے ہیں۔ ایسی کسی ایک چیز کا بھی انکار کر دینے کے بعد آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ یہ انکار تاویل کے پردہ میں اور لفظوں کے اقرار کے ساتھ ہو جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہو چکا۔

پرویز صاحب کے مسئلہ کی نوعیت بھی یہی ہے۔ زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے ادھر چند برسوں سے منصبِ رسالت کی جو نئی تشریح کی ہے جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے تشریعی ارشادات کو "امیرِ ملت" کے وقتی اور ہنگامی احکام قرار دیتے ہوئے ان کے حجتِ شرعی ہونے سے انکار کیا ہے۔ (جو اُن کی دعوت کا مرکزی نقطہ بنا ہوا ہے) ہمارے نزدیک اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ تاویل کے پردہ میں حقیقتِ رسالت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کا انکار ہے۔

انکار کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی صاف کہے کہ میں فلاں کو نبی و رسول نہیں مانتا۔ یہ بالکل سیدھا سادہ کفر ہے جس میں کوئی دجل، فریب اور کوئی پردہ نہیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ رسولؐ اور رسالت کے الفاظ کا تو انکار نہ کرے بلکہ اقرار کرے لیکن نبوت کی حقیقت اور رسولؐ کے منصب کی بالکل نئی ایسی تشریح کرے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ رسولؐ کی حیثیت قرآن مجید نے بیان کی ہے اور جو امت میں بلا اختلاف مُسلّم چلی آرہی ہے وہ باقی نہ رہے۔ یہ انکارِ رسالت کی نہایت خطرناک اور فریب کارانہ صورت ہے اور علمی و دینی اصطلاح میں کفر و انکار کی اس صورت کو الحاد و زندقہ کہا جاتا ہے۔

اگر دین کی مسلّم اور بنیادی حقیقتوں کی اس قسم کی ملحدانہ تاویلوں کو بھی کفر نہ کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ توحید و رسالت جیسی بنیادی دینی اصطلاحوں کی بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہے جس کا جو جی چاہے اُن کے معنی تراش لے۔ اور اسلام کے بارے میں اس سے زیادہ غلط اور گمراہانہ بات کوئی نہیں کہی جاسکتی۔

ایک فریب یا مُغالطہ

یہاں ایک مغالطہ کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جب کسی محرفِ دین ملحد کے بارے میں محتاط اور خدا ترس علماء بھی اپنے منصبی فریضہ اور امت کی خیرخواہی کے تقاضے سے مجبور ہوکر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس شخص نے اپنا رشتہ اسلام سے منقطع کرلیا اور یہ اسلامی برادری سے نکل گیا۔ اس لئے اب مسلمان اس کے ساتھ مناکحت جیسے وہ معاملات نہ کریں جو صرف مسلمانوں کے ساتھ کئے جاسکتے ہیں۔ تو اس کے حامیوں کی طرف سے علماء کے اس فیصلہ کو بے اثر و بے وقعت بنانے کے لئے ایک وکیلانہ چال یہ بھی چلی جاتی ہے کہ طبقہ علماء کے بعض غیر محتاط افراد یا بعض خاص حلقوں کی طرف سے تکفیر کے بارے میں جو بے احتیاطیاں اور افسوسناک زیادتیاں پچھلے دور میں ہوئی ہیں ان کی فہرست مرتب کرکے عوام کے سامنے رکھ دی جاتی ہے اور بڑے مصنوعی انداز میں کہا جاتا ہے کہ ان مولویوں مفتیوں کے فتووں کا کیا اعتبار ان لوگوں نے تو فلاں فلاں اکابر امت اور خادمانِ دین و ملت کو کافر کہا ہے۔۔۔"

حالانکہ یہ محض مغالطہ یا فریب ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے اس بارے میں دانستہ یا نادانستہ غلطی کی تو کسی بھی منطق کی رو سے اس سے یہ تو لازم نہیں ہوجاتا کہ اب قیامت تک جس ملحد کے خلاف بھی فتویٰ دیا جائے وہ لازماً غلط ہی ہوگا۔

اگر یہ لوگ اپنی اس غلط منطق کے ذریعے سیدھے سادے بندگانِ خدا کی آنکھوں میں دیدہ و دانستہ خاک جھونکنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ غلط فہمی یا کم علمی کی وجہ سے یہ باتیں کرتے ہیں تو ہم ان سے کہنا چاہتے ہیں۔ خدارا آپ سوچیں کہ انسانوں کا وہ کونسا معاملہ اور حیاتِ انسانی کی کتابِ زندگی کا وہ کونسا باب ہے جس میں کبھی غلطی نہیں ہوئی اگر کسی معاملہ میں کچھ لوگوں سے غلطی ہوجانا یا دیدہ و دانستہ نفسانیت کے کسی تقاضہ کی بنا پر کسی کا کوئی غلط فیصلہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ اس باب میں اب جو کوئی بھی کچھ کہے گا وہ لازماً غلط ہی ہوگا تو پھر تو زندگی کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکے گی۔

کیا پولیس کی طرف سے مجرموں کے چالانوں اور عدالتوں کی طرف سے ان کے لئے سزاؤں کے فیصلوں میں کبھی کبھی غلطی ہوجانے کو بنیاد بنا کر پولیس کے ہر اس چالان کو جو وہ کسی چور، ڈاکو یا دوسری قسم کے کسی مجرم کا کرے اور اس کی سزا کے ہر عدالتی فیصلہ کو غلط ہی کہا جائے گا اور محکمہ پولیس اور سارے عدالتی نظام کو لاحاصل اور بے اعتبار قرار دے کر اس کو ختم کردیا جائے گا؟ اور کیا طبیبوں، ڈاکٹروں

نقص و تجویز میں کبھی کبھی غلطی ہو جانے کی وجہ سے سارے محکمۂ صحت کو فضول اور ناقابلِ اعتبار قرار دے کر سارے ہسپتالوں کو توڑ ڈالا جائے گا؟

کیسی احمقانہ بات ہے اور کتنا پُر مغالطہ ہے جس کو ہمارے زمانے کے ملحدوں اور ان کے حامیوں نے "منطق" بنالیا ہے ؟

واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب کے متعلق اب، اور مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کو نبی ماننے والے اُن کے امتیوں کے بارے میں اب سے محتاط اور خدا ترس علمائے جو فیصلہ کیا وہ اس وقت کیا جب یہ بات غیر مشکوک طور پر سامنے آگئی کہ انھوں نے تحریف اور تاویل کے پردہ میں دین کی ان اساسی حقیقتوں کا انکار کیا ہے جن کے انکار کے بعد کسی شخص کے لئے اسلام کے نہایت وسیع دائرہ میں بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی برادری والے تعلقات ایسے شخص سے منقطع کرلیں اور دین و شریعت کے امین علمائے کرام پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کے بارے میں بلا خوف لومۃ لائم مسلمانوں تک اللہ و رسول کا حکم پہنچا دیں۔

ظاہر ہے کہ تجدد اور "روشن خیالی" کے اس زمانے میں اس دینی ذمہ داری کا ادا کرنا اور فیشن کے خلاف اس طرح کے شرعی فیصلے کا اعلان کوئی خوشگوار اور "نفع بخش" کام نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو ملامت کے طعنوں اور ملامت کے تیروں کا نشانہ بنانا ہے۔ اگر علماء فیشن سے مرعوب ہو کر اس فرض کو ادا کرنا چھوڑ دیں تو اسلام اور کفر کا امتیاز ہی ختم ہو جائے گا۔ اور اللہ اور رسول اور دین کے ساتھ یہ علماء کی غداری ہوگی۔

ہاں اسی کے ساتھ ہم کہتے ہیں کہ علماء کرام کا یہ بھی فرض ہے کہ اس طرح کا کوئی فیصلہ انتہائی احتیاط، پوری خدا ترسی اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ صرف اسی وقت کریں جب شرعاً وہ اس کے لئے بالکل مجبور ہیں اور اس میں بھی ملت اور امت کی خیر خواہی کو "رہنما" اصول کے طور پر اپنے سامنے رکھیں۔

وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ!

—×—

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

ناخدائے سخن حضرت نوحؔ ناروی مرحوم

شعر کہنے اور شعر سمجھنے کا جب تھوڑا بہت شعور پیدا ہوا، اُس وقت میری عمر بہت سے بہت تیرہ چودہ سال کی ہوگی، اُسی زمانے میں حضرت نوحؔ ناروی کا کلام رسالوں میں پڑھا، اُن کے نام کے ساتھ "جانشینِ داغ" لکھا جاتا تھا۔ یہ نسبت میرے لئے مرعوب کن بھی اور محبوب و پسندیدہ بھی!

سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ کا ایک مشہور قصبہ ہے، وہاں سال کے سال بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہوا کرتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب شعراء کسی معاوضہ اور نذرانہ کے بغیر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور دو چار شاعروں کو چھوڑ کر باقی حضرات تو اپنی گرہ سے پیسہ لگا کر یہ خرچ کر کے مشاعروں کو گرماتے تھے!

ہاں! تو جن دنوں (۱۹۲۶ء) میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا، اُسی سال سکندرہ راؤ کے مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا، حضرت نوحؔ ناروی کے دیکھنے کا شوق وہاں کھینچ کر لے گیا، مگر اُن کے آنے کی خبر "افواہ" نکلی، وہ وہاں نہیں آئے! اُس نواح کے مشہور شعراء میں تین استادوں (دلگیر مارہروی، طپش مارہروی، اور اختر فیروزآبادی) کو اُس مشاعرے میں سُنا حضرت دلگیر مارہروی کی عمر ستر سے کیا کم ہوگی، مگر ترنم میں وہ سوز، دل کشی اور گرمی تھی کہ سننے والے سچ مچ دل تھام کر رہ جاتے تھے! جوان بیٹے کی موت نے دلگیر مرحوم کے کلام اور آواز میں اور زیادہ درد اور سوز پیدا کر دیا تھا، اُن کے یہ شعر آج تک یاد ہیں:-

جو خون دل میں تھا، وہ مری چشمِ تر میں ہے ۔۔۔ اے ضبط! روکنا کہ ابھی گھر کے گھر میں ہے

پہلے ہی خاکِ دل تھی مری مختصر کائنات ۔۔۔ اب پوچھنا ہی کیا کہ تری رہگذر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کش مکشِ نزع سے دلگیر

پہلا یہ اتفاق اُسے عمر بھر میں ہے

زمانہ گزرتا گیا۔ راقم الحروف کی شعر فہمی اور شعر گوئی کا معیار بھی مشق و مُطالعہ کے ساتھ بلند ہوتا اور نکھرتا چلا گیا۔ بدوِ شعور اور آغازِ شباب میں علم و سیاست اور شعر و ادب کی جن شخصیتوں سے متاثر ہوا تھا، اُن کے بارے میں بھی رائے پہلی جیسی نہیں رہی! انفعال و تاثر کے یہ پہلے نقوش کچھ اور زیادہ اُبھرے، کچھ دُھندلا گئے، اور بعض مٹ گئے۔

پھر وہ دور بھی آگیا کہ میں خود شہر شہر مشاعروں میں جانے لگا، آج مدراس میں مشاعرہ پڑھا، پرسوں بمبئی میں اور اس کے تیسرے دن بعد کھڑک پور (بنگال) میں! یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا، مگر حضرت نوحؔ ناروی مرحوم سے ملاقات نہیں ہوئی، ہاں! اُن کے شاگرد سکھ دیو سہائے بسمل الٰہ آبادی کو کئی مشاعروں میں سُنا، وہ از راہِ عقیدت اپنے اُستاد کی مدح میں ایک دو رُباعیاں اور قطعے ضرور پڑھتے تھے!

حضرت نوحؔ ناروی سے علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں سب سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا، یہ غالباً ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے، یہ ملاقات بہت

ہی سرسری سی تھی، مشاعرے کے اسٹیج پر طویل ملاقات کا کہاں موقع تھا! اس کے بعد حضرت سائل دہلوی مرحوم کے دولت کدہ پہ دلی میں حضرت نوح ناروی مرحوم سے نہ صرف ملاقات بلکہ طویل صحبتیں رہیں! سائل اور نوح میں بڑا یارانہ اور بھائی چارہ تھا ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے اور ساتھ ہی ادب و احترام کے حدود کا بھی پورا لحاظ رکھتے! یہ وضعداری اب عنقا ہوتی جارہی ہے۔

حضرت سائل مرحوم مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے، حیدرآباد دکن میں ان سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا، یہ اب چھبیس سال پہلے کی بات ہے۔ نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج مرحوم جو حضرت داغ سے شرف تلمذ رکھتے تھے، مجھے سائل مرحوم کی قیام گاہ پر لیگئے۔ پہلی ملاقات ہی میں دل ملا ان سے قربت محسوس کی فرمایا جب وطن کی طرف آنا ہو تو دلّی میں میرے یہاں قیام کرنا۔

۱۹۳۵ء میں میرا دلّی جانا ہوا، میں تانگے میں سامان رکھے ہوئے، قاضی حوض کے آس پاس حضرت سائل مرحوم کا مکان پوچھ رہا تھا آگے بڑھ کر گلی کے نکڑ پر ایک خوش رو نوجوان ملا، وہ مجھے سائل صاحب کے یہاں پہونچا آیا ——— یہ نوجوان صاحبزادہ جمیل الدین عالی تھے، اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ مسیں بھیگ رہی تھیں اور

بالائے سرش زہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

حضرت سائل مرحوم کے یہاں چھ سات دن قیام کیا۔ اُن کی بیگم صاحبہ مجھ سے پردے سے بات چیت کرتی تھیں اُن کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کی لذت آج تک یاد ہے کس خلوص و شفقت کے ساتھ میزبانی فرمائی، حضرت سائل مرحوم نام کے نہیں دل کے نواب تھے، گرمی میں برف کا پانی پیتے، تو اُس میں گلاب حل کیا جاتا، بعض اوقات۔ مجھے خاصہ کے اس پانی کا گلاس مرحمت کرتے ہوئے فرماتے:۔

"ماہر! میں ہر کسی کو یہ پانی نہیں دیتا، تجھے دیتا ہوں تجھے ...."

نوح ناروی مرحوم کا ذکر چلا تو اُن کے استاد بھائی سائل دہلوی کی بھی یاد آگئی، حضرت نوح ناروی سے میری کئی مفصل ملاقاتیں حضرت سائل دہلوی ہی کے یہاں ہوئیں! ایک بار انھوں نے جوانی اور پیری کے عنوان پر اپنی رُباعیاں سُنائیں! بعض رُباعیاں تو خیام اور سرمد کی رُباعیوں سے ملتی جلتی تھیں ——— اُن کی غزلوں کے رنگ سے بالکل مختلف!

دھولیا، صوبہ بمبئی کا ایک ضلع ہے، وہاں کے مُشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا، حضرت نوح ناروی کے شاگرد حافظ دھولیوی (مرحوم) تھے۔ اُن کے شاگردوں کا سلسلہ اُس نواح میں پھیلا ہوا ہے، اس رشتہ اور نسبت سے وہ اپنے دادا اُستاد (حضرت نوح) کا عزت و احترام پیروں کی طرح کرتے تھے۔ نہایت ادب کے ساتھ عقیدت مندوں کا ایک ہجوم اُن کے اردگرد بیٹھا رہتا! اس مُشاعرے کا یہ لطیفہ میں بھولنا چاہوں تو بھی نہیں بھول سکتا:۔

مُشاعرہ اپنے شباب پر تھا، رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ اناؤنسر صاحب نے مائکروفون ہاتھ میں پکڑ کر اعلان فرمایا:۔

"حضرات! مشاعرہ دس منٹ کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے، کیونکہ ناخدائے سخن،

فصیح العصر جانشین داغ حضرت قبلہ نوح ناروی مدظلہٗ استنجا کرنے جارہے ہیں"

یہاں یہ حال کہ ہنسی کا ضبط کرنا مشکل تھا، اور وہاں سامعین میں سے کسی کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تک نہیں آئی، وہ لوگ اس قسم کے اعلانات سُننے کے عادی ہونگے۔

بمبئی میں پنجاب مُسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے بڑے شاندار پیمانہ پر "یوم اقبال" منایا جاتا تھا۔ تین دن کا پروگرام ہوتا

ہماری نظر میں

شہادت امام مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ از:- مولانا سید نورالحسین بخاری، ضخامت ۴۶۶ صفحات (مجلد مع گرد پوش کے ساتھ) قیمت:- پانچ روپے - ملنے کا پتہ:- دارالتصنیف والاشاعت محلہ قدیر آباد ملتان شہر اور --- ۱۴ - بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور-

صاحب الحیاء والایمان حضرت سیدنا عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد ہیں، ذوالنورین اور مجہز جیش العسرہ ہیں، جس کو ایمان واسلام کی حلاوت نصیب ہے اُسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی محبت ہونی چاہیے جو وہ لوگ جو صحابہ کرام پر زبان طعن دراز کرکے اپنی عاقبت کو خراب کرتے ہیں ---- تو وہ :-

؎ بے ادب محروم شد از فضل رب

کا مصداق ہیں -

مولانا سید نورالحسین بخاری نے یہ کتاب بڑی تحقیق اور محنت و کاوش کے ساتھ لکھی ہے، انھوں نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو فتنہ برپا ہوا اس کے محرکات وعوامل کیا تھے؟ عبداللہ ابن سبا اور مالک ابن اشتر کی پارٹی نے اس فتنہ کو کس طرح ہوا دی؟ بصرہ اور شام میں خفیہ جماعتوں نے کیا پارٹ ادا کیا؟ حضرت عثمانؓ نے کتنی عظیم استقامت اور صبر کا ثبوت دیا، یہاں تک کہ آپ مظلومیت کے عالم میں شہید ہوگئے، خلیفۂ ثالث کی شہادت اسلامی تاریخ کا انتہائی غم انگیز سانحہ ہے! اُن عزاداروں کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس ناانصافی کا جواب دینا پڑے گا، جو شہادتِ کربلا کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں مگر شہادتِ عثمانؓ کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عبداللہ ابن سبا نے سب سے پہلے یہ عقیدہ تراشا کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے، حضرت علیؓ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وصی ہیں، اسی مجوسی سرشت فتنہ ساز نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے الوہی صفات منسوب کیں۔

وہ کہتا ان امیرالمومنین علیہ السلام ھو اللہ تعالیٰ اور اس کا خیال تھا کہ علی نعوذ باللہ تعالیٰ ہیں۔

شاہانِ بنو اُمیہ کی مدافعت میں سر آغا خان آنجہانی کی تحریر کا جو اقتباس پیش کیا گیا ہے، وہ اس کتاب کا کمزور باب ہے، تاریخی حقیقت ہے کہ مجموعی طور پر بنو اُمیہ کا دور اسلامی تاریخ کا دھندلا دور ہے، خلافت کو ملوکیت سے بدلنے کی بدعت بنو اُمیہ ہی کی ایجاد کی ہوئی ہے! یہ کیا ضرور ہے کہ حضرت عثمانؓ یا حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کے مناقب و فضائل جب بیان ہوں، تو بنو اُمیہ کی مدح و ستائش کے پہلو اور گوشے بھی پیدا کئے جائیں۔

"... پھر حضرت امیر معاویہؓ کی ذاتِ پاک، عظمتِ شان اور جلالتِ قدر اپنی نظیر آپ ہے، آپ کے فضائل ومناقب بے شمار و بے حساب ہیں۔ (ص ۹۷)

"ذاتِ پاک" کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے (سبحان اللہ وبحمدہ) کوئی شک نہیں حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) صحابی رسول ہیں، اور کاتب وحی ہیں، مگر اُن کے فضائل ومناقب کو بے شمار و بے حساب کہنا یہ مبالغہ آمیز عقیدت

ہے! اس کے مقابلے میں یہی الفاظ (آپکے فضائل ومناقب بے شمار و بے حساب ہیں) اگر حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے لئے استعمال کئے جائیں، تو یہ حقیقت و واقعیت کی صحیح ترجمانی ہوگی۔

مروان تاریخ اسلام کی قابل تعریف شخصیت ہرگز نہیں ہے مگر اس کتاب میں مروان کے مناقب وفضائل بیان کئے گئے ہیں! اب رہیں بعض علماء کی بعض غیر ثقہ اور ناپسندیدہ اشخاص کے بارے میں رائیں تو اسی قسم کی رایوں کو لے کر محمود عباسی نے یزید کا مناقب نامہ لکھ ڈالا ہے۔

حضرت عثمانؓ خلیفہ راشد تھے اور اُن کی شہادت مظلومیت کی شہادت ہے (رضی اللہ عنہ) اُن کی محبت وعقیدت ہمارے ایمان کا تقاضا ہے، اس اعتراف کے بعد یہ بھی واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے مقابلہ میں حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ڈھیل پیدا ہو گئی!

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر بعض الزامات جو لگائے جاتے ہیں، اُن کی فاضل مؤرخ نے بڑے اچھے انداز میں مدافعت کی ہے کوئی شک نہیں یہ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش کے ساتھ مُرتب کی گئی ہے! مولانا سید نور الحسن بخاری عرصہ دراز سے "رفض" کی تردید فرمارہے ہیں، مگر رفض کی تردید کرتے کرتے اُنہیں بنو امیہ سے دلی لگاؤ اور خاص اُنسیت وعقیدت پیدا ہو گئی ہے!

نجاتُ المومنین

از:۔ مولانا شاہ محمد عبد المجید قادری عثمانی بدایونی —— ضخامت ۳۲ صفحات۔
قیمت:۔ ۵۰ نئے پیسے، ملنے کا پتہ:۔ ادارہ مدینۃ العلم ۲۳ زکریا اسٹریٹ، کلکتہ

یہ رسالہ مختصر ہے مگر مفید ہے، اس میں دین کے بنیادی معتقدات واحکام آسان اور سہل زبان میں بیان کئے گئے ہیں، رسالہ ہذا بہت سے ابواب اور فصول پر مشتمل ہے، ایمان سے لے کر مسائل حج تک کے بنیادی عقائد واحکام کی تشریح اس میں ملتی ہے! ڈاکٹر شیخ علیم الدین قادری نے اس رسالہ پر پیش لفظ لکھا ہے، موصوف بریلوی عقائد کے پرجوش مُبلغ ہیں، یہ ادارہ انہی عقائد کی تبلیغ کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اِسلام اور جدید مسائل

از:۔ ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۳۷ پیسے۔
(تبلیغی مقاصد کے لئے، ساڑھے بارہ روپیہ فی سینکڑہ)
ملنے کا پتہ —— آزاد بک ڈپو، سرگودھا

اس کتابچہ میں بہت سے جدید مسائل پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے دینی نقطۂ نگاہ سے اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے، چند صفحے دین ودانش کا دفتر ہیں، سُلجھی ہوئی فکر، دل نشین انداز بیان، وزنی دلائل! پھر سب سے بڑھ کر اعتماد ویقین کی وہ کیفیت جو جواب دینے والے کے قلب وضمیر میں پائی جاتی ہے کہ —— اِسلام ہی دینِ فطرت اور دینِ انسانیت ہے!

اِسلامی دُنیا چوتھی صدی میں

از:۔ حافظ غلام مرتضیٰ (اُستاد عربی وفارسی الٰہ آباد یونیورسٹی)
ضخامت ۱۷۶ صفحات (مجلد، رنگین سرورق) قیمت:۔ دو روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ حافظ نعمان احمد، ۵۔ احمد گنج تکیہ الٰہ آباد ۳ (انڈیا)

اس کتاب کے تعارف کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:۔
"پیشِ نظر کتاب —— اسلامی دُنیا —— (چوتھی صدی میں) کے اندر پورے عالمِ اسلام کی مذہبی حالت سے بحث کی گئی ہے، شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے

میں دین مختلف اسلامی فرقوں کا تعارف کرایا گیا ہے، نیز اہلِ سنت والجماعت کے ائمہ اربعہ کے سوانح حیات، طریقۂ اجتہاد اور علمی خدمات کو مستند اور معتبر کتابوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ غیر اسلامی مذاہب۔ مثلاً یہود و نصاریٰ وغیرہ کے عقائد کی تشریح اور انکے مختلف فرقوں کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔

"مقدمہ کے علاوہ کتاب میں چودہ (۱۴) فصلیں ہیں، ہر فصل کے شروع میں خاص اقلیم کا جائے وقوع اور اس کی جغرافیائی تقسیم کا بیان ہے، اس کے بعد وہاں کے باشندوں کی مذہبی حالت اور عقائد کا ذکر ہے"۔۔۔

"تعارف" میں اس کتاب کے بارے میں جو تفصیل دی گئی ہے، اس کی تصدیق کتاب کے مطالعے سے ہوتی ہے! "اسلامی دنیا شروع سے لے کر آخر تک معلومات آفریں کتاب ہے، عربی کی دسیوں کتابوں سے استفادہ کے بعد فاضل مولف نے یہ کتاب لکھی ہے، اردو جاننے والوں کو اس کتاب سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

تاریخ تدوین حدیث

از:- ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ——— تعلیقات:- مولانا سید یحییٰ ندوی۔
پیش لفظ:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۶۷، اصفحات (مجلد دیدہ زیب سرورق)
قیمت:- تین روپے پچاس پیسے، ملنے کا پتہ:- پاک اکیڈیمی کراچی۔

علمِ حدیث کا بلند مقام اور اس کی اہمیت ——— عہدِ نبوی میں احادیث کے صحیفے ——— کتابتِ حدیث عہدِ نبوی کے بعد، منکرینِ حدیث کی تکنیک ——— حدیث کی حجت، ماخذ قانونِ اسلامی کی حیثیت سے ——— فتنۂ وضعِ احادیث کا آغاز ——— احادیثِ نبوی کے متعلق صحابہ کا حزم و احتیاط ——— روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ کا مسئلہ ——— روایتِ حدیث کی شرائط ——— تنقیدِ حدیث کے بعض اہم اصول ——— طریقہ اسناد کی ایجاد۔۔۔۔

ان عنوانات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر کتنی جامع، مدلل اور مفید و کارآمد ہے! "تاریخ تدوینِ حدیث" نے فتنۂ انکارِ حدیث پر خوب کس کر ضرب لگائی ہے! اللہ تعالیٰ ان اہلِ قلم اور اربابِ علم کو دارین میں اجر عطا فرمائے گا جنھوں نے اس خبیث فتنہ کی تردید میں اپنی قوتیں اور توانائیاں صرف کی ہیں۔

کتاب الآداب

از:- محمد یٰسین، ضخامت ۲۱ صفحات، ۲۸۴ بندر روڈ کراچی سے، ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر بلا قیمت طلب کی جاسکتی ہے۔

تفسیر سورۂ حجرات

اس کتابچہ میں سورۂ حجرات کی تفسیر آسان اردو میں پیش کی گئی ہے، زیادہ تر اقتباسات "تفسیر المنان" اور "بیان القرآن" سے لئے گئے ہیں! اندازِ بیان صاف و سادہ ہے، نہ کسی اختلافی مسئلہ کو چھیڑا ہے اور نہ کوئی ایسی بات کہی ہے جو پُر پیچ ہو!

جناب محمد یٰسین مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں، انھوں نے متعدد دینی کتابچے مرتب فرمائے ہیں اور ان پہ ہزاروں روپیہ خرچ کیا ہے! ان کی مرتب کی ہوئی تمام کتابیں کسی قیمت کے بغیر دی جاتی ہیں! یہ انکی "HOBBY" اور شوق ہے مگر کتنا مبارک شوق ہے۔

حقیقتِ تصوف

مرتبہ:- مولوی حیات شریف، ضخامت ۲۴ صفحات۔ قیمت دو آنہ۔
ملنے کا پتہ:- ادارۂ اہلِ سنت و جماعت کمان سلطان شاہی حیدرآباد دکن (بھارت)

اس کتابچہ میں اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ ہندو فلسفہ، تصوف کی بنیاد ہے! فاضل مُرتب نے بھگوت گیتا، پتنجلی، اتھروید اور رگ وید کے بعض وہ اقتباسات پیش کئے ہیں، جو تصوف کی بعض تعلیمات سے ملتے جلتے ہیں!

"تصوف میں دیوتاؤں کی نسبت عقیدہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے خصوصی دائروں میں حکمراں ہیں، ان کو ماننے والا اگر اُن سے دُعا کرے تو وہ اُن کی مدد کرتے ہیں ـــــ جو مسلمان تصوف کے معتقد ہیں، اُن کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ حاجت روائی کے لئے غوث کا ایک ڈپارٹمنٹ ہے، امام، ابدال، اوتاد، اقطاب، نقباء، نجباء وغیرہ ہم اس ڈیپارٹمنٹ کے کارپرداز ہیں، جو بھی ان کے حضور میں دستِ سوال دراز کرتا ہے، یہ عہدہ دار اُن کی حاجات و مُرادات میں ان کی دستگیری کرتے ہیں"۔ (ص ۲۵)

کوئی شک نہیں کتنے فاسد عقائد اور مشرکانہ رسوم و بدعات ہیں جو کہ تصوف کے واسطے سے مسلمانوں میں درآمد ہوتے رہیں ـ

تدریس اُردو

از :- فرمان فتحپوری، ضخامت دو سو صفحات، (مجلد، رنگین سرورق، دیدہ زیب ٹائپ)

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ تعلیم ملی طیرسٹی، کراچی ۲۳ ـ

جناب فرمان فتحپوری (لکچرار شعبہ اُردو کراچی یونیورسٹی) شاعر ہیں، نقاد ہیں اور انشاء پرداز ہیں! افسوس ہے اُردو دنیا میں وہ اتنے معروف نہیں ہیں جتنا معروف اُنہیں ہونا چاہیے، اُن کی اس کتاب (تدریس اُردو) کو پڑھ کر اس کا اندازہ ہوا کہ فرمان صاحب "لسانیات" میں بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور اس موضوع پر اُن کا مطالعہ خاصہ وسیع ہے ـ

اس کتاب میں فرمان فتحپوری نے زبان کے وجود میں آنے کے اسباب، اُردو زبان کی پیدائش، اُردو کی سرشت و ساخت اردو میں داخل ہونے والے الفاظ کی نوعیت، اُردو کے لب و لہجہ اور اُردو زبان کے ارتقاء سے بحث کی ہے!

اس کے بعد اردو کی اہمیت، اردو تدریس کا مقصد و معیار، اُردو تدریس کے عام وسائل و ذرائع، بولنا، پڑھنا، لکھنا، انشاء و قواعد ـــــ اس کتاب کے اہم ابواب ہیں! فاضل مصنف نے دل نشین انداز میں ہر موضوع پر گفتگو کی ہے، اور جو بات کہی ہے کھرا کہی ہے! یہ کتاب اساتذہ، طلباء، عوام و خواص سبھی کے کام کی ہے!

صفحہ ۱۲ پر اُردو تلفظ "مُزدور" لکھا ہے ("مُ" پر پیش کے ساتھ) اُردو بولنے والے! عام طور پر "مَزدور" ("مَ" مفتوح) بولتے ہیں ـــــ "پیار و محبت" (صفحہ ۱۶) عربی اور اُردو کے لفظوں کے درمیان "واو" عطف نہیں لاتے! یوں بھی جھگڑا ٹنٹا، کھیل کود، پیار محبت، لاڈ پیار، چین آرام، وغیرہ الفاظ "عطف" کے بغیر بولے جاتے ہیں ـــــ صفحہ ۱۲۱ پر "وسعت و گہرائی" پڑھ کر اور زیادہ تعجب ہوا ـ

اُردو کی ترقی اور اثر و نفوذ کے سلسلہ میں "باغ و بہار" تک کا ذکر ہے، مگر حیرت ہے مولوی اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان اور شاہ عبدالقادر صاحب کے "اُردو ترجمہ قرآن" کا ذکر نہیں کیا گیا! اُردو نثر نگاروں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام ضرور آنا چاہیے ـ اُن کی تحریریں اُردو زبان و ادب کا مثالی اور معیاری نمونہ ہیں ـ

نسانۂ مبتلا

از :- شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مُرتبہ :- پروفیسر افتخار احمد صدیقی ـ ضخامت :- ۳۷۰ صفحات، سفید کاغذ پر ـــــ قیمت :- چار روپے پچاس پیسے، اخباری کاغذ پر، تین روپے پچیتر پیسے ـ

ملنے کا پتہ :- مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور ـ

"فسانۂ مبتلا" ڈپٹی نذیر احمد کا مشہور اصلاحی ناول ہے، جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے دیدہ زیب ٹائپ میں شائع کیا ہے! پروفیسر افتخار احمد صدیقی نے اس ناول کو مُرتب فرمایا ہے اور ایک فاضلانہ مقدمہ تحریر کیا ہے! ڈپٹی صاحب مرحوم کی غیر معمولی ذہانت و قابلیت، انشاپردازی اور ناول نگاری کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ، پروفیسر صاحب موصوف نے اُن کے فن پر تنقید بھی کی ہے، فرماتے ہیں :-

- "یہی وجہ ہے، اُن کے قصوں میں اُن کا اصلاحی جذبہ اور مقصدیت کا جوش چھلکا پڑتا ہے، یہ غیر معتدل مقصدیت فن کے لئے ہمیشہ ناسازگار ثابت ہوتی ہے، نذیر احمد بھی مقصد اور فن میں توازن قائم نہ رکھ سکے"۔
- "نذیر احمد نے فسانۂ مبتلا میں تاریخی واقعیت کو ملحوظ نہیں رکھا، اور بہت سی ان مل بے جوڑ باتیں بیان کرتے چلے گئے ہیں"۔
- "روزمرہ اور محاورے کے استعمال میں بھی انھوں نے بڑی کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہے، بعض محاورات تو ایسے ہیں، جنھیں سُن کر خود دہلی والے بھی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں، بہرحال ناول میں بے ساختہ و بے تکلف زبان کا یہ انداز کھپ جاتا ہے، خصوصاً مکالموں میں تو اس کے جوہر اور بھی کھل جاتے ہیں، لیکن مذہبی تصانیف میں محاورہ بازی کا یہ شوق ان کے لئے بالآخر باعثِ رُسوائی ہو گیا"۔

اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کے چند جملوں پر فاضل مقدمہ نگار نے کس قدر معقول احتساب کیا ہے۔

"ازواج مطہرات میں بہ تقاضائے بشریت جو معمولی سی رقابت تھی، اُسے عام سوکنوں کے محاسدات سے تشبیہ دینا، اور پھر یہ کہنا کہ شیعہ سُنی تفرقہ انہی محاسدات پر مبنی ہے تاریخی حقائق کا منہ چڑھانا ہے"۔ (ص ۲۲۷)

مقدمہ نگار، ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کے قدر ہی نہیں مداح بھی ہیں، لکھتے ہیں :-

"نذیر احمد نے مکالموں میں بھی ایسی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے کہ اُردو کے بہت کم ناول نگار اس فن میں اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں"۔

اور

"نذیر احمد کے فن کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی بالکل سچی تصویر کشی کی ہے، اور یہی خصوصیت اُن کے ناولوں کی دائمی قدر و قیمت کی ضامن ہے ---"

"فسانۂ مبتلا" کوئی شک نہیں ایک دلچسپ ناول ہے، یہ ناول اس زمانے میں لکھا گیا ہے، جب ڈپٹی نذیر احمد کے سامنے ناول نویسی اور کردار نگاری کا کوئی نمونہ اُردو زبان و ادب میں موجود نہ تھا، اس لئے مقدمہ نگار کے لفظوں میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کردار نگاری کی صنعت میں ڈپٹی صاحب اُردو زبان کے "نقاشِ اول" ہیں! بعض مقامات پر مکالموں نے وعظ و نصیحت کی کھلی ہوئی صورت اختیار کر لی ہے، اور ناول نگار نے ایجاز کی جگہ خاصے اطناب سے کام لیا ہے!

اس ناول میں زبان کی گھلاوٹ اور سلاست کا کیا پوچھنا، جی چاہتا ہے کہ عبارت کو بار بار پڑھیئے اور شعر کی طرح لطف اُٹھائیے - ایک نمونہ

" ایک عورت ہے جوان، ماتھے پر افشاں چنی ہوئی، پٹیاں جمی ہوئیں، اُلٹے بل کی چوٹی اور اس میں
چنپا کا مُوباف، کانوں میں چنبیلی کی کلیاں، آنکھوں میں دُھواں دھار سُرمہ، مِسّی کی دھڑی،
اور دھڑی پر لاکھا - - - "

اس ناول میں دینی اسپرٹ کا یہ رنگ ہے :-

" - - حضرت موسیٰ سے بھی یہود ایسی ہی بے جا فرمائشیں کرتے تھے، لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ
جَهْرَةً (ہم تو جب تک خدا کو کھلے خزانے نہ دیکھ لیں، تجھ پر ایمان لانے والے ہیں نہیں)
لیکن مذہب کے لئے ایسے ثبوت کا ہم نہ پہونچ سکنا ضعف مذہب کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ
انسان کی ضعفِ خلقت کے سبب سے ہے "

• ـــــ " گھڑی میں ایک پرزہ لگایا جاتا ہے، جس کا نام ہے رگیولیٹر، اور اس قوت سے وقت کی شناخت
کا عمدہ کام لیا جاتا ہے، یہی حال انسان کا کہ اس میں بھی ایک حالت کے مناسب خدا کی دی ہوئی
چند قوتیں ہیں اگر ان قوتوں کا کوئی روکنے والا رگیولیٹر نہ ہو تو یہ تمام قوتیں بیکار ہیں، بلکہ
بجائے مفید ہونے کے الٹی مضر، انسان کا رگولیٹر ہے مذہب، جو اس کو اندازۂ مناسب اور
حدِ اعتدال سے گھٹنے بڑھنے نہیں دیتا - - - "

اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے " تعدد ازدواج " کے مسئلہ کو جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ دینی نقطۂ نگاہ سے مستحسن نہیں ہے! " تعدد ازدواج " بے شک " حکم " نہیں " اجازت " ہے مگر اس " اجازت " کو جو کوئی بُرائی سمجھتا ہے اُس نے قرآنی نقطۂ نگاہ کو نہیں سمجھا۔

دیباچہ میں ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں :-

" - - - - - اُنہی کی قدردانی مجھے تصنیف و تالیف کی باعث ہوئی " (ص۱۲)

اس جملہ میں کس قدر ناپختگی پائی جاتی ہے ـــــ " میری ساری عمر انہی غوروں اور فکروں میں گزری ہے " (ص۱۵) " غور " کی جمع " غوروں " محلِ نظر ہے ـــــ " سُنا سُنا کر گالیوں کی بوچھار برسا رکھی ہے " (ص۲۴۳) " بوچھار " کے ساتھ " برسا " روزمرہ نہیں ہے " گالیوں کی بوچھار کر رکھی ہے " لکھنا تھا۔

" ماں بہنوں کے ساتھ بیوی کی صحنک کھاتے " (ص۲۹۶) دلی اور لکھنؤ میں " بی بی کی صحنک " اور " بیوی کی صحنک " دونوں طرح بولتے ہیں، مگر فصیح تر " بی بی کی صحنک " ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا کو بیوی فاطمہ نہیں، بی بی فاطمہ کہتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں " فرہنگِ الفاظ " ہے، جس کے بعض لفظوں کے معنی کو پڑھ کر کھٹک پیدا ہوئی ـــــ مثلاً : ـــــ

اُچاپت ـــــ اُدھار کا لین دین (ص۳۴۲) مگر قصائی کے یہاں سے گوشت اور پرچون کی دکان سے سودا سلف اُدھار لینے کو " اُچاپت " کہتے ہیں اگر سُنار کی دکان سے زیور قرض لیا جائے یا ساہوکار سے اُدھار کا لین دین ہو تو اُسے اچاپت نہیں کہتے۔

ششی پروین

از :- محترمہ مہر مزنی خلیل قدوائی (ایم اے) ضخامت ۸۶ صفحات، خوب صورت سرورق۔

قیمت :- ایک روپیہ :ـــــ ادارۂ نگارش و مطبوعات، حسین ڈسی سلوا ٹاقان
ناریتہ ناظم آباد، کراچی ۱۸

اور دُوسری کہانیاں

جناب جلیل قدوائی اردو زبان کے مشہور شاعر، ناقد اور انشاپرداز ہیں۔ محترمہ

اُن کی شریکِ زندگی بھی زبان و ادب اور نگارش و انشاء کا اچھا ذوق رکھتی ہیں ۔ اُن کی لکھی ہوئی دس کہانیاں کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں ۔ یہ کہانیاں بچوں کی نفسیات کے مطابق لکھی گئی ہیں' ان میں زبان کا چٹخارہ بھی ہے' اندازِ بیان کی دلچسپی بھی ہے ، اور ہنسنے ہنسانے کی باتیں بھی ہیں ۔

" گندی لڑکی ! جلدی بول " (ص ۱) ! پری کی زبان سے جو ڑی کو جو " گندی لڑکی " کہلوایا گیا ہے تو " گندی " کہنے کا یہاں کوئی محل نہ تھا ——— " ڈالی بہن سے کھیلنے آیا تھا " (ص ۲) ایسے موقعوں پر " سے " کی جگہ " کے ساتھ " بولتے ہیں ———

" مجھے اپنی نانی جان سے بہت محبت ہے' اور کیوں نہ ہو' وہ بھی میرے اوپر جان دیتی ہیں' اور مجھے طرح طرح سے لبھاتی ہیں " (ص ۳) " لبھاتی ہیں " یہ یہاں بے موقع استعمال ہوا ہے ——— " اب اُسے عقل ہو گئی تھی " (ص ۴) یہ اُردو روزمرہ نہیں ہے ——— " کچھ خواتین اچانک ملنے آگئیں " (ص ۵) " بیبیاں " لکھنا تھا ۔ " اُس کے ننھے سے دماغ سے خاص اپنے لئے خریداری کا خیال نہیں نکلا تھا " (ص ۷) اس جملہ میں کتنا تکلف پایا جاتا ہے ———

ذرا دیر بعد اپنے کو گھی میں ڈبکی لگاتے ، چوہے کی صورت بناتے ، سارے آنگن میں
منہ سے گھومنے لگے (ص ۶۵)

بھیڑ کا گھی کے کنستر یا گھی کے برتن میں ڈبکی لگانا ، خلافِ واقعہ ہے ، ہاں ! وہ اپنا پیر یا ہاتھ اُس میں البتہ ڈال سکتا ہے !

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا ، توقع ہے یہ دوسرا ایڈیشن بھی مقبول ہوگا ۔ پہلے ایڈیشن کی کہانیوں پر نظرِ ثانی کر کے محترمہ برتری بیگم صاحبہ نے ان کے نوک پلک درست کر دیئے ہیں اور تین نئی کہانیاں بھی شامل فرما دی ہیں ۔

ماہنامہ " سیّارہ "

ایڈیٹر :- نعیم صدیقی ۔ قیمت فی پرچہ :- ایک روپیہ' سالانہ چندہ دس روپیہ ۔
ملنے کا پتہ :- دفتر " سیارہ " ذیلدار پارک ، اچھرہ ، لاہور ۔

جناب نعیم صدیقی کا نام شعر و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ، وہ ایک صاحبِ طرز ادیب اور مفکر شاعر ہیں' اُن کی کتابیں شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہو چکی ہیں ——— برسوں کے غور و فکر اور مشق و تجربہ کے بعد نعیم صدیقی نے ماہنامہ " سیارہ " اس اہتمام اور شان سے نکالا ہے کہ ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی ہے " سیارہ " کے مضامین میں تنوع کے ساتھ دلچسپی' سنجیدگی اور افادیت پائی جاتی ہے ! پورا رسالہ پڑھ جایئے مگر دماغ تکان کی جگہ نشاط محسوس کرتا ہے ۔

" سیارہ " کی کتابت و طباعت کا بھی خاصہ اہتمام کیا گیا ہے' خاص طور سے عنوانات' ذیلی سرخیاں' صفحات کے نمبر ان سب میں کتابت کا حسن اور تناسب پایا جاتا ہے !

" سیارہ " کے چوتھے شمارے میں شیر افضل جعفری کے قطعات وجدان کو کھٹکے ، فرماتے ہیں :—

آکاش کے شہ زینے کے مَج پہ قدم رکھ ——— جھلکاتے ——— مہتاب کی سج دھج پہ قدم رکھ
یہ گردشِ ایام ہے براق جواں زور ——— للکار کے چڑھتے ہوئے سورج پہ قدم رکھ

" شہ زینہ " تو سنا تھا مگر " شہ زینے " کی ترکیب عجیب سی لگی' پھر مہتاب پہ قدم رکھنے کی بجائے مہتاب کی " سج دھج " پہ قدم رکھنا اور زیادہ کھٹکا !

گھبرا کے لرزتے ہوئے تاسیر کو توان دے ——— پھر گردشِ حالات کو ایامِ جواں دے

یہ شاعری کے کتنا مذاق ہے !

پروفیسر محمود منور کا ایک قطعہ ہے :-

ذوقِ تعمیر الم اور نمایاں ہوگا ——— ابھی احوالِ جہاں اور پریشاں ہوگا
روز روشن کا انداز کیا جاتا ہے ——— آدمی کہتے ہیں جس کو ستارہ ہوگا

متغیر الم کا ذوق کیا بات ہوئی؟ —— چوتھے مصرعہ میں "بڑا" کا الف بری طرح چب رہا ہے! قطعہ میں کوئی شاعرانہ لطف نہیں!

"سیارہ" کا سرورق رنگین، حسین اور جاذبِ نظر ہوتا ہے، اس نوطلوع ستارے نے چمک دمک سے بڑے بڑے صاحبانِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے، یقین ہے کہ "سیارہ" بہت جلد اُردو دُنیا کے ماہناموں میں ایسا مقام پیدا کرلے گا جہاں اُس کا کوئی حریف نہ ہوگا!

سالنامہ اُردو ڈائجسٹ

مجلسِ ادارت:۔ الطاف حسین قریشی ایم اے، ظفراللہ خاں (ایم اے) امین اللہ وثیر ایم اے، مقبول جہانگیر۔
ضخامت ۳۰۲ صفحات۔ قیمت، دو روپے پچاس پیسے۔ سالانہ چندہ، چودہ روپے، فی پرچہ، ایک روپیہ پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ ۵ مین روڈ، سمن آباد، لاہور، ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ تحفیظ احمد رحمانی، اقبال منزل، متصل عیدگاہ شاملی روڈ، مظفر نگر (یو۔پی)

اُردو ڈائجسٹ کسی وقفہ اور ناغہ کے بغیر دو سال سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اس ماہنامہ کی مقبولیت، ہر دلعزیزی اور شہرت، حیرت انگیز اور قابلِ رشک ہے —— اب اُس کا سالنامہ صوری و معنوی تمام خوبیوں کے ساتھ منظرِ عام پر جلوہ گر ہوا ہے! سرورق کتنا جاذبِ نظر ہے، کتابت طباعت کس قدر دیدہ زیب ہے! مضامین کس سلیقہ کے ساتھ مُرتب اور منتخب کئے گئے ہیں!

"اُردو ڈائجسٹ" کے سالنامے میں شخصیات، شعر و ادب، افسانے، طنز و مزاح، دلچسپ تاریخی واقعات، نفسیات اور دوسرے معلومات آفریں مضامین ایک سے ایک بلند ہے! خاص طور سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا انٹرویو جسے الطاف حسین قریشی نے مرتب کیا ہے، بڑا جاندار اور اثر انگیز ہے! —— اس رسالہ کے ارکانِ ادارہ سالنامہ کی کامیاب اشاعت پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

—×—

بقیہ یادِ رفتگاں صفحہ ۴۹ سے آگے

محترم —— السلام علیکم!

۱۰ر اکتوبر ۶۲ء کی منحوس شام کو پونے سات بجے ہم لوگوں کو ایک زبردست صدمے سے دوچار ہونا پڑا، یعنی قبلہ نانا نوح صاحب ناروی مرحوم نے اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے! اس صدمہ جانکاہ کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں، دل بیٹھا جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیا لکھوں، لیکن چونکہ مرحوم کو آپ سے خاص تعلق تھا، اس لئے آپ کو خاص طور سے مطلع کر رہا ہوں!

غمزدہ، سُہیل ناروی
از نارا ضلع الہ آباد ۱۳ر اکتوبر ۶۲ء

سچ تو یہ ہے:۔

موت سے کس کو رستگاری ہے ۔۔۔ آج وہ کل ہماری باری ہے

—— مقامِ عبرت ہے کہ ——

کشتیٔ نوح بھی گرداب میں آگئی اور موت کے طوفان نے ناخدائے سخن کی زندگی کے سفینہ کو بھی غرق کرکے چھوڑا، اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے، یہ وہ لوگ تھے —— کہ

؎ اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں ——

اوپل لیبارٹریز لمیٹڈ کراچی

گھر —
خوشیوں کا
گہوارہ
پختہ مکانات تعمیر کئے ہیں۔
جوں جوں زمانہ بیتا انسان بتدریج غار، جھونپڑے، کچی پکی مٹی کے مکانات
اور پتھروں کی تعمیرات کے لئے بہتر سے بہتر وسائل استعمال کرتا رہا
تا آنکہ دورِ حاضر میں پختہ، خوبصورت اور پُرعظمت تعمیرات
کے لئے سیمنٹ کا استعمال شروع ہوا۔
ویسٹ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کا تیار کردہ زیل پاک اور میپل لیف
سیمنٹ پاکستان کو خوشیوں کا گہوارہ بنانے میں پیش پیش ہے۔ اور
بین الاقوامی معیار کے مطابق بہترین شمار کئے جانے والے اس سیمنٹ سے
تعمیر شدہ عمارات پختگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔
ہر جگہ آسانی سے مل سکتا ہے۔
ZEALPAK
زیل پاک میپل لیف
MAPLE LEAF
D.C
I.D.C
ویسٹ پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

ایڈیٹر:۔ ماہر القادری

ماہ جنوری ۱۹۶۳ء

ترتیب

چندہ سالانہ:۔ ساٹھ روپے

قیمت فی پرچہ:۔ باسٹھ پیسے

مقام اشاعت:۔ دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نقشِ اوّل

اِسلام عقیدہ اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے، عقیدہ اور عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کا لازمی طور پر یہی نتیجہ ظہور میں آنا چاہیئے کہ اسلام نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے، اُن پر عمل کیا جائے، اور جن باتوں کے کرنے سے روکا ہے، انہیں ترک کر دیا جائے قبولِ اوامر اور ترکِ نواہی یہ ہے ایمان اور اسلام کا مُطالبہ!

ایک مومن سے بشری کمزوری کی بنا پر ہوائے نفس سے مغلوب ہو کر معصیت کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے، کوئی شک نہیں معصیت دین کا نقصان ہے مگر معصیت سے ایمان ضائع نہیں ہوتا، ایک عاصی و خاطی بھی مومن ہی ہوتا ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے "توبہ" کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھا ہے، مردِ مومن سے معصیت کا ظہور وارتکاب ہو جائے، تو اُس کے ایمان واسلام کا یہ تقاضا ہے کہ اپنے گناہ پر خلوصِ دل سے ندامت و توبہ کا اظہار کرے، اللہ تعالیٰ سے اپنی خطا اور لغزش کی معافی چاہے اور گناہ کی تلافی اور اصلاحِ حال کی جانب پوری طرح مائل ہو جائے۔

جب تک کوئی مسلمان دین کے بتلائے ہوئے حلال و حرام پر ایمان رکھتا اور ان کے درمیان امتیاز کرتا ہے، عمل کی خرابی اور لغزش و معصیت کے باوجود اُس کا ایمان باقی رہتا ہے، معصیت دین کا زیاں ہے، وہ "کفر" نہیں ہے! اس عقیدہ کے باوجود ایک مسلمان کو خوش اعمال اور نکوکار ہی ہونا چاہیئے۔ فسق و فجور اور غفلت و معصیت کی زندگی، ایمان کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتی، عقیدہ اور عمل اور قول و فعل کے درمیان مطابقت اور یک رنگی کا نہ ہونا "نفاق" کی علامت ہے!

مگر

"عمل" کے مقابلہ میں "عقیدہ" کا معاملہ بہت زیادہ نازک اور اہم ہے، عقیدہ کی خرابی کے مختلف مدارج اور متعدد صورتیں ہوتی ہیں۔ معصیت، گمراہی، مُشابہ کفر، قریب کفر اور بعض "کفر" اور بعض "شرک"!

عمل میں خرابی اور فساد لذتِ نفس اور ہوائے نفس کے سبب پیدا ہوتے ہیں، مثلاً ایک مرد کسی نامحرم عورت کو اس لئے گھورتا ہے کہ ایسا کرنے سے اُس کا نفس لذت محسوس کرتا ہے، آدمی کسی دوسرے کا مال اس لئے چُراتا ہے کہ چُرائے ہوئے مال کو کام میں لا کر اس کو طرح طرح کی لذتیں حاصل ہوتی ہیں! جلبِ منفعت اور حصولِ لذتِ نفس، یہ ہیں فسادِ عمل اور معصیت وخطا کے اسباب!

عمل کے فساد و خرابی کی طرح، عقیدہ کے فساد و خرابی کا سبب لذتِ نفس نہیں ہوتی، اس خرابی کے دوسرے بہت سے اسباب و دواعیات ہیں، جن میں سے ایک سبب "جلبِ منفعت" کا جذبہ بھی ہے، اس کی مثال ہمیں عرب کی تاریخ میں ملتی ہے ——— یہ کہ عرب کے ایک شخص (عمرو بن لحی) نے شام میں لوگوں کو بُت پرستی کرتے دیکھا، تو اُن سے پوچھا کہ یہ تم کیا کرتے ہو؟ انہیں جواب دیا گیا کہ یہ بُت جن کو ہم پوجتے ہیں، مُصیبت میں ہمارے کام آتے ہیں، ان کی بدولت ہم پر رزق کی فراوانی ہوتی ہے، خشک سالی ہو تو ان کی برکت سے ہماری زمینوں پر مینہ برستا ہے، ہمارے ارضی خدا بیماریوں کو دُور کرتے ہیں ——— شام کے بُت پرستوں کی یہ تقریر سُن کر اُس شخص نے کہا کہ اپنے ان خداؤں میں سے ایک دو خدا مجھے بھی عنایت فرما دیجئے، ہم عرب کے رہنے والوں پر رزق کی بڑی تنگی رہتی ہے، چنانچہ یہ شخص ملک شام سے چند بُت

لے آیا، اور مکّہ میں آکر اُس نے پروپیگنڈا شروع کیا کہ میں نے ان خداؤں کی پرستش کی بدولت اپنی آنکھوں سے شام میں بسنے دیکھا ہوا کہ لوگ ان بتوں کو پوج کر بڑے فائدے حاصل کرتے ہیں ـــــ اس شخص کی باتیں مکّہ والوں کے دلوں میں گھر کر گئیں، اور اس طرح عرب میں بُت پرستی شروع ہو گئی۔۔

غیر اللہ کی پرستش میں یہی "جلب منفعت" کا جذبہ ہے، جو ہمیشہ شریکِ کار رہا ہے، جو لوگ دریاؤں کو، درختوں کو، گایوں اور سانپوں کو اور سونے چاندی کے ڈھیروں (لکشمی دیوی) کو پوجتے ہیں، وہ اسی لالچ میں پوجتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہمارے رزق میں، روزگار میں، کاروبار میں ترقی ہو گی، اور کلفتوں کی جگہ راحتیں حاصل ہوں گی! یہی "جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت" کا جذبہ ہے جو مُسلمانوں سے قبروں کے طواف بلکہ سجدے تک کراتا ہے، یہاں تک کہ مقابر کے دروازوں اور جالیوں میں عقیدت مند عرضیاں اور درخواستیں لکھ لکھ کر لٹکاتے ہیں! ان قبروں اور آستانوں کے مجاوروں اور خادموں نے عوام میں یہ باتیں مشہور کر رکھی ہیں کہ قبروں پر رات کو اولیاء اللہ کا دربار لگتا ہے اور وہ ان درخواستوں پر حکم صادر فرماتے ہیں!

ہم نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ "عقیدہ" کی خرابی کے دوسرے بہت سے اسباب ہیں، یقیناً ہیں، مگر ان تمام اسباب و داعیات کا مرکز، منبع اور اصل مرجع "عقیدت" ہے! جہاں تک "نفسِ عقیدت" کا تعلق ہے، یہ انسان کی جبلت اور فطرت و مزاج میں شامل ہے، اپنے خاندان کے بزرگوں سے، دینی رہنماؤں سے اور اُن شخصیتوں سے جو اہلِ کمال ہوتی ہیں، آدمی کو ایک خاص قسم کا لگاؤ ہوتا ہے جس میں محبت کے ساتھ عظمت و احترام کا جذبہ بھی شریک ہوتا ہے، اسی لگاؤ اور ربط کا نام "عقیدت" ہے! جذبہ عقیدت کا تعلق انسانوں سے ہے اور جذبہ پرستش کا اللہ تعالیٰ سے!

مگر

جذبہ عقیدت میں جب حد سے زیادہ غلو اور افراط پیدا ہو جائے، تو یہ مفرط عقیدت، عقیدہ کی خرابی کا سبب بن جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :۔

انی لا ارید ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنیھا اللہ تعالیٰ ۔ انا محمد بن عبد اللہ عبدہٗ ورسولہٗ (رواہ رزین)

(بیشک میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اُس رُتبہ سے زیادہ بڑھاؤ، جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بخشا ہے، میں تو وہی محمدؐ ہوں بیٹا عبد اللہ کا، اللہ کا بندہ اور اُس کا رسولؐ)

یہی وہ عقیدت کا غلو اور افراط ہے، جس سے حضورؐ نے روکا ہے! آئندہ چل کر "شرک و بدعات" کی جتنی صورتیں اور شکلیں ظہور میں آئی ہیں اُن کی تہ میں یہی مبالغہ آمیز عقیدت کارفرما رہی ہے!

اُمتِ محمدیہؐ کی تاریخ میں سب سے پہلا غلوِ عقیدت حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کی شان میں کیا گیا، یہ کہ آپ کی ذات سے الوہی صفات منسوب کی گئیں، حضرت علیؓ نے اس قسم کے اپنے غالی معتقدین کو شدید سزائیں دیں۔

نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں نے علیؓ کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے ایسے "اسرار" بتا دیئے ہیں، جو کسی دوسرے صحابی کو نہیں بتائے، اور نہ حضرت علیؓ نے اس کا دعویٰ کیا کہ دوسرے صحابہ تو علم ظاہر کے جاننے والے ہیں، اور میں علم باطن کا جاننے والا ہوں، یعنی میں تو "عارف باللہ" ہوں، اور دیگر صحابہ محض "عالم دین" ہیں! عہدِ رسالت اور اُس کے بعد دورِ صحابہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کے بارے میں عوام و خواص کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ علی کرم اللہ وجہ تو اسرارِ باطن اور رموزِ حقیقت کے حامل ہیں اور عرفان و طریقت کے احوال و

مقامات کی خبر رکھتے ہیں اور باقی دوسرے صحابہ شریعت کے عالم ہیں! ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی تقسیم قرنِ اول میں نظر نہیں آتی! یہ دور رمز و اشاریت اور جذب و تواجد کا دور نہیں بلکہ "بلاغِ مُبین" اور اسلام کی خالص سادگی اور پاکیزگی کا دور تھا، فلسفیانہ تصورات کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی بجائے، اللہ اور رسول ؐ کی بے چون و چرا اطاعت کا دور!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں جو غلو کیا گیا تھا، وہ مجوسی مزاج و ذہن کی اختراع تھی، صحابہ کرام ؓ، تابعین اور تبع تابعین جو کتاب و سنت کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، دین کی سادگی جن کا مزاج تھا، اور توحید جن کے دل و دماغ میں رچی ہوئی تھی اُن کے زمانے میں اس فاسد عقیدہ کو کہیں سے ذرا سی بھی شہ اور غذا نہ مل سکی۔

مگر
____

آگے چل کر جب ایران کی "ثنویت" بھارت کے "ویدانت" مصر کے "علم الاصنام" اور یونان و روما کے فلسفہ سے مسلمانوں کا تعارف ہوا، تو دینی تصورات و معتقدات میں نزاکتیں، موشگافیاں، ابہام اور رمز و اشاریت پیدا ہوتی چلی گئی! اُن نازک مسائل کو موضوعِ غور و فکر بنایا گیا، جن کے سوچنے اور حل کرنے کی ذمہ داری اللہ اور رسول ؐ کی طرف سے نہیں ڈالی گئی تھی۔

تاریخ و سیر میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی کو "سلسلہ طریقت" میں بیعت کیا ہو اور بیعت فرمانے کے بعد اسرارِ باطن کی تعلیم دی ہو اور اس قسم کی باطنی علوم کی تعلیم دے کر اپنے کسی مُرید اور خلیفہ سے یہ ارشاد فرمایا ہو کہ تم طریقت کے اس سلسلہ میں دوسرے لوگوں کو بیعت کیا کرنا، اور بزرگوں کے نسب نامے اور شجرے پڑھا کرنا۔

مگر
____

نقشبندیہ سلسلہ کے علاوہ طریقت کے تمام سلسلے اور شاخیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر جا کر ختم ہوتی ہیں! اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں جو غلو کیا گیا تھا، وہ آگے چل کر طرح طرح کے روپ دھارتا ہوا نظر آتا ہے ـــــ یہ کہ حضرت علی ؓ ولیوں کے شہنشاہ اور عارفوں کے امام ہیں! تمام اجلّ صحابہ کو ولایت اور عرفان و حقیقت سے کورا اور بے بہرہ قرار دے کر حضرت علی ؓ سے عرفان و ولایت اور روحانیت کی نسبت اور صفت کو مخصوص ٹھیرانا، اس میں مجوسیت، رفض اور باطنیت کی کتنی غالب آمیزش پائی جاتی ہے! حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو افضل الصحابہ ہیں، وہ تک سلسلہ نقشبندیہ کے منبع و مرکز ہونے کے باوجود، نہ شہنشاہِ ولایت سمجھے جاتے ہیں اور نہ امام العارفین!!

پھر یہ غلوِ عقیدت اس حد تک پہونچ گیا کہ ولایت کو نبوت سے افضل بتایا گیا۔ اور نبی کی عصمت کے مقابلہ میں ولی کے گناہوں سے "محفوظ" رہنے کا عقیدہ تراشا گیا، صوفیاء کرام کے ملفوظات میں یہ تک ملتا ہے کہ حضرت علی ؓ نے فلاں بزرگ کی روحانی تربیت فرمائی، اور فلاں شیخ کو بیعت کی اجازت دی، حضرت علی ؓ کی روح اگر فلاں پیر کی مدد نہ فرماتی تو وہ راہِ ہدایت سے بھٹک گئے ہوتے ـــــ تمام اجلّ صحابہ کی عظمت و روحانیت کو بالائے طاق رکھ کر، صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو روحانیت کی سلطنت کا نگراں اور چلانے والا سمجھا گیا، اور یہ غلوِ عقیدت عقیدہ کے اس فساد تک پہونچ گیا ـــــ کہ

؎ علی ؓ دولھا بنے سہرا بندھا مشکل کشائی کا

حالانکہ زمامِ خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جن واقعات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے اُن میں قدم قدم پر وہ مقدرات کے آگے مجبور نظر آتے ہیں، اُن کے ارادوں کو اتنی بار ٹوٹنا پڑا ہے کہ مایوس ہونے کے بجائے، وہ حق شناس انسان بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ۔

؎ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ ؂

اس عجمی مزاج کو کیا کہئے جس نے مسلمانوں کے اکابر تک کو ـــــ اہلِ ظاہر او اہلِ باطن ـــــ دو طبقوں میں تقسیم کر دیا، بڑے

بڑے پایہ کے تذکرے اٹھا کر دیکھ لیجئے ان میں یہ طبقاتی تقسیم نظر آئے گی، مثلاً امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور امام مسلم (رحمہم اللہ تعالیٰ) کو اس طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے جو شریعت کا علم رکھتا ہے اور عرفان و روحانیت کے لوازم مقامات سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ہے بھی تو کچھ یوں ہی سا ہے، جو قابلِ ذکر نہیں! دوسری طرف جُنید و شبلی، بایزید بسطامی، معروف کرخی (رحمہم اللہ تعالیٰ) ہیں جو اسرارِ باطن کے عالم اور عرفان و روحانیت کے امام سمجھے جاتے ہیں!

عرفِ عام ہی میں نہیں خواص تک کی نگاہ میں باطن کو ظاہر پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہے لہٰذا اس تقسیم کا یہ نتیجہ نکلا کہ علم دین کے مقابلہ میں علم معرفت و تصوف کو اور عالمِ دین کے مقابلہ میں صوفی اور عارف کو برتر و بالا سمجھا جانے لگا، جس کے سبب دین و شریعت ـ روحانیت و تصوف اور علم باطن سے فروتر اور ثانوی درجہ کی چیز بن کر رہ گئے۔ یہ بات ہم کسی قیاس اور ظن و تخمین کی بناء پر نہیں کہہ رہے ہیں، منصور حلاج کا نعرۂ "انا الحق" اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایسے واہی تباہی اور ضلالت آمیز نعرے کی تحسین اور تاویل کی گئی! فرض کیجئے اس نعرے میں باطن کی کوئی دقیق رمزیت تھی، تو بھی اس کی ظاہری خطرناکیوں کے لحاظ سے یہ نعرہ تحسین و تاویل کا نہیں بلکہ نفی و تردید اور برأت کا مستحق تھا! غیرتِ توحید اس نعرے کو برداشت ہی نہیں کر سکتی! مگر اس کو کیا کیجئے کہ عرفان و تصوف کے اسرار اور باطنی رموز کی بدولت منصور جیسی غیر ذمہ دار اور مجہول شخصیت آج تک فنِ تصوف کی ہیرو بنی ہوئی ہے، اور شاعری نے تو منصور کو حق گوئی اور سرفروشی کی "علامت" (SYMBOL) بنا دیا ہے! کس فخر و ناز کے ساتھ کہا گیا ہے:۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

صحیح احادیث بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو زیارتِ قبور سے روک دیا تھا، پھر زیارتِ قبور کی اجازت دی تو اس کا سبب اور فائدہ بھی بتا دیا کہ قبروں پر جانے اور ان کے دیکھنے سے موت اور آخرت کی یاد آتی ہے!

مگر

باطن و روحانیت کے علوم جاننے والوں، منزلِ طریقت کے رہ نوردوں اور نعرۂ "انا الحق" کے رمز شناسوں نے قبروں پر اعتکاف اور چلّے کئے اور اُن کا بیان ہے کہ ان قبروں سے اُن کو فیضِ روحانیت کے ساتھ ہدایات و احکام بھی ملے ہیں!

ہو سکتا ہے کہ شروع شروع میں قبروں پر یہ چلّے دینی اعتبار سے بے ضرر رہے ہوں، غرض اور نیت یہی رہی ہو کہ اس طرح طویل زیارت سے آخرت کی یاد میں رسوخ و استحکام اور پائیداری پیدا ہو گی، مگر چونکہ قبروں پر اس طرح اعتکاف کرنے اور چلّے کھینچنے کے لئے کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں کوئی دلیل نہیں ملتی، اس لئے پوری نیک نیتی، اخلاص اور خدا خوفی کے باوجود یہ بات اسی حد تک نہیں رُکی رہی، بعد کے لوگوں نے زیارتِ قبور کے بارے میں اور زیادہ غلو کیا، یہاں تک کہ قبریں نشانِ عبادت بن کر رہ گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جن باتوں کے کرنے سے روکا تھا، وہ باتیں ادا کی گئیں! اور آج کلمۂ توحید کے پڑھنے والے قبروں پر جن مشرکانہ رسوم و بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں، ان پر اقبال کا یہ مصرعہ پوری طرح صادق آتا ہے ـــــ کہ ؎

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

احوال و مقامات اور واردات و مکاشفات کے اظہار میں جو زبان اور اسلوب اختیار کیا گیا، اُس نے اسلامی ادب میں ایک ایسی صنف کا اضافہ کر دیا، جس میں ذو معنویت ہے، رمز و اشاریت ہے۔ دقیق ژولیدگی اور عجیب قسم کی پیچیدگی ہے، بعض سادہ اور صاف باتوں کا بھی یہ رنگ ہے ـــــ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "نماز میں جنت و دوزخ کا جب خیال آجاتا ہے، تو میں سجدۂ سہو کرتا ہوں۔"

بات بظاہر واضح ہے، اور پہلی نظر میں عبارت پڑھنے کے بعد ذہن مرعوب ہو جاتا ہے کہ اوہو! نماز میں غیر اللہ کے تصور سے بے تعلقی کا

کتنا شدید مخلصانہ جذبہ اس قول میں ملتا ہے، اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جنت کی طمع اور دوزخ کا خوف دل میں لاکر نماز پڑھی، تو عبادت کا اخلاص جاتا رہا ـــــــ مگر جب غور کیا تو محسوس ہوا کہ اللہ اور رسول نے بندوں پر یہ پابندی نہیں لگائی کہ نماز میں جنت اور دوزخ کا خیال آجانے سے نماز میں ایسی کوتاہی واقع ہوجاتی ہے کہ جس کی تلافی اور کفارے کے لئے سجدۂ سہو لازم آتا ہے! حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر نماز میں اخلاص کوئی ولی اور صوفی کیا پیش کرے گا۔ اُن کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ نماز کی حالت میں اسلامی فوجوں کو لڑایا کرتے تھے، مگر انھوں نے اس خیال کے آجانے پر سجدۂ سہو نہیں کیا۔

ایک طرف "اخلاص" کے نام پر عبادت میں یہ شدت اور پابندی، دوسری طرف جائز لذات سے کنارہ کش ہونے میں یہ غلو کیا کہ ایک بزرگ کو کھانا کھانے میں لذت محسوس ہوتی ہے، تو وہ دانتوں سے اپنی زبان کو چبا ڈالتے ہیں! بے نفسی اور زہد و ورع کی اس بے نکی کے ساتھ اس شوراشوری اور رنگینی کو دیکھئے کہ موسیقی ہے، ساز ہے، مطرب ہے، رقص اور وجد و حال ہے!

یک دست زُلفِ ساقی و یک دست جام مے
رقص چنیں میانۂ میدانم آرزوست

ایک بزرگ ہیں کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا ہی ورد کئے جاتے ہیں "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ" کہہ کر کلمہ کو پورا نہیں کرتے، اُن سے اس کا سبب پوچھا گیا تو جواب میں فرمایا کہ میں ابھی الوہیت کے اسرار ہی میں غور کر رہا ہوں، رسالت کی جانب قدم کس طرح بڑھاؤں پہلی منزل طے کئے بغیر، دوسری منزل میں کوئی کس طرح پہونچ سکتا ہے ـــــ اس جواب کو سُن کر بے ساختہ طبیعت پھڑک جاتی ہے مگر شریعت اور واقعیت کی دُنیا میں اس کی حقیقت ایک ادبی لطیفہ سے زیادہ نہیں ہے۔

کتابوں کی کتابیں ہیں کہ جذب، بیخودی، خرقِ عادات اور غلبہ حال کے واقعات سے بھری پڑی ہیں، ایک بزرگ دوسرے بزرگ کی ولایت کو سلب فرما کر ان بیچارے کو بالکل کورا کر دیتے ہیں، ایک شیخ کسی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ شخص بیہوش ہوجاتا ہے، اور ہوش میں آنے کے بعد سیدھی جنگل کی راہ لیتا ہے اور برسوں جنگل کے درختوں کے پتے کھا کر زندگی گزارتا ہے، ایک بزرگ شیر پر سوار ہیں اور ہاتھ میں سانپ کا کوڑا ہے، دوسرے بزرگ اس کرامت کے جواب میں دیوار کو اشارا کرتے ہیں اور وہ چل پڑتی ہے!

ایک بزرگ تارکِ صلوٰۃ ہیں مگر اس کے باوجود مُریدوں کی عقیدت میں کوئی کمی نہیں آتی، اُن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ پانچوں وقت کی نماز خانہ کعبہ میں ادا کرتے ہیں بعض لوگوں نے جرأت کر کے اُن پر اعتراض کیا تو ظہر کے وقت نیت باندھ کر جو کھڑے ہوئے ہیں تو دوسرے دن ظہر کے وقت جاکر سلام پھیرا ـــــــ اس کے ساتھ اس لٹریچر کا ایک باب "دعووں" سے تعلق رکھتا ہے، کسی نے فرمایا کہ میں تمام انبیاء کے مقامات کی سیر کر آیا، کسی نے خواجہ خضر سے ملاقات کی اور بیعت بھی! کسی پر کائنات کے تمام اسرار منکشف ہوگئے۔ کسی سے یہ قول منسوب کیا گیا ہے ہر ولی اللہ کی گردن میرے قدموں کے نیچے ہے! کسی پر حقیقتِ محمدی ظاہر کی گئی، کسی نے بتایا کہ میں اس وقت فلاں مقام پر فائز ہوں اور فلاں حال مجھ پر گزر رہا ہے، کسی نے "ما اعظم شانی" کہا، "کوئی" انا الحق" پکارا یہاں تک کہ کسی بزرگ سے یہ مصرعہ:- ع

پنجہ با پنجۂ خدا کردم (معاذ اللہ)

منسوب کیا جاتا ہے۔

"وحدت الوجود" کے فلسفہ نے اس لٹریچر کو اور زیادہ مغلق، مُبہم، پیچیدہ اور خطرناک بنا دیا، یہ فلسفہ اس قدر شاخ در شاخ اور خطرناک ہوتا چلا گیا کہ کہیں شیطان کے "موحد" ہونے پر نکتے تراشے جاتے ہیں، کہیں فرعون کے ایمان لانے کو ثابت کیا جاتا ہے! یہ فلسفہ کیا ہے؟ خیالات کا لق و دق جنگل اور تصورات کی اتھاہ دلدل!! کہ جو بیچارہ اس میں دھنسا بس وہ پھر دھنستا ہی چلا گیا!

اس فلسفہ نے جذب، غلبۂ حال اور سُکر و صحو کی اصطلاحیں پیدا کیں، جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایسے لوگ جو لایعقل اور مرفوع القلم ہیں، جنہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں جہاں چاہیں رفع حاجت کر دیں، اُن سے "جذب و سوز" کی عظمت و کرامت منسوب کی گئی، اور اُن کے سروں پر ولایت کا تاج رکھا گیا!

بالآخر عقیدہ اور عمل کی خرابی اس پستی تک پہونچ گئی کہ کسی بارگاہ میں شیخ وقت کو تعظیمی سجدے ہو رہے ہیں، کہیں پیر کی تصویر کو ہار پہنائے جا رہے ہیں، کسی خلوت کدے میں عقیدت مند عورتوں کے سروں پر دستِ شفقت پھیرا جا رہا ہے، کسی خلیفہ نے اپنے شیخ کا جوتا دیوار پر ٹانگ رکھا ہے اور اسی کے سایہ میں نمازیں ادا کی جاتی ہیں! ایک بزرگ مدینۃ النبی میں رہ کر بھی بغداد جانے کے لئے بے چین و مضطر ہوتے ہیں، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کی زیارت انہیں روضۂ رسول کے مقابلے میں زیادہ تڑپا رہی ہے، اُن کے اس اضطراب کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ ان پر "قادریت" کا غلبہ ہے!

متصوفین کا ایک گروہ ہے جو اپنے جسموں پر ہتھوڑوں کی ضربیں لگواتا ہے کسی کی آنکھ میں لوہے کی سلاخ گھسی ہوتی ہے اور کسی کے اپنے سینہ میں چاقو اُتار لیا ہے۔ دوسری ٹولی سدا سہاگنوں کی ہے، جو عورتوں کی طرح رنگین لباس، بالی پتے، نتھ اور چوڑیاں پہنتی ہے، تیسرا طبقہ رنگین احرام زیب تن کئے رہتا ہے اور پلنگ پر بیٹھنا اس نے اپنے اوپر حرام ٹھیرا لیا ہے، اُن کا نعرہ "یا وارث" ہے، اس میں رمز اور ذو معنویت یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام "الوارث" بھی ہے اور اُن کی شاخ کے امام طریقت کے نام کا بھی ایک جزو "وارث" ہے!

ہم ذاتی طور پر بعض ایسے پیروں سے واقف ہیں، جو نہ اہل تقویٰ تھے اور نہ اہل علم تھے، پیری مریدی اُن کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ اسی کاروبار کے سہارے وہ عیش و راحت کی زندگی بسر کرتے تھے، جہاں تک زندگی کے عام حالات کا تعلق ہے اُن کے حالات پسندیدہ نہ تھے، مگر مرنے کے بعد دھوم دھام سے اُن کے عُرس ہوتے ہیں، اور اشتہاروں میں اُن کے ناموں کے ساتھ ——— سند الاصفیا، فخر الاولیا، امام العارفین ... قسم کے القاب دو دو سطروں میں لکھے جاتے ہیں، اُن سے بہت سی کرامات بھی منسوب کی گئی ہیں، سو دو سو سال بعد یہ کاروباری قسم کے پیر یقیناً اولیاء اللہ کی صف میں شمار کئے جائیں گے ——— اس ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بزرگ جن کے ناموں کے ساتھ مرعوب کُن القاب لکھے ہوئے ملتے ہیں، اُن میں سے نہ جانے کس کے کیا حالات تھے، اُن کی اولاد نے اور اُن کے جانشین خلفاء نے اُن کی گدّیوں کو قائم رکھنے کے لئے اُن کو کیا سے کیا بنا دیا؟ اور اُن سے جو تقدس، روحانیت اور عرفان و تصوف وابستہ ہو گیا ہے، اُس کے پیش نظر اُن کے ملفوظات اور کرامات کی تصدیق یا تاویل کرنی پڑتی ہے، کسی نے بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا تو سکوت اختیار کر لیا، ان پر نقد و احتساب کی کسی بندۂ خدا نے جرأت بھی کی، تو اُس پر بد عقیدگی، وہابیت اور اولیاء اللہ کی عداوت کی پھبتیاں چُست کی گئیں۔

جن بزرگوں سے تصوف و روحانیت منسوب کی جاتی ہے، اُن میں سب ایک جیسے نہیں ہیں، کوئلہ کے ڈھیروں میں بہت سے ہیرے بھی پائے گئے ہیں! ان میں وہ مقدس نفوس بھی ہیں کہ جو احسان اور تزکیہ نفس کے تقاضوں کو نہ صرف پہچانتے تھے بلکہ اُن کو پورا کرنے کے لئے جد و جہد کرتے تھے، ان سے کرامات بھی ظاہر ہوئی ہیں، اُن کے ملفوظات دینی افکار و معارف سے لبریز ہیں، اُن کی صحبت اور تربیت سے لوگوں کو بہت نفع ہوا ہے، اُن کی کوششوں سے اسلام پھیلا ہے، اور اُن کے دستِ حق پرست پر بہت سے کافروں اور مشرکوں کو توبہ کرنے اور ایمان لانے کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔

اس اعتراف کے بعد

عرض ہے کہ مجموعی طور پر جو تصوف کا رنگ نظر آتا ہے، جو اس شعبہ کا مزاج ہے، جو اسلوب بیان ہے اور صوفیوں کے جو حالات ملتے ہیں، وہ صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ حدیث و فقہ کے حالات، مزاج اور اندازِ بیان سے مختلف نظر آتے ہیں! وہاں سادگی یہاں تکلفات

وہاں ہر بات صاف و واضح، یہاں رمزیت، اشاریت اور غموض و پیچیدگی! وہاں فکر و نظر کا محور "محکمات" یہاں "متشابہات" سے غیر معمولی شغف! سب سے زیادہ حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ وہ اکابر جو کتاب و سنت کے عالم باعمل تھے، شرک و بدعات کا جنھوں نے رَد فرمایا ہے اور توحید کی تبلیغ جن کا اوڑھنا بچھونا تھی، وہ تک جب تصوف کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، تو بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی تصوف آمیز باتوں سے اہل بدعت اپنے مسلک کے لئے دلیلیں فراہم کرتے ہیں، یہاں تک کہ تصوف کی منزل میں دیوبند اور بریلی کے بعض ملفوظات اور احوال و مواجید بہت کچھ مشابہ نظر آتے ہیں۔

دعوت واصلاح

اگر کوئی شخص اپنے کاروبار کو چمکانے کے لئے حق کی حمایت میں کوئی ہنگامہ کھڑا کرتا ہے، تو اُس کی نیت کے اعتبار سے اُسے اجر ملے گا، ہم تو چند ماہ سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان میں بعض حضرات شرک و بدعات کی تردید کے لئے میدان میں آئے ہیں! اسی لئے ہم نے ان داعیات و محرکات کا جائزہ لیا ہے، جن کے سبب عجمی تصورات و معتقدات مسلمانوں میں درآمد ہوئے ہیں، اور پھر رفتہ رفتہ مُشرکانہ رسوم اور بدعتوں کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

جو نا سمجھ اہل علم و تقویٰ اور توحید کے داعیوں اور مبلغوں کو گالیاں دیتے اور اُن سے طرح طرح کی غلط اور بے سر و پا باتیں منسوب کرتے ہیں، اُن کے جواب میں گالیاں دی جائیں گی، تو ظالم و مظلوم برابر سرابر ہو جائیں گے، ضرورت ہے کہ اُن کی جھوٹی اور غلط باتوں کی تردید شائستہ اور مہذب انداز میں کی جائے، لہجہ بے شک گرم و تند اور غیرت مندانہ ہو سکتا ہے مگر الفاظ بازاری نہ ہوں!

شرک و بدعت کی تردید علمی دلائل کے ساتھ ہونی چاہیئے، بات مدلل ہو اور پھر قرینہ سے کہی جائے، تو ذہن و فکر اُس کا کسی نہ کسی حد تک اثر ضرور قبول کرتے ہیں، مسلمانوں میں قبول حق کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کے فضل سے موجود ہے، اُن کا دل مطمئن ہو جائے کہ فلاں بات اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی کا سبب نہیں بن سکتی، پھر وہ اس قسم کی تمام باتوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

عوام جو عربی نہیں جانتے، اُنہیں اُردو زبان کی ایسی دینی کتابوں کے مطالعہ کی رغبت دلائی جائے، جن میں معتقدات و تصورات کی پیچیدگی اور نزاکتیں نہ ہوں، اور جن کے مُطالعہ سے توحید کے صحیح اور واقعی تقاضے اُبھر کر سامنے آئیں، اور شرک و بدعت کے کسی واہمہ اور خطرے کو بھی شبہ نہ مل سکے! کتابوں کے انتخاب میں کسی گروہی اور فقہی عصبیت سے کام نہ لیا جائے۔

توحید خالص کے پیش کرنے والے چاہے مقررین ہوں یا اہل قلم ہوں، پہلے اُنہیں اہل بدعت کے علم کلام (؟) کے ان چکموں سے باخبر ہونا چاہیئے، جو وہ بیچارے عوام کو دیا کرتے ہیں! مثلاً دُنیا میں جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے بے تکلف ہوتا ہے، اُس کی محبت کے دباؤ سے، مُروت سے اور لحاظ سے دوست کا کہنا کر دیتا ہے اور اُس کی بات کو نہیں ٹالتا، اسی قسم کی مثالوں کے تحت اہل بدعت عوام کو گمراہ کرتے ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے ناز اُٹھاتا ہے اور وہ جو چاہتے ہیں، وہی ہو کر رہتا ہے، اُن کی کسی دُعا تمنا اور خواہش کو اللہ تعالیٰ ٹال ہی نہیں سکتا ——— اس کے جواب میں مُسلمانوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کسی بندے یہاں تک کہ نبیؐ اور رسولؐ کا بھی تعلق دُنیا کے دوستوں، آشناؤں اور قرابت داروں کی طرح نہیں ہے! دُنیوی دوستوں میں جس طرح برابری اور بھائی چارہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ پر کسی کی دوستی کا دباؤ نہیں، اللہ تعالیٰ کو جو جتنا پیارا ہوتا ہے، اُتنی ہی وہ اپنی عاجزی، بیچارگی اور بندگی و تذلل اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرتا ہے! دوسرے لوگ تو کس گنتی میں ہیں، خود جلیل القدر انبیاء اور عظیم المرتبت رسولوں کو طرح طرح کی مشکلوں اور پریشانیوں سے سابقہ پڑا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات نبیوں کی تمنائیں تک پوری اور اُن کی دعائیں تک قبول نہیں ہوئیں!

ہر نبی اور ہر رسول اپنا دکھ درد اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتا تھا۔ کسی نبی نے وفات پاتے ہوئے نبی سابق سے استغاثہ نہیں کیا، خاتم الانبیاء نبی آخر علیہ الصلٰوۃ والسلام تو دن رات اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کیا کرتے تھے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کوئی ایسی موضوع

روایت اور جھوٹا قول تک منسوب نہیں ہے، جس میں آپ نے فرمایا ہو کہ میرے دُنیا سے رحلت کر جانے کے بعد تم مجھ سے استغاثہ کیا کرنا، میں تمہارے دکھ درد دُور کیا کروں گا۔ صحابہ کرام نے بھی مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی کو پکارا۔ اُن نفوسِ قدسیہ میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے احوال کی ہمہ وقت خبر رکھتے ہیں اور دُنیا کا کارخانہ حضور ؐ کے حکم سے چل رہا ہے اور آپ دُنیا کے معاملات میں جس طرح چاہتے ہیں، تصرف فرماتے ہیں!

رکوع ہے، سجدہ ہے، نذر اور قربانی ہے ــــــ غرض بندگی کے جتنے مراسم اور طریقے ہیں، اُن سب کی مستحق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہے، کسی مخلوق سے بندگی کے آداب و رسوم ...... کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا، یہ ہے ــــــ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ــــــ کا مفہوم! اسی طرح اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھنا۔ وہی دلوں کے احوال جانتا ہے، وہی ساری مخلوق کا رازق، رکھوالا اور پالن ہار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہماری مصیبتوں کو اور کوئی دور نہیں کر سکتا، اسی کے دستِ قدرت میں ہماری جانیں ہیں، وہی عزّت دیتا ہے، وہی ذلّت دیتا ہے! پاتال میں ایک چیونٹی بھی چلتی ہے تو اُس کے پاؤں کی دھمک اللہ تعالیٰ سُن لیتا ہے، نبی اور رسول اپنی تمام عظمت، عصمت اور تقدس کے باوجود بشر ہے اور کوئی بشر بھی اللہ تعالیٰ کی مانند قوی اور قادر و توانا نہیں ہے، نبی اور رسول راتوں کو عبادت کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور پیر ورم کر آتے تھے مگر اللہ تعالیٰ ساری کائنات کے کارخانہ کو کسی کی شرکت و رفاقت کے بغیر چلا رہا ہے اور وہ ذرہ برابر گرانی اور تکان محسوس نہیں کرتا کیونکہ وہ حیّ و قیوم اور قوی العزیز ہے۔ نبی اور رسول تک کو غنودگی اور نیند آ جاتی تھی کہ وہ بشر تھے مگر اللہ تعالیٰ کی صفت یہ ہے کہ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْم! کسی دوست سے عزیز سے یا کسی دوسرے آدمی سے جب ہم اپنی غرض بیان کرتے ہیں، تو اُسے خبر ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ ہمارے کہے بغیر ہمارے دکھ درد، ضرورت اور خواہشوں کو جانتا ہے، اس لئے کہ وہ خالق و معبود ہی نہیں خبیر و علیم اور "ربّ" بھی ہے، لہٰذا استغاثہ اور استعانت اُسی سے کی جائے گی، یہ ہے "وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا مفہوم و منشاء! زبان سے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کہتے رہنا، اور غیر اللہ سے عبادت و بندگی کے آداب، مراسم کا تعلق رکھنا، روحوں کو مدد کے لئے پکارنا، بزرگوں کے ناموں کی دہائی دینا، یہ عقیدہ رکھنا کہ ہم جہاں سے بھی بزرگوں کو پکاریں گے، وہ ہماری فریاد کو سُن کر ہماری مصیبتوں کو دُور کر دیں گے، "شرک" ہے! اور شرک وہ ظلمِ عظیم ہے کہ جس کے لئے مغفرت کے خانے میں صفر لکھا ہوا ہے۔

خود قرآنِ کریم اس پر شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت کی دعوت دینے اور ہدایت کی طرف لوگوں کو بلانے والے تھے مگر "ہدایت" کا دینا اور بخشنا حضور ؐ کے اختیار میں نہ تھا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا، اُسے ہدایت ملی اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہوا۔

عوام کی اس نہج پر تربیت، اصلاح اور افہام و تفہیم کرنی چاہئیے کہ اللہ اور رسول ؐ کے نزدیک جو چیز ناپسندیدہ ہے، وہ کسی صورت میں فوز و فلاح کا سبب نہیں بن سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر دو ٹوک لفظوں میں قبروں پر میلے لگانے، قبروں کو گچ اور چُونے سے پختہ کرنے اور قبروں پر عمارتیں بنانے کی ممانعت فرمائی ہے اور قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت بھیجی ہے! اس لئے قبروں پر جہاں کہیں بھی میلے لگ رہے ہیں، اور چراغاں کیا جا رہا ہے، اُس سے حضور ؐ کے ارشاد اور حکم کی مخالفت ہوتی ہے، اور حضور ؐ کے حکم کی مخالفت معصیت اور دین کا بہت بڑا نقصان ہے! اور جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی مخالفت یہ جان کر کرتا ہے میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں، تو یہ عقیدہ اور عمل صریح کفر ہے! (اس فاسد عقیدہ سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ!)

بزرگانِ دین سے ہمارا تعلق عبادت و پرستش کا نہیں عقیدت و احترام کا ہے! ان نیک لوگوں نے اپنی زندگیاں اللہ اور رسول ؐ کے احکام کے مطابق گزاریں، صدقِ مقال ان کا مسلک اور اکلِ حلال ان کا مشرب تھا، اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے انہوں نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں اور قربانیاں دیں! اُن کی عقیدت و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی اپنی زندگیوں میں پاکیزگی اور اخلاق

پیدا کریں! اور ان کے سینوں کی طرح ہمارے سینے بھی اللہ تعالیٰ کی خشیت سے معمور ہو جائیں!

ان بزرگوں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کا کارخانہ ہمیں سونپ دیا ہے اور سارے جہان کے احوال کی ہم خبر رکھتے ہیں اور دُنیا کی کوئی چیز ہماری نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے ——— نہ انھوں نے یہ فرمایا کہ ہماری وفات کے بعد تم ہمارا عُرس کیا کرنا ہمارے نام پر جانور ذبح کرنا، دُکھ درد اور مُصیبت میں ہمارے ناموں کی دُہائی دینا، اگر کسی بزرگ سے اس قسم کا کوئی قول منسوب کیا جاتا ہے تو وہ کسی غالی معتقد اور جاہل عقیدت مند کا جوڑا اور وضع کیا ہوا ہے، توحید اور کتاب و سُنّت کے تقاضوں کو پہچاننے والے بزرگ ایسے کلمات زبان سے نکال ہی نہیں سکتے، اور اگر کوئی اس کا ثبوت بہم پہونچا دے کہ واقعی فلاں بات فلاں بزرگ نے کہی ہے، تو اُس کی اس قسم کی بات کو بلا جھجک رد کر دیا جائے گا، کہ کتاب و سُنّت کے معیار پر جس کسی کا بھی قول و عمل پورا نہ اُترتا ہو، وہ ٹھکرا دینے اور رد کر دینے کے قابل ہے!

ہمارے سامنے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات ہیں، حضرت شیخ نے "توحید" کو کس کس عنوان سے پیش فرمایا ہے! مگر اُن کے عقیدت مندوں (قادریوں) نے شیخ جیسے مُبلّغ توحید کو "معبود" بنا دیا ہے! غضب خدا کا بعض مسجدوں تک میں "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کے کتبے، تختیاں اور مخطوطے آویزاں ہیں! قیامت کے دن تمام بزرگانِ دین اپنے غالی عقیدت مندوں کے اس قسم کے فاسد عقائد سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے۔

عوام کے سامنے ان مسائل کو اس انداز میں قرینہ کے ساتھ پیش کیا جائے، تو اُس کے مُفید نتائج ظاہر ہوں گے! مگر اس کام کو وہی حق پسند لوگ ٹھیک طور پر انجام دے سکتے ہیں، جن کے سامنے اُن اکابر کے ایسے ملفوظات اور احوال و واقعات آئیں، جن سے توحیدِ خالص مشتبہ ہوتی ہو اور شرک و بدعت کو شہ ملتی ہو ——— تو وہ اُنہیں بے دریغ ٹھکرا دیں! اسی غرض سے ہم نے آج کی صحبت میں پوری تفصیل کے ساتھ تصوف کا جائزہ لیا ہے، آخری بات یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عجمی تصوف کے بہت سے اوراق پر خطِ تنسیخ کھینچنے کی جس میں ہمت اور جرأت ہوگی، وہی توحید کی تبلیغ اور شرک و بدعت کی تردید کا ٹھیک طور پر حق ادا کر سکتا ہے۔

ماہر القادری
۲۴ دسمبر ۶۲

ماہنامہ "فاران" کا عظیم الشان توحید نمبر

توحید کسے کہتے ہیں! اُس کے کیا تقاضے ہیں! شرک و بدعات سے ایمان میں کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں! اسکی تفصیل اور تحقیق "توحید نمبر" میں ملے گی! ایک ایک مضمون ایمان افروز! ایک ایک نظم یقین آفریں دین و دانش علم و عمل اور شعر و ادب کا شاہکار! "توحید نمبر" میں

- نقش اول ـ ماہر القادری
- توحید الوہیت ـ ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے
- ایصالِ ثواب کیلئے قرآن پاک کا ختم ـ "الصدیق" ملتان
- توحید خالص ـ ترجمہ مولانا ظفر احمد
- بدعات و محدثات ـ مولانا مفتی محمد شفیع
- قبر پرستی ـ ابو منظور شیخ احمد
- اسلامی توحید کی حقیقت ـ علامہ محمد البشیر الابراہیمی
- زیارتِ قبور ـ مولانا محمد اسمٰعیل سلفی
- اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کیلئے نذر و نیاز
- توحید ـ مولانا سید ابوالحسن
- الوسیلہ کا حقیقی مفہوم ـ محترمہ عطیہ خلیل
- اللہ وحدہٗ لاشریک ـ مولانا عبدالحمید ارشد
- عقیدہ توحید کا اثر ہماری عملی زندگی پر ـ مولانا امین احسن اصلاحی
- عقیدت کا غلو اور اسکے نتائج ـ مولانا محمد نجیب اللہ ندوی
- شرک کیا ہے؟ ـ مولانا محمد ناظم ندوی
- رسول اللہ صلعم کی وصیتیں ـ مولانا ظفر احمد عثمانی
- اسلام میں توحید ـ مولانا قاضی زین العابدین سجاد
- انسانی زندگی پر توحید کے اثرات ـ مولوی عبدالرحمٰن حاکم
- چار اہم سوالات ـ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
- پیامِ توحید ـ مولانا محمد ادریس ندوی
- بدعت اور اُس کی خرابیاں ـ مولانا مفتی محمد شفیع
- حقیقتِ شرک ـ سید ابوالاعلیٰ مودودی
- عقیدہ توحید اور انسانیت ـ ابو محمد امام الدین
- توحید اور مسلمانوں کی مروجہ رسمیں ـ مولانا محمد اسحاق
- [illegible] ـ [illegible]
- بدعت توحید کی ضد ہے ـ مولانا عامر عثمانی
- اذانِ محبت کدہ ـ مختلف شعرا

اشفاق احمد بلخی

حُجّتِ ابراہیمیؑ

ایک مناظر کی ساری کاوشیں اس بات میں صرف ہوتی ہیں کہ وہ مخاطب کو کسی طرح ساکت کردے۔ اس لئے وہ ذہنی کشتی کے سارے داؤ پیچ سے مسلح ہوکر حریف پر حملہ آور ہوتا ہے۔ کبھی الزام و معارضہ سے کام لیتا ہے کبھی اپنے استدلال کے مقدمات مغالطوں سے تیار کرتا ہے اور کبھی مخاطب کے کلام کی جراحی کرکے اس کی درجنوں شقیں نکالتا ہے۔ ہر شق کے مختلف گوشے پیدا کرتا ہے اور پھر ہر گوشہ پر نقض و ابرام کی بارشیں شروع کردیتا ہے۔ تاکہ مخاطب کا دماغ مرعوب و مفلوج ہوکر رہ جائے۔ لیکن ایک داعئ حق کی شان اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی روش تحکم آمیز چیلنج بازی کی نہیں ہوتی اور نہ کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے قسم کی مہارت طلبی اس کا شیوہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد ہدایت ہوتا ہے جو صرف اذعان و یقین سے حاصل ہوسکتی ہے اور یہ اذعان و یقین بحث و تکرار کے الجھاوے سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ مخاطب کے دل سے شکوک کے کانٹے نکال کر اس میں حق اتارنے کی سعی سے ہی ممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ فلسفیانہ موشگافیوں سے اور ان کے مکالمے منطقیانہ رد و قدح سے نہیں بلکہ حکمت اور موعظۂ حسنہ اور بہترین انداز پر مکالمہ کی خوبیوں سے معمور ہیں۔ چنانچہ اس کی تصدیق ہر وہ شخص کرسکتا ہے جو انبیائے کرام کے ان مواعظ اور مکالموں کا تدبر و بصیرت کے ساتھ مطالعہ کرے جو قرآن میں مختلف انبیا کے واقعات کے سلسلے میں حکایتاً بیان کئے گئے ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی حُجّتِ ابراہیمی کے وہ مظاہر ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک تو وہ مکالمہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے درمیان ہوا تھا جو اپنے اقتدار و فرمانروائی کے گھمنڈ میں اپنے آپ کو حاکمِ مطلق سمجھ رہا تھا، اور اپنے اوپر کسی ایسے بالاتر اقتدار کا منکر تھا جس کے سامنے وہ جواب دہ ہو اور اس فریب میں مبتلا تھا کہ چونکہ اہلِ ملک کی معاشی ضروریات اور ان کی جان و مال اس کے قبضۂ اقتدار میں ہیں اس لئے وہ ان کا رب ہے لیکن حضرت ابراہیمؑ اس کے اس غرورِ حکمرانی پر ضرب لگاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ "(میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے) یعنی جو خزاں کو بہار سے اور بہار کو خزاں سے تبدیل کرتا ہے، جو سوکھے پتوں کو سرسبز و شاداب کردیتا ہے جو چٹیل میدان کو سبزہ زار بنا دیتا ہے جو بے آب و گیاہ زمین پر لہلہاتی ہوئی کھیتی کھڑی کر دیتا ہے، اور تم اپنی آنکھوں سے اس بہار و خزاں، زمین کی اس پامالی و شگفتگی اور خشک سالی و سرسبزی کا یہ دور دیکھتے رہتے ہو اور پھر کیا یہ وہ تم ہو جو ایک بے جان قطرۂ آب کو گوشت پوست اور ہڈیوں سے تبدیل کرکے اس میں جان ڈالتے ہو اور ایک جیتا جاگتا بچہ ماں کی گود میں دے دیتے ہو جو زندگی کے ایام مختلف سرگرمیوں میں بسر کرتا ہے اور پھر موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ بھی وہی ہستی ہے جو بہار و خزاں لاتی ہے اور پھر تم اس کا بکثرت مشاہدہ کرتے ہو کہ ایک انسان بیمار ہوتا ہے، وقت کے بڑے بڑے معالجین اپنی ساری طبی ماہرانہ تدبیریں اور طاقت صرف کر ڈالتے ہیں، مگر اس مریض کو موت سے بچا نہیں سکتے۔ اور اس کے ساتھ تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ایک مریض کی صحت و تندرستی کے لئے معالجین نے اپنی ساری تدبیریں صرف کر ڈالیں مگر اس کی حالت دگرگوں ہی ہوتی چلی گئی، تاآنکہ معالجین نے ناامید ہوکر جواب دے دیئے اور اس مریض کی جان بچ جانے کو ناممکن قرار دیتے ہیں پھر تیمار دار اس مریض کے نزع اور موت کے منتظر رہتے ہیں کہ اچانک اس پر صحت و تندرستی کے آثار طاری ہونا شروع ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اسی ہستی کا ایک کرشمۂ قدرت ہے۔ غرض جو ہستی اس کائنات کی خالق ہے اور جس کے تکوینی امر کی

اطاعت میں یہ نظامِ عالم کام کر رہا ہے وہی ہستی حاکم و فرماں روا مالک و مختار اور "رب" ہونے کی مستحق ہے۔ اور جس طرح تو خالقِ کائنات ہے اسی طرح وہ کائنات کی حاکم و مالک بھی ہے اور حکومت و اقتدار کا یہ تخت اسی کا بخشا ہوا ہے جس پر تو بیٹھا ہے۔ لہٰذا تجھے چاہیئے کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے اپنے آپ کو عابدہ تصور کرتے ہوئے کارِ حکومت انجام دے۔

مگر نمرود نے مجادلانہ رویہ اختیار کیا اور اس نے حضرت ابراہیمؑ کی دلیل کے جواب میں کہا کہ "اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ" (جلانے اور مارنے والا تو میں ہوں) اہلِ ملک کی گردنیں میرے قبضہ میں ہیں میرے ایک اشارۂ ابرو سے انسان کا سر اس کے دوش سے جدا ہو جاتا ہے اور میں چشمِ عنایت سے دیکھ لوں تو وہ زندگی کی نعمتوں سے کھیلتا ہے۔

ظاہر ہے کہ نمرود کا یہ جواب نہایت نامعقول اور انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ کے استدلال میں ذکر کردہ الفاظ احیاء (جلانا) اور اماتت (مار ڈالنا) کا یا تو مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھا، یا سمجھ کر رکیک تاویل اور سطحی مغالطہ کا سہارا لینا چاہا۔ اس کی اس کج فہمی اور سفیہانہ جواب پر ایک مناظر اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لے سکتا تھا کہ اس کا ناطقہ بند ہو جاتا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ ایک داعیِ حق تھے کوئی مناظر نہ تھے، ان کی راہ دعوت و تلقین کی راہ تھی نہ کہ جدل و خصومت کی، اور داعیِ حق کے پیشِ نظر یہ ہوتا ہے کہ اپنے مخاطب کے دل میں کسی طرح حق اتار دے نہ یہ کہ اسے بحث و نزاع میں سراسیمہ کر کے چھوڑ دے اس لئے جب حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ ان کی دلیل کی روح اور طرزِ استدلال کو نمرود کا دماغ ہضم نہ کر سکا تو انھوں نے اس دلیل پر مزید گفتگو کرنے کی بجائے فوراً دوسری بات پیش کر دی کہ "فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ" (اچھا، اگر تیری قدرت و اختیار کی وسعت ایسی ہی ہے تو میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اس کو مغرب سے نکال کر دکھا) تیر نشانہ پر لگا، "فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ" (وہ نمرود جس نے کفر و سرکشی کی روش اختیار کی تھی، یہ جواب سن کر مبہوت و ششدر رہ گیا)

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ضمناً بعض ایسے مدعیانِ ہمہ دانی کی یہ استہزائی منطق ذکر کر دینے کو دل چاہتا ہے جو اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتے ہیں کہ:—

"کہا جاتا ہے کہ یہ جواب سن کر نمرود دگیر ہو گیا حالانکہ اگر وہ بھی الٹ کر یہی کہہ دیتا کہ میں آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہوں تو اپنے خدا سے کہہ کہ وہ مغرب سے نکالے تو شاید ابراہیم کے پاس کوئی جواب نہ رہ جاتا" (من و یزداں حصہ دوم ص۲۰۹ از جناب نیاز فتحپوری)

"کہا جاتا ہے" — گویا یہ بھی ان "احادیث" میں سے کوئی حدیث ہے جنھوں نے صاحب من و یزداں میں اسلامی لٹریچر کی طرف سے اولین بیزاری پیدا کی" (ملاحظہ ہو من و یزداں حصہ اول ص۴۹۵)

رہی یہ بات کہ نمرود نے الٹ کر اس "برہانِ قاطع" سے کام کیوں نہ لیا جو صاحب من و یزداں کی "ذہانت و جودتِ طبع" نے پیدا کیا ہے، تو سوائے افسوس کے اور کیا کہا جائے کہ نمرود کو ایسے اتالیق و مشیر میسر نہ آسکے، ورنہ وہ الٹ کر یہ جواب ضرور دے دیتا، اور بات یہ ہے پھر شاید اس استہزاکی جسارت کرنے والی عقل میں یہ بات نہ آئے کہ ابراہیمؑ کا وہ خدا جس کے تکوینی نظام میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے۔ جب اس کے حکم سے وہی آگ ابراہیمؑ کے لئے سلامتی کا گہوارہ بن سکتی ہے تو پھر کیا اسی خدا کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سورج کو مغرب سے طلوع ہونے کا حکم دیتا۔ اور وہ طلوع ہو کر نمرود اور اس کے ضرورت سے زیادہ عقلمند اتالیقوں اور مشیروں کے لئے ششدر ہو جانے کا باعث ہو جاتا؟ لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوتا؟ شاید اس قسم کا استہزا کرنے والے اربابِ عقل و خرد کو معلوم نہیں کہ پھر نمرود اور نمرود کے ہم نوا اور متبعین کے واسطے ایک منٹ کے لئے بھی زمین کی پشت پر قرار ناممکن تھا کیونکہ جب بھی قدرتِ الٰہی نے اس طرح کا چیلنج قبول کر لیا ہے تو

سنتِ اللہ یہی رہی ہے کہ سرکشوں کو بے نام ونشان کردیا گیا ہے اور پھر شاید ایسے عقلائے دہر کو معلوم نہیں کہ دنیا میں کبھی کوئی شخص ایسا فہیم العقل نہ تھا اور نہ ہے کہ وہ اس کا ادّعا کرتا ہو یا کرسکتا ہو یہ آفتاب و ماہتاب، یہ ستارے اور یہ شجر وحجر اس کی تخلیق کے کرشمے ہیں اور ان مخلوقات کی کارگزاریاں اُس کے حکم وامر کے تحت ہوتی ہیں زیادہ سے زیادہ کوئی نیچریت و دہریت کا دعویٰ کرسکتا ہے لیکن اس بات کی جسارت کسی عاقل کی عقل نہیں کرسکتی کہ وہ اس کائنات کا خالق اور آمر ہے۔ اور اس کے حکم سے یہ نظامِ عالم کارفرما ہے اس لئے نمرود احیاء واماتت کے معاملہ میں تو الفاظ کے مجازی استعمال کا سہارا لیتے ہوئے فریب ومغالطہ سے کام لے سکتا تھا۔ مگر چونکہ وہ بہرحال عقل سے کورا نہ تھا اس لئے یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ آفتاب کا خالق ہے اور اس کا طلوع وغروب اس کے امر ومشیت کے تابع ہے۔ اس کے علاوہ اس "منطق استہزائی" کی یہ "پرواز" بھی قابلِ رحم ہے کہ اگر نمرود الٹ کر یہ کہہ دیتا تو "شاید ابراہیمؑ کے پاس کوئی جواب نہ رہ جاتا"۔ کیونکہ پھر بھی ابراہیمؑ کے پاس یہ جواب تھا کہ پھر کیا مشکل ہے، اب تک جناب اس سورج کو مشرق سے نکالتے رہے ہیں، اب ذرا براہِ کرم مغرب سے نکال کر بتا دیجئے تاکہ میں جناب کے ادّعائے ربوبیت کو تسلیم کرلوں اور چونکہ نمرود اپنے رب ہونے کا مدعی تھا۔ اس لئے اس کا بارِ ثبوت اس پر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اس کے ادّعائے ربوبیت کے منکر تھے اس لئے اصولاً نمرود کو اپنے اس ادّعا کے ثبوت میں حضرت ابراہیمؑ کے اس مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے سورج کو مغرب سے نکالنا پڑتا۔ محض یہ کہہ دینے سے اس کا ادّعائے ربوبیت ثابت نہیں ہوسکتا کہ میں مشرق سے نکالتا ہوں ورنہ صاحبِ "من ویزداں" کے لئے ضروری ٹھہرے گا کہ وہ ہر اس بوالہوس کی تصدیق فرمادیا کریں جو اپنے اہلِ نظر ہونے کا ادّعا کرے اور مسیلمہ کذاب کی نبوت کی تصدیق کا اعلان کریں بلکہ ہر اس دماغی مریض کو خدا تسلیم کریں جس نے اب تک خدائی کے دعوے کئے ہیں اور ایک آدھ اب بھی شاید آگرہ کے پاگل خانہ میں مل جائے گا۔

دوسرا واقعہ جو قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے حکمت سے لبریز طریق واستدلال سے متعلق مذکور ہے وہ "استدلال مشہود" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے جب یہ دیکھا کہ ان کی قوم عقل وفہم سے اتنی نابلد ہورہی ہے کہ علمی وعقلی انداز میں توحید کی حقانیت اور شرک کا بطلان اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو انھوں نے استشہاد کا ایسا طریقہ اختیار فرمانا چاہا جسے ان کی قوم بچشم سر دیکھ لے۔ اور اس طرح ممکن تھا کہ ان مشرکین کو یہ محسوس ومشاہد دلیل قائل کردے۔ چنانچہ ایک دن جب کہ مندر کے پجاری اور مجاور موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ ان مشرکین کے مرکزی بت خانے میں گھس گئے اور سارے بتوں کو پاش پاش کردیا اور صرف ایک بت کو چھوڑ دیا جو ان میں سب سے بڑا تھا کہ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ (ممکن ہے وہ لوگ یہ افتاد دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ کی طرف رجوع کریں) تو پھر مندر کے تاراج شدہ اس منظر سے کام لیا جاسکے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے حسبِ توقع انہیں بلایا گیا اور صرف پجاریوں کے سامنے ہی وہ پیش نہیں لئے گئے بلکہ عوام اور پجاریوں کے ایک مشترکہ اجتماع کے روبرو ان سے جواب طلبی کی گئی۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو اس کا موقع مل گیا کہ وہ عامۃ الناس کے سامنے شرک کی لغویت واضح کردیں اور پجاریوں کے مکر وفریب کا طلسم توڑ دیں کیونکہ پجاریوں نے بتوں کی پُراسرار آواز دینے کے قصے مشہور کر رکھے تھے اور عوام کے دل میں یہ بٹھا رکھا تھا کہ یہ بت ان پجاریوں سے باتیں کرتے ہیں غرض حضرت ابراہیمؑ کو اس بھرے مجمع میں بلا کر ان پجاریوں نے ان سے پوچھا کہ کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ بَلْ فَعَلَهُ "ہاں، یہ کام تو کیا ہے اور کسی نہ کسی نے تو کیا ہی ہے) "كَبِيرُهُمْ هَٰذَا"۔ یہ رہا تمہارا "ربّ الارباب" اور یہ ابھی صحیح وسالم ہے "فَاسْأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ"۔ (انہی سے پوچھ لو اگر فی الحقیقت یہ بولتے ہیں) اور تمہاری باتوں کا جواب دیتے ہیں۔ جیسا کہ تم نے عوام کو باور کرا رکھا ہے تو پھر آج اس "سانحۂ عظیم" پر تمہارا جواب کیوں نہ دیں اور کیوں نہ اس "مجرم" کا نام بتا دیں جس نے ان کا بھرکس نکال کر رکھ دیا ہے تم نے بتوں کے اقتدار ونصرت کے افسانے پھیلا کر عوام کو خوف زدہ کر رکھا ہے تو تمہارا یہ "ربّ الارباب" دم سادھے دیکھتا کیوں رہا؟ اس نے

اپنی "ذریات" کو پاش پاش ہونے سے کیونکر بچا لیا، اور اس شکست و ہزیمت کرنے والے کی "گستاخی" پر اُسے کوئی عبرتناک سزا کیوں نہ دی؟ یہ جواب سنتے ہی حاضرین پر ایک سناٹا چھا گیا۔ عوام کے سامنے پجاری یہ کہنے سے رہے کہ یہ بُت ہماری باتوں کا جواب نہیں دیتے اور نہ دے سکتے ہیں کیوں کہ بتوں کی آوازوں اور ان سے اپنی ہم کلامی کے یہ پرچار کرتے رہتے تھے۔ خود حقیقت جانتے تھے اس لئے بتوں سے استفسار کرنے سے رہے۔ فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ (پجاریوں کی جماعت اپنے ضمیر سے استفسار کرنے لگی) مگر اپنے نفس کو فریب دے سکے۔ بات بنائی بھی نہ بنا سکے اور بالآخر مجبوراً اپنے آپ سے اور آپس میں انھیں کہنا ہی پڑا کہ "إِنَّكُمْ أَنتُمُ الظَّالِمُونَ" (بلاشبہ حق سے روگردانی کرنے والے تم ہی ہو) یقیناً نافرمان و سرکش ہم ہی ہیں، ٹھیک بات تو وہی ہے جو ابراہیمؑ کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ بے بس ہو کر دبی زبان سے وہ اس اعتراف پہ مجبور ہوئے کہ "لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَٰؤُلَاءِ يَنطِقُونَ" (یہ حقیقت تو اے ابراہیمؑ تمہیں معلوم ہی ہے کہ بتوں کی آوازوں کے افسانے کیا حیثیت رکھتے ہیں یہ بت بولا نہیں کرتے) پھر تمہارا یہ کہنا کہ ان بتوں سے پوچھ لو کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر کیا تھا حضرت ابراہیمؑ کی آوازِ حق بھرے مجمع میں گونجی کہ "أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۔۔۔ الآیہ" جب ان بتوں کے نطق و الہام کے افسانے من گھڑت ہیں اور ان کے عجز و بیچارگی کا یہ عالم ہے تو پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہو جو تمہیں نہ کچھ نفع ہی پہنچا سکتے ہیں اور نہ ذرہ برابر بھی نقصان!!!

تف ہے تم پر۔ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی؟

تیسرا واقعہ جو حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ استدلال سے متعلق میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس کی بنیاد قرآن کی یہ آیات ہیں:-

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۔ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ۔ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّي هَٰذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۔ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۔۔ (انعام رکوع ۱۰)

پھر جب اُن (ابراہیمؑ) پر رات طاری ہوئی تو انھوں نے ایک ستارا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غائب ہوگیا تو کہا کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غائب ہوگیا تو کہا کہ اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ غروب ہوگیا تو کہا اے میری قوم میں بری ہوں ہر اس چیز سے جس کو تم خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ان کی قوم ان سے حجت کرنے لگی تو انھوں نے کہا کہ کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو، حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دی ہے۔ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اُن کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔ الخ (الانعام۔ رکوع ۹-۱۰)

اس واقعہ کے متعلق اکثر مفسرین کرام جو باتیں فرماتے ہیں اسے مولانا مودودی نے بہترین پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے:-

میں حضرت ابراہیمؑ کے اس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے ان کے لئے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت انسان، جس نے شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہو سکی تھی، کس طرح آثار کائنات کا مشاہدہ کر کے اور ان پر غور و فکر اور ان سے صحیح استدلال کر کے حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد و پیش ہر طرف چاند، سورج، اور تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے، اس لئے قدرتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی جستجوئے حق کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہیے تھا کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہو سکتا ہے؟ اسی مرکزی سوال پر انھوں نے غور و فکر کیا اور آخرکار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ جن کے رب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر بھی ربوبیت کا شائبہ تک نہیں، رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور بندگی پر مجبور کیا ہے۔ اس قصہ کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (وہ یہ کہ) کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیمؑ پر رات طاری نہ ہوتی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند تاروں اور سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے، ظاہر ہے یہ غور و فکر انھوں نے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ پھر یہ قصہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا کہ جب رات آئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا گویا اس خاص واقعہ سے پہلے انہیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مستبعد ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بات بالکل صاف ہے۔ ۔ ۔ ۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اشیاء آخر زمین پر ہی کیوں گرا کرتی ہیں، یہاں تک کہ غور کرتے کرتے وہ قانون جذب و کشش کے استنباط تک پہنچ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (بات یہ ہے کہ) بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، مگر ایک وقت اسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی طرف کام کرنے لگتی ہیں یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن الجھ رہا ہوتا ہے اور یکایک روزمرہ ہی کے مشاہدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گتھی کا دوسرا سرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سلسلہ میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت

ابراہیمؑ نے تارے دیکھ کر کہا یہ میرا رب ہے اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انہیں اپنا رب کہا تو
کیا اس وقت عارضی طور پر ہی، شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک
طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لئے ٹھہرتا ہے
.... (تو) اصلاً یہ ٹھہراؤ، سوالی و استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالبِ حق جب ان میں سے
کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ "ایسا ہے" تو درحقیقت یہ اس کی آخری رائے نہیں ہوتی بلکہ اس
کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ایسا ہے؟" اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پاکر وہ آگے بڑھ جاتا
ہے اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھہرتا رہا، وہاں وہ
عارضی طور پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص۵۵۶ - ۵۵۹)

لیکن چند دوسرے مفسرین کرام جن میں حضرت ابن عباسؓ جیسی مفسرِ قرآن شخصیت بھی ہے، اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید کے طرزِ استدلال کا وہ رُخ قرار دیتے ہیں جو انھوں نے ستارہ پرستوں کے مقابلہ میں اختیار فرمایا تھا، اور میرے نزدیک ان آیات کی یہی تشریح و تفسیر صحیح ہے۔

درحقیقت حضرت ابراہیمؑ کی قوم میں جس طرح صنم پرستی کی ضلالت پھیلی ہوئی تھی اسی طرح ستارہ پرستی کا بھی زور تھا۔ شہر اُر جو حضرت ابراہیمؑ کا مولد و مسکن ہے، میں زہرہ، چاند اور سورج کے مندر تھے، جہاں صبح و شام اور رات کے وقت پرستش کے لئے لوگ جمع ہوتے چنانچہ ان ستارہ پرستوں پر حجت قائم کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے طنز و تعریض کا پہلو اختیار کرتے ہوئے مشاہدہ اور احساس کو اپیل کرنے والا تقریباً اسی قبیل کا طریقۂ استدلال اختیار فرمایا تھا۔ جس کا تذکرہ بتوں کے توڑنے کے سلسلہ میں اُوپر کیا جاچکا ہے اور اس بات کی شہادت متذکرہ بالا آیات کے اندر بھی ہے اور ان کے سیاق و سباق میں بھی کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کی "جستجوئے حق" کا بیان نہیں ہے بلکہ ستارہ پرستوں کے سامنے اثباتِ حق سے متعلق ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ سُورۂ انعام پوری کی پوری بیک دفعہ نازل ہوئی، ایسا نہیں ہے کہ اس کا کچھ حصہ ایک موقع پر نازل ہوا ہو اور اس اثنا میں کچھ دوسری آیات جو کسی اور سورہ میں ہیں نازل ہوئیں پھر ترتیبِ آیات و سورہ کی رُو سے سُورۂ انعام کی موجودہ ترتیب قرار پائی ہو۔ بلکہ یہ سُورۃ از ابتدا تا انتہا اس ترتیب سے یکبارگی نازل ہوئی ہے اس کے علاوہ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ (پھر جب ابراہیمؑ پر رات طاری ہوئی) کے جملہ میں لفظ فلمّا کی ف (پھر) بجائے خود اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس کا تعلق پیشتر سے ہونا چاہیے، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ بیشتر کا حصہ پیشِ نظر رکھا جائے جس سے سلسلہ بیان کی ابتدا ہوئی ہے اور وہ یہ ہے:-

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝
وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ

اور جب کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر سے کہا تھا کہ کیا تم بتوں کو الٰہ بناتے ہو، میں تمہیں اور تمہاری
قوم کو صریح گمراہی میں پاتا ہوں ـــ اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے
نظامِ سلطنت دکھاتے اور اس لئے دکھاتے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں، پھر
جب ان پر رات طاری ہوئی ـــ الخ

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رات کے وقت کے اس واقعہ سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ شرک و بت پرستی سے بیزار تھے۔ کیونکہ وہ اسے "ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" (کھلی گمراہی) قرار دے رہے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت انسان اصنام کو رب بنانے کو تو ضلال مبین قرار دے، مگر ستارے چاند اور سورج میں ربوبیت کے امکانات سمجھے، بالخصوص جب کہ ان اصنام میں زہرہ اور آفتاب و ماہتاب کی مورتی اور بت بھی تھے۔ نیز اگر حضرت ابراہیمؑ کا ذہن کسی مخصوص ہستی کی الوہیت کے تصور سے خالی ہوتا تو وہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ "اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا آلِهَةً" (کیا تو اصنام کو الٰہ بناتا ہے؟) لہٰذا معلوم ہوا کہ کسی متعین ذات کی الوہیت کا علم و یقین انہیں حاصل تھا جس کے ساتھ اصنام کو شریک ٹھہرانے یا خود اصنام ہی کو اس الوہیت کا مصداق و مظہر قرار دینے کو وہ ضلال مبین فرما رہے ہیں اور جب ایسا تھا تو "پھر (فلما) رات طاری ہونے پر جستجوئے حق کے لئے سفر تفکر کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

اور اس متعین ذات کے علم و یقین پر وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ کا جملہ بھی شہادت دے رہا ہے، کیوں کہ اصنام پرستی کو ضلال مبین قرار دینے کی بنیاد اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی وقت سے موقنین (یقین کرنے والوں) میں سے تھے۔ جس وقت وہ آذر سے اصنام پرستی کو ضلال مبین کہہ رہے تھے، اور جب ایسا ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ارشاد کے وقت حضرت ابراہیم ملکوت السماوات والارض کا مشاہدہ کر چکے تھے، جبھی تو "موقنین" میں سے ہوئے؟ ورنہ ایسا شخص اصنام پرستی کو "ضلال مبین" (صریح گمراہی) کس طرح قرار دے سکتا ہے جس پر ابھی خواہ راہ حق منکشف نہیں ہوئی ہے اور جستجوئے حق کے لئے ابھی وہ سفر تفکر شروع کرنے والا ہے۔ اور اگر مدعا یہ ہو کہ صرف اصنام کے الٰہ ہونے کی حد تک وہ مطمئن نہ تھے تو کیا وہ محض اپنے اس عدم اطمینان کی بنا پر اصنام پرستی پر "ضلال مبین" کا حکم لگا دینے میں حق بجانب ہو سکتے تھے جب کہ وہ خود کسی ایسی متعین ہستی کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے تھے جو فی الحقیقت الٰہ ہے؟ کیا ایک غیر مطمئن اور مذبذب شخص اتنے پُریقین لہجے میں، اس قدر اعتماد اور زور کے ساتھ اصنام پرستی کو صریح گمراہی کہہ سکتا تھا؟ اور اگر کہتا تو اس کی ذمہ داری اس پر نہ تھی کہ پھر بتاتا کہ اگر اصنام الٰہ نہیں تو کون الٰہ ہے؟ اور اگر آذر ان سے یہ سوال کر بیٹھتا تو کیا حضرت ابراہیمؑ اس پوزیشن میں تھے کہ وہ حقیقی الٰہ کی طرف رہبری کرتے؟ اور کیا غیر مطمئن اور مذبذب شخص کو "اِنِّیْ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" — (میں تمہیں اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں پاتا ہوں) کہتے وقت لوگوں کا یہ طعنہ نہ سننا پڑتا کہ　　او خویشتن گم است کرا رہبری کند؟

تو کیا حضرت ابراہیمؑ جیسے "صحیح الدماغ اور سلیم النظر" انسان کے حق میں یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہی نہیں کیا اور ان نتائج و عواقب تک ان کی نگاہ ہی نہیں گئی؟ یا یہ بات ان کے شایان شان ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے اور ان نتائج و عواقب پر بھی ان کی نگاہ تھی مگر سب کچھ جانتے بوجھتے، ان سبھوں سے بے پروا ہو کر بڑھے بڑھے ہوئے اور کھلے ہوئے لوگوں کے قلوب میں جڑ پکڑے ہوئے ان کے اعتقاد پر ایک نہایت زبردست حملہ کرتے ہوئے ضرب لگا دیں اور خود انہیں اپنے متعلق پتہ نہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں، خود ان کے فکر کی قوتیں اس مضمون کی طرف کام نہیں کر رہی ہیں۔ ان کے ذہن میں کوئی حرکت اور کوئی کھٹک پیدا نہیں ہوتی ہے یا ابھی خود ان کا ذہن تحقیق حق میں الجھا ہوا ہے اور کسی ایسی چیز پر ابھی نظر نہیں پڑی ہے کہ کسی کا دوسرا سرا ہاتھ لگ جائے جس سے ساری الجھنیں دور ہو جائیں اور یہ احتمال ایک عجیب بات ہوگی کہ آذر سے اس گفتگو کے وقت حضرت ابراہیمؑ موقنین میں سے تو تھے مگر اس حد تک کہ صرف "ملکوت الارض" کا مشاہدہ کرنے کے سبب محض "زمینی دیوتاؤں" کی الوہیت کی "کھلی گمراہی" ان پر عیاں تھی۔ اور ابھی ان پر "آسمانی دیوتاؤں" کی ربوبیت کا بھی "ضلالِ مبین" ہونا روشن نہ تھا۔ اس لئے اللہ نے انہیں "ملکوت السماوات" کا مشاہدہ کرانا چاہا "پھر" (فلما) رات طاری ہونے پر جستجوئے حق کے لئے ان تدریجی منازل

کی مسافت طے فرمانے لگے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ محض منفی پہلو کے لحاظ سے وہ موقنین میں سے تھے، یعنی انہیں صرف اس کا یقین تھا کہ یا اصنام الٰہ نہیں ہیں اور اسی بنا پر انھوں نے اصنام پرستی کو ضلال مبین قرار دیا۔ رہی یہ بات کہ پھر الٰہ کون ہے؟ تو یہ حقیقت ابھی اُن پر منکشف نہ ہوئی تھی۔ لیکن اس تاویل کی رکاکت اس لئے واضح ہے کہ ایقان و ایمان کی صفت کا تعلق محض منفی حالت کے تھا نہیں ہوتا، ان الفاظ کا اطلاق اس حالت پر نہیں ہوگا کہ ایجابی رُخ تو تشنہ ہے اور منفی حیثیت میں انحصار ہو۔ دور کیوں جایئے۔ خود ہی آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ یہاں "موقنین" سے یہ مراد و مدعا نہیں ہے بلکہ مراد و مدعا یہ ہے کہ تاکہ ابراہیم مومن باللہ ہو جائیں، ان کا ایقان و اذعان اس پر ہو جائے کہ الٰہ وہ ہے جو اس آسمان و زمین کا خالق ہے اور وہی اس کائنات کا مالک، آمر اور رب ہے، لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ اصنام پرستی کو ضلال مبین قرار دیتے وقت حضرت ابراہیمؑ موقنین میں سے تھے اور موقنین میں سے ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مومن باللہ تھے، اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی ربوبیت بلا شائبۂ ریب ان پر آشکارا تھی۔

پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ کوکب (ستارہ) کے غروب کے بعد حضرت ابراہیمؑ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں) فرماتے ہیں، پس اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کا تفکر تھا تو ستارے کے ڈوبتے ہی معاً چاند اور سورج کا اُفول (غروب) بھی ذہن میں آجانا چاہیئے تھا، ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ یہ "سفرِ تفکر" چاند اور سورج کے طلوع و غروب تک ممتد اور جاری رہتا، نہ صرف ضرورت نہ تھی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ جیسے صحیح الدماغ اور سلیم النظر انسان کے لئے ضروری تھا کہ ستارے کے ڈوبتے ہی اُن کا ذہن فوراً اس بات کی طرف منتقل ہو جاتا کہ چاند اور سورج بھی تو اسی طرح غروب ہو جاتے ہیں، رات دن تو وہ ان کے طلوع و غروب کا مشاہدہ کرتے ہی رہتے تھے۔ ذہن کی حرکت کے لئے جس طرح اس رات ستارے کا طلوع سبب بنا اسی طرح اس کا غروب چاند اور سورج کے بھی غروب کی طرف انتقالِ ذہنی کا موجب ہونا چاہیئے تھا لیکن ستارہ طلوع ہوتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے ذہن میں اچانک حرکت ہوتی ہے اور ان کے فکر کی قوتیں ایک "سوال" کے "مضمونِ جواب" کی طرف کام کرنے لگتی ہیں، اس اثنا میں وہ ستارہ ڈوب جاتا ہے مگر حضرت ابراہیمؑ جیسے صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت انسان کا حال یہ ہے کہ ان کی متحرک فکری قوتوں کا دھارا نہ اس سمت جاتا ہے کہ اچھا اگر یہ ستارہ "رب" ہونے کا مستحق نہیں تو کیا چاند اور سورج اس کے مستحق ہیں؟ اور نہ ان کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اسی طرح چاند اور سورج بھی تو طلوع ہوتے اور پھر غروب ہو جایا کرتے ہیں، اور وہ بدستور "سفرِ تفکر" فرما رہے ہیں۔ کیا یہ تعجب خیز بات نہیں؟

پھر قابلِ لحاظ یہ امر بھی ہے کہ چاند جب غروب ہوتا ہے تو حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا) اس جملہ نے ساری گتھیاں سلجھا دیں کیوں کہ یہ جملہ پوری طرح اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ایک ایسے متعین رب کی معرفت انہیں حاصل تھی جس کی طرف وہ ہدایت کو نسبت دیتے ہوئے اُسے ہادی قرار دے رہے ہیں اور آفتاب کے طلوع و غروب سے پہلے ہی وہ ستارہ پرستی کی ضلالت سے اشارتاً اپنی برأت کر رہے ہیں، اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ صرف کوکب پرست اور چاند پرست لوگوں کو وہ ضالین قرار دے رہے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا وہ کونسا متعین رب تھا جس کا انھوں نے اپنے ہادی کی حیثیت سے اظہار کیا؟ نیز لطیفہ یہ ہے کہ اس طلوع و غروبِ قمر کے بعد بھی ان کا ذہن آفتاب کے طلوع و غروب کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اور ان کا سفرِ تفکر بدستور جاری ہے۔ کیا یہ صورتِ حال حضرت ابراہیمؑ جیسے سلیم الفطرت اور صحیح الدماغ شخص کی رسائیِ فکر کو کیا محلِ نظر نہیں بنا دیتی؟ پس اگر فی الواقع یہ حضرت ابراہیمؑ کا تفکر تھا اور حقیقت تک رسائی کے لئے غور و فکر کے سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے تو لئن لم یھدنی ربی الخ کا جملہ ابھی نہیں، بلکہ غروبِ آفتاب کے بعد کہا جانا چاہیئے تھا۔ پھر آگے بڑھیے غروبِ آفتاب کے بعد فرماتے ہیں کہ يَا قَوْمِ

اِنِّی بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ۔ اگر یہ غور وفکر تنہا حضرت ابراہیمؑ کا تھا اور ان کے ابتدائی تفکر کی کیفیت کا یہ بیان ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ "قوم" کہاں سے ٹپک پڑی ؟ اگر یہ بیان اس کا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی سلامت فکر و نظر کو کام میں لاتے ہوئے امرِ حق معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ان کا ذاتی مشاہدہ و تفکر تھا جس کا تعلق انہی سے ہونا چاہیے تھا اور اس موقع پر انہیں وہ کہنا چاہیے تھا جو اس جملہ (یَا قَوۡمِ اِنِّی بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ) کے بعد کہا، یعنی "اِنِّی وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ ---- الخ کیوں کہ قوم تو اس تفکر میں ان کی شریک سفر نہ تھی ؟ درمیان میں اچانک "یا قوم" (اے میری قوم) کا فقرہ تو کچھ اس طرح کا منظر پیش کر رہا ہے کہ ایک تحقیقاتی بورڈ ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم کے چند افراد پر مشتمل ہے اور یہ سارے لوگ مل کر تحقیق و اکتشاف رب کے کام میں لگے ہوئے ہیں، آثارِ کائنات کا مشاہدہ ہو رہا ہے، تفکر کے مدارج طے ہو رہے ہیں کہ اتنے میں ان مشاہدات سے حضرت ابراہیمؑ پر حقیقتِ حال واضح ہو جاتی ہے اور اس بورڈ کے دیگر افراد کو ان کی کج فہمی و کوتاہ نظری جمالِ حقیقت کے مشاہدے سے محروم رکھتی ہے، اس پر حضرت ابراہیمؑ اُن لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے میری قوم میں نے راہِ حقیقت پالی، وہ راہ جو تمہاری کج بینی و غلط اندیشی کے سبب تم پر منکشف نہ ہو سکی، اب میں تم سے مقاطعہ کرتا ہوں کیوں کہ نشانِ منزل مل جانے کے بعد میری اور تمہاری راہیں جدا ہو گئیں ۔ اور یہ نہ سمجھئے کہ اس "یا قوم" کا تخاطب محض برسبیل تذکرہ ہے، یعنی حضرت ابراہیمؑ نے غروبِ شمس کے بعد جس وقت اپنے سامنے حقیقت کو برافگندہ حجاب دیکھا تو معاً عالم تصور میں ان کے پردۂ ذہن پر قوم کے مشرک اشخاص و رجال کی صورتیں ابھریں تو انھوں نے جس طرح کوئی دل سے یا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کچھ کہتا ہے، اسی طرح اپنے چشمِ تصور کے سامنے آئے ہوئے ان افراد سے باندازِ تخاطب کہا کہ یَا قَوۡمِ اِنِّی بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ۔۔ نہیں، بلکہ سچ مچ، خارجی دنیا میں افرادِ قوم ان کے گرد جمع تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی جانب سے اس اعلانِ برأت اور ان کے اس اظہارِ ایمان و اسلام کو سنتے ہی ان سے مناظرہ کرنے لگ جاتے ہیں "وحاجّہ قومہ" ۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارروائی بطورِ حجت کے اس قوم کے سامنے ہوئی تھی، جس پر وہ ردّ و کد کر رہی ہے ۔

اور پھر اس ردّ و کد کی حکایت کے بعد قرآن کہتا ہے کہ "وَتِلۡكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيۡنٰهَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ عَلٰى قَوۡمِهٖ" ۔ "یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی) اس جملہ میں تلک (یہ) سے اشارہ حضرت ابراہیمؑ کے محض اس کلام کی طرف نہیں ہے جس کا تذکرہ (وحاجّہ قومہ کے بعد کیا گیا ہے، یعنی حضرت ابراہیمؑ کا ان مشرکین سے یہ فرمانا کہ:۔

(۱) کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے ہدایت دی ہے ۔

(۲) خدا کے ساتھ ٹھہرائے ہوئے تمہارے شریکوں سے میں نہیں ڈرتا ۔ ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور کر سکتا ہے ۔

(۳) بجائے مجھے خائف ہونے کے تمہیں ڈرنا چاہیے کہ تم نے بلا دلیل خدا کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک ٹھیرا رکھا ہے ۔

بلکہ "تلک" سے اشارہ اس پورے سلسلۂ بیان و عمل کی طرف ہے جو رات طاری ہونے کے وقت سے لے کر اس گفتگو تک حضرت ابراہیمؑ فرماتے اور کرتے رہے ہیں ۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحاجہ قومہ کے بعد ذکر کردہ محض وہ کلام "قوم پر حجت" بننے سے زیادہ وہ طرزِ عمل قوم پر بہترین "حجت" ہو سکتا ہے جو رات طاری ہونے کے بعد سے طلوعِ شمس تک حضرت ابراہیمؑ نے اختیار فرمایا تھا ۔ اور درمیان میں موقع بموقع کچھ ارشادات و اشارات بھی فرماتے گئے ۔ اس طرح وہ طرزِ عمل حضرت ابراہیمؑ کا در اصل ایک ایسا استدلال تھا جس کے مقدمات احساس و مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں، وہ توحیدِ الٰہی کی ایک حجت تھی جو حضرت ابراہیمؑ پر القا کی گئی اور اس لئے القا کی گئی تاکہ وہ اسے اپنی قوم کے سامنے پیش کریں، نہ کہ وہ اللہ کی ایک حجت تھی اس بات کے لئے کہ خود حضرت ابراہیمؑ پر امرِ حق واضح ہو جائے ورنہ جملہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ وَتِلۡكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيۡنٰهَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ عَلٰى نفسہٖ ۔

میں بھی یہی کہتا ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب یہ کہا کہ "ایسا ہے" ۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ "ایسا ہے ؟ ۔ لیکن یہ ؟ اپنی تحقیق جستجو کی خاطر سوالی و استفہامی نہ تھا، بلکہ انکاری تھا۔ طنز و تعریض کی شکل میں تھا۔ جس کی صورت یہ تھی کہ رات کے وقت جب زہرہ لور چاند کی پرستش کے لئے ستارہ پرست جمع ہوتے تو حضرت ابراہیمؑ نے جو پہلے ہی آزر کے سامنے اصنام پرستی کو ضلال مبین قرار دے چکے تھے ان ستارہ پرستوں پر راہ حق واضح کرنے کے لئے یہ اسلوب استدلال اختیار کیا۔ کوکب یعنی وہی زہرہ نمودار ہوتی ہے جس کی پرستش کی جاتی تھی۔ اسے دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ قوم کے سامنے تعریضاً ان کا عقیدہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ میرا رب ہے ؟ وہ غروب ہو جاتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ اِنِّیۡ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ ۔ یہ کیسی ربوبیت ہے جس پر فنا کی حالت طاری ہوتی ہے، جو اپنے قیام و قرار میں کسی ٹھہرائے ہوئے قانون کی پابند ہے، اور جو خود کسی کی اطاعت کر رہا ہو، وہ رب ہونے کا سزاوار کس طرح ہو سکتا ہے، اور وہ کونسا انسان ہے جو اپنے معبود کو کسی دوسرے کی اطاعت کرتا ہوا پسند کرے۔ معلوم ہوا یہ رب نہیں ہے، مخلوق و مربوب ہے۔ پھر چاند نکلتا ہے، ستارہ پرستوں پرستوں کی جبین عبادت اس کے سامنے جھکتی ہے تو تعریضاً پھر اس قوم کے عقیدہ کو اپنی طرف منسوب کرکے نقل کرتے ہیں کہ اچھے ہاں یہ ہے میرا رب۔ لیکن چاند بھی ٹک نہ سکا۔ اُس ستارے کے غروب کے بعد لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ فرما ہی چکے تھے۔ ضرورت نہ تھی کہ اس چاند کی محکومی و عجز کی طرف توجہ دلائیں، ہر آنکھ دیکھ رہی تھی کہ زہرہ کی طرح یہ چاند ڈوب گیا، اور ہر کان میں چند ساعت پہلے کہی ہوئی یہ آواز گونج رہی تھی کہ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ ۔ اس لئے اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے ایک دوسری بات فرمائی یعنی لَئِنۡ لَّمۡ یَہۡدِنِیۡ رَبِّیۡ الخ اس طرح ایک قدم اور آگے بڑھے، اور اشارتاً فرما گئے کہ رب کوئی اور ہے جس نے مجھے ہدایت دی ہے، اور یہ چاند ستارے اسی کے محکوم ہیں، اور جب ایسا ہے تو بھلا یہ سب الوہیت و ربوبیت میں اس کے شریک کس طرح ہو سکتے ہیں لیکن طلوع آفتاب کا مرحلہ ابھی باقی تھا، اس لئے کھل کر پوری بات نہیں کہی اور غروب آفتاب تک کے لئے اسے اٹھا رکھا۔ چنانچہ آفتاب اپنی تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ حسب معمول ستارہ پرستوں کی پیشانیوں میں سجدے تڑپتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اسی طرح طنز و تعریضاً فرماتے ہیں کہ اچھا یہ ہے میرا رب، ہاں واقعی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رب ہے بھی تو بہت بڑا اور بڑا تابناک و پُر جلال ؟ اور جیسا کہ آج کل بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ سورج پرست اشخاص آفتاب کے طلوع و غروب دونوں وقت اس کی پوجا کرتے ہیں، اس لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ غروب آفتاب کے وقت بھی وہ لوگ اس کی پرستش کے لئے جمع ہوتے، تا آنکہ وہ غروب ہو جاتا ہے اور ان ستارہ پرستوں کا ایک اور "خدا" اسی طرح اپنی محکومی و بیچارگی کی شہادت دیتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے، اب حضرت ابراہیمؑ وہ سب کچھ فرماتے ہیں، جس کی خاطر انھوں نے اس نوعیت کا یہ تدریجی طرز استدلال اختیار فرمایا تھا۔

طنز و تعریض کی شکل میں کلام و تخاطب کی متعدد مثالیں خود سی قرآن میں ملتی ہیں، جن کا اس وقت تذکرہ طوالت طلب ہے اس لئے بالفعل ان تفصیلات کو ترک کرتے ہوئے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ یہ واقعات ہمیں کیا سبق دے رہے ہیں ؟ قرآن نے مسلمانوں کو اسوۂ ابراہیمؑ کی اتباع کی ہدایت کی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ دعوت و تبلیغ کے طریقوں میں ان اصول کو ہمیشہ نظر رکھا جائے جو ان واقعات سے معلوم ہوتے ہیں، اور مختصر طور پر وہ یہ ہیں :-

- ـــــ دعوت حق پہنچانے اور مخاطب کو دلائل سے قائل کرنے کے جوش میں اس کے فہم و عقل کے معیار کا اندازہ لگانا نہ بھولنا چاہئے۔ بلکہ مخاطب کی سمجھ اور اس کے ظرف کی رعایت ضروری ہے، دلیل معقول سے معقول ہو لیکن اگر مخاطب کے عقل و فہم کی گرفت میں نہ آ رہی ہو تو اس پر خواہ مخواہ جمنا نہ چاہئے۔ اور اس کی کوشش نہ کرنی چاہئے کہ یہ دلیل اس کے دماغ میں زبردستی ٹھونس دی جائے، یا یہ محسوس ہو کہ مخاطب سطحیانہ تاویل

اور تعبیر کے دامن میں پناہ لینا چاہ رہا ہے تو مناسب یہ ہے کہ اسے وہاں سے کھینچ کر بحث و تکرار کی سرگرمی میں خواہ مخواہ نہ گھسیٹا جائے، کیونکہ پھر اس کا امکان ہے کہ اس کے ردِ عمل میں اس پر مخاصمت، ضد اور ہٹ دھرمی کا دورہ پڑے اس لئے ایسے موقع پر کسی دوسری دلیل کا پیش کرنا زیادہ مفید رہے گا، بالخصوص ایسی دلیل جو اس کے فہم و عقل سے قریب تر ہو، اس کے ظرف کے مناسب ہو اور جس کی شہادت اس کا احساس و مشاہدہ اور تجربہ بھی دیتا ہو۔

• ـــــ علمی و عقلی دلائل و براہین بھینس کے آگے بین ثابت ہوتے ہیں جب کہ سامع کا معیارِ علم و تعقل پست ہو اور مخاطب کی ذہنی سطح پر ایسے دلائل و براہین محض بارِ گراں ثابت ہوتے ہیں جب کہ وہ علم و تدبر سے خالی ہوں اس لئے ایسے مخاطب و سامع کے روبرو محسوسات و مشاہدات سے استدلال یا استشہاد مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے ذہنوں کو حسی و عملی اور تجرباتی دلائل اپیل کرتے ہیں، نہ کہ فلسفیانہ اور عقلی اور نظری استدلال کو بروئے کار لاتے ہوئے بحث و مباحثہ ـــ

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۸)

آپ فرمائیں گے کہ وہ بغاوت خلافت کے خلاف نہیں بلکہ دینِ اسلام کے خلاف تھی۔ وہ جواب دے گا کہ حضرت اگر اس بغاوت کا قائد حبیب ابن مسیلمہ واقعی مُرتد کا قرار نبوت کا داعی، تھا تو کیا ملت مُسلمہ اتنی بے حس ہو گئی تھی کہ دھڑا دھڑ اپنی اولاد کا نام حبیب[1] رکھتی۔ اس کے بعد وہ سینکڑوں حبیب نام کے اکابرِ عظام کو پیش کر دے گا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ اس کا کیا جواب دے سکیں گے؟

(اللہ تعالیٰ مجھے اس تمثیل کے لئے معاف فرمائے ـــــ)

والسلام ـــــ (سید معین الحق۔ شعبۂ تاریخ، اُردو کالج کراچی)

---

[1] محمود عباسی نے اپنی بدنام کتاب میں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کو غلط کار (معاذ اللہ) ٹھہرانے کے لئے ٹھیک یہی ٹیک نک استعمال کی ہے۔ (م۔ ق)

سید علین الحق
(ایم اے)

مُدیر "تجلّی" کے نام

مکرمی ومحترمی ! ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

میں ایک عرصے سے آپ کے مؤقر جریدہ "تجلی" کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اور اس بات کا معترف ہوں کہ فی الحقیقت یہ تاریکیوں میں ایک جلتا ہوا چراغ ہے۔ خصوصاً شرک وبدعت کے رد وابطال میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بہت ہی قابلِ قدر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید کا موقع عطا فرمائے اور آپ کے زورِ قلم کو اور زیادہ کرے۔

مگر اس طرف چند ماہ سے آپ نے جو اس بدنام کتاب "خلافتِ معاویہؓ ویزید" کی مدافعت شروع کی ہے اور ان متنازع فیہ مسائل کے متعلق جو موقف اختیار کیا ہے وہ میرے لئے سخت پریشان کن اور تکلیف دہ رہا ہے۔ اس کتاب کا میں بھی بغور مطالعہ کرچکا ہوں اور اس کے رد میں جو کتابیں لکھی گئیں اور جو بحثیں مختلف رسالوں میں آئیں وہ بھی میری نظر سے گزریں مگر کسی طرح میں آپ کے موقف کا قائل نہ ہوسکا۔ اس سے پہلے متعدد بار یہ خواہش ہوئی کہ میں آپ سے اس بحث کو ختم کردینے کی درخواست کروں۔ مگر یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید تاریخ کا کوئی مخفی گوشہ سامنے آجائے یا آپ خود اسے لایعنی سمجھ کر چھوڑ دیں۔ بہرحال باز رہا۔ مگر ماہِ اکتوبر کے "تجلّی" میں جب آپ نے پھر اپنا زور صرف کیا تو خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے علم کی حد تک تبلیغ کا فرض انجام دوں۔ لہٰذا اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے جناب عبدالمغنی صاحب کے جواب میں جو یہ فرمایا ہے کہ " یہ کہنا کہ قصاص کا عذر کسی شرعی سے معتبر نہیں ہے۔ فدوی کے نزدیک بہت بڑی جسارت ہے"۔ صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپ مسئلے کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ورنہ بات بالکل واضح ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انعقادِ خلافت کو مطالبۂ قصاص یا اس طرح کے کسی مطالبہ سے مشروط کیا جاسکتا ہے؟ زیادہ واضح الفاظ میں کیا کوئی شخص یہ شرط لگا سکتا ہے کہ اگر آپ یہ کام انجام دیدیں گے تو میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا؟ اور کیا اس طرح کے مطالبہ یا شرط کو شرعی حیثیت حاصل ہوسکتی ہے اور وہ قیامِ خلافت کا کوئی بنیادی عنصر بن سکتا ہے؟ جواب اگر اثبات میں ہے تو یہ قول متناقض ہے۔ یعنی کو وجود کا عنصر ترکیبی کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ قصاص کا مطالبہ خلافت سے ہے، جب خلافت قائم ہی نہیں ہو تو یہ مطالبہ کیسا اور کس سے؟ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر کسی حکومت کے قیام کو اس طرح کے (کسی) مطالبے سے مشروط کردیا جائے تو حکومت قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جواب نفی میں ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ قصاص لینا چاہتے تھے یا نہیں کیا موانع اور حالات تھے؟

اب بحث طلب بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت قائم ہوئی یا نہیں؟ یا کیا وہ حضرت معاویہؓ کی بیعت کے بغیر قائم ہی نہ ہوسکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ اگر امیر معاویہؓ کی بیعت کے بغیر حضرت علیؓ کی خلافت قائم نہیں ہوسکتی تھی تو حضرت سعدؓ ابن عبادہ کی بیعت کے بغیر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کیسے قائم ہوگئی؟ دوسرے اگر یہ عذر شرعی حیثیت رکھتا تھا تو دیگر اصحاب رسولؐ کے علاوہ عشرہ مبشرہ میں تین حضرات یعنی حضرت طلحہؓ۔ حضرت زبیرؓ اور حضرت سعدؓ نے بیعت کیسے کرلی؟ حالانکہ ان میں سے دو تو مطالبۂ قصاص کے ا

حد تک حامی تھے کہ بعد میں اپنے طور پر اس فرض کو انجام دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ کیا آپ اُن پر بزدلی یا مصلحت بینی کا کوئی الزام عائد کریں گے؟ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ ان حضرات پر امیر معاویہؓ کو کسی طرح کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے کہ ان کے عمل کو سند کی حیثیت دی جائے ۔

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت علی رضؓ کی خلافت قائم ہو گئی تھی ۔ اس لئے مزید وضاحت کی خاطر میں آپ کی توجہ حضرت علی رضؓ کے اُس خط کی طرف مبذول کراتا ہوں جو آپ نے امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا تھا جس کا مضمون یہ ہے :۔

"جن لوگوں نے ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی انھوں نے میری بیعت کر لی ہے اس کے بعد کسی کے لئے چون و چرا کی گنجائش نہیں ۔ خلیفہ کے انتخاب کا حق مہاجرین و انصار کو ہے ۔ ۔ ۔ " (اخبار الطوال)

اگر یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ یہ خط حضرت علی رضؓ کا ہے تو اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ " اکابر صحابہ کی اکثریت نے جو مدینہ میں موجود تھی بیعت سے گریز کیا " جیسا کہ عباسی صاحب نے تحریر فرمایا ہے (خلافت معاویہؓ و یزید صہ۲) حضرت علی رضؓ کی طرف کذب منسوب نہیں کیا جا سکتا ۔ اور اگر اس خط سے انکار کیا جاتا ہے تو میں طبقات ابن سعد[1] ابن اثیر اور طبری کی طرف آپ کو متوجہ کروں گا ! جن میں اس بیعت کی پوری تفصیل آئی ہے ۔ اُن تمام روایات کا جائزہ لینے سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ رضؓ ابن عمر رضؓ نے بیعت نہیں کی بقیہ جن حضرات کے نام بیعت نہ کرنے کے سلسلہ میں عباسی صاحب نے تحریر فرمائے ہیں وہ صحیح نہیں ۔ ابن خلدون نے بھی زیر بحث حضرات کے متعلق صرف یہ لکھا ہے کہ انھوں نے تاخیر کی[2] ہاں یہ ضرور ہے کہ جب حضرت علی رضؓ نے ان سے معاونت طلب کی کہ وہ جنگ میں اُن کا ساتھ دیں تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ حق و باطل کا فیصلہ نہیں کر سکے ہیں ۔ ۔ ۔ انکار سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ انھوں نے سرے سے بیعت ہی نہیں کی تھی ۔

اب آپ غور فرمائیں کہ امیر معاویہؓ حضرت علی رضؓ کے دستِ حق پرست پر بیعت نہ کرنے میں کس حد تک حق بجانب تھے اور کیا اُن پر بغاوت کا الزام عائد نہیں ہوتا تھا ؟ ساتھ ہی اگر بات صرف بیعت نہ کرنے کی ہوتی تو یہ ممکن تھا کہ جس طرح حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت سعد ابن عبادہ رضؓ سے اور حضرت علی رضؓ نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضؓ سے تعرض نہیں کیا اُن کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا مگر انھوں نے بیعت نہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ باضابطہ اُس قائم شدہ خلافت کو چیلنج کیا اور خلافت کی صحت و جواز کو مطالبۂ قصاص کی تکمیل سے مشروط کر دیا اگر آپ بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ اُسے مشروط ہونا چاہیئے تھا تو آپ پر یہ ذمہ داری ساتھ ہی ساتھ عائد ہوتی ہے کہ دوسرے اصحاب رسول ﷺ کے عمل کے لئے جن میں تین عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں ۔ جواز کی صورت تلاش کریں ۔

اس بحث کے بعد امیرِ معاویہؓ سے متعلق حکم معزولی کے جواز و عدم جواز کا سوال ضرور اُٹھتا ہے اور آپ نے اسی سلسلہ میں اپنا زورِ قلم صرف کر کے حضرت علی رضؓ کے اقدام کو آمرانہ اور قاہریت و مطلق العنانی پر مبنی قرار دیا ہے ۔ بہرکیف معزولی کے اسباب پر تو بعد میں روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا ۔ پہلے یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا حکومت کے مختلف عہدوں پر مامور کرنے کے لئے کم از کم خوبیوں کا کوئی شرعی معیار اور اُن سے علیحدہ کرنے کے لئے کم از کم برائیوں کا کوئی شرعی پیمانہ آپ پیش کر سکتے ہیں ؟ اگر آپ ایسا کر سکتے ہیں تو پہلے اُس معیار اور پیمانہ کو عزل و نصب کے اُن تمام واقعات پر چسپاں کر کے دیکھیں جو حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں پیش آئے ۔ اُس عہد میں جو معزول ہوئے ان میں حضرت سعد رضؓ ابن وقاص ، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ ، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ اور حضرت عمرو بن العاص ہیں اور جو مقرر کئے گئے

[1] طبقات جزو خامس صہ۱۲۶ مطبوعہ دکن

[2] تاریخ ابن خلدون الجزو الثانی صہ۲۰۲ مطبوعہ مصر ۱۳۵۵ھ ۔

اُن میں ولید ابن عقبہؓ، سعید بن العاص، عبداللہ ابن عامر اور عبداللہ ابن ابی سرح ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر آپ نے ایسی کوئی کوشش کی تو حضرت عثمان رضؓ کو اس حد تک مطعون کر دیں گے کہ شاید اُن کی مدافعت ممکن نہ ہو سکے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ حضرت علی رضؓ پر اعتراض کرنے سے پہلے آپ یہ بھی غور فرمالیں کہ اس اعتراض کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے، اور اس کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے "یہاں تو لطف ہے کہ حضرت معاویہؓ نہ تو حضرت علی رضؓ کے مقرر کردہ ہیں نہ اُنھوں نے حضرت علی رضؓ کی بیعت کی" میں حیران ہوں کہ آپ کے اس جملہ کی کیا قدر و قیمت متعین کروں۔ کیا آپ یہ تحریر فرماکر حضرت عثمان رضؓ کے اُن اقدامات کو غلط قرار دینا چاہتے ہیں جو انھوں نے حضرت عمر رضؓ کے مقرر کردہ عمال کو معزول کرنے کے سلسلہ میں کئے تھے اور حضرت حسینؓ کے اقدام کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی؟ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے اقدامات صحیح تھے کیوں کہ اُن عہدہ داروں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی تو امیرِ معاویہؓ کی معزولی بدرجۂ اتم صحیح تھی کیونکہ اُنھوں نے بیعت سے انکار کر دیا تھا اور اس لحاظ سے حضرت علیؓ پر اُن کے حقوق کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔

اب معزولی کے اسباب پر غور فرمائیے:۔

(۱) حضرت عثمانؓ کے خلاف کچھ شکایتیں تھیں۔ اُن شکایتوں کا ازالہ نہ ہو سکا یہاں تک کہ اُس نے اہمیت اختیار کی اور اُن کی شہادت کا دردناک سانحہ پیش آیا۔ یہاں اس سوال سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے کہ وہ شکایتیں صحیح تھیں یا غلط۔ اُس شر و فساد کے پیچھے حضرت طلحہؓ کا ہاتھ تھا یا عبداللہ ابن سبا کا۔ احتجاجیوں کی تعداد ہزاروں پر مشتمل تھی یا لاکھوں پر۔ بہرحال شکایتیں تھیں) اُن میں سے اکثر شکایتوں کا تعلق حضرت عثمان رضؓ کی ذات سے تھا جن کے ازالہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا مگر چند ایسی تھیں جن کو دور کرنے کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ اُن میں سب سے اہم شکایت یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ گورنر ناتجربہ کار، نااہل اور غیر محتاط ہیں اس لئے انھیں بلاتاخیر معزول ہونا چاہیئے۔ کیا اُس نئی خلافت کا پہلا فرض یہی نہیں تھا کہ اُن گورنروں کو معزول کرکے اس شکایت کا ازالہ کر دے تاکہ لوگ مطمئن ہو جائیں اور حکومت اس قابل ہو جائے کہ دوسرا اہم کام انجام دے سکے؟ اگر پہلی ہی فرصت میں ایسا نہیں کیا جاتا تو کیا حکومت کی طرف سے یہ اس بات کا کھلا اعلان نہ ہوتا کہ اُس کی پالیسی سابقہ حکومت کی پالیسی سے مختلف نہیں ہے؟ اور کیا حکومت خود انتشار کے دروازہ کو چوپٹ کھل جانے کا موقع فراہم کر دیتی؟

(۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں امراء اور غرباء کے درمیان جو کشاکش شروع ہو جاتی ہے اُس سلسلہ میں دورِ عثمانی کے مقتدر اور بااثر گورنر امیرِ معاویہ تموّل و خوشحالی کی اس بلندی پر نظر آتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ امیرِ معاویہؓ کے محل "الخضراء" کی تعمیر اور خزانہ عامہ میں اُن کے ذاتی تصرف پر بڑی شدت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، یہاں تک کہ یہ کشمکش اس نوبت تک پہونچ جاتی ہے کہ امیرِ معاویہؓ نے فرمان کے ذریعہ حضرت ابوذرؓ کی مجلس میں لوگوں کو بیٹھنے سے روک دیا۔ اس کے بعد بھی اُن کی طرف سے خطرہ رہا، تو حضرت عثمان رضؓ کو لکھا ——— "ابوذرؓ کی وجہ سے فساد برپا ہو رہا ہے انہیں مدینہ بُلا لیجئے"۔ چنانچہ دمشق سے انہیں مدینہ منتقل کر دیا گیا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ج ۴، تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۰۱، ابن اثیر ج ۳ ص ۴۳ و ص ۴۲، و انساب الاشراف نیز "ابوذر غفاریؓ" مولانا مناظر احسن گیلانی)

ان روایات کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سبائیوں کی گھڑی ہوئی ہیں! حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سامنے امیرِ معاویہؓ کی زندگی اور اُن کا طرزِ عمل بھی تھا اور ساتھ ہی آپ نے حضرت عثمان رضؓ ہی کے عہد میں اُس مالی پالیسی سے اپنے اختلاف کا اظہار فرمایا تھا۔ اور ایک بار تو حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضؓ کے درمیان تلخ کلامی تک کی نوبت آگئی (انساب الاشراف)

خلافتِ عثمانی کی مالی پالیسی کو کامیاب بنانے بلکہ اُسے پروان چڑھانے میں امیر معاویہؓ کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ تھا! اس پالیسی کے نتیجہ میں جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور جس سے طبقاتی کش مکش کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اُس کو دُور کرنے کے لئے امیر معاویہؓ کی معزولی کیا ضروری نہ تھی؟

(۳) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں حکومت کی مشین کا ایک ایک پُرزہ چُست اور کسا ہوا تھا، اس لئے "کسرائے عرب" (امیر معاویہؓ) اپنے حدود سے تجاوز نہ کر سکے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ڈھیل پیدا ہو گئی تھی، جس کے سبب امیر معاویہؓ کی زندگی اور طرزِ حکومت میں "امارتِ خلافتِ اسلامی" کی سادگی کی جگہ خاصہ ترفہ اور آرائش و زیبائی پیدا ہو گئی اس لئے حضرت علیؓ نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی "کسرائے عرب" کو معزول کر دیا کہ حضرت علیؓ اپنی ذات سے اسلام کی سادگی کا مقدس پیکر تھے اور آپؓ حکومت کے عمال اور اپنے رفقاءِ کار کو اسلام کی سادگی کی زندہ تصویر دیکھنا چاہتے تھے!

(۴) امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جس انداز میں خلافت کو ملوکیت سے بدلا ہے، اور اپنے نا اہل فرزند یزید کی ولی عہدی کے لئے جو ترکیبیں اختیار کی ہیں، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم معزولی کو جائز ثابت کرتی ہیں کہ علی مرتضیٰؓ کی فراست، امیر معاویہؓ کے بارے میں صحیح اندازہ کر چکی تھی کہ برسوں کی گورنری نے اُن میں حکومت و فرمانروائی سے ذاتی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

یہ تھے امیر معاویہؓ کی معزولی کے اہم اسباب جو بیان کر دیئے گئے، کیا اس کے بعد بھی آپ کا یہی خیال ہے کہ۔۔

"مطلق العنانی اور لاقانونیت کی تائید کی جا رہی ہے!"

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

حضرت علیؓ کا اقدام عزل حضرت معاویہؓ کی سرتابی کا سبب بنا تھا"۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ تو کیا آپ ۔۔۔

یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام شرعی احکام کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کو اپنا عہدہ زیادہ عزیز تھا! میری رائے تو یہی ہے، گو آپ اس سے اختلاف کریں گے، میں اپنی رائے کی تائید میں صرف اتنا ہی اشارہ کافی سمجھتا ہوں کہ صرف چار ہی سال کے بعد امیر معاویہؓ حکومت کے فرمانروا بن جاتے ہیں مگر نہ سازشیں و مجرمین کی گرفتاری عمل میں آتی ہے، نہ قاتلانِ عثمان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور نہ تاریخ میں کسی ایسی عدالت کا تذکرہ کہیں ملتا ہے ۔۔۔۔۔۔ کیا چار سال کے عرصہ میں وہ تمام افراد جن میں تین ہزار تو وہ تھے جنہوں نے مدینہ پر یورش کی تھی مر چکے تھے؟ یا جنگ جمل و صفین میں قتل ہو چکے تھے؟ اور کیا اس کی رپورٹ امیر معاویہؓ کو مل چکی تھی جس کی بنا پر گرفتاری یا کسی قسم کی کارروائی کی نوبت نہیں آئی؟ یا کیا شرعی قانون کی رُو سے قصاص کی میعاد گزر چکی تھی۔

آگے چل کر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ۔۔۔۔۔ اگر حضرت امیر معاویہؓ اور ان کے ہم نواؤں کا تعاون ملک و ملت کے لئے مفید ہوتا تو انہیں معزول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔۔۔۔۔۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا صُورتِ حال یہی ہے، امیر معاویہؓ ملوکیت کے اشہب خوش خرام کو تو ضرور چلا سکتے تھے مگر ادارۂ خلافت کے چلانے کی مطلوب اہلیت اُن میں نہ تھی، اُن کا بیس سالہ عہدِ حکومت خود اس حقیقت پر شاہد ہے، کیا وہ اپنے مقاصد، روح، تنظیم اور نتائج کے لحاظ سے خلافتِ راشدہ کہلانے کا مستحق ہے! ملوکیت کی راہ دُنیا کے ہر گوشہ میں پہلے ہی سے ہموار تھی، مگر خلافت علیٰ منہاج النبوت کا چلانا انتہائی بے نفس، فقر سرشت اور سادہ مزاج نفوس قدسیہ کا حصہ تھا۔ بلکہ اُن کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "بیعت کرنے والا ظالم ہوتا ہے، خلیفہ بنتے ہی نزاع اور جنگ کی ت ۔۔۔۔۔۔ اگر میں اس بات کو کہ نزاع اور جنگ کی

ابتدا حضرت علیؓ نے کی ـــــــــ کذب پر محمول کروں تو غلط نہیں ہے، کیا حضرت عثمانؓ کی موت بستر پر واقع ہوئی تھی؟ کیا آپ کو اُس فتنہ و فساد کی سرے سے خبر ہی نہیں ہے، جو حضرت عثمان رضؓ کی شہادت پر منتج ہوا؟ اور کیا آپ کو اس کی اطلاع نہیں ملی کہ حضرت علی رضؓ کے حکم معزولی کے پہونچنے سے پہلے ہی امیر معاویہؓ نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

صفحہ ۳۶ پر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس حکم (معزولی) کو مان لینے کا مطلب یہ تھا کہ معاویہؓ اُس گروہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے، جس نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا تھا"۔ تو کیا آپ کا خیال ہے کہ قصاص کا تعلق خلافت کے بجائے امیر معاویہؓ سے تھا؟ یا کیا امیر معاویہؓ کو قبل از وقت یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ حضرت علیؓ قصاص نہیں لیں گے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو پھر آپ عبداللہ ابن عمرؓ کے اقدام کو صحیح قرار دیں گے جنھوں نے اپنے طور پر اپنے والد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے بدلے لیا؟ اور اگر آپ دوسری بات کو صحیح مانتے ہیں تو اس کے لیے واضح ثبوت چاہیے۔

آپ نے متعدد بار امیر معاویہؓ کے متعلق تحریر فرمایا ہے ـــــــــ "معظم صحابی، فکر و تدبر کے ایک معروف پیکر وغیرہ" (ص۲۵) جس طرح قرآنِ پاک میں بعض اجل صحابہ کی تعریف اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کی قدر شناسی کے اشارے نکلتے ہیں، کیا کلامِ پاک میں امیر معاویہؓ کی عظمت متعلق آپ نے کوئی اشارہ پایا ہے؟ یقیناً نہیں! احادیث کے ذخیروں میں اُن کے بارے میں آپ کو کتنی حدیثیں ملیں! میرا مطالعہ اتنا وسیع نہیں مگر مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا کی ـــــــ "اے اللہ! معاویہؓ کو ہدایت کرنے والا اور ہدایت پانے والا بنا دے" اور یہ کہ "یا اللہ! معاویہؓ کو حساب و کتاب کا علم دے اور اُس کو عذاب سے بچا"۔ اگر ان کے علاوہ آپ کے علم میں ایسی احادیث ہوں تو ضرور پیش فرمائیں، اور اس کا بھی ضرور جائزہ لیں کہ اسناد کے اعتبار سے وہ اس حدیث سے قوی تر ہیں، جو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت سے متعلق وارد ہوئی ہے۔ جس کی بنا پر حضرت امیر معاویہؓ کا شمار "طائفہ باغیہ" میں ہوتا ہے۔

امیر معاویہؓ کی صحابیت کا شرف اپنی جگہ ثابت ہے، مگر اس شرف میں ہر درجہ کے ہزارہا اصحاب رسول شریک ہیں، اور اُن اصحاب کے درجات و حالات موضوعِ بحث و گفتگو نہیں بنتے! امیر معاویہؓ کا معاملہ اُن عام اصحاب رسولؐ سے بالکل مختلف ہے، امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں وہ صحابی رسولؐ ہے، جو خلیفہ راشد ہے اور عشرہ مبشرہ، سابقون الاولون میں اور بدریین میں جس کا شمار ہوتا ہے، اور جس کی پوری زندگی معیت رسولؐ اور خدمتِ نبویؐ میں گزری ہے، جس کا فقر، سادگی، اخلاص للہیت خدا ترسی، زہد اور بے نفسی سب کے نزدیک مسلّم اور معروف ہے! اس کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کو جب "عظیم و جلیل" کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو عجب قسم کی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔

اب رہیں امیر معاویہؓ کی فتوحات اور اُن کے جنگی کارنامے تو عہد فاروقی میں قیساریہ کی تسخیر اور عہدِ ثانی میں ایشیائے کوچک کا ایک حصہ اور قبرص کی فتح اُن سے ضرور منسوب ہے! اس میدان میں بھی حضرت خالدؓ حضرت سعدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ سے اُن کا کیا مقابلہ؟ یہ تو اتنے بھی نہیں کہ عبداللہ ابن عامر اور عبداللہ بن ابی سرح کے جنگی کارناموں کے مقابلہ میں پیش کیے جا سکیں! گورنری کے زمانہ میں امیر معاویہؓ کے جنگی کارناموں کا جتنا کریڈٹ امیر معاویہؓ کو جائے گا، اُس سے زیادہ مرکزی تنظیم قدر و ستائش کی مستحق ہے جس کے تحت وہ کام کر رہے تھے۔ اُن کے اپنے عہدِ حکومت میں جو کچھ انھوں نے کیا، وہ مختصراً یہ ہے کہ مشرق میں افغانستان کا ایک مختصر سا حصہ فتح ہوا۔ سندھ اور بلوچستان کی مہم نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی، مغرب میں سوڈان کے دو شہر فتح ہوئے اور مراکش کا ایک حصہ! اس کے علاوہ مشرق و مغرب میں جنگوں کے جو تذکرے ملتے ہیں اُن کا تعلق فتوحات سے نہیں بلکہ بغاوتوں کے استیصال سے ہے! اس کے بعد اُن کے عہد کی ایک قابل ذکر مہم قسطنطنیہ کی مہم ہے جو بُری طرح ناکام رہی، اس سے اُن کی جنگی بصیرت و تدبر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ساتھ ہی یہ کل کارنامے بیس سال کی طویل مدت میں انجام پائے!

تاریخوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے گرمائی اور سرمائی فوجیں تیار کی تھیں، مگر وہ کیا کرتی تھیں؟ معلوم نہیں اگر آپ کے علم میں ان فوجوں کے کچھ ایسے کارنامے ہوں، تو پیش فرمائیں، یقیناً وہ جدید تحقیق ہوگی۔

حضرت امیر معاویہ رضؓ نے نظامِ حکومت کے اندر حجابت کا عہدہ ضرور قائم کیا تاکہ وہ عوام اور خلیفہ کے درمیان واسطہ بنے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے کچھ کارنامے ہی نہیں ہیں۔ چند نہریں انھوں نے کھُدوائی ہیں اور ایک نیا محکمہ دیوان خاتم بھی قائم کیا ہے، مگر اس طویل عرصہ حکومت کے لحاظ سے اور دوسرے اصحاب رسول کے کارناموں کے پیش نظر ان کی آخر کس قدر قدر و قیمت متعین کی جاسکتی ہے؟ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُن کے عہد حکومت کی خوبی یہ ہے کہ امن و امان قائم رہا تو میں عرض کروں گا کہ اُس امن و امان کے قیام میں جتنا اُن کے تدبر کو دخل رہا ہے اُس سے زیادہ اصحاب کے اخلاص کو ہے جو مسلمانوں کی خونریزی کے خوف سے ملوکی انداز کی حکومت کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسن رضؓ نے دست بردار ہو کر اور دوسرے حضرات نے مکمل اطاعت کا اظہار کر کے بہت اچھا کیا تاکہ امیر معاویہ رضؓ اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بغیر کسی رکاوٹ کے، بروئے کار لاسکیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ زیادہ الجھ جاتی اور حضرت علی رضؓ۔ حضرت حسن رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کے موقف صد درجہ مشتبہ اور کمزور معلوم ہونے لگتے۔ لوگ یہ گمان کرتے ... کہ امیر معاویہ رضؓ زیادہ مدبر اور مذہب و ملت کے لئے زیادہ مفید تھے اگر اقتدار اُن کے ہاتھ میں آجاتا تو خلافتِ راشدہ کی زندگی دراز ہو جاتی۔ مگر اب اس قسم کے کسی گمان کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ موروثی حکومت کا قیام تھا اور اُن کا صرف یہی ایک کارنامہ سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ ایسی صورت میں حضرت علی رضؓ۔ حضرت حسن رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کے موقف کی توجیہ دشوار نہ رہی اور وہ ہر انصاف پسند کو مبنی بر حق نظر آنے لگے۔

بات بہت طویل ہو گئی اس لئے حضرت حسین رضؓ کے موقف سے بحث و تمحیص کی زیادہ گنجائش نہ رہی۔ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

امیر معاویہ رضؓ کا عہد "انتظار کرو اور دیکھو" کا عہد تھا۔ جب ملوکیت کے قیام کا خدشہ حقیقت کا جامہ پہن کر سامنے آگیا تو پھر حضرت امام حسین رضؓ کے لئے کوئی چارہ نہ رہا سوائے اس کے کہ یہ گاڑی جو چل پڑی ہے اُس کے رُخ کو موڑنے کی کوشش کریں۔ حجاز کی سرزمین کو آپ نے اپنے مقصد کے لئے ہموار پایا (اس کا ثبوت ابھی پیش کرتا ہوں) اب قدرتی طور پر دُنیائے اسلام کے دوسرے حصہ کی طرف آپ کی نگاہ اُٹھی۔ کوفہ سے خطوط آرہے تھے اور وہاں کے لوگ یزیدیت سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے چنانچہ آپ نے پہلے اُسی طرف کا رُخ کیا اور صرف بہتر آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ راستہ میں یزید کی فوج نے آپ کا راستہ روک لیا اور مجبور کیا کہ آپ بیعت کریں۔ بیعت کے علاوہ کسی دوسری شرط کو قبول کرنے کے لئے وہ لوگ تیار نہ ہوتے۔ حضرت حسین رضؓ اُس طرزِ حکومت پر جواز کی مہر ثبت کرنے کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا آپ نے انکار کیا۔ انھوں نے جنگی کارروائی کی۔ آپ نے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔

آپ نے جو یہ فرمایا کہ "اصلاح کی تدبیریں ممکن تھیں" (ص ۲۴) تو کیا آپ نے یہ خیال فرمالیا کہ حضرت حسین رضؓ بہتر آدمیوں کے ساتھ جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ لڑائی کے لئے نکلے تھے؟ سمجھنے کے لئے بات بالکل واضح ہے۔ جب آپ نے حجاز کو اپنے مقصد کے لئے ہموار پایا تو کوفہ کا رُخ کیا تاکہ اُس کو اپنی تحریک کا مرکز بنائیں۔ حجاز کے ہموار ہونے کا کھلا ثبوت حضرت عبداللہ ابن زبیر کا یزید کے خلاف خروج ہے۔ اس واقعہ کو کوئی حق شناس یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کرسکتا کہ عبداللہ ابن زبیر رضؓ اور چند دیگر سر پھروں کی یہ فتنہ پردازی تھی اور یہ واقعہ سانحہ کربلا کے دو سال بعد پیش آیا ہے اس لئے اس کا اُس سانحہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر اس کے اسباب تو متعین کرنے ہی ہوں گے۔ کیا کوئی صحیح الدماغ آدمی یہ تسلیم کرسکتا ہے کہ محض عبداللہ ابن زبیر رضؓ کے بھڑکانے کی وجہ سے پورا حجاز یک وقت خروج پر آمادہ ہو گیا اور باستثناء چند پوری آبادی نے خلع بیعت کا اعلان کر دیا؟ یہ یزید کی مقبولیت عام کا کونسا مظاہرہ تھا؟ پھر یہ خروج اتنا شدید کہ سخت قسم کی فوجی کارروائی کرنی پڑی۔

تین دن کے لئے مدینۃ النبی کی حرمت اٹھادی گئی اور وہ سب کچھ پیش آیا جس کی توقع خدا ترس مسلمانوں سے نہیں کی جاسکتی۔ آخر مدینۃ النبی سے اُنس ظاہر کرنے کی یہ کونسی قسم تھی؟ (خلافت معاویہؓ و یزید ص۱۶۲) اصحاب رسولؐ جو واقعہ حرہ میں شہید ہوئے اُن کی کم از کم تعداد اسّی ہے اور قریش و انصار کی تعداد سات سو۔ شہداء کی کل تعداد ہزاروں پر مشتمل ہے (ملاحظہ ہو التنبیہ والاشراف ص۱۶۷، ابن اثیر ص۴۲۳ تا ص۴۵۰ الامامت والسیاست ص۲۲۳ تا ص۲۲۸، تاریخ الخلفاء ص۱۳۶، نیز طبری و مروج الذہب) اس دہشت گردی کے بعد بزور شمشیر یزید کے لئے بیعت لی جاتی ہے اور بیعت کتاب و سنت پر نہیں بلکہ اس بات پر کہ وہ سب کے سب یزید کے "قین" یعنی خاندانی غلام ہیں۔ آخر ان تمام روایات کی تکذیب کے لئے تاریخ میں کونسی بنیاد موجود ہے؟ اس کے بعد مکہ پر فوج کشی ہوتی ہے مگر قبل اس کے کہ یہ مہم تکمیل تک پہنچے یزید مرجاتا ہے۔ کیا یہ تمام واقعات اُس غم و غصہ اور حقارت و نفرت کے اُس جذبہ کو ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں جو اہل حجاز کے دلوں میں یزید کے خلاف پایا جاتا تھا؟ یہیں یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ کیوں بعض صحابہؓ نے حضرت حسینؓ کو کوفہ جانے سے منع کیا؟ اس سے یہ استدلال کرنا کہ یزید کی امارت کو مقبولیت عام حاصل ہوچکی تھی اور صحابہؓ حضرت حسینؓ کے خروج کو صحیح نہیں سمجھ رہے تھے تاریخ پر صریح اور کھلا ہوا ظلم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جملہ صحابہؓ نے منع نہیں کیا۔ ہاں بعض نے منع کیا۔ اُن کے پیش نظر یہ بات تھی کہ حجاز کی سرزمین زیادہ موزوں ہے اس لئے اسی کو تحریک کا مرکز بنایا جائے۔ بعض نے یمن کی رائے دی۔ مگر حضرت حسینؓ نے کوفہ کو پسند کیا۔

آپ نے جناب عبدالمغنی صاحب کی چھٹی شق کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے کہ "وضاحت طلب ہے"۔ آخر اس میں کونسا ابہام ہے؟ کیا کوئی ایسا طرز حکومت بھی ہے جو خدا اور رسولؐ کے نزدیک پسندیدہ ہو؟ جو اسلامی رُوح کے عین مطابق ہو؟ عام مسلمانوں کے نزدیک وہ خلافت راشدہ ہے۔ یزید کی حکومت اُس کے برعکس اور اس سے منحرف ہے۔ اگر حضرت حسینؓ یزید کی بیعت کرکے اس طرز حکومت پر اپنی رضامندی کا اظہار فرمادیتے اور اہل حجاز اپنی اُس بیزاری کا اظہار نہ کرتے، تو پھر کیا بات آخر باقی رہ جاتی جس کی بنا پر خلافت راشدہ کو مثالی حکومت کہا جاتا؟ اور پھر ملوکیت کو عین اسلامی حکومت قرار دینے میں کون سی چیز مانع آتی؟ نیز ولید، ہارون رشید اور مامون رشید کی حکومت کو خلافت راشدہ کہنے میں کیا قباحت لازم آتی؟ جب موروثی شخصی اور مطلق العنان حکومت کی گنجائش اسلام ہی میں نکال لی جاتی تو پھر کسی طرز حکومت کو غیر اسلامی کہنے اور اُسے تبدیل کرنے کی کیا خاص بنیاد ... باقی رہ جاتی؟ ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرلینا ہی پڑتا کہ دُنیا کے سیاسی نظام کے اندر اسلام نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ آپ نے جو اس سلسلہ میں شخصیت پرستی اور روایات سے متاثر ہوجانے کا الزام عائد کیا ہے وہ حد درجہ خطرناک ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنی ایک نئی تحقیق پیش کرتا ہے کہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت حد درجہ نامقبول تھی اور آپ کے انتخاب میں رائے عامہ کو کوئی دخل نہ تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت سعدؓ ابن عبادہ نے بیعت نہیں کی اور وہ تمام انصار کی نیابت کررہے تھے۔ حضرت علیؓ نے[1] بیعت نہیں کی اور بنو ہاشم نیز اُن کے حلیفوں کی نیابت کررہے تھے۔ سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ کی خلافت کی خبر سنتے ہی پورے عرب نے بیک وقت بغاوت کا اعلان کردیا۔ یہ یقینی بات ہے کہ آپ اس تحقیق پر اپنا سر پیٹ لیں گے۔ اس کی تردید میں احادیث لائیں گے۔ تاریخ کی روایات پیش کریں گے۔ وہ چند احادیث کو تو یہ کہہ کر رد کردے گا کہ کلام کی گنجائش ہے۔ چند کے بارے میں یہ کہے گا کہ یہ فضائل سے متعلق ہیں زیر بحث مسئلہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم اُن کی فضیلت کے منکر نہیں ہیں۔ تاریخی روایات کے متعلق جواب دے گا کہ ان تمام کی بنیاد صرف دو کتابیں ہیں جو جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ بعد کے مؤرخین نے اُن کی محض اندھی تقلید کی ہے۔ آپ تمام لوگ کثرت روایات سے متاثر ہوئے ہیں اور شخصیت پرستی میں مبتلا ہیں۔

[1] یعنی فوراً بیعت نہیں کی قدرے تاخیر سے کی (م۔ق)

(بقیہ مضمون ص[illegible] پر)

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
آدم جی کاٹن ملز، لانڈھی، کراچی

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی
ایم۔ اے

شیخ عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ

اکابر اسلام میں ایسی شخصیتیں بہت کم ہیں جو شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاریؒ کی طرح ایک طرف صوفی اور شاعر کی حیثیت سے اور دوسری طرف مفسر و محدث کی حیثیت سے مشہور ہوں۔ شیخ کے حالات اور تصنیف پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر صوفی اور تصوف کے ماخذ۔ تصوف کی اصل اور مفہوم کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے۔ ان الفاظ کے اشتقاق کے متعلق بہت کچھ[1] اختلاف آرا ہے۔ مگر اکثر حضرات کا خیال ہے کہ صوفی اور تصوف ،صوف سے مشتق ہیں۔ اور چونکہ یہ بزرگ موٹا اُون پہنتے تھے اس لئے اس نام[2] سے موسوم ہوئے۔ "پشمینہ پوش" کا لقب بھی اسی کا مؤید ہے۔ تصوف کا آغاز کیوں کر ہوا۔ اس کے متعلق بھی رائیں بہت کچھ مختلف ہیں۔ کوئی اس کا رشتہ یونان سے جوڑتا ہے۔ کوئی، ہند و ایران سے۔ لیکن ممتاز صوفیہ مثلاً شیخ ابو النصر سراج۔ امام ابو القاسم قشیری۔ شیخ علی بن عثمان ہجویری وغیرہم کا بیان ہے کہ تصوف[3] دراصل تعلیمات اسلامی ہی سے ماخوذ ہے۔ اور اہل البیت ابصر بما فی البیت کے مطابق اگر اس نقطۂ خیال کو مان لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے تصوف کی تعریف بھی ہر ایک نے اپنے مذاق کی رعایت سے کی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔

التصوف ہو تصحیح الخیال (تصوف خیال کی درستی کا نام ہے)

ابن الجلال الدمشقی کہتے ہیں۔ التصوف حقیقۃٌ لارسمٌ (تصوف حقیقت ہے۔ رسم نہیں)۔ علیٰ ہذا

ابن السماک ۔ التصوف ترک التکلف (تصوف تصنع کو ترک کرنے کا نام ہے)

ابو علی قزوینی ۔ التصوف ہو الاخلاق الرضیۃ (تصوف پسندیدہ اخلاق کو کہتے ہیں)

امام غزالی ۔ التصوف ہو التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ (تصوف خدا کے حکم کی تعظیم اور اس کے مخلوق پر شفقت سے عبارت ہے)

مولانا تھانوی ۔ التصوف تعمیر الظاہر والباطن (تصوف سے ظاہر و باطن کی تعمیر مراد ہے)

ان حضرات کے برخلاف پروفیسر براؤن نے تصوف کو واضح تحریک کی بجائے "ایک غیر واضح سکون" قرار دیا ہے۔

ممکن ہے کہ براؤن کی یہ تعریف بہت سے بعد کے صوفیہ پر صادق آئے۔ مگر شیخ عبداللہ انصاری کی ذات جن کا نام نامی عنوان کی زینت

---

[1] تصوف کے اشتقاق کے سلسلے میں آٹھ اقوال پیش کئے جاتے ہیں جن کو بخوف طوالت نظر انداز کیا گیا۔

[2] یہ الفاظ قرآن و حدیث میں نہیں آئے ہیں۔ ایک حدیث بعض لوگوں نے بیان کی ہے مگر اس کی صحت مشتبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے اپنے والی مدینہ ابن ام الحکم کو خط لکھتے ہوئے ایک شعر کے اندر لفظ صوفی استعمال کیا (مصارع العشاق) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں صحابی اور تابعی کا لقب ایک مسلمان کے امتیاز کے لئے کافی تھا۔ بعد کے زمانے میں جن بزرگوں نے (انکی تعداد کافی ہے) حکومت وقت سے علیحدگی اختیار کی اور زہد و عبادت کی زندگی پسند کی انکو امتیاز کے لئے صوفی کہنے لگے۔ مفسر۔ محدث۔ فقیہ کے القاب اور ان کی مخصوص اصطلاحات بھی تو آخر عہد سعادت و خلافت راشدہ کے بعد وضع کی گئی ہیں۔

[3] ہماری مراد اس تصوف سے ہے جو کتاب و سنت سے معارض نہ ہو۔ اس سلسلے میں اہل علم۔ نیز مستشرقین نے جو دلائل اور مباحث چھیڑے ہیں ان سے ہم صرف نظر کرتے ہیں۔

ہے۔ عام صوفیوں سے بہت ممتاز نظر آتی ہے۔ شیخ موصوف بیک وقت ایک بڑے صوفی۔ ایک فاضل مفسر۔ ایک نامور محدث۔ ایک جادو بیان واعظ۔ ایک بلند پایہ شاعر اور ایک زبردست مصنف ہیں۔ ان کا پورا نام ابو اسمٰعیل عبداللہ بن ابی منصور محمد انصاری ہے۔ شیخ کی ولادت کہن دز (ہرات) میں ۳۹۶ھ ہجری مطابق ۱۰۰۶ء عیسوی میں واقع ہوئی۔ وہ پیر انصار اور پیر ہرات کے القاب سے مشہور ہیں۔ خود مقطعوں میں کہیں پیر انصار۔ کہیں انصاری۔ کہیں عبداللہ بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ وہ عربی النسل اور صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں ہیں۔ ان کے بزرگ ہرات میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ شیخ کے والد ابو منصور محمد بھی ایک متقی بزرگ تھے چنانچہ انھوں نے ابتدائی روحانی تربیت انہیں سے حاصل کی تعلیم اور علمی مدارج۔ شیخ موصوف نے اپنے عہد کے مشاہیر علماء مثلاً ابو منصور ازدی۔ ابو الفضل جارودی اور یحیٰی بن عمار سے اکتساب علم کیا اور چودہ برس کی عمر میں مختلف علوم میں سرآمد روزگار ہو گئے۔ مگر ہنوز علم کی پیاس باقی تھی۔ چنانچہ نیشاپور تشریف لے گئے اور وہاں کے علما سے سند فراغ لی۔ وہ شروع میں شافعی المذہب تھے مگر رائے و قیاس کے مقابلے میں حدیث کی طرف زیادہ میلان تھا۔ اس بنا پر حنبلی مذہب اختیار کیا[1]۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً محدث تھے لیکن تصوف کے رجحان کے باعث صوفی مشہور ہوئے۔ ان کے برخلاف علامہ ابن قیم طبعاً صوفی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ حدیث کی مزاولت کی وجہ سے محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

صوفیہ میں ایسے حضرات کم ہوئے ہیں جن کو علما کے حلقے میں اس قدر قبول عام حاصل ہوا ہو۔ علامہ سیوطی نے طبقات المفسرین میں شیخ کا ذکر کیا اور ان کو الحافظ العارف کے القاب سے یاد فرمایا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حق میں ذیل کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ الحافظ الامام الزاہد البارع فی اللغۃ الحافظ للحدیث (وہ حافظ۔ امام اور زاہد۔ لغت کے ماہر اور حدیث کے حافظ ہیں) اور وعظ و تصوف میں ان کا کمال تسلیم کیا ہے۔ شیخ عبدالغافر لکھتے ہیں کان اماماً کاملاً فی التفسیر حسن السیرۃ فی التصوف علی حظ تام من معرفۃ العربیۃ والحدیث والتواریخ والانساب قائماً بنصر السنۃ والدین من غیر مداہنۃ ولا مراقبۃ لسلطان ولا غیرہ (وہ ایسے امام تھے جو تفسیر میں کامل۔ تصوف میں نیکنام۔ عربیت۔ حدیث۔ علم تواریخ اور علم انساب میں ماہر اور سنت و دین کی حمایت میں مستعد تھے۔ اور مذہب کے معاملے میں سلطان وغیرہ کی پروا نہ کرتے تھے) وہ جب تفسیر کا درس دیتے تھے تو بڑے بڑے اہل علم ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ میں تفسیر قرآن کے وقت ۷۰ تفاسیر کے مطالب پیش نظر رکھتا ہوں۔ اُن کے علم تفسیر کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے آیہ کریمہ اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَہُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤی ۙ اُولٰٓئِکَ عَنۡہَا مُبۡعَدُوۡنَ کی تشریح ۳۶۰ جلسوں میں ختم کی تھی۔ خود ان کے اُستاد تفسیر شیخ یحیٰی فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ ایک دن اپنے زمانے کے امام ہوں گے۔ حدیث میں بھی شیخ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ علامہ ذہبی کی شہادت اوپر گزری۔ علامہ موصوف عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان کا اس طرح کسی کو خراج عقیدت پیش کرنا یقیناً ایک مزیت کبریٰ ہے۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ شیخ عبداللہ کو تین لاکھ احادیث مع اسناد یاد تھیں۔ حدیث کا درس و تدریس۔ اور سماعت و روایت ان کا عزیز ترین مشغلہ تھا۔ سُنت سے اس درجہ شغف تھا کہ اسی بنا پر حنبلی طریقہ اختیار کیا اور اہل الرائے اور علمائے کلام کو ہدف ملامت بنایا۔ حنبلیت سے جو عشق ان کو تھا ان کو تھا اس کی ترجمانی کے لئے اُن کا شعر ذیل کافی ہے ؎

انا حنبلیٌ ما حییتُ وان اَمُت   فوصیتی للناس ان یتحنبلوا

(میں جب تک زندہ رہوں حنبلی رہوں گا۔ اور اگر مر جاؤں تو میری وصیت لوگوں کو یہ ہے کہ حنبلی مذہب اختیار کریں)

---

[1] معلوم ہوا کہ اس خاندان کی ایک شاخ ہندوستان میں ہے [illegible] اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دوسرے ائمہ مجتہدین کے یہاں معاذاللہ سنت و حدیث کی اہمیت نہیں ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ حنابلہ کے یہاں قیاس و تاویل کا دخل کم ہے۔ مشہور ہے کہ امام احمد نے صرف دو حدیثوں میں تاویل کو دخل دیا ہے [illegible] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنبلیت سے عشق ان کو اپنے شیخ ابو حاتم سے ورثہ میں ملا تھا ان کا قول من لم یکن حنبلیاً فلیس بمسلم (جو حنبلی نہیں وہ مسلمان نہیں) مشہور ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ کسی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے دریافت کیا [illegible] علی غیر طریق الامام احمد بن حنبل [illegible]

اس موقع پہ بے محل نہ ہوگا اگر حنبلی مذہب اور اس کے محترم بانی کے بارے میں چند جملے سپرد قلم کر دیئے جائیں۔

سب جانتے ہیں کہ اہل سنت کے نزدیک ادلۂ اربعہ (قرآن۔ حدیث۔ اجماع۔ قیاس) پر احکام شریعت کا مدار ہے۔ انہیں چار سے امام ابوحنیفہ۔ امام مالک۔ امام شافعی۔ اور امام احمد نے مسائل کا استخراج و استنباط کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی امام کے یہاں قیاس یا رائے کا دخل زیادہ ہے کسی کے یہاں کم۔ لیکن زیادہ ہو یا کم۔ ایسا نہیں ہے کہ ان بزرگوں میں سے کسی نے نص صریح کے ہوتے ہوتے دیدہ و دانستہ قیاس کو ترجیح دی ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی کو ایک مسئلے میں حدیث ہی نہیں پہونچی۔ یا پہونچی مگر پایۂ استناد سے ساقط معلوم ہوئی یا اس کی تعبیر دوسروں سے مختلف ذہن میں آئی۔ ورنہ اس خصوص میں امام اعظم کا ارشاد اذا صح الحدیث فہو مذہبی (جب کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے) امام مالک کا اعلان کہ ہر شخص سے اس کے قول پر جواب طلب ہوگا بجز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے امام شافعی کا فرمان کہ اگر میرا قول حدیث نبوی کے خلاف ہو تو میرے قول کو دیوار سے مار دو۔ امام احمد کا بیان ہے کہ مجھے کتاب و سنت کی دلیل دو تو مانوں ہمارے دعوے کے اثبات کے لئے کافی ہیں۔

امام احمد ہی سے حنبلی دبستان فکر منسوب ہے۔ (۱۶۴۔ ۲۴۱ ہجری) زمانے کے لحاظ سے چاروں میں متاخر ہیں۔ آپ حدیث و فقہ کے امام۔ جناب شافعی کے شاگرد اور بخاری۔ مسلم اور ابوداؤد جیسے مسلّم الثبوت محدثین کے استاد ہیں۔

آپ کا علم و عمل۔ زہد و تقویٰ۔ معتزلی خلفائے عباسیہ کے مظالم پر ثبات قدم کسی سے مخفی نہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں۔ خرجت من بغداد وما خلفت بہا اتقیٰ و افقہ من ابن حنبل (میں بغداد سے اس حالت میں نکلا کہ وہاں احمد بن حنبل سے زیادہ پرہیزگار اور فقیہ کسی کو نہیں چھوڑا) آپ کے ایک معاصر کا بیان ہے کہ ما رایٔ احمد مثل نفسہ (احمد نے اپنا مثل نہیں دیکھا) آپ کے رفیق یحییٰ بن معین اور دوسرے اکابر نے بھی اسی طرح آپ کی مدح کی ہے۔

دنیا میں بہت سی ایسی باتیں مشہور ہو جایا کرتی ہیں جو تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ مثلاً ابوحنیفہ محدث نہ تھے۔ یا امام احمد فقیہ نہ تھے۔ یا قیاس سے (جائز حدود میں بھی) اجتناب کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ابن خلدون جیسا فلسفۂ تاریخ کا ماہر لکھتا ہے۔ فاما مذہب احمد فمقلدہ قلیل لبعد مذہبہ عن الاجتہاد واصالتہ فی معاضدۃ الروایۃ والاخبار بعضہا ببعض (مذہب احمد کے ماننے والے تھوڑے ہیں جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ مذہب اجتہاد سے دور ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اس میں ایک روایت کو (کتنی ہی ضعیف کیوں نہ ہو) دوسری روایت کے ذریعے سے تقویت دی جاتی ہے)۔ حالانکہ محمد ابو زہرہ کے قول کے مطابق حنابلہ کی تعداد کم ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مذہب سب سے متاخر ہے۔ نیز یہ لوگ امام کی تقلید میں تقرب سلطانی و خدمات شاہی سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے تھے۔

رہا یہ امر کہ امام قیاس سے کس حد تک کام لیتے تھے اس سلسلے میں علامہ ابن قیم کا قول یاد رکھنے کے قابل ہے۔ موصوف کہتے ہیں کہ فقہ حنبلی کے اصول استنباط پانچ ہیں۔ (۱) نص کتاب و سنت (۲) فتاوائے صحابہؓ (۳) صحابہؓ میں اختلاف کی صورت میں صحابی کا وہ قول جو کتاب و سنت سے قریب تر ہو۔ (۴) مرسل اور ضعیف روایات (۵) قیاس۔

امام احمد کی ذات تشدد و تعصب سے بالاتر تھی۔ بلکہ علما کا اتفاق ہے کہ عقود و شروط میں امام کے یہاں سب سے زیادہ وسعت ہے البتہ ہاں کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ بعد کے حنابلہ میں شدت و عصبیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خود ابو زہرہ لکھتے ہیں۔ ان الحنابلۃ کانوا متعصبین اشد ما یکون التعصب۔ ان میں سے اکثر حشویہ۔ مشبہہ اور مجسمہ تھے۔ اور کعت۔ واصابع و رجلین۔ صعود الی السماء۔

[illegible] تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ امام کو دس لاکھ احادیث حفظ تھیں جن سے آپ نے اپنی مسند کو مرتب کیا۔ احمد بن حنبل از ابن جوزی [illegible] مرسل۔ حدیث کی وہ قسم جس کا اسناد منقطع ہو۔ ضعیف۔ وہ حدیث جس کے راوی میں کوئی کمزوری ہو یا جو برخلاف صحیح و حسن کے ہو۔ ابن حنبل از محمد ابو زہرہ۔ حشویہ۔ فرقہ تھا جو اللہ کے ید و اصابع وغیرہ کے ظاہری معنی لیتا تھا۔ مشبہہ۔ حق تعالیٰ کو مخلوق سے مشابہہ بتانے والا فرقہ۔ مجسمہ۔ حق تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کرنے والا فرقہ۔ یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے ہاتھ۔ انگلیاں۔ پاؤں مانتے تھے۔ اسی طرح آسمان کو چڑھنا اور زمین پر اترنا تجویز کرنے والے تھے۔

نزول الی الدنیا۔ طعن الجماعۃ۔ انکار زیارۃ قبور الائمہ وغیرہ میں جمہور کی روش کے خلاف چلتے تھے اور بعض بے کار اپنے معتقدات کو ان امور سے منسوب کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مورخ ابن اثیر کے قول کے مطابق ۴۴۳ ہجری میں بغداد میں سخت فساد ہوا جس میں حنبلی مذہب والوں نے قتل وغارت میں دل کھول کے حصہ لیا۔ آمدم برسر مطلب۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں (شیخ عبداللہ کا عہد) اُس زمانے میں حنابلہ دوسرے دبستان ہائے فکر سے برسر پرخاش تھے۔ نہ صرف اہل بدعت عموماً اور جہمیہ خصوصاً (جو صفات الٰہی کی مخلوقیت کے قائل تھے) بلکہ دوسرے متکلمین جن کو وہ اہل الرائے کہتے تھے نیز اہل کلام ان کے مطاعن کا نشانہ تھے۔ شیخ عبداللہؒ کے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے تین سو شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ اور اس میں یہ التزام رکھا تھا کہ ان میں سے کوئی بدعقیدہ یا بدعتی نہ ہو۔ ان حالات کا یہ نتیجہ ہوا کہ شیخ میں اور ان کے معاصرین میں اختلاف ہوا جو بڑھتے بڑھتے مخالفت اور عداوت کے درجے کو پہنچ گیا شیخ کے حسن نیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کے مخالفین میں بھی بعض شاید نیک نیت ہوں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان منازعات نے بڑی شدت اختیار کر لی۔ شیخ ان کو مخالف سنت ٹھہراتے اور وہ شیخ کو تجسیم کا قائل بتاتے۔ بالآخر شیخ کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور تین بار جلاوطن کیا گیا۔ چونکہ اُن کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے اس لئے ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض اشاعرہ نے وزیر نظام الملک طوسی کے روبرو (جو خود مذہباً اشعری وشافعی تھا) ان کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ امام ابوالحسن اشعری کو برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں جب شیخ سے پوچھا گیا تو کہا کہ میں ابوالحسن کو نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جو خدا کے آسمان پر ہونے کا انکار کرے وہ گمراہ ہے۔ اس کے ساتھ شیخ مناظرہ کے لئے آمادہ ہوتے مگر اُن لوگوں نے راہ فرار اختیار کی۔ ایک دفعہ تو مخالفین نے غضب کیا کہ کہیں سے تانبے کا ایک چھوٹا سا بت لاکر شیخ کی جانماز کے نیچے چھپا دیا۔ اور سلطان الپ ارسلان سلجوقی سے جاکر جڑ دیا کہ وہ بت کی پوجا کرتے ہیں (اس سے یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ فرقہ مجسمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔) لیکن جب سازش کھل گئی تو اُن لوگوں کو ذلیل ہونا پڑا۔

عادات وخصائل۔ شیخ عبداللہ ایک متقی۔ عبادت گذار اور متدین بزرگ تھے۔ وہ جس بات کو حق جانتے تھے اُس سے ذرہ بھر ہٹتا۔ خوف یا لالچ سے متاثر ہونا اور سلاطین وامراء سے مرعوب ہونا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ اہل بدعت سے ان کو نفرت تھی ان کی زندگی زاہدانہ تھی اور وہ ہمیشہ روکھی سوکھی غذا اور موٹا جھوٹا کپڑا پسند فرماتے تھے۔ ہاں جب باہر نکلتے تو اعزاز دین کے خیال سے لباس فاخرہ پہن کر اور عمدہ گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے۔

شیخ صوفی کی حیثیت سے۔ ۴۲۳ھ ہجری میں شیخ حج وزیارت سے مشرف ہوئے۔ حجاز سے واپسی میں وہ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ سے ملے اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اس تعلق کا اثر اُن کی زندگی میں بہت نمایاں ہے۔ ان کے سوانح حیات نیز تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر وحدیث کے مشاغل کے بعد ان کا وقت بیشتر اپنے تزکیہ نفس اور دوسروں کی اصلاح باطن کی کوششوں میں صرف ہوتا تھا۔

اس موقع پر ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ شیخؒ کا تصوف بعد کے تصوف سے بہت مختلف تھا۔ اس میں زہد وقناعت تبتل وانقطاع کی شان تھی۔ نظریاتی اور فلسفیانہ رنگ نہ تھا۔ اس کی بنیاد کلام الٰہی واحادیث رقاق پر تھی نہ کہ خارجی اور غیر اسلامی افکار پر۔ خود حضرت رسول مقبولؐ اگرچہ دین ودنیا کے بادشاہ تھے تاہم دنیا اور مال دنیا سے دور رہنا ہی آپ کو مرغوب تھا صحابہ کرامؓ

۱۔ کامل ابن کثیر ۲۔ شذرات الذہب

۳۔ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل (دنیا میں اس طرح رہو گویا تو مسافر ہے یا راہ رو ہے۔ بخاری وترمذی) نیز فرمایا۔ مجھے دنیا سے کیا مطلب۔ میری مثال تو مسافر یا راہرو کی ہے۔ نیز دعا کی۔ پروردگار مجھے مسکین رکھ۔ مسکین مار اور مسکین اٹھا۔

میں بھی ایک گروہ (مثلاً حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت سلمانؓ۔ حضرت ابوذرؓ۔ حضرت ابوالدرداءؓ۔ حضرت حذیفہؓ نیز اصحاب صفہؓ) حضورؐ ہی کے نقش قدم پر ہمیشہ چلتا رہا۔ تابعین اور تبع تابعین کے زمرے میں بھی ایسے متعدد اکابر کے نام ملتے ہیں جو سلاطین جور کے تقرب سے بھاگتے اور زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اہل ایران کا قومی امتیاز تفکر ہے اور عرب کا عمل۔ چنانچہ ایران پہنچ کر تصوف میں بھی فکری اور خارجی عناصر شامل ہوگئے۔ اور ہر صوفی وحدۃ الوجود کی مے ہوش ربا سے سرشار نظر آنے لگا۔

قدیم تصوف کی بنیاد اُس اخلاص فی العمل پر تھی جس کو حدیث میں الاحسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ صوفیہ متقدمین کے یہاں وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کی جگہ نہ تھی۔ ہاں وہ اپنا مطلوب حقیقی صرف حق سبحانہٗ کو جانتے تھے اور فنا کا مفہوم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں گم کردینا سمجھتے تھے۔ شریعت و طریقت ان کے نزدیک دو متغایر راہیں نہ تھیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو تھے۔ غرض انکے عقیدے میں کلام الٰہی و سنّتِ رسول ہی معیار حق و ذریعہ وصول الی الحق تھے۔ دگر ہمہ ہیچ مگر اُن کے برخلاف زمانۂ مابعد کے تصوف میں اس امر پر زور دیا گیا کہ خدا کے سوا کوئی موجود نہیں۔ کائنات محض فریبِ نظر ہے یا ذات حق میں شامل ہے۔ فنا یہ ہے کہ غیر حقیقی وجود حقیقی وجود میں ضم ہوجائے۔ شریعت اور طریقت گویا دو متوازی خطوط ہیں جن کا ملنا ضروری نہیں۔ علیٰ ہذا دنیا میں اختلاف مذاہب و مسالک محض سطحی ہے۔ گویا یہ سب راہیں بالآخر ایک ہی منزل پر پہونچاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ شیخ جو صوفی ہونے کے ساتھ محدث اور حنبلی بھی تھے قدیم تصوف کے علمبردار تھے۔

تصانیف۔ شیخ نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جن کا تعلق مذہب اور تصوف سے ہے۔ انمیں سے چند مطبوعہ ہیں۔ زیادہ تر قلمی۔ یہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مناجات (یہ ملفوظات کے نام سے بھی چھپی ہے) (۲) رباعیات۔ (۳) منازل السائرین مطبوعۂ مصر۔ (۴) انوار التحقیق۔ (۵) نصیحت نامہ (۶) الٰہی نامہ۔ (۷) زاد العارفین (۸) کتاب الاسرار (۹) طبقات صوفیہ (۱۰) انیس المریدین (۱۱) اکمل الموحدین (۱۲) الاربعین (۱۳) کتاب الفاروق (۱۴) ذمّ الکلام واہلہٗ (۱۵) مناقب الامام احمد۔ شیخ کی تصانیف کے مندرجات اور اسلوب سے بحث تو بڑا وقت چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں مختصراً ہی اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔

مناجات کی فارسی نثر تکلف سے عاری اور سادہ ہے۔ انداز حد سے زیادہ دلنشین اور پُر اثر ہے۔ کہیں کہیں عبارت مقفیٰ ہے۔ مگر تصنع اور آورد کا نام نہیں۔ نثر کے ساتھ نظم کا پیوند بہت لطف دے جاتا ہے۔ براؤن نے سچ کہا ہے کہ ان مناجاتوں نے لوگوں میں تصوف و اخلاق کی رُوح پھونکنے کا حیرت انگیز کام دیا ہے۔ کچھ بعید نہیں جو دو سو برس کے بعد شیخ سعدی نے اسی اسلوب کو اپنے لئے ماڈل قرار دیا ہو۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

الٰہی ما در دنیا معصیت می کردیم' دوست تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم غمگین می شد و دشمن تو ابلیس شاد۔ الٰہی اگر فردا عقوبت کنی! دوست تو محمد اندوہ گیں شود و ابلیس شاد۔

الٰہی دو شادی بہ دشمن مدہ و دو اندوہ بر دل دوست منہ۔

الٰہی اگر یکبار گوئی بندۂ مومن از عرش بگذرد خندۂ من۔

الٰہی بیزارم ازاں طاعتے کہ عجب آرد و بندۂ آں معصیتم کہ مرا بہ عذر آرد۔

الٰہی ہمہ ترسند کہ فردا چہ خواہد شد و عبداللہ می ترسد کہ دی چہ رفت۔ اگر حساب با مایہ داران است من درویشم۔ و اگر با مفلسان است من از ہمہ بیشم۔

الٰہی چوں تراجوئیم کہ در ملکوت کمتر از موریم ۔
الٰہی دردمند آواز تو شاداست و بندہ دربند تو عزیز تر آزاداست
الٰہی اگرچہ گناہ من افزون است امّا عفو تو از حد بیرون است
الٰہی ہمہ از تو ترسند و عبداللہ از خود۔ زیرا کہ از تو نیکی آید و از عبداللہ بدی
الٰہی ابوجہل از کعبہ می آید و ابراہیم از بتخانہ ۔ کار بہ عنایت است باقی بہانہ

رباعیات ۔ مصنف اور شاعر کی حیثیت سے شیخ کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کو لڑکپن سے شاعری سے ذوق تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے عربی میں چھ ہزار شعر کہے تھے ۔ آپ کے علاوہ ان کو شعرائے عرب کے ایک لاکھ اشعار یاد تھے ۔ ان کے فارسی اشعار خصوصاً فارسی رباعیات روانی و صفائی ۔ لطافت و اثر کے لحاظ سے ادبی شاہ کار کہے جانے کے لائق ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلی صف کے قدیم رباعی نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ رباعیات ذیل سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوگی۔

جھوٹے صوفیوں کا نقشہ ۔

پوشیدہ مرقع اند این خامے چند ۔۔۔ بگرفتہ ز طامات الف لامے چند
نارفتہ رہ صدق و صفا گامے چند ۔۔۔ بدنام کنندۂ نکو نامے چند

دیگر

قومے بہ سر زبان خود در بستی ۔۔۔ صد خانۂ پُر از بتاں بشکستی
گوئی کہ بہ یک قبول شہادت رستم ۔۔۔ فردات کند خمار کامشب مستی

دیگر

عیب است بزرگ برکشیدن خود را ۔۔۔ وز جملۂ خلق برگزیدن خود را
از مردمک دیدہ بباید آموخت ۔۔۔ دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

عشق

عشق آمد و شد چو خونم اندر رگ و پوست ۔۔۔ تا کرد مرا تہی و پر کرد ز دوست
اجزائے وجودم ہمگی دوست گرفت ۔۔۔ نامیست ز من بر من و باقی ہمہ اوست

معشوق حقیقی

گر دامن دیدار تو در چنگ آید ۔۔۔ سہل است کہ پائے عمر بر سنگ آید
ہر چند گدائے کوئے عشقم حقا ۔۔۔ از جملہ جہاں بے تو مرا ننگ آید

اشعار کی خوبی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی بعض رباعیات خیام سے منسوب ہو گئی ہیں ۔
اسی سلسلے میں اکمل الموحدین پر بھی سرسری نظر ڈالتے چلئے ، یہ بھی شیخ کی طرف منسوب ہے اس کا ایک قلمی نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ کے حبیب گنج سیکشن میں موجود ہے اس کی عبارت کا انداز مناجات کی عبارت سے ملتا ہوا ہے ۔ توحید کے متعلق فرماتے ہیں ۔
توحید عام یکے شنیدن و یکے گفتن ، و توحید خاص یکے دانستن و یکے دیدن ۔ توحید درویش یکے بودن است تا بودن۔
سچے صوفی کی پہچان ۔

اگر فوت شود گنجہا وبدیشاں رسد رنجہا ونمانند کج باز وشطرنجہا، ایشاں نہ چناں مردانند کہ روے از دوست گردانند۔ نکتہ و نصیحت ایشاں تر وتازہ۔ والصابرین فی الباساء والضراء۔ اگر دوست بر دار و سکین اند واگر بگذارد بے کین اند۔ در دست ایشاں نہ خشک ونہ تر، ولله یحق وجوہہم قتر۔

رجاء وخوف کی شان۔

شیخ لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو اکثر مسکرانے کی اور حضرت یحییٰ کو رونے کی عادت تھی۔ جب حضرت حق عز اسمہ سے اس کے بارے میں رجوع کی گئی تو ارشاد ہوا۔ ما بہم عیسیٰ را دوست تر دارم ساز رجا تبسم زاید کہ عیسوی است۔ واز خوف بکا متولد شود کہ یحیائیت۔ آخر میں شیخ رائے دیتے ہیں کہ آدمی دن میں[2] حضرت عیسیٰؑ کی تقلید کرے اور رات میں جناب یحییٰؑ کی۔

(۱) منازل السائرین کو ان کی تصانیف میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ چھوٹا سا رسالہ عربی میں گویا تصوف کا عطر ہے۔ علامہ[3] ابن قیمؒ نے رسالہ مذکورہ کی شرح لکھی ہے۔

(۲) منازل السائرین اہل ہرات کی فرمائش پر لکھی گئی۔ مصنف نے اس کو دس منازل پر تقسیم کیا ہے۔ ہر منزل دس بابوں میں منقسم ہے۔ یہ وہ منازل ہیں جن سے ایک سالک کو لازمی طور پر گذرنا پڑتا ہے۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ سالک کو عموماً ابتدائی منزلوں سے گزر کے انتہائی منزلوں تک پہونچنا ہوتا ہے اگرچہ کچھ خاص بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ابتدا ہی میں انتہائی مقامات دکھا دیئے جاتے ہیں۔ تاہم دستور یہی ہے کہ جب تک ابتدائی راہیں طے نہیں ہو جاتیں انتہائی مدارج تک رسائی محال ہے جس طرح بنیاد کمزور ہونے کی صورت میں عمارت کا مستحکم ہونا غیر ممکن ہے۔ شیخ کہتے ہیں کہ بنیاد کے استحکام کے لئے اخلاص۔ اتباع سنت۔ پاسداری اوامر ونواہی۔ شفقت علی الخلق۔ مردم آزاری سے اجتناب۔ اور اضاعت وقت وفساد قلب سے احتراز لازم ہے۔

ابتدائی منازل یقظہ (بیداری) توبہ۔ محاسبہ۔ انابہ (رجوع) فکر۔ ذکر۔ اعتصام (اوامر الٰہی کو مضبوطی سے پکڑ لینا) خدا کی طرف گریز۔ ریاضت سماع (اجابت دعوت دین) ——— انتہائی منزل معرفت۔ فنا۔ بقا۔ تحقیق۔ تلبیس (یعنی بقدر ضرورت اسباب سے تعلق رکھنا) وجود حق۔ تجرید۔ تفرید۔ جمع (کائنات کے وجود کو نظر انداز کرنا) توحید۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صوفیہ کے نزدیک اکثر منتہی کو مبتدیوں کی ہدایت کی خاطر ابتدائی منازل پر اُتر آنا پڑتا ہے۔ نقل ہے کہ کسی صوفی نے کہا کہ معراج میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ملکوت کی سیر کو تشریف لے گئے اور واپس آگئے۔ اگر مجھے یہ مرتبہ میسر آتا تو میں کبھی واپس نہ آتا۔ اس پر ایک دوسرے صوفی نے کہا کہ یہی تو نبی اور غیر نبی میں فرق ہے۔ نبی خود کامل ہوتے ہیں مگر ناقصوں کی تکمیل کی خاطر ان کو دنیا کی طرف لوٹ کر آنا پڑتا ہے۔ جان عشاق فدائے تو کہ بازآمدہ آخر شیخ عبداللہ نے ۴۸۱ ہجری میں سفر آخرت فرمایا اور ہرات میں مدفون ہوئے۔

(ہندی انجمن روابط ثقافتی دہلی کے شکریہ کے ساتھ)

---

[1] ان کے چہروں پر گرد وغبار نہیں چھاتا۔ [2] شاعر نے حضرت علیؓ کی مدح میں ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے۔

هو البكاء في المحراب ليلاً　　　هو الضحاك في يوم الطعان

وہ رات کو محراب میں زار زار روتے اور جنگ کے دن خوب قہقہے لگاتے ہیں

[3] تعجب ہے کہ حافظ ذہبی نے اس بہرہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس کے مسائل علمائے سلف کے خلاف ہیں۔ [4] منازل السائرین تصوف کے عمیق افکار، نفسیاتی تجزیہ، اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے بلند مرتبہ تصنیف ہے۔ مثالیں طوالت کے خوف سے ترک کی جاتی ہیں۔ [5] محمود شبستری نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

وقد سألوا وقالوا ما النهايه　　　فقيل هي الرجوع الى البدايه

(لوگوں نے سوال کیا کہ تصوف کی انتہائی منزل کیا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ابتدائی منزل کی طرف واپس آنا)

نیرنگیٔ دوراں

صباجائسی

میں نے جو خواب سا دیکھا تھا کبھی اے ہمدم
تیری معصوم نگاہی ہے اسی کی تعبیر
میں نے جو حادثۂ غم سے تغافل برتا
تیری دزدیدہ نگاہی ہے اسی کی تفسیر
حدِ فاصل ہو گئی ہوش و جنوں کی میرے
تیری آنکھوں میں جھلکتی ہو جو کاجل کی لکیر
اس پہ نیرنگیٔ دوراں کا تماشا کیا خوب!
نہ میں تقدیر ہوں تیری نہ تو میری تقدیر

بات کرو

ابوسعید حیرت جلال پوری

صدف کی بات کرو یا گہر کی بات کرو
جو بن پڑے تو کسی چشم تر کی بات کرو
عجب نہیں ہے دمک اٹھے پھر جبین نیاز
نیاز مند کسی سنگِ در کی بات کرو
حدیثِ عقل و خرد کا یہاں مقام نہیں
حریم عشق میں قلب و نظر کی بات کرو
یہ ذکر تیرہ شبی بے محل ہوا اب اے دوست
فروغ شعلۂ داغ جگر کی بات کرو
فسانے اب نہ سناؤ شکستہ پائی کے
فرازِ عرش بریں کے سفر کی بات کرو
ہزار زد میں زمانہ ہو ظلمت شب کی
سحر پسند وا طلوعِ سحر کی بات کرو

فلم اسٹار

واہی رپٹنہ

میں "فلمی ستارہ" ہوں، دنیا مری اُجالی
جھوٹا مرا صنوعی، پیشہ مرا نقالی
بچپن کا زمانہ تھا، گھر والوں سے چھپ چھپ کے
اک زنخے سے بستی میں سیکھی تھی جو قوالی
یہ فیض اسی کا ہے، اس فلم کی نگری میں
حاصل جو ہوئی مجھ کو خوش وقتی و خوش حالی
دلی میں، دسہرے میں بھرتا تھا میں سوانگ اکثر
کام آ ہی گئی آخر، سیکھی ہوئی نقالی
تعلیم سے اُکتا کر، جب گھر سے میں بھاگ آیا
اک سیٹھ کی کوٹھی[1] میں پہلے تو بنا مالی
جب ساکھ ہوئی قائم کچھ اور ترقی کی
اک فلم کے دفتر کی کرنے لگا رکھوالی
اک روز طبیعت میں اپنی جو ہڑک اٹھی
بیٹھا ہوا پھاٹک پر گاتا تھا میں قوالی
جیسی بھی ہو موسیقی اک بات تو تھی اس میں
لے تھی مری ملتانی، لہجہ میرا بنگالی
سنتا تھا کھڑا پیچھے اک فلم پروڈیوسر
اس نے مرے سرگم میں کچھ بات نئی پالی
پھر کیا تھا اُسی دن سے تقدیر چمک اٹھی
جیون کے اندھیرے میں بس آ گئی دیوالی
محفل ہے نگاروں کی کیا رُت ہے بہاروں کی
اب میری نگاہیں ہیں اور فلم کی ہریالی
تصویر کے پردے پر کھاتا ہوں قلابازی
فلموں میں شہنشاہی، کھولی میں زبوں حالی
"میک اپ" کی پٹاری میں تفریح کا ساماں ہے
تھالی کا کبھی بینگن، بینگن کی کبھی تھالی
اک فلم میں ہیرو ہوں، اک فلم میں جوکر ہوں
کرسی پہ کبھی جج کی، مجرم کبھی اقبالی
ہر بات بناوٹ ہے، ہر شے میں نمائش ہے
ہنسنا مرا مصنوعی، آنسو مرے گھڑیالی

---

[1] کوٹھی

روحِ انتخاب

ریڈیم

ریڈیم ایک قسم کی دھات ہے جس کا رنگ چاندی کی مانند سفید چمکدار ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اپنے جسم سے خاص قسم کی شعاعیں خارج کرتی ہے اس لئے اس کا نام ریڈیم بمعنی لامع رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ نام ہم باسمّیٰ ہے۔

ریڈیم جس معدنی چیز سے نکالا جاتا ہے اسے معدنی یورنیم آکسائیڈ یا پچ بلینڈ کہتے ہیں جو ایک قسم کے سیال کولتار کا کیمیاوی مرکب ہے اس معدنی پچ بلینڈ کے سینکڑوں ٹن وزن سے سخت و شدید محنت اور نہایت پیچیدہ کیمیاوی عمل کے بعد صرف چند ملی گرام ریڈیم نکلتا ہے یہی سبب ہے کہ یہ دھات دنیا کی تمام دھاتوں سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ یہ باحیات اور زندہ دھات اس قدر کمیاب ہے کہ زمین سے اب تک کل ۲۶ اونس بمشکل حاصل کی گئی ہے۔ جو ایک کرکٹ کی گیند کو بھر دینے کے لئے بمشکل کافی ہے۔ اس لئے دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ریڈیم کی دریافت کا سہرا ایک پولستانی خاتون میڈم کیوری کے سر ہے جس نے آسٹریا میں اس دھات کے نمکوں کو پچ بلینڈ سے ۱۸۹۸ء میں سب سے پہلے حاصل کیا۔ بعد ازاں ۱۹۱۱ء میں ان نمکوں سے ریڈیم نکالا گیا۔ ریڈیم کا عمل یہ ہے کہ خود بخود مسلسل طریقہ پر تین اقسام کی حرارت شعاعوں کی صورت میں خارج کرتا رہتا ہے۔ یہ شعاعیں اہل سائنس کی اصطلاح میں الیفا شعاعیں، بیٹا شعاعیں اور گاما شعاعیں کہی جاتی ہیں حقیقت میں الیفا اور بیٹا مثبت اور منفی برقی ذرات ہیں جو ریڈیم سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ الیفا شعاع سے جو ذرات نکلتے ہیں ان میں چار پروٹون اور دو الیکٹرون ہوتے ہیں۔ اور ان دونوں قسم کے برقی ذرات کی سرعت رفتار سینکڑوں میل فی سیکنڈ ہے

الیفا شعاعیں کہربائی لہروں کا مجموعہ ہیں۔ یہ بیس ہزار میل فی لمحہ حرکت کرتی ہیں۔ ان کی طاقت نفوذ بہت ہی کم ہے یعنی یہ معمولی کاغذ کی موٹائی سے بآسانی نہیں گزر سکتیں۔ بیٹا شعاعیں انسانی بدن میں نصف انچ تک اتر جاتی ہیں اور سیسے اور ایلومینیم کی چادر میں ساڑھے بارہ انچ نفوذ کر جاتی ہیں ان کی رفتار ۱۰۰۰۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔ ان کی طاقت نفوذ الیفا شعاعوں سے تقریباً سو گنا زیادہ ہے یعنی یہ کسی دھات کی پتلی سطح کو بآسانی عبور کر سکتی ہیں جسم پر ان کا اثر بہت مہلک ہوتا ہے یعنی جو حصہ جسم ان کے زیر اثر ہو وہ گل سڑ کر مردہ ہو جاتا ہے۔ گاما شعاعیں عکس ریز اور بالائے بنفشی شعاعوں کے مشابہ ہیں۔ ان کی رفتار روشنی کی شعاعوں کے برابر ہے۔ لیکن ان کی لہر کی لمبائی عکس ریز کی لہر کی لمبائی سے بہت کم ہے۔ یہ شعاعیں سیسے کی ایک فٹ موٹی چادر کو پار کر جاتی ہیں

سائنس اور طب کی دنیا اب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو چکی ہے کہ ریڈیم سے اس قدر تیز زبردست اور زود اثر ریڈیو برقی شعاعیں خارج ہوتی ہیں جو انتہا درجے کی مہلک بھی ہیں اور مفید و کارآمد بھی۔ انسان میں براہ راست ان شعاعوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے اس لئے ریڈیم اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ لیکن یہی شعاعیں پردہ کے اندر سے استعمال کی جاتی ہیں تو بعض خطرناک امراض خصوصاً سرطان کے امراض میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آفتاب کی حرارت کا سرچشمہ ریڈیم ہی ہے۔ آفتاب میں ہیلیم کا وجود پہلے ہی سے معلوم کر لیا گیا تھا یقین کیا جاتا ہے کہ آفتاب کے گرد ہزاروں میل کا جو آتشیں ہالہ ہے جس سے کہ روشنی کے طوفان اُبلتے ہیں۔ وہ حقیقت میں ہیلیم کی شعاعوں کا ہی عکس ہے۔ ہیلیم تحقیقات

سے معلوم ہوا ہے کہ ایک گرام ریڈیم سال بھر میں ۱۲۰۰۰۰۰۰ وزن حرارت پیدا کرتا ہے۔ یہ حرارت تقریباً پندرہ من برف کو گھلا سکتی ہے۔ اس سے خود ریڈیم میں ۲۰۰۵ کی کمی ہو جاتی ہے۔ ریڈیم تقریباً پانچ ہزار برس میں اپنی حرارت اور اپنی روشنی کھو کر سیاہ بن جاتا ہے۔ آفتاب کا وزن تقریباً دو ہزار مہا سنکھ ٹن یعنی زمین سے تقریباً ۳ لاکھ ۳۲ ہزار گنا وزنی ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ اتنے عظیم الشان کرہ کو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں برس سے منور رکھنے کے لئے ریڈیم کے کتنے بڑے خزانے کی ضرورت ہوگی۔

یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ سورج کی روشنی اور حرارت احتراق کا نتیجہ نہیں ہے یعنی آفتاب میں چمک دمک کسی بھڑکنے والے مواد سے نہیں ہے۔ ریڈیم کی حرارت بھی احتراق کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کی مخفی طاقت کا نتیجہ ہے۔ سورج کی شعاعیں جو ۹ کروڑ ۳ لاکھ میل کا فاصلہ طے کر کے زمین تک پہنچتی ہیں وہ ریڈیم کی گاما شعاعوں سے بہت مشابہ ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ شعاع گاما ہی ہو جسے سورج کی کرن کہتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اگرچہ ریڈیم سے ہزاروں برس تک بے شمار حرارت و قوت لی جا سکتی ہے مگر اس سے خود اس کے جوہر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہزاروں برس کے بعد البتہ وہ سیسے کی قلب میں تبدیل ہو جاتا ہے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ریڈیم تنزل کر کے پولونیم بن جاتا ہے اور پھر سیسے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ریڈیم کی پیدائش بچپن جوانی، انحطاط، بڑھاپا اور موت کے لئے بھی کئی ارب سال کی مدت درکار ہے۔

جہاں ریڈیم کئی مہلک امراض کے خلاف جنگ کرنے میں انسان کا سب سے بڑا دوست ہے۔ وہاں دوسری طرف یہ سب سے زیادہ خطرناک، اور ہلاکت آفریں دشمن بھی ہے۔ اگر اس کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ انسان کے جسمانی نظام میں ناک یا حلق سے چلا جائے یا کسی اور ذریعے سے داخل ہو جائے تو دنیا کوئی ڈاکٹر یا سرجن اسے نکال نہیں سکتا وہ ذرہ اپنی جلتی ہوئی تیز اور تند ریڈیو برقی شعاعیں خارج کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ انسان اس کے اثر سے مر جائے گا اور اگر یہ ذرہ اپنی جسامت میں ایک کا تیس کروڑواں حصہ یا اس سے زیادہ ہوگا تو وہ فوراً ہلاک کر دے گا۔

چونکہ ریڈیم کی شعاعیں اپنے اثر میں بے حد دور رس اور مہلک ہوتی ہیں۔ اس لئے جو ڈاکٹر ریڈیم کے ذریعے علاج کرتے ہیں وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کو لمبے لمبے چمٹوں کے ذریعے پکڑتے یا چھوتے ہیں۔ جست کا دستانہ اور پورا لباس پہنے رہتے ہیں۔ اور خود بھی ریڈیم کے سامنے نہیں جاتے بلکہ جست کے ایک موٹے پردے کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تاکہ ان کے جسم کے کسی حصہ تک ریڈیم کی شعاعیں نہ پہنچ سکیں۔

ریڈیم کی گاما شعاعوں کی اہم خاصیت یہ ہے کہ جسم کے مہلک پھوڑوں مثلاً سرطان یا کینسر وغیرہ کو جلا کر خشک کر دیتی ہیں اور تندرست حصہ جسم پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جتنی ان شعاعوں کی لہر کی لمبائی کم ہوگی اتنی ہی زیادہ یہ موثر ہوں گی۔ کیونکہ کم لمبی لہر والی شعاعیں طاقت زیادہ رکھنے کے باعث موٹی دیوار کو آسانی سے عبور کر لیتی ہیں اور سرطان وغیرہ کو بہت جلد خشک کر دیتی ہیں۔ دنیا کے وہ شفاخانے یا دوسرے ادارے جو ریڈیم کے چند ذرات کے مالک ہیں ان کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ لندن کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں صرف چار گرام ریڈیم کو رد و بدل کر دیا جاتا ہے صرف ایک گرام ایک ہفتہ تک استعمال میں رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد سے ایک خاص برتن میں ڈال کر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ دوبارہ استعمال کے وقت تک اپنی پوری طاقت اور اثر کو حاصل کر سکے۔

سائنسدانوں نے تجربات سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ ۱۶۰۰ برس کی مدت میں ریڈیم کی شعاعیں اپنی نصف طاقت کھو دیتی ہیں۔ اس لئے جن ہسپتالوں کے پاس بیش قیمت دھات موجود ہے ان کو نئے ریڈیم کے لئے پریشان اور فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ریڈیم کیسی ہوش ربا اور طلسمی دھات ہے۔ یہی وہ سنگ پارس ہے جو کم سے کم ۱۶۹۰ برس تک روشنی حرارت اور طاقت بخش سکتا ہے۔ یہی وہ سرچشمہ حسن و ضیا ہے جس سے چاند ستارے اور سورج تابندہ و درخشاں ہیں یہی وہ طاقت و توانائی کا لازوال خزانہ ہے جس سے جمادات، نباتات اور معدنیات میں حرکت و حرارت پائی جاتی ہے اور یہی وہ اکسیر حیات ہے جس کی مدد سے، سرطان، نقرس، اعصابی درد، جراحت حرارت خون، اور ہیضہ کا کامیاب علاج کیا جا سکتا ہے۔

(ماہنامہ کارگر، کراچی)

ہماری نظر میں

سُنن ابوداؤد (اُردو) ترجمہ و فوائد :- علامہ وحید الزماں، تعلیقات و حواشی :- مولانا سُبحان محمود صاحب،
ضخامت ۷۸۴ صفحات، (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت بارہ روپے۔
ملنے کا پتہ :- قرآن محل، مقابل مولوی مُسافر خانہ کراچی۔

سُنن ابوداؤد' احادیث نبوی کا مشہور، مقبول اور مُستند مجموعہ ہے، امام ابوداؤدؒ سلیمان بن اشعث سجستانی (المتوفی ۲۷۵ھ) آئمہ کے مولف ہیں جو احادیث کے ائمہ میں مُمتاز درجہ رکھتے ہیں! سُنن ابوداؤد کی یہ پہلی جلد جس میں پانچ ہزار دو سو ایک (۵۲۰۱) احادیث شامل ہیں عربی متن اور اُردو ترجمہ کے ساتھ محمد سعید اینڈ سنز کے حُسنِ اہتمام اور سعیِ بلیغ سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ احادیث کا آغاز "کتابُ الطہارۃ" سے ہو کر "کتاب المناسک والحج" پر یہ پہلی جلد ختم ہوتی ہے! کتاب کے شروع میں فہرست کے بعد فاضل مترجم کا دیباچہ ہے' اُس کے بعد مولانا محمد سبحان صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ ہے' پھر امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات ملتے ہیں! احادیث کی کتنی قسمیں اور اُن اقسام کی کیسی تعریفات ہیں؟ یہ باب علامہ وحید الزماں نے مُرتب فرمایا ہے۔

اُردو ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، کہیں کہیں تانیث و تذکیر کے استعمال میں غلطی ہوگئی ہے، ایک جگہ "شفق ڈوب گیا" ترجمہ کیا ہے حالانکہ "شفق" بالاتفاق مونث ہے ——— "پھر اُس میں ڈانٹے لگا دیا (یعنی پانی کی مشک میں) (صفحہ ۲۵۱) اول تو اس کا املا "ڈاٹ" ہے، پھر یہ مذکر نہیں مونث ہے "ن" سے جو "ڈانٹے" (Rebuke) ہے' وہ بھی مونث ہے!

علامہ وحید الزماں اہلِ حدیث مسلک رکھتے ہیں' اس لئے انھوں نے فقہی مسائل میں اہلِ حدیث کے مسلک کی حمایت کی ہے' اور کہیں کہیں فقہ حنفی پر طنز بھی فرمادی ہے ——— مثلاً :-

"بعض حنفیہ جن کو عِلم حدیث سے مَس نہیں ہے"۔ (صفحہ ۳۸۲)

ایک روایت :-

"محمد بن کثیر، سفیان، ابو یحییٰ قتات، مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر کے ساتھ تھا، ایک شخص نے تثویب کہی ظہر یا عصر میں (یعنی اذان کے بعد پھر اعلام کیا اور الصّلوٰۃ رحمکم اللہ کہا یا الصّلوٰۃ خیر من النوم) عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا نکل چل اس مسجد سے (ترمذی کی روایت میں ہے، نکل چل اس بدعتی کے پاس سے) کیونکہ یہ بدعت ہے (ص۲۳۱)

صحابہ کرامؓ کو "بدعت" سے کس قدر نفرت تھی' مگر آج مُسلمانوں کا کیا حال ہے؟ اُن کو سب سے زیادہ شغف "بدعات" ہی سے ہے!!

عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو نماز پڑھائی اور آپنے پانچ رکعتیں پڑھیں جب آپ فارغ ہوئے تو لوگوں نے کھسر پھسر شروع کی' آپنے فرمایا کیا کہتے ہو' لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا نماز بڑھ گئی ہے' آپ نے فرمایا "نہیں" لوگوں نے کہا پھر آپنے پانچ رکعتیں (کیسے) پڑھیں؟ آپ مڑے اور دو سجدے کئے، پھر سلام پھیرا، اس کے بعد فرمایا۔

انما انا بشر انسیٰ کما تنسون ——— میں بشر ہوں، جیسے تم بھول جاتے ہو میں (بھی) بھول جاتا ہوں۔

ان اہلِ بدعت کو کیا کہیے جو کتاب و سنت کے اس قدر روشن دلائل کے ہوتے ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" کا انکار کرتے ہیں! سنن ابوداؤد شریف کا اُردو ترجمہ چھاپ کر قرآن محل نے دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے! اُردو جاننے والوں کے لئے یہ کتاب نعمتِ غیر مترقبہ ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباعِ سُنّت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے کہ جس راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں وہی راہِ مغفرت اور صراطِ مُستقیم ہے۔

جائیں تو کہاں جائیں کہ جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر ترے گھر کے تو نہ دُنیا ہے نہ دیں ہے

قاموس القرآن

مرتبہ: ۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

ضخامت ...۸۰۰ صفحات، پائدار خوبصورت جلد، دیدہ زیب سرورق، کاغذ کتابت اور طباعت ہر چیز خوب سے خوب تر!

قیمت مجلد نو روپے، غیر مجلد آٹھ روپے، ملنے کا پتہ: ۔ مکتبہ علمیہ دفتر "الحرم" قاضی منزل میرٹھ (انڈیا)

——— پاکستان میں: ۔ مکتبہ القادر، ناشران کتب اسلامی ۱۴۱، ایمپرس روڈ، لاہور۔

"قاموس القرآن" کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا آٹھ سال کے بعد اُس کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا ہے، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی نے بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ یہ لُغت مرتب فرمائی ہے، امام راغب اصفہانی کی "مفردات غریب القرآن" سے لے کر علامہ رشید رضا کی "المنار" اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے "فوائد القرآن" تک سے فاضل مرتب نے استفادہ کیا ہے! پاکستان اور ہندوستان کے بلند پایہ علما اور ارباب فکر و نظر نے اس لُغت کو نہ صرف یہ کہ پسند فرمایا بلکہ اسے بہت کچھ سراہا ہے۔

قرآنی الفاظ کی شرح و ترجمہ کا یہ انداز ہے: ۔

حصُور: ۔ پاکباز، عورتوں سے علیحدہ رہنے والا ——— حصر (روکنا) سے مبالغہ کا صیغہ ہے،

"حصور" اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے نفس کو ایسی باتوں سے روکے جو فضل و کمال کے منافی ہوں، عورتوں سے الگ تھلگ رہنے والے کو بھی حصور کہتے ہیں۔ اور اکثر مفسرین نے یہی معنی لئے ہیں، یہ لفظ قرآنِ کریم میں حضرت یحییٰ علیہ السّلام کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

"قاموس القرآن" سے خواص و عوام سبھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، قرآن فہمی میں یہ لُغت بہت مُعاون و مفید ثابت ہوگی! تیسرے ایڈیشن میں ہر لفظ کے بعد رکوع اور پارہ کا نام بھی اگر درج کر دیا جائے، تو یہ کتاب آیاتِ قرآنی کی تلاش کے لئے "کلید" اور "گائڈ" کا کام بھی انجام دے گی۔

غالب ـــ فکر و فن

از: ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، صفحہ ۲۶۴ (مجلد) قیمت پانچ روپے،

ملنے کا پتہ: ۔ کل پاکستان انجمن ترقی اُردو، اُردو روڈ کراچی ۱

قاضی عبدالودود صاحب زبان و ادب اور تاریخ ادب کے بہت بڑے محقق ہیں، قاضی صاحب نے علی گڑھ میگزین کے "غالب نمبر" میں ایک مقالہ لکھا تھا جس میں غالب کی زباں دانی اور تحقیقِ لُغات پر خوب کس کر تنقید فرمائی تھی، اور غالب کے بارے میں یہ تک لکھ دیا تھا کہ: ۔

"غالب کے معلومات اتنے قلیل، ان کے اغلاط اتنے مختلف النوع اور کثیر التعداد ہیں کہ بزمِ تحقیق کی
صفِ نعال میں بھی اُن کے لئے جگہ نکالنی مُشکل ہے"۔

قاضی صاحب موصوف کا یہ مضمون ہماری نگاہ سے گزرا ہے، اُس میں غالب پر جو ایک بھرپور گرفت کی تھی وہ آج تک یاد ہے ——— غالب نے اپنے ایک شاگرد کو خط میں لکھا تھا کہ "سرشار" اُس پیالہ کو کہتے ہیں جو کناروں تک بھرا ہوا ہو، اُردو داں طبقہ "سرشار" جس معنی

(سرخوش و بیخود) میں استعمال کرتا ہے، ایرانی اس معنی میں اس لفظ کو نہیں بولتے ـــــــ اس کے جواب میں قاضی عبدالودود صاحب نے ایرانی شعراء کے ایک دو شعر پیش کئے، جن میں "سرشار" انہی معنی میں استعمال ہوا ہے، جن معنی میں ہم بولتے ہیں۔

غالب پر اس قسم کے اعتراضات پڑھ کر، قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق لغت، وسعت مطالعہ اور فارسی دانی سے ہم مرعوب ہوگئے، اور غالب کے بارے میں یہ خیال قائم ہوگیا کہ غالب محقق کم اور ذہین زیادہ تھے، اور فارسی زبان و لغت کے بارے میں ان کی رائے آنکھ بند کرکے قبول نہیں کرنی چاہیے، مزید تحقیق درکار ہے!

مگر

جناب ڈاکٹر شوکت سبزواری کی اس کتاب کو پڑھ کر ہماری رائے کچھ اور ہوگئی! ڈاکٹر سبزواری نے قاضی عبدالودود صاحب کے اعتراضات پر جو انھوں نے غالب پر کئے تھے، جس تحقیق اور ذہانت و بصیرت کے ساتھ جرح فرمائی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے! فارسی لغت میں وہ کس قدر تبحر رکھتے ہیں، ان کا مطالعہ کس قدر وسیع اور مستحضر ہے! کتنے مضبوط اور معقول دلائل کے ساتھ قاضی صاحب کے اعتراضات کو رفع کیا ہے ایک ٹکڑا:

"کرگدن، کے کاف اول کو غالب نے فارسی بتایا ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی سند غالب نے پیش نہیں کی! یہ کاف عربی سے ہے اور اس کی دو سندیں ہیں گرشاسپ نامے کے ایرانی مرتب نے کاف عربی سے لکھا ہے، فولرس نے بھی کاف اول کو عربی بتایا ہے، لیکن خود قاضی صاحب کا بیان ہے کہ "فارسی میں کاف عربی و فارسی بہ کثرت ایک ہی مرکز سے لکھے جاتے تھے (آثار ص ۲۳) یہ کوئی سند نہیں، فولرس محقق اور عالم سہی مگر اس کی بات سند کے بغیر کیسے مان لی جائے اس لفظ کے ماخذ ہی سے پتہ چل سکتا ہے کہ اس کا پہلا کاف عربی ہے یا فارسی! میرا خیال ہے کہ کرگدن، گج گردن سے مرکب ہے، گج گردن یعنی ہاتھی جیسی گردن والا، گینڈے کی گردن خصوصیت کے ساتھ ہاتھی کی گردن سے مشابہ ہوتی ہے، شاید اس لئے اسے گج گردن کہا گیا۔ جو زبان کی خراد پر چڑھ کر "کرگدن" ہوگیا گر کی 'ر' 'ج' کا بدل ہے، یا گردن کی 'ر' نے اپنا مقام بدل لیا ہے۔"

قاضی عبدالودود صاحب نے غالب کے بارے میں لکھا تھا:-

"اس فن کی مستند کتابیں شاید ہی ان کی نظر سے گزری ہوں، یہ بات کہ روی قافیہ کے آخری حرف اصلی یا اس کے قائم مقام کو کہتے ہیں، انہیں عمر بھر معلوم نہیں ہوئی۔"

ڈاکٹر شوکت سبزواری اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"جب سے دنیا میں تحقیق وجود میں آئی، شاید ہی کسی محقق یا نقاد نے اتنے سخت الفاظ اپنی تحریر میں کسی اہل علم کے متعلق استعمال کئے ہوں جیسے شعر اور اس کے فن سے ذرا سی بھی مس نہیں ہے، وہ جانتا ہے کہ روی کیا چیز ہے، قاضی صاحب غالب جیسے شاعر شیوا بیان اور محقق بے مثال کو "روی" سے جاہل و ناواقف بتاتے ہیں، یہ حقیقت سے بہ مراحل دور اور غلو یا اغراق کی آخری حد ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ غالب روی سے اچھی طرح واقف تھے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　　ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

• ـــــــ اردو زبان کا عام اور مسلّمہ قاعدہ ہے کہ فعل اپنے فاعل کے مطابق مفرد یا جمع ہوتا ہے، آتش کے

شعر میں "ہزارہا" مجبوراً واحد جمع ہے، فعل مفرد ہے، یہ غلط ہے، آتش جیسے ماہر زبان کا استعمال اس کی صحت کی ضمانت نہیں بن سکتا۔"

ڈاکٹر سبزواری کی اس رائے اور تحقیق سے ہم اتفاق نہیں کرتے، آتش کے شعر میں کوئی سقم نہیں ہے، یہ تو روزمرہ ہے ــــ یوں:۔

"اُس جلسے میں ہزارہا (یا لکھوکھا) آدمی تھا۔"

یہاں "لکھوکھا اور ہزارہا آدمی" کی حیثیت "COLLECTIVE NOUN" جیسی ہے! دیا شنکر نسیم کے یہاں تو یہ تک ملتا ہے۔

ذرہ کا بھی چمکے گا ستارا ــــ قائم جو زمین و آسماں ہے

"عسس المتقین کے بارے میں غالب کی مدافعت کرتے ہوئے ڈاکٹر سبزواری نے جو کاوش کی ہے، اگر وہ "غیاث اللغات" ہی دیکھ لیتے تو مزید دلائل لانے کی زحمت سے بچ جاتے، غیاث میں لکھا ہے:۔

"عسس جمع عاس است کہ بمعنی شحنہ، شب باشد و در فارسی بر مفرد اطلاق کنند۔"

صفحہ ۴۴ پر ڈاکٹر صاحب نے "نزاع" کو جو مونث ہے، مذکر لکھا ہے:۔

"برہانِ قاطع کا نزاع کھڑا نہیں ہوا تھا۔"

"ذال معجمہ فارسی میں" اس کتاب کا ایک مستقل باب ہے، جس میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے انتہائی تحقیق و کاوش کے ساتھ مرزا غالب کی مدافعت اور حمایت کی ہے اور یہ ثابت کر کے چھوڑا ہے کہ غالب کے قول کے مطابق "گزشتن" اور "پزیرفتن" ہی صحیح املا ہے، کیونکہ "گزشتن" اور "پذیرفتن" میں ذال عربی ہے جو فارسی حروف میں سے نہیں ہے ــــ مگر صفحہ ۲۶۰ پر خود اُن کی کتاب میں "گذرا" زز کی بجائے ذال سے کتابت ہوا ہے۔

ڈاکٹر سبزواری غالب سے اس قدر متاثر ہیں اور اس درجہ عقیدت رکھتے ہیں کہ غالب کے فن اور شخصیت میں اُنہیں کوئی کمزوری نظر نہیں آتی، فرماتے ہیں:۔

"غالب کی شخصیت ــــ طلب، طمع، حرص و آز اور زبونیٔ ہمت کی تمام لعنتوں سے پاک ہے گدائی اُنکی خو نہیں، فقر اُن کا فخر ہے بے نیازی اُن کا کردار ہے۔" (ص ۲۵۹)

حالانکہ غالب حریص بھی تھے اور طامع بھی تھے، اور امیروں سے "فتوحات" کی بھی اُمید رکھتے تھے۔ مالک رام (ایم اے) غالب کے فن اور شخصیت پر سند (AUTHORITY) سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے کھل کر لکھا ہے کہ غالب کے مکان میں جوا ہوتا تھا اور وہ "نال" (جوئے کا کمیشن) وصول کرتے تھے۔

غالب[1] کے بارے میں یہ کہنا کہ "فقر اُن کا فخر تھا" یہ مبالغہ آمیز عقیدت بھی ہے اور واقعیت کے خلاف بات بھی ہے، جو شخص اُدھار شراب پیتا ہو، اچھے سے اچھا کھانا کھاتا، اور بہت سے بہتر لباس پہنتا ہو اُس سے "فقر" منسوب کرنا، ایک عجوبہ سے کم نہیں ہے۔

میر و غالب، غالب اور میرٹھ، غالب کے اُردو کلام کی اشاعت، غالب کی شخصیت، غالب خطوط کے آئینے میں ــــ یہ پانچوں مقالے خوب ہیں! ــــ غالب کے "خطوط کی خصوصیت کو چند لفظوں میں کس خوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے:۔

"غالب نے اُردو میں سب سے پہلے نجی خطوط لکھے، سرسید، سرور، اور حبر وغیرہ ان کے بعد آئے لیکن انھوں نے اپنی شخصیت اور کردار کی جھلک اپنے خطوط کے آئینے میں نہیں پڑنے دی۔ اور وہ

---

[1] جہاں تک غالب کی شاعرانہ عظمت کا تعلق ہے۔ میں اس معاملہ میں اُن کے بڑے سے بڑے مداح سے زیادہ غالب کا عقیدت مند ہوں۔ (م - ق)

اپنی سیرت کو چھپانے میں کامیاب ہوگئے، جب وہ اس آئینے کے سامنے آئے، تو ایک سنگار کرنے والی حسینہ کی طرح بن سنور کر آئے، اس لئے ہم انہیں بے نقاب نہ دیکھ سکے، غالب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بیباکی کے ساتھ اس آئینے کے سامنے آگئے۔ "اپنی عمایم ہم تم کہتے بہتے کھڑے ہوگئے۔"

"غالب ــــ فکر وفن" نے کوئی شک نہیں اُردو ادب کی ثروت میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس تحقیق کے ساتھ کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں! ڈاکٹر شوکت سبزواری کی شخصیت زیادہ سے زیادہ قدرشناسی کی مستحق ہے۔

فاوسٹ ازگوئٹے ــــ منظوم ترجمہ:۔ از عبدالقیوم خاں باقی مرحوم۔
ضخامت ۲۲۵ صفحات (مجلد) قیمت چار روپے پچاس پیسے۔
(حصہ اول)　ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو، اُردو روڈ، کراچی ۱

جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے جس کا پورا نام:۔

JOHN WOUEANG VON GOETHE

ہے اُس کی شہرہ آفاق کتاب "فاوسٹ" (FAUST) کا اُردو نثر میں ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے کیا تھا۔ جو ۱۹۳۱ء میں انجمن ترقی اُردو ہند کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ ہماری نگاہ سے گزرا ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف ترجمہ کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، خاص طور سے "فاوسٹ" کا ترجمہ اُن کا شاہکار ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین کے مشہور ترجمہ کے بعد عبدالقیوم خاں باقی مرحوم نے فاوسٹ کا منظوم ترجمہ کیا، اور اب سے تقریباً پچیس سال پہلے اس کے چند حصے ماہنامہ "الجامعہ" (دہلی) میں شائع بھی ہوئے۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے ناظم مطبوعات جناب مشفق خواجہ نے مترجم کے دیباچہ سے پہلے "حرفے چند" کے ذیل میں لکھا ہے کہ:۔

"بابائے اُردو مرحوم ۵ر مئی ۱۹۶۱ء کو جناح ہسپتال کراچی میں داخل ہوئے، ہسپتال کو روانہ ہونے سے کچھ دیر پہلے انھوں نے چند اہم مسودات طباعت کے لئے دفتر انجمن کے حوالے کئے زیر نظر ترجمہ بھی انہیں مسودات میں شامل تھا۔"

کوئی شک نہیں عبدالقیوم خاں باقی نے "فاوسٹ" کا ترجمہ بڑی محنت اور کاوش سے کیا ہے۔ اور اس چیز کو ملحوظ رکھا ہے کہ اصل نظم کا آہنگ ترجمہ میں باقی رہے۔ ان شعروں میں کتنی روانی اور شعریت پائی جاتی ہے:۔

اے تخیل! مرے جذبات کی سلطانی کر　　اے تماشا!! مری آنکھوں کی نگہبانی کر
آج میں قافلۂ عشق کا رہبر بن کر　　آیتِ درد سُناتا ہوں پیمبر بن کر
یہ میری خوشی ہے کہ بڑھے گرمیِ بازار　　لگ جائیں سویرے ہی زر و سیم کے انبار
دستِ فطرت میں اُلجھ جاتے ہیں جب تارِ حیات　　بے اثر ہوتی ہے جب آہِ دلِ افگارِ حیات
نغمۂ جاں کون سُنواتا ہے دن اور رات سے　　کون سلجھاتا ہے ان تاروں کو اپنے ہاتھ سے
دورنگی دیکھ لے ہر شام و سحر کا　　ذرا دیکھنا روپ اس فتنہ گر کا

علامہ عبدالقیوم خاں باقی (ایم اے) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ادبیات اُردو کے استاد تھے اور بلدہ حیدرآباد میں چونکہ راقم الحروف کے ہم محلہ تھے، اس لئے اُن سے بارہا ملنا ہوا اور کسی کسی دن تو شعر و ادب اور فلسفہ پر کئی کئی گھنٹے گفتگو رہی۔ مرحوم شاعر تھے، مطالعہ وسیع تھا، اور شاعری

کتنا پر لطف ہے نظارۂ انوارِ قدیم　　کتنی پرکیف ہے یہ صحبتِ آدابِ نیاز
دیکھنا شانِ کریمی کہ خدائے قہار　　مجھ سے مُنکر کو عطا کرتا ہے اک ساعتِ راز
میں ایک غم کدۂ علم کے فشار میں ہوں　　میں ایک نشۂ بے کیف کے خمار میں ہوں
تری نظر سے ہو پرواز کوہساروں میں　　میں تیرنے لگوں روحوں کے ساتھ غاروں میں
سحر کو شبنمِ عرفاں کی دے کے آب و تاب　　تو میری رُوح کو دے غسلِ نورِ مہتاب
شعاعِ فیضِ ازل چھن رہی ہے شیشے میں　　چھلک رہی ہے مئے حُسن آبگینے میں!
جگمگاتے ہیں مرے سینے کے داغ　　جیسے ہوں تاریک جنگل میں چراغ
ہاں! اگر راس سدرۂ تخییل سے　　پار ہو شعلوں کی رودِ نیل سے
ذوقِ نغمہ تو ہے مجھ میں مگر ایقان کہاں　　کفر کے سینۂ بے نور میں ایمان کہاں
معجزہ بادۂ ایمان کی مدہوشی ہے　　اور ایماں حرمِ قدس کی سرگوشی ہے
ربط اس کو ہے جہانِ خس و خاشاک کے ساتھ　　میں سمجھتا ہوں یہ مٹ جائے گا اس خاک کے ساتھ
شاخوں کے اندر　　زلفوں کا خم ہے
خوشوں کے اندر　　صہبا کا نم ہے
سچ ہے وہ دل سے دور ہے جو آنکھ سے ہو دور　　ہجراں کی بیخودی میں کہاں لذتِ حضور
بجلیاں ساغرِ رنگیں میں رُخساروں کی　　تابشیں آنکھ میں تھیں حسن کے گلزاروں کی
شرم اس دہر میں جب جلوہ نما ہوتی ہے　　رُخ پہ اوڑھے ہوئے رنگین ادا ہوتی ہے
آہ! کیا شورشِ نغمہ ہے کہ دل ہلتا ہے　　کشتۂ ذوق کو زحمت کا صلہ ملتا ہے
عشق کے جذبِ شوق نے دل کو تباہ کر دیا　　پھولوں کی رُوح کھینچ لی شبنم اشکبار نے
پیغمبرو! بچا تو مجھے اس عذاب سے　　تم کو نوید رحمتِ یزداں کا واسطہ
اے یادِ دوست! اب نہ مجھے بیقرار کر　　اس انتظارِ عمر گریزاں کا واسطہ

دُوسرا رُخ:-

آہ وہ محفلِ قدسی، وہ بہشتِ آرام　　آہ وہ بزمِ محبت وہ طربگاہِ تمام (صـ۳)

"طربگاہِ تمام" کھٹکتا ہے، مصرعہ ثانی کاش یوں ہوتا:-

؎ آہ! وہ صبحِ محبت، وہ طرب گاہ کی شام

کن نگاہوں سے ہے شاعر نگراں جان و دل　　کس طرح دیتا ہے یہ اک امتحانِ جان و دل (صـ۱۰)

"نگراں جان و دل"!! مصرعہ ثانی میں "اک" نے شعر کے لطف کو اور غارت کر دیا۔

ہاں عطا کر مجھ کو پھر وہ گرمیِ عہدِ شباب　　جس کی نفرت ذی اثر ہو، جس کی الفت کامیاب (صـ۱۸)

"ذی اثر" ایک روڑا ہے جو نگینہ کی جگہ بٹھایا گیا ہے! کاش! دوسرا مصرعہ اس طرح ہوتا!-

؎ جس کی نفرت ہو اثر انگیز، الفت کامیاب

تم کو اک تعظیم لفظی ہی میں حاصل ہے کمال ایک پیکار من و تو، ایک جنگ قیل و قال (ص۲۰)

پہلے مصرعہ، دوسرے مصرعہ کا جوڑ کا نہیں ہے! اس کے علاوہ دونوں مصرعے دو لخت بھی ہیں!

ظاہر ہے غریبوں پر ترا لطف و کرم بھی تو عالم لذات ہے اور واقف غم بھی (ص۲۴)

"اور" حذف کرکے "دانندۂ غم" کہنا تھا (تو عالم لذات ہے دانندۂ غم بھی)

دست افشانی بے علم سے خوش ہوتے ہیں کم سوادوں کے لئے رفعت دل کھوتے ہیں (ص۳۷)

"دست افشانی" سے نہ جانے کیا مراد ہے؟ "رفعت دل کا کھونا" اس میں بڑی غرابت پائی جاتی ہے۔

صومعہ کے قصر عالی شان سے خانۂ شوریدہ کے خلجان سے (ص۵۹)

"خانۂ شوریدہ" اور اس کا "خلجان" یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟

ان میں چھائی ہوئی اسرار کی تاریکی ہر قدس اور وحشت بیدار کی تاریکی ہے

"قدس" نے شعر میں ابہام نہیں اہمال پیدا کردیا!

لعنت ہے ایسے خواب پہ جو فتنہ کار ہو جو شوکت و فتوح کا آئینہ دار ہو (ص۹۱)

آخر یہ بات کیا ہوئی!

اک جوا تری حکومت میں ملے گا ایسا جس میں ہوگا نہ کبھی جیت کا موقعہ پیدا (ص۹۵)

دکن میں "جوا" (قمار بازی) واو کی تشدید کے ساتھ بولا جاتا ہے، جو سامعہ پہ گراں گزرتا ہے! پھر مصرعہ اولی میں "حکومت" کی "ح" تقطیع میں نہیں آتی۔

ہو مری روح پہ بارانِ عروج اور زوال اس کو ہر وقت رہے پستیٔ رفعت کا خیال (ص۱۰۱)

"بارانِ عروج و زوال" کی جگہ "بارانِ عروج اور زوال" شاعر نے لاکر اپنے ذوق اور فن کا اچھا مظاہرہ نہیں کیا۔

علم و حکمت سے ہے اے فاوسٹ حقارت تجھکو اب ملی ہے مرے ارماں کی وزارت تجھ کو (ص۱۰۶)

نہ جانے اصل شعر کیا ہے؟ اگر مصرعہ ثانی لفظی ترجمہ ہے تو گوئٹے نے ایک بے تکی بات کہی ہے، "ارماں کی وزارت" یہ عجیب انداز بیان ہے؟؟ پہلے مصرعہ میں یا تو "اے" کو حذف کرنا ہوگا، یا فاوسٹ کی جگہ "فاسٹ" (FAST) پڑھنا ہوگا۔ تب کہیں جاکے مصرعہ کا وزن پورا ہوگا

چشمہ ہائے ازلی سے مئے راحت پینا کوہساروں میں شب و روز بہ عشرت جینا (ص۱۴۷)

"بہ عشرت جینا" یہ نوشقوں کا سا انداز بیان ہے۔

اک صومعۂ خدائی میں شیطان کی جیسے راجدھانی
اک قاز کہری جھاڑیوں سے دیکھو تو جو اشارے کر رہا ہے
لغزش کا کوئی آج اندیشہ نہیں سب میں کوئی ہے تیز گام

اوپر کے دونوں شعروں کے شروع کے مصرعے، اور تیسرا شعر۔ یہ ناموزوں اور بحر سے خارج ہیں، خدا کرے یہ کتابت کی غلطی ہو۔

کون یقین لائے گا کس سے کہوں یہ ماجرا لوٹ لیا مرا چمن عسریدہ بہار نے (ص۲۲۳)

"عسریدہ" یہ کیا چیز ہے؟ اس کے علاوہ مصرعہ ثانی ناموزوں ہے۔

رکعات تراویح

از :- مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ——— مذیل بردر انوار مصابیح (حصہ اول)
از :- مولانا عبدالباری قاسمی، ضخامت ۲۳۶ صفحات، قیمت :- دو روپے آٹھ آنہ -
ملنے کا پتہ :- مجلس علمی مفتاح العلوم، مئو (اعظم گڑھ)

مشہور فقہی مذاہب اور اہل حدیث کے اختلافات فرعی مسائل میں فروعی ہیں اور ان کی حیثیت راجح و مرجوح کی ہے، مثلاً کوئی شخص زور سے آمین کہے یا آہستہ سے، نماز میں رفع یدین کرے یا نہ کرے، دونوں طرح نماز ہو جاتی ہے ان فقہی مسائل میں جو ایک سے زیادہ مفہوم و عمل کی گنجائش رکھتے ہیں، شدت برتنی نہیں چاہیے، لیکن افسوس ہے اہل حدیث حضرات فقہی جزئیات میں بڑا مبالغہ کرتے ہیں اور سخت شدت برتتے ہیں بالخاص طور سے ہندوستان اور پاکستان کے اہل حدیث حضرات احناف پر جو نقد و جرح فرماتے ہیں وہ بڑی تحقیر آمیز اور دل آزار ہوتی ہے ——— اس کتاب میں اس قسم کی دل آزارانہ تنقید کے بعض اقتباسات دیئے گئے ہیں۔

"حنفی مذہب بھی کیسا یتیم مذہب ہے کہ اس غریب کا سہارا یا تو کوئی کمزور حدیث ہے یا ضعیف توجیہ ـــ

"یہ تنگ نظری جو صرف حلقۂ دیوبند کے چند ضدی مولویوں ہی میں پائی جاتی ہے۔"

"ہاتھ کی صفائی کا کرتب ــ چور دروازہ کی تلاش ــ عوام کو فریب دینے کے لئے۔"

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رمضان میں بیس رکعت تراویح کی تعداد نہ بدعت ہے نہ دین میں زیادتی ہے، اس کے ثبوت میں خاصی شرح و بسط کے ساتھ بڑی جاندار دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ ساڑھے بارہ سو سال سے مسلمانوں کی غالب اکثریت کا یہ عمل رہا ہے اور رمضان میں عشاء کی نماز کے علاوہ تراویح کی بیس رکعتیں عام طور سے پڑھی جاتی رہی ہیں!

اس کتاب میں اہل حدیث کے بعض علماء کی تحریروں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ انھوں نے اصل عربی عبارتوں کے ترجمہ میں دیانت کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا ——— مثلاً :-

"اعلم انہ لم یوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی التراویح عدداً معیناً بل لایزید فی رمضان ولا غیرہ علی احدی عشر رکعۃ" کا ترجمہ ایک اہل حدیث عالم (علوی صاحب) نے اس طرح کیا ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کا کوئی خاص عدد (قولاً تو) مقرر نہیں فرمایا ہے لیکن (عملاً) گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے!

حالانکہ اس عبارت کا لفظی ترجمہ یہ ہے :-

- ——— "تم جانو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح میں کوئی معین عدد مقرر نہیں فرمایا بلکہ آپ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ پڑھتے تھے ــ ــ ــ ــ اب آپ دونوں ترجموں کو ملا کر دیکھئے کہ علوی صاحب نے کیا سے کیا کر دیا، پہلے انھوں نے ہلالین کے درمیان ایک جگہ قولاً اور دوسری جگہ عملاً کا اضافہ کر کے ابن تیمیہ کی عبارت کے مفہوم کو بالکل مسخ کر دیا۔ پھر انھوں نے رمضان اور غیر رمضان کا لفظ حذف کر دیا، تاکہ گیارہ رکعات پڑھنے والی بات تراویح پر چسپاں ہو سکے ـــ
- ——— ملا علی کی مرقاۃ سے ابن تیمیہ کا جو کلام نقل کیا ہے اس میں پوری دیدہ دلیری سے ثلث عشرۃ

رکعۃ کو احدی عشرۃ رکعت بنادیا، مرقاۃ کوئی نایاب کتاب نہیں ہے، اس کی جلد ثانی کے ص۱۷۵ پر یہ عبارت موجود ہے اس کو ملاحظہ کیجئے اور اطہری صاحب کی ڈھٹائی کی داد دیجئے۔

• ــــ اطہری صاحب نے مصابیح سیوطی کی عبارت ولو ثبت ذالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یختلف فیہ کعدد الوتر والرواتب میں ولو ثبت کے بعد بلا فصل بین ذالک العدد الخاص بعد التحدید والتضییق کا اضافہ کیا، اور جب ترجمہ کی باری آئی تو اضافہ کی عبارت کے ترجمہ کو بلا فصل میں نہیں رکھا، تاکہ عوام سمجھیں کہ یہ پوری عبارت علامہ سیوطی کی فرمائی ہوئی ہے ــــ"

اپنے مسلک کو ثابت اور دوسرے فقہی مذہب کو بے دلیل اور غلط ٹھیرانے کے لئے عبارتوں کے ترجمہ اور نقل میں اس قسم کی بے پروائی بلکہ خیانت حق پسندوں کو زیب نہیں دیتی، ہمیں خود ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریر کے ایک اقتباس کے سلسلہ میں گوجرانوالہ کے مشہور و معروف عالم اہل حدیث نے دیانت کے تقاضوں کو دانستہ نظر انداز فرماکر بڑی غیر ذمہ داری سے کام لیا ــ "فاران" میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

اس کتاب کا ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن اقتباس :ــ

"۔۔۔ ابن تیمیہ کے کلام کا صرف ابتدائی فقرہ جو کان یطیل الرکعات پر پورا ہوتا ہے اس کو بھی (کان یطیل الرکعات) اطہری صاحب نے ناتمام نقل کیا ہے اور اتنے ہی حصہ کو لے کر ابن تیمیہ کی مراد بیان کرنا شروع کردی ہے، کیا یہ تلبیس حق اور متکلم کے منشاء کو خبط کرنا نہیں ہے؟ ابن تیمیہ کا کلام آپکے سامنے ہے آپ خود دیکھیں وہ توقیت عدد معین کی نفی کے بعد صرف اتنا ہی نہیں کہتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ پڑھتے تھے بلکہ ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ پڑھنے کے بقدر رکعتوں کو دراز کرتے تھے اور اس کلام کا یہ جزء تو نہایت اہم اور ضروری ہے اس لئے کہ اس کے بعد انھوں نے عہد فاروقی کی تکثیر رکعات کو اس درازیٔ قیام کا عوض بتاکر جس کو تحمل ہو اس کے حق میں لمبے قیام کے ساتھ تیرہ رکعتوں کو اور جس کو تحمل نہ ہو اس کے حق میں بیس رکعتوں کو سنت ہی نہیں بلکہ افضل قرار دیا ہے، اطہری صاحب نے نقل عبارت کرتے وقت بھی اور مراد بتانے کے وقت بھی اس کو چھوڑ کر ابن تیمیہ کے منشاء کو اس طرح خبط کردیا کہ ابن تیمیہ کے نزدیک بھی ہر حال میں تیرہ پڑھنے کو سنت اور بہتر (افضل) بنادیا"

یہ کتاب چونکہ ایک دوسری کتاب (انوار مصابیح) کے رد میں لکھی گئی ہے، اس لئے کہیں کہیں طبعی طور پر لہجہ سخت ہوگیا ہے، مگر جہاں تک کتاب کے عمومی تاثر کا تعلق ہے اس میں متانت، تہذیب اور شائستگی پائی جاتی ہے! فریق ثانی کی دلیلوں کو بڑی قوت کے ساتھ توڑا ہے اور رمضان کی تراویح میں رکعات کے تعداد کے مسئلہ کو اس قدر وضاحت سے سلجھا کر بیان کیا ہے کہ یہ مسئلہ آئینہ کی طرح روشن و کھلا ہوگیا ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حنفی مسلک میں تفقہ فی الدین کا کتنا عمق بصیرت، نزاکت اور باریکی پائی جاتی ہے!

لسان القرآن (حصہ اول)
مرتبہ :ــ عزیز دانش، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ :ــ پاکیزہ دارالکتب فرنٹیئر، جیل روڈ، حیدرآباد (مغربی پاکستان)

یہ کتاب ایک ایسے دل کش اسلوب اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے کہ عربی کا مبتدی طالب علم اسے سبقاً سبقاً پڑھ کر عربی زبان ، قرآن و حدیث سے ابتدائی طور پر متعارف ہو جاتا ہے ، خاص طور سے عربی گرامر کو سمجھانے اور اُس کی مشق کرانے کے انداز میں وحشت کی جگہ اُنس و دلچسپی پائی جاتی ہے ۔

کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ درج ہے ، اس کا پہلا لفظ "آل" ہے ـــــ اُس کا ترجمہ :-

"گھر کے لوگ ، احباب ، اولاد ، پیروکار"

اس ایک لفظ کے ترجمہ سے اس کا اندازہ ہوا کہ فاضل مرتب قرآن کریم کے معانی و مفاہیم میں بصیرت رکھتے ہیں ۔ اور وہ اس خرابی عقیدہ سے واقف ہیں ، جو بعض لفظوں کے مفہوم کو مخصوص اور تنگ و محدود کرنے کے سبب مسلمانوں میں واقع ہوئی ہے اور اس کی بنیاد پر ایک مستقل "علم کلام" وضع کیا گیا ہے ۔

صراطِ مستقیم

تالیف :- سردار محمد اکبر خاں - نظر ثانی :- مولوی صدر الدین

ضخامت ۱۹۲ صفحات ، قیمت :- ایک روپیہ پچاس پیسے -

ملنے کا پتہ :- تعمیری کتب خانہ ، اُردو بازار راولپنڈی -

اس کتاب کے چند عنوانات :-

سُورہ فاتحہ کی جامعیت کا اجمالی تصور ـــــ حمد کے معنیٰ ـــــ دلائل استحقاق حمد ـــــ خدا کی رحمت کا غلط تصور ـــــ انسان کی زندگی پر عقیدۂ آخرت کا اثر ـــــ شرک فی الذات ـــــ شرک فی الصفات ـــــ نماز ـــــ توبہ کے تین عناصر خوف و رجا و ـــــ

یہ کتاب پڑھنے والے کے دل میں خشیتِ الٰہی پیدا کرتی ہے ، اور دین کے بنیادی صحیح تقاضے اُبھر کر سامنے آتے ہیں ! جناب سردار محمد اکبر خاں صاحب کی یہ پہلی تصنیف ہے جو منظرِ عام پر آئی ہے ، مگر یہ پہلا نقش ہی خوب سے خوب تر ہے ! اسلوب بیان میں زبان و ادب کی خوبیاں پائی جاتی ہیں ، جیسے سردار صاحب موصوف برسوں سے شاید انشا پردازی کی مشق گوشۂ گمنامی میں کر رہے ہیں !

ایک اقتباس :-

" ۔ ۔ ۔ اگر بہ تقاضائے بشریت کبھی گناہ ہو جائے ، تو خدائے رحمان و رحیم سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے ۔ بلکہ اس کی مغفرت و بخشش کی اُمید رکھیئے ۔ توبہ و استغفار کے ذریعے اس سے معافی مانگنی چاہیئے ۔ لیکن اُسے الرحمٰن اور الرحیم سمجھ کر گناہوں کے ارتکاب کی جرأت کرنا کسی طرح درست نہیں ہے ، اسلام بدی سے نکل کر نیکی کی طرف آنے کے لئے خدا کی رحمت کا سہارا بنانے کی تعلیم دیتا ہے ، نیکی سے نکل کر بدی کی طرف جانے کے لئے خدا کی رحمت کا سہارا لینا کسی طرح درست قرار نہیں دیتا ۔ ۔ ۔ "

پوری کتاب کا یہی رنگ ہے ، صحیح عقیدہ ، صحیح خیال اور صحیح اندازِ بیان ! جیسا نام ، ویسا کام ـــ یعنی مسلمانوں کو "صراطِ مستقیم" دکھانے والی !

گل خنداں

مینجنگ ایڈیٹر :- عبدالرؤف (بی اے آنرز) مدیر اعزازی :- پیام شاہ جہاں پوری -

ضخامت ۳۹۲ صفحات ، ملنے کا پتہ :- ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار ، لاہور -

بزرگانِ دین نمبر

ماہنامہ "گل خنداں" (لاہور) کے اس "بزرگان دین نمبر" میں پاک و ہند کے ۵۳ بزرگان دین کے حالات زندگی ملتے ہیں جنہیں مختلف اہل علم نے مرتب فرمایا ہے! یہ مضامین ہر طرح کے ہیں بعض میں تحقیق کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور بعض سرسری طور پر مرتب کئے گئے ہیں، جن میں صاحب تذکرہ کی پیدائش اور موت کے سنین تک نہیں ملتے! ان بزرگوں کے حالات میں زیادہ تر خانقاہی رنگ غالب ہے!

حضرت بابا اخوند رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "سماع" کے سخت مخالف تھے ـــــ اور :ـ

"اس معاملہ (سماع) میں انھوں نے اپنے مرشد حضرت سید علی خواص ؒ سے بھی مباحثہ کیا اور اس وقت تک یہ بحث جاری رکھی، جب تک حضرت خواص نے محفل سماع میں شرکت سے پرہیز کرنے کا وعدہ نہ کرلیا!

"آپ بدعات کے بہت بڑے مخالف تھے، اور پابندی شریعت پر بہت زور دیتے تھے، فرقہ روشنیہ کے بانی بایزید سے آپ کے اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ شریعت پر طریقت کو ترجیح دیا کرتا تھا"۔

حضرت علی ہجویری (گنج بخش) رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے :ـ

"آپنے آخری عمر میں سماع بالکل ترک کردیا، اور نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ میں اسے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ کوئی شخص سماع میں نہ پڑے، اس سے طبیعت پریشان نہ کرے کیونکہ اس میں بڑے خطرے ہیں "۔

جغرافیہ ممالک اسلامیہ (حصہ اول)

جزیرۃ العرب

از :ـ محمد رابع حسنی ندوی، ضخامت ۲۵۴ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت :ـ پانچ روپے ـ

ملنے کا پتہ :ـ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء بادشاہ باغ، لکھنؤ

یہ کتاب ہندوستان کے اس خانوادے کے ایک فرد کی لکھی ہوئی ہے، جس کا شجرۂ نسب "اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء" کا مصداق ہے! سارا گھرانا اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے! اور ـ ـ ـ ـ

؎ یہاں تو روشنی ہی روشنی معلوم ہوتی ہے ـ

ڈاکٹر سید عبدالعلی الحسنی رحمۃ اللہ علیہ اس دور انحطاط میں صحابہ کرام سے ملتی جلتی زندگی بسر کرتے تھے، انہی کے نام سے اس کتاب کا انتساب کیا گیا ہے کہ مصنف ڈاکٹر صاحب مرحوم کے تربیت یافتہ ہیں! "جزیرۃ العرب" کا پیش لفظ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے تحریر فرمایا ہے!

یہ کوئی ڈرامہ، ناول یا افسانوں کی کتاب نہیں ہے، یہ جغرافیہ کی کتاب ہے، جس میں جگہ جگہ کثرت سے دریاؤں، چشموں، پہاڑوں، وادیوں اور بستیوں کے نام آتے ہیں، خشک موضوع ہے، مگر ہم نے تھوڑے سے وقفہ سے مسلسل دو نشستوں میں کتاب کو ختم کیا اور کتاب ختم کرنے کے بعد طبیعت گراں نہیں چست اور نشاط آمیز تھی ـ

پہلے باب کا آغاز جزیرہ نمائے عرب کے عمومی حالات کے تعارف سے ہوتا ہے اس کے بعد فصل اول میں طبعی حالات کا، دوسری فصل میں موسم اور پیداوار کا، تیسری فصل میں اقوام اور قبائل کا اور چوتھی فصل میں ثقافت و تمدن کا بیان ہے!

دوسرے باب کی چار فصلوں میں سعودی سلطنت کے صوبوں حجاز، نجد، احسار اور عسیر کے جغرافیائی حالات وغیرہ کی تفصیل ملتی ہے۔ تیسرا باب یمن، عدن، لحج، حضرموت، عمان، قطر اور کویت کے جغرافیہ اور اس کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

پوری کتاب معلومات سے لبریز ہے، اس میں یہ بھی ملے گا کہ عربوں نے اختلافِ حرکت کے لحاظ سے ہواؤں کے نام (رُکاد، عاصف، ہُوجار) تعین کئے ہیں اور سمتوں کے اعتبار سے بھی ان کے نام صبا، دبور، نکبار، متذآبہ، شمال، جنوب اور نعامی ہیں ——— متذآبہ اس ہوا کو کہتے ہیں "جس کی سمت کا تعین نہ کیا جا سکے، اور وہ کسی بھی سمت سے چلے، اور جو اپنی سمت سے بدلتی بھی رہتی ہے، اس لفظ کا مادہ ذئب ہے۔ جس طرح بھیڑیا بغیر کسی سمت کے تعین کے آجاتا ہے، اسی طرح یہ ہوا بھی بلا معلوم سمت کے چلتی ہے"

اس کتاب کو پڑھ کر آپ اہل الوبر اور اہل المدر کی اصطلاح اور معنیٰ اور اس کی وجہ تسمیہ سے بھی واقف ہوں گے کہ بدوی عرب "اہل الوبر" اور حضری عرب "اہل المدر" کیوں کہلاتے ہیں ——— مذاہب کا جس فصل میں بیان ہے، اس میں یہ تحقیق بھی پائی جاتی ہے کہ عہد عباسی میں "صابی" مذہب والوں نے اپنے مذہب کو ترقی یافتہ اور عالمی بنانے کی کیا کوشش کی؟ اور بقول فاضل مصنف وہ اپنی ساری خرافات کے ساتھ ساتھ موحد اور اہل کتاب بھی معلوم ہوتے ہیں! عہد عباسی کا مشہور اہلِ قلم ابواسحٰق صابی تھا۔

اس کتاب میں قدیم عربوں کے لہجہ اور تلفظ کے فرق و اختلافات کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً ——— "بنو تمیم ہمزہ ابتدا کو "عین" میں تبدیل کر دیتے تھے، جیسے أَسْلَمَ کے بجائے عَسْلَم، بنو ہذیل "ح" کو "ع" بنا دیتے تھے جیسے "حرب" کے بجائے "عَرَب" ——— بنو قضاعہ "ی" کو "ج" کر دیتے تھے، جیسے "تمیمی" کے بجائے "تمیمج"! بنو سعد "ع" کو "ن" سے بدل دیتے تھے۔ جیسے "أَعْطیٰ" کو "انطیٰ" ——— اور ربیعہ و مضر مونث میں "ک خطاب" کے بعد "ش" بڑھاتے تھے، جیسے "علیک" کے بجائے "علیکش" اور "ح" کو "گ" میں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔

اس کتاب میں معلومات کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ حجاز کے پودوں (سمرة الطلح، غرار، غرغر، اور حرمل) تک کے نام اور ان کی شکل و شباہت درج ہے! اس کتاب کے مطالعہ کی بدولت پہلی بار اس کا علم ہوا کہ: —

"بحرین کے سامنے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر سمندر کے اندر ایسے چشمے ہیں جن کا پانی خشکی کے چشموں سے بھی زیادہ میٹھا ہے، یہ سمندر کے اندر اُبلتے رہتے ہیں، ان میں سب سے بڑا چشمہ جزیرہ سترہ کے پاس ہے"

قبائل عرب کا جہاں بیان ہے، وہاں اُن کے بعض مشہور شاعروں کا بھی ذکر آگیا ہے ——— کہ مہلہل جو عربی کا سب سے پہلا شاعر تھا وہ قبیلہ تغلب سے تعلق رکھتا تھا ——— جریر کا وہ عربی شعر بھی درج کر دیا ہے، جس نے بنو نمیر کی شہرت کو بٹہ لگا دیا تھا اور حطیئہ کا وہ شعر بھی ملتا ہے جس کی بدولت بنو انف الناقہ کی ذلت دور ہو گئی تھی ——— خورنق و سدیر جو عربی ادب میں دولت و عظمت کی علامت (SYMBOL) بن گئے تھے، اُن کا ذکر بھی عربی شاعر منخل کے شعروں کے ساتھ آگیا ہے۔

بستیوں کے بیان میں تیمار کا ذکر آیا ہے، لکھا ہے کہ سموئل ابن عادیا شاعر کا الابلق الفرد نامی محل اسی بستی میں واقع تھا ——— اور نجد کے اصل علاقہ میں جسے قصیم کہتے ہیں عربی کے ممتاز ترین شعراء کی خاصی بڑی تعداد پیدا ہوئی، جیسے امراؤالقیس، طرفہ بن العبد، الحارث بن الحلزہ، اوس بن حجر، زہیر بن ابی سلمیٰ، عنترہ بن شداد العبسی اور اخیر میں جریر و فرزدق وغیرہ!

شاعروں کے اجمالی تذکرے اور ان کے شعروں نے جغرافیہ کی اس کتاب میں شعریت اور رنگینی بھی پیدا کر دی ہے، اس سے فاضل مصنف کے شعری ذوق کی بلندی اور لطافت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے جغرافیائی حالات اور اُس کے آثار کا تذکرہ جس تفصیل اور شوق و عقیدت سے کیا گیا ہے، اس نے اس کتاب کی دینی اور [illegible] حیثیت بھی متعین کر دی ہے۔ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کن مقامات سے گزرے، اُس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی، اور مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرماتے ہوئے حضورؐ نے عام مُروج راستے کو چھوڑ کر جو نیا راستہ اختیار فرمایا تھا، اس راستہ میں ان مقامات (عسفان، امج، قدید، الخرار، لقف، مجاح، ابجدا جد الاجرد، ذوسلم، العبابید، القاحہ، العرج، بطن ائم) کو قدوم مبارک سے مشرف فرمایا، اُن کا بیان بھی آگیا ہے!

راہِ بدر میں ملنے والے خاص خاص مقامات کا ذکر ہے، تو اس میں یہ بھی ملتا ہے کہ اولات الجیش کی وادی سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہار تلاش کرنے کے لئے حضورؐ نے آدمی بھیجے تھے اور یہیں تیمم کی آیت نازل ہوئی تھی ـــــ مکہ اور مدینہ کے آثار و مقامات کی تفصیل نے اس کتاب کو برکت و تقدیس عطا کی ہے ـــــ قرآنِ کریم میں عرب کی جن قوموں اور بعض آثار و مقامات کا ذکر آیا ہے "جغرافیہ ممالک اسلامیہ" میں اُن کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے!

اس کتاب میں جو عربی اشعار اور ضرب الامثال آئے ہیں' ان کی فرہنگ بھی دی ہے' جن کا ترجمہ شستہ اور رواں..... اُردو میں مولوی سعید الرحمٰن اعظمی نے کیا ہے ـــــ اُردو میں بہت مشہور ضرب المثل ہے "اُلٹے بانس بریلی" عربی میں بھی اسی قسم کی ضرب المثل ہے' یہ بات اس کتاب کے واسطے سے معلوم ہوئی ـــــ "کناقل تمرالی ہجر" (جیسے مقام ہجر کو کھجوریں لیجانے والا" ترجمہ میں غالباً کتابت کی غلطی کے سبب "الیٰ" کا ترجمہ "کو" کی بجائے "میں چھپ گیا)!

فاضل و دیدہ ور مُصنف نے عربی ناموں میں اعراب کا بڑا لحاظ رکھا ہے' کہ عربی زبان و ادب کے علماء تک ناموں کے تلفظ ٹھیک طور پر نہیں کر پاتے ـــــ اس لئے کتاب کے آخر میں اس مقصد کے لئے انڈکس لگایا ہے ـــــ مثلاً:ـــ

فَدَک ـــــ حَضرَ مَوت ـــــ بَرْکُ الغِمادُ ـــــ تَدْمُرْ ـــــ تَغلِبْ ـــــ حُطَیئہ ـــ العَلاءَ ـــــ فِلَسْطِیْن ـــــ حَرّ الظّهْرَان ـــــ جیسے مشہور ناموں کا تلفظ عام طور پر غلط ہی سُنا گیا ہے۔

فاضل مصنف عربی اور اُردو زبان و ادب کا اتنا شُستہ مذاق رکھتے ہیں، مگر حیرت ہے کہ انھوں نے "ـ ودھ واون" (ص۱۷) "لوٹے وار" (ص۱۲) اور "مقام دکام"[1] (ص۱۲۳) استعمال کیا ہے۔ خدا نہ کرے کہ اُردو زبان میں یہ بدعت چل پڑے! "لوٹ مار" میں تو "گاؤں" والے بھی نہیں بولتے اور نہ لکھتے ہیں۔

کتاب میں "شحر و مکلا" کا جہاں ذکر ہے، وہاں ذرا سی یہ تفصیل بھی آجاتی کہ تقسیم ہند سے قبل سلطانِ مکلا ریاست حیدر آباد دکن کا جاگیر دار اور جمعدار تھا!

مسجد نبوی کی جہاں تفصیل دی ہے' وہاں صفہ کے بعد قبلہ رُخ سب سے پہلے حجرہ نبوی بتایا گیا ہے، حالانکہ صفہ کے بعد پہلا حجرہ، حجرۂ فاطمہؓ ہے۔

جناب مولانا سید رابع حسنی ندوی اس کتاب کی تصنیف و تالیف پر علمی دنیا اور خاص طور سے اسلامی دنیا کی طرف سے قدر و ستائش کے مُستحق ہیں! جغرافیہ کے ساتھ تاریخ و ادب کے امتزاج نے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

اشک و تبسّم

از:۔ معراج رام پوری، ضخامت ۱۲۸ صفحات ـ مجلد' رنگین سرورق، قیمت:۔ تین روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ مصنف سے' محلہ جھنڈا آرام پور (یو۔پی)

---

[1] "کام" یہاں مقصد نہیں "کار" (DUTY'S WORK) کے معنی میں لایا گیا ہے (م۔ق)

موجؔ رام پوری کا نام سنتوش کمار ہے، کایستھوں کے سکسینہ گوت سے تعلق رکھتے ہیں، ۱۹۳۵ء سالِ ولادت ہے، ان کے بڑے بھائی چندر سین خنجرؔ بھی شاعر تھے اور اُردو کے ساتھ فارسی کی بھی اچھی قابلیت رکھتے تھے! موجؔ رام پوری کو جناب ابر احسنی گنوری سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ مصر کی ایک انشا پرداز خاتون آنسہ .... کے مضامین کا مجموعہ کا "ابتسامات و دموع" نام ہے پھر اُردو میں اب سے تقریباً بیس سال قبل صاحبزادہ میکشؔ حیدرآبادی نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "گریہ و تبسم" رکھا، اور اب جناب معراج رام پوری کا کلام "اشک و تبسم" کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔

اس کتاب کا مختصر تعارف نامہ شادؔ عارفی رام پوری نے تحریر فرمایا ہے، اس کے بعد دوسرا مضمون پروفیسر لوگندر پال صاحب کا ہے۔ جو خاصہ جاندار ہے، پھر خود شاعر نے اپنے حالات لکھے ہیں اور شاعری کے بارے میں اپنے رجحانات اور نظریوں کا ذکر کیا ہے!

جناب موجؔ رام پوری جواں سال شاعر ہیں، اُن کی شاعری کی مشق تھوڑے دنوں کی ہے، اس اعتبار سے اُن کا کلام قابلِ لحاظ اور ستائش و حوصلہ افزائی کا مستحق ہے! موجؔ کی محبت خوددار و غیور بلکہ مقدس ہے، اس لئے اُن کی غزلیں شرافت و سنجیدگی سے لبریز ہیں اور اُنکی نظمیں انسانیت دوستی کا مرقع ہیں!

چند منتخب اشعار:-

یوں اوس دمکتی ہے دامانِ بہاراں پر　　　جیسے ابھی پھولوں کے آنسو نکل آئے ہیں
کل جو آنکھیں ترے جلووں کی تماشائی تھیں　　　آج منہ تکتی ہیں جس جس کا ترے نام کے ساتھ
سنتے ہیں ہاتھ گریباں کی طرف جاتا ہے　　　کتنا مضبوط تعلق ہے ترے نام کے ساتھ
یہ کس انداز سے دیکھا ہے تم نے　　　خوشی سے آنکھ پُرنم ہو رہی ہے
آتشِ گل نے یہ گل کھلائے　　　دے رہے ہیں دھواں آشیانے
نجات پائے گا انساں فریبِ دولت سے　　　یہ وقت آئے گا بے شک ضرور آئے گا

تباہ کر کے ہمیں آپ مطمئن کیوں ہیں
تباہیوں کا اثر آپ پر بھی آئے گا

گلستاں پر نہ آنچ آئے گلستاں پھر گلستاں ہے　　　نشیمن بجلیوں کی زد میں آ جانے سے کیا ہوگا
مژگاں کے تصور سے سویا نہ گیا مجھ سے　　　کہنے کو تو یوں اکثر کانٹوں پہ بھی نیند آئی
کبھی سوچا بھی آئینِ وفا کے توڑنے والے　　　جو دُنیا کا یہی دستور ہو جائے تو کیا ہوگا
اُجاگر ہو گئے رُخ زندگی کے　　　مگر نہ تھے ارادے خودکشی کے
نگاہِ زمانہ نے کروٹ جو بدلی　　　بدل کر رہ گئے رُخ زندگی کے
ستم حد سے گزرتا ہے تو یہ منزل بھی آتی ہے　　　خموشی خود زباں بنتی چلی جاتی ہے انساں کی

دُوسرا رُخ :-

کوئی جہاں میں عظمتِ بہار کی نہ کرے　　　اگر بہار گریباں ہی تار تار نہ ہو (ص ۱۹)

"سہی" کی جگہ "بھی" ہوتا تو شعر زیادہ جاندار ہو جاتا۔

ہلاکت تھی جہاں ہر تنگ منزل　　　کچھ ایسے موڑ آئے زندگی کے (ص ۲۳)

پہلا مصرعہ بہت کمزور ہے۔

تمول کی عنایت پر نہ جانا　　اُلجھ جاتے ہیں دامن بے کسی کے

مفہوم "بطنِ شاعر" ہی میں رہ گیا۔

خلش کی منزلت ہے میرے دل میں　　خلش سے یاد مبہم ہو رہی ہے (ص۲۳)

شاعر کی نومشقی کا نمونہ!

ظلمتیں ہیں وہی وحشتیں ہیں وہی　　کہتے ہیں سب نمودِ سحر ہو گئی (ص۲۷)

"کہتے ہیں" پڑھتے ہوئے زبان کو جھٹکا سا لگتا ہے۔

عشق جب برسرِ اقتدار آگیا　　دوست کو خود بخود مجھ پہ پیار آگیا (ص۳۷)

مصرعہ اولیٰ مبہم نہیں مہمل ہے۔

اُن نگاہوں سے دامن بچانا　　جن کا آغاز ہو کچھ سہانا (ص۵۱)

"نگاہوں سے دامن بچانے" کی بھی ایک ہی رہی! پھر نگاہوں کے آغاز کا "سہانا" ہونا بھی محلِ نظر ہے۔

بیابانوں میں، تاروں میں، گلستاں میں بہاروں میں
تمہارا حسن ہر اک شے میں مدغم کون دیکھے گا (ص۶۲)

شعر میں یوں بھی کچھ نہیں ہے، پھر "مدغم" نے اس کا اور حلیہ بگاڑ دیا۔

بہت ہے سخت راہِ عشق اے موج　　بچھڑ جانا، نہ تھوڑی دور چل کے (ص۶۴)

موج کی جگہ "اے دوست!" ہوتا، تو شعر کا رنگ ہی کچھ اور ہو جاتا! اس مفہوم میں شوق کھنڈوی کا شعر کتنا اچھا ہے۔

وہ کیا کیا کر گئے دُشوار منزل　　ہمارے ساتھ دو اک گام چل کے

حضرت جگر مرادآبادی مرحوم نے اس شعر کو سنا تو بے اختیار جھومنے لگے۔

سائے نصیب بڑھ کے وہ رہرو پہ چھا گئے　　منزل جو پاس آئی قدم ڈگمگا گئے (ص۶۵)

مصرعہ ثانی جتنا بے ساختہ ہے مصرعہ اُولیٰ میں اتنا ہی تکلف اور آورد پائی جاتی ہے۔

خود اپنی بیکسی کی اُڑائی ہے یوں ہنسی　　آئے جو اشک آنکھ میں ہم مسکرا گئے (ص۶۵)

"ہم مسکرا گئے" یہ کہاں کی زبان ہے؟ ایسے موقعوں پر اہلِ زبان "مسکرا دیئے" یا "مسکرا اُٹھے" بولتے ہیں۔

علم وادب کی راہ دکھاتا تھا جو ہمیں　　اک حربۂ ستم سے اُسے بھی چھپا دیا (ص۶۶)

گاندھی جی کے حادثہ قتل سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی ہے، جس کا یہ ایک شعر ہے۔ گاندھی جی سے "علم وادب" کی "راہ دکھانے" کی نسبت عجیب لگتی ہے، وہ تو سیاست و اخلاق کے رہنما تھے! دوسرے مصرعہ میں لفظوں کی جوڑ جاڑ کے علاوہ اور کیا رکھا ہے!

فرقہ وارانہ خیز تقریریں　　وہ چمکتی ہوئی سی شمشیریں (ص۹۰)

"فرقہ وارانہ خیز" کا کیا جواب ہے!!! توبہ!

توجہ کی نہیں مجھ کو ضرورت　　ہلاکِ شانِ غفلت ہو گیا ہوں
فریبِ حسن سے کچھ دور رہ کر　　تری الفت میں اک عریانیت ہے

خدا کے واسطے کچھ ساتھ دیجیے   میں سانسوں کا گزر اچاہتا ہوں   (ص۱۱۸)

ان شعروں کے تینوں آخری مصرعے بھرتی کے ہیں!!

نہیں مانگی تھی گیسو کی درازی   نہیں چاہی تھی ہونٹوں کی گلابی

فقط انسانیت کا سا ز مانگا   مگر قسمت کر دردوں نے صدا دی   (ص۱۱۷)

پہلے دو مصرعے خاصے اچھے ہیں، مگر بعد کے دونوں مصرعے انتہائی سُست اور سطحی ہیں!

"درد" کی جمع اُردو میں نہیں آتی ــــــ ہاں "دردِ زہ" کے لئے یوں بولتے ہیں ــ

"اُس عورت کے درد اُٹھ رہے ہیں"۔

نہ جانے کیوں مجھے دل سے بھلا گئے ہو تم   مری حیات فسانہ بنا گئے ہو تم   (ص۱۳۳)

"بھلا گئے ہو تم" یہ روزمرہ کے خلاف ہے! اس غلطی کے علاوہ بھی شعر بالکل سپاٹ اور بے مزہ ہے ــ

ڈھندلکوں میں وفائیں آن پھنسیں   شام ہے دوستی کی رات نہیں

اسی "کاواک شعر" پر کتاب ختم ہوتی ہے ــ

شاعرِ انسانیت کے محسنِ اعظم نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بارگاہِ اقدس میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، نعت کا یہ حسنِ مطلع کتنا یقین افروز ہے ــ

کیا نرالی ہے تری شان مدینہ والے   تیری ہر بات ہے قرآن مدینہ والے

جناب موج رام پوری میں شعرگوئی کی خاصی قوت پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام چھپوانے میں جلدی کی، توقع ہے کہ اُن کا دوسرا مجموعۂ کلام :ــ

"نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

کی مصداق ہوگا!

اُردو رُباعی

از:ــ فرمان فتحپوری، (ایم اے) ضخامت ۲۷۲ صفحات، (مجلد، رنگین سرورق) قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ:ــ موڈرن پبلشرز صدر، کراچی ۳

فنی و تاریخی ارتقا اُردو رباعی کے فنی و تاریخی ارتقاء پر یہ کتاب ہر حیثیت سے قدر و ستائش کی مستحق ہے' اس کتاب کے ابواب رباعی کے فنی لوازم و خصوصیات ــــــ فارسی رباعی کا آغاز و ارتقاء ــــــ اُردو رباعی اور دکنی شعراء ــــــ شمالی ہند میں اُردو رباعی کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے پہلے تک ــــــ اُردو رُباعی کا دورِ جدید ۱۸۵۷ء سے پہلی جنگِ عظیم کے بعد ــــــ اُردو رباعی کی اہمیت اور مستقبل ــ

جناب فرمان فتحپوری نے اول تو "رباعی" پر بڑی محنت و کاوش کے ساتھ مواد فراہم کیا، پھر اُس کو بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا، فرمان صاحب کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اُن کا قلم اعتدال کی حدود میں رہتا ہے، کسی کی تعریف کرتے ہیں تو مبالغہ نہیں کرتے۔ کسی پر نقد و جرح فرماتے ہیں تو تفریط کو کام میں نہیں لاتے!

دولت شاہ سمرقندی کے "تذکرۃ الشعراء" کی بدولت عام طور پر یہ بات شہرت پاگئی ہے کہ رُباعی کا موجد رودکی ہے؟ شبلی نعمانی نے بھی اپنی بے مثل کتاب "شعر العجم" میں اسی تذکرہ پر اعتماد اور حصر کیا ہے بعض دوسرے علماء اور نے تحقیق کے بعد

کی بجائے "ابوالعلا حضرت الکعب" کو رُباعی کا موجد قرار دیا، مگر جناب فرمان فتحپوری کی تحقیق یہ ہے کہ فارسی رباعی کا پہلا شاعر ابوشکور بلخی (المتوفی ۳۳۳ھ) ہے ———— انھوں نے اس سے بھی بحث کی ہے کہ "ایرانی ترانہ — یا چہار بیتی کا عربی نام "رباعی" ہے، فارسی، اُردو یا عربی شعری مصطلحات میں اب بالعموم یہی نام لکھا جاتا ہے ۔ ۔ ۔"

فاضل ناقد نے ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم کی اس رائے کی تصدیق کی ہے کہ اُردو رباعی کا پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) ہے!

فرمان فتحپوری نے اُردو کے قدیم، متوسط اور جدید رُباعی گو شاعروں کی منتخب رباعیوں کے نمونے دیئے ہیں، اور انکی خصوصیات کو دل نشین انداز میں ظاہر کیا ہے! اُن کی تحقیق کی بدولت رگھو نیدر راؤ جذب عالم پوری اور اختر مُرادآبادی جیسے شعرا گمنامی کی تاریکی سے روشنی میں آگئے!

فرمان صاحب غالبًا واقف مرادآبادی سے واقف نہیں ہیں، ورنہ اُن کا ذکر ضرور فرماتے، واقف مرادآبادی اسی دور کے مزاج نگار شاعر ہیں، انھوں نے خیام کی رباعیوں کو اُردو رُباعی میں جس روانی و سلاست کے ساتھ منتقل فرمایا ہے، وہ اُنہی کا حصہ ہے!

فرمان فتحپوری نے اُردو میں "رُباعی گوئی" کی تحقیق کی داغ بیل ڈال دی ہے، دوسرے لوگ تحقیق کریں گے، تو اس ثروت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔

صفحہ (ص) پر مصنف نے "گرید و تلاش" لکھا ہے، فارسی، عربی اور اُردو لفظوں کے درمیان واؤ عطف نہیں آتا، نہیں آتا نہیں آتا! اس "بدعت" کو رواج دینا نہیں چاہیے ———— صفحہ ۲۱ پر "غیر خصی نمونہ" نظر سے گزرا کہ فارسی میں رباعی کی یہ ایک قسم تھی، جو تقریبًا متروک ہو چکی تھی، مگر بقول مصنف اُردو شعرا کے یہاں آج تک ایسے نمونے ملتے ہیں، چنانچہ انھوں نے فراق گورکھپوری کی رباعی مثال میں پیش کی ہے، جس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔

یہ "غیر خصی" کہیں کتابت کی غلطی تو نہیں ہے ———— اُردو بولنے والے اس نام میں کس قدر ذم محسوس کریں گے!

یک بارہ چناں جبا　　　　ہل دخونخوار مباش　(ص ۲۵)

اس بیت کو پیش کرتے ہوئے، کسی عربی شاعر کا کوئی شعر ضرور درج کرنا چاہیے تھا تاکہ اُردو جاننے والے جان جاتے کہ عربی شاعری میں اس کا رواج تھا کہ ایک شعر کے پہلے مصرعے کے آخری لفظ کے ٹکڑے کر دیا کرتے تھے، اور لفظ کے دوسرے ٹکڑے سے مصرعہ ثانی کا آغاز کرتے تھے! فارسی شاعری میں یہ پہلی مثال ہماری نظر سے گزری ہے! ورنہ عام کیا خاص طور پر بھی عربی کے اس انداز کی فارسی شعرا نے تقلید نہیں کی! اور نہ کرنی چاہیے، ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے!

> "اس وقت نظم اور غزل دونوں ایک دوسرے کی حریف کی حیثیت سے آگے قدم بڑھا رہی ہیں، غزل میں معنوی تسلسل اور نظم میں تغزل پیدا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، رباعی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نظم و غزل دونوں کا درجہ رکھتی ہے، اور دونوں ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، نظم کا تسلسل خیال اور غزل کا اختصار و گداز اس کی فطرت میں ہے، ایک طرف وہ نظم کی طرح خارجی حالات کو استدلال و تسلسل کے ساتھ بیان کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے —
> دوسری طرف وہ وارداتِ قلبیہ کے اظہار کا حسین ذریعہ ہے، گویا رباعی ایسی صنفِ سخن ہے جو خارجی اور داخلی شاعری دونوں کے لئے موزوں ترین ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی عجب نہیں کہ آج کی

مصروف زندگی میں رباعی کو وہی مقام حاصل ہو جائے جو ناول اور طویل داستان کے مقابلے میں افسانے کو حاصل ہے "۔

اس متوازن اور بصیرت افروز عبارت پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے ـــــ اور مصنف کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے :۔

؎ اے وقتِ تو خوش کہ وقت ما خوش کردی !

نوائے ظہیر

از۔ سید ظہیر جعفری، ضخامت ۴۸ صفحات، مجلد قیمت :۔ ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ :۔ مرکز ادب، بدھواره، بھوپال (بھارت)

مرکز ادب بھوپال اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لئے کچھ نہ کچھ کوشش کرتا ہی رہتا ہے، جناب عشرت قادری اُس کے نگراں ہیں، اسی مرکز کے زیرِ اہتمام یہ کتاب شائع ہوئی ہے! جناب سید محمود الحسن نے اس کا پیش لفظ لکھا ہے اور کوثر چاند پوری، شفا گوالیاری، کیف بھوپالی، محمد علی تاج اور گوہر جلالی نے اس کتاب کے بارے میں اچھی رائیں دی ہیں ۔

"نوائے ظہیر" میں شاعر کے قطعے، غزلیں اور نظمیں کل مل ملا کر سو شعروں سے کچھ ہی زائد ہونگی! ظہیر صاحب کے کلام میں شادابی اور شگفتگی پائی جاتی ہے، اُن کی غزل کے دو شعر ہیں :؎

دل پہ بجلی گرا گئی وہ نظر ⁂ سر سے پا تک اب اضطراب ہوں میں
آ ادھر مجھ میں دیکھ اپنا عکس ⁂ تیرے چہرے کی آب و تاب ہوں میں

منقبت کے اس شعر :؎ سر سے پا تک وہ ترا عکسِ حسیں ⁂ جس کے منصور سوئے دار آیا
میں ابہام نہیں اہمال پایا جاتا ہے! عکسِ رُخ اور منصور و دار سے آخر کیا ربط و تعلق ہے؟

ایک غزل کا یہ شعر سادہ ہے مگر لطف انگیز ہے :؎ پہلے پہلے وہ عہدِ مہر و وفا ⁂ اور پھر بے وفائیاں توبہ
لیکن اسی غزل میں "فتنہ آرائیاں" اور "برق زائیاں" کی ترکیبیں غزل کی لطافت پہ گراں گزرتی ہیں ـــ صفحہ ۲۴ پر جو مسلسل غزل ہے اس میں "رشکِ مہ رخاں" کی ترکیب بھی کھٹکتی ہے ۔

کتاب کے آخر میں شاعر کے والد میر سید مہر حسین مہر جعفری مرحوم کی کہی ہوئی منقبتیں ہیں ـــ فرماتے ہیں ۔

علم میں یکتا ہے تو، حلم کا دریا ہے تو ⁂ تو ہے وہ بحرِ سخا بخش دیئے جان و تن

علم و حلم اور بحر و سخا کے ساتھ "جان و تن بخش دیئے" کا کیا ربط ہے؟

کون یداللہ ہے، کون ہے عین خدا ⁂ کس میں یہ اوصاف ہیں مثل احد من و عن

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوصاف کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا "من و عن" مثل و ہمسر ٹھیرانا مشرکانہ عقیدہ ہے! توبہ! حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اُن لوگوں کو شدید سزائیں دی تھیں، جو آپ کی شان میں مبالغہ کرتے تھے اور آپ کی ذات سے الوہی صفات منسوب کرتے تھے!

ایک رُباعی میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حضرت علیؑ کا شاگرد بتایا ہے ـــ

؎ جبریل بہ شاگردیِ حیدر نازد

یہ بھی خلافِ واقعہ ہے اور حد سے بڑھا ہوا مُبالغہ ہے! جبرئیلؑ کا تعلق ذاتِ رسالت مآبؐ سے تھا، کسی دوسرے سے نہ تھا!

— x —

مقبول عام
ماہنامہ سیارہ لاہور
اب ۲ ایڈیشن ہونگے
(۱) علمی و ادبی مجلہ
بہ ادارت نعیم صدیقی
مقالوں ۰ افسانوں اور نظموں کا مرقع
ایک سو صفحات
(۲) ڈائجسٹ ایڈیشن
معلوماتی و تفریحی ضمیمہ
آغاز فروری ۱۹۶۳ء سے
سائنس کے کرشمے
صحت و مرض کی معلومات
مہمات کی روداد
بین الاقوامی احوال
واقعاتی کہانیاں
عالم اسلام کے کوائف
جرم و سزا کے واقعات
شخصیتیں
سفر کی داستانیں
انٹرویو
نفسیاتی حکایتیں
تصویریں
لطیفے
کارٹون
اقوال
جواں سال مدیروں کا وسیع حلقہ ترتیب دے رہا ہے
آراستہ سرورق ڈائجسٹ سائز ۱۹۲ صفحات
سیارہ ڈائجسٹ
ایڈیشن میں آپ کیلئے ۸ فائدے
(۱) آپ کے لئے ضروری معلومات
سیارہ زندگی کے متعلق تمام ضروری اور تازہ معلومات فراہم کرے گا۔ آپ ذہنی لحاظ سے پیش پیش رہیں گے۔
(۲) آپ کی گفتگو کے لیے مواد
سیارہ آپ کو گفتگو کے لئے نئے نئے موضوعات اور اچھے فقرے اور الفاظ فراہم کریگا۔ آپ محفلوں میں نمایاں رہیں گے۔
(۳) آپ کے کام میں مدد
آپ جو کام — ملازمت کاروبار وغیرہ — بھی کرتے ہوں، سیارہ میں اس کے متعلق مفید باتیں آپکو ملیں گی
(۴) آپ کے مسائل کا حل
سیارہ کے رنگا رنگ مضامین میں ہر ماہ آپ کو اپنے عملی مسائل اور ذہنی الجھنوں کا حل ملیگا
(۵) آپ کے لئے تفریح
سیارہ آپ کیلئے اور آپ کے گھر کے ہر فرد کیلئے تھکن اور پریشانی میں سامان تسکین بہم پہنچائے گا۔
(۶) آپ کے وقت کی بچت
سیارہ بہت سی کتابوں اور رسالوں کا خلاصہ ہے۔ آپ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر سکیں گے۔
نوید اسلام صدیقی منیجنگ ایڈیٹر سیارہ (ڈائجسٹ ایڈیشن) لاہور نمبر ۱۲
(۷) آپ کے پیسے کی بچت
سیارہ آپ کو اس سے بے نیاز کر دیگا کہ آپ بہت سے انگریزی اور اردو رسائل پر پیسہ خرچ کریں۔ کم سے کم قیمت میں زیادہ سے زیادہ مواد۔
(۸) آپ کیلئے سستی لائبریری
سیارہ کو خریدتے رہیئے تو سال بھر کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ۱۲ کتابوں کی ایک لائبریری آپ کے پاس جمع ہے۔ جو ۲ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل اور ہر موضوع پر معلومات سے مالا مال ہے۔
۱۰ سال میں ۲۰ ہزار صفحے کی ۱۲۰ کتابیں

خوبی
پر نظر
کیجئے
قیمت پر نہیں
کے ٹو
اعلیٰ قدر و قیمت کا نشان ہے
کم خرچ بالا نشین کی
بہترین مثال
K-2
CIGARETTES
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

فاران کراچی

جلد ۱۴ — شمارہ ۱۱

ایڈیٹر :- ماہر القادری ✵ ماہ فروری ۱۹۶۳ء

چندہ کا سالانہ ساتھ روپے — فی پرچہ باسٹھ پیسے

ترتیب

مقامِ اشاعت :- دفتر ماہنامہ کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

پرنٹر و پبلشر :- مسرور حسین — مطبوعہ مطبع سعدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

بعض احباب و شناسا، جاننے اور ملنے والے اور دوسرے حضرات ہم سے دریافت کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان میں جب اسلامی حکومت قائم ہوگی تو کلب گھروں، سینما ہاؤسوں اور تھیٹر ہالوں کو کیا بند کر دیا جائے گا؟ رقص و سرود پر پابندی لگا دی جائے گی؟ سٹہ، لاٹری، گھوڑ دوڑ کی شرطیں اور قمار بازی کی دوسری صورتوں کو کیا قانوناً جرم قرار دیا جائے گا ـ ـ ـ ـ ـ ؟؟ اس قسم کے سوالات بعض لوگ مذاق اور تفریح کے انداز میں کرتے ہیں، چھیڑ مقصود ہوتی ہے کہ اس طرح کے بحث مباحثہ سے تھوڑی دیر کے لئے محفل میں گرمی پیدا ہو جائے گی، بعض کا انداز گفتگو طنز آمیز ہوتا ہے، بعض حضرات سنجیدگی کے ساتھ یہ بات پوچھتے ہیں اور سمجھنا چاہتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور مغربی تمدن و تہذیب کے لوازم و مظاہر کے ساتھ اسلامی حکومت کا کیا رویہ ہوگا؟

اس قسم کے سوالات کرنے والوں میں پہلا نمبر اُن لوگوں کا ہے جن کے ماں باپ نے اُن کے نام تو مسلمانوں کے ناموں پر رکھے ہیں اور انہی ناموں سے وہ جانے پہچانے جاتے ہیں، مگر اسلام سے اُنہیں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رہی، اُن میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو الحاد و انکار کی سطح تک پہونچ چکے ہیں اور ایمان و یقین کو قدامت کی یادگار اور جہل و توہمات کی علامت سمجھتے ہیں، اور بعض شدید قسم کے متشکک ہیں۔

شک دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وہ جو آدمی کے دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے اور کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔ جس کے دُور کرنے کے لئے آدمی تحقیق و جستجو کرتا ہے! طلب صادق ہو تو اس قسم کا شک دُور ہو سکتا ہے اور اس اُلجھن سے نجات مل سکتی ہے، دوسری قسم کا شک وہ ہے جس میں آدمی لطف لینے لگتا ہے، اور اس شک کے بارے میں اُس متشکک کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اُس کے ذہن و فکر میں جو چیز اُبھر رہی ہے اُس کا سبب آزادیٔ رائے اور تنویرِ فکر ہے ـــــ اس قسم کی تشکیک آدمی کو بالآخر ملحد و منکر بنا کر چھوڑتی ہے۔

جو لوگ نہ صرف یہ کہ اپنے عمل سے بلکہ ذہنی و فکری طور پر بھی اسلام سے اپنی وابستگی ختم کر چکے ہیں، اور ایمان و یقین کی رمق بھی جن میں باقی نہیں رہی، وہ اسلامی حکومت کے بارے میں ایسے سوالات تفریح کے لئے کیا کرتے ہیں مگر اس چھیڑ چھاڑ اور تفریح میں وہ اسلام پر طنز کرنے سے بھی نہیں چوکتے! یہ حضرات نفس کے اس فریب اور شیطان کے اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ اپنے فکر و مطالعہ کی بدولت، قدامت، رجعت پسندی اور توہمات کے چکر سے نکل کر ہم اُس بلند مقام پر پہونچ گئے ہیں، جہاں فکر و نظر کی روشنی اور خیال و رائے کی آزادی پائی جاتی ہے۔

اس ذہن و فکر اور مزاج و طبیعت کے افراد میں یہ تبدیلی اس طرح آئی ہے کہ اُنھوں نے مسلمان گھرانوں میں تو بیشک پرورش پائی ہے مگر اُن کی تربیت اسلامی انداز پر نہیں ہوئی! عام طور پر مسلمان گھرانوں کا یہی حال ہے کہ بڑے بوڑھے لوگ تو نماز پڑھتے ہیں مگر اپنی اولاد کو نماز کی تلقین نہیں کرتے اور نوجوانوں کا تارکِ صلوٰۃ ہونا اُن کے سرپرستوں کو کسی اُلجھن میں مبتلا نہیں کرتا۔

ہاں! تو ان لوگوں کو ایک طرف تو اسلامی انداز پر تربیت نہیں دی گئی، اور دوسری طرف انھوں نے بڑے ہو کر زیادہ تر اُس لٹریچر کا مطالعہ کیا، جس میں ایمان و یقین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ذرا سی غذا بھی نہیں مل سکی! نماز، روزے سے پوری طرح

غفلت بلکہ بیزاری، مادہ پرستانہ لٹریچر کا مطالعہ، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان و یقین مضمحل ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے اسلامی ادب کا بھی مطالعہ کیا مگر شک کی نگاہ سے! اس طرف نظر کم ہی گئی بلکہ نہیں گئی کہ بنیادی اصولوں میں مسلمانوں کے تمام فرقے کس قدر متحد اور متفق ہیں زیادہ تر نگاہ اختلافات پر ہی رہی! اس فکر و مزاج کے لوگوں کو معاش اور روزی کی تنگی ہوئی، تو ان کا ذہن اس طرف گیا کہ اشتراکیت کی طرح معیشت کی مساوات ہمارے یہاں بھی ہوتی تو ان حالات سے ہمیں کاہیکو دوچار ہونا پڑتا! جب ان کو خوشحالی اور فراغت نصیب ہوئی تو شکر کی بجائے اپنے قلم اور دماغ کی توانائیوں ہی کو اس کا سبب قرار دیا، جب صبر و شکر اور توکل علی اللہ کا احساس اور داعیہ ہی سرے سے مفقود ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رزاقیت اور ربوبیت پر سے ایمان اٹھ جائے، تو اس کے بعد انکار و الحاد میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔

ان منکرین و ملحدین کے بعد دوسرا درجہ اُن متشککین کا ہے، جو الحاد کی دوزخ اور ایمان و یقین کی جنت کے درمیان تشکیک کے اعراف کا موقف رکھتے ہیں، جو نہ اِدھر ہیں اور نہ اُدھر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم ابھی غور و فکر کی منزلوں سے گزر رہے ہیں، مشاہدہ مطالعہ اور تجربہ جاری ہے، یہ گروہ بھی اسلام کے معاملے میں اجنبیت اور وحشت برتتا ہے! مگر پروفیسر براؤن اور جارج برنارڈشا کی طرح کبھی کبھار اسلام کی تعریف میں قصیدہ بھی سنا دیتا ہے۔

ملحدین اور متشککین کے بعد اُن لکھے پڑھے مسلمانوں کا نمبر آتا ہے، جن کے افکار مغرب زدہ ہیں اور جو ہر مسئلہ کو مغرب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور یورپ نے خوب و ناخوب کا جو معیار مقرر کیا ہے، یہی "معیار" ان "صاحب" لوگوں کے تخیل کی معراج ہے۔

پھر وہ حضرات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے خدا، رسول، کتاب اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اسلام سے بھی انہیں عقیدت ہے نماز، روزہ اور دوسرے دینی احکام سے بھی اُنہیں شغف اور دلچسپی ہے، مگر اسلام کے بارے میں اُن کا تصور بہت محدود ہے ــــ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسلام ہی وہ دین ہے، جو اپنے مزاج سے فاتح عالم اور آفاق گیر واقع ہوا ہے چونکہ اسلام "دینِ فطرت" ہے، اس لئے زندگی کے ہر شعبہ میں اسی دین کا چلن ہونا چاہیئے! اسلام سے بغاوت دراصل فطرت سے بغاوت ہے! اور فطرت سے بغاوت کر کے، نہ کوئی قوم پنپ سکتی ہے اور نہ کوئی فرد ترقی حاصل کر سکتا ہے ــــ ان حضرات کے سامنے جب "حکومت و سیاست" کا سوال آتا ہے، تو وہ اس سوال کو دنیاداری کی بات سمجھتے ہیں جیسے اسلام کا حکومت و سیاست سے کوئی تعلق ہے! ان حضرات کا طائرِ فکر و نظر "غنیمت ہے" کی فضا میں پرواز کرتا ہے ــــ اس طرح :-

• ــــ مانا کہ شراب، زنا، سود جیسی کھلی ہوئی برائیوں پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے اور اسلام کے قانون معطل پڑے ہوتے ہیں مگر نماز اور روزے کی تو آزادی ہے ــــ یہی غنیمت ہے ــــ! فلاں بڑا آدمی نہ نماز پڑھتا ہے اور نہ روزہ رکھتا ہے، مگر اس نے مسجدیں تو بنوادی ہیں، عید بقرعید کی نماز تو پڑھ لیتا ہے۔ یہی غنیمت ہے یہ وہ ذہنیت ہے جو غیر ضروری انکسار نفس اور شکست خوردگی میں مبتلا ہے! اگر قرنِ اول کے مسلمانوں کا خدانخواستہ یہی مزاج اور یہی فکر ہوتی، تو مانعینِ زکوٰۃ کے بعد تارکینِ صلوٰۃ کا ایک گروہ پیدا ہوتا اور اس طرح ایک ایک کر کے اسلام کے تمام احکام سے بغاوت کی جاتی، یہاں تک کہ جاہلیت و کفر پھر سے واپس آجاتے! حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں، انھوں نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کر کے جرأت و عزیمت کی ایک روشن مثال قائم کر دی اور دنیا کو بتادیا کہ اسلام بھکشوؤں، راہبوں، سنیاسیوں کا دھرم نہیں ہے بلکہ فاتحوں اور کشور کشاؤں کا دین ہے، جس میں امن و سلامتی کے ساتھ ساتھ حالات کے لحاظ سے مدافعت بھی ہے اور مزاحمت و اقدام اور محاسبہ بھی ہے۔

یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے اور اس وقت تک دہرائی جاتی رہے گی، جب تک لوگ اسلام کو سامنے

یہودیت اور ہندو دھرم کی طرح ایک مذہب سمجھتے رہیں گے کہ اسلام مذہب نہیں۔ الدین ہے! جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے! جو کوئی مسلمان ہوتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کے کچھ ایسے خانے اور شعبے بھی ہیں، جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ایسے کوتاہ اندیش کا اسلام غیر معتبر ہے!

عیسائیت کی طرح اسلام میں قیصر اور کلیسا کی تقسیم نہیں پائی جاتی۔ اسلام زندگی کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا، اسلام کے نزدیک زندگی ایک مستقل وحدت ہے، جو تجزی و تقسیم کو گوارا نہیں کر سکتی' اور کوئی شخص مسلمان ہوتے ہوئے، یہ نہیں کہہ سکتا، یہ تو میری معاشرتی زندگی ہے جس پر اسلام کا قانون نافذ ہوتا ہے' اور یہ میری پرائیوٹ لائف ہے، جس کو میں نے اسلام کے حدودِ عمل سے خارج کر دیا ہے ـــــــ یہ فکر، یہ تصور اور یہ عقیدہ غیر اسلامی عقیدہ ہے!

ہم نے جو کچھ اوپر عرض کیا ہے، یہ کوئی فلسفیانہ نکتہ سنجی شاعرانہ تشبیہ و استعارہ نہیں ہے خود قرآنِ کریم ایمان لانے والوں اور اسلام قبول کرنے والوں کو حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ! جو کوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے' وہ اس صریحی حکم کے بعد تاویل کی راہ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر سکتا! ہوائے نفس کے سبب ایک مسلمان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے مگر ایک مسلمان یہ نہیں کر سکتا اور نہ اس کو کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے ہوائے نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں چور دروازے نکالنے کے لئے تاویل اور نکتہ سنجی کی راہ اختیار کرے!

اسلام اپنا ایک مستقل فلسفۂ اخلاق اور ضابطۂ اخلاق رکھتا ہے' حلال و حرام کے حدود کھول کر بیان کر دیئے گئے ہیں! اللہ اور رسولؐ کے قائم کئے ہوئے حدود میں رد و بدل نہیں کی جا سکتی!

وہ نئے مسائل ہوں یا پرانے تصورات! آہن و سنگ کا عہد ہو یا سائنس کا دور! اسلامی اخلاق کی بنیادی قدریں کسی دور میں بھی نہیں بدلتیں' یہ قدریں مستقل قدریں ہیں' جن کو زمانہ کا تغیر چھو بھی نہیں سکتا! اسلام زمانہ کی ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کے لئے اپنے اندر لچک رکھتا ہے مگر جہاں تک اسلام کی اخلاقی قدروں کا تعلق ہے' وہ فولاد کی طرح سخت اور بے لچک ہیں!

جو حضرات "اسلامی حکومت" کے بارے میں سوالات کیا کرتے ہیں' ان کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ "اشتراکی حکومت" سے کیا توقع رکھتے ہیں! کیا وہ سرمایہ داری کے نظام کو چلاتی ہے یا اشتراکیت کی اقدار کو بروئے کار لاتی ہے' اگر ایک اشتراکی حکومت، اشتراکی عقائد اور نظریات کے مطابق چل سکتی ہے اور اس غرض کے لئے قائم کی جا سکتی ہے' تو پھر "اسلامی حکومت" کے بارے میں ذہن و فکر میں طرح طرح کے شبہات کس لئے ابھرتے ہیں! دنیا میں اشتراکیت چل سکتی ہے اور اسلام نہیں چل سکتا۔ یہ آخر اندازِ فکر کیا ہے؟

"اسلامی حکومت" اس حکومت کو کہتے ہیں' جس کا دستور' قانون اور طرزِ حکومت اسلام کے مطابق ہو اور اسلام کتاب و سنت سے عبارت ہے! اس لئے اسلامی حکومت کے مزاج میں یہ چیز داخل ہے' اور یہی مزاج اس کا "فرض" بھی ہے کہ کتاب و سنت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس مشین کے کل پرزے حرکت کرتے رہیں' جو چیزیں اسلام کے نزدیک معروف ہیں ان کو قائم کیا جائے، جو چیزیں اسلام کی نگاہ میں "منکر" ہیں' ان پر قانونی پابندیاں لگائی جائیں!

مغربی تہذیب نے اگر برائیوں کا نام "آرٹ" رکھ دیا ہے' تو کسی بری چیز کا اچھا نام رکھ دینے سے وہ برائی تو نہیں بدل جاتی! فحاشی، مجسمہ سازی، بت گری' رقص و سرود، شراب نوشی، قمار بازی، زناکاری، نامحرم مرد و زن کا اختلاط ـ ـ ـ ـ یہ تمام چیزیں اسلام کی نگاہ میں معاشرے میں بداخلاقی کا فساد پیدا کرنے والی ہیں' اس لئے اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان برائیوں پر

پابندیاں عائد کرے، اور ان فتنوں کو نہ اُبھرنے دے!

اس نوبت پر یہ سوال بعض ذہنوں میں اُبھرتا ہے کہ دُنیا کا آج کیا چلن ہے، زمانہ کس راہ پر جا رہا ہے؟ اُس سے موافقت نہ کی جائے تو دُنیا کا کام نہیں چل سکتا! فکر و خیال کا یہ وہ دوراہا ہے جہاں خاصے سمجھدار لوگوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں، حالانکہ بات بالکل سامنے کی ہے! سوچنا اور دیکھنا اس طرح چاہیے، دُنیا کا چلن اچھا ہے یا بُرا ہے اچھا ہے تو اُس سے موافقت کرنی چاہیے اگر بُرا ہے تو اُس کی مخالفت کرنی چاہیے، اسی طرح زمانہ اگر غلط راہ پر جا رہا ہے، تو زمانہ کی اس غلط روی کا ساتھ دینے کے لئے اسلامی تعلیمات میں کمی بیشی اور اصلاح و تبدیلی نہیں کی جا سکتی! جو لوگ انسانیت کے خیر خواہ ہیں، وہ زمانہ کی غلط روی کا ساتھ دینے کا بجائے، زمانہ کو سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، اور یہی وہ حقیقت ہے، جو اقبال کے یہاں شعر کے حسین قالب میں ڈھل گئی ہے۔

زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز

اسلام تمدن و تہذیب اور سائنس کی ترقیوں کا مخالف نہیں ہے، اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، وہ سائنس سے متصادم نہیں ہو سکتا، علم و فن کی ترقیوں کو اسلام نہیں روکتا، اس لئے اسلامی حکومت سائنس کی ایجادات سے فائدہ اٹھانے ہوئے کائنات کی تسخیر میں رکاوٹ نہیں بلکہ ممد و معاون ثابت ہوگی۔ اسلام جتنا قدیم ہے اُتنا ہی جدید بھی ہے قدیم اس اعتبار سے کہ دُنیا میں جس پہلے انسان کا وجود ملتا ہے، وہ انسان دینِ فطرت پر تھا، یعنی مُسلم تھا، اور جدید اس لحاظ سے کہ تمدن و تہذیب کے تمام جدید تقاضوں کا اسلام ساتھ دیتا ہے، بشرطیکہ وہ تقاضے اسلام کے ضابطۂ اخلاق کے مخالف نہ ہوں۔

بُت تراشی، رقص، سود خواری، قماربازی، شراب نوشی اور بدکاری یہ نہ تو سائنس کی ایجادیں ہیں اور نہ فلسفہ نے انہیں جنم دیا ہے، ان کا تعلق علم کی کسی شاخ سے بھی نہیں ہے، اور نہ یہ بُرائیاں "جدید" ہیں۔ جاہلیت کے دور میں یہ سب کی سب بُرائیاں پائی جاتی تھیں، مغربی تہذیب نے بس اتنا کیا ہے کہ ان بُرائیوں اور معصیتوں کو جلا دیدی ہے، انہیں خوشنما اور ہمہ گیر بنا دیا ہے اور ان کے اچھے سے نام رکھ دیئے ہیں! ——— اسلام نے جاہلیت کے غلط تقاضوں کا نہ اُس وقت ساتھ دیا تھا اور نہ اب اس "جاہلیت ثانیہ" کی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں کا ساتھ دے سکتا ہے!

جاہلیتِ اُولیٰ میں بھی عورت ذلیل تھی، مگر تہذیب حاضر نے عورت کو جتنا ذلیل، بے آبرو اور سستا بنا دیا ہے، اُس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اس تہذیب کے نمائندوں نے عورت کو حُسن کے مقابلوں کی چاٹ لگا دی ہے، جن میں عورت کے بدن کا معائنہ اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ پچھلے دور کی زنانِ بازاری بھی اس بے حیائی کو شاید گوارا نہ کریں! ہوائی جہاز ہوں، کلب گھر ہوں، ہسپتال اور ٹیلیفون کے مراکز ہوں، رقص خانے اور تھیٹر ہال ہوں مدرسے اور کالج ہوں غرض ہر مقام پر عورت کی عصمت اور پاکیزگی کے لئے طرح طرح کے خطرے مہیا کر دیئے گئے ہیں! غیر مردوں سے ہر وقت کا ساتھ، بات چیت، ہنسی مذاق، بے تکلفی ——— اس کے بعد جو کچھ بھی ہو جائے وہ تھوڑا ہے۔ اور یہ بات تہذیب اور ظن و تخمین کے ساتھ نہیں کہی جا رہی ہے، مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط کے جو نتائج ظہور میں آ رہے ہیں وہ انتہائی شرمناک اور ساتھ ہی افسوسناک ہیں! یہ کوئی راز نہیں ہے، جس کی پردہ دری کی جا رہی ہے اور نہ کوئی نفسیات کا دقیق نکتہ ہے، جسے ہم اُجاگر کر رہے ہیں، یہ تو عالم آشکارا باتیں ہیں، جنہیں ایک قلی اور رکشا چلانے والا بھی جانتا ہے۔

جو کوئی تہذیب حاضر کی ان بُرائیوں، معصیتوں، بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے اسلام کی ہمنوائی اور اُن کا ساتھ دینے کی توقع رکھتا ہے، اُسے اس باب میں اسلام سے مایوس ہو جانا چاہیئے! یہ "ترقیاں" نہیں "بُرائیاں" ہیں اسلام تہذیب و تمدن اور

سائنس کی ترقیوں کا ساتھ دیتا ہے ۔ "برائیوں" کا ساتھ نہیں دیتا۔

کسی گناہ کو بہت سے آدمی کرنے لگیں، تو گناہ کا اس طرح عام ہو جانا، اس کے جواز کے لئے دلیل نہیں بن سکتا، گناہ، گناہ ہی رہے گا چاہے ساری دُنیا اُس میں مبتلا ہو جائے اور اچھائی اچھائی ہی سمجھی جائے گی، خواہ اس کو ساری دُنیا نے چھوڑ دیا ہو! نظر اس پر نہیں رہنی چاہئیے کہ دُنیا کیا کر رہی ہے؟ دیکھنا یہ ہے کہ دُنیا کو کرنا کیا چاہئیے؟ کسی مُلک، شہر اور بستی میں اگر لوگ ڈکیتی اور رہزنی کو اپنا پیشہ بنا لیں، تو وہاں کی حکومت ڈاکوؤں اور رہزنوں کی کیا پشت پناہی کرے گی؟ یا ان برائیوں کے خلاف سخت قدم اُٹھائے گی!

اسی ایک مثال سے

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت میں کن باتوں کو ممنوع، قابلِ مواخذہ اور مستوجبِ سزا قرار دیا جائے گا ——— اسلام جن افعال و اعمال کو ناجائز قرار دیتا ہے، اُن سے تمدن و تہذیب کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے اور اُن کے ترک کر دینے سے سائنس کا فلسفہ کا، علم و تجربہ کا، معیشت و زندگی کا ذرہ برابر کوئی نقصان نہیں ہوتا! اسلامی حکومت کو جن لوگوں نے "رحمت" کی بجائے "زحمت" سمجھ رکھا ہے۔ اُن کا حال اس مریض جیسا ہے، جس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہو اور جسے مٹھاس میں تلخی محسوس ہوتی ہو یہ وہ لوگ ہیں جن کے ذہن و فکر کو مرض لاحق ہو چکا ہے، اور جن کے دل و دماغ صحت سے محروم ہیں!

اسلامی حکومت پر طنز کرنے والے، ایک بات یہ بھی کہتے ہیں، جو بہ ظاہر خاصی معقول نظر آتی ہے ——— یہ کہ تاجیریا ہو یا الجزائر یا کوئی دوسرا مُلک ان نو آزاد مسلمان ملکوں میں اسلامی حکومت کے مقابلے میں بلکہ اس کے علی الرغم قومی اور سوشل حکومتیں کیوں قائم ہو رہی ہیں؟ اس کا جواب ایک سوال میں مضمر ہے: —

"آج دُنیا کی سیاست مکر و فریب اور دغا بازی کی سیاست کیوں ہے؟
صالح اور ایمان دار سیاست کیوں نہیں اُبھرتی؟ ———"

اس سوال کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن بڑے لوگوں کے ہاتھوں میں دُنیا کی زمام کار ہے، وہ اپنی ذات سے غیر صالح اور غیر ذمہ دار واقع ہوئے ہیں، اس لئے یہ لوگ جس سیاست کو کام میں لاتے ہیں، وہ اُن کے کردار اور ذہنیت کی آئینہ دار ہوتی ہے! نیم کے درخت سے نبولیاں ہی پیدا ہوں گی، انگور اور انار کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں ——— تو مسلمانوں کے نو آزاد ملکوں میں جو قیادت اُبھر کر آئی ہے وہ ان اکابر کی قیادت ہے جو اپنے فکر و معتقدات میں مغرب زدہ اور نیشنلسٹ واقع ہوئے ہیں، اس لئے اس کلیہ کے مطابق کہ "ظرف میں جو کچھ ہوتا ہے، وہی اس سے چھلکتا اور ٹپکتا ہے"۔ ان قائدین سے بھی وہی ظہور میں آ رہا ہے، جس سے اُن کے دل و دماغ لبریز ہیں! یہ ملت کی بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ غیر اسلامی مزاج کے لیڈر مسلمانوں پر مسلط ہیں! یہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کا ان لیڈروں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے، اور اس تجربہ میں ناکام ہونے کے بعد، وہ دوسری طرز کی حکومتوں کی طرف بادلِ ناخواستہ مائل ہوئے ہیں، اسلامی حکومت تو بڑی چیز ہے ان خدا کے بندوں نے تو اسلام کی کسی ایک قدر کا بھی تجربہ نہیں کیا۔

مسلم ممالک کے یہ وہ قائدین ہیں جن کی تعلیم و تربیت مغربی طرز پر ہوئی ان کا رہن سہن بھی یورپین انداز کا تھا کی وابستگی بس قانونی قسم کی وابستگی رہی "نماز" روزہ اور دین کے دوسرے فرائض سے وہ بیگانے بیگانے سے رہے، انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کی تہذیب و تمدن کا انھوں نے زیادہ سے زیادہ اثر قبول کیا، اسلام کے مطالعہ کی اول تو انہیں توفیق ہی نصیب نہیں ہوتی اور تھوڑی بہت ہوئی بھی تو اسلام کا مطالعہ انھوں نے مغربی اہلِ قلم کے واسطے سے کیا۔ ایسے

لوگوں سے کون احمق یہ توقع رکھ سکتا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں جب اقتدار آئے گا تو وہ اسلامی نظام کو بپا کریں گے۔

ان تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک اور سوال سامنے آتا ہے، کہ اس قدر ناسازگار ماحول اور غیر موافق فضا میں اسلامی نظام آخر کس طرح برپا اور قائم ہوگا؟ ——— اس کے جواب میں عرض ہے کہ پہلے اس بات پر اچھی طرح مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ جس مقصد کے لئے جد وجہد کرنی مطلوب ہے، وہ مقصد اپنی جگہ نیک ہے یا نہیں ہے! اگر مقصد نیک ہے، اور اس کے پورا ہونے سے اسلام کی ملت کی بلکہ انسانیت کی فوز و فلاح وابستہ ہے، تو پھر مشکلوں اور دشواریوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے، حق کی راہ پھولوں کی سیج نہیں ہوا کرتی۔ اس راہ کے چلنے والوں کے پاؤں ہی چھلنی نہیں ہوتے۔ دل و جگر کو بھی زخمی ہونا پڑتا ہے، قربانی اور ایثار کے بغیر دنیا میں اصلاح و ترقی کا ایک نقش بھی نمودار نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے دین کو اللہ کی زمین پر نافذ و قائم کرنے والوں سے یہ حقیقت چھپی ہوئی نہیں ہے کہ حکومت و اقتدار کے بھوکے کو اسلامی نظام کے قیام میں اپنی شخصیت اور اقتدار کی موت نظر آتی ہے، اس لئے جہاں تک اُن کا بس چلتا ہے، وہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کا دین حکومت کے معاملات میں دخل انداز نہ ہونے پائے! یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ صالح معاشرہ غیر صالح لوگوں کی قیادت کو گوارا نہیں کر سکتا، اس لئے شراب فروشی کی سود خواری اور رقص و سُرود کی، تبرج جاہلیت کی، اور ان تمام فواحش و منکرات کی جن سے نیکی اور تقویٰ کے تصورات مضمحل اور کمزور ہوتے ہوں، پشت پناہی کی جاتی ہے، دوسری طرف اُن اداروں کو نوازا جاتا ہے جو دین کے مسلّمات کے خلاف نت نئے شوشے چھوڑتے، طرح طرح کی اُلجھنیں ڈالتے اور نئے نئے شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں، یہ وہ ضمیر فروش اہل قلم ہیں، جو اپنی تن پروری کی خاطر، مغرب زدہ ارباب اقتدار کے افکار کی تائید و تصویب کے لئے علمی دلیلیں فراہم کرتے ہیں ——— یہ مصیبت اسی حد پر جا کر ختم نہیں ہو جاتی، اصلاح معاشرہ کے نام پر ایسے قوانین وضع کئے جاتے ہیں، جن سے دین کا نظام شریعت مجروح ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے اُن مومنین کی، جن کو اللہ تعالیٰ کی زمین پر تمکن حاصل ہوتا ہے، یہ صفت بتائی ہے کہ وہ زمام اقتدار سنبھالتے ہی نماز کو قائم کرتے ہیں! مگر مغرب زدہ قصر نشین اقامت صلوٰۃ کی بجائے اسلامی ریسرچ کے ادارے قائم فرماتے ہیں!

مصر میں جمال ناصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، اس شخص نے سب سے پہلے اس دینی جماعت کو ختم کیا، جو مصر میں ہی نہیں بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں اللہ تعالیٰ کے دین کو برپا کرنے کے لئے جد وجہد کر رہی تھی! اخوان المسلمون کی تباہی دین و اخلاق کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے جمال ناصر نے مصر کا دستور ایسے ماہرین قانون سے بنوایا ہے، جو اس شخص کے مزاج، طبیعت اور خواہشوں کو اچھی طرح جانتے ہیں، پھر یہ دستور سنگینوں کے سائے میں نافذ کیا گیا ہے!

غضب خدا کا وہ مصر جو کبھی اسلام کا گہوارہ تھا، اُس کے شہروں میں فراعنۂ مصر کے مجسمے نصب کئے گئے ہیں، فرعونوں کو مصر کا ہیرو قرار دینے میں جمال ناصر کی یہ سیاست پنہاں ہے کہ صدیق و فاروق، عثمان و علی (رضی اللہ عنہم) کی شخصیتوں اور کرداروں سے مسلمانوں کی توجہ ہٹ کر فراعنہ پر مرکوز ہو جائے، تاکہ جمال ناصر صاحب کی شخصیت، سیرت اور کردار پر حرف گیری نہ ہو سکے!

مسلمانوں کے جس ملک میں بھی مصطفیٰ کمال، بورقیبہ اور جمال ناصر کی ذہنیت اور فکر کے اکابر موجود ہونگے، وہاں اُن لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے دین کو بپا کرنا چاہتے ہیں، قدم قدم پر دشواریوں اور مزاحمتوں سے دوچار ہونا پڑیگا، مگر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں اُنکے سامنے نتائج نہیں فرض کا احساس ہوتا ہے، اس لئے وہ دشواریوں سے نہیں گھبراتے، اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی دین کے کام کو جاری رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بندوں کو نتائج کی نہیں جد وجہد کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے، اس امتحان میں جو کامیاب ہو گیا، وہی آخرت میں سرخرو ہوگا! وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ!

ماہر القادری

یکم رمضان المبارک [illegible] فروری ۶۳

محمد حسام اللہ شریفی

اِسلام کا تصورِ عقد

خالقِ کائنات نے اپنے دستِ قدرت سے انسان کے خوبصورت اور عظیم الشان ہیولے کی تشکیل فرمائی اور اسے اپنی نمائش گاہ میں بلند ترین مقام عطا فرمایا کہ اس کی مصوری کا اعلیٰ ترین اور نادر شاہکار تھا اور پھر اس شاہکارِ دلنواز کی دو مختلف نوع ترتیب دیں ایک صنفِ نازک اور دوسری صنفِ مقابل اور دونوں کو ایک دوسرے کے لئے تخلیق کیا۔ اور ان میں سے ہر صنف اور نوع کے لئے دوسری میں کچھ ایسی کشش رکھ دی کہ بلا قصد واختیار وہ اس کی طرف کھنچی چلی آئے ——— اس کی فطرت میں شروع ہی سے یہ ودیعت فرما دیا گیا کہ انہیں ایک دوسرے کے میل جول اور امداد واعانت ہی سے اپنی زندگی بسر کرنا ہوگی ——— یا پھر یوں کہیئے کہ نصف بہتر درجۂ کمال تک پہنچنے کے لئے اپنے دوسرے نصف کی امداد کا محتاج اور تعاون کا خواہاں بنایا گیا۔ اور نہ صرف مذاہبِ عالم بلکہ حکما اور فلاسفۂ مشرق ومغرب کی نظر میں بھی ایک کے بغیر دوسرے کی زندگی نامکمل اور ناقص ٹھیری۔ اور اس فطری خواہش کو پامال کرنے کی صورت میں نبیٔ دینِ فطرت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی جماعت میں شمولیت سے محروم رکھا اور فرمایا۔ النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی (الحدیث)

اس فطری خواہش کو غیر فطری طریقے سے پورا کرنا نہ صرف دینِ فطرت بلکہ اہلِ عقل وخرد کے نزدیک بھی نہایت درجہ ناپسند ہونے کی وجہ سے ایک جرمِ عظیم قرار دیا گیا۔ اور دینِ فطرت نے اس حد تک احتیاط برتی کہ اس کے قریب تک جانے سے بھی اپنے پیروکاروں کو منع فرما دیا۔ حکم دیا کہ لَاتَقْرَبُوالزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (القرآن) یعنی تم زنا کے قریب بھی مت جاؤ کیوں کہ اس سے بے حیائیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اسی بنا پر دینِ فطرت یعنی اسلام نے اس فطری خواہش کی تکمیل اور غیر فطری طریقے سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے متبعین کو چار بیویوں تک رکھنے کی اجازت عطا فرمائی۔

لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے جو طریقہ دینِ فطرت نے مقرر فرمایا وہ پہلے سب طریقوں سے بہتر، برتر اور مکمل تھا۔ اگرچہ آج کل اس دورِ ترقی میں ہم ہر چیز کو مغرب کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اہلِ مغرب کی اچھائیوں اور خوبیوں کی بجائے برائیوں کو اپنانے میں پہل کرتے ہیں لیکن اس حقیقت کو اہلِ مغرب بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اسلام نے اس سلسلے میں جو قانون نافذ کیا وہی اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔

شادی سے مقصود محض حظِ نفس ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں ارفع واعلیٰ مقاصد دینِ فطرت کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ جن میں سے یہ چند قابلِ ذکر ہیں:۔

- افزائشِ نسلِ بنی آدم
- صنفِ نازک اور صنفِ مقابل آرام وسکون کی لذت سے آشنا اور ایک دوسرے کے غم واندوہ اور خوشی مسرت میں برابر کے شریک ہوں۔
- اور سب سے بڑھ کر شادی کا مقصد فریقین کی عصمت اور عفت کو قائم رکھنا ہے۔

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لئے اس نے کبھی اپنے متبعین کے لئے کوئی ایسی بات لازم قرار نہیں دی جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہو اور جسے امیر اور غریب سب لوگ بخوبی انجام نہ دے سکتے ہوں۔ اور اگر کوئی ایسا حکم دیا بھی ہے تو وہ امیر اور غریب کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لئے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے معاملے میں بھی اسلام نے ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کی جس کی بنا پر غریب کو امیر کا زیر بار احسان ہونا پڑے اور اس کی عملی مثال اسوۂ رسول علیہ السلام میں خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح میں انتہائی سادگی اختیار کر کے دی گئی۔

اسلام اپنے متبعین کو زندگی کے اس نئے دور میں داخل ہونے کا جو طریقہ بتلاتا ہے وہ نہایت ہی سادگی کا حامل ہے اور اس طرح ہر شخص اس مقدس فریضے سے بڑی آسانی سے سبکدوش ہو جاتا ہے اور کوئی بوجھ محسوس نہیں کر پاتا اور بہ آسانی اس فریضے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

رسم و رواج

ہمارے ہاں شادی کو مجموعۂ رسوم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پھر خاص طور پر وہ لوگ ان رسوم کا آلۂ کار بنتے ہیں جو لڑکیوں کے والدین یا سرپرست ہوتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے لڑکیوں کی پیدائش کو لوگ اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ ان رسم و رواج کی بیجا قیود اور پابندی اور سب سے بڑھ کر ناک کٹ جانے کا اندیشہ ہر وقت ان پر مسلط رہتا ہے اور محض اسی بنا پر بہت سے غریب گھرانے شادی جیسے مقدس فریضے کی ادائیگی سے قاصر رہتے ہیں۔ نہ وہ اس قدر رقم فراہم کر پاتے ہیں کہ برادری کو مدعو کر کے ان رسوم کو پورا کر سکیں جنہیں اس سلسلے میں ان کے ہاں لازمی سمجھا جاتا ہے اور نہ وہ قرض لینے کی اپنے میں ہمت پاتے ہیں۔ لیکن تا بکے۔ آخر کب تک جوان لڑکی کو اپنے گھر بٹھائے رکھیں۔ مجبوراً انہیں قرض کا سہارا لینا پڑتا ہے جو اکثر اوقات مرتے دم تک بھی ادا نہیں ہو پاتا۔

جہیز کو، جس کے بغیر شادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس کے بغیر شادی ہونا قریب قریب ناممکن ہے، ان رسموں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ کیونکہ جہیز کی توقع نہ ہونے کی صورت میں اس کی لڑکی سے کوئی پیغام دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ جہیز، جو سراسر دکھاوے کے لئے دیا جاتا ہے اور اسی بنا پر شادی میں شریک ہونے والے ایک ایک شخص کو اشیائے جہیز دکھائی جاتی ہیں اور پھر بازار میں نمائش کی غرض سے سجا کر مزدوروں کے سروں پر رکھ کر لیجائی جاتی ہیں۔ شادی کی رسوم میں یہ بدترین رسم ہے۔

پھر بری کی رسم کہ یہ بھی جہیز ہی کی رسم سے مشابہ ہے۔ سلامی کی رسم، جوتا چھپائی کی رسم، چوتھی اور بہوڑے کی رسوم اور ان کے علاوہ دوسری ان گنت رسمیں، کہ ان رسموں ہی سے ہمارے یہاں کی شادی مرکب ہوتی ہے اور ان رسوم قبیحہ اور افعالِ شنیعہ کے امتزاج ہی سے وہ شے ظہور میں آتی ہے جسے عقدِ مسنون کے متبرک اور مقدس نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن اسلام ان تمام فضول اور بیہودہ رسم و رواج سے اپنے متبعین کو نہایت سختی سے روکتا ہے اور انہیں اس بات کی قطعاً کوئی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے خون اور پسینے کی گاڑھی کمائی کو ان باتوں میں صرف کریں جن کا مقصد لوگوں سے محض نعرہ ہائے تحسین اور داد وصول کرنا ہو۔

اسلام کی ہدایات

شادی کے معاملے میں اسلام اولاً اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ دونوں فریق جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنا ہے بیشتر اس سے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عہد کریں انہیں ایک دوسرے کے افکار و خیالات اور عقائد و نظریات کا مطالعہ کر لینا چاہیئے۔ کہیں ایک دوسرے کے نظریات آپس میں متصادم ہونے کی صورت میں انہیں فوراً بعد ہی علیحدگی اختیار نہ کرنا پڑ جائے اور پھر انہیں اس معاملے میں والدین سے مشورہ کرنے کا حکم بھی دیا لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اسلام والدین کو مشورہ دینے کا حق ہی بخشتا ہے لڑکے اور لڑکی کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیتا۔ البتہ فریقین کو اپنے والدین کے مشورے کا احترام اور اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ پھر اگر دونوں فریق اپنی بقیہ زندگی ایک ساتھ بسر کرنے پر آمادہ و تیار ہو جائیں تو ان کے والدین کو ان کی امداد اور ان سے تعاون کرنا چاہیئے۔

فریقین کے آپس کے اس معاہدے کو عقد اور نکاح سے تعبیر کیا گیا اور انہیں اہتمام سے محفوظ رکھنے اور ان کی نسل کو معاشرے میں ایک مستقل مقام اور مرتبہ دلانے کے لئے اس موقع پر چند افراد کی موجودگی کو بھی اسلام نے ضروری قرار دیا۔

اللہ رب العزت اپنے کلام مقدس میں اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے فانکحوا ما طاب لکم۔ تم ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں اس میں تمہارے والدین کی پسند کو دخل نہیں۔ زندگی تمہیں بسر کرنا ہوگی اس لئے شریکِ زندگی کا انتخاب تم خود اپنی پسند سے کرو لیکن ذرا سوچ سمجھ کر۔ محض ظاہری ٹیپ ٹاپ ہی پر نہ جاؤ بلکہ اس کے ظاہری اور باطنی محاسن کو پرکھ کر پھر اس کا فیصلہ کرو کہ واقعی وہ تمہاری آئندہ زندگی میں ممد و معاون ثابت بھی ہو سکے گی؟ اور اس سلسلے میں جلد بازی سے کسی طرح بھی کام نہ لو۔ اور حقیقی حسن و جمال تو علم و ادب ہی سے تشکیل پا کر وجود میں آتا ہے ؎

لیس الجمال باثواب تزینا
بل الجمال جمال العلم والادب

ایک صحابی نے جناب نبی کریم علیہ السّلام کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور اطلاع دی کہ حضورؐ! میں نے ایک انصاری عورت سے پیغام نکاح دیا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا "بھلا تم نے اس عورت کو دیکھا بھی ہے؟" انھوں نے نفی میں جواب دیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا "فاذھب فانظر الیھا۔" (صحیح مسلم) جاؤ اور اُسے دیکھ لو　پھر بعد میں اس عورت سے شادی کر کے تمہیں پچھتانا پڑے یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دیکھنے سے محض شکل و صورت کا دیکھ لینا مراد نہیں بلکہ اس وقت تک کی سابقہ زندگی میں اُس کے عادات و اخلاق اور کردار و افعال کا مطالعہ کرنا بھی مقصود ہے۔ اسی قسم کے دوسرے مسائل سے خاتم النبیین احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کی علت بھی بیان فرما دی۔ فانہ احریٰ ان یودم بینکما (ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ وغیرہم) اس دیکھ لینے سے تم ایک دوسرے کے عادات و اخلاق سے آگاہ ہو جاؤ گے اور اس واقفیت کے بعد پھر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوئے تو تمہارے درمیان زیادہ محبت و الفت ہونے کے باعث اپنی زندگی زیادہ بہتر طریقے سے بسر کر سکو گے۔

اسلام نے اس کی ممانعت بھی کر دی کہ لڑکی کی مرضی نہ ہوتے ہوئے اُسے کسی دوسرے سے وابستہ کر دیا جائے اور اس کی رضامندی اور اجازت کو کوئی وقعت ہی نہ دی جائے۔ اس کے برعکس اسلام نے اپنے پیروکاروں کو تلقین کی کہ اُس کے والدین کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ وہ اس کا ہاتھ اس کی رضامندی اور اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے ہاتھ میں پکڑا دیں اور اس کی زندگی کی باگ ڈور دوسرے آدمی کے ہاتھ میں دیدیں۔ ایک کنواری لڑکی نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی اور اپنے والدین کی شکایت کی کہ انھوں نے بغیر اس کی مرضی ایک شخص سے شادی کر دی ہے اب اُسے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئیے۔ رسول اللہ نے اُسے اختیار دیا کہ چاہے تو والدین کی اطاعت کرتے ہوئے اُس شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے اور چاہے تو اس معاہدے کو ختم کر دے۔ فخیرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ابوداؤد) جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کنواری لڑکی کو بھی اس کے والدین کسی شخص سے شادی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اس معاملے میں لڑکی کی رضامندی ہی معتبر ہوگی اور اُس سے اجازت حاصل کرنا نہایت ضروری ہوگا۔ بصورت دیگر یہ نکاح کسی صورت میں بھی درست نہیں ہوگا۔ صحیح مسلم میں ہے لا تنکح البکر حتی تستاذن۔ کنواری لڑکی کا نکاح اُس سے اجازت لئے بغیر عمل میں نہیں آتا اور سنن نسائی میں اس کی مزید وضاحت فرما دی گئی۔ البکر یستامرھا ابوھا۔ یعنی کنواری لڑکی کا نکاح کرتے وقت اُس سے مشورہ ضرور کر لیا جائے۔

اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئیے کہ کنواری لڑکی سے حصولِ اجازت کی تین صورتیں ہیں۔ سب سے پہلی صورت تو یہ ہے کہ

لڑکی اپنی زبان سے اجازت اور رضامندی کے الفاظ ادا کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے قلم کو حرکت میں لائے اور تحریری طور پہ اپنے آپ کو اس شخص کے ساتھ وابستہ ظاہر کردے اور تیسری صورت اُس لڑکی سے متعلق ہے جیسے انتہا شرمیلی ہو اور اس معاملے میں زبان کھولتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہو اور پہلی دونوں صورتوں میں اس سے اجازت لینا ممکن نہ ہو یعنی اجازت باللسان اور اجازت بالکتابت کی اُس سے توقع نہ ہو تو اُس کی غیرت مندانہ خاموشی کو ہی اُس کی اجازت اور رضامندی سمجھا جائے گا۔

اور پھر نبیٔ دینِ فطرت نے اس کی وضاحت بھی بتمام وکمال فرمادی کہ شادی کرتے وقت عورت کی کن خوبیوں کو مدنظر رکھا اور کس قسم کی عورت کا انتخاب کیا جائے۔ علیکم بالابکار فانھن اعذب افواھا وانتق ارحاما وارضی بالیسیر (ابن ماجہ) کنواری لڑکیوں سے شادی کیا کرو کیوں کہ وہ شیریں دہن، پاکیزہ رحم رکھنے والی اور تھوڑے پر راضی ہوجاتی ہیں۔ تنکح المرأۃ لاربع لمالھا ولحسبھا ولجمالھا ولدینھا فاظفر بذات الدین (بخاری ومسلم) عورت سے عموماً چار خوبیوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ اُس کے مال و دولت، اُس کے حسب اور نسب، اُس کے حسن وجمال اور اس کی دینداری کے سبب۔ لہٰذا تم دیندار عورت کو اپنے لئے منتخب کیا کرو۔ تزوجوا الودود الولود وفانی مکاثر بکم الاولاد (ابو داؤد۔ نسائی) ایسی عورتوں سے نکاح کیا کرو جن سے زیادہ اولاد ہونے کی توقع ہو۔

ضبط تولید اس مقام پر جملہ معترضہ کے طور پر ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث مثلاً صحیح مسلم کی یہ روایت قال رجل یارسول اللہ ای الذنب اکبر عند اللہ۔ قال ان تقتل ولدک مخافۃ ان یطعم معک۔ اس حقیقت کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں کہ اسلام میں ضبطِ تولید کی کوئی گنجائش اور اجازت نہیں۔ ان احادیث اور خود قرآن مجید میں خشیۃ املاق کے الفاظ سے تنگیٔ رزق کی بنا پر ہی، جو آج بھی ضبط تولید اور خاندانی منصوبہ بندی کا پرچار کرنے والوں کے ہاں ایک معقول سبب اور بڑی اہم وجہ شمار کی گئی ہے' ضبطِ تولید سے روکا گیا ہے کیوں کہ اس طرح معاشرے میں بے حیائی، فحاشی اور عیاشی ہی رواج پذیر نہیں ہوتیں بلکہ اخلاقی پستی بھی عام ہوجاتی ہے۔

اسلام نے تنگیٔ معیشت کے حل کا یہ طریقہ ہرگز نہیں بتلایا کہ ضبط تولید کے ذریعے اس مسئلہ لاینحل کو حل کرنے کی ناکام کوشش کی جائے بلکہ منفی اقدامات کی بجائے مثبت اندازِ فکر و نظر اختیار کرنے کی تلقین کی کہ ایسے ذرائع اور وسائل بروئے کار لائے جائیں جن سے بنجر زمین قابلِ کاشت ہوجائے اور اسی قسم کی دوسری تدابیر اختیار کی جائیں جن سے غذائی قلت ختم ہوجائے۔

دعوتِ ولیمہ اس جملۂ معترضہ کے بعد سلسلۂ کلام پھر اصل مقصود کی طرف دعوتیں اٹھانے کی خاطر لوٹانا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں آج کل کی مختلف النوع دعوتوں میں سے اسلام دعوتِ ولیمہ کو مسنون قرار دیتا ہے۔ دولہا اپنی جانب سے اس خوشی میں، کہ اب وہ زندگی کے نئے دور میں داخل ہو رہا ہے اور ذمہ داری کی منزل میں قدم رکھ رہا ہے اپنے احباب اور اعزا اور اقربا کو بھی شریک کرے لیکن اس کی تلقین بھی فرمائی گئی کہ صرف اپنے دوست احباب اور اعزا و اقربا۔ اور امراء محلہ ہی کو شریکِ دعوت نہ کیا جائے بلکہ فقرا اور مساکین کو بھی دعوتِ ولیمہ میں مدعو کیا جائے۔ شر الطعام طعام الولیمۃ یدعی لھا الاغنیاء ویترک الفقراء ومن ترک الدعوۃ فقد عصی اللہ ورسولہ (مسلم اور بخاری) یعنی سب سے بدتر دعوت وہ ولیمہ کی دعوت ہے جس میں امرا کو شریک کیا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے اور جو شخص دعوتِ ولیمہ کو قبول نہ کرے اس نے اللہ اور اُس کے رسول علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ اور دعوت دیئے جانے کی صورت میں شرکتِ ولیمہ کو پیغمبر اسلام نے ضروری قرار دیا اور شریک نہ ہونے کی صورت میں خدا اور رسول ؐ کی نافرمانی سے تعبیر فرمایا۔ اذا دعی احدکم الی الولیمۃ فلیاتہا (بخاری ومسلم) جب تم میں سے کسی کو دعوتِ ولیمہ دی جائے تو اُسے اس میں ضرور شرکت کرنی چاہیئے۔ اور امت کو اس بات کی بھی تلقین فرمائی اور یہ ادب بھی سکھایا کہ بغیر بلائے دعوت میں شرکت سے گریز کیا جائے اور ان لوگوں کو جو بن بلائے دعوت میں شریک ہوں زجر و توبیخ فرمائی اور دربارِ رسالت ؐ

سے انہیں چور اور غاصب کے لقب سے نوازا گیا۔ من دخل علی غیر دعوۃ دخل سارقاً و خرج مغیراً (ابوداؤد) جو شخص بغیر دعوت دیئے کسی کی دعوت میں شریک ہوا وہ داخل کے وقت تو ایک چور کی حیثیت سے داخل ہوا اور نکلتے وقت ایک غاصب کی حیثیت سے نکلا۔

اسلام نے اگرچہ مہر کی تحدید نہیں کی تاہم اس امر کا اہتمام ضرور کیا کہ مہر صرف اسی قدر مقرر کیا جائے جو بہ آسانی ادا کیا جا سکے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا الا لا تغالوا صدقۃ النساء (ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ) خبردار! عورتوں کے مہر کے معاملہ میں مبالغہ (زیادتی) کو اپنا شیوہ نہ بناؤ۔

لوگوں کے حالات اور طبائع ایک دوسرے سے مختلف اور ممالک متفرقہ کی آب و ہوا ایک دوسرے سے جداگانہ ہونے کی وجہ سے اسلام نے شادی کے سلسلے میں لڑکے اور لڑکی کی عمر کے لئے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ جب بھی کوئی شخص ضرورت محسوس کرے اُسے اسی وقت شادی کر لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور اس میں بالغ اور نابالغ کی بھی کوئی قید نہیں لگائی گئی اور یاد رکھنا چاہیئے کہ ان مسائل میں کسی قسم کی تجدید کرنے کا حق اسلام نے کسی حکومت کو بھی نہیں دیا۔ اور اس اہم مسئلے کو مطلق چھوڑ دینے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلام کے پیش نظر اپنے متبعین کی عصمت اور عفت اور ناموس کو ہر صورت میں بحال رکھنے کی کوشش رہی ہے اور انہیں ہر ممکن طور پر غلط طریقہ اختیار کرنے سے بچایا گیا اور جائز طریقے سے اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس قسم کے احکامات دینے کی ایک وجہ اسلام کا عالمگیر مذہب ہونا بھی ہے۔ یہ مشرق کے لئے بھی ہے اور مغرب کے لئے بھی، عرب کے لئے بھی ہے اور عجم کے لئے بھی۔ اور یہی ایک ایسے مکمل دین کی شکل میں لوگوں کے سامنے آیا ہے جو رہتی دنیا تک بغیر کسی ترمیم و تنسیخ نافذ ہو سکتا ہے اور یہی ایک ایسا مذہب ہے جس پر چل کر نجاتِ اُخروی اور فلاح دنیوی حاصل ہو سکتی ہے۔

بس یہی چند افعال اور اعمال ہیں جنہیں اسلام شادی کے موقع پر جائز قرار دیتا ہے۔ ان میں سے بعض وہ افعال بھی ہیں جنہیں لزوم اور وجوب کا درجہ حاصل ہے۔ اور یہ تمام افعال اور اعمال یقیناً ایسے ہیں کہ جنہیں ہر امیر اور غریب بآسانی انجام دے سکتا ہے اور اس طرح ہر شخص نہایت آسانی سے اس مقدس فریضے سے فراغت حاصل کر لیتا ہے جسے لوگوں نے مجموعہ رسوم بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہے مزاجِ آدمیت امتزاجِ مرد و زن — لازم و ملزوم دونوں، رُوحِ زن ہے مردِ تن
ہے ظہورِ زن سے مردانہ شعورِ زندگی — مرد آنکھیں، عورتیں آنکھوں کی ہیں تابندگی

مرد اک خاک ہے، اس خاک میں عورت رنگ ہے
مرد ہے اک ساز، عورت ساز میں آہنگ ہے

—×—

"قولِ فیصل"

پانچ ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا تھا، جس کے تمام نسخے ختم ہو گئے! اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت چند ماہ بعد ہو سکے گی! اس لئے شائقین حضرات "قولِ فیصل" (مصنفہ ماہر القادری) منگانے کی زحمت نہ فرمائیں!

مہتمم مدرسہ اسلامیہ، گلبرگ، لاہور

عبدالمجید اصلاحی - طبیہ کالج - لکھنؤ

عربوں کی بلاغت

(یہ مقالہ الاستاذ حمید الدین الفراہیؒ کے افکار و خیالات کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے جو مضمون کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا واحد مقالہ قارئین کے لئے ثابت ہوگا)

اعجازِ قرآن کو آئینہ بنا کر پیش کرنے کے لئے علماءِ اسلام نے عجمی بلاغت کے فن کے ساتھ دلچسپی کا عظیم الشان مظاہرہ کیا ہے۔ جس سے بڑھ کر افسوسناک غلطی کی مثال اُمت کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ملے۔ علمائے اگر اس کے بجائے کلامِ عرب کے غائر مُطالعہ، اس کے محاسن کی جستجو، حسن و قبح اور تنقیدی حدود کی تعیین کا اہتمام کیا ہوتا اور پھر قرآن کے محاسن کلام کا مطالعہ اور اس کے اعجاز نظم و ترتیب پر غور و فکر کیا ہوتا تو یہ قرآن پاک کے بحرِ معانی میں اتر کر حقائق و معارف کی غواصی کا آسان اور صحیح طریقہ ہوتا۔

متقدمین میں صرف جاحظ کی ایک شخصیت ایسی ہے جسے مذکورہ کلیہ سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ یہ شخص کلامِ عرب کا دلدادہ، شیدائی اور صحیح معنوں میں اس کا متبع اور پیرو تھا، تعبیر و بیان کے اندر اس نے قدیم عربوں کی ادبی روایات کو پوری شان کے ساتھ قائم رکھا۔ زبان و ادب کا معاملہ رہا ہو، یا بلاغت و معانی کا کہیں بھی اس کا قدم جادۂ عرب سے نہیں ہٹا۔ اس کی ادبی زندگی کے اس رُخ کی ترجمانی اس کے اس بیان سے بخوبی ہو جاتی ہے "سلف اور خالص عربوں کے خطبے ناپسندیدہ الفاظ، پر تکلف معانی، گھٹیا مذاق اور بدگوئی کے کسی بھی عنصر سے بالکل پاک تھے۔ یہ تمام باتیں زیادہ تر ان تجدد پسند متاخرین اور ادب نواز اہلِ فن میں پائی جاتی ہیں جو تکلف پسند اور بزعم خویش نازک خیال واقع ہوئے ہیں۔ ان کا برجستہ کلام ہو یا غور و فکر کے بعد کہا گیا کلام بہرحال وہ مذکورہ معائب سے پاک نہیں ہوتا"۔

صاحبِ دلائل الاعجاز نے اس باب میں اپنا جو مقام اختیار کیا ہے وہ بڑا ہی تعجب خیز اور افسوسناک ہے۔..... حد ہے کہ کرنے متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کو سراہا، ان کے فضائل کا اعتراف کیا اور پھر ان کے ادبی محاسن کا کچھ اس انداز میں تذکرہ کیا کہ بڑے بڑے لوگ دھوکہ کھا بیٹھے۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ بیچارے کو کلامِ عرب کے مطالعہ و تحقیق کی توفیق ہی حاصل نہیں ہوئی۔ ورنہ وہ متاخرین کے فضل و کمال کا نغمہ نہ الاپتا۔ اس نے اگر متقدمین کا کلام دیکھا ہوتا تو یقیناً وہ بھی وہی بات کہتا جو جاحظ کے قلم سے نکل چکی ہے۔ مگر افسوس اس نے اپنے تنقیدی خیالات و افکار کی عمارت سراسر متاخرین کی تخلیقات پر تعمیر کی جس نے اسے حقیقت سے بہت دور جا پھینکا۔

عربوں کا تنقیدی سرمایہ

یہ تصور بالکل غلط ہے کہ کسی قوم کی فطرت میں زبان و ادب کی بلاغت کا جوہر تو موجود ہو مگر وہ کلام کے کھرے کھوٹے اور غلط و صحیح کی تمیز سے بالکل عاری ہو۔ جس طرح عربوں کی بلاغت، اور زبان دانی کو تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح ان کی تنقیدی صلاحیتوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر اس کے اندر تنقیدی پرواز کا وجود نہ مانا جائے تو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں ہر شخص کو تامل ہو سکتا ہے کہ عرب قوم بلاغت و معانی کی انتہائی بلندیوں پر جا پہونچی تھی۔

قصائد کی مختلف درجہ بندی، معلقات، مذہبات، منتقیات اور مجمہرات وغیرہ کی لافانی تقسیم، بازار عکاظ اور دوسرے عظیم عرب قومی میلوں میں شعر و ادب اور بلاغت و خطابت کی معرکہ آرائی اور پھر حکم کے اطمینان بخش اور قطعی فیصلے، شعر و نظم کے صدر سے ایک قوم خوابیدہ کو جگا کر شعلۂ جوالہ بنا دینا یا بیداروں کو خوابِ غفلت میں واپس کر دینا، عزیز کو ذلیل اور ذلیل کو عزیز تر بنا دینا، قوم ممدوح کو تا بہ عرش پہونچا دینا

جنگ کے بجھتے ہوئے شعلوں کو دفعتاً بھڑکا دینا۔ یہ سب باتیں عرب کی جاہلی تنقید کے آئینے نہیں تو اور کیا ہیں؟ لائق فکر ہے یہ بات کہ اگر عربوں میں فن بلاغت کا کوئی ضابطہ اور زبان وادب کا کوئی معین اصول نہ ہوتا تو شعر وادب کے باہمی مقابلہ میں ایک حکم اپنے فیصلے کیوں کر دے سکتا تھا؟ اور ان فیصلوں کو عرب جیسی غیور قوم کیوں کر مان سکتی تھی؟ وہ کیا ضابطہ نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ ایک قصیدہ کو سنہری حرفوں سے لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کرتے اور دوسرے قصیدہ کو بالکل ہی ناقابل التفات تصور کرتے۔

دور جاہلیت میں مہلب کی بیٹیوں کا قصہ مشہور ہے، جن کی غربت وافلاس نے انہیں شوہروں سے محروم کر رکھا تھا۔ اعشیٰ کا یہاں سے گزر ہوا تو مہلب نے اسے اپنی داستان غم سنائی۔ اعشیٰ بیحد متاثر ہوا اور جب وہ عربی قبائل میں پہونچا تو دختران مہلب کی شان میں اس طرح قصیدہ خواں ہوا کہ نکاح کے ایک دو نہیں سینکڑوں پیغامات پہونچ گئے۔ پیغام دینے والوں میں امیر وغریب اور حاکم ومحکوم سبھی تھے، آخر اعشیٰ کے کلام نے ان لڑکیوں کے اندر کونسی خوبیاں بھر دیں۔ جن کے سحر سے لوگ مست ودیوانے سے ہوگئے۔

اسی اعشیٰ نے علقمہ ابن علاثہ کی شان میں ہجو کرتے ہوئے ایک شعر کہا تھا ؎

تبیتون فی المشتیٰ ملاً بطونکم　　　وجاراتکم غرثیٰ یبتن خمائصا

تم شکم سیر ہوکر موسم سرما کی راتیں بسر کرتے ہو اور تمہارے ہمسایہ خالی پیٹ بھوکے سو رہے ہوتے ہیں ——

اصحاب ذوق کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اعشیٰ کا یہ شعر سارے کلام جاہلی کے اندر "اھجیٰ بیت" یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ہجو یہ شعر نہیں ہے علقمہ نے جب یہ شعر سنا تو آہ وبکا سے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کہنے لگا "اے اللہ! تو اعشیٰ کو رسوا کر، اگر وہ جھوٹا ہے تو اسے اس غلط بیانی کی بھرپور سزا دے"

لبید کا یہ شعر ؎

وجلا السیول عن الطلول کأنھا　　　زبر تجد متونھا اقلامھا

"اور سیل رواں کے مختلف دھاروں نے (محبوبہ کے) کھنڈروں کو دھوکر ان قدیم صحیفوں کے مانند بالکل روشن کر دیا ہے جن کی عبارتوں کو روشنائی پھیر کر پھر سے تازہ کر دیا گیا ہو"

جب فرزدق نے سنا تو سجدہ میں گر پڑا۔ لوگوں نے کہا "ابوفراس! یہ کیا کر رہے ہو؟" تو اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم سجدۂ قرآن کا علم رکھتے ہو اور میں سجدۂ شعر کا"

اور جب اسی لبید نے اپنا یہ شعر ؎

یعلو طریقة متنھا متواتر　　　فی لیلة کفر النجوم ظلامھا

اس وحشت زدہ نیل گاؤ کے سلسلۂ پشت پر بارش پیہم کے قطرات ایسی تیرہ وتار شب میں گرتے ہوئے گذر رہے ہوں جس کے سیاہ پردوں نے تاروں کو بھی ڈھک رکھا ہو۔

اپنا مشہور قصیدہ پڑھتے ہوئے سنایا تو شعراء فوراً سجدہ ریز ہوگئے۔

غور وفکر کا انداز مذکورہ بالا نہج پر اختیار کیا گیا ہوتا تو ٹھوکریں کھانے کی کوئی وجہ نہ تھی، مگر

صاحب اسرار البلاغۃ کی روش

حقیقت یہ ہے کہ اس انداز پر سوچنے کی زحمت کبھی گوارا نہ کی گئی، ادب کے معاملہ میں صاحب اسرار البلاغۃ نے جو روش اختیار کی ہے وہ روش عربوں کی قطعاً نہ تھی۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ آگے مزید غور وفکر کا دروازہ بھی بند ہوگیا۔ یعنی بعد کے اصحاب ذوق نے اسی اسرار البلاغۃ کو اپنا مرجع اور معتمد قرار دیا جس کے نتیجہ میں ان کے اور کلام عرب کے فہم اور مطالعہ وتحقیق کے

مابین ایک زبردست خلیج سی حائل ہوگئی۔ اگر صرف کلام عرب کا بلاواسطہ مطالعہ رکھا جائے اور حقیقت سے بہک جانے والوں کی بنائی ہوئی روش کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو یہ طریقہ زیادہ انسب اور علمی ہوگا۔ اس طرح فن کے راستے سے نہ سہی پھر بھی ایک ایسا مستحکم ادبی ذوق ابھر سکتا ہے جس سے اعجاز قرآن کے فہم کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

بلاغت ارسطو کی نظر میں

ارسطو، یونانی قوم کا ایک فرد۔ کلام عرب سے اس کا کوئی دور کا علاقہ تک نہیں پھر بھی اس نے ادب بلاغت کے ضمن میں اپنا جو نظریہ پیش کیا ہے بعض علماء اسلام کے مقابلہ میں غنیمت ہے۔ اگر اس کے پیش نظر یونان کا کلام جو قصص و حکایات کا ایک دفتر بے معنی ہوا کرتا تھا نہ ہوتا بلکہ عربوں کا کلام ہوتا تو یہ شخص اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں، کامیاب ہو جاتا۔ اور آج وہ دشواریاں مطلقاً باقی نہ رہ جاتیں جو کلام عرب کو سمجھنے میں پیش آرہی ہیں۔

ارسطو نے شعر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک ایسا اصول پیش کیا ہے جو صداقت کے بالکل قریب جا پہونچا تھا۔

"شعر و نغمہ کی سرحدیں محاکات سے محدود ہیں کیونکہ انسان فطرۃً یا تعلیم کے نتیجہ میں رنگ، شکل یا آواز سے مختلف چیزوں کی نقالی ہی کرتا ہے"۔

مگر اس نے جہاں شعر کی علت مادی، علت غائی، اور مبدء وغیرہ پر بحث کی ہے وہاں وہ حقیقت سے بہت دور نکل گیا ہے اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس کے پیش نظر صرف اپنی ہی قوم کا شعر و ادب تھا۔ اگر اس نے اپنے قومی ادب سے گریز اختیار کر کے شعر و ادب پر خالص فلسفیانہ رنگ میں غور و فکر کیا ہوتا اور مابعد الطبیعاتی علل و اسباب پر بحث و تمحیص کی طرح یہاں بھی بلند ہوا فکر و نظر دوڑاتا تو حق کا دامن اس سے کسی حال نہ چھوٹتا۔

ارسطو کا نظریہ ہو سکتا ہے اس کے عنفوان شباب کے فکر کا نتیجہ ہو، ہم اس کی خامیوں سے اغماض بھی کر لیتے ہیں لیکن چونکہ اس کے اس نظریہ کا اثر فن بلاغت پر پوری طرح پھیلا ہوا ہے اس لئے ہم ذرا تفصیل سے اس پر گفتگو کرنے کے لئے مجبور ہیں۔

یونانی شعر و ادب چونکہ تمامتر قصص و حکایات پر مشتمل تھا۔ ہومرس (HOMERS) اور سوفاکلیس (SUPHOKOCLIS) جیسے یونانی شعراء ہی کو اس وقت مقبولیت حاصل تھی اس لئے اصول تنقید اور محاسن ادب کی تعین کے لئے ارسطو کو بھی دفاتر پیش نظر رکھنے پڑے کیونکہ کسی زبان کے محاسن وجود میں پہلے آتے ہیں پھر اصحاب نظر انہیں سامنے رکھ کر اصول و کلیات کا استنباط کرتے ہیں۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے جس طرح اہل طبیعات طبعی اصول و قوانین کے اخذ و استنباط کے لئے طبعی محاسن اور قدرتی آثار و مظاہر اپنے سامنے لاتے ہیں واقعہ بھی یہی ہے کہ اس طرح استخراج اصول کی مہم میں غلطیوں اور خامیوں کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو کچھ صعوبتیں اور مشکلات بھی ہیں جن کا اگر صحیح طور پر ازالہ نہ کیا جائے تو بڑے بڑے بھی ٹھوکر کھا جائیں۔ ارسطو نے اسی بنیاد پر اپنے نظریہ کو قائم کیا اور اس نظریہ کو حسب ذیل امور پر مضبوط بنا کر پیش کیا۔

(۱) حسن کلام کی غالب صفت یہ ہے کہ حوادث و واقعات کی پوری پوری حکایت و عکاسی کی جائے۔

(۲) حکایت و قصہ گلہ ہے واقعات کے مطابق نہیں ہوتے اس لئے کذب بیانی اور دروغ بافی کی حسین نقاشی سے کلام کے اندر حسن پیدا کیا جاتا ہے۔

اس نے مثال میں تصویر کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ تصویر بہر حال حسین اور جاذب نگاہ ہوتی ہے خواہ وہ کسی مکروہ و قبیح منظر ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس خیال کو مستحکم کرنے کے لئے اس نے حسب ذیل دو مقدمات قائم کئے۔

(۱) دیگر حیوانات کے مقابلہ میں انسان فطرۃً نقال واقع ہوا ہے، اس لئے نقالی ہی اس کی فطرت کے مطابق انسب و محبوب ہے۔

(۲) علم طبعاً مرغوب خاطر ہے، اور کسی شے کی حکایت درحقیقت اس شے کی خبر و علم اور اطلاع ہی کا نام ہے۔

اس خیال پر وہ اس شدت کے ساتھ جما کہ معترضین کے لاکھوں اعتراضات کے باوجود اس نے اپنے اس مسلک سے ایک انچ ہٹنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ سوفاکلیس پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ لوگوں کی تصویریں ایسی کھینچتا ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہوتی ہیں تو اس نے جواب دیا۔

"یوری پیڈیس کی تصویر حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہوتی ہے لیکن میری تصویر کشی ایسی ہوتی ہے جیسی کہ ہونی چاہیئے۔"

اور اس جواب کو ارسطو نے خوب سراہا۔

شعر یونان کی غرض و غایت پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں فکاہیہ اور المیہ حکایات کے ذریعہ لذت کوشی اور لہو و لعب کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اس واقعہ کو دیکھتے ہوئے ارسطو کو شاعری کا مقصد طرب و مستی کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ اگر سچائی اور صداقت سے طرب و مستی کی فضا پیدا نہ ہوتی ہو تو شاعر کو چاہیئے کہ وہ اپنے کلام کے اندر ضرور رنگ آمیزی کرے۔ ارسطو اپنی رائے میں منفرد نہ تھا بلکہ پوری قوم کا یہی حال تھا! چنانچہ یونان میں شاعر اسی کو سمجھا جاتا تھا جو سامعین کو خوش کرنے اور ہنسانے کے لئے افسانے اور حکایتیں گھڑ کر پیش کرتا تھا۔

عرب نقادوں پر اس نظریہ کا اثر

ارسطو نے جب مہارت و حذاقت کی بنیاد قوت تخلیق پر رکھ دی تو خیال کیا جانے لگا کہ سب سے عمدہ شعر وہی ہے جس میں جھوٹ کو سب سے زیادہ کام میں لایا گیا ہو۔ اور شعر العرب میں چونکہ جز تشبیہ قصہ و حکایت کا نام نہیں ہے اس لئے تصور کر لیا گیا کہ تشبیہ میں مبالغہ من جملہ محاسن شعر ہے۔ ارسطو نے محاکات کو محور ادب قرار دیا تو یہاں تمثیل و تشبیہ فن بلاغت کی اساس قرار پائی اور بے خوف و خطر کہہ دیا گیا کہ

"بلیغ کا سب سے عظیم کمال یہ ہے کہ وہ تشبیہ کے استعمال پر پوری قدرت اور مہارت رکھتا ہو۔"

صاحب اسرار البلاغۃ کا خیال ہے کہ

"کل نہیں تو کم از کم کلام کے زیادہ تر محاسن (انواع تشبیہ) سے ماخوذ ہیں۔"

غور فرمایئے کہ یہ خیال ارسطو کے نظریہ سے کس قدر قریب تر ہے۔

زمانہ مابعد میں تشبیہ سے بھی زیادہ لذیذ اور حسین طرز ادا "استعارہ" کو تصور کیا گیا اور ان سب کا ملا کر نتیجہ یہ ہوا کہ کلام عرب کی سحر طرازیوں اور معجز نمائیوں پر بالکل ہی پردہ سا پڑ گیا۔ چونکہ تشبیہ و استعارہ کے مابین، مبالغہ کا فرق ہے اس لئے کذب بیانی و مبالغہ آرائی کو حسن کلام کا معیار قرار دے دیا گیا، حالانکہ عربوں کے نزدیک محاسن کلام کے کچھ دوسرے اصول و امتیازات تھے جن کی بنیاد پر حقیقت پسندی اور صداقت شعاری کا وصف پیدا ہوتا ہے نہ کہ سچائی اور حقیقت سے فرار کی راہ۔

ہمیں تشبیہ اور انواع تشبیہ کے محاسن سے انکار نہیں ہے، اصل میں ہم حسن کلام کو ارسطو کے مذہب کے بالکل خلاف صدق کی بنیاد پر مبنی خیال کرتے ہیں اور یہاں حسن کا دار و مدار تشبیہ پر رکھ دیا گیا ہے، ایک صاحب ہوش و خرد کیونکر یاور کر سکتا ہے کہ اپنی توجہ کا مرکز ان اشیاء کو بنائے جن میں بندروں کے مانند نقالی، جن کے نام افسانے، جن کی وجہ آرائش کذب بیانی اور جن کا مقصد لہو و لعب کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ اور اس شخص کے نزدیک تو ان باتوں کا گذر تک نہیں ہو سکتا جو یہ خوب سمجھتا ہو کہ بلاغت انبیاء کرام کے اعلیٰ ترین کمالات میں داخل ہے۔ بالخصوص وہ شخص تو ان باتوں کو کسی طرح سننا بھی گوارا نہ کرے گا جو بلاغت کے مکمل غیر فانی اور اعلیٰ ترین معجزہ ہونے پر پورا ایمان و یقین رکھتا ہو۔ اور وہ شخص تو ان باتوں کی ہوا تک لگنے نہ دے گا جو لوگوں کو بلاغت کا اسرار و رموز کی تعلیم دینے کے لئے میدان میں

ہمارا نقطۂ نظر

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ جنم لیتے ہی اپنی ماں کی چھاتیوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے از خود پکڑ لیتا ہے، کچھ بڑا ہوکر بانی کے لئے مم یا بب بب جیسے اشارات کرنے لگتا ہے، ایسے ہی کچھ بڑھ کر وہ ماما یا بابا جیسے الفاظ بولنے لگتا ہے ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بچہ کے اندر تکلم کی ایک ارادی قوت اور ذاتی طور پر جدوجہد کی طاقت موجود ہوتی ہے، یہی طاقت مختلف تمرینی عوامل اور وسائل کے ذریعہ تربیت پاکر اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ بچہ از خود دوسری مختلف آوازوں کو ادا کرنے لگتا ہے، اس کے بعد اس کے سامنے ماں باپ کی زبان آتی ہے جسے وہ سیکھتا ہے اگر مادری زبان سامنے نہ آئے تو بچہ یقیناً اپنے آلات صوت کو استعمال میں لاکر ایک مخصوص زبان تخلیق کرے گا۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی انسان بے زبان نہیں ہے پھر زبان دانی کا یہ فن فطرت کے علاوہ سے آخر کس نے سکھا رکھا ہے؟ اگر محاکات کا یہ کرشمہ ہے تو اس کا بھی کوئی مبدء ہونا چاہئیے؟

مذکورہ حقیقت کی بنیاد پر یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ انسان کی فطرت میں محاکات نہیں، بلکہ نطق ہے، انسان فطرۃً نقال نہیں بلکہ ناطق ہے۔ محاکات تو غیر انسان کا بھی شیوہ ہیں، اگر انسان فطرۃً نقال ہی واقع ہوتا تو اپنے پاس سے گزرنے والی ہر شئے کی نقالی کیا کرتا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ انسان بچے کے اندر خصائل انسانی بالقوہ پوشیدہ ہوتے ہیں جو بڑوں کو دیکھ کر ظہور میں آجاتے ہیں۔ مثلاً ہنسی دیکھ کر بچے میں ہنسنے کی قوت فعل میں آجاتی ہے۔ یا رونا دیکھ کر وہ رونے لگتا ہے۔

یہ حقیقت بھی تسلیم شدہ ہے کہ دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان اپنی ذہانت، طباعی اور زبان کے لئے کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انسان نطق کے گوہر نایاب سے مالامال ہے، جو کمال فہم و ادراک کا نتیجہ ہوا کرتا ہے چنانچہ خود انسانوں میں جو شخص علمی اعتبار سے سب سے زیادہ کامل ہوتا ہے وہی سب سے زیادہ فائق اور شریف تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی قابل لحاظ ہے کہ زبان عقل کے تابع اور مطیع فرمان ہوتی ہے گویا یہ عقل کا آلۂ کار ہوئی، اس حقیقت سے دوسری بات یہ پیدا ہوتی ہے کہ حسن نطق، نغمۂ عندلیب کے مانند حسنِ نغمہ کا نام نہیں، بلکہ عقل کا صحیح ترجمان بننے کا نام ہے، اس طرح "از دل خیزد بر دل ریزد" کی صورت دو عقلوں کے مابین نطق ایک پیغام رساں کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔

محاکات بھی ایک امر مسلم مگر ثانوی ہے، اس کے ذریعہ انسان محض اپنے نطق کی قوتوں کو ابھارنے کی مشق فراہم کرتا ہے۔

اگر انسان میں نطق کی قوت نہ ہوتی تو وہ محاکات پر قادر بھی نہ ہوتا۔ لہٰذا محاکات کو ثانوی اور نطق کو اولین درجہ حاصل ہے۔

حکمت کے پہلو سے غور کیا جائے تو کلام کے اسباب حسب ذیل ہوسکتے ہیں۔

(۱) علت فاعلی	قوت نطق
(۲) علت مادی	الفاظ و معانی
(۳) علت صوری	حسن کلام
(۴) علت غائی	پیغام عقل

نطق معانی اخذ کرکے الفاظ کا جامہ تیار کرتا ہے خواہ یہ الفاظ خود اختراعی ہوں یا انتقالی و محاکات کے ذریعہ درآمد کئے ہوئے کلام کی علت غائی لذت کو قرار دینا بوالعجبی سے کم نہیں، ہر قوت کے استعمال میں ایک لذت پوشیدہ ہوتی ہے جسے ظاہر کرنے کے لئے انسان مشتاق و بیقرار ہوتا ہے جاہل اس قوت کو لذت کی خاطر اور عاقل و دانا اس کو حکمت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس لئے حکمت و دانائی اور عقل و خرد کا پیغام ہی کلامی قوت کا مقصد قرار دیا جاسکتا ہے نہ کہ جہالت و سفاہت کے نتیجہ میں حاصل کی ہوئی لذت کو حسن کلام۔ کلام کی علت صوری۔ کا کمال ہے "بر دل ریزد" اس لئے حسن کلام کی علامت ابلاغ یعنی ذہن نشین کرا دینا ہی قرار دی جاسکتی ہے۔

الفاظ و معانی جس قدر عمدہ، دلکش، حسین اور پاکیزہ ہوں گے بلاغت کا حسن و کمال بھی اسی قدر ہوگا۔ ایسے کلام کی کوئی قدر و قیمت

نہیں جو کمال صحت کے ساتھ کسی برے، گندے اور گھٹیا معنی و مفہوم کا حامل ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی گونگا بن کر رہے۔ ابو جعفر قدامہ کا خیال ہے۔

"معنی و مفہوم کی فحاشی فی نفسہٖ ایسی چیز نہیں جو شعر کی خوبی پر پانی پھیر دے کیونکہ لکڑی کی خرابی سے بڑھئی کے کمالِ فن پر کوئی عیب نہیں لگایا جاسکتا"۔ ایک دوسری جگہ یوں بھی رقمطراز ہے :-

"شاعر کی خوبی یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کلام میں صدق و صفا سے کام لیتا ہے بلکہ اس سے مطلوب یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کوئی معنی اخذ کرے تو موجودہ زمانہ کے اعتبار سے اس میں رنگ پیدا کرے"۔

شعر و شاعر کے بارے میں قدامہ کا یہ خیال کتنا پست، گندہ اور گھٹیا قسم کا ہے، اس نے شعر و شعراء کو اصل مقام سے گرا کر تحت الثریٰ پہونچا دیا ہے، اسی نہج پر چلنے والے شعراء کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ۔

"ان کی اتباع گم کردہ راہ کیا کرتے ہیں"۔

ہم تو کلام کے انہی محاسن کو محاسن مانیں گے جو کمال نطق کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ شعر کے حسن وزن اور حسن صوت کے ساتھ اگر حسن معنی نہ ہو تو اسے عمدہ شعر یا کلام بلیغ ہرگز نہ کہیں گے۔ ایک آنکھ کا اندھا اور ناک کا چپٹا انسان اگر اپنی دوسری آنکھ نہایت خوبصورت رکھتا ہو تو اسے خوب صورت کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ایک آنکھ بڑی ہی خوبصورت ہے۔ اسی طرح ایسے شعر کو عمدہ کلام نہیں کہا جاسکتا جو حسن معنیٰ سے بالکل خالی ہو، اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس شعر کا وزن وغیرہ اچھا ہے۔ اصحاب فکر و نظر کے لئے باعث جذب و کشش کلام بھی وہی ہوتا ہے جو حسن معنیٰ اور جودتِ مضمون کا حامل ہوتا ہے، باقی احمقوں اور جہلاء کی تخلیقات میں عامیانہ پن ہی ہوتا ہے کوئی وزن نہیں ہوتا۔ پھر یہ حقیقت بھی نہایت اہم ہے کہ معنیٰ ہی کلام کے اندر سب کچھ ہے باقی الفاظ وغیرہ تو وہ ایک ظاہری لباس ہوتا ہے اگر حسن باطن کے ساتھ حسن ظاہر بھی ہو تو کیا کہنا، حسن باطن کے ساتھ حسن ظاہر نہ ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے لیکن قبح باطن کے ساتھ حسن ظاہر کی مثال تو لیس چونا پھری ہوئی قبر ہے جسے دیکھ کر دھوکا وہی کھا سکتے ہیں جو پاسبانِ عقل سے محروم ہوں۔

عربوں کا بھی یہی حال تھا، انھوں نے اگر کسی کلام کی تعریف کی ہے تو صرف اس کے حسن معنیٰ کی بنیاد پر، خباثت معنیٰ کی تو انھوں نے کھل کر مذمت کی ہے، زہیر بن سلمیٰ ۔ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے ۔

وذی نعمة تممتها وشکرتها   وخصم یکاد یغلب الحق باطله

کچھ صاحب احسان ہیں جن کے احسان کو میں نے پایۂ کمال تک پہونچایا اور اسے سراہا اور کچھ مد مقابل ہیں جن کی باطل نوائی حق کو مغلوب کر بیٹھتی ہے ۔

دفعت بمعروف من القول صائب   اذا ما اضل الناطقین مفاصله

جب ایسے باطل نواؤں کے اشعار "نطق مآبوں" کو گمراہ کرنے لگتے ہیں تو میں اپنی راست گفتگو سے اس کی مدافعت کرتا ہوں۔

وذی خطل فی القول یحسب انه   مصیب فما یلمم به فهو قائله

اور کچھ بیہودہ گو ایسے بھی ہیں جو اپنے کو راست گو تصور کرتے ہیں، اور جو مضمون بھی نوک زبان پر آجاتا ہے کہہ بیٹھتے ہیں ۔

عبأت له حلما واکرمت غیره   واعرضت عنه وهو باد مقاتله

میں نے ایسے مہربانوں کے لئے حلم کا سامان کر رکھا ہے اور دوسروں کے لئے تکریم کا، میں اس سے اعراض کرتا ہوں حالانکہ اس کی غلطیاں بالکل کھلی ہوئی ہوتی ہیں۔

کلام عرب کے اندر فحش، بیہودہ گوئی، گندہ ذہنی، سفلہ پن اور بدکلامی کی کثرت سے اور کھل کر مذمت کی گئی ہے۔ ان معائب سے بھرا

ہوا شعر ان کے نزدیک اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ اسے کسی قسم کی مقبولیت حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حجر نے اپنے صاحبزادہ امرئ القیس کو جو بڑا ہی بدگو شاعر تھا قتل کر دینے کا حکم دے رکھا تھا۔ نابغہ ذبیانی نے جب بادشاہوں کی شان میں قصیدہ گوئی شروع کی تو وہ عربوں کی نگاہوں سے بالکل گر گیا۔ عربوں کے یہاں مدح و مذمت دونوں پسندیدہ تھے مگر اپنے اپنے محل اور موقع پر۔ چنانچہ انہیں ذلیل اور پست درجہ کے لوگوں کی مدح و ستائش سے بے حد نفرت تھی۔ بشر اور اس کے ساتھیوں کا جو مرثیہ خرنق نے لکھا تھا اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں: ؎

لا یبعدن قومی الذین ھم	سم العداۃ وآفۃ الجزر
خدا نہ کرے کہ میری قوم بدقسمت و محروم ہو	یہ وہ لوگ ہیں جو دشمنوں کے حق میں زہر اور اونٹوں کے حق میں آفت ہیں
النازلون بکل معترک	والطیبون معاقد الأزر
ہر معرکہ میں اتر جانے والے	نہایت عفیف و پاک دامن ہیں
ان یشربوا یھبوا وان یذروا	یتواعظوا عن منطق الہجر
پیتے ہیں تو لٹاتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں	بیہودہ کلامی سے ایک دوسرے کو روکتے ہیں
قوم اذا رکبوا سمعت لھم	لغطا من التاییہ والزجر
یہ وہ لوگ ہیں کہ جب سوار ہوتے ہیں تو	زجر و توبیخ (اونٹوں کے لئے) کے ایسے شور سنائی دیتے ہیں
من غیر ما فحش یکون بھم	فی منتج المھرات والمھر
جس میں کسی طرح کا کوئی فحش نہیں ہوتا	- - - - - - - - - - - - -

جاحظ کا قول ہے۔

"اللہ تعالیٰ جسے اپنی معرفت کا ایک حقیر سا حصہ عطا فرما دے اور جسے اپنی محبت سے سیراب کر دے اس کی جانب معانی و الفاظ کا دریا بہہ کر آئے وہ سامع کو تکلف کی مشقت اور قاری کو فہم کے لئے دماغ ریزی کی مصیبت سے نجات دیدے گا۔"

مطلب یہ ہوا کہ بلاغت کا دار و مدار سراسر علمی بصیرت اور قلبی طہارت و پاکیزگی کے اوپر ہے، اس کے بغیر کوئی کلام کلام نہیں اور نہ اس کے بغیر زبان سے کوئی صحیح، بچی تلی اور معقول بات نکل سکتی ہے۔ بلند ترین کلام قرآن پاک اور زبور ہیں۔ قرآن و انجیل اور بیانات عرب کے مطابق زبور ایک ایسا کلام ہے جو مردہ دلوں میں زندگی کی روح رواں کرتا ہے، قوموں کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی رفعت پہونچاتا ہے۔ ایک عربی شاعر عبید بن الابرص کہتا ہے۔

القائل القول الذی مثلہ	یمرع منہ البلد الماحل
ایک ایسا کلام کہنے والا ہے	جس سے مردہ آبادی سبزہ زار ہو جاتی ہے

عربوں نے اس لئے سچی بات کی تعریف کی ہے۔ طرفہ کہتا ہے۔

ان احسن بیت انت قائلہ	بیت یقال اذا انشدتہ صدقا
سب سے عمدہ شعر جسے تم کہو وہ	ہے کہ جب تم اسے سناؤ تو اسے سچائی کی سند دی جائے

ان دونوں اشعار کے اندر انہی باتوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے جن میں اخلاقی اور عقلی دونوں پہلوؤں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

قرآن پاک نے بھی اپنے کلام کو بلیغ اسی معنی میں کہا ہے کہ وہ دلوں میں پیوست ہو جاتا ہے۔

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ۔ ان سے ایک ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں پیوست ہو جائے۔

معلوم ہوا کہ سب سے بلیغ کلام وہ ہے جو سب سے زیادہ دلنشین اور عقل و خرد کو اپیل کرنے والا ہو۔
وَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ   اور اللہ ہی کے پاس ایسی دلیل ہے جو ذہن نشین ہو سکتی ہے
ہماری اوپر کی تمام گفتگوؤں کا حاصل یہی ہے کہ

(۱) حسن کلام محض محاکات ہونے کا نہیں بلکہ معانی کو ذہن نشین کرانے کا نام ہے
(۲) حسن کلام کا مقصد طرب و مستی پیدا کرنا نہیں بلکہ عقل و خرد کی سچی پیامبری ہے۔
(۳) اظہار کلام سے شادکامی کا حصول اس بنا پر نہیں ہے کہ محاکات انسان کی فطرت میں داخل ہے بلکہ اس لئے ہے کہ انسان میں اپنی بلند سے بلند تر قوتوں کے استعمال کی فطری خواہش موجود ہے۔
(۴) انسان کی امتیازی شان محاکات میں نہیں بلکہ نطق میں ہے۔
(۵) صاحب کلام کو سچا اور باخبر ہونا چاہئے، دروغ گوئی انسان کو اس کے مرتبہ سے گرا دیتی ہے۔
(۶) معنیٰ کی خرابی اور اس کا بیہودہ پن کلام بلیغ کی تعریف سے بالکل خارج ہے۔

شعر و شاعری کے اندر کذب و مبالغہ کا مقصد بھی صرف اتنا ہوا کرتا ہے کہ تمثیل کے زاویے ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ کسی مبہم اور غیر واضح واقعہ کو ایک مخصوص شکل دینا بڑا مشکل ہوتا ہے اس لئے اسے پیش کرنے کے لئے اپنا خیالی رنگ بھی بھرنا پڑتا ہے۔ مقصود کہنا صرف واقعہ کی تصویر ہوتی ہے اور بس۔ چنانچہ امثال و حکایات اور حیوانات کی داستانوں میں یہی بات مقصود ہوتی ہے۔

تشبیہ وغیرہ کے اندر مبالغہ آرائی کا تعلق شاعر کی اپنی حسیات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ شدتِ جذبہ سے ایک ناقابلِ التفات واقعہ کو عظیم اور عظیم واقعہ کو حقیر خیال کر لیتا ہے، جیسا کہ ایک مریض تھوڑی مدت کو لمبی مگر ایک صحت مند و تندرست انسان لمبی مدت کو تھوڑی تصور کرتا ہے، شعراء کے یہاں شب اضطراب کی درازی کا تذکرہ بہت ملتا ہے، مقصد معلوم ہے کہ وہ اپنے احساس کو ظاہر کرتے ہیں۔ نہ کہ کذب بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اگر مبالغہ اس حد سے آگے نہیں بڑھتا تو عین صداقت ہے۔ اس نازک فرق کو کوئی نہ سمجھے تو وہ احساس اور افتراء میں کوئی فرق نہ سمجھ کر کذب بیانی کو شعر کا ایک جزء تصور کر بیٹھے گا حالانکہ شعر کی بنیاد محض صداقت و صفا پر مبنی ہے۔

ایک گزارش

توحید نمبر کی قیمت چار روپے پچاس پیسے ہے۔ ہندوستان میں طلب کرنے والے حضرات یہ قیمت دفتر الحسنات رامپور (یو۔پی) کو روانہ فرما کر رسید سے ہمیں مطلع فرمائیں رجسٹری کے لئے مزید ۵۰ پیسے روانہ فرمائیں۔

وارث سرہندی

پاکستانی ثقافت

ہمارے یہاں آجکل پاکستانی ثقافت کے چرچے ہو رہے ہیں جس زور شور سے ثقافت کا ذکر ہو رہا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہو کہ ثقافت
کوئی دیا ہے جس کا بھوت ہر شخص پر سوار ہے۔ طبقہ امرا کے افراد اس ثقافتی پرچار میں پیش پیش ہیں اور متوسط طبقہ جو عوام سے اپنا تعلق ختم کر کے جلد از جلد
طبقہ امرا میں شامل ہونا چاہتا ہے ثقافت کی تان بلند کرنے میں سب سے آگے ہی

اس باب میں جو بیانات سامنے آرہے ہیں وہ ایکدوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ایک عام انسان کے لئے یہ سمجھنا محال ہو گیا ہے کہ ثقافت
ہے کس بلا کا نام اور پاکستانی ثقافت سے کیا مراد ہے؟ کوئی موہن جوڈارو کے ہزار ہا سال پرانے آثار کو پاکستانی ثقافت کی خشت اولین قرار دیتا ہے
تو کوئی ہڑپہ اور ٹیکسلا کے آثار قدیمہ میں پاکستانی ثقافت کے ابتدائی نمونے تلاش کرنے میں سرگرداں ہے، بعض لوگ سابق صوبۂ سرحد کے قرب وجوار
سے ملنے والے بدھ مت کے مندروں اور مجسموں کے آثار کو پاکستانی ثقافت کا نمونہ بتا رہے ہیں یہ تو رہی پاکستانی ثقافت کے ابتدائی آثار کی بات' اب
جیسے پاکستانی ثقافت کی موجودہ ارتقائی صورت کو اس سلسلہ میں ہمارے اعیان ملک کی سرپرستی میں جو ثقافتی تقریبات Cultural shows
منعقد ہوتی ہیں اور جن کو پاکستانی ثقافت، کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ ان میں راگ رنگ اور رقص و سرود کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب کوئی غیر ملکی مہمان
پاکستان میں آتا ہے تو ہم بڑے فخر کے ساتھ رقص و سرود کی صورت میں پاکستانی ثقافت کے نمونے دکھاتے ہیں۔ پاکستانی عوام کے لئے ثقافت کا
لفظ ایک نیا لفظ ہے جس کا قیام پاکستان کے بعد رواج ہوا ہے، اس لئے وہ اس کے صحیح مفہوم سے بے خبر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ثقافت عیش و
طرب کے ہنگاموں کو کہتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ ہم ثقافت کی تعریف کرنے کے بعد یہ دیکھیں کہ پاکستانی ثقافت کیا ہے اور رقص و سرود کے
مظاہروں کا پاکستانی ثقافت سے کیا تعلق ہے؟

ثقافت عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی تیز فہم و ہوشیار ہونا ہیں لیکن اردو میں یہ اصطلاحی طور پر انگریزی لفظ Culture کے
مترادف کے حیثیت سے استعمال ہو رہا ہے۔ کلچر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بڑا وسیع اور جامع لفظ ہے۔ کسی قوم کے آداب معاشرت، انداز فکر،
ذاتی فن وادب، ذہنی ارتقا، وضع قطع، لباس اور رسم و رواج غرضیکہ تہذیب و تمدن اور اطوار زیست کے مجموعہ کو کلچر کہا جاتا ہے، اگر انتہائی
اختصار کے ساتھ کلچر کا مفہوم ادا کرنا ہو تو اس کے لئے ہم "طرز حیات" کی ترکیب استعمال کر سکتے ہیں۔ اس تعریف کی روشنی میں ثقافت کسی قوم
کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ یہاں غیر مناسب نہ ہوگا اگر ثقافت کے اجزائے ترکیبی پر بھی ایک نظر ڈال لیں کسی قوم کی ثقافت کی تشکیل میں اس کی
قومی روایات، ملکی حالات، مذہبی رسوم معاشرتی آداب، فرد اور معاشرے کے تعلقات، اجتماعی ہیئت اور جغرافیائی حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے
جہاں تک غیر مسلم اقوام کا تعلق ہے ان کی ثقافت پر ملکی و مقامی اثرات غالب ہیں، کیونکہ ان کی قومی ہیئت کی بنیاد وطنیت کے تصور پر ہے۔ چونکہ
اسلام کے سوا دیگر تمام مذاہب چند آداب پرستش اور اخلاقی ہدایات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے وہ کسی قوم کی ثقافت کو جزوی طور پر تو متاثر کرتے ہیں
نہ مجموعی طور پر قومی ثقافت کی ہیئت ترکیبی پر اثر انداز نہیں ہوتے لیکن اسلام محض مذہب یا پوجا پاٹ کے طریقوں کا مجموعہ نہیں بلکہ دین ہے
جس کے معنی مکمل ضابطۂ حیات کے ہیں۔ اس لئے پیدائش سے لیکر موت تک انسان کی مجلسی و معاشرتی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام
اصول و ضوابط اسلام میں موجود ہیں۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں اسلام انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام

بذات خود ایک ثقافت ہے۔ اس لیے مسلمان دنیا کے جس خطہ میں بھی ہوگا، اس کی ثقافت اسلامی ہوگی جس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اس کی ثقافت بھی بعض جزوی اختلافات کے باوجود اسلامی ہوگی۔ جزوی اختلافات جو اسلامی ضابطہ حیات کے خلاف نہوں ان کی اسلام میں گنجائش موجود ہے۔ چونکہ اسلام کی بنیاد وطنیت کے محدود تصور پر نہیں۔ بلکہ اس کا تصور قومیت رنگ و نسل اور ملک و اقلیم کی حدود سے بالاتر اور آفاقی ہے، اس لئے اس میں فروعی اختلافات کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ چونکہ ہر انسان خواہ وہ متمدن ہو یا وحشی، مہذب ہو یا اجڈ فطرۃً یکساں ہوتا ہے اس لئے اسلام بھی سب انسانوں کے لئے ہے۔ اسلام انسانی فطرت کا تحفظ کرنا چاہتا ہے۔ جو چیز انسانی فطرت کے خلاف ہے، اس کی مخالفت کرتا ہے اور جس سے انسانی فطرت پر زد نہ پڑے اس سے تعرض نہیں کرتا۔ ملکی و وقتی حالات کے مطابق ایسے اختلافات جو فطرت انسانی کے خلاف نہیں ہوتے، انکو اسلام ناپسندیدہ قرار نہیں دیتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ایک خاکہ ہے۔ جس میں انسانی زندگی کے تمام پیچ و خم اور حدود نمایاں خطوط سے واضح کر دیئے گئے ہیں لیکن اس خاکہ میں رنگ بھرنے کا اختیار مسلمانوں کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ حالات زمانہ اور ملکی ضروریات کے مطابق ان حدود میں رہتے ہوئے اپنی مرضی کا رنگ بھر سکتے ہیں، لیکن مقررہ حدود سے تجاوز کی قطعاً اجازت نہیں کیونکہ اس سے اسلام کی ہیئت ترکیبی اور بنیاد پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے اسلامی ثقافت جزوی اختلافات کے باوجود جو اسکے تنوع کی علامت ہیں ہر جگہ اور ہر ملک میں متحد الاصل ہے

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور یہاں اکثریت بھی مسلمانوں کی ہے۔ اس لئے لامحالہ پاکستانی ثقافت کا مطلب اسلامی ثقافت ہوگا۔ اول تو اس کو کہنا ہی اسلامی ثقافت چاہیئے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اسلامی ضوابط پر ہے اور پاکستانی ثقافت کہنے سے اس میں وطنیت کے محدود تصور کے باعث تنگ نظری پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ بہر حال اگر مقامی خصوصیات اور بعض جزوی و فروعی اختلافات کے اظہار کے لئے اس کو پاکستانی ثقافت کہنا ضروری ہے تو بھی ہمیں ثقافت کے ہر نمونہ کو اسلام کے بنیادی اصول اور اکثریت کے مجموعی طرز حیات سے ملا کر دیکھنا ہوگا کہ آیا یہ واقعی پاکستانی ثقافت کا نمونہ ہے یا نہیں؟

موہن جوڈارو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے آثار قدیمہ کا اسلامی ثقافت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ آثار جن قوموں کی ثقافت ہو سکتے ہیں ان میں اور ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں، اس لئے ان آثار کو کسی طرح بھی پاکستان کی ثقافت کی ابتدائی صورت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکستانی ثقافت کی بنیاد اس ملک میں اس وقت پڑی تھی جب پہلی بار مسلمانوں نے اس خطۂ زمین پر قدم رکھا۔ بدھ کے مجسموں اور مندروں سے ہماری ثقافت کا کیا تعلق ہو سکتا ہے، جبکہ مجسمہ سازی و بت تراشی اسلام کے نزدیک مذموم اور حرام ہے

اب لیجئے ثقافت کی موجودہ صورت کو جسکا مظاہرہ آئے دن رقص و سرود کی مجالس آراستہ کر کے کیا جاتا ہے۔ کسی قوم کی ثقافت بحیثیت مجموعی کسی قوم کے طرز حیات کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے ناچ رنگ کی ان محفلوں پر نظر ڈالئے تو ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان سے ہمارے کسی شعبۂ حیات کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ پاکستان کے عوام کی اکثریت دیہات میں رہتی ہے۔ پاکستان کے دیہات میں جا کر دیکھئے تو سادگی اور حیا کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ ناچ رنگ کسی جگہ بھی پاکستانی عوام کا جزو زندگی نہیں، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کس طرح پاکستانی ثقافت کا نمونہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اب ذرا ان مجالس رقص و سرود کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھئے کیونکہ پاکستانی ثقافت کی بنیاد اسلام ہی ہے۔

ضابطہ اسلامی کے مطابق عورت کو اس قسم کا ڈھیلا لباس پہننا چاہیئے جس سے اس کے جسم کے زاویئے نمایاں نہ ہوں۔ بلکہ پوشیدہ رہیں عورت کو نامحرم کے سامنے بے پردہ نہیں آنا چاہیئے۔ عورت کو نامحرم سے گفتگو کرتے وقت ایسا لب و لہجہ اختیار کرنا چاہیئے جس میں دلکشی نہ ہو، لیکن رقص کے ان مظاہروں میں جن میں بالعموم عورتیں ہی نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ عورتیں نہ صرف غیر مردوں کے سامنے کھلے منہ آتی ہیں بلکہ ان کا لباس اس قطع کا ہوتا ہے کہ ان کے جسم کا ہر زاویہ اور ہر خط انتہائی نمایاں ہوتا ہے۔ کامل برہنگی کی صورت میں جسم کے بعض حصے اتنے نمایاں نہیں ہو سکتے

جتنے اس تنگ لباس میں نمایاں ہوتے ہیں یہ بدتر از عریانی لباس پہنکر اور بناؤ سنگھار کرکے وہ اس طرح رقص کرتی ہیں اور گاتی ہیں کہ ان کی ہر حرکت اور ہر ادا سے دعوت گناہ ملتی ہے اس قسم کے شہوت انگیز مظاہروں کی اسلامی ثقافت میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام نے جو نظام حیات پیش کیا ہے اس کی بنیاد حیا، پاکیزگی اخلاق اور سنجیدگی اور جفاکشی پر ہے لیکن ان مظاہروں سے جس قسم کی ثقافت کی ترجمانی ہوتی ہے اس کے بنیادی عناصر بے حیائی، اخلاق سوزی، جنسی بے راہ روی، کھلنڈراپن اور ذمہ داریوں سے فرار ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں اسلامی ضابطۂ حیات سے متصادم ہیں اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس قسم کے مظاہروں کو اسلامی ثقافت کا عکاس کہا جائے۔ پاکستان میں زندگی کا جو عام انداز ہے اس کو دیکھیے اور ان ثقافتی نمونوں کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی مطابقت نہیں، نہ ان سے ہماری مجلسی زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ نہ ہماری معاشرت اور طرز فکر کی۔ ثقافت کا نمونہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جن سے کسی قوم کے طرز حیات اور امتیازی خصوصیات کی عکاسی ہو لیکن ناچ گانے سے ہمارے کسی شعبۂ حیات کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ رقص و سرود کو اگر کسی طبقہ کی ثقافت کہا جا سکتا ہے تو وہ ارباب نشاط کا انتہائی محدود طبقہ ہے جس نے اس کو پیشہ کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ لیکن اس طبقہ کو ہمارے یہاں اس گئے گزرے زمانہ میں بھی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس طبقہ کو معاشرہ کا عضو بیکار قرار دے کر معاشرہ سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جو طبقہ اتنا مختصر اور معاشرہ میں کسی مقام کا حامل نہ ہو اس کو پوری قوم کا نمائندہ قرار دینا قوم کے ساتھ دردناک مذاق ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارا سرمایہ دار طبقہ جس میں بعض اعیان دولت اور مغرب زدہ افراد شامل ہیں، اس ثقافت کو اپنانے کے لئے بےچین ہے، لیکن یہ طبقہ اتنا محدود ہے کہ اس کو پاکستانی عوام کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے طرز زندگی اور پاکستانی عوام کی زندگی کے عام چلن میں بعد المشرقین ہے۔ اس صورت میں رقص و سرود کے ان مظاہروں کو کسی طرح بھی پاکستانی ثقافت کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔

جو لوگ ان بیہودگیوں کو پاکستانی ثقافت کا نمونہ قرار دے رہے ہیں۔ وہ یا تو ثقافت کا مفہوم ہی نہیں سمجھتے، اور اگر اس کے مفہوم سے واقف ہیں تو وہ دانستہ طور پر پاکستان کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ ایک غیر ملکی رقص و سرود کے ان مظاہروں کو دیکھ کر پاکستانی عوام کے متعلق یہی اندازہ لگائے گا کہ پاکستانی عوام انتہائی غیر ذمہ دار اور عیاش لوگ ہیں۔ جو کار زار حیات سے فرار حاصل کر کے ان بیہودگیوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں یہ پاکستانی عوام پر ایک تہمت ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ تہمت لگانے والے بھی پاکستانی ہی ہیں۔ ثقافت کے نام جو طوفان بدتمیزی برپا ہے، اس کو روکنا ہر محب قوم کا فرض ہے۔ ہماری حکومت پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے غیر ذمہ دار افراد سے سختی سے باز پرس کرے جو اس طرح پاکستان کو نام بدنام کر رہے ہیں۔ اور اگر اس کا بر وقت تدارک نہ کیا گیا تو یہ زہر تمام قوم میں سرایت کر جائے گا اور اس کے نتائج انتہا تباہ کن ہوں گے۔

وارث سرہندی

پاکستان میں اردو

محبانِ اُردو کی طرف سے آئے دن ایسے مطالبات کئے جاتے رہتے ہیں کہ اُردو کو سرکاری دفاتر میں وہ مقام ملنا چاہیئے جس کی وہ مستحق ہے اور اسی طرح ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک ذریعہ تعلیم اُردو ہونی چاہیئے۔ ان مطالبات کو سن کر شرم بھی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی مطالبہ کرے کہ انگلینڈ میں سرکاری و درباری کارروائی انگریزی میں ہونی چاہیئے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ اُردو جو ہماری قومی زبان ہے۔ اس کو سرکاری و عوامی اداروں میں بار دلانے کے لئے مطالبوں کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ قوم کی اس بے حسی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ وہ اپنی قومی زبان کو نظر انداز کر کے ایک ایسی غیر ملکی زبان کو گلے لگائے ہوئے ہیں جو ہمارے دورِ غلامی کی یادگار ہے جب تک انگریزی ہم پر مسلط رہے گی اس وقت تک ہم انگریز کی ذہنی غلامی سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ کسی قوم کی تہذیب و ثقافت کی ترویج میں اس کی زبان کو بڑا دخل ہوتا ہے اور جب کوئی قوم اپنی زبان سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو اپنی تہذیب و ثقافت سے بھی بیگانہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہم جس بُری طرح مغرب پرستی کا شکار ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم اپنی زبان سے منہ موڑ کر انگریزی زبان کو اپنے آپ پر مسلط کر چکے ہیں۔ انگریزی زبان میں ہمیں اسلامی و مشرقی تہذیب کا نمونہ مل ہی نہیں سکتا، اس لئے انگریزی زبان کو اوڑھنا، بچھونا بنانے کے بعد یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم انگریزی تہذیب سے دامن بچا سکیں۔ اس کے برعکس اُردو از سرتاپا مشرقی و اسلامی تہذیب کا عکس جمیل ہے کیونکہ اس کی پیدائش و پرورش اسی مشرقی تہذیب کی مرہونِ منت ہے اُردو زبان میں مشرقی و اسلامی علوم کا جو سرمایہ موجود ہے وہ کسی بھی اسلامی زبان سے کم نہیں۔ اس معاملہ میں اُردو فارسی اور عربی سے فخر کے ساتھ آنکھ ملا سکتی ہے۔ جب تک ہم اُردو زبان کو نہیں اپناتے اسی وقت تک ہم مغرب پرستی کی لعنت سے نجات نہیں حاصل کر سکتے۔ افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ہم ترقی یافتہ کہلانے کے باوجود اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکے اور انگریزی بول اور لکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ بعض غیر ملکی طلبہ اور علما محض اس لئے پاکستان آئے کہ پاکستان میں رہ کر اُردو زبان کی تکمیل کر سکیں لیکن جب وہ پاکستان سے واپس جانے لگے تو انہیں بڑے ملول کے ساتھ یہ کہنا پڑا کہ پاکستان آئے تھے تو وہ اُردو میں مہارت حاصل کرنے کے لئے تھے لیکن مہارت انہیں انگریزی میں حاصل ہوئی۔ کیونکہ اگر وہ کسی سے اُردو میں بات کرتے تھے تو جواب انگریزی میں ملتا تھا۔ ان غیر ملکیوں کے یہ بیانات ہمارے لئے باعثِ ندامت اور تازیانہ عبرت ہیں، لیکن ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ نہ ہمیں اپنی اس ذہنی غلامی پر شرم آتی ہے اور نہ ہم اس سے کوئی سبق سیکھتے ہیں۔ قومی زبان کی اہمیت کو فراموش کرنے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج ہم ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے ہیں۔ ہماری درسگاہیں ذہن کو جلا دینے کی بجائے اسے زنگ آلود کر رہی ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر ہم ذہنی طور پر ترقی کر ہی نہیں سکتے۔ انگریز اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ وہ طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کے جذبہ حریت کو نہیں دبا سکتے تو انھوں نے انگریزی تعلیم کا جال پھیلا دیا۔ ہم نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اس دامِ ہمرنگ زمیں کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور اس طوق کو اپنے گلے میں ڈال کر فخر سے اکڑنے لگے، اس کا نتیجہ انگریز کی توقع کے مطابق نکلا اور ہم خود بخود ان کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھلتے گئے اور غلامی کو اپنے لئے رحمت سمجھنے لگے۔ سر سید نے جب انگریزی تعلیم کی ترویج کی کوشش کی تو اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام تمام ہوا

اکبر کی یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور سر سید نے جو انگریزی تعلیم کے سب سے بڑے داعی تھے آخر عمر میں جب انگریزی تعلیم کے نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ رنج والم سے بے تاب ہو کر پکار اٹھے کہ افسوس جن لوگوں نے مکتبوں کے بوریوں پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کی تھی وہ تو قوم کے لئے سرمایۂ افتخار بنے اور وہ لوگ جنھوں نے کالجوں کی شاندار عمارتوں میں تعلیم حاصل کی وہ رامش و رنگ، عیش و طرب اور تکلف و تصنع میں گرفتار ہو کر قوم کے لئے ایک بوجھ اور راہ ترقی کا سنگ گراں ثابت ہوئے۔ خود سر سید جنھوں نے قوم کو ترقی سے ہم کنار کرنے کے لئے اتنی جد و جہد کی مکتبوں اور بوریہ نشین اساتذہ کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کے دل میں قوم کا جو درد اور قومی روایات کا جو احساس تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے اُردو اور فارسی کے ذریعہ تعلیم حاصل کی تھی اور ان اسلامی زبانوں کے فیض سے مشرقی اور اسلامی تہذیب ان کی طبیعت میں رچ بس گئی تھی۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کی وہ اپنی قومی روایات سے دور ہو کر مغرب پرستی کا شکار ہو گئے اور قوم کی ترقی و آزادی میں مفید ثابت ہونے کی بجائے انگریز کے آلۂ کار بنتے گئے۔ اس میں ان بیچاروں کا کوئی قصور بھی نہیں اور نہ ہم انھیں مورد الزام ٹھیرا سکتے ہیں۔ ان بیچاروں کو تعلیم ہی ایسی ملی اور غیر زبان کے تسلّط نے نہ صرف ان کے سوچنے کا انداز بدل دیا بلکہ ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو بھی مفلوج کر کے رکھ دیا۔ سر سید کو آخر عمر میں اس موقف کا احساس ہو گیا تھا اور اسی لئے انھوں نے اُردو زبان کی ترویج کے لئے دل و جان سے کوشش کرنی شروع کر دی تھی۔ پاکستان کا قیام اسی تحریک اردو کا نتیجہ ہے۔ انگریز اس بات سے پوری طرح واقف تھے، اس لئے انھوں نے اُردو زبان پر ایک ضرب کاری لگانے کی کوشش کی اور یو۔ پی کے ہندوؤں کو اُبھار کر ہندی زبان اور دیوناگری لپی کو یو پی کی علاقائی زبان کا درجہ دلانے کی کوشش کی۔ اگرچہ انگریز اپنی اس سازش میں بظاہر کامیاب ہوتے لیکن اب مسلمان ان کی اس سازش سے آگاہ ہو چکے تھے، اس لئے انھوں نے اُردو زبان کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کے پرچم تلے جد و جہد آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ جس روز سے ہندی اور اُردو کی نزاع شروع ہوئی تھی اسی روز سے دو قومی نظریہ کی بنا پڑ گئی تھی اور مسلمانوں کی جد و جہد غیر شعوری طور پر اپنی جداگانہ مملکت کے حصول کا راستہ اختیار کر چکی تھی حالانکہ اس وقت پاکستان کا قیام کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا لیکن سر سید کی دور بین نگاہ نے اس بات کو پوری طرح بھانپ لیا تھا اور بنارس کے کمشنر کے رُو برو واشگاف لفظوں میں یہ کہہ دیا تھا کہ اب ہندو اور مسلمان کسی طرح بھی اکٹھے نہیں رہ سکتے، کیوں کہ ان کے قومی اور تہذیبی اختلاف کے باوجود جو چیز اب تک انہیں متحد کئے ہوئے تھی وہ محض ایک مشترک زبان اور مشترک رسم الخط تھا، جب زبان اور رسم الخط الگ الگ ہو گئے تو مسلمان اور ہندو میں کوئی قدر مشترک باقی نہ رہی جو ان کو متحد رکھ سکے اور سر سید کی یہ بات سچ ہو کر رہی۔ آج پاکستان ایک ٹھوس حقیقت بن چکا ہے، لیکن ہم یہ بھول چکے ہیں کہ پاکستان کا قیام اسلام کے بعد اسی اردو کا رہین منت ہے، جس سے آج ہم آنکھیں چُرا رہے ہیں۔

جس وقت قیام پاکستان کی جد و جہد جاری تھی، ہر شخص یہ جانتا تھا کہ پاکستان کی واحد سرکاری زبان اُردو ہوگی۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی کو اس سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب اُردو کی حیثیت ایک مسئلہ متنازعہ بن سکتی ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد بعض تخریب پسند عناصر نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے انھوں نے لسانی افتراق کی بنیاد ڈالی اور مشرقی پاکستان کے سیدھے سادے عوام کو اس بات پر ابھارنے کی کوشش کی کہ وہ مشرقی پاکستان کے لئے علیحدہ سرکاری زبان کا مطالبہ کریں۔ قائدِ اعظم مرحوم نے اس خطرہ کو ابتدا ہی میں بھانپ لیا تھا۔ اگرچہ خود قائدِ اعظم کی مادری زبان اُردو نہیں تھی۔ لیکن وہ زبان کی اہمیت سے کماحقہٗ آگاہ تھے اور یہ جانتے تھے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں جو فاصلہ اور جغرافیائی بُعد ہے اس کو دُور کرنے اور ذہنی قرب پیدا کرنے کے لئے مذہب کے بعد سب سے اہم چیز مشترک زبان ہے اور یہ مشترک زبان اُردو ہی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اُردو کسی علاقہ کی مخصوص زبان نہیں، اس لئے اس سے صوبائی اور علاقائی عصبیت کے رجحان پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اُردو پاکستان کے ہر علاقہ میں

کم و بیش سمجھی اور بولی جاتی ہے اور اس لحاظ سے یہ پاکستان کی مشترکہ زبان ہے، اس کے علاوہ اُردو علمی و ادبی لحاظ سے بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ اس میں بلا تکلف ہر موضوع پر لکھا اور بولا جا سکتا ہے۔ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائداعظم مرحوم نے اپنے دورۂ مشرقی پاکستان میں صاف اور واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا تھا کہ پاکستان کی واحد سرکاری زبان اُردو ہو گی۔ قائداعظم کے اس اعلان نے لسانی اختلاف و انشقاق کے اس فتنہ کو دبا دیا تھا۔ قائداعظم اور قائدِ ملت کی زندگی میں کسی کو اس سے اختلاف کی جرات نہ ہوئی۔ اختلاف ہوتا بھی کیسے ہر شخص اُردو کی اس حیثیت کو ذہنی طور پر قبول کر چکا تھا۔ قائدِ ملت کی شہادت کے بعد اس رجحان نے پھر سر اٹھانا شروع کیا اور مسٹر محمد علی بوگرہ کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں کھل کر اُردو کی مخالفت ہونے لگی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مشرقی پاکستان کے وطن دوست حضرات اور اہلِ نظر حضرات نے اس وقت بھی اس غلط رجحان کی مخالفت کی تھی لیکن ہمارے خود غرض سیاستدانوں نے اس قدر شور و غوغا کیا کہ ان دوراندیش اصحاب کی بات کو سننے نہ دیا۔ اس وقت اگر حکومت چاہتی تو حالات پر بڑی آسانی سے قابو پایا جا سکتا تھا لیکن اس کو سیاسی مصالح پر قربان کر دیا گیا۔ مسٹر محمد علی بوگرہ کے اس بیان نے کہ کینیڈا کی دو سرکاری زبانیں ہیں اسی طرح پاکستان کی بھی دو سرکاری زبانیں ہو سکتی ہیں، لسانی افتراق کی اس تحریک کو تقویت مزید دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے پہلے دستور میں بنگالی کو مشرقی پاکستان کی اور اُردو کو مغربی پاکستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا۔ قوم نے بابِ افتراق کو اسی جگہ بند کر دینے کے لئے اس صورت حال کو بھی قبول کر لیا۔ اور حکومت پر زور دیا کہ اب ان قومی زبانوں کو سرکاری دفاتر میں رائج دینے کے لئے عملی قدم اٹھایا جائے۔ لیکن افسوس کہ قیامِ پاکستان کو سولہ سال ہونے کو آئے، لیکن اُردو کی حیثیت محض کاغذی سرکاری زبان کی ہے اور عملاً ہم اب بھی دورِ غلامی کی یادگار انگریزی کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں حکومت نے اُردو کی ترویج کے لئے ایک محکمہ زبان دفتری کے نام سے قائم کیا جس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ دفتری اصطلاحات کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کرے تاکہ سرکاری دفاتر میں انگریزی کی بجائے ان کو رائج کیا جائے۔ یہ محکمہ تیرہ سال سے زیادہ مدت سے کام کر رہا ہے اور اس پر ہر سال قوم کے لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ قومی دولت کے صرفِ کثیر کے باوجود نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہے۔ محکمہ زبان دفتری متبادل مصطلحات کی فہرستیں شائع کرتا رہا اور مختلف محکموں کو بھیجتا رہا اور سرکاری محکموں کے سربراہان والا اقتدار ان فہرستوں کو دفتر کے کسی کونے میں ناکارہ سامان کے ساتھ انبار کرتے رہے۔ اب محکمہ زبان دفتری اپنی ان تمام فہرستوں کو یکجا کر کے ایک فرہنگ مصطلحاتِ دفتری کی صورت میں مرتب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب یہ فرہنگ مرتب ہو جائے گی تو اسے سرکاری کتب خانوں کی زینت بنا دیا جائے گا۔ چلئے قصہ تمام ہوا۔ قوم کا مطالبہ بھی پورا ہو گیا اور انگریزی بھی بدستور رائج رہی۔ قومی دولت کے اس ضیاع پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ اس محکمہ کا قیام اس لئے تو عمل میں نہیں آیا تھا کہ ایک فرہنگ مرتب کر کے کتابوں کے ڈھیر میں اضافہ کر دیا جائے بلکہ اس کے قیام کا مقصد وحید یہ تھا کہ سرکاری دفاتر میں اُردو زبان عملی طور پر اپنا مقام حاصل کر سکے لیکن افسوس ان مغرب زدہ نیازمندانِ افرنگ کی ہٹ دھرمی کے باعث اُردو زبان اپنے وطن میں رہ کر بھی بے وطن رہی اور محکمہ زبان دفتری کے تمام کام کو مذاق بنا کر رکھ دیا گیا۔ ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ محکمہ زبان دفتری کی سیزدہ سالہ کوششوں کی کیفیت و کمیت کیا ہے۔ کسی روز اس محکمہ کی مرتبہ فہرستوں پر سیر حاصل تبصرہ کر کے اس محکمہ کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا لیکن فی الحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس محکمہ نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے کیا اس کو عملی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی؟ محکمہ زبان دفتری کی وضع کردہ مصطلحات کے حسن و قبح کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کو استعمال میں لایا جائے، لیکن ہمارے سرکاری دفاتر اس کے لئے کسی طرح بھی تیار نہیں۔

اگر حقیقت بیں نگاہ سے دیکھا جائے تو اتنے بڑے جھمیلے میں پڑنے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ اُردو میں ہر شعبہ کے لئے موزوں الفاظ اور مصطلحات پہلے سے موجود ہیں۔ اگر سرکاری دفاتر میں رواج دینے کی سنجیدگی سے دلی کوشش کی جائے تو بڑی آسانی سے تمام کام اُردو میں

ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ تمام محکموں کے ابتدائی شعبوں میں ہر قسم کی کارروائی مدت مدید سے اُردو میں ہو رہی ہے ۔ پولیس، مال، عدالتوں اور دیگر تمام محکموں کی ابتدائی کارروائی اُردو میں ہوتی ہے اور کسی کو اُردو کی تنگ دامانی کی شکایت نہیں ہوتی لیکن محکموں کے اعلےٰ شعبوں میں جن کی کرسی امارت پر مغرب زدہ لوگ متمکن ہیں تمام کارروائی انگریزی میں ہوتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اعلےٰ مدارج میں اُردو کام نہیں دے سکتی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ محکموں کے سربراہ اُردو میں بات کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں ۔ یہی غلامانہ ذہنیت ہماری تعلیم کے اعلےٰ مدارج میں کارفرما ہے اور انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر طالب علموں کو ذہنی خلفشار اور جمود کا شکار بنایا جا رہا ہے ۔ ہم تعلیمی معیار کی پستی کا رونا تو روز رونا رہتے ہیں ۔ لیکن ہم نے کبھی پستی کے سبب کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ جب کبھی ارباب حل وعقد کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ہے تو وہ سوکھا سا منہ بنا کر وہی فرسودہ جواب دیتے ہیں کہ جناب اُردو ایک نیم ترقی یافتہ زبان ہے اعلےٰ تعلیمی مدارج میں یہ کام نہیں دے سکتی ۔ حالانکہ سالہا سال پیشتر ان کے اس بے بنیاد اعتراض کا مسکت جواب دیا جا چکا ہے اور یہ عملی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اُردو ہر درجہ میں ذریعہ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے ۔ آج سے قریباً ایک صدی پہلے دلی کالج میں تمام علوم و فنون کی تعلیم اُردو ہی میں دی جاتی تھی اور اس کالج سے تعلیم حاصل کر کے نکلنے والوں نے علمی دنیا میں غیروں سے بھی اپنا لوہا منوا لیا تھا ۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو جملہ علوم و فنون کی تعلیم اُردو میں دی جاتی رہی اور نتائج نے یہ ثابت کر دیا کہ جن طلبہ نے اُردو میں تعلیم حاصل کی وہ انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے والوں سے زیادہ قابلیت پیدا کر سکے اور دور کیوں جایئے آج کراچی میں اردو کالج میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اردو کے طفیل اس کالج کے نتائج مقابلۃً اچھے ہی ہوتے ہیں ۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کو تسلیم کرنے پر ہر شخص مجبور ہے اور انگریزی کے حامی بھی ان حقائق کی تکذیب کی جرأت نہیں کر سکتے ، لیکن اس کے باوجود وہ اب بھی اردو کی تنگیٔ داماں کے شاکی ہیں ۔ ان کے اس عذر لنگ کے متعلق ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ع خوئے بدرا بہانہ بسیار ۔

افرنگ زدہ سربراہان دفاتر سرکاری نے تو اُردو کو سرکار دربار سے بارہ پتھر باہر کیا ہی تھا ، لیکن اب بعض تخریب پسند عناصر نے اُردو کو اس مقام سے بھی محروم کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے جو اس نے اتنی مخالفتوں کے باوجود از خود حاصل کیا ہے ۔

اس تخریبی سازش میں شریک ایک گروہ تو وہ ہے جو علاقائی زبانوں کو حریف بنا کر اُردو کے مقابلہ میں لانے کی کوشش کر رہا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو اُردو کو اس کے بہترین رسم الخط سے محروم کر کے رومن رسم الخط میں مقید کر کے اس کی صورت مسخ کر دینا چاہتا ہے ۔

علاقائی زبانوں کی ترقی کے ہم بھی مخالف نہیں اور نہ اُردو زبان ہی علاقائی زبانوں کی جگہ لینی چاہتی ہے ۔ اُردو تو اپنی آفرینش ہی سے تمام زبانوں کے لئے ایک سنگم اور علاقائی حدود سے بالاتر رہی ہے ۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُردو کسی زبان کی ترقی میں مانع ہو گی اُردو تو ہمیشہ علاقائی زبانوں کی ترقی و ترویج کی حامی رہی ہے ۔ اس کی یہی ہمہ گیر حیثیت ہے جس کے باعث یہ تمام لوگوں کی خواہ ان کا تعلق کسی علاقہ سے ہو ۔ مشترکہ زبان بن چکی ہے ۔ اس لئے علاقائی زبانوں کی حمایت کا علم بلند کرنے والوں کی یہ دلیل تو سرے سے غلط ہے کہ وہ اس طرح محض اپنی زبانوں کی ترقی چاہتے ہیں ۔ اگر علاقائی زبانیں اپنی حدود میں رہ کر ترقی کریں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں لیکن علاقائی زبانوں کو اُردو کا حریف بنا کر پیش کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ علاقائی تعصب کی آگ کو ہوا دے کر قومی اتحاد کو انتشار و نفاق سے بدل دینا چاہتے ہیں ۔ اُردو کا تعلق کسی خاص علاقہ سے نہیں اور اس کے علاوہ اس میں بعض ایسی اور خصوصیات ہیں کہ یہ ہر علاقہ میں سمجھی اور بولی جاتی ہے اس کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے اس کو پاکستان کی (Lingua franca) مشترکہ زبان کا درجہ دیا ہے ۔ اُردو تعصب و افتراق کی دشمن ہے اور اتحاد و اشتراک کی حامی و ناصر ہے ۔ اگر اس کو اس کا جائز حق فوراً دے دیا جائے تو بیشتر علاقائی تعصبات رواداری و اتحاد میں بدل سکتے ہیں ۔ اگر اس کو اس کے جائز حق سے محروم کیا گیا تو لسانی تعصب کی جو رو چل پڑی ہے وہ ایک دن قومی اتحاد کو پارہ پارہ

رہے گی اور ہم ایک دیس کے باسی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے۔ اس لئے ضروری ہے اس تخریبی تحریک کو کسی صورت میں بھی پنپنے نہ دیا جائے۔

اب ایک نظر رسم الخط کے مسئلہ پر بھی ڈال لینی چاہیئے۔ جو اصحاب اُردو کو رومن رسم الخط کے بے ہنگم لباس میں مقید کر دینا چاہتے ہیں انھوں نے غالباً اس کے نتائج و عواقب پر نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ جس طرح ایک غیر موزوں لباس انسان کی شخصیت بلکہ اس کے حلیہ کو بگاڑ دیتا ہے اسی طرح ایک غیر موزوں رسم الخط کسی زبان کی امتیازی خصوصیات کو زائل کر کے اس کی صورت کو مسخ کر دیتا ہے۔ آج ہم چست لباس کے خلاف بہت شور مچا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چست لباس ہماری قومی روایات کے خلاف ہے اور اس کے استعمال کرنے والوں میں اخلاقی قیود سے بیزاری، جنسی بے راہروی اور بے حیائی پیدا ہو جاتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لباس انسان کی شخصیت پر زبردست اثر ڈالتا ہے اسی طرح رسم الخط زبان کے مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جس طرح ٹیڈی لباس مذکورہ بالا تمام عیوب کا مظہر ہے اور ہمارے لئے ناقابلِ قبول ہے اسی طرح رومن رسم الخط اُردو زبان کے لئے سم قاتل ہے۔ یہ تو ایک مثال تھی ورنہ رسم الخط کی جو اہمیت ہے وہ لباس سے کہیں زیادہ ہے۔ اُردو لباس کے موجودہ رسم الخط سے محروم کر دینا اس کو اس کے ہزار سالہ علمی و ادبی سرمایہ سے محروم کر دینے کے مترادف ہے۔ اگر اس تجویز کو قبول کر لیا جائے تو آئندہ نسلیں محض رسم الخط کے اختلاف کے باعث اپنے شاندار ماضی سے محروم ہو جائیں گی اور آج تک اُردو زبان میں جو علمی کارنامے انجام دیئے گئے ہیں ان سے استفادہ نہیں کر سکیں گی اور یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ آج تک اُردو میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کو ایک دم رومن رسم الخط میں منتقل کر دیا جائے۔ اُردو کی پونجی چند درسی کتابیں نہیں کہ ان کو رومن رسم الخط میں تبدیل کر کے یہ مقصد پورا ہو سکے، بلکہ اُردو میں ہر موضوع پر بہت زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جن کو یکجا کرنا ہی ناممکن ہے اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس کا علمی سرمایہ لامحدود ہے۔ اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ اُردو کی تمام اہم کتابوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی دوبارہ طباعت و اشاعت کے جو مصارف ہوں گے کیا ہم ان کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے وسائل تو ظاہر ہے کہ بڑے محدود ہیں اور ہم اپنے وسائل کی کمی کے باعث اس وقت اقتصادی بدحالی کو بھی دور نہیں کر سکے۔ اگر امریکہ جیسا متمول ملک بھی اس کی کوشش کرے تو دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور کام پھر بھی نامکمل رہے۔ اگر ہمیں کسی طرح قارون کا خزانہ مل بھی جائے اور ہم پورے جوش و خروش سے یہ کام شروع بھی کر دیں تو بھی یہ سوچنا ہوگا کہ تمام کتب کی تلاش و حصول اور اس کے بعد طباعت و اشاعت کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایک دو دن کا نہیں اس کے لئے باقاعدہ ایک محکمہ قائم کرنا ہوگا جس کو سالہاسال تک کام کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب تک دوبارہ طباعت و اشاعت کا کام مکمل نہ ہو جائے جس کو لازماً ایک طویل مدت درکار ہوگی، اس وقت تک قوم ان علمی کتب کے مطالعہ سے محروم رہے گی اور اس محرومی کے باعث ہمارے علمی ارتقا میں جو رکاوٹ پیدا ہوگی، اس کے نتائج انتہائی نقصان دہ ہوں گے، چند لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس تجویز کو بروئے کار لانے سے ہماری ترقی تنزل میں بدل جائے گی، اس لئے یہ تجویز تو سرے سے ناقابلِ عمل ہے۔ اب ایک اور راستہ باقی ہے جو بظاہر زیادہ آسان نظر آتا ہے کہ آئندہ اور موجودہ نسل کو رومن رسم الخط کے ساتھ اردو کے موجودہ رسم الخط کی بھی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اُردو کے علمی ذخیرہ سے براہِ راست استفادہ کر سکیں، لیکن اس سے وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ جس کے حصول کے لئے رومن رسم الخط کو رائج کرنے کی تجویز پیش کی جا رہی ہے اگر اُردو کے موجودہ رسم الخط سے ہم دامن نہیں چھڑا سکتے تو اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی زحمت بے سود کیوں کی جائے۔ اس کے علاوہ دو علیحدہ علیحدہ رسوم خط میں لکھنے سے زبان کی یک آہنگی اور صوتی نظام میں اختلاف و انتشار پیدا ہو جائے گا اور اس طرح اُردو زبان ایک داخلی انتشار اور بے آہنگی کا شکار ہو جائے گی۔ اب ایک اور پہلو پر نظر ڈالئے۔ مغربی پاکستان میں رائج تمام زبانوں کا رسم الخط وہی ہے جو اُردو کا ہے، جس سے ان میں ایک قدر مشترک پیدا ہو گئی ہے۔ محض رسم الخط کے اشتراک سے یہ علاقائی زبانیں ہمیں مانوس نظر آتی ہیں۔ اور ان کو سیکھنا

ہمارے لئے آسان ہے۔ اس طرح موجودہ رسم الخط غیر محسوس انداز میں پاکستان کے مختلف علاقوں میں وحدت و اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی بھی اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ محض اس رسم الخط کے باعث اسلامی دنیا سے ہمارا رشتہ استوار ہے۔ عربی اور فارسی بولنے والے اسلامی ممالک سے دور ہونے کے باوجود ہم محض رسم الخط کے اشتراک کے باعث ان سے قرب محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ ان تمام اسلامی زبانوں کا رسم الخط ایک ہے، اس لئے ان زبانوں کو سیکھنے میں ہمیں ان دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جن سے دوسری اقوام کو دوچار ہونا پڑتا ہے محض رسم الخط کے مشترک ہونے کے باعث ہم ان زبانوں کو بہت آسانی کے ساتھ اور بہت جلد سیکھ سکتے ہیں۔ عربی قرآن مجید کی زبان اس لئے ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم عربی زبان سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہمارا اور عربی کا ساتھ ہے۔ اسی طرح فارسی بھی علوم اسلامی کی امین ہے اور اس سے رشتہ توڑنا بھی ہمارے لئے ممکن نہیں اور یہ رشتے اسی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں جب اُردو کے موجودہ رسم الخط کو اپنائے رہیں۔ رومن رسم الخط سے رشتہ جوڑنے کے بعد ہم ان تمام مفادات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف علمی و ادبی سرمایہ سے ہمیں ہاتھ دھونے پڑتے ہیں بلکہ اپنے مذہب و ثقافت سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے اور یہ اتنی گراں قیمت ہے جس کو ادا کر کے ہم رومن رسم الخط کو اختیار نہیں کر سکتے۔ سچ جانئے اُردو کا موجودہ رسم الخط ہمارے لئے ایک رحمت ہے اور رومن رسم الخط ہمارے لئے ایک لعنت بن جائیگا۔ رسم الخط کی اہمیت کو نظر انداز کرنا انتہائی افسوسناک امر ہے۔ یہ رسم الخط ہماری اسلامیت کا بھی ضامن ہے۔ غیروں نے اس کی اہمیت محسوس کی ہے۔ گاندھی جی اپنے دل کی اس کھٹک کو نہ چھپا سکے، انھوں نے کہا کہ اُردو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔

اب آخر میں فنی حیثیت سے بھی رومن رسم الخط پر اگر ایک نظر ڈال لی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

ہر رسم الخط کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک صوتی اور دوسرا صورتی. صوتی لحاظ سے کسی رسم الخط کی عمدگی کا مدار اس بات پر ہے کہ اس کی لپی ایسے حروف پر مشتمل ہو کہ اس کے ذریعہ ہر قسم کی آواز ادا کی جا سکے اور ہر آواز کے لئے کم از کم ایک حرف مخصوص ہو۔ اس کے علاوہ حروف کا نام اس کی آواز کے مطابق ہو تاکہ تلفظ میں دشواری پیش نہ آئے۔ اگر اس معیار پر رومن رسم الخط کو جانچا جائے تو یہ رسم الخط ناقص ثابت ہوتا ہے۔ ہندی، فارسی اور عربی کی مخصوص اصوات رومن حروف سے ادا نہیں ہو سکتیں، کیونکہ جن اقوام میں اس رسم الخط کا رواج ہے وہ ان اصوات سے آشنا نہیں، مثلاً ڑ، ژ، ث، ص، ع وغیرہم حروف کی آوازوں کو ادا کرنے کے لئے رومن حروف تہجی میں کوئی حرف نہیں۔ اس کے علاوہ رومن حروف میں ایک قباحت یہ ہے کہ بعض حروف ایک سے زیادہ اصوات کی علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً رومن حروف C ، G ، X ، J ، S ، اور مرکب حروف ch ، gh وغیرہم کو لیجئے۔ یہ حروف کئی آوازوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً C (سی) کو اپنے نام کے لحاظ سے سین کی آواز دینی چاہیے۔ لیکن یہ سین کے علاوہ کاف کی آواز بھی دیتا ہے جیسے Cant (کینٹ) اور Car (کار)۔ G (جی) کو جیم کی آواز دینی چاہیے لیکن جیم کے ساتھ ساتھ گاف کی آواز بھی دیتا ہے جیسے (Germ) (جرم) اور Gum (گم) اسی طرح S (ایس) کو سین کی آواز دینی چاہیے لیکن یہ زائے منقوطہ کی آواز بھی دیتا ہے۔ جیسے Sing (سنگ) اور Is (از) میں۔ X (ایکس) کو کاف اور سین مرکب کی آواز دینی چاہیے لیکن یہ گاف اور زائے منقوطہ مرکب کی آواز بھی دیتا ہے جیسے Box (بکس) Example (ایگزامپل) میں۔ Ch کی آواز چ (جیم فارسی) کی ہے، لیکن یہ کہیں "چ" کی آواز دیتا ہے کہیں "ک" کی جیسے Charm (چارم) اور Chemical (کیمیکل) میں۔ اسی طرح gh ہے جس کو گ کی آواز دینی چاہیے لیکن یہ کہیں گ کی آواز دیتا ہے کہیں ف کی اور کہیں کوئی آواز ہی نہیں دیتا۔ مثلاً Ghulam (غلام) Bermingham (برمنگھم) Rough (رف) اور Though (دو) میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی تلفظ ایک گورکھ دھندا بن گیا ہے اور تلفظ کا کوئی قاعدہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ رومن رسم الخط ہم مخرج اور قریب المخرج حروف جو مثیل الصوت اور قریب الصوت

رتے ہیں ان کے نازک فرق کو ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ اب اسی معیار پر اُردو رسم الخط اور اس کی "لپی" کو جانچیئے۔ اُردو کی لپی کو اگر بالکل مکمل نہ بھی کہا جائے تو بھی اسے معیاری لپی کہا جائے گا کیونکہ اس میں ہر قسم کی آواز کو ادا کرنے کی قابلیت ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام حروف کا نام بھی آواز کے مطابق ہے۔ اس لئے ایک اردو جاننے والا ہر قسم کی آواز کو ادا کر سکتا ہے اور اسے کسی بھی زبان کے تلفظ میں دشواری پیش نہیں آتی۔ اُردو کی لپی میں مخرج اور قریب المخرج الفاظ کے وجود کے باعث لب و لہجہ کے کم سے کم فرق کو بھی واضح کیا جا سکتا ہے اور ایک انجان بھی اُردو میں لکھے ہوئے کسی لفظ کے تلفظ میں دشواری پیش نہیں آتی۔ رومن رسم الخط کے ناقص ہونے کا احساس خود ان اقوام کو بھی ہے جن میں یہ رسم الخط رائج ہے۔ اس لئے بہت سے ادارے قائم ہو چکے ہیں جو مختلف علامات کے اضافے سے اس کے صوتی نقص کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں International Phenetic Association انجمن بین الاقوامی صوتیات مشہور ادارہ ہے۔

اب دوسرا پہلو لیجئے۔ صوتی اور مکتوبی لحاظ سے کسی رسم الخط کی خوبی کا انحصار اس بات پر ہے کہ حروف کی بناوٹ میں حسن کے ساتھ ساتھ اختصار بھی پایا جائے۔ یعنی کوئی لفظ لکھنے میں جگہ بھی کم خرچ ہو اور وقت بھی کم صرف ہو۔ اس لحاظ سے بھی رومن رسم الخط ناقص رسم الخط ہے۔ رومن حروف میں کسی لفظ کو لکھنے کے لئے جگہ اور وقت زیادہ خرچ ہوتا ہے رومن رسم الخط کی اسی قباحت کے باعث Pitman کو اختصار نویسی کے لئے ایک الگ رسم الخط ایجاد کرنا پڑا جو Pitman Short hand کے نام سے معروف ہے۔ اب اس معیار پر اُردو رسم الخط کو جانچیئے تو معلوم ہوگا کہ اردو رسم الخط جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اختصار نویسی کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اُردو کو اس کے ہر لحاظ سے اعلیٰ رسم الخط سے محروم کر کے ایک ناقص اور سقیم رسم الخط سے بدلنے کی کے بارے میں کیوں سوچا جاتا ہے۔ اگر ہم اس تخریبی تجویز کے محرکوں اور حامیوں کو شبہ کی رعایت بھی دیں تو بھی انہیں نادان دوست کہنا پڑیگا۔

ہمارے اس مختصر سے تجزیے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو زبان ہر لحاظ سے ایک معیاری، مکمل اور زندہ زبان ہے۔ اس میں اخذ و قبول اور زمانہ کا ساتھ دینے کی جو خوبیاں ہیں وہ اس درجہ کسی زبان میں نہیں اور یہی وجہ ہے جس نے اس کو ایک ہمہ گیر زبان بنا دیا ہے۔ اتنی عمدہ اور معیاری زبان کے مالک ہوتے ہوئے بھی اگر ہم اس سے بے اعتنائی برتیں اور ایک غیر زبان کو جو ہمارے مزاج کے خلاف اور ہماری روایات سے متصادم ہے اپنے آپ پر مسلط رکھنے میں فخر محسوس کریں۔ تو اسے بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ غلامی کی سب سے شدید قسم ذہنی غلامی ہے اور ہم اب تک ذہنی طور پر انگریز کے غلام ہیں۔ انگریزی زبان ایک طوقِ زریں ہے۔ جب تک ہم اس طوق کو نہیں اتار دیتے اس وقت تک اس غلامی سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اُردو کو اس کا جائز حق دیا جائے۔ یعنی ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں اُردو ہی ذریعہ اظہار ہو۔ سرکاری دفاتر میں ہر قسم کی کارروائی اُردو میں ہو تمام عدالتوں میں خواہ وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ اُردو ہی میں تمام کارروائی ہو اور تعلیم کے تمام مدارج میں اُردو ہی ذریعہ تعلیم ہو۔ درسگاہوں میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانا سب سے ضروری ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی سے انسانی ذہن کی ترتیب ہوتی ہے۔ غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے باعث طلبہ کی بیشتر ذہنی صلاحیتیں غیر زبان کے حصول میں صرف ہو جاتی ہیں اور وہ نفس مضمون پر پوری توجہ نہیں دے سکتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لفظی ہیر پھیر میں پھنس کر تعلیم کے اصل مقصد سے دور جا پڑتے ہیں۔ اور آدھا تیتر آدھا بٹیر بن کر دین دنیا کے کسی کام کے لائق نہیں رہتے۔ آج ہماری یہی حالت ہے اور اس زبوں حالی کی بیشتر ذمہ داری ان ارباب اختیار پر عائد ہوتی ہے جو ایک غیر زبان کو قوم پر مسلط کر کے اس کو ذہنی طور پر مفلوج بنا رہے ہیں۔

خدا کرے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھ کر تلافیٔ مافات کر سکیں ——

مُلّا واحدی دہلوی

جینے کا سلیقہ

کسی میں کپڑا پہننے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ کسی میں کھانے پینے کا، کوئی رہتا اور اُٹھتا بیٹھتا اور ملتا جُلتا سلیقے سے —— اور لوگوں کے ساتھ برتاؤ سلیقے سے کرتا ہے۔ کسی میں سارے سلیقے جمع ہو جائیں تو کہنا چاہیئے کہ یہ جینے کا سلیقہ جانتا ہے۔

سلیقہ کیا شے ہے اور سلیقے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ بغیر کشش پیدا کرنے کی نیت کے اپنے اندر کشش پیدا کر لینے کا نام سلیقہ ہے، اور سلیقے سے بس یہی کشش کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔

جو شخص کپڑا پہننے کا سلیقہ رکھتا ہے لوگ اُسے پاس بٹھاتے ہیں۔ جسے ملنے جُلنے کا سلیقہ آتا ہے کامیابی اُس کے قدم چُومتی ہے۔ بدسلیقہ سے دنیا نفرت کرتی ہے اور خوش سلیقہ کی طرف دُنیا کھنچی چلی جاتی ہے۔ جو جینے کا سلیقہ جانتا ہے اُس کی ذات لوگوں میں مقبول اور محبوب ہو جاتی ہے۔

سلیقہ پیٹ کا اطمینان ہونے کے بعد سُوجھا کرتا ہے۔ کھانے پینے تک کا سلیقہ پیٹ بھرے ہی جانتے ہیں، رہنے سہنے اور ملنے جُلنے کے سلیقے کا تو ذکر کیا۔ اور جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، جینے کا سلیقہ ہے کیا۔ پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے اور ملنے جُلنے کے سلیقوں کا مجموعہ ہے۔

میں خالی جینے کا ذکر نہیں کر رہا۔ سلیقے سے جینے کا ذکر کر رہا ہوں۔ جیتا تو انسان بُرے سے بُرے حال میں بھی ہے۔ بدسلیقہ جیتے رہتے ہیں اور سلیقے والے چل دیتے ہیں۔

سلیقہ ہر قسم کا پیسہ سکھاتا ہے، یا اللہ کے پیغمبر سکھاتے ہیں، یا خود اللہ سکھاتا ہے۔ سلیقے کا مادہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ پیغمبر اور پیغمبروں کے متبع سلیقے کی فطرت کو اُبھارتے ہیں اور دولت اس فطرت کو چمکاتی ہے۔ جن کی فطرت میں سلیقہ نہیں ہوتا انہیں پیغمبر بھی سلیقہ مند نہیں بنا سکتے، اور دولت آجانے کے بعد بھی وہ پھوہڑ کے پھوہڑ رہتے ہیں۔ آپ اچھے اچھے امیروں کے ہاں دھوانسی آنچ پر جلتے کا پانی پیتے اور اچھے اچھے امیروں کو کُرتے کے دامن سے مُنہ پونچھتے دیکھیں گے۔ لیکن بہرحال عرفِ عام میں جسے سلیقہ کہا جاتا ہے وہ امیروں، پڑھے لکھوں، مہذّب اور شائستہ لوگوں ہی کا سلیقہ ہے۔ انہیں ہی رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے جُلنے اور جینے کا سلیقہ آتا ہے یا آسکتا ہے۔ پیغمبر بھی لوگوں کو خوشحال اور سلیقہ مند ساتھ ساتھ بناتے ہیں۔ سلیقے کی بنیاد بچپن میں پڑتی ہے۔ بچے کے ماں باپ یا بچے کے دوسرے تربیت کرنے والے اور بچے کا ماحول، بچے کو سلیقہ یا پھوہڑپن سکھاتے ہیں۔ جوانی اور بڑھاپے میں ماحول بدل بھی جاتے تو بچپن کے ماحول کا اثر مٹائے نہیں مٹتا اور بچپن کا غریب جوانی یا بڑھاپے میں امیر ہو جاتے تو بچپن کا پھوہڑپن کبھی نہ کبھی جھلک ضرور دکھائے گا۔ گلیوں کی گالیاں یاد کر لینے کے بعد کوٹھیوں کی رہائش گالیوں کو بُھلا نہیں سکتی۔

خیر تو جینے کا صحیح سلیقہ اُسی کو آتا ہے، جس نے بچپن سے سلیقہ سیکھا ہے۔ ہر شخص کا جینا بالکل یکساں نہیں ہوتا، کوئی نوکری کر کے جیتا ہے، کوئی تجارت کر کے، کوئی حکومت کر کے جیتا ہے، کوئی غلامی کر کے۔ جسے تجارت کرنے کے لئے جنم دیا گیا ہے اُسے نوکری مل جائے یا جو غلامی کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے وہ حاکم بنا دیا جائے تو اُس میں سلیقہ کہاں سے آئے گا۔ اللہ انسان کو اُسی کام پر لگائے جس سے اُس کی طبیعت کو

ناسبت ہے تو یہ اللہ کا بڑا احسان ہے، اور تب ہی سلیقہ بہار دکھاتا ہے ۔ یورپ و امریکہ میں ایسے ماہر موجود ہیں جو بتادیا کرتے ہیں کہ ماں بچے کی طبیعت کس کام میں اپنے جوہر دکھائے گی ۔

بچپن میں سلیقہ ارادہ کرکے نہیں سیکھا جاتا، جیسا سلیقہ سامنے آتا ہے بچہ بےارادہ سیکھتا ہے ۔ آپ جس طرح رہتے سہتے ہیں اُسی طرح کے رہنے سہنے کو آپ کا بچہ اختیار کرے گا ۔ آپ جس طرح کھائیں پئیں گے اُسی طریقے کو وہ بہترین طریقہ سمجھے گا ۔ آپ جس طرح عزیزوں اور دوستوں سے ملیں جلیں گے اور جس طرح کا اُن سے معاملہ اور برتاؤ رکھیں گے وہ اُسی سے واقف ہوگا اور اُسی ڈگر پہ چلے گا ۔

سلیقے کی بنیاد بچپن میں پڑتی ہے، لیکن سلیقے کا نمایاں مظاہرہ اور امتحان بڑھاپے میں ہوتا ہے ۔ جس طرح جسم میں قوت ہو تو بیماریاں دُور رہتی ہیں، اُسی طرح بچپن اور جوانی میں پھوہڑپن چھپ جاتا اور نبھ جاتا ہے، مگر بڑھاپا خوش سلیقگی اور بدسلیقگی دونوں کو کھول کر رکھ دیتا ہے ۔ بوڑھوں کی غلطیوں کو دنیا معاف نہیں کیا کرتی ۔ بڈھوں سے توقع کی جاتی ہے کہ اُن کا بچپن اور اُن کی جوانی کیسی بھی گزری ہو، بڑھاپے میں وہ انسان بن جائیں ۔ انھوں نے بچپن اور جوانی میں صحت کی پرواہ کی ہو یا نہ کی ہو بڑھاپے میں وہ تندرست رہیں ۔ بچپن کی بیماری کو ماں سنبھالتی ہے، جوانی کی بیماری کو بیوی ۔ بڑھاپے میں عموماً بہوؤں سے سابقہ رہ جاتا ہے جو بہت کم ایسی ہوتی ہیں اور ہوسکتی ہیں کہ شوہر کا باپ تو کجا اپنے باپ کی بیماری کو برداشت کرلیں ۔

بڑھاپے میں جینے کا بہت بڑا سلیقہ یہ ہے کہ انسان صحت کا خیال رکھے ۔ بچے اور جوان کی بیماری سے کوئی نہیں اُکتاتا، لیکن بوڑھوں کی بیماری گھروالوں کو تنگ کردیتی ہے اور لوگ بوڑھوں کی موت چاہنے لگتے ہیں، اور جب بوڑھا مرجاتا ہے تو اُس کے رہنے کی جگہ صاف کراکر کہتے ہیں ۔ "توبہ! کیسا خراب کر رکھا تھا کمرہ، گھُسنے کو جی نہ چاہتا تھا" ۔ بوڑھوں سے بچوں اور جوانوں کی نسبت بہتر اخلاق کی اُمید کی جاتی ہے ۔ بچے کی بیہودگی اور جوان کا طیش نظرانداز کیا جاسکتا ہے، مگر بوڑھے کا چڑچڑاپن اولاد بھی پسند نہیں کرتی ۔ جس بوڑھے کو خندہ پیشانی کے ساتھ گفتگو کرنے کا سلیقہ نہیں آتا اُسے جینے کا سلیقہ نہیں آتا ۔ ایندھن کی کوٹھری یا کاٹھ کباڑ کی کوٹھری کی طرح ایسے بوڑھوں کے لئے الگ کوٹھری مخصوص کردی جاتی ہے کہ پڑے رہو الگ کے اندر ۔ باہر صورت نظر آئی اور گھروالوں نے سوچا ۔ الٰہی خیر ۔

بچپن سے اگر ایک عادت ڈلوادی جائے اور جوانی میں اُس کی مزاولت کی جائے تو بڑھاپے میں وہ بے حد کام آتی ہے، وہ یہ کہ دوسروں کے اعمال سے زیادہ انسان اپنے اعمال پر نظر رکھے ۔ صرف اپنی اصلاح کرکے اپنے آپ کو مطمئن اور بشاش بنایا جاسکتا ہے، اور دُوسرے بھی اُس کے نمونے سے متاثر ہوسکتے ہیں اور سبق لے سکتے ہیں ۔ فلاں ایسا ہے اور فلاں ویسا ہے، فلاں نے یہ کیا اور فلاں نے وہ کیا کہتے رہنا جوانی میں بھی ذلیل کراتا ہے اور بڑھاپے کے لئے تو بہت ہی خراب ہے ۔ انسان اپنے اعمال پر قابو پالے تو اُسے کسی عمر میں کوئی دُکھ نہیں ہوسکتا، اور یہ جینے کا بہت عظیم سلیقہ ہے ۔ جس کا دل، جس کا دماغ، جس کی زبان، جس کا تمام جسم اور جس کے تمام عاداتِ واطوار قابو میں ہوں، مقناطیس کی مانند لوگ اُس کی طرف کھنچتے ہیں اور پارس کی طرح اُس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ ایسا انسان انسان ہوتا ہے ۔ وہ جوانی میں بچپن کو نہیں ڈھونڈتا اور بڑھاپے میں جوانی کو نہیں روتا ۔ وہ مرتے دم تک تن دُرست اور خوش وخرم رہتا ہے ۔ وہ بچپن اور جوانی سے بڑھ کر بڑھاپے کو نعمت سمجھتا ہے اور بڑھاپے کی نعمت کو زحمت نہیں بناتا وہ جانتا ہے کہ کچھ باتیں بچپن کے ساتھ مخصوص تھیں کچھ باتیں جوانی کے ساتھ اور وہ مانتا ہے کہ بچپن اور جوانی میں بڑھاپے کی خصوصیات اختیار نہیں کی جاتیں تو بڑھاپے میں بچپن اور جوانی کی خصوصیات کیوں اختیار کی جائیں ۔ بچپن اور جوانی کے بعض

وصف جوانی کے عیب ہیں۔

بڑھاپے میں دُوسروں کی خرابیاں پکڑنے اور جتانے کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ بوڑھے نصیحتیں کرنا بھی اپنا حق خیال کرتے ہیں۔ وہ بچوں اور جوانوں سے اُن حرکتوں کو چھڑوانا چاہتے ہیں جنہیں بچپن اور جوانی میں خود نہیں چھوڑ سکے تھے۔ اگر خود وہ حرکتیں نہیں بھی کی تھیں تو بھی زبان سے کہنے کا خاک اثر نہیں ہوگا۔ عملی نمونہ پیش کیجئے۔ نمونے سے زیادہ کوئی شے کارگر نہیں ہے۔

سو کی ایک بات یاد رکھئے۔ انسان اُس کی طرف کھنچتا ہے جس سے اُسے کچھ ملتا ہے۔ روپیہ ملے، عزت ملے۔ آرام ملے، خوشی ملے۔ نصیحت بھی بڑی نعمت ہے۔ لیکن نصیحت کرنے کی اہلیت ہونی چاہئیے۔ آپ نصیحت کرنے کے اہل ہیں تو ضرور نصیحت کیجئے ورنہ کسی اور اعتبار سے لوگوں کے لئے مفید بنئے۔ بس یہی جینے کا سلیقہ ہے۔ بڑھاپے ہی میں نہیں، عمر کے ہر دور میں، اور یہ سلیقہ اللہ جسے چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے۔ آپ میں اس سلیقے کی خواہش ابھر رہی ہے تو یقیناً آپ کو یہ نعمت اللہ دینی چاہتا ہے۔ بڑھئے اور اس نعمت کو لے لیجئے۔

مجاز و حقیقت

طالوت

طغیان معصیت پہ سزائے عتاب ہے
اس کے کرم کی حد ہے نہ کوئی حساب ہے

اک ذرۂ ذلیل پہ اتنی نوازشیں
اس بندہ پروری کا بھی کوئی جواب ہے

سرمایۂ نجات بجز عجز کچھ نہیں
ہو بھی، تو احتساب کی یاں کس میں تاب ہے

شایانِ التفات ہیں دل کی ہدائیں
فرشِ زمیں کا ذرہ بھی عرش انتساب ہے

ساقی کی چشم لطف نے کردی دوآتشہ
پیمانۂ حیات میں جتنی شراب ہے

صانع کی معرفت سے ہو مصنوع بے نصیب
اللہ! کیا زمانہ ہے کیا انقلاب ہے

آفتاب احمد جوہر بدایونی

غنچہ و گل سے سوا ربط ہے خاروں سے مجھے
سابقہ پہلا ہے گلشن کی بہاروں سے مجھے

میں نے طوفان کی موجوں میں بڑھا دی کشتی
دوست دیتے رہے آواز کناروں سے مجھے

اتنی دوری پہ بھی اکثر یہ ہوا ہے محسوس
جیسے تم پاس بلاتے ہو اشاروں سے مجھے

وادیٔ شوق سے پھر مل نہ سکی راہ گریز
جانے تم لائے تھے کن راہگزاروں سے مجھے

میری خاکسترِ دل میں جو نہاں ہے ہمدم
ابھی امید ہے ان چند شراروں سے مجھے

میں تہی جام چلا بزم سے تیری ساقی
روک لے نیو د گیسو کے اشاروں سے مجھے

کیوں ہے دامن کشِ دل منزل ہستی جوہر
ابھی جانا ہے بہت دور ستاروں سے مجھے

محمد نہکی کیفی

ان کا یہ کرم ہے کہ ستم کہہ نہیں سکتے
غم بھی وہ دیا ہے جسے غم کہہ نہیں سکتے

کس طرح تری راہ میں پامال ہوئے ہیں
خاموش ہیں جوں نقش قدم کہہ نہیں سکتے

ملنے کے اس انداز سے اچھا ہے تغافل
کھنچنے کا وہ عالم جسے رم کہہ نہیں سکتے

کیا خوب معمہ ہے تجلی کی لطافت
موجود نہیں اور عدم کہہ نہیں سکتے

کس کس طرح پیمانِ وفا توڑے ہیں تو نے
کیا کیا تجھے ترے قول العتم کہہ نہیں سکتے

احساس ندامت سے ہیں نمناک وہ پلکیں
اس لطف کو بھی ظلم سے کم کہہ نہیں سکتے

آتا ہے خدا یاد جسے دیکھ کے کیفی
اس دشمنِ ایماں کو صنم کہہ نہیں سکتے

راہی بلند شہری

گل فشاں غیروں پہ جب ہوتا ہے دامانِ بہار
یاد آجاتے ہیں ہم کو عہد و پیمانِ بہار

ہو سکے تو لے صبا! گلشن سے آہستہ گزر
سو رہے ہیں سایۂ گل میں شہیدانِ بہار

عارضِ گلرنگ ہوں یا گیسوئے شب رنگ ہوں
یہ بھی جانِ فصل گل، اور وہ بھی شایانِ بہار

کون سرتابی کرے جب کالی کالی بدلیاں
میکشوں کے نام لیکر آئیں فرمانِ بہار

رشید اختر

حسن جتنا وفا شعار ہوا — عشق اتنا ہی بے قرار ہوا
موت آئی سکون کے بدلے — لیجئے ختم انتظار ہوا
تم نے ٹھکرا دیا کہ اپنایا — دل بہرحال بیقرار ہوا
ہم سے رندوں کا دل دکھا کے اختر
محتسب خود گناہگار ہوا

مظہر القادری

بہ ہر شکل جلوہ طلب ہوگئی ہے
نظر کس قدر بے ادب ہوگئی ہے
وفا برہمی کا سبب ہوگئی ہے
تمہاری طبیعت عجب ہوگئی ہے
مجھے دیکھ کر زیر لب مسکراہٹ
ستم بن گئی ہے غضب ہوگئی ہے
تمہاری نوازش سے پہلے کہاں تھی
یہ حالت ہماری جواب ہوگئی ہے
وہ ماہر تصور میں جب آگئے ہیں
شب غم بھی صبح طرب ہوگئی ہے

نسیم (لیہ)

رخ و گیسو تو حکایات کی زنجیریں ہیں
ان کو توڑو یہ روایات کی زنجیریں ہیں
کوئی دشمن بھی یہاں آئے نہ مجرم بن کر
قید ہستی میں مکافات کی زنجیریں ہیں
بادلوں میں ہے گرفتار کرن سورج کی
دن کے پاؤں میں ابھی رات کی زنجیریں ہیں
میں غم دہر کی تقدیر بدلتا تو سہی
وقت کے پاؤں میں حالات کی زنجیریں ہیں

تابش دہلوی

سوز دل پر نگاہ رکھتے ہیں
ہم نظر میں بھی آہ رکھتے ہیں

راشد اللہ خاں جوہر (دہلوی)

گلوں کے چاک گریباں کی داستان لکھوں
کہ جشن فصل بہاراں کی داستان لکھوں
کلی کلی کے دل خوں شدہ کا ذکر کروں
کہ حسن صبح گلستاں کی داستاں لکھوں
نگاہ شوق کی بے تابیوں کا حال کہوں
کہ پردۂ رخ جاناں کی داستان لکھوں
نظر سے دور جو ہو جائے گریۂ شبنم
گلوں کے خندۂ گریاں کی داستاں لکھوں
ملے جو پیچ و خم راہ زیست سے فرصت
تو ان کے گیسوئے پیچاں کی داستاں لکھوں
نگاہ شوق کی گل چینیوں کا ذکر کروں
کہ سیر شہر نگاراں کی داستان لکھوں
بہ نام دست زلیخا، بہ پاس خاطر شوق
کسی کی پاکیٔ داماں کی داستاں لکھوں
بہت دنوں سے اسی کش مکش میں ہوں جوہر
میں اپنے خواب پریشاں کی داستاں لکھوں

ناصر کاسگنجوی

ہزار آئینہ ساماں ہو یہ دل حیراں
جمال و عکس میں لیکن برابری کیا ہے

خمار انصاری

یہ اور بات ہے وہ بے رخی سے ملتا ہے
مگر قرار دل و جاں اسی سے ملتا ہے

روحِ انتخاب

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قسم .... کی تمام باتوں کو بدعت قرار دیا، اور مسلمانوں میں ان بدعتوں کے خلاف تجدیدی اور اصلاحی تحریک شروع کی اور ایسے تصوف کو ضلالت سے تعبیر کیا جس میں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو، اور ایسے احوال وکیفیات کو جو نامشروع طریقہ پر مترتب ہوں، استدراج کہا انھوں نے کسی چیز کی حلت یا حرمت کے سلسلہ میں اولیاء کرام کے الہام کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کیا، اسی طرح ارباب باطن کے کشف کو کسی چیز کے فرض یا سنت ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا اور صاف طور پر بتایا کہ علوم لدنیہ کی صحت ومقبولیت کی علامت صریح علوم شرعیہ کے ساتھ ان کی مطابقت ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے الحاد اور بے دینی ہے، سنت سے ہٹ کر جو ریاضتیں کی جاتی ہیں وہ صریحاً گمراہی ہے۔

حضرت مجدد صاحب اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ :-

> جو کوئی جس قدر شریعت میں راسخ اور ثابت قدم ہوگا اسی قدر ہوائے نفس سے دور ہوتا جائیگا، کیونکہ شریعت کے اوامر ونواہی کے بجالانے سے دشوار کوئی اور چیز نہیں اور صاحب شریعت کی پیروی کے بعد کسی خرابی کا تصور نہیں آسکتا، اسی لئے وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو سنت کی تقلید کے سوا اختیار کئے جائیں معتبر نہیں ہیں۔

وہ اپنے ایک مکتوب میں نظام تھانیسری کو یہ بھی لکھتے ہیں کہ

> جس طرح آپ کی مجلس میں تصوف کا ذکر ہوتا رہتا ہے، اسی طرح فقہ کی کتابوں کا ذکر بھی ہونا چاہیئے اور اگر تصوف کی کتابیں نہ پڑھی جائیں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وہ احوال سے تعلق رکھتی ہیں اور قال میں نہیں آتیں لیکن کتب فقہ کے نہ پڑھنے سے ضرر کا احتمال ہے اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال متابعت عطا فرمائے!

سید صباح الدین عبد الرحمن (ایم۔اے)

ماہر القادری

یادِ رفتگاں!

علامہ احمد شبیلی مرحوم

مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی معیت میں میرا بمبئی پہلی بار جانا سنہ ۱۹۳۳ء میں ہوا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرین ڈرائیو (MARINE DRIVE) ان دنوں زیرِ تعمیر تھا اور اس علاقہ کا سمندری حصہ پاٹا جا رہا تھا۔ چند دن بمبئی میں قیام کرنے کے بعد بحری جہاز سے ہم عراق پہنچے اور وہاں سے واپسی میں پھر بمبئی میں قیام رہا ——— دوسری بار سنہ ۴۰ء میں وہاں جانا ہوا۔ تقریب یہ تھی کہ بمبئی میں یومِ شہنشاہ اکبر" منایا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک مشاعرہ تھا، جناب ضیاء الدین احمد برنی نے مشاعرے کا دعوت نامہ بھیجا، اور میں حیدرآباد دکن سے روانہ ہو کر مشاعرے کے دن بمبئی پہنچ گیا۔

کرافٹ مارکیٹ کے قریب، شاہ جہاں نام کا ایک ہوٹل تھا، سید فضل شاہ مرحوم اس کے مالک اور منتظم تھے، اسی ہوٹل میں مجھے ٹھیرایا گیا، مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے کئی قطعے اس ہوٹل کی تعریف میں کہے تھے۔ صابو صدیق ہال میں شب میں مشاعرہ ہوا، سامعین کے اصرار اور فرمائش پر میں نے کئی چیزیں سنائیں۔ تیسری یا چوتھی غزل پڑھ رہا تھا کہ میں نے گرانی اور گھبراہٹ محسوس کی، دل دھڑکنے لگا۔ یہاں تک کہ باہر صحن میں جا کر میں نے کئی قے کیں۔ بدن پسینہ میں شرابور تھا اور سستی بے حد تھی۔ مشاعرہ گاہ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بعض لوگ بولے کہ اس شاعر نے مقدار سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اسی نے اس کی یہ حالت کر دی!

ماہنامہ صبح امید" کے ایڈیٹر جناب عبدالحمید بوہیری جن سے کئی سال سے خط و کتابت تھی، اُن سے اسی مشاعرے میں پہلی بار بالمشافہ تعارف ہوا۔ بوہیری صاحب نے اپنے یہاں ایک ضیافت اور اس کے ساتھ شعری نشست کا انتظام کیا، دوسرے دن بمبئی کے اخباروں میں اس ضیافت کی روداد شائع ہوئی۔ علامہ شبیلی اس ضیافت کی روداد پڑھ کر "صبح امید" کے دفتر میں آئے، بوہیری صاحب معذرت کرنے لگے کہ آپ کو اس دعوت میں بلانا بھول گیا، علامہ بولے کہ کل میرے یہاں ماہر کی، آپ کی اور ان تمام شاعروں اور ادیبوں کی دعوت ہے، جو کل کی ضیافت میں شریک تھے

علامہ شبیلی کی وہ دعوت بلکہ یوں کہیے پُرتکلف عشائیہ آج تک یاد ہے، عربی اور مغلئی کھانوں کا وہ لذیذ امتزاج، وسیع دسترخوان، ہر چیز ذائقہ دار اور فراوانی کے ساتھ کھانے کے بعد شعر و شاعری ہوئی۔ بس اُس دن سے شبیلی مرحوم سے تعارف ہی نہیں دوستی ہو گئی ——— اور پھر بمبئی میں ان سے برابر ملنا جلنا ہوتا رہا

ایک بار حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کے اعزاز میں شبیلی صاحب نے دعوت دی۔ یہ صحبت بڑی پرلطف رہی، تین چار گھنٹہ کی نشست مگر ہر شخص محفل سے شگفتہ خاطر اٹھا۔

اب سے دو سال پہلے جب میں بمبئی گیا تھا تو حسبِ معمول علامہ شبیلی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت اور تپاک سے ملے! انکے مکان کے فرنیچر اور ماحول کو دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے مالی حالات غالباً پہلے سے نہیں رہے۔ بڑھاپے کے سبب کمزوری بھی انکے چہرے اور بدن سے نمایاں تھی۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ اب وہ چند مہینہ سے اُس دنیا میں ہیں کہ جہاں جانے کے بعد پھر کسی کی خبر نہیں آتی

علامہ شبیلی ہندوستان میں سلطان مسقط کی طرف سے وکیل مختار تھے اور حکومت انگریزی کے خطاب یافتہ خان بہادر! عربی اُردو

فارسی اور بھاشا کے عالم، ساتھ ہی شاعر اور مضمون نگار بھی۔ بمبئی کے رسالوں اور اخباروں میں ان کا کلام اور مضامین ایک زمانہ میں چھپا کرتے تھے

اردو شاعری میں "تضمین" معروف صنف ہے، مگر علامہ شبلی نے اردو شاعری میں "تشطیر" کا اضافہ کیا۔ اس صنف میں ان کی بعض نظمیں پسند کی گئیں۔ ان کا مطالعہ خاصہ وسیع تھا اور علم و ادب کی جامع صفات رکھتے تھے۔

علامہ شبلی مرحوم "فاران" کے نہ صرف خریدار بلکہ قدردان تھے۔ اتنے دنوں کی شناسائی کے باوجود اصرار کر کے "فاران" کا چندہ بھجوایا۔ ان کا کوئی [illegible] آتا تو اس کی معرفت سلام کہلواتے، وضعدار، ملنسار، مہمان نواز، علم دوست اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی اس شخصیت کے باوجود ہر کسی سے تواضع کے ساتھ پیش آتے۔ ان کی موت عروس البلاد بمبئی کے ایک ممتاز شہری اور بڑے آدمی کی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آمین

ہماری نظر میں!

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

تالیف :۔ محمد ابوزہرہ پروفیسر فواد یونیورسٹی، ترجمہ :۔ سید رئیس احمد جعفری
مقدمہ :۔ غلام رسول مہر، تنقیح، تحقیق، اضافہ ـــــ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی
ضخامت ۹۰۶ صفحات (مجلد، رنگین سرورق۔ قیمت :۔ اکیس روپے
ملنے کا پتہ :۔ المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور۔

علامہ احمد تقی الدین ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور کام آفتاب کی طرح روشن ہے، اُن کی ذات نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری علمی دُنیا کے لئے باعثِ فخر و ناز ہے! اسلامی تاریخ کی امام موصوف بلاشبہ بہت بڑی شخصیت ہیں، اس ذہانت، فکر و بصیرت علم و تبحر اور کردار و تقویٰ کے لوگ دنیا میں صدیوں کے بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں! علامہ ابن تیمیہ تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے اکابر اور ائمہ میں اس حیثیت سے اور زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں کہ وہ اہلِ قلم ہی نہیں "صاحبِ سیف" بھی تھے!

علامہ ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ کے بہت سے علماء اور شیوخ سے علمی استفادہ کیا، مگر انھوں نے ایسی چیزیں بھی دنیا کے سامنے پیش کیں جن سے اُن کے اساتذہ بھی آشنا نہ تھے! امام موصوف کے ایک معاصر (علامہ کمال زملکانیؒ) نے، اُن کی خدمت میں ان لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے

"اللہ تعالیٰ نے ابن تیمیہ کے لئے علوم کو اس طرح کر دیا تھا، جیسے حضرت داؤد علیہ السّلام کے لئے لوہے کو نرم کر دیا تھا"۔۔

ابن دقیق العید بہت بڑے محدث گزرے ہیں، دینی علوم میں اُن کی شخصیت "اتھارٹی" سمجھی جاتی تھی، انھوں نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا :۔

"یہ ایسا شخص میری نظر سے گزرا ہے، کہ سارے علوم ہاتھ باندھے اُس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں، علوم کے خزانۂ عامرہ میں سے جسے چاہتا ہے، ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیتا ہے، اور جسے چاہے رد کر دیتا ہے"۔

امام ذہبی نے امام ابن تیمیہؒ کو ایسے سمندر سے تشبیہ دی جس کا ساحل نہیں، اور ایسا خزانہ کہا، جس کی کوئی نظیر نہیں۔

ہندوستان کے مسلمان عجمی تصوف اور تقلیدِ جامد سے بہت زیادہ متاثر رہے ہیں، اس لئے امام ابن تیمیہ سے وہ عام طور پر متعارف نہیں رہے، اُردو ادب میں سب سے پہلے اُن کا ذکر علامہ شبلی نعمانی نے کیا اور اُس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں نے امام موصوف کو ہندوستان میں روشناس کرایا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں بھی ابن تیمیہؒ کا مختلف عنوانات سے نام اور ذکر آتا رہا ہے!

امام ابن تیمیہ پر اُردو ادب میں سب سے زیادہ مفصل کتاب مولانا محمد یوسف کوکن عمری کی ہے، جسے انھوں نے ۱۹۳۷ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۵۹ء میں وہ چھپ کر منظرِ عام پر آئی! مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب بھی امام موصوف کی سیرت پر بہت خوب اور اپنے رنگ میں منفرد ہے!

اُردو میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کئی کتابوں اور رسالوں کے اب تک ترجمے ہو چکے ہیں! سب سے زیادہ کتابیں مولانا عبدالرزاق

ملیح آبادی مرحوم نے ترجمہ کی ہیں! اور ان کوششوں کی بدولت پاکستان اور ہندوستان کے علمی اور دینی حلقوں میں آج کل امام ابن تیمیہ کے افکار گونج رہے ہیں! اہلِ حدیث کے نزدیک تو ابن تیمیہؒ کا قریب قریب وہی مرتبہ جو احناف کے یہاں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے! اب رہے دوسرے دینی اور علمی حلقے تو جو لوگ دیوبند سے متاثر ہیں اُن کے یہاں ابنِ تیمیہ اُتنے مقبول، متعارف اور محترم نہیں ہیں جتنے ندوہ اور جماعتِ اسلامی کے متاثرین کے یہاں ہیں!

یہ اپنے اپنے ذوق وطبیعت کی بات ہے

مولانا محمد ابو زہرہ فواد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اور اس دورِ تشکیک والحاد اور خاص طور سے مصر کے ماحولِ تجدد و آزاد خیالی میں اُنکی ذات ایمان ویقین اور دینی علوم اور ایمانی فراست وبصیرت کا روشن مینار رہے، موصوف متعدد علمی ودینی بلند پایہ کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں جن میں سے بعض کتابیں اُردو میں بھی منتقل ہوچکی ہیں! اُن کی اس کتاب (حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ) کا ترجمہ مشہور ادیب جناب رئیس احمد جعفری نے کیا ہے، جو زود نویسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے، اُن کے قلم نے اُردو زبان کو بہت کچھ سرمایہ اور ثروت عطا کی ہے، جس میں وہ روزانہ اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

"حیات امام ابن تیمیہؒ" کا ترجمہ نہ صرف رواں اور شستہ ہے بلکہ اُس میں ادبیت پائی جاتی ہے، فاضل مترجم نے پوری کوشش کی ہے کہ عربی نثر کا زور بیان اُردو میں منتقل ہوجائے! اس کتاب کے بعض مقامات بہت زیادہ دقیق، فنی، علمی اور فلسفیانہ ہیں مگر مترجم کی ذہانت اور علمی تجربہ نے ان نزاکتوں اور باریکیوں کو بھی ترجمہ میں بڑی حد تک منتقل کردیا ہے ——— کتاب پڑھتے میں کہیں کہیں کھٹک بھی محسوس ہوئی:۔

"لیکن ابن تیمیہؒ کی ایک ذات، مجمع علوم وفنون، منبع حرب وپیکار اور ذخیرۂ گفتار وکردار تھی"۔ (صفحہ ۲۹) ——— "منبع حرب وپیکار" نامانوس قسم کی ترکیب ہے! ——— "اس مذہب نے مشرق کی طرح مغرب (بلاد اندلس وغیرہ) میں بھی اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی (ص ۶۱) "اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی"۔ اہلِ زبان اس طرح نہ بولتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں ——— "اس جگرے کا آدمی نہیں دیکھا"۔ (ص ۷۹) ایسے موقعوں پر "جگرے" نہیں "دل گردے" بولتے ہیں! ——— "تلوار وسنان" (ص ۸۰) اُردو اور فارسی وعربی الفاظ کے درمیان اضافت نہیں آتی۔

"اب کے انھوں نے وعظ مجرد سے کام نہیں لیا۔ بلکہ جہاد کی دعوت دی (ص ۸۲)

"وعظ مجرد" کے مفہوم کو یوں ادا کرنا چاہیئے تھا:۔

"اب کے انھوں نے صرف وعظ وتقریر ہی تک اپنی کوششوں کو محدود نہیں رکھا، بلکہ..."

"... چند سطریں لکھیں، اُن پر ایک نظر ڈالی اور پھر منہ زبانی فرفر سنادیا"۔ (صفحہ ۱۷۹)

"زبانی" لکھنا تھا، "منہ زبانی" فصحا کی زبان نہیں ہے، ہاں! "منہ زبانی" اُردو میں "ہم زبانی اور رو دررو گفتگو کے معنی میں بولتے ہیں، داغ کا شعر ہے:۔

نامہ بر نے طے کئے سارے پیام
منہ زبانی کا مزہ جاتا رہا

"چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکری گروہ بندی اور انتشار مدارس میں گہرا ربط ہے"۔ (ص ۲۴۷)

"انتشار مدارس" کی ترکیب اُردو دانوں کے لئے غریب ونامانوس ہے، مولانا ابوالکلام آزاد جو اُردو زبان وادب میں اس طرزِ نگارش کے موجد ہیں انھوں نے آگے چل کر خود اپنے اس طرز کو سہل وآسان بنادیا تھا۔ "الہلال" کا "مُعرّب آزاد" "غبارِ خاطر" میں کس قدر "موند" ہوگیا ہے۔

"معتزلہ کے اس اختلاف کثیر اور تعدد طوائف کا سبب یہ ہے"۔ (ص ۲۸۶) "تعدد طوائف" ثقیل ترکیب ہے، کچھ

ط یہ کتاب کا ترجمہ نہیں، مترجم کی اپنی لکھی ہوئی عبارت بہ عنوان "تقدیم" ہے!

اُردو میں جو "طوائف" کا مفہوم لیا جاتا ہے، اس کے سبب اس ترکیب میں ذم بھی پیدا ہو گیا ہے ——— " نہ ہی صرف شعریت کی طرف دعوت کا مدار بنایا ، (ص۲۹۹) حیرت ہے کہ رئیس احمد جعفری جیسا پختہ مشق ادیب بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی "نہ ہی" "یہ لکھا ——— "یاد" کی جمع "یادوں" NOR کے مفہوم میں "نہ ہی" اور غیظ کا املا "غیض" یہ اس دور کی زبان و ادب کی لغزشیں ہیں جن میں شستہ ذوق رکھنے والے محتاط ادیبوں کو مبتلا نہیں ہونا چاہئیے !

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ، ایسی حکمت کے ماتحت جس کا علم خود اسی کو ہے، اور یہ حکمت انتشار کی علت نہیں ہے (ص۴۸۹) "ماتحت" کی جگہ "کے ساتھ" لکھتے یا کوئی دوسرا موزوں لفظ لاتے تو اچھا تھا ——— "کیونکہ حلف یا تقرب الٰہی کے لئے ہوتی ہے ..." (ص۶۴۷) "قسم" بے شک مونث ہے مگر "حلف" مذکر ہے، امیر اللہ تسلیم کا شعر ہے ؎

ناصح ! خیال مصحفِ عارض کا چھوڑ دوں　　　اس پر حلف تو مجھ سے اٹھایا نہ جائے گا

"نزاع وجھگڑا پیدا ہو جاتے ہیں" (ص۷) "واو عطف" کا غلط استعمال جو لکھے پڑھے لوگوں کو کسی عنوان زیب نہیں دیتا ——— "یہ کہنا آسان نہیں کہ ان میں آلاتِ اجتہاد کی کچھ کمی تھی" "آلات" کی جگہ "صفاتِ اجتہاد" یا "شرائط اجتہاد" جیسی کوئی ترکیب لانی تھی ——— "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معتدہ (وہ عورت جو ابھی عدت میں ہو) سے خطبہ کرنے کو منع فرمایا ہے" جس طرح "معتدہ" کے معنی قوسین میں لکھ دیئے گئے ہیں، اسی طرح "خطبہ" کے بعد بریکٹ میں "منگنی" لکھ دینا چاہئیے تھا۔

"ان کتابوں میں فلسفہ کی گہرائی بھی ہے اور جمال فنی بھی" (ص۴۶۶) "جمال فنی" ——— یہ ترکیب بھلی نہیں لگتی ——— "حافظ عماد الدین ابو الفداء اسمٰعیل .... ابن کثیر سے شہرت رکھتے ہیں۔ (ص۴۶۹) ایسے موقعوں پر "سے" نہیں بولتے ! ——— "بعض مدارس کی مشیخت کے عہدہ پر فائز رہے" (ص۴۸۲) "مشیخت" کی جگہ "صدارت" یا اسی مفہوم و معنیٰ کا کوئی دوسرا لفظ لکھنا تھا ——— "مشیخت" تو اُردو میں "شیخی" اور "گھمنڈ" کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے ——— "گو ان کے کسی کلام میں وہم پڑتا ہو" (صفحہ ۷۴۴) "وہم پڑتا ہو" اس جملہ میں وجدان کو کھٹکتا ہے !

ترجمہ میں دو تین مقامات پر "کوتنالے" نظر آیا، جو غالباً "ترجمان" یا "جاسوس" کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے | اُردو جاننے والوں کے لئے یہ لفظ اجنبی اور غریب ہے ۔

اس کتاب کا مقدمہ جناب غلام رسول مہر نے لکھا ہے، اور کتاب کی تنقیح، تحقیق اور اس پر اضافہ جناب مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے فرمایا ہے ! مولانا موصوف نے کئی سال اس کتاب کی تحقیق و تنقیح میں صرف کئے ہیں اور حاشیہ میں کتابوں اور شخصیتوں کے ناموں کی ضروری تفصیل درج کر دی ہے، اس مقصد کے لئے انہیں دس بیس نہیں سینکڑوں کتابیں پڑھنی بلکہ کھنگالنی پڑی ہیں !

ان کی تحقیق و اضافہ کے چند نمونے :—

- ——"علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد حنفیت میں پختہ محقق، ابن الہمام سے شہرت ہے، علوم عقلیہ کے مسلم ماہر، بقول حافظ سخاوی، حدیث میں درک کم تھا ، وفات سنہ ۸۶۱ھ (الضوء اللامع ص ۱۲۷ ج ۸ — الفوائد البہیہ ص ۷۴)
- —— اس مدرسہ (کتاب خانہ دار العلوم) کے محقق مقریزی لکھتے ہیں — بنی الکامل ھذہ الدار ووقفھا علی المشتغلین بالحدیث النبوی ثم من بعدھم علی لفقہاء الشافعیہ۔
- —— مقالات الاسلامیین از امام اشعری ص ۴۲ ، ج ۲ — طبع جدید مصر، لیکن میرے سامنے جو نسخہ ہے

ہن اطیں جبائی کی بجائے نظام کا یہ قول ہے ۔

۔ــــ (العقیدۃ والواسطیہ) واسط شہر کی طرف منسوب کیوں کہ یہ رسالہ واسط سے آتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ جس کی روداد خود امام صاحبؒ کی زبان سے العقود (ص ۲۱۰ ۔ ۲۱۱) میں ہے ۔

۔ــــ کتاب الابانہ امام اشعری کی آخری تصنیف ہے، جس پر اشاعرہ کو بہت اعتماد ہے امام اشعری پر معترضین کے دفاع میں اسی کتاب کو پیش کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو فتوی حمویہ الامام ابن تیمیہؒ بہ ضمن مجموعہ رسالہ کبریٰ ص ۴۴۸ ج ۱ شذرات ص ۲۰۳ ۔

مشہور عالمی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں ایک عجیب بات لکھ دی تھی ــــ یہ کہ

کنت اذ ذاک بدمشق فحضرتہ یوم الجمعۃ وھو یعظ الناس علی منبر الجامع ویذکرھم فکان من جملۃ کلامہ ان قال ان اللہ ینزل من السماء الدنیا کنزولی ھذا ونزل درجۃ من درج المنبر۔	جن دنوں میں دمشق میں تھا، جمعہ کے دن وہاں کی جامع مسجد میں گیا تو ابن تیمیہؒ منبر پر وعظ کہہ رہے تھے، دوران وعظ یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ پہلے آسمان پر (رات کے آخری حصے میں) اترتا ہے، پھر منبر کی سیڑھی سے ایک سیڑھی نیچے

اتر کر کہا کہ یوں اترتا ہے، جیسے میں اترا ہوں ۔

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے تحقیق کے بعد دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن بطوطہ نے امام ابن تیمیہ کے دشمنوں کی زبانی سے سُنا سنایا افسانہ لکھ دیا ہے۔ ابن بطوطہ جب دمشق پہونچا ہے، تو اُن دنوں ابن تیمیہؒ قلعہ دمشق میں محبوس تھے، اس واقعہ کی کوئی اصلیت نہیں ہے ــــ مولانا موصوف نے جگہ جگہ حواشی میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد و افکار کی مدافعت بلکہ تائید و حمایت بھی کی ہے، اور مصنّف کی بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کی بھی سعی فرمائی ہے! ایک جگہ مولانا ابو زہرہ لکھتے ہیں :ــ

"کیا یہاں پہونچ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبقریت کا احساس اور زیادہ قوی نہیں ہو جاتا۔ ۔ ۔"

س پر مولانا بھوجیانی گرفت فرماتے ہیں :ــ

"بعض مصری اہل قلم، مستشرقین کی دیکھا دیکھی اس لفظ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بول دیتے ہیں۔ لیکن آپؐ پر "عبقری" کا اطلاق مناسب نہیں۔ ۔ ۔"

ولانا موصوف کی گرفت واجبی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے "ادیب" "ذہن" "نابغہ" "سیاست دان" مُدبّر جیسے قاب اور ناموں کی نسبت کسی طرح مناسب نہیں!

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے علامہ ابن تیمیہؒ کی تصانیف کی فہرست بھی مرتب کی ہے! ایک تو اصل کتاب ہی اپنی جگہ علم و تحقیق شاہکار ہے، مولانا حنیف بھوجیانی کی تنقیح، تحقیق اور اضافہ نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے! اس کو کہتے ہیں سونے پر سہاگا!

پروفیسر محمد ابو زہرہ نے علامہ ابن تیمیہؒ کے حالات اور علمی کارناموں کو جس تحقیق اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے! پوری کتاب دلچسپ اور معلومات آفریں ہے، اس کے مطالعہ سے دل و دماغ کو روشنی ملتی ہے ۔

اس کتاب کے چند نمایاں عنوانات

ابن تیمیہؒ کی مسند درس ــــ محرابِ علم سے میدانِ قتال کی طرف ــــ عہد ابن تیمیہؒ کے سیاسی حالات ــــ عہد ابن تیمیہؒ کے مباحث کا علمیہ کا انداز ــــ مسلمانوں کے اعتقادی فرقے ــــ تصوف امام ابن تیمیہؒ کے عہد میں ــــ امام صاحب کی فقہ اور اُن کے افکار و آراء ــــ آیات متشابہات اور اُن کی تاویل ــــ مختاراتِ ابن تیمیہؒ ــــ اصول اجتہاد ابن تیمیہؒ ــــ امام ابن تیمیہؒ کے رسائل و کتب - - - - - - - !

ارسطو کے منطقی مباحث ہوں کہ امام غزالی کے فلسفیانہ افکار، ابن عربی کا تصوف ہو یا اشاعرہ و معتزلہ کا علم کلام، امام ابن تیمیہ کو جہاں کہیں بھی حق سے انحراف نظر آتا ہے، وہ خاموش نہیں رہ سکتے، وہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ نقد و جرح اور احتساب فرماتے ہیں! دین کے معاملہ میں وہ شدید غیرت مند واقع ہوئے ہیں۔

احناف نے شریعت کی بعض باتوں کو مخالفِ قیاس قرار دیا ہے مگر امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک شریعت کی کوئی چیز قیاسِ سلیم کی مخالف نہیں ہے! اس کے ثبوت میں فاضل مصنف نے بعض فقہی مسائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے کس دقتِ نظر اور ذہانت و بصیرت کے ساتھ ان مسائل کو عقل و قیاس کے عین مطابق ثابت کیا ہے۔

"افتتاحیہ" کے تحت مولانا محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں :-

"- - - - اس لئے بھی کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اب تک بھی فقہ و عقائد میں اُن (ابن تیمیہؒ) کی حلقہ بگوش ہے" (ص ۳۴)

حیرت ہے کہ مولانا حنیف بھوجیانی نے اس عبارت پر نقد و جرح کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، اس سے صاف طور پر یہ مطلب نکلتا ہے کہ "اہلِ حدیث" اور حنابلہ فقہ و عقائد میں امام ابن تیمیہ کے مقلد (حلقہ بگوش) ہیں!

اس کے بعد مندرجہ ذیل عبارت کو ملاحظہ فرمائیے :-

"پس صورت مسئلہ یہ ہے کہ عامی اصولِ استنباط سے ناواقف ہوتا ہے، اور طریق استدلال نہیں جانتا لہٰذا اسے دلیل کی بجائے رجال کی پیروی کرنی چاہئیے"۔ (ص ۵۵)

اس صاف اور واضح عبارت کی شرح و تفسیر کی محتاج نہ تھی، مگر مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب نے اس کا مفہوم یوں واضح کیا ہے۔

"یعنی بلا واسطہ ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بجائے صاحبِ علم اور اہلِ حضرات سے با دلیل مسئلہ دریافت کرے"

اسے کہتے ہیں بہت دُور کی کوڑی لانا!!

تقلید دراصل "اعتماد" کا نام ہے، اور اس قسم کی تقلید کو امام ابنِ تیمیہ بھی تسلیم کرتے ہیں، اور اہلِ حدیث یا غیر مقلدین بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر امام بخاری، امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ ... وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے مقلد ہی ہوتے ہیں! ہاں! تقلید کی ایسی شدت جو

سِرّ از حدیث چہ کار، قولِ ابوحنیفہ بیار۔ (معاذ اللہ)

تک پہنچ جاتے، مذموم ہے! اسی جامد تقلید کا ابن تیمیہ نے رد فرمایا ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول امام ابن تیمیہؒ نے تقلید کے قلعہ پر اس شدت سے حملے کئے ہیں کہ اُس کی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔

پروفیسر ابوزہرہ امام ابن تیمیہؒ کے بہت بڑے عقیدت مند اور مداح ہیں، اُن کو فقہ میں مجتہد منتسب مانتے ہیں، مگر انھوں نے کہیں کہیں ابن تیمیہؒ کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے ــــ مثلاً "آیاتِ متشابہات" کی تاویل کے ذیل میں، وہ امام غزالیؒ اور امام ابنِ تیمیہؒ

کہ افکار و خیالات پیش کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار فرماتے ہیں۔

"...... فہمِ متشابہ میں امام ابن تیمیہؒ کا طریقہ ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے کیوں کہ وہ بہرحال تشبیہ و تجسم کی طرف راغب کرتا ہے، خاص طور سے عوام کا جہاں تک تعلق ہے، وہ تو اس وہم سے اپنا دامن کسی طرح بچا ہی نہیں سکتے۔ البتہ امام غزالیؒ کا طریقہ بلاشبہ ہمارے لئے بہت زیادہ قابلِ قبول ہے کیوں کہ فکرِ صائب سے قریب تر ہے۔"

امام ابن تیمیہ متشابہات کی تاویل نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے جو ید، وجہ، ساق اور نزول و استواء کے معنی الفاظ و اسماء بیان فرمائے ہیں، امام موصوف اُن کی تاویل سے گریز کرتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے لئے "ید" کی صفت استعمال فرمائی کہ واللہ کا "ید" یقیناً ہے، مگر ہم نہیں جانتے وہ کیسا "ید" ہے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اللہ تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہوگا، بندوں کے ہاتھ پر اُس کا قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

مگر علماءِ اُمت کی اکثریت ان اسماء و الفاظ کی تاویل کرتی ہے ــــ یہ کہ "استواء علی العرش" سے مُراد و مقصود غلبہ اور استیلاءً ہے۔ "ید" سے مقصود و مفہوم "قدرت" ہے! جیسے اُردو میں بولتے ہیں ــــ

"فلاں بادشاہ اُس کے وزیر کی مٹھی میں تھا۔"

اس طرزِ بیان سے کہنے والے یہ بات ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ بادشاہ پر وزیر اتنا حاوی تھا کہ بادشاہ ہر کام اُسی کی مرضی اور منشاء کے مطابق کرتا تھا اس عبارت کی یہ ترجمانی کتنی عجیب لگتی ہے ــــ کہ ہمیں نہیں معلوم کہ وزیر کی کیسی مٹھی تھی، اور بادشاہ اُس مٹھی میں کس طرح سما گیا!

اسی کتاب میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے چچازاد بھائی حنبلؒ سے ایک روایت درج کی گئی ہے۔

"ایک مناظرہ میں حریفِ مقابل نے مجھ پر حجت لاتے ہوئے کہا، قیامت کے دن سورۂ بقر اور سورۂ تبارک (حسبِ نص) آئیں گی، میں نے جواب دیا، یہ سورتیں نہیں آئیں گی، ان کا ثواب آئے گا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (تیرا رب اور فرشتے صف بہ صف (قیامت کے دن آئیں گے) یہاں خدا کے آنے سے مطلب یہ ہے کہ اُس (اللہ تعالیٰ) کی قدرت ظاہر ہوگی۔"[1]

مگر امام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آنے سے مُراد اس کا سچ مچ آنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے نزول و استواء اور ید و وجہ ۔ ۔ ۔ کا تعلق ہے اس قبیل کے قرآنی الفاظ و اسماء کی تاویل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ حنابلہ اور (بعض یا اکثر اہلِ حدیث و ظاہریین) کے علاوہ جمہورِ اُمت تاویل کو جائز سمجھتا ہے ــــ مثلاً قرآنِ کریم کی آیت ہے ــــ

وَمَا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا — اور نہیں زمین پر کوئی پاؤں دھرنے والا مگر اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کی چوٹی!

(سورہ ہود، رکوع ۵)

کیا اس کا صرف یہ مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سچ مچ ہاتھ ہے اور وہ ہاتھ ہر جاندار کی چوٹی پکڑے ہوئے ہے؟ "ناصیۃ" پیشانی کے بالوں کو کہتے ہیں۔ حالانکہ کروڑوں جانداروں کی پیشانیوں پر سرے سے بال ہی نہیں ہیں اور بہت سے آدمی بھی اصلع (گنجے) ہوتے ہیں اس صورت میں اگر قرآنی آیت کے لفظوں کی تاویل نہ

[1] مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب نے اس پر ایک نوٹ دیا ہے۔ "مگر امام احمد سے روایت ثابت نہیں" [2] تاویل کی ایک اور مثال: سورہ یوسف میں ہے "یخل لکم وجہ ابیکم" میں "وجہ" سے حضرت یعقوبؑ کا چہرہ نہیں بلکہ اُن کی مہربانی اور توجہ مراد لی جائے گی۔

کی جاتے، تو قرآن کریم پر (معاذ اللہ) ایک بات کے خلافِ واقعہ ہونے کا الزام آتا ہے ـــــــ اس لئے اس آیت کی مفسرین اور راسخون فی العلم کی غالب اکثریت نے یہی تاویل کی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہر جاندار کی چوٹی ہونے سے"۔ قبضہ اور تصرف مُراد ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ واختیار سے نکل سکے، اور کوئی جاندار اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ "سیف من سیوف اللہ" ہیں۔ تو کیا خالدؓ واقعی تلوار کی طرح لوہے کے بنے ہوئے تھے، یا اسلام لانے کے بعد جہاد کرتے کرتے سچ مچ فولادی تلوار بن گئے تھے! یہاں سیف اللہ سے خالدؓ کی شجاعت، جذبۂ جہاد، تیغ زنی، اور کافروں کا قتال اور اُن کے ان کارناموں کا اعتراف وقدر شناسی مُراد ومقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ کے استواء، نزول، ضحک، نفس، ید، ساق، وجہ ـ ـ کی جس نے تاویل کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی شان تنزیہ کے تقاضے کو پورا کیا اور جس نے تاویل سے گریز کر کے الفاظ کے ظاہری مفہوم ہی پر حصر کیا، اُس نے پوری نیک نیتی اور خدا خوفی کے باوجود اللہ کی ذات کے بارے میں تشبیہ وتجسیم کا وہم پیدا کر دیا (سبحان اللہ عما یصفون)

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی بھی امام ابن تیمیہ کے ان مسائل میں مُقلّد ہیں، انھوں نے لکھا ہے ـــــــ "بخلاف اس کے سلفِ صالح سب نصوص استواء علی العرش وعلو کے معانی پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ذاتاً عرش کے اوپر ساری مخلوق سے الگ اور علماً سب پر محیط ہے اس علو واحاطہ کی کیفیت انسانی عقل سے باہر ہے، والکیف مجہول والاستواء معلوم" (ص ۲۱۳)

جس فکر وعقیدہ میں اللہ تعالیٰ کے حلول، اتحاد، تجسیم اور تشبہ کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے، ہم اُس فکر وعقیدہ سے اپنی برأت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں!

امام ابن تیمیہ کسی مسئلہ کو "اجماعی مسئلہ" کس صورت میں کہتے ہیں: ـــ

"بہرحال امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک کسی مسئلہ کو علماء کا اجماعی مسئلہ اس وقت کہا جا سکتا ہے، جب یہ پتہ چل جائے کہ سارے عالم اسلام میں ہر عالم کی رائے اس سے متفق ہو"۔ (صفحہ ۶۸۸)

اگر واقعی "اجماع" کے بارے میں ابن تیمیہؒ کی یہی رائے ہے، تو بڑی مبالغہ آمیز رائے ہے، اس شرط کے ساتھ کہ سارے عالم اسلام کا ایک عالم بھی کسی اجماعی مسئلہ میں اختلاف کا اظہار نہ کرے، بہت دُشوار ہے اور اس کڑی اور ناقابلِ عمل شرط کے ساتھ "اجماع" واقع ہی نہیں ہو سکتا

امام ابنِ تیمیہؒ اپنے تمام فضل وکمال کے ساتھ بہرحال انسان تھے فرشتہ نہ تھے، اُن سے بھی فکر ورائے کی غلطیاں ہوئی ہیں! اس کتاب میں فاضل مصنف نے کہیں کہیں امام موصوف کے افکار سے اختلاف ظاہر کر کے، حق شناسی اور حریت فکر کا ثبوت دیا ہے! مثلاً زیارتِ قبر نبیؐ کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ نے جس ضرورت سے زیادہ شدید احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے، اُس پر مولانا محمد ابو زہرہ نے گرفت کی کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے محتاط انداز میں بڑی اچھی بات کہی بلکہ تنقید کی کہ امام ابن تیمیہؒ کی اس رائے میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے کہ کوئی مسلمان مسجد نبویؐ کی زیارت کے لئے سفر کرے، اور اپنے ذہن میں روضۂ رسولؐ کی زیارت کا تصور وخیال نہ آنے دے! حالانکہ جب بھی کوئی مسلمان مدینہ جانے کا قصد کرے گا تو مسجد نبویؐ کے ساتھ روضۂ رسولؐ کی زیارت کا تصور آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، اور اس تصور کا ذہن میں آنا، ذرہ برابر بھی معیوب بات نہیں ہے!

منہاج السنہ میں علامہ ابن تیمیہؒ نے واقعہ کربلا کے سلسلہ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کی جو توجیہ کی ہے اُس سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا، ابنِ تیمیہؒ کی اس توجیہ سے "ناصبی" پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں! رفض کی طرح خارجیت اور ناصبیت بھی ضلالت کا مسلک ہے کوئی شک نہیں امام ابن تیمیہؒ نے شرک، بدعت اور عجمی تصوف کے رد میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیا ہے، وہ اُن کی سیرت اور شخصیت

کا سب سے زیادہ نمایاں رُخ اور روشن پہلو ہے! حامیِ کتاب و سُنّت اور ماحیِ شرک و بدعت کا لقب امام موصوف کو کتنا زیب دیتا ہے اور یہ خلعت اُن کے قامت موزوں پر کس قدر ٹھیک آتا ہے۔ (اللّٰھم کثّر امثالہ رحمۃ اللہ علیہ)

مکتبہ سلفیہ نے اس بلند پایہ کتاب کو شائع کرکے درحقیقت ایمان و یقین کی شمع روشن کردی ہے ادبی اعتبار سے بھی اس کتاب نے اُردو کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ مصنف، مترجم، حاشیہ نگار اور ناشرین کو اس کا دارین میں اجر عطا فرمائے گا۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء

کتابُ المیراث

از:۔ تو قیر مرزا رزقی، ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت دو روپے پچھتر پیسے۔ (مجلد)!

مسلمانوں کا ترکہ، دینی اور فقہی اصول کے تحت کس طرح تقسیم ہونا چاہیے، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے! عصبہ نسبی، عصبہ سببی، ذوالفروض اور ذوی الارحام کسے کہتے ہیں! ان کے حصص کا تعین کس طرح ہوگا؟ کون ذوالفروض عصبہ ہوسکتے ہیں! عول و رد کے کیا قواعد ہیں؟ میراث وابستہ یا مناسخہ کی کیا تعریف ہے؟ کون کون سے وارث محجوب اور محروم سمجھے جاتے ہیں! اور اسی طرح کے دوسرے متفرق مسائل کا حل، اس کتاب میں ملتا ہے!

علم الفرائض کے تحت حساب لگا کر، میراث و ترکہ کے مسائل حل کئے گئے ہیں، ایک نمونہ:

مسئلہ:۔ تین زوجائیں، چھ فرزند، چھ دختران

حل:۔

تین زوجگان $\frac{1}{8} \times \frac{1}{3}$ = $\frac{1}{24}$ فی زوجہ

باقی ر $1 - \frac{1}{8} = \frac{7}{8}$ فرزندان اور دختران میں ۲ : ۱ کے تناسب سے

چھ فرزندان = کا $\frac{2}{3}$ کا $\frac{1}{6}$ = $\frac{7}{72}$ فی فرزند

چھ دختران کو $\frac{7}{8}$ کا $\frac{1}{3}$ کا $\frac{1}{6}$ = $\frac{7}{144}$ فی دختر

جملہ ترکہ (۱۴۴) سہام میں تقسیم ہوکر فی زوجہ چھ، فی فرزند چودہ اور فی دختر سات سہام۔

میراث کے مقدمات میں جب وکلاء دعوے کو ترتیب دیتے ہیں، تو انہیں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، "کتابُ المیراث" عدالتوں اور وکیلوں کے لئے خاص طور سے بڑی کام کی کتاب ہے[1]

قولِ طیب

مولفہ:۔ عبدالحکیم الیاسی (ایم۔ اے) ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد دکن۔

پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں، انھوں نے قرآنِ کریم کی تجوید پر بھی کتاب لکھی ہے۔ رگ وید کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے، اُردو ہندی رسم الخط کا علمی و فنی نقطۂ نگاہ سے مقابلہ بھی فرمایا ہے، حرمین شریفین کا سفرنامہ بھی لکھا ہے اُردو کی نظموں کے انتخابات بھی چھاپے ہیں، انگریزی زبان میں "اسلام" پر ایک کتاب بھی مرتب فرمائی ہے —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "قادیانی مذہب" کو ترتیب دے کر قادیانیت کو بیچ چوراہے پر ننگا کھڑا کر دیا ہے!

الیاس برنی مرحوم صرف پروفیسر اور مُصنّف و مولّف ہی نہیں تھے، بلکہ شیخ طریقت بھی تھے، اُن کے تصوف اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ اس نوبت تک پہونچا ہے، کہ اُن سے رفاعی، نظامی صابری سلسلوں کی طرح "الیاسی" سلسلہ منسوب کیا جاتا ہے۔

"قولِ طیب" مولانا الیاس برنی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے اُن کے مُرید جناب عبدالحکیم الیاسی (ایم اے) نے

[1] اس کتاب میں جگہ "سوتیلے" کو "سو تیلے" (ن کے ساتھ) لکھا گیا ہے۔

مرتب فرمایا ہے! اس کتاب میں دین واخلاق اور تزکیہ نفس کے بڑے مفید نکتے بیان کئے گئے ہیں، جن کے مطالعے سے قلب میں سوز وگداز پیدا ہوتا ہے!

"قول طیب" میں کوئی شک نہیں بہت سی عرفان وحکمت کی باتیں ملتی ہیں، مگر جناب الیاس برنی چونکہ "تصوف" کا خاص ذوق رکھتے تھے بلکہ اس فلسفہ کے مبلغ اور منادی تھے، اس لئے اُن کی زبان وقلم سے ایسی باتیں بھی نکل گئی ہیں، جو دینی اعتبار سے محلِّ غور بلکہ بعض تو حد درجہ قابلِ اعتراض ہیں۔

مقدمہ میں کتاب کے مولف لکھتے ہیں: ۔

"آپ کی اہلیہ محترمہ کا بھی یہی حال تھا، کہ اُن کو حضرت سیدہ زینبؓ کی توجہات حاصل تھیں"۔ (ص۲)

عالمِ برزخ سے رُوحوں کا دُنیا والوں کو فیض پہونچانا اور اُن کی امداد کرنا، کتاب وسُنّت سے ثابت نہیں ہے۔

مقدمہ کے بعد مولانا الیاس برنی مرحوم کے ملفوظات ومکاشفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، فرماتے ہیں: ۔

"انبیاء تک حضورؐ کے واسطے سے فیض لے رہے ہیں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ انبیاء ورسل میرے واسطے سے فیض حاصل کرتے ہیں! ہر نبی پر براہِ راست اللہ تعالیٰ کا فیضان ہوتا ہے۔

"حضورؐ نے فرمایا ــــ اللّٰہ معطی وانا قاسم، یعنی اللہ اصل میں خالق ہے، اور رسول اللہؐ کو نعمتیں عطا فرماتا ہے، اور حضورؐ ان نعمتوں کو سارے عالم میں بانٹ رہے ہیں"۔ (ص۶۳)

جناب الیاس برنی نے اس حدیث کا صرف ایک ٹکڑا بیان کیا ہے، اور عموماً اہلِ بدعت اس حدیث کے دوسرے لفظوں کو دانستہ حذف کرکے، یہی ٹکڑا بیان کیا کرتے ہیں! اس حدیث کا تعلق "علمِ دین" سے ہے کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کو علمِ دین اور اس کے احکام وحی فرماتا تھا۔ اور حضورؐ انہیں اُمت تک پہونچاتے تھے! یہ بات کتاب وسنّت سے ثابت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی نعمتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کرتا رہتا ہے، اور حضورؐ انہیں تقسیم فرمایا کرتے ہیں۔

"سارے عالم پر تصرف کئے جانے کا راز اسی عبدیت میں ہے"۔ (ص۶۴) کائنات میں "تصرف" کرنے کو "عبدیت" کی شرط ٹھیرانا یہ بڑی اُلجھن میں ڈالنے والی بات ہے، اس چکر میں پھنس کر لوگ اولیاء اللہ سے استغاثہ وفریاد کرتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری فریادوں کو سنتے اور احوالِ عالم میں تصرف کرتے ہیں ــــ یہ بالکل غلط اور گمراہ کن عقیدہ ہے۔

"فرمایا ہمارا مسلک قرآنی ہے، یعنی قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ ترجمہ۔ کہدے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو ــــ یہی مسلک حضرت عمرؓ کا رہا ہے مستدرک میں حاکم نے روایت کی ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنائے گئے، تو آپؓ نے منبر پر خطبہ میں فرمایا "اِنِّیْ کُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَکُنْتُ عَبْدَہٗ وَخَادِمَہٗ" (ص۶۵)

الیاس برنی مرحوم نے مولانا عبدالقدیر حسرت حیدرآبادی کی تفسیر کے حوالے سے یہ بات کہی ہے! قرآن پاک کی اس آیت "قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ ــــ" میں "میرے بندو" سے "رسول اللہؐ کے بندو" مراد لینا، قرآن کریم کی اصل تعلیم کی نفی کرنا ہے ــــ توبا استغفراللہ! علیہ کی حدیث یہ ہے ــــ من یرد اللّٰہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین وانما انا قاسم واللّٰہ یعطی" چنانچہ علامہ حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی شرح میں عطا اور تقسیم سے "علم دین" اور "حکمت" ہی مراد لی ہے۔

مولانا عبدالقدیر حسرت حیدرآبادی نے اپنی تفسیر میں "ایاک نعبد وایاک نستعین" کی جو تشریح کی ہے اس میں توحید کو بری طرح مجروح کیا گیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

"۔۔۔۔اسی لئے ملائکہ کو سجدہ اصلاً صرف آدم کو نہیں بلکہ حضور انورؐ کو تھا۔ (ص)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شان میں اس قسم کے غلو سے منع فرمایا ہے ــــ آگے چل کر اس سلسلے میں جو نکتہ آفرینیاں کی گئی ہیں وہ "تصوف کی شاعری" سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

یہی علم رسالت ہے کہ فرمایا ــــ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۔۔۔"

ترجمہ: ــــ "تجھ کو گمراہ پایا، تو ہدایت کی" (ص ۱۰۰)

ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں وہ مبالغہ، دوسری طرف تفریط کا یہ عالم کہ "ضالاً" کا ترجمہ "گمراہ" کیا گیا! اس کا ترجمہ "حیران و سرگشتہ" کرنا چاہیے تھا!

"جب بغداد شریف میں ہماری چھ ہزار کی ہیونی گم ہوگئی تو میں سید صاحب حضرت کے آستانے پر حاضر ہوا، اور عرض کیا، ہمارا ایسا نقص تھا کہ اتنی بھی رقم لی صرف آپ کا ہی نام لے کر نکلتے تو اس سے بہتر سامان ہو سکتے، ہم آپ کے غلام ہیں، اگر مرضی یہ ہے کہ غلام ناکام ہوں اور حج نہ ہو تو مرضی مولی از ہمہ اولیٰ، تھوڑی دیر میں گم شدہ رقم مل گئی"۔ (صفحہ ۱۳۹)

قبروں پر جاکر عرض معروض کرنا، کتاب و سنّت کے خلاف ایک ایسا فعل ہے، جسے اللہ اور رسولؐ کی پسندیدگی حاصل نہیں ہے! ــــ "صرف آپ ہی کا نام لے کر نکلتے" یہ تو "شرک آمیز" عقیدہ ہے! اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہر کام کی ابتدا کرنی چاہیئے کہ وہی ہر کام میں برکت عطا فرماتا ہے۔

"بعض لوگ کسی بزرگ کے مزار کا سجدہ کرتے یا قدم بوسی کرتے دیکھتے ہیں تو اس عمل پر شرک کا حکم لگا دیتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے"۔۔۔۔ (ص ۱۴۳)

بزرگوں کے پاؤں چومنا، تعظیم میں مبالغہ کرنا ہے، جو شریعت کے نزدیک کسی طرح پسندیدہ نہیں، اور قبروں کو سجدہ کرنا، تو صریحاً شرک ہے۔

"اہل اللہ اہل باطن ہیں جو کچھ اس عالم میں گزر رہا ہے، قلبِ مومن پر پہلے گزرنا لازم ہے، حیدرآباد کی حد تک حضرت یوسف صاحب شریف صاحب قطب ہیں، سب احکام یہاں سے جاری ہوتے ہیں"۔ (ص ۱۸۸)

اہل قبور کے بارے میں یہ فلسفہ کہ کچھ بزرگ "قطب" ہوتے ہیں، اور اپنے شہروں اور ملکوں کا انتظام اپنی قبروں سے کرتے ہیں، قرامطیوں اور باطنیوں سے لیا ہوا فلسفہ اور عقیدہ ہے جو سراسر غلط، بے بنیاد اور ضلالت آمیز ہے۔

"قرآناً یہ امر مسلّم ہے کہ حضور انورؐ کے پاس سے عالم میں حکومت تقسیم ہوتی ہے"۔ (ص ۱۹۱)

یہ قرآنِ کریم پر بہتان ہے، تہمت ہے، افترا ہے! حکومت اللہ تعالیٰ دیتا ہے کہ وہی معزّ و مذل اور ربِّ کریم ہے!

"اس عالم میں خاص خاص اولیاء اللہ کو حکومت سے ربط رہتا ہے، اگر روحانیت کے تحت ان کی حمایت مختلف حکومتوں کو حاصل نہ ہو، تو ان کا قیام ناممکن ہو جاتے (ص ۱۹۱)

یہ بھی غلط عقیدہ ہے کہ کسی حکومت کو کسی وفات پائے ہوئے ولی اور بزرگ کی حمایت حاصل نہیں ہوتی ــــ "بادشاہ پر سات ولیوں کا سایہ ہوتا ہے" ــــ یہ کسی جاہل کا تراشا ہوا مقولہ ہے۔

"مسلمان پہلوان ہمیشہ اللہ اللہ کیا کرتے تھے ۔۔۔۔ اور یا علی کہہ کر دنگل میں کود تے تھے، علی اسم الہٰی بھی ہے اور حضرت علیؓ اسم علی کی تجلی بھی ہیں ۔۔۔۔" (ص۱۹۵)

ہندو پہلوان اکھاڑوں اور دنگلوں میں "بجرنگ بلی" کا نعرہ بلند کرتے ہیں، اور اپنے دیوتاؤں کو پکارتے ہیں ـــ اس مشرکانہ نعرہ کے توڑ پر مسلمان پہلوانوں نے "یا علیؓ" کا نعرہ ایجاد کیا، جو سراسر گمراہی کی بات ہے! کربلا کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے، حضرت حسینؓ اور آپ کے اعوان وانصار پر کیسا سخت وقت آکر پڑا تھا، مگر کسی کی زبان سے "یا علیؓ" نہیں نکلا، سب نے اللہ تعالیٰ ہی کے نام کی دُہائی دی ـ

اسی طرح "امام ضامن" کی رسم بھی جاہلوں اور بدعتیوں کی نکالی ہوئی ہے، حیرت ہے الیاس برنی جیسے لکھے پڑھے لوگ جہلاء کے اقوال وافعال سے سند حاصل کرتے ہیں ـ

"سجدۂ حسینؓ امانت کا وہ آخری سجدہ تھا، جو من جانب صدیقین شہداء صالحین اُمت بطور فرض کفایہ آپ نے پیش فرمایا (ص۲۰۱)

یہ عقیدہ عیسائیوں کے اس عقیدے سے لیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مصلوب ہو کر امت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ـ

"فرمایا ـــ ہمارے سلسلہ کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت کمال الدین شاہ نے حضرت غوث اعظم کی شان میں نہایت بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں، جن کو بڑے حضرت قبلہ مستاوار جھوم جھوم کر پڑھتے تھے، "یا پیر غوث الاعظم" لیکن بعض وہابی منش صوفیوں کے نزدیک یہ شرک ہے" ـ (ص۲۱۴)

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو "یا پیر غوث اعظم" کہہ کر اس عقیدہ اور نیت کے ساتھ پکارنا کہ وہ ہماری آواز کو سن رہے ہیں اور ہماری مدد فرما سکتے ہیں ـــ "شرک" تو نہیں اور کیا ہے (معاذ اللہ)

افسوس ہے کہ "قول طیب" جسے دین وحکمت اور تزکیۂ نفس کا چشمۂ صافی ہونا چاہیے تھا، اُسے اس قسم کی شرک و بدعت آمیز باتوں نے خاصہ مکدر اور گدلا کر دیا ہے! بزرگوں کے ملفوظات جو اُن کے مُریدوں اور حاشیہ نشینوں نے جمع کئے ہیں، انھوں نے بدعت و شرک کی بہت سی راہیں کھول دی ہیں!

حضرت غوث اعظم کی بہت سی تحریرات ایک صدی بعد کی مُرتب کردہ ہیں، جن میں بہت سے اضافے کئے گئے ہیں، اسی لئے ہر بات میں قرآن کو مقدم رکھنا چاہیے" ـ (ص۲۲۵)

کاش! "قول طیب" میں بھی احتیاط اور فکر کو ملحوظ رکھا جاتا!

پرویز کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ

شائع کردہ:ـ شعبہ تصنیف مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ۱؎ ضخامت ۲۵۶ صفحات، قیمت قسم اعلیٰ تین روپے، قسم دوم دو روپے

مدرسہ عربیہ اسلامیہ، نیو ٹاؤن، کراچی دینی علوم کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اس کے نگراں ہیں! اسی مدرسہ کی جانب سے ماہنامہ "بینات" نکلنا شروع ہوا ہے، جس کی ادارت مولانا عبد الرشید نعمانی کو تفویض ہوئی ہے، جو اُن علماء میں شمار ہوتے ہیں، جن کی علم اور سیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے!

۱؎ اسی مدرسہ سے یہ "فتویٰ" قیمتاً مل سکتا ہے ـ

چودھری غلام احمد پرویز کے "کفر" کا جو فتویٰ مُرتب ہوا تھا، اس کی ترتیب کی سعادت اور توفیق اسی مدرسہ اسلامیہ کو میسّر آئی، اب وہی فتویٰ جدید اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے، کہنے کو تو یہ ایک "استفتاء" ہے مگر "اضافاتِ جدیدہ" کے بعد یہ ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔ پرویز کی عبارت صفحہ ۱۰۴ پر نقل کی گئی ہے:-

"معراج خواب کا واقعہ ہے یا ہجرت کی داستان ہے، اور مسجدِ اقصیٰ سے مُراد مسجدِ نبوی ہے"۔

اس عبارت میں "معراج" سے ہجرت اور مسجدِ اقصیٰ سے مسجدِ نبوی مراد لینا، یہ تو بالکل واہی تباہی بات ہے مگر معراج کو جو کوئی "خواب" کا واقعہ کہتا ہے، وہ اگرچہ غلط بات کہتا ہے لیکن یہ "کفر" نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) سے اس بارے میں جو اقوال مروی ہیں، اہلِ علم اُن سے باخبر ہیں! علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم بہت دن تک یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی معراج نہیں ہوئی، بعد میں اُن کو اس غلط عقیدہ سے رجوع کی توفیق نصیب ہوئی ——— مگر جن دنوں وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے، اُس وقت بھی وہ مُسلمان تھے!

اسی طرح "ایصالِ ثواب" (صفحہ ۱۲۳) کا مسئلہ بھی کفر و اسلام کا مسئلہ نہیں ہے! اس مسئلہ میں بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں، "ایصالِ ثواب" کا انکار کفر نہیں ہے!

اس کتاب میں چودھری غلام احمد پرویز مدیر "طلوعِ اسلام" کی کتابوں کے جو متعدد اقتباسات دیئے گئے ہیں، اُن سے اس کا نہ صرف گمراہ ہونا بلکہ دین کے بنیادی عقائد و اعمال کا منکر ہونا ثابت ہوتا ہے، اس انکار کو "کفر" نہ کہیں تو اور کیا کہیں!

اس فتویٰ میں ایک ہزار سے زیادہ علماء نے پرویز کے کفر کی توثیق فرمائی ہے، پاکستان اور ہندوستان کے علماء کے علاوہ حرمین شریفین اور شام کے علماء نے بھی پرویز کی "کفریات" پر اُسے کافر قرار دیا ہے۔

کسی مسلمان کا کافر ہو جانا بڑے دُکھ کی بات ہے، مگر جب کوئی شخص صریحی طور پر کفر بکتا ہو، تو دین کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اُس کے "کفر" کا اعلان کر دیا جائے!

اب سے بارہ سال قبل، سب سے پہلے "فاران" ہی میں مسٹر پرویز کے ضلالت آمیز مسلک پر مفصل تنقید کی گئی تھی، اُس وقت یہ فتنہ اپنے دورِ آغاز میں تھا، پھر رفتہ رفتہ یہ گمراہی مائل بہ کفر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ہر مکتبِ فکر و خیال کے علماء کو کتاب و سُنّت کی روشنی میں پرویز کو "کافر" قرار دینا پڑا۔

کلیہ قانون و کامرانی و مسرت

مولفہ: حکیم قاضی عظیم اللہ، ضخامت ۱۰۴ صفحات
قیمت مجلد، دو رُوپے۔ بلا جلد ایک روپیہ بارہ آنہ،

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ متعلقہ ہاتھیا ہیلتھ ہوم کریمی دواخانہ۔ دروازہ میہاں سنگھ گوجرانوالہ۔

اس کتاب میں سیدھے سادے انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ احساسِ فرض، دیانت، کفایت شعاری، فیاضی، ضبطِ نفس، حُسنِ انتظام، اعمالِ حسنہ، حُسنِ گفتار اور صداقت و راستبازی کی بدولت انسان کو زندگی میں کامرانی و مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ مصنف کوئی قابلِ ذکر انشا پرداز نہیں ہیں، وہ اپنے اندر اخلاقی تبلیغ کا جذبہ رکھتے ہیں جو تحریر و نگارش میں آ کر ایک کتاب بن گیا ہے۔

اُردو سفرنامے

مُرتبہ:- اُردو اکاڈمی بہاولپور، ضخامت ۲۶۰ صفحات۔ قیمت:- تین روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- دفتر اُردو اکاڈمی، بہاولپور۔

اُردو اکادمی بھاولپور، اُردو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے لئے قائم ہوئی ہے، مشرقی اور مغربی علوم کے جاننے والے اس کی مجلس منتظمہ میں شامل ہیں، اس اکادمی کی جانب سے سہ ماہی مجلہ "الزبیر" شائع ہوتا ہے، اُسی کا یہ شمارہ خاص (اُردو سفرنامے) ہمارے سامنے ہے، جس کی ادارت کا بارِ گراں جناب مسعود حسن شہاب اٹھائے ہوئے ہیں۔

"حرفِ آغاز" کے بعد جناب عبدالمجید قریشی نے "سفرنامے ــــــ ایک تجزیہ" کے عنوان سے معلومات آفریں مضمون لکھا ہے، اُس کے بعد "قدیم سفرنامے" شروع ہوتے ہیں، جن میں حکیم ناصر خسرو، ابن جبیر، ابن بطوطہ کے سفرناموں اور تزک جہانگیری کے دلچسپ اقتباسات دیئے گئے ہیں!

اس کے بعد "چند نادر سفرنامے" ہیں، جن میں سر سید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، علامہ سید سلیمان ندوی جیسے مشاہیر کے سیر و سیاحت کے حالات ملتے ہیں! پھر "حج نامے" ہیں!

"سفرنامے" (بطرز خطوط) ــــــ سفرنامے (افسانوی رنگ میں) ــــــ رپورتاژ یہ اس مجلّہ کے آخری تین ابواب ہیں ــــــ اُردو ادب میں اس عنوان و موضوع پر یہ پہلا رسالہ مُرتب ہوا ہے، جو اپنی جگہ قابلِ تحسین ادبی پیشکش ہے!

جن مغربی سیاحوں نے ہندوستان کے "سفرنامے" لکھے ہیں مثلاً ڈاکٹر برنیر وغیرہ، اُن کے سفرناموں کے کچھ حصے ضرور شامل کرنے چاہئیے تھے! ترجمہ میں ایک دو جگہ عبارتیں کھٹکیں:—

"ایک پہاڑ پر پہونچا اور اُس کے نیچے سو گیا" (ص ۲۳)

پہاڑ پر پہونچ کر اُس کے نیچے سو جانا عجیب بات ہے! کہنا یوں چاہئیے تھا "پہاڑ پر پہونچا، اور ایک چٹان کے نیچے سو گیا" اگر اصل عبارت اسی طرح ہے، تو مترجم کو اس پر حاشیہ نوٹ دینا چاہئیے تھا، یا پھر ترجمہ میں اس سہوِ قلم کی تصحیح کر دینی چاہئیے تھی۔

بھاولپور اکادمی کو اپنی مطبوعات کو دیدہ زیب انداز میں شائع کرنا چاہئیے، کتابت، طباعت اور کاغذ ہر چیز دل کش ہونی چاہئیے۔

ترجمہ منتخبات العربیہ مکمل

مترجمہ:- محمد ظل الرحمن ندوی الازہری (استاذ ادب و بلاغت و حدیث دارالعلوم قدسیہ کرلو)
ضخامت ۱۰۳ صفحات، قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ:- حاجی عبدالقیوم تاجر کتب ۱۹ ویلسلی اسکوائر کلکتہ ۱۹ (انڈیا)

مولانا محبوب الرحمن ازہری اور مولانا معصومی نے فن ادب کی مختصر سی کتاب "منتخبات العربیہ" مرتب کی تھی، اسی کا ترجمہ مولانا ظل الرحمن ندوی نے کیا ہے، مولانا موصوف خطہ بنگال سے پیدائش و وطن کا تعلق رکھتے ہیں، اس کے باوجود ان کے اردو ترجمہ میں روانی ملتی ہے۔

ترجمہ کے چند اقتباسات:—

جو شخص خطروں پر سوار نہ ہو وہ بزرگی پر کیسے سوار ہو سکتا ہے۔ جو خوف کو سامنے رکھے وہ بلندیاں نہیں پا سکتا۔

میرے ارادے کی پختگی پانی میں آگ لگا دیتی ہے اور میرے علم کی تدبیر تلواروں کو بے کار کر دیتی ہے

قلم کے چلنے کی آواز جب کاغذ پر ہوتی ہے تو تلواروں کی آوازوں کے سامنے محض آواز بازگشت ہو جاتی ہے۔

کتاب میں جابجا زبان روزمرہ کی غلطیاں بھی نظر آئیں، "ــــــ اس نے خیمہ کو باخراش بنا دیا" (صفحہ ۳۰)

"باخراش" نامانوس ترکیب ہے!

"قارون جو سونا جمع کیا تھا وہ کہاں ہیں۔ (صفحہ ۵۵)

یوں لکھنا چاہیئے تھا :۔۔۔۔۔ "قارون نے جو سونا جمع کیا وہ کہاں ہے"

صفحہ ۱۲ پر ایک جملہ ہے ۔۔۔۔۔ "اور نہ قمری چڑیا نے چھپایا بلکہ تکلیف ہی کو ظاہر کیا" ۔۔۔۔۔ "قمری" کے ساتھ "چڑیا" لانے کی ضرورت نہ تھی جملہ کے آخری ٹکڑے میں بھی جھول پیدا ہو گیا۔

"حتی کہ سخاوتی کرے گا" (صفحہ ۱۴) "سخاوت" کی جگہ "سخاوتی" لکھنا مضحکہ خیز ہے!

"جو شخص سخاوتی کرتا ہے لوگوں کی جمگھٹ اسی کی طرف رجوع کرتی ہے" (صفحہ ۲) فاضل مترجم نے نہ جانے کس کی زبانی "سخاوتی" سن لیا ہے پھر "جمگھٹ" مؤنث نہیں مذکر ہے ۔۔۔۔۔ "اس کی طرف رجوع کرے" یہ بھی لفظی ترجمہ ہے!

"اگر میری لکڑی جدوجہد کے سامنے ٹوٹ جاتی ۔۔۔۔۔" (صفحہ ۹) یہ بھی نرا لفظی ترجمہ ہے!!

اس کتاب میں ادب و اخلاق کے پاکیزہ نمونے ملتے ہیں، بعض جملے "ضرب الامثال" بننے کے قابل ہیں۔

تارِ پیرہن[1]

از :۔ وفا صدیقی ۔ ترتیب عشرت قادری، ضخامت ۱۰۴ صفحات (مجلد رنگین گرد پوش) قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ :۔ مرکز ادب، بدھوارہ، بھوپال (بھارت)

جناب وفا صدیقی ایک نوجوان شاعر ہیں جن کی شاعری کی عمر دس سال سے بھی کم ہے۔ مگر ان کے کلام میں خاصی پختگی پائی جاتی ہے "وفا" کی شاعری دلکش آہنگ رکھتی ہے۔ مشق و مطالعہ کے ساتھ ان کے کلام میں ترقی ہوتی جائے گی!

وفا صدیقی کے چند منتخب اشعار "فاران" پڑھنے والوں کے ذوق کی پذیرائی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں :۔

دل برباد کا جو حال ہوتا ہو وہ ہو جائے ۔۔۔ کہ اب ہنگامۂ آہ و فغاں دیکھا نہیں جاتا

اب حال مرا پوچھ رہے ہیں مرے احباب ۔۔۔ جب راہ محبت میں مجھے کچھ نہ رہا یاد

دیوانوں کو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے ۔۔۔ ہو خضر تو پھر راہ دکھا کیوں نہیں دیتے

کچھ راہ نکل آئے ممکن ہے محبت میں ۔۔۔ کچھ تم بھی بدل جاؤ کچھ ہم بھی بدل جائیں

تم سے تو گریزاں نظر آتے ہیں یہ میکش ۔۔۔ ہم سب کو پلائیں گے ذرا جام ہمیں دو

اسی منزل کی جانب جا رہے ہیں اب خرد والے ۔۔۔ کہ جس منزل سے گزری تھی مری دیوانگی پہلے

تبسم ہو کہ آنسو ہو کسی سے کچھ نہیں ہوتا ۔۔۔ محبت میں سکون عارضی سے کچھ نہیں ہوتا

وفا کی منزلیں ذوق سفر سے جگمگاتی ہیں ۔۔۔ چراغ رہ گذر کی روشنی سے کچھ نہیں ہوتا

انقلابات کی پھوٹی ہیں یہیں سے کرنیں ۔۔۔ قدر و قیمت ہمیں معلوم ہے زندانوں کی

کاروانوں کو لوٹنے والے ۔۔۔ رہبری کا فریب دیتے ہو

دوسرا رخ :۔

میرے عزم محکم سے منزلیں درخشاں ہیں ۔۔۔ رشک ماہ و انجم ہے میری آبلہ پائی (صفحہ ۱۷)

"آبلہ پائی" اور "آبلوں" کو خون کی سرخی کے سبب پھولوں سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ مگر آبلہ پائی کو "رشک ماہ و انجم" کہنا عجیب تشبیہ ہے اور خلاف واقعہ مبالغہ ہے۔

کہکشاں بچھا دی ہے رہ گزار ہستی میں ۔۔۔ جس طرف سے گزرا ہے زندگی کا سودائی (صفحہ ۱۷)

[1] پاکستان میں جناب بشان الحق حقی کا مجموعہ کلام کئی سال ہوئے اسی نام (تارِ پیرہن) سے شائع ہو چکا ہے۔

"زندگی کا سودائی" نے شعر میں ابہام پیدا کردیا ——— اس طرح کون بولتا، لکھتا اور سوچتا ہے کہ فلاں شخص زندگی کا سودائی ہے یا اُسے زندگی کا سودا ہوگیا ہے۔

ڈھالیں گے اے دوستو! ہم صبح طرب میں   آفات سے لپٹی ہوئی یہ شام ہمیں دو   (صفحہ ۲۱)

"شام کا آفات میں لپٹا ہوا ہونا" عجیب انداز بیان ہے! پھر اس پر یہ انداز تخاطب، ——— "یہ شام ہمیں دو"

خار و خس بھی پھول بن جاتے ہیں غنچے ہی نہیں   باغباں میں جب شعور رنگ و بو آجائے ہے   (صفحہ ۳۰)

کیا یہ کوئی کلیہ ہے کہ باغبانوں کو رنگ و بو کا شعور نہیں ہوا کرتا اور یہ شعور جب پیدا ہوجاتا ہے تو "خار و خس" پھول بن جایا کرتے ہیں۔

اک سسکتی ہوئی کرن دیکر   روشنی کا فریب دیتے ہو   (صفحہ ۳۳)

کرن کو سسکتی کہنا، یہ ان نام نہاد "ترقی پسندوں" کا انداز بیان ہے جو اردو زبان و ادب کا بہت کچھ حلیہ بگاڑ چکے ہیں۔

جب بات ہے ساقی کے اطوار بدل جائیں   میکش بھی قدامت کی سرحد سے نکل جائیں   (صفحہ ۴۳)

آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟

دیکھ دیوانے ستاروں سے سجا بیٹھے ہیں   حسن معصوم تری راہگذر عید کے دن   (صفحہ ۶۴)

دن کے وقت بھی "ستارے" ہوتے ہیں ——— خوب! "سجا بیٹھے ہیں" (زبان و روزمرہ کے اعتبار سے) اس پر مستزاد! پھر "ستاروں" کا "دیوانوں" سے کیا ربط ہے۔

صدیوں رسن و دار کی بازی لیکر   دوشیزہ جمہور کو پایا ہم نے   (صفحہ ۸۸)

پہلا مصرعہ زبان و بیان کے اعتبار سے کس قدر کمزور اور کاواک ہے۔

یہ جو تو نے ظلم کی بستی بسا رکھی ہے آج   آتش بے چارگی سے ایک دن جل جائے گی   (صفحہ ۱۰۳)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ مظلومیت کی شدت ایک نہ ایک دن ظلم کی بساط الٹ دے گی اور ظالم تباہ ہوجائے گا۔ مگر "آتش بے چارگی" نے اس مفہوم کو کتنا گنجلک اور عجیب بنادیا۔

شاعرنامہ

از:- محشر بدایونی، ضخامت ۱۲۶ صفحات، قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:- ریپلیکا پبلی کیشنز، مانڈرسی والا لین، پریڈی اسٹریٹ، صدر کراچی۔

جناب محشر بدایونی شعر و ادب کے حلقوں میں خاصے معروف ہیں، "شاعرنامہ" اُن کی دو سال کی مسلسل کاوشوں کا حاصل ہے، اس کتاب میں پچاس نامور شعراء کے منظوم حالات، شعراء کی تصویروں کے ساتھ درج ہیں!

اُردو زبان کی تاریخ سب سے پہلے حضرت ناطق لکھنوی مرحوم نے نظم کی تھی۔ محشر صاحب نے شعراء کے سوانح حیات نظم فرما کر اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے ——— ان نظموں میں روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے، اس لئے طلباء اور طالبات میں یہ مقبول ہوں گی، اور بہت سے شعر تو انہیں آسانی کے ساتھ از بر ہوجائیں گے۔

میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کی ایک شعر میں کتنی سچی تعریف کی ہے :-

مثنوی کی ہر ایک بات سند   ہیں حسن کے محاورات سند

انشاءاللہ خاں انشا کی شاعری پر ایک ہی شعر میں کتنا جامع تبصرہ فرمایا ہے۔

ہے بہت خوب بندشوں کا سجاؤ   نہ کوئی پیچ ہے نہ ہے اُلجھاؤ

سراج الدین شاہ ظفر کی سیرت پر ایک شعر کہا، اور اُن کی زندگی کا ست نکال کر رکھ دیا۔

گھر میں امیری، دل میں گدائی — رُخ پہ چمک سینے میں صفائی

چند اور اشعار:—

فکر میں اک پاکیزہ مزاقی — اکثر شعر اُن کے اخلاقی (ذوقؔ پر)

لفظ تھوڑے مگر خیال بڑا — ان کو حاصل تھا یہ کمال بڑا (انیسؔ پر)

یوں ہے شعروں میں رزم کی تصویر — بول اُٹھتی ہے بے زباں تحریر (دبیرؔ پر)

ضد کا تھا کچھ ان کی ٹھکانا — غالبؔ سے شاعر کو نہ مانا (یاسؔ یگانہ پر)

کہیں کہیں اشعار اور مصرعے کھٹکتے بھی:—

علم خسرو کو تھا جو گانے کا — ان پہ ریجھا ہے دل زمانے کا

مصرعہ ثانی میں "علم" کا استعمال محلِّ نظر ہے، یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا:—

ع جانتے تھے وہ فن جو گانے کا

تھے وہ دُنیا کے غموں سے بے نیاز — شاعری میں اُن کی بیحد ہے گداز

اول تو یہ بات ہی مبالغہ آمیز بلکہ غلط ہے کہ خواجہ میر درد کو دُنیا کا کوئی غم ہی نہ تھا — پھر غموں سے بے نیازی اور بے تعلقی کے بعد شعروں میں سوز و گداز کا پیدا ہو جانا، اور زیادہ تعجب خیز ہے۔

رنگ آتش میں ہیں اُن کی غزلیات — ویسا ہی انداز اور ویسی ہی بات[1]

"غزلیات" کی "ز" پڑھنے میں، زبان کو جھٹکا لگتا ہے — غزل کی جمع غزلیات ہے جس کی "ز" جمع میں بھی ساکن نہیں متحرک ہی رہتی ہے

لوہارو خاندان وہ خاندان ہے — کہ جس کا اک زمانہ قدرداں ہے

قدرداں کا نہیں "مدح خواں" کا محل تھا۔

مزاج اُن کا تھا بے حد شاعرانہ — دماغ اُن کا نہایت عالمانہ

سائل دہلوی نہ عالم تھے اور نہ عالمانہ دماغ رکھتے تھے۔ شاعری سے زیادہ اُن کی وضعداری اور شرافت کی تعریف کرنی تھی اور اس کا اظہار ضروری تھا کہ وہ دلی کی تہذیب کا آخری نمونہ تھے۔

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے وطن "پٹیالی" کے ساتھ قوسین میں آگرہ لکھا ہے! پٹیالی نہ تو آگرہ کا کوئی محلہ ہے نہ فتحپور سیکری اور سکندرہ کی طرح آگرہ کے مضافات میں واقع ہے اور نہ آگرہ کے ضلع سے اس کا کوئی تعلق ہے، پٹیالی ضلع ایٹہ کا ایک قصبہ ہے۔

ان کا اک اک شعر موثر — فن کا سہرا ان کے سر پر

"موثر" کی "ث" پر فتحہ نہیں کسرہ ہے، اس لئے اُس کا قافیہ "پر" نہیں "مسافر" "نامر" "شاعر" ہو سکتے ہیں۔

تھی وہاں تھیٹروں کی ریل اور پیل — چل رہے تھے طرح طرح کے کھیل

"ریل پیل" روزمرہ ہے، ان لفظوں کے درمیان "اور" یا "واؤ" نہیں آتا۔

[1] کتاب کے صفحات نمبروں سے خالی ہیں۔ خدا جانے یہ جدت ہے یا کاتب کی بھول چوک! اس لئے شعروں کے ساتھ صفحات نمبر درج نہیں کئے گئے!

سال چھتیس میں ہوئی بندش — اور بھی بڑھ گئی وفائے سخن

وفاؔ کا یہاں کیا محل تھا؟

نام اُن کا ہے ثناءاللہ ڈار — ان کی خدمت سے بڑھا فن کا وقار

حالانکہ میراجی (ثناءاللہ ڈار) نے فنِ شاعری کی مٹی پلید کی ہے! محشرؔ صاحب نے مشاہیر شعراء کے ساتھ میراجی کو شامل کرکے اپنے ذوقِ انتخاب کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔

یہ ہیں شیریں زباں چراغ حسن — ان سے مہکا ہے شاعری کا چمن

چراغ حسن حسرتؔ نے شاعری کے چمن کو نہیں زبان وادب (نثر) کے گلکدہ کو مہکایا ہے۔

بڑھ گئی آب فن کے گوہر کی — سن پیدائش اس سخنور کی

"سن" بالاتفاق مذکر ہے۔

اس کتاب کا "سرنامہ" جناب ذوالفقار علی بخاری نے لکھا ہے، جناب آذرؔ ذوبی نے اوراق کی تزئین کی ہے، کتابت دیدہ زیب ہے، طباعت کتابت سے بھی زیادہ دلکش! کاغذ، جدولیں، تصویریں غرض ہر چیز دامنِ دل کو کھینچتی ہے کہ "جا اینجا است"۔

قوتِ صحت اور شباب کے لئے خاص مجربات
حبِ فضلی
جسمانی، دماغی، اعصابی، کمزوری کا بہترین علاج۔ یہ گولیاں ہر قسم کی طاقتوں کو بحال کرتی ہیں۔ بدن کی کمزوری
چہرہ کی زردی، کمی خون، دُبلاپن، ضعفِ جگر کو دُور کرکے خون بڑھاتی ہیں۔ چہرہ کو سُرخ بارعب بناتی ہیں، گردہ
مثانہ کی کمزوری اور پیشاب کی زیادتی کو روکتی ہیں۔ قیمت فی شیشی :۔ دو رُوپے پچاس پیسے صرف
رفیقِ صحت
مردوں اور عورتوں کی پوشیدہ امراض اور بدنی کمزوریوں کو دُور کرنے والا اکسیر اور نایاب مرکب۔ مقوی اعضائے
رئیسہ، دل و دماغ و جگر اور معدہ کو قوت دیتا ہے، بھوک لگاتا اور قبض کو دُور کرتا ہے۔ مادہ تولید پر اس کا
خاص اثر ہوتا ہے۔ (پرچہ ترکیب ہمراہ شیشی) قیمت فی شیشی :۔ چار روپے
معجون مقوی خاص
یہ ایک شاہی نسخہ ہے جو زعفران۔ مشک خالص، عنبر اشہب اور بہت سی قیمتی ادویات کا مرکب
ہے۔ نئی جوانی و طاقت کی فراوانی کے لئے جادو اثر ہے۔ مادہ تولید کو گاڑھا کرتی ہے اور قوتِ مردی کے
لئے بے نظیر ہے۔ (پرچہ ترکیب ہمراہ شیشی) قیمت فی شیشی :۔ پانچ روپے پچاس پیسے
(محصول ڈاک بذمہ خریدار ایک روپیہ پندرہ پیسے صرف) جنسی معلومات کے لئے لٹریچر "محافظِ جوانی" مفت منگوائیں
پتہ :۔ ہندی دواخانہ یونانی قصور

K-2
CIGARETTES

ایڈیٹر:- ماہر القادری ماہ مارچ ۱۹۶۳ء

ترتیب

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

چندہ سالانہ سات رُوپے

مقامِ اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

مطبوعہ:- ... سعیدی کراچی

پرنٹر و پبلشر:- مسرور حسین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

نقشِ اوّل

پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں "ثقافت" (culture) کے نام پر عشقیہ تمثیل واداکاری اور رقص وسرود کا جو طوفانِ بدتمیزی برپا ہے اُس کے خلاف عام مسلمانوں کے دلوں میں مارشل لا کے زمانہ ہی سے سخت برہمی نفرت اور بیزاری پائی جاتی ہے، ان غیر اسلامی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کے جو بُرے نتائج ظہور میں آرہے ہیں غالباً اُن سے اور طلبا و طالبات کے والدین اور سرپرستوں کے عام جذبات واحساسات سے متاثر ہوکر محکمہ تعلیمات کے ریجنل ڈائرکٹر نے ان لغو اور بیہودہ سرگرمیوں کے بند کرنے کا اعلان فرمادیا، اس اعلان حقیقت ترجمان نے مُلک کے طول وعرض میں مسرت کی لہر دوڑادی کہ ایک سرکاری عہدیدار کی دینی غیرت کو حرکت تو ہوئی، اُس نے اپنے فرض کو تو پہچانا، خدا کے اُس نیک دل اور غیرت مند بندے کو اس خرابی کا تو احساس ہوا کہ ان غیر اخلاقی کھیل تماشوں سے لڑکیاں اور لڑکے کیا بنے جا رہے ہیں!

مگر

افسوس کہ مُسلمانوں کی اس مسرت کو بیگم محمودہ سلیم کے اس فرمان خرابی نشان نے خاک میں ملادیا جس میں بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اسکولوں اور کالجوں میں رقص وسرود کی پابندیاں لگاکر طلبا اور طالبات کو میں مُلّا بنانا نہیں چاہتی! خاتون وزیر تعلیمات کے اس اعلان پر مُسلمانوں کے ہر طبقہ کے افراد شدید احتجاج کررہے ہیں اس اعلان نے ان کے دلوں کو دُکھایا ہے اُن کے دینی جذبات کو مجروح کیا ہے اور ملک میں بیٹھے بٹھائے برہمی اور ناراضی کی لہر دوڑادی ہے اخبارات میں مسلمانوں کے شدید احتجاج کی خبریں آرہی ہیں اور یہ تک مُطالبہ کیا جارہا ہے:—

"۔۔۔صُوبائی وزیر تعلیم کا بیان چونکہ نظریۂ پاکستان اور دستورِ مملکت کے صریحاً خلاف ہے، لہٰذا ان سے نہ صرف وزارتِ تعلیمات کا محکمہ واپس لیا جائے، بلکہ انہیں صوبائی کابینہ سے فوراً نکال دیا جائے۔۔۔"

(روزنامہ — حُریت — ۱۵/فروری ۱۹۶۳ء)

اس قسم کے احتجاج اور مطالبوں پر سرکاری حلقوں کی طرف سے کہا جاسکتا ہے کہ پبلک اور اس قدر گستاخ! عزت مآب وزیرِ تعلیم کی شان میں ایسی بے ادبی! مگر یہ بھی تو دیکھئے وزیر تعلیمات نے مسلمانوں کو "مُلّا" کہہ کر ملّتِ اسلامیہ کی غیرت کی توہین کی ہے اور اسلام کی اخلاقی قدروں کا مذاق اُڑایا ہے! یہ تو نرم سے نرم مطالبہ ہے جو عوام نے کیا ہے۔

اگر

خلافتِ راشدہ کا دور ہوتا، تو اس قسم کے اعلان وبیان پر قانونی اور تعزیری طور پر احتساب کیا جاتا اور انتظامیہ نہیں اسلامی عدالت اپنا فیصلہ صادر کرتی۔

جہاں تک شخصی عزت کا تعلق ہے ایک چپراسی اور قلی بھی عزت رکھتا ہے اور اس کی ذات اور شخصیت بھی احترام کی مستحق ہے
مگر جب اسلام کی عزت سے لوگ کھیلنے لگیں تو پھر شخصی آداب کی حدود باقی نہیں رہ سکتیں۔

مسٹر غلام محمد اور اسکندر مرزا اسلام پسندوں کو "مُلّا" کہہ کر مسلمانوں کی دل آزاری کیا کرتے تھے اور "مُلّائیت" کی منطق کے پردے میں اسلام کا مذاق اڑاتے تھے، ان دونوں نے اپنا انجام دیکھ لیا، کرسیوں اور عہدوں کے سہارے مصنوعی عزت کا جو طلسم قائم تھا، وہ کرسیوں کے چھنتے ہی ریت کی دیوار ثابت ہوا! ان کے دفع ہونے کے بعد یہ طنز پھر سننے میں نہیں آئی، اب بیگم محمودہ سلیم صاحبہ نے "مُلّا" کی اس طنز کی تجدید فرما کر غلام محمد اور اسکندر مرزا کے عہد کی تاریخ کو دہرایا ہے اور انکی "سُنّت" پر عمل کیا ہے ——

قصر ایوان سے آئے دن دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ "انتشار پسندوں کو کچل دیا جائے گا"۔ بجا ارشاد فرمایا، انتشار پسند سچ مچ اسی قابل ہیں، مگر اس باب میں یہ خاک نشین بھی کچھ عرض و معروض کرنے کی جرات کرتے ہیں —— پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے مگر جمہوری کوششوں کے ذریعہ بنا ہے، اس لئے پاکستان کے باشندے اگر "جمہوریت" کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہیں، تو اس مطالبہ کو کیا "انتشار" کہا جاسکتا ہے؟ —— عائلی قوانین میں ایسی کتنی دفعات پائی جاتی ہیں جو صریحی طور پر کتاب و سنت کے نہ صرف یہ کہ مطابق نہیں ہیں بلکہ کتاب و سنت سے متصادم ہیں، قوم اس پر ان قوانین کی تنسیخ کے لئے درخواست کرتی ہے کہ خدا کے لئے شریعت کا احترام کرو، ہم اپنے عائلی قوانین کتاب و سنت کے مطابق چاہتے ہیں —— کیا اس گزارش، درخواست اور آئینی احتجاج کو "انتشار" سے تعبیر کر سکتے ہیں —— بیگم محمودہ سلیم کے جو قابلِ اعتراض بیان پر جو احتجاج کیا جارہا ہے اس کا مقصد انتشار پسندی نہیں اسلامی اخلاق کی حفاظت اور "منکرات" کے خلاف احتجاج ہے —— ان واقعات کی روشنی میں سوچئے کہ انتشار کا اصل سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ کس کی بے دانشی اور غلط اندیشی ہے جو عوام کو احتجاج پر مجبور کرتی ہے!

متحدہ ہندوستان میں انگریز کی حکومت استبداد آمیز حکومت تھی، رقص و سرود انگریز کی تہذیب میں داخل ہے اور ہندوؤں کے یہاں بھی مذہبی تیوہاروں میں ناچ گانے کو خاص اہمیت حاصل ہے، مگر انگریز نے مسلمانوں کے دینی جذبات اور قومی احساسات کے پیشِ نظر اسکولوں اور کالجوں میں رقص و سرود کو رواج دینے کی حماقت نہیں کی، انگریز جانتا تھا کہ دین کے معاملہ میں مسلمان بہت حسّاس اور غیرت مند واقع ہوا ہے مگر افسوس اور ہزار افسوس کہ انگریز اپنے جس "کلچر" کو حکومت کے بل بوتے پر عام کرنے کی جرأت نہ کر سکا، پاکستان میں اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں اس "کلچر" کی تخم ریزی ہو رہی ہے اور اس "شجرِ خبیث" کی غور و پرداخت اور نشو و نما کے اسباب مہیا کئے جارہے ہیں۔

مسلمان گھرانوں کے بعض مردوں کو تو البتہ کسبیوں اور طوائفوں سے اور رقص و سرود سے دل چسپی رہی ہے، مگر معاشرے میں ایسے مردوں کو "تماش بین" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے! اس مزاج و طبیعت کے لوگوں نے اپنی اس بے راہ روی پر فخر نہیں کیا، معاشرے میں وہ ہمیشہ دبے دبے سے اور جھینپے جھینپے سے رہے ہیں! لیکن مسلمان عورتوں کی غیرت نے رقص و سرود میں دل چسپی لینا گوارا نہیں کیا! ہمارے یہاں رقص و سرود کو طوائفوں، کنچنیوں اور ہیروئنوں کے پیشہ کے لئے مخصوص اور محدود سمجھا گیا ہے۔

—— مگر ——

اب گراوٹ اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں "زیر سرپرستی سرکار" ناچ گانے کی محفلیں جمتی ہیں، اور ایک مسلمان خاتون وزیر کی زبان سے یہ جملے نکلتے ہیں کہ "میں رقص و سرود پر پابندی لگا کر طلبا اور طالبات کو مُلّا بنانا نہیں چاہتی"

؎ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

یہی وہ مقام ہے، جہاں ناطقہ کو سر بگریباں اور خامہ کو انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے!

پاکستان تو ان توقعات پر قائم ہوا تھا کہ یہاں کے مردوں کے کرداروں میں صدیقؓ و فاروقؓ اور عثمانؓ و علیؓ کی مقدس سیرتوں کی جھلک پیدا ہوگی اور یہاں کی عورتوں میں خدیجہؓ، فاطمہؓ عائشہؓ اور رابعہ بصریؒ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی پاک زندگیوں کا حسن و جمال منعکس ہوگا، مگر وائے افسوس کہ انہیں اوشے شنکر اور دیویکا رانی بنانے کی تدبیریں اور کوششیں کی جا رہی ہیں۔

؎ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

ہم نے "فاران" میں متعدد بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ رقص و سرود ہو یا بے حیائی اور بداخلاقی کے دوسرے مظاہر ہوں کمیونسٹ اس کی ترویج اور اشاعت میں خاص طور سے حصہ لیتے ہیں کیونکہ اس سے اسلام کے ضابطۂ اخلاق کو نقصان پہونچتا ہے اور خدا پرستی کی جگہ مادہ پرستی کے تصورات و عقائد کو غذا ملتی ہے! اب تک پاکستان میں کمیونسٹوں کو اسلامی اقدار پر کھلم کھلا حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر بیگم محمودہ سلیم کے بیان نے کمیونسٹوں کو جری اور دلیر بنایا اور کمیونسٹوں نے کھل کر رقص و سرود کی حمایت کی اور اس طرح اسلامی اخلاق و روایت پر طنز و تنقید کرنے کی بنیاد پڑ گئی۔

مذہب کی، اخلاق کی اور خیر و ثواب کے کاموں کی تخریب اور اس کے مقابلہ میں بداخلاقیوں اور ہوسناکیوں کی ترویج و اشاعت کمیونزم کی فطرت میں داخل ہے، اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ حکومت روس نے اس بدعت سیئہ کا آغاز کیا ہے کہ اپنے یہاں فلمی میلے لگاتے ہیں، اور نقالوں، اور ناچنے گانے والے مردوں اور عورتوں کو خطابات اور تمغے دیتے ہیں، اور ان کی طرح طرح سے قدر افزائی کی ہے!

ناچ گانا ہندوؤں کی تہذیب میں داخل ہے، اُن کے یہاں دیوداسیوں تک کا وجود ملتا ہے، مگر اس کے باوجود ہندوستان میں رنڈیوں، بھڑووں، سارنگیوں، طبلچیوں، ڈوم ڈھاڑیوں، نچکیوں، گویوں، کتھکوں، پاتروں اور سوانگ بھرنے والوں کو مقام عزت عطا نہیں کیا گیا، مگر روس کی دیکھا دیکھی اب بھارت کی حکومت بھی پنڈتوں، ودوانوں، ادیبوں، سائنس دانوں اور شاعروں کی طرح فلمی ستاروں، سازندوں اور ناچنے گانے والوں کو بھی تمغے اور خطابات دے رہی ہے! اس میں سب سے زیادہ دلچسپی پنڈت جواہر لال نہرو لے رہے ہیں، پنڈت جی کوئی شک نہیں شریف اور وسیع الظرف انسان ہیں مگر اُن کی تربیت ایک خوشحال عیش پسند گھرانے میں ہوئی ہے اور جب وہ جوان ہوئے تو انہیں یورپ بھیج دیا گیا، رہی گاندھی جی کے ساتھ اُن کی طویل معیت تو گاندھی جی کا سیاسیات میں تو پنڈت جی نے اثر قبول کیا، مگر مذہب اور مذہبی اخلاق و معاشرت میں وہ گاندھی سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ مخالف الخیال ہی رہے! مرد و زن کے آزادانہ بیباکانہ اختلاط کے جو بُرے نتائج ظہور میں آتے ہیں اُس کے وہ خود زخم خوردہ ہیں مگر اس سانحہ سے پنڈت جی نے کوئی عبرت حاصل نہیں کی، صاحب موصوف سوشلزم اور کمیونزم سے بھی متاثر ہیں، اس کے بعد اُن کی نگاہ میں ایک متقی پرہیزگار اور ایک رقاصہ دونوں برابر کے مقامِ عزت کے مستحق ہوں، تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔

مگر

پاکستان روس اور بھارت کی نقالی کرنے کے لئے وجود میں نہیں آیا ۔ اگر رقص و سرود اور اسی طرح کی دوسری "فنکاریوں" (BRTS) کو فروغ دینا تھا تو اس کے لئے متحدہ ہندوستان سب سے زیادہ موزوں تھا، پاکستان تو اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کی خاطر اور ان کو فروغ دینے کے لئے بنا ہے، یہاں اس قسم کی بیہودگیاں جو پاکستان کے مقصد وجود کی نفی کرتی ہیں نہیں چل سکتیں، ثقافت و تمدن کے ان مسائل میں پاکستان کی روح روس سے یورپ سے اور اُن تمام ملکوں سے جو اس راہ پر جارہے ہیں، پکار پکار کر کہہ رہی ہے ——

آں کہ فخر تست آں ننگ من است

سوچیئے

اس کے بعد ہم رقص و سرود اور تمثیل و اداکاری پر دین و اخلاق اور عام معاشرے کے نقطۂ نگاہ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں "رقص" چاہے اس کا فنکار مرد ہو یا عورت ہو کسی حیثیت سے بھی اور کسی درجہ میں بھی، اسلام اسے جائز اور پسندیدہ نہیں ٹھیراتا! رقص اور اسلام یہ دو متضاد چیزیں ہیں، دورِ رسالت بعہد صحابہ اور تابعین کے زمانے کی تاریخ موجود ہے، "رقص" کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آتا!

بتاشوں پر اُپی ہوئی تلواروں پر کچی کلیوں پر رقص اور اس فنکارانہ انداز کے ساتھ رقص کہ پیروں کو مسلسل جنبش ہو رہی ہے مگر صرف ایک گھنگرو بج رہا ہے باقی گھنگرو خاموش ہیں! یہ رقص طاؤس ہے، ناچنے والی سچ مچ مور کی طرح ناچ رہی ہے یہ کتھک ناچ ہے اور یہ کہروا ہے جس کے توڑے بڑے اثر انگیز اور نشاط خیز ہوتے ہیں —— یہ وہ ناچ ہے جس میں رقاص سپیرے کی طرح بین بجا رہا ہے —— اور اس رقص میں رقاصہ ایک منٹ میں دو سو بار گھومتی ہے، تیزی اور پھرتی کا یہ عالم ہے کہ نگاہ اُس کے ارد گرد شعلہ جوالہ کی طرح بس حلقہ سا گھومتا ہوا محسوس کرتی ہے —— مگر

ان سب کا حاصل خانہ خرابی

یہ اگر آرٹ ہے تو پھر اُن گرہ کٹوں اور جیب کتروں کے آرٹ کی بھی قدر کرنی چاہیئے، جو بھرے مجمع میں اس صفائی سے جیب کاٹتے ہیں کہ جس کی جیب کاٹی ہے اور جو لوگ اس کے پاس بیٹھے یا کھڑے ہوئے ہوتے ہیں اُن کو احساس تک نہیں ہوتا!

رقص میں جسمانی اعضا کے مڑنے، تھرکنے اور پھڑکنے سے دیکھنے والوں کے صنفی جذبات متاثر ہوتے ہیں اُن میں ہیجان برپا ہوتا ہے اور اس طرح رقص فسادِ اخلاق کا سبب قرار پاتا ہے، رہے ناچنے والے اور ناچنے والیاں اُن کے حالات اور زندگیاں سو فیصدی مشتبہ، خراب بلکہ داغدار ہوتی ہیں، یہ فن اور پیشہ ہی ایسا ہے کہ اس کی پرچھائیں بھی جس پر پڑ جائے گی، وہ اچھوتا نہیں رہ سکتا!

مزامیر کے بغیر سادہ غنا اور موسیقی کی اخلاقی مضرت رقص سے بہت کم ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ "گانا" سفلی جذبات میں تحریک ضرور پیدا کرتا ہے، آواز کا اتار چڑھاؤ، لہجہ کی لٹک، گٹکری، سُر، تال، راگ، راگنی اُس کے ساتھ نرت ہو، مزامیر ہوں اور عاشقانہ اشعار اور پریم کے بول ہوں تو پھر اس کے اخلاقی فساد کا کیا پوچھنا، بعض صورتوں میں رقص کی مضرت سے بھی اس کی خرابی بازی لے جاتی ہے، اسلام دینِ فطرت ہے، وہ خوش آوازی اور لحن کی شیرینی کو جائز بلکہ پسندیدہ قرار دیتا ہے، قرآن پاک کی تجوید اور قرأت میں نغمہ کے "ایقاع" کی خاصی جھلک ملتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کی تلاوتِ قرآن پاک بہت پسند تھی کہ وہ خوش آواز تھے! اگر بد الصوت قاری کے بارے میں شیخ سعدی کا فتویٰ یہ ہے :-

چوں تو قرآں بریں نمط خوانی ببری رونقِ مسلمانی

ترنم سے غزل بھی پڑھی جاسکتی ہے اور خوش آوازی کے ساتھ گیت کے بول بھی دُہرائے جاسکتے ہیں، مگر آواز، لہجہ اور لحن

ترنم کی اس فطری رخصت و اجازت کے بعد اسلام راگ راگنی کو پسندیدہ نہیں سمجھتا کہ اس سے طبیعت تو بیشک لطف اندوز ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے [illegible] ملتا ہے مگر سفلی جذبات میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے، گانے والا اور گانا سننے والے ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں رامش و رنگ، عیش و مستی کا ہجوم ہوتا ہے اب اس عالم میں ہوسناکیوں کو جتنی بھی شہ اور غذا مل جائے ـــــ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ غنا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے۔ عید کے موقعہ پر اس کی البتہ اجازت ہے کہ گھر کی لڑکیاں جی چاہے تو حمد، نعت اور اخلاقی اشعار خوش آوازی کے ساتھ پڑھ سکتی ہیں اور گانے میں دف یا تھالی وغیرہ بجا بھی سکتی ہیں، مگر گھر کی حدود میں شائستگی کے ساتھ! غیر محرموں کو سنانے کے لئے اس قسم کا محتاط گانا بجانا بھی حرام ہے۔

بعض لوگ غنا و موسیقی کے جواز کے لئے صوفیا کے "سماع" کو دلیل میں لاتے ہیں، ان حضرات کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ دین میں اصل حجت اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اس کے بعد صحابہ کرام کے اجماع کا درجہ ہے، کتاب و سنت اور آثار صحابہ کے علاوہ اور کسی کا قول و عمل دین میں حجت، سند اور نمونہ نہیں ہے، کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں غنا و موسیقی کے جواز کے لئے دلیل نہیں ملتی، عہد رسالت اور دور صحابہ میں گانے بجانے کی محفلیں برپا نہیں ہوتی تھیں اور نہ اس فن کی تعلیم دی جاتی تھی، روم و مصر اور عراق و شام فتح ہونے کے بعد بھی وہاں کے باشندوں کے ذوق کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صحابہ کرام نے موسیقی اور غنا کی حوصلہ افزائی نہیں کی! کوئی صحابی، تابعی، تبع تابعی یا حدیث و فقہ کا امام نہ کسی راگ کا موجد ہے اور نہ کسی آلۂ طرب کا مخترع ہے!

طریقت کے جو مشہور سلسلے ہیں اُن میں قادریہ اور نقشبندیہ سلسلوں میں تو سماع کی ممانعت پائی جاتی ہے، چشتیہ اور سہروردیہ دو سلسلے ایسے ہیں جن میں سماع کا رواج ہے! ان چشتی اور سہروردی صوفیا میں بعض ایسے صوفی بھی گزرے ہیں جنھوں نے سماع کی مضرت دیکھ کر اُسے ترک کر دیا حضرت علی ہجویری (گنج بخش) رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ملتا ہے: ـــ

"آپ نے آخری عمر میں سماع بالکل ترک کر دیا اور نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ میں اسے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ کوئی شخص سماع میں نہ پڑے، اس سے طبیعت پریشان نہ کرے کیونکہ اس میں بڑے خطرے ہیں۔"

حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ کے مریدوں میں اُن کے اجل خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عالم تھا کہ جب اُن کے شیخ کے یہاں محفل سماع برپا ہوتی تو وہاں سے اُٹھ جاتے سماع کی محفل میں شرکت نہ فرماتے! بعض مریدوں کے ٹوکنے پر حضرت سلطان جی نے حضرت چراغ دہلوی کے اس عمل کو سراہا کہ ان پر سنت کا غلبہ ہے ـــــــ پھر ـــــــ

سماع کی محفل کے آداب و شرائط بھی تو سامنے رکھئے، حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ـــ

"سامع از اہل دل باشد، از اہل ہوا و شہوت نباشد، مسمع مرد تمام شد کودک و زن نباشد، مسموع مضمون ہزل نہ باشد، آلۂ سماع چنگ و رباب درمیان نباشد۔" (فوائد الفواد)

ترجمہ: ـــ سننے والا اہل دل ہو، اور اہل شہوت نہ ہو، سنانے والا (یعنی قوال) پورا مرد ہو، اور بے ریش و بروت لڑکا یا عورت نہ ہو، جو کلام (سماع میں) پڑھا جائے، وہ فحش یا ہجو مضمون والا نہ ہو، آلۂ سماع چنگ یا باجا نہ ہو (یعنی سماع بے ساز ہو)

صوفیا کے اس سماع پر آج کل کی موسیقی اور غنا کا جو کوئی قیاس کرتا ہے وہ نیک نیتی کے ساتھ ایسا کرتا ہے تو جاہل ہے اور ایسا کرنے میں بدنیتی شامل ہے تو وہ مفسد ہے! سماع کے لئے صوفیا کے یہ سخت شرائط، پھر اُن کی ریاضت اور مجاہدہ کی زندگیاں بھی تو دیکھئے کہ نفس کو جائز لذتوں تک سے اپنے کو محروم رکھتے تھے، ان کے سماع کو اس گناہ پرور دور کی موسیقی سے کوئی مناسبت ہی نہیں! خدا کی قسم یہی وہ موسیقی ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے گانا دل میں نفاق کو اگاتا ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جس حکمت اور مصلحت کے پیش نظر یہ فرمایا تھا کہ سماع اہل کے لئے حلال اور نااہل کے لئے حرام ہے — قرآن کی
یہ دنیا سماع سننے کی قطعاً اہل نہیں ہے اور امام غزالی کے نقطہ نگاہ سے موسیقی موجودہ دنیا پر حرام ہے! کیونکہ زمانہ ہوسناکی اور نفس پرستی کی جس ڈگر
پر جا رہا ہے اُس کو موسیقی سے خاصی شہ ملتی ہے۔

جہاں تک ڈرامہ، تمثیل اور اداکاری کا تعلق ہے — تو عورت کا مرد کے روپ میں اسٹیج پر آنا اور مرد کا عورت کا بھیس بھرنا، یہ دونوں صورتیں مرد و عورت
کی فطری تخلیق کو مسخ کرتی ہیں، اس لئے غلط ہیں، لغو ہیں بلکہ گناہ ہیں! عورت کی حیا اور عصمت و عفت کے پیش نظر اُس کا ممثلہ، اداکارہ اور ایکٹریس کی اصطلاح
میں "ہنر پیشہ" بننا کسی عنوان پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا، ہاں امردوں کے لئے اس کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے کہ وہ غیرت و حیا کے آداب و حدود ملحوظ رکھتے
ہوئے "اخلاقی تمثیلیں" پیش کر سکتے ہیں! اگر ان تمثیلوں اور ڈراموں میں "لذتیت" کا عنصر غالب ہو گیا، تو یہ بھی اخلاقی مضرت و فساد کا سبب بن
جائیں گے! جس طرح واعظین اور مقررین زبان کے ساتھ اپنے جسمانی اعضا کو بھی حرکت دیتے ہیں، تو ڈراموں اور تمثیلوں میں حرکت و ادا ([illegible])
کو مقررین سے زیادہ آزادی دینی ہو گی۔

مگر —

اس تصویر کا ایک اور تاریک رخ بھی ہے، یہ کہ متحدہ ہندوستان میں سوانگ کی منڈلیاں جو کھیل کھیلتی تھیں، جن میں عورت نہیں صرف
ادھیڑ عمر کے مرد اور لڑکے کام کرتے تھے تو اداکاری کی تربیت کے دوران امردوں سے اس خلط ملط کے سبب بعض ناشائستہ باتیں ظہور میں آتی تھیں! اسی طرح
کی ایک بات یہ ہے کہ جہاں لذتیت کے ساتھ آزادی ملے گی، وہاں بے عنوانیوں اور غلط کاریوں کا ہر وقت امکان ہے! اور اسلام بے عنوانیوں، غلط کاریوں
اور لغزشوں کے انہی امکانات پر قدغن لگاتا اور پابندیاں عائد کرتا ہے۔

رقص و موسیقی ہو، تمثیل و اداکاری ہو، شعر خوانی اور تقریر ہو، دینی نقطہ نگاہ سے نامحرم مردوں کے مجمع میں عورت کے اسٹیج پر آنے کا تو کوئی
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں (امہات المومنین) تھیں، ان کے لئے قرآن یہ تلقین کرتا ہے کہ ضرورت
کے وقت کسی غیر مرد سے گفتگو کرنی پڑے، تو پردے کی آڑ سے گفتگو کریں (سامنے نہ آئیں) اور بات چیت کرنے میں ایسا لب و لہجہ اختیار نہ ہو کہ
بات سننے والے کے دل میں کسی قسم کی دلچسپی پیدا ہو جائے! — وہ دین کتنا فطری، سچا اور پاکیزہ دین ہے، جو صنف نازک کی شخصیت کی حفاظت کے لئے
اُس کے گرد پاکیزگی کے اتنے حصار قائم کرتا ہے! اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رقص و نغمہ اور اداکاری جس کا مقصد ہی دیکھنے اور سننے والوں کو رجھانا، اُبھارنا
اور ان کے لئے دلچسپی کا سبب بننا ہوتا ہے، عورت کے لئے کتنا خطرناک اقدام اور کس قدر شدید گناہ ہے! جو لوگ رقص و سرود کے مخلوط اجتماعات اس غرض سے منعقد کرتے ہیں کہ
عوام و خواص ان سے لطف اندوز اور لذت یاب ہوں، ایسے لوگ دراصل "قرمساقوں" (PIMPS) کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔

وہ دیندار لوگ جو رقص و سرود اور مرد و زن کے آزادانہ اختلاط پر احتجاج و احتساب کرتے ہیں، اُن کا ایسا کرنے میں کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ
مادی لذت کے نقطہ نگاہ سے تو وہ غریب گھاٹے ہی میں رہتے ہیں کہ ان لذتوں اور چٹخاروں سے فیض یاب ہونے سے انہوں نے اپنے کو محروم کر لیا ہے! اور یہ
محرومی انہوں نے صرف اس لئے گوارا کی ہے کہ یہ باتیں اللہ اور رسول کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں، اور جن باتوں کو اللہ اور رسول ناپسند کرتے ہیں، وہ دنیا کے نزدیک
چاہے آرٹ اور کلچر کا شاہکار کیوں نہ ہوں، مگر ملت اسلامیہ کے لئے باعث ننگ و عار ہیں!

گرلز گائیڈ کا فتنہ ہو، رقص و سرود ہو، مرد و زن کا آزادانہ اختلاط اور مخلوط تعلیم ہو، یہ ملت اسلامیہ اور پاکستان کے جسم کے داغ اور ناسور
ہیں، ان کا جب تک ازالہ نہ ہوگا، پاکستان کی فضا ناپاک اور مسموم رہے گی —

جن بڑے لوگوں کو رقص و سرود اور عورتوں کی بے حجابی اور آزادروی میں کوئی عیب نظر نہیں آتا، وہ پاکستان کے مقصد وجود سے اور اس کی
تاریخ سے بے خبر ہیں، کاش! انہیں پاکستان، ملت اسلامیہ، اسلام اور ایمان کے تقاضوں کے سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب ہو!

ماہر القادری
۱۴، فروری سنہ ۶۳ء

ماہر القادری

احتساب اور جائزہ!

فارسی کی مشہور ضرب المثل ہے ——— خطائے بزرگاں گرفتن خطا است ——— مگر حق گوئی اور حق شناسی کی منزل میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے کہ بزرگوں کی "خطا" پر گرفت نہ کی جائے، تو احترام و عقیدت کا یہ غلو خود اپنی جگہ خطا بلکہ گناہ بن جاتا ہے! اُن "اخلاف" پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، جنھوں نے "اسلاف" کے جذبۂ احترام و عقیدت کے باوجود اُن کی غلطیوں پر احتساب کیا ہے! اگر حق شناسی اور حق گوئی کا یہ داعیہ عقیدت و احترام کے جذبات سے دبا رہتا، تو تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور تاریخ میں غلطیوں کے انبار لگ جاتے اور دینِ حق کی نہ جانے کتنی قدریں مسخ ہو کر رہ جاتیں! اُمت کے سامنے واضح مثال حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے اصحاب (شاگردوں) کی ہے جنھوں نے متعدد مسائل میں اپنے قابلِ فخر استاد اور مایہ ناز شیخ سے اختلاف کر کے، حق شناسی، حق فہمی اور حق گوئی کی شمعیں روشن کر دیں (رحمہم اللہ تعالیٰ)

تفاسیر میں کتنی روایات ہیں، جن کو "اسرائیلیات" کی علت کی بنا پر رد کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُن کے راوی تابعین تک پہنچتے ہیں ——— بعض تفاسیر ہی کی روایات کی بنا پر یہ بات کس قدر مشہور ہے کہ امراۃ العزیز (زلیخا) سے حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی ہوئی تھی، اور امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ تک لکھ دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے فرزند ——— منشی اور فرائیم ——— یہی امراۃ العزیز کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، اس روایت کی تردید قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے اس اصول:۔

الطیبات للطیبین ——— اور الخبیثات للخبیثین

سے ہوتی ہے کہ ایک ایسی عورت جس کی بدچلنی ظاہر ہو گئی ہو، وہ ایک نبی کے حرم میں نہیں پائی جا سکتی، مفسرین کی اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جن خاتون (آس ناتھ) سے شادی کی تھی، وہ شہر اون کے کاہن فوطی فرع کی بیٹی تھیں! چونکہ العزیز کا نام فوطی فار تھا اس لئے ان لفظوں کے مشتبہ الصوت ہونے کے سبب یہ بزرگ علماء اس التباس، اشتباہ اور غلط فہمی کا شکار ہو گئے، اس قسم کی کمزور اور افسانوی روایتوں کو لے کر مولانا جامی نے "یوسف و زلیخا" نظم کر ڈالی، اور اُس میں ایک پیغمبر کی "شب زفاف" کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہے، اللہ تعالیٰ جامی کی اس شاعرانہ لغزش کو معاف فرمائے

ہماری اس تنقید پر کوئی صاحب طنز فرمائیں کہ تم ——— تم حضرت مولانا نور الدین جامی قدس سرہٗ پر زبانِ تنقید دراز کرتے ہو! ایاز قدرِ خود بشناس، تمہاری علمی بے مائیگی کو مولانا جامی کی علمی عظمت سے بھلا کوئی نسبت بھی ہے ——— بیشک نہیں ہے مولانا جامی کے مقابلہ میں ہم ہر حیثیت سے فروتر بلکہ ذرۂ بےمقدار ہیں مگر مولانا جامی کی عظمت و احترام سے کروڑ مرتبہ زائد ہمیں نبی کی عصمت، عظمت اور احترام عزیز ہے! مولانا جامی کتنے ہی بڑے آدمی سہی مگر نبی سے اُن کا کیا مقابلہ! ہماری جہالت اور بے علمی اور مولانا جامی کے علم و فضیلت کے باوجود ہماری گرفت درست اور قرینِ صواب ہے۔

جس طرح تفاسیر میں

کمزور اور افسانوی قسم کی روایات کو "اسرائیلیات" کہہ کے رد کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اُن کے راوی تابعین تک پہنچتے ہیں، اور ایسا کرنے سے

راویوں کی تنقیص نہیں ہوتی کہ حق شخصیتوں سے بلند ہے، اسی طرح تصوف کے بعض مسائل، نکات اور نظریات اور رموز واشارات کی یہ حیثیت نہیں کہ اگر رد کر دیا جائے، تو اس پر جو کوئی "ارباب تصوف سے رزم آرائی" کی طنز کرتا ہے، وہ لوگوں کو ایک غلط تاثر دینا چاہتا ہے۔ اہل مزاج و فکر کے حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم اس طرح اسلاف کی عقیدت و احترام کے تقاضوں کا حق ادا کر رہے ہیں حالانکہ یہ وہ غلو عقیدت ہے، جو دینی نقطۂ نگاہ سے مذموم ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں ———— ماہ نومبر ۱۹۵۹ء کے "فاران" میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ) مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تصنیف "آفتاب نبوت" (جلد اول) پر ہم نے تنقید کی تھی! اس کتاب کے دو اقتباسات جو قابلِ اعتراض تھے، فاران میں درج کئے گئے تھے :————

(۱) "چنانچہ بہ تصریح قرآن جبرئیل علیہ السلام نے ایک کامل الخلقہ اور بالفاظ قرآن بشرِ سوی کی صورت میں نمایاں ہو کر مریمؑ پاک کے گریبان میں پھونک ماری، جس سے وہ حاملہ ہوئیں، تو اُس وقت جبرئیلؑ صورتِ محمدیؐ میں تھے (جیسا کہ روح المعانی میں اس کے بارے میں بعض آثار و روایات منقول ہیں) اور ہر صورت اپنے مناسب ہی حقیقت کا تقاضا کرتی ہے، اس لئے یہ صورتِ محمدیؐ، کمالاتِ محمدیؐ ہی کی نوعیت کی متقاضی تھی، اگرچہ وہ اُس وقت جبرئیل کا چولا بنی ہوئی تھی اور انھوں نے گویا اس صورت میں حقیقتِ محمدیؐ ہی کی نوعیت کو لے کر مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری، جس سے مسیح علیہ السلام کا ماں کے پیٹ میں وجود ہوا جس کے یہ معنی ہوتے، کہ گویا مسیح علیہ السلام کی حقیقت میں بواسطہ شبیہہ محمدیؐ خود حقیقتِ محمدیہ کی نوعیت شامل تھی۔"

اور

(۲) ———— "بلکہ آپ کا اصل امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نورِ نبوت میں سب انبیاء کے مُربی اُن کے انوار کمال کی اصل ہیں، اس لئے اصل میں نبی آپ ہیں اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل سے نہیں بلکہ آپ کے فیض سے نبی ہوئے ہیں - - - "

"فاران" میں ان اقتباسات پر جو تنقید کی گئی تھی اُسے پڑھ کر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے راقم الحروف کے نام ایک خط ارسال فرمایا، جسے پورے کا پورا جنوری ۱۹۶۰ء کے "فاران" میں درج کر کے، ہم نے اس ضمن میں ضروری باتیں عرض کرنے کی جرأت کی! جو حضرات "فاران" پڑھتے رہتے ہیں، اُن کی نظر سے یہ مباحث یقیناً گزرے ہوں گے، ان کا اعادہ کیا جائے، تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا، مختصراً عرض ہے کہ حضرت قاری صاحب موصوف نے اپنے نوازش نامہ میں اپنے مافی الضمیر اور مفہوم کی وضاحت فرمائی مگر ساتھ ہی اقتباس ۲ کے بارے میں لکھا :-

"- - - - آپ کی مخلصانہ تنبیہ سے متاثر ہو کر مناسب معلوم ہوا کہ اصل عبارت سے یہ تفریعی جملے حذف کر دیئے جائیں تاکہ لفظ "اصل" اور لفظ "مربی" کی مراد صاف ہو جائے، ذیل کی عبارت (جو آپ نے آفتاب نبوت سے فاران میں نقل فرمائی ہے) حذف کردہ جملوں پر خط کھینچ دیا گیا ہے - - - "

"فاران" میں قاری صاحب موصوف کے اس "اعترافِ حق" کو سراہا گیا! اگر ہم قاری صاحب کی علمی عظمت کے پیشِ نظر، اُن کی تحریر کے اس اقتباس پر گرفت نہ کرتے، تو اُن کی یہ تحریر پڑھنے والوں کو کتنی غلط فہمیوں میں مُبتلا کر دیتی' اور اُن کے کتنے عقیدت مند اُن کے اس تسامح کو تصوف کی کوئی رمز اور حقیقتِ محمدیہ کی کوئی دقیق اشارت سمجھ کر حق سمجھ لیتے!

پہلے اقتباس (حضرت مریم علیہا السّلام کے "نفخ" کے متعلق قاری صاحب موصوف نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا:-

"- - - - - - - - یہ مضمون لطائف کے درجہ کی چیز ہے' جو علم الاعتبار سے تعلق رکھتا ہے، اسے کسی منصوص یا مُستنبط مضمون کے لئے بطورِ تائید لایا جاسکتا ہے، نہ بطورِ دلیل کے! اور اسی حد تک وہ پیش بھی کیا گیا ہے —— !

ضروری نہیں ہے اسے قبول ہی کیا جائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے اکابر مفسرین کو ہدفِ تہمت نہ بنایا جائے کہ ان کا سرا باطنیت کے ملاحدہ سے جوڑ دیا جائے ہاں! اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کے مضامین کا عوام کے سامنے آنا، مفید نہیں تو یہ مشورہ صحیح ہوگا، مگر یہ کوتاہی مصنف "آفتابِ نبوت" کی ہوگی نہ کہ صاحبِ رُوح المعانی یا شیخ عبد الغنی نابلسی کی' اور اگر عوام کو یہ مشورہ دیا جائے کہ فلاں بات گو اپنے دائرہ علم میں صحیح ہے مگر تم اس میں غور نہ کرو' وہ تمہارے لئے نہیں خواص کے لئے ہے' تو پھر اس میں مُصنف آفتاب نبوت کی بھی کوتاہی نہ رہے گی۔"

جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب قبلہ کی اس تحریر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے رُوح المعانی کے حوالہ سے جو یہ بات لکھدی تھی کہ

"- - - - انھوں (جبریلؑ) نے گویا اس صورت میں حقیقتِ محمدیؐ ہی کی نوعیت کو لے کر' مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری' جس سے مسیح علیہ السلام کا ماں کے پیٹ میں وجود ہوا۔"

اس کو "علمی لطیفہ" سمجھا' جو اس قول کی کمزوری کی خود اُن کے نزدیک بیّن دلیل ہے' اور دین میں "لطائف" کا اعتبار نہیں ہے' جب کسی مسئلہ پر نزاع ہو تو کتاب و سنّت سے اُس کے لئے دلیل لانی چاہیئے!

یہ نکتہ دینی اعتبار سے حد درجہ محلِ نظر اور بہت سے مفاسد کا دروازہ کھولنے والا ہے کہ فلاں بات عوام کے لئے اور فلاں بات خواص کے لئے ہے! اس طرح بہت سے مشائخ کے شطحیات اور اُن کی غلطیاں ناپسندیدہ سمجھے جانے کے بجائے، پسندیدہ سمجھی جاتی ہیں! پھر قاری صاحب قبلہ نے "آفتابِ نبوت" کیا خواص کے لئے لکھی تھی؟ اگر خواص کے لئے لکھی تھی' تو اُس کی عام اشاعت کی کیا ضرورت تھی؟ وہ شیخ نابلسی ہوں یا صاحبِ رُوح المعانی یا اُن کے شارح اور مؤید قاری محمد طیب صاحب' حضرت عیسٰی علیہ السلام کے "وجود" میں آنے کے بارے میں جو عبارت آفتابِ نبوت میں نقل کی گئی ہے' وہ سو فیصدی غلط ہے! کتاب و سُنّت' آثارِ صحابہ' اور ائمہ فقہ و حدیث کے یہاں اس غلط بات کے لئے کوئی سند نہیں ملتی۔

قاری محمد طیب مدظلہ نے دار العلوم دیوبند کے دفتری خط کے کاغذ پر جواب ارسال فرمایا تھا، اس کاغذ (Letter head) پر یہ حدیث:—

"اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ"

درج تھی، جسے دفترِ دارالعلوم دیوبند کا "مونوگرام" بتایا گیا ہے! ہم نے "فاران" میں اس پر گرفت کی :-

"اہلِ بدعت کا یہ شعار ہے کہ وہ اپنے خطوں اور تحریروں کو اس قسم کے لفظی و معنوی ایہام سے مزین کرتے ہیں، مثلاً سلسلہ قادریہ کے بعض علما کے خطوں پر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی جگہ "ہوالقادر" اور سلسلہ چشتیہ کے منتسبین کے یہاں "ہوالمعین" اور دیوہ کے حاجی وارث علی شاہ کے معتقدین کے یہاں "ہوالوارث" لکھا ہوا، ہم نے دیکھا ہے! "قادر" "معین" اور "وارث" اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، اور ان کو خطوں کے سرناموں پر لکھا جانا، خیر و برکت کی دلیل ہے، مگر یہ لوگ اس "پردے" میں ان بزرگوں کے ناموں کی رعایت بھی ملحوظ رکھتے ہیں، جو حد درجہ قابلِ اعتراض بات ہے"۔

"چونکہ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اس لئے اس حدیث (أَنَا قَاسِمٌ) کے دفترِ دارالعلوم دیوبند کے سرنامے پر خاص طور سے درج ہونے سے، اسی قابلِ اعتراض ایہام کا پہلو نکلتا ہے! اللہ اور رسول کی ذات و صفات کے ساتھ لفظی رعایت ایہام اور سجع کے پیرایہ میں بھی، دوسروں کے ناموں کی "شرکت" دینی اعتبار سے سخت ناپسندیدہ فعل ہے! پھر وہ ادارہ جو "شرک و بدعت" کے رد و استیصال اور توحیدِ خالص اور سنّتِ رسول کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وجود میں آیا ہو، اس کے یہاں اس قسم کی بات اور زیادہ کھٹکتی ہے! ہم دارالعلوم دیوبند کے فاضل مہتمم اور دوسرے رجالِ کار سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کھٹک کو باقی نہ رہنے دیں گے کہ بے خبری کی اور بات ہے، مگر کسی فرد گزاشت کا علم ہونے کے بعد معاملہ کی نوعیت سنگین ہو جاتی ہے"۔

خدا کرے ہماری اس گزارش کے بعد دارالعلوم دیوبند کے "قرطاس مکتوب" (لیٹر پیڈ) سے یہ "مونوگرام" دور کر دیا گیا ہو!

عبرت خیز! اس واقعہ کے بعد ایک اور حادثہ بلکہ سانحہ پیش آیا، جو جس قدر افسوسناک ہے، اتنا ہی عبرت خیز ہے — ہوا یہ کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک دوسری تصنیف "اسلام اور مغربی تہذیب" سے چند اقتباسات لے کر، مولانا سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بھیج دیئے گئے، اور مندرجہ ذیل استفتار کو اس کے جواب کے ساتھ اخبار "دعوت" دہلی نے ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں من و عن چھاپ دیا :-

اقتباس نمبر ۱ "یہ دعویٰ تخیل یا وجدانِ محض کی حد سے گزر کر ایک شرعی دعوے کی حیثیت میں آجاتا ہے کہ مریم عذرا کے سامنے جس شبیہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھونک ماری وہ شبیہ محمدی ہی تھی"۔

اس ثابت شدہ دعویٰ سے بین طریق پر خود بخود کھل جاتا ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہ مبارک کے سامنے بمنزلہ زوجہ کے تھیں، جب کہ اس کے تصرف سے حاملہ ہوئیں"۔

اقتباس نمبر ۲ "پس حضرت مسیح کی ابنیت کے دعوے دار ایک حد تک ہم بھی ہیں مگر ابن اللہ مان کر نہیں ابن احمد کہہ کر، خواہ وہ ابنیت تمثالی ہی ہو"۔

اقتباس ۳ "حضورؐ تو بنی اسمٰعیل میں پیدا ہو کر کل انبیاء کے خاتم قرار پائے، اور عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں پیدا ہو کر اسرائیلی انبیاء کے خاتم کہے گئے، جس سے ختم نبوت کے منصب میں ایک گونہ مشابہت پیدا ہو گئی ——— آواز سرِ لابیہ"۔

اقتباس ۴ "بہر حال اگر خاتمیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کو حضورؐ سے کامل مناسبت دی گئی تھی تو اخلاق خاتمیت اور مقامِ خاتمیت میں بھی مخصوص مشابہت و مناسبت دی گئی، جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسوی کی بارگاہِ محمدی سے خلقاً و خلقاً رتبتاً و مقاماً ایسی ہی مناسبت ہے، جیسی کہ ایک چیز کے دو شریکوں میں یا باپ و بیٹوں میں ہونی چاہیئے"۔

"براہِ کرم مندرجہ بالا اقتباسات کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اس کی صحت و عدمِ صحت کو ظاہر کر کے بتائیں کہ ایسا "شرعی دعویٰ" کرنے والا، اہلِ سنت و الجماعت کے نزدیک کیسا ہے! ——— المستفتی

دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی مولانا سید مہدی حسن صاحب نے ان اقتباسات پر مندرجہ ذیل فتویٰ صادر فرمایا۔

"جو اقتباسات سوال میں نقل کئے ہیں، اس کا قائل قرآنِ عزیز کی آیات میں تحریف کر رہا ہے بلکہ در پردہ قرآنی آیات کی تکذیب اور ان کا انکار کر رہا ہے۔ بلکہ مفسرین نے تفاسیر میں تصریح کی وہ جبرئیل علیہ السلام تھے، جو مریم علیہا السلام کی طرف بھیجے گئے، وہ شبیہِ محمدی نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے کبھی یہ نہ سمجھا بلکہ "اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ کلمۃ اَلْقَاھَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ، فَاَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا (الیٰ قولہٖ تعالیٰ) قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا۔ قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا۔ قَالَ کَذٰلِکِ قَالَ رَبُّکِ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ۔ وَلِنَجْعَلَہٗ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَۃً مِّنَّا ——— (الیٰ آخر الآیات)

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔

کے قائل تھے، اور اس پر اجماعِ امت ہے کہ وہ فرشتہ تھا، جو حضرت مریم کو خوش خبری سنانے آیا تھا ——— شخص مذکور ملحد و بے دین ہے، عیسائیت و قادیانیت کی رُوح اس کے جسم میں سرایت کئے ہوئے ہو وہ اس ضمن میں عیسائیت کے عقیدے عیسیٰ ابن اللہ کو صحیح و ثابت کرنا چاہتا ہے ——— جس کی تردید علیٰ رؤس الاشہاد قرآن عزیز نے کی ہے، نیز لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ ابن مریم (الحدیث)

ببانگ دہل شخص مذکور کی تردید کرتی ہے ، الحاصل یہ اقتباسات قرآن و حدیث اور جملہ
مفسرین اور اجماع اُمت کے خلاف ہیں، مسلمانوں کو ہرگز اس طرف کان نہ لگانا چاہئے۔
بلکہ ایسے عقیدے والے کا بائیکاٹ کرنا چاہئیے ، جب تک توبہ نہ کرے —— واللہ تعالیٰ اعلم

ہفتہ وار "شہاب" (لاہور) نے اخبار "دعوت" (دہلی) سے یہ استفتاء جواب سمیت نقل کیا ، اس پر بعض علماء دیوبند برہم
گئے ! جو حضرات دین میں اس قسم کے "متصوفانہ لطائف" کو اہمیت دیتے ہیں ، اُنہیں سراہتے ہیں اور اس انداز کا مزاج و فکر رکھتے ہیں
ہیں اس فتوے کی اشاعت پر برہم ہونے کی بجائے ، ندامت و عبرت سے دوچار ہونا چاہئیے تھا۔ کاش ! اب بھی اُنہیں اپنے "لطائف نما
کار" پر غور کرنے کی توفیق نصیب ہو !

جناب کوثر نیازی مدیر "شہاب" بعض خیر خواہ اور ہمدرد دوستوں کے توجہ دلانے پر ، اکابر دیوبند سے معذرت خواہ ہوئے اور
معذرت اپنے ہفتہ روزہ اخبار میں چھاپ دی ، وہ لکھتے ہیں : ــ

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مضمون چھاپتے وقت ذہن کے کسی گوشے میں بھی دارالعلوم دیوبند یا حضرت
مہتمم مدظلہ کی توہین کا خیال نہ تھا اور نہ ہی اس کے مضمرات و نتائج تک نگاہ پہونچی ، مگر
اب بعض محترم اور خیر خواہ دوستوں کے توجہ دلانے پر محسوس ہوا ہے کہ اس طرح کی تحریریں نفس
دین کو ضعف پہونچانے کا باعث بنتی ہیں ، اس احساس کے بعد —— میں اس تحریر کی اشاعت
کے لئے اللہ رب العالمین کے حضور عفو طلب ہوں ، اور اکابر دیوبند سے بھی صدق دل کے ساتھ
معذرت خواہ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

ونکہ دین کو نقصان اس قسم کے "متصوفانہ لطائف" کی اشاعت سے اُن کی تائید سے اور اُن کی بیجا تاویلات سے پہونچا ہے ، اس انداز
ہ لطائف" جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کتاب و سُنّت میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا بلکہ ایسے "لطائف" کتاب و سنت کے مزاج اور دین کی
ط رت سے مغایر اور مختلف ہیں ، اُن کی اشاعت نے عقائد میں اس درجہ فساد پیدا کیا ہے کہ یہ خرابی مشرکانہ رسوم اور بدعات تک
پہونچ گئی ہے۔

جس شخص نے مفتی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں استفتاء بھیجا تھا ، اُس نے کسی قسم کی اخلاقی بے اعتدالی کا ارتکاب نہیں کیا
ں بیچارے پر یہ الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ اُس نے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے قاری محمد طیب صاحب کی عبارت کے اقتباسات
بھیج دیئے ہوں یا اپنی طرف سے کتر بیونت کی ہو !

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مُستفتی نے ایسا کیوں کیا ؟ جواب یہ ہے کہ ایسا ہوتا رہا ہے یا نہیں ؟ کتابوں کے اقتباسات مفتیان
رام کے پاس بھیجے جاتے ہیں کہ ان کے بارے میں دین و شریعت کیا کہتے ہیں ؟ دارالعلوم دیوبند کے فتووں کے مجموعوں میں ایسے فتاویٰ
موجود ہیں ، جو کتابوں کے اقتباسات پر دیئے گئے ہیں ! —— تو جس مُستفتی نے قاری محمد طیب صاحب کی کتاب کے اقتباسات
فتی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں ارسال کئے ہیں ، اُس نے دُنیا سے کوئی نرالا کام نہیں کیا ! صاحبانِ افتاء سے اسی وقت فتویٰ
ریافت کیا جاتا ہے ، جب کسی شخص کو کسی کی تحریر یا روایت و گفتگو میں کوئی بات کھٹکتی ہے ! اُن کی ذمہ داری مفتی پر عائد ہوتی
ہے کہ وہ فتویٰ طلب عبارت پہلے ہی طرح غور و خوض کر کے پوری ذمہ داری اور خدا خوفی کے ساتھ فتویٰ دے !
پھر یہ بھی نہیں ہے کہ قاری محمد طیب صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اور جس پر فتویٰ دیا گیا ہے ، اب مطلع ہونے کے بعد قاری

صاحب موصوف نے اس "علمی لطیفہ" سے اظہار برأت فرمایا ہو بلکہ وہ شیخ عبدالغنی نابلسی کے قول کی تاویل اور تصویب ہی کئے جا رہے ہیں اور جس عبارت اور اُس کی شرح و تفسیر پر دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم نے الحاد و بے دینی کا فتویٰ لگایا ہے اور اُسے عیسائیت و قادیانیت کی رُوح سے سرایت کرنے سے تعبیر فرمایا ہے اُس کی کمزوری بلکہ لغویت اب بھی قاری صاحب کو نظر نہیں آتی

ہم نے جب "فاران" میں قاری صاحب کی کتاب "آفتاب نبوت" پر تبصرہ کیا تھا، تو اُن کی اس عبارت کو درج کر کے محتاط الفاظ میں لکھا تھا:-

"صاحب رُوح المعانی کی یہ دماغی اُپج اس قابل نہ تھی کہ مولانا قاری طیب صاحب جیسے سنجیدہ اور متبحر عالم اس کا اثر قبول فرماتے، یہ نری شاعری اور افسانہ سازی ہے اور عجمی تصوف کا وہ تاریک ترین پہلو ہے جس نے "باطنیت" کو فروغ دیا ہے! دین کو اس قسم کی دُور از کار بحثوں اور عجیب و غریب نکتہ آفرینیوں سے نقصان ہی پہونچا ہے"

دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب کو دینی نقطۂ نگاہ سے اس تحریر میں اور زیادہ خرابی اور فساد نظر آیا جس کا اظہار انہوں نے اپنے فتوے میں فرمادیا! کیا لطیفہ اعجوبہ بلکہ عبرت انگیز مذاق ہے کہ ایک ہی مکتبہ فکر اور مدرسہ علم و خیال کے دو عالموں کے درمیان نقطۂ نگاہ کے تفاوت کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم کو جس تحریر میں الحاد و بے دینی نظر آتی ہے دوسرا عالم اس میں دینی اعتبار سے کوئی خرابی محسوس نہیں کرتا، وہ بر سبیل تنزل زیادہ سے زیادہ ——— بس اتنا اعتراف کرتا ہے:-

"تاہم پھر بھی یہ کوئی اصرار کے قابل بات نہیں اس کا رد و قبول میرے نزدیک دونوں برابر ہیں"

(پندرہ روزہ - میقات دیوبند - قاری محمد طیب صاحب کا وضاحتی بیان) فاعتبروا یا اولی الابصار

آہ! یہ تاویلات!؟

دیوبند سے پندرہ روزہ "میقات" شائع ہوتا ہے، قاری محمد طیب صاحب کے لائق فرزند مولانا سالم صاحب قاسمی اس کے نگران اعلیٰ اور رئیس التحریر (چیف ایڈیٹر) ہیں اس کے پہلے صفحہ پر قاری صاحب موصوف کا وضاحتی بیان ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"حضرت عیسیٰ علیہ السّلام بلا باپ کے محض مریم عذرا کے بطن سے پیدا ہوئے، وہ ابن اللہ نہ تھے، ابن مریم تھے ـ ـ ـ ـ"

اور

"ـ ـ ـ ـ حقیقی معنیٰ میں خاتم الانبیاء صرف حضورؐ کی ذات اقدس ہے، آپ زمانی خاتم بھی ہیں، منصب و مقام کے لحاظ سے بھی خاتم ہیں اور ذات کے لحاظ سے بھی خاتم ہیں۔"

مگر

مقام افسوس و حیرت ہے کہ اپنے ان عقائد کے اعلان و وضاحت کے بعد وہ پھر بھی اس "علمی لطیفہ" کی تاویل فرماتے ہیں اور اس سے برأت کا اعلان نہیں کرتے! قاری صاحب کا یہ موقف دینی اعتبار سے قطعاً غلط ہے اور اُن کی جس عبارت اور اُس کی توضیح پر مفتی دارالعلوم دیوبند نے "الحاد و بے دینی" کا فتویٰ لگایا ہے، ہم اُسے اس فساد سے تعبیر کرتے ہیں، جو ذہنوں کو گمراہی کی طرف لے جاسکتا ہے!

قاری صاحب فرماتے ہیں:۔

> "مسئلہ میں پیچیدگی یہ ظاہراً اس سے پیدا ہوئی کہ میں نے شیخ عبدالغنی نابلسی کے کلام کو (جو اہلِ سُنّت کے موقف سے کچھ ہٹا ہوا تھا) اس موقف سے قریب کرنے اور باہمی تطبیق دینے کی سعی کی تاکہ ان کا کلام مخالف اہلِ سنّت والجماعت نہ رہے۔۔۔۔"

اول تو یہی بات غلط ہے کہ شیخ عبدالغنی نابلسی کا کلام "اہلِ سُنّت کے موقف سے کچھ ہٹا ہوا ہے" —— کچھ نہیں سو فیصدی ہٹا ہوا ہے —— صرف اسی مسئلہ میں نہیں بلکہ دوسرے دینی مسائل میں سوچنے کا یہ انداز ہی سرے سے غلط ہے —— پھر شیخ عبدالغنی نابلسی پر کسی نے کیا اعتراض وارد کر دیا تھا، جس کی مدافعت کی آپ کو فکر لاحق ہوئی اور اس تطبیق و توضیح کو ایک فریضہ سمجھ کر آپ نے ادا کیا! —— شیخ نابلسی صاحب کے اس قول سے لوگ نابلد تھے، آپ نے اُسے اپنی کتاب میں نقل فرما کر اُجاگر کیا ہے، اور اُسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر منظرِ عام پر لائے ہیں —— آپ کے ذوق نے شیخ نابلسی کے اس کلام کو پسند اور گوارا کس طرح کر لیا!

تفاسیر ہوں، یا صوفیا کے ملفوظات ہوں، یا دوسری کتابیں ہوں، اُن میں بہت سی غلط باتیں لکھی ہوئی ہیں —— بعد کے آنے والے علما پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اُن غلط باتوں کو اپنی کتابوں میں دُہرائیں، اور اُن کی تطبیق و تاویل کی زحمت برداشت کریں! یہ تو وہی "بناء فاسد علی الفاسد" والی بات ہے جس کے سبب:۔

تا ثریا می رود دیوار کج

حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ اکابر سے جو غلطیاں ہو گئی ہیں، اُن کو ظاہر کر دیا جائے۔ تاکہ دوسرے لوگ اُن غلطیوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہیں! یا اگر پاسِ ادب مانع ہے اور کوئی عالم مفرطِ عقیدت کے سبب نقد و احتساب کی جُرأت نہیں کر سکتا، تو اس قسم کی فروگزاشتوں یا مُبہم و مُشتبہ اور ذو معنی باتوں کے اعادہ سے، اُس کو چاہیئے کہ گریز کرے! اہلِ علم دوسروں کی کہی ہوئی مُستند اور مفید باتیں نقل کرتے اور دہراتے ہیں! اور مشتبہ باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں!

ہم تطبیق و تاویل کی اہمیت اور اس کی ضرورت کے مُنکر نہیں ہیں، یقیناً بعض ایسی عبارتیں اور اقوال ہوتے ہیں، جن کی تطبیق و تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اس کے سبب ایک طرف تو اُن کا کہنے والا الزام و طعن سے بچ جاتا ہے اور دوسری طرف لوگوں کے ذہنوں کی اُلجھنیں دور ہو جاتی ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں جو "واقعہ قرطاس" پیش آیا ہے، اربابِ حدیث و سیر نے اُس کی تاویل فرما کر، بات کو صاف اور اہلِ ایمان کو مُطمئن کر دیا ہے! مگر شیخ عبدالغنی نابلسی نہ صحابی ہیں، نہ تابعی ہیں، نہ اُن کا قول ائمہ فقہ کے قول کا درجہ رکھتا ہے، پھر اُن کے قول کی غلطی صریحی طور پر نظر آتی ہے، تطبیق و تاویل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— کوئی عامی مسلمان ہو یا اوسط درجہ کی قابلیت رکھنے والا یا صاحبِ علم و فضل جس کسی کے سامنے بھی جناب نابلسی کے قول کو بیان کیا جائے گا، سننے والا شدید قسم کی وحشت اور اجنبیت اس میں محسوس کرے گا!

حیرت ہے کہ دین کے معاملہ میں ہم جیسے ابجد خوانوں کو اس قول کا سُقم نظر آ گیا، اور وہ جو "حکیم الاسلام" کہے جاتے ہیں اور جن کے علم و فضل اور وعظ و تقریر کا ہندوستان اور پاکستان میں ڈنکا بج رہا ہے! انہیں یہ قول اس قدر پسند آیا کہ بلا تکلف اپنی کتاب میں سند و حجت کے طور پر نقل کر دیا اور اب جب کہ اس کلام کی غلطی واضح کر دی گئی ہے تو بھی اس قول کی غلطی تسلیم نہیں کی جاتی۔

قاری صاحب کی جس کتاب (آفتابِ نبوت) پر "فاران" میں تبصرہ کیا گیا تھا، اُس میں جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے "خاتمیت"

کا کوئی ذکر نہیں تھا، ورنہ ہم اس پر ضرور نقد و احتساب کرتے، استفتاء میں چوتھے نمبر پر جو عبارت درج کی گئی ہے وہ قاری صاحب کی کتاب "اسلام اور مغربی تہذیب" کا ایک اقتباس ہے ــــــ جس کی وضاحت قاری صاحب نے اب یوں فرمائی ہے۔

"۔۔۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اسرائیلی سلسلہ کے پیغمبروں کا خاتم کہا گیا ہے، اس سے نہ تو حضور کے خاتم النبیین ہونے پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے، نہ وہ متوازی خاتم ثابت ہوتے ہیں!

حقیقی معنیٰ میں خاتم الانبیاء صرف حضورؐ کی ذاتِ اقدس ہے، آپ زمانی خاتم بھی ہیں، منصب و مقام کے لحاظ سے بھی خاتم ہیں، اور ذات کے لحاظ سے بھی خاتم ہیں اس لئے خاتم النبیین کے لفظ کا جب اطلاق کیا جائے گا، تو صرف آپ کی ہی ذات مُراد ہوگی، جیسا کہ میں نے اپنے رسالہ خاتم النبیین میں اس کو کافی مدلل اور بہترین طریقہ پر واضح کیا ہے! عیسیٰ علیہ السلام اگر اسرائیلی سلسلہ کے خاتم ہیں، تو وہ نہ اصطلاحی نبوت سے کہ ان پر خاتم النبیین کا اطلاق صحیح ہو، اور نہ اس سے حضورؐ کی ختمِ نبوت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے کہ دو متوازی خاتموں کا سوال کھڑا کیا جائے۔"

قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کا بیشک یہی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "خاتم الانبیاء" ہیں حضورؐ کے بعد نبوت کا منصب ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا، اور سرکار سے پہلے بھی کوئی "خاتم الانبیاء" نہیں گزرا، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر بعثت محمدی تک "خاتم الانبیاء" صرف حضورؐ ہی ہوئے ہیں!

مگر

قاری صاحب نے اپنی کتاب (اسلام اور مغربی تہذیب) میں جو عبارت لکھی ہے وہ بلاشبہ سخت محلِ اعتراض ہے اور مفہوم کے ادا کرنے میں بے احتیاطی اور بے اعتدالی کا برا نمونہ ہے! اور جب تک اس عبارت کے ساتھ قاری صاحب کی یہ "وضاحت" شامل نہ کی جائے، ان کی وہ عبارت شدید غلط فہمی کا سبب بن سکتی ہے! بلکہ ہماری تو یہ گزارش ہے اور اس گزارش پر ہم اصرار کرتے ہیں کہ اس کتاب کا جب بھی کوئی ایڈیشن شائع ہو، تو "خاتمیت" کی اس بحث والی پوری عبارت ہی کو حذف کر دیا جائے!

قاری محمد طیب صاحب کے جدِ گرامی قدر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" سمجھتے تھے مگر اُن کی تحریر کا ایک "اقتباس" قادیانی اپنے مسلک کی تائید میں بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا کرتے ہیں! حیرت ہے کہ اس واقعہ کے علم کے باوجود قاری صاحب نے ایسی بات لکھ دی اور اس قسم کا نکتہ پیدا فرما دیا کہ مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ دقیق و باریک "قول" جو قادیانیوں کی جانب سے اُن کے مسلکِ ضلالت کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے، اُس کی تائید کے لئے قادیانیوں کو ایک اور نکتہ ہاتھ آ گیا۔

جو حضرات اس قدر علم و فضل رکھتے ہیں، اور دین کی حکمت سے باخبر ہیں اُن کے قلم سے اس قسم کی باتیں آخر کس طرح نکل جاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب دوسرے انبیاء سے مقابلہ کرتے ہیں تو یہ تک لکھ جاتے ہیں، ـــ

"در اصل نبی آپ ہیں اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل سے نہیں بلکہ آپ کے فیض سے نبی ہوتے ہیں۔ ـــ"

اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف کرتے ہیں ـــ تو اُن کے قلم سے ایسے غیر محتاط جملے نکل جاتے ہیں۔ـــ

حضور بنی اسمٰعیل میں پیدا ہو کر کل انبیاء کے خاتم قرار دیا جائے، اور عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل
میں پیدا ہو کر اسرائیلی انبیاء کے خاتم کئے گئے، جس سے ختمِ نبوت کے منصب میں ایک گونہ
مشابہت پیدا ہو گئی، الولد سرٌّ لابیہ !

بہر حال اگر خاتمیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کو حضورؐ سے کامل مناسبت ہو گئی تھی
تو اخلاقِ خاتمیت اور مقامِ خاتمیت میں بھی مخصوص مشابہت و مناسبت دی گئی۔۔۔"

حضرت سیدنا علیہ السلام کے بارے میں یہ نکتہ پیدا کرنا ہی غلط ہے، بلکہ موجبِ فتنہ و فساد ہے کہ آپ بنی اسرائیل کے انبیاء کے خاتم تھے اور حضرت عیسٰیؑ کی اس "متوہم خاتمیت" کو اس قدر موکد کرنا کہ ختمِ نبوت کے منصب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یک گونہ مشابہت اور کامل مناسبت پیدا ہو گئی۔ کس قدر وحشت ناک نکتہ آفرینی ہے ——— "یک گونہ مشابہت کے بعد" "کامل مناسبت" کے تیور تو دیکھئے ——— ! "خاتم الانبیاء" کا لقب، خطاب اور منصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا، اور کسی نبی اور رسولؑ کے لئے کسی عنوان اور تقریب سے بھی استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ دین و دنیا کی پوری تاریخ میں خاتم الانبیاء صرف ایک ہی نبی اور انسانِ کامل ہوا ہے اور وہ ذاتِ گرامی محمدؐ عربی کی ہے (ہماری جانیں سرکار کی خاکِ پا پر قربان ہوں) ! اور "خاتمیت" کے وصف و منصب میں کوئی نبی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کی مشابہت اور مناسبت نہیں رکھتا، حضور اس وصف و منصب میں تمام انبیاء کرام سے منفرد اور ممتاز ہیں !

پھر قاری صاحب نے عربی کی مشہور ضرب المثل "الولد سرٌّ لابیہ" کا بالکل بے موقع اور غلط طور پر استعمال فرما کر اپنی تحریر کو اور زیادہ دلفگار بنا دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسٰی علیہ السلام میں آخر کون کس کا باپ تھا؟ اور کون کس کا بیٹا تھا! یہ اندازِ فکر آخر کیا ہے؟ اگر ان بے سر و پا باتوں کا نام "علمی لطائف" ہے، تو ایسے علمی لطائف سے ہزار بار اللہ کی پناہ (استغفر اللہ)

یہ سانحہ جو کچھ ہوا، سو ہوا، اس سے زیادہ شدید سانحہ یہ ہے کہ دار العلوم دیوبند کے علمائے قاری محمد طیب صاحب کی ان حد درجہ قابلِ اعتراض عبارتوں کی جن پر دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم مولانا سید مہدی حسن "الحاد و بے دینی" کا حکم لگا چکے ہیں، تصویب و توثیق اور تائید فرمائی ہے۔

اس فتوی پر مولانا سید مہدی حسن کے دستخط کہیں نظر نہیں آئے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دیئے ہوئے فتوے سے رجوع کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے! جہاں تک ہمارے محدود مطالعہ کا تعلق ہے افتاء کی تاریخ میں یہ پہلا سانحہ ظہور میں آیا ہے کہ علماء فقہاء اور مفتیان کرام نے کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ اور ائمہ فقہ کے اقوال کی سند کے بغیر مجرد شاعرانہ قسم کی تخیل و نکتہ سنجی سے لطائف و ظرائف کی تائید و توثیق فرمائی ہو۔

اس فتوے میں سب سے زیادہ جاندار بات جو بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا یہ اقتباس پیش کیا گیا ہے :-

"فعیسٰی علیہ السلام ھو خاتم انبیاء بنی اسرائیل وقد اقام فی ملاء بنی اسرائیل
مبشراً بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وھو احمد خاتم الانبیاء والمرسلین الذی
لا رسالۃ بعدہ ولا نبوۃ"

ہم عرض کرتے ہیں یہ فقہ کا کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے، جس کے لئے بہت زیادہ قوی سند درکار نہ ہو۔ یہ عقائد کا بنیادی مسئلہ ہے، جس کی

بنا پر جمہور اُمت نے قادیانیوں کو "کافر" قرار دیا ہے، لہٰذا حافظ ابن کثیر نے جو حضرت عیسٰی کو "خاتم انبیاء بنی اسرائیل" کہا ہے، یہ محض اُن کی اپنی نکتہ سنجی اور انشا پردازی ہے، جسے قبول نہیں کیا جا سکتا، پھر انھوں نے جس انداز میں اس عبارت کو ختم کیا ہے:-

"... کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی رسولوں اور نبیوں کے خاتم ہیں اور آپ کے بعد نہ کوئی رسالت ہے، نہ نبوت ہے"۔ (ترجمہ)

اس نے اُن کی کہی ہوئی بات کے اس خلجان کا ہاتھ کے ہاتھ ازالہ بھی کر دیا! قاری محمد طیب صاحب کی اصل تحریر کا یہ انداز نہیں ہے بلکہ اُس میں تو یہ کہا گیا ہے کہ "خاتمیت" میں عیسٰی علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یک گونہ مشابہت بلکہ کامل "مناسبت" رکھتے ہیں۔

اس نوبت پر کہا جا سکتا ہے کہ تم حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی بات کو نہیں مانتے ——— ہاں! نہیں مانتے اس لئے کہ ان کے قول (فعیسٰی علیہ السلام ہو خاتم انبیاء بنی اسرائیل) سے "ختم نبوت" کے مسلّم عقیدہ کے بارے میں کسی نہ کسی حیثیت سے خواہ نخواہ کا "اشتباہ" تو پیدا ہو سکتا ہے! علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنی تفسیر میں اپنے سے پہلے مفسرین کے بعض اقوال اور روایتوں کو قبول نہیں کیا اور انہیں رد کر دیا ہے! حق کا معیار کتاب و سنت ہے، کسی کا قول اگر کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو، یا کتاب و سنت کے کسی مسئلہ کو مشتبہ بناتا ہو تو اُسے بلا دریغ رد کر دینا چاہیے۔

"فاران" کے "توحید نمبر" میں علمِ غیب کے موضوع پر قاری محمد طیب صاحب کا نہایت ہی مدلل و بسیط مقالہ شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے ایک حدیث (فتجلیٰ لی کل شیٍٔ عرفت ۔ ۔ ۔ ۔) تک کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ وہ قرآن کے پیش کردہ مسلّمہ عقیدہ (قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ) کے خلاف پڑتی ہے، قاری صاحب فرماتے ہیں:-

"یہی "کل شیٔ" کا مبہم کلمہ ہے، جو علمِ غیب کلی کے لئے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے ——— لیکن اول تو قرآن حکیم کی اتنی صاف و صریح اور غیر مبہم تصریحات کے ہوتے ہوئے، جو پیش کی گئیں، ایک خبر واحد کے ایک مبہم جملہ کو اُن کے خلاف پیش کرنا، اور قطعیات کو ظنی کے تابع بنانا مطلب برآری کے سوا اور کس عنوان کا مستحق ہو سکتا ہے؟ دوسرے عقیدہ کے لئے نص قطعی کی ضرورت ہے، ظنی سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔"

جب قطعیات اور قرآن کے مسلمات کے مقابلہ میں حدیث کی روایت تک کو قبول نہیں کیا جاتا تو کسی مفسر کے قول یا کسی صوفی کی نکتہ کو نہ صرف یہ کہ قبول کرنا بلکہ اُس قول کی مضرت ظاہر ہونے پر اُس پر اصرار کرنا، اہلِ علم اور حق شناسوں کو زیب نہیں دیتا۔

غلطیہائے مضامین

دار العلوم دیوبند کے علماء نے قاری محمد طیب صاحب کی مدافعت، تائید و تصویب میں مولانا سید مہدی حسن صدر مفتی دار العلوم دیوبند کے فتوی کے جواب میں جو فتوی صادر فرمایا ہے، اُس کے "خاتمیت" والے جزو کی توجیہ و تاویل ہو سکتی ہے اور اس کے بارے میں کوئی سنگین شرعی حکم لگانے کی بجائے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مشتبہ اور التباس پیدا کرنے والی نکتہ سنجی اور غیر محتاط اندازِ بیان ہے۔

مگر

قاری محمد طیب کے ان اقوال کو کہ:-

"مریم عذرا کے سامنے جس شبیہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھونک ماری وہ شبیہ

محمدی تھی ــــــــ اس ثابت شدہ دعوے سے بیّن طریقہ پر خود بخود کھل جاتا ہے کہ
حضرت مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہ مبارکہ کے سامنے بمنزلہ زوجہ کے تھیں، جب کہ اس
تصرف سے حاملہ ہوئیں ــــــــ پس حضرت مسیح کی ابنیت کے دعویدار ایک حد تک
ہم بھی ہیں مگر ابن اللہ مان کر نہیں ابنِ احمد کہہ کر خواہ وہ ابنیت تمثالی ہو۔

مفتیانِ دیوبند نے جو عجیب و غریب تاویلیں فرمائی ہیں اور ان لغو بلکہ قرآن کی مخالف نکتہ سنجیوں کی جس شاعرانہ انداز میں تائید، توثیق اور تصویب کی ہے، اُس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کیا دیوبند کی علمی سطح اس قدر پست ہو گئی ہے!

اس گمراہ کن فتوے کے اگر ایک ایک جملہ کو لے کر ہم اس کی کمزوریاں اور فاحش غلطیاں ظاہر کریں، تو یہ گفتگو دراز ہو کر پوری ایک کتاب بن جائے گی! کتاب و سنت سے اور آثارِ صحابہ سے اور حدیث و فقہ کے ائمہ کے اقوال سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی! بس فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز میں، جو فقہ کا مزاج ہی نہیں ہے لطائف بیان کئے ہیں اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ دیوبند کے ان مفتیوں کو قاری صاحب کی عبارت میں کوئی "خلجان" تک نظر نہیں آیا، فرماتے ہیں:-

"۔۔۔۔ آخر امر یہ ہے کہ اقتباسات مذکورہ بے غبار ہیں، جن کے بارے میں کسی خلجان کا
کوئی موقع نہیں ہے"۔

اگر قاری محمد طیب صاحب کے یہ اقتباسات "بے غُبار" ہیں تو پھر دُنیا میں آج تک کسی آدمی نے کوئی غلط بات ہی نہیں کہی!

یہ بات کہ ــــ حضرت مریم شبیہ محمدی کے سامنے بہ منزلہ زوجہ کے تھیں، اور حضرت عیسیٰ ابن اللہ نہیں ابنِ احمد تھے، خواہ وہ ابنیت تمثالی ہو ــــ اگر شیخ عبد الغنی نابلسیؒ یا علامہ آلوسیؒ نے کہی ہے، تو اس پر حیرت ہے کہ قاری محمد طیب صاحب نے اس مخالف قرآن بات کو قبول کیسے کر لیا! نابلسیؒ چاہے شیخ الشیوخ ہوں یا قطب الاقطاب ہوں، اللہ اور رسولؐ کے مقابلہ میں بہرحال وہ فرد تر ہیں، اور کتاب و سنت کے مسلّمات کے مقابلہ میں اُن کی متصوفانہ نکتہ سنجی خار و خس کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتی! اس لغویت کی بھلا کوئی حد ہے کہ قرآن حضرت عیسیٰ سے "ابوت" کی نسبت کی نفی کر رہا ہے، اور شیخ نابلسیؒ قرآن کے مقابلہ میں "تمثالی ابوت" کا طلسم کھڑا کر رہے ہیں ــــــــ اس فتوے کا ایک اقتباس:-

"معلوم نہیں اس اقتباس پر سائل کو کیوں خلجان پیش آیا جب کہ خود اقتباس کی عبارت
میں کھلے لفظوں میں "ابنِ احمد تمثالی" لکھا ہوا ہے، ہاں! اگر معاذ اللہ "ابن احمد نسبی"
لکھا ہوتا، تو بلاشبہ ہر خلجان کا موقعہ تھا، لیکن ظاہر ہے کہ ابنِ احمد تمثالی اور احمد نسبی میں
زمین آسمان کا فرق ہے ۔۔۔۔۔"

دیوبند کے اس فتوے میں یہ بات اس قدر غلط اور لغو کہی گئی ہے کہ اس سے شاخ در شاخ گمراہیوں اور ضلالتوں کے دروازے کھلتے ہیں، اور بدعقیدوں، قادیانیوں یہاں تک کہ مُشرکوں اور بُت پرستوں تک کو اپنے مسلک کی تائید کے نکتے ہاتھ آتے ہیں!

قادیانی یہی تو کہتے ہیں کہ ہم مرزا غلام احمد کو "بروزی" اور ظلّی (یعنی تمثالی) نبی مانتے ہیں ــــ تو پھر اُن پر کفر کے فتوے کیوں عائد کئے جاتے ہیں! اس فتوے کی بنا پر تو جو شخص جس کو چاہے "اللہ" کہہ سکتا ہے، اور اعتراض وارد ہونے پر اپنے قول کی یہ توجیہ کر سکتا ہے کہ میں نے "حقیقی اللہ" نہیں "تمثالی اللہ" کہا ہے اور حقیقت و تمثال میں زمین آسمان کا فرق ہے!

شریعت کی نہ سہی طریقت و تصوف کی ہی کونسی ضرورت پیش آگئی تھی کہ حضرت عیسیٰؑ کو "ابن احمد تمثالی" بنا دیا گیا۔

قرآن کریم میں واضح طور پر کسی تشابہ کے بغیر محکم انداز میں فرمایا گیا ہے:۔

"فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا"

(پھر ہم نے اُس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا)

اور

"فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا"

اس کے صاف سیدھے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتہ پوری مردانہ ہیئت کے ساتھ عین مین انسانی صورت میں ظاہر ہوا، اس "تمثّل" اور "بشراً سویا" کو "شبیہ محمدیؐ" ثابت کرنا، کہنے والے کی نری دماغی اُپج ہے اور ایسا "علمی لطیفہ" ہے، جس کا قرآن کریم کی آیت میں کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم اس آیت کی تفسیر یوں فرماتے ہیں:۔

"یعنی حضرت جبریلؑ نوجوان خوب صورت مرد کی شکل میں پہونچے، جیسا فرشتوں کی عادت ہے کہ عموماً خوش منظر صورتوں میں متمثل ہوتے ہیں۔۔۔"

حضرت جبریل نے جب مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری ہے، فرض کیجئے کہ وہ اُس وقت صورت محمدی ہی میں تھے، مگر اس سے کیا یہ علمی نکتہ پیدا کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "ابن تمثالی" ہیں اور اُن کی ماں مریم حضورؐ کی تمثالی زوجہ یا بہ منزلہ زوجہ ہیں۔۔۔! اس اصول کی بنا پر تو تعویذ گنڈے اور علاج معالجے سے جن عورتوں کے اولاد ہوتی ہے وہ عورتیں، عالموں، طبیبوں، ڈاکٹروں اور ویدوں کی تمثالی بیویاں کہلائیں گی ـــــ اصل واقعہ سے قطع نظر، کیا ذوقِ سلیم اس "لطیفہ" کو قبول کر سکتا ہے، اور اس قسم کے "لطائف وظرائف" کیا اس قابل ہیں کہ انہیں دینی کتابوں میں نہ صرف نقل کیا جائے بلکہ اُن کے درست ماننے پر اصرار کیا جائے، اور اہل علم تک کو اس قسم کی واہی تباہی باتوں میں کسی قسم کا خلجان تک محسوس نہ ہو۔

یہ فتویٰ نہیں ایک "باب لطائف وظرائف" ہے بلکہ دین کے ساتھ مذاق اور تلاعب ہے، سیاہی کے دھبہ کو جو کوئی سیاہی سے دھونے کی کوشش کرے گا، وہ دھبہ اور زیادہ پھیل جائے گا۔ غلطی کی تاویل سے کچھ اور مزید غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس فتویٰ نے دیوبند کی باعظمت تاریخ کو داغدار بنا دیا ہے۔ کاش! ان مفتی صاحبان کو رجوع الی الحق کی توفیق نصیب ہو۔

"مسلمانوں نے رُوم ومدائن کے دھوئیں اُڑا دیئے۔"

لطائف؟ یہ ایک ادبی لطیفہ ہے، جسے فنی اصطلاح میں استعارہ کہتے ہیں مسلمانوں نے روم ومدائن فتح کرتے ہوئے نہ آگ جلائی تھی اور نہ کہیں دھواں اٹھا تھا، یہ ایک پیرایہ بیان ہے، جس سے فتح کی قوت، شدت اور اس کی کیفیت بیان کرنا مقصود ہے، اس جملہ کو سُن کر ذہن لطف لیتا اور اچھا اثر قبول کرتا ہے۔

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ می زد
صبا حکایتِ زلفِ تو درمیاں انداخت

حالانکہ نہ بنفشہ اپنی چوٹی گوندھ رہی تھی نہ بادِ صبا نے اُس کے سامنے زلفِ محبوب کی بات چھیڑی! بنفشہ اور صبا دونوں نطق و سماعت اور شعور سے محروم ہیں!

یہ شاعرانہ لطیفہ ہے اس پیرایہ میں زُلفِ محبوب کی دل کشی اور خوشنمائی کو پیش کیا گیا ہے کہ محبوب کی زلفوں کے مقابلہ میں

نقشہ بھی یہی ہے۔

یہ تو رہی شعر و ادب کی دنیا، دین و اخلاق میں "لطائف" کی یہ نوعیت ہوتی ہے، مثلاً کوئی یوں کہے:۔

"نماز پڑھنے سے میاں اور بیوی محبوب و محب بن جاتے ہیں"۔

حالانکہ بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس "لطیفہ" کی توجیہ و تاویل یہ ہے کہ نماز آدمی کو "فحش و منکر" سے روکتی ہے، میاں بیوی دونوں باعصمت رہیں گے، تو اُن کے تعلقات میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا ہوگی، کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو شوہر بد نظر بد چلن اور آوارہ ہوتے ہیں، بیویوں سے اُن کی کھٹ پٹ ہی رہتی ہے!

مشہور مصری سیرت نگار محمود العقاد نے حضرت سیدنا صدیق اکبر اور حضرت سیدنا عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) دونوں کے اندازِ فکر اور مزاج و طبیعت کو کس قدر باریک بینی کے ساتھ لطیف انداز میں بیان کیا ہے:۔

"حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پہلے محمدؐ تھے، پھر نبوت تھی اور حضرت عمرؓ کے سامنے پہلے نبوت تھی پھر محمدؐ تھے۔۔۔"

یہ ہے وہ "علمی لطیفہ" جس میں جتنا غور کیجئے، قلب کو انشراح ہوتا ہے! سُبحان اللہ!

مولانا روم قدس سرہ کی مثنوی کا ایک شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ فرشتوں نے جسدِ آدم میں نورِ حق کو دیکھ کر سجدہ کیا تھا یہ بھی ایک "علمی لطیفہ" ہے جو بادی النظر میں اچھا لگتا ہے مگر اس لطیفہ کو قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ قرآن سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ فرشتوں نے صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے اتباع میں آدم کو سجدہ کیا تھا!

دین و اخلاق کے "لطائف" کتاب و سنت کے مخالف نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان "لطائف" سے تو دین و اخلاق کی قدریں اور نکھر کر سامنے آتی ہیں! جس لطیفہ سے دین کے مُسلّمات اور نظریات کے بارے میں اشتباہ یا التباس پیدا ہو وہ لطیفہ ناقابلِ اعتنا ہے۔ اس کا بیان کرنا اور اُسے پھیلانا دینی نقطہ نگاہ سے پسندیدہ نہیں! اربابِ فکر کو لطائف اور خباثت میں فرق کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کا ایک گروہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو "نفس نبی" کہتا ہے تو یہ بھی ایک ایسا ہی لطیفہ ہے جسے جمہورِ امت نے قبول نہیں کیا۔ کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کے "نفس" میں شامل اور شریک نہیں ہوا کرتا، یہ بات دینی لحاظ سے اور طبیعیات، طب اور علم النفس کے اعتبار سے بھی دُرست نہیں ہے! کسی کے لئے یوں کہنا:۔

"وہ میرا جان و دل ہے"۔

اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ وہ آدمی کہنے والے کا سچ مچ "جان و دل" ہے، یہ تو محبت و مودت اخوت و دوستی، اخلاص اور اتحادِ قلبی کے اظہار کا ایک پیرایہ ہے۔

تصوف پر!

دین "کتاب و سنت" سے عبارت ہے، یہی وہ دو ستون ہیں جن پر دین کی عمارت قائم ہے! کتاب و سنت کی کوئی بات، اُس کی افادیت اور رمز چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اُس کا ماننا ضروری ہے، کتاب و سنت کی ہر بات عقل کے عین مطابق ہے، اگر کسی کی عقل اس کے سمجھنے میں اُلجھن محسوس کرتی ہے اور اُسکی تاویل و توجیہ سے قاصر ہے۔ تو یہ عقل کا قصور اور فہم کی کوتاہی ہے۔

دین میں کسی کے قول کو بھی کتاب و سنت کے برابر درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ہر کسی کے قول و عمل کو جانچنے کا معیار "کتاب و سنت" ہے! کتاب و سنت کی ہر بات بے چون و چرا اور بے دلیل تسلیم کی جاتی ہے کہ کتاب و سنت اپنی جگہ خود سب سے بڑی برہان و دلیل ہے

بلکہ قول فیصل ہے۔

اسلام کتاب و سنت سے عبارت ہے، اسلام کی خدمت یہی ہے کہ کتاب و سنت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے! پس ہر کسی کا قول و عمل، احوال، واردات، ملفوظات، علمی نکات و لطائف، وہی قبول کئے جائیں گے، جن کی مطابقت کتاب و سنت سے ہوتی ہو!

جن کو بزرگانِ دین اور سلفِ صالحین کہتے ہیں، اُن کی بزرگی اور عظمت اسی وجہ سے ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کی ہیں، وہ دین کے خیر خواہ، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اطاعت گذار تھے! مگر یہ حضرات اللہ اور رسول کی طرح ہمارے مطاع نہیں ہیں! جس طرح اللہ اور رسولؐ کے ہر حکم اور ہر قول کی اطاعت ہم پر لازم ہے، اور اس قول کی افادیت و ضرورت چاہے ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کی صحت پر یقین کرنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے ـــــ یہ معاملہ کسی بزرگ کے قول کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا، کتاب و سنت کے بعد آثارِ صحابہ اور اجماعِ صحابہ سے دین میں سند لی جاتی ہے، اس کے بعد کسی کا قول و عمل دین میں حجت اور سند نہیں بن سکتا! ائمہ فقہ کے اجتہادات کا دین میں بے شک ایک درجہ ہے مگر وہ کتاب و سنت کی طرح منصوص نہیں ہیں، اور نہ اُن کی حیثیت اجماعِ صحابہ کی برابر ہے۔

جمہورِ اُمت کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور بزرگ یہاں تک کہ صحابہ کرام بھی معصوم نہیں ہیں! ہاں! اجلّ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت اور معصوم کردار سے بڑی قربت اور مشابہت رکھتے ہیں۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

بزرگانِ دین سے ہم بھی عقیدت رکھتے ہیں اور اُن سے عقیدت رکھنی ہی چاہیئے مگر جو حضرات عقیدت میں غلو کرتے ہیں اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ جب یہ کہتے ہیں "بزرگانِ دین معصوم نہیں ہیں" - تو وہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں کہ یہ بات وہ رسمی یا قانونی طور پر تو نہیں کہہ رہے ہیں، اور حافظؔ کے اس شعر:-

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

کی معنویت کو تو انھوں نے عقیدت و محبت کے معاملہ میں اپنا اصول نہیں بنالیا ہے۔

ان گزارشوں کو ذہن میں رکھ کر اس بات کو سوچئے کہ دورِ رسالت اور صحابہ و تابعین کے عہد میں اہلِ ظاہر و اہلِ باطن اور اہلِ شریعت و اہلِ طریقت کی کوئی تقسیم نہیں ملتی! قرنِ اول میں دین ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا، یہی ظاہر تھا، یہی باطن بھی تھا! کسی صحابی کے بارے میں یہ روایت نہیں ملتی کہ اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر باطن کے کچھ اسرار و رموز بتائے تھے، حضرت حذیفۃ الیمانی کا لقب البتہ "صاحب السر" ضرور مشہور ہے وہ کسی "سرِ باطنی" کی بنا پر نہیں، بلکہ اس سبب سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منافقین کے ناموں سے مطلع فرمایا تھا ـــــ پھر کسی صحابی نے کسی تابعی کو کسی "سلسلہ طریقت" میں بیعت نہیں کیا! خلفاء راشدین اور دوسرے اجلّ صحابہ کے بیٹوں اور شاگردوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہمیں ہمارے محترم باپوں اور اُستادوں نے کسی خاص باطنی سلسلہ میں مرید کیا ہے! پیری مُریدی کا سلسلہ قرنِ اول میں نہیں تھا ـــــ نہ اُس دور میں "شجرے" پڑھے جاتے تھے، نہ طریقت کے خانوادے اور گدیاں تھیں، نہ قبروں پر چلہ کشی کی جاتی تھی اور نہ کوئی ایسا علم وجود میں آیا تھا، جس میں احوال و مقامات اور کشف و واردات کے رموز و اسرار ملتے ہوں

ریاضتیں اور مجاہدے کرتے تھے
اس دور کے مسلمان اور اکابر نہ لطائف غیبی کی جستجو میں رہتے تھے نہ تجلیات کے مشاہدے کے لئے
یہ دور فلسفیوں کی طرح ژولیدہ غور و فکر کا دور نہیں بلکہ سمع و طاعت کا دور تھا! کتاب و سنّت کی پوری پوری اطاعت! اور
یہی اطاعت اُن کا سب کچھ تھی ——— کشف بھی، کرامت بھی، حال و مقام بھی، روح بھی اور باطن بھی!
اس بحث و موضوع کی تفصیل میں جانے سے بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ خلاصہ گزارش یہ ہے کہ بعد میں جا کر مسلمانوں میں
ایک ایسا علم وجود میں آیا جو رمز و غموض اور اسرار باطن سے تعلق رکھتا ہے اور جسے ساری دُنیا "علم تصوف" کے نام سے جانتی
ہے ——— یہ علم منصوص تو ہے ہی نہیں، اس پر تو سب کا اتفاق ہے اگر منصوص ہوتا تو اس کا جاننا اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا
ہر مسلمان پر فرض ہوتا! یہ علم ماثور بھی نہیں ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال اور آثار میں یہ علم نہیں پایا جاتا ——— یہ علم
دین کا "مطلوب و مقصود" بھی نہیں ہے، اگر مطلوب و مقصود ہوتا، تو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن
حنبل، امام بخاری اور امام مسلم (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے دینی اکابر اس سے واقف ہوتے! اس علم کے نہ جاننے سے دین کا کوئی ضرر
بھی نہیں ہوتا! اگر اس سے بے خبری کے سبب دین میں نقصان کوتاہی اور نقص واقع ہوتا، تو اکابر مفسرین، محدثین اور ائمہ
فقہ کو اس کا عالم ہونا چاہئیے تھا کہ یہ بزرگ جو خیر و ثواب کی زیادہ سے زیادہ حرص رکھتے اور احسان و تزکیہ نفس کے تقاضوں کو
جانتے تھے اس علم کو نظر انداز کیسے کر سکتے تھے!
ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ بالکل سامنے کی بات ہے، اس کے لئے کسی منقول دلیل کی ضرورت نہیں، پھر بھی حضرت
مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کے ایک مکتوب کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے ـــ

"جس طرح آپ کی مجلس میں تصوف کا ذکر ہوتا رہتا ہے، اسی طرح فقہ کی کتابوں کا بھی ذکر
ہونا چاہئیے، اور اگر تصوف کی کتابیں نہ پڑھی جائیں، تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ
وہ احوال سے تعلق رکھتی ہیں اور قال میں نہیں آتیں، لیکن کتب فقہ کے نہ پڑھنے سے
ضرر کا احتمال ہے (مکتوب حضرت مجدد صاحب بنام نظام تھانیسری ـــ ترجمہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن)

حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کے بقول جس علم (تصوف) کی کتابیں نہ پڑھنے سے دین میں کوئی حرج بھی نہ واقع ہوتا ہو
اُس علم کو دین کا مغز سمجھنا اور اُس کے جاننے والوں کو دین متین کے علماء پر ترجیح دینا کہ یہ بیچارے تو محض "عالم" ہیں، عارف باللہ
اور حقائق شناس تو یہ ارباب تصوف ہیں ——— اس خیال، عقیدہ اور تصور میں کس قدر مبالغہ پایا جاتا ہے، اور دینی
نقطۂ نگاہ سے یہ بات کس قدر محل نظر ہے ——— مُسلمانوں کو، ملّت کو اور دین کو جو فائدہ امام ابوحنیفہ، عبداللہ ابن مبارک، امام
مالک اور امام بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ کی علمی جد و جہد اور دینی فکر سے پہونچا ہے، کیا اُس کے پاسنگ برابر بھی فائدہ منصور حلاج کی ذکر الطواسین
شیخ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم اور اس فکر و مزاج کے دوسرے ارباب تصوف کے افکار اور ملفوظات سے پہونچا ہے؟ ایک
طرف دین و شریعت کی صاف و بے غبار تعلیم ہے۔ دوسری طرف طرح طرح کے شطحیات ہیں! وہاں "محکمات" کا انداز، یہاں "متشابہات"
کا رنگ!

دو شخص ہیں کہ ایک وہ جو وضو کے مسائل کتاب و سُنّت کے مطابق بتاتا ہے، اور دوسرا شخص اس پر غور کرتا ہے کہ کاتب
عین ذات ہے، یا عین صفات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں پہلے شخص کو جو ثواب ملے گا، اور اُس کی دینی کوشش سے مسلمانوں کو جتنا فائدہ پہونچے گا، دوسرے شخص کے غور وفکر سے نہیں پہونچ سکتا بلکہ فائدہ پہونچنا تو ایک طرف رہا اس طرز پر سوچنے سے بہت سے مزلّات کا خطرہ ہے!

ہاں! اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر کرتے رہنا چاہئیے تاکہ ایمان ویقین میں اور زیادہ ثبات پیدا ہو اور قلب وضمیر اس کا اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اور ہر صنعت حسن وخوبی، عدل وتوازن اور حق وراستی پر مبنی ہے اور ایک ذرہ بھی بیکار پیدا نہیں کیا گیا۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا!

علم تصوف کے بارے میں ہم نے چند بنیادی باتیں بیان کی ہیں، رہیں تصوف کی کتابیں تو اُن میں سب کا ایک ہی جیسا رنگ نہیں ہے، ہماری نظر سے کتنے ہی بزرگوں کے ایسے اقوال اور ملفوظات بھی گزرے ہیں جو ایمان افروز ہیں، جن کے مطالعہ سے شہرت یا حرص وعُجب اور نام ونمود کے سفلی داعیات پر تنبیہ ہوتا ہے، زخارف دُنیوی سے بے رغبتی اور خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے، فرائض دین کے بجالانے میں "احسان کے تقاضے" اُبھر کر سامنے آتے ہیں! ان میں بہت سے دقیق نکات بھی ہیں، جن میں غور کرنے سے قلب کو انشراح اور رُوح کو نشاط حاصل ہوتا ہے! یہ تو ہم اپنے بہت ہی محدود مطالعہ کی حد تک بات کہہ رہے ہیں، تصوف کی کتنی بہت سی کتابیں ہیں، جو ہماری نظر سے نہیں گزریں، اُن میں نہ جانے حکمت وبصیرت کے کتنے لعل وگہر درخشاں ہوں گے!

صوفیائے کرام کی دینی خدمات کا کون انکار کر سکتا ہے مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں تزکیۂ نفس احسان اور توحید کی کس یقین افروز انداز میں تشریح نظر آتی ہے، یہ قصور تو ان کے غالی معتقدین کا ہے کہ حضرت شیخ کو "معبود" بنادیا ہے، قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح، حضرت شیخ جیلانی بھی اپنے ایسے معتقدین سے اپنی بیزاری کا اظہار فرمائیں گے!

حضرت شیخ کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے بڑی کشش اور جاذبیت عطا فرمائی تھی، ہزاروں ملحدوں بے دینوں، رافضیوں اور خارجیوں کو آپ کے دستِ حق پرست پر توبہ وانابت کی توفیق نصیب ہوئی!

ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص اور جدوجہد کی بدولت جو اسلام پھیلا ہے، اُس کے اعتراف میں جو تامل کرتا ہے، وہ جاہل کورچشم اور بدنصیب ہے!

خانوادۂ چشت نے ہندوستان کے کفرزار میں ایمان واسلام کی شمعیں فروزاں کی ہیں ــــــ صوفیائے کرام میں ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جنھوں نے شاہانِ وقت کے روبرو کلمۂ حق بلند کیا ہے۔ اُن کے عتاب کی پروا نہیں کی کتنے بےنفس بزرگوں نے بادشاہوں اور امیروں کی دی ہوئی جاگیروں اور ہدیوں کو حقارت کے ساتھ ٹھکرادیا اور ان زخارف پر فقر وفاقہ کو ترجیح دی۔ قناعت، بے رغبتی، توکل علی اللہ، اکلِ حلال اور صدقِ مقال ان کا شعار اور شیوہ تھا، اور یہ مبارک نفوس شریعت کی پابندی کا بڑا اہتمام کرتے تھے (رحمہم اللہ تعالیٰ)

خدا کی لعنت ہو اُس شخص پر جو یہ خیال رکھتا ہو کہ مسلمانوں میں اہلِ تصوف کے نام سے کوئی ایسا گروہ وجود میں آگیا تھا جو دیدہ ودانستہ دین میں بگاڑ پیدا کرنا چاہتا تھا، اور جس کا مشن ہی دین میں فساد پیدا کرنا تھا (معاذ اللہ)

اس اعتراف کے بعد عرض ہے کہ تصوف شریعت کے تابع ہے، شریعت سے مافوق نہیں ہے! دوسرے علوم وفنون کی طرح تصوف کی تعلیمات اور اُس کے عالموں کے احوال کو بھی شریعت کی کسوٹی پر جانچا اور کسا جائے گا، جو بات اس کسوٹی پر پوری نہیں اُترے گی، اُسے بلا دریغ رد کردیا جائے گا! بزرگوں کے احوال واقوال کی تاویل اور تطبیق کے بھی حدود ہیں، اور اُس کے بھی شرائط ہیں۔ مگر ــــــ "اس قسم کی تاویل وتطبیق کہ جس سے کتاب وسنّت کے حدود ٹوٹتے ہوں، دین کا نقصان ہے۔

اربابِ باطن کا کشف دین میں کوئی درجہ نہیں رکھتا، اور نہ اُن کے لطائف علمیہ دین میں سند ہیں! بلاشبہ مکاشفے

لطائف کے سلسلہ میں ایسی باتیں نظر آتی ہیں جن میں طرح طرح کے شطحیات، خطرات اور مفروضے پائی جاتی ہیں! اور صوفیا کے یہاں بعض ایسی ریاضتیں بھی ملتی ہیں، جن کا سنّت نبوی اور آثار صحابہ میں نشان نہیں ملتا! اب یہ "علوم لدنیہ" ——— سو اُس کی بھی شریعت سے مطابقت ضروری ہے ——— حضرت مجدد الف ثانی نے صاف طور پر بتایا ——— کہ علوم لدنیہ کی صحت و مقبولیت کی علامت صریح علوم شرعیہ کے ساتھ ان کی مطابقت ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے الحاد اور بے دینی ہے سنّت سے ہٹ کر جو ریاضتیں کی جاتی ہیں وہ صریحاً گمراہی ہے۔

حضرت مجدد صاحب نے یہ "نکیر" مفروضہ کے طور پر نہیں فرمائی، یقیناً علم لدنی کے دعویداروں اور اہلِ ریاضت کے یہاں انہیں بعض ایسے مفاسد نظر آئے جن پر مجدد صاحب کو تنقید کرنی پڑی! اسی قسم کے مفاسد، شطحیات اضطرابات اور خطرات کا جب ہم اظہار کرتے ہیں، تو ہم پر طنز کی جاتی ہے کہ تم ارباب تصوف سے رزم آرائی کر رہے ہو ——— حضرت مجدد صاحب جب یہ فرماتے ہیں کہ

"ما را نص درکار ست نہ کہ فص"۔

تو کیا وہ اس وقت صاحبِ فصوص الحکم شیخ ابن عربی سے رزم آرا ہوتے ہیں ——— علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو کیا ارباب تصوف سے خدا واسطہ کا بیر تھا! انھوں نے دین کی خیر خواہی کے لئے ہی اُن پر شدت کے ساتھ احتساب کیا ہے!

حقائق

تصوف اور ارباب تصوف پر نقد و احتساب جب کیا جاتا ہے، تو یہ طنز بھی سُننے میں آتی ہے کہ تم اس کوچہ سے نابلد ہو، تمہیں ان حقائق و رموز کے بارے میں بولنے کا کیا حق ہے۔

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی، بخدا تا نہ چشی

یہ طنز اپنے اندر جان اور وزن نہیں رکھتی! دلیل کا جواب دلیل سے دینا چاہیئے!

ایک بے علم بلکہ نرا جاہل جو فاسق و فاجر بھی ہے کسی عالم اور متقی کو الٹے ہاتھ سے پانی پیتے دیکھ کر، یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ یہ فعل سُنّت کے خلاف ہے، پانی سیدھے ہاتھ سے پینا چاہیئے"۔ ہو سکتا ہے کہ اُس عالم کے سیدھے ہاتھ میں کوئی زخم یا تکلیف ہو، اس کے اعتراض کے جواب میں اس توجیہ سے بات واضح ہو جاتی ہے، اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ معترض اُس عالم و زاہد کے مقابلہ میں چاہے، خاک کے ذرے سے بھی کمتر کیوں نہ ہو مگر اُس کا اعتراض حق ہے اور اُس عالم کا فعل خلافِ سُنّت ہے۔

اسی طرح نقد و احتساب کے باب میں یہ بھی کوئی اُصول نہیں ہے کہ ناقد اور محتسب کو اُس شخص سے جس پر نقد و احتساب کیا جا رہا ہے علم و فضل اور سیرت و اخلاق میں بڑھ کر یا تھوڑا بہت کمتر ہونا چاہیئے! اصل چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ "گرفت" صحیح کی گئی ہے یا غلط! ایک شخص چاہے شعر و شاعری کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو مگر غالب کے اس شعر: ؎

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے ——— وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

پر یہ گرفت کرے کہ مصرعہ اولیٰ میں ذم پایا جاتا ہے، تو اس کی یہ گرفت اس بنا پر باطل نہیں ٹھیرائی جا سکتی کہ وہ نہ عروض جانتا ہے اور نہ شعر و ادب میں درک رکھتا ہے ——— ہاں! اعتراض، گرفت اور نقد و احتساب نادرست ہو تو جاہل معترض تو جاہل ہے ہی، ایک عالم و فاضل بھی اس قسم کے غلط اعتراض پر اور پھر اُس کے اصرار کرنے کے سبب اُس اعتراض کی حد تک جاہل قرار دیا جائیگا

دیوبند ہی کے ایک بہت بڑے عالم اور شیخ وقت کی سوانح عمری "فاران" میں تبصرے کے لئے آئی، تو اُس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ایک طباق یا ٹوکری میں مٹھائی تھی اُس پر پچیس روپے رکھے تھے، یہ ہدیہ انھوں نے بیعت ہوتے وقت اپنے پیر و مرشد کو پیش کیا ہم نے اس پر لکھا:—

"کتاب و سُنّت سے اس کے لئے کیا کوئی دلیل ملتی ہے"۔

احتیاط و ادب کا تقاضا دیکھئے کہ ہم نے اس فعل کو غلط، ناجائز یا اسی قسم کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا، نہایت نرم انداز میں اشارہ کر دیا۔

اگر ہم یہ کہیں کہ فقہ میں ہم شُدبُد رکھتے ہیں، تو یہ بھی مبالغہ آمیز بات ہوگی مگر "فتاوی رشیدیہ" میں جب منی آرڈر کو سود لکھا گیا، تو ہم نے تنقید کی کہ یہ بات درست نہیں ہے اور علم فقہ سے ہماری بے خبری کے باوجود ہماری تنقید سو فیصدی درست ہے، کیونکہ ڈاک خانوں میں منی آرڈر پر جو کمیشن لیا جاتا ہے، وہ روپیہ بھیجنے کی اُجرت ہے۔ سُود نہیں ہے۔

تصوف کی کتابوں میں ایک باب "حسنِ مجاز" سے دلچسپی کا ملتا ہے، جس کی اس قول:۔

"المجاز قنطرۃ الحقیقت"

کی بنا پر تحسین کی جاتی ہے، اگر تحسین کا پہلو نہ ہوتا، تو ایسے واقعات بعض صوفیوں کے حالات میں کاہے کو نقل کئے جاتے ——— مثلاً مولانا فخر الدین عراقی کے بارے میں یہ روایت کی جاتی ہے:۔

"ایک دن مرچیوں کے بازار میں پھر رہے تھے کہ دفعتاً ایک قبول صورت لڑکے پر نظر پڑی بس دل دے بیٹھے ۔۔۔"

اسی طرح ایک بہت بڑے صوفی اور شیخ کے حالات میں لکھا ہے کہ انھوں نے حسن نامی قوال کو جو نہایت خوش گلو اور خوش شکل تھا اپنی بغل میں لے کر خوب بھینچا ——— جذب و سرمستی اور سرفروشی میں منصور کے بعد سرمد ہی کا نام لیا جاتا ہے، اس کا مشہور واقعہ ہے کہ ٹھٹھہ میں ابھے چند نامی ہندو لڑکے پر فریفتہ ہو گیا تھا ——— ایک اور صوفی کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ایک خوب صورت لڑکے کے منہ کو چوما اور لوگوں نے اعتراض کیا تو دہکتے ہوئے گرم لوہے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے، یہ دکھانے کے لئے کہ فقیر کے نزدیک دہکتا ہوا لوہا اور کسی انسان کے لب و رُخسار دونوں برابر ہیں ——— حیرت ہے کہ اس قسم کے رکیک واقعات سے بھی عقیدت مند تحسین و ستائش کے پہلو نکال لیتے ہیں!

ایسے شعراء جنھوں نے اپنی شاعری میں استعارے کے پردے کو بھی اُٹھا دیا ہے جو معشوقِ چاردہ سالہ کی تعریف کرتے ہیں، شراب کو "ام الخبائث" کہہ کر اُسے بوسہ رخسار سے زیادہ شیریں بتاتے ہیں، جن کی شاعری میں ہوسناکی اور رندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، جن کا عالم یہ ہے کہ کوئی نیک دل بادشاہ شراب پر پابندی لگا دیتا ہے، تو انہیں دُکھ ہوتا ہے اور اُس دکھ کو اپنے شعروں میں ظاہر کر کے شراب کی بندش پر مرثیہ لکھتے ہیں، اور دوسرا آزاد منش فرمانروا شراب پر لگی ہوئی اس پابندی کو اُٹھا دیتا ہے، تو شاعر صاحب خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے اور اس مسرت کو اپنے شعروں میں ظاہر فرماتے ہیں۔ شراب کی بندش پر مرثیہ اور شراب سے بندش ہٹ جانے پر قصیدہ ——— (استغفر اللہ) اس قسم کی رندانہ اور ہوسناک شاعری سے بعض صاحبانِ ارشاد و تصوف نے جو اونچے درجے کے عالمِ دین بھی ہیں معرفت کے حقائق و نکات منسوب کئے ہیں اور ایسے شعروں کی شرح فرمائی ہے! یا للعجب!

بزرگوں کے احوال و کرامات میں ——— تو اُن کا یہ رنگ ہے کہ ملک الموت انسانی لباس میں آ کر ایک بزرگ کے ہاتھ میں لفافہ دیتا ہے کہ اسے حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں پہونچا دیجئے۔ اس لفافہ کو پڑھتے ہی حضرت غوث العلمین سر کو سجدے میں رکھ دیتے ہیں اور رُوح پرواز کر جاتی ہے۔

اور

"شیخ محمد یوسف گردیزی قدس سرہ العزیز کو دارِ فانی سے پردہ کئے تقریباً ڈیڑھ سو برس
گزر چکے تھے، لیکن اب تک اُن کی یہ کرامت برابر کار فرما تھی کہ جو شخص مزار پُر انوار پر جاکر
سلام عرض کرتا حضرت اپنا ہاتھ باہر نکال دیتے۔" (تذکرہ حضرت صدر الدین عارف ملتانی)

اس عبارت میں "پردہ کرنا" خاص طور سے قابل غور ہے! گویا کہ بزرگوں کو موت نہیں آتی، بس وہ دُنیا والوں کی نگاہ سے پردہ فرما لیتے ہیں "حیات النبی" کے مسئلہ میں جو شدت پیدا کی گئی ہے اور جس انداز میں اُس کی شرح کی جاتی ہے، اُس کا لازمی یہی نتیجہ نکلنا چاہیئے تھا کہ بزرگانِ دین سے موت کی نسبت کرتے ہوئے، طبیعتوں میں جھجک پیدا ہوا

تصوف کی بعض کتابوں اور تذکروں میں یہ بھی ملتا ہے کہ جب کوئی بزرگ مقام ملکوت میں داخل ہوتا ہے، تو اُس سے بشری صفات دور ہو جاتی ہیں —— یقین کے درجہ اور معرفت کے کسی مقام پر پہنچ کر "تکلیفات شرعی کا اسقاط" (شرعی پابندیوں کا باقی نہ رہنا) یہ بھی بعض صُوفیوں کے ذہن کی پیداوار ہے۔

منصور حلاج نہ کوئی فقیہ تھا نہ محدث تھا، نہ مفسر قرآن تھا، نہ حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت بشر حافی (رحمہما اللہ تعالیٰ) کی طرح اُس کے زہد و ورع کی شہرت تھی، اُس کے جو اشعار ملتے ہیں، اُن میں مشرکانہ تخیل کا امتزاج ملتا ہے، اُس کے مُریدوں اور معتقدوں کا یہ عقیدہ تھا کہ منصور کے جسد میں اللہ تعالیٰ حلول کر گیا ہے (توبہ —— توبہ! معاذ اللہ) اس کردار اور ذوق و مزاج کے آدمی کا نعرۂ انا الحق —— تردید کا مستحق تھا، یا تحسین و ستائش کا سزاوار تھا! غیرتِ توحید اس نعرے کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے مگر "منصور" تصوف کی دُنیا کا "ہیرو" بنا ہوا ہے، یہی وہ منصوری جذب و ذوق اور فکر "انا الحق" ہے، جو تصوف میں جہاں بھی کار فرما نظر آتی ہے، وہیں فساد پایا جاتا ہے! منصور اور اُس کے نعرۂ "انا الحق" کی تائید و تحسین تصوف کے دامن پر نہایت ہی بدنُما داغ ہے۔

یہی وہ ذوق اور غلو عقیدت ہے، جس نے ایسے لایعقل اور مسلوب الحواس لوگوں کو "سلطان المجاذیب" بنا دیا ہے، جو بیچ بازار میں رفع حاجت کیا کرتے تھے، اور تارکینِ صلوٰۃ تک سے نہ صرف یہ کہ ولایت بلکہ تصوف کی بعض شاخیں منسوب ہیں۔

وہ جو کسی نے کہا ہے —— تصوف برائے شعر گفتن خوب است —— تو کوئی شک نہیں تصوف نے شاعری کو دلکش انداز بیان اور علمی اصطلاحیں دی ہیں اور شعر و سخن کی محفل میں بڑی گرمی پیدا کر دی ہے —— مولانا روم فرماتے ہیں:-

یک دست زلفِ ساقی و یک دست جام مے
رقص چنیں میانۂ میدانم آرزوست

اس شعر میں کتنا کیف پایا جاتا ہے مگر یہ کیف "مجاز" کے سبب ہے، جب اس سے "حقائق" منسوب کئے جائیں گے، لُطف جاتا رہے گا!

بہت دور کے فاصلہ کو ذرا سی دیر میں طے کرنا، یہ "کرامت" ہے، جسے تصوف کی اصطلاح میں "طے ارض" کہتے ہیں اس اصطلاح سے شاعر نے "طے لسان" بنا لیا کہتا ہے

عشق را طے لسان الیست کہ صد سالہ سخن
دوست را دوست بہ یک چشم زدن میگوید

یعنی عشق کو بغیر لسان کی کرامت حاصل ہے ، اس لئے جو بات صد ہا برس میں بیان ہونی چاہئیے ، دوست دوسرے دوست سے اس بات کو پلک جھپکانے میں کہہ دیتا ہے ۔

تصوف آمیز شاعری کا یہ لطف اور سوز وگداز اپنی جگہ مُسلّم ـــــ مگر دینی نقطۂ نگاہ سے تصوف زدہ شاعری میں کتنے شدید اضطرابات اور طلجانات پائے جاتے ہیں ـــــ کفر کو ایمان پر ، زنار کو تسبیح پر ، بت خانہ کو کعبہ پر ، رند کو شیخ پر اتنی کھلی ہوئی ترجیح کہ شریعت کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے ۔

کافر عشقم مُسلمانی مرا در کار نیست
در حیرتم کہ دُشمنِ کفر و دیں چرا است　　　از یک چراغ ، کعبہ و بت خانہ روشن است

ـــ اور سُنئیے ـــ

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن　　　ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

مردم آزاری کوئی شک نہیں بہت بڑا گناہ ہے مگر اس گناہ پر انتباہ کے تیور کتنے سخت اور مکروہ ہیں !

ما پرتوِ نورِ بادشاہ ازلیم　　　فرزند نہ ایم آدم و حوا را

(ہم بادشاہ ازل کے نور کے سایہ ہیں ، آدم و حوا کے فرزند نہیں ہیں)

حالانکہ ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اُس کے بندے ہیں اور ہمارے نسب کا سلسلہ آدم و حوا سے ملتا ہے جس کے کتاب و سنت شاہد ہیں !

اسلام کا کلمہ ہے ۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی دوسرا الٰہ (یعنی معبود) نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں ! اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی شے سرے سے ہے ہی نہیں یہ کلمہ موجودات کی نفی نہیں بلکہ اثبات کرتا ہے کیونکہ حضرت سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ [illegible] اللہ ہیں اور موجودات میں شامل ہیں ـــــ مگر صوفیوں کا قول (کلمہ) یہ ہے :۔

لا موجود اِلا اللّٰہ !

یہ خیال صوفی شاعروں کے شعروں میں طرح طرح کے روپ دھارتا ہے ـــ

این وحدت است لیک بہ تکرار آمدہ

خود کوزہ و کوزہ گر و خود گِل کوزہ

عشق و اوصاف کردگار یکے است　　　عاشق و عشق و حُسن یا ریکے است

اور یہ لطائف و ظرائف آخر اس گمراہی تک پہونچ جاتے ہیں کہ " جو شخص انا الحق نہیں کہتا وہ کافر ہے " :۔

ہر کہ از وے نزد انا الحق سر　　　او بود از جماعتِ کفار

تصوف کی کتنی بہت سی کتابیں ہیں جن میں " وحدت الوجود " کے نکات اسی شاعرانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں ! اور اس طرح یہ " لطائف " شطحیات و مزلّات میں شاخ در شاخ ہوتے چلے گئے ہیں !

یہی وہ صوفیانہ فکر ہے ، جو نعت و منقبت میں غلو کرتی ہے ، نعتِ نبی میں ایک صوفی شاعر کی غزل کا مطلع ہے ۔

انبیاء کی شان میں اسی غلو نے یہودیوں اور عیسائیوں کو شرک و بدعات میں مبتلا کر دیا، اور حضور نے خود اپنی شان میں غلو سے منع فرمایا تھا۔

اپنے پیروں، مرشدوں اور شیوخ کے مناقب میں صوفی شعراء نے کتنی خطرناک مبالغہ آمیزیاں کی ہیں، فرماتے ہیں ـــ

چوں بگردش نمی رسد جبریل　　چہ عجب گر نماندش بز میں
دیدہ باید کہ جاں تواند دید　　ورنہ او در ہمہ جہاں پیداست

یہ ـــــ ورنہ او در ہمہ جہاں پیداست ـــــ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے!

دیوبند ہی کے ایک بڑے شیخ اور عالم کی وفات پر، وہاں کے ایک معروف و مشہور عالم اور صاحب سلسلہ شیخ کے مرثیہ کے دو تین شعر محلِّ اعتراض ہیں، خاص طور سے یہ مصرعہ:۔

اُٹھا دنیا سے جیسے بانیٔ اسلام کا ثانی　(معاذ اللہ)

اہل بدعت قرآنِ کریم کی اس آیت:۔

قُلْ یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ

میں "ی" کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"(اے نبی) تم کہو اے میرے بندو (یعنی محمد رسول اللہ کے بندو)

ہم بہت دن تک یہی سمجھتے رہے کہ قرآن پاک کے معنی کے ساتھ یہ عجیب سلوک اہلِ بدعت نے کیا ہے، مگر مولانا حمید الدین فراہی کی ایک کتاب میں جب ہم نے پڑھا کہ یہ نکتہ "مولانا رُوم نے اپنی مثنوی میں بیان فرمایا ہے" تو ہماری حیرت کی کوئی حد و انتہا نہ رہی۔ تصوف کا یہ خاصہ ہے کہ محتاط سے محتاط اہلِ علم اور صاحبانِ زہد و تقویٰ کو اس قسم کی غیر ضروری بلکہ خطرناک و اضطراب انگیز نکتہ سنجیوں میں مبتلا کر دیتا ہے ـــــ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے امام اور مجدد ہیں، مگر جب تصوف کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، تو کتنے بدلے بدلے نظر آتے ہیں، اور حیرت ہوتی ہے کہ شرک و بدعت کے خلاف جہاد کرنے والا، یہ رنگ بھی اختیار کر سکتا ہے۔

ہندوستان میں طریقت کے جو مشہور سلاسل اور خانوادے ہیں، اُن میں نقشبندی سلسلہ کے یہاں شریعت کی سب سے زیادہ پابندی ملتی ہے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں یہ تکرار اس پر زور دیا ہے کہ تصوف شریعت کے تابع ہے، اور کسی بزرگ کا کشف و الہام دین میں حجت نہیں ہے ـــــ مگر حضرت مجدد صاحب "عالم دین" ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ تصوف بھی ہیں، اس لئے اُن کے سلسلہ میں جو "تصورِ شیخ" کی مشق کی جاتی ہے، اُس کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے کہ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں کیا اس کے لئے کوئی نمونہ، اشارہ اور ایماء ملتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے جو اسماء مقدسہ ہیں اُن میں صمد اور قیوم ایسے نام ہیں جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے پر استعارہ اور مجازاً کسی انداز میں بھی نہیں ہو سکتا، قیومیت صرف ذاتِ باری کی صفتِ خاص ہے کہ اُس کی ذات تمام کائنات کو کسی واسطہ اور سہارے کے بغیر تھامے ہوئے ہے، اور خود اُس کی ذات بھی آپ ہی آپ قائم ہے ـــــ مگر حیرت ہوتی ہے کہ مجددیہ سلسلہ میں "قیوم اول" اور "قیوم ثانی" نام کے عہدے اور منصب پائے جاتے ہیں! جس کسی نے بھی یہ عہدہ اور لقب تراشا ہے بے حد غلط کیا ہے!

میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی تصوف کی مشہور کتاب "التکشف" پر مفصل تنقید ہو چکی ہے جو باتیں ہمیں کھٹکیں اُن کا اظہار کر دیا گیا ـــــــ اُس کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ گنگوہ میں کوئی بزرگ تھے جن کا نام "صادق" تھا، اُن کے پاس جو کوئی مُرید ہونے کے لئے آتا وہ اس کی عقیدت کی پختگی کا امتحان لینے کے لئے اُس کو: ـــ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ صادق رسول اللہ !

پڑھنے کا حکم دیتے ـ ـ ـ ـ ـ ـ اُن بزرگ کا یہ فعل کتنا ہی ابہام اور سوء معنویت لئے ہوتے ہو پھر بھی نکیر کا مستحق ہے، مگر حضرت مولانا تھانوی نے نکیر کی بجائے، اس واقعہ کو تحسین کے انداز میں پیش فرمایا ہے ـــــــ "حکیم الامت" بھی کیا کہتے "تصوف" کا یہی مزاج ہے ؟!!!

کسی صوفی کا قول ہے، بلکہ یوں کہئے تصوف کا خاص مسئلہ ہے:ـــ

ترکِ دُنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولا، ترکِ ترک

"ترکِ دُنیا" کی تو یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اس لئے یہاں "ترکِ دُنیا" سے مراد دُنیا کی غیر ضروری لذتوں اور خواہشوں کا ترک مُراد ہے ـــــــ مگر یہ "ترکِ عقبیٰ" ـــــــ ؟؟

آخرت اور عقبیٰ کے بہتری کے لئے کتاب و سُنّت میں دُعائیں آئی ہیں، آخرت کی بہتری اور جنت کی نعمتوں کی طمع کرکے عبادت کرنا دین میں پسندیدہ اور مطلوب چیز ہے، جنّت الفردوس محلِ رضائے الٰہی ہے، اس لئے اُس کی تمنا کرنی ہی چاہیے وہ جو غالب نے کہا ہے ـ

طاعت میں تار ہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

فرض کیجیے عبادت کے "اخلاص خالص" کے تحت اس کی کوئی تاویل ہو سکتی ہے مگر "ترکِ مولا" یہ کیا رمز ہے، اگر "مولا" سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے، تو اس رمز کے تصور سے ایمان لرز اُٹھتا ہے ـــــ استغفر اللہ! ـــــ اب رہا ـــ "ترک ترک" یہ تصوف کے وہ لطائف و ظرائف اور نکتے ہیں، جن کا کوئی وجود، مصداق اور معہود ذہنی نہیں پایا جاتا ـ

مولانا جامیؒ فرماتے ہیں: ـــ

"فنا کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کے باطن پر خدا کی ہستی کے ظہور کا غلبہ ہوتا ہے، تو سوائے خدا کے کسی شے کا علم و شعور باقی نہ رہے ـــــ اور "فناء الفنا" ـــــ یہ ہے کہ اس بے شعوری کا بھی شعور نہ رہے (اُردو ترجمہ ـــــ لوائح)

عبارت پڑھتے میں جھُوم جھُوم جاتیے کہ ترکِ "ماسوا" اور "فنائیت" کی کتنی دقیق تعلیم دی گئی ہے! دینی اعتبار سے بھی اس عبارت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، مگر یہ کیفیت چند لمحوں کے لئے تو ممکن ہے کہ طاری ہو جائے ـــــــ لیکن پُوری عملی زندگی میں اس تعلیم کا "مصداق" نہیں ملتا، اس "عنقا" کو آخر کہاں تلاش کیا جائے !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اور صحابہ کرامؓ کی مُبارک زندگیاں ہمارے سامنے ہیں، ان میں کمال درجہ کی خدا شناسی، خدا دانی اور خدا آگاہی کے ساتھ ساتھ دوسری اشیاء کا شعور و علم بھی ملتا ہے ـــــــ مثلاً وہ وضو طاہر ہونے کے لئے کرتے تھے، تو اپنے جسم کا شعور، پھر طہارت کا علم، اُس کے بعد جس پانی سے وضو کیا جاتا ہے، اُس کا جاننا، کہاں یہ تمام اشیا

علماء کے اقتباسات اور پھر ان کا علم و شعور "خدا کے ماسوا" نہیں ہے؟! تواریخ میں مولانا جامی نے "فنا الفنا" کی جو تعریف کی ہے، وہ بھی "تحریک شرک" کی طرح تصوف کا ایک لطیفہ ہے!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصوف ایران کی زروانیت، ہندوستان کے ویدانت اور یونان کے فلسفہ سے کسی نہ کسی درجہ میں ضرور متاثر ہوا ہے ——— اور اس میں ان حقائق و متشابہات پر غور کرنے کی زحمت برداشت کی گئی ہے، جن کے سمجھنے کی ذمہ داری اللہ اور رسول نے انسانوں پر نہیں ڈالی ——— مثلاً "حقیقت محمدی" کیا ہے؟ اس کے سمجھنے اور غور کرنے کا کتاب و سنت میں نہ تو کہیں حکم دیا گیا ہے، اور صحابہ کرام اور تابعین کے یہاں نہ یہ "عنوان" ملتا ہے! اس قسم کے عنوانات دین میں سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں!

"حقیقت محمدی" تو بہت بڑی شے ہے، گیہوں، جوار، باجرے کی حقیقت کا پتہ لگانا، دشوار بلکہ ناممکن ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ سب سے پہلے "کن" کے ساتھ گیہوں، جوار اور باجرے کے پودے پیدا ہوئے، یا دانے! کن سے پہلے یہ چیزیں کہاں موجود تھیں، کس طرح موجود تھیں، عین علم، جوہر، عرض ——— کس ہیئت اور کیفیت کے ساتھ ———! اس پر غور کرتے کرتے دل و دماغ اور ذہن و فکر جلنے لگیں گے، اور اس غور و فکر کے مقدمات کو جو کوئی بیان و تحریر میں لائے گا، تو اس کے ایسا کرنے سے افکار کی بھول بھلیاں اور خیالات کے پرخطر جنگل کاغذ پر ثبت ہو جائیں گے ——

"استواء علی العرش" ——— کی طرح تمام متشابہات کا یہی حال ہے کہ ——— الفاظ معلوم، کیفیت مجہول ہے، اس کیفیت اور حقیقت کی ٹوہ لگانے سے طرح طرح کے مزلات اور خطرات کا امکان ہے۔ اس کی زندہ مثال شیخ عبدالغنی نابلسی کا وہ قول ہے، جسے قاری محمد طیب صاحب نے اپنی کتاب میں نقل فرمایا اور پھر اس کی توجیہ کی! جس کے سبب ایک انتہائی ناخوشگوار صورت پیدا ہو گئی بلکہ یوں کہیے بیٹھے بٹھائے ایک فتنہ کھڑا ہو گیا۔

شیخ عبدالغنی نابلسی کے قول اور قاری صاحب کی توجیہ اور نکتہ سنجی کی طرح صوفیاء کرام کے نہ جانے کتنے ایسے اقتباسات ہیں، جن کو کہنے والوں کے ناموں کے بغیر صاحبانِ افتاء کے پاس بھیج دیا جائے، تو ان پر بڑے سخت قسم کے فتوے صادر ہوں! اس عقیدت کو اور شخصیتوں سے مرعوبیت کو کیا کہیے کہ اتنے اتنے بڑے عالموں کو "ارشادات و ملفوظات" کی اتنی کمزوریاں اور غلطیاں دکھائی نہیں دیتیں، بلکہ ایسا ذہول طاری ہو جاتا ہے کہ عیب حسن نظر آتا ہے ——

آخری گزارش

دیوبند نے ہندوستان اور پاکستان میں دین کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، ان کا جو اعتراف نہیں کرتا، وہ حق ناشناس ہے! دارالعلوم دیوبند کے چشمہ فیض سے افغانستان، ہرات و بخارا، افریقہ، انڈونیشیا، سیلون، برما اور دوسرے ملکوں کے تشنگانِ علم سیراب ہوئے ہیں، دیوبند کے اکابر ہماری دینی اور ملی تاریخ کی عظیم شخصیتیں ہیں! دیوبند نے انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا ہے ——

شرک و بدعت کے رد میں دیوبند نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے، اسی لئے ہم نے جگہ جگہ اپنی تحریروں میں دیوبند کو سراہا ہے اور اہل بدعت کے حملوں کے مقابلہ میں اس کی مدافعت کی ہے، اس کے سبب خود ہم پر "دیوبندیت اور وہابیت" کی طنز کی جاتی ہے ——

دیوبند کا علمی اور دینی فیض ایک بہتا ہوا چشمہ اور خیر جاریہ ہے، اس ایک چراغ سے لاکھوں چراغ روشن ہوئے ہیں —— ہمارے سامنے دیوبند کی جہاں یہ روشن تاریخ ہے وہاں! اس تصویر کا یہ رخ بھی ہے کہ "تصوف" کے ذوق اور اس سے شغف

کے سبب شیوخ دیوبند کے یہاں بعض ایسی غیر ضروری اور دقیق و پیچیدہ نکتہ سنجیاں بھی ملتی ہیں، جو خاصی کھٹک پیدا کرتی ہیں اور کہیں کہیں تو یہ فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ آواز دیوبند سے آ رہی ہے یا بریلی سے!

ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے پوری ذمہ داری اور خدا خوفی کے ساتھ عرض کیا ہے۔ کوئی مبالغہ نہیں، کسی کے مفہوم و عقیدہ کی غلط ترجمانی نہیں، کسی کے قول کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا، نقد و احتساب کیا ہے تو اُس میں ادب و شائستگی کو ملحوظ رکھا ہے، جو بات کہی ہے، عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ کہی ہے! اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے کہ وہ شخصیتیں اور بزرگ جو ہمارے مخدوم و محترم ہیں، اور جن کے احترام و عقیدت کے جذبات ہم اپنے اندر رکھتے ہیں، اُن کی کسی بات پر نقد و احتساب کرنا ایک ناخوشگوار فریضہ ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے دین کی خیر خواہی کے لئے یہ جرعہ تلخ بھی گوارا کرنا پڑتا ہے! فن حدیث میں راویوں پر جو نقد و جرح کی گئی ہے کہ فلاں راوی مدلّس ہے، فلاں راوی مائل با اعتزال ہے، فلاں راوی فلاں علت کے سبب زیادہ مستند اور لائق اعتماد نہیں ہے، تو اس سے مقصود نہ احادیث کے راویوں سے لوگوں کو بدگمان کرنا ہے، اور نہ فنِ حدیث کو اُمت کی نگاہ میں مشتبہ بنانا ہے۔ احادیث ہی کی حفاظت اور صحت کے لئے یہ فریضہ انجام دیا گیا ہے، حق شخصیتوں سے بلند ہے، جب کسی کی بات کتاب و سنّت کے کسی مسلّمہ اصول کو مجروح کر رہی ہو تو حق و دیانت کا یہ تقاضا ہے کہ اُس پر نکیر کی جائے! اللہ تعالیٰ کا دین لطیفوں اور کم مکرنیوں کا دین نہیں بلکہ دینِ "متین و مُبین" ہے، اس دین کا اپنا خاص مزاج اور لب و لہجہ ہے، اور یہی چیز دینی و اخلاقی مسائل کی شرح و تفسیر میں ملحوظ رہنی چاہیئے!

فساد کی نیت سے باطل کے لئے اہل باطل سے لڑنا بھی گناہ ہے، اور نیک نیتی کے ساتھ اللہ کے لئے اللہ والوں سے نزاع و تصادم کا موقعہ آجائے تو یہ معرکہ آرائی خیر و ثواب ہے! بزرگانِ دین سے عقیدت ہی رکھنی چاہیئے اُن سے بدظنی بدنیتوں اور مفسدوں کا شیوہ ہے، اُن کا جن کے دلوں میں کھوٹ ہوتی ہے ——— مگر اللہ اور رسولؐ کی عظمت اور دین کی بڑائی اس عقیدت پر غالب رہنی چاہیئے! حق جب مجروح اور مشتبہ ہوتا نظر آئے تو پھر اہل حق سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

تنقید تنقید میں بھی فرق ہے منکرین سُنّت راویانِ حدیث پر نقد و جرح اس لئے کرتے ہیں کہ لوگ سُنّتِ رسول اللہ سے بدظن ہوں، مگر ناقدین حدیث کی راویوں پر جرح اس غرض سے ہوتی ہے کہ احادیث کی صحت متعین اور منقح ہو!

تو جو لوگ

دین کی خیر خواہی چاہتے ہیں، انہیں بعض اوقات دین و اخلاق کے شارحین، مفسرین، اور سماتذوں پر نقد و جرح کی ضرورت پیش آجاتی ہے، اور اس سے اُن کی نیت اور مقصد دینی اقدار ہی کی حفاظت اور دینی مسائل کے تکدر اور غبار کو دور کرنا ہوتا ہے۔

اسی غرض اور مقصد کے لئے ہم نے یہ زحمت اٹھائی ہے، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمیں کہاں سے گالیاں ملیں گی اور کہاں سے دعائیں!

ابو محمد امام الدین رامنگری

حقائق وبصائر

ہم ذیل میں چند حقائق پیش کر رہے ہیں۔ عام مسلمان بھی ان کو سمجھیں اور علماء بھی ان پر غور فرمائیں۔ ہماری فکر و نظر میں کوئی غلطی ہو تو ہمیں اس سے مطلع کریں۔

(۱) ہمارے لئے بنیادی چیز اسلام ہے۔ یہی ہمارے فکر و فیصلہ کی اساس ہے اور اسلام کی بنیاد ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودات پر۔

(۲) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوں۔ ائمہ عظام رحمہم اللہ ہوں، علماء ہوں، سب کے لئے اصول و معیار اللہ و رسول کے ارشادات و فرمودات ہی ہیں۔

(۳) دین کا کوئی مسئلہ ہو یا انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی معاملہ ہو صحابہ کرام کسی کی شخصیت دیکھ کر اس کی بات نہیں مان لیتے تھے وہ جس کسی کی بات بھی مانتے تھے اللہ و رسول کی سند ہی کے ساتھ مانتے تھے افضل الامم خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کسی معاملے میں اللہ و رسول کا کوئی حکم نہ ملتا تو ایک ایک کو بلا کر دریافت کرتے کہ کسی کے علم میں اللہ کے رسول کا کوئی حکم ہو تو بتائے۔ کوئی شخص کوئی بات بیان کرتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کی صحت میں شک ہوتا تو وہ سختی سے اس سے سند کا مطالبہ کرتے۔ اگر ان کے کسی حکم پر اللہ و رسول کی سند کر کوئی خاتون بھی اعتراض کرتیں تو اسے قبول کر لیتے، مسائل میں صحابہ کرام کے درمیان اختلافات بھی تھے، لیکن سب کے فیصلے کی بنیاد اللہ و رسول ہی کے فرمودات تھے، اختلافات کا سبب ان کا اپنا اپنا علم و اجتہاد تھا۔

(۴) صحابہ کرام کے ذریعہ امت کو دین ملا۔ وہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ تھے۔ ان پر ہمارا اعتماد و احترام لازم ہے اور ہمیں اسکی ہدایت اللہ و رسول کی جانب سے ملی ہے، لیکن اس اعتماد و احترام کے ساتھ عملاً ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم تمام صحابہ کی باتیں مانیں ان کے اجتہاد و عمل کے اختلاف کی موجودگی میں سب کی باتوں پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں اسی لئے آئمہ کے درمیان اختلاف ہوا۔ اصول و معیار سب کا واحد تھا جسکے نزدیک اللہ و رسول کے احکام و ارشادات سے اقرب جس کی بات تھی۔ اس نے اسکی بات مانی یہی اصول و معیار علماء کا بھی ہے۔ ایسا کسی گروہ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ تمام صحابہ کی تمام باتیں ملنے۔ اور یہ صحابہ کے اعتماد و احترام کے منافی نہیں، کیونکہ اس صورت میں جو بات بھی مانی جاتی ہے وہ صحابہ کے واسطہ اور سند سے مانی جاتی ہے، ان کا تعلق منقطع نہیں ہوجاتا، یہی صورت ہے صحابہ کے اعتماد و احترام کی۔

(۵) اوپر جو حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ صحابہ کرام ؓ سے لیکر آج تک اسی اصول پر امت کا عمل ہے ان حقائق کی موجودگی میں کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ صحابہ میں جو جنگیں ہوئیں ان کے متعلق ان اصول و حقائق کو نظر انداز کرکے رائے قائم کرے امت کے لئے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ جو واقعات عہد بعہد ہوتے ہوئے اس کے سامنے آگئے ہیں ان کے متعلق وہ غور و بحث ہی نہ کرے، یہ فطرت کے خلاف ہو۔ اور ماضی کے تجربات مستقبل کے لئے درس عبرت کا باعث ہوتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق صحیح و غلط کا فیصلہ کرکے ان نقصانات سے حال و استقبال میں امت بچنے کی کوشش نہ کرے جو ماضی میں پہنچ چکے ہیں۔

(۶) صحابہ کے اندر ایسا اختلاف جس کے سبب حرب و ضرب تک نوبت پہنچ گئی۔ حضرت علی ؓ اور ام المومنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ہوا جو جلد ہی ختم بھی ہوگیا۔ اگر ایسا اختلاف اتنا ہی ہوتا تو اس کا امت پر چنداں اثر نہ پڑتا۔ اس ناگوار حادثے کا خاتمہ خوشگواری سے

مانع ہو گیا جس خلافت نے اسلامی نظامِ حکومت کا رُخ صحیح سمت سے غلط سمت میں موڑ دیا۔ وہ حضرت علی رض سے حضرت معاویہ کا اختلاف ہے بلمت کا
یہ بات پر اتفاق ہے کہ اسلام کی اجتماعیت و سیاست کا اصول و معیار خلافت راشدہ ہے جسے لسان رسالت نے خلافت علی منہاج النبوۃ
کے شرف سے مشرف فرمایا ہے، یہ اصول و معیار اٹل اور ناقابل تغیر ہے، اگر اس اصول و معیار سیاست و حکومت کو چھوڑ دیا جائے تو خلافت و قیصریت
کا اصولی فرق باقی نہیں رہ سکتا۔ حضرت معاویہؓ نے یہی کیا۔ خلافت راشدہ قیصریت و پرویزی میں تبدیل ہو گئی۔ حضرت معاویہؓ کی صحابیت کا
احترام کیا جائے گا۔ لیکن یہ احترام اس طرح نہیں کیا جا سکتا کہ خلافت راشدہ کے اصول و منہاج کو نظر انداز کر دیا جائے اور حضرت معاویہؓ نے جس طرز کی
حکومت قائم کی اس پر خلافت راشدہ کے اصول و منہاج کو قربان کر کے یہ عقیدہ بنا لیا جائے کہ وہ اسلام کی معیاری حکومت تھی۔ اس طرح تو
اسلامی سیاست و خلافت کا وہ اصول و منہاج ہی مٹ جائے گا جس کو لیکر اسلام آیا ہے اور جو دنیا کے لئے روشنی کا منارہ ہے۔ امت مسلمہ
کا مستقبل ہی تاریک ہو جائے گا۔ یہی روشنی تو ہر دور اور ہر عہد میں اس کی منزل کی نشان دہی کرتی رہی ہے۔ حضرت امام حسین اور حضرت
امام عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اسی شمع کے پروانے بن کر اٹھے اور اس پر قربان ہو کر درس پروانگی دے گئے۔ حضرت سید احمدؒ اور حضرت
مولانا اسمٰعیلؒ اور ان کے رفقا اسی شمع کے پروانے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی اصول و منہاج کے مجدد تھے۔ یہ کوئی قابلِ
بحث نقطۂ نظر نہیں، اس پر امت کا اتفاق ہے جن بزرگوں نے صحابہ کرامؓ کے باہمی نزاعات کو زیر بحث لانے سے منع فرمایا ہے انکا فیصلہ
بھی یہی ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف میں حق حضرت علی کے ساتھ تھا۔ اور اس فیصلے کے بعد اصل صحابہ کرامؓ کے نزاعات
سے بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔ پھر بھی اس طے شدہ مسئلے کے خلاف فتنہ پسند لوگ طبع آزمائی اور خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں۔

(۷) امت کے اس اجماع کے خلاف آج کل ایک نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے کوئی محقق بن کر اور کوئی محقق کا مؤید اور حامی بن کر داد علم و
تحقیق دے رہا ہے۔ حضرت علی رض کی خلافت کو جسے امت خلافت راشدہ مانتی ہے۔ خلافت جابرہ، حضرت علی کو سبائیوں کا آلۂ کار، سیاست سے
ناآشنا، خودرائے، ڈکٹیٹر اور ان کے طرز عمل کو اسلام کے خلاف قرار دے رہا ہے اور حضرت معاویہؓ کی بغاوت کو حق و صواب ٹھہرا رہا ہے
اور اس کے ساتھ یزید کی ولی عہدی کو جواز روئے واقعات قیصریت و ملوکیت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی حضرت معاویہ کی صحابیت کو آڑ بنا کر
جائز و حق ثابت کر رہا ہے۔ اس فریب کارانہ اور گمراہانہ طرز استدلال سے کتنے علماء اور صحافی غلط مبحث میں اور کتنے عوام حضرت علیؓ کے
متعلق بدعقیدگی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ حقائق سے صرف نظر کر کے کتنے لوگ اخباروں میں مضامین اور مراسلے لکھتے رہتے ہیں اور صحافی
انہیں شائع کرتے رہتے ہیں۔

(۸) اس طرح بہکے ہوئے علماء اور عوام ایک طرف تو خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کے خلاف حضرت معاویہؓ کی بغاوت کو حق قرار دے رہے ہیں
اور دوسری طرف فاسق و فاجر اور ملک عضوض یزید کے خلاف حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو خلاف شریعت ٹھہرا رہے ہیں۔ حالانکہ دونوں
بغاوتوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ حضرت معاویہؓ کی بغاوت سے خلافت راشدہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ملوکیت آگئی جس کو خلافت
سے بدلنا ہی چاہیے۔ اور حضرت امام حسین کا اقدام ملوکیت کی جگہ خلافت راشدہ کا قیام تھا۔

کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن کے مقصد کے مطابق ان کا حکم ہوتا ہے۔ جنگ اگر ناحق کے لئے ہو تو نامحمود ہے اور حق کے لئے تو محمود ہے
دونوں حالتوں میں جنگ کا حکم ایک نہیں ہے۔ اسی طرح خلافت حقہ کے خلاف بغاوت ہو تو وہ ناجائز ہوگی اور خلافت حقہ کے قیام کیلئے
ہو تو اسے جائز قرار دیا جائے گا۔

یزید کی حمایت اور حضرت امام حسینؓ کی مخالفت میں وہ حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جن میں بدلے ہوئے حاکم کی عدم اطاعت کی ممانعت
آئی ہے۔ تاوقتیکہ اس کا ظلم و فساد حد کفر تک نہ پہنچ جائے۔ حدیثیں صحیح ہیں اور یہ ہدایت مبنی بر مصلحت ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے

کہ اسلام کا نصب العین کیا ہے اور اس کی سیاست و حکومت کا اصول و منہاج کیا ہے یہ اوپر بتایا جا چکا ہے پھر کیا اس قسم کی حدیثیں اسلام کے اصول و منہاج سیاست و حکومت کی ناسخ ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام کا مزاج تو ایک فرد کے فسق و فجور اور ظلم و عدوان کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ وہ فاسق و فاجر اور ظالم و جابر حکومت کو برداشت کرے جو پوری اجتماعیت کو تباہ کر ڈالتی ہے اور خدا کی زمین کو فسق و فجور اور ظلم و جبر سے گراں بار بنا دیتی ہے۔ ایسی حدیثیں ایک خاص پہلو سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ خاص پہلو یہ ہے کہ ایک برا نظم سہی جو قائم ہو اس کے خلاف ایسا اقدام جائز نہیں جو کسی ٹھوس اور بلند مقصد کا حامل نہ ہو اور جس کا نتیجہ مزید ظلم و فساد اور شر و طغیان ہو۔ لیکن ایک صاحب کردار صالح اور خدا ترس مسلمان اپنی بصیرت کی حد تک یقین کر لیتا ہے کہ وہ ایک فاسق و فاجر اور ظالم و جابر حکومت کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک صالح و عادل خلافت قائم کر دے گا تو خواہ نتیجۃً وہ ناکام ہی کیوں نہ ہو اس کا اقدام اسلام کے اصول و معیار سیاست و حکومت کے تحت آئے گا اور اس کا حکم دوسرا ہوگا۔ حضرت امام حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا اقدام اسلام کے سیاسی نصب العین اور منہاج کے عین مطابق تھا۔

(۹) ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ جب اقامت دین کے علمبردار کسی پرچے میں ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جو حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کے خلاف حضرت معاویہؓ اور یزید کی تائید و حمایت میں ہوتی ہیں، اس بارے میں اخبار "ایشیا" اور اس کے محترم مدیر جناب نصر اللہ خاں صاحب کا طرز عمل کیسا ہے اسے ہم ایک بار قارئین "فاران" کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں۔ کہ حضرت علی رضؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت امام حسینؓ اور یزید نیز یزید کی ولی عہدی کے معاملے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا مسلک اور نقطۂ نظر کیا ہے۔ اس کے بعد بھی "ایشیا" میں ہمارے خلاف مراسلات شائع ہوتے رہے، اور اس نقطۂ نظر اور مسلک کے خلاف ہم پر اعتراضات ہوتے رہے جو مولانا مودودی کا ہے۔ اس لئے ہم نے تنگ آکر جناب مدیر "ایشیا" کو ایک مراسلہ لکھا کہ "ایشیا" کے مراسلہ نگار ہمارے خلاف مراسلے لکھتے ہیں جو معناً مولانا مودودی کے خلاف ہوتے ہیں۔ پھر وہ کھل کر براہ راست مولانا پر تنقید کیوں نہیں کرتے۔ یہ لکھنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ جناب مدیر ایشیا اپنے طرز عمل پر متنبہ ہوں۔ لیکن اس کے برعکس جناب مدیر نے ہمارے مراسلے کے نیچے ایک نوٹ لکھا جس کے ایک ہی فقرے میں ہمیں ایک تنبیہ بھی فرمائی اور ایک دعویٰ بھی کیا۔ ارشاد یہ ہوا کہ مولانا مودودی کو اس بحث میں نہ گھسیٹو۔ ہم مولانا کے مسلک کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ مولانا کا مسلک کیا ہے یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے جو جناب مدیر ایشیا ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ مولانا برسوں سے سوالوں کے جواب میں بار بار ترجمان القرآن میں اپنا مسلک بیان کر چکے ہیں۔ ایشیا میں مولانا کی تقریریں شائع ہو چکی ہیں، تجلی کے خلافت نمبر میں محمود احمد عباسی مولانا کے مسلک کی مخالفت کر چکے ہیں۔ پھر مولانا کا وہ پوشیدہ مسلک کونسا ہے جو مدیر ایشیا ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہمارے مسلک کے خلاف اگر ایشیا میں مراسلے شائع ہوتے ہیں تو در پردہ مدیر ایشیا مولانا کو بحث میں الجھاتے ہیں یا ہم مولانا کو بحث میں گھسیٹتے ہیں؟ جناب مدیر ایشیا نے ہم پر یہ بھی الزام بھی لگایا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کے بارے میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ ہمارا اس سے زیادہ قصور اور کیا ہے کہ جو مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں وہی عباسی صاحب اور جناب مدیر تجلی کے جواب میں ہم بھی لکھتے ہیں۔ کیا جناب مدیر ایشیا کے نزدیک حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں ہیں۔ حضرت معاویہؓ اور یزید ہی دوست اور عزیز سب کچھ ہیں؟ اور اسی لئے جناب مدیر ایشیا نے عباسی صاحب اور مدیر تجلی کے خلاف ہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کے بارے میں حد اعتدال سے بڑھ گئے ہیں! جناب مدیر ایشیا نے ہم پر یہ الزام مدیر تجلی کا اس مضمون کے بعد لگایا ہے جس کے متعلق سید عین الحق صاحب کا خط مدیر تجلی کے نام "فاران" میں شائع ہوا ہے۔ جناب مدیر ایشیا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ امام الدین کے سینے پر عباسی کا بھوت بن کر سوار ہو گیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جناب مدیر ایشیا کے سر پر عباسی صاحب اس طرح سوار ہوئے تو امام الدین کے سینے پر عباسی صاحب کا بھوت بن کر کیونکر سوار ہوا۔ ہم چاہتے ہیں کہ عباسی اور مدیر تجلی کے حامیوں کے ساتھ مدیر ایشیا بھی ہمارے بیان کردہ حقائق پر غور فرمائیں کہ وہ اقامت دین کے نقیب ہیں

طالب جمیل

حمد

مقامِ ہستی سے لامکاں تک کرشمے تیرے کمال کے ہیں
کہیں نظارے جلال کے ہیں کہیں اجالے جمال کے ہیں

فروغِ انجم، جمالِ لالہ، نمودِ شبنم، خمارِ نرگس
اگر ترے آئینے نہیں ہیں تو رنگ کس کے جمال کے ہیں

یہاں وہاں حسن منتظر ہے کہیں نظر ہے کہیں سحر ہے
رگِ گلو سے قریب تر ہے مگر تقاضے وصال کے ہیں

بہار اور اس کا آئینہ کیا؟ شباب اور اس کا ماجرا کیا
غبارِ ہر نقش ماسوا کیا؟ فریبِ چشمِ خیال کے ہیں

اسی کے گاتے ہیں سب ترانے، اُسی کے پھیلے ہیں سب فسانے
اُسی سے جاری یہ کارخانے تمام ماضیٔ وحال کے ہیں

جہاں پہ ہے لطفِ عام تیرا ادھر بھی رحمت کی شان دکھلا
کہ طالبِ خستہ جاں کے سر پر ہجومِ رنج و ملال کے ہیں

نعت

قبول در پہ ہمارا سلام ہو جائے
زباں خموش رہے اور کلام ہو جائے

کہوں صلوٰۃ تو محراب نور بن جائے
پڑھوں سلام تو بابِ السلام ہو جائے

وہ مسکرائیں تو صبحِ ازل نمایاں ہو
جھٹک دیں کملی کا دامن تو شام ہو جائے

حرم کی سمت بڑھے آرہے ہیں دیوانے
بڑا مزہ ہو جو دیدارِ عام ہو جائے

یہ آرزو ہے حریمِ رسولؐ میں طالبؔ
پڑھوں وہ نعت زمانے میں نام ہو جائے

شہِ لولاک و سلطانِ سلاطینِ جہاں آئے
انیسِ بے نوایاں دستگیرِ بے کساں آئے

مقامِ مَاعَرَفنا معرفت کے راہ داں آئے
سلام! اے کارواں والو! امیرِ کارواں آئے

نبی و مرسلِ اعظم، کریم و ہادیٔ و خاتم
مطاعِ عالم و آدم شفیعِ عاصیاں آئے

قمر، واللیل طٰہٰ، والضحیٰ مدثر و اسریٰ
ماذاغ البصر، خیر البشر خیر الزماں آئے

قدم سے فرق تک چھائی ہوئی اک شانِ محبوبی
وہ جن کو دیکھتے ہی یادِ ازل کی داستاں آئے

فضائیں دردِ مظلومی سے اب چیخیں نہ گونجیں گی
یتیمو! غمگسار آئے، غریبو! مہرباں آئے

زمانے کو دیئے دھوکے بہت جھوٹی خدائی کے
حرم سے اے بتو! رخصت! حرم کے پاسباں آئے

سلام اے کفر کے طوق و سلاسل توڑنے والے
سلام اے رشتۂ انساں خدا سے جوڑنے والے

سوز و ساز

شادعارفی

ستقبل روشن تر کہیے — لیکن آنکھ ملا کر کہیے
بادی کو منظر کہیے — سیدھی بات الٹ کر کہیے
م گھٹنے کی بات الگ ہے — طوقِ گلو کو زیور کہیے
مجھایا تھا دیکھ کے چلئے — کیسی کھائی ٹھوکر کہیے
ئینہ دکھلانا ہوگا — سچی باتیں۔ منہ پر کہیے
بط کی آخر۔ حد ہوتی ہے — کب تک "بہتر بہتر" کہیے
م سے کہنے والی باتیں — آکر یا بلوا کر کہیے
رتے ہیں انداز تقاضے — کوئی مصرع ہم پر کہیے

کہیے ان سے شاد کا قصہ
لیکن سب سے بچ کر کہیے

شفقت کاظمی

یوں چھیڑتی ہیں دہر کی رنگینیاں مجھے
غم ہائے روزگار سے فرصت کہاں مجھے
کس کو ہے میرے حالِ پریشاں سے آگہی
دیتا ہے کون مژدۂ تسکینِ جاں مجھے
اس طرح ساتھ جادۂ منزل میں چھٹ گیا
پھر کارواں کو میں نہ ملا کارواں مجھے
مجھ سے تری نگاہ ملی بارہا ملی
لیکن تری نگاہ نے سمجھا کہاں مجھے
کیا کیا ہوا ہے ترکِ محبت پہ انفعال
آئی ہے تیری یاد جو پھر ناگہاں مجھے
دل کا ہجومِ یاس نے یہ حال کر دیا
شفقت خیالِ یار بھی ہے اب گراں مجھے

عروج زیدی

پیمانہ کی گردش کا انداز تھا مستانہ
جب ان کی نظر اٹھی شرما گیا پیمانہ
کیا پیش کروں تجھ کو اے جلوۂ جانانہ
ایمان کا نذرانہ یا جان کا نذرانہ
دل میں تری الفت کو دانستہ جگہ دے کر
کعبہ میں لگائی ہے تصویرِ صنم خانہ
افسانۂ الفت اب موقوف ہے ہم تم پر
ہم سرخیٔ افسانہ، تم حاصلِ افسانہ
بے مہریٔ دنیا کا اک زندہ نمونہ ہو
تم اس طرح ملتے ہو جیسے کوئی بیگانہ

غافل کرنالی

ہر آنکھ میں اشکوں کے نگینے سے جڑے ہیں
اے گردشِ دوراں ترے احسان بڑے ہیں
آواز نہ دیں اب ہمیں تقدیر کے سائے
ہم لوگ کڑی دھوپ میں صدیوں سے کھڑے ہیں

اختر فدائی

کہاں کا غم کہاں یاد آ رہا ہے
چراغوں کا دھواں یاد آ رہا ہے
جو سنگِ آستاں ہم چھوڑ آئے
وہ سنگِ آستاں یاد آ رہا ہے
خزاؤں کا چلن بھولے ہیں لیکن
سلگتا آشیاں یاد آ رہا ہے
خدا جانے کہاں ہم آ گئے ہیں
ہمیں شہرِ بتاں یاد آ رہا ہے

روح انتخاب

قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جس نے کل دنیا کو یہ بتایا وَاِنْ مِنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ۔ یعنی دنیا کی ہر قوم میں ایک نذیر آیا ہے۔ یہ اصول دنیا کو محبت واتفاق، یکجہتی واتحاد کی تعلیم دینے والا ہے، اور یہی اصول واضح کر دیتا ہے کہ ایسی پاکیزہ تعلیم کا پیش کرنے والا ہرگز ہرگز مفتری نہیں ہو سکتا۔

یہ کتاب "تفصیل کل شیٔ" یعنی ہر ایک وہ شے جس کا تعلق تزکیۂ قلب، تنویر روح، نجات اُخروی، تمدن انسانی، حیات ملی، حقوق العباد اور فرائض الٰہی سے ہو۔ اُسے نہایت جامعیت اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ——— یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید عدالت ہائے فوجداری ودیوانی ومال کے لئے ایک بہترین قانون بھی ہے اور ایام اللہ کے بیان میں صحیح ترین تاریخ بھی ہے، وہ ہدایت نامہ اور کتاب اخلاق بھی، وہ مواعظ وامثال بھی بیان کرتا ہے اور انذار وبشارت بھی۔ اس میں علوم اُخروی ودنیاوی کے دو دریائے زخار پہلو بہ پہلو جوش زن ہیں، وہ برہان کو پیش کرتا اور فطرت سلیمہ کو بیدار کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور صحیح طریقہ پر اللہ کے کام کو ظاہر کرتا ہے، وہ کتب سماویہ کا مہیمن، اور ان کے مطالب کا جامع ہے!

توراۃ میں صرف حلال وحرام کے احکام تھے، زبور مجموعہ مناجات ہے۔ انجیل میں صرف اخلاقی سبق ہیں لیکن ہدایت کی ہر ایک قسم کو اپنی ذات میں جمع کر لینا، صرف قرآن پاک ہی کا خاصہ ہے، قرآن مجید سراپا ہدایت اور کامل رہنما ہے ——— ہر ایک کتاب پر غور کرو کہ اس نے کیا کیا اثر پیدا کئے!

کیا وید کی تعلیم نے ہندوستان سے باہر کسی قوم میں کوئی وقعت پائی؟ کیا ژند واستا نے اولاد ایرج کی حدود سے باہر قدم نکالا؟ کیا توراۃ کی تعلیم سے اسباط کے سوا کسی اور نے کچھ استفادہ کیا؟ کیا انجیل نے توراۃ سے علیحدہ ہو کر اپنے آپ مستقل کتاب کہلانے کا دعویٰ کیا ——— اور کیا مسیح کے بارہ منتخب کردہ اور تیار کردہ شاگردوں نے انجیل کو کبھی غیر اقوام کے سامنے پیش کرنے کی سبقت کی ہے ——— ہاں یہ قرآن مجید ہی ہے، جس نے شروع ہی سے اپنے آپ کو کل مخلوق کا رہنما بنایا۔ یہ قرآن مبین ہی ہے جس نے زبانوں کے اختلاف، رنگتوں کے تباین اور نسل ونسب کے امتیازات کو الگ کر کے سب کے دلوں میں ایک ہی عقیدہ اور سب کے دماغوں میں ایک ہی ولولہ اور سب کی زبانوں پر ایک ہی کلمہ جاری کر دیا ———

قرآن مجید رحمت ہے ——— بنی اسرائیل نے نجات کے دروازے صرف اسرائیلیوں ہی کے لئے کھولے، ہندوؤں نے صرف برہمنوں کو مکتی (نجات) پانے والا قرار دیا، اسی طرح ہر ایک مذہب نے نجات کے لئے ایسی ایسی قومی اور ملکی ونسلی خصوصیات وقیود کا اضافہ کیا جس سے اس کے مذہب کا فیض بالکل محدود ہو گیا، قرآن مجید نے ان قیود کو توڑا، اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کا فرمان جاری کیا۔

(الجمال والکمال ——— علامہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری رح)

———•••———

چی

انقادری

یادِ رفتگاں

محمد باقر خاں مرحوم

سنہ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں جب چند مہینے ملتان میں میرا قیام رہا۔ ان دنوں محمد باقر خاں مرحوم سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آتے
،اوران سے پہلا تعارف ملتان ہی میں ہوا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی، طبیعت میں انشراح پیدا ہوتا، وہ خوش خلق، ملنسار
ں ملکھ تھے! ملتان کے بعد بھی مرحوم سے سال میں ایک دو بار کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی۔ یہ ان کی محبت تھی کہ دفتر "فاران"
یب خانہ پر بھی راقم الحروف سے ملنے کے لئے کئی بار تشریف لائے۔ اور اسٹی سے کچھ اوپر سیڑھیاں چڑھنے کی زحمت گوارا کی۔

چارسال پہلے کی بات ہے ملتان میں "یوم حسینؓ" تھا۔ کراچی سے میں اور لاہور سے مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری اور جناب
یاری اس میں تقریر کرنے کے لئے بلائے گئے، انہی کے زیر تعمیر مکان میں ہم نے قیام کیا! مکان کی ساخت، ہیئت اور اس کے رکھ
ؤ، غرض ہر چیز سے سلیقہ اور خوش ذوقی ظاہر ہوتی تھی۔

پارسال کراچی تشریف لائے۔ تو مجھ سے جامع العلوم ملتان کے جلسہ میں شرکت کے لئے اصرار کیا، میں نے کہا مجھے بلانا ہے تو
ں کی فصل میں جلسہ کیجئے، اس پر وہ بے ساختہ مسکرا کر بولے، اچھا! ایسا ہی انتظام کیا جائے گا۔ یہ اُن سے آخری ملاقات تھی

تین مہینے پہلے یہ خبر سننے میں آئی کہ محمد باقر خاں مرحوم پر فالج گرا ہے حالت نازک ہے، پھر اطلاع ملی کہ اب وہ خطرے سے
رہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ دماغ کا آپریشن ہوگا۔ انہیں ملتان سے لاہور لے جایا گیا۔ وہاں آپریشن ہوا اور اس
ثن کو کامیاب بتایا گیا ـــــــ مگر یہ ڈاکٹروں کی خوش اندیشیاں اور دوستوں اور عزیزوں کی دل خوش کن توقعات تھیں،
یت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس دنیا سے ان کا دانہ پانی اٹھ چکا تھا۔ موت جو ہر جان کے لئے مقدر گئی، اس سے ان کو بھی دوچار ہونا
اور کل جن کے نام کے ساتھ سلمہٗ، مدظلہٗ اور زید مجدہ لکھا جاتا تھا آج "مرحوم" و "مغفور" لکھا جارہا ہے ــــــ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے

محمد باقر خاں مرحوم جماعت اسلامی میں آنے سے پہلے کوآپریٹو سوسائٹی میں انسپکٹر تھے۔ فیشن ایبل گریجویٹ! مولانا سید ابوالاعلیٰ
ںودی کی کتابوں سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی سے قریب ہوئے اپنے آبائی شیعی مذہب کو چھوڑا۔ یہاں تک کہ جماعت کے رکن بن گئے
ول نے ملازمت کو بھی خیرباد کہہ دیا! تجارت کے لئے دیانت و اعتماد کے ساتھ سرمایہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے انھیں ایسے
دن کا سرمایہ آسانی سے مل گیا جو مرحوم پر اعتماد کرتے تھے، تجارت اور لین دین میں ان کی دیانت اور خوش معاملگی نے ایک اچھی مثال
ئم کردی۔ سرمایہ لگانے والے نہ صرف ان سے خوش اور مطمئن رہتے بلکہ ان کا احسان مانتے

عائلی قوانین کی تشکیل و تنفیذ سے پہلے ہی وہ "تعدد ازدواج" کے مسئلہ میں اس دفعہ کی قانون شکنی کر چکے تھے۔ تین بیویاں تھیں،
یرالاولاد تھے، مگر مطمئن زندگی! حوصلہ کے آدمی تھے، کوئی پریشانی ہوتی تو اُسے خاطر میں نہ لاتے اور مضطرب نہ ہوتے۔
جماعت اسلامی کے وہ نہایت پرجوش اور مخلص کارکن تھے۔ ملتان کے حلقہ کے تو وہ روح رواں تھے! چند سال پہلے جب بعض

ارکان جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے لگے، تو محمد باقر خاں مرحوم بھی اس اضطراب اور ہل چل سے ہل گئے، مگر ان کی طبیعت میں ضد نہ تھی اور دین کے معاملہ میں وہ شخصی آن بان کے بھی قائل نہ تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں ثبات اور استقامت عطا فرمائی، یہاں تک کہ دم واپسین تک وہ جماعت سے وابستہ رہے۔

محمد باقر خاں مرحوم حق کے معاملہ میں جری اور بے باک تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ملتان میں جماعت اسلامی کا جلسہ منعقد کرنے کے لئے جماعت کے کارکن نے متعلقہ مجسٹریٹ سے اجازت چاہی، ان صاحب نے تاؤ میں آکر اس قسم کی تلخ باتیں کہیں کہ یہ حلوے مانڈے کھانے والے یوں ہی وقت ضائع کرتے رہتے ہیں........ مرحوم کو جب اس واقعہ کا پتہ چلا تو وہ ضلع کے مقتدر حاکم سے جاکر ملے، اور ان سے رو در رو کہا کہ اگر ہم ایسی باتوں کے جواب میں یہ کہیں کہ یہ شراب پینے والے اور ناچنے گانے والے حکومت کو کیا کیا چلائیں گے تو کیا آپ کو ناگوار نہ ہوگا! سچ کہا اقبال نے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

محمد باقر خاں مرحوم کی موت سے جماعت اسلامی کو بڑا دھچکا لگا۔ جماعت کے لئے یہ نقصان ناقابل تلافی ہے، مگر دین کا کام رُکنے کا نہیں۔ جسے ہم "ناقابل تلافی" سمجھ رہے ہیں، اس کی تلافی اللہ تعالیٰ فرمائے گا! یہاں تک کہ پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ اور سربلندی نصیب ہوگی! حق کے قافلہ کے اے مخلص مسافر، تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، تیرے بعد تیرے نقش قدم کو لوگ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

ہماری نظر میں

الجمال والکمال از:۔ علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری، ضخامت ۲۵۲ صفحات مجلد (خوبصورت گرد پوش) قیمت:۔ چھ روپے، ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ الرحمانیہ ۱۲ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

تفسیر سورۃ یوسف قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمتہ اللہ علیہ اپنی مشہور تصنیف "رحمۃ اللعالمین" کے سبب دینی اور علمی دنیا میں بڑی شہرت رکھتے ہیں، اُن کا نام آتے ہی اخلاص، سوز و گداز اور اللہ تعالیٰ کے دین کی خیر خواہی اور تبلیغ عقائد کا روشن تصور مجسم ہو کر سامنے آجاتا ہے ——— قاضی صاحب موصوف نے اب سے چالیس سال پہلے سورہ یوسف کی تفسیر لکھی تھی، جو بس ایک بار چھپ کر رہ گئی، اس تفسیر کو اب مکتبہ الرحمانیہ نے کتابت و طباعت کے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کر کے دین کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

کتاب کا آغاز محی الدین سلفی صاحب کی "عرض ناشر" سے ہوتا ہے، مضامین کی فہرست کے بعد جناب غلام رسول مہر کا مقدمہ ہے ——— وہ لکھتے ہیں:۔

> "یہ ہر حال پوری تفسیر میں وہ تمام بنیادی اصول پیشِ نظر رہے، جو اہلِ علم کے نزدیک مُسلّم ہیں یعنی عربیت کی جامعیت، روایاتِ صحیحہ کا اہتمام اور بین و واضح قرآن کے مطابق مختلف نکات کی توضیح، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو زبان میں تفسیر کا یہ طریقہ ہر جگہ نظر نہیں آتا۔

اس تفسیر کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ان باتوں کی تردید کی گئی ہے، جو عوام میں بڑی شہرت پا چکی ہیں مثلاً یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تمام بھائی "نبی" تھے، ہم بچپن سے یہی روایت سنتے آئے ہیں ——— مگر قاضی صاحب مرحوم کی تحقیق یہ ہے:۔

> "اس مقام پر یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے ۱۲ بیٹوں میں صرف یوسف علیہ السلام ہی نبی اللہ تھے، باقی ہرگز نبی اللہ نہ تھے، کوئی صحیح اسلامی روایت یا اسرائیلی حکایت اس بارے میں مروی نہیں ——— ابن حزم کتاب المفصل میں لکھتے ہیں:۔
>
> "برادران یوسف علیہ السلام نبی نہ تھے، ان کی نبوت کے متعلق ہرگز ہرگز کوئی نص موجود نہیں، نہ قرآن سے، نہ حدیث سے، نہ اجماع سے اور صحابہ کرام میں سے کسی ایک صحابی کا قول بھی اس بارے میں ثابت نہیں"۔

یہ روایت کس قدر مشہور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے بھائیوں نے فروخت کیا تھا، یہ روایت مصرعہ میں آکر اور زیادہ مشہور و مقبول ہو گئی:۔

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی   بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہوئے

مگر

قاضی صاحب مرحوم لکھتے ہیں :-

"یہاں اس قدر قصہ ایزاد کیا جاتا ہے کہ پھر بھائیوں کو خبر ہو گئی، وہ قافلہ والوں سے آکر جھگڑ پڑے کہ یہ تو ہمارا غلام ہے اور پھر انھوں نے تھوڑے سے درہم لے کر فروخت کر دیا، لیکن کلام اللہ میں کوئی ایسا قرینہ نہیں، جو اس کی تائید میں ہو، عدم موجودگی قرینہ کے علاوہ اِن معنی سے انتشار ضمائر بھی لازم آتا ہے جو قرآن مجید کی اعلیٰ بلاغت کے خلاف ہے فتح البیان میں قتادہؒ کا قول درج ہے ——— "بل ھو عائد علی السیارۃ" علامہ ابن کثیر نے بھی اس کی تصحیح کی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہ جو مشہور ہے کہ برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام کو فروخت کر دیا تھا، یہ غلط واقعہ ہے"۔

"الجمال والکمال" میں اس مشہور عوام روایت کی بھی تردید کی گئی ہے کہ امراۃ العزیز ——— یعنی زلیخا ——— جوان بن جانے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آئی تھی !

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "بزرگ پرستی" کی نشان دہی اور اُس کا نفسیاتی تجزیہ کتنے جچے تلے انداز میں کیا ہے؟

"ان لوگوں کے نزدیک اولیاء اللہ کا معتقد کوئی شخص تب ہی ہو سکتا ہے، جب اُن بندگانِ خدا کو خدائی طاقتوں کا مالک یا حصہ دار تسلیم کر لیا جائے"۔

کتاب میں کہیں کہیں الفاظ کا استعمال کھٹکتا ہے ۔

"یوسف علیہ السلام کے ماں جائے بھائی بنیامین شامل مشورہ نہ تھے" (ص ۶۳) "ماں جایا بھائی" روزمرہ ہے۔ "بلکہ پہلے تو باپ پر ہی جمائی" (ص ۶۵) "پر ہی جمائی" غالباً "پٹی پڑھائی" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے ! "پر ہی جمانا" اردو میں ——— گھوڑے کے سوار کا زین پر راتین جمانا اور آسن جمانا ——— کے مفہوم میں بولا جاتا ہے ——— انیس کا شعر ہے۔

پاسِ ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی ‌‌‌‌ پر ہی ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

"جو اکیلا ایک ہزار کے برابر کا ہے" (ص ۸۵) "کا" زائد استعمال ہوا ہے، اس کی ضرورت نہ تھی ——— "کا" کا صحیح استعمال یوں ہوتا ہے : ——— "وہ اُس کا برابر کا بھائی ہے"۔

"طلاء ناب نے آتش امتحان میں پڑ کر بھی طلاء ناب رہتا تھا" (ص ۱۱۳) "نے" کی جگہ "کو" بولنا اور لکھنا چاہیے ——— "تیج استغنار یعقوب علیہ السلام نے قائم فرمائی تھی"۔ (ص ۱۰۱) "استغنار کے ساتھ "قائم فرمانا" نامانوس اندازِ بیان ہے ! اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کرنا تھا ——— "اُس سے استفادہ اُٹھایا ہے" (صفحہ ۲۵۰) "استفادہ کیا ہے" روزمرہ ہے ۔

صفحہ ۱۳۹ پر "فرقہ کیسانیہ" کتابت کی غلطی کے سبب "فرقہ کیانیہ" چھپ گیا ——— صفحہ ۱۰۴ پر "مغلقت الابواب" کی "سغلقت الابواب" کا چھپ جانا بھی کتابت کی غلطی ہے۔

قال اجعلنی علی خزائن الارض ——— اور "دین الملک" کی تفسیر میں قاضی صاحب مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے اس بحث کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مشہور تفسیر "تفہیم القرآن" میں ضرور پڑھ لینا چاہیے !

کوئی شک نہیں "الجمال والکمال" بڑی دل نشین اور ایمان افروز تفسیر ہے، اس میں تاریخ وجغرافیہ کی معلومات بھی ملتی ہیں قاضی صاحب "توریت وانجیل" پر خاصہ عبور رکھتے ہیں اس لئے جہاں بھی یہ مباحث آئے ہیں، کتاب کے وہ حصے بڑے معلومات آفریں ہیں، قاضی صاحب مرحوم کا یہ خاص فن ہے ——— رحمہ اللہ تعالیٰ

"الحسنات" کا "نماز نمبر"

مرتبہ :- ابوسلیم محمد عبدالحیٰ، ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت ایک روپیہ ("الحسنات" کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ آٹھ آنہ) ملنے کا پتہ :- مکتبہ "الحسنات" رام پور (یو۔پی - بھارت)

پندرہ روزہ "الحسنات" کا موضوع اور مقصد "اخلاق وتقویٰ" کی تبلیغ ہے، اور اس مقصد کے لئے وہ اپنی پہلی اشاعت ہی سے جدوجہد کر رہا ہے، اس کے مضامین عام فہم، دل نشین اور ایمان افروز ہوتے ہیں! "الحسنات" دین و دُنیا کی راہ میں چراغ دکھانے کا فرض انجام دے رہا ہے ——— اس دینی مجلہ کا "نماز نمبر" ہمارے سامنے ہے، جس کا ایک ایک مضمون دل کش اور یقین آفریں ہے، جن کے مطالعہ سے "اقامتِ صلوٰۃ" کے تقاضے اور آداب و شرائط اُبھر کر سامنے آتے ہیں!

"الحسنات کا "نماز نمبر" بے نمازیوں کو نماز پڑھنے کے لئے خدا کا خوف دلاتا ہے اور جو مسلمان اللہ تعالیٰ کے فضل سے نماز پڑھنے کے عادی ہیں، اُن کو بتاتا ہے کہ نماز کس خضوع وخشوع کے ساتھ پڑھنی چاہیئے اور نماز کی مداومت کا یہ نتیجہ نکلنا چاہیئے کہ مسلمان پوری زندگی میں "نمازی" بن کر رہے!

"نماز آدمی کے سامنے خدا کو اتنا زندہ اور تازہ کر دیتی ہے ..." (صفحہ ۶۹) یہ اندازِ بیان کھٹک ہی نہیں نامناسب بھی ہے، صاحبِ مضمون کا جو مفہوم ہے اُسے انہیں واضح اور مناسب الفاظ میں بیان کرنا چاہیئے تھا ——— صفحہ ۱۳۴ پر "الملک دلی" کا ترجمہ "منصف بادشاہ" کیا گیا ہے "منصف حاکم یا منصف فرمانروا" ترجمہ کرنا تھا۔

"نماز نمبر" اس قابل ہے کہ مسلمانوں کے گھر گھر میں اسے پہونچایا جائے، اور ادبی مذاکروں اور عام محفلوں اور نشستوں میں اس کے مضامین پڑھے جائیں۔

زاد الحرمین

از :- حکیم ابوالمرتضیٰ عصمت اللہ رحمانی ——— ضخامت ۲۰۸ صفحات (مجلد سرورق رنگین)
قیمت :- ڈھائی روپے، ملنے کا پتہ :- غنی بک ڈپو زیر مسجد قاضی مرچی محل، متونا تھ بھنجن (یوپی)
اور دفتر اہلِ حدیث ہندو راؤ مارکٹ صدر، دہلی ع

اس کتاب میں خانہ کعبہ کی تاریخ، فریضۂ حج کی ادائیگی کا مسنون طریقہ، مناسکِ حج کے فوائد اور اس کی حکمتیں، مسجدِ نبوی اور روضۂ مبارک وغیرہ کی زیارت کے آداب اور حج وزیارت کی ماثورہ دعائیں ——— بیان کی گئی ہیں! کوئی شک نہیں یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک کامیاب دینی اور علمی پیش کش ہے، حجاج کے لئے "زاد الحرمین" ایک گائڈ کا فرض انجام دیتی ہے، ہر بات خاصی تفصیل سے لکھی ہے، اندازِ بیان اثر انگیز ہے۔

اب سے آٹھ سال قبل جب راقم الحروف کو حج وزیارت کی سعادت نصیب ہوئی تھی تو مکہ میں بہت سے حاجیوں کو دیکھا کہ وہ "تنعیم" جا جا کر احرام باندھتے ہیں اور عمرہ ادا کرتے ہیں! اُن کے اس فعل کے بارے میں دل نے خود بخود کھٹک محسوس کی لیکن میں نے کسی حاجی کو ٹوکا نہیں مگر اُن کی طرح خود عمرہ نہیں کیا ——— اب اس کتاب سے معلوم ہوا کہ اس طرح عمرہ کرنا غیر مسنون اور غیر مشروع ہے :-

"چونکہ عمرہ کے لئے وقت مقرر نہیں ہے، اس لئے جو سال میں متعدد بار کیا جا سکتا ہے لیکن

> عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظمہ کے باہر حل (یعنی تنعیم وغیرہ) کی طرف بار بار جانا اور وہاں احرام باندھ کر عمرہ کرنا (جیسا کہ فی زمانہ عوام الناس بکثرت کرتے ہیں اور اس کو عمرہ لانا کہتے ہیں) جائز تو ہے، لیکن درحقیقت غیر مسنون اور غیر مشروع ہے، کیونکہ عمرہ کے ارادے سے مکہ سے باہر نکلنا، اور عمرہ کرنا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل ثابت نہیں ہے ۔ ۔ ۔ "

طواف وداع کے بعد حاجیوں کو کعبہ کی طرف رُخ کر کے اُلٹے پاؤں چلتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے' اس فعل کو اس کتاب میں "خلافِ سنت" اور "بدعت" لکھا ہے!

صفحہ ۳۳ پر "وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ" کا ترجمہ "ان کو (طرح طرح کے) میوے کھلا" کھٹکا ــــ "کھلانے" کی جگہ "دینا یا عطا کرنا" وغیرہ کوئی مناسب لفظ لکھنا تھا ــــ صفحہ ۴۶ پر حج کی اجتماعی عبادت کو "محیر العقول" لکھا ہے حالانکہ یہ عبادت عقلوں کو حیران کرنے والی نہیں ہے' حج ہی پر کیا منحصر ہے، دین کا کوئی حکم اور فریضہ بھی "محیر القول" نہیں ہے بلکہ عقل کے عین مطابق ہے! اور عقل سلیم کو دین کے ہر فریضہ میں وحشت وحیرت کی جگہ اُنس محسوس کرنا چاہیئے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مناسکِ حج اور زیارتِ مشاہد وقبور کا جہاں ذکر ہے، وہاں "توحید" کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے' اور مشرکانہ رسوم اور بدعات سے نفرت دلائی ہے!

ہم کیسے رہیں؟

از:- ابن فرید :- ضخامت ۱۴۲ صفحات، (مجلد' خوب صورت گرد پوش)
قیمت :- دو روپے - ملنے کا پتہ :- ادارۂ بتول' اچھرہ، لاہور۔

اس کتاب میں کیا ہے؟ اُس کے ان عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

ــــ زندگی کا مقصد ــــ خود کو پہچانئے ــــ یہ دوسرے لوگ ــــ آپ والدین کی تمنا ہیں ــــ سہیلیاں ــــ ہماری شخصیت کا آئینہ ــــ پڑوسی' ہمارا ماحول ــــ اسکول اور کالج کی زندگی ــــ شوہر' شریکِ زندگی ــــ ساس، سُسر اور نئے سرپرست ــــ بچے امانت ہیں ــــ ملازم' گھر کے افراد ــــ!

"عائلی زندگی" کس طرح خوشگوار بن سکتی ہے اور بنائی جا سکتی ہے؟ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب ہماری نگاہ سے نہیں گزری! زبان انتہائی شیریں' اندازِ بیان زیادہ سے زیادہ دل نشین' پھر نفسیات کا تجزیہ ان تمام خوبیوں پر مستزاد ۔! باتوں باتوں میں اس قدر خوبی کے ساتھ وعظ و نصیحت کی ہے کہ "حق" تلخ ہونے کی بجائے شیریں محسوس ہوتا ہے ۔

مغربیت اور مادہ پرستی نے آج کی "عورت" کو جس انداز میں متاثر کیا ہے، اُس کی اس کتاب میں نشان دہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان خرابیوں کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے! پوری کتاب اول سے آخر تک جتنی دل چسپ ہے اُتنی ہی مُفید اور اہم ہے ــــ اخلاق کا صحیفہ ــــ! تعلیم یافتہ لڑکیوں کو یہ کتاب سبقاً سبقاً پڑھنی چاہیئے! انہی کی اصلاح و تربیت کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے ۔

جناب ابن فرید نے اس کتاب کو لکھ کر اور ادارۂ بتول نے اسے چھاپ کر دین واخلاق اور معاشرت کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے ــــ "لمبے لمبے اقتباسات سے کاٹ کپٹ کر کے ۔ ۔ ۔ " (صفحہ ۱۹) ایسے موقعوں پر "کاٹ پیٹ کے" بولتے ہیں ــــ "تخمینہ لگانا" (صفحہ ۲۴) اس سے کیا مُراد ہے اور یہ کیا اصطلاح ہے' سمجھ میں نہیں آئی!

انجام دی ہے! زبان وادب کے اعتبار سے یہ وہ پاکیزہ اور تعمیری ادب ہے جس کے سامنے نام نہاد "ترقی پسند ادب" کوڑا کرکٹ نظر آتا ہے ——— اور یہ گلدستہ، بلکہ سبد گل!

گلشنِ بے خار تصنیف :- نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ - ترجمہ وحواشی :- محمد احسان الحق فاروقی (ایم اے)
تعارف :- سید الطاف علی بریلوی ——— پیش لفظ :- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی -
ضخامت ۵۵۲ صفحات (بڑا سائز مجلد، خوب صورت گرد پوش ——— کتابت وطباعت جلی اور خوش نما)

قیمت :- بارہ روپے، ملنے کا پتہ :- پاک اکیڈمی ۱/۱۳۱ وحید آباد کراچی ۱۸

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ "اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ" ہے جو علم وادب کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہا ہے، اونچے درجہ کی متعدد کتابیں (تصانیف، تالیف وتراجم) اس نے شائع کی ہیں اور اب نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مرتب کئے ہوئے مشہور تذکرے (گلشن بے خار) کا اُردو ترجمہ چھاپا ہے -

میر تقی میر کی "نکات الشعراء" (سال تصنیف ۱۷۵۲ء) سے لے کر محمد حسین آزاد کی "آب حیات" (سال مصنف ۱۸۸۰ء) تک متعدد تذکرے لکھے گئے، مگر نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کا مرتب کیا ہوا تذکرہ ——— گلشنِ بے خار ——— بعض خصوصیتوں کے سبب ان تذکروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے! نواب صاحب موصوف اُردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ شعر کے ناقد بھی تھے! یہ تذکرہ سب سے پہلے ۱۸۳۷ء میں دہلی کے لیتھو گریفک پریس میں طبع ہوا تھا -

جناب احسان الحق فاروقی (ایم اے) نے اس تذکرہ کو اُردو میں منتقل فرمایا ہے اور اس پر مقدمہ کے ساتھ ساتھ حواشی بھی لکھے ہیں، صاحب موصوف علمی اور ادبی حلقوں میں معروف نہیں ہیں، ان کی اس کتاب کو پڑھ کر پتہ لگا کہ یہ جوہر قابل اب تک گمنام ہی رہا۔

جناب احسان الحق فاروقی نے "گلشن بے خار" پر جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے وہ زبان وادب، معلومات اور منفرد فن کے اعتبار سے قدر وستائش کا مستحق ہے! ترجمہ بھی رواں اور شُستہ ہے ——— ایک نمونہ :-

> "اکثر جھوٹے دعویداروں کا ان اوراق میں کوئی ذکر نہ دکھائی دے گا، تاکہ اُن کی جہالت
> کی مجھ سے نسبت نہ دی جائے، اگر کسی کے شیریں خیالات اور نمکین افکار کا جلد ہی میں
> ذکر نہ کیا گیا ہو تو یہ سمجھ لیا جائے، کہ وہ ہم تک نہیں پہونچے، دوستوں کی محبت اور
> دشمنوں کے کینہ کا اہل صفا کے دل کی طرح انشاء اللہ اس کتاب میں تو کوئی اثر نہ پائے گا
> اور اس وجہ سے اختصار سے لکھا گیا ہے کہ اکتاہٹ نہ پیدا ہو جائے - - -"

ترجمہ میں کہیں کہیں کھٹک بھی محسوس ہوتی :-

"بو نصر اور بو علی پر چشم التفات نہیں کھولتا اور گوشۂ رغبت نہیں دھرتا" (صفحہ ۱۵) یہ لفظی ترجمہ ہے اس کا ترجمہ اس انداز سے کرنا تھا :-

"بو نصر علی اور بو علی کی جانب التفات نہیں کرتا اور اُن سے رغبت نہیں رکھتا"

گوشۂ رغبت کے ساتھ "دھرنا" اہل زبان نہیں بولتے ——— بو نصر بو علی پر چشم التفات نہیں کھولتا" اس میں پر" محل نظر ہے

صفحہ ۶۶ پر : ——— "ایک جماعت محل والا کی طرح ملی ہوئی تھی"

کے بجائے "تع" لکھا ہے، حالانکہ یہ "تصرع" نہیں ہے! اور یہ عبارت بھی ترجمہ میں گنجلک سی ہو گئی ہے! ـــــ "نسیم اور صبا عطاری کر رہی تھیں" ـــــ اس کے متن کا ترجمہ یوں کرنا چاہیئے تھا:۔

"نسیم اور صبا عطر بیز تھیں ـــ یا عطر چھڑک رہی تھیں ـــ یا خوشبو بکھیر رہی تھیں"۔

اُردو زبان میں "عطاری" یونانی دوا بیچنے کے معنی میں بولا جاتا ہے!

"اور اس قدر مکرر کے باوجود بھی روح کا تالو حلاوت اندوز نہیں ہوتا"۔ (ص۳۳)

یہاں جہاں ترجمہ کا یہ رنگ ہے، وہاں وجدان بے کیفی سی محسوس کرتا ہے، فارسی کی اصل عبارت میں غالباً "کامِ رُوح یا "کامِ جاں" ہوگا۔ "کام" کا ترجمہ (تالو) کرنے کی ضرورت نہ تھی:۔

"رُوح حلاوت اندوز نہیں ہوتی"۔

بامحاورہ ترجمہ ہے۔

"مراتبِ حکمت میں باقر اور نصیر کے مثل ہیں"۔ (ص۳۷) اُردو داں طبقۂ علم و ادب کے اس دورِ انحطاط میں باقر اور نصیر کے ناموں میں اجنبیت محسوس کرے گا، یہ حواشی نگار کا فرض تھا کہ وہ حاشیہ میں میر باقر داماد اور نصیر الدین طوسی کے مختصر حالات لکھ دیتے

"مگر بمصداق بیٹا باپ کا بھید ہوتا ہے"۔ (ص۱۳۷) عربی کی مشہور ضرب المثل ـــــ الولدُ سِرٌّ لابیہ ـــ کا یہ لفظی ترجمہ کیا گیا ہے، حالانکہ اس ضرب المثل کا بامحاورہ ترجمہ کرنا تھا ـــــ "بیٹا باپ سے مشابہ ہوتا ہے"۔

صفحہ ۱۵۲ پر "واللہ، در من قال ـــ" کی "د" پر نقطہ لگنے سے "ذر" ہو گیا اور صفحہ ۴۴ پر "آثم" کی جگہ "عاثم" چھپ گیا، یہ کتابت کی غلطیاں ہیں، مگر ایسی غلطیاں اُردو جاننے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

"مہوسی کا بہت شوق ہے" (ص۲۰۶) ـــــ "کیمیا بنانے کا بہت شوق ہے"۔ یہ ہے بامحاورہ ترجمہ! ـــ جرأت اور انشا کے ساتھ مشاعرات اور مطارحات کرتے تھے" (ص۲۰۸) یہ فنِ ترجمہ اور زبان کے ساتھ مذاق ہے! اصل عبارت کے لفظی ترجمہ کی بجائے، ترجمہ اس انداز میں کرنا تھا ـــ

"جرأت اور انشا کے ساتھ مشاعرے پڑھتے تھے اور طرحی غزلیں کہتے تھے"۔

جناب سید الطاف علی بریلوی نے فاضل مترجم کے حالاتِ زندگی اختصار کے ساتھ لکھے ہیں اور اُن کی ادبی خدمات کو سراہا ہے، پیش لفظ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے لکھا ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود بہت خوب ہے ـــ لکھتے ہیں:۔

"ہمارے تذکرہ نگاروں میں اگر کسی کو نقاد کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے، تو وہ شیفتہ ہیں
جی چاہتا ہے کہ اُردو تنقید میں اُنہیں وہی مقام دیا جائے، جو انگریزی میں سر فلپ
سڈنی کو حاصل ہے، شیفتہ اور سڈنی میں بہت سی مناسبتیں ملتی ہیں، دونوں عالی
خاندان، صاحبانِ ذوق تھے، شاعروں کے مُربی اور دوست۔ اور خود بھی پیدائشی
شاعر، دونوں کے کردار کی شرافت اور نیک دلی مشہور ہے ـــ"

والد مترجم (جناب محمد احسان الحق فاروقی) کے مقدمہ پر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے یہ چند الفاظ کتنے وقیع ہیں:۔

"اس ایڈیشن کے ساتھ فاروقی صاحب کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے اس میں پہلی

وہ محنت اور ریسرچ ملتی ہے، جو اگر بڑھا دی جائے، تو اسے ڈاکٹر کی سند کے لئے ہر یونیورسٹی قبول کر لے گی۔

اصل کتاب ــــــ گلشنِ بے خار ــــــ یقیناً اُردو شاعروں کے تذکروں میں ممتاز مقام رکھتی ہے! شیفتہ نے یہ تذکرہ لکھ کر اُردو دُنیا پر احسان کیا ہے! اس میں اُردو کے ۶۴۳ غزل گو شاعروں کے مختصر حالات اور اُن کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں! نواب صاحب مرحوم کا شاعرانہ ذوق بلند بھی ہے اور لطیف و شستہ بھی ہے!

ہمارے نزدیک شعروں کے انتخاب کا معیار یہ ہے کہ انتخاب کو دیکھ کر اہلِ ذوق یہ تو کہیں کہ فلاں اچھا شعر اس میں آنے سے رہ گیا، مگر اُن کی زبان سے یہ نہ نکلے کہ فلاں فلاں اشعار اس انتخاب میں آنے کے قابل نہ تھے ــــ گلشنِ بے خار ــــ میں بعض ایسے پست اور بے مزہ اشعار بھی ملتے ہیں: ـ

کہتے ہو کیا رقیب کو بھیجوں بتا صلاح	لعنت ہی بھیجئے گا یزید لعین کو (ص ۹۲)
قتل کر لاشۂ اکبر کو چھپایا گھر میں	ہاے اس نے مجھے جانے نہ دیا اور کہیں (ص ۱۰۵)
طاس قلیاں میں رکھا ہے اس نے ابر مُردہ کو	ڈوب مر رورو کے تو اے ابر بہمن آب میں (ص ۲۱۱)
دُشمن کو مرے گور پہ لانا نہیں اچھا	مردہ کو مسلماں کے جلانا نہیں اچھا (ص ۳۹۸)

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ نے کوئی شک نہیں شعرا کے حالات جمع کرنے میں بڑی زحمت اُٹھائی ہے، مگر بعض شاعروں کے حالات یا تو اُن کو مل نہیں سکے، یا اُن کو نواب صاحب موصوف نے قصداً نظر انداز کر دیا ــــــ مثلاً دیا شنکر نسیم کا شیفتہ نے ذکر نہیں کیا، ہو سکتا ہے کہ تذکرہ کی ترتیب کے وقت نسیم مشہور نہ ہوئے ہوں ـ

"گلشنِ بے خار" میں یہ بات بھی کھٹکتی کہ دہلی کے شاعروں کا تذکرہ جس فراخ دلی سے کیا گیا ہے، لکھنؤ کے شعرا کے حالات میں وہ انداز نہیں ملتا!

خواجہ حیدر علی آتش جو اُردو غزل کے عظیم شاعر ہیں اور دلی کے اساتذہ کے ہم پلہ ہیں، اُن کا ذکر صرف چار سطروں میں کیا ہے اور اُن کی تعریف اس بے دلی کے ساتھ کی ہے:ـ

"اُن کی طبیعت کی موزونیت میں کوئی کلام نہیں"۔

بعض اشعار بہت مشہور ہیں، مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس کے شاعر کے ہیں! "گلشنِ بے خار" نے ایسے مشہور شعروں کے کہنے والوں کی نشاندہی کی ہے: ؎

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم، نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے (مرزا صادق شرر)

چمن کے تخت پر جس دن شہِ گل کا تجمل تھا	ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شورِ تغافل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں	بتاتا باغباں رو رو کے یاں غنچہ یہاں گل تھا

(خواجہ برہان الدین عاصی)

تم غیر کے گھر بیٹھ کے دل شاد کرو گے	ہم کون ہیں صاحب نہیں کیوں یاد کرو گے

(حکیم میر عزت اللہ خاں عشق دہلوی)

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے — عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
(مرزا محمد علی عرف مرزا بچو فدوی)

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند — کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا (قائم چاندپوری)

دردِ سر ہے ہو گئے صندل لگانے کا دماغ — اس کا اک گھسنا لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے (الٰہی بخش خاں معروف دہلوی)

اس شعر کو بچپن سے ہم یوں سنتے آئے ہیں:—

دردِ سر کیواسطے، صندل بتاتے ہیں مفید — اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

"تک" نکل جانے سے مصرعِ ثانی کوئی شک نہیں زیادہ رواں ہو گیا، مگر مصرعِ اولیٰ میں معروف کے یہاں "دماغ" کا کیا جواب ہے!

مجھ میں اور اُن میں سبب کیا جو لڑائی ہو گی — یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی (محمد امان نثار دہلوی)

تیغ ابرو کا اگر کچھ بھی اشارا ہو جائے — آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہو جائے (الٰہی بخش نشاط کاندھلوی)

جو کوئی آ کے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے — ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں (سید غلام حسن)

حضرت شیفتہ کے سبدِ گل سے راقم الحروف نے جو پھول چنے ہیں اُن کے رنگ و بو سے قارئینِ "فاران" کو محروم رکھنا ہمیں گوارا نہ ہوا:—

چھوڑتا میرے گریباں کو نہیں دستِ جنوں — کیا یہ اس کو کسی محبوب کا داماں سمجھا (آتش)

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے — دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست (آتش)

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم — نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم (آتش)

پیام بر نہ میسر ہوا، تو خوب ہوا — زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے (آتش)

ہو نہ دامن گیر کوئی جان کر قاتل مجھے — تو بھی روتا چل کر جنازے کو ہمارے دیکھ کر (صدر الدین آزردہ)

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ — اِدھر اُدھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ
(مرزا رضا علی آشفتہ لکھنوی)

کبھی دوستی ہے، کبھی دشمنی — تری کون سی بات پہ جائیے (میر اثر دہلوی)

حسن پر اپنے ہر اک مہ پارہ گرمِ لاف تھا — گھر سے وہ خورشید رو نکلا تو مطلع صاف تھا (احسن علی آصف)

چرچا ہوا ہے گھر گھر، اب دیکھئے کہ کیا ہو — دو دن نہ چھپ سکی تو چاہت ترا ہرا ہو (احسان)

ہائے! اُس سرخی ترے رخسار کی ہنگامِ عتاب — جتنا بگڑے ہے تو اُتنا ہی سنورتا جاتا ہے (نواب علی محمد خاں امیر)

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو — بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو (انشاء اللہ خاں انشاء)

رونے سے اپنے دل کی تپش کم نہ ہو گئی — تھی چار بوندیوں میں ہوا سرد ہو گئی (انشاء)

انجان ہو تو اُس سے کوئی درد دل کہے — جو جانتا ہو، میں اُسے آگاہ کیا کروں (میر عبد الحی تاباں)

کس سے فریاد کروں میں کہ وہ ہرجائی ہے — آہ اس بات میں میری بھی تو رسوائی ہے (〃 〃 تاباں)

یہ شعر یوں مشہور ہے:—

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

توانائی تو کر بیٹھی جدا آغوش سے مجھ کو — کرامت دیکھیو اے ناتوانی! دوش سے مجھ کو (جوش ملیح آبادی)

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو — اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو (شاہ حاتم)

کس کا جگر ہے جس پہ یہ بیداد کروگے — لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے (جعفر علی حسرت لکھنوی)

روندے ہے مثل نقش قدم خلق یاں مجھے — اے عمر رفتہ! چھوڑ گئی تو کہاں مجھے (خواجہ میر درد)

سب سہیں گے ہم اگر لاکھ برائی ہوگی — پر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی (خیراتی خاں دلسوز)

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ — تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ (ذوق)

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگ بوئے گل — وہ رہا آغوش میں، لیکن گریزاں ہی رہا (ذوق)

ساقی گئی بہار، رہی دل میں یہ ہوس — تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس (سودا)

کیا گلہ صیاد سے ہم کو یونہی گزری ہے عمر — اب اسیر دام ہیں، تب تھے گرفتار چمن (سودا)

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا (شیفتہ)

جنوں میں کیا مرے پیوند پیرہن کو لگے — کہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن کو لگے (سراج الدین شاہ ظفر)

دل گرفتہ ہوں کروں گا ہر کے میں آزاد کیا — مجھ کو یکساں ہے چمن کیا، خانۂ صیاد کیا (عیش لکھنوی)

اس کو شہرت کی تمنا، مجھے رسوائی کی — ہر کوئی آرزوئے نشو و نما رکھتا ہے (شیخ غلام ضامن کرم)

جس کم سخن سے کیجئے، تقریر بول اٹھے — ہے ہم میں وہ کمال کہ تصویر بول اٹھے (گویا فرخ آبادی)

آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں — یہ جو ہو جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں (محبت بریلوی)

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا (مصحفی)

وہی دشت اور وہی گریباں چاک — جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں (مصحفی)

مجھ کو پامال کر گیا ہے ابھی — یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے (مصحفی)

کیسی بے رحمی خدا نے اس کے جی میں ڈال دی — بات رونے کی مرے سن کر ہنسی میں ڈال دی (معروف دہلوی)

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے مگر — منتظر تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے (معروف)

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل — تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا (مومن)

جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا — وہ کیوں شریک ہوں مرے حال تباہ میں (مومن)

دن رات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک — میں بھی ذرا آرام لوں، تم بھی ذرا آرام لو (مومن)

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا (میر)

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا (میر)

عرض غصہ میں کبھی اہل وفا کی نہ سنے — ہٹ پہ آجائے وہ کافر تو خدا کی نہ سنے (محمد شاکر ناجی)

گردش کا اس نگاہ کی اب طور اور ہے — اے ساکنان میکدہ! یہ دور اور ہے (محمد امان نثار دہلوی)

نزع میں ہم نے عجب طرح سے دل شاد کیا — آئی ہچکی تو کہا اس نے ہمیں یاد کیا (ہوش لکھنوی)

دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا — اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانوں کو کیا کہیے (انعام اللہ خاں یقین)

مخاطبات

از:۔ مولانا حکیم انجم فوقی بدایونی، ضخامت ۳۲۰ صفحات، قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ:۔ انجمی دواخانہ، جی ۴۴ ۵ کورنگی، کراچی

جناب انجم فوقی بدایونی پاکستان تشریف لانے سے قبل ہندوستان کے معروف شاعر تھے، انھوں نے مشاعرے بھی لوٹے ہیں اور شاگردوں کو بھی ان کے تلمذ اور صحبت نے فیض پہونچایا ہے، پاکستان آنے کے بعد وہ گمنام سے ہوگئے ہیں! اس گمنامی کے ساتھ ان کے حالات میں بھی بڑا تغیر آگیا، کہاں وہ مشاعروں، دعوتوں اور پارٹیوں کی گرماگرمی اور کہاں یہ گوشہ گیری! وضع قطع ہی بدل گئی، لمبی ڈاڑھی، سر پر دوش سے بھی نیچے گیسو، فقیرانہ لباس! برسوں کے بعد ان کی بجائے اس کتاب میں ان کی "تصویر" کو دیکھا! جوانی میں خواجہ حسن نظامی کا یہی حلیہ ہوگا! ان کی آنکھوں سے "استغراق" کا ترشح ہوتا ہے، اور چہرے پر محویت سی طاری ہے! مسلمان کے بارے میں خوش گمانی ہی کرنی چاہئے یقین ہے کہ ظاہری درویشی کے ساتھ ان کا باطن بھی درویش صفت ہوگا ـــــ مگر کتاب پر یہ "تصویر"؟! صوفیا کے بارے میں تو یہ سنا گیا ہے کہ نام و نمود کو بہت برا سمجھتے ہیں اور کسی کسی نے تو اسے "شرک" کہا ہے کہ کبریائی تو اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے ـــــ یہ الفاظ لکھتے ہوئے راقم الحروف خود اپنے حالات پر ندامت محسوس کر رہا ہے! کہ "قال" ابھی تک "حال" نہیں بن سکا۔

یہ کتاب انجم صاحب کے مکتوبات کا مجموعہ ہے، نہ معلوم یہ خطوط ان لوگوں نے جن کے نام لکھے اور بھیجے گئے تھے، انجم صاحب کو واپس کر دیئے ہیں، یا صاحب موصوف ہر خط کی نقل اپنے پاس رکھ لیتے ہیں! اس کتاب کے پڑھنے سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ انجم صاحب کی نثر کا انداز سادہ و پرکار ہے، ان کے بعض جملے تو "ضرب المثل" بننے کے قابل ہیں ـــــ چند نمونے

- ـــــ "کشائش رزق کے لئے کوئی زود اثر اور مجرب دعا؟ فکر و فہمائش دونوں خوب ہیں، خدا راس لائے مگر یہ تو بتائیے، سر دست جس قدر رزق میسر ہے اس کا حق آپ کتنا ادا کرتے ہیں؟"
- ـــــ "ڈرنا اور وہ بھی موت سے؟ حضرت موت تو زندگی کا ایک بے حس و حرکت سایہ ہے حقیقتاً ڈریے زندگی سے کہ زندگی ڈرنے کی چیز ہے"۔
- ـــــ "میں وہاں نہیں ہوں، جہاں خدا ہے ـــــ لیکن خدا اس جگہ ہے جہاں میں ہوں"
- ـــــ "تہذیب حد سے بڑھ کر تصنع ہو جاتی ہے، مشورہ اعتدال سے گزر کر امر بن جاتا ہے"۔
- ـــــ "شرع اگر میرے ہاتھ میں ہوتی تو بہ حالت مجبوری دو چیزوں کی چوری یقیناً جائز کر دیتا، ایک آم دوسرے کتاب!"
- ـــــ "میں تو عالم ہوں نہیں اور کسی حد تک ہوں بھی تو ان علما میں نہیں جنھیں رمضان کے چاند کے لئے دو متشرع آدمیوں کی عینی شہادت چاہیئے ـ لیکن اگر معاملہ ذاتی نقصان نفع کا آجائے، تو محض شبہ اور قیاس کی بنا پر سولی چڑھوا دیں۔۔۔"

ـــــ "استنباط کرنا بری بات نہیں، قیاس سے پہلے آثار اور آثار سے پہلے علت اور علت سے قبل معلول تلاش کیجئے، ان تمام باتوں سے پہلے اس فیصلے کی بھی ضرورت ہے کہ استنباط کا حق آپ کو پہونچتا ہے یا نہیں؟"

• ــــــ "پہلے آپ علمِ فراستِ التحریر اور نفسیاتی کتابیں پڑھیئے، پھر معاملات کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی، چونکہ بعض باتیں لفظی حیثیت سے کچھ اور ہوتی ہیں، معنوی لحاظ سے کچھ اور، اور بسا اوقات یہ دونوں صورتیں ایک ہی قول میں جمع ہو جاتی ہیں، جیسے تکثیرِ عبادت کے لئے منع فرمایا جس کا سیدھا سادہ مطلب تو یہ ہے کہ تقلیلِ عبادت سے غافل نہ ہو جائیں مگر فی نفسہٖ یہ مراد نہیں کہ تکثیرِ عبادت سے گریز کرو، بلکہ در اصل کنایۃً تکثیرِ عبادت ہی کو فوقیت دی گئی ہے! اس مسئلہ کی توضیح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ ہر کثرت سبب بن جاتی ہے، قلت کا، اور قلت کا آخری درجہ ہے مفقود! لہٰذا کثیر کو برقرار رکھنے کے لئے قلیل سے کام لیا گیا۔"

ان خطوط میں شعر و شاعری کے بھی تذکرے ہیں، عروض پر بھی عالمانہ بحثیں ہیں، شریعت و طریقت کے بھی اسرار اور دین کی حکمتیں بھی بیان کی گئی ہیں، سیاسیات پر بھی اظہارِ رائے فرمایا گیا ہے، مولانا مودودی کی مدح بھی ہے اور اُن پر طنز بھی ہے! غرض یہ کتاب شعر و ادب، اخلاق و تصوف اور سیاست و معاشرت کا ایک کشکول اور گلدستۂ رنگ و ہزار برگ ہے۔

"بوند کی ترقی کو دریا، ذرے کے عروج کو پہاڑ، کونپل کے ارتقا کو درخت ...... اور چنگاری کی معراج کو آپ شعلہ کہتے ہیں، لیکن بشر کو اس کے منتہائے کمال کو پہونچنے کے بعد بھی آپ نرا البشر ہی فرمائیں تو یہ کوتاہیٔ عقل یا بشر دشمنی نہیں تو اور کیا ہے۔" (ص ۲۲)

تو

انجم صاحب ہی فرمائیں کہ بشر کو اُس کے منتہائے کمال پر پہونچ جانے کے بعد کیا کہیں؟ "فرشتہ"۔ مگر بشر تو فرشتے سے افضل ہے "خدا" کہیں! یہ "شرک" ہے! انبیائے کرام سے بڑھ کر منتہائے کمال پر کون پہونچ سکتا ہے، لیکن قرآن ان کو "بشر" ہی کہتا ہے! جس طرح انسان چاہے وہ بچہ ہو، جوان یا بوڑھا ہر حالت میں بشر ہی رہتا ہے، اسی طرح روحانیت کی معراج کے بعد بھی اس کی "بشریت" کچھ اور نہیں ہو جاتی! ہم نمازوں میں روزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت بلکہ عبدیت کی گواہی دیتے ہیں۔

انجم صاحب نے میرا ایک شعر نقل فرمایا ہے:—

ہم نشیں! آملے گا میں لُٹ کے دل کے سلاؤ ۔۔ میں محمدؐ کو پکاروں، تو خدا کا نام لے

پہلے میں نے ایسا ہی کہا تھا، مگر اب مصرعِ ثانی یوں کر دیا۔

میں کروں ذکرِ محمدؐ، تو خدا کا نام لے

استعانت تو اللہ تعالیٰ ہی سے کیا جائے گا، اور اُسی کے نام کی دہائی دی جائے گی کہ وہی ہر بیکس، غمزدہ اور محتاج کی پکار سُنتا ہے۔

"بہر کیف یہ اختلافی مسئلہ نہیں کہ اہل اللہ جو چاہتے ہیں، وہی اللہ چاہتا ہے۔" (ص ۴) اس قسم کی نکتہ سنجی اور خیال آرائی

دہی خطرناک ثابت ہوتی ہے! یہ مسئلہ نہ صرف اختلافی بلکہ سرے سے غلط ہے! اصل چاہنا اللہ تعالیٰ ہی کا ہے! اہل اللہ کی چا
ند اور مانگ کو اللہ تعالیٰ رد بھی کر دیتا ہے! دُنیا کا کارخانہ اہل اللہ کی مرضی سے نہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے چل رہا ہے۔

حیرت ہوتی کہ جناب انجم جیسا ذہین اور بالغ نظر آدمی کراچی کے ایک مولود خواں سے متاثر ہو گیا، اس کی کیا کیا تعریفیں
یں ہیں! راقم الحروف نے اس شخص کا "وعظ" سنا ہے، اُس کے وعظ میں "شرک و بدعت" کی جس انداز میں تبلیغ کی جاتی ہے
انداز تو دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا، گلے بازی کا نام "عشقِ رسولؐ" نہیں ہے! جس نے "توحید" کے تقاضوں کو مجروح
یا، اس نے رسولؐ کی اطاعت کیا خاک کی!

بال و پر تو ہیں مگر یہ حال ہے   آشیانے تک اُڑا جاتا نہیں

رشؔ ملسیانی کے اس شعر میں انجم صاحب نے "مگر یہ حال ہے" کو بے ضرورت بتایا ہے، حالانکہ نہ یہ حشو ہے اور نہ بے
ضرورت ہے ———— یہ مصرعہ :-

دلوں کے زخم چھپاؤ، خوشی کو عام کرو

انجم صاحب کو پسند ہی ہے جبھی تو انھوں نے اپنی تحریر میں نقل کیا ہے! دل کے زخم تو چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی کو
نظر کہاں آتے ہیں ———— "خوشی کو عام کرو" یہ کیا بات ہوئی! شاعر کا مفہوم یہ ہے:-

"دل کا دکھڑا بیان کر کے، لوگوں کو غمگین اور مکدر نہ کرو، ہنسی خوشی کی باتیں کرو"

مگر اس کا اظہار ٹھیک طور پر نہیں ہو پایا۔

صفحہ ۵۹ ۲ پر ابوجہل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سگا چچا لکھا ہے، حالانکہ حضورؐ کا چچا ابولہب تھا، ابوجہل نہ
تھا! ابوجہل کا تو قبیلہ بھی حضورؐ کے قبیلہ سے مختلف ہے۔

صفحہ ۱۹۲ پر "غیظ" کا املا "غیض" نظر آیا، یہ آجکل کے نام نہاد ترقی پسند "تلاطم" کو "طلاطم" "شعاعوں" کو "شعاؤں" کو
اور "غیظ" کو "غیض" لکھتے ہیں! انجم صاحب اُن سے کیسے متاثر ہو گئے!

اس کتاب میں حضرت انجم کے بڑے اچھے اچھے شعر نظر آئے:-

لوگ سمجھتے ہیں محبت میں پریشانی ہے   میں نے سیکھا ہے محبت میں پریشاں ہونا
کھلیں گے پھول ہمارے لئے بہار کے بعد   یہ دور آئے گا، لیکن کچھ انتظار کے بعد
عشق ناقص سہی، بیکار نہیں ہے اے دوست   زندگی ریت کی دیوار نہیں ہے اے دوست
بکھری ہوئی ہے آج کئی دن سے زلفِ دوست   اتنی سی بات پر کہ پریشاں نہیں ہوں میں
دل کی دھڑکن سے پشیمانِ تجسس ہوں میں   اب مرے سامنے آجا، مجھے آواز نہ دے

پتھر کی لکیر

از:- سرشار صدیقی، ضخامت ۱۰۲ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- ہمارا ادارہ، ۷ — ہاجرہ آباد، کراچی ۲۵

جناب سرشار صدیقی اُردو زبان کے جانے پہچانے شاعر ہیں، اُن کا کلام کئی سال سے رسالوں میں چھپ رہا ہے! اُن کی غزلو
ور نظموں کا یہ پہلا مجموعہ ہے، جو منظرِ عام پر آیا ہے اور ادبی حلقوں میں جس کے چرچے ہو رہے ہیں!

سرشار صدیقی کی غزلوں میں مستی و سرشاری اور سوز و گداز کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے، تغزل میں وہ اپنا ایک آہنگ

لکھتے ہیں، اُن کی محبت میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں سموتے ہوتے ہیں ــــــ اُن کی نظموں میں جوش و ولولہ اور گرمی پائی جاتی ہے، فرماتے ہیں :ــ

نہ میرے ہاتھ میں تیشہ نہ میرے سر پہ غبار
نہ میرے نام کی رُسوائیاں سرِ بازار
مری قمیص کا دامن بھی تار تار نہیں
مگر نہیں، کہ مرے دل کو تجھ سے پیار نہیں
یہ اور بات کہ دُنیا کو اعتبار نہیں

اس نظم کے یہ دو شعر کتنے اچھے ہیں :ــ

جو کل تھی تلخ حقیقت وہ افسانہ ہے ۔ یہ مہر و ماہ کی تسخیر کا زمانہ ہے

اور

مگر طریقۂ اظہار اور ہے پیارے
یہ کوہکن کا نہیں اپنا دور ہے پیارے

چند منتخب اشعار :ــ

قدم قدم پہ صداقت کی آزمائش ہے ۔ کہیں صلیب، کہیں ہے پیالۂ زہراب
مجھے دار و رسن بخشے گئے ہیں ۔ تمنا کی تھی میں نے زلف و لب کی
مجھے منزل پہ لا کر کھو دیا ہے ! ۔ نکالی دُشمنی یاروں نے کب کی
چھپیں گے مجھ سے اب رہبر نہ رہزن ۔ ادا پہچان لی ہے میں نے سب کی
دیکھیں کون چمن میں شمیرے، کون چلے سرشار کے ساتھ
زنداں کی زنجیر بھی چھنکی، پائل کی جھنکار کے ساتھ

آج تقدس کے پردے میں چھپ نہ سکے گی بات حضور
دل کے اندھیروں پہ بھی نظر آئے چہرۂ پُرانوار کے ساتھ

ایک مانوس سی آواز سنائی دی تھی ۔ بے خودی میں تجھے میں نے ہی پکارا تو نہ تھا
چاکِ جگر نہ دیکھ، گریباں کی فکر کر ۔ اے ہم نشیں ! یہ ہوش و خرد کا زمانہ کر
اب کہاں جائیں گے خرابِ بہار ۔ آشیاں بھی نہیں، قفس بھی نہیں
زمیں سے عرش تک انساں کا بول بالا ہے ۔ نئی حیات کا سورج نکلنے والا ہے
کون اس سادگیٔ عشق کو سمجھے سرشار ۔ اس پہ مرتا ہوں کہ میں نے جسے دیکھا بھی نہیں
وہ شہرِ دیارِ دار و رسن ۔ یہ شہرِ صلیبِ فکر و نظر
اُس شہر میں جینا دوبھر تھا ۔ اِس شہر میں مرنا مشکل ہے
جہاں پہ رقصِ شرر کو ترس رہی ہو نگاہ ۔ وہاں تو شعلۂ خس بھی بہت غنیمت ہے

خیالِ ہجرِ مسلسل میں آتے ہیں کیا کیا — مری وفا کے قدم ڈگمگاتے ہیں کیا کیا

یہ بھی کیا کم ہے اس زمانے میں — جی رہا ہوں بقیدِ ہوش و حواس

ہم سے سیکھے کوئی آدابِ قدح نوشی کہ — ہم کہ میخانے میں غافل گئے ہشیار آئے

بس یہ دار و رسن و دار گزر جانے دو — سایۂ زلف میں آرام کریں گے ہم بھی

دوسرا رُخ :۔

صبح کی ایک لگن تھی دل میں — اُس کی نازک ڈور نہ کاٹی (صفحہ ۱۱)

کس کی ڈور نہیں کاٹی ؟ یہ تلمیح ہے یا گورکھ دھندا ہے ؟ پھر صبح اور شب کے ذکر و بیان میں "ڈور" کا ذکر کتنا بے جوڑ لگتا ہے۔

موجِ صبا ۔۔ یا لمحۂ گزراں — کون پلٹ کر آیا ہے

میں نے لیکن تیرا وعدہ — اپنے دل میں بسایا ہے

یہ آخر بات کیا ہوئی ؟ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے ؟ "وعدہ" کا دل میں بسانا خاص طور سے محلِ غور ہے۔

وہ درد جو دل میں جاگزیں تھا

وہ درد، دل سے سوا حسیں تھا

نگاہِ بے مہر کا امیں تھا (ص۲۹)

دل کا حسین ہونا ــــــ یہ نہ کوئی مسلّمہ ہے اور نہ کلیہ ہے، قافیہ کی مجبوری کے سبب "دل سے سوا پیارا" تھا کی جگہ "دل سے سوا حسیں" تھا نظم کر دیا۔

میں اُن کے طنزِ تبسم کو خوب جانتا ہوں — وفا اب اتنی بھی تحسین ناشناس نہیں (ص۲۶)

مصرعِ ثانی خوب ہے ــــ مگر "خوب جانتا ہوں" کے "الف" نے دب کر شعر کی موسیقیت کو مجروح کر دیا۔

جہانِ راز کی تخلیق کرنے والے سے — حریمِ رازِ جہاں نے مزاج پوچھا ہے (ص۵۶)

سرشار صدیقی کی نظم ــــ دسواں سیارہ ــــ کا یہ آخری شعر ہے، جس کا دوسرا مصرع کھٹکتا ہے ! انسان نے دسویں سیارے کا پتہ لگا لیا، تو انسان کو اللہ تعالیٰ کا شکر بھیجنا چاہیئے کہ اُس کی دی ہوئی عقل اور توانائیوں کی بدولت وہ شکاری بن گیا، اور جن چیزوں کے سہارے وہ چاند کی فضا پایا، اُس سے ماورا پہونچا ہے، تو یہ چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں ــــ سائنس کی ترقی دیکھ کر اللہ کی ذات پر طنز بے جوڑ سی بات ہے !

یہ بھی سوچا ہے کہ اس مکھو کھلے سمجھوتے سے — صاف ہوں گے بھی حریفوں کے غبار آگیں دل (ص۶۶)

"سمجھوتا" اور "مکھو کھلا" کتنا عجیب سا لگتا ہے ! "مکھو کھلا، تھکن" ــــ "رینگنا"، "تیرنا" ــــ یہ الفاظ نثے ادب میں بہت استعمال ہوتے ہیں !

نیند کی موت کے سوتے ہوئے منظر نامے — رات کی قسمت بے خواب پہ آویزاں ہیں (ص۷۴)

منظر ناموں کو موت کی نیند آنا ہی عجیب تھا کہ رات کی قسمتِ بے خواب پہ اُن کا آویزاں ہونا اور زیادہ عجیب محسوس ہوا ! رمزیت و اشاریت کے بھی کچھ حدود ہیں، یہ کیا کہ مافی الضمیر بطنِ شاعر ہی میں دفن ہو کر رہ جائے اور سننے والے شعر کے مفہوم کو نہ پاسکیں !

تیرے لب پر بھی تبسم کے شگوفے ہیں مگر ان شگوفوں سے مجھے کرب کی بو آتی ہے (ص ۴۵)

"کرب" میں بو بھی آتی ہے ـــــ خوب! نیا تجربہ مگر مضحکہ خیز تجربہ!

اس کتاب میں ایک نظم کا عنوان "سمجھوتا" ہے:-

ایک آوارہ و مفلس کے فسردہ دن رات
تجھے مفہوم مسرت نہیں سمجھا سکتے
تیری راحت کے یہ ساماں جو میسر ہیں تجھے
میں تو کیا میرے فرشتے بھی نہیں لا سکتے

شاعر جو بدقسمتی سے مفلس اور نادار ہے، اپنے محبوب سے جو خوشحال واقع ہوا ہے خطاب کرتا ہے ـــــ کہ مجھ مفلس و آوارہ کے افسردہ روز و شب، تجھے مسرت کا مفہوم نہیں سمجھا سکتے ـــــ سوال یہ ہے کہ "محبوب" کو تو "مسرت" میسر ہے پھر اسے "مفہوم مسرت" سمجھانے کی کیا ضرورت ہے!

پھر چوتھے مصرعہ میں "نہیں لا سکتے" قابلِ غور ہے ـــــ "مہیا نہیں کر سکتے" کا محل تھا۔

تو نے اکثر جنہیں بیداری میں دیکھا ہوگا
تجھے ان خوابوں کی تعبیریں نہ مل پائیں گی!
تیرے فردوسِ خیالات کی نورس کلیاں
میرے منحوس جہنم میں نہ کھل پائیں گی!

"بیداری میں جو خواب" دیکھے گئے ہیں، اُن سے آخر کس کیفیت اور واقعہ کا اظہار مقصود ہے، شعر میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں! محبوب کی آخر وہ کونسی تمنا ہے، جو پوری نہیں ہو سکتی ـــــ پھر یہ کیا اندازِ بیان ہے کہ "اے محبوب! تیرے فردوسِ خیالات کی نورس کلیاں، مجھ شاعر کے منحوس جہنم میں نہ کھل سکیں گی"! شاید یہ مراد ہو کہ اے میری محبوبہ! تو جو میرے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو یہ تیری تمنا پوری نہیں ہو سکتی، میں غریب و مفلس، تو خوشحال گھرانے کی چشم و چراغ، تیرا اور میرا کیا جوڑ! تیرے گھر والے یہ رشتہ قیامت تک نہیں ہونے دیں گے!

اگر شاعر کا یہی مفہوم ہے، تو اس کے اظہار و بیان کے لئے الفاظ جو استعمال ہوئے ہیں، وہ کتنے مبہم اور مفہوم سے غیر آہنگ ہیں

تیری دُنیا کا ہر اک ذرّہ ہے سرشارِ شباب
میری دُنیا میں جوانی ہے نہ سرشاری ہے
تیرے انگ انگ پہ چڑھتے ہوئے دریا کا خروش
میرے احساس پہ صدیوں کی تھکن طاری ہے

اس بند سے ایک اور بات معلوم ہوئی کہ شاعر نہ صرف مفلس و آوارہ ہے بلکہ بوڑھا بھی ہے، یا یوں کہیئے جوانی کی منزل سے گزر چکا ہے، ایسی صورت میں شکایت کس بات کی؟ ظاہر ہے کہ ایک جوان عورت کی دنیا میں شباب و سرشاری کی جو کیفیت ہونی چاہیئے وہ کیفیت ایک بوڑھے یا ادھیڑ عاشق کی دُنیا میں کہاں مل سکتی ہے!

پھر

"انگ انگ نے صوتی طور پر شعریت کا الگ خون کر دیا! اس پر مستزاد محبوبہ کے بدن کے جوڑ جوڑ پر دریا کے خروش کا چڑھنا!
جوانی کے جذبات کی سرمستی، سرشاری اور ہیجان کا اس طرح اظہار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! کس قدر ناقص اور عجیب ہے!

یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے جذبات میں دریا کا خروش پایا جاتا ہے مگر اس طرح کوئی نہیں کہتا اور نہ سوچتا ہے کہ اُس کے بدن کے جوڑ جوڑ پر "دریا کا خروش" طاری ہے یا چڑھا جا رہا ہے ــــــ پھر "صدیوں کی تھکن" سے آخر کیا مراد ہے؟ شاعر کیا دو سو تین سو سال کا بوڑھا ہے! شاید اس سے یہ مراد ہو کہ شاعر اُس مفلس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، جو صدیوں سے افلاس کے ہاتھوں خستہ و تباہ ہے ـــ

جانے کب ٹوٹیں یہ تفریق و تفاوت کے طلسم
کب مٹے جانے یہ ماحول کا بے رحم تضاد
آدمی کیا ہے ــــــ خدا بھی تو نہیں سن سکتا
دو دھڑکتے ہوئے معصوم دلوں کی فریاد

جب افلاس کے ساتھ ساتھ شاعر بوڑھا بھی ہے اور محبوبہ خوشحال اور جوان ہے، تو جوانی اور بڑھاپے کا یہ تفاوت آخر کس طرح دور ہو سکتا ہے؟ یہ تضاد نہ بے رحم ہے اور نہ اس فطری واقعہ کو "طلسم تفاوت" کہہ سکتے ہیں، جس کے ٹوٹنے کی تمنا کی جا رہی ہے!

اللہ تعالیٰ پر طنز کرنے کا یہاں کیا محل تھا؟ سرشار صاحب کے نام کے ساتھ "صدیقی" لکھا جاتا ہے، یعنی وہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں، اور اس خاندانی نسبت کا وہ اظہار بھی فرماتے ہیں، اس لئے انہیں لازمی طور پر مسلمان ہونا چاہیئے ــــــ اور ایک مسلمان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا مگر اللہ تعالیٰ پر جو رحمٰن و رحیم اور سمیع و بصیر ہے طنز نہیں کر سکتا ــــ

آدمی کیا ہے ــــــ خدا بھی تو نہیں سن سکتا
(معاذ اللہ، توبہ ـــ خاک بدہن گستاخ)

پھر یہ سمجھ میں نہیں آیا ـــ کہ اس نظم کا عنوان جو "سمجھوتا" رکھا گیا ہے، اُس کا نظم سے کیا معنوی تعلق ہے! اس نظم کا تجزیہ ہم نے یہ دکھانے کے لئے کیا ہے کہ نئی نسل اسی انداز کی شاعری کی طرف جا رہی ہے، اور یہ شعر و ادب کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے، اس سے اُردو زبان و ادب کو بڑا شدید نقصان پہونچے گا!

جب اس طرح کی نظمیں :۔
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
کہنے والے شاعری کے "ہیرو" بنا دیئے جائیں ــــــ تو اُس ملک، قوم اور زبان کی شاعری کا جتنا بھی حلیہ بگڑ جائے کم ہے!
جناب سرشار صدیقی بڑی شاعرانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں، جس کی جھلکیاں جابجا "پتھر کی لکیر" میں ملتی ہیں، اگر وہ نام نہاد "ترقی پسندی" کے سانچے سے بچ کر اپنی شاعرانہ توانائیوں کو بروئے کار لائیں تو ان کا مستقبل اُردو زبان و ادب کو بہت کچھ دے سکتا ہے ـــ

ـــــ×ـــــ

دردِسر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیبارٹریز لمیٹڈ ۔ کراچی

سنن ابن ماجہ شریف مترجم اُردو، چھ روپے میں!

حدیث کی مشہور و معروف کتاب سنن ابن ماجہ شریف مترجم اُردو کامل بارہ روپے میں!

رعایتی قیمت چھ روپے، محصول ڈاک دو روپے

جملہ آٹھ روپے پیشگی بھیجکر طلب فرمائیے!

غنیۃ الطالبین مترجم، آدھی قیمت میں!

محبوب سبحانی سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی شہرہ آفاق تالیف غنیۃ الطالبین مع فتوح الغیب مترجم عربی، اُردو، دو جلدوں میں کامل، اصل قیمت چوبیس روپے، صرف دو ماہ کے لئے رعایتی قیمت بارہ روپے محصول ڈاک ۲ روپے کل ۱۴ روپے پیشگی بھیج کر طلب کیجئے۔

مکتبہ سعودیہ حدیث منزل بنس روڈ، آرٹیلری میدان کراچی فون نمبر ۵۳۷۸۹